جلد اوّل

اِصلاحی مجالِس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- تصوف کی حقیقت
- مجاہدہ و ریاضت
- بدنظری اور اس کا علاج
- غیبت اور اس کا علاج
- بدگمانی اور اس کا علاج
- تجسس اور اس کا علاج
- تکبر اور اس کا علاج

حضرت مولانا مُفتی مُحمّد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

عرضِ مرتّب

استاذ مکرم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اللہ جل شانہ نے علم ظاہری و باطن دونوں سے نوازا ہے۔ ایک طرف آپ شیخ الحدیث ہیں، تو دوسری طرف آپ پیر طریقت بھی ہیں۔ جس طرح طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، اس طرح آپ روحانی بیماریوں کا علاج فرماتے ہیں، اور اس وقت سینکڑوں روحانی مریض آپ کے زیرِ علاج ہیں۔

"رمضان المبارک" کو اصلاحِ باطن کے لئے خاص مناسبت حاصل ہے، اس لئے حضرت والا مدظلہم نے اصلاحِ باطن کی مجالس کے لئے اس مہینے کو منتخب فرمایا چنانچہ کئی سالوں سے رمضان المبارک میں بعد نمازِ ظہر اصلاحی مجالس کا سلسلہ جاری ہے۔ اور سینکڑوں طالبین اصلاح اس مجلس سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔

احقر کو اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی صحبت اور آپ کے قرب کی عظیم نعمت سے محض اپنے فضل و کرم سے نوازا ہوا ہے، چنانچہ اس قرب سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے احقر نے وہ مجالس ریکارڈ کرلیں، اور اب ان حضرات تک ان مجالس کو پہنچانے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں جو دُور ہونے کی وجہ سے براہِ راست ان مجالس سے فیضیاب نہیں ہوئے، اب ان مجالس سے فائدہ اُٹھانا، اور ان پر عمل کر کے اپنی زندگیوں میں تبدیلی لانا آپ کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت والا کے درجات بلند فرمائے۔ عمر میں برکت عطا فرمائے۔ اور مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

عبد اللہ میمن

دار العلوم کراچی ۱۴-۹ شعبان سنہ ۱۴۲۱ھ

اجمالی فہرست "اصلاحی مجالس"

صفحہ

نمبر شمار	فہرست مضامین	صفحہ نمبر
۱۹۱	**گیارہویں مجلس**	۲۱۳
۱۹۲	**بدگمانی اور تجسّس۔ اور انکا علاج**	″
۱۹۳	معاشرتی خرابیوں کا سبب	۲۱۶
۱۹۴	ہمارے معاشرے کی حالت	۲۱۷
۱۹۵	آیت قرآنی میں عجیب ترتیب	″
۱۹۶	تجسّس اور تحسّس میں فرق	۲۱۸
۱۹۷	تجسّس کیوں حرام ہے؟	۲۱۹
۱۹۸	اپنے عیوب کی فکر کرو	″
۱۹۹	حضرت تھانویؒ کی حالت	۲۲۰
۲۰۰	مذموم بدگمانی کونسی؟	۲۲۱
۲۰۱	دوسرے کے عمل کی تاویل کرو	۲۲۲
۲۰۲	یہ بدگمانی کے دو درجے	۲۲۳
۲۰۳	بدگمانی کا منشا کِبر ہے	۲۲۴
۲۰۴	تجسّس اور بدگمانی انتہاء "غیبت" ہے	۲۲۵
۲۰۵	بدگمانی میں گناہ کا درجہ	۲۲۶

☆☆☆

پہلی مجلس

تصوف کی حقیقت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

پہلی مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین، والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم وعلی آله وأصحابه اجمعین أما بعد:

کئی سال سے رمضان المبارک میں حکیم الامت مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات سنانے کا معمول ہے۔ سنانے سے مقصود یہ ہے کہ ہمارے اندر اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہو، رمضان المبارک کا مہینہ خصوصی طور پر اصلاح نفس اور تہذیب اخلاق کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نعمت ہے۔ اگر انسان اس ماہ کی قدر کرے اور اس ماہ میں اپنی اصلاح کی فکر اور اس کا اہتمام کرے تو وہ جلد منزل کے قریب پہنچ جاتا ہے۔ اسی لئے کئی سالوں سے رمضان المبارک میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے (تہذیب اخلاق سے متعلق) ارشادات سنانے کا یہ سلسلہ شروع کیا ہوا ہے۔

حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ

جو کتاب اس وقت میرے سامنے ہے، اس کا نام "انفاس عیسیٰ" ہے، یہ کتاب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے اصلاحی ملفوظات، آپ کی تربیتی ہدایات اور نفسانی امراض کے علاج کے لئے سفید اور مجرب نسخوں کا خلاصہ ہے جس کو حضرت والا کے خاص خلیفہ مجاز حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مرتب کیا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلفاء کی بڑی تعداد ہے، ان میں سے ہر ایک نے اپنی بساط اور صلاحیت کے مطابق حضرت والا سے کسب فیض کیا، اور ان میں سے ہر ایک ہمارے لئے آفتاب اور مہتاب کا درجہ رکھتا ہے، لیکن ہر خلیفہ میں کچھ خصوصیات ایسی ہیں جو اس کو دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت والا کے ابتدائی دور کے خلفاء میں سے ہیں، ان کے بارے میں یہ بات معروف اور مشہور ہے کہ حضرت والا کے ساتھ مشابہت میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی، ظاہری شکل وصورت، لباس وپوشاک، چال ڈھال، رفتار وگفتار، ہر چیز میں حضرت والا کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت تھی، یہاں تک کہ آواز میں بھی مشابہت تھی۔ چنانچہ جب آپ قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو باہر سے سننے والے کو دھوکہ ہو جاتا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تلاوت کر رہے ہیں یا حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب تلاوت کر رہے ہیں، اتنی زیادہ مشابہت تھی۔ اور جب ظاہری مشابہت اتنی زیادہ تھی تو اندر اور باطن میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کیا کیا کسب فیض کیا ہوگا، اس کا اندازہ ہم اور آپ کر ہی نہیں سکتے۔

جب کسی کو اپنے شیخ کے ساتھ شدید محبت ہو، مناسبت کامل ہو اور پھر

طویل صحبت اور رفاقت رہی ہو اور اکتساب فیض رسوخ کے ساتھ کیا ہو تو بسا اوقات ظاہری انداز و عادات میں بھی مشابہت پیدا ہو جاتی ہے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانہ میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، چنانچہ روایات میں آتا ہے (کان اشبه الناس برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دلاّ وسمتا وهديا) کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اپنے انداز و ادا میں، اٹھنے بیٹھنے میں، چال ڈھال میں، لباس پوشاک میں جتنی مشابہت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی، اتنی مشابہت کسی اور کو حاصل نہیں تھی۔ چنانچہ لوگ ان کو دیکھ کر اپنی آنکھیں اس طرح ٹھنڈی کیا کرتے تھے جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت سے ٹھنڈی کیا کرتے تھے۔

حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ تو بہر حال ایک الگ حیثیت رکھتا ہے، تاہم اس سے ملتی جلتی کیفیت کے نمونے امت میں پائے گئے ہیں، اسی طرح کا ایک نمونہ حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب اور ان کے شیخ علیہ الرحمۃ کا بھی ہے۔ جس شخص میں ظاہری طور پر بھی ایسی مشابہت ہو جائے اس کے بارے میں یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ اپنے شیخ کے مزاج و مذاق اور ان کے علوم و فیوض کو جذب کئے ہوئے اور پوری طرح ہضم کئے ہوئے ہے۔

انفاس عیسیٰ

بہر حال، حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت اور خدمت میں رہنے کے دوران حضرت والا سے جو باتیں سنیں اور جو تعلیمات حاصل کیں، ان کا خلاصہ ہمارے لئے اس کتاب "انفاس

عیسیٰ" میں جمع کر دیا ہے۔ یہ کتاب حضرتؒ کے دیگر عام ملفوظات کے مجموعوں کی طرح ملفوظات کی کتاب نہیں ہے، چنانچہ عام ملفوظات اور مجالس کی کتابوں میں یہ نظر آئے گا کہ حضرت والا نے کسی موضوع سے متعلق ایک بات ارشاد فرمائی، پھر تھوڑی دیر کے بعد دوسرے کسی اور موضوع سے متعلق دوسری بات ارشاد فرمائی۔ اور پھر تیسری بات تیسرے موضوع سے متعلق ارشاد فرمائی، اور ان باتوں کو لوگوں نے جمع کرنا شروع کر دیا۔

لیکن اس کتاب میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہنے کے دوران تصوف اور طریقت سے متعلق جو کچھ سنا اور جو تعلیم حاصل کی، پہلے اس کو ہضم کیا، پھر اس کی تلخیص اس طرح لکھی کہ اس میں اکثر الفاظ بھی حضرت والا ہی کے ہیں۔

اس طرح ان تعلیمات کا نچوڑ اور خلاصہ ہمارے لئے اس کتاب کے اندر جمع کر دیا ہے، لہٰذا یہ کتاب "انفاس عیسیٰ" ہمارے لئے بڑی عجیب و غریب نعمت ہے۔

تصوف اور سلوک کا مقصود اصلی

تصوف، طریقت، سلوک، احسان، ایک ہی مفہوم کے مختلف عنوانات ہیں، اس تصوف کا اصل مقصود نہ تو محض ذکر ہے، چنانچہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصود "ذکر" ہی ہے، جب ہم کسی شیخ سے بیعت ہو جائیں گے تو وہ ہمیں وظائف بتادے گا۔ اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد عملیات اور روحانی علاج ہے کہ شیخ ہمیں کچھ عملیات اور تعویذ گنڈے اور روحانی علاج کا طریقہ بتائے گا۔ خوب سمجھ لیں کہ "تصوف" کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں،

حتیٰ کہ "ذکر" بھی تصوف کا مقصود اصلی نہیں، بلکہ مقصود اصلی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی طرح بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کہیں تنہائی میں بیٹھ کر مراقبہ کرے، اور چلہ کاٹے، مجاہدے کرے۔ حالانکہ یہ سب چیزیں بھی "تصوف کا مقصود اصلی نہیں ہیں بلکہ مقصود اصلی کو حاصل کرنے کے کے مختلف طریقے اور راستے ہیں۔

پھر "تصوف" کا مقصود اصلی کیا ہے؟ تصوف کا مقصود اصلی وہ ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا: ﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا﴾ (سورہ الشمس) یعنی تزکیہ نفس۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے بیان کرتے ہوئے فرمایا "وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ" (سورہ بقرہ) اس آیت میں تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کو مقاصد بعثت میں سے بیان فرمایا، پھر "تزکیہ" کو علیحدہ کر کے بیان فرمایا۔ "تزکیہ" کے لفظی معنی ہیں، پاک صاف کرنا۔ شریعت کی اصطلاح میں تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح انسان کے ظاہری اعمال و افعال ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے میں نواہی ہیں مثلاً یہ کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ دو، حج کرو وغیرہ، یہ اوامر ہیں، اور جھوٹ نہ بولو، غیبت نہ کرو۔ شراب نہ پیو، چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ ڈالو وغیرہ، یہ نواہی اور گناہ ہیں، ان سے بچنے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔

اسی طرح انسان کے باطن یعنی قلب میں بعض صفتیں مطلوب ہیں، وہ اوامر میں داخل ہیں، ان کو حاصل کرنا واجب ہے اور ان کو حاصل کئے بغیر فریضہ ادا نہیں ہوتا، اور بعض صفات ایسی ہیں جن کو چھوڑنا واجب ہے، وہ نواہی میں داخل ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کی نعمت پر "شکر کرنا" واجب ہے، اگر کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو اس پر صبر کرنا واجب ہے، اللہ تعالیٰ پر "توکل اور بھروسہ" رکھنا واجب

ہے، ''تواضع'' اختیار کرنا یعنی اپنے آپ کو کمتر سمجھنا واجب ہے، ''اخلاص'' حاصل کرنا، یعنی جو کام بھی آدمی کرے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے کرے، اس اخلاص کی تحصیل واجب ہے، اخلاص کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔ لہٰذا یہ صفات ''شکر، صبر، توکل، تواضع، اخلاص، وغیرہ، یہ سب صفات ''فضائل'' اور ''اخلاقِ فاضلہ'' کہلاتی ہیں، ان کی تحصیل واجب ہے۔

اسی طرح باطن کے اندر بعض بُری صفات ہیں جو حرام اور ناجائز ہیں جن سے بچنا ضروری ہے، وہ ''رذائل'' اور ''اخلاق رذیلہ'' کہلاتی ہیں، یعنی یہ صفات کمینی اور گھٹیا صفات ہیں، اگر یہ صفات باطن کے اندر موجود ہوں تو ان کو کچلا اور مٹایا جاتا ہے، تاکہ یہ صفات انسان کو گناہ پر آمادہ نہ کریں، مثلاً ''تکبر'' کرنا یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، ''حسد'' کرنا، ''ریاکاری'' اور دکھاوا، یعنی انسان اللہ کو راضی کرنے کے بجائے مخلوق کو راضی کرنے کے لئے اور ان کو دکھانے کے لئے کوئی دینی کام کرے، یہ ریا ہے، لہٰذا تکبر حرام، حسد حرام، بغض حرام، ریاکاری حرام، اور بے صبری یعنی اللہ تعالیٰ کی قضا پر راضی نہ ہونا بلکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرنا، یہ حرام ہے، یہ سب رذائل ہیں جو انسان کے باطن میں موجود ہوتے ہیں۔ اسی طرح غصہ کو اگر انسان بے محل استعمال کرے تو یہ بھی رذائل میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ باطن میں بہت سے ''فضائل'' ہیں، جن کو حاصل کرنا ضروری ہے، اور بہت سے ''رذائل'' ہیں جن سے اجتناب ضروری ہے۔ اور حضرات صوفیاء اور مشائخ یہ کام کرتے ہیں کہ اپنے مریدین اور شاگردوں کے دلوں میں اخلاق فاضلہ کی آبیاری کرتے ہیں اور اخلاق رذیلہ کو کچلتے ہیں تاکہ یہ اخلاق رذیلہ کچلتے کچلتے نہ ہونے کے حکم میں ہو جائیں۔ جس کے لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ

علیہ نے یہ اصطلاح بیان فرمائی کہ "امالہ بدرجہ ازالہ" یعنی باطن کے اندر جو رذیلہ ہے، اس کو اتنا کچلو اور اس کو اتنا پیٹو کہ اس کے بعد وہ رذیلہ باقی تو رہے گا، ختم تو نہیں ہو گا، لیکن نہ ہونے کے حکم میں ہو جائے گا۔ بہر حال، تصوف میں رذائل کو کچلنا ہوتا ہے اور فضائل کو حاصل کرنا ہوتا ہے، اسی کا نام تزکیہ ہے اور بس یہی تصوف کا مقصود اصلی ہے۔

شیخ کی ضرورت

لیکن عام طور پر یہ چیز کسی شیخ کی صحبت حاصل کئے بغیر اور شیخ کے سامنے اپنے آپ کو فنا کئے بغیر حاصل نہیں ہوتی، کیوں؟ اسلئے کہ "لکل فنٍ رِجَالٌ" یعنی ہر فن کو حاصل کرنے کے لئے اسکے ماہر کے پاس جانا ضروری ہے، اگر فقہ کا مسئلہ معلوم کرنا ہو تو کسی مفتی کے پاس چلے جاؤ، کیونکہ اس کو یہ فن آتا ہے، وہ جانتا ہے کہ کس سوال کا کیا جواب دینا چاہئے۔ لیکن اعمال باطنہ کے بارے میں مہارت حاصل کرنا اور یہ پہچاننا کہ آیا اس شخص کے اندر یہ بیماری پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ کیونکہ باطن کی بیماریاں بھی مخفی اور باریک قسم کی ہوتی ہیں، ایک چیز بڑی اچھی ہے اور دوسری چیز بڑی خراب ہے، لیکن دونوں کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے۔ مثلاً تکبر کرنا حرام ہے اور اس سے بچنا واجب ہے، اس لئے کہ یہ تکبر اُمّ الامراض ہے۔ لیکن دوسری صفت "عزت نفس" ہے، اس کو حاصل کرنا واجب ہے، کیونکہ اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں۔ لیکن یہ دیکھنا کہ کہاں "تکبر" ہے اور کہاں "عزت نفس" ہے، جو کام میں کر رہا ہوں یہ "تکبر" کی وجہ سے کر رہا ہوں یا یہ "عزت نفس" کی وجہ سے کر رہا ہوں، دونوں کے درمیان کون خط امتیاز کھینچے اور دونوں کو کون پہچانے کہ یہ تکبر ہے اور یہ "عزت نفس"

ہے، یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ خاص طور پر انسان کا خود اپنے اندر ان بیماریوں کا پہچاننا بڑا مشکل ہے۔

مثلاً ایک بیماری ہے "اپنی بڑائی بیان کرنا" کہ میں ایسا اور ویسا ہوں، میرے اندر یہ اچھائی ہے، میرے اندر یہ خوبی ہے، یہ حرام ہے، اسی کو "تعلّی" کہا جاتا ہے۔ دوسری چیز ہے "تحدیث نعمت" جس کا قرآن کریم کے اندر ذکر ہے:

﴿وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ﴾ (سورۃ الضحیٰ) اب کون اس کے درمیان فرق کرے کہ میں جو اپنی اچھائی بیان کر رہا ہوں، یہ "تعلّی" ہے یا "تحدیث نعمت" ہے؟

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ

اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہوئی ایک بات یاد آگئی، فرمایا کہ ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ دھلی میں مسجد کے منبر پر بیٹھ کر وعظ فرما رہے تھے، بہت بڑا مجمع سامنے بیٹھا ہوا تھا، وعظ فرماتے فرماتے کہنے لگے کہ آج میں ایک بات آپ لوگوں سے بیان کرتا ہوں، یہ بات مجھ ہی سے سنیں گے اور کسی سے سننے میں نہیں آئیگی، اور میں یہ بات "تحدیثِ نعمت" کے طور پر کہہ رہا ہوں کہ یہ علم اللہ تعالیٰ نے مجھے ہی القاء فرمایا ہے۔ یہ بات کہنے کے بعد ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا کہ "استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ" میں نے یہ کیا جملہ کہہ دیا کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سن سکیں گے اور کہیں سننے میں نہیں آئے گی، یہ تو دعویٰ اور "تعلّی" ہے اور میں نے اپنی بڑائی بیان کی ہے، اور اس کو میں نے "تحدیثِ نعمت" کا نام دیدیا، لہٰذا میں اس پر استغفار کرتا ہوں "استغفر اللہ،

استغفر اللہ" اول تو میں نے اپنی بڑائی بیان کی، اور پھر اس بڑائی کو "تحدیثِ نعمت" کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی، اور قاعدہ ہے کہ "توبة السرّ بالسرّ والعلانية بالعلانية" کیونکہ یہ گناہ میں نے اعلانیہ کیا تھا، اس لئے توبہ بھی اعلانیہ کرتا ہوں کہ یہ مجھ سے غلطی ہوئی، اس غلطی پر استغفار کرتا ہوں، استغفر اللہ، استغفر اللہ۔ عین وعظ کے دوران یہ کام کیا، اس طرح کوئی دوسرا کر کے دکھائے، یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جو اپنے آپ کو مٹا چکا ہو، اپنے کو فنا کر چکا ہو، اور پھر نفس کی باریک چالوں سے باخبر ہو اور اپنے نفس کا نگراں رہتا ہو، اس کا احتساب ہمہ وقت کرتا رہتا ہو۔ اب آپ دیکھیں کہ جو بات میں بیان کر رہا ہوں، یہ "تعلّی" کے طور پر بیان کر رہا ہوں یا "تحدیث نعمت" کے طور پر بیان کر رہا ہوں، ان کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے اور اس کو پہچاننا ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

تواضع اور ذلت نفس میں فرق

اسی طرح "تواضع" بڑی عمدہ چیز ہے، اعلیٰ درجے کی صفت ہے اور مطلوب ہے، ایک دوسری صفت ہوتی ہے "ذلتِ نفس" یعنی دوسرے کے سامنے نفس کو ذلیل کرنا، یہ حرام ہے، اللہ تعالیٰ نے نفس کی عزت واجب کی ہے، اس کو ذلیل نہیں کرنا چاہئے، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق کرنا کہ کونسا عمل "تواضع" کی وجہ سے کیا جارہا ہے اور کونسے فعل میں "ذلت نفس" ہے، ان کے درمیان فرق کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

ایک واقعہ

اسی فرق کے سلسلے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا واقعہ بیان فرمایا کہ میں ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہا تھا، ریل میں میرے پاس کچھ دیہاتی بھی بیٹھے ہوئے تھے، سفر کے دوران جب کھانے کا وقت آیا تو ان دیہاتیوں نے اپنے ساتھ جو سالن روٹی لائے تھے، وہ نکال کر سامنے رکھا، اور مجھے بھی کھانے کی دعوت دیتے ہوئے کہا کہ حضرت جی! کچھ گوہ موت ہمارے ساتھ بھی کھالو، اس کھانے کو تواضعاً "گوہ موت" کا نام دیدیا، اب بظاہر تو یہ تواضع کی بات تھی، لیکن حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کے رزق کی ناقدری تھی کہ اللہ تعالیٰ کے رزق کو "گوہ موت" قرار دے کر اس کی دوسرے کو دعوت دیا اور بلائے، یہ "تواضع" نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری اور بے توقیری ہے۔

بہر حال، کبھی تواضع کی سرحد ذلت نفس کے ساتھ مل جاتی ہے، اور کبھی اس کی سرحد ناشکری کے ساتھ مل جاتی ہے، اب کس حد تک تواضع کرے اور کس حد پر تواضع نہ کرے، کہاں تواضع ہے کہاں اور ناشکری ہے۔ کہاں تواضع ہے اور کہاں ذلت نفس ہے، ان کے درمیان فرق کو پہچاننا ہر ایک کا کام نہیں جب تک کسی شیخ سے تربیت حاصل نہ کرلے۔

یہ چیز محض پڑھا دینے سے حاصل نہیں ہوتی کہ کتاب میں پڑھ کر کسی چیز کی حد تام معلوم کرلی اور پھر خود ہی اس کے فوائد اور قیود نکالنے شروع کر دیے۔ یاد رکھئے! یہ اس قسم کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ کام عملی تربیت سے آتا ہے، جب کسی شیخ کو مسلسل آدمی دیکھتا رہے اور اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کرتا رہے اور اس کو اپنے حالات بتا کر اس سے ہدایات لیتا رہے، اس کے نتیجے میں پھر انسان کو یہ ادراک حاصل ہوتا ہے کہ عمل و اخلاق کا یہ درجہ قابل حصول صفت ہے اور یہ کیفیت یا درجہ قابل ترک رذیلہ ہے۔

ایک مثال

میں اس کی یہ مثال دیا کرتا ہوں جیسے ایک گلاب کا پھول ہے۔ کسی بڑے سے بڑے فلسفی اور منطقی سے کہا جائے کہ تم اس گلاب کے پھول کی خوشبو کی ایسی جامع مانع تعریف کرو جو اس کو چنبیلی کی خوشبو سے ممتاز کردے۔ گلاب کے پھول سے بھی خوشبو آرہی ہے اور چنبیلی کے پھول سے بھی خوشبو آرہی ہے، اس کام کے لئے کسی بڑے سے بڑے فصیح اور بلیغ کو بلالو، کسی ادیب اور شاعر کو بلالو اور اس سے کہو کہ گلاب اور چنبیلی کی خوشبو میں فرق بیان کرو، بتایئے! کوئی فرق بیان کرسکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ بس اس کے فرق کرنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے کہ پوچھنے والے سے کہا جائے کہ اس گلاب کے پھول کو سونگھ لو اور اس چنبیلی کے پھول کو سونگھ لو۔ سونگھنے کے بعد پتہ چل جائے گا کہ گلاب کی خوشبو کیسی ہوتی ہے اور چنبیلی کی خوشبو کیسی ہوتی ہے، اس کے علاوہ دونوں کے درمیان فرق معلوم کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔

دوسری مثال

ایک مثال اور سنئے! دیکھیں، آم بھی میٹھا ہوتا ہے، اور گڑ بھی میٹھا ہوتا ہے گڑ کی مٹھاس کیسی ہے؟ اور آم کی مٹھاس کیسی ہے؟ دونوں کی مٹھاس میں جو فرق ہے، وہ کسی بڑے سے بڑے فلسفی اور منطقی سے بیان کراؤ، ہرگز بیان نہیں کرسکتا، کیونکہ دونوں کی مٹھاس کا جو فرق ہے وہ زبان سے لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا، اس فرق کو جاننے کا یہ طریقہ ہے کہ اس پوچھنے والے کہا جائے کہ تو گڑ بھی کھا اور آم بھی کھا، پھر پتہ چل جائے گا کہ آم کی مٹھاس کیسی ہوتی ہے اور گڑ

کی مٹھاس کیسی ہوتی ہے۔

بالکل اسی طرح انسان کے باطن کے جو فضائل ہیں۔ مثلاً ''تواضع'' ہے، اگر اس کی لفظوں میں کوئی مکمل تعریف بیان کرنا چاہے تو بہت مشکل ہے، لیکن جب کسی متواضع آدمی کو دیکھو گے اور اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کرو گے اور اس کی صحبت میں رہو گے تو اس کے نتیجے میں وہ اوصاف تمہارے اندر بھی منتقل ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اس لئے تصوف اور سلوک میں شیخ کی صحبت اور اس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ صرف باتیں کر لینے سے یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، بلکہ کسی کے سامنے رگڑے کھانے سے اللہ تعالیٰ فضل فرما دیتے ہیں اور یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔

اپنی اصلاح کرانا ضروری ہے

بہر حال، پیر اور شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہونا کوئی فرض نہیں کہ آدمی کسی شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ضرور بیعت ہو جائے، لیکن اپنی اصلاح کرانا ضروری ہے، اور جب اپنی اصلاح کے لئے کوئی شخص اپنے شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ آدمی کو فضائل حاصل ہوں اور رذائل سے آدمی بچ جائے، ان رذائل کا امالہ ہو اور وہ انسان کے قابو میں آجائیں سلوک و تصوف کا یہ اصل مقصد ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں اذکار اور اوراد یا مختلف وظائف سالک کے لئے معین اور مددگار ہو جاتے ہیں، مگر ہر شخص کے لئے ان اذکار اور اوراد کی مقدار، اس کا موقع اور وقت، یہ شیخ کی رہنمائی اور مشورے سے ہی مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی سے اصلاح حال کا فائدہ ہوتا ہے، ورنہ عام حالات میں یہ اذکار اور اوراد اس درجہ میں خود مقصود

نہیں، بلکہ اصل کام اپنے اخلاق کی اصلاح ہے اور اس کا تزکیہ ہے، جس کے لئے ضروری ہے کہ شیخ کو اپنے حالات کی اطلاع دیتا رہے اور اس سے ہدایات لیتا رہے اور پھر ان ہدایات پر عمل کرتا رہے، بس ساری زندگی یہی کام کرتا رہے۔ شیخ کی طرف رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے۔

اس کتاب "انفاس عیسیٰ" میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "رذائل" اور "فضائل" سے متعلق جو ملفوظات جمع فرمائے ہیں، ان کو پڑھ لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ ان کی تھوڑی سی تشریح کر دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان کو سمجھنے کی بھی توفیق عطا فرمائے اور ان کے ذریعہ اپنی اصلاح کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

دوسری مجلس
رذائل کی اصلاح

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

دوسری مجلس
رذائل کی اصلاح

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم وعلی آله واصحابه اجمعین اما بعد:

رذائل کے اصلاح کی حد

انسان کے باطن میں جو خراب اور فاسد قسم کی صفتیں ہوتی ہیں، ان کو "رذائل" کہا جاتا ہے۔ اس عنوان کے تحت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"سالک کو چاہئے کہ رذائل کی اصلاح شیخ سے ایک ایک کی کرائے، جب ایک رذیلے کی مقاومت پر پوری قدرت ہو جائے اور مادّے کا اضمحلال ہو جائے تو دوسرے رذیلے کا علاج شروع کرے، اور اس رذیلے کے ازالۂ کلی کا کبھی انتظار نہ کرے، کیونکہ یہ ناممکن ہے، بلکہ اس مادّے کے وجود میں ہزارہا حکمتیں ہیں"۔

(انفاسِ عیسیٰ: ص ۱۳۷)

"سالک" کے معنی ہوتے ہیں "چلنے والا" تصوف کی اصطلاح میں "سالک" اس کو کہتے ہیں جو کسی شیخ کے پاس اپنی اصلاح کرانے کے لئے جاتا ہے، گویا کہ وہ راستے پر چل رہا ہے۔ "تصوف" کو کہتے ہیں "طریق" اور "سالک" اس طریق پر چلنے والا، اور "شیخ" کی مثال رہنما کی ہے جو اس کو راستہ بتاتا ہے کہ اس طرح چلو اور اس طرح کام کرو۔ حضرت نے فرمایا کہ "سالک" کو چاہئے کہ "رذائل" کی اصلاح شیخ سے ایک ایک کی کرائے۔ مثلاً اس کے اندر غصہ ہے، اور "غصہ" ایک رذیلہ ہے، اس کی اصلاح کرانی ہے، غصے کے نتیجے میں مارتا پیٹتا ہے یا ڈانٹ ڈپٹ کرتا رہتا ہے، اور غصہ کے اندر آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ تو اس شیخ کو بتائے کہ میرے اندر غصہ بہت ہے، اور اس غصے کے نتیجے میں بہت سی غلط باتیں بھی مجھ سے ہو جاتی ہیں۔ اب شیخ اس کا علاج کریگا۔ کیسا علاج کریگا؟ وہ ایسا علاج نہیں کریگا کہ اس کے نتیجے میں غصہ آنا بند ہو جائے گا، بلکہ علاج کے بعد بھی غصہ تو آئے گا، کیونکہ غصہ ایک فطری صفت ہے جو ہر انسان کے اندر ہوتی ہے، لیکن علاج کے نتیجے میں وہ غصہ شریعت کے تابع ہو جائے گا۔

اسی طرح نفس کے اندر جتنے بھی رذائل ہیں، چاہے وہ غصہ ہو یا شہوت ہو یا بخل ہو، یہ سب فطری ہیں، اور یہ صفات اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر اس لئے رکھی ہیں تاکہ انسان ان کو صحیح محل پر استعمال کرے، اگر انسان کے اندر غصہ نہ ہو تو وہ اپنی جان کا دفاع کیسے کریگا؟ مال کا دفاع کیسے کریگا؟ اپنے بیوی بچوں کا دفاع کیسے کریگا؟ غصہ نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خواہ کوئی اس پر حملہ آور ہو یا اس کے بیوی بچوں پر حملہ آور ہو، مگر اس کو غصہ ہی نہیں آئے گا، دوسرے کے اس غلط اقدام کو روکنے کے لئے طبیعت میں کوئی محرک ہی نہ ہوگا، نہ اپنے نقصان سے

بچنے کا کوئی تقاضا بیدار ہوگا۔

ایک نواب کا واقعہ

جیسے میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ ایک نواب صاحب ہر کام ضابطے میں کیا کرتے تھے، ان کا طرہ امتیاز یہ تھا کہ انہوں نے اپنا ایک ضابطہ بنا رکھا تھا کہ اتنے بجے سے اتنے بجے تک فلاں کام کروں گا، اتنے بجے سے اتنے بجے تک فلاں کام کروں گا، فلاں وقت کھانا کھاؤں گا، فلاں وقت سوؤنگا، فلاں وقت اٹھونگا۔ اور جس کام کے لئے جو وقت مقرر کر رکھا تھا، اس کے بارے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ میں اس وقت ضابطے میں یہ کام کر رہا ہوں، چاہے وہ کام نہ کر رہے ہوں۔ مثلاً سونے کا وقت چھ گھنٹے مقرر کیا ہے، اور یہ طے کیا ہوا ہے کہ مجھے صبح ٦ بجے اٹھنا ہے، اب اگر پانچ بجے آنکھ بھی کھل جائے گی تب بھی وہ چھ بجے تک لیٹے رہیں گے، اگرچہ اس وقت وہ حقیقت میں تو نہیں سو رہے ہیں، لیکن ضابطے میں سو رہے ہیں۔

ایک دن نواب صاحب کے اٹھنے کا وقت ٦ بجے تھا، مگر ۵ بجے آنکھ کھل گئی، اب ضابطے میں وہ سو رہے تھے، اس وقت گھر میں ایک بندر گھس آیا، وہ بندر نواب صاحب کے کپڑے لیکر بھاگ گیا، پھر دوبارہ آکر روٹی لیکر بھاگ گیا، پھر کچھ اور سامان لیکر بھاگ گیا، مگر نواب صاحب لیٹے لیٹے بندر کو دیکھ رہے ہیں، جونہی چھ بجے تو فوراً ہڑ بڑا کر اٹھے، اور کہنے لگے کہ ارے بھائی! کوئی دیکھنے والا نہیں ہے، یہ بندر سب چیزیں اٹھا کر لیجا رہا ہے، کیا سب لوگ مر گئے ہیں؟ لوگوں نے ان سے پوچھا کہ جناب! آپ نے بندر کو لیجاتے ہوئے خود دیکھا تھا؟ کہنے لگے ہاں! ہم نے خود لیجاتے ہوئے دیکھا تھا۔ تو پھر جناب آپ ہی بندر کو روک دیتے، نواب

صاحب نے کہا: ارے بھائی! ہم اس وقت ضابطے میں سو رہے تھے۔ اب دیکھئے کہ اس ضابطے کو اس درجہ اپنے اوپر لاگو کر لیا کہ انسان کے جو فطری جذبات ہوتے ہیں کہ انسان اپنے جان اور مال کا دفاع کرے، وہ بھی اس ضابطے کے آگے قربان ہے۔

غصہ کو برمحل استعمال کرنا

اللہ تعالیٰ نے یہ غصہ اور غیرت اس لئے پیدا کی ہے کہ اگر دوسرا شخص تمہارے مال پر، تمہاری جان پر، تمہارے بیوی بچوں پر، تمہارے اعزہ اقرباء پر زیادتی کرے تو آدمی اس غیرت اور غصے کو کام میں لا کر اس کا دفاع کرے۔ مگر اس غصے کا حد سے زیادہ ہونا یہ ہے کہ جہاں غصہ کا محل نہیں تھا، آدمی وہاں غصہ کرے، جہاں شریعت نے غصہ استعمال کرنے کو منع کیا تھا، اگر وہاں پر آدمی غصہ کرے۔ ڈانٹ ڈپٹ کرے، مار پیٹ کرے، یہ اس کا غلط استعمال ہے، یہ جائز نہیں۔ بہرحال، غصے کے کچھ جائز محل ہیں اور کچھ ناجائز محل ہیں، جائز محل میں غصے کا استعمال کوئی بری بات نہیں، بلکہ عین مطلوب ہے، مثلاً کوئی باپ اپنے بیٹے کو اس کی غلط بات پر ڈانٹے، یا استاد شاگرد کو ڈانٹے، یا شیخ مرید کو ڈانٹے، تاکہ اس کی خراب بات دور ہو جائے، تو یہ غصہ عین مطلوب ہے، بلکہ ایسے محل پر غصہ نہ کرنا مرض اور بیماری ہے۔ لیکن اگر وہ غصہ اپنی حد سے متجاوز ہو جائے، مثلاً ایک آدمی آپ سے ملنے کے لئے آیا، آپ نے اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا، ارے بھائی! وہ آنے والا تو مہمان تھا اور مہمان کا اکرام کرنا چاہئے تھا، اس کی خاطر کرنی چاہئے تھی، لیکن آپ نے اس کو الٹا ڈانٹنا شروع کر دیا، یہ مذموم ہے اور غلط ہے اور قابل اصلاح ہے۔

بہر حال، غصّے کو جائز حدود میں استعمال کرانا اور ناجائز حدود سے اس کو بچانا، بس یہی شیخ کا کام ہے لہٰذا جب تمہارے اندر غصہ تو ہے مگر تمہیں یہ پتہ نہیں کہ میں اس کو غلط استعمال کرتا ہوں یا صحیح استعمال کرتا ہوں، تو اب اپنے شیخ کو اپنے حالات اور معاملات بتادو، وہ خود تشخیص کردینگے اور صحیح و غلط کا فیصلہ کردیں گے، اور اگر خود ہی کو اپنے غصہ کے بے جا ہونے کا اندازہ ہے تو ایسے واقعات اور اپنے غصہ کے شدید ہونے کو اپنے شیخ سے بتادو کہ میرے اندر غصہ شدید ہے، پھر شیخ رفتہ رفتہ اس کی تدبیریں بتائے گا کہ تم کس طرح اس غصہ کو قابو میں لاؤ، اور کس طرح اس غصے کو صحیح استعمال کرو، تم اس کی بتائی ہوئی تدبیروں پر عمل کرلو۔

حسد کے علاج کی ضرورت

یا مثلاً طبیعت کے اندر "حسد" کی بیماری ہے، اب آدمی اپنے شیخ کو بتائے کہ میرے اندر "حسد" ہے، میرا فلاں ساتھی ہے جب امتحان میں اس کے نمبر زیادہ آتے ہیں اور میرے نمبر کم آتے ہیں تو اس وقت میرے دل میں ایک کڑھن پیدا ہوتی ہے، اور دل یہ چاہتا ہے کہ اس کے نمبر کم ہوجائیں۔ اب شیخ سے پوچھے کہ یہ صورت "حسد" ہے یا نہیں؟ اگر "حسد" ہے تو اس کا کس طرح علاج کروں؟ کیا طریقہ اختیار کروں؟

شہوت کے علاج کی ضرورت

یا مثلاً "شہوت" ہے، اگر یہ "شہوت" حد اعتدال سے بڑھی ہوئی ہے تو شیخ کو بتائے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے، اس کا کیا علاج کروں؟ یا مثلاً دوسروں کے بتانے سے یا آپ خود ہی اپنے اندر یہ محسوس کررہے ہیں کہ میرے اندر بڑائی اور

تکبر ہے، یہ "تکبر" ایسی بیماری ہے کہ عموماً خود انسان کو اس کے بارے میں پتہ نہیں چلتا، چنانچہ دیکھ لیجئے کہ کبھی کوئی "متکبر" اپنے آپ کو متکبر نہیں کہے گا، اگر کوئی دوسرا ابھی اس سے پوچھے کہ تو تکبر کرتا ہے؟ تو وہ یہی جواب دیگا کہ میں تو تکبر نہیں کرتا، لیکن دوسرے شخص کو پتہ لگ جاتا ہے کہ اس کے اندر تکبر ہے۔ لہذا شیخ کو بتلائے کہ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ میرے اندر تکبر ہے، یا فلاں عمل سے مجھے خود اپنے اندر "تکبر" کا شبہ ہو رہا ہے، اس کا علاج بتائیں کہ کیا علاج کروں؟

لہذا شیخ کے پاس جانے کا منشا یہ نہ ہو کہ ان سے وظائف اور اذکار پوچھ لیا کروں گا کہ کتنا ذکر کروں؟ کتنی تسبیح پڑھا کروں؟ کیا کیا معمولات اختیار کروں؟ کیونکہ یہ ذکر و اذکار، وظائف اور تسبیحات تو اس راستے کے لئے معین ہیں، لیکن خود مقصود اصلی نہیں، مقصود اصلی اس طریق کا یہ ہے کہ اپنی صبح سے شام تک کی زندگی کا جائزہ لیتا رہے، اور یہ دیکھے کہ میں نے جو فلاں کام کیا تھا، اس میں کہیں تکبر تو شامل نہیں ہو گیا؟ فلاں کام کے اندر غصے کا ناجائز استعمال تو نہیں ہوا تھا؟ فلاں کام میں نے طمع اور حرص کی وجہ سے تو نہیں کیا تھا؟ یا میرے اندر حب مال اور حب جاہ تو نہیں ہے؟ ان تمام چیزوں کا جائزہ لیتا رہے اور شیخ کو اطلاع کرتا رہے اور ان کا علاج پوچھتا رہے، اور شیخ جو علاج بتائے اس پر عمل کرتا رہے۔ اور اگر اس علاج پر عمل در آمد میں کوتاہی یا دشواری ہو تو وہ بھی شیخ کو بتائے۔ غرضیکہ اصلاح حال کے لئے اپنی ہر کیفیت سے اپنے مصلح اور شیخ کو باخبر کرتا رہے۔

اطلاع اور اتباع

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ جب

کسی شیخ سے رجوع کرے تو دو کام کرے، ایک "اطلاع" دوسرے "اتباع" "اطلاع" کے معنی یہ ہیں کہ اپنے حالات کی شیخ کو اطلاع کرے، اور "اتباع" کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ شیخ ہدایت دے اس کی اتباع کرے اور اس کی پیروی کرے، اس پر عمل کرے، اسی طریقے سے انسان کی اصلاح ہوتی ہے۔

آج ہم نے "تصوف اور طریقت" کو ایک رسم بنالیا ہے کہ ہم فلاں صاحب سے بیعت ہیں، بس آگے کچھ نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کرلیا کہ شیخ نے جو کچھ معمولات اور کچھ مخصوص تسبیحات بتادیں کہ فجر کے بعد یا کسی اور وقت کو مقرر کر کے ان کو پڑھ لیا کرو، وہ پوری کرلیں، بس اس سے آگے کچھ نہیں، حالانکہ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ رذائل کی اصلاح کے بغیر تو یہ اذکار بعض اوقات مضر ہو جاتے ہیں، اس کی مثال یہ ہے کہ جب تک کوئی آدمی بیمار ہو، اس کو بیماری کی حالت میں مقویات یعنی طاقت کی دوائیں نہیں دی جاتیں، مثلاً شدید نزلہ یا بخار ہو رہا ہے تو اطباء کہتے ہیں کہ پہلے اس نزلہ اور بخار کا علاج کراؤ، اس حالت میں کوئی قوت بخش "خمیرہ" نہیں دیا جائے گا، کیونکہ طب کا اصول یہ ہے کہ جب آدمی کے اندر کوئی "خلط" غالب آجاتی ہے تو اس حالت میں انسان جو غذا بھی کھائے گا وہ غذا اس "خلط" کی طرف مستحیل ہو جاتی ہے، مثلاً اگر "بلغم" غالب ہے تو اس حالت میں جو مقویات اور غذا کھائے گا وہ سب بلغم کی طرف مستحیل ہو جائے گی۔ لہٰذا پہلے اس بیماری کا اور اس خلط کا علاج کیا جائے گا، پھر مقویات دی جائیں گی تو وہ مقویات کار آمد ہوں گی۔

اسی طرح اگر دل میں تو تکبر اور انانیت کا اور تعلّی کا بت بسا ہوا ہے اور اس حالت میں وہ ذکر کر رہا ہے، تو اپنے اس عمل کے نتیجے میں بعض اوقات وہ تکبر کی بیماری اور زیادہ ہو جاتی ہے، چنانچہ وہ اب یہ سمجھے گا کہ دیکھو میں کتنا بڑا اللہ والا

ہوں کہ اس طرح ذکر کر رہا ہوں، اور جو کام بڑے بڑے صوفیاء کرام نے کئے تھے وہی کام میں کر رہا ہوں۔ لہٰذا اس ذکر سے اسے فائدہ ہونے کے بجائے اس کی تکبر کی بیماری کو اور زیادہ تقویت حاصل ہوگی، اس لئے عام طور پر ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ آدمی پہلے اپنے رذائل دور کرائے۔

"رذائل" کے فطری ہونے کی دلیل

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"رذائل" کے فطری ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ بچوں کو بھی غصہ آتا ہے، اور محققین کا قول ہے کہ "غضب" "کبر" سے پیدا ہوتا ہے، پھر "غضب" سے غیبت پیدا ہوتی ہے، جب بچوں میں "غصہ" ہے تو معلوم ہوا کہ ان میں "کِبر" بھی ہے، تو بچوں کے اندر ان امور کے ہونے سے معلوم ہوا کہ یہ امور فطری ہیں"۔

(انفاسِ عیسیٰ ص ۱۳۷)

بتانا یہ مقصود ہے کہ یہ "رذائل" فطری ہیں، اور فطری ہونے کی وجہ سے اس فکر میں مت رہنا کہ یہ "رذائل" کبھی جاکر ختم ہو جائیں گے، نہیں، یہ ختم نہیں ہونگے، نہ غصہ ختم ہوگا اور نہ تکبر کی اصل ختم ہوگی، البتہ ان "رذائل" کو مضمحل کیا جائے گا، ان کو پیٹا جائے گا، کوٹا جائے گا، کچلا جائے گا، یہاں تک کہ ان کے اندر سے وہ زہر نکل جائے جو تمہارے لئے قاتل ہے۔ اسی کی تشریح آگے خود حضرت والا فرما رہے ہیں کہ:

زوال "رذائل" سے مقصود اضمحلال ہے

زوال "رذائل" سے مقصود اضمحلال ہے، اور "اضمحلال" کے

معنی یہ ہیں کہ مجاہدہ کے بعد اخلاق رذیلہ کی مقاومت میں پہلی جیسی مشقت نہ رہے۔(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۷)

یعنی ”رذائل“ بالکلیہ زائل نہیں ہو سکتے، بلکہ ان کو ضعیف اور کمزور کر دیا جاتا ہے، ایسے کمزور ہو جاتے ہیں کہ ان کا مقابلہ کرنے میں جو مشقت پہلے ہوتی تھی، اب اتنی مشقت نہیں ہوتی۔ دنیا کے ہر کام میں بھی یہی معاملہ ہے اور دین کے ہر کام میں بھی کہ جو کام مشکل ہوتا ہے، مشق کے نتیجے میں وہ کام آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کو جب تک پانچ وقت نماز پڑھنے کی عادت نہیں تھی، تو اس کو نماز کے لئے مسجد کی طرف جانا اور نماز کی پابندی کرنا بہت شاق گزرتا تھا، اس کو بہت تکلیف ہوتی تھی، لیکن رفتہ رفتہ جب نماز پڑھنے کی عادت پڑ گئی تو اب نماز پڑھنے کی مشقت کم ہو گئی۔ بالکلیہ مشقت تو ختم نہیں ہو گی، تھوڑی بہت مشقت کرنی پڑتی ہے، نفس کی مخالفت کرنی پڑتی ہے، لیکن عادت پڑنے سے وہ مشقت پہلے کی بنسبت کم ہو گئی۔ اور نماز پڑھنے پر جو ثواب ملتا ہے وہ درحقیقت اسی مشقت کا انعام ہے، اگر مشقت بالکل نہ رہے تو پھر ثواب کس چیز کا؟ اس لئے نماز پڑھنے میں کچھ مشقت اور محنت ہر حالت میں کرنی پڑتی ہے۔

یہی معاملہ خلاقِ رذیلہ کا ہے۔ مثلاً غصہ ہے، پہلے یہ حال تھا کہ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا، ذرا سی طبیعت کے خلاف کوئی بات ہوئی، بس پارہ آسمان پر چڑھ گیا اور دوسروں کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا، ڈانٹ ڈپٹ اور مار پیٹ شروع کر دی۔ پھر جب اپنی اصلاح کرانے کے لئے تصوف اور طریقت کے راستے پر چلا تو پتہ چلا کہ غصہ بری چیز ہے اور غصہ کو بے محل استعمال کرنا گناہ ہے، چنانچہ اس نے اپنے غصہ کو روکا اور غصہ کا کڑوا گھونٹ پیا، دل چاہ رہا ہے کہ اس شخص کو زور سے تھپڑ ماروں، اس کے ٹکڑے کر دوں، لیکن اپنے آپ کو قابو کیا، اور اس قابو کرنے میں

بہت دقت اور مشقت ہوئی، پھر آہستہ آہستہ غصہ کو دباتے دباتے بالآخر یہ حال ہوا کہ اب غصہ تو آتا ہے، لیکن اس کے روکنے میں پہلی جیسی مشقت نہیں ہوتی۔

شہوت کا امالہ

یا مثلاً "شہوت" ایک رذیلہ ہے، اگر انسان اس کو غلط جگہ پر استعمال کرے تو اللہ تعالیٰ بچائے، یہ بہت خطرناک چیز ہے اور اس طریق میں یہ مہلک ہے، مثلاً شہوت کے تقاضے سے کسی ناجائز جگہ پر نظر ڈالنا، لذت لینے کے لئے نامحرم کو دیکھنا، نفس کو اس کی عادت پڑی ہوئی تھی، جب نفس کی اصلاح کے لئے تصوف اور سلوک میں قدم رکھا تو معلوم ہوا کہ یہ تو بہت گناہ کی بات ہے، اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے، چنانچہ اس کے بعد جب وہی منظر سامنے آیا تو دل میں شدید تقاضہ ہوا کہ خوب دل کھول کر اہتمام کے ساتھ اس کو دیکھا جائے جیسا کہ ہمیشہ سے دیکھتے چلے آئے تھے، لیکن یہ بات یاد آگئی کہ ہم تو اب نفس کی اصلاح کا کام شروع کر چکے ہیں، لہٰذا ہمیں اپنی نگاہ کو سنبھالنا ہوگا، نگاہ کو پست کرنا ہوگا، جب یہ خیال آیا تو نظر اس غلط جگہ سے ہٹالی تو اس وقت نفس پر قیامت گزر گئی، دل پر آرے چل گئے، اس لئے کہ اب تک تو غلط جگہ پر نگاہ ڈالنے کی عادت پڑی ہوئی تھی، اب وہاں سے نظر ہٹانے میں نفس کو شدید مشقت ہوئی، لیکن ایک مرتبہ یہ تہیہ کر لیا کہ چاہے دل پر آرے چلیں، قیامت ٹوٹے، کچھ بھی ہو، لیکن میں یہ کام نہیں کروں گا۔

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

یہ سوچ کر نظر کو وہاں سے ہٹالیا، تو جتنی مشقت پہلی مرتبہ ہوئی تھی، دوسری مرتبہ جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو پہلی مرتبہ کے مقابلے میں مشقت کچھ کم ہو گی، تیسری مرتبہ جب پیش آئے گا تو اور کم مشقت ہو گی، چوتھی مرتبہ اور کم ہو گی، اس طرح کم ہوتے ہوتے وہ مشقت گھٹتی چلی جائے گی اور آخر میں جب طبیعت اعتدال پر آجائے گی تو اس کے بعد جب نگاہ غلط جگہ پر پڑے گی تو اس وقت اگرچہ نفس کا ہلکا تقاضا تو پھر بھی رہے گا، لیکن اس تقاضے کے باوجود اس نظر کو وہاں سے ہٹالینا اتنا دشوار نہیں ہوگا، اس لئے کہ بار بار نظر ہٹاتے رہنے سے مادے میں اضمحلال ہو گیا۔ اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ زوال رذائل سے مقصود اضمحلال ہے، اور اضمحلال کے معنی یہ ہیں کہ مجاہدہ کے بعد اخلاق رذیلہ کی مقاومت (یعنی ان کا مقابلہ کرنے) میں پہلی جیسی مشقت نہ رہے" البتہ تھوڑی سی مشقت پھر بھی رہے گی۔ کتنا ہی انسان مجاہدے اور ریاضتیں کر کے اپنے آپ کو انتہا تک پہنچادے، تب بھی شہوت کا مادّہ ختم نہیں ہو گا، غضب کا مادہ ختم نہیں ہو گا، اور گناہ کے تقاضے بالکلیہ ختم نہیں ہونگے، گناہ کی جھلکیں پھر بھی آئیں گی، تقاضے پھر بھی پیدا ہوں گے، داعیے پھر بھی آئیں گے، البتہ فرق اتنا ہو گا کہ پہلے اس داعیہ کا مقابل کرنے میں بہت دقت ہوتی تھی، اب دقت کم ہو جائے گی۔

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آگے فرماتے ہیں:

"ورنہ مجاہدہ سے نہ حریص کی حرص زائل ہوتی ہے، نہ بخیل کا بخل، نہ متکبر کا کبر، ہاں اضمحلال ہو جاتا ہے"۔

یعنی طبیعت میں حرص کا جو اصل مادہ ہے، وہ ختم نہیں ہوتا، اگر طبیعت میں بخل کا مادہ ہے تو وہ ختم نہیں ہوتا، اگر طبیعت میں "تکبر" ہے تو وہ ختم نہیں ہوتا،

لیکن 'اضمحلال'' ہو جاتا ہے۔ اضمحلال کا مطلب یہ ہے کہ یہ سارے مادّے اور ساری چیزیں اندر موجود تو ہیں، لیکن مجاہدے کے نتیجے میں وہ ایسی کمزور ہو گئی ہیں کہ اب وہ غلط کام پر انسان کو آمادہ نہیں کرتیں اور ان کے مقتضٰی پر انسان عمل نہیں کرتا۔

حرص کا امالہ

مثلاً مال کی حرص انسان کی طبیعت میں موجود ہے، خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ﴾ (سورۃ آل عمران) لیکن اگر یہ ''حرص'' صحیح جگہ پر استعمال ہو تو یہ اتنی بری بھی نہیں۔ مال کی اتنی حرص جس کی انسان کو اپنی زندگی گزارنے کے لئے ضرورت ہے اور اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے اور ان کے حقوق ادا کرنے کے لئے جتنے حرص کی ضرورت ہے، اتنی حرص تو ہونی چاہئے۔ لیکن ایک وہ حرص ہے جس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر انسان کو ایک وادی سونے کی مل جائے تو وہ یہ حرص کریگا کہ دوسری وادی بھی مل جائے، اور جب دوسری وادی مل جائے گی تو یہ حرص کریگا کہ تیسری وادی مل جائے اور آدم کے بیٹے کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔ یہ حرص حرام ہے، کیونکہ جب مال کی یہ حرص انسان پر غالب آجاتی ہے تو یہ انسان کو جائز ناجائز ہر طریقے سے پیسے حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے،

حرص کے درجات

پھر حرص کے کچھ درجات ہیں، پہلا درجہ یہ ہے کہ وہ حرص انسان کو ایسے

طریقوں سے دولت حاصل کرنے پر آمادہ کرے جو کھلے طور پر ناجائز اور حرام ہیں، مثلاً وہ حرص اس کو چوری کرنے پر امادہ کرے کہ چوری کر کے دولت حاصل کرو، ڈاکہ پر انسان کو آمادہ کرے کہ ڈاکہ ڈال کر دولت حاصل کرو، یا دھوکہ دینے پر آمادہ کرے کہ دوسروں کو دھوکہ دے کر دولت حاصل کرو۔ اللہ بچائے! یہ حرص کا انتہائی درجہ ہے۔

حرص کا دوسرا درجہ

حرص کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ وہ حرص اس کو دولت حاصل کرنے کے لئے کھلے حرام طریقے اختیار کرنے پر تو آمادہ نہیں کر رہی ہے لیکن وہ حرص اس کو تاویل اور توجیہ کر کے مال حاصل کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ حرص کا یہ درجہ عام طور پر مولوی صاحبان کے اندر ہوتا ہے۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے، کیونکہ کسی مولوی صاحب کو اگر اس کا نفس یہ کہے کہ تو چوری کر لے، یا ڈاکہ ڈال لے، یا فلاں کا حق دبا لے تو وہ مولوی اس کی بات نہیں مانے گا اور کہے گا کہ یہ تو برا اور ناجائز کام ہے، میں تو نہیں کرتا، لیکن مولوی کا شیطان بھی مولوی ہوتا ہے، وہ شیطان آکر اس کو طرح طرح کی دلیلیں اور تاویلیں سناتا ہے کہ دیکھو یہ تمہارا حق ہے، اس کو تم وصول کرلو، حالانکہ حقیقت میں وہ اس کا حق نہیں بن رہا تھا، مگر اسی جذبہ "حرص" نے تاویل پر آمادہ کیا، اور اس تاویل کے نتیجے میں وہ ناجائز پیسے حاصل کر رہا ہے۔ حرص کا یہ درجہ بھی حرام ہے۔

حرص کا تیسرا درجہ

حرص کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ پیسے اچھے لگتے ہیں، اور دل میں یہ خواہش ہے

کہ پیسے زیادہ سے زیادہ آجائیں، لیکن اس خواہش کے نتیجے میں وہ شخص نہ تو کسی صریح حرام کام کا ارتکاب کرتا ہے اور نہ ہی مال حاصل کرنے کے ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے، نہ ہی تاویل اور توجیہ اختیار کرتا ہے، بس اللہ تعالیٰ نے جو کچھ حلال اور جائز طریقہ سے دیدیا اس کو بخوشی لیا ہے اور مزید حاصل کرنے میں لگا ہوا ہے، تو حرص کا یہ درجہ مذموم نہیں کیونکہ اس حرص نے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا اور نہ اس حرص کے تقاضے پر کوئی ناجائز عمل کیا۔

بخل ایک بیماری ہے

یہی حال "بخل" کا ہے، خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:
﴿وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ﴾ یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے نفس میں بخل کا مادّہ رکھا ہے، اسی وجہ سے انسان کو پیسوں سے کچھ نہ کچھ محبت ہوتی ہے، لیکن جب تک یہ بخل کسی فریضے کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بنے اور اس بخل کے نتیجے میں کوئی ایسا کام نہ ہو جو یا تو حرام ہے یا مکروہ ہے یا خلاف مروّت ہے، تو وہ بخل مذموم نہیں ہے، ہاں اگر وہ شخص بخل کی وجہ سے زکوٰۃ نہیں دیتا یا بخل کی وجہ سے اپنے بیوی بچوں کا جتنا نفقہ واجب ہے وہ نہیں دیتا، یا بخل کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے راستے میں خرچ نہیں کرتا، یا بخل کی وجہ سے وہ فقیروں کی طرح رہتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دولت دی ہے، پیسے دئے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا یہ حق ہے کہ انسان اس کو اس طرح استعمال کرے کہ دیکھنے والے کو بھی پتہ چلے کہ یہ شخص کوئی بھیک منگا اور فقیر نہیں ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ اَنْ یُرٰی اَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلَیْهِ" یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ بندے کو اس نے جو نعمت دی ہے،

اس کا اثر بھی اس پر ظاہر ہو۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا اظہار ہونا چاہئے، یہ نہ ہو کہ وہ ہے تو لکھ پتی آدمی، لیکن پھٹے پرانے کپڑے پہنے پھر رہا ہے، کیونکہ یہ بھی ایک طرح سے اللہ تعالیٰ کی ناشکری ہے، جب اللہ تعالیٰ نے نعمت دی ہے تو اس کو استعمال کرنے سے اس کا اظہار بھی ہونا چاہئے، اس دولت کو اس طرح استعمال کرے کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ اللہ تعالیٰ کی فلاں نعمت اس کو حاصل ہے۔

بخل کی ایک صورت

بخل کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی حقوق واجبہ تو ادا کر رہا ہے، لیکن اس طرح ادا کر رہا ہے کہ گھر میں روزانہ دال روٹی پکواتا ہے، حالانکہ اس کے پاس اتنی وسعت ہے کہ اپنے گھر والوں کے لئے اچھے اور عمدہ کھانے کا انتظام کر سکے۔ یہ بھی بخل کے اندر داخل ہے البتہ یہ بخل خلافِ مروّت ہے۔

لیکن اگر بخل کے نتیجے میں کوئی حق واجب نہیں چھوٹ رہا ہے، بلکہ اطمینان اور فراغت کے ساتھ بیوی بچوں کے حقوق ادا کر رہا ہے، مگر پیسہ خرچ کرتے ہوئے طبیعت پر تھوڑی سی گرانی ہوتی ہے اور دل کو تکلیف ہوتی ہے تو اس میں کوئی قباحت نہیں، حالانکہ یہ بھی بخل کی ایک صورت ہے، لیکن بخل کے تقاضے پر عمل نہیں ہوا اور اس بخل نے کسی غلط کام پر آمادہ نہیں کیا، اس لئے یہ بخل کچھ مضر نہیں۔ لہٰذا "مجاہدہ" کے نتیجے میں یہ بخل زائل نہیں ہوتا، نہ حرص زائل ہوتی ہے، لیکن ان کا نقصان ختم ہو جاتا ہے، کیونکہ پھر ان کے تقاضوں پر عمل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو رزائل سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔

آمین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

تیسری مجلس

مجاہدہ اور ریاضت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تیسری مجلس

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العٰلمین، والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم وعلی آله وأصحابه اجمعین أما بعد!

ریاضت اور مجاہدہ کا ایک فرق

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ایک درجہ تو ہے تقاضائے معصیت کا، اس کی مخالفت کرنا تو "مجاہدہ" ہے، اور ایک اس تقاضا کا منشاء ہے "خلق رذیل" اس کے ازالہ بمعنی اضمحلال کو "ریاضت" کہتے ہیں"۔

تصوف اور سلوک کی کتابوں میں آپ اکثر "مجاہدہ" اور "ریاضت" کی اصطلاح پڑھتے ہیں، لیکن "مجاہدہ" کسے کہتے ہیں؟ اور "ریاضت" کسے کہتے ہیں؟ اور دونوں کے درمیان فرق کیا ہے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں ان دونوں کا مطلب اور ان کے درمیان فرق کو بیان فرمایا ہے۔

فرمایا کہ "مجاہدہ" تو یہ ہے کہ جب نفس کسی کام کا تقاضا کر رہا ہے کہ یہ کام کرو، اب زبردستی نفس کو اس کام سے روکنا "مجاہدہ" ہے۔ اور "ریاضت" کا مطلب یہ ہے کہ اس کام کے داعیے کا جو منشاء تھا، بار بار مجاہدہ کرنے کے نتیجے میں اس منشاء پر ضرب لگی، اس ضرب لگنے کے نتیجے میں وہ کمزور ہو گیا اور اضمحلال ہو گیا۔ تو یہ "ریاضت" ہے۔

جائز چیزوں کا ترک

گناہ سے بچنے کے لئے بعض اوقات انسان کو کچھ جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑ جاتی ہیں، ایک کام بذات خود جائز ہے لیکن کبھی اس کو بھی اس لئے چھوڑنا پڑتا ہے کہ کہیں یہ نفس اس جائز کام سے بالآخر کسی ناجائز کام کی طرف لیجانے والا نہ بن جائے۔ مثلاً بعض اوقات صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کھانا بھوک سے کم کھاؤ، اب بتائیے کہ بھوک کے مطابق کھانا کھانا کوئی گناہ ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ گناہ نہیں، اس کے باوجود فرماتے ہیں کہ کم کھاؤ، کیوں؟ اس لئے کہ کم کھانے کے نتیجے میں یہ تمہارے نفس کا مجاہدہ ہو گا اور مجاہدہ کا اثر یہ ہو گا کہ نفس کو تقاضوں کے خلاف کام کرنے کی عادت پڑے گی جو معصیت کے تقاضے کی خلاف ورزی کرنے میں کام آئے گی۔

کم کھانے کا مجاہدہ

مثال کے لئے میں نے کم خوراکی کے مجاہدے کی بات ذکر کی ہے، تاہم ہمارے زمانہ میں خاص اسی چیز کا مجاہدہ کرنے کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کم کھانے کا جو مجاہدہ پہلے زمانے کے صوفیاء کرام کرایا

کرتے تھے، وہ آج کل مفید نہیں۔ کیونکہ پہلے زمانے کے لوگوں کے قوی مضبوط ہوا کرتے تھے اور خوراکیں زیادہ ہوا کرتی تھی، اس میں کمی کرنا بنیادی صحت کے لئے نقصان دہ نہیں ہوتا تھا بلکہ نفس کو قابو میں رکھنے کا ذریعہ ہو جاتا تھا، لیکن یہ کم خوراکی بھی انہی کے حساب سے تھی چنانچہ "احیاء العلوم" میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کم کھانے کی جو مقدار لکھی ہے، وہ آج کے دور میں مجھ جیسے دو آدمی کھالیں۔ اس لئے ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب عارفی قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کے دور میں کم کھانے کی مقدار یہ ہے کہ ضرورت کے مطابق کھالے اس سے زائد نہ کھائے، اور اس کی پہچان کا طریقہ یہ ہے کہ کھانے کے دوران ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ آدمی کو یہ کشمکش ہوتی ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ اس وقت کھانا چھوڑ دے، بس آج کل کم خوراکی کے لئے اتنا مجاہدہ کرلو۔ اب بتائیے کہ اگر اس مرحلے پر کوئی شخص ایک دو نوالے اور کھالے تو کیا وہ ایک دو نوالے کھانا گناہ ہے؟ کوئی ناجائز ہے؟ نہیں، جائز ہے، لیکن اس کو مزید کھانے سے جو روکا جارہا ہے، وہ مجاہدہ کی وجہ سے روکا جارہا ہے۔

بہر حال، صوفیاء کرام بعض اوقات جائز چیزوں سے ابھی اس لئے روک دیتے ہیں تاکہ نفس کو مجاہدہ کا عادی بنایا جائے۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ صوفیاء کرام بہت سی ایسی چیزوں سے بھی منع کردیتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، یہ کیوں حرام کردیتے ہیں؟ مثلاً اللہ تعالیٰ نے کھانا حلال کیا تھا، صوفیاء کہتے ہیں کہ مت کھاؤ، سونا حلال کیا ہے، صوفیاء کہتے ہیں کہ مت سوؤ، لوگوں سے ملنے جلنے اور بات چیت کرنے کو اللہ تعالیٰ نے حلال کیا ہے، صوفیاء کہتے ہیں کہ بات چیت کم کرو، اس کی کیا وجہ ہے؟

انسان کے نفس کا مثال

حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کاغذ لیا اور فرمایا کہ اس کاغذ کو ایک طرف موڑو، پھر فرمایا اس کاغذ کو سیدھا کرو، لیکن بار بار سیدھا کرنے کے باوجود یہ کاغذ سیدھا نہیں ہوتا، جو سلوٹ اس میں پڑ گئی ہے وہ اسی طرف اس کاغذ کو موڑ رہی ہے۔ اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کاغذ کو دوسری طرف الٹی سمت میں موڑ دو، اب یہ کاغذ سیدھا ہو جائے گا۔

پھر فرمایا کہ انسان کا نفس بھی گناہ کی طرف مڑا ہوا ہے، جب اس کو تم اعتدال پر لانا چاہتے ہو تو یہ اعتدال پر نہیں آتا، اس لئے اس نفس کو دوسری طرف موڑو، اور اس نفس سے جائز اور حلال چیزیں بھی چھڑاؤ، جب اس سے جائز چیزیں چھڑاؤ گے تو بالآخر اس کے اندر اعتدال پیدا ہو جائے گا اور پھر گناہ سے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے محفوظ رہے گا۔ یہ ہمارا نفس گناہوں کا عادی بنا ہوا ہے، العیاذ باللہ۔ ہماری نگاہ بد نظری کی عادی بنی ہوئی ہے، ناجائز چیزوں پر نگاہ ڈالنے اور ان سے لذت حاصل کرنے کی عادی بنی ہوئی ہے، جب کہ قرآن کریم میں فرمایا کہ ﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ﴾ آپ مؤمنوں سے فرمادیں کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی رکھیں۔ اگر بازار جاتے ہوئے آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتے بھالتے جاؤ گے تو یہ جائز ہے یا ناجائز ہے؟ جائز ہے۔ کیونکہ جب سامنے وہ چیزیں نظر آرہی ہیں جن کا دیکھنا جائز ہے، مثلاً بلڈنگ نظر آرہی ہے، سڑک نظر آرہی ہے، کاریں آتی جاتی نظر آرہی ہیں، ان سب کو دیکھنا جائز ہے، لیکن نگاہ چونکہ گناہ کی عادی بنی ہوئی ہے اور گناہ کی چیز کو بار بار دیکھنے کے تقاضے پیدا ہوتے رہتے ہیں، لہٰذا سدِ باب کے لئے اور حفظ ماتقدم کے طور پر فرمایا کہ جب بازار میں چلو تو نگاہ

نیچی کر کے چلو، کیوں؟ اس لئے کہ جب تم جائز چیزوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھو گے تو ایک مرحلہ ایسا آئے گا کہ بالآخر حرام پر نگاہ پڑ جائے گی، اور یہ تمہارا دل، تمہارا نفس کمزور ہے، گناہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور اگر نیچے نگاہ کر کے چلو گے تو محفوظ رہو گے۔

نگاہ کی حفاظت کا طریقہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے شیطان کو راندۂ درگاہ کیا تو شیطان نے قسم کھا کر کہا کہ آپ مجھے راندۂ درگاہ کر رہے ہیں، تو اب میں انسان کے پاس بہکانے کے لئے دائیں طرف سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا۔ شیطان نے چار سمتوں کو تو بیان کر دیا لیکن دو سمت بھول گیا، ایک اوپر کی سمت اور ایک نیچے کی سمت، اس کا مطلب یہ ہے کہ اوپر اور نیچے کی سمت شیطان کی پہنچ سے محفوظ ہے۔ اگر اپنی نگاہ کو دائیں طرف کرو گے تو شیطان بہکا سکتا ہے، بائیں طرف کرو گے تو بھی شیطان بہکا سکتا ہے، سامنے اور پیچھے کرو گے تو بھی شیطان آکر بہکا سکتا ہے، لیکن اگر اوپر یا نیچے کرو گے تو شیطان نہیں بہکا سکتا، البتہ اگر نگاہ اوپر کر کے چلو گے تو گرو گے، لہٰذا ایک ہی راستہ ہے کہ نگاہ نیچے کر کے چلو تو پھر شیطان کے تصرفات سے انشاء اللہ محفوظ ہو گے۔

یہ مجاہدہ ہو رہا ہے، اس میں مقصود تو یہ ہے کہ نامحرم پر لذت لینے کی غرض سے نگاہ ڈالنے سے بچنا، لیکن پہرہ پہلے بٹھا دیا کہ نیچے دیکھو، دائیں بائیں نہ دیکھو، یہ مجاہدہ ہے، اس مجاہدہ کے بعد جب انسان اس بات کا عادی ہو جائے گا کہ اس کی نگاہ غیر محرم پر پڑے گی ہی نہیں، اور اگر کسی وقت پڑیگی تو فوراً ہٹالی جائے گی تو ایسی

صورت میں پھر دائیں اور بائیں طرف دیکھنے میں کچھ مضائقہ نہیں، سب کچھ دیکھو، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو دیکھنا حلال کیا ہے، وہ سب دیکھنا جائز ہے۔ بہر حال، بعض اوقات حرام سے بچنے کے لئے حلال کو چھوڑنا پڑ جاتا ہے، اسی کا نام مجاہدہ ہے۔

مجاہدات کا نتیجہ

ان مجاہدات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے باطن میں جو "خلق رذیل" ہے وہ مہذب ہو جاتا ہے، مثلاً مال کی محبت تھی لیکن مجاہدہ کے نتیجے میں وہ محبت مہذب ہو گئی، دنیا کی محبت تھی لیکن مجاہدہ کے نتیجے میں مہذب ہو گئی، شہوت تھی مگر مجاہدہ کے نتیجے میں مہذب ہو گئی، غصہ تھا مگر مجاہدہ کے نتیجے میں مہذب ہو گیا۔ اب جب ان رذائل کی تہذیب ہو گئی تو اسی کا نام "ریاضت" ہے۔

لیکن ان "رذائل" کے مہذب ہونے کے باوجود ان کی دیکھ بھال ہر وقت ضروری ہے، یہ نہ ہو کہ بس ایک مرتبہ ان کو مہذب بنا کر فارغ ہو گئے تو اب چھٹی ہو گئی، نہیں، اس کی چھٹی نہیں ہوتی، آخر دم تک چھٹی نہیں ہوتی۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جنم روگ ہے، زندگی بھر کی بیماری ہے کہ آدمی ہر وقت اس بات کا دھیان رکھے کہ کہیں کوئی کام غلط تو نہیں ہو رہا ہے، کہیں گڑ بڑ تو نہیں ہو رہی ہے۔ کیونکہ مجاہدہ کے نتیجے میں یہ رذائل فنا نہیں ہوتے بلکہ کمزور پڑ جاتے ہیں، کسی وقت بھی ان کے اندر جان آ جائے تو انسان کو گناہ کے اندر مبتلا کر دے اس لئے ہر وقت دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

اندریں راہ می تراش و می خراش
تا دم آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راستے میں ہر وقت تراش خراش کرنی پڑتی ہے، آخر دم تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا۔

تجدید معالجہ کی ضرورت

آگے حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ:

"مادہ کا استیصال جب تک نہ ہو، تجدید معالجہ کی ضرورت رہے گی، اور استیصال کی تدبیر نہیں" (انفاس عیسیٰ ۱۳۸)

اگر کسی چیز کا مادہ بالکل ختم نہ ہو تو وہ مادہ کسی بھی وقت اپنا اثر دکھا سکتا ہے۔ اس لئے علاج معالجے کی تجدید کی ضرورت پڑتی رہتی ہے، یہ مت سمجھو کہ جب ہم شیخ کے پاس گئے، اس نے مجاہدات کرائے، اصلاح کی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حالات بہتر ہو گئے، برائیوں کی طرف رغبت اتنی زیادہ نہ رہی اور برائیوں سے بچنے کا اہتمام ہو گیا۔ لیکن یہ نہیں ہے کہ اب دوبارہ برائیوں کی طرف عود ہی نہیں ہو گا، نہیں، بلکہ دوبارہ عود ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کو ایک مثال سے سمجھا رہے ہیں کہ:

"موسمی بخار کا نسخہ پینے کے بعد کیا پھر آئندہ فصل میں بخار نہ ہو گا؟ وہ کونسی تدبیر ہے کہ صفراہی پیدا نہ ہو، اور اگر ایسا کیا جائے گا تو بہت منافع جو خلط صفراء سے متعلق ہیں، وہ فوت ہو جائیں گے۔ اسی طرح مادہ شہوانی میں بہت منافع ہیں"۔

یعنی تمہیں جب موسمی بخار آیا تو تم ڈاکٹر کے پاس گئے، اس نے تمہیں نسخہ لکھ دیا کہ یہ نسخہ استعمال کرو، تم نے وہ نسخہ استعمال کر لیا اور تمہارا بخار اتر گیا، لیکن کیا اس بات کی کوئی گارنٹی ہے کہ وہ بخار دوبارہ نہیں آئے گا؟ کوئی ڈاکٹر کوئی حکیم

اس کی گارنٹی دے سکتا ہے کہ ایک دفعہ کے علاج کے بعد آئندہ بخار نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر نے بس اتنا کام کر دیا کہ جو تمہارا بخار اس وقت موجود تھا، اس کا علاج کر دیا، اب آئندہ بخار نہ آئے، اس کے لئے خود تمہیں کچھ احتیاط اور پرہیز کرنا پڑے گا، اور اس احتیاط اور پرہیز کے باوجود پھر بھی بخار آجائے تو کچھ بعید نہیں، لیکن جب دوبارہ بخار آجائے تو دوبارہ ڈاکٹر کے پاس چلے جاؤ اور اس سے کہو کہ یہ پھر بخار آگیا ہے، دوا دیدیں، وہ پھر دوا دیدے گا، دوا پینے کے بعد پھر ٹھیک ہو جاؤ گے۔

اسی طرح شیخ کے پاس جا کر اپنے کسی ایک رذیلے کا علاج کرا لیا اور علاج ہو گیا، اور وہ رذیلہ زائل ہو گیا تو اب یہ مت سمجھو کہ چھٹی ہو گئی اور اب وہ رذیلہ کبھی دوبارہ نہیں لوٹے گا، نہیں، وہ دوبارہ لوٹ سکتا ہے، لہٰذا جب وہ رذیلہ دوبارہ لوٹے تو دوبارہ شیخ کے پاس چلے جاؤ اور علاج کرا لو۔

اخلاق رذیلہ کی صفائی بار بار کرتے رہو

ایک مرتبہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے عرض کیا کہ حضرت! یہ عجیب معاملہ ہے کہ جب تک آپ کی خدمت میں اور آپ کی صحبت میں رہتے ہیں تو طبیعت میں بڑی پاکیزگی اور صفائی محسوس ہوتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اخلاق رذیلہ نکلے جا چکے ہیں، اور گناہوں سے نفرت محسوس ہوتی ہے اور نیکیوں کی طرف رغبت محسوس ہوتی ہے۔ لیکن جب واپس اپنے گھر جاتے ہیں تو پھر وہی گناہوں کے تقاضے اور خواہشات پھر شروع ہو جاتی ہیں۔ اس کا کیا کریں؟ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ اس میں تعجب کی کیا بات ہے، میں تو دھوبی ہوں، جب تمہارے کپڑے میلے ہو جائیں، یہاں اٹھا کر لے آؤ، میں دھو

دو نگا، لیکن جب ایک مرتبہ کپڑے دھل گئے تو کوئی دھوبی اس بات کی گارنٹی نہیں دیتا کہ یہ کپڑے آئندہ میلے نہیں ہونگے، دھوبی نے کپڑے دھودیے اور صاف ستھرے کر کے تمہیں دیدیے کہ ان کو پہن لو، اب ہفتہ دس دن کے بعد جب دوبارہ میلے ہو جائیں پھر دھوبی کو دیدو وہ پھر دھودیگا۔

لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ بات ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی بلکہ تجدید معالجہ کی ضرورت رہتی ہے، یعنی بار بار رجوع کرنے اور علاج کرنے کی ضرورت رہتی ہے۔ اور یہ جتنے مشائخ ہوتے ہیں جن کو بیعت کرنے کی اجازت دیدی جاتی ہے، ان کے بارے میں یہ مت سمجھو کہ وہ ایسے کامل ہوگئے کہ اب ان سے کوئی غلطی نہیں ہوگی اور وہ خطا سے معصوم ہوگئے یا اب ان کے اندر گناہ کا تقاضہ پیدا نہیں ہوگا۔ نہیں، بلکہ ان کے اندر بھی گناہوں کے تقاضے پیدا ہوتے ہیں، ان سے بھی غلطیاں ہوتی ہیں، لیکن چونکہ نفس کے اندر ایک صلاحیت پیدا ہو گئی ہے اور اخلاق کی تہذیب ہو گئی ہے، اس لئے فوراً تنبّہ ہو جاتا ہے، اور اس تنبّہ کے بعد خود ان کو بھی اپنا معالجہ کرنا پڑتا ہے، خود حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے اندر ایسی کوئی بیماری دیکھتا ہوں تو اس کا خود سے علاج کرتا ہوں۔

لیکن چونکہ ان حضرات کی طبیعت، ان کا مزاج، ان کے اخلاق مزکّی اور مجلّی ہو چکے ہوتے ہیں، اس لئے خود ہی بیماری کو پہچان لیتے ہیں اور خود ہی علاج کر لیتے ہیں۔ بخلاف ہم جیسے ایک عام آدمی کے، ہمیں علاج کے لئے معالج کے پاس جانے کی ضرورت پڑتی ہے، انکے پاس جاکر اپنے حالات بیان کرنے کی اور ان سے ہدایات لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ لہٰذا علاج معالجہ آخر دم تک جاری رہتا ہے، بڑے بڑے اولیاء اللہ کو بھی یہی حالت پیش آتی ہے۔

تم انسان ہو فرشتے نہیں

اگر انسان کے اندر گناہ کرنے کے جذبے اور تقاضے نہ ہوتے تو پھر تم میں اور فرشتے میں کیا فرق رہ جاتا، فرشتے کے اندر یہ تقاضے موجود نہیں، نہ ان کے اندر غضب ہے، نہ ان کے اندر شہوت ہے، نہ ان میں خواہشات نفس ہیں، نہ ان کے اندر بھوک پیاس ہے، کچھ بھی نہیں ہے، اب اگر تمہارے اندر سے بھی یہ چیزیں ختم ہو جائیں تو تم فرشتے بن گئے، اب تمہاری ان پر کوئی فضیلت نہیں رہی، تمہاری فضیلت اسی وجہ سے ہے کہ تمہارے اندر اچھائی کے ساتھ برائی کا مادہ رکھا گیا ہے، اور اس بُرائی کے مادّے کے مقابلے کی وجہ سے تم فرشتوں سے آگے بڑھ جاتے ہو۔

معصوم تھا، نہ وقفِ سجود ودعا تھا میں
خوبی میری یہی تھی کہ اہلِ خطا تھا میں

فرشتے معصوم بھی ہیں اور وقفِ سجود ودعا بھی ہیں۔ اور انسان کی خوبی یہی ہے کہ اس کے اندر خطا کرنے اور گناہ کرنے کا مادہ موجود ہے، اس کے بعد وہ اس مادّے سے مقابلہ کر کے اللہ کے لئے گناہ سے بچتا ہے۔ یہ خوبی خود یہ چاہتی ہے کہ مادہ موجود رہے، اور جب یہ مادّہ رہے گا تو کشاکشی بھی رہے گی، البتہ یہ ہوگا کہ شروع میں یہ کشاکشی بہت زور کی ہوتی ہے اور مجاہدوں کے بعد ہلکی ہو جاتی ہے، لیکن یہ ہلکی ہلکی کشاکشی آخر دم تک باقی رہے گی، اس کشاکشی سے نہ تو گھبراؤ اور نہ مایوس ہو اور نہ اس سے غافل ہو کر بیٹھو۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجاہدہ کے ذریعہ اپنے نفس کے تقاضوں کو کچلنا تاکہ وہ اعتدال پر آجائیں اور کسی ناجائز کام پر آمادہ نہ کریں یہ کام مرتے دم تک جاری

رہنا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ پہلے زیادہ کشاکشی ہوتی تھی، بعد میں کم ہوتی چلی جائے گی۔

تمام اخلاق رذیلہ کا علاج

فرمایا:

"تمام اخلاقِ رذیلہ کا علاج تأمل اور تحمل ہے یعنی جو کام کرے سوچ کر کرے کہ شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جلدی نہ کرے۔ بلکہ تحمل سے کیا کرے" (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۸)

اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان اخلاقِ رذیلہ کے علاج کے لئے دو کام کرے، ایک تأمل، دوسرے تحمل۔ تأمل کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کرے غور کر کے اور سوچ کر کرے کہ جو کام کر رہا ہوں شرعاً جائز ہے یا نہیں اور جو بات میں کہہ رہا ہوں یہ جائز ہے یا ناجائز؟ اگر تأمل کے نتیجے میں پتہ چلا کہ جس کام کا میں نے ارادہ کیا ہے وہ ناجائز ہے اور ناجائز ہونے کے باوجود نفس اس کی طرف مائل ہو رہا ہے، تو پھر اب تحمل سے کام کرے یعنی اس کام کو چھوڑنے پر جو مشقت ہو رہی ہے اس کو برداشت کرے اگر انسان یہ دو کام کرتا ہے تو تمام رذائل قابو میں آجائیں گے۔

یہ کام ہماری طاقت سے باہر نہیں

اس بیان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہ بہت مشکل راستہ ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس کام کا ہمیں اور آپ کو مکلّف کیا ہے وہ کبھی ہماری برداشت سے باہر نہیں ہو سکتا، لہٰذا گناہوں سے بچنے کی فکر اور سوچ اور اس پر آنے والی تکلیف کو

برداشت کرنا شروع کردو، یہ کام کرتے کرتے کبھی پھسل بھی جاؤ گے، کبھی غلطی بھی ہو جائے گی، اور تمہارے اور نفس کے درمیان کشاکشی ہوتی رہے گی، تمہارے اور شیطان کے درمیان ایک دوسرے سے کشتی چلتی رہے گی، کبھی شیطان اور نفس تمہیں چت کردیگا اور کبھی تم اس کر چت کردو گے۔ جب تم اس کو چت کردو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کہو "الحمد للہ" اور اگر وہ تمہیں چت کردے تو استغفار کرو اور کہو "استغفر اللہ" پھر کچھ عرصہ کے بعد یہ ہوگا کہ تم اس کو زیادہ چت کرو گے اور وہ تمہیں کم چت کریگا، تم زیادہ غالب رہو گے، قرآن کریم کی آیت: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ سے بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔

بچہ کس طرح بڑا ہوتا ہے

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ آپ نے چھوٹے بچے کو دیکھا کہ وہ کس طرح بڑا ہو جاتا ہے اور پتہ بھی نہیں چلتا کہ وہ کس طرح بڑا ہو رہا ہے، اگر وہ بچہ روزانہ اپنے آپ کو ناپے اور یہ دیکھے کہ میں آج کتنے انچ بڑا ہوا، تو اس کو یہ نظر آئے گا کہ میں تو بڑا ہی نہیں ہوا، جیسا کل تھا ویسا ہی آج ہوں۔ اگلے دن پھر ناپتا ہے کہ اب میں کتنا بڑا ہوا تو پھر ویسا کا ویسا ہی پاتا ہے، لیکن حقیقت میں بڑھوتری ہو رہی ہے اور بڑا ہو رہا ہے لیکن وہ بڑھوتری غیر محسوس ہے، اور ہوتے ہوتے وہ بالغ اور جوان ہو گیا اور ڈاڑھی نکل آئی اور پورا آدمی بن گیا۔ اسی طرح جب آدمی اس راستے پر چلتا ہے بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ چلے اور لگا رہے، چھوڑے نہیں اور غافل نہ ہو تو دھیرے دھیرے اس کی ترقی ہوتی رہتی ہے۔

اور یہ بتدریج ترقی ہی بہتر ہے، کیونکہ اگر ایک آدمی ایک دم سے اپنے اندر

ایسا انقلاب لے آئے جس کے نتیجے میں اس کی طرف انگلیاں اٹھنے لگے کہ فلاں آدمی کیا سے کیا بن گیا، یہ بعض اوقات فتنے کی نشانی ہوتی ہے، اور اس کی وجہ سے وہ فتنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس لئے تدریج کے ساتھ دھیرے دھیرے جو انقلاب آتا ہے، اسی میں بہتری ہے، اسی میں خیر ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے برکت ہوتی ہے۔ لہٰذا مایوس ہو کر مت بیٹھو، لگے رہو، اس راستے چلتے رہو، نفس و شیطان کے ساتھ لڑائی لڑتے رہو، یہاں تک کہ تم کامیاب ہو جاؤ گے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

چوتھی مجلس
اصلاحِ باطن کا طریقہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

چوتھی مجلس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین، والصلاة والسلام علی رسوله الکریم، وعلی آله واصحابه اجمعین، امابعد!

اصلاح اعمال واصلاح باطن کا طریقہ

فرمایا کہ:

"اعمال کی اصلاح اور باطن کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے"۔

"اعمال کی اصلاح" سے مراد ہے "اعمالِ ظاہرہ کی اصلاح۔ یعنی وہ اعمال جو ظاہری اعضاء سے سرزد ہوتے ہیں، جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔ اور "باطن کی اصلاح" سے مراد باطن کے وہ اعمال ہیں جو انسان کے دل سے سرزد ہوتے ہیں، جیسے صبر، شکر، توکل، تواضع وغیرہ۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ چاہے اعمال ظاہرہ کی اصلاح کا معاملہ ہو یا باطن کی اصلاح کا معاملہ ہو، دونوں کا طریقہ یہ

ہے کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے، دل میں جو غلط جذبہ اور غلط داعیہ پیدا ہو رہا ہے، زبردستی اس کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے۔

شیخ کا ایک نظر ڈالنا

لوگ سمجھتے ہیں کہ جب کسی اللہ والے کے پاس آدمی جاتا ہے یا کسی شیخ کی خدمت میں حاضری دیتا ہے اور اس سے اصلاحی تعلق قائم کرتا ہے اور اس سے بیعت ہوتا ہے تو وہ اپنی نظر سے کام بنادیتے ہیں، شیخ نے ایک نظر ڈال دی تو بس دل کی دنیا بدل گئی۔

خوب سمجھ لیں کہ اصلاح نفس کے لئے یہ کوئی معمول کا طریقہ نہیں ہے، لہٰذا یہ نہیں ہوگا کہ کوئی اللہ والا نظر ڈال دیگا تو تمہاری طبیعت بدل جائے گی اور تمہارے حالات میں خود بخود انقلاب آجائے گا، بلکہ کرنا تو خود ہی پڑے گا۔ ہمت کرنی ہوگی، کوشش کرنی ہوگی، مشقت اٹھانی ہوگی، شیخ کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ توجہ دلادے اور راستہ بتادے، ایسی تدبیریں بتادے جس کے ذریعہ کام نسبتاً آسان ہو جائے، لیکن کرنا خود ہی پڑے گا، چلنا خود ہی پڑے گا کوئی شخص یہ سوچے کہ مجھے خود کچھ کرنا نہ پڑے، بلکہ دوسرا آدمی مجھے منزل تک پہنچادے، تو یہ بات نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو پھر انبیاء کرام علیہم السلام کو اشاعت دین کے لئے مجاہدات اور مشقت اٹھانے کی ضرورت نہ ہوتی، بس لوگوں پر ایک نظر ڈال دیتے اور سب لوگ مسلمان ہو جاتے۔

اللہ تعالیٰ نے ایسا معاملہ نہیں کیا، کیونکہ ہر انسان کو جزا اور سزا اس کے اپنے عمل پر دی جائے گی، لہٰذا عمل تو اسی کو کرنا ہے، اور عمل کرنے کے لئے ہمت

چاہئے، عزم اور پختہ ارادہ چاہئے کہ چاہے اس راستے میں کتنی بھی مشقت ہو، پھر بھی یہ کام کروں گا۔ لہٰذا اعمال کی اصلاح اور باطن کی اصلاح کے لئے بھی ضروری ہے کہ خود ہمت کرے اور دل میں جو غلط جذبات پیدا ہو رہے ہیں ان کی مخالفت کرے، اور ہمت کر کے ان کا مقابلہ کرے، اور اپنے آپ کو اس مشقت کے اٹھانے کا عادی بنائے۔

حاصل تصوف

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ کا ایک ملفوظ بہت کثرت سے نقل فرمایا کرتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ وہ ملفوظ پورے تصوف اور طریقت کا عطر اور خلاصہ ہے، فرماتے تھے کہ:

"وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب کسی طاعت کے ادا کرنے میں سستی ہو تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو انجام دے، اور جب کسی گناہ سے بچنے میں نفس سستی کرے تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، بس اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اسی سے ترقی کرتا ہے، اور اسی سے تعلق باقی رہتا ہے"۔

یہ وہ بات ہے جو ایک مجدد تصوف اور طریقت جس نے اس طریق کے سارے دفتر چھان مارے، اس راستے کی خاک چھانی، وہ کہہ رہا ہے کہ سارے تصوف کا حاصل یہ ہے کہ سستی کا مقابلہ کرو، مثلاً نماز پڑھنے میں سستی ہو رہی ہے اور دل چاہ رہا ہے کہ مسجد میں نہ جاؤ، گھر میں ہی نماز پڑھ لو یا نماز کی چھٹی کر لو، اب اس سستی کا علاج سوائے چستی کے اور کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا سستی کے مقابلے کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو ہمت دی ہے اس کو استعمال کرو، جب ہمت

کو استعمال کرو گے تو سستی زائل ہو گی، اگر ہمت کو استعمال نہیں کرو گے تو یہ سستی تمہارے اوپر اور قبضہ جماتی چلی جائے گی، کیونکہ اس سستی کا حال یہ ہے کہ تم جتنا اس کے سامنے ہتھیار ڈالو گے یہ اتنی ہی تمہارے اوپر قابو پائے گی، آج تم سے ایک فرض چھڑا لیا، کل کو دوسرا فرض چھڑائے گی، آج ایک گناہ کرا لیا، کل کو دوسرا گناہ کرادے گی۔ اور اگر تم اس کے مقابلے میں ڈٹ گئے اور اپنے آپ کو مضبوط کر لیا کہ مجھے یہ کام نہیں کرنا یا مجھے یہ کام ضرور کرنا ہے تو پھر یہ سستی کمزور پڑتی چلی جائے گی۔

انسان کا نفس بچے کی طرح ہے

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے "قصیدہ بردہ" میں کیا خوبصورت بات فرمائی ہے، فرمایا:

النفس كالطفل إنْ تهمله شبَّ على
حُبِّ الرضاع وان تفطمه ينفطم

یعنی انسان کا نفس چھوٹے بچے کی طرح ہے، اگر تم بچے کو دودھ پلاتے رہو گے اور کبھی نہیں چھڑاؤ گے تو وہ بچہ جوان ہو جائے گا اور دودھ پیتا رہے گا، لیکن اگر ایک مرحلے پر تم یہ محسوس کرو کہ اب دودھ پلانا اس کے لئے مضر ہے، اسے چھڑا دینا چاہئے تو اس وقت دودھ چھڑانے کے لئے تھوڑی سی دقت اور مشقت ضرور ہو گی، وہ بچہ روئے گا، چیخے گا، چلائے گا، راتوں کو خود جاگے گا اور تمہیں بھی جگائے گا، لیکن بالآخر وہ دودھ چھوڑ ہی دیگا۔ اور اگر تم اس مشقت سے گھبرا گئے اور کہا کہ بچے کو دودھ چھڑانا تو بہت مشکل ہے، یہ رات کو خود بھی نہیں سوئے گا اور مجھے بھی نہیں سونے دیگا، چلو دودھ پلاتے رہو، اس صورت

میں وہ بچہ جوان ہو جائے گا لیکن اس کی شیر خواری نہیں جائے گی۔

اسی طرح تمہارا نفس بھی بچے کی طرح ہے، اس کو تو گناہوں کی لت لگی ہوئی ہے، اس کو تو معصیتوں اور نافرمانیوں کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس کو مزہ اسی میں آتا ہے کہ نافرمانی کرے گناہ کرے، اور طاعت سے بچے، اب اگر تم نے اس کو اسی معصیت اور گناہوں پر لگائے رکھا اور کہا کہ چل تو گناہ کا دودھ پی تارہ، تو یہ نفس کبھی بھی گناہ نہیں چھوڑے گا، اور اگر کبھی تم نے اس سے گناہ چھڑانا چاہا تو اس وقت مشقت ضرور ہوگی لیکن بالآخر وہ گناہ چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے گا اور گناہ چھوڑ دے گا۔ بس اس نفس کو تھوڑی سی مشقت اور مشق کرانے کی دیر ہے۔

یہ علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ کا عجیب و غریب پیغام ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بھی یہی فرماتے ہیں کہ تصوف کا حاصل بھی یہی ہے کہ سستی کا مقابلہ کر کے آدمی طاعت کو کرے اور سستی کا مقابلہ کر کے معصیت سے بچے۔

ہمت بڑی چیز ہے

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر سستی پیدا فرمائی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر ایک اور چیز پیدا فرمائی ہے، وہ ہے "ہمت" یہ ہمت بڑی عجیب و غریب چیز ہے، اور اس کی مثال ربڑ ہے، اگر ربڑ کو تم کھینچو گے تو وہ کھینچتی چلی جائے گی، اسی طرح انسان کے اندر جو ہمت ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے ایسا بنایا ہے کہ اس کو جتنا چاہو کھینچ لو اور اونچے سے اونچے مقام تک پہنچ جاؤ۔ اس دنیا کے اندر جس شخص نے بھی کوئی کارنامہ انجام دیا ہے وہ اسی ہمت کی بنیاد پر انجام دیا ہے، چاہے وہ دنیا کا کارنامہ ہو یا دین کا کارنامہ ہو، چاہے وہ فضول اور لغو کارنامہ ہو۔ فضولیات اور لغویات کے کارنامے بھی ہمت ہی سے انجام پاتے ہیں۔

نیاگرہ آبشار اور مہم جوئیاں

امریکہ میں ایک مشہور آبشار ہے "نیاگرہ" دنیا کے عجائبات میں اس کا شمار ہے۔ ایک مرتبہ میرا وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو ایک صاحب نے وہاں پر ایک کتابچہ لاکر دیا، اس کتابچے میں اس آبشار کے تاریخی واقعات لکھے تھے کہ اس "نیاگرہ آبشار" پر کیا کیا عجائب وغرائب پیش آئے ہیں اور لوگوں نے یہاں کیا کیا کارنامے انجام دیے ہیں اور کیا کیا مہم جوئیاں کیں۔ اس آبشار میں پورا دریا اوپر سے نیچے بڑی قوت سے گرتا ہے۔ چنانچہ اس کتابچہ میں لکھا تھا کہ کن کن لوگوں نے یہاں یہ کارنامہ انجام دیا کہ وہ ایک ربڑ کی کشتی میں بیٹھے اور آبشار کے دھانے پر کشتی لاکر کشتی سمیت اس آبشار کے ذریعہ نیچے گرتے تھے۔ چنانچہ اس میں لوگوں کے مقابلے ہوئے کہ کون جلدی گرتا ہے اور کون دیر لگاتا ہے، اس کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کی جانیں چلی گئیں، اور اس کے ذریعے یہ ریکارڈ قائم کرنا تھا کہ ہم "نیاگرہ آبشار" کے ساتھ ساتھ اپنی کشتی کو گرا کر لے گئے۔

بہت سے لوگوں نے یہاں یہ مقابلہ کیا کہ "نیاگرہ آبشار" کی چوڑائی میں رسّا باندھا اور پھر اس رسّے پر چل کر اس آبشار کو عبور کر رہے ہیں۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے عبور کرنے کی کوشش کی لیکن درمیان میں گر پڑے اور گرنے کے نتیجے میں جسم کے ٹکڑے ہوگئے، کیونکہ جس رفتار سے پانی اوپر سے نیچے گرتا ہے اس میں اگر کوئی جاندار آکر گرے تو اس کی ہڈی پسلی ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ کوشش کے نتیجے میں بعض لوگوں نے عبور کرلیا اور اپنا ریکارڈ قائم کرلیا۔ اس کے بعد پھر ایک شخص نے کہا کہ فلاں آدمی نے تو اس کو تنہا عبور کیا، میں ایک آدمی کو اپنے اوپر بٹھا کر رسّے پر چل کر اس آبشار کو عبور کرتا ہوں،

چنانچہ اس نے ایک اندھے آدمی کو سر پر بٹھا کر اس رسّے کے ذریعہ اس آبشار کو عبور کیا اور اپنا ریکارڈ قائم کیا، اور دنیا کی تاریخ میں آج تک اس کا نام لکھا ہوا ہے کہ فلاں شخص نے اس طرح "نیاگرہ آبشار" عبور کیا۔

اب بتائیے! کیا آپ یہ کام کرسکتے ہیں؟ نیاگرہ آبشار کیا، ایک چھوٹے سے نالے پر رسّی باندھ کر اس کو پار کرنے کی کوشش کریں؟ آپ سے نہیں بنے گا، لیکن جب ایک شخص نے ہمت کرلی کہ مجھے یہ کام کرنا ہے اور عزم کرلیا کہ میں یہ کام کرونگا تو اس نے کرلیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس ہمت میں ایسی قوت عطا فرمائی ہے کہ کافر غیر مسلم اور اللہ کو نہ ماننے والا بھی جب کسی کام کو کرنے کی ہمت کرلیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی ہمت میں بھی برکت عطا فرمادیتے ہیں اور اس کو رسّے پر چلا کر اس کا ریکارڈ قائم کرادیتے ہیں۔

نافرمانی سے بچنے کے لئے ہمت کرو

جب اللہ تعالیٰ ایک کافر کی ہمت میں یہ برکت عطا فرمادیتے ہیں تو ایک صاحب ایمان جب اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنے کے لئے ہمت کرے تو کیا اللہ تعالیٰ اس میں برکت نہیں دیگا؟ اس ہمت کو اللہ تعالیٰ نے اتنی قوت عطا فرمائی ہے کہ اس کے ذریعہ بڑے بڑے معرکے سر کرادیتے ہیں، بس عزم کرنے کی دیر ہے۔

دراصل ہوتا یہ ہے کہ انسان بے ہمتی اور سستی کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے اور پھر یہ سمجھتا ہے کہ میں بے بس ہوگیا، لیکن شریعت کا کہنا یہ ہے کہ تم کسی کے آگے بے بس نہیں ہو۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے ﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (سورہ بقرہ پارہ نمبر ۳) لہٰذا جن کاموں کا تمہیں حکم دیا گیا ہے وہ تمہاری

وسعت میں ہیں، بس ہمت کرنے کی دیر ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ سارے تصوف کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمت کر کے سستی کا مقابلہ کرے اور طاعات کو انجام دے اور معصیت سے بچے۔ پوری زندگی اس کام میں گزارنی ہے، اگر کسی وقت پھسل جاؤ تو پھر سے ہمت کو تازہ کرلو۔

بچہ کس طرح چلنا سیکھتا ہے

حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ آپ نے بچے کو دیکھا ہے کہ وہ کس طرح چلنا سیکھتا ہے؟ جب پہلی مرتبہ وہ چلنا چاہتا ہے تو ایک قدم چلتا ہے پھر گر پڑتا ہے، اب اگر وہ بچہ گرنے کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جائے کہ چلنا میرے بس میں نہیں ہے تو کبھی اس کو چلنا نہیں آئے گا، لیکن اگر وہ دوبارہ چلے گا پھر گریگا اور گر کر پھر چلے گا پھر گریگا پھر چلے گا، یہاں تک کہ گرتے پڑتے چلتے چلتے بالآخر اس کو چلنا آجائے گا۔ لہٰذا ہمت کے ذریعہ اپنے آپ کو آگے بڑھاؤ، آگے قدم بڑھاؤ، جب گر جاؤ تو کوئی پرواہ نہ کرو، پھر دوبارہ کھڑے ہو کر چلنا شروع کردو، پھر گر گئے پھر اٹھ کر چلنا شروع کردو۔ آج دو مرتبہ گرے، کل کو ایک مرتبہ گروگے، آج پورے گرے، کل کو آدھے گروگے، رفتہ رفتہ چلنا آجائے گا۔ بہر حال، ہمت کے ذریعہ انسان آگے بڑھتا ہے اور ہمت کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ ہو گا وہ انسان کی ہمت سے ہو گا۔

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

یہ جو مشہور ہے کہ فلاں بزرگ ایک نظر ڈال دیتے ہیں تو زندگی بدل جاتی ہے، انقلاب آجاتا ہے۔ جیسا کہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ مشہور ہے کہ حافظ شیرازیؒ ابتداء میں ویسے ہی آوارہ پھرتے رہتے تھے، ان کے والد کے ایک

شیخ تھے، والد کی یہ خواہش تھی کہ یہ میرا بیٹا آوارہ پھر تا رہتا ہے اور شیخ کے پاس ملاقات اور اصلاح کرنے نہیں جاتا، اس کو چاہئے کہ شیخ کے پاس جاکر اصلاح کرائے۔ ایک دن شیخ ان کے گھر تشریف لائے، حافظ صاحب ویسے ہی پھر رہے تھے، باپ نے ان کو بلایا کہ ادھر آو، چونکہ شاہر تھے ہی، جب قریب آئے تو ایک شعر پڑھا کہ ؎

آں را کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشم بما کنند

یعنی وہ لوگ جو ایک نظر سے خاک کو کیمیا بنادیتے ہیں۔ دراصل شیخ کو خطاب ہے کہ آپ تو ایک نظر میں خاک کو کیمیا بنادیتے ہیں، کاش ایک نظر کا کنارہ ہم پر بھی ڈال دیں۔ شیخ نے فوراً جواب دیا کہ "نظر کردم نظر کردم" میں نے نظر ڈال دی، میں نے نظر ڈال دی، بس اس وقت سے حافظ کی دنیا بدل گئی اور وہ آوارہ گردی ختم ہو گئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو صاحب مقامات بنادیا۔ بہر حال پچھلے زمانے کے صوفیاء کرام کے یہاں اس قسم کے چند واقعات ملتے ہیں کہ شیخ نے ایک نظر ڈالی اور ایک نظر سے زندگی میں انقلاب آگیا۔

نظر ڈال کر تصرف کرنے کی حقیقت

اس بارے میں کئی باتیں سمجھنے کی ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نظر ڈالنا "تصرف" ہے، اور یہ تصرف کرنا ہر ایک کو نہیں آتا، اور تصرف نہ آنا کوئی عیب کی بات نہیں، یعنی اگر کسی شیخ اور ولی اللہ کی نظر میں تصرف کی قوت نہ ہو تو اس کے اندر کوئی عیب نہیں، اگر تصرف کی یہ قوت حاصل ہو جائے تو اللہ کی نعمت ہے اور اگر حاصل نہ ہو تو کوئی عیب نہیں۔

آج کل ایک پیر صاحب بڑے مشہور ہو رہے ہیں، ان کی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا کہ "جو پیر اپنے مریدوں کو بیت اللہ میں نماز نہ پڑھوا سکے وہ پیر بیعت کے لائق نہیں" یاد رکھئے! یہ گمراہی کی فکر ہے، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، تصرف کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ تصرف کا عمل فاسق وفاجر کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، حتی کہ کافر اور غیر مسلم کو حاصل ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ یہ حالت مقرب بارگاہ خداوندی ہونے کی علامت نہیں اور نہ ہی یہ متقی ہونے کی علامت ہے، اور نہ اس کا نہ ہونا کوئی عیب ہے، بعض اوقات کسی کو تصرف حاصل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا۔

تصرف کے ذریعہ وقتی نشاط پیدا ہوتا

دوسری بات یہ ہے کہ "تصرف" کا حاصل صرف یہ ہے کہ جس شخص پر تصرف کیا گیا ہے، تصرف کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں ذرا سا نشاط پیدا ہو جاتا ہے، لیکن یہ نشاط دیرپا نہیں ہوتا بلکہ وقتی ہوتا ہے، آگے کام اس کو خود ہی کرنا پڑتا ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ اس تصرف کے نتیجے میں ساری عمر کام کرتا رہے۔ اس تصرف کی مثال ایسی ہے جیسے گاڑی کو دھکا لگانا، اگر گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے تو اس کو دھکا لگا کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس دھکا لگانے کے نتیجے میں اس گاڑی میں چلنے کی تھوڑی سی صلاحیت پیدا ہوئی، لیکن جب دھکے کے ذریعہ اسٹارٹ ہو گئی تو اب وہ گاڑی انجن اور پیٹرول کی طاقت سے چلے گی، لیکن اگر انجن ہی خراب ہے یا پیٹرول ہی نہیں ہے تو پھر ہزار دھکے لگاؤ، گاڑی نہیں چلے گی۔ بس دھکا لگانے سے دو چار قدم چل کر کھڑی ہو جائے گی۔

بالکل اسی طرح اگر انسان کے اندر سلوک میں اور اللہ تعالیٰ کے راستے میں

چلنے کی ہمت اور طاقت ہے تو کسی کی نظر پڑ جانے سے اس کے اندر چلنے کی صلاحیت پیدا ہو گئی اور طبیعت کے اندر ذرا سا نشاط پیدا ہو گیا، اب اگر اپنے اندر طاقت ہے تو وہ اس کے ذریعہ آگے چلے گا۔ لیکن اگر اندر ہی طاقت نہیں تو ہزار نظر ڈالتے رہو، ہزار تصرف کرتے رہو، کچھ نہیں ہوگا، ہاں وقتی طور پر تھوڑا سا جذبہ پیدا ہو گا پھر وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

بہر حال، یہ "نظر" نہ تو دیرپا چیز ہے، نہ دائمی ہے، نہ ہر ایک کو حاصل ہوتی ہے، نہ کوئی ایسی صفت مدح ہے جس کا نہ ہونا عیب ہو۔ اور اگر نظر سے فائدہ ہو بھی جائے تو وہ وقتی ہو گا، آخر میں کام اپنی ہمت ہی سے کرنا ہو گا، انجن اپنا مضبوط کرنا ہو گا، اسی انجن سے ہی گاڑی چلے گی، دھکے سے نہیں چلے گی۔ لہٰذا اصل کام یہ ہے کہ اپنی ہمت کو تازہ کرو۔ اسی لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ "اعمال کی اصلاح اور باطن کی اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ نفس کے جذبات کی مخالفت کی جائے اور اس کو مشقت کا عادی بنایا جائے"۔ اس کو جتنا مشقت کا عادی بناؤ گے وہ بنتا ہی چلا جائے گا اور اس کے نتیجے میں تمہارا کام بنتا چلا جائے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔ پھر اس سے ظاہری اعمال بھی درست ہوتے چلے جائیں گے اور باطن بھی درست ہوتا چلا جائے گا۔

حسن اخلاق کی بھی ایک حد ہے

آگے فرمایا کہ:

"حدیث میں ہے کہ جب تم سائل کو تین بار عذر سمجھا کر جواب دیدو اور وہ پھر بھی نہ جائے، لپٹ کر جم ہی جائے جس سے ایذاء ہونے لگے تو پھر اس کے جھڑک دینے میں کچھ ڈر نہیں۔ اس سے یہ معلوم ہوا

کہ حسن اخلاق کی بھی ایک حد ہے اور بندہ اس کا مکلّف نہیں کہ اس حد سے آگے ایذاء کا تحمل کرے" (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۸)

ایک طرف قرآن کریم کا تو یہ ارشاد ہے کہ "وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلاَ تَنْهَرْ" یعنی جو سائل تم سے مانگ رہا ہو، اس کو مت جھڑکو اور ڈانٹ ڈپٹ کر مت بھگاؤ، اگر منع کرنا ہے تو نرمی سے منع کردو کہ بابا معاف کرو، اس وقت دینے کو نہیں ہے، یا کوئی اور عذر ہے تو بتادو، جھڑکنا نہیں چاہئے۔ لیکن اگر ایک مرتبہ سمجھادیا کہ بابا اس وقت نہیں ہے، معاف کرنا، پھر بھی وہ مانگ رہا ہے پھر سمجھادیا کہ بابا معاف کرو، پھر بھی وہ پریشان کر رہا ہے، پھر تیسری مرتبہ سمجھادیا، تین مرتبہ سمجھانے کے بعد اب تم نرمی کرنے کے مکلّف نہیں ہو، اب اگر تم اس کو جھڑک دو کہ بھاگ یہاں سے، یہ جھڑکنا تمہارے لئے جائز ہے اور یہ جھڑکنا "اَمَّا السَّآئِلَ فَلاَ تَنْهَرْ" میں داخل نہیں ہوگا۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ اس سے پتہ چلا کہ لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کی بھی ایک حد ہے، یہ نہیں کہ حسن اخلاق کا حکم انسان کو غیر متناہی تکلیف پہچانے کے لئے دیا گیا ہے، دوسرا شخص چاہے کتنی تکلیف پہنچائے مگر یہ برداشت ہی کرے اور حسن اخلاق ہی کا مظاہرہ کرے، ایسا نہیں ہے، بلکہ ایک حد کے بعد ظاہر اًبد اخلاقی کا مظاہرہ کرنا پڑے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ ہر چیز کی اللہ تعالیٰ نے ایک حد رکھی ہے، اسی حد تک وہ محمود بھی ہے اور مطلوب بھی ہے، اس حد سے آگے کا انسان مکلّف نہیں۔

ابتداءً برمحل بھی غصہ نہ کرے

اگرچہ انسان کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وہ غصہ نہ کرے،

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ویسے تو بے محل غصہ کرنا گناہ ہے اور بر محل غصہ کرنا جائز ہے، لیکن بے محل غصہ کرنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے اس کی مشق کرنی پڑتی ہے کہ بر محل بھی غصہ نہ کرے۔ اور مبتدی کو تو چاہئے کہ پہلے تو غصہ بالکل چھوڑ ہی دے، نہ برحق غصہ کرے، نہ ناحق غصہ کرے پھر جب غصہ قابو میں آجائے تو برحق غصہ کرنے میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ برحق غصہ کرنا جائز ہے وہ کوئی رذیلہ نہیں ہے۔

اب یہ دیکھنا کہ کس حد تک انسان حسن اخلاق سے پیش آئے، یہ وہ مقام ہے جہاں انسان دھوکہ کھا جاتا ہے، یہی وہ چیز ہے جو بزرگوں کی صحبت سے حاصل کی جاتی ہے کہ کس جگہ آدمی غصہ کرے اور کس جگہ غصہ نہ کرے۔ یہ کوئی ریاضی کا فارمولا نہیں ہے جو دو اور دو چار کر کے سمجھا دیا جائے کہ فلاں جگہ پر رک جاؤ اور فلاں جگہ پر غصہ کرلو، بلکہ بزرگوں کی صحبت کے نتیجے میں ایک ذوق اور ملکہ پیدا ہو جاتا ہے پھر اس ملکہ کے ذریعہ انسان فیصلہ کرتا ہے کہ یہاں پر غصہ کرنا صحیح ہے اور یہاں پر غصہ کرنا غلط ہے۔ اور یہ ملکہ صاحبِ ملکہ کی صحبت کے بغیر حاصل ہو ہی نہیں سکتا۔ صاحب کمال کو دیکھئے کہ وہ کس طرح عمل کر رہا ہے، اس کو دیکھنے سے اپنے اندر بھی وہ ملکہ رفتہ رفتہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ریاضت سے اصلاحِ اخلاق کے معنیٰ

فرمایا کہ:

"حدیث میں ہے کہ جب تم سنو کہ اپنی جگہ سے پہاڑ ٹل گیا تو تصدیق کرلو اور جب تم کسی شخص کی نسبت سنو کہ اپنے اخلاق سے ہٹ گیا تو

تصدیق مت کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ریاضت سے اخلاق جبلیہ زائل نہیں ہوتے، ہاں مضمحل ہو جاتے ہیں" (انفاس عیسیٰ ص ۱۳۹)

یہ مشہور حدیث ہے کہ اگر کوئی تم سے یہ کہے کہ فلاں پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ کر فلاں جگہ چلا گیا ہے تو اس کی تصدیق کرنے کی گنجائش ہے، کیونکہ اس کا امکان ہے، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں شخص جبلی اور فطری اخلاق سے ہٹ گیا تو اس کی تصدیق مت کرو۔ مطلب یہ ہے کہ پہاڑ تو اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے لیکن اخلاقِ فطری اور جبلی اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتے۔ جیسا کہ فارسی کی مثل مشہور ہے کہ "زمین جنبد زمان جنبد، نہ جنبد گل محمد" گل محمد سے مراد اخلاق جبلیہ ہیں، وہ اپنی جگہ سے نہیں ٹل سکتے۔

اس حدیث کو نقل کر کے حضرت والا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ ریاضت سے اخلاق جبلیہ زائل نہیں ہوتے، ہاں! مضمحل ہو جاتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ حدیث میں نفی اس بات کی کی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اس کا غصہ ختم ہو گیا تو اس کی تصدیق مت کرو، کیونکہ غصہ ختم نہیں ہوتا۔ البتہ ریاضت، مجاہدہ اور صحبت کے نتیجے میں غصہ مضمحل ہو جاتا ہے اور اب ہر جگہ غصہ نہیں آتا، بلکہ بر محل غصہ آتا ہے اور حد سے تجاوز نہیں کرتا لیکن وہ غصہ بالکلیہ ختم نہیں ہوتا۔

درحقیقت اس حدیث کو یہاں لانے کا منشا ان لوگوں کی تردید ہے جو اس حدیث کو بنیاد بنا کر یہ کہتے ہیں کہ صاحب! پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل سکتا ہے لیکن اخلاق انسان کے نہیں بدل سکتے۔ یہ سن کر لوگ اصلاح سے مایوس ہو جاتے ہیں کہ جب میرے اخلاق نہیں بدل سکتے تو اصلاح کرانے سے کیا فائدہ؟ بس جیسے اخلاق ہیں ان کو ویسے ہی رہنے دیا جائے۔ حضرت نے اس حدیث کا صحیح مطلب

واضح فرمایا کہ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جبلی اخلاق نہیں بدل سکتے البتہ کمزور پڑجاتے ہیں، اور کمزور پڑجانے کے نتیجے میں برائی پر آمادہ کرنا ختم ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ انسان اپنے اخلاق کی اصلاح کی کوشش ہی نہ کرے۔

پانچویں مجلس

بدنظری اور اس کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

پانچویں مجلس

بد نظری اور اس کا علاج

الحمد لله رب العالمین والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم، وعلی آله واصحابه اجمعین امابعد!

ایک صاحب نے اپنا حال لکھا کہ:

"شہوانی خیالات کا ہر وقت دل پر استیلاء رہتا ہے، نامحرموں کو بری نظر سے دیکھنے میں ذرا بھی باک نہیں"۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۳)

یہ ایک صاحب نے اپنا حال حضرت والا کو لکھ کر بھیجا، اور اصول یہ ہے کہ جب کسی شیخ سے تعلق ہو تو اس کو اپنی ہر بات لکھنی ضروری ہے، اگر وہ اس کو چھپائے اور شرمائے تو علاج کیسے ہو؟ جیسے ڈاکٹر اور طبیب سے اپنی بیماری نہیں چھپائی جاتی، اگر بیماری کو چھپائے گا تو علاج کیسے ہو گا؟ اسی طرح جب کسی شیخ سے اصلاحی تعلق ہو تو چاہے کتنی ہی شرمناک بات ہو، وہ شیخ پر ظاہر کرے تاکہ اس کا علاج ہو سکے، اور یہ خیال نہ کرے کہ شیخ کو یہ بات لکھوں گا تو اس کی نظر سے میری قدر کم ہو جائے گی، یا اس کے دل میں میرے بارے میں برائی پیدا ہو گی، اور شیخ کے دل میں برائی پیدا ہونا مرید کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے۔

یاد رکھئے! جب اللہ تعالیٰ کسی سے اصلاح کا کام لیتے ہیں تو اس کو اپنی مخلوق پر

رحمت اور شفقت عطا فرماتے ہیں، اگر کوئی شخص بری سے بری بات بھی شیخ کو لکھتا ہے تو شیخ کے دل میں اس کی طرف سے برائی پیدا نہیں ہوتی، بلکہ شیخ کے دل میں رحم، ترس اور شفقت پیدا ہو جاتی ہے، جیسے ماں باپ کو دیکھا ہوگا کہ اگر ان کی اولاد میں کوئی بچہ بیمار یا معذور ہو تو ماں باپ کو تندرست بچے پر اتنی شفقت اور محبت نہیں ہوتی جتنی معذور اور اپاہج بچے پر ہوتی ہے، ساری دنیا اس بچے سے گھن کر رہی ہے لیکن ماں باپ اس پر فدا ہیں اور اس کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، اس کا پیشاب پاخانہ صاف کر رہے ہیں۔ اسی طرح شیخ کو بری بات لکھنے سے یہ مت سوچو کہ شیخ بد ظن ہوگا اور شیخ کا بد ظن ہونا میرے حق میں نقصان دہ ہوگا، بلکہ ایسے مرید سے اور زیادہ محبت اور شفقت پیدا ہوتی ہے، اس کی طرف اور زیادہ توجہ ہوتی ہے۔

مربی کے سامنے اپنا عیب ظاہر کرنا

بعض اوقات اہل علم کو ایک اشکال ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص اپنا عیب اور اپنا گناہ دوسرے پر ظاہر نہ کرے کہ میں نے فلاں وقت فلاں گناہ کیا تھا یا میں فلاں گناہ میں مبتلا ہوں یا فلاں باطنی بیماری میں مبتلا ہوں، اس کا اظہار دوسرے سے نہیں کرنا چاہئے۔ ہاں، اللہ تعالیٰ سے کرنا چاہئے کہ یا اللہ! میں اس گناہ میں مبتلا ہوں، مجھے اس گناہ سے نکال دیجئے۔

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس حدیث کی تشریح میں فرمایا کہ یہ حکم غیر مربی کے لئے ہے، یعنی اپنے گناہ اور اپنی باطنی بیماریوں کا اظہار ہر کس و ناکس پر نہ کرے، البتہ وہ شخص جس مربی کی تربیت میں ہے، اس پر ضرور اس کا اظہار کرے، وہ اظہار اس حدیث کی نہی میں داخل نہیں۔ جیسے کسی انسان کے

سامنے کشفِ عورت جائز نہیں، لیکن طبیب کے سامنے ضرورۃً کشف عورت جائز ہے، اگر آپ کسی طبیب کے پاس علاج کے لئے گئے اور بیماری جسم کے اس حصے میں ہے جس کو چھپانا واجب ہے، یا بیماری تو کسی اور حصے میں ہے لیکن طبیب کے لئے علاج کی ضرورت کے لئے اس حصے کا دیکھنا ضروری ہے تو اس طبیب کے سامنے ستر کا کھولنا جائز ہے، اس لئے کہ علاج اس پر موقوف ہے۔

اسی طرح اپنے گناہ کا اظہار کسی دوسرے پر کرنا جائز نہیں کہ میں نے فلاں گناہ کیا تھا بلکہ اس گناہ کو چھپاؤ، اس لئے کہ وہ گناہ گندگی ہے، اس پر پردہ ڈال دو اور اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرو، خواہ مخواہ اس کا اظہار اور افشاء نہ کرو۔ لیکن مربی اور شیخ کے سامنے اس کا اظہار ضروری ہے تاکہ اس بیماری کا علاج اور اس کا ازالہ ہو سکے۔ لہٰذا جس کسی سے تربیت کا تعلق ہو، چاہے وہ ضابطے کا شیخ ہو، یا ضابطے کا شیخ تو نہ ہو بلکہ استاذ ہو اور اس کو اپنا مربی بنا رکھا ہو، یا باپ ہو اور وہ باپ بیٹے کی تربیت کر رہا ہو تو اس کے سامنے اپنی اس بیماری کا اظہار اس حدیث کی ممانعت میں داخل نہیں۔ اس اصول کے تحت ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ "شہوانی خیالات کا ہر وقت دل پر استیلاء رہتا ہے، نامحرموں کو بری نظر سے دیکھنے میں ذرا بھی باک نہیں"۔ مطلب یہ تھا کہ بدنظری میں مبتلا ہوں، کیا علاج کروں؟۔ چونکہ اس گناہ میں بکثرت ابتلاء ہوتا ہے، اس لئے حضرت والا کا یہ جواب بڑا جامع اور سب کے لئے مفید ہے۔

نظر بچانے کے لئے ہمت کی ضرورت

چنانچہ جواب میں ارشاد فرمایا کہ:

"یہ شر ایسا ہے کہ اپنے اثر سے تمام طاعات کے انوار کو تاریک کر دیتا ہے، اس لئے اس کا علاج اہتمام سے کرنا چاہئے، اور ظاہر ہے کہ یہ مادہ

خلقی ہے، پس وہ شر نہیں، بلکہ اس میں بہت سی مصالح ہیں، البتہ اس مادے کے اقتضا پر عمل کرنا شر ہے، اور وہ اختیاری ہے اور اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہے، پس فعل سے رکنا اختیاری ٹھہرا، اس میں کوئی معذوری نہیں، پس ہمت کیجئے، یہی اس کا جواب ہے، چندے تکلف ہوگا، پھر عادت ہو جائے گی پھر لذت اور فرحت ہوگی"۔(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۳)

جب آدمی کسی بیماری میں مبتلا ہو تو پہلے اس بیماری کی کیفیت، اس کی شدت اور اس کے اثرات کا ادراک اور احساس کرے، پھر اس بیماری کے علاج کی فکر ہوگی، لیکن اگر بیماری کے بارے میں معلوم ہی نہیں کہ یہ بیماری کیسی شدید ہے تو پھر اس کا علاج کیا کریگا۔ اس لئے پہلے جملے میں حضرت والا نے بد نظری کی بیماری اور نگاہ کو غلط استعمال کرنے کی بیماری، نامحرموں پر لذت کی نظر سے دیکھنے کی بیماری کی شدت اور خطرناکی کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "یہ شر اینا ہے کہ اپنے اثر سے تمام طاعات کے انوار کو تاریک کر دیتا ہے"۔

بدنگاہی سے طاعت کے نور کا زوال

اس سے آپ اس گناہ کی شدت میں اندازہ لگائیں، آپ نے نمازیں بھی پڑھیں، تہجد پڑھے، تراویح بھی پڑھی، ذکر بھی کیا، تسبیحات بھی پڑھیں، ان طاعات اور عبادات سے جو نور اور برکات حاصل ہوئی تھیں، وہ سب اس ایک شر کی وجہ سے تاریک ہو جاتی ہیں، اور ان تمام طاعات کا نور اور حلاوت اور فائدہ رخصت ہو جاتا ہے، اللہ بچائے۔ طاعت کا فائدہ یہ ہے کہ انسان ایک طاعت کے بعد دوسری طاعت کی طرف بڑھتا ہے، اور دوسری طاعت تیسری طاعت کی

طرف لیجاتی ہے، اور آدمی ترقی کرتا چلاجاتا ہے، لیکن جب طاعت کانور نہیں ہوتا تو وہ طاعت بے حلاوت ہو جاتی ہے اور اس کے فوائد میں کمی ہو جاتی ہے۔

ہم لوگ تو طاعت کے نور اور اس کی حلاوت سے بھی واقف نہیں تو اس کے سلب ہونے کا کہاں احساس ہو گا، جس کو پہلے نور اور حلاوت حاصل ہو تو اس کو پھر اس کے سلب ہونے کے بارے میں پتہ چلے کہ وہ نور اب سلب ہو چکا ہے۔ ہمارے مزاجوں کے خراب ہونے کی وجہ سے ہمیں طاعت کے نور کا مطلب بھی معلوم نہیں، جو اللہ والے ہوتے ہیں، ان کو نور کا ادراک ہوتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز وہ کسی دعوت میں چلے گئے، اور وہاں کھانا کھالیا، یہ معلوم نہیں تھا کہ جن کے یہاں دعوت ہے ان کی آمدنی حرام کی ہے۔ بس ایک مسلمان نے دعوت دی چلے گئے، بعد میں پتہ چلا کہ ان کی آمدنی کچھ مشکوک ہے، فرمایا کرتے تھے کہ اس دعوت کا یہ اثر تھا کہ کافی عرصے تک اس کھانے کی ظلمت قلب میں محسوس ہوتی رہی، وہ اس طرح کہ دل میں کافی عرصے تک فاسد خیالات آتے رہے، اور ناجائز کاموں کی طرف طبیعت کا میلان ہوتا رہا۔ بہر حال، جن اللہ والوں کے قلوب مجلّی اور مصفی ہوتے ہیں ان کی قلوب پر ذرا سا دھبہ بھی لگ جائے تو ان کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ قیامت آگئی۔ ؎

بہ دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر زباغِ دل خلالے کم بود

چونکہ ہم لوگوں کے ذوق اور مزاج خراب ہوگئے ہیں، اس لئے نہ طاعت کے نور اور لذت کا ہم کو ادراک ہوتا ہے اور نہ ہی اس کے سلب ہونے کا ادراک ہوتا ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ جس دن کوئی شخص بد نظری کے گناہ میں مبتلا ہو گا، اس دن اس کی طاعات میں نور نہیں ہو گا، اور اس طاعت کے دنیوی فوائد اس کو حاصل نہیں ہوں گے۔ اس لئے حضرت نے آگے فرمایا کہ اس لئے اس کا علاج اہتمام سے کرنا چاہئے۔

یہ مادہ شر نہیں

پھر علاج کے بارے میں فرمایا کہ "ظاہر ہے کہ یہ مادہ خلقی ہے، پس وہ شر نہیں" یعنی یہ شہوت اور نفسانی خواہشات کا دل میں پیدا ہونا یہ بذات خود شر نہیں، کیونکہ یہ خلقی اور فطری ہے، کوئی انسان اس مادے سے خالی نہیں، بلکہ اس مادے سے انسان کا خالی ہونا عیب ہے، لہٰذا اپنی ذات میں یہ شر نہیں، بلکہ اس میں بہت سی مصالح ہیں کیونکہ اس کی بنیاد پر توالد اور تناسل قائم ہے، عالم کا نظام اس پر قائم ہے، اگر یہ مادہ نہ ہو تو عالم کا نظام فنا ہو جائے گا۔ البتہ اس مادے کے ناجائز اقتضا پر عمل کرنا شر ہے، یعنی مادہ خود شر نہیں، اور خود طبیعت میں میلان اور خواہش پیدا ہونا شر نہیں، لیکن اس کے ناجائز تقاضے پر عمل کرنا شر ہے، اور اس کے جائز تقاضے پر عمل کرنا شر نہیں، بلکہ خیر محض ہے۔

اس مادے کے جائز استعمال پر ثواب

حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص اپنے گھر میں داخل ہوا اور اپنی بیوی کو محبت کی نگاہ سے دیکھا اور بیوی نے شوہر کو محبت کی نگاہ سے دیکھا تو اللہ تعالیٰ دونوں کو رحمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور اس پر اجر و ثواب عطا فرماتے ہیں۔ لہٰذا اس مادے کے جائز استعمال پر تو ثواب ملتا ہے۔ اس لئے نہ مادہ بذات خود شر ہے

اور نہ ہی اس مادّے کو صحیح جگہ پر استعمال کرنا شر ہے بلکہ خیر ہے، لیکن صرف اس مادّے کا غلط جگہ پر استعمال کرنا اور اس مادّے کے غلط تقاضے پر عمل کرنا شر ہے۔ اور وہ عمل کرنا اختیاری ہے اور اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہے، پس فعل سے رکنا اختیاری ٹھیرا، اس میں کوئی معذوری نہیں۔ پس ہمت کیجئے، یہی اس کا جواب ہے، چندے تکلف ہوگا، پھر عادت ہو جائے گی پھر لذت اور فرحت ہوگی۔

اس بیماری کا علاج ہمت ہے

اشارہ اس طرف فرمادیا کہ اس کے علاج کے لئے کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے کہ وہ نسخہ گھول کر پلا دیا جائے اور اس کے بعد دل میں گناہ کا کوئی تقاضہ ہی پیدا نہ ہو۔ اور نہ کوئی ایسا وظیفہ ہے جو پڑھ کر پھونک دیا جائے اور پھر شہوت کا کوئی تقاضہ دل میں پیدا نہ ہو۔ ایسا نہیں ہوگا۔ پہلے بتادیا کہ یہ مادہ بذات خود شر نہیں اور اس کے جائز تقاضے پر عمل کرنا بھی شر نہیں، ہاں! اس کے غلط تقاضے کے دل میں پیدا ہونے کے بعد اس کے اوپر عمل کرنا شر ہے، اور وہ اختیاری ہے، اور جب عمل اختیاری ہے تو اس سے بچنا بھی اختیاری ہے، اور جو بھی کام اختیاری ہو اس کے لئے ہمت کی ضرورت ہے، آدمی ہمت سے کام لے اور ہمت کو استعمال کرے۔

بعض اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں نے یہ کام چھوڑا تو جان پر بن جائیگی، اس لئے میں یہ کام نہیں چھوڑ سکتا۔ یعنی یہ کام عقلی اعتبار سے تو بیشک اختیاری ہے لیکن عملی زندگی میں آکر دیکھو تو یہ معاملہ غیر اختیاری معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ اس کام کو چھوڑنے سے مجھ پر قیامت آجاتی ہے، پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے، لہٰذا یہ کیسے کہہ دیا جائے کہ یہ کام اختیاری ہے۔

کسی عادت کے چھوڑنے پر تکلیف ہونا اضافی ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جتنے بھی افعال اختیاری ہوتے ہیں، ان کا شدید تقاضہ ہونا اور ان کے چھوڑنے پر شدید تکلیف کا مرتب ہونا، یہ سب چیزیں اضافی ہیں، حقیقی نہیں ہیں۔ لہٰذا ایک شخص کی نسبت سے کم ہوگی اور دوسرے شخص کی نسبت سے زیادہ ہوگی، ایک شخص کو ایک کام کے چھوڑنے میں بڑی تکلیف ہو رہی ہے اور دوسرے شخص کو کم تکلیف ہو رہی ہے، تیسرے کو اور کم ہو رہی ہے چوتھے کو اور کم ہو رہی ہے، لہٰذا کسی فعل کا اختیاری اور غیر اختیاری ہونا یہ حقیقی ہے، اور اس اختیاری فعل کے چھوڑنے پر تکلیف کا شدید ہونا اضافی ہے جو افراد کے اختلاف سے مختلف ہوتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ ایک آدمی خود اس فعل کے چھوڑنے کو اپنے حق میں شدید بنالیتا ہے اور دوسرا آدمی اس فعل کو اپنے حق میں خفیف بنالیتا ہے۔ اگر ایک کام کو بار بار کر کے تم اپنے آپ کو اس کا عادی بنالو گے تو عادی بنانے کے نتیجے میں اس کا چھوڑنا بہت دشوار ہو جائے گا۔ لہٰذا فی نفسہٖ چھوڑنا دشوار نہیں تھا لیکن اپنے اختیاری عمل سے عادت ڈال ڈال کر اس کو اپنے حق میں مشکل بنادیا۔ اور جب اس کام کو چھوڑنا مشکل بنادیا تو اب یہ کہہ دیا کہ اس کا چھوڑنا غیر اختیاری ہے۔ ارے بھائی! جس طرح تم نے عادت بنا کر مشکل بنایا تھا، اسی طرح عادت ڈال کر چھوڑ بھی سکتے ہو۔

دیکھئے! پان، بیڑی، سگریٹ، تمباکو وغیرہ اگر یہ چیزیں کسی شخص کو پہلی مرتبہ کھلاؤ گے تو اس کو چکر آئیں گے، الٹی ہو جائیگی، اگر اس سے کہا جائے کہ آئندہ یہ مت کھانا وہ کہے گا کہ میں توبہ کرتا ہوں آئندہ نہیں کھاؤں گا۔ اسی دن چھوڑنے

کو تیار ہو جائے گا بلکہ کھانے کے مقابلے میں چھوڑنا زیادہ آسان ہوگا۔ لیکن دوسرے دن آپ نے اس کو وہ چیز دوبارہ کھلادی تو پہلے دن کھانے سے جو تکلیف ہوئی تھی اب دوسرے دن اس سے کم تکلیف ہوگی تیسرے دن پھر کھلادیا تو اب تکلیف اور کم ہوگی، ہوتے ہوتے اب اس کی عادت بن گئی، اب نہیں چھوٹتی۔ ع

چھوٹتی نہیں منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اب اتنی عادت ہوگئی کہ اب اگر اس کو چھوڑے تو قیامت گزر جائے۔ اب آپ بتائیں کہ کیا تمباکو زندگی کے لئے ایسا ناگزیر تھا کہ اس کو چھوڑنا بڑا مشکل تھا؟ ایسا نہیں تھا، بلکہ تم نے اپنے عمل سے اس کی عادت ڈال لی، اور اتنی عادت ڈالی کہ وہ تمہاری زندگی کا ایک حصہ بن گیا اور اب اس کو چھوڑنا تمہیں مشکل نظر آنے لگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ فی نفسہ اس کو چھوڑنا مشکل نہیں تھا، لیکن تم نے خود اپنے اختیاری عمل سے اس کو مشکل بنادیا۔ اور جب تم نے اپنے اختیاری عمل سے اس کو مشکل بنادیا تو اب تم اپنے اختیاری عمل سے اس کو آسان بھی بنا سکتے ہو، لہٰذا اس کو اسی طریقے سے اختیاری عمل کے ذریعہ چھوڑنا چاہو گے تو چھوٹ بھی جائیگا۔

عربوں کا قہوہ

عربوں کے یہاں قہوہ کا بڑا رواج ہے، جب میں چھوٹا تھا اور دارالعلوم نانک واڑہ میں قدوری، کافیہ وغیرہ پڑھتا تھا، اس زمانے میں قطر کے ایک شیخ کراچی آگئے، ان سے ملاقات کے لئے طلبہ کا ایک وفد جارہا تھا، میں بھی ان کے ساتھ چلا گیا، جب ہم وہاں پہنچے تو سب سے پہلے انہوں نے قہوہ کے ذریعہ ہماری خاطر

تواضع کی، اس سے پہلے قہوہ نہ کبھی پیا تھا اور نہ چکھا تھا، چنانچہ چھوٹے چھوٹے فنجانوں میں ذرا ذرا سا قہوہ سب کے سامنے لاکر رکھا گیا، ہم اپنے دل میں سوچ بیٹھے تھے کہ یہ قہوہ بڑا میٹھا اور لذیذ ہوگا، لیکن جب اس کو منہ سے لگایا تو وہ اتنا کڑوا تھا کہ اس کو حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا، مجھے یاد ہے کہ اس وقت میرے سر میں درد ہو گیا۔ اور یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس ایک گھونٹ کو کس طرح اگلیں یا کس طرح اس کو نگلیں، میں سوچنے لگا کہ یا اللہ! یہ عرب لوگ تو یہ قہوہ ہر وقت پیتے رہتے ہیں اور ہمارے تو حلق سے بھی نہیں اتر رہا ہے۔ بہر حال، پہلی مرتبہ اس وقت قہوہ پیا، پھر رفتہ رفتہ عربوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا شروع ہوا تو وہاں یہ قہوہ ہر وقت چلتا ہی تھا، ہم نے اس کو تھوڑا تھوڑا کر کے پینا شروع کیا، یہاں تک کہ اب وہ اتنا لذیذ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ساری کڑواہٹ اور تلخی جاتی رہی اور اس کے پینے میں مزہ آنے لگا۔

زیتون کی کڑواہٹ

۱۹۶۳ء میں جب ہوش کے عالم میں پہلی بار سعودی عرب گیا، جدہ میں ایک بازار میں جانا ہوا، وہاں دیکھا کہ ایک دکان میں تھال کے اندر زیتون رکھے ہوئے ہیں اور ان زیتون سے تیل بھی رِس رہا تھا۔ زیتون کا نام قرآن کریم میں پڑھا تھا، لیکن کبھی زیتون کو نہ تو دیکھا تھا، نہ کھایا تھا، نہ چکھا تھا۔ البتہ اس کی تعریف سنی تھی کہ زیتون بڑا لذیذ ہوتا ہے، اب دماغ میں یہ بات تھی کہ یہ زیتون میٹھا ہوگا اور دیکھنے میں بھی ایسا لگتا تھا کہ یہ زیتون میٹھا ہوگا، چنانچہ زیتون خریدا اور میٹھا سمجھ کر منہ میں رکھا، لیکن جیسے ہی منہ میں رکھا تو کڑوا ہونے کی وجہ

سے اس کو نگلنا مشکل ہو گیا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کو کھاتے کھاتے عادت ہو گئی، اور اب وہ اتنا لذیذ معلوم ہونے لگا کہ کوئی حد و حساب نہیں۔

بہر حال، یہ کہنا کہ فلاں عادت کو چھوڑنا منطقی اعتبار سے تو اختیاری ہے لیکن حقیقت میں وہ ہمارے اختیار سے باہر ہے، در اصل وہ ہمارے اختیار سے اس لئے باہر ہو رہی ہے کہ ہم نے خود اپنے عمل سے اس کی عادت ڈال لی، اور اب اس عادت پڑنے کے نتیجے میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس کو چھوڑنا بہت مشکل ہے، لیکن جب تم ایک مرتبہ چھوڑنے کا ارادہ کر لو گے اور عزم اور ہمت کر لو گے تو وہ عادت اس طرح چھوٹ جائے گی کہ پھر یاد بھی نہیں آئے گی۔

کاموں کو چھوڑنا اختیار میں ہے

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مت سمجھو کہ اس کام کو چھوڑنا غیر اختیاری ہے بلکہ اختیاری ہے، البتہ صرف ہمت کی ضرورت ہے، ہمت کو استعمال کر کے پختہ ارادہ کر لو کہ مجھے یہ چیز چھوڑنی ہے، چاہے اس کے نتیجے میں میرے دل پر آرے چل جائیں، چاہے میرے اوپر پہاڑ ٹوٹ جائیں، لیکن میں اس کام کو چھوڑوں گا۔ اس طرح کرنے سے چند روز تکلیف ہو گی، دقت ہو گی، پھر رفتہ رفتہ عادت ختم ہو جائے گی، اس کے بعد پھر کبھی اس کام کا دل میں تقاضہ بھی ہو گا تو اس وقت بچنا دشوار نہیں ہو گا، بلکہ پھر اس کام سے بچنے میں ایسی لذت اور فرحت حاصل ہو گی کہ اس کے مقابلے میں اس کام کے کرنے کی لذت اور فرحت ہیچ ہو گی۔

خارش والے کو کھجانے کی لذت

حضرت والا نے اس کی ایک خوبصورت مثال دی ہے، جیسے ایک آدمی کے جسم پر خارش ہو رہی ہو تو اس کو کھجانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ چنانچہ یہ مقولہ مشہور ہے کہ دنیا میں دو کاموں میں مزہ ہے، ایک کھاج میں ایک راج میں۔ یعنی ایک کھجانے میں اور دوسرا حکومت کرنے میں بڑا مزہ ہے۔ بہر حال، کھجلانے میں بڑا مزہ آتا ہے، لیکن اس کھجلانے کا انجام یہ ہے کہ جتنا کھجائے گا اتنا ہی وہ زخمی ہوگا، اور خارش اور زیادہ بڑھے گی، اتنی ہی بیماری بڑھے گی۔ اب ڈاکٹر اس سے یہ کہہ رہا ہے کہ اپنے جسم کو مت کھجاؤ، اس سے تمہاری بیماری اور زیادہ ہوگی، وہ کہتا ہے کہ روکنا یہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ دیکھو، تمہاری صحت اس پر موقوف ہے کہ کھجال مت کرو، اب وہ بیمار ڈاکٹر کے کہنے پر کھجال کو روکتا ہے، لیکن روکنے میں اس کو بڑی تکلیف، مشقت اور دقت ہو رہی ہے، کھجلی اٹھ رہی ہے، طبیعت کھجلی کرنے کو چاہ رہی ہے مگر اس نے زبردستی اپنے آپ کو روک لیا۔ اب شروع میں اس کو بڑی تکلیف ہوئی لیکن جب وہ مسلسل رکتا رہا تو رفتہ رفتہ اسکو عادت ہو گئی، اب خارش سے رکنے میں دقت اور پریشانی نہیں ہو رہی ہے، یہاں تک کہ جب نہ کھجانے کے نتیجے میں بیماری دور ہو گئی اور خارش ہی ختم ہو گئی تو اب صحت حاصل ہو گئی۔ اور صحت کی یہ لذت اس خارش کرنے کی لذت کے سامنے ہیچ ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ کھجانے میں جو لذت آرہی تھی وہ جھوٹی لذت اور جھوٹا مزہ تھا، اب صحت کی جو لذت اور فرحت حاصل ہو رہی ہے، یہ حقیقی لذت اور مزہ ہے۔

بد نگاہی کی لذت چھوڑ دو

اسی طرح بد نگاہی کے نتیجے میں جو لذت حاصل ہو رہی ہے، وہ خارش والی لذت ہے، اس کو چھوڑنے سے تکلیف ضرور ہو گی، لیکن ایک مرتبہ تکلیف اٹھانے کے بعد جب انسان چھوڑنے کا عادی ہو جائے گا، اور اس کی نگاہ پاکیزہ ہو جائے گی، اور اس کو عفت اور عصمت حاصل ہو جائے گی، اور تقویٰ کی لذت حاصل ہو گی تو اس کے آگے گناہوں کی لذتیں ہیچ ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ کیونکہ گناہ سے بچنے میں ایک طرف صحت کی لذت ہے۔ اور دوسری طرف گناہ سے بچنے میں اس تصور کی لذت ہے کہ میں نے اپنی ایک بڑی خواہش کو اپنے محبوب حقیقی کے لئے قربان کر دیا ہے، جب کسی سے حقیقی محبت ہوتی ہے تو اس کے آگے اپنی خواہشات کو کچلنے میں بڑی لذت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ اس وقت یہ تصور کرتا ہے کہ ؎

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

ایک اور جگہ پر حضرت والا فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر انسان دو کام کرے: ایک یہ کہ اپنی ہمت کو استعمال کر کے چل کھڑا ہو، دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ سے اس ہمت کے اندر قوت عطا ہونے کی دعا کرے کہ یا اللہ! میری ہمت کمزور ہے، میں اپنی طرف سے یہ ارادہ کرتا ہوں کہ اب یہ نگاہ غلط جگہ نہیں اٹھے گی، لیکن یا اللہ! میں کیا اور میرا ارادہ کیا، میری ہمت کیا اور میرا عزم کیا، اے اللہ!

ہمت بھی آپ کے قبضہ قدرت میں ہے اور ارادے بھی آپ کے قبضہ قدرت میں ہیں، اے اللہ! اپنی رحمت سے میری ہمت میں قوت عطا فرمادیجئے، اور اس عزم پر مجھے ثبات عطا فرمادیجئے۔ اے اللہ! مجھ سے اس شر کو دور فرمادیجئے۔ اور یہ دعا کرے کہ:

اِنْ لاَ تَصْرِفْ عَنِّی کَیْدَھُنَّ اَصْبُ اِلَیْھِنَّ وَاَکُنْ مِنَ الْجَاھِلِین

(سورۃ یوسف)

جب انسان یہ دعا کرتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ ہمت اور قوت عطا فرمادیتے ہیں اور انسان کو اس گناہ سے نجات مل جاتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ:

"مَنِ اسْتَعَفَّ یُعِفُّہُ اللّٰہ"

جو عفت حاصل کرنا چاہے تو اللہ تعالیٰ اس کو عفیف بنا ہی دیتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو گناہوں سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ہمت میں قوت پیدا کرنے کا طریقہ

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ:

"حضور کی تنبیہ سے معلوم ہوا کہ بد نظری فعل اختیاری ہے اور علاج "استعمالِ اختیار" ہے، مگر باوجود اس کے پھر بھی اختیار کے استعمال کی ہمت نہیں ہوتی اور گناہ ہو جاتا ہے، ہمت میں قوت نہیں"

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۴)

یہ وہی بات ہے جس میں کسی نہ کسی گناہ کے سلسلے میں آج ننانوے فیصد

افراد مبتلا ہیں، معلوم ہے کہ یہ چیز اختیار میں ہے، اس کے باوجود اس کو چھوڑنے کی ہمت نہیں ہوتی، اور ہمت میں قوت نہیں۔ جیسا کہ غالب شاعر کہتا ہے کہ:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت وزھد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

مطلب یہ ہے کہ علمی اور عقلی طور سے معلوم ہے کہ یہ راستہ اچھا ہے اور یہ راستہ برا ہے، اعتقاد بھی ہے، لیکن طبیعت اس طرف راغب نہیں ہوتی، اس کا کیا علاج؟

ہمت کے استعمال سے قوت کا پیدا ہونا

جواب میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

"قوت بھی استعمال ہی سے پیدا ہوگی"

یہ نہیں ہے کہ پہلے سے فرض کر لیا کہ ہمت کمزور ہے، لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے، بلکہ ہمت کو استعمال کرو، اور اس کو جتنا استعمال کرو گے اس میں اتنی ہی قوت آئے گی۔

دنیا کی اکثر چیزیں ایسی ہیں کہ ان کو جتنا استعمال کرو گے تو استعمال کے نتیجے میں آہستہ آہستہ کمزور پڑتی جاتی ہیں، مثلاً گاڑی ہے، اس کو جتنا استعمال کرو گے وہ کمزور ہوتی چلی جائے گی، آخر میں با کر ٹھپ ہو جائے گی، مکان کو استعمال کرو گے تو آہستہ آہستہ بوسیدہ ہوتا چلا جائے گا، کپڑا استعمال کرنے کے نتیجے میں پرانا ہوتا جائے گا۔ لیکن بعض چیزیں اللہ تعالیٰ نے ایسی بنائی ہیں کہ ان کو جتنا استعمال کرو گے ان میں اور زیادہ طاقت آئے گی، جیسے حافظہ، اس حافظہ کو جتنا

استعمال کیا جائے گا، اتنی ہی قوت آئے گی، کوئی یہ نہ سوچے کہ اگر میں نے قرآن حفظ کرلیا تو پھر دوسری چیزیں یاد کرنے کی گنجائش نہیں رہے گی، ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کے اندر اور قوت پیدا ہوگی۔ اسی طرح "ہمت" بھی ایسی چیز ہے کہ اس کو انسان جتنا استعمال کریگا اتنی قوت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ اس میں مزید طاقت پیدا فرمادیں گے۔

حسن پسندی کا علاج

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ:

مجھ میں اس قدر حسن پسندی ہے کہ معمولی اشیاء کو بھی نہایت قرینہ اور خوش ترتیبی سے رکھتا ہوں اور حسن صورت کی طرف بھی بے حد کشش ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

حضرت والا کا اس کا جواب عربی میں لکھا اس سے پتہ چلا کہ وہ صاحب عالم ہونگے، چنانچہ لکھا کہ:

بعضه خيرٌ فاشكروا عليها، وبعضه شرّ فاصبروا عنها، أى غض البصر حيث أمر الشارع بالغض، ولو بتكلف شديد يحتمل زهوق الروح، فإن الله غيور يشتد غيرته عن النظر الى ما نهى الله أن ينظر إليه فالحذر الحذر أن يغيظ المحبوب الأكبر (ایضاً)

یعنی جو حالت آپ نے لکھی ہے اس کا کچھ حصہ تو خیر ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اچھی چیز کی طرف رغبت عطا فرمائی ہے اور اس کا حق ادا کرنے کی

توفیق ہوتی ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کچھ حصہ شر ہے، وہ ہے حسن صورت کی طرف میلان، جس کا دیکھنا جائز نہیں، تو اس پر صبر کرو اور اپنی نگاہ کو نیچی رکھو اگرچہ اس میں اتنی تکلیف ہو کہ جان نکلتی محسوس ہوتی ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ بھی بڑے غیرت مند ہیں، اور اللہ تعالیٰ کو اس بات سے بڑی غیرت آتی ہے کہ بندہ ایسی چیز کو دیکھے جس کے دیکھنے کو اللہ تعالیٰ نے حرام کیا ہے۔ جب تمہارے اندر حسن پسندی ہے اور حسن اچھا لگتا ہے اور حسن سے محبت ہے تو پھر حسن کا جو کمال ہے وہ تو اللہ جل شانہ کے پاس ہے اور وہی محبوب اکبر ہیں، پھر ان دنیا کے معمولی حسن کی خاطر اس محبوب اکبر کو ناراض کرنا کیسی غیرت کی بات ہے؟ اس سے بچو۔

وسوسۂ حرام کاری اور اس کا علاج

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ:

"شیطان یہ سمجھاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر ان مرغوب صورتوں پر جائز شرعی قبضہ دیدے تو اس وقت کیا کرو گے؟ سو جائز قبضہ سمجھ کر حظ کا خیال کرو اور حظ حاصل کرو، حرام کاری کا خیال مت کرو"

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

حضرت والا نے جواب دیا کہ:

خیال کا علاج بھی خیال ہے (یعنی اس خراب خیال کا علاج بھی ایک دوسرا خیال ہے وہ یہ کہ) اس وقت یہ خیال کرو کہ اگر اس عورت کے شوہر کو اس خیال کی اطلاع کردوں تو کتنی رُسوائی ہو (اس کو یہ اطلاع

کردوں کہ میں جو خیال کررہا ہوں یہ کوئی ناجائز خیال نہیں کررہا ہوں، بلکہ یہ خیال کررہا ہوں کہ تو مر جائے اور تیری بیوی کے ساتھ میرا جائز تعلق قائم ہو جائے، تو اس وقت کتنی رسوائی ہوگی) تو اللہ تعالیٰ تو بے کہے ہی اس خیال پر مطلع ہیں۔ کتنی شرم کی بات ہے کہ وہ اس ارادے کو دیکھ رہے ہیں۔ نیز اس سلسلے میں عقوبت جہنم کو مستحضر کرکے اس میں لگ جائے، یا نفس سے یہ کہے کہ جس طرح تو مجھے دوسری عورتوں سے حظ حاصل کرنے کو کہتا ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص میری بیوی سے حظ حاصل کرے اور مجھ کو اس کا علم ہو جائے تو میں کیا کرونگا؟ ظاہر ہے کہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاؤنگا۔ اسی طرح کیا دوسروں کو غیرت نہ ہوگی کہ اگر ان کو خبر ہو جائے تو وہ بھی مجھے مار ڈالیں اور ہر طرح کے ضرر پہنچانے پر آمادہ ہو جائیں، پھر جہنم کا نقشہ پیش نظر کرلے۔ علاوہ اس کے شیطان کی وہ تاویل ایسی ہے کہ کوئی شخص سچ مچ کسی عورت سے زنا کرنے لگے اور یہ سوچ لے کہ اگر اس پر جائز قدرت ہو تو اس طرح مقاربت کروں، اور اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں، یہی حکم ہے زنا بالقلب کا"۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۵)

حضرت والا نے جواب میں یہ جو فرمایا کہ آدمی یہ سوچے کہ میری بیوی، میری بہن اور میری بیٹی کے بارے میں اگر دوسرا شخص اس طرح کی بات سوچے تو مجھے غیرت آئے گی یا نہیں؟ اور میں مرنے مارنے کے لئے تیار ہو جاؤں گا یا

نہیں؟

حضورؐ سے زنا کی اجازت طلب کرنے والا

یہ بات حدیث سے ماخوذ ہے، "مجمع الزوائد" میں یہ حدیث ہے کہ ایک صاحب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور آکر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں آپ کے ہر حکم پر عمل کرنے کو تیار ہوں، لیکن ایک اجازت مانگتا ہوں، وہ یہ کہ مجھے زنا سے صبر نہیں ہوتا، آپ مجھے زنا کی اجازت دیدیں۔ اب آپ اندازہ لگائیں کہ وہ شخص کس چیز کی اجازت طلب کر رہا ہے اور کس سے طلب کر رہا ہے؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قریب بلایا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور فرمایا کہ یہ بتاؤ! یہ زنا تم جس عورت کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، وہ عورت کسی کی ماں ہوگی، کسی کی بہن ہوگی، کسی کی بیٹی ہوگی، کسی کی خالہ ہوگی، اگر دوسرا کوئی شخص یہی عمل تمہاری بہن کے ساتھ کرنا چاہے تو کیا تم پسند کروگے؟ اس نے جواب دیا: نہیں یا رسول اللہ! کوئی تمہاری بیٹی کے ساتھ یہ عمل کرنا چاہے تو تم پسند کروگے؟ اس نے جواب دیا: نہیں یا رسول اللہ! کوئی تمہاری بیوی کے ساتھ یہ عمل کرنا چاہے تو تم پسند کروگے؟ یا تمہاری خالہ کے ساتھ یہ عمل کرنا چاہے تو کیا تم پسند کروگے؟ اس نے کہا کہ نہیں یا رسول اللہ! پھر فرمایا کہ جب دوسروں کے اس عمل کو تم گوارا نہیں کرسکتے اور اس عمل کے نتیجے میں تمہیں تکلیف پہنچتی ہے تو پھر وہی کام تم دوسروں کی خواتین کے ساتھ کرنا چاہتے ہو، کیا ان کو تکلیف نہیں ہوگی؟ کیا وہ لوگ اس کو گوارہ کرلیں گے؟ وہ صاحب کہتے ہیں کہ جب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا

تھا، اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ مسلمان ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ میرے لئے زنا کو چھوڑنا ہے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنکر میرے دل میں اس عمل کی ایسی نفرت ہو گئی کہ پھر اس عمل کی طرف رجحان نہیں ہوا۔

زنانہ اشیاء کی فروخت

ایک صاحب نے یہ پوچھا کہ بعض مقامات ایسے ہوتے ہیں جہاں مردوں کو عورتوں سے واسطہ پڑتا ہے، مثلاً زنانہ اشیاء کی خرید و فروخت کرنے والے دکاندار، زیورات کے تاجر، ہسپتال کے ڈاکٹر اور ملازم وغیرہ، ایسے مواقع پر بد نگاہی سے بچنے کے طریقے پر روشنی ڈالیں تو بڑی عنایت ہو گی۔

یہ حضرات واقعۃً سب سے زیادہ مشکل میں گھرے رہتے ہیں، کیونکہ ہر وقت خواتین سے سابقہ رہتا ہے جس کی وجہ سے بچنا آسان نہیں ہوتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو کوئی ایسا حکم نہیں دیا جس پر عمل کرنا ناممکن ہو۔

پہلی بات تو یہ سمجھ لیں کہ عورت کو دیکھنا اور اسکے چہرے پر نظر ڈالنا، بذات خود گناہ نہیں، بلکہ یہ اس وقت گناہ ہوتا ہے جب لذت لینے کی نیت سے نظر ڈالے یا اس وقت عملاً التذاذ ہو رہا ہو، اس وقت نظر ڈالنا حرام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی عمل کے دوران کسی عورت سے بات چیت کرنے کی ضرورت پیش آگئی اور اس بات چیت کے دوران نہ لذت لینے کا قصد ہے اور نہ عملاً التذاذ ہوا، تو اس حد تک عورت کو دیکھنا حرام نہیں، لیکن چونکہ اس کا معلوم کرنا مشکل ہے کہ کہاں لذت کا قصد ہے اور کہاں لذت کا قصد نہیں، یا کہاں عملاً

التذ ذ ہو رہا ہے اور کہاں نہیں ہو رہا ہے، اس لئے یہ کہہ دیا گیا کہ عورت کو دیکھو ہی مت، اسی وجہ سے قرآن کریم نے بھی غضِ بصر کا حکم دیا، اس لئے کہ تم کہاں کہاں یہ امتیاز کرتے رہو گے کہ التذاذ ہو رہا ہے یا نہیں ہو رہا ہے، اور کہاں قصدِ لذت ہے اور کہاں نہیں ہے۔ لہٰذا آسان راستہ یہی ہے کہ نظر ہی مت ڈالو۔

نظر اٹھا کر مت دیکھو

اب جن مردوں کو بکثرت خواتین سے سابقہ پڑتا ہے، ان کے لئے سب سے پہلا حکم یہ ہے کہ غضِ بصر سے کام لیں۔ اس لئے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ خواتین سے معاملہ کرتے وقت ان کی طرف نظر بھی اٹھائے، بہت سے لوگوں کو میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ ایسے مواقع پر کام کرتے ہیں مگر ان کی نگاہ نہیں اٹھتی، بلکہ نگاہ نیچی رہتی ہے اور کام کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر بالفرض کہیں نظر اٹھانے کی ضرورت پیش آہی جائے تو اس نظر کو التذاذ سے محفوظ رکھے، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ یا اللہ! میری حفاظت فرمائیے۔ اور اگر نظر پڑتے وقت کچھ قصدِ لذت ہو جائے تو فوراً استغفار کرے اور توبہ کرے۔

حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب کا مجاہدہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب قدس اللہ سرہ ہومیو پیتھک ڈاکٹر تھے اور مطب چلاتے تھے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بتا کر یہ مطب شروع کیا تھا، پہلے وکالت کرتے تھے، جب مطب شروع کیا تو وہاں مرد بھی آنے لگے اور عورتیں بھی آنے لگیں۔ حضرت فرماتے تھے کہ ابتداء میں بعض اوقات علاج

کے لئے میں گھر پر بھی چلا جاتا تھا، ایک مرتبہ مجھے ایک گھر میں علاج کے لئے بلایا گیا۔ وہاں ایک خاتون بیمار تھیں، جب میں وہاں پہنچا تو دیکھا کہ اس خاتون کا لباس بھی پوری طرح ساتر نہیں تھا، میں بڑا پریشان ہوا کہ یا اللہ! میں کس مصیبت میں پھنس گیا، پتہ نہیں کیا ہوگا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے حفاظت فرمائی۔

بعد میں میں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ حضرت: میں پہلے وکالت کرتا تھا، اس میں دوسرے قسم کا فتنہ تھا، اور اس ڈاکٹری میں اور قسم کا فتنہ ہے، خواتین سے ہر وقت واسطہ پڑتا ہے، میں کیا کروں؟ جواب میں حضرت والا نے دو جملے لکھے، لکھا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کر کے اپنی نگاہ اور دل کی حفاظت کیجئے، میں بھی دعا کرتا ہوں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ جب یہ خط آیا تو میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور پھر مطب میں بیٹھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، میرا دل اس معاملہ میں پتھر ہو گیا۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ میں نے نگاہ کی حفاظت اس طرح کی کہ میں نے سوچا کہ یہ غض بصر کرنا اور جب عورت سامنے آجائے تو نگاہ نیچی کرنا یہ بڑا مشکل کام ہے، اس لئے میں نے سوچا کہ اس کی عادت کیوں نہ ڈال لی جائے کہ سامنے چاہے مرد ہو یا عورت، نگاہ نیچی ہی کر کے بات کی جائے۔ چنانچہ میں نے اس کی مہینوں مشق کی کہ سامنے مرد ہو یا عورت، نگاہ اٹھا کر دیکھا ہی نہیں، جب بھی کسی سے بات کی، نگاہ نیچی کر کے بات کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب مجھے پتہ ہی نہیں چلتا کہ سامنے مرد ہے یا عورت، بوڑھا ہے یا جوان ہے۔ ہمارا تو ایک ہی طریقہ ہے کہ نگاہ نیچی رہے۔

اللہ کی مدد ہمت پر آتی ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جب آدمی ان چیزوں میں مبتلا ہوتا ہے تو اس کو بچنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے لیکن جب اللہ تعالیٰ انسان کو ایسے حالات میں مبتلا فرماتے ہیں تو پھر آسانی بھی پیدا فرماتے ہیں، یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ بندے کو بے یارومددگار چھوڑ دیں۔ اگر انسان بچنے کا قصد اور ارادہ کرے اور اللہ تعالیٰ سے مدد چاہے اور اپنی طرف سے تھوڑی بہت ہمت کا استعمال کرے تو میرا تو اس پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو بے یارومددگار نہیں چھوڑیں گے، انشاء اللہ تعالیٰ۔ لیکن اگر انسان بچنے کا قصد ہی نہ کرے، ارادہ ہی نہ کرے، فکر ہی نہ کرے، بلکہ غفلت میں پڑا رہے، یہ بہانہ بنائے رکھے کہ میں تو ایسی جگہ میں مبتلا ہوں کہ بچ ہی نہیں سکتا، ہر وقت عورتوں سے واسطہ ہے، عورتیں ہر وقت سامنے آتی ہیں، میں کیا کروں؟ یہ سب بے فکری کے بہانے ہیں۔ ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کا کوئی وعدہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مدد فرمائے اور اس گناہ سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

چھٹی مجلس

غیبت اور اس کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸ - لیاقت آباد، کراچی ۱۹

چھٹی مجلس

غیبت اور اس کا علاج

الحمد للہ رب العالمین والعاقبة للمتقین، والصلاۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین اما بعد!

ابتک "بدنظری" سے متعلق بیان چل رہا تھا اور اس سے بچنے کی تدبیریں بتائی گئی تھیں، آگے ایک اور باطنی بیماری کا تذکرہ ہے، وہ ہے "غیبت" یہ بیماری ایسی ہے کہ شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اللہ کی توفیق سے بچا ہوا ہو، ورنہ سب لوگ کسی نہ کسی درجے میں اس بیماری میں مبتلا ہیں، اور یہ بیماری اتنی سنگین ہے کہ قرآن کریم نے اس کے لئے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں کہ کسی اور بیماری کے لئے ایسے الفاظ استعمال نہیں کئے، چنانچہ فرمایا:

وَلاَ تَجَسَّسُوْا وَلا یَغْتَبْ بَعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا فَکَرِھْتُمُوْہ (سورہ حجرات پارہ ۲۶)

(یعنی تجسس نہ کرو اور تم میں سے بعض لوگ دوسرے بعض کی غیبت نہ کریں، کیا تم میں سے کوئی اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ اپنے مردار بھائی کا گوشت کھائے، پس تم اس کو ناپسند کرتے ہو) اس آیت میں غیبت کو مردار بھائی کا گوشت کھانے سے تعبیر کیا۔ ایک تو انسان کا گوشت، اور انسان بھی بھائی، اور بھائی بھی

مردہ، کوئی بھی انسان جس کے اندر انسانیت کا ذرہ بھی موجود ہوگا، وہ اس کام کا نہ تو ارتکاب کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچ سکتا ہے، لیکن قرآن کریم کہتا ہے کہ غیبت کرنا بھی ایسا ہے جیسے مردار بھائی کا گوشت کھانا۔ اور یہ "غیبت" گناہ کبیرہ ہے، معمولی گناہ نہیں ہے۔

غیبت کے گناہ کی شدّت

یہ غیبت کرنا ایسا ہی گناہ ہے جیسے شراب پینا گناہ ہے، جیسے خنزیر کھانا گناہ ہے، جیسے چوری کرنا اور ڈاکہ ڈالنا گناہ ہے۔ بلکہ غیبت کرنا ان گناہوں سے زیادہ سنگین ہے، کیونکہ شراب پینے اور خنزیر کھانے کا تعلق خالصتاً حقوق اللہ سے ہے، اگر کوئی شخص شراب نوشی کرتا ہے، یا خنزیر کھاتا ہے تو وہ اپنی ذات کا گناہ کرتا ہے، اس کا حقوق العباد سے کوئی تعلق نہیں، لہٰذا اگر کبھی اللہ تعالیٰ توبہ کی توفیق عطا فرمادیں گے تو شراب کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا اور خنزیر کھانے کا گناہ بھی معاف ہو جائے گا۔ لیکن غیبت کا گناہ ایسا ہے کہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور حقوق العباد کا اصول یہ ہے کہ یہ اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک صاحب حق معاف نہ کر دے، ہزار توبہ استغفار کرتے رہو، نماز روزے کرتے رہو، لیکن یہ معاف نہیں ہونگے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اپنا حق تو معاف کر دوں گا، لیکن اگر تم نے کسی بندے کی جان کو نقصان پہنچایا، یا مال کو نقصان پہنچایا، یا اس کی آبرو کو نقصان پہنچایا، یا تم نے اس کی کوئی بھی حق تلفی کی، تو جب تک وہ معاف نہیں کریگا یا جب تک اس کا حق ادا نہیں کر دو گے، میں معاف نہیں کروں گا۔ حقوق العباد کا معاملہ اتنا خطرناک ہے، لیکن ہم نے اس کو اتنا معمولی سمجھ

رکھا ہے جیسے ناک پر مکھی آ بیٹھی اور اس کو اڑا دیا۔ اور ”غیبت“ بھی حقوق العباد میں سے ہے۔

غیبت کی تعریف

”غیبت“ کسے کہتے ہیں؟ غیبت یہ ہے کہ کسی مسلمان کا تذکرہ اس کی پیٹھ پیچھے اور اس کی غیر موجودگی میں اس انداز سے کیا جائے کہ اگر اس کو پتہ چلے کہ میرا تذکرہ اس انداز سے کیا گیا ہے تو اس کو ناگوار گزرے، تو یہ غیبت ہے اور گناہ ہے۔ اب ہم اپنا جائزہ لیکر دیکھیں کہ ہم لوگ صبح سے لیکر شام تک آپس میں جو گفتگو کرتے ہیں، اس میں غیبت ہوتی ہے یا نہیں؟ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ میں اس کے بارے میں یہ بات جو کہہ رہا ہوں، میں اس کے منہ پر کہہ دوں، اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غیبت تو اس وقت ہوگی جب منہ پر نہ کہہ سکیں، میں تو اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہوں۔ ارے بھائی! تم اس کے منہ پر کہنے کو تیار ہو یا نہ ہو، اگر وہ بات اس کی ناگواری کا سبب ہے تو بس غیبت کی تعریف اس پر صادق آگئی اور وہ گناہ ہو گیا، اور تم نے مردار بھائی کا گوشت کھالیا۔ العیاذ باللہ۔

غیبت اور بہتان میں فرق

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں جس شخص کی غیبت کر رہا ہوں، اس میں وہ بات واقعی موجود ہو، جو میں کہہ رہا ہوں، کیا پھر بھی گناہ ہوگا؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات تم اس کے بارے میں کہہ رہے ہو، وہ بات اس کے

اندر موجود ہے اور تم اس کی سچی برائی بیان کر رہے ہو تو یہ غیبت ہے، اور اگر تم جھوٹی بات بیان کر رہے ہو، اور وہ بات اس کے اندر موجود نہیں ہے، تو پھر غیبت کے ساتھ ''بہتان'' لگانے کا گناہ بھی ہوگا۔

ایک شخص کے اندر ایک برائی موجود ہے، تم نے ایک مجلس کے اندر اس کی وہ خرابی بیان کر دی، مثلاً تم نے یہ کہہ دیا کہ فلاں آدمی تو بڑا جھوٹا ہے، اور حقیقت میں بھی وہ جھوٹا ہے، تو تمہارا اس کے پیٹھ پیچھے اس کے جھوٹا ہونے کا تذکرہ کرنا غیبت ہے اور گناہ ہے، بشرطیکہ اس کو اپنا جھوٹا کہلوانا ناگوار ہو۔ اور اگر وہ جھوٹا نہیں ہے، پھر بھی تم نے اس کو جھوٹا کہہ دیا، تو اس صورت میں تم نے دو گناہ کئے: ایک غیبت کرنے کا گناہ کیا اور ایک بہتان لگانے کا گناہ کیا۔ لہٰذا غیبت بڑا سنگین گناہ ہے، آدمی اپنی زبان کو سنبھال کر رکھے، اور اللہ تعالیٰ سے حفاظت کی توفیق مانگتا رہے تب تو اس گناہ سے بچ سکتا ہے، ورنہ اس گناہ کے اندر مبتلا ہو جائے گا۔

ایک پروفیسر صاحب کا غیبت پر تبصرہ

میں نے ایک مرتبہ غیبت کے بارے میں ایک مضمون لکھا، ایک یونیورسٹی کے پروفیسر صاحب نے وہ مضمون پڑھ کر مجھے ایک خط لکھا کہ آپ نے اس مضمون میں غیبت کی بہت برائی بیان کی کہ یہ غیبت گناہ کبیرہ ہے، حرام اور ناجائز ہے، اس کو چھوڑنا چاہئے۔ میں نے اس غیبت پر بہت غور کیا، میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر ''غیبت'' کو زندگی سے نکال دیں تو یہ زندگی پھیکی ہے، اس میں پھر کوئی مزہ ہی نہیں ہے، اس لئے کہ جب ہم دو چار آدمی ملکر بیٹھتے ہیں اور کوئی بات چیت چلتی ہے تو اس بات چیت میں غیبت شامل نہ ہو تو ہم پھر کسی موضوع پر بات

چیت کریں؟ بس پھر تو "اللہ اللہ" ہی کریں، اور کوئی ہنسی مذاق کی بات، کوئی تفریح کی بات، کوئی دل لگی کی گفتگو تو ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ نے اتنا لمبا چوڑا مضمون لکھا اور اس کی اتنی برائیاں بیان کی، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ سب لوگ اپنی تفریح وغیرہ سے دست بردار ہو جائیں اور زندگی کا لطف ہی ختم کر دیں۔ چونکہ وہ پروفیسر صاحب تھے، اس لئے اپنی ذھنی سوچ کے مطابق آخر میں یہ کہا کہ میں نہیں سمجھتا کہ اسلام ایسی چیز کو منع کریگا جس کو انسان ہر وقت کرتا ہی ہے، اور اگر نہ کرے تو مزہ ہی نہ رہے۔ یہ خط لکھ کر بھیجا۔

میں نے اس خط کے جواب میں لکھا کہ یہ جو آپ فرما رہے ہیں کہ اگر "غیبت" کو زندگی سے نکال دیا جائے تو زندگی کا مزہ ہی ختم ہو جائے، تو آپ کی زندگی کا مزہ تو "غیبت" نہ کرنے کی وجہ سے ختم ہو جائے گا، لیکن جب دوسرا شخص آپ کی غیبت کر رہا ہو، اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ جب آپ کو پتہ چلے کہ پروفیسر صاحب کے بارے میں فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی، فلاں شخص نے فلاں مجلس میں یہ بات کہی تو اس وقت آپ کو زندگی کا لطف آئے گا یا کیا حال ہو گا؟

اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک معیار رکھو

بات دراصل یہ ہے کہ ہر انسان اپنے لطف اور مزہ کو تو دیکھتا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھتا کہ جو کام میں دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر دوسرا میرے ساتھ کرے تو مجھ پر کیا گزرے؟ مجھ پر کیا بیتے؟ حدیث شریف میں جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسا کیمیا کا نسخہ بیان فرمادیا کہ ایک پیغمبر ہی ایسا نسخہ بیان کرسکتا ہے، کسی اور کے بس کا کام نہیں۔ اگر اس نسخے پر عمل کرلیا جائے تو معاشرے کے سارے مسائل حل ہو جائیں اور معاشرے کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں، ساری خرابی اس نسخے کو فراموش کرنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے، وہ نسخہ یہ ہے کہ:

أحب لاخيك ماتحب لنفسك

واكره لغيرك ما يكره لنفسك

(مسند احمد ج ۴ ص ۷۰)

یعنی اپنے بھائی کے لئے وہی پسند کرو جو تم اپنے لئے پسند کرتے ہو، اور دوسروں کے لئے وہی بات ناگوار سمجھو جس کو تم اپنے لئے ناگوار سمجھتے ہو۔ یہ جو ہم نے دوہرے پیمانے بنا رکھے ہیں کہ اپنے لئے پیمانہ کچھ اور ہے اور دوسرے کے لئے کچھ اور ہے، اپنے لئے ترازو اور ہے اور دوسرے کے لئے اور ہے، اس کی وجہ سے معاشرے میں ساری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ لہٰذا ہر معاملے میں یہ دیکھو کہ میں جو معاملہ دوسرے کے ساتھ کر رہا ہوں، اگر میں اس کی جگہ پر ہوتا اور وہ میری جگہ پر ہوتا تو میرے اوپر کیا گزرتی۔ ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچ لے تو کبھی بھی اس سے دوسرے کی حق تلفی نہ ہو اور ناانصافی نہ ہو اور دوسرے کا حق پامال نہ ہو۔

لہٰذا غیبت کرتے وقت ذرا یہ سوچو کہ اگر اس کی جگہ میں ہوتا، مجلس کے اندر میرا اس انداز سے ذکر ہو رہا ہوتا، اور میرے بارے میں یہ باتیں کہی جا رہی

ہوتیں جو میں دوسروں کے بارے میں کہہ رہا ہوں، تو مجھے یہ چیز پسند ہوتی یا نہیں؟ اگر پسند نہیں ہوتی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ "غیبت" ہے اور اس سے بچنا ہے۔

لوگ یہ کہتے ہیں کہ غیبت سے بچا نہیں جاتا۔ میں کہتا ہوں کہ غیبت اختیار سے ہوتی ہے، غیر اختیاری نہیں ہوتی، اور جب غیبت کرنا اختیار میں ہے تو بچنا بھی اختیار میں ہے، لہٰذا اس سے بچنا ضروری ہے۔

غیبت کی اجازت کے مواقع

البتہ جس موقع پر کسی مسلمان کو نقصان سے بچانا منظور ہو تو اس وقت غیبت جائز ہو جاتی ہے، مثلاً ایک شخص آپ کے پاس آیا، اس نے کہا کہ فلاں شخص نے میری بیٹی کے لئے رشتہ بھیجا ہے، آپ کی نظر میں یہ آدمی کیسا ہے؟ اب اگر آپ کی نظر میں اس شخص کی ایسی برائی ہے جو شادی بیاہ کے معاملے میں قابل غور ہوا کرتی ہے، تو اس صورت میں اگر آپ وہ برائی اس کو بتادیں تاکہ وہ اور اس کی بیٹی نقصان سے بچ جائے تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔ یا مثلاً ایک شخص دھوکہ باز ہے اور دھوکہ دے کر لوگوں سے پیسے حاصل کر لیتا ہے، اگر آپ کسی کو یہ بتادیں کہ اس شخص سے ذرا سوچ سمجھ کر معاملہ کرنا، یہ آدمی معاملے کا ٹھیک نہیں ہے، تو یہ غیبت نہیں، اس لئے کہ دوسرے شخص کو نقصان سے بچانا منظور ہے۔

لہٰذا جہاں دوسرے کو تنبیہ کرنے کی ضرورت ہو، اور دوسرے کو دنیا یا آخرت کے نقصان سے بچانے کی ضرورت ہو، وہاں کسی کی واقعی برائی بیان کرنا

غیبت میں داخل نہیں، یہ جائز ہے۔

فاسق اور گناہ گار کی غیبت کرنا

عام طور پر لوگوں میں مشہور ہے کہ جو فاسق و فاجر ہو، اس کی غیبت جائز ہے۔ مطلقاً اس طرح سے یہ بات درست نہیں، بلکہ جس طرح نیک آدمی کی غیبت جائز نہیں اسی طرح سے فاسق و فاجر کی غیبت بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص کسی گناہ کو اس طرح علانیہ کرتا ہے کہ اس گناہ کی اپنی طرف نسبت سے نہیں شرماتا، اور نہ اس کو وہ برا سمجھتا ہے کہ یہ گناہ اس کی طرف منسوب ہو، تو اگر اس گناہ کا ذکر اس کی غیر موجودگی میں کر کے اس کی طرف منسوب کریں تو یہ جائز ہے۔ مثلاً ایک آدمی علانیہ شراب پیتا ہے اور سب کو بتا کر پیتا ہے، اب اگر آپ اس کے پیٹھ پیچھے یہ ذکر کریں کہ فلاں شخص شراب پیتا ہے، ظاہر ہے کہ آپ کے اس ذکر کرنے سے اس کو کوئی تکلیف اس لئے نہیں ہوگی کہ وہ خود دوسروں کو بتاتا ہے کہ میں شراب پیتا ہوں، لہٰذا یہ غیبت ناجائز نہیں ہے۔ لیکن جس گناہ کو وہ چھپانا چاہتا ہے، اور اس گناہ کا اپنی طرف منسوب ہونے کو برا سمجھتا ہے، اور اس کے ذکر سے اُس کو تکلیف پہنچتی ہے تو اس کے پیٹھ پیچھے اس گناہ کا تذکرہ کرنا ناجائز ہے، چاہے وہ سچی بات ہو، وہ غیبت ہے، اور حرام ہے۔ لہٰذا اگر زبان پر لگام نہ ڈالی جائے تو یہ انسان کو گناہ میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور غیبت جس طرح کرنا جائز نہیں، اسی طرح سننا بھی جائز نہیں۔

دوسروں کا تذکرہ ہی نہ کرو

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ احتیاط اس میں ہے

کہ دوسروں کا تذکرہ ہی مت کرو، نہ اچھائی سے اور نہ برائی سے، کیونکہ جب دوسرے کا ذکر اچھائی سے بھی کروگے تو شیطان آخر میں برائی کے تذکرے میں مبتلا کرہی دیگا کہ بھائی! فلاں آدمی تو بڑا اچھا ہے لیکن اس میں ذرا یہ برائی بھی ہے۔اس لئے بہتر یہ ہے کہ انسان دوسرے کا ذکر ہی نہ کرے۔

اپنی فکر کرو

پھر دوسرے کا ذکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، بس اپنی فکر کرو۔ بقول کسی کے:

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جس کو اپنے عیوب کی فکر ہو وہ دوسروں کے عیوب کہاں تلاش کریگا جو خود بیمار ہو اور اس کے پیٹ میں درد ہو رہا ہو، وہ دوسروں کی بیماریوں کی کہاں فکر کریگا۔جب انسان اپنی فکر میں پڑ جاتا ہے کہ میں کس عیب کے اندر مبتلا ہوں؟ میرے اندر کیا خرابی ہے؟اس کی کس طرح اصلاح کروں اور کس طرح اس کا تدارک کروں تو پھر اس سے دوسرے کی غیبت نہیں ہوتی بہادر شاہ ظفر نے بڑے اچھے اشعار کہے:۔

تھے جو اپنی برائی سے بے خبر، رہے ڈھونڈتے اوروں کے عیب
وہنر
پڑی اپنی برائی پر جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب اپنی برائی پر نظر پڑی تو پتہ چلا کہ کوئی برا نہیں ہے، سب سے برا میں

ہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اپنے نفس کے عیوب پر نگاہ ڈالنے کی اور ان کے ادراک کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

غیبت کا ایک عملی علاج

بہر حال، غیبت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کی تشریح عرض کرتا ہوں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ:

"سالک کے سامنے کوئی غیبت یا لایعنی کلام کرے اور اس کو منع کرنے پر قدرت نہ ہو تو خود اٹھ جانا چاہئے اور اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابل احتراز ہے، یوں اگر نہ اٹھ سکے تو کسی بہانہ سے اٹھ جائے یا قصداً فی الفور کوئی مباح تذکرہ شروع کر دیا جائے تا کہ وہ قطع ہو جائے"۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۹)

جیسا کہ ابھی بتایا کہ غیبت جس طرح کرنا ناجائز ہے، اسی طرح سننا بھی ناجائز ہے۔ لہٰذا اگر مجلس میں غیبت شروع ہو گئی تو اب کیا کیا جائے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ اگر منع کرنے پر قدرت ہے تو روک دے، روکنے کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صاف صاف کہہ دے کہ دیکھو اس طرح تذکرہ کرنے سے غیبت ہو جائے گی، چھوڑو اس تذکرے کو۔ اور اگر اس طرح نہیں کہہ سکتے تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خود موضوع کلام بدل دے اور کوئی اور بات چھیڑ دے تا کہ وہ قصہ ختم ہو جائے۔ اور اگر ان دونوں طریقوں پر قدرت نہ ہو تو پھر وہاں سے اٹھ جائے، اس مجلس میں نہ بیٹھے۔

دل شکنی کی پرواہ نہ کرے

آگے ایک اصول بیان فرمادیا کہ اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابل احتراز ہے۔ ہمارے ہاں افراط اور تفریط حد درجے کی ہے، ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ حقوق العباد کی پرواہ ہی نہیں، جس کا جو حق چاہا مار لیا، چاہے وہ جانی حق ہو یا مالی حق ہو۔ اور دوسری طرف یہ ہے کہ اگر کسی کو حقوق العباد کا خیال ہے تو وہ اس درجہ اس کے اندر آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اپنے فرائض شرعیہ کے اندر کوتاہی کرنا شروع کر دیتا ہے۔

وقت پر نماز پڑھنا فرض ہے

چنانچہ ایک ڈاکٹر صاحب تھے، ان کی بیوی نے مجھ سے بتایا کہ میرے شوہر ویسے تو بہت اچھے ہیں، لیکن مطب کے اوقات میں نماز نہیں پڑھتے، میں ان سے کہتی ہوں کہ مطب کے اوقات کے دوران جب نماز کا وقت آئے تو نماز پڑھ لیا کرو، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ میں تو لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں اور یہ حقوق العباد میں سے ہے، مطب میں مریض بیٹھے ہوں اور میں اپنی نماز شروع کر دوں؟ چنانچہ وہ مطب بند کر کے رات کو جب گھر آتے ہیں تو عصر، مغرب اور عشاء تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میں تو خدمت خلق کرتا ہوں، اور خدمت خلق کے دوران نمازیں قضا ہو جائیں تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

بھائی! خدمت خلق تم پر اس طرح فرضِ عین نہیں جس طرح نماز فرض

عین ہے۔ دوسرے اس خدمت خلق کے ساتھ نماز کا کوئی تعارض بھی نہیں ہے، اگر تم عصر کی چار رکعت پڑھ کر دوبارہ مریضوں کو دیکھنا شروع کر دو تو اس میں کیا تکلیف ہو گی؟ لہٰذا نفس نے نمازیں قضا کرنے کا ایک بہانہ تلاش کر لیا کہ خدمت خلق ہو رہی ہے۔ یہ سب افراط اور تفریط ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی صحیح فہم اور سمجھ نہیں۔ اسی لئے حضرت فرماتے ہیں کہ دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کی خاطر اپنے دین کو توڑ دینا ٹھیک نہیں۔ لہٰذا یہ خیال کرنا کہ میں اگر اس کو غیبت سے روکونگا تو اس کا دل برا ہو گا، یا میں اٹھ کر چلا جاؤں گا تو اس کا دل برا ہو گا، یاد رکھئے! اگر معصیت سے بچنے کے نتیجے میں دوسرے کا دل برا ہوتا ہے تو ہونے دو، اس کی پرواہ ہی مت کرو۔ تم اس حد تک مکلّف ہو کہ جائز حدود میں رہ کر اس کی دل شکنی سے بچو، لیکن جہاں دل شکنی سے بچنے کے لئے کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے تو پھر دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹنے دو، اس کی پرواہ نہ کرو۔

دوسروں کی دنیا بنانے والا

ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دوسرے کو دنیا کا فائدہ پہنچانے کے لئے اپنی آخرت خراب کرے تو اللہ تعالیٰ اس دوسرے شخص کو دنیا ہی میں اس پر مسلط کر دیتے ہیں کہ تو نے اس کی دنیا کی خاطر اپنی آخرت خراب کی تھی، اب یہ تیری دنیا کو بھی خراب کریگا۔ جو لوگ بیوی بچوں کو آرام اور راحت پہنچانے کی خاطر حرام آمدنی میں مبتلا ہوتے ہیں تو تجربہ یہ ہے کہ وہی بچے اس باپ کے سر پر جوتے بجاتے ہیں، اس لئے کہ اس نے بیوی بچوں کو راضی کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا، اور ان کی دنیا

بنانے کے لئے اپنی آخرت خراب کی، تو پھر دنیا کے اندر ہی ان کو مسلط کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کے لئے اپنی دین شکنی مت کرو۔

غیبت سے بچنے کے لئے ہمت کی ضرورت ہے

ایک اور حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **لا طاعة لمخلوق فی معصیة الخالق** کسی مخلوق کی ایسی اطاعت نہیں کرنی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی نوبت آجائے، اللہ تعالیٰ کو ناراض کر کے نہ کسی کی بات ماننے کی ضرورت ہے اور نہ مخلوق کی دلداری کی اجازت ہے۔ یاد رکھئے! کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، ہر کام میں کچھ نہ کچھ محنت اور مشقت اٹھانی پڑتی ہے، تب جا کر وہ کام انجام پاتا ہے، لہٰذا اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ غیبت کرنا برا کام ہے اور گناہ کا کام ہے، اور تم یہ سمجھتے ہو کہ اس سے آخرت تباہ ہو رہی ہے تو پھر محنت اور مشقت اور اپنی ہمت کو استعمال کرنا پڑیگا۔ جب اپنی ہمت کو استعمال کرو گے تو اللہ تعالیٰ مدد فرمائیں گے اور پھر اس گناہ سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

ناجائز غیبت کی شرط ناگواری ہے

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ:

"اگر کسی کو بنا بر بے تکلفی ایسی بات کہی جائے جو بنظر الفاظ تو ناگواری کی بات ہے، مگر بنظر بے تکلفی یا تعلق یا بطور مزاح ہونے کے ناگواری کا خیال نہیں۔ (تو آیا یہ بھی ناجائز اور غیبت میں داخل ہے یا نہیں؟)

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴۹)

مطلب ان سوال کرنے والے کا یہ تھا کہ کچھ لوگوں سے بے تکلف تعلقات ہوتے ہیں، دوستی ہے، آپس میں ہنسی مذاق ہے، اور ایک دوسرے کو کچھ باتیں ہنسی مذاق میں کہہ دیتے ہیں، اب اگر اس کی غیر موجودگی میں بے تکلفی کے انداز کا اس کا اسطرح ذکر کر دیا جائے کہ اس کے الفاظ تو بظاہر ایسے ہیں کہ جب دوسرا سنے تو اس کو ناگوار ہو کہ میرے بارے میں ایسے الفاظ کہے، لیکن تعلقات کی نوعیت ایسی ہے کہ اس کے ساتھ بے تکلف دوستی ہے، رشتہ داری ہے، تو آیا ایسے الفاظ کہنا جائز ہیں یا نہیں، یہ الفاظ غیبت میں داخل ہیں یا نہیں؟ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ:

"جب وہ ناگواری ہے، خواہ کسی بھی حیثیت سے ہو، وہ مانعیت کے لئے کافی ہے، اور اگر خود ناگواری میں تردد ہے تب بھی واجب الکف ہے، البتہ اگر عدم ناگواری یقینی ہو تو غیبت کی حد سے خارج ہو گیا۔"

حضرت والا کے اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا مکمل سو فیصد یقین ہو کہ جس کے بارے میں میں یہ بات کہہ رہا ہوں وہ اگر یہ سنے گا تو اس کو میرا یہ جملہ اور فقرہ اور یہ الفاظ ناگوار نہیں ہونگے، وہ ان کو برا نہیں سمجھے گا، کیونکہ تعلق کی نوعیت ایسی ہے تو اس صورت میں وہ الفاظ غیبت میں داخل نہیں۔ مثلاً اپنے کسی دوست سے کہا کہ تو بڑا بے وفا ہے، پھر بعد میں کسی مجلس میں اس دوست کا تذکرہ آیا تو اس نے کہا کہ اس بے وفا کا کیا اعتبار۔ اب لفظ "بے وفا" ایسا لفظ ہے کہ کسی اجنبی کو کہیں گے تو اس کو ناگواری بھی ہو سکتی ہے، لیکن دوستی میں جب یہ

لفظ بولا جاتا ہے تو عموماً ناگوار نہیں ہوتا۔ لہٰذا اگر اس بات کا یقین ہے کہ جب میرا دوست یہ سنے گا کہ میں نے اس کے بارے میں یہ بات کہی تھی تو اس کو ناگوار نہیں ہوگا تو یہ غیبت میں داخل نہیں۔ لیکن اگر ناگوار ہونے کا شبہ ہو، یعنی یہ بھی احتمال ہو کہ ناگوار ہوگا اور یہ بھی احتمال ہے کہ ناگوار نہیں ہوگا تو اس کو ناجائز ہی سمجھیں گے۔

ایسا ہنسی مذاق جائز نہیں

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ بعض اوقات دوستوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ایک دوست تو بے تکلفی میں دوسرے سے ہنسی مذاق کر رہا ہے، اور اس کا مقصد دوسرے کو ستانا اور تکلیف پہنچانا نہیں ہے، لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ہنسی مذاق کو پوری طرح برداشت نہیں کرپاتے اور اس پر وہ چڑتے ہیں اور انکو ناگواری ہوتی ہے۔ لیکن دوست احباب ایسے شخص کو چڑانے کے لئے اس سے اور زیادہ ہنسی مذاق کرتے ہیں اور اس سے مزہ لیتے ہیں، تو اگرچہ دوست احباب اس کو بے تکلفی میں وہ الفاظ کہہ رہے ہیں، لیکن چونکہ اس کو تمہاری یہ بے تکلفی ناگوار ہو رہی ہے تو یہ ہنسی مذاق بھی جائز نہیں، کیونکہ کسی مسلمان کو ناگواری پہنچانا جائز نہیں۔ لہٰذا ایسے آدمی سے اس طرح گفتگو کرنا جو اس کی دل شکنی کا باعث ہو، یہ کسی صورت میں جائز نہیں ہے۔

لیکن اگر یہ یقین ہے کہ فلاں سے ایسی بے تکلفی کی دوستی ہے کہ وہ برا نہیں مانے گا بلکہ اس کو اچھا لگے گا، اور اس کو اس بے تکلفی سے خوشی ہوگی، تو

ایسے موقع پر اس کے سامنے بھی ایسے الفاظ کہنا جائز ہے اور پیٹھ پیچھے کہنا بھی جائز ہے۔ خلاصہ یہ کہ تین صورتیں ہوئیں، نمبر ایک: اگر ناگواری کا یقین ہو تو ایسے الفاظ کہنا ناجائز ہے، نمبر دو: اگر ناگواری کا شبہ ہو تو بھی ناجائز ہے، نمبر تین: اگر یہ یقین ہو کہ اس کو ناگوار نہیں ہوگا تو جائز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں غیبت سے بچنے کی ہمت اور توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

ساتویں مجلس

غیبت سے بچنے کا طریقہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

ساتویں مجلس

غیبت سے بچنے کا طریقہ

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علی رسوله محمد وعلی آله واصحابه اجمعین، امابعد!

حضرت والا نے غیبت سے بچنے کے لئے ایک اصول ارشاد فرمایا، وہ یہ ہے کہ:

"بے سوچے ہرگز کوئی کلام نہ کیا جائے، اگرچہ بعض اوقات یہ بھی نہ یاد رہے گا کہ سوچ کر بولوں، مگر خیال رکھنے سے اکثر اوقات یاد رہے گا کہ سوچ کر بولوں، پھر انشاء اللہ ذہول نہ ہوگا، پس جب سوچ کر بولا جائے تو ہر کلام سے پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ اس کلام سے گناہ تو نہ ہوگا، انشاء اللہ تعالیٰ اس سے بہت کچھ اصلاح ہو جائے گی" (انفاس عیسیٰ ص ۱۴۹)

یعنی بے سوچے سمجھے بولنے کی جو عادت پڑی ہوئی ہے، اس کو ختم کرو، بولو تو سوچ کر بولو، اور یہ سوچو کہ جو کلمہ میں زبان سے نکالنا چاہتا ہوں، وہ کہیں مجھے گناہ میں اور اللہ کی نافرمانی میں مبتلا نہ کر دے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "قُلْ خَیْرًا وَاِلاَّ فَاصْمُتْ" یا تو بھلائی کی بات کہو ورنہ خاموش رہو۔ خاموش رہنا ہزار درجہ بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ آدمی فضول ایسی باتیں کرتا

پھرے جو اس کے لئے عذاب جہنم کا باعث ہوں۔

جہنم میں اوندھے منہ ڈالنے والی

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ھَل یَکُبُّ النَّاسَ فِی النَارِ اِلاَّ حَصَائد اَلسِنَتِھِم"

یعنی لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز ان کی زبان سے نکلے ہوئے کلمات ہونگے، العیاذ باللہ۔ یہ زبان سرکاری مشین ہے، جو اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے عطا فرمادی ہے، جب سے پیدا ہوئے اس وقت سے یہ مشین چل رہی ہے اور مرتے دم تک چلتی رہے گی، نہ اس میں تیل ڈالنے کی ضرورت، نہ اس کی سروس کرانے کی ضرورت، نہ اس کی مرمت کرانے کی ضرورت، مگر یہ کام کر رہی ہے، اور اس طرح کام کر رہی ہے کہ جیسے ہی ذہن میں ایک بات آئی کہ یہ بات زبان سے ادا کروں، بس فوراً وہ بات زبان کے ذریعہ باہر آجاتی ہے، گویا کہ آٹومیٹک مشین ہے۔ اس نعمت کی ہمیں قدر اس لئے نہیں ہے کہ یہ نعمت بچپن سے ہمارے ساتھ ہے اور کام دے رہی ہے، اور اس کے حصول کے لئے کوئی روپیہ پیسہ خرچ نہیں کرنا پڑا، اور کوئی محنت نہیں اٹھانی پڑی، اس لئے اس کی قدر نہیں۔

زبان کی قدر کریں

اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھئے جن کی گویائی کی قوت سلب ہوچکی ہے کہ وہ کس عذاب کے اندر مبتلا ہیں؟۔ جن لوگوں کی فالج کی وجہ سے زبان بند ہوجاتی ہے، وہ بات کہنا چاہتے ہیں، اپنی بیوی بچوں سے، اپنے ماں باپ سے، اپنے بھائی

سے، اپنے دوست سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، لیکن قوت گویائی نہیں ہے، بول نہیں سکتے۔ بعض اوقات اپنا سر پیٹ لیتے ہیں کہ میں کہنا چاہتا ہوں، میں اپنے دل کی بات اس کو کیسے سمجھاؤں، اس وقت پتہ چلتا ہے کہ اس زبان کی گویائی کی کیا قیمت ہے۔ خدانہ کرے، اگر ہم میں سے کسی کی گویائی دو منٹ کے لئے بند ہو جائے، اور بولنے کی طاقت نہ رہے، اور دوسرا شخص کہے کہ تمہارے بولنے کی طاقت تمہیں واپس نہیں مل سکتی، پہلے اس کے لئے تمہیں خرچ کرنا پڑے گا تو لاکھوں روپیہ خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جائے گا تا کہ مجھے یہ قوت گویائی واپس مل جائے۔ اب اس وقت یہ گویائی مفت ملی ہوئی ہے، اور یہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے، اور انسان اس کو جابجا استعمال کر رہا ہے، اور اس کے ذریعہ حلال اور حرام ایک کر رکھے ہیں، کوئی فکر نہیں۔

دو عظیم کلمے:

شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ سرکاری مشین تمہیں مفت ملی ہوئی ہے اور کام دینے والی مفید چیز ہے تو اس کو فائدے کے کاموں میں استعمال کرو اور حرام کاموں سے اس کو بچاؤ۔ اگر انسان اس سے فائدہ اٹھانا چاہے تو اس کا فائدہ بھی بڑا عظیم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر ایک مرتبہ زبان سے "سبحان اللہ" کہہ دیا یا "الحمد للہ" کہہ دیا تو میزان عمل کا آدھا پلہ بھر جاتا ہے۔ بخاری شریف کے ختم کے موقع پر آپ یہ حدیث سنتے ہیں کہ: کلمتان حبیبتان الی الرحمن خفیفتان علی اللسان ثقیلتان فی المیزان، سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم" دو کلمے ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بڑے محبوب

ہیں۔ جن کا زبان سے ادا کرنا بہت آسان ہے، ایک لمحے میں ادا ہو جاتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی یہاں میزان عمل میں بڑے بھاری ہیں وہ دو کلمے یہ ہیں "سبحان اللہ وبحمدہ سبحان اللہ العظیم" لہٰذا اگر انسان اس زبان کو صحیح استعمال کر لیں تو جنت کی نعمتوں کے ڈھیر لگا سکتا ہے۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے انسان اس زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھے۔

حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ سب سے افضل عمل کونسا ہے؟۔ آپ نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا کہ سب سے افضل عمل یہ ہے کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے۔ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اللہ کا ذکر کرتے رہو گے تو تمہارے نامہ اعمال میں اضافہ ہوتا رہے گا، نیکیوں کے ڈھیر لگتے رہیں گے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اجر وثواب کا خزانہ اکٹھا ہوتا رہے گا۔

اسلام میں داخل کرنے والی چیز

یہی زبان ہے جو انسان کو کفر سے نکال کر اسلام میں داخل کر دیتی ہے، ایک ستر برس کے کافر کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دیدی اور اس نے زبان سے "اشهد أن لا إله الا الله و أشهد ان محمداً رسول الله" کہہ دیا تو وہ ستر برس کا کافر جہنم کے ساتویں طبقے سے نکل کر ایک لمحے میں جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا۔ یہ کس کی بدولت ہوا؟ اس زبان کی بدولت ہوا، اللہ تعالیٰ نے اس زبان میں یہ تاثیر رکھی ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک شخص کی ساری عمر کفر میں، فسق وفجور میں اور بد اعمالیوں میں گزری، آخر میں اللہ تعالیٰ نے

ایمان کی توفیق دیدی اور اس نے کلمہ شہادت پڑھ لیا۔ کلمہ شہادت پڑھنے کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اب اگر کلمہ شہادت پڑھنے سے ذرا دیر پہلے انتقال ہو جاتا تو سیدھا جہنم میں جاتا، لیکن، جب اس کلمہ کے پڑھنے کے بعد انتقال ہوا تو سیدھا جنت میں چلا گیا۔ اس کلمہ نے اس کو جہنم کے ساتویں طبقے سے نکال کر جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام تک پہنچادیا۔

☆☆☆

زبان کا فائدہ اور نقصان دونوں عظیم ہیں

لہٰذا اگر چاہو تو اس زبان کے ذریعہ آخرت کا ذخیرہ جمع کر لو۔ تلاوت کے ذریعہ، ذکر و تسبیح کے ذریعہ، اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے ذریعہ، شکر کے ذریعہ اور کسی مسلمان بھائی کا دل خوش کرنے کے ذریعہ آخرت کے لئے ذخیرہ جمع کر لو۔ کیونکہ زبان سے کوئی ایسا کلمہ نکالنا جس سے دوسرے مسلمان بھائی کا دل خوش ہو جائے، یہ بھی صدقہ ہے۔ اور اگر زبان کو غلط استعمال کیا جائے تو اس کا نقصان بھی بہت ہے، جیسا کہ پہلے یہ حدیث سنائی کہ لوگوں کو جہنم میں اوندھے منہ گرانے والی چیز اس زبان کے کرتوت ہوں گے، کیونکہ جھوٹ یہ بول رہی ہے، غیبت یہ کر رہی ہے، دل آزاری یہ کر رہی ہے، فحش کلامی یہ کر رہی ہے، اور یہ سب کام انسان کو جہنم کے اندر اوندھے منہ گرانے والے ہیں۔ لہٰذا جب اس زبان کا فائدہ بھی عظیم ہے اور نقصان بھی عظیم ہے تو عافیت اور نجات کا راستہ یہی ہے کہ آدمی سوچ سمجھ کر زبان کو استعمال کرے۔ اسی لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب کوئی کلمہ بولو، تو بولنے سے پہلے سوچو کہ یہ کلمہ مجھے جنّت میں لے جا رہا ہے یا جہنّم میں لے جا رہا ہے۔

امام شافعیؒ کا جواب سے پہلے خاموش رہنا

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص آکر ان سے سوال کرتا تو بعض اوقات امام صاحب دیر تک خاموش رہتے، کوئی جواب نہ دیتے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! اتنی دیر ہو گئی، آپ کچھ بول ہی

نہیں رہے، کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں! جواب میں فرمایا:

حتّى أعرف أن الفضل في السكوت أو في الكلام

میں اس لئے خاموش ہوں کہ پہلے یہ دیکھ لوں کہ خاموش رہنا زیادہ بہتر ہے یا بولنا زیادہ بہتر ہے۔

لہٰذا پہلے تول رہے ہیں کہ اب جو کلمہ بولوں گا، یہ میرے لئے فائدہ مند ہوگا یا نقصان دہ ہوگا۔ پہلے تولو پھر بولو۔ جو کلمہ زبان سے نکالو، تول کر نکالو کہ یہ کلمہ کیسا ہے اور کتنا ہے؟ اور اس سے مجھے فائدہ پہنچے گا یا نقصان پہنچے گا؟

زبان کی حفاظت پر جنّت کی ضمانت

اسی لئے حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"من يضمن لي مابين لحييه و ما بين رجليه اضمن له الجنة"

جو شخص مجھے دو چیزوں کی ضمانت دیدے، میں اس کو جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔

کونسی دو چیزیں؟ ایک وہ چیز جو جبڑوں کے درمیان ہے یعنی زبان، اس کی ضمانت دیدے کہ وہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا۔ اور ایک وہ چیز جو ٹانگوں کے درمیان ہے یعنی شرمگاہ، کہ اس کو غلط استعمال نہیں کرے گا، میں اس کو جنّت کی ضمانت دیتا ہوں۔

لہٰذا یہ نہ ہو کہ یہ سرکاری مشین مفت میں مل گئی ہے تو اب صبح سے شام

تک قینچی کی طرح چل رہی ہے اور رکنے کا نام نہیں لیتی، جو منہ میں آرہا ہے بک رہے ہیں، کوئی سوچ و فکر نہیں۔ یہ حالت ٹھیک نہیں، بلکہ بولنے سے پہلے سوچو کہ جو بات میں منہ سے نکالنے والا ہوں وہ فائدہ پہنچائے گی یا نقصان پہنچائے گی؟ اس کے بعد زبان سے بات نکالو۔

فضول گوئی پر دو طالب علموں کا واقعہ

دھلی میں حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے۔ ان کی نازک مزاجی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ دو طالب علم ان سے بیعت ہونے کے لئے "بلخ" سے آئے۔ بلخ افغانستان کا ایک شہر ہے۔ وہاں انہوں نے یہ سنا کہ دھلی میں یہ بڑے بزرگ اور اللہ والے ہیں، تو دل میں خیال آیا کہ ان سے بیعت ہونا چاہئے۔ چنانچہ بلخ سے طویل سفر کر کے دھلی پہنچے، حضرت مرزا مظہر جان جاناں کی مسجد میں پہنچے، نماز کا وقت قریب تھا اس لئے حوض پر بیٹھ کر دونوں وضو کرنے لگے، وضو کرتے وقت آپس میں باتیں کرنے لگے کہ یہ حوض بڑا ہے یا ہمارے بلخ کی مسجد کا حوض بڑا ہے؟ ایک نے کہا کہ یہ حوض بڑا ہے، دوسرے نے کہا وہ بڑا ہے، اور آپس میں بحث ہونے لگی، حضرت مرزا صاحب نے وہاں سے گزرتے ہوئے ان کی گفتگو سن لی۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو حضرت مرزا صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ ہم بلخ سے آئے ہیں، حضرت والا نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ کہا کہ ہم آپ کے دست مبارک پر بیعت ہونے آئے ہیں۔ حضرت مرزا صاحبؒ نے فرمایا

کہ بیعت ہونے تو آپ آئے ہیں، لیکن کیا اس کا فیصلہ ہو گیا کہ یہ حوض بڑا ہے یا بلخ کا حوض بڑا ہے؟ اب دونوں خاموش، شرمندہ ہو رہے تھے کہ حضرت والا نے ہماری گفتگو سن لی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ ابھی فیصلہ نہیں ہوا تو ایسا کرو کہ بیعت تو تم بعد میں ہونا، پہلے بلخ جاؤ اور اس حوض کو ناپ کر آؤ، اور واپس آکر پھر اس حوض کو ناپو، اور پھر فیصلہ کرو کہ کونسا حوض بڑا ہے اور کونسا حوض چھوٹا ہے، اس کے بعد بیعت ہونا۔

کیونکہ تمہاری بحث اور گفتگو سے پتہ چلا کہ تمہاری گفتگو میں اوّل تو تحقیق نہیں، احتیاط نہیں، ایک نے ناپے تولے بغیر یہ دعویٰ کر دیا کہ یہ حوض بڑا ہے، اور دوسرے نے یہ دعویٰ کر دیا کہ وہ حوض بڑا ہے، اور آپس میں بحث شروع کر دی، اس سے معلوم ہوا کہ طبیعت میں احتیاط نہیں۔ دوسرے یہ کہ بے کار اور بے فائدہ گفتگو کی عادت پڑی ہوئی ہے، اگر یہ پتہ چل جاتا کہ یہ بڑا ہے یا وہ بڑا ہے تو اس سے دنیا یا آخرت کا کیا فائدہ حاصل ہوتا؟ لہٰذا واپس بلخ جاؤ اور وہ حوض ناپ کر آؤ۔ اس کے بغیر بیعت نہیں کروں گا۔

علاج کا فائدہ

پہلے زمانے میں ایسے ہی علاج ہوا کرتے تھے۔ اب یہ علاج تو بڑا سخت اور کڑوا ہوا، لیکن ساری زندگی کیلئے یہ علاج کافی ہو گیا ہو گا، پھر اس کے بعد ساری عمر بلا تحقیق اور بے فائدہ بات زبان سے نہیں نکلی ہو گی۔ بہر حال۔ اس طرح کے علاج ہوتے تھے، یہ نہیں کہ ذکر و تسبیحات بتا دیں اور اب بیٹھے ہوئے تسبیح گھونٹ

رہے ہیں، بس وظیفہ گھونٹنے سے ہی کامل بن گئے، بلکہ اس طرح رگڑے دیے جاتے تھے، تب جاکر اصلاح ہوتی تھی۔

علاج سخت ہونے پر اشکال اور جواب

یہ واقعہ سنا کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ان طلبہ نے زیادہ سے زیادہ یہ کیا کہ ایک غلط کام کیا، اگر غلط کام نہ کر رہے ہوتے تو پھر آنے کی ضرورت ہی کیا تھی، یہ طلبہ اسی لئے تو آئے تھے کہ اپنی اصلاح کرائیں، اگر پہلے سے کامل ہوتے اور زبان قابو میں ہوتی، خیالات قابو میں ہوتے، تو شیخ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟ لہٰذا اس غلطی پر شیخ نے بیعت کرنے سے کیوں انکار کر دیا؟ پہلے بیعت کر لیتے اور پھر علاج کرتے۔

پھر خود ہی حضرتؒ نے اس اشکال کا جواب دیا کہ یہاں دو باتیں ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ اس انکار سے یہ بتلانا منظور ہے کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ طالب، سالک اور مرید کو پہلے سے ان کا دھیان اور ان کی فکر ہونی چاہیئے۔ شیخ سے فائدہ اسی وقت ہوتا ہے کہ جب مرید نے پہلے سے بڑے بڑے امور کا دھیان اور خیال کیا ہوا ہے، البتہ جو دقائق اور باریک باتیں ہیں، ان کی اصلاح شیخ سے کرانی ہے، اس وجہ سے شیخ بیعت کرنے سے انکار کر دیتا ہے کہ تمہیں ابھی بیعت نہیں کرنا ہے۔

ہر شخص کا علاج علیحدہ ہوتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی شیخ کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ

اس شخص کے ساتھ اس وقت کیا معاملہ کرنا ہے، ہر آدمی کا علاج الگ ہوتا ہے، کسی کا علاج تھپڑ مارنے سے ہو جاتا ہے، کسی کا علاج ڈانٹ دینے سے ہو جاتا ہے، کسی کا علاج پیار کرنے سے ہوتا ہے، کسی کا علاج چمکارنے سے ہو جاتا ہے، اور کسی کا علاج صرف ایک نظر دیکھ لینے سے ہو جاتا ہے۔ اب اللہ جل جلالہ شیخ کے دل پر یہ وارد فرماتے ہیں کہ اس شخص کے لئے اس وقت کیا چیز فائدہ مند ہے۔ دوسرا آدمی دیکھ کر یہ محسوس کرتا ہے کہ شیخ صاحب نے کچھ زیادتی کر دی، لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح اسی میں رکھی ہے۔

میرے والد ماجدؒ کا طرز عمل

ہم نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے طرز عمل میں یہ چیز بارہا مشاہدہ کی، حالانکہ وہ انتہائی نرم خو آدمی تھے، غصہ تو نہ ہونے کے برابر تھا، ہر ایک کے ساتھ نرمی اور تحمل سے پیش آتے تھے، تواضع اور انکساری کے ساتھ ملتے، لیکن کبھی کبھار ایسا ہوتا کہ اچانک کسی شخص پر چھوٹی سی بات پر شدید غصہ ہو جاتے، اب ظاہر بین کو یہ دیکھ کر شبہ ہوتا کہ انہوں نے اس شخص پر زیادتی کی ہے، مگر اللہ تعالیٰ نیک بندوں کے قلب پر وارد فرماتے ہیں کہ کس شخص کے ساتھ کس وقت کیا معاملہ کرنا ہے۔

ایک صاحب کو ڈانٹنے کا واقعہ

چنانچہ ان کا ایک واقعہ یاد آیا کہ ایک مرتبہ ایک بڑے صاحبِ حیثیت، پڑھے لکھے مشہور آدمی، والد صاحب سے ملاقات کے لئے آگئے اور بات کرنی

شروع کی، ابھی دو تین جملے ہی کہے تھے کہ والد صاحبؒ نے ان کو شدید ڈانٹنا شروع کر دیا، میں بھی حیران ہو گیا کہ آج تک کبھی کسی کو اس طرح نہیں ڈانٹا، یہاں تک کہ ان سے یہ کہہ دیا کہ یہاں سے نکل جاؤ۔ چنانچہ ان کو دفتر سے نکال دیا۔ آج تک میں نے ایسا منظر نہیں دیکھا تھا، میں نے سوچا کہ یا اللہ یہ شخص تو کام سے گیا، اس لئے کہ نو تعلیم یافتہ آدمی ہے، کوٹ پتلون پہنے ہوئے ہے، ڈاڑھی بھی برائے نام ہے، اور حضرت والد صاحبؒ نے اس کو ڈانٹ دیا، اب ہمیشہ کے لئے یہ شخص متنفر ہو کر جائے گا۔ اسی آدمی نے بعد میں خود اپنی زبان سے مجھے کہا کہ مفتی صاحبؒ کی اس دن کی ڈانٹ نے میری زندگی کی کایا پلٹ دی اور میرے اوپر اس ڈانٹ نے ایسا اثر کیا کہ میرا مرکز توجہ ہی بدل گیا۔

بہر حال، اللہ تعالیٰ ہی اپنے نیک بندوں کے دلوں پر یہ القاء فرماتے ہیں کہ کس کے ساتھ کس وقت کیا معاملہ کرنا چاہیئے۔ کسی اللہ والے کے طرزِ عمل پر شبہ مت کرو کہ کسی شخص کو ڈانٹ رہے ہیں، کسی کو پھٹکار رہے ہیں، اور کسی سے محبت سے پیش آ رہے ہیں۔ کیونکہ معطی حقیقی اور مبدأ فیاض تو اللہ تعالیٰ ہیں، شیخ تو ایک واسطہ ہوتا ہے، وہی شیخ کے دل میں ڈالتے ہیں کہ اس کی اصلاح کا کیا طریقہ مناسب ہو گا، ہر ایک کو ایک ہی نسخہ نہیں پلایا جاتا۔ اس لئے کبھی ان اللہ والوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیئے۔

لہٰذا حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے ان دو طالب علموں کو یہ سزا دی کہ واپس بلخ جاؤ اور وہاں کا حوض ناپ کر آؤ۔ اللہ تعالیٰ نے ہی ان کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ ان کا علاج یہی ہے۔ ایک مرتبہ جب چوٹ لگ جائے

گی تو ساری عمر کے لئے کار آمد ہو جائے گی، چنانچہ کار آمد ہو گئی۔ اور اس سے حضرت مرزا صاحب نے ان کو یہ سبق دیا کہ تم زبان کو احتیاط سے استعمال نہیں کرتے اور احتیاط ضروری ہے۔

پہلے سوچو پھر بولو

اور اس احتیاط کرنے کا طریقہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتا دیا کہ پہلے سوچو کہ جو بات میں کہنا چاہتا ہوں یہ صحیح ہے یا نہیں؟ اور اس میں حدود سے تجاوز تو نہیں ہے؟ اس میں جھوٹ تو شامل نہیں ہے؟ اس میں مبالغہ تو نہیں ہے؟ بے احتیاطی تو نہیں ہے؟

آج بہت سے فسادات اور جھگڑے صرف اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ ایک شخص نے بے سوچے سمجھے اِدھر کی بات اُدھر کہہ دی، تحقیق کی نہیں اور صحیح طور پر یاد رکھا نہیں، بس اس ایک بات کی وجہ سے خاندان میں فسادات کھڑے ہو گئے۔ لہٰذا پہلے سوچو کہ کیا بات کہی گئی ہے؟ کتنی مقدار میں کہی گئی ہے؟ اگر آگے نقل کرنی ہے تو بس اتنی ہی نقل کرو، اپنی طرف سے اس میں اضافہ نہ کرو۔

حضرت فرماتے ہیں کہ چونکہ زبان کو تو ہر وقت چلنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، وہ رکنے کا تو نام نہیں لیتی، تو اب کس وقت کس طرح سوچے؟ حضرت فرماتے ہیں کہ ہر کام مشق کرنے سے ہوتا ہے، لہٰذا مشق کرو، اور شروع میں تو سوچنے کا خیال ہی نہیں آئے گا، لیکن سوچنے کا تھوڑا سا اہتمام کرو تو رفتہ رفتہ

عادت پڑجائے گی۔ اگر شروع میں سوچنا بھول جاؤ، تو جب یاد آئے اس وقت سوچو، پھر یاد آئے، پھر سوچو، اس طرح کرتے کرتے سوچنے کی عادت پڑ جائے گی، پھر بے تکلف سوچنا آئے گا، اور سوچنے کے لئے کسی خاص اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ پھر جو بات نکالو گے بالکل درست نکلے گی۔ غیبت، جھوٹ اور دل آزاری سب سے بچنے کا واحد راستہ یہی ہے۔

غیبت کو جائز کرنے کیلئے نفس کی تاویل

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ:

"میرا نفس مجھے یہ تاویل سکھاتا ہے کہ تیری بھی تو لوگ غیبت کرتے ہیں، قیامت میں جب پکڑ ہوگی تو اپنے مغتابین (غیبت کرنے والوں) سے جو اجر ملے گا وہ اجر جن کی تو نے غیبت کی، ان کو دیدیا جائے گا۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جو آدمی کسی کی غیبت کرے تو اس کا اجر اس کو دیدیا جاتا ہے، ایک حدیث شریف ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ: جس کی غیبت کی گئی۔ اس لئے میرے دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ میری بھی لوگ غیبت کرتے ہیں اور میں بھی کرتا ہوں، جو لوگ میری غیبت کرتے ہیں ان کا اجر مجھے ملتا ہے، میں دوسروں کی غیبت کرتا ہوں تو میرا اجر ان کو مل جاتا ہے، لہٰذا معاملہ برابر سرابر ہوگیا، اس لئے زیادہ پرواہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

اس تاویل کا جواب

جواب میں حضرت والاؒ نے فرمایا:

اوّل تو یہ کسی دلیل سے ثابت نہیں کہ وہ اجر جو دوسروں سے ملا ہوا ہے اس کے تدارک کے لئے کافی ہے، ممکن ہے کہ یہ دوسروں سے ملا ہوا اجر تمہارے ہی پاس رہے، اور خاص تمہارے اعمال کا اجر اہل حقوق کو ملے اور نجات کے لئے دوسروں کا اجر کافی نہ ہو۔ دوسرے اس سے قطع نظر کر کے مساوات کی کوئی دلیل نہیں، ممکن ہے کہ تم کو کم ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے تو تدارک کے لئے کیسے کافی ہو جائے گا؟ (ایضاً)

یعنی تمہارے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ تمہیں جو اجر مغتابین سے حاصل ہوا ہے، وہی دوسروں کے پاس جائے گا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تمہاری نمازیں، تمہارے روزے، تمہاری تلاوت، تمہارا ذکر وغیرہ وہ سب تمہاری غیبت کے بدولت دوسروں کے پاس چلے جائیں اور دوسروں کا اجر تمہارے پاس آجائے۔ دوسرے تمہارے پاس مساوات کی بھی کوئی دلیل نہیں کہ جتنا اجر تمہیں ملا ہے، اتنا ہی اجر دوسروں کے پاس جائے گا، ممکن ہے کہ تمہیں کم اجر ملے اور تم سے زیادہ لے لیا جائے۔

یہ سب شیطانی تاویلات ہیں

یہ سب شیطان کی تاویلیں ہیں، جو انسان کو غلط کاموں میں مبتلا کرنے کے لئے دل میں ڈالتا ہے کہ ایسا کرلو، اور اس طرح معاملہ سیدھا ہو جائے گا۔

اللہ بچائے، جب آخرت میں اجر و ثواب کا معاملہ ہوگا اور اپنا اجر و ثواب دوسروں کے پاس جائے گا تو اس وقت پتہ چلے گا کہ یہ کتنی زبردست دھوکے کی تاویل تھی، اچھے خاصے نیک اعمال کئے، نمازیں پڑھیں، روزے اور تلاوت کے ساتھ رمضان المبارک گزارا، اعتکاف کرنے کی توفیق ہوئی، رات بھر جاگ جاگ کر عبادات اور نوافل ادا کرتے رہے، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ سارے اعمال دوسروں کے قبضے میں جارہے ہیں اور جو کچھ کیا کرایا تھا وہ سب دوسروں کے پاس چلا گیا۔ اس وقت جو حسرت اور تکلیف ہوگی، اس کا کوئی علاج نہیں۔ لہٰذا یہ سوچنا کہ آخرت میں حساب برابر ہو جائے گا، یہ خیال اور سوچ درست نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے، آمین۔

غیبت کا علاج ہمّت اور استحضار ہے

آگے حضرت والاؒ نے فرمایا:

> ”غیبت“ ایک اختیاری امر ہے، اس کا طریق علاج ہمّت و استحضار ہے اور معینِ طریق یہ ہے کہ جب ایک بار ایسا ہو جائے ایک وقت فاقہ کرے۔
>
> (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

سب سے پہلے یہ فرمایا کہ غیبت اپنے اختیار سے ہوتی ہے، کبھی بے اختیار نہیں ہوتی، اگر غیبت بے اختیار ہوتی تو حرام نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے کوئی ایسا کام حرام نہیں کیا جس سے بچنا انسان کے اختیار میں نہ ہو۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا

لہٰذا غیبت سے بچنا اختیار میں تو ہے، البتہ اس سے بچنے کے لئے ہمت اور استحضار کی ضرورت ہے۔ یہ ہمّت کرلے کہ میں یہ گناہ نہیں کروں گا، زبان سے غلط بات نہیں نکالوں گا۔ اور اس بات کا استحضار کرے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے، کتنا بڑا گناہ ہے اور اس کے نتیجے میں اپنے اچھے اعمال دوسروں کے قبضے میں چلے جاتے ہیں۔ ان چیزوں کا استحضار کرے۔

غیبت پر اپنے نفس کو سزا دینا

آگے فرمایا کہ اس سے بچنے میں یہ چیز معاون ہو جاتی ہے کہ آدمی یہ طے کرلے کہ اگر آئندہ غیبت ہوگی تو اپنے آپ کو یہ سزا دوں گا۔ حضرتؒ فرماتے تھے کہ وہ سزا نہ تو اتنی معمولی ہو کہ آدمی کو اس کی پرواہ ہی نہ ہو، جیسے میرے والد صاحبؒ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جب "علیگڑھ کالج" قائم ہوا تو اس وقت یہ قانون تھا کہ تمام طلبہ کو نماز پڑھنا لازم ہے، اور نماز چھوڑنے پر جرمانہ مقرر تھا کہ جو طالب علم نماز چھوڑے فی نماز دو آنے ادا کرے، اب ہوتا یہ تھا کہ بہت سے طالب علم ایسے بھی تھے جو مہینہ بھر کا جرمانہ اکٹھا شروع میں جمع کرا دیا کرتے تھے۔ چونکہ جرمانہ ایسا تھا کہ اس کو ادا کرنے میں کوئی خاص مشقت نہیں تھی اس لئے اس

جرمانہ لگانے سے کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ جرمانہ ایسا ہونا چاہئے جس سے کچھ مشقت ہو اور وہ جرمانہ اتنا بھی سخت نہ ہو کہ آدمی اس کو برداشت نہ کر پائے اور پھر آدمی اصل عمل سے بھی جائے اور جرمانہ سے بھی جائے، لہٰذا جرمانہ درمیانہ درجے کا ہونا چاہئے۔

غیبت کرنے پر نفس کو فاقہ کرانا

لہٰذا کسی کے حق میں مالی جرمانہ فائدہ مند ہوتا ہے کہ جب کبھی مجھ سے یہ فعل سرزد ہوگا تو میں اتنے پیسے صدقہ کروں گا۔ یہ ان لوگوں کے لئے ہے جن پر صدقہ کرنا بڑا شاق ہوتا ہے، کیونکہ اس سے بھی انسان کے نفس کو سزا ملتی ہے۔ اور جن لوگوں کو پیسوں کی پرواہ نہیں ہوتی، انہیں چاہئے کہ وہ اپنے اوپر ایسا جرمانہ عائد کریں جس سے ان پر تھوڑی مشقت ہو۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ جرمانہ بیان فرمایا کہ آدمی یہ طے کرلے کہ اگر مجھ سے غیبت ہوگی تو ایک وقت کا فاقہ کروں گا، کھانا نہیں کھاؤں گا، بلکہ بھوک ہڑتال کروں گا۔ آج کل لوگوں نے بھوک ہڑتال کا الٹا طریقہ نکالا ہے کہ جب دوسرے پر دباؤ ڈالنا مقصود ہوتا ہے تو لوگ بھوک ہڑتال کرتے ہیں، اگر دوسرا شخص دباؤ قبول نہ کرے تو بھوک کی وجہ سے مرجائے، یہ طریقہ تو درست نہیں۔ حضرت والا نے جو طریقہ بیان فرمایا ہے وہ انسان کے اپنے اوپر دباؤ ڈالنے کے لئے بیان فرمایا کہ میں اس لئے فاقہ کر رہا ہوں تاکہ مجھ سے آئندہ غیبت سرزد نہ ہو، اور جب کبھی غیبت ہوگی تو اپنے نفس کو فاقے کی سزا دوں گا۔ اور یہ فاقہ ایسی چیز ہے کہ اگر

انسان اس پر عمل کرے تو چند دن میں علاج ہو جائے گا اور غیبت چھوٹ جائے گی۔

دوسروں کے عیوب ظاہر کرنے کا حکم

ایک صاحب نے حضرت والا سے سوال کیا کہ:

"بعض لوگ جو گناہ کبیرہ میں مبتلا ہیں، ان کے عیوب اور گناہ کو ظاہر کرنا غیبت ہے یا نہیں؟ نفس اس تاویل پر ہمیشہ آمادہ رہتا ہے کہ ایسوں کے عیوب اگر لوگوں پر ظاہر نہ کئے جائیں تو لوگوں کو دھوکا ہو گا اور مسلمانوں کو دھوکہ سے بچانا ضروری ہے"۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

یعنی دوسروں کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ فلاں فلاں عیب میں مبتلا ہیں، اس عیب کی خبر لوگوں کو ہونی چاہئے تاکہ وہ اس سے دھوکہ نہ کھائیں، تو آیا ایسے آدمی کی غیبت کریں یا نہ کریں؟ جن صاحب نے یہ سوال کیا تھا وہ ابھی نئے نئے اس طریق میں داخل ہوئے تھے اور اپنی اصلاح کے لئے حاضر ہوئے تھے اور ابتداء ہی تھی کہ انہوں نے یہ سوال کر لیا۔ چنانچہ حضرت نے جواب تحریر فرمایا کہ:

مُبتدی جائز غیبت بھی نہ کرے

"یہ سوال منتہی کے قابل ہے، مبتدی کو جائز غیبت بھی نہ کرنی چاہئے۔" (ایضاً)

یعنی جو مبتدی ابھی اپنی اصلاح کرانے کے لئے چلا ہے اور ابھی اس نے اصلاح کے لئے قدم بڑھایا ہے، ابھی تو اس کے نفس کی تہذیب ہونی ہے، اس کو چاہئے کہ وہ جائز غیبت بھی نہ کرے۔ یہ وہی بات ہے جس کو حضرت مولانا یعقوب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال سے سمجھایا تھا کہ جیسے ایک کاغذ کو ایک طرف موڑ دیا جائے، پھر اس کو اگر سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو الٹی طرف موڑو، جب الٹی طرف موڑو گے تو یہ سیدھا ہو جائے گا۔ اسی طرح انسان کا نفس بھی الٹی طرف مڑا ہوا ہے، اس کو ناجائز غیبت کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس عادت کو چھڑانے کے لئے ضروری ہے کہ وہ شروع میں جائز غیبت بھی چھوڑے، پھر یہ نفس سیدھا ہو جائے گا، اور آئندہ صرف جائز غیبت ہی سرزد ہوگی، ناجائز غیبت سرزد نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

آٹھویں مجلس

کیفیاتِ انفعالیہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

آٹھویں مجلس

الحمد لله رب العالمين ـ والصلاة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله واصحابه اجمعين ـ
أمّا بعد!

انفعالی کیفیت کے تقاضے پر عمل

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ:

”اگر کوئی شخص میری بے جا غیبت کرتا ہے تو بشرط اطلاع اس شخص سے دل میں کدورت بلکہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۰)

یعنی جب مجھے پتہ چل جائے کہ فلاں شخص نے پیٹھ پیچھے میری برائی کی تھی تو اس شخص سے دل میں تکدّر پیدا ہو جاتا ہے بلکہ حرارت پیدا ہو جاتی ہے، یعنی طبیعت میں اس کے خلاف غصّہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ ان صاحب کا حضرت والا کو یہ حال لکھنے کا منشا یہ تھا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو ٹھیک، اور اگر یہ خطرناک اور

قابلِ اصلاح بات ہے تو پھر اس کا علاج ہو جائے۔

جواب میں حضرت والاؒ نے فرمایا:-

"یہ دونوں کیفیتیں اِنفعال ہیں، اور انفعالات غیر اختیاری ہوتے ہیں، اور غیر اختیاری پر ذم و اثم نہیں (یعنی مذمت اور گناہ نہیں) البتہ ان کے مقتضیات کہ اس کی غیبت کرنے لگے اور اس کو ایذاء پہنچانے لگے و مثل ذالک، یہ افعال ہیں، اور افعال اختیاری ہوتے ہیں، اور ان میں سے بعض پر ذم و اثم بھی ہوتا ہے، پس جب یہ کیفیات انفعالیہ حادث ہوں (یعنی پیدا ہوں) ان کے مقتضیات فعلیہ پر عمل نہ کیا جائے اور ان کے ازالے کی دعا کی جائے، یا اللہ! میرے یہ خیالات میرے دل سے نکل جائیں تاکہ مفضی الی الافعال نہ ہو جائیں، اور اپنے عیوب و ذنوب کا استحضار کیا جائے تاکہ اس کا جزم ہو جائے کہ میں تو اس شخص کی بدگوئی سے بھی زیادہ کا مستحق ہوں، اور افعال پر عقوبت کا بھی استحضار کیا جائے تاکہ داعیہ افعال کا مضمحل ہو جائے، اور ایک ہفتہ کے بعد پھر اطلاع دی جائے۔" (ایضاً)

بُرائی کا خیال دل میں آنا

اس ملفوظ میں حضرت والا نے ایک اصول بھی بیان فرمادیا اور اس پر عمل

کرنے کا طریقہ بھی بیان فرما دیا، اور مختصر لفظوں میں معاملے کی حقیقت پوری طرح واضح فرما دی۔ یہ بڑی کام کی بات ہے جو حضرت والاؒ نے یہاں بیان فرمائی ہے۔

وہ یہ کہ کسی برائی کا خیال خود بخود دل میں آجانا یہ ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، انسان کے اختیار کو اس میں دخل نہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر گرفت بھی نہیں ہے، گناہ بھی نہیں، یہاں تک کہ اگر شدید گناہ بلکہ (العیاذ باللہ) کفر و شرک کا خیال بھی دل میں آجائے، لیکن یہ خیال خود بخود آئے، تو محض اس خیال کا آجانا نہ تو موجب ملامت ہے یعنی وہ آدمی اس پر ملامت کا مستحق نہیں، نہ وہ سزا کا مستحق ہے، اور نہ ہی اس کا فعل گناہ ہے، کیونکہ غیر اختیاری طور پر یہ خیال اس کے دل میں آیا ہے۔

کیفیت انفعالیہ گناہ نہیں

اسی طرح کسی شخص کے کوئی عمل کرنے کے نتیجے میں دل کے اندر اگر کوئی تغیر پیدا ہوا جس کو "انفعال" کہا جاتا ہے۔ "انفعال" کا مطلب ہے کسی دوسرے کا اثر قبول کرنے کے نتیجے میں دل میں ایک حالت کا پیدا ہونا۔ مثلاً دوسرے نے گالی دی، اس کے نتیجے میں طبیعت کے اندر ایک جوش پیدا ہوا، اور غصہ آیا کہ اس نے مجھے گالی دی اور میرے خاندان کو برا کہا، اس غصہ اور جوش کے پیدا ہونے کو "انفعال" کہا جاتا ہے۔ یہ "انفعال" غیر اختیاری ہے، بلکہ طبعی ہے اور انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لئے گناہ بھی نہیں۔

اس کے مقتضیات پر عمل گناہ ہے

بعض اللہ والے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے نفس کو اتنا کچل چکے ہوتے ہیں کہ ان کو غصہ آتا ہی نہیں، دوسرے شخص نے برا بھلا کہہ دیا، لیکن اس سے طبیعت میں کوئی تغیر اور تأثر نہیں ہوا۔ یہ خاص بندے ہوتے ہیں، ریاضتوں اور مجاہدوں کے نتیجے میں ان کا نفس کچلا جاچکا ہوتا ہے۔

لیکن یہاں عام انسان کی بات ہو رہی ہے۔ جب ایک عام انسان کو برا بھلا کہا جائے گا، یا گالی دی جائے گی، تو اس کے نتیجے میں اس کے اندر تأثر پیدا ہوگا، یہ تأثر کوئی گناہ نہیں، اور نہ ہی اس پر سزا ہے، نہ اس پر ملامت ہے، نہ اس پر مؤاخذہ ہے۔ لیکن جو تأثر پیدا ہوا، اگر تأثر کا مظاہرہ کر دیا، مثلاً کسی نے گالی دیتے ہوئے کہا کہ تو خبیث ہے، آپ نے جواب دیا کہ "تو خبیث تیرا باپ خبیث" اس جواب دینے میں غصہ پر عمل کرتے ہوئے حد سے تجاوز کر گئے، تو صرف غصّہ آنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا، کدورت پیدا ہونے پر کوئی مؤاخذہ نہیں تھا، بلکہ اس کدورت اور غصے کے نتیجے میں اگر برابر کا بدلہ لے لیتے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا، انشاء اللہ، لیکن جب بدلہ لینے میں ایک انچ آگے بڑھ گئے، تو بس اب پکڑ ہوگئی۔ کیونکہ جب آدمی اپنے غصے کے تقاضے پر عمل کرتا ہے تو اکثر و بیشتر حدود پر نہیں رہتا، بلکہ حدود سے متجاوز ہو جاتا ہے، یہ حد سے تجاوز کرنا بڑا خطرناک ہے، کیونکہ یہ اختیاری ہے اور اس پر آخرت میں پکڑ ہو جائے گی۔

معاف کرنے میں عافیت ہے

مثلاً اگر کسی نے آپ کو ایک مکّہ مار دیا، اب بدلہ لیتے ہوئے تول کر مکّہ مارنا کہ جتنی زور سے اس نے مکّہ مارا تھا، اتنا ہی زور کا مکّہ میں بھی ماروں، اس میں زیادتی نہ ہو جائے، اگر ترازو لے کر مارے گا تبھی ایسا کر سکے گا، ورنہ انسان کے بس میں نہیں کہ برابری کر سکے۔ اسی لئے اللہ کے نیک بندے کو جب کوئی مارتا ہے تو وہ بدلہ نہیں لیتے، اور وہ معاف کرنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں، کیونکہ اگر ذرا سا حد سے تجاوز کر گئے تو پکڑے جائیں گے۔

بزرگوں کے مختلف رنگ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "ارواحِ ثلاثہ" میں ایک قصّہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ حضرت! یہ جو اللہ والے ہوتے ہیں ان کے الوان (رنگ) مختلف ہوتے ہیں، کسی کا کوئی رنگ ہے، کسی کا کوئی رنگ ہے، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بزرگوں کے کیا کیا رنگ ہوتے ہیں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ ارے بھائی: چھوڑو، کس چکر میں پڑ گئے، مگر وہ صاحب ان بزرگ کے پیچھے ہی پڑ گئے، ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ فلاں گاؤں کی مسجد میں جاؤ، اس مسجد میں تمہیں تین بزرگ عبادت کرتے ہوئے نظر آئیں گے، تم پیچھے سے جا کر تینوں کو ایک ایک مکّہ مار دینا اور پھر مجھے آ کر بتانا کہ کیا ہوا۔ چنانچہ وہ صاحب اس گاؤں کی مسجد میں پہنچے تو دیکھا کہ واقعۃً تین بزرگ بیٹھے ہوئے ہیں، انہوں نے جا کر پہلے ایک کو مکّہ مارا، پھر دوسرے کو مارا، پھر تیسرے کو مارا۔ اور جب واپس

آئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ ہاں بھائی، کیا معاملہ پیش آیا؟

ان صاحب نے جواب دیا کہ واقعۃً بڑا عجیب معاملہ ہوا، وہ یہ کہ جب میں نے پہلے بزرگ کے مُکا مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا، بلکہ اپنے ذکر واذکار میں لگے رہے۔ جب دوسرے کو مارا تو انہوں نے مڑ کر ایک مکا مجھے بھی مار دیا۔ جب تیسرے کو مُکا مارا تو وہ مُڑ کر میرا ہاتھ دبانے لگے کہ تمہارے ہاتھ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟ پھر ان بزرگ نے فرمایا کہ تم جو یہ کہہ رہے تھے کہ مجھے اولیاء اللہ کے رنگ دکھائیں تو یہ مختلف رنگ تھے جو تم نے دیکھے۔

منزل کھوٹی ہوگی

پہلے بزرگ کا یہ رنگ تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد میں لگے ہوئے ہیں، اگر اس دوران ایک شخص آکر مکا مار گیا تو کونسی قیامت آگئی؟ اب اگر میں منہ موڑ کر دیکھوں کہ کون مارنے والا ہے اور کیوں مارا؟ اور پھر اس سے بدلہ لینے کی فکر کروں تو اس سے میری یہ منزل کھوٹی ہوگی، اور جس کام میں میں لگا ہوا ہوں اس میں خلل واقع ہوگا، اس لئے انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون مار رہا ہے۔ یہ ایک رنگ تھا۔

شفقت کی بنیاد پر بدلہ

اور جن بزرگ نے پلٹ کر مکا مارا اور بدلہ لے لیا، تو یہ بتاؤ کہ انہوں نے جو مکہ مارا وہ اتنا ہی زور کا مکہ مارا جتنا زور کا تم نے مارا تھا یا زیادہ زور سے مارا؟ ان صاحب نے جواب دیا کہ اتنا ہی زور کا مارا تھا۔ فرمایا کہ یہ دوسرا رنگ ہے، چونکہ

اللہ تعالیٰ نے بدلہ لینے کی اجازت دی ہے، اسلئے بدلہ لے لیا۔ اور بعض اوقات بدلہ لینا بھی اللہ والوں کی طرف سے شفقت کی وجہ سے ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اوقات کسی اللہ والے کو ستایا جائے اور اس ستانے کے نتیجے میں وہ صبر کرے، تو اس صبر کا نتیجہ بعض اوقات اس تکلیف دینے والے کے حق میں بہت بُرا ہوتا ہے۔ (العیاذ باللہ) کیونکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:-

من عادیٰ لی ولیاً فقد آذنته بالحرب

یعنی جو شخص میرے کسی ولی کو ستائے تو اس کو میری طرف سے اعلان جنگ ہے۔ بہر حال، اس لئے ان بزرگ نے بدلہ لے لیا۔ یہ دوسرا رنگ تھا۔

تیسرا رنگ

تیسرے بزرگ کا یہ رنگ تھا کہ بھائی! ہمیں کیا چوٹ لگی، جس نے ہمیں مارا ہے، کہیں اس کو ہماری کمر سے تکلیف نہ پہنچ گئی ہو، اس لئے اس مارنے والے کا ہاتھ سہلانے لگے۔ بہر حال، بزرگوں کے یہ مختلف الوان تھے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کسی دوسرے کے فعل پر تمہیں جو غصہ آیا، اور تمہارے دل میں کدورت پیدا ہوئی، یہ کوئی گناہ نہیں۔ لیکن اگر اس غصے کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے حد سے تجاوز ہو گیا تو یہ قابل مؤاخذہ ہے، اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ بدلہ ہی نہ لو، بلکہ معاف کر دو۔ اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ تمہیں اجر بھی ملے گا اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنے کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔

اس خیال کو جمنے مت دو

لہٰذا دل میں جو انفعال کی کیفیت اور اثر پیدا ہوا اس پر کچھ مؤاخذہ تو نہیں ہے، لیکن اگر یہ تأثر زیادہ دیر تک دل میں بیٹھ جائے اور جم جائے، تو بالآخر یہ تأثر انسان کو کبھی نہ کبھی گناہ کے اندر مبتلا کر ہی دیتا ہے۔ بالکل یہی معاملہ "حسد" کا ہے۔ مثلاً ایک آدمی کو آپ نے بڑھتا چڑھتا دیکھا، اب آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ تو مجھ سے آگے بڑھ گیا، میں آگے بڑھتا تو اچھا تھا، اس کے پاس پیسہ زیادہ آ گیا، اس کا مکان میرے مکان سے زیادہ بڑا، اس کی گاڑی زیادہ خوبصورت، اس کی شہرت مجھ سے زیادہ ہے، اس کی تعریف کرنے والے مجھ سے زیادہ، اگر اس کی جگہ میں ہوتا تو زیادہ مناسب تھا۔ اور اس کے ساتھ غیر اختیاری طور پر دل میں یہ خیال بھی آ گیا کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے۔ اس حد تک بھی یہ عمل حرام نہیں۔

ورنہ یہ خیال گناہ میں مبتلا کر دیگا

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جب یہ خیال دل میں بیٹھ جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں کوئی نہ کوئی ایسا فعل سرزد ہو جاتا ہے جو اس شخص کی بدخواہی پر مشتمل ہوتا ہے جس سے وہ حسد کرتا ہے، مثلاً اس کے لئے بددعا کر دی کہ یا اللہ! اس کی یہ دولت چھن جائے، یا کوئی ایسی تدبیر کر لی جس کے نتیجے میں اس کو نقصان پہنچے، یا لوگوں کے سامنے اس کا ذکر اس انداز سے کر دیا جس سے لوگوں کے دلوں میں اس کی بے عزتی ہو، یا کوئی بھی ایسا کام کر لیا جس سے اپنے دل کے اس جذبے کو تسکین

دینا مقصود ہو، تو یہ سب کام بالاتفاق حرام ہیں۔ لہٰذا صرف خیال کا آجانا بذات خود حرام نہیں تھا، لیکن جب وہ خیال دل میں جم گیا اور اس خیال کے مطابق عمل کرلیا تو اب یہ حرام ہو گیا۔

غیر اختیاری خیال کا علاج

لہٰذا یہ غیر اختیاری خیال جو دل میں آیا ہے، چاہے وہ خیال ''حسد'' کا ہو یا ''تکدر'' کا ہو یا ''غصہ'' کا ہو، اس کا بھی علاج کرنا ضروری ہے، کیونکہ اگر تم نے اس غیر اختیاری خیال کا علاج نہیں کیا تو یہ تمہیں مار دے گا، گرادے گا۔ اب اس کا علاج کیا ہے؟ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے اس خیال کو دل سے برا سمجھو کہ جو خیال میرے دل میں آرہا ہے یہ بہت غلط خیال ہے، میرے دل میں یہ خیال نہیں آنا چاہئے۔ مثلاً میرے دل میں یہ جو خیال آرہا ہے کہ فلاں شخص سے یہ نعمت چھن جائے اور مجھے مل جائے، یہ برا خیال ہے۔ یا مثلاً میرے دل میں فلاں کی طرف سے تکدر پیدا ہو رہا ہے کہ فلاں شخص بہت بُرا آدمی ہے، یہ اچھی بات نہیں۔ اور اس وقت اپنے اندر جو عیوب ہیں، ان کا استحضار کرو کہ میرے اندر کیا عیب ہیں؟ اس نے تو غیبت کرتے ہوئے میرے بارے میں ایک کلمہ کہا تھا، حقیقت میں تو میں اس سے زیادہ کا مستحق تھا۔

پہلا علاج - دعا کرنا

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! میرے دل میں جو خیال پیدا ہو رہا ہے، کہیں میرا یہ خیال کسی ایسے فعل پر آمادہ نہ کردے جو حرام ہو، اور اس

کے نتیجے میں میں ہلاک ہو جاؤں۔ یا اللہ! میرے دل سے اس خیال کو نکال دیجئے۔ اس خیال کا اس طریقے سے علاج کرنا ضروری ہے اور اگر تم اس خیال کا اس طرح سے علاج نہیں کرو گے، بلکہ اس خیال کو اسی طرح چھوڑ دو گے تو وہ خیال دل میں جمتا چلا جائے گا اور کسی نہ کسی وقت وہ تمہیں گناہ میں مبتلا کر دے گا۔ لہٰذا اس خیال کو برا سمجھو اور اس کو ختم کرنے کی فکر کرو۔ اور اگر دوسرے کی طرف سے حسد پیدا ہو رہا ہے تو ایسی تدبیریں اختیار کرو جو تقاضۂ حسد کے الٹ ہوں۔ مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ فلاں شخص ذلیل ہو جائے، لیکن تم دل پر پتھر رکھ کر یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو عزت عطا فرما۔ یا مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ لوگ اس کی برائی کریں اور لوگوں کی نظروں میں یہ حقیر ہو جائے، لیکن تم اس کے لئے یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو لوگوں کی نظروں میں مقبول بنا دے۔ دعا کے یہ الفاظ زبان سے ادا کرتے وقت حاسد کے دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن اس بیماری کا علاج یہ آرے چلانا ہی ہے۔ اسی طرح اگر دوسرے کی طرف سے دل میں تکدر پیدا ہو رہا ہے تو اس کا بھی یہی علاج ہے کہ اپنے اس تکدر کو بُرا سمجھے۔

دوسرا علاج، عذاب کا استحضار

آخر میں حضرت والاؒ نے فرمایا کہ: "افعال پر عقوبت کا استحضار کیا جائے" یعنی میرے دل میں جو تکدر پیدا ہو رہا ہے اگر اس تکدر نے آگے بڑھ کر مجھ سے کوئی گناہ کا کام کرا لیا، مثلاً غیبت کرا لی یا دوسرے کی بدخواہی کا کام کرا لیا تو اس گناہ پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب ہو گا وہ عذاب کتنا سخت ہے۔ یہ عقوبت کا

استحضار کیوں کرے؟ "تاکہ داعیہ افعال کا مضمحل ہو جائے" یعنی دل میں جو یہ خیال آرہا ہے کہ میں اس کے خلاف کوئی کام کر گزروں، یہ خیال کمزور ہو جائے۔

ایک ہفتہ کے بعد اطلاع دو

پھر آخر میں حضرت نے فرمایا کہ "ایک ہفتہ کے بعد پھر اطلاع دی جائے" کیونکہ معالج تو یہ دیکھتا ہے کہ اس دوا سے کتنا فائدہ ہوا، اگر فائدہ ہوا تو ٹھیک، ورنہ بدل کر دوسری دوا دی جائے، اس لئے کہ بعض اوقات پہلے سے زیادہ کڑوی دوا دینی پڑتی ہے، اس لئے صرف ایک مرتبہ شیخ سے رہنمائی لینا کافی نہیں۔ لہٰذا حضرت والاؒ نے جو بیان فرمایا وہ اصول کے درجے میں تو درست ہے، لیکن مختلف حضرات کے لحاظ سے یہ علاج کسی کے لئے کارآمد ہو جائے گا اور دوسرے کے لئے مزید کسی علاج معالجے کی ضرورت ہوگی۔ لہٰذا کوئی شخص یہ اصولی علاج پڑھ کر یہ نہ سمجھے کہ میں نے یہ اصول پڑھ لیا اور علم حاصل ہو گیا، اور اب میں خود ہی اس پر عمل کرلوں گا اور اپنے آپ کو اس گناہ سے بچالوں گا، شیخ کی ضرورت ہی نہیں۔

حضرت نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ شیخ کی پھر بھی ضرورت ہے، اگرچہ تمہیں علم حاصل ہو گیا، لیکن ایک ہفتہ کے بعد شیخ کو اطلاع دینا کہ اس علاج سے کتنا فائدہ ہوا، اس کے بعد شیخ فیصلہ کرے گا کہ یہ علاج کافی ہے یا نہیں؟ اور مزید دوا کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

نویں مجلس
غیبت کی معافی کا طریقہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

نویں مجلس

الحمد للّٰہ رب العالمین ۔ والصلاۃ والسلام علی
رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ۔
أمّا بعد!

غیبت کی معافی کا طریقہ

حضرت والاؒ نے فرمایا کہ:

"اگر کسی کی غیبت ہوگئی تو استغفار کے ساتھ مغتاب سے بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔ لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کو ایذاء دینا ہے، اس لئے اجمالاً یوں کہنا کہ "میرا کہا سنا معاف کردو"، "کافی ہے"

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۱)

حضرت والا نے اس ملفوظ میں غیبت کی معافی کا طریقہ بیان فرمایا ہے کہ اگر کسی کی غیبت ہو جائے تو اس کی معافی کا کیا طریقہ ہے؟ غیبت کا تعلق حقوق العباد سے ہے، کیونکہ غیبت میں دوسرے مسلمان بھائی کا حق پامال ہوتا ہے اور

حقوق العباد کی معافی اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے۔ لہٰذا اگر آپ نے کسی کو جسمانی یا ذھنی یا کسی اور قسم کی تکلیف پہنچائی ہے تو محض توبہ استغفار کر لینے سے اس کی معافی نہیں ہو گی بلکہ صاحبِ حق کا معاف کرنا ضروری ہے۔

حقوق العباد کی سنگینی

جو گناہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہیں، جیسے شراب نوشی ہے، زناکاری ہے وغیرہ، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اگر انسان ایک مرتبہ بیٹھ کر صدق دل سے یہ عزم کر لے کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا، اور پچھلے گناہ پر نادم اور شرمندہ ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑا کر توبہ کر لے تو انشاء اللہ یہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔ لیکن حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک وہ شخص معاف نہ کرے جس کا حق پامال کیا گیا۔ غیبت بھی اسی میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر خالی بیٹھ کر توبہ کر لی کہ یا اللہ! جو غیبت کر لی ہے اس سے میں توبہ استغفار کرتا ہوں مجھے معاف فرما، صرف اتنا کر لینے سے غیبت کا گناہ معاف نہیں ہو گا جب تک اس شخص سے معافی نہ مانگی جائے جس کی غیبت لی گئی ہے اور وہ معاف نہ کر دے، اس وقت تک غیبت کا گناہ معاف نہیں ہو گا۔ اس لئے حضرت والا نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ اگر کسی کی غیبت ہو گئی تو استغفار کے ساتھ "مغتاب" سے (یعنی جس کی غیبت کی گئی تھی اس سے) بھی معافی مانگنے کی ضرورت ہے۔"

غیبت کی تفصیل بتانے کی ضرورت نہیں

پھر فرمایا کہ:

"لیکن تفصیل غیبت کی اس کو بتلانا اس کو ایذاء دینا ہے۔"

مثلاً اس سے یہ کہنا کہ میں نے فلاں وقت میں فلاں غیبت کی تھی اور تمہیں یہ یہ کہا تھا اور تمہاری یہ یہ بُرائی بیان کی تھی، اب تم مجھے معاف کر دو" کیونکہ اندیشہ یہ ہے کہ اس تفصیل کے بیان سے اس کو تکلیف پہنچے گی۔ اس لئے ساری تفصیل بیان کر کے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں، بلکہ اجمالاً یوں کہنا کہ میرا کہا سنا معاف کر دو، یہ بھی کافی ہے۔ دیکھئے، اللہ تعالیٰ کتنی آسانی کے راستے پیدا فرما دیتے ہیں۔

کہا سنا معاف کر دینا

یہ جملہ کہ "کہا سنا معاف کر دینا" یہ ہمارے بزرگوں کا چلایا ہوا کتنا حکیمانہ جملہ ہے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے اس وقت سے بڑوں سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ جب دو چار آدمی کچھ دن ساتھ رہنے کے بعد جدا ہونے لگتے ہیں تو اس وقت ایک دوسرے سے یہ جملہ کہتے ہیں کہ بھائی! ہمارا کہا سنا معاف کر دینا۔ اس لئے کہ جب سفر یا حضر میں دو چار آدمی ساتھ رہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی حق تلفی ہونے کا احتمال ہوتا ہے، لہٰذا جدا ہونے سے پہلے ان حقوق کو معاف کرالو، اگر یہ معاف نہ کرایا اور بعد میں کچھ عرصہ کے بعد خیال آیا کہ ہم نے تو فلاں کی حق تلفی کی تھی، تو اس وقت کہاں ڈھونڈتے پھرو گے؟ بعد میں

معلوم نہیں کہ ملاقات ہو یا نہ ہو، معافی مانگنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لہٰذا جدا ہوتے وقت ہی یہ کام کرلینا چاہئے۔ اس جملہ میں غیبت بھی خود بخود داخل ہو جائے گی اور غیبت سے بھی معافی ہو جائے گی۔

حضرت تھانویؒ کا طرزِ عمل

میں نے حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی شخص مجھ سے یہ کہتا ہے کہ میں نے آپ کی غیبت کی ہے، مجھے معاف کردو۔ تو میں اس سے کہتا ہوں کہ میں معاف تو ضرور کردوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ ظاہر ہے کہ صاحبِ حق کو یہ پوچھنے کا حق ہے کہ کیا غیبت کی تھی۔ فرماتے تھے کہ اس سوال سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات غیبت سچی ہوتی ہے، اس لئے کہ غیبت کے اندر یہ ضروری نہیں ہے کہ غلط ہی ہو تو اس کے بتانے سے اپنی غلطی کا پتہ لگ جاتا ہے۔

کہتی ہے تجھے خلقِ خدا غائبانہ کیا!

دوسرے اس کے ذریعہ یہ پتہ چل جاتا ہے کہ تمہارے بارے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق کا غیر جانب دارانہ تبصرہ کیا ہے؟

کہتی ہے تجھے خلقِ خدا غائبانہ کیا

کیونکہ جو لوگ تمہارے اردگرد رہتے ہیں وہ تو تمہاری تعریف ہی کریں

گے، تمہیں اچھا ہی کہیں گے، لیکن پیٹھ پیچھے تمہیں لوگ کیا کہتے ہیں اور تمہارے بارے میں کیا خیال کرتے ہیں، کیا تصور رکھتے ہیں، اس کا علم ہو جانا بھی مفید ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر سب لوگ تمہاری تعریف کرتے رہیں تو اس کے نتیجے میں بعض اوقات آدمی کے دل میں عجب پیدا ہو جاتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ یہ ساری مخلوق جو میری تعریف کر رہی ہے، تو ضرور میرے اندر کمال ہے جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اس طرح دل میں عُجب پیدا ہو جاتا ہے۔

اس عُجب کا علاج یہ ہے کہ تم یہ دیکھو کہ جو لوگ تمہارے پیچھے رہنے والے ہیں، وہ تمہیں کیا کہتے ہیں؟ اور تمہارے بارے میں ان کی کیا رائے ہے؟ اس کے ذریعہ انسان کے عُجب کا علاج ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ جب میرے پاس کوئی معافی مانگنے آتا تو میں اس سے کہتا کہ میں معاف تو کر دوں گا، لیکن پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ کیا غیبت کی تھی؟ جب بتاؤ گے تو میں معاف کر دوں گا۔

اجمالی معافی تمام متعلقین سے مانگ لو

اب سوال یہ ہے کہ کس کس سے معافی مانگے؟ پہلے تو دھیان اور فکر نہیں تھی، نہ جانے کس کس کی غیبت ہو گئی، تو کیا ان آدمیوں کی پہلے فہرست بنائے، اور پھر ان سے معافی مانگے؟ حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اگر جنت لینی ہے تو جنت اس قدر سستی نہیں ہے، یہ کام تو کرنا پڑے گا۔ لہٰذا جو اپنے متعلقین ہیں، اپنے دوست احباب ہیں، ملنے جلنے والے ہیں، عزیز رشتہ

دار ہیں، ان کی ایک فہرست بناؤ، اور پھر جا کر ان سے معافی مانگو۔

حضور ﷺ کا صحابہ سے معافی مانگنا

ہم اور آپ تو کس شمار و قطار میں ہیں، ہم سب کے سردار جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ کے کے مجمع میں کھڑے ہو کر معافی مانگ رہے ہیں، کہ کسی کا مجھ پر کوئی حق رہ گیا ہو تو وہ یا تو مجھ سے وصول کر لے، اور اگر جسمانی حق ہو تو مجھ سے بدلہ لے لے، یا معاف کر دے۔ چنانچہ ایک صحابی کھڑے ہو گئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے ایک دن میری کمر پر مارا تھا، وہ میرا حق آپ ﷺ کے ذمے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر میں نے تمہاری کمر پر مارا تھا تو تمہیں حق ہے کہ تم میری کمر پر آکر مار لو۔ جب وہ صحابی قریب آئے تو انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! جس وقت آپ نے میری کمر پر مارا تھا، اس وقت میری کمر پر کپڑا نہیں تھا، جبکہ آپ کی کمر مبارک پر کپڑا ہے۔ چنانچہ رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے کمر مبارک سے کپڑا اٹھالیا۔ ان صحابیؓ کا اصل مقصد یہ تھا کہ میں مہر نبوت کو بوسہ دوں۔ چنانچہ وہ صحابیؓ آگے بڑھے اور مہر نبوت کو بوسہ دیا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بات کے لئے تیار تھے کہ کوئی چھوٹا بھی مجھ سے آکر بدلہ لینا چاہے تو بدلہ لے لے۔ جب اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں ہو، آخرت کی فکر ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا احساس ہو، تو پھر دنیاوی طور پر لوگوں کے سامنے ذلیل ہونے کے سارے تصورات ہیچ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نفس و شیطان نے ہمارے دلوں

میں ان تصورات کے بت بنا رکھے ہیں کہ معافی مانگنے سے ہماری ذلت ہو جائے گی، ہماری ناک کٹ جائے گی، ہماری بے عزتی ہو جائے گی۔ ارے ایسی ہزار بے عزتیاں ہو جائیں، اس کے لئے ہم تیار ہیں۔ بس اللہ تعالیٰ اپنی ناراضگی سے بچالے اور اپنے غضب سے بچالے۔

میرے والد ماجدؒ کا معافی نامہ شائع کرانا

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب دل کا دورہ پڑا، اسپتال میں بستر پر لیٹے ہوئے تھے، جب ہوش آیا تو پہلا کام جو مجھ سے فرمایا، وہ یہ تھا کہ:

> میری طرف سے میرے تمام متعلقین کو ایک تحریر لکھ کر بھیج دو کہ جس کسی کا کوئی حق مجھ سے فوت ہوا ہو، یا کسی کی غیبت کی ہو، یا برائی کی ہو تو وہ مجھ سے بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے۔

چنانچہ میں نے وہ تحریر لکھی اور "کچھ تلافیٔ مافات" کے نام سے پہلے "البلاغ" میں شائع کی، اور پھر اس کو ایک پمفلٹ کی صورت میں شائع کر کے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے جتنے متعلقین تھے، ان سب کے پاس بھیجا۔

بہر حال، حقوق العباد کی معافی کیلئے صرف زبانی توبہ کافی نہیں، بلکہ صاحب حق سے معاف کرانا ضروری ہے، اور غیبت کرنا حق العبد کو ضائع کرنا ہے، لہٰذا جس کی غیبت کی ہے اس سے معافی مانگنا ضروری ہے۔

جس کی غیبت کی اس کی تعریف کرو

آگے فرمایا کہ:

> اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں کے سامنے غیبت کی تھی ان کے سامنے اس کی مدح و ثنا بھی کرو اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کردو۔ (ایضاً)

کیونکہ تم نے اس سے تو معافی مانگ لی، اور اللہ تعالیٰ سے بھی توبہ استغفار کر کے معاملہ صاف کرلیا، لیکن مخلوق کے دل میں تم نے اس شخص کی جو برائی پیدا کی ہے اس کی تلافی بھی ضروری ہے، تلافی کے لئے اب اس کی مدح و ثنا اور تعریف کرو، اور پہلی بات کا غلط ہونا ثابت کردو اور ان سے یہ کہو کہ جو بات میں نے کہی تھی وہ غلط تھی۔ آگے فرمایا:

> اور اگر وہ بات غلط نہ ہو، بلکہ سچی ہو تو یوں کہدو کہ بھائی! اس بات پر اعتماد کر کے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا، کیونکہ مجھے خود اس پر اعتماد نہیں رہا۔ یہ تو ریہ ہو جائے گا، کیونکہ سچی بات پر بھی اعتماد قطعی بدون وحی کے ہو نہیں سکتا۔ (ایضاً)

یعنی اگر تم نے غیبت کے دوران سچی برائی بیان کر دی تھی، کیونکہ غیبت سچی بھی ہوتی ہے، تو اب اس کے بارے میں یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ غلط تھی، لہٰذا اب یہ کہدو کہ میری اس بات پر اعتماد کر کے تم فلاں شخص سے بدگمان نہ ہونا،

کیونکہ مجھے خود اس بات پر اعتماد نہیں رہا۔ اس لئے کہ کچی بات پر مکمل بھروسہ وحی کے بغیر نہیں ہوسکتا، مکمل بھروسہ کے لئے یا تو مشاہدہ ہو، یا وحی ہو، اس کے علاوہ سوفیصد اعتماد کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ اب مجھے اس بات پر اعتماد نہیں۔ انشاء اللہ اس کے ذریعہ اس غیبت کی تلافی ہو جائے گی جو آپ نے اس کی برائی بیان کر کے کی ہے۔

جس کی غیبت کی تھی اگر وہ مر چکا ہو تو

آگے ارشاد فرمایا کہ:

> اگر وہ شخص مر گیا ہو جس کی غیبت کی ہے، تو اب معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے دعا و استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ دل گواہی دیدے کہ اب وہ تم سے راضی ہو گیا ہو گا۔

یعنی جس شخص کی آپ نے غیبت کی تھی، اب اس کا انتقال ہو چکا ہے، تو اب اس سے کیسے معافی مانگی جائے؟ تو اس سے معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے دعاء و استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہارا دل یہ گواہی دیدے کہ اب وہ شخص تم سے راضی ہو گیا ہو گا۔

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ بڑا سنگین ہے کہ جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، اس وقت تک معاف نہیں ہو گا۔ اور اگر صاحبِ حق کا انتقال ہو گیا تو اور زیادہ مشکل، لیکن کسی صورت میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کسی بھی

حالت میں اللہ تعالیٰ نے مایوسی کا راستہ نہیں رکھا کہ اب تیرے لئے معافی کا راستہ بند ہے۔

ننانوے قتل کرنے والے کا راستہ

بخاری شریف میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے ننانوے قتل کر دیے، پھر اس کو توبہ اور استغفار کا خیال آیا تو وہ ایک راہب کے پاس گیا، اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں، کیا میرے لئے توبہ اور معافی کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا کہ تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو سیدھا جہنم میں جائے گا، اس لئے کہ تو نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا ہے۔ اور صرف توبہ کرنے سے یہ گناہ معاف نہیں ہوگا۔ جب تک کہ تو ان سب مقتولین کے ورثاء سے معافی نہ مانگ لے، اور ان سب کے ورثاء سے کیسے تو معافی مانگے گا؟ اس لئے تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، تو جہنمی ہے۔ اس نے کہا کہ اچھا میری معافی کا کوئی راستہ نہیں تو ننانوے قتل تو ہو گئے، سوواں ایک اور سہی، اور یہ کہہ کر اس نے اس راہب کو بھی قتل کر دیا۔ اس طرح اس نے سو کی تعداد پوری کر لی۔

اس کے بعد پھر ایک اور راہب کے پاس گیا، اس سے جا کر اس نے سارا واقعہ بتایا کہ ننانوے تو پہلے قتل کر دیے تھے، ایک اور قتل کر دیا، اب بتائیے کہ میرے لئے توبہ اور استغفار کا کوئی راستہ ہے؟ اس راہب نے کہا کہ ہاں! تیرے لئے توبہ کا راستہ ہے، وہ یہ کہ تو پہلے توبہ اور استغفار کر، اور پھر فلاں مقام پر ایک بستی ہے، وہاں نیک لوگ رہتے ہیں، وہاں جا کر ان کی صحبت اختیار کر۔ اس راہب

نے نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے کا مشورہ اس لئے دیا تھا کہ جب برے لوگوں کی صحبت سے نکل کر نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرے گا تو اس گناہ سے بچنا اس کے لئے آسان ہو جائے گا۔ چنانچہ یہ قاتل توبہ اور استغفار کر کے یہ ارادہ کر کے اپنی بستی سے چل پڑا کہ میں اب اپنی زندگی میں انقلاب لاؤں گا اور آئندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کروں گا، کوئی نافرمانی نہیں کروں گا، نیک لوگوں کی صحبت اختیار کروں گا، جو میرے ذمے فرائض و واجبات ہیں ان کو ادا کروں گا۔ یہ سب ارادے لے کر چلا۔

ابھی وہ راستے میں تھا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم آگیا کہ اس کی روح قبض کر لو، چنانچہ اس کی روح قبض کر لی گئی اور اس کا انتقال ہو گیا، اب انتقال کے بعد ملائکہ کا آپس میں جھگڑا ہو گیا، ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کر کے پاک صاف ہو کر دوسری بستی کی طرف جا رہا تھا، اور نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے جا رہا تھا، لہٰذا ہم اس کو لے کر جائیں گے۔ جو ملائکہ عذاب تھے، انہوں نے کہا کہ اس شخص کی ساری زندگی گناہوں کے اندر گزری، اس نے سو آدمیوں کو قتل کیا ہے، لہٰذا ہم اس کو عذاب کے لئے لے جائیں گے۔ یہ جھگڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اچھا یہ دیکھو کہ جس بستی سے یہ نکلا تھا اور جس بستی کی طرف یہ جا رہا تھا، انتقال کے وقت یہ کس بستی سے زیادہ قریب تھا؟ جب ناپا گیا تو جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے چند گز زیادہ قریب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب یہ شخص توبہ کر کے نیک لوگوں کی بستی کی طرف چل پڑا تھا اور اس سے زیادہ قریب ہو گیا تھا تو اب ہم بھی اس کے ساتھ مغفرت کا معاملہ کرتے ہیں۔

مایوس ہونے کی ضرورت نہیں

بہر حال، مایوسی کا کوئی راستہ نہیں کہ چونکہ ہم سے حقوق العباد ضائع ہوگئے ہیں، اور جن کے حقوق ضائع کئے ہیں ان کا انتقال ہو گیا ہے، لہٰذا اب ہماری مغفرت نہیں ہو سکتی، ایسا نہیں ہے۔ ابتداء میں تو حقوق العباد کا بہت اہتمام کرو، اور ان کے ضائع ہونے کو سنگین سمجھو، اور کسی اللہ کے بندے کے حق کو پامال نہ کرو، لیکن اگر کسی کا کوئی حق ضائع ہو جائے تو فوراً معاف کرالو اور اگر معاف کرانے کا کوئی راستہ نہ ہو تو مایوس نہ ہو، بلکہ اس کے لئے استغفار کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! اپنے فضل و کرم سے مجھ سے ان بندوں کو راضی کر دیجئے جن کے حقوق میں نے پامال کئے، اور یہ دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! ان کے درجات بلند فرمایئے، ان کی مغفرت فرمایئے، ان کو رضاء کاملہ عطا فرمایئے۔ یہ دعا کرتے رہو یہاں تک کہ یہ گمانِ غالب ہو جائے کہ وہ راضی ہوگئے ہونگے۔

ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں مایوسی کا کوئی راستہ نہیں، ساری تعلیم یہ ہے کہ:

سوئے نا امیدی مرو امید ھا است
سوئے تاریکی مرو خورشید ھا است

حضرت والا نا امیدی اور تاریکی کی طرف جانے ہی نہیں دیتے، بلکہ راستہ بتا دیتے ہیں کہ اب اس طرح کرلو، اب اس طرح کرلو، اللہ تعالیٰ نے ہر صورت حال کا علاج رکھا ہے۔

کفر و شرک سے توبہ

دیکھئے! کفر و شرک سے زیادہ خراب چیز دنیا میں کوئی اور نہیں، کفر اور شرک کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس کو معاف نہیں کروں گا، اس کے علاوہ ہر چیز معاف کردوں گا۔ لیکن اس کفر و شرک سے بھی توبہ کرنے کا راستہ کھول دیا، اگر ستر برس کا کافر بھی کفر و شرک سے توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ قبول کرلیتے ہیں اور اس کو معاف فرمادیتے ہیں۔

شیطان کا بہکاوا

لہٰذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ مشکل ہے، لیکن ایسا نہیں ہے کہ اس کی وجہ سے آدمی ناامید ہوکر بیٹھ جائے۔ **اسی** لئے شیطان انسان کے اندر مایوسی پیدا کرکے بہکاتا ہے اور وہ انسان سے یہ کہتا ہے کہ اس گناہ کے نتیجے میں تو مردود ہوگیا، اب تیرا ٹھکانہ جہنم ہے، تیری معافی کا کوئی راستہ نہیں، لہٰذا جو تیری مرضی میں آئے وہ کام کر، اس لئے کہ جب جہنم میں جانا ہی ٹھہرا تو پھر دنیا میں خوب مزے اڑا کر اور خوب گناہ کرکے جا۔ یہ شیطان اس طرح دھوکہ دیتا ہے اور زیادہ گناہوں کے اندر مبتلا کردیتا ہے۔

جب کہ حقیقت حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامیدی مؤمن کا کام نہیں، کتنے ہی بڑے سے بڑے گناہ کرلئے ہوں پھر بھی وہ گناہ اللہ کی رحمت سے زیادہ نہیں ہوسکتے۔

"ابونواس" کی مغفرت کا واقعہ

عرب کے ایک شاعر گزرے ہیں، جس کی کنیت "ابونواس" تھی، یہ آزاد منش قسم کا شاعر تھا، ان شعراء میں اس کا شمار تھا جو ہر قسم کے گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں، چنانچہ ساری عمر گناہوں میں اور پینے پلانے میں گزری۔ ایک شخص نے مرنے کے بعد ان کو خواب میں دیکھا، اس سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ اس نے کہا کہ میں کیا بتاؤں! جب میں مر رہا تھا، اس وقت میں بہت ڈر رہا تھا کہ جب اللہ میاں کے سامنے جاؤں گا تو وہاں میری ایسی پٹائی ہوگی کہ ساری زندگی کے مزے دھرے رہ جائیں گے، اس لئے مجھے بہت فکر اور تشویش تھی کہ کیا ہوگا؟ اسی فکر اور تشویش کے عالم میں میں نے تین شعر کہے، بس اللہ تعالیٰ نے ان شعروں کی وجہ سے مجھے بخش دیا۔ اب خواب میں اس نے وہ شعر سنائے کہ وہ شعر یہ تھے، وہ شعر بھی بڑے عجیب تھے، جب اللہ تعالیٰ شاعر کو توفیق دیدے تو شعر کے اندر اچھی بات بھی خوب بیان کرتا ہے۔ وہ شعر یہ ہیں۔

یَاربِّ ان عَظُمَتْ ذنوبی کثرۃً
فلقد عَلمتُ بأنّ عفوك اَعْظمُ
ان كان لا یر جوك الاَّ محسنٌ
فَبِمن یلوذ ویستجیر المجرمُ

اے پروردگار! اگرچہ میرے گناہ بہت زیادہ ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کی مغفرت اور آپ کی معاف کرنے کی صفت میرے گناہوں سے کہیں

زیادہ عظیم ہے۔ اگر آپ کی رحمت کی امید صرف نیک لوگ ہی کر سکتے ہیں تو یہ مجرم بیچارہ کہاں جائے گا؟ یہ کس کی پناہ حاصل کرے گا؟ یہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے گا۔

ومددت یدی إلیک تضرعاً
فلئن رددت یدی فمن ذایرحمُ

میں آج آپ کے سامنے عاجزی کے ساتھ ہاتھ پھیلا رہا ہوں، اگر آپ نے یہ ہاتھ واپس کر دیے تو پھر کون ہے جو ان پر رحم کرے۔

جاتے جاتے یہ شعر کہے، پتہ نہیں کس دل سے یہ اشعار کہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ جا، میں تیری ان شعروں پر بخشش کرتا ہوں۔ اور یہ وہ اشعار ہیں جو "ابونواس" کے بیاض میں موجود نہیں تھے، اس لئے کہ بالکل آخر وقت میں دنیا سے جاتے جاتے کہے تھے، اس لئے بیاض میں لکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی، اس لئے خواب ہی میں خواب دیکھنے والے کو بتایا کہ میں نے یہ شعر کہے تھے۔ جس شخص نے خواب دیکھا تھا، اس نے اس خواب ہی کے حوالے سے یہ اشعار ابونواس کے دیوان میں تحریر کر دیے۔

ظاہری حالت پر فیصلہ مت کرو

اسی لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ کسی شخص کی ظاہری حالت دیکھ کر اس کے بارے میں کبھی جنتی یا جہنمی ہونیکا فیصلہ نہ کرو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کو اس کی کونسی ادا پسند آجائے، کیا پتہ آخر میں اس کا خاتمہ کیسے عمل پر ہو، اور اللہ تعالیٰ اس

کو نواز دے، اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "میں ہر مسلمان کو اپنے آپ سے حالاً اور ہر کافر کو احتمالاً افضل سمجھتا ہوں۔ "احتمالاً" کا مطلب یہ ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو ایمان کی توفیق دیدے اور مجھ سے آگے نکل جائے۔ اس لئے ظاہری حالت میں کوئی شخص کیسا بھی ہو، تم اس کے فعل سے نفرت کرو کہ یہ شراب پینا بری بات ہے، لیکن اس کی ذات سے نفرت مت کرو۔ کیا پتہ اللہ تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دیدے اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

دسویں مجلس
غیبت مباح کی صورت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

دسویں مجلس

﴿گزشتہ سے پیوستہ﴾

الحمد للّٰہ رب العالمین۔ والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم۔ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔

أمّا بعد!

غیبت مباح کی صورت

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ:

اگر دینی ضرورت ہو تو پھر غیبت بھی مباح ہے، جیسے محدّثین نے رواۃ حدیث پر جرح کی ہے۔ اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی غیبت محرمہ ہے اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے۔ کِذب کا مدار تحقیق کذب پر نہیں بلکہ عدم تحقیق صدق پر ہے۔

یعنی دینی ضرورت سے کسی کا عیب یا برائی بیان کرنا جائز ہے۔ چنانچہ تمام محدّثین حضرات کا تو کام ہی لوگوں کے حالات کی تحقیق کرنا تھی کہ فلاں راوی کیسا ہے اور فلاں راوی کیسا ہے؟ چنانچہ جب کوئی شخص ان سے راوی کے بارے میں سوال کرتا تو وہ بتا دیتے کہ یہ راوی ضعیف ہے، اور یہ راوی جھوٹا ہے، یہ راوی کذّاب ہے، یہ راوی شتام ہے۔ لیکن یہ بیان کرنا ان کے ذمے واجب تھا۔ اگر بیان نہ کرتے تو گناہ گار ہوتے، کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کی حفاظت کا یہی طریقہ تھا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ کونسا راوی کیسا ہے؟ لہٰذا یہ غیبت چونکہ دینی ضرورت کے لئے تھی اس لئے یہ جائز تھی۔

علی بن مدینیؒ کا واقعہ

حضرت علی بن مدینی رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے محدّثین میں سے ہیں اور جرح و تعدیل کے امام ہیں۔ البتہ ان کے والد حدیث کے معاملے میں پوری طرح قابل اعتماد نہیں تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اپنے والد کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ وہ حدیث میں قوی ہیں یا ضعیف ہیں؟ پہلے تو فرمایا کہ میرے والد کے بارے میں یہ بات دوسرے محدّثین سے پوچھ لو۔ سوال کرنے والے نے کہا کہ ان کے بارے میں مجھے آپ کی رائے معلوم کرنی ہے۔ جب سوال کرنے والے نے اصرار کیا تو آپ نے سر جھکایا اور پھر فرمایا: هو الدين، انه ضعيف" یہ دین کی بات ہے، اس لئے یہ بتا رہا ہوں کہ میرے والد حدیث کے معاملے میں ضعیف ہیں۔ چونکہ دین کی بات ہے اور دین کی بات کو چھپانا نہیں ہے، چاہے وہ باپ کے خلاف ہو یا بیٹے کے خلاف ہو، وہ دین کی ضرورت کے

تحت کہنی ہوگی۔

امام ابوداؤدؒ کا واقعہ

امام ابوداؤد سجستانی رحمۃ اللہ علیہ جو "سنن ابوداؤد" کے مصنف ہیں، اتنے بڑے جلیل القدر محدّث اور اتنے بڑے امام ہیں۔ ان کا بیٹا "ابن ابی داؤد" حدیث کے بارے میں ضعیف تھا۔ امام ابوداؤدؒ سے کسی نے پوچھا کہ اپنے بیٹے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا:

لا تحلّ عنه الرواية

اس سے روایت کرنا حلال نہیں

دیکھئے! حضرات محدّثین نے عیب کا اظہار کرنے میں نہ باپ کی پرواہ کی، نہ بیٹے کی پرواہ کی، اور نہ عزیز واقارب کی پرواہ کی، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا معاملہ تھا اور راوی کی خامی کا اظہار کرنا دینی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ محدّثین کا گروہ پیدا ہی اسی مقصد کے لئے کیا تھا کہ ان کے ذریعہ احادیث کی حفاظت کا کام کرایا جائے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جہاں دین کی ضرورت ہو، وہاں نہ صرف یہ کہ غیبت کرنا جائز ہے بلکہ بعض اوقات غیبت کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔

ورنہ غیبت محرمہ ہے

"لیکن اگر دینی ضرورت نہیں بلکہ محض نفسانیت ہی نفسانیت ہے تو اس صورت میں امر محقق کا بیان کرنا بھی

غیبت محرمہ ہے"

اب یہ فرق کرنا ہے کہ جو بات میں کہہ رہا ہوں، یہ واقعی دینی ضرورت سے کہہ رہا ہوں یا اپنے نفس کی لذت لینے کے لئے نفسانیت کے طور پر کہہ رہا ہوں، جائزہ لینے پر پتہ چلے گا کہ غیبت کے شوق میں اب نفس نے یہ حیلہ تراش لیا کہ جو بات تم کہہ رہے ہو یہ دینی ضرورت کے تحت کہہ رہے ہو۔ لیکن جب اپنے باطن کے اندر کرید کر دیکھو گے تو پتہ چلے گا کہ حقیقت میں دینی ضرورت نہیں تھی بلکہ نفسانیت تھی، لہٰذا وہ غیبت محرمہ ہے، چاہے وہ ایسی بات ہو جو حقیقت میں صحیح اور درست ہو اور تحقیق سے ثابت ہو چکی ہو، تب بھی وہ حرام اور ناجائز ہے۔

بلا تحقیق بات کہنا بہتان ہے

"اور بلا تحقیق کوئی بات کہی جائے تو بہتان ہے۔ کذب کا مدار تحقیق کذب پر نہیں بلکہ عدم تحقیق صدق پر ہے۔"

یعنی جھوٹ کا مدار صرف اس بات پر نہیں کہ جب کسی چیز کا جھوٹا ہونا ثابت ہو جائے تب جھوٹ ہوگا، بلکہ اگر کسی چیز کا سچا ہونا ثابت نہیں ہوا پھر بھی تم اس کو بیان کر رہے ہو تو تمہارے حق میں وہ کذب ہے، کیونکہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف ارشاد فرمادیا:

كفى بالمرء كذباً أن يحدث بكل ما سمع

(ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی التشدید فی الکذب)

انسان کے جھوٹا ہونے کے لئے یہ کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات کو آگے بیان کر دے۔

لہٰذا جب ہم دوسرے کی غیبت کرتے ہیں تو شیطان آکر یہ سبق پڑھاتا ہے کہ تم جو برائی بیان کر رہے ہو، یہ کوئی گناہ کا کام نہیں ہے کیونکہ یہ دینی ضرورت ہے، حالانکہ حقیقت میں وہاں کوئی دینی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اپنی نفسانیت ہوتی ہے۔ دونوں میں فرق کرنا بڑا مشکل ہوتا ہے، ایک محقق اور شیخ ہی اس کا فرق بتاتا ہے کہ یہ جو کام کیا ہے یہ دینی ضرورت سے کیا ہے یا نفسانیت کی وجہ سے کیا ہے۔ شیطان دینی ضرورت کو آڑ بناکر غیبت میں مبتلا کرا دیتا ہے، یہ غیبت کھلی ہوئی غیبت سے زیادہ خطرناک ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینا چاہتا ہے کہ یا اللہ! میں جو غیبت کر رہا ہوں، تیرے دین کی ضرورت سے کر رہا ہوں، لہٰذا اس میں غیبت کے گناہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دینے کا گناہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے غیبت کے گناہ سے ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

غیبت سے حسّی تکلیف ہوتی ہے

حضرت والا نے فرمایا کہ:

"غیبت میں نہ معلوم لوگوں کو کیا مزا آتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے اپنا جی خوش کر لیتے ہیں، پھر اگر اس کو خبر ہو گئی اور اس سے دشمنی پڑ گئی تو عمر بھر اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے، اور اگر ذرا دل میں حِس ہو تو غیبت کرنے کے

ساتھ ہی قلب میں ایسی ظلمت پیدا ہوتی ہے جس سے سخت تکلیف ہوتی ہے جیسے کسی نے گلا گھونٹ دیا ہو۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۲)

چونکہ ہم لوگوں کے مزاج خراب ہوگئے ہیں اور حِس جاتی رہی ہے، اس لئے ہم گناہ کرتے رہتے ہیں لیکن ہمیں گناہوں کی ظلمت کا احساس نہیں ہوتا، جن لوگوں کے قلوب کو اللہ تعالیٰ مجلّٰی اور مصفّٰی فرماتے ہیں ان کے قلب پر معمولی سے گناہ کی بھی ایسی ظلمت ہوتی ہے جیسے کسی نے ان پر پہاڑ رکھ دیا ہو۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر ز باغِ دل خلالے کم بود

اگر دل کے باغ سے ایک تنکا بھی کم ہو جائے تو سالک کے دل پر ہزاروں غم ٹوٹ پڑتے ہیں۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ ایک مرتبہ آپ بہت غمگین بیٹھے ہوئے تھے، اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ گیا ہو۔ ایک شاگرد نے حضرت سے جا کر پوچھا کہ حضرت! آپ کے چہرے پر غم کے آثار نظر آرہے ہیں، خیریت تو ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں کچھ غم ہے۔ انہوں نے اصرار کیا کہ حضرت! کیا غم ہے؟ اس وقت دارالعلوم دیوبند میں

دستار بندی کا جلسہ ہو رہا تھا۔ فرمایا کہ جلسہ میں کچھ ایسی مصروفیت ہو گئی کہ آج جب ہم مسجد میں نماز پڑھنے گئے تو ہماری تکبیر اولیٰ چھوٹ گئی امام سے نہیں سُن سکے۔ پھر فرمایا کہ ۳۵ سال میں یہ پہلا واقعہ ہے کہ نماز میں تکبیرِ اولیٰ چھوٹ گئی۔ اب آپ اندازہ لگائیں، کیونکہ صرف تکبیرِ اولیٰ چھوٹ جانے کا مطلب یہ ہے کہ قراءت سنی، رکوع میں شریک ہوئے، رکعت مل گئی، اور صحیح قول کے مطابق تکبیر اولیٰ میں بھی شرکت ہو گئی، لیکن اس کے باوجود تکبیرِ اولیٰ کے چھوٹنے پر اتنے غمگین تھے۔

ہماری بے حِسی

دوسری طرف ہمارا یہ حال ہے کہ ہماری جماعتیں نکل جاتی ہیں، اور اکثر نمازی حضرات مسبوق ہو کر اپنی نمازیں پوری کرتے ہیں، لیکن اس کا احساس نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے اندر بے حِسی ہے۔ العیاذ باللہ! اللہ تعالیٰ اپنی رحمت فرما کر اسے دور فرمادے۔ آمین۔

مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ کا واقعہ

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ایک مشکوک لقمہ پیٹ میں چلا گیا، اس لقمہ کے حلال اور حرام ہونے میں شک تھا، فرمایا کہ ایک مہینے تک اس لقمہ کی ظلمت اپنے دل کے اندر محسوس کرتا رہا۔ ہماری تو حِس خراب ہے، مزاج بگڑا ہوا ہے، اس لئے گناہ کی برائی کا احساس ہی نہیں ہوتا، بس ایسا سمجھتے ہیں جیسے ایک مکھی آکر بیٹھی اور اسکو اڑا دیا،

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہماری حِس کو درست فرمائے اور مزاج درست فرمائے۔ آمین۔

غیبت سے کیا حاصل ہوا؟

بہر حال، غیبت کو چھوڑنے کے لئے یہ سوچنا چاہئے کہ اگر تم نے تھوڑا بہت وقت غیبت کے اندر خرچ کر بھی لیا اور غیبت سے تھوڑا مزہ بھی آ گیا، لیکن اس غیبت کا حاصل کیا ہوا؟ نتیجہ کیا ہوا؟ کیا فائدہ حاصل ہوا؟ ظاہر ہے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، بلکہ اس کے نتیجے میں آخرت کا اتنا بڑا گناہ کما لیا۔ اور دنیا کے اندر یہ صورت حال ہے کہ اگر اس شخص کو خبر ہو گئی جس کی تم نے غیبت کی ہے کہ فلاں نے میری یہ غیبت کی ہے تو اس کی طبیعت میں تمہاری طرف سے جو کدورت اور عداوت پیدا ہو گی وہ نہ جانے کیا خمیازہ لے کر آئے گی۔

غیبت کے نتیجے میں کئی گناہ ہو جاتے ہیں

اور حقوق العباد کے گناہوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے تو اس کی بیچ میں اس کو دس غلط کام کرنے پڑتے ہیں، مثلاً جس کی غیبت کی تھی اس کو پتہ چل گیا، اس نے آکر اس سے پوچھ لیا کہ تم نے یہ غلط بات کہی تھی؟ اب یا تو اعتراف کرے کہ ہاں! میں نے یہ بات کہی تھی، اب اگر اعتراف کرے تو مجرم بنے، یا اعتراف نہ کرے تو پھر یا تو تاویل کرے گا کہ میں نے تو یوں کہا تھا، یا جھوٹ بولے گا کہ میں نے تو یہ بات نہیں کہی۔ اب اگر اس دوسرے شخص کو پتہ چل گیا کہ یہ جھوٹ بول رہا ہے تو اس کے دل میں اس کی طرف سے اور زیادہ

کدورت اور دشمنی پیدا ہوگی۔ لہٰذا انسان ایسا کام کیوں کرے جس کے نتیجے میں دشمنیاں پیدا ہوں، بغض اور عداوت پیدا ہو، ایسے کام کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ قلب میں ظلمت پیدا ہونے کا نقصان علیحدہ ہے۔

غیبت کا اصل علاج تواضع ہے

حضرت والا نے فرمایا کہ:

> غیبت کا علاج بھی تواضع ہی ہے، مگر تواضع ایک دن میں پیدا نہیں ہوتی، اس لئے جب تک تواضع حاصل نہ ہو، غیبت سے بچنے کے لئے فوری علاج یہ کرو کہ بدون سوچے کوئی بات نہ کیا کرو، جو بات کرو سوچ کر کرو، اس سے غیبت کم ہو جائے گی، اور کچھ دنوں کے بعد بالکل نہ ہوگی، اور اگر کسی وقت بے سوچے کوئی بات نکل جائے تو اسی وقت دو رکعت نفل "صلوٰۃ التوبہ" کی نیت سے پڑھ لیا کرو۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۲)

اس ملفوظ میں پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ غیبت انسان سے سرزد ہی نہ ہو، اس کا اصل علاج یہ ہے کہ دل میں تواضع پیدا کرو۔ ہمیشہ یاد رکھو! غیبت تواضع کے فقدان کی وجہ سے ہوتی ہے، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور تکبر میں مبتلا ہوتا ہے، تب دوسرے کی غیبت کرتا ہے۔ جس شخص کو اپنے عیوب کا دھیان ہو، اس کی اصلاح کی فکر ہو، اس کو دوسروں کے عیوب بیان کرنے کی کہاں فرصت، وہ تو اپنے درد میں مبتلا ہے کہ میرے اندر یہ عیب ہے، میرے اندر یہ

خرابی ہے، کس طرح ان کو دور کروں، بس اسی ادھیڑ بُن میں مبتلا ہے، وہ دوسروں کے عیوب کو کہاں دیکھتا پھرے گا۔ ہاں! اگر دل میں تکبر اور بڑائی ہے اور دوسروں کی تحقیر ہے، اس کو اپنی فکر تو نہیں ہے، اس لئے وہ دوسروں کے عیوب کو دیکھتا پھرتا ہے کہ اس میں فلاں برائی ہے، اس میں فلاں برائی ہے، پھر ان برائیوں کو دوسروں کے سامنے بیان کرتا رہتا ہے۔ لہٰذا غیبت کی اصل جڑ عجب اور تکبر ہے، جب یہ تکبر اور عجب ختم ہو جائے گا تو پھر غیبت کبھی سرزد ہی نہیں ہوگی۔ اس لئے غیبت کا اصل علاج تکبر کا ختم کرنا اور تواضع کا پیدا کرنا ہے۔

ہمارے بزرگوں کی تواضع

حضرت ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ دارالعلوم میں تشریف لائے۔ ان کی زبانی ایک واقعہ سنا کہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ خیر المدارس ملتان کے بانی) نے فرمایا کہ جب میں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جاتا تو بلا مبالغہ مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ اس مجلس کے اندر جتنے لوگ موجود ہیں، ان میں سب سے کمتر اور حقیر اور بدحال میں ہوں، اور یہ سب مجھ سے افضل ہیں، بلکہ یہ سب انسان ہیں اور میں بیل ہوں۔ پھر مجھے خیال پیدا ہوا کہ میری یہ حالت درست ہے یا نہیں؟ چنانچہ میں حضرت مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (جامعہ اشرفیہ لاہور کے بانی) کی خدمت میں حاضر ہوا، اور جاکر عرض کیا کہ میرا یہ معاملہ ہے کہ جب میں حضرت والا کی مجلس میں آتا ہوں کہ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس مجلس میں سب سے کمتر اور حقیر میں ہوں، مجھ سے زیادہ حقیر اور کمتر کوئی اور نہیں ہے۔ حضرت مفتی صاحب

فرمانے لگے کہ یہ حالت تو میری بھی ہے کہ جب میں مجلس میں جاتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ سب حاضرین سے زیادہ کمتر اور بدحال میں ہی ہوں تو حضرت مولانا خیر محمد صاحبؒ نے فرمایا کہ تم بھی میرے ساتھ اس حال میں شریک ہوگئے، چلیں حضرت والا سے اپنی یہ حالت بیان کرتے ہیں۔

چنانچہ یہ دونوں حضرات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ جب ہم مجلس میں بیٹھتے ہیں تو ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ اس مجلس کے اندر جتنے حاضرین ہیں وہ سب ہم سے افضل ہیں اور ہم سب سے کمتر اور ذلیل ہیں اور حقیر ہیں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ کچھ فکر نہ کرو، ارے بھائی! میرا بھی یہی حال ہے، جب میں مجلس میں بیٹھتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ میں ان سب کے مقابلے میں کمتر ہوں، سب مجھ سے افضل ہیں۔

غیبت کو ختم کرنے والی چیز تواضع

تواضع یہ نہیں ہے کہ آدمی صرف اپنی زبان سے یہ کہدے کہ احقر ناکارہ ہے، ناچیز ہے، بلکہ تواضع یہ ہے کہ واقعۃً اپنے عیوب پر اتنی نگاہ ہو کہ اپنے عیوب کے مقابلے میں دوسروں کے عیوب نظر ہی نہ آئیں۔ جس دن یہ تواضع پیدا ہوگئی تو پھر انشاء اللہ غیبت پاس بھی نہیں پھٹکے گی۔ اس لئے کہ جب انسان اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھ رہا ہے اور اس کو اپنے عیوب کا استحضار ہے تو وہ دوسروں کے عیوب کو کیسے دیکھے گا؟ لہٰذا اگر "غیبت" کا جڑ سے بالکلیہ خاتمہ کرنا ہے تو اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

اپنے عیوب کا استحضار کرو

اب تواضع کیسے پیدا کریں؟ تواضع پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کا استحضار کرو۔ یہ جو ہر وقت اپنی بڑائی کا خیال دل میں جما رہتا ہے کہ "ہم چوں ما دیگرے نیست" (ہم جیسا کوئی دوسرا نہیں) اور یہ جو ہمیں کبھی اپنے علم پر گھمنڈ، کبھی اپنے تقویٰ پر گھمنڈ، کبھی اپنے مال و دولت پر گھمنڈ، کبھی اپنی صحت پر گھمنڈ، کبھی اپنی شکل و صورت پر گھمنڈ رہتا ہے، یہ گھمنڈ ہی انسان کو تباہ کر دیتا ہے۔

انسان کی حقیقت یہ ہے

ایک بزرگ سے ایک نوجوان نے کہا کہ جانتے نہیں، میں کون ہوں؟ ان بزرگ نے فرمایا: ہاں! میں جانتا ہوں کہ تم کون ہو، کہو تو بتادوں؟ چنانچہ ان بزرگ نے فرمایا:

> **أولك نطفة قذرة ـ وآخرك جيفة قذرة وأنت فيما بين ذلك تحمل العذرة ـ**
>
> تیرا آغاز تو یہ ہے کہ تو ایک گندے نطفے سے پیدا ہوا ہے، اور تیرا انجام یہ ہے کہ تو بدبودار مردار ہو جائے گا حتیٰ کہ تیرے گھر والے بھی تجھے رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے۔ اور ولادت سے وفات تک جو درمیان کا عرصہ ہے، اس میں تو گندگی کے ٹوکرے اٹھائے پھر رہا ہے۔

جو کھال جسم پر ہے، اس کھال کو اللہ تعالیٰ نے "ساتر العیوب" بنا رکھا ہے، اگر یہ کھال ذرا سی چھل جائے تو اندر نجاست ہی نجاست بھری ہوئی ہے، کہیں خون ہے، کہیں پیپ ہے، کہیں پیشاب ہے، کہیں پاخانہ ہے، یہ سب نجاستیں اٹھائے پھر رہا ہے یہ حقیقت ہے ہماری، مگر خود کو بڑا سمجھ رہا ہے، اور تکبر کے یہ خیالات پھر انسان کو غیبت پر آمادہ کرتے ہیں۔

لہٰذا "غیبت" کا اصل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرے، جب تواضع پیدا ہو جائے گی تو پھر انشاء اللہ کسی کی غیبت نہیں ہو گی۔ البتہ جہاں دینی ضرورت ہو وہاں "غیبت" جائز ہے، مثلاً کسی کو نقصان سے بچانا ہے، آپ اس کو بتا دیں کہ فلاں شخص سے ہوشیار رہنا، یہ معاملات کا صاف نہیں ہے، تو یہ غیبت میں داخل ہی نہیں۔

تواضع کیلئے صحبت شیخ

تجربہ یہ ہے کہ رگڑے کھائے بغیر "تواضع" پیدا نہیں ہوتی۔ دراصل بات یہ ہے کہ انسان کے دماغ میں خنّاس ہوتا ہے، اور وہ خنّاس یہ ہے کہ انسان اپنی رائے کو بالا سمجھتا ہے، اپنی سوچ کو بالکل صحیح سمجھتا ہے کہ جو میں سوچ رہا ہوں یہ صحیح ہے اور دوسرا جو سوچ رہا ہے وہ غلط ہے، جب انسان اپنی اس سوچ اور فکر کو کہیں جا کر اس طرح فنا نہیں کرے گا کہ جو میں سوچتا ہوں وہ غلط ہے اور جو آپ کہتے ہیں وہ صحیح ہے، چاہے مجھے آپ کی سوچ کتنی ہی غلط اور بری معلوم ہو رہی ہو اور دلیل کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، بداہت کے خلاف معلوم ہو رہی ہو، لیکن

میں آپ ہی کی بات مانوں گا۔ جب تک اس طرح اپنی سوچ و فکر کو نہیں مٹائے گا، اس وقت تک تواضع پیدا نہیں ہوگی اور تکبر ختم نہیں ہوگا۔

حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ کی نصیحت

اللہ تعالیٰ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ جب میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات ہوئی تو حضرت شیخ الحدیث صاحبؒ نے بہت مفصل خط مجھے اور بھائی صاحب حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہم کو لکھا، اس خط میں بہت ساری نصیحتیں فرمائیں، لیکن ایک نصیحت یہ فرمائی کہ:

"میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ صاحبزادگی کا سور بہت دیر سے نکلتا ہے"

یعنی کسی بڑے آدمی کے بیٹے ہونے کی وجہ سے دماغ میں ایک خنّاس پیدا ہو جاتا ہے، اس کو "سور" سے تعبیر فرمایا، اس خنّاس کا مطلب "تکبر" ہے اور یہ "سور" بہت دیر میں نکلتا ہے، یعنی دوسرے امراض کا علاج تو جلدی ہو جاتا ہے لیکن اس کا علاج بہت دیر سے ہوتا ہے۔ بہرحال، اس خط کے ذریعہ اس طرف ہمیں متوجہ فرمایا کہ اس کی فکر کرنی چاہئے کہ کسی طرح یہ مرض نکل جائے۔ اور پھر فرمایا کہ:

جب کوئی شخص اپنے آپ کو کسی کے سامنے فنا کردے اور رگڑے کھائے، جب یہ نکلے، جب تک یہ نہ نکلے اس وقت

تک راستہ نہیں کھلتا۔

علم کا ''سور'' دیر سے نکلتا ہے

اسی طرح ''علم کا سور'' ہے کہ ہم عالم ہیں، یہ عالم ہونے کا جو گھمنڈ ہے، یہ بھی بڑا خطرناک ہے اور یہ بھی دیر سے نکلتا ہے۔ جب تک اپنے آپ کو دوسرے کے سامنے فنا نہ کر دے، اس وقت تک یہ نہیں نکلتا۔ اور اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں کہ عِلم بھی ہو اور صاحبزادگی بھی ہو، پھر تو سور در سور جمع ہو گئے۔

اس کا علاج آسان نہیں ہے، اس کا علاج صرف یہی ہے کہ کہیں رگڑے کھائے، اپنے آپ کو پامال کرے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

قال را بگزار صاحبِ حال شو
پیشِ مردے کاملے پامال شو

''پامال'' کے معنی یہ ہیں کہ تمہیں پاؤں سے روندا جائے۔ پاؤں سے روندے جانے کا مطلب یہ ہے کہ چاہے تمہارے دل و دماغ میں بات نہیں آ رہی ہے، عقل اور بداہت کے خلاف وہ بات معلوم ہو رہی ہے، لیکن پھر بھی بڑے کی بات کے سامنے تم اپنے آپ کو اس طرح جھکا دو جیسے پاؤں میں روندا جا رہا ہے۔ جب تک اس پر عمل نہیں ہو گا، اس وقت تک یہ سور دماغ سے نہیں نکلے گا۔ لہٰذا جب تک تکبر دل میں موجود رہے گا، ''حسد'' بھی رہے گا، غیبت بھی رہے گی، بغض بھی رہے گا، غصّہ بھی رہے گا، اور جب تکبر چلا جائے گا اور تواضع پیدا ہو

جائے گی، اس وقت یہ سارے امراض بھی چلے جائیں گے۔

غیبت ہونے پر جرمانہ

لیکن یہ تواضع اور انکساری ایک دو دن میں پیدا نہیں ہوگی، اس کے لئے محنت اور مشق کی ضرورت ہے، اور کسی شیخ کامل کی صحبت کی ضرورت ہے، تب جاکر تواضع پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ جب تک یہ بات حاصل نہ ہو یعنی تواضع نہ ہو اس وقت تک یہ کرے کہ بے سوچے بات نہ کرے، اور اگر کبھی غیبت ہو جائے تو اپنے اوپر جرمانہ مقرر کرے۔ ایک جرمانہ کا بیان پیچھے گزر چکا کہ ایک وقت کا فاقہ کرے، یہاں ایک دوسرا جرمانہ بیان فرمایا کہ دو رکعت صلوٰۃ التوبہ پڑھ لیا کرو۔ اس طرح کرنے سے رفتہ رفتہ انشاء اللہ یہ بیماری دور ہو جائے گی۔

صرف آرزو کرنا کافی نہیں

دیکھئے! دنیا میں کوئی کام محنت کے بغیر نہیں ہوتا، تھوڑی بہت محنت ضرور کرنی پڑتی ہے، محض آرزو کر لینے سے اور خواہش کر لینے سے کام نہیں بنتا ہے ؎

آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

یعنی صرف آرزو کر لینے سے تقدیر نہیں بدلا کرتی بلکہ اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے۔

ایک دیہاتی کا قصہ

جیسے ایک دیہاتی کا قصہ حضرت والا نے لکھا ہے کہ ایک دیہاتی بیٹھا ہوا اپنی دیہاتی زبان میں یہ کہہ رہا تھا کہ یوں جی کرے ڈھیر سارا دودھ ہو، اور ڈھیر سارا اگڑ ہو اور میں ڈھیر سارے دودھ میں ڈھیر سارا اگڑ ڈال کر اُنگڑ (انگلی) سے اس کو چلاؤں اور پھر خوب پیوں، یوں جی کرے۔ کسی نے اس دیہاتی سے کہا کہ تیرا یوں جی تو کرے، لیکن تیرے پاس کچھ ہے بھی؟ اس نے کہا میرے پاس اُنگڑ (انگلی) ہے۔ یعنی نہ دودھ ہے اور نہ گڑ ہے، بس انگڑ ہے، اب وہ اس انگڑ کے بل بوتے پر آرزو کر رہا تھا۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ ”جیسے وہ بیوقوف اُنگڑ کی بنیاد پر یہ آرزو باندھ رہا تھا، حالانکہ صرف آرزو باندھنے سے کچھ نہیں ہوتا، ایسے ہی ہم بھی اصلاح کی محض آرزوئیں باندھا کرتے ہیں۔ ارے یہ دیکھو! تمہارے پاس کچھ عمل ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو اس کے حصول کے لئے کوشش اور محنت کرو تب جا کر وہ حاصل ہوگا۔

یہ عاجز بندہ ہے

لہٰذا کوئی کام محض آرزو کر لینے سے نہیں ہوتا کہ کاش میں ایسا ہو جاؤں، کاش میں نیک ہو جاؤں، کاش میں متقی بن جاؤں، کاش میں غیبت چھوڑ دوں، محض تمنائیں کرنے سے اور آرزوئیں کرنے سے بات نہیں بنتی۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

العاجز من أتبع نفسه هواها وتمنّى على الله

(ترمذی، باب صفۃ القیٰمۃ حدیث نمبر ۲۴۶۱)

عاجز وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو خواہشات نفسانی کے پیچھے چھوڑ رکھا ہو۔ خواہشات جس طرح لے جارہی ہیں وہ جارہا ہے، کوئی روک اور لگام نہیں، لیکن اللہ تعالیٰ پر تمنائیں باندھ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ بڑا غفور رحیم ہے، معاف کردے گا، ایسا بندہ عاجز ہے۔ لہٰذا محض تمنا اور آرزو کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ تمنا کے ساتھ ساتھ قدم آگے بڑھائے، تھوڑی سی محنت کرے، عمل کرے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے کہے کہ یا اللہ! میرے بس میں جتنا تھا، اتنا میں نے کرلیا، اب اس کی تکمیل کرنا آپ کے قبضہ و قدرت میں ہے، آپ اس کی تکمیل فرمادیجئے۔

ذرا چلو تو سہی

کیا اللہ تعالیٰ ہمیں مشقت میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتے ہیں کہ میرا یہ بندہ ذرا سا میری طرف چلے، جب وہ چلے گا تو ہم خود اس کی رہنمائی کریں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

(العنکبوت:۶۹)

جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلیں گے۔ ذرا سی توجہ کی ضرورت ہے۔

اللہ تعالیٰ اٹھالیں گے

حضرت والا اس کی ایک مثال دیتے ہیں کہ جیسے ایک بچہ چلنا سیکھتا ہے، اور باپ یہ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا چلنا سیکھ لے، تو اب باپ ذرا دور کھڑے ہو کر بچے کو بلاتا ہے کہ بیٹا میرے پاس آؤ، جب وہ بیٹا ذرا سا قدم بڑھاتا ہے اور گرنے لگتا ہے تو باپ جلدی سے اس کو گود میں اُٹھالیتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی بندہ اللہ تعالیٰ کی طرف چلے گا اور قدم بڑھائے گا اور پھر وہ گرنے لگے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو گرنے نہیں دیں گے بلکہ آگے بڑھ کر اس کو تھام لیں گے۔ جب ایک باپ اور ماں اپنی اولاد کے ساتھ یہ معاملہ کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ جو رحمٰن الرحیم ہے، اور جو ماں اور باپ کا خالق ہے، جس نے ماں اور باپ کے دل میں شفقت اور محبّت ڈالی ہے، کیا وہ اپنے بندوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا؟ بس اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتے ہیں کہ میرا بندہ میرے راستے پر چلا ہے، اس نے تھوڑی سی محنت کی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔

غیبت کا ایک عجیب عملی علاج

پھر حضرت والا نے آگے ایک عجیب عملی علاج بیان فرمایا۔ یہ علاج کڑوا تو ہے، لیکن اگر اللہ تعالیٰ اس علاج کی توفیق دیدے تو چند دن میں غیبت چھوٹ جائے، فرمایا کہ:

> ”غیبت کا ایک عجیب و غریب عملی علاج یہ ہے کہ جس کی غیبت کرے، اس کو اپنی اس حرکت کی اطلاع کر دیا کرے،

تھوڑے دن اس پر مداومت سے انشاء اللہ یہ مرض بالکل دفع ہو جائے گا۔"

(انفاس عیسیٰ ص ۵۳)

جب کسی شخص کی غیبت ہو جائے، جاکر اس کو بتادو کہ آج میں نے تمہاری یہ غیبت کی ہے، جس وقت جاکر یہ بتائے گا اس وقت دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ "آرا" ہی اس بیماری کا آپریشن کرے گا، اگر چند مرتبہ یہ عمل کرلیا تو انشاء اللہ یہ بیماری جڑ سے نکل جائے گی۔اور دوسری بات یہ ہے کہ جب آدمی دوسرے سے جاکر کہے گا کہ میں نے تمہاری غیبت کی تھی، اس دوسرے آدمی کے دل میں بھی نرمی پیدا ہو گی کہ یہ شخص چونکہ ندامت اور پشیمانی کے ساتھ میرے پاس آیا ہے، چلو اس کو معاف کردو، چنانچہ غیبت کے نتیجے میں جو عداوت اور دشمنی اور اشتعال پیدا ہوتا ہے، وہ اشتعال پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

گیارہویں مجلس

بدگمانی اور تجسس۔ اور انکا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

گیارھویں مجلس

بدگمانی اور تجسّس اور اس کا علاج

الحمد للّٰہ رب العالمین ۔ والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ۔

أمّا بعد! فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ یٰاَ یُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضاً ۔

(سورۃ الحجرات آیت ۱۲)

بدگمانی اور تجسّس ایسے گناہ ہیں جن کو ہم نے گناہ سمجھنا ہی چھوڑ دیا ہے، حالانکہ قرآن کریم کی نص صریح ہے کہ دوسرے کے خلاف بدگمانی کرنا بھی حرام ہے اور تجسّس کرنا یعنی دوسرے کی ٹوہ میں لگنا کہ یہ کیا غلط کام کر رہا ہے، اور

دوسرے کے عیب تلاش کرنا بھی حرام ہے۔

قرآن کریم نے صاف لفظوں میں فرمادیا "وَلَا تَجَسَّسُوْا" دوسرے کی ٹوہ میں نہ لگو، بلکہ ہر شخص کو چاہئے کہ اپنے کام سے کام رکھے، دوسرے کی فکر میں نہ پڑے۔ اسی طرح بدگمانی کرنا بھی حرام ہے، کسی کے بارے میں اگر کوئی بات سامنے آئی ہے تو آدمی کو چاہئے کہ اس کے بارے میں نیک گمانی کرے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ظُنُّوا بِالمؤمنين خيراً۔

مؤمنین کے ساتھ نیک گمان رکھو۔

خواہ مخواہ بلاوجہ بدگمانی کرنا کہ اس نے یہ کیا ہوگا، اس نیت سے کیا ہوگا، یہ بدگمانی ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا:

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔

یعنی بعض گمان براہ راست گناہ ہوتے ہیں۔

معاشرتی خرابیوں کا سبب

یہ سب کام ناجائز اور حرام ہیں اور قرآن و حدیث کی نصوص ان کے خلاف صریح ہیں، ان میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اور یہ گناہ معاشرتی خرابیاں پیدا کرنے کی ذمہ دار ہیں، معاشرے میں آپس میں نااتفاقیاں، ناچاقیاں، ایک دوسرے سے لڑائیاں یہ سب بدگمانی اور تجسّس سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ دونوں بڑے گناہ ہیں اور بہت سے فتنوں کی جڑ ہیں۔

ہمارے معاشرے کی حالت

لیکن ہمارا معاشرہ ان دونوں سے بھرا ہوا ہے، ہر شخص اپنی طرف سے دوسرے کے بارے میں ایک گمان قائم کرلیتا ہے اور پھر اس پر ایسا یقین کرلیتا ہے جیسے اس نے اپنی آنکھوں سے اسے وہ کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ذرا سی بات علم میں آگئی، بس اس پر اپنی طرف سے مفروضوں کا محل تعمیر کرلے گا، پھر ان مفروضوں کو دوسروں کی طرف منسوب کردے گا کہ اس نے ایسا کیا ہوگا۔ پھر بعد میں "کیا ہوگا" بھی نہیں رہتا بلکہ "کیا ہے" ہو جاتا ہے۔

آیت قرآنی میں عجیب ترتیب

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ قرآن کریم کی اس آیت:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا

(سورۃ الحجرات آیت ۱۲)

کی تفسیر کے تحت بیان فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے عجیب ترتیب قائم فرمائی ہے، وہ یہ کہ پہلے تو یہ فرمایا کہ بدگمانی مت کرو، یعنی کسی شخص کے بارے میں کسی بات کا کوئی قرینہ اور شائبہ معلوم ہوا تو آپ اس کی تحقیق کئے بغیر اس کے بارے میں بدگمانی کرکے بیٹھ گئے، یہ فعل تو حرام ہے۔ اب جو شخص بدگمانی کر رہا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ اچھا آپ نے بدگمانی کو تو منع کر دیا کہ بلا تحقیق کے کسی کے بارے میں بدگمان مت ہو جاؤ۔ تو اچھا مجھے تحقیق کرنے کی اجازت

دیدو تاکہ میں تحقیق کروں کہ آیا اس نے یہ گناہ کیا یا نہیں؟ یہ عیب اس کے اندر موجود ہے یا نہیں؟ تو اب دوسرے مرحلے پر قرآن کریم نے یہ حکم دیدیا کہ "وَلَا تَجَسَّسُوْا" یعنی اگر تم کسی کے گناہ کی اور عیب کی تحقیق کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اس تحقیق کی بھی اجازت نہیں۔ اس لئے کہ تمہیں اس کے گناہوں کی کیا پڑی ہے کہ تم اس کی فکر میں لگ گئے کہ اس نے یہ گناہ کیا ہے یا نہیں؟

تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کا جواب اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ دے گا، تمہیں اس کی تحقیق کی کیا ضرورت ہے۔ اس لئے تجسس کرنا منع ہے۔

تجسس اور تحسس میں فرق

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے دو لفظ استعمال فرمائے، فرمایا:

وَلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا تَحَسَّسُوْا

نہ تجسس کرو اور نہ ہی تحسس کرو،

"تجسس" کے معنی وہ ہیں جو اوپر بیان کئے یعنی انسان اس فکر میں پڑے کہ دوسرے کا عیب مجھے معلوم ہو جائے، چاہے اس کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کرے۔ اور "تحسس" کے معنی وہ ہیں جس کو اردو میں "کنسوئے لینا" کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی راز کی بات چپکے سے سننے کی کوشش کرنا، وہ چھپانا چاہتا ہے اور یہ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "تجسس

اور تحسّس" دونوں کو حرام قرار دیدیا۔

تجسّس کیوں حرام ہے؟

کیوں حرام قرار دیا؟ اس لئے کہ تجسّس کرنا یا تحسّس کرنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنے عیب سے بے خبر اور بے فکر ہے، اگر اسے اپنے عیب کی فکر ہوتی تو کبھی دوسرے کے عیوب کی تجسّس میں نہ پڑتا۔ جس آدمی کے خود پیٹ میں درد ہو رہا ہو اور وہ اس درد سے بیتاب اور بے چین ہو، کیا اس کو یہ فکر ہوگی کہ فلاں کو نزلہ ہے یا نہیں؟ فلاں کو کھانسی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ اس کو اپنی فکر پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے درد سے بے چین ہے، جب تک اس درد سے اس کو سکون نہ مل جائے، وہ اس وقت تک دوسرے کی طرف کیسے دیکھے!

اپنے عیوب کی فکر کرو

اگر ہم لوگوں کو اپنے عیب کی فکر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جاکر میرا کیا انجام ہونا ہے؟ آخرت میں میرا کیا حال ہوگا؟ جب یہ فکر پیدا ہو جائے تو پھر دوسرے کی طرف نگاہ پڑ ہی نہیں سکتی۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم فرماتے ہیں ؂

تھے جب اپنے عیوب سے بے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب تک اپنی برائیوں سے بے خبر تھے، اس وقت تک یہ حال تھا کہ کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اور انہی کو برا سمجھ رہے ہیں، لیکن جب اپنے عیوب پر نگاہ پڑی تو کوئی برا نہ رہا۔

حضرت تھانویؒ کی حالت

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں، ان کو تو ساری دنیا اچھی نظر آتی ہے۔ حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس صدی کے مجدّد تھے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

"میں تمام مسلمانوں کو اپنے آپ سے حالاً اور تمام کافروں کو اپنے آپ سے مآلاً افضل سمجھتا ہوں۔"

یعنی مسلمان تو سارے کے سارے اس وقت بھی مجھ سے افضل ہیں اور کافروں کو بھی آئندہ کے اعتبار سے افضل سمجھتا ہوں کہ شاید اللہ تعالیٰ ان کو کسی وقت ایمان کی توفیق دیدے اور مآل اور انجام کے اعتبار سے وہ بھی مجھ سے آگے نکل جائیں، اس لئے میں ان کو بھی افضل سمجھتا ہوں۔ جب اتنے بڑے آدمی کا یہ حال ہے تو ہما شما کس شمار قطار میں ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ اپنے عیوب کی فکر عطا فرماتے ہیں وہ ساری دنیا کو اپنے سے افضل سمجھتا ہے، وہ دوسروں کے عیوب کی فکر میں نہیں رہتا ہے۔

لہٰذا اپنی فکر کرو کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ کیا عمل کر رہے ہو؟ کیا کیا عیب تمہارے اندر موجود ہیں؟ کیا کیا خرابیاں تمہارے اندر پائی جاتی ہیں؟ ان کو دور

کرنے کی فکر کرو۔ دوسروں کی فکر کرنا، دوسروں کا تجسس کرنا، ان کی ٹوہ میں لگنا، دوسروں کے بارے میں بدگمانی اور غیبت کرنا حرام ہے، اور اس کے ذریعہ ہم اپنی دنیا بھی خراب کر رہے ہیں اور آخرت بھی خراب کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے فضل و کرم سے ان برائیوں سے محفوظ رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مذموم بدگمانی کونسی؟

بہر حال، اس بدگمانی اور تجسس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات ہیں:

> فرمایا کہ بدگمانی تکبر سے پیدا ہوتی ہے۔ مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو، اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کرلے یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کر دے، جب تک وسوسہ پر عمل نہ ہو اس وقت تک نہ اس پر مواخذہ ہے نہ وہ مضر ہے۔
>
> (انفاس عیسیٰ: ۱۵۳)

ایک شخص کے طرز عمل سے اس کے بارے میں آپ کو کچھ شبہ ہوا، اور دل میں وسوسہ آیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلاں کام کیا ہوگا، اگر دل میں یہ وسوسہ خود بخود آیا اور خود بخود دل میں شبہ پیدا ہوا تو اس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ

اس میں آپ کے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔

دوسرے کے عمل کی تاویل کرو

مثلاً رمضان کے دن میں آپ نے ایک شخص کو ہوٹل سے نکلتے دیکھا، آپ کے دل میں خیال آئے گا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے روزہ توڑا ہے، اب یہ جو خیال دل میں خود بخود پیدا ہوا، یہ کوئی گناہ نہیں۔ البتہ آدمی کو چاہئے کہ حتی الامکان اس کے اس عمل کو صحیح محمل پر محمول کرے۔ مثلاً یہ کہ یہ شخص جو ہوٹل سے نکل رہا ہے، شاید یہ اپنے بیمار کے لئے کھانا خریدنے گیا ہوگا یا کسی آدمی سے بات کرنے کے لئے ہوٹل کے اندر گیا ہوگا۔ یہ احتمالات بھی موجود ہیں، لہٰذا دل میں یہ احتمالات پیدا کرے کہ شاید ایسا ہوا ہو، زیادہ تحقیق میں پڑنے کے ہم مکلف نہیں۔

یہ بدگمانی حرام ہے

لہٰذا خود بخود دل میں جو خیال آیا تھا، وہ گناہ نہیں، اس پر مؤاخذہ بھی نہیں، لیکن اگر دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا، اس پر آپ نے پہلے اعتقاد اور یقین کرلیا کہ یہ صاحب ہوٹل میں روزہ توڑنے کے لئے داخل ہوئے تھے اور کھانا کھاکر باہر آئے ہیں، اس کا یقین کرلیا اور دوسرے احتمالات کی طرف دھیان نہیں کیا، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر یہ کیا کہ دوسروں کے سامنے بیان کرنا شروع کردیا کہ میں نے خود اس کو روزہ میں کھاتے ہوئے دیکھا ہے، حالانکہ اس نے صرف یہ دیکھا تھا کہ وہ شخص ہوٹل سے نکل رہا تھا، کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن

دوسروں کے سامنے اس طرح بیان کر رہا ہے جیسے خود اس نے کھاتے ہوئے دیکھا تھا، اور سو فیصد یقین کے ساتھ دوسروں سے کہہ رہا ہے کہ یہ شخص روزہ خور ہے، یہ بدگمانی حرام اور ناجائز ہے۔

اس لئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ دل میں خود بخود کسی کے بارے میں کوئی گمان پیدا ہو جانا، یہ کچھ گناہ نہیں، لیکن اس گمان پر سو فیصد یقین کرا بیٹھنا اور پھر اس یقینی انداز میں اس کا تذکرہ کرنا گناہ ہے۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ:

> "مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو، اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کرلے (یعنی یقین کرلے، پہلے صرف گمان تھا پھر اس گمان کو یقین سے تبدیل کر دیا) یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کردے"

بدگمانی کے دو درجے

گویا کہ بدگمانی کے دو درجے ہوئے، ایک درجہ غیر اختیاری ہے، وہ یہ کہ اپنے کسی عمل کے بغیر دل میں کسی کی طرف سے کوئی گمان پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں۔ دوسرا درجہ اختیاری ہے، وہ یہ کہ جو گمان دل میں پیدا ہوا، اس گمان کو لے کر بیٹھ گیا، اور اس سے مختلف باتیں نکال رہا ہے، اور اس پر یقین کر رہا ہے، یا اس کا تذکرہ دوسروں کے سامنے کر رہا ہے۔ یہ دوسرا درجہ

حرام ہے، اس سے بچنا ضروری ہے۔

بدگمانی کا منشاء کبر ہے

آگے حضرت والا نے بدگمانی کا علاج بیان فرمایا کہ:

"جب کسی سے بدگمانی پیدا ہو جس کا منشا کبر ہے، تو اپنے عیوب کو پیش نظر کرلیا کرو۔

(انفاس عیسیٰ: ۱۵۳)

یہ اس کا علاج ہے۔ یعنی دوسرے کے بارے میں دل میں برا گمان آیا، دل میں بُرا خیال آیا، بدگمانی پیدا ہوئی، اگرچہ وہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ غیر اختیاری بدگمانی بھی اگر دل میں زیادہ دیر جمی رہے گی تو گناہ کے اندر مبتلا کر دے گی، یا تو دل میں یقین پیدا کردے گی یا دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ کرادے گی۔ اس لئے اس کے علاج کی بھی فکر کرنی چاہئے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چنگاری آکر گر پڑی، اور آپ نے اس کو بجھایا نہیں، تو وہ چنگاری کسی بھی وقت شعلہ بن جائے گی۔ اسی طرح غیر اختیاری گمان کا بھی علاج کرنا ضروری ہے، وہ علاج یہ ہے کہ اپنے عیوب کو پیش نظر کرلے کہ میرے اندر تو فلاں فلاں عیب ہیں تو دوسرے کو کیا دیکھوں، اور ان کے بارے میں کیا گمان کروں، میری حالت خود خراب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے، میرے اندر فلاں عیب ہے۔ لہٰذا اپنے عیوب کے استحضار کرنے سے یہ بیماری رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔

تجسّس اور بدگمانی کی انتہاء "غیبت" ہے

آگے حضرت والا نے فرمایا:

"بدگمانی، تجسّس، غیبت، ان سب کا منشا کبر ہے، بلکہ متکبر کی غرض پوری طرح غیبت ہی سے حاصل ہوتی ہے، بدگمانی اور تجسّس سب اسی کے مقدمات ہیں۔ اگر کوئی شخص تجسّس اور بدگمانی کرے، مگر غیبت نہ کرے تو اس کا مقصود حاصل نہ ہوگا، اس لئے وہ بدگمانی اور تجسّس کو بھی ترک کر دے گا۔ پس غیبت سب سے اشد ہے۔"

(ایضاً)

یعنی یہ تینوں بیماریاں، بدگمانی، تجسّس اور غیبت، یہ سب ایک اور بیماری سے پیدا ہوتی ہیں، وہ ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، جب آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے تب ہی وہ دوسرے سے بدگمان ہوتا ہے، اور تب ہی دوسرے کی ٹوہ میں لگتا ہے کہ اس کا کوئی عیب میرے ہاتھ آجائے، اور تب ہی اس کی غیبت کرتا ہے۔ اور اصل ان تینوں میں سے غیبت ہے، اور متکبر کو اصل مزہ تو غیبت کرنے میں آتا ہے، لیکن غیبت کی تمہید کے طور پر وہ متکبر بدگمانی اور تجسّس کو استعمال کرتا ہے کہ جب میں بدگمانی اور تجسّس کروں گا تو اس کے نتیجے میں غیبت کرنے کا موقع ملے گا۔ لہٰذا بدگمانی اور تجسّس غیبت کے مقدمات ہیں، کیونکہ تجسّس کے نتیجے میں کوئی عیب ظاہر ہوگا تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا اور بدگمانی کے نتیجے میں کوئی عیب دل میں آئے گا تو اس کو لوگوں کے سامنے بیان کروں گا۔

لہٰذا آخری نتیجہ تو غیبت ہے جو متکبر کی اصل غرض ہے۔ ایسا آدمی ملنا مشکل ہے جو بدگمانی کرے اور تجسس بھی کرے لیکن پھر آگے غیبت نہ کرے، کیونکہ وہ بدگمانی اور تجسس اسی لئے کر رہا ہے کہ وہ غیبت کا مزہ لینا چاہتا ہے۔ اصل مقصود تو غیبت ہے، یہ بدگمانی اور تجسس تو درمیان کے آلے اور واسطے ہیں۔ لہٰذا ان سب بیماریوں میں سب سے زیادہ اشد اور قابل توجہ بیماری "غیبت" ہے۔ اگر غیبت چھوٹ گئی تو پھر بدگمانی اور تجسس بآسانی چھوٹ جائیں گی۔

بدگمانی میں گناہ کا درجہ

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ:

> "بدگمانی میں گناہ کا درجہ تو وہ ہے جس کا ذہن میں اعتقاد راسخ ہو، اگر راسخ نہ ہو تو مضر نہیں، مگر علاج اس کا بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے، پھر اگر علاج کے بعد کچھ اثر رہے تو وہ مذموم نہیں۔"
>
> (انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

یعنی بدگمانی میں گناہ اس وقت ہے جب اس بدگمانی پر یقین کر لے، لیکن اگر یقین نہ کرے بلکہ محض احتمال کے درجے میں دل کے اندر موجود ہے کہ شاید اس نے یہ کام کیا ہو تو وہ مضر نہیں اور اس غیر اختیاری احتمال پر گناہ بھی نہیں۔ مثلاً رمضان میں کسی کو دن میں ہوٹل سے نکلتا ہوا دیکھا تو دل میں یہ خیال آیا کہ شاید اس نے روزہ توڑ دیا ہو، لیکن اس پر یقین نہیں کیا، یہ مضر تو نہیں لیکن علاج اس کا بھی ضروری ہے، کیونکہ یہ خیال ابھی چنگاری کے درجے میں ہے، ابھی

شعلہ نہیں بنی، لیکن کسی بھی وقت شعلہ بن کر تمہیں خاکستر کر دے گی۔ لہٰذا اس کا بھی علاج کرے، وہ یہ کہ اپنے عیوب کو پیش نظر رکھے۔ البتہ علاج کے بعد اب بھی تھوڑا بہت بدگمانی کا خیال دل میں آتا ہے تو وہ مذموم نہیں، کیونکہ یہ اختیار سے باہر ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو دین پر صحیح طور پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

بارہویں مجلس

بدگمانی اور تجسس کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بارھویں مجلس

الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبة للمتقین۔
والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ
واصحابہ اجمعین۔ اما بعد :

بدگمانی اور تجسس اور غیبت سے بچنے کے تین علاج

حضرت والا نے فرمایا کہ:

"بدگمانی، تجسس اور غیبت کا علاج یہ ہے کہ تواضع اختیار کرو، تکبر کو دل سے نکالو، اور جب تک اصلی مرض زائل نہ ہو اس وقت تک غیبت کا فوری علاج یہ کرو کہ (۱) فکر و تأمل سے کام لو (۲) اور کوتاہی پر جرمانہ مقرر کرو (۳) اور وسوسہ بدگمانی کے وقت توجہ کو ذکر اللہ وغیرہ کی طرف منعطف کرو۔"

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو علاج تجویز فرمائے ہیں۔ ایک علاج

پائیدار، دوسرا علاج وقتی اور فوری۔ پھر فوری اور وقتی علاج کی بھی تین صورتیں بیان فرمائیں۔ پہلا علاج یہ ہے کہ فکرو تأمل سے کام لو۔ یعنی بات کرنے سے پہلے سوچو کہ یہ بات زبان سے نکالوں یا نہ نکالوں، پہلے تولو پھر بولو۔

امام شافعیؒ کا سکوت

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے جب کوئی شخص سوال کرتا تو آپ خاموش رہتے، فوراً جواب نہیں دیتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں لیکن آپ کچھ دیر تک خاموش بیٹھے رہتے ہیں۔ جواب میں فرمایا:

حتی اعرف ان الفضل فی السکوت او فی الکلام

یعنی میں اس وقت تک خاموش رہتا ہوں جب تک میرے سامنے یہ واضح نہ ہو جائے کہ بہتری بولنے میں ہے یا خاموش رہنے میں ہے۔

یہ درحقیقت اس مقولے پر عمل ہو رہا تھا کہ ”پہلے تولو پھر بولو“۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا زبان کو سزا دینا

روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی زبان کو بیٹھے ہوئے مروڑ رہے تھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ حضرت! آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ جواب دیا کہ:

ان ھذا اوردنی الموارد

اس زبان نے مجھے ہلاکت کی جگہوں میں ڈالا ہے۔

یہ کون کہہ رہا ہے؟ صدیق اکبرؓ "صدیق" کون ہوتا ہے؟ نبی کا آئینہ، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس زبان نے مجھے ہلاکت میں ڈال دیا ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ فکر عطا فرماتے ہیں، وہ اس طرح زبان کا استعمال کرنے میں احتیاط اور اس کا استحضار رکھنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

لہٰذا اگر انسان زبان کو صحیح استعمال کرے تو بڑی اچھی چیز ہے، اور اگر اس کو غلط استعمال کرے تو یہ بڑی خراب چیز ہے۔ یہی زبان جنّت میں لے جانے والی ہے، اور یہی زبان جہنّم میں ڈالنے والی ہے۔ اگر دل کے یقین کے ساتھ زبان سے یہ کلمہ " اشهد ان لا اله الا الله واشهد ان محمداً رسول الله " پڑھ لیا، تو کافر جہنّم سے جنّت میں پہنچ جائے گا۔ اور اگر کسی مسلمان نے اس زبان سے کفر بول دیا تو وہ مسلمان سیدھا جہنّم میں پہنچ جائے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ لوگ اپنی زبان کے کرتوت کی وجہ سے جہنّم کے اندر اوندھے منہ ڈالے جائیں گے۔ اس زبان کا بے محابا استعمال کہ جو منہ میں آیا بک دیا، جو سمجھ میں آیا کہہ گزرے، اس کو چھوڑو اور بولنے سے پہلے سوچنے کی عادت ڈالو کہ یہ زبان سے جو کلمہ نکال رہا ہوں یہ کہیں مجھے ہلاکت میں تو نہیں ڈال دے گا۔

خاموش رہنے کا مجاہدہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ بہت بولتے تھے، آتے ہی بولنا شروع کر دیتے اور پھر کوئی انتہاء نہیں ہوتی تھی۔

والد صاحب برداشت کرتے تھے۔ چند روز کے بعد ان صاحب نے کہا کہ حضرت! میں آپ سے بیعت ہونا چاہتا ہوں اور اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت والد صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتے ہو تو پہلا کام یہ کرو کہ اس زبان پر تالا لگاؤ، یہ زبان جو قینچی کی طرح چل رہی ہے اس کو روکو، بس یہی تمہارا وظیفہ اور علاج ہے۔ چنانچہ اس کے بعد جب وہ مجلس میں آتے تو خاموش بیٹھے رہتے اور اسی علاج کے ذریعے ان کی اصلاح ہو گئی۔

غیبت ہونے پر جرمانہ

اس لئے بولنے میں فکر اور تأمل سے کام لو کہ میں جو بول رہا ہوں یہ غیبت ہے یا جھوٹ ہے، جائز ہے یا ناجائز ہے، حرام ہے یا حلال ہے، اس کو پہلے سوچو، اور اگر تأمل اور غور و فکر کرنے کے باوجود اور توبہ و استغفار کرنے کے باوجود پھر بھی کوتاہی ہو جائے اور غیبت سرزد ہو جائے تو پھر اپنے اوپر جرمانہ مقرر کرو کہ آئندہ جب بھی غیبت ہوگی تو اتنے پیسے ادا کروں گا۔ لیکن پیسے اتنے ہونے چاہئیں جن کو نکالنے میں تھوڑی سی تکلیف ہو، اتنا کم نہ ہو جیسے علیگڑھ کالج میں تھا۔

نماز چھوڑنے پر جرمانہ

علیگڑھ کالج میں تمام طلبہ کو مسجد میں نماز پڑھنا ضروری تھا، اگر کوئی حاضر نہ ہوتا تو فی نماز چار آنے جرمانہ ادا کرنا ضروری ہوتا۔ چنانچہ جو طلبہ بڑے بڑے رئیسوں کے بیٹے ہوتے وہ مہینے کے شروع میں ہی پورے مہینے کا جرمانہ جمع کرا دیتے۔ لہٰذا جرمانہ ایسا ہونا چاہئے جس کے ادا کرنے میں تھوڑی سی مشقت بھی ہو۔

اور یا یہ جرمانہ مقرر کرو کہ جب کبھی غیبت ہو گی تو چار رکعتیں نفل پڑھوں گا۔ اس کے نتیجے میں انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمادیں گے۔

اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاؤ

ایک علاج یہ بھی ہے کہ جب کبھی دوسرے کی طرف سے بدگمانی کا خیال آئے تو اپنی توجہ کو ذکر اللہ کی طرف منعطف کردو، مثلاً استغفر اللہ پڑھنا شروع کردو، کلمہ پڑھنا شروع کردو، کوئی تسبیح پڑھنا شروع کردو اور اپنی توجہ اس طرف سے پھیر لو۔

تواضع پیدا کرو

یہ تو وقتی علاج تھے، مستقل علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو، کیونکہ جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ یہ ساری بیماریاں تکبر کے ہونے سے اور تواضع کے نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ دل میں اپنی بڑائی ہے کہ جو میں سوچتا اور سمجھتا ہوں، وہ درست ہے، میں بڑا عقل مند ہوں، میں بڑا عالم ہوں، میں بڑا پارسا ہوں، یہ سب تکبر کے خیالات ہیں جو انسان کے اندر غیبت، بدگمانی اور تجسس کا داعیہ پیدا کرتے ہیں۔ ان سب کا علاج یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کرو۔

اپنی حقیقت میں غور کرو

اب تواضع کیسے پیدا ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ کسی شیخ کا دامن پکڑ لو، کیونکہ شیخ کے سامنے رگڑے کھائے بغیر کام نہیں بنتا، اس کی چپت کھاؤ، اس کی

ڈانٹ کھاؤ، اس کے ساتھ لگے لپٹے رہو، اس کی نگاہوں کو برداشت کرو، اس کے خلاف طبع امور کو برداشت کرو، تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ تواضع پیدا ہو جائے گی۔ اور جب تک شیخ نہ ملے یا شیخ سے تعلق قائم نہ ہو، اس وقت تک کم از کم اتنا کرو کہ اپنی حقیقت کو سوچا کرو کہ میری حقیقت کیا ہے؟ میری ذات میں کوئی کمال ہے؟ جو کچھ میرے اندر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے۔ اگر صحت ہے وہ بھی اللہ کی عطا ہے، اگر میرے اندر حسن ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر علم میرے پاس ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اگر پیسہ ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اور وہ جب چاہے ان کو واپس لے لے۔ ایک آدمی بڑا صحت مند اور تندرست ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ چاہیں اس کی صحت کو واپس لے لیں۔

ایک صاحب کی قوّت اور کمزوری

میرے ایک عزیز تھے، جن کا انتقال ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی قوت دی تھی کہ برف کی سل کو ایک مکّا مار کر توڑ دیتے تھے۔ تربوز کو کبھی چھری سے نہیں کاٹتے تھے، بس ہاتھ مارا اور توڑ دیا۔ آخر عمر میں جب بیمار ہوئے تو میں ان کی عیادت کے لئے گیا، دیکھا کہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور ہاتھ اوپر اٹھانے کی طاقت بھی نہیں تھی، جب مجھے دیکھا اور ملاقات ہوئی تو میں نے دل میں کہا کہ یہ وہی "حامد" ہے جو برف کی سل اپنے ہاتھ سے توڑ دیا کرتا تھا، اور اب یہ حالت ہے کہ ہاتھ خود سے نہیں اٹھا سکتا۔ لہٰذا انسان کس بات پر ناز اور فخر کرے۔

عِلم پر ناز نہ کریں

مولوی کو عِلم کا بہت ناز ہوتا ہے کہ میں بڑا عالم ہوں، مجھے بہت کچھ آتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جب چاہیں اس علم کو سلب فرمالیں۔ چنانچہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ دکھادیتے ہیں کہ کاغذ قلم لے کر لکھنے بیٹھے تو اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھیں، جبکہ ہمیں اپنے لکھنے پر ناز ہے، ہم بڑے اچھے اہل قلم ہیں۔ بعض اوقات اپنے نام کے ہجے نہیں آتے کہ کس طرح اپنا نام لکھیں۔ لہٰذا انسان کس چیز پر ناز کرے، کس چیز پر اکڑے، کس چیز پر بھروسہ کرے، جو کچھ حاصل ہے، وہ سب ان کی عطا ہے، وہ جب چاہیں سلب کرلیں۔ جس دن یہ بات دل میں بیٹھ گئی اور اپنی بڑائی کا احساس دل سے نکل گیا کہ میں تو کچھ نہیں ہوں، ذرّہ ناچیز ہوں، بے مقدار ہوں، ہیچ در ہیچ ہوں، بس اس دن انشاء اللہ تواضع پیدا ہو جائے گی۔

آڑ میں بیٹھ کر باتیں سننا

آگے ارشاد فرمایا:

> آڑ میں بیٹھ کر کسی کی باتیں سننا بھی تجسس میں داخل ہے، جس کو آڑ میں بیٹھنا ہے تو زبان سے کہہ دینا چاہئے کہ میں بیٹھا ہوں یا اس کے سامنے بیٹھنا چاہئے، غرض کسی طرح اپنے بیٹھنے کی اطلاع کردے۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

مثلاً دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں اب آپ نے آڑ میں جا کر ان کی

باتیں سننا شروع کر دیں، یہ گناہ اور حرام ہے اور تجسس کے اندر داخل ہے۔ لہٰذا جو شخص آڑ میں بیٹھا ہو وہ باتیں کرنے والوں کو بتا دے کہ میں یہاں پردے میں بیٹھا ہوں، تاکہ اگر وہ راز کی باتیں کرنا چاہتے ہیں تو نہ کریں، یا ان کے سامنے آکر بیٹھ جائے۔

ہمارا طریقہ

آج ہمارے معاشرے میں سب کام الٹے ہو رہے ہیں۔ ایسے موقع پر لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اپنے آپ کو چھپالیں، اور باتیں کرنے والوں پر یہ ظاہر نہ کریں کہ میں یہاں پر موجود ہوں، اور آرام سے بیٹھ کر ان کی باتیں سنوں۔ یاد رکھئے! یہ سب تجسس میں داخل ہے اور حرام ہے، ناجائز ہے۔ دیانت کا تقاضہ یہ تھا کہ تم اپنے وجود کو ان پر ظاہر کر دیتے تاکہ وہ لوگ سوچ سمجھ کر باتیں کرتے۔

لڑائی جھگڑے کی جڑ

ہماری شریعت نے ہمیں ایسی ایسی باتیں بتائی ہیں کہ اگر واقعۃً ہم لوگ اس پر عمل کرلیں تو آپس میں کوئی جھگڑا پیدا ہی نہ ہو اور معاشرے میں کوئی فساد رونما ہی نہ ہو۔ جہاں کہیں فتنہ و فساد اور جھگڑا ہوتا ہے وہ شریعت کی کسی نہ کسی تعلیم کو چھوڑنے کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ شریعت نے فتنہ اور فساد اور جھگڑے کے راستے پر ایسے پہرے بٹھائے ہیں کہ اگر ہم ان پر عمل کرلیں تو پھر کوئی جھگڑا ہی نہ ہو۔ چنانچہ ایک طرف تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں یہ حکم دیا کہ:

لا یتناجیٰ اثنان دون ثالث

یعنی اگر محفل میں تین آدمی ہیں، تو ان میں سے دو آدمیوں کو یہ نہیں کرنا چاہئے کہ آپس میں علیحدہ ہو کر اس طرح باتیں کرنے لگیں کہ تیسرا آدمی اکیلا رہ جائے، ایسا کرنا جائز نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ تیسرے کو یہ احساس اور خیال ہوگا کہ انہوں نے مجھے اکیلا کر دیا اور میرے بارے میں کوئی بات کر رہے ہیں اور مجھ سے وہ بات چھپانا چاہتے ہیں، اس سے اس کی دل شکنی ہوگی۔ اس لئے دو آدمی علیحدہ ہو کر سرگوشی نہ کریں۔

ایسی جگہ پر مت جاؤ

اور دوسری طرف یہ حکم دیا کہ اگر پہلے سے دو آدمی سرگوشی کر رہے ہیں تو تیسرے کو چاہیئے کہ وہ وہاں نہ جائے، تاکہ ان کی باتوں میں خلل واقع نہ ہو، ان کو اپنی باتیں کرنے دو، تم بیچ میں جا کر کیوں گھستے ہو؟ - یہ ساری باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتا دیں، لیکن ہم نے بس چند چیزوں کا نام دین رکھ لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، بس قصہ ختم، دین کو اسی میں منحصر سمجھ لیا، زندگی گزارنے کے جو آداب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتائے ہیں، ان کو قطعی طور پر دین سے خارج ہی کر دیا، حالانکہ یہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔

فون پر دوسروں کی باتیں سننا

یا مثلاً ٹیلیفون ہے۔ اب آپ نے ٹیلیفون کرنے کے لئے ریسیور اٹھایا اور جب کان سے لگایا تو اس میں دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کسی دوسرے کی لائن آپ کے فون سے مل گئی تھی، آپ نے ان کی باتیں سننا شروع کر دیں، حالانکہ آپ کے لئے فون پر ان کی باتیں سننا جائز نہیں، بلکہ آپ فون بند کر دیں۔ اگر آپ ان کی باتیں سنیں گے تو وہ تجسس میں داخل ہے جو ناجائز اور حرام ہے۔

دوسروں کے خط پڑھنا

یا مثلاً دوسرے کا خط آپ کے ہاتھ لگ گیا، تو آپ کے لئے اس کی اجازت کے بغیر اس کا خط پڑھنا جائز نہیں۔ یہ بھی تجسس کے اندر داخل ہے اور گناہ ہے۔

جائز تجسس

بعض اوقات انتظامی طور پر "تجسس" ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ادارے کا سربراہ اور ذمہ دار ہے، وہ اگر تجسس نہ کرے تو ادارے میں فساد پھیل جائے، مثلاً ذمہ دار کا یہ تجسس کرنا کہ کہیں ہمارے زیرانتظام ادارے میں کوئی ایسا جرم تو نہیں ہو رہا ہے جو خطرناک قسم کا ہو۔ اس حد تک تجسس کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اب پولیس کے محکمے کو دیکھ لیں وہ تو تجسس ہی کے کام کے لئے بنایا گیا ہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ رات کو مدینہ منورہ کی گلیوں میں

گشت کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ گشت کے دوران دیکھا کہ ایک گھر سے گانے کی آواز آرہی ہے اور کچھ گلاسوں کے کھڑکنے کی بھی آواز آئی، ان کو خیال ہوا کہ شاید یہاں پینے پلانے کا شغل ہو رہا ہے اور گانا بجانا بھی ہو رہا ہے، تھوڑی دیر تو آپ سب سنتے رہے، پھر دیوار پھاند کر اندر داخل ہوگئے، اور دیکھا کہ وہاں شراب پی جارہی ہے اور گانا بجانا ہو رہا ہے، چنانچہ آپ نے رنگے ہاتھوں ان کو پکڑ لیا۔ ان کا جو سربراہ تھا، وہ بڑا ہوشیار تھا، اس نے پوچھا کہ آپ نے ہمیں کیوں پکڑا؟ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تم شراب پی رہے تھے اور گانا بجانا کر رہے تھے، تم مجرم ہو، اس لئے تمہیں پکڑ لیا۔ ان کے سربراہ نے کہا کہ ہم نے تو ایک ہی گناہ کیا تھا اور آپ نے کئی گناہ کئے، ایک گناہ تو آپ نے یہ کیا کہ آپ نے تجسس کیا اور ہماری ٹوہ میں لگے کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ دوسرا گناہ یہ کیا کہ اجازت کے بغیر ہمارے گھر میں داخل ہوئے اور اجازت کے بغیر دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز نہیں۔ تیسرا گناہ یہ کیا کہ دیوار پھاند کر داخل ہوئے، حالانکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

وَأْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا۔

یعنی گھروں میں دروازے کے ذریعہ آؤ۔

لہٰذا ہم نے تو صرف ایک گناہ کیا تھا اور آپ نے تین گناہ کئے۔

آپؓ کا استغفار کرنا

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی یہ بات سن کر تینوں

گناہوں پر استغفار کیا کہ کہیں واقعی مجھ سے یہ گناہ سرزد نہ ہو گئے ہوں، اس لئے میں اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہتا ہوں۔ ہم جیسا ہوتا تو اس شخص کو دو تھپڑ مارتا کہ کم بخت ایک طرف تو یہ گناہ کرتا ہے اور دوسری طرف میرے اوپر یہ اعتراض کرتا ہے، چوری اور سینہ زوری۔ لیکن چونکہ یہ حضرات ساتھ ساتھ اپنے نفس کا بھی علاج کیا کرتے تھے، اس لئے انہوں نے یہ سوچا کہ چونکہ میری ذات پر اعتراض آیا ہے، تو اس کی مدافعت نہ کرنی چاہئے، بلکہ اس کے اندر جس خرابی کا احتمال ہے، اس کا تدارک کرنا چاہئے۔ اس لئے فوراً استغفار کیا۔

صحابہ کرامؓ کا فیصلہ

پھر یہ مسئلہ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے سامنے پیش کیا کہ یہ شخص مجھے یہ کہہ رہا ہے کہ میں نے تین گناہ کئے۔ آیا واقعۃً میں نے تجسّس کا گناہ کیا؟ اور یہ تجسّس کرنا میرے لئے گناہ تھا یا نہیں تھا؟ اور میرا اس طرح دوسرے کے گھر میں داخل ہونا جائز تھا یا نہیں تھا؟ صحابہ کرامؓ کی اس جماعت نے مشورہ کرنے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ جو ذمہ دار آدمی ہے، اگر اس کو یہ اندیشہ ہو کہ یہ فساد ایسا ہے جو معاشرے میں پھیل جائے گا اور لوگوں کے اندر اس کے بُرے اثرات مرتب ہوں گے تو اس صورت اس ذمہ دار کے لئے تجسّس کرنا بھی جائز ہے، اور اجازت کے بغیر اندر داخل ہونا بھی اس کے لئے جائز ہے، اور دیوار پھاندنا بھی جائز ہے۔ لیکن اگر متعدی خرابی کا اندیشہ نہ ہو، مثلاً ایک آدمی اپنے گھر میں کوئی ایسا عمل کر رہا ہے جس کا فساد اس کی ذات کی حد تک محدود ہے، اس کے بُرے اثرات دوسروں

تک متعدّی نہیں ہوں گے، تو اس صورت میں ذمہ دار اور سربراہ کو بھی تجسّس کرنا جائز نہیں۔ چنانچہ فقہاء کرامؒ نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے کہ کِن حالات میں تجسّس جائز ہے اور کِن حالات میں تجسّس جائز نہیں۔

فقہاء کا قول فیصل

امام خصّاف رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "ادب القضاء" ہے، اس کی شرح علامہ صدر الشہید رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے۔ اس میں اس موضوع پر بہت طویل بحث کی ہے اور فقہاء کرام کا اختلاف نقل کیا ہے کہ کس حالت میں تجسّس جائز ہے اور کس حالت میں جائز نہیں۔ اس اختلاف میں قول فیصل یہ ہے کہ جہاں کسی متعدّی بُرائی کا اندیشہ ہو تو وہاں سربراہ کے لئے سب کچھ کرنا جائز ہے، تجسّس کرنا بھی جائز، دیوار پھاندنا بھی جائز، اجازت کے بغیر اندر گھسنا بھی جائز۔ اور جہاں متعدّی بُرائی کا اندیشہ نہ ہو بلکہ ایک شخص کا ذاتی عمل ہے، وہ اپنے گھر میں بیٹھا کر رہا ہے تو اس وقت سربراہ کے لئے بھی تجسّس کرنا جائز نہیں۔

دارالعلوم کراچی کی تھوڑی سی ذمہ داری ہمارے سپرد بھی ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں یہ تجسّس کرنا پڑتا ہے کہ دارالاقامہ میں کیا ہو رہا ہے، طلبہ کن سرگرمیوں میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ یہ اس وقت جائز ہے جب کسی متعدّی خرابی کا اندیشہ ہو ورنہ سکوت افضل ہے۔

اپنے جاگنے کی اطلاع کر دے

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اسی طرح ایک آدمی سونے کو لیٹ گیا، اور دوسروں کو یہ
خیال ہوا کہ یہ سو گیا ہے اور وہ آپس میں باتیں کرنے لگیں،
مگر یہ جاگ رہا تھا تو اس کو چاہئے کہ ان کو اطلاع کر دے کہ
میں جاگ رہا ہوں، البتہ اگر وہ لوگ اسی کے متعلق باتیں کر
رہے ہوں اور اس کو ضرر پہنچانا چاہتے ہوں تو تجسّس کے
ساتھ ان کی گفتگو سننا جائز ہے۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

آج کل الٹا معاملہ ہوتا ہے کہ جاگنے والا اپنے آپ کو اور زیادہ سوتا ہوا ظاہر کرتا ہے تاکہ ان کی گفتگو کے ذریعہ تمام رازوں کا پتہ چل جائے اور بعد میں وہ اپنی مہارت اور استادی دکھائے کہ تم نے جو جو باتیں کیں اس کا ہمیں پتہ چل گیا ہے۔ حالانکہ شرعاً ایسا کرنا جائز نہیں، جاگنے والا بتادے کہ میں جاگ رہا ہوں، یہ بھی شریعت کا حکم ہے۔ البتہ اگر وہ گفتگو کرنے والے اسی کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں اور اس کو نقصان پہنچانا چاہتے ہوں تو پھر اس طرح چپکے چپکے باتیں سننا جائز ہے تاکہ ان کے شر سے اپنے آپ کو بچاسکے۔

زبان دانی کی اطلاع کر دے

آگے حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

نیز اگر دو شخص انگریزی یا عربی میں گفتگو کر رہے ہوں، اور
تیسرا شخص بھی ان زبانوں کو سمجھتا ہوں، مگر ان دونوں کو
خبر نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ ان دونوں کو مطلع کر دے کہ

میں عربی یا انگریزی سمجھتا ہوں۔

(انفاس عیسیٰ: ۱۵۴)

تاکہ دھوکہ میں آکر اپنا راز فاش نہ کر دیں۔ مقصد یہ ہے کہ نہ تو انسان خود تجسّس کرے اور نہ ہی تجسّس کے اسباب پیدا کرے، اور نہ ہی دوسرے کو ایسی غلط فہمی میں مبتلا کرے جس سے وہ یہ سمجھے کہ یہ بے خبر ہے اور تم اس کی نادانستگی میں اس کے کسی راز پر مطلع ہو جاؤ۔

ایک بزرگ کا تجسّس سے بچنا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین میں ایک بزرگ تھے، انگریزی تعلیم یافتہ تھے، مگر حضرت والا کی صحبت نصیب ہوئی تو ان کی وضع قطع بھی ایسی ہو گئی جیسے دیندار لوگوں کی اور مولویوں کی ہوتی ہے، چہرے پر ڈاڑھی، لمبا کرتا وغیرہ، وہ ایک مرتبہ ریل میں سفر کر رہے تھے، ان کے قریب ہی دو آدمی اور بیٹھے تھے، وہ بھی انگریزی داں تھے، وہ دونوں اِن کا حلیہ دیکھ کر یہ سمجھے کہ یہ کوئی مولوی ہے، ان کو انگریزی کیا آتی ہو گی، چنانچہ ان دونوں نے بیٹھ کر انہی کے بارے میں انگریزی میں باتیں کرنا شروع کر دیں۔ انگریزی میں باتیں کرنے کا مقصد ان سے چھپانا تھا کہ یہ مُلاّ آدمی ہے، انگریزی کیا سمجھے گا۔ ابھی گفتگو شروع ہی کی تھی کہ یہ بزرگ سمجھ گئے کہ یہ دونوں صاحب مجھ سے چھپ کر کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں، اس لئے انگریزی میں باتیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہ یہ بات دیانت کے خلاف ہے کہ میں اسی طرح بیٹھ کر ان کی باتیں سنتا رہوں، چنانچہ ان بزرگ نے ان دونوں سے کہدیا کہ ”میں انگریزی جانتا ہوں، اگر آپ کو مجھ

سے چھپ کر باتیں کرنی ہیں تو کوئی اور طریقہ اختیار کریں، اس دھوکے میں نہ رہیں کہ میں انگریزی نہیں جانتا، اگر آپ کہیں تو میں اٹھ کر چلا جاتا ہوں تاکہ آپ علیحدگی میں باتیں کرلیں۔

بہر حال، ان بزرگ کو یہ جو خیال آیا کہ یہ دونوں یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں زبان نہیں جانتا، اور مجھ سے چھپ کر باتیں کرنا چاہتے ہیں، اب اگر میں خاموش بیٹھا رہوں تو یہ "تجسس" میں داخل ہو جائے گا، یہ خیال ان کے ذہن میں کیوں پیدا ہوا؟ اس لئے کہ "تھانہ بھون" میں کچھ دن گزار لئے تھے اور حضرت والا کی صحبت نصیب ہوگئی تھی، ورنہ آج کیا کسی کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میں بتادوں کہ جس زبان میں تم باتیں کر رہے ہو، میں یہ زبان جانتا ہوں، آج اگر کوئی یہ بات بتائے گا بھی تو اپنا عِلم جتانے کے لئے بتائے گا کہ ہمیں جاہل مت سمجھنا، ہمیں بھی یہ زبان آتی ہے، اس لئے نہیں بتائے گا کہ کہیں تجسس کے گناہ میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ بلکہ آجکل تو اس کو کمال سمجھا جائے گا کہ چپکے چپکے بات سنتے رہیں اور بعد میں اس کا اظہار کریں گے کہ تم نے تو ہم سے چھپانے کی کوشش کی، لیکن ہم کو سب پتہ چل گیا کہ آپ نے کیا کیا باتیں کیں۔

بات یہ ہے کہ ان سب باتوں کا خیال کرنا دین کا ایک حصہ ہے، آج ہم نے ان کو دین سے خارج کر دیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ فکر عطا فرمادیں تو پھر یہ سب باتیں سمجھ میں آنے لگتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

تیرہویں مجلس

تکبر اور اس کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

تیرھویں مجلس

تکبّر اور اس کا علاج

الحمد لله رب العالمین ۔ والعاقبة للمتقین والصلاة والسلام علی رسوله الکریم ۔ وعلی آله وأصحابه اجمعین ۔ وعلی کل من تبعهم باحسان إلی یوم الدین ۔ أمّا بعد!

کائنات کا سب سے پہلا گناہ

کبر، یعنی تکبّر بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس سے بہت سی باطنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کو "امّ الامراض" کہا جاتا ہے۔ اور سب سے پہلا گناہ جو کائنات میں سرزد ہوا، وہ کبر کا گناہ تھا۔ جب اللہ جل شانہ نے ابلیس سے کہا کہ (حضرت) آدم کو سجدہ کرو، تو اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا اور دلیل یہ

دی کہ:

اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ

(سورۃ الاعراف، آیت ۱۲)

میں اس سے بہتر ہوں، اپنے کو اس ابلیس نے بڑا سمجھا اور حضرت آدم علیہ السلام کو چھوٹا سمجھا۔ اس کی دلیل بھی بہت مضبوط پیش کی کہ آپ نے ان کو مٹی سے پیدا کیا ہے اور مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور آگ مٹی سے افضل ہے۔

اگر دلیل کی طرف دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ یہ دلیل بڑی قوی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نہ ماننے کے نتیجے میں کبر کا جو مظاہرہ ہوا، یہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی وہ نافرمانی تھی جو سب سے پہلے سرزد ہوئی، اور اسی تکبر کے نتیجے میں شیطان ہمیشہ کے لئے راندۂ درگاہ ہوا۔

"تکبر" تمام گناہوں کی جڑ ہے

اسی تکبر سے "حسد" پیدا ہوتا ہے، کیونکہ جب دل میں یہ خیال ہے کہ میں بڑا ہوں، اب اگر دوسرا آدمی اس سے آگے بڑھ گیا اور ترقی کر گیا تو دل میں یہ حسد پیدا ہوتا ہے کہ یہ آدمی کیوں آگے بڑھ گیا، مجھے آگے بڑھنا چاہئے تھا۔

اسی تکبر سے "بغض" پیدا ہوتا ہے، "غصہ" کی کثرت تکبر کی وجہ سے ہوتی ہے، "غیبت" کا گناہ عموماً تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، "تجسس" بھی تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، غرض یہ کہ "تکبر" بے شمار امراض کی جڑ ہے۔ جس طرح جسمانی امراض کے ماہرین اور اسپیشلسٹ ہوتے ہیں، کوئی کان کا اسپیشلسٹ ہے،

کوئی ناک کا اسپیشلسٹ ہے، کوئی حلق کا اسپیشلسٹ ہے، اسی طرح روحانی امراض کے اسپیشلسٹ بھی ہوتے ہیں، ان میں ایک امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، وہ اپنی کتاب "احیاء العلوم" میں فرماتے ہیں کہ یہ تکبر "ام الامراض" ہے، یعنی تمام بیماریوں کی ماں ہے۔ اگر یہ ایک مرتبہ پیدا ہو جائے تو دوسری بیماریاں اس سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس بیماری کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس بیماری سے محفوظ فرمائے اور اگر یہ بیماری ہمارے اندر ہے تو اس کا علاج بھی فرمادے۔ آمین۔

کبر کے معنی

"کبر" کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا، اگر کسی کی عمر ۳۰ سال ہے اور دوسرے کی عمر بیس سال ہے تو ظاہر ہے کہ تیس سال والا شخص اپنے آپ کو بیس سال والے سے عمر کے اعتبار سے بڑا سمجھے گا، یہ کبر نہیں اور بری بات نہیں، اپنے آپ کو بڑا یعنی افضل سمجھنا کہ میں اس سے بہتر ہوں، میں اس سے اچھا ہوں، یہ کبر ہے۔

اور جب اپنی بڑائی دل میں ہوتی ہے تو پھر اپنے کسی انداز و ادا سے اس کا مظاہرہ بھی ہو جاتا ہے، مثلاً گفتگو سے، قول سے، فعل سے، اس کا نام ہے "تکبر" لہٰذا دوسرے کے مقابلے میں بڑائی جتلانا تکبر ہے۔ یہ فرق ہے "تکبر" اور "کبر" میں۔ گویا کہ "کبر" یہ ہے کہ دل میں اپنی بڑائی کا پیدا ہونا اور تکبر یہ ہے کہ دوسرے کے مقابلے میں اپنی بڑائی جتلانا، مثلاً دوسرے سے اس انداز سے گفتگو کرنا جس میں دوسرے کی تحقیر شامل ہو۔ یہ تکبر کبر کا نتیجہ ہوتا ہے، اس کو ختم

کرنے کی ضرورت ہے۔

تکبر ایک مخفی بیماری ہے

یہ بیماری ایسی ہے کہ اکثر و بیشتر انسان کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ بیماری میرے اندر ہے یا نہیں۔ اور وہی بیماری سب سے زیادہ خطرناک ہے جو اندر ہی اندر بڑھتی چلی جائے، اور اس کا پتہ ہی نہ چلے، جیسے آج کل ڈاکٹر یہ کہتے ہیں کہ سب سے خطرناک بیماری ''کینسر'' کی ہے، اس لئے کہ یہ بیماری ایسی ہے کہ جب انسان کے بدن میں پیدا ہو جاتی ہے تو اندر ہی اندر بڑھنے لگتی ہے، اس وقت نہ بیمار کو پتہ چلتا ہے، نہ ڈاکٹر کو پتہ چلتا ہے کہ اندر کیا ہو رہا ہے، کیونکہ جب بیماری میں انسان کو تکلیف ہوتی ہے اُس وقت پتہ چلتا ہے کہ میرے اندر یہ بیماری ہے۔ اس لئے بیماری کے اندر تکلیف کا ہونا یہ بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، کیونکہ تکلیف اس بات کا سگنل ہوتا ہے کہ اندر کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے، لہٰذا آدمی ڈاکٹر کے پاس اس کے علاج کے لئے جاتا ہے اور اپنا علاج کرالیتا ہے اور ٹھیک ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر بیماری تو اندر پیدا ہو گئی اور اس کی تکلیف نہیں ہوئی تو اب اس کے علاج کی طرف بھی دھیان نہیں جائے گا اور اس کے تدارک کی فکر نہیں ہوگی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بیماری اندر ہی اندر بڑھتی چلی جاتی ہے، اور انسان کو اس وقت پتہ چلتا ہے جب وہ ناقابل علاج ہو جاتی ہے اور اس کے بعد کوئی علاج ممکن نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

اسی طرح کبر کی بیماری بھی ایسی ہی ہے، آدمی اپنے آپ کو یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں، لیکن حقیقت میں وہ کبر اور تکبر کا شکار ہوتا ہے، اور یہ

بیماری اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ کبھی آپ نے یہ سنا کہ کسی متکبر نے یہ کہا ہو کہ میں تکبر کرتا ہوں، آج تک کسی نے یہ اقرار نہیں کیا۔

ٹخنوں سے نیچے شلوار لٹکانا

ایک بات ہمارے معاشرے میں بہت مشہور ہو گئی ہے، وہ یہ کہ ٹخنوں سے نیچے پاجامہ، شلوار وغیرہ پہننے کی جو ممانعت حدیث شریف میں آئی ہے، اس کے بارے میں لوگوں نے یہ حیلہ نکالا ہے کہ حدیث شریف میں تو یہ آیا ہے کہ جو شخص تکبر کی وجہ سے پاجامہ یا شلوار ٹخنوں سے نیچے لٹکائے گا تو وہ حصہ جہنّم میں جائے گا، اب لوگ یہ کہتے ہیں کہ دیکھئے! اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبر کی قید لگائی ہے، لہٰذا تکبر کی وجہ سے شلوار کو نیچے لٹکانا تو ناجائز ہے، لیکن اگر تکبر کے بغیر ویسے ہی فیشن کے طور پر لٹکالیا، یا اس لئے لٹکالیا کہ ہمیں اس طرح لٹکانا اچھا لگتا ہے تو پھر کوئی گناہ نہیں، اور ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے۔ یہ بات لوگوں نے بہت زیادہ مشہور کر رکھی ہے۔ میرا یورپ اور امریکہ جانا ہوا تو دیکھا کہ وہاں کے مسلمانوں میں یہ بات بہت مشہور ہے اور جس سے بھی پوچھا جائے تو وہ یہی کہتا ہے کہ ہم یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے۔

میں ان سے یہ کہتا ہوں کہ اچھا تم مجھے کوئی ایک آدمی بھی ایسا دکھا دو جو کہتا ہو کہ میں تکبر کی وجہ سے شلوار نیچے لٹکاتا ہوں۔ کوئی آدمی ایسا ملے گا؟ نہیں ملے گا، کیونکہ تکبر ایسی چیز ہے کہ اگر متکبر کو پتہ چل جائے کہ میں تکبر کرتا ہوں تو بس تکبر ختم ہو جائے۔ تکبر تو پیدا ہی اس طرح ہوتا ہے کہ جس شخص کے اندر تکبر ہے اس کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ میں کبر اور تکبر کے اندر مبتلا ہوں۔ یہ شیطان

کا دھوکہ ہے کہ آدمی یہ کہے کہ میں یہ کام تکبر کی وجہ سے نہیں کرتا ہوں، لہٰذا میرے لئے یہ عمل جائز ہے۔

حضور ﷺ کے ازار کی کیفیت

حالانکہ دنیا میں کسی شخص کے بارے میں یہ گارنٹی نہیں ہے کہ وہ تکبر سے پاک ہوگا، سوائے حضور اقدس نبی کریم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے، آپ کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ آپ ﷺ تکبر سے پاک تھے، اب جس ذات اقدس کے بارے میں یہ گارنٹی ہے کہ وہ تکبر سے پاک تھے، وہ تو اپنا ازار ٹخنوں سے نیچے نہیں لٹکاتے بلکہ آپ اپنا ازار نصف ساق تک رکھتے تھے، کیونکہ ٹخنوں سے نیچے لٹکانا تکبر والا کام ہے، اور ہم لوگ جن کے اندر تکبر پیدا ہونے کا ہر وقت خطرہ ہے، لیکن ازار نیچے لٹکا کر یہ کہتے ہیں کہ ہم تکبر سے نہیں لٹکاتے، اس سے زیادہ شیطان کا دھوکہ اور کیا ہوگا۔ اس لئے کہ یہ تکبر ایک ایسا امر مخفی ہے کہ متکبر کو پتہ نہیں لگتا کہ میں تکبر کر رہا ہوں۔

ظاہری تواضع میں مخفی تکبر

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ایک آدمی ایسا کام کر رہا ہوتا ہے جو بظاہر تواضع کا ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ سراسر تکبر ہوتا ہے۔ جیسے آج کل یہ رواج ہے کہ لوگ اپنے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ میں بالکل ناکارہ ہوں، میں گیا گزرا جاہل ہوں۔ اب یہ الفاظ تو بظاہر تواضع کے ہیں کہ وہ شخص اپنے آپ کو ناکارہ اور جاہل کہہ رہا ہے، لیکن بسا اوقات یہ سراسر تکبر ہوتا

ہے، کیونکہ وہ شخص یہ الفاظ اس لئے کہتا ہے تاکہ سامنے والا پلٹ کر یہ کہے کہ جناب! آپ جاہل کہاں، آپ تو بہت بڑے علامہ ہیں۔ اس کا آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں، وہ اس طرح کہ جو شخص اپنے آپ کو یہ کہہ رہا ہے کہ میں جاہل ہوں، میں ناکارہ ہوں، اس کے جواب میں کوئی دوسرا شخص یہ کہدے کہ بیشک آپ جاہل اور ناکارہ ہیں، بس اس وقت اس کی طبیعت صاف ہو جائے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ سچے دل سے یہ الفاظ نہیں کہہ رہا تھا بلکہ اس لئے کہہ رہا تھا تاکہ سامنے والا پلٹ کر اس کے لئے تعریفی کلمات کہے، یہ تواضع نہیں بلکہ تکبر ہے۔

لہٰذا یہ تکبر بڑا دقیق اور باریک ہوتا ہے، اس کے وجود کا پتہ نہیں چلتا، اس لئے کسی معالج کی ضرورت ہوتی ہے جو یہ پہچان کر بتائے کہ اس کے اندر تکبر ہے۔

بظاہر تکبر حقیقت میں تکبر نہیں

بعض اوقات بظاہر دیکھنے میں تکبر نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں نہیں ہوتا، جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

انا سید ولد آدم ولا فخر

میں آدم کے تمام بیٹوں کا سردار ہوں

یہ کون کہہ رہا ہے؟ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم، اگر کوئی دوسرا آدمی یہ بات کہے تو یہ اس کے حق میں بڑائی کا جملہ ہے۔ لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے ہیں کہ میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، لیکن یہ بات کسی فخر اور تکبر کی وجہ سے نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا شکر ادا کرتے

ہوئے کہہ رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے آدم کے بیٹوں کی سرداری عطا فرمائی ہے۔ اب ظاہر میں یہ الفاظ بڑائی کے ہیں، حقیقت میں بڑائی نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا تعریف پر ہنسنا

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ، بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ان کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی شخص ان کے پاس آکر ان کی تعریف کرتا کہ حضرت! آپ نے بڑا اچھا وعظ فرمایا، فلاں بات بڑی اچھی ارشاد فرمائی، تو وہ بہت خوش ہوتے اور ہنستے تھے، اب دیکھنے والا یہ سمجھتا کہ یہ بزرگ اپنی تعریف سن کر خوش ہو رہے ہیں، اور جس شخص کے دل میں عجب اور کبر ہوتا ہے اس کی تو خواہش ہی یہ ہوتی ہے کہ دوسرا آدمی میری تعریف کرے اور تعریف سن کر اس کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ کسی شخص نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! آپ کو اپنی تعریف سن کر بڑا مزہ آتا ہے، کیونکہ جب کوئی آپ کے کسی کام کی تعریف کرتا ہے تو آپ بہت خوش ہوتے ہیں۔ حضرت نے جواب میں فرمایا، ہاں بھائی! میں بہت خوش ہوتا ہوں، اس لئے کہ کوئی شخص میرے کسی عمل کی تعریف کرتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ میرا تو کوئی عمل نہیں ہے، وہ تو میرے اللہ نے مجھے توفیق دی تو میں نے وہ عمل کر لیا، تو درحقیقت میرے اللہ کی تعریف ہوتی ہے، اور میں اللہ کی تعریف پر خوش ہوتا ہوں کہ میرے اللہ نے مجھ سے یہ کام کرادیا اور مجھے اس کام کی توفیق عطا فرمادی، میں اس پر خوش ہوتا ہوں۔ اب دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ صاحب عجب اور کبر

میں مبتلا ہیں، لیکن حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے مقام پر ہیں۔

لہٰذا بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ تکبر کی بیماری ہوتی ہے، لیکن انسان کو پتہ نہیں لگتا، اور بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے میں بیماری معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں بیماری نہیں ہوتی۔ اس لئے صرف یہ کہدینا کہ ہمارے اندر تکبر نہیں ہے، اس سے بات نہیں بنتی، اس لئے کہ جب تمہارے اندر تکبر ہوگا تو تمہیں پتہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اندر تکبر ہے یا نہیں۔

متکبر کی بہترین مثال

کسی نے عربی زبان میں متکبر کی ایک بہت اچھی مثال بیان کی ہے، کہ متکبر کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا ہو اور نیچے کی طرف دیکھ رہا ہو، اب نیچے جو لوگ اس کو نظر آرہے ہیں، وہ ان سب کو چھوٹا سمجھتا ہے، کیونکہ وہ سب اس کو چھوٹے چھوٹے نظر آتے ہیں، اور نیچے والے اس کو چھوٹا دیکھتے ہیں، اس لئے وہ اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں، لہٰذا وہ دوسروں کو چھوٹا سمجھتا ہے اور دوسرے اس کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اس متکبر کو اپنے تکبر کا پتہ نہیں ہے، لہٰذا اپنے آپ کو ان سے افضل سمجھ کر ان کو چھوٹا سمجھ رہا ہے، اور دوسرے لوگ جن کو یہ معلوم ہے کہ یہ متکبر ہے، وہ چاہے منہ پر اس کی تعریف کریں، لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بیوقوف آدمی ہے اور تکبر کے اندر مبتلا ہے۔ اس لئے معالج کے بغیر تکبر کا پتہ نہیں چلتا۔ لہٰذا یہ دھوکہ مت کھانا کہ ہم تو تکبر........ کی وجہ سے ٹخنوں سے نیچے ازار نہیں کرتے، کیونکہ ازار کو نیچے کرنا ہی.... تکبر پیدا کرنے کا

ایک سبب ہے، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا۔

تکبر کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ملفوظات ہیں۔ ان کی مختصر تشریح عرض کرتا ہوں۔

عالم کا اپنے کو جاہل سے اچھا سمجھنے کا علاج

ایک صاحب نے حضرت والا سے پوچھا کہ:

"اکثر بلا قصد یہ خیال آتا ہے کہ فلاں جاہل ہے، میں عالم ہوں، میں اس سے اچھا ہوں"

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ نے واقعۃً علم عطا فرمایا ہے، عالم ہے، اور دوسرا شخص عالم نہیں ہے، اب اس عالم کو یہ خیال آہی جاتا ہے کہ مجھے الحمدللہ عِلم حاصل ہے جو دوسرے کو حاصل نہیں ہے، اور علم جہل سے اچھا ہے، اس لئے اپنے اچھے ہونے کا خیال دل میں آ گیا۔ آیا یہ خیال تکبر ہے یا نہیں؟ حضرت والا نے جواب دیا کہ:

نفس سے کہے کہ کیا معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے، ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل و خوار ہوں، اور خدا تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھلا دیے ہیں، اس لئے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے تو کیا

کرے گا، اسی کا استحضار بہ تکرار کرے اور دعا بھی کرے۔

(ایضاً)

ایک اشکال

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے، بعض اوقات دل میں یہ خیال آتا ہے کہ آدمی کسی حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتا، اگر ایک آدمی کے پاس علم ہے اور دوسرے کے پاس وہ علم نہیں ہے، اب جس کے پاس علم ہے وہ یہ کیسے کہدے کہ میرے پاس علم نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ علم جہل کے مقابلے میں بہتر ہے، قرآن کریم کی آیت ہے:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ

(سورۂ الزمر، آیت ۹)

یعنی علم رکھنے والا بہتر ہے اس کے بنسبت جو علم نہیں رکھتا۔ لہٰذا جس کے پاس علم ہے وہ کیسے جھٹلادے کہ میرے اندر یہ وصف نہیں ہے۔ یا مثلاً ایک آدمی زیادہ صحت مند ہے، اس کے مقابلے میں دوسرا آدمی کمزور ہے، اب ظاہر ہے کہ صحت مند یہ سوچے گا کہ اس کے مقابلے میں میری صحت اچھی ہے، میں اس کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہوں، مضبوط ہوں۔

یا مثلاً ایک آدمی کے پاس پیسہ زیادہ ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرے آدمی کے پاس پیسہ نہیں ہے، تو وہ یہ خیال کرے گا کہ میں اس کے مقابلے میں مالدار ہوں، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے، میرے پاس پیسہ ہے۔ یا ایک آدمی بڑا افسر ہے، کسی بڑے عہدے پر فائز ہے، دوسرا آدمی چپراسی اور مزدور ہے، تو

بڑے منصب اور عہدے والا اپنے آپ کو اس چپراسی سے بڑا سمجھے گا یا نہیں؟ اب اگر وہ اپنے کو بڑا سمجھے تو تکبر ہو گیا، اور اگر بڑا نہ سمجھے تو جھوٹ ہو گیا، مثلاً اگر وہ یہ سمجھے کہ میں افسر نہیں ہوں، بلکہ میں تو ایک مزدور ہوں، یہ تو بالکل جھوٹ ہو گیا، یا مثلاً ایک آدمی طاقتور ہے، صحت مند ہے، وہ یہ کہے کہ میں طاقت ور نہیں ہوں، بلکہ میں کمزور ہوں، یا مثلاً ایک عالم ہے، وہ یہ کہے کہ میں عالم نہیں ہوں، بلکہ جاہل ہوں، یہ تو جھوٹ ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں باتوں کے درمیان کیسے تطبیق ہو گی کہ تکبر بھی نہ ہو اور جھوٹ بھی نہ ہو؟

اس اشکال کا جواب

ایک اور جگہ پر حضرت والا نے ایک اور جملہ ارشاد فرمایا ہے، اس کو یاد رکھنا چاہئے، اس سے یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے وہ یہ کہ:

"اپنے آپ کو اکمل سمجھنا تکبر نہیں، افضل سمجھنا تکبر ہے۔"

اکمل سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ دوسرے کے پاس بظاہر علم کم ہے اور میرے پاس علم زیادہ ہے، اس کی صحت اچھی نہیں ہے اور میری صحت اچھی ہے، اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس الحمدللہ اتنے پیسے ہیں، اس کے پاس چھوٹا مکان ہے اور میرے پاس بڑا مکان ہے، اس کی اولاد کم ہے اور میری اولاد زیادہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں مقدار کے اعتبار سے اپنے آپ کو زیادہ سمجھنا تکبر نہیں۔ البتہ افضل سمجھنا کہ میں اس سے افضل ہوں، یہ تکبر ہے۔ اور اس کا علاج حضرت والا نے یہ بتا دیا کہ آدمی یہ سوچے کہ کیا

معلوم خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے۔

اس نعمت پر شکر ادا کرے

یہ جو اوپر بیان کیا کہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں اکمل سمجھنا اور علم میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، یا عمر میں زیادہ سمجھنا، یا صحت میں زیادہ سمجھنا، یا مال میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، اس میں بھی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ دل میں جس زیادتی کا خیال آرہا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اور یہ کہے کہ یہ زیادتی میری قوت بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ جل جلالہ کی عطا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی عطا کا تصور کرے گا تو اس سے تکبر پیدا نہیں ہوگا۔

افضل سمجھنا بے بنیاد ہے

اور اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھنا بالکل بے بنیاد ہے، کیا معلوم کہ آخر میں جا کر کیا انجام ہونا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقرب ہے اور کون مقرب نہیں ہے، نہ وہاں علم کی بڑائی کام آئے گی، نہ عمر کی بڑائی کام آئے گی، نہ وہاں مال و دولت کی کثرت کام آئے گی، نہ اس کی گارنٹی ہے کہ جس کے پاس علم زیادہ ہے وہ ضرور افضل ہوگا، جبکہ حدیث شریف میں ہے کہ سب سے پہلے جہنم جس کے ذریعہ سلگائی جائے گی وہ ایک عالم ہوگا۔ لہٰذا صرف علم کے بھروسے پر یا اس بنا پر کہ لوگ دنیا میں میرے ہاتھ چومتے ہیں، یا مجھے بڑا سمجھتے ہیں، یا علامہ سمجھتے ہیں، میں افضل ہوں، یاد رکھے! اس پر کوئی بھروسہ نہیں ہے، جب حساب کتاب کا منظر سامنے ہوگا تو بڑے بڑے علامہ دھرے رہ جائیں گے، لہٰذا علم کی

وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے۔

اسی طرح مال کی وجہ سے اپنے آپ کو دوسرے سے کیا افضل سمجھے، جبکہ قیامت کے دن بڑے بڑے مالدار جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ لہٰذا جب کسی بات کا بھروسہ نہیں تو پھر کس بنیاد پر آدمی اپنے آپ کو دوسرے سے افضل سمجھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ ایک آدمی نے ان سے یہ کہدیا کہ تم تو میرے کتے سے بدتر ہو۔ ان بزرگ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ ابھی میرا کچھ پتہ نہیں کہ میں کتے سے بدتر ہوں یا نہیں، جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی اور وہاں پر میں حساب کتاب کے مرحلے کو پار کر گیا تو میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں کتے سے افضل ہوں، اور اگر میں وہاں حساب کتاب کے مرحلے سے نہ گزر پایا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق ہو گیا تو پھر بیشک تم ٹھیک کہتے ہو کہ میں کتے سے بدتر ہوں، اس لئے کہ کم از کم اس کتے کو حساب کتاب نہیں دینا پڑے گا اور اس کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا سامنا نہیں ہوگا۔

یہ خیال دل سے نکال دو

یہ ہیں حقیقی معنی میں اللہ والے، دوسرا شخص گالی دے رہا ہے، لیکن یہ اپنے حقائق اور معارف میں گم ہیں، اور اپنی حقیقت حال کو دیکھ رہے ہیں کہ میری حقیقت تو یہ ہے۔ لہٰذا دماغ سے افضل ہونے کا خیال نکال دو، نفس سے کہے کہ تمہیں کیا معلوم کہ خدا تعالیٰ کے یہاں کون اچھا ہے، ممکن ہے کہ اس کا باطن اچھا

ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں خدا تعالیٰ کے نزدیک بڑا ذلیل و خوار ہوں، اور خدا تعالیٰ نے تجھ کو دو چار حرف ظاہری سکھا دیے ہیں، اس لئے تو بڑائی کرتا ہے، اگر وہ چاہے تو آج چھین لے۔ کس چیز پر تو اکڑتا ہے اور اتراتا ہے؟ کیا یہ علم تجھے ماں کے پیٹ سے حاصل ہو گیا تھا؟ کسی نے اپنے فضل و کرم سے عطا فرمادیا، اور جس نے عطا فرمایا ہے وہ جب چاہے سلب کرلے، جب چاہے واپس لے لے۔

کیا تو مال پر اکڑتا ہے، کیا یہ مال تجھے ماں کے پیٹ سے ملا تھا؟ کسی دینے والے نے مال دیا ہے، اور جس نے دیا ہے وہ جب چاہے واپس لے لے۔ کیا تو صحت پر اکڑتا ہے؟ بڑے بڑے تندرست اور توانا لوگ ایسے گزرے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے صحت واپس لی تو وہ بتاشے کی طرح پچک گئے۔

سبق آموز واقعہ

ہمارے ایک عزیز تھے، جن کا ابھی ایک دو سال پہلے انتقال ہوا۔ ان کے بارے میں سارے دیوبند میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ برف کی سلی کو مکّہ مار کر توڑ دیتے تھے، اتنے طاقت ور تھے، انہوں نے کبھی بھی زندگی میں تربوز کو چاقو سے نہیں کاٹا، بس مکہ مارا اور توڑ دیا، اور اس کے ساتھ ساتھ بڑے عابد و زاہد آدمی تھے۔ بعد میں لاہور میں مقیم ہوگئے تھے، چار پانچ سال پہلے لاہور میں ان سے ملاقات کے لئے گیا تو دیکھا کہ کھانا کھانے کے لئے ہاتھ منہ تک نہیں اٹھ رہا تھا، دوسرے لوگ کھانا کھلا رہے تھے، جب میں ان کے پاس پہنچا تو مجھے دیکھ کر رو پڑے، اور کہنے لگے کہ یہ وہی "حامد" ہے جو برف کی سلی مکے سے توڑ دیا کرتا تھا، اور اب یہ حال ہے کہ خود اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھا سکتا۔

تم کس بات پر اتراتے ہو؟

ارے تم کس بات پر اتراتے ہو؟ صحت پر اتراتے ہو؟ قوت پر اتراتے ہو؟ کیا مال پر اتراتے ہو؟ کیا علم پر اتراتے ہو؟ ارے ان میں سے کوئی چیز ایسی ہے جس کی ہمیشہ تمہارے پاس رہنے کی گارنٹی ہو؟ بلکہ کسی دینے والے نے دی ہے، وہ جب چاہے واپس لے لے؟ اس لئے یہ دو چار حرف اس نے سکھا دئے ہیں، وہ اگر آج چھین لے تو تم کیا کرلو گے؟ بس اس کا استحضار اور تکرار کیا جائے، جب کبھی دل میں بڑائی کا خیال آئے، بس اس کا دھیان کرلے کہ کسی دینے والے نے یہ وصف اپنے فضل سے دیا ہے، اپنے انعام سے دیا ہے، تیرا کوئی استحقاق نہیں تھا، کتنے لوگ ہم میں ایسے ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، اور جس طرح دیا ہے وہ اسی طرح واپس بھی لے سکتا ہے۔ لہٰذا تیرے لئے اترانے اور اکڑنے کا اور دوسروں پر بڑائی جتلانے کا اور اپنے آپ کو افضل سمجھنے کا کوئی موقع نہیں، ہاں، شکر کا موقع ہے کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، میں اس کا مستحق نہیں تھا، اور میرے قبضہ قدرت میں نہیں تھا، آپؐ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے عطا فرمائی، اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

"شکر" بے شمار بیماریوں کا علاج

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ شکر ایسی چیز ہے کہ یہ بیشار روحانی بیماریوں کا علاج ہے، جو آدمی شکر کرے گا، وہ کبھی تکبر

میں مبتلا نہیں ہوگا، انشاء اللہ۔ اس لئے کہ شکر کے معنی کیا ہیں؟ شکر کے معنی یہ ہیں کہ یہ نعمت جو مجھے ملی ہوئی ہے، میں اس کے لائق نہیں تھا، میں اس کا مستحق نہیں تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے دی ہے، اس کا شکر و احسان ہے۔

قرض کی ادائیگی شکر کا موقع نہیں

شکر کب کیا جاتا ہے؟ اگر کوئی شخص اپنا فریضہ ادا کرے یا قرضہ ادا کرے، تو کیا قرض خواہ کے ذمے شکر ادا کرنا واجب ہے؟ نہیں، مثلاً ایک آدمی مجھ سے ایک ہزار روپے قرض لے گیا، اور یہ کہا کہ دو مہینے بعد واپس کروں گا، یہ احسان تو میں نے کیا کہ میں نے ایک ہزار روپے بطور قرض دیے، اس کو چاہئے کہ میرا شکریہ ادا کرے، پھر جب دو ماہ بعد وہ ایک ہزار روپے مجھے واپس لا کر دے گا، تب بھی احسان دینے والے کا رہا کہ اس نے ایک ہزار روپے دیے تھے اور دو ماہ تک اس ہزار روپے سے اپنے آپ کو محروم رکھا، لہٰذا وہ قرض دار جب واپس لا کر دے رہا ہے تو وہ کوئی احسان نہیں کر رہا ہے، لہٰذا وہ شکریہ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔

شکر کا موقع یہ ہے

شکریہ اس وقت ادا کیا جاتا ہے جب آدمی اپنے فریضہ سے زیادہ کام کرے، مثلاً ایک ہزار روپے دوسرے کے ذمے واجب تھے، واپس کرتے وقت اس نے ایک ہزار کے بجائے بارہ سو روپے اپنی طرف سے خوش دلی کے ساتھ واپس کر دیے، چونکہ اس نے زیادہ دے کر احسان کیا، لہٰذا اس کا شکریہ واجب

ہے۔ جب انسان اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذمے یہ کام ضروری اور واجب نہیں تھا، اور میں اسکا مستحق تو نہیں تھا لیکن اللہ جل جلالہ نے محض اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی۔ لہٰذا شکر کے اندر خود یہ اعتراف پنہاں ہے کہ میں اس کے لائق نہیں تھا، اور جو شخص لائق نہ ہونے کا اعتراف کرے کیا وہ تکبر میں مبتلا ہو سکتا ہے؟ نہیں ہو سکتا، اس لئے جب بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت ملے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، انشاء اللہ تکبر کی جڑ کٹتی جائے گی۔

شیطان کے داؤ سے بچنے کا طریقہ

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جب شیطان راندۂ درگاہ ہو گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ سے کہا:

ثُمَّ لَاٰتِیَنَّھُمْ مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْھِمْ وَمِنْ خَلْفِھِمْ وَعَنْ اَیْمَانِھِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِھِمْ وَلَا تَجِدُ اَکْثَرَھُمْ شَاکِرِیْنَ O

(سورۃ الاعراف، آیت ۱۷)

چونکہ ابن آدم نے مجھے تباہ کیا ہے، اس لئے اس کا بدلہ لینے کے لئے اس کے پاس دائیں سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، اور ابن آدم کو گمراہ کروں گا۔ (آخر میں کہتا ہے کہ) آپ ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہیں پائیں گے۔

ہمارے حضرت والا فرماتے تھے کہ شیطان چونکہ بڑا خرّانٹ ہے، اس کو یہ معلوم ہے کہ جو آدمی شکر کرنے والا ہوگا، اس کے سامنے میری نہیں چلے گی، اس پر میرا داؤ نہیں چلے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے والا ہو، اس پر شیطان کا داؤ نہیں چلتا۔

عین پریشانی میں نعمتوں کو یاد کرو

لہٰذا اللہ تعالیٰ کی جو نعمت حاصل ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور ایک وقت میں صرف ایک نعمت نہیں ہے بلکہ ہر لمحے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا

(سورۂ ابراہیم، آیت ۳۴)

اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو شمار نہیں کرسکو گے۔

انسان چونکہ ناشکرا ہے، اس لئے اگر ذرا سی کوئی تکلیف پہنچ جاتی ہے یا پریشانی آجاتی ہے تو اس کو ہر وقت گاتا رہتا ہے، اور عین اس تکلیف اور پریشانی کے وقت میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں متوجہ اور مبذول ہیں، ان کا کوئی ذکر نہیں، ان کی طرف ذرا سا دھیان نہیں، ورنہ عین تکلیف اور پریشانی کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی اتنی نعمتیں ہماری طرف متوجہ ہوتی ہیں کہ ہم ان کا شمار نہیں کرسکتے۔

”شکر“ کا ایک انوکھا انداز

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک نانا تھے، حضرت والا کی تربیت میں ان کو بھی بڑا دخل رہا ہے، بڑے فاضل اور بزرگوں کے صحبت یافتہ تھے، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں بچپن میں رات کو سونے کے وقت ان کو دیکھتا تو مجھے عجیب نظر آتا تھا، وہ یہ کہ میرے نانا رات کو سونے کے وقت بستر پر بیٹھ جاتے اور بڑے والہانہ انداز میں پڑھنا شروع کر دیتے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ۔

مسلسل جھوم جھوم کر کافی دیر تک یہ پڑھتے رہتے۔ جب میں نے کچھ ہوش سنبھالا تو میں نے ایک دن ان سے پوچھا کہ یہ رات کو سونے سے پہلے آپ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے جواب میں فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ سارا دن تو غفلت میں گزر جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہیں ہوتا، اس لئے میں رات کو سونے سے پہلے بستر پر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں۔ یا اللہ! آپ نے یہ مکان عطا فرمایا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے صحت عطا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے رزق عطا فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے یہ آرام دہ بستر عطا فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے عافیت عطا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے بیوی عطا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

آپ نے بچے عطا فرمائے۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

ایک ایک نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں تاکہ ان نعمتوں کے شکر کا ہزارواں یا لاکھواں حصہ زبان سے ادا ہو جائے۔

سونے سے پہلے شکر ادا کرلو

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ تم بھی ایسا ہی کیا کرو، رات کو سونے سے پہلے تمام نعمتوں کا شکر ادا کرلیا کرو۔ ذرا سا دھیان کرو گے تو سینکڑوں نعمتوں کا استحضار ہو جائے گا۔ ارے صرف ایک نعمت کو سوچنا شروع کرو گے تو وہ بھی اتنی زیادہ نظر آئے گی کہ ساری عمر بھی سجدے میں پڑے رہو گے تب بھی اس ایک نعمت کا شکر ادا نہیں ہوگا۔ یہ دو آنکھیں اللہ تعالیٰ نے دی ہیں، ایک آنکھ کو لے لو اور اس کے بارے میں سوچو کہ یہ کیسی نعمت ہے؟ ذرا سا اس میں بال آجائے تب اندازہ ہوگا کہ کیسی نعمت ہے، اسی ایک نعمت کو سوچنا شروع کردو گے تو حق شکر ادا نہیں ہوسکے گا۔

تکبر سے بچنے کا ایک چٹکلہ

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میاں! یہ تکبر بڑی خراب چیز ہے، بڑے بڑے معالجوں کو چکر دیدیتی ہے، اس کا علاج کرنا آسان کام نہیں ہے۔ لیکن میں تمہیں ایک چٹکلہ بتا رہا ہوں، اس چٹکلے پر عمل کرلو تو انشاء اللہ پھر اس تکبر کی بیماری میں مبتلا ہی نہیں ہو گے، اور اگر ہو گئے تو انشاء اللہ جلدی نکل جاؤ گے، وہ چٹکلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، ہر وقت، ہر لمحے، چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اللہ تعالیٰ کے شکر کی رٹ لگاؤ، موسم اچھا ہے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

ہوا چل رہی ہے،

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ۔

جو اچھی بات سامنے آئے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جتنا جتنا شکر ادا کرو گے، انشاء اللہ تکبر سے اتنی ہی حفاظت رہے گی۔ کہنے کو تو یہ چھوٹا سا چٹکلہ ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ بڑے کانٹے کی بات ہے، اور عمل کرنا بھی اس پر مشکل نہیں، صرف دھیان کرنے اور مشق کرنے کی بات ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

چودہویں مجلس
تکبر کی اقسام

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

چودھویں مجلس

الحمد للّٰہ رب العالمین ۔ والعاقبۃ للمتقین ۔ والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم ۔ وعلی آلہ وأصحابہ اجمعین ۔ أمّا بعد!

کبر کی اقسام

فرمایا کہ:

اقسام کبر کے اس کثرت سے ہیں کہ لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی ۔ اور اکثر ان میں ادق اور اغمض اس قدر ہیں کہ بجز محقق کے کسی کی بھی نظر وہاں نہیں پہنچتی، اور اس میں علماء ظاہر کو بھی اس محقق کی تقلید بلا تفحص حقیقت کرنا پڑتی ہے۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۵۴)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ یہ کبر کی بیماری ایسی ہے کہ خود بیمار کو پتہ نہیں ہوتا کہ میں اس بیماری میں مبتلا ہوں اور کبر کی بعض قسمیں اتنی دقیق اور باریک ہیں کہ اکثر اوقات بیمار کو اس کا پتہ نہیں چلتا، ایسا شیخ جو محقق بھی ہو، وہی

پتا لگاتا ہے کہ اس کو یہ بیماری ہے یا نہیں ہے، اور اس بیماری کا علاج کیا ہے؟

کبر کے مختلف علاج

ایک مثال کے ذریعہ اس کو سمجھئے! وہ یہ کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں یہ معمول تھا کہ جب کوئی شخص اپنی اصلاح کرانے کے لئے آتا تو "کبر" کا علاج سب سے پہلے کیا جاتا تھا، حضرت والا مختلف لوگوں کے لئے مختلف علاج تجویز فرمایا کرتے تھے۔ مثلاً کسی کے اندر دیکھا کہ اس کے اندر "تکبر" ہے تو آپ نے اس سے فرمایا کہ تم ہر نماز کے بعد مسجد میں یہ اعلان کیا کرو کہ: بھائیو! میرے اندر تکبر کی بیماری ہے، میرے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے نجات عطا فرمائے۔ اب ظاہر ہے کہ ایک متکبر آدمی جس کے دل میں تکبر اور اپنی بڑائی ہے، اس کو جب بھرے مجمع میں یہ اعلان کرنا پڑے کہ میرے اندر تکبر ہے تو اس اعلان کے نتیجے میں اس کے دل پر قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ لیکن جب شیخ کے حکم سے کرتا ہے تو دل پر اتنی زور کی ضرب پڑتی ہے کہ وہ سارا تکبر ختم ہو جاتا ہے۔

یا مثلاً کسی متکبر کے لئے یہ علاج تجویز کیا کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو۔ ہر ایک کو مختلف علاج بتائے، کیونکہ ہر آدمی کے لئے ایک علاج نہیں ہوتا، چونکہ بیماریاں مختلف ہوتی ہیں، ان کے انداز مختلف ہوتے ہیں، اسباب مختلف ہوتے ہیں، حالات مختلف ہوتے ہیں، اس لئے ایسا نہیں ہے کہ ایک علاج سب کے لئے تجویز کر دو، جیسے حکیم صاحب نے ایک ہی جوشاندہ سب کے لئے تجویز کر دیا۔ یا کوئی شخص یہ سوچے کہ چونکہ حضرت والا نے فلاں شخص کو فلاں

بیماری میں یہ علاج تجویز کیا تھا، لہٰذا میں بھی وہی علاج کرلوں، یہ ٹھیک نہیں ہے، بلکہ شیخ دیکھتا ہے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے۔

خود اپنا علاج کرنا

ایک صاحب نے یہ دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فلاں شخص کو یہ علاج بتایا ہے کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو، اب بجائے اس کے کہ اپنے علاج کے لئے خود رجوع کرتے اور اپنے لئے علاج تجویز کراتے، ان صاحب کو دیکھ کر خود اپنا علاج شروع کر دیا اور نمازیوں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیے۔ حضرت کو پتہ چلا کہ فلاں صاحب نے خود سے یہ کام شروع کر دیا ہے، آپ نے اس کو بلایا، اور اس سے فرمایا کہ اس طرح علاج نہیں ہوا کرتا، اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ تمہارے اس طرح لوگوں کے جوتے سیدھے کرنے سے تمہارے تکبر میں اور زیادہ اضافہ ہوگا، اس تکبر میں کمی نہیں ہوگی، اس لئے کہ دماغ میں شیطان یہ بات بٹھائے گا کہ دیکھ تو کتنا متواضع ہے۔ لہٰذا یہ نہیں ہو سکتا کہ آدمی خود اپنے تکبر کا علاج کرنے بیٹھ جائے، بلکہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے جس کو یہ علم عطا کیا ہو، وہی یہ کام کر سکتا ہے۔

کسی شیخ سے تربیت حاصل کرنا

عام طور پر یہ علم عطا نہیں ہوتا جب تک اس نے اپنے آپ کو پامال نہ کیا ہو، شیخ تھوڑے رگڑے دیتا ہے، اس رگڑے کھانے کے نتیجے میں وہ کبر دل سے نکلتا ہے اور اس وقت حقیقت کھلتی ہے کہ کس کبر کا کیسے علاج کیا جائے۔ ہمارے

یہ جتنے بزرگ جن کا نام لے کر ہم زندہ ہیں: حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، یہ حضرات رگڑے کھائے ہوئے تھے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو خود ساختہ پیر بن کر بیٹھ گیا ہو، بلکہ ان سب نے رگڑے کھائے تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوھیؒ کا واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوھی قدس اللہ سرہ جب نئے نئے درس نظامی سے فارغ ہوئے اور عالم بن گئے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ علم تکبر پیدا کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہوتا ہے، اس لئے کہ عالم بننے کے بعد دماغ میں یہ بات آجاتی ہے کہ میں نے بہت کچھ پڑھ لیا، مجھے بہت کچھ آتا ہے۔ بہر حال، حضرت مولانا رشید احمد گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ، یہ ہمارے تمہارے جیسے عالم نہیں تھے کہ بس کچے پکے پڑھ کر عالم بن گئے بلکہ ان کی استعداد بڑی پختہ تھی۔ اس وقت تھانہ بھون کی خانقاہ میں تین بزرگ بیٹھتے تھے، ایک حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اور تیسرے حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ، ان کو ''اقطاب ثلاثہ'' کہا جاتا ہے، یہ تین اولیاء اللہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ عالم تھے، ان کا ایک رسالہ حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر سے گزرا، اس رسالے میں کوئی ایسی بات لکھی ہوئی تھی جو

علمی طور پر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو صحیح معلوم نہیں ہو رہی تھی، چنانچہ انہوں نے ارادہ کیا کہ حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی صاحب سے اس مسئلہ پر مناظرہ کروں۔ چنانچہ مناظرہ کی نیت سے گنگوہ سے تھانہ بھون کی طرف روانہ ہوئے۔

جب تھانہ بھون پہنچے تو چونکہ پہلے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اور حضرت حاجی صاحب سے پہلے سے شناسائی تھی، اس لئے سلام کرنے کے لئے حاجی صاحب کے پاس رکے، حضرت حاجی صاحب نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ کہا کہ شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جا رہا ہوں، کیوں جا رہے ہو؟ ان سے مناظرہ کرنا ہے، توبہ توبہ، وہ اتنے بڑے عالم، اور تم ابھی نئے فارغ ہوئے ہو، اور ابھی ابھی مولوی بنے ہو، اور اتنے بڑے عالم سے مناظرہ کرنے جا رہے ہو، جو اللہ والے بھی ہیں۔ حضرت گنگوہیؒ نے عرض کیا کہ حضرت! انہوں نے ایک رسالے کے اندر ایسی غلط بات لکھ دی ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے حضرت مولانا کو ٹھنڈا کیا، اور اسی ٹھنڈا کرنے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی کایا پلٹ دی، حاجی صاحب کی ان پر ایسی نظر پڑی کہ مناظرہ کرنے کا جو ارادہ تھا وہ تو ختم کر دیا، اور وہیں حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت ہو گئے۔

تمہیں سب کچھ دیدیا

پھر چالیس دن وہاں رہے، حالانکہ جب گنگوہ سے چلے تھے تو اس خیال سے چلے تھے کہ تھوڑی دیر بعد واپس آجاؤں گا، اس لئے کوئی کپڑے وغیرہ بھی

ساتھ نہیں لئے تھے، بلکہ جو جوڑا پہن کر آئے تھے، اسی کو دھو کر سکھا کر دوبارہ پہن لیتے، اس طرح چالیس دن وہاں گزار دیے۔ اس قیام کے دوران حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خوب رگڑے کھلائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب چالیس دن کے بعد واپس جانے لگے تو حضرت حاجی صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ:

"میاں رشید احمد: جو کچھ میرے پاس امانت تھی، وہ ساری میں نے تمہارے حوالے کر دی۔"

یہ کوئی معمولی مقام ہے کہ شیخ یہ کہے کہ جو کچھ میرے پاس تھا، وہ سب کچھ میں نے چالیس دن میں تمہیں دیدیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وہ مقام عطا فرمایا تھا۔

حضرت گنگوہیؒ کی عجیب حالت

پھر جب آپ واپس گنگوہ پہنچے تو ایک عرصے تک عجیب استغراق کی حالت طاری رہی، حتیٰ کہ بہت عرصے تک حضرت حاجی صاحب کو خط بھی نہیں لکھا، تو حضرت حاجی صاحب نے خود خط لکھا کہ:

"مدّت سے آں عزیز کی خیریت معلوم نہیں ہوئی، کس حالت میں ہیں، خط کے ذریعہ اپنے حالات سے مطلع کریں۔"

اب دیکھئے! یہ خط شیخ اپنے مرید کو لکھ رہا ہے۔ جواب میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ:

حضرت! بہت دن سے خط نہیں لکھ سکا، کوتاہی رہی، لیکن

اس لئے نہیں لکھا کہ اپنی حالت لکھتے ہوئے شرم معلوم ہوتی تھی کہ کیا اپنا حال لکھوں، آپ سے تعلق بھی ہو گیا، اس کے باوجود اپنی بے حالی کو کیا لکھوں۔ اس لئے شرم معلوم ہوتی تھی، البتہ آپ کی دعاؤں اور توجہ سے اتنا فرق ضرور معلوم ہوتا ہے کہ:

﴿۱﴾...... شریعت طبیعت بن گئی ہے۔

یعنی جس طرح انسان کے اندر طبعی تقاضے بھوک اور پیاس کے ہوتے ہیں اور جب تک انسان ان تقاضوں کو پورا نہ کرلے، انسان کو اس وقت تک چین نہیں آتا، اسی طرح شریعت کے تقاضوں پر جب تک عمل نہ کرلوں، اس وقت تک چین نہیں آتا۔

﴿۲﴾...... مادح اور ذام یکساں ہوگئے ہیں۔

یعنی تعریف کرنے والا اور برائی کرنے والا دونوں برابر ہوگئے ہیں، کوئی تعریف کرے تو، اور کوئی برائی کرے تو، دونوں کے اندر کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا کہ یہ تعریف کر رہا ہے اور یہ برائی کر رہا ہے، نہ تعریف سے طبیعت میں کوئی حرکت پیدا ہوتی ہے اور نہ برائی سے طبیعت میں کوئی تغیر آتا ہے۔

﴿۳﴾...... کسی مسئلہ شرعی میں کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔

جب یہ خط تھانہ بھون میں حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس پہنچا تو آپ نے وہ خط اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا کہ:

یہ حال جو انہوں نے لکھا ہے، یہ تو اب تک ہمیں بھی حاصل نہیں ہوا۔

بہر حال! یہ کیسے شیخ اور کیسے مرید تھے۔ یہ ایسے ہی نہیں بن جاتے، بلکہ کچھ رگڑے کھانے پڑتے ہیں۔

حضرت گنگوہیؒ کا ایک اور واقعہ

انہی چالیس دن کے قیام کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک دن حضرت حاجی صاحبؒ نے اپنے مرید حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کو بلایا کہ آج تم ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ، چنانچہ کھانے کے وقت تشریف لے آئے، دستر خوان پر سالن کے دو پیالے تھے، ایک میں کوفتے ایک میں دال تھی، حضرت حاجی صاحبؒ نے کوفتے کے سالن کا پیالہ اپنے پاس رکھا اور دال کا پیالہ ان کے سامنے رکھ دیا، اشارہ اس طرف کر دیا کہ دال تم کھاؤ، کوفتے ہم کھائیں گے، کھانے کے دوران حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ پہنچ گئے، حافظ صاحبؒ نے فرمایا کہ:

حضرت! یہ کیا آپ کر رہے ہیں کہ خود تو کوفتے کھا رہے ہیں اور اس کو دال کھلا رہے ہیں؟

حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ:

ارے یہ تو میرا احسان ہے کہ اس کو اپنے ساتھ بٹھا کر کھلا رہا ہوں، حق تو یہ تھا کہ روٹی پر دال رکھ کر ہاتھ میں دیدیتا کہ باہر سیڑھیوں پر بیٹھ کر کھالے۔

یہ الفاظ کہنے کے بعد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے چہرے کی طرف دیکھا کہ اس بات سے ان کے چہرے پر کوئی تغیر آیا یا نہیں؟ دیکھا کہ کوئی تغیر نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ الحمدللہ کبر کی بیماری نکل گئی ہے۔ بہر حال! اس طرح رگڑے دیے جاتے ہیں، تب جاکر علاج ہوتا ہے، ہر ایک کے بس کا کام نہیں کہ وہ اپنے بارے میں خود فیصلہ کرلے کہ میرا کیا علاج ہے۔

شیخ سے علاج تجویز کراؤ

ایک صاحب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا کرتے تھے، وہ اپنا علاج خود تجویز کرلیا کرتے تھے، خود ہی فیصلہ کرلیا کہ میرے اندر تکبر کی بیماری ہے اور پھر خود ہی اپنا علاج تجویز کرلیا۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحبؒ نے ان کو پکڑ لیا اور فرمایا کہ اس طریقے سے تمہارا نفس اور زیادہ موٹا ہو رہا ہے، اور تمہارے اندر اور زیادہ تکبر بڑھ رہا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس "تکبر" کی بیشمار قسمیں ہیں، ہر ایک کا حکم الگ ہے، ہر ایک کا علاج الگ ہے۔ اس لئے اس کے علاج کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو کسی شیخ کے حوالے کردو۔ وہ شیخ پہلے یہ دیکھے گا کہ تکبر ہے یا نہیں؟ کیونکہ بعض اوقات حقیقت میں تکبر نہیں ہوتا، بلکہ تکبر کا شبہ اور دھوکہ

ہوتا ہے۔ بعض اوقات تکبر ہوتا ہے مگر اسے تکبر نہیں سمجھا جاتا، اس لئے شیخ پہلے تشخیص کرے گا کہ اس کے اندر تکبر ہے یا نہیں؟ تشخیص کرنے کے بعد وہی اس کا علاج بھی تجویز کرے گا۔

شیخ کی تقلید محض کرو

حتیٰ کہ جو شخص بظاہر عالم اور فارغ التحصیل ہے، قرآن و حدیث اور فقہ و تفسیر سب کچھ پڑھا ہوا ہے، بظاہر تو وہ سب کچھ جانتا ہے، لیکن ایسے عالم کو بھی شیخ محقق کی تقلید محض کرنی پڑتی ہے، جب شیخ یہ کہدے کہ تمہارے اندر کبر ہے تو سمجھ لے کہ ہاں میرے اندر کبر ہے، اور پھر اس کا علاج کرائے، چوں و چرا کی گنجائش نہیں، اگر چوں و چرا کرے گا تو مارا جائے گا۔

کسی نے خوب کہا ہے کہ:

تلمیذے کہ چون و چرا نکند و مریدے کے چون و چرا کند، ہر دو را بصحرا باید فرستاد۔

یعنی وہ شاگرد جو علم ظاہر حاصل کر رہا ہے، اگر وہ چوں و چرا نہ کرے، اس کو باہر نکال دو، وہ شاگرد بننے کے لائق نہیں، اس کا کام ہی یہ ہے کہ سمجھنے کے لئے سوال کرے، جو شبہ پیدا ہو جائے اسے پیش کرے۔ اور جو شخص کسی شیخ کا مرید ہو، وہ چوں و چرا کرے کہ یہ آپ نے کیوں کیا؟ ایسا کیوں کیا؟ ایسے مرید کو جنگل بھیج دینا چاہئے، وہ مرید بنائے جانے

کے قابل نہیں ہے۔ لہٰذا شاگرد کا وظیفہ یہ ہے کہ چون وچرا کرے اور سوال کرے، جو شاگرد سبق میں خاموش بیٹھا ہے اور کبھی کچھ پوچھتا ہی نہیں، وہ احمق ہے، وہ سبق کا حق ادا نہیں کر رہا، اور مرید کا کام یہ ہے کہ وہ خاموش بیٹھے، وہ چون و چرا نہ کرے، وہ اگر چوں و چرا کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر خرابی ہے۔

لہٰذا جو عالم ظاہر ہو، اس کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے کہ وہ بلاچوں و چرا شیخ کی بات کو تسلیم کرے، اس لئے کہ علم کے اندر خود رفعت کی شان موجود ہے، لہٰذا جس شخص کو کوئی علم حاصل ہو جاتا ہے، اس کے اندر خود بخود ترفع اور بڑائی کا احساس پیدا ہو جاتا ہے کہ میرے اندر یہ کمال حاصل ہوا۔ اس لئے اکثر و بیشتر علم کے ساتھ تکبر آ ہی جاتا ہے، جب تک اس کی تربیت نہ ہو اور رگڑے نہ کھائے۔

بھائی ذکی کیفی مرحومؒ کا واقعہ

میرے سب سے بڑے بھائی محمد ذکی کیفیؒ مرحوم تھے، جو شاعر بھی تھے۔ بچپن میں انہوں نے دارالعلوم دیوبند میں کافیہ اور شرح جامی تک کتابیں پڑھی تھیں اس کے بعد پڑھنا چھوڑ دیا تھا، پھر تجارت وغیرہ میں لگ گئے، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ بھائی جان! آپ نے تعلیم مکمل کیوں نہیں کی تھی، درمیان میں کیوں چھوڑ دیا تھا؟ جواب میں فرمایا کہ بڑے میاں نے ہمارا معاملہ ختم کر دیا

تھا۔ "بڑے میاں" سے مراد حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، اور صاحبِ کشف و کرامات بزرگ تھے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ قصہ ہوا تھا؟ فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ میں گھر سے دارالعلوم دیوبند پڑھنے کے لئے جارہا تھا، راستے میں حضرت میاں صاحب کا مکان تھا، اور حضرت میاں صاحب گھر میں تشریف فرما تھے۔ ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تربیت کا یہ اثر تھا کہ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ میاں صاحب کے گھر کے پاس سے گزریں اور میاں صاحب سے سلام کر کے اور دعا کرا کے نہ جائیں۔ میں نے سوچا کہ حضرت میاں صاحب موجود ہیں، چلو ان کو سلام کر کے دعا کرالوں پھر مدرسہ جاؤں۔ میاں صاحب اپنے پاس بادام وغیرہ بھی رکھا کرتے تھے، جب کوئی بچہ ان کے پاس ملاقات کے لئے آتا تو اس کو بادام وغیرہ بھی دیا کرتے تھے۔

"علم" تعلّی کا سبب

بہر حال! میں ان کے پاس گیا اور جا کر سلام کیا، حضرت میاں صاحب نے جواب دیا، پھر میں نے دعا کی درخواست کی: حضرت! میرے لئے دعا فرمادیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے علم عطا فرمادے۔ بڑے میاں نے جواب دیا، نا بھائی نا، علم بڑی خراب چیز ہے، میں تمہارے واسطے دعا نہیں کرتا۔ میں بڑا پریشان ہوا کہ یا اللہ یہ کیا فرمارہے ہیں کہ علم بڑی خراب چیز ہے۔ پھر اپنے بارے میں فرمانے لگے کہ میاں صاحب پہلے دارالعلوم میں مولسری کے درخت کے نیچے پھٹی پرانی چٹائی پر بیٹھا

کرتا تھا، اور اب چوکی پر بیٹھ کر پڑھاتا ہے، اور اب میاں صاحب سے کہو کہ نیچے بیٹھ کر پڑھادو تو میاں صاحب کے مزاج میں فرق آجاتا ہے۔ میاں! علم تو تکبر پیدا کرتا ہے، اس واسطے میں تمہارے واسطے علم کی دعا نہیں کرتا۔ بھائی جان کہتے ہیں کہ مجھے اسی دن خطرہ ہو گیا تھا کہ بڑے میاں نے ہمارا تو پتہ صاف کر دیا، اب یہ علم پورا ہونے والا نہیں۔ بہر حال! وہ تو صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ نے ان پر منکشف فرمایا ہو گا کہ اس علم کی تکمیل ان کے حق میں مقدر نہیں ہے، اِس لئے مناسب طریقے سے بچے کو بتادیا۔

لیکن بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی کہ علم تکبر پیدا کرتا ہے، لہٰذا اگر علم کی وجہ سے تکبر پیدا ہو گیا، تو پھر اس علم سے ہزار درجہ بہتر یہ تھا کہ آدمی جاہل رہتا، اور ایک ان پڑھ دیہاتی کی طرح زندگی گزارتا تو کم از کم اللہ تعالیٰ کے یہاں جاکر علم کے اس تکبر اور بڑائی کا عذاب نہ ہوتا۔ اس لئے علم کے ساتھ اکثر و بیشتر یہ چیز جمع ہو جاتی ہے اور اس کا حل اس کے علاوہ کوئی اور نہیں کہ اپنی لگام کسی کے حوالے کرے، وہ یہ دیکھے کہ کیا بیماریاں اس کے اندر پیدا ہو رہی ہیں، اور جو بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں، ان کا علاج کرے۔

علم دودھاری تلوار ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ علم دو دھاری تلوار ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس علم میں نور عطا فرمادے، اس میں برکت عطا فرمادے اور اس کو نافع بنادے تو پھر سبحان اللہ، یہ علم کیا عجیب و غریب چیز ہے۔

لیکن اگر خدانخواستہ اس علم میں نور اور برکت نہ ہو، اس میں نافعیت نہ ہو، اور یہ انسان کو کبر اور گھمنڈ میں مبتلا کر دے تو پھر اس علم سے زیادہ مہلک چیز بھی کوئی نہیں ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جتنی مرغن اور شاندار اور مزیدار غذا ہوتی ہے، سڑنے کے بعد وہ اتنی ہی زیادہ بدبودار بن جاتی ہے، اگر معمولی غذا ہے، جس میں روغن نہیں ہے، اس کے سڑنے سے تھوڑی بہت بدبو پیدا ہوگی، لیکن مرغن غذا سڑنے کے بعد سارے محلے کو متعفن کر دے گی۔ اسی طرح جتنے اونچے سے انسان گرتا ہے، اتنی ہی چوٹ زیادہ لگتی ہے، اسی طرح یہ علم اگرچہ اعلیٰ درجے کی چیز ہے، لیکن اگر یہ خراب ہو جائے اور انسان کو تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا کر دے تو یہ علم انسان کے لئے اتنا ہی مہلک ہے، اس لئے خاص طور پر عالم کو اس بات کی زیادہ ضرورت ہے کہ وہ کسی سے اپنی اصلاح کرائے۔

شیطان کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے سنا کہ کسی شخص نے خواب میں شیطان کو دیکھا کہ وہ بہت ساری گٹھریاں اپنی کمر پر اٹھائے لے جا رہا ہے۔ جیسے بنجارہ ایک شہر سے دوسرے شہر سامان اٹھا کر لے جاتا ہے اور بیچتا ہے، اسی طرح وہ بھی سامان لے جا رہا ہے، اب گٹھریوں کو دیکھا تو کسی گٹھری میں پاخانہ بھرا ہوا ہے، کسی میں لید، کسی میں گوبر، اور کسی میں پیشاب بھرا ہوا ہے، اس نے شیطان سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ شیطان نے ایک گٹھری کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ تکبر ہے، دوسری گٹھری کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ حبّ جاہ ہے، کسی کی

طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ حسد ہے وغیرہ، لیکن یہ سب چیز نجاستوں کی شکل میں تھیں۔ ان صاحب نے پھر شیطان سے پوچھا کہ ان کو کہاں لے جا رہا ہے؟ شیطان نے جواب دیا کہ ان کو لے جا کر فروخت کروں گا۔ ان صاحب نے پھر پوچھا کہ پیسے دے کر تجھ سے یہ نجاستیں کون خریدے گا؟ شیطان نے جواب دیا کہ اپنے مال کی منڈی میں جانتا ہوں، اور اس کے گاھک اور خریداروں کو میں جانتا ہوں، یہ "تکبر" اور "حُبّ جاہ" یہ دو نجاستیں میں مولویوں کے پاس جا کر بیچوں گا، وہ ان دونوں کے بڑے شوقین ہیں، ان کو ان دونوں کے کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ حُبّ جاہ کا کیا مطلب ہے؟ "حُبّ جاہ" کے معنی ہیں "شہرت" کہ لوگ میرے آگے جھکیں، لوگ میرے معتقد بنیں، لوگ میری تعریف کریں، میری شہرت ہو، یہ سب "حُبّ جاہ" ہے۔ "حُبّ جاہ" کو بیچنے کی سب سے بہترین منڈی "مولوی صاحبان" ہیں، وہاں جا کر اس کو بیچوں گا، وہ خوب مزے لے کر اس کو کھائیں گے۔

"ہم بھی کچھ ہیں" کا خیال

بہر حال! یہ علم ایک تو بذاتِ خود فی نفسہ طالبِ علو ہے، اس لئے صاحبِ علم کے اندر تکبر پیدا کرتا ہے۔ دوسری آفت اس علم میں یہ ہے کہ لوگ حاملِ علم دین کی عزت کرتے ہیں، کوئی اس کے ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی اس کے پاؤں چوم رہا ہے، کوئی اس کے لئے عزت سے کھڑا ہو رہا ہے، کوئی اس کے لئے ہدیہ لا رہا ہے، کوئی دعوت کر رہا ہے، ان افعال کے نتیجے میں وہ حاملِ علم اپنے بارے میں یہ سمجھنے لگتا ہے کہ ہم بھی کچھ ہیں، یہ اتنی ساری مخلوق جو ہماری عزت کر رہی

ہے، ہمارے پیچھے پھر رہی ہے، آخر کچھ تو ہمارے اندر کمال ہو گا۔

ایک لالچی کا واقعہ

چنانچہ اہل علم کی ایک مثال دیتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ "اشعب طماع" ایک بہت لالچی انسان تھا۔ ایک مرتبہ راستے سے گزر رہا تھا، بچے اس کو چھیڑنے کے لئے اس کے پیچھے لگ گئے، ان بچوں سے پیچھا چھڑانے کے لئے اس نے بچوں سے کہا کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو، فلاں جگہ جاؤ، وہاں مٹھائی تقسیم ہو رہی ہے، چنانچہ بچے اس طرف بھاگے تو خود بھی بچوں کے پیچھے بھاگنے لگا، لوگوں نے پوچھا کہ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟ اس نے کہا کہ سب بچے بھاگ رہے ہیں تو ضرور مٹھائی تقسیم ہو رہی ہو گی۔ ہماری مثال بھی ایسی ہے کہ پہلے اپنے علم کے ذریعہ مخلوق کو دھوکہ دیا، اس دھوکہ دینے کے نتیجے میں جب مخلوق ہماری معتقد ہو گئی، اب کوئی ہاتھ چوم رہا ہے، کوئی دعوت کر رہا ہے، کوئی ہدیہ لا رہا ہے، کوئی علاّمہ کا لقب دے رہا ہے، تو اب دماغ میں یہ خیال آیا کہ جب اتنی ساری مخلوق ہمارے پیچھے چل رہی ہے اور ہماری معتقد ہو رہی ہے تو ہمارے اندر ضرور کوئی وصف ہو گا جس کی وجہ سے یہ ساری مخلوق ہماری معتقد ہو رہی ہے ۔

زبانِ خلق کو نقارۂ خدا سمجھو

اس کے نتیجے میں وہ عالم اور زیادہ تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

علم پر شکر ادا کریں

لہٰذا جو حضرات علم دین سے وابستہ ہیں، یا جن کو اللہ تعالیٰ نے کوئی اور وصف عطا فرمایا ہے، ان کو اس کی بہت زیادہ فکر رکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں یہ بیماری پیدا نہ ہو جائے۔ اور اگر پیدا ہو جائے تو اس کا فوری علاج ضروری ہے، وہ علاج یہ ہے کہ اس علم پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کریں کہ یا اللہ! میں اس علم کا مستحق نہیں تھا، پھر بھی آپ نے عطا فرما دیا، اے اللہ! آپ کا شکر ہے۔ اور اس بات کا استحضار کرے کہ یہ علم ان کی عطا ہے، اور وہ جب چاہیں واپس لے لیں، میرا اس پر کوئی کنٹرول نہیں ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْئًا۔

سب کچھ پہلے معلوم تھا، بعد میں سب رخصت ہو گیا، اور اب کچھ بھی باقی نہیں۔ اگر انسان کے دماغ کا ذرا سا اسکرو ڈھیلا ہو جائے، تو ایک سیکنڈ کے اندر سارا علم، ساری معرفت، ساری تحقیقات، سب ختم ہو جائیں، لہٰذا انسان کس بات پر اترائے؟ کس بات پر ناز کرے؟ کس بات پر اکڑے؟

عالم اور شیخ کے درمیان فرق

اسی وجہ سے حضرت گنگوہیؒ اور حضرت نانوتویؒ جو اپنے وقت میں علم کے پہاڑ تھے، لیکن اپنی اصلاح کے لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں گئے، جو ضابطے کے پورے عالم بھی نہیں تھے، لوگوں نے حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! یہ کیا قصہ ہوا کہ الٹا معاملہ ہو گیا

؟ان کو چاہئے تھا کہ وہ آپ کے پاس آتے، اس لئے کہ آپ عالم ہیں، وہ عالم نہیں ہیں، لیکن آپ ان کے پاس چلے گئے۔

ایک مثال

جواب میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہماری اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو مٹھائی کے بارے میں پورا علم اور پوری تحقیق حاصل ہے، مثلاً اس کو گلاب جامن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ یہ سب سے پہلے کس نے ایجاد کی، اس کا موجد کون ہے، کہاں کہاں یہ متعارف ہوئی، کن ملکوں میں یہ کھائی جاتی ہے، کن چیزوں سے اس کو بنایا جاتا ہے، اس کے اجزاء ترکیبی کیا کیا ہیں، اور اس کی کتنی قسمیں ہیں، اور اس کو کیسے پکایا جاتا ہے، اور کیسے تلا جاتا ہے، اور اگر اس سے کہا جائے تو وہ گلاب جامن کے فضائل پر ایک تقریر کر دے اور ایک مقالہ لکھدے۔ لیکن اس سے پوچھا جائے کہ تم نے کبھی گلاب جامن کھائی ہے؟ تو وہ جواب میں کہے میں نے کبھی نہیں کھائی۔ ایک دوسرا شخص ہے جس کو گلاب جامن کی تاریخ کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ کس نے ایجاد کی، کون اس کا موجد ہے، کس طرح پکائی جاتی ہے، لیکن روزانہ صبح و شام گلاب جامن کھاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ بتاؤ ان دونوں میں سے کون بہتر ہے؟ وہ بہتر ہے جس میں گلاب جامن پر مقالہ لکھنے کی صلاحیت ہے یا وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح و شام گلاب جامن کھاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ بہتر ہے جو روزانہ صبح و شام کھاتا ہے، اگرچہ اس کی تعریف بیان نہیں کر سکتا۔

پھر فرمایا کہ ہماری مثال اس شخص کی سی ہے جس کو گلاب جامن کی پوری

تاریخ معلوم ہے، اس کی لغوی اور اصطلاحی تعریف جانتا ہے، لیکن کھائی کبھی نہیں، اور حاجی صاحب وہ ہیں جو روزانہ کھاتے ہیں، جب ہم حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں گئے تو ہم نے صرف گلاب جامن کی تاریخ ہی پڑھی تھی، انہوں نے گلاب جامن اٹھا کر ہمارے منہ میں رکھ دی کہ لو گلاب جامن کھالو۔ اس لئے ہم حاجی صاحب کی خدمت میں گئے تھے۔ بہر حال! علم والے کو خاص طور پر اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ باطن کی اصلاح کرائے اور کسی شیخ سے تربیت حاصل کرے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

پندرہویں مجلس

کبر کا ایک اور علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پندرھویں مجلس

الحمد للہ رب العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلوٰة والسلام علیٰ رسوله الکریم، وعلیٰ آله واصحابه أجمعین أمابعد!

کبر کا ایک علاج

"فرمایا کہ کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ عظمت حق سبحانہ کو پیش نظر رکھے، جس موقع پر کبر کا اندیشہ ہو اس وقت تو ضرور ورنہ اور بھی بہتر یہ ہے کہ روزانہ ایک وقت اس کے لئے نکال لے"

کبر کا ایک علاج یہ ہے کہ انسان اللہ جل جلالہ کی عظمت کا استحضار کرے، اور اس کے ساتھ اپنی بے وقعتی کا استحضار کرے۔ اس کے علاوہ ایک بزرگ کے جواب کا استحضار کرے جو جواب ان بزرگ نے ایک متکبر کو دیا تھا، ایک متکبر نے ان بزرگ سے کہا کہ جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ میں جانتا ہوں تو کون ہے؟ تیری حقیقت یہ ہے کہ:

أولك نطفة مذرة، وآخرك جيفة قذرة
وأنت فيما بين ذلك تحمل العذرة

یعنی تیری ابتداء تو ایک گندہ نطفہ ہے، اور تیری انتہاء بدبودار مردار پر ہونے والی ہے۔ تو ایسی حالت میں پہنچنے والا ہے کہ تیرے عزیز واقارب اور رشتہ دار بھی تجھے اپنے پاس رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے، بلکہ تجھے گھڑے میں پھینک آئیں گے، اس لئے کہ اگر تجھے اور زیادہ گھر میں رکھا گیا تو گھر میں بدبو پھیلادے گا۔ لہٰذا تیری ابتداء اور انتہا تو یہ ہے، اور دونوں کے درمیان کا جو زمانہ ہے، اس میں تو ہر وقت نجاست اٹھا کر پھر رہا ہے۔

کھال کے ذریعہ پردہ پوشی

اللہ تعالیٰ نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرمارکھی ہے، یہ کھال اگر کسی جگہ سے چھیل دی جائے تو اندر سے گندگی برآمد ہو جائے گی، کہیں سے خون نکل آئے گا، کہیں سے پیپ نکل آئے گی، کہیں سے پیشاب نکل آئے گا، کہیں سے پاخانہ نکل آئے گا۔ پورے جسم میں گندگی ہی گندگی بھری ہوئی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کھال کے ذریعہ پردہ پوشی فرمارکھی ہے جس کی وجہ سے وہ نجاست نظر نہیں آتی۔ حضرت والا فرماتے ہیں جب کبھی تمہارے دل میں اپنی بڑائی کا احساس پیدا ہو تو ذرا اس بات کو سوچ لیا کرو کہ میری ابتداء کہاں سے ہوئی اور میرا انجام کیا ہونا ہے۔

قضاء حاجت کی حالت کا تصور

حضرت فرماتے ہیں: ایک کارآمد نسخہ اور بتاتا ہوں۔ وہ یہ کہ جب دل میں تکبر پیدا ہو، اس وقت اپنی اس حالت کا تصور کر لیا کرو جب قضاء حاجت کے لئے بیٹھتے ہو، اس وقت کیا حالت ہوتی ہے اور کیا شان ہوتی ہے۔ بس

سارا تکبر دھرا رہ جائے گا اور پتہ چل جائے گا کہ میری حقیقت تو یہ ہے۔

بہر حال اللہ جل جلالہ کی عظمت کا استحضار اور اپنی بے وقعتی کا استحضار کرے۔ کس بات پر انسان ناز کرے؟ کس چیز پر فخر کرے؟ نہ کوئی چیز اپنی ہے، نہ اپنی طاقت سے حاصل ہوئی، نہ اپنے بل بوتے پر باقی رہ سکتی ہے، جو کچھ حاصل ہے، وہ سب کسی کی عطا ہے۔

ایک اور علاج

"فرمایا کہ: علاج ہی کا ایک جزو یہ ہے کہ قصداً ایسے افعال اختیار کرے جو عرفاً موجب ذلت سمجھتے ہیں۔ اور بدون اس کے دوسرے علاج ناکافی ہیں"

یعنی قصداً ایسا کام اختیار کرے جس کو عام طور پر لوگ ذلت کا کام سمجھتے ہیں، بطور علاج کے وہ کام کرے۔ جیسے صحابہ کرام کیا کرتے تھے۔

حضرت عمرؓ کا اپنا علاج کرنا

حضرت فاروق اعظمؓ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شاندار جبّہ پہن کر خطبہ دیا، وہ جبہ بہت پسند آیا اور اپنا سراپا اچھا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ جبہ اتارا اور مشک اٹھا کر کمر پر لادی، اور پانی بھر کر لوگوں کے گھروں میں پہنچانا شروع کر دیا۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ فرمانے لگے کہ چونکہ میرے دل میں عجب کا خیال آگیا تھا، اس لئے اس کے ذریعہ میں اس عجب کا علاج کر رہا ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور گورنری

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ درس و تدریس کے کام لگے رہتے

تھے، ان کو سیاست سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک مرتبہ بحرین کے گورنر چھٹی پر جارہے تھے، ان کی جگہ پر ان کو گورنر بنادیا گیا۔ چونکہ درویش آدمی تھے، ساری عمر قال اللہ و قال الرسول میں گزاری تھی۔ سارادن گورنری کے کام میں مشغول رہتے، شام کو لکڑیوں کا ایک گٹھر سر پر رکھتے اور بازار کے درمیان سے اس طرح گزرتے کہ آواز لگاتے جاتے کہ ہٹو! امیر المومنین آرہے ہیں ہٹو! امیر المؤمنین آرہے ہیں۔ گویا کہ راستے میں لوگوں کو متنبہ بھی کرتے جاتے کہ یہ امیر المؤمنین آرہا ہے جس کے سر پر لکڑی کا گٹھر ہے۔ یہ کام اس لئے کرتے کہ کہیں گورنری کی شان کی وجہ سے دماغ میں تکبر پیدا نہ ہو جائے، اس طرح سے اپنا علاج خود کیا۔

حضرت گنگوہیؒ کا طلبہ کے جوتے اٹھانا

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، جو "قطب الارشاد امام وقت اور ابو حنیفہ عصر" کے لقب سے مشہور ہیں، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "ارواح ثلاثۃ" میں ان کا واقعہ لکھا ہے کہ حضرت والا ایک دفعہ سبق پڑھا رہے تھے اور بارش شروع ہو گئی تو طلبہ سے فرمایا کہ اندر چلیں۔ طلبہ اپنی اپنی کتابیں لے کر اندر جانے لگے، اور حضرت والا طلبہ کے جوتے سمیٹ کر اندر لے جانے لگے تاکہ وہ بارش میں بھیگ کر خراب نہ ہو جائیں۔

یہ طلبہ کے جوتے دو وجہ سے اٹھا رہے تھے: ایک اپنے علاج کی غرض سے کہ کہیں میرے اندر تکبر کا شائبہ پیدا نہ ہو جائے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جب انسان یہ علاج کرلیتا ہے تو اس کا نفس مزکی اور مجلی ہو جاتا ہے اور

جب اللہ والے کا نفس مزکیٰ اور مجلّیٰ ہو جاتا ہے تو اس کو یہ بات غیر معمولی معلوم نہیں ہوتی کہ میں طلبہ اور شاگردوں کے جوتے اٹھا رہا ہوں بلکہ یہ کام بھی اس کے معمول کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔

حضرت تھانویؒ کی سید سلیمان ندویؒ کو نصیحت

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حضرت سید سلیمان ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے گئے۔ پورے ہندوستان میں جن کے علم کا ڈنکا بج رہا تھا، "سیرۃ النبی" کے مصنف، محقق وقت، اور سیاسی اعتبار سے بھی لوگوں کے اندر مشہور و معروف۔ حضرت سید صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ میں جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سے رخصت ہونے لگا تو میں نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! کوئی نصیحت فرمادیں۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! یہ اتنے بڑے عالم ہیں اور مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں نصیحت کروں۔ یا اللہ! ایسی نصیحت دل میں ڈال دیجئے جو ان کے حق میں فائدہ مند ہو۔ تو اس وقت بیساختہ میرے دل میں یہ بات آئی کہ ہمارے یہاں اول و آخر ایک ہی چیز ہے، وہ یہ کہ اپنے آپ کو مٹا دینا۔ حضرت سید صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بات کہتے ہوئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے ہاتھ کو جھٹکا دیا، وہ جھٹکا میرے دل پر ایسا لگا کہ اسی وقت گریہ طاری ہو گیا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس کے بعد حضرت سید صاحب نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا، ایسا مٹایا کہ میں نے ایسی بہت کم نظریں

دیکھی ہیں کہ اتنے بڑے عالم نے اپنے آپ کو ایسا مٹایا ہو۔ اس طرح مٹایا کہ میں نے ایک دن حضرت سید صاحب کو دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس کے باہر حاضرین مجلس کی جوتیاں سیدھی کر رہے ہیں۔

علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے دیکھا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سہ دری میں بیٹھ کر تصنیف کا کام کر رہے تھے، اور حضرت سید صاحب دور ایسی جگہ پر کھڑے ہو کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہے تھے جہاں سے حضرت تھانوی ان کو نہ دیکھ سکیں۔ میں اچانک پیچھے سے ان کے قریب پہنچا اور کہا کہ حضرت! یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کیا دیکھ رہے ہیں؟ میرے سوال پر اچانک چونک پڑے اور کہا کہ کچھ نہیں۔ میں نے جب اصرار کیا تو فرمایا کہ میں یہ دیکھ رہا تھا کہ ساری زندگی جن چیزوں کو علوم سمجھتے رہے، وہ تو جہل ثابت ہوئے، علوم تو ان بڑے میاں کے پاس ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت سید صاحب کو وہ مقام بخشا کہ خود ان کے شیخ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں یہ شعر کہا:

از سلیمان گیر اخلاصِ عمل
داں تو ندوی را منزہ از دغل

یہ شعر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سید صاحب کے بارے میں کہا۔ بہر حال، اپنے آپ کو مٹانا پڑتا ہے، تب جا کر کچھ بنتا ہے۔

مٹا دے اپنی ہستی کو گر کچھ مرتبہ چاہئے
کہ دانہ خاک میں ملکر گل گلزار بنتا ہے

کسی کے در پر رگڑے کھائے بغیر یہ چیز حاصل نہیں ہوتی، اس لئے کہا جاتا ہے کہ شیخ کی نگرانی میں یہ عمل کرے۔

حضرت مفتی اعظمؒ کی تواضع

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبد الحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مطب ابتداء میں رابسن روڈ پر تھا۔ اسی زمانہ میں میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا اسی مطب کے کچھ فاصلے پر مکان تھا، حضرت ڈاکٹر صاحب خود بیان فرماتے ہیں کہ ایک دن میں مطب میں بیٹھا ہوا تھا اور میرے پاس کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت ڈاکٹر صاحب کے پاس ظاہری بیماریوں کے مریض بھی آتے تھے اور باطنی بیماریوں کے مریض بھی آیا کرتے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہاتھ میں دودھ کی پتیلی لئے ہوئے سڑک پر سامنے سے گزر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ یا اللہ! یہ مفتی اعظم اس طرح سڑک پر پتیلی ہاتھ میں لئے جارہا ہے۔ جو لوگ مطب میں بیٹھے ہوئے تھے، ان سے میں نے پوچھا کہ یہ شخص جو پتیلی ہاتھ میں لئے جارہا ہے، جانتے ہو یہ کون ہے؟ لوگوں نے کہ ہم نہیں جانتے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ پاکستان کے مفتی اعظم ہیں، اور ہاتھ میں پتیلی لئے ہوئے اس طرح جارہے ہیں جس طرح ایک عام آدمی جاتا ہے۔

کبھی بڑائی کا تصور ہی نہیں آیا

اللہ تعالیٰ نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو تواضع کا وہ مقام عطا فرمایا تھا کہ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ایسا متواضع آدمی کوئی نہیں دیکھا۔

ایک تو آدمی بتکلف تواضع کرتا ہے، لیکن ان کے یہاں تواضع کے لئے کوئی تکلف نہیں تھا، کیونکہ ان کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ میں تو بالکل بے حقیقت ہوں، اور اپنے بارے میں دماغ کے اندر کسی بڑائی کا تصور کبھی آیا ہی نہیں، اسی وجہ سے ان کو معمولی سے معمولی کام کرنے میں کوئی تکلف نہیں ہوتا تھا میں نے خود دیکھا ہے کہ آپ کرتے کے دامن میں بازار سے آلو خرید کر لے آتے تھے۔

حضرت مدنیؒ کی مفتی صاحبؒ کو نصیحت

دیوبند میں بھی ایک دن اسی طرح دودھ لینے کے لئے پتیلی لے کر جارہے تھے، حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو دیکھ لیا اگلے دن جب آپ دارالعلوم دیوبند میں پہنچے تو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مفتی صاحب سے فرمایا کہ: دیکھو بھائی مولوی شفیع صاحب! اللہ تعالیٰ نے آپ کو تواضع کا بہت اونچا مقام عطا فرمایا ہے، لیکن اتنی تواضع بھی نہ کیا کرو، اس لئے کہ اب آپ دارالعلوم کے مفتی ہوگئے ہیں، اور اس طرح کے کام کرنے سے بعض اوقات عوام کی نگاہوں میں وقعت کم ہوجاتی ہے، اس لئے اتنی بھی تواضع نہیں کرنی چاہئے۔ لیکن والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ سمجھتے تھے کہ میں تو کچھ ہوں ہی نہیں، اس لئے میں کیا اہتمام کروں کہ فلاں کام کروں اور فلاں کام نہ کروں۔ اللہ تعالیٰ نے تواضع کا یہ مقام عطا فرمایا تھا۔

کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی کبھی ننگے پاؤں بھی چلا کرو، اور کبھی کبھی دوسروں کے جوتے سیدھے کر دیا کرو۔ ''ارواح الثلاثہ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر تکبر ہے، اور اس کے تکبر کا علاج کرنا ہے تو اس کو مامور کرتے تھے کہ تم درسگاہ کے باہر طلبہ کے جوتے روزانہ سیدھے کیا کرو۔ اور جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر کوئی خرابی نہیں ہے تو اس کے جوتے خود سیدھے فرما دیا کرتے تھے۔

شیخ کے بتانے پر ذلت کے کام کرے

یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس راستے میں بعض اوقات ذلت کے کام کرنے پڑتے ہیں، وہ ذلت کے کام بھی اپنی خود رائی سے نہ کرے، خود رائی سے کرنے سے بعض اوقات تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور دماغ اور سڑ جاتا ہے بلکہ شیخ کی نگرانی میں کرے، جب شیخ کہے تو وہ کام کرے اور جب شیخ نہ کہے تو وہ کام نہ کرے۔

ایک صاحب نے کسی کتاب میں پڑھ لیا تھا کہ دوسروں کے جوتے سیدھے کرنے سے تکبر دور ہوتا ہے، چنانچہ وہ صاحب حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں آئے اور دوسروں کے جوتے سیدھے کرنے شروع کر دیے۔ حضرت والد صاحب نے ان کو منع کیا کہ یہ کام نہ

کرو، پھر منع کرنے کی وجہ بتائی کہ اس شخص کے حالات ایسے ہیں کہ اگر یہ جوتے سیدھے کریگا تو اور زیادہ اس کے دماغ میں تکبر پیدا ہوگا کہ میرے اندر اتنی تواضع پیدا ہو گئی ہے کہ میں لوگوں کے جوتے سیدھے کرتا ہوں۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ اس راستے میں کسی کی نگرانی میں چلنا پڑتا ہے۔

کبر اور شکر کا فرق

فرمایا کہ:

نعمت پر فخر کرنا "کبر" ہے اور اس کو عطاء حق سمجھنا اور اپنی نااہلی کو مستحضر رکھنا "شکر" ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ "تکبر" کی بیماری کا بہترین علاج کثرت شکر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالنا۔ وہی بات حضرت نے اس ملفوظ میں ارشاد فرمائی کہ کسی نعمت کے حصول پر فخر کرنا کہ اس کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو کمتر سمجھنا، تکبر ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ میں تو اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اللہ جل شانہ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی ہے۔ یہ استحضار "شکر" ہے اور یہی شکر کبر کا علاج ہے۔

یہ "تحدیث نعمت" ہے

اسی کو "تحدیث نعمت" کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ذکر کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، نہ صرف یہ کہ یہ چیز تکبر نہیں

بلکہ عبادت ہے۔ اور اپنی بڑائی کا ذکر کر کے اپنا کوئی وصف بیان کرنا تکبر ہے اور زبردست گناہ ہے۔

باطن کے یہ گناہ بہت باریک ہیں، اور ان کی سرحدیں آپس میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ایک طرف "تحدیث نعمت" ہے، اگر تحدیث نعمت کی غرض سے انسان اپنا کوئی وصف بیان کر رہا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کا اور اس کی عطاء کا اظہار کر رہا ہے تو یہ "عبادت" ہے، اور اگر اپنی بڑائی کے خیال سے اس کا اظہار کر رہا ہے تو یہ گناہ کبیرہ ہے۔ لیکن دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچنا کہ کیا بات تکبر ہے اور کیا بات "تحدیث نعمت" ہے، یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

"تحدیث نعمت" کا حکم

"تحدیث نعمت" تو وہ چیز ہے کہ اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دے رہے ہیں، فرماتے ہیں:

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (سورۃ الضحیٰ)

یعنی آپ پر آپ کے رب کی جو نعمتیں ہوئی ہیں، ان کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کریں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔ اسی "تحدیث نعمت" کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں۔ ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا:

"أنا سيد وُلد آدم، ولا فخر"

میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، یہ "تحدیث نعمت" ہے، کہ اللہ

تعالیٰ نے مجھے یہ مقام عطا فرمایا کہ مجھے تمام آدم کے بیٹوں کا سردار بنادیا۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ "تحدیث نعمت" کبر کی حد میں داخل ہو جائے۔ اس لئے فوراً اگلا جملہ ارشاد فرمادیا "ولا فخر" یعنی میں اس پر کس فخر کا اظہار نہیں کرتا، جس سے دوسروں کی تحقیر ہو۔ اب دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے اوپر ہونے والی نعمتوں کا ذکر فرمارہے ہیں، لیکن دھڑکا یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں حدود سے متجاوز نہ ہو جاؤں، اس لئے فوراً فرمایا "ولا فخر" میں فخر نہیں کرتا۔

تحدیث نعمت کی علامت

پھر "تحدیث نعمت" کی ایک علامت ہے، وہ یہ کہ "تحدیث نعمت" کے نتیجے میں سر اور زیادہ جھکتا ہے، اور تواضع پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور مزید عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انسان یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ تعالیٰ میں اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اور میں اس نعمت کو حاصل کرنے سے عاجز تھا، لیکن آپ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی۔ اس استحضار اور اقرار کے نتیجے میں اور زیادہ عاجزی پیدا ہوگی۔

فتح مکہ کے موقع پر آپ کی انکساری

فتح مکہ کے موقع پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاتح بن کر "مکہ مکرمہ" میں داخل ہو رہے ہیں، اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہو رہے ہیں جس شہر کے لوگوں نے آپ کے ہجرت کرنے پر مجبور کیا، جس شہر کے

لوگوں نے آپ کو قتل کے منصوبے بنائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے اوپر غلاظتیں ڈالنے کی کوشش کی، جہاں کے لوگوں نے آپ پر پتھر برسانے کی کوشش کی۔ اس شہر کے لوگوں پر فاتح بن کر تشریف لارہے ہیں، صرف ۸ آٹھ سال کی مدت کے بعد تشریف لارہے ہیں۔ آپ کے علاوہ کوئی اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہوتا تو اس کا سینہ تنا ہوا ہوتا، گردن اکڑی ہوئی ہوتی، "أنا ولا غیری" کے نعرے لگارہا ہوتا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کی گردن مبارک جھکی ہوئی ہے، یہاں تک کہ سینہ مبارک سے آپ کی ٹھوڑی لگ رہی ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور زبان مبارک پر قرآن کریم کی یہ آیات ہیں:

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحاً مُبِيناً، لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا
تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ
وَيَهْدِيَكَ صِرَاطاً مُسْتَقِيماً (سورۃ فتح: ۱-۲)

یہ ہے "تحدیث نعمت" کیونکہ "إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُبِينًا" کی آیات تلاوت کر کے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا ذکر فرمارہے ہیں کہ یا اللہ! آپ نے یہ فتح مجھے عطا فرمائی۔ اور اس نعمت کے استحضار کے نتیجے میں عاجزی اور انکساری پیدا ہو رہی ہے، اور شکستگی پیدا ہو رہی ہے، اور رجوع الی اللہ زیادہ ہو رہا ہے۔ یہ "تحدیث نعمت" کی علامت ہے۔

تکبر کی علامت

اور تعلّی اور تکبر کی علامت یہ ہے کہ اس سے گردن اکڑتی ہے، سینہ تنتا ہے، اور انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بالا سمجھتا ہے، اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اور ان کے ساتھ حقارت کا معاملہ کرتا ہے۔ ورنہ کم از کم یہ تو ہوتا ہی ہے کہ وہ دل سے اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھتا ہے۔ اب دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرنا کہ کہاں "تحدیث نعمت" ہے، اور کہاں "تکبر" شروع ہو گیا، یہ حد قائم کرنا آسان کام نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شیخ یہ بتاتا ہے کہ تم جو نعمت کا اظہار کر رہے ہو، یہ "تحدیث نعمت" نہیں ہے بلکہ یہ تکبر ہے، لیکن اس کا نام تم نے "تحدیث نعمت" رکھ دیا، حالانکہ حقیقت میں وہ تکبر اور شیطانی عمل تھا۔

حضرت تھانویؒ کا ایک واقعہ

جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے نفس کی نگرانی کی توفیق عطا فرماتے ہیں، وہ قدم قدم پر اپنے نفس کا جائزہ لیتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ نفس صحیح راستے سے نہ ہٹ جائے۔ میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ ایک مرتبہ حضرت تھانویؒ ایک مسجد میں وعظ فرما رہے تھے، بڑا مجمع وعظ سن رہا تھا، اور شرح صدر کے ساتھ وعظ ہو رہا تھا، علوم و معارف کے دریا بہہ رہے تھے۔ اسی وعظ کے دوران کوئی بات حضرت والا کے ذہن میں آئی آپ نے فرمایا کہ اب میں

آپ سے ایک بات کہتا ہوں، اور میں "تحدیث نعمت" کے طور پر کہتا ہوں کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنیں گے، کسی اور سے یہ بات آپ کو سننے میں نہیں آئے گی۔

ابھی وہ بات کہی نہیں تھی، بلکہ اسی وقت سر جھکایا اور فرمایا استغفر اللہ، میں نے یہ کیا کہہ دیا، میں نے اس کو تحدیث نعمت کا نام دیدیا، حالانکہ یہ تو تعلّی ہو گئی اور اپنی بڑائی کا بیان ہو گیا کہ یہ بات آپ مجھ ہی سے سنئے گا اور کسی سے نہیں سنئے گا، میں استغفار کرتا ہوں، یا اللہ: مجھے معاف فرما۔ یہ عمل وہی شخص کر سکتا ہے جسکے دل میں میٹر لگا ہوا ہے، اور وہ میٹر یہ تول رہا ہے کہ کونسا کلمہ حد سے متجاوز ہو گیا اور کونسا حد کے اندر ہے۔ لہٰذا اتنے بڑے انسان، بزرگ، محقق یہ فرما رہے ہیں کہ میں نے تحدیث نعمت کا لفظ تو استعمال کیا، لیکن حقیقت میں تو یہ تعلّی اور تکبر ہو گیا، تو پھر ہم اور آپ کس شمار و قطار میں ہیں۔ ہم لوگ نہ جانے کتنی مرتبہ "تحدیث نعمت" کے عنوان سے اپنے اوصاف بیان کرتے ہیں جب کہ حقیقت میں وہ تعلّی اور تکبر میں داخل ہوتا ہے۔

نعمتوں میں اضافے سے رجوع الی اللہ میں اضافہ

لہٰذا "تحدیث نعمت" کی جو علامت ہے، اس کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس "تحدیث نعمت" کے نتیجے میں عاجزی پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ خشوع پیدا ہو رہا ہے یا نہیں؟ رجوع إلی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں؟ اگر یہ چیزیں پیدا ہو رہی ہیں تو پھر سمجھ لیجئے کہ یہ "تحدیث نعمت" ہے۔ اور ایک

مؤمن کی علامت ہی یہ ہے کہ اس کو جتنا جتنا نعمتوں سے نواز ا جاتا ہے، وہ اتنا ہی اللہ تعالیٰ کے آگے سجدہ ریز ہوتا چلا جاتا ہے، اپنی بے حقیقتی اس پر عیاں ہوتی چلی جاتی ہے، اپنی عاجزی، اپنی فرومائیگی، اپنی عبدیت اور اپنی بندگی کا احساس اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، اور اس کو اپنے بندہ ہونے کا احساس ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس کو جس نعمت سے بھی نوازتے ہیں، وہ پکار اٹھتا ہے کہ یا اللہ! میں تو اس نعمت کے قابل نہیں تھا، آپ نے اپنی رحمت سے عطا فرمادی ہے۔ لہٰذا جتنی نعمت بڑھتی ہے، رجوع الی اللہ میں اتنا ہی اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام اور نعمتوں پر شکر

حضرت داؤد علیہ السلام اور ان کی اولاد میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بے شمار نعمتیں عطا فرمائیں۔ مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایسی حکومت عطاء فرمائی جو تاریخ انسانیت میں کسی کو بھی ایسی حکومت نہ تو پہلے نصیب ہوئی اور نہ بعد میں نصیب ہوئی۔ وہ یہ کہ انسانوں پر حکومت، جنات پر، چرندوں پر، پرندوں پر، فضاؤں پر اور ہواؤں پر حکومت عطا فرمائی۔ یہ نعمتیں دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا:

﴿اِعْمَلُوْا آلَ دَاوُدَ شُکْراً وَقَلِیْلٌ مِنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْر﴾(سبا: ۱۳)

اے آل داؤد! شکر کا عمل اختیار کرو، اور میرے بندوں میں بہت کم لوگ شکر گزار ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے یہ طے کر رکھا تھا کہ چوبیس گھنٹے میں کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے جس میں ہمارے

گھر میں کوئی شخص بھی اللہ کا ذکر یا شکر نہ کر رہا ہو، چنانچہ آپ نے اوقات کو تمام گھر والوں پر تقسیم کر دیا تھا کہ اس وقت سے لے کر اس وقت تک فلاں ذکر میں لگا رہے گا، اس وقت سے اس وقت تک فلاں صاحب ذکر کریں گے۔ دیکھئے! جس طرح نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے تو اسی طرح رجوع الی اللہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور یہ دعا فرما رہے ہیں:

رَبِّ اَوْزِعْنِی اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِی اَنْعَمْتَ عَلَیَّ وَعَلٰی وَالِدَیَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰه وَاَدْخِلْنِی بِرَحْمَتِكَ فِی عِبَادِكَ الصّٰلِحِیْنَ (النمل:۱۹)

ترجمہ: اے میرے رب! مجھ کو اس پر ہمیشگی دیجئے کہ میں آپ کو ان نعمتوں پر شکر کیا کروں، جو آپ نے مجھ کو اور میرے ماں باپ کو عطا فرمائی ہیں، اور میں نیک کام کیا کروں جس سے آپ خوش ہوں، اور مجھ کو اپنی رحمت سے اپنے نیک بندوں میں داخل رکھئے۔

لہٰذا ایک مؤمن کی خاصیت یہ ہے کہ جوں جوں اس کو نعمتوں سے نوازا جائے گا، اس کے اندر عاجزی اور انکساری پیدا ہو گی، تواضع پیدا ہو گی، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع میں اضافہ ہو گا۔

شریر آدمی کی خاصیت

دوسری طرف شریر آدمی کی خاصیت یہ ہے کہ اس کو جتنی زیادہ نعمتیں ملیں گی، اتنا ہی اس کی رعونت میں اضافہ ہو گا، اس کی فرعونیت بڑھے گی۔ متنبّی شاعر بھی کبھی کبھار بڑی حکیمانہ باتیں کہہ دیتا ہے، چنانچہ وہ

کہتا ہے کہ:

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهُ
وَإِنْ أَنْتَ أَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

یعنی اگر تم ایک شریف آدمی کی عزت کرو گے، اس کے ساتھ اچھا معاملہ کرو گے تو تم اس کے مالک بن جاؤ گے، وہ تمہارا غلام بن جائے گا، اس لئے کہ شریف آدمی تمہارا احسان نہیں بھولے گا، اس کے نتیجے میں وہ تمہارا غلام اور تم اس کے مالک بن جاؤ گے۔ اور اگر تم کمینے آدمی کا اکرام کرو گے، تو چونکہ وہ کمینہ آدمی تھا، وہ اکرام کے قابل نہیں تھا، مگر تم نے اس کی عزت کر کے اس کو سر پر چڑھا دیا، تو اس کے نتیجے میں وہ سرکش بن جائے گا۔

یہی معاملہ ہر انسان کا ہے کہ اگر کسی انسان کو نعمتیں ملتی جائیں اور اس کے نتیجے میں اس کا سر اللہ تعالیٰ کے سامنے جھکتا چلا جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ بندہ شکر گزار ہے، اور اب اگر وہ نعمت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ الحمد للہ مجھے فلاں نعمت حاصل ہے اور یہ بات وہ ڈرتے ڈرتے کہتا ہے کہ کہیں تکبر اور تعلّی نہ ہو جائے، تو معلوم ہوا کہ یہ "تحدیث نعمت" کے طور پر یہ بات کہہ رہا ہے۔ اور اگر نعمت ملنے کے بعد وہ منہ اٹھا کر اپنی بڑائی بیان کر رہا ہے کہ میں نے ایسا ہوں، میں نے ایسا کیا، میں نے ایسا کیا، تو اس صورت میں وہ چاہے "تحدیث نعمت" کے الفاظ استعمال کرے، لیکن حقیقت میں وہ "تحدیث نعمت" نہیں بلکہ وہ تکبر ہے۔

شیخ کی ضرورت

یہ تو "تحدیث نعمت" کی علامت ہے، لیکن انسان خود سے اس علامت کو اپنے اوپر منطبق نہیں کر سکتا، اسلئے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا جب کسی نعمت کا اظہار کرے تو اپنے شیخ سے پوچھے کہ فلاں موقع پر میں نے فلاں نعمت کا اظہار کیا تھا، آیا یہ حدود سے متجاوز ہوا یا نہیں؟ وہ شیخ بتائے گا کہ اس حد تک ٹھیک ہے اور اس حد کے بعد غلط ہے۔ اور جب پندرہ بیس مرتبہ شیخ کو بتایا اور شیخ نے اس کی اصلاح کر دی تو اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ خود ذہن کے اندر ایک ترازو قائم ہو جائے گا، پھر انسان کو خود اس بات کا ادراک ہونے لگے گا کہ کہاں میرا قدم صحیح ہے اور کہاں غلط ہے، اور کہاں تکبر ہے اور کہاں "تحدیث نعمت" ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

سولہویں مجلس

گناہ گار کی تحقیر نہ کریں

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سولہویں مجلس

الحمد للّٰہ رب العالمین، والعاقبۃ للمتقین، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین امابعد!

برے کام کرنے والے کو کم نہ سمجھو

فرمایا کہ: یہ جائز ہے کہ برا کام کرنے والے پر غصہ کرو، اس سے بغض کرو، مگر اپنے سے کم نہ سمجھو، اور کبھی تم کو کسی کی سزا وتادیب کے واسطے مقرر کیا جائے تو خبردار! اپنے کو اس سے اچھا ہرگز نہ سمجھنا، ممکن ہے کہ وہ خطاوار شہزادے کے مثل ہو اور تم نوکر جلاد کے درجہ میں ہو، ظاہر ہے کہ خطاوار شہزادے کو بادشاہ جلاد کے ہاتھوں سزا دلوائے تو جلاد اس سے افضل نہیں ہو سکتا۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۵۵)

یعنی ایک آدمی برا کام کر رہا ہے، اور وہ کسی ناجائز اور گناہ کے کام میں مبتلا ہے، تو اس پر غصہ کر سکتے ہو، اور اس سے بغض رکھ سکتے ہو یعنی اس کے اس عمل سے نفرت کر سکتے ہو، کیونکہ اس کا یہ عمل قابل نفرت ہے، لیکن اس کو اپنے سے کم نہ سمجھو۔ یعنی ایک طرف اس کی برائی کو برائی سمجھو، اور دوسری طرف اس کو اپنے سے کمتر بھی نہ سمجھو، یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہوں؟

نفرت گناہ سے، نہ کہ گناہ گار سے

اس بات کو دو لفظوں میں یوں سمجھو! کہ "فسق" سے نفرت کرو، فاسق سے نفرت نہ کرو۔ یعنی فاسق کی ذات سے نفرت نہ کرو، بلکہ اس کے فعل سے نفرت کرو۔ کفر سے نفرت کرو، کافر کی ذات سے نفرت نہ کرو۔ اور فاسق اور فاجر کو یہ سمجھو کہ یہ بیمار ہے، جب کوئی بیمار ہو جاتا ہے تو کیا اس بیمار سے نفرت کی جاتی ہے؟ نہیں، بلکہ بیماری سے نفرت کی جاتی ہے کہ اس کو بڑی خراب بیماری لگ گئی۔ ہے، لیکن بیمار پر انسان ترس کھاتا ہے کہ یہ بیچارہ اس بیماری کے اندر مبتلا ہو گیا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کسی گناہ کے اندر مبتلا ہے، یا کسی برے کام کے اندر مبتلا ہے تو اس کے برے کام سے نفرت کرو، لیکن اس کی ذات پر ترس کھاؤ۔

گناہ گار ترس کھانے کے لائق

میرے خسر صاحب (جناب بھائی شرافت صاحب) اللہ تعالیٰ ان کو عافیت اور سلامتی کے ساتھ رکھے۔ آمین۔ جب وہ کسی ایسے آدمی کا ذکر

کرتے ہیں جو کسی گناہ یا برے کام میں مبتلا ہوتا ہے تو یوں کہتے ہیں، فلاں بیچارے بدعات میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اس کے لئے "بیچارے" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ترس کھانے کے لائق ہے، کیونکہ وہ بیماری کے اندر مبتلا ہے۔ لہٰذا اس کا عمل قابل نفرت ہے، لیکن اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے۔ اور جب اس کی ذات ترس کھانے کے لائق ہے تو پھر اس کو اپنے سے کم تر سمجھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور بالخصوص اس نقطۂ نظر سے کہ شاید اللہ تعالیٰ اس کو اس گناہ سے بچنے کی توفیق عطا فرمادے، اور توبہ کی توفیق عطا فرمادے، اور اسکے نتیجے میں یہ کہیں سے کہیں پہنچ جائے، اور میں یہیں پڑا رہ جاؤں۔ اس لئے کسی کو اپنے سے کم تر نہ سمجھو۔

شیطان کس طرح راہ مارتا ہے

جن کو اللہ تعالیٰ دین سے وابستگی عطا فرمادیتے ہیں، جیسے اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہماری طلب اور استحقاق کے بغیر۔ الحمد للہ ایسے حلقے سے وابستہ کر دیا جو دین سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن دین سے وابستگی رکھنے والے حضرات جب ان لوگوں کو دیکھتے ہیں جو دین سے وابستہ نہیں ہیں، بلکہ گناہوں کے اندر مبتلا ہیں، تو بسا اوقات ان کو دیکھ کر ان کی ذات سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے اور اپنی برتری کا احساس پیدا ہونے لگتا ہے کہ ہم ان سے برتر ہیں۔ بس یہیں سے شیطان راہ مارتا ہے۔ اس لئے اس بات کو یاد رکھیں کہ کسی کی ذات سے نفرت نہ ہو، اگر نفرت ہو تو اس کے عمل سے ہو، اور اس عمل کی وجہ سے اس پر ترس کھاؤ، اور ترس کھانے کے باوجود یہ سوچو کہ پتہ نہیں کب اللہ

تعالیٰ اس کو توبہ کی توفیق دیدیں اور یہ ہم سے آگے نکل جائے۔

حضرت تھانویؒ کا انداز تربیت

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ایسی پیری نہیں تھی کہ اصلاح کے لئے آنے والوں کو بس وظیفے بتادیے، اور اب وہ خانقاہ میں بیٹھے ہوئے وظیفے گھونٹ رہے ہیں، اور وظیفے پڑھنے کے نتیجے میں نفس اندر سے پھول رہا ہے۔ بلکہ جب کوئی شخص ان کے یہاں تربیت کرانے کے لئے آتا تو اس کی واقعی تربیت کی جاتی تھی، اور تربیت ہی کے لئے کبھی ڈانٹنے کی اور کبھی غصہ کرنے کی اور کبھی سزا دینے کی ضرورت بھی پیش آتی تھی۔ اسی وجہ سے حضرت والا سخت مشہور تھے، اور حضرت والا کے پاس جہاں اہل علم و فہم اپنی اصلاح کے لئے آتے تھے، وہیں ایک سے ایک اکھڑ اور غیر تہذیب یافتہ آدمی بھی آتا تھا، اور حضرت ہر ایک کی اخلاقی تربیت کرتے تھے اور معاشرت و معاملات میں کسی قاعدے یا اصول کی خلاف ورزی پر روک ٹوک بھی فرماتے تھے، اس میں بھی ہر ایک کے ساتھ اسی کے انداز سے پیش آتے تھے۔

تم بیل ہو تو میں قصائی ہوں

چنانچہ ایک مرتبہ ایک دیہاتی آیا، اس نے کوئی خلاف اصول بات کی، تو اس کو سمجھایا اور ڈانٹا، تو وہ دیہاتی کہنے لگا: اجی حضرت! ہم تو بیل ہیں، جواب میں حضرت نے فرمایا کہ میں بھی تو قصائی ہوں۔ اس طرح ہر ایک کے ساتھ علیحدہ معاملہ ہوتا تھا۔

ایک لطیفہ

ایک مرتبہ آپ حوض پر وضو فرمارہے تھے، اتنے میں ایک دیہاتی ایک بڑا سا تربوز لے کر آگیا اور کہا: لے مولوی: تیرے واسطے لایا ہوں، اس کو کہاں دھر دوں؟ حضرت والا نے وضو کرتے ہوئے فرمایا کہ: "میرے سر پر دھر دے" اس دیہاتی نے وہ تربوز اٹھا کر آپکے سر پر رکھ دیا۔ لوگ جلدی سے دوڑے کہ یہ کیا حرکت کر رہا ہے، حضرت نے فرمایا کہ غلطی میری ہے، میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ سر پر دھر دے۔ ایسے ایسے لوگ آیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کی تربیت کے لئے کبھی آپ غصہ بھی فرمایا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ میرا فرض ہے کہ میں غصہ کروں، اس لئے کہ دیانت کا تقاضہ یہی ہے، اگر یہ نہ کروں تو بد دیانتی ہو گی اور امانت میں خیانت ہو گی۔

میری مثال

لیکن فرمایا کہ میں جب بھی کسی پر غصہ کر رہا ہوتا ہوں تو الحمد للہ ذہن سے کبھی یہ بات غائب نہیں ہوتی کہ میری مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ جلاد کو حکم دے کہ شہزادے کو کوڑے مارو، اب وہ جلاد اس حکم پر شہزادے کو کوڑے لگائے گا، لیکن عین اس وقت بھی جس وقت وہ جلاد کوڑے لگا رہا ہو گا، اپنے آپ کو شہزادے سے افضل نہیں سمجھ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ یہ شہزادہ ہے اور میں جلاد ہوں، لیکن مارے گا اس لئے کہ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرنی ہے۔ الحمد للہ، میں جس وقت کسی کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں اور کسی کام پر کسی کا مؤاخذہ کر رہا ہوتا ہوں تو الحمد للہ اس بات کا استحضار رہتا ہے کہ یہ

شہزادہ یا ور میں جسلا ہوں، میں اس سے افضل نہیں ہوں۔

عین ڈانٹ ڈپٹ کے وقت دعا کرنا

دوسرے یہ کہ جسوقت ڈانٹ رہا ہوتا ہوں یا مؤخذہ کر رہا ہوتا ہوں، اسی وقت دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتا رہتا ہوں کہ یا اللہ! مجھ سے ایسا مؤاخذہ نہ فرمایئے گا، آخرت میں میری اس طرح پکڑ نہ فرمایئے گا۔

اب دیکھئے! جو آدمی اس نیت سے ڈانٹ رہا ہو کہ منکر سے روکنا اور اس کی اصلاح کرنا ضروری ہے، اس کا ہمیں حکم ہے، اور ہر ڈانٹ پر اور ہر غصے پر ان دو باتوں کا استحضار رکھتا ہو، اس کا غصہ بھی عبادت نہیں تو اور کیا ہے۔ بہر حال، اس طرح یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں کہ غصہ بھی ہو رہا ہے، برے عمل سے نفرت اور بغض بھی ہے، لیکن اپنے سے اس کو کمتر بھی نہیں سمجھ رہا ہے۔ اپنے کو اس سے افضل بھی نہیں سمجھ رہا ہے لیکن یہ چیز مشق سے اور کسی کے آگے پامال ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل سے حاصل ہوتی ہے۔

سالکین کے کبر اور تواضع مفرط کا علاج

فرمایا کہ: کام کرنے والوں کو دین کا کام کرنے سے دو مرض پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک کبر اور دوسرا تواضع مفرط، کبر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر اپنے اوپر نگاہ کرنے لگے، نماز پڑھ کر بے نمازیوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ اس کا علاج یہ سمجھنا ہے کہ تکبر کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں کے قدم توڑ دیے گئے ہیں کہ

منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، شیطان اور بلعم باعور کی حکایت اس کی نظیر ہے۔ "تواضع مفرط" یہ ہے کہ اس حد تک تواضع کرے کہ اپنے اعمال صالحہ کی بے قدری کرنے لگے، مثلاً اس طرح کہ اگرچہ ہم نماز پڑھتے ہیں مگر اس میں خشوع تو ہے نہیں، ذکر کرتے ہیں مگر انوار بالکل نہیں، گویا کہ در پردہ خدا کی شکایت کر رہے ہیں۔ اس کا علاج یہ کہنا ہے کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہم کو ذکر و نماز کی توفیق دی، ورنہ ہماری کیا مجال تھی جو آپ کی بندگی کر لیتے۔

دین کے راستے سے بہکانہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو متضاد قسم کی بیماریوں کا ذکر فرمایا ہے۔ جو لوگ دین کے کام میں لگتے ہیں، شیطان ان کو دین کے ذریعہ بہکاتا ہے، شیطان کی اول کوشش تو یہ ہوتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ دین کے کام میں لگے ہی نہیں۔ بلکہ اس بندے کو نفسانی لذتوں اور معصیتوں میں اس طرح پھنسایا جائے کہ دین کے کسی کام کی طرف اس کی توجہ ہی نہ ہو، نہ نماز کی طرف اس کی توجہ ہو، نہ روزے کی طرف، نہ زکوٰۃ اور حج کی طرف اس کی توجہ ہو، بلکہ نفسانیت کے اندر پھنسا رہے۔ اور اگر کوئی شخص دین کے کام میں لگ ہی گیا ہے تو اب اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ وہ دین کا کام کر رہا ہے، اس کو برباد کر دوں، چنانچہ شیطان اس کو برباد کرنے کے لئے مختلف طریقے اختیار کرتا ہے، ان طریقوں میں سے دو طریقوں کا حضرت

والا نے اس ملفوظ میں ذکر فرمایا ہے۔

کبر کے ذریعہ بہکانا

پہلا طریقہ یہ ہے کہ شیطان دین کا کام کرنے والے کے دل میں کبر، عجب اور خود پسندی کے خیالات ڈالتا ہے۔ مثلاً اس سے یہ کہتا ہے کہ دیکھ! تو بہت پہنچا ہوا آدمی بن گیا ہے، تو بڑے خشوع وخضوع سے نماز پڑھنے لگا ہے، تو نماز اور جماعت کا پابند ہو گیا ہے، بہت سے لوگ نماز نہیں پڑھتے اور فسق وفجور کے اندر مبتلا ہیں۔ اس کے نتیجے میں اپنی بڑائی اور بے نمازیوں کی حقارت دل میں آجاتی ہے۔ جو انسان بے ظرف ہوتا ہے، جب وہ ذرا نماز کی پابندی کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف ذرا رجوع کرتا ہے تو پھر اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگتا ہے۔

جولاہے کی مثال

عربی کی ایک مثل ہے کہ "صَلّٰی الحائِك رکعتین وانتظر الوحی" ایک مرتبہ ایک جولاہے نے دو رکعت نماز پڑھیں اور نماز کے بعد وحی کا انتظار شروع کر دیا کہ اب میرے اوپر وحی آئے گی۔ یہ ہم لوگوں کا حال ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے ذرا سی عبادت کی توفیق ہو گئی تو بس، دماغ عرش معلی پر پہنچ گیا کہ ہم بڑے عابد، زاہد، متقی اور پارسا ہو گئے ہیں۔ یہ کبر ہے۔ اسکے علاج کے لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

تکبر کا ایک علاج

"اس کا علاج یہ سوچنا ہے کہ "تکبر" کی وجہ سے بڑے بڑے عابدوں

کے قدم توڑ دیے گئے ہیں کہ منزل مقصود تک نہ پہنچ سکے، شیطان اور "بلعم باعور" کی حکایت اس کی نظیر ہے"

یعنی آدمی یہ سوچے کہ اگر میں نے تکبر کیا تو اسکے نتیجے میں یہ سب عمل جو میں کررہا ہوں، یہ سب اکارت ہو جائے گا۔ اس کی نظیر "شیطان" ہے اسلئے کہ شیطان پہلے بڑی عبادت کرتا تھا، یہاں تک کہ اس کا لقب "طاؤس الملائکہ (فرشتوں کا مور) پڑ گیا تھا، لیکن اس عبادت کے نتیجے میں دماغ میں خلل اور تکبر آگیا، چنانچہ جب حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا تو اس نے انکار کردیا، اور یہ عقلی دلیل پیش کی کہ اس کو آپ نے مٹی سے پیدا کیا اور مجھے آگ سے پیدا کیا، لہٰذا میں اس سے افضل ہوں تو میں اس کو سجدہ کیوں کروں؟ بہر حال، اس تکبر کے نتیجے میں وہ راندۂ درگاہ ہو گیا۔ العیاذ باللہ۔

بلعم باعور کا قصہ

دوسری نظیر "بلعم باعور" کی بیان فرمائی، "بلعم باعور" حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ایک شخص گزرا ہے، یہ بڑا عابد و زاہد شخص تھا، بلکہ "مستجاب الدعوۃ" تھا، یعنی جو دعا کرتا وہ فوراً قبول ہو جاتی تھی۔ چنانچہ لوگ اس کے پاس آکر اس سے دعائیں کرایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مقام عطا فرمایا تھا۔ یہ "عمالقہ" کے علاقے میں رہتا تھا، چونکہ اس علاقے کے لوگ کافر تھے، اسلئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا، جب علاقے کے کافروں کو پتہ چلا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

حملہ کرنے والے ہیں تو وہ لوگ "بلعم باعور" کے پاس گئے، اور جا کر اس سے کہا کہ تم بڑے عابد و زاہد ہو، اللہ تعالیٰ تمہاری دعائیں قبول فرماتے ہیں، آپ یہ دعا کریں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر کو شکست ہو جائے اور ہم پر فتح نہ پا سکے۔

بلعم باعور نے کہا کہ میں یہ دعا تو نہیں کر سکتا، اس لئے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ پیغمبر ہیں، اور جو لوگ لشکر میں ان کے ساتھ ہیں وہ سب صاحبِ ایمان ہیں، میں ان کے حق میں شکست کی دعا تو نہیں کر سکتا، انہوں نے اصرار کیا کہ آپ ضرور دعا کریں۔ تو اس نے کہا کہ اچھا! میں اللہ تعالیٰ سے استخارہ کرتا ہوں، چنانچہ استخارہ کیا، اور استخارہ میں یہی جواب آیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر ہیں، تم ان کے حق میں کیسے بددعا کرو گے؟ چنانچہ اس نے لوگوں کو جواب دے دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تھا، اللہ تعالیٰ نے بددعا کرنے سے منع فرما دیا۔

وہ لوگ دوسرے دن پھر اس کے پاس پہنچے، اور اس کے لئے رشوت کے طور پر کچھ ہدیے تحفے بھی لے گئے، اور اس سے کہا کہ یہ ہدیہ تحفہ لے لو اور دعا کر دو۔ اب اس عابد کو چاہئے تو یہ تھا کہ جب استخارہ کے ذریعہ یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہیں ہے، تو بس ان سے انکار کر دیتا اور قصہ ختم ہو جاتا، لیکن جب ہدیہ تحفہ پہنچا تو ایک مرتبہ پھر استخارہ کرنے کی بات دماغ میں آ گئی۔ چنانچہ ان سے کہا کہ اچھا میں ایک مرتبہ اور استخارہ کر لوں، جب دوبارہ استخارہ کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا، تو اس نے لوگوں سے منع کر دیا کہ میں دعا نہیں کرتا۔ ان لوگوں نے پوچھا کہ

آپ نے جو استخارہ کیا تھا، اس کا کیا جواب آیا؟ اس نے کہا کہ جواب میں کچھ نہیں آیا، ان لوگوں نے کہا کہ بس پھر تو کام ہو گیا، اگر اللہ تعالیٰ کو آپ کو روکنے کی مرضی ہوتی تو اللہ تعالیٰ آپ کو منع کر دیتے، جب منع نہیں کیا اور جواب نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو اجازت مل گئی۔ یہ تاویل قوم نے بھی کر لی اور اس کے ساتھ اس عابد نے بھی کر لی، اور بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کی ہلاکت کی بد دعا کر دی۔ العیاذ باللہ۔

چونکہ یہ بد دعا ایک نبی کے بارے میں تھی، اس لئے قبول تو نہیں ہوئی، البتہ بعض حضرات نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بعد میں کئی سال تک میدان تیہ میں پھرتے رہے، یہ ”بلعم باعور“ کی دعا کا نتیجہ تھا۔ پھر اس عابد نے قوم سے کہا کہ میں نے تمہارے کہنے سے دعا تو کر دی تھی مگر اللہ تعالیٰ قبول نہیں کریں گے، کیونکہ میں نے پہلے ہی استخارہ کر لیا تھا۔ لوگوں نے اس سے کہا کہ آپ نے جو گناہ کرنا تھا وہ تو کر لیا، اور اب دعا بھی قبول نہیں ہو رہی ہے، اب کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کے لشکر کو بربادی کا سامنا کرنا ہی پڑے۔

اب اس عابد نے غور کرنے کے بعد کہا کہ اب میں ایسی تدبیر بتاتا ہوں جس کے نتیجے میں یہ لوگ خود اپنے آپ کو ہلاک کر دیں گے۔ وہ یہ کہ تم اپنی قوم کی نوجوان لڑکیوں کو تیار کرو اور ان کو بنا سنوار کر ان کے لشکر کے اندر داخل کر دو، اس لئے کہ یہ لوگ کافی عرصے سے اپنے گھروں سے نکلے ہوئے ہیں، جب لڑکیاں ان کے پاس پہنچیں گی تو ان میں سے کوئی نہ کوئی گناہ میں مبتلا ہو جائے گا، جب یہ گناہ میں مبتلا ہوں گے تو اللہ تعالیٰ کی طرف

سے ان پر عذاب آجائے گا، اس طرح تم ان کو ہلاک کر سکتے ہو۔ چنانچہ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا، اور نوجوان لڑکیاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لشکر میں داخل کردیں، جسکے نتیجے میں بعض لوگ گناہ میں مبتلا ہو گئے۔ بلکہ واقعات میں لکھا ہے کہ عمالقہ کی شہزادی بنی اسرائیل کے ایک بڑے سردار کے پاس پہنچ گئی، وہ سردار اس شہزادی کو لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس آیا اور ان سے پوچھا کہ کیا یہ شہزادی میرے اوپر حرام ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ہاں! یہ تم پر حرام ہے، اس نے کہا کہ حرام ہونے کے باوجود میں اس کو آج اپنے ساتھ لیجاؤں گا، چنانچہ وہ اس کو لے گیا اور پھر اس کے ساتھ بد عملی میں مبتلا ہوا، اس کے بعد حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے کسی نے جا کر ان دونوں کو نیزے سے قتل کر دیا۔ اس واقعے کے بعد اس بد عملی کے عذاب کے طور پر بنی اسرائیل کے اندر "طاعون" کی بیماری پھوٹی، چنانچہ حدیث شریف میں بھی آیا ہے کہ:

"إنه بقية رجز أرسل إلى بني اسرائيل"

یعنی یہ طاعون اس عذاب کا بقیہ حصہ ہے جو بنی اسرائیل کی طرف بھیجا گیا تھا۔

یہ سب کچھ "بلعم باعور" کی تجویز کی بنا پر ہوا، اس نے عمالقہ کو یہ حیلہ سکھایا تھا۔ اب دیکھئے کہ وہ بلعم باعور جو اتنا بڑا عابد، عالم، اور مستجاب الدعوۃ تھا، لیکن جب اس کا دل پھرا تو اس انجام کو پہنچا جس کا ذکر ان آیات قرآنی میں ہے:

﴿وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا

فَاتَّبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ، وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ، فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ، اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ﴾۔(الاعراف:۱۷۵)

ترجمہ: ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنایئے، جس کو ہم نے اپنی آیتیں دیں، پھر وہ ان سے بالکل نکل گیا، پھر شیطان اس کے پیچھے لگ گیا سو وہ گمراہ لوگوں میں داخل ہو گیا، اور اگر ہم چاہتے تو اس کو ان آیتوں کی بدولت بلند مرتبہ کر دیتے، لیکن وہ تو دنیا کی طرف مائل ہو گیا، اور اپنی نفسانی خواہش کی پیروی کرنے لگا، سو اس کی حالت کتے کیسی ہو گئی کہ اگر تو اس پر حملہ کرے تب بھی ہانپے، یا اس کو چھوڑے تب بھی ہانپے۔

دل کب پلٹے جاتے ہیں؟

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ ”بلعم باعور“ کی حکایت اس کی نظیر ہے۔ حالانکہ وہ اتنا بڑا عالم اور عابد اور مستجاب الدعوۃ تھا، اور لوگ اس کے پاس جاکر اپنے لئے دعائیں کراتے تھے، لیکن اس کا یہ انجام ہوا۔ دل پلٹتے دیر نہیں لگتی، لیکن اللہ تعالیٰ ظلمت کی طرف کسی کا دل ویسے ہی نہیں پلٹ دیتے کہ اچانک بیٹھے بیٹھے ایک مسلمان کافر بن جائے، بلکہ اس شخص کی حرکتیں ایسی ہوتی ہیں

جس کی بنیاد پر دل پلٹے جاتے ہیں۔ وہ حرکت یہ ہوتی ہے کہ اپنی عبادت پر گھمنڈ ہو گیا اور تکبر ہو گیا۔ اور تکبر کے نتیجے میں بڑوں بڑوں کے قدم توڑ دیے گئے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ایک حکایت

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں ایک حکایت لکھی ہے۔ یہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تہجد پڑھ رہے تھے، اس دوران انہوں نے دیکھا کہ ایک نور چمکا، اور پوری فضا منور ہو گئی، اور اس نور میں سے آواز آئی:

> ''اے عبدالقادر! تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کر دیا، جو عبادت اب تک تم نے ادا کر لی وہ کافی ہے، آج کے بعد تم پر نماز فرض نہیں، روزہ فرض نہیں، تمام عبادات کی تکلیف تم سے اٹھا لی گئی''

یہ آواز نور میں سے آئی، گویا کہ اللہ تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ تیری عبادتیں اس درجہ میں قبول ہو گئیں کہ آئندہ کے لئے تجھے عبادتوں سے فارغ کر دیا گیا۔ حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جب یہ نور دیکھا اور یہ آواز سنی تو فوراً جواب میں فرمایا:

> کمبخت! دور ہو، مجھے دھوکہ دیتا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو عبادتیں معاف نہیں ہوئیں اور ان پر سے

عبادتوں کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، مجھ سے ختم ہو جائے گی؟ تو مجھے دھوکہ دینا چاہتا ہے؟

دیکھئے: شیطان نے کتنا بڑا وار کیا، اگر ان کے دل میں عبادت کا ناز آجاتا تو وہیں پھسل جاتے۔ جو لوگ کشف و کرامات کے پیچھے بہت پڑے رہتے ہیں، ان کو ختم کرنے کیلئے تو شیطان کا یہ بہترین وار تھا، لیکن شیخ تو شیخ تھے، فوراً سمجھ گئے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر سے تو عبادت کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، میرے اوپر سے کیسے ختم ہو جائے گی؟

شیطان کا دوسرا حملہ

تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک اور نور چمکا اور فضا منور ہوئی اور اس نور میں سے آواز آئی:

"اے عبدالقادر! آج تیرے علم نے تجھے بچالیا، ورنہ میں نے نہ جانے کتنے عابدوں کو اس وار کے ذریعہ تباہ کر دیا"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دوبارہ فرمایا:

کمبخت! دوبارہ مجھے دھوکہ دیتا ہے، میرے علم نے مجھے نہیں بچایا، مجھے اللہ کے فضل نے بچایا ہے۔

یہ دوسرا حملہ پہلے حملے سے زیادہ خطرناک اور اس سے زیادہ سنگین تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ ان کے اندر علم کی بڑائی اور اس کا ناز پیدا کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے حملے کی سنگینی

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ پہلا حملہ اتنا سنگین نہیں تھا، کیونکہ جس شخص کے پاس ذرا بھی شریعت کا علم ہو، وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ زندگی میں ہوش حواس کی حالت میں کسی انسان سے عبادات معاف نہیں ہو سکتیں، لیکن یہ دوسرا حملہ بڑا سنگین تھا، نہ جانے کتنے لوگ اس حملے میں بہک گئے، اس لئے کہ اس میں اپنے علم پر ناز پیدا کرنا مقصود تھا اور یہ باریک بات ہے۔

دل سے گھمنڈ نکال دو

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس تکبر کا علاج یہ ہے کہ آدمی یہ سوچتا رہے کہ کیسے کیسے بڑے صاحبانِ علم، صاحبانِ معرفت، عبادت گزار، متقی اور پارسا بھی جب گھمنڈ میں مبتلا ہوئے تو ان کا انجام کیا ہوا۔ العیاذ باللہ۔ لہٰذا دل سے گھمنڈ کو نکالو، اگر تم دین کے راستے میں لگے ہوئے ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلق خدا کی تحقیر میں لگ جاؤ اور ساری دنیا کی مخلوق کو جہنمی سمجھنے لگو۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من قال هلك الناس فهو اهلكهم

جو شخص یہ کہے کہ ساری دنیا تباہ ہو گئی تو سب سے زیادہ تباہ وہ کہنے والا شخص ہے۔ جس شخص کو اپنے عیوب نہیں نظر آ رہے ہیں، اور ساری دنیا کے عیوب تلاش کرتا پھر رہا ہے، ان کی تحقیر کر رہا ہے، تو وہ شخص سب سے

زیادہ تباہ اور سب سے زیادہ برباد ہے۔

تکبر کا علاج، رجوع الی اللہ

لہٰذا جب کبھی دل میں اپنی عبادت کا، اپنے علم کا، اپنے زھد کا، اپنے صدقہ خیرات کا خیال آنے لگے تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، اور کہو کہ یا اللہ! آپ کی دی ہوئی توفیق کے نتیجے میں میں نے یہ کام انجام دیا، میں اس پر آپ کا شکرادا کرتا ہوں، یہ کام کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔ اور شیطان کے شر سے پناہ صرف رجوع الی اللہ میں ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عیوب کا استحضار کرو، جب دونوں چیزیں یعنی رجوع الی اللہ اور اپنے عیوب کا استحضار جمع ہو جائیں گی تو پھر تکبر پیدا نہیں ہونے دیں گی۔

”تواضع مفرط“ کا پیدا ہونا

بہرحال، اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ دین کا کام کرنے والوں میں ایک تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بعض اوقات اس کے بالکل الٹ چیز یعنی ”تواضع مفرط“ (حد سے بڑھی ہوئی تواضع) پیدا ہو جاتی ہے۔ تواضع اچھی چیز ہے، لیکن یہ بھی اپنی حد کے اندر ہونی چاہئے، اگر حد سے آگے بڑھ جائے تو یہ بھی مضر ہے۔

”تواضع مفرط“ کا ایک قصہ

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے وعظ میں اپنے سامنے کا ایک قصہ بیان فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ میں ریل میں سفر کر رہا تھا، کچھ اور لوگ بھی میرے قریب بیٹھے ہوئے تھے جب کھانے کا وقت آیا تو

انہوں نے اپنا کھانا نکالا اور دستر خوان بچھایا، اور ساتھیوں کو جمع کر کے کھانا شروع کیا، تو جس طرح تواضعاً ہم کہتے ہیں کہ آیئے! دال روٹی آپ بھی کھا لیجئے، اسی طرح انہوں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے شخص سے تواضعاً کہا کہ کچھ گوہ موت آپ بھی کھا لیجئے" انہوں نے تواضعاً اپنے کھانے کو گوہ موت کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ تو اللہ تعالیٰ کے رزق کو گوہ موت کہنا یہ "تواضع مفرط" ہے، اس لئے کہ تواضع کے نتیجے میں ایسا عمل کرنا جس سے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری اور توہین اور تحقیر ہو جائے، یہ بری بات ہے، اور یہ تواضع کا حد سے بڑھ جانا ناشکری ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہے۔ اس لئے یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

اپنی نماز کو "ٹکریں مارنا" مت کہو

یہی تواضع مفرط انسان کو پاس تک پہنچا دیتی ہے اور انسان کے اندر مایوسی پیدا کر دیتی ہے۔ جیسے آپ نے لوگوں سے یہ جملہ سنا ہو گا کہ: ارے ہماری نماز کیا ہے، ہم تو ٹکریں مارتے ہیں۔ اب نماز کو "ٹکریں مارنے" سے تعبیر کرنا "تواضع مفرط" ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے اپنی بارگاہ میں حاضری کی توفیق دی۔ نہ جانے کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو بارگاہ میں حاضری کی بھی توفیق نہیں ملی، اس لئے کیوں اس نماز کی ناقدری اور ناشکری کرتے ہو؟ یہ ٹھیک ہے کہ تمہاری نماز میں بہت ساری کوتاہیاں بھی ہیں، لیکن وہ کوتاہیاں تمہاری ہیں، اور توفیق ان کی ہے، لہٰذا پہلے توفیق پر شکر ادا کرو، اور پھر کوتاہیوں پر استغفار کر لو۔

اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! آپ نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تھی، لیکن میں نے اس نماز کا حق ادا نہیں کیا۔ استغفر اللہ۔ لہٰذا پہلے اس عبادت کی توفیق پر شکر ادا کرو اور پھر اپنی کوتاہی پر استغفار کرو، یہ نہ کہو کہ ہماری نماز تو ٹکریں مارنا ہے، یہ بات کہنا کسی طرح بھی درست نہیں۔

کوتاہیوں پر استغفار کرو

اور جب تم اپنی کوتاہی پر استغفار کرو گے تو جس نے اس عبادت کے کرنے کی توفیق دی ہے وہ تمہارے استغفار کو قبول کر کے اس عبادت میں کمال بھی عطا فرمادے گا انشاء اللہ۔ ارے کوئی آدمی بھی ایسا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کا حق ادا کر سکے؟ ہم اور تم تو کس شمار میں ہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن کے پاؤں رات کو تہجد کی نماز میں کھڑے کھڑے سوج رہے ہیں، وہ یہ فرمارہے ہیں:

ما عبدناك حق عبادتك

ما عرفناك حق معرفتك

ہم آپ کی عبادت کا حق ادا نہیں کر سکے، جب وہ یہ فرمارہے ہیں تو ہم کیسے اس کی عبادت کا حق ادا کر سکتے ہیں۔ ارے! ہماری تو ہر عبادت ان کی نسبت سے ناقص ہی رہے گی، لیکن جب انہوں نے اپنے در پر آنے کی توفیق دی، اپنے آستانے پر سجدہ کرنے کی توفیق دی، تو پھر اس سے یہ کیسی بدگمانی کرتے ہو کہ وہ یہ سجدہ قبول نہیں فرمائیں گے، اور کیسے تم اس سجدہ کی ناقدری کرتے ہوئے کہتے ہو کہ یہ گندہ سجدہ ہے۔ جب تم اس کی دی ہوئی توفیق پر شکر ادا کرنے کے بعد استغفار کرو گے اور یہ کہو گے کہ یا اللہ! اس

عبادت میں جو کوتاہی ہوئی ہے، اپنی رحمت سے اس کو معاف فرمادیجئے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ ان کوتاہیوں کو ضرور معاف فرمائیں گے۔

حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کا ایک واقعہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے جب کوئی آکر یہ کہتا کہ میں نماز کیا پڑھتا ہوں، بس ٹکریں مارتا ہوں، تو آپ کو ان باتوں سے بہت توحش ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک صاحب نے آکر حضرت والا سے عرض کیا کہ حضرت! میری نماز کیا، میرا سجدہ کیا، جب میں سجدہ کرتا ہوں تو اس میں گندے گندے شہوانی اور نفسانی خیالات آتے ہیں، میری یہ نماز تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کے لائق بھی نہیں ہے۔ حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ اچھا یہ تمہارا سجدہ جو نفسانی اور شہوانی خیالات والا ہے، یہ تو بڑا گندہ سجدہ ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ ہاں! بالکل گندہ سجدہ ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اچھا یہ گندہ سجدہ تم مجھے کرو، کیونکہ یہ شہوانی اور نفسانی خیالات والا سجدہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کرنے کے لائق تو نہیں ہے، لہٰذا یہ سجدہ اللہ میاں کے بجائے تم مجھے کرو۔ انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ آپ کیسی بات کررہے ہیں۔ میں آپ کو سجدہ کروں؟ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ گندہ سجدہ ہے، اور اللہ میاں کو کرنے کے لائق نہیں ہے تو مجھے کرکے دیکھ لو، انہوں نے کہا کہ حضرت! یہ نہیں ہوسکتا، میں یہ سجدہ کسی اور کو نہیں کرسکتا۔ حضرت نے فرمایا کہ جب یہ سجدہ کہیں اور نہیں ہوسکتا تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ سجدہ انہی کے لئے ہے، یہ پیشانی کہیں اور ٹک نہیں سکتی، یہ سجدہ کہیں اور ہو نہیں سکتا، یہ سر کسی اور آستانے پر جھک نہیں سکتا،

یہ سجدہ تو انہی کے لئے ہے اور ان کی توفیق سے ہے۔ البتہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے اس سجدے میں خرابیاں داخل ہو گئی ہیں، اس کی طرف سے استغفار کر لو، لیکن یہ پیشانی وہیں ٹکے گی۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ:

قبول ہو کہ نہ ہو پھر بھی ایک نعمت ہے
وہ سجدہ جس کو تیرے آستاں سے نسبت ہے

یہ سجدہ معمولی چیز نہیں۔ لہٰذا اس سجدے کے بارے میں جو الٹی سیدھی باتیں کرتے ہو، ان کو چھوڑو اور اللہ جل شانہ کی توفیق پر شکر ادا کرو۔

عبادات چھڑانے کا طریقہ

ہوتا یہ ہے کہ شیطان "تواضع مفرط" پیدا کر کے اس کی راہ مارتا ہے اور اس کے دل میں یہ خیال ڈالتا ہے کہ میں تکبر کی بیماری میں تو مبتلا نہیں ہوں، اس لئے کہ میں تو اپنی نماز کو کچھ سمجھتا ہی نہیں ہوں، اور ساتھ میں تواضع بھی اختیار کر رہا ہوں۔ لیکن یہ خیالات جب زیادہ ہو جاتے ہیں تو رفتہ رفتہ اس کے دل میں مایوسی پیدا کر دیتا ہے کہ یہ عبادت کرنا تیرے بس کی بات نہیں، تیری نماز کبھی قبول نہیں ہو سکتی، جب قبول ہی نہیں ہو گی تو پھر پڑھنے سے کیا فائدہ؟ لہٰذا چلو چھوڑو اور گھر بیٹھو۔ اس طرح یہ شیطان نماز چھڑا دیتا ہے۔

عبادات پر شکر ادا کرو

خوب یاد رکھو! جب بھی اللہ تعالیٰ کسی عمل کو کرنے کی توفیق دیدے، اس پر شکر ادا کرو، اور شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ یہ کہو کہ یا اللہ! آپ کی

توفیق سے میں نے یہ عبادت انجام دی، البتہ اس میں میری طرف سے جو کوتاہیاں شامل ہو گئی ہیں، اپنی رحمت سے ان کو معاف فرما دیجئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین فرمایا کرتے تھے:

لولا الله ما اهتدينا

ولا تصدقنا ولا صلينا

اے اللہ! اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہمیں ہدایت نہ ملتی، اور اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو ہم نہ صدقہ دے سکتے تھے اور نہ نماز پڑھ سکتے تھے۔ جو کچھ ہے وہ آپ کی توفیق سے ہے۔ اس لئے ہم اس توفیق پر شکر ادا کرتے ہیں، اور اپنی کوتاہیوں سے استغفار کرتے ہیں۔ بس: اگر یہ دو باتیں پلّے باندھ لو گے تو نہ کبر پیدا ہو گا اور نہ تواضع مفرط پیدا ہو گی، جو شیطان کے دو ہتھیار ہیں۔

شیطان کی کمر توڑنے والے الفاظ

میں نے اپنے شیخ سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ مقولہ سنا کہ "جو شخص کوئی بھی نیک عمل کرنے کے بعد یہ الفاظ کہہ دے:

"الحمد لله، استغفر الله"

تو شیطان یہ الفاظ سن کر کہتا ہے کہ اس نے میری کمر توڑ دی۔ کیونکہ "الحمد للہ" کہنے سے توفیق پر شکر ادا ہو گیا تو اس سے کبر کی جڑ کٹ گئی، اور "استغفر اللہ" کہنے سے یہ ہوا کہ تواضع مفرط کے نتیجے میں جن کوتاہیوں پر نظر ہو رہی تھی، ان کی جڑ کٹ گئی، دونوں کا علاج ہو گیا۔ اس لئے ہر نماز کے بعد اور ہر نیک عمل کے بعد کہو "الحمد للہ، استغفر اللہ" اور یہ الفاظ کہتے وقت یہ کہو کہ یا اللہ! آپ نے مجھے نیک عمل کرنے کی توفیق

دی، اس پر میں "الحمد للہ" کہہ رہا ہوں، اور اس عمل میں میری طرف سے جو کوتاہیاں ہوئیں اس پر میں "استغفر اللہ" کہہ رہا ہوں کہ اے اللہ! مجھے معاف فرما دیجئے۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ ہائے ہائے کرنے کی ضرورت نہیں، بس جو بھی عبادت کرو، اس کے بعد یہ پڑھ لو، انشاء اللہ شیطان کے عمل سے محفوظ رہو گے۔

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

جلد ۲

اِصلاحی مجالس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- مخلوق کی وجہ سے عمل چھوڑنا
- چھوٹے پر زیادتی کی معافی مانگنا۔
- تکبر کا علاج، ذلتِ نفس۔
- رمضان کے لئے اعمال مؤخر کرنا۔
- اللہ تک پہنچنے کے راستے
- تصرف کی حقیقت
- اعمال میں رسوخ پیدا کریں۔

حضرت مولانا مُفتی مُحمّد تقی عُثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین
والصّلاة والسّلام علی رسوله الکریم، وعلی
کل من تبعهم باحسان الی یوم الدین، أمابعد

الحمدللہ "اصلاحی مجالس" کی دوسری جلد آپ تک پہنچانے کی سعادت کر رہے ہیں۔ اگرچہ اس کے آنے میں قدرے تاخیر ہو گئی، لیکن ہر چیز کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔ وہ چیز نہ اس سے پہلے وجود میں آ سکتی ہے نہ بعد میں۔

جلد اوّل میں "رذائل" کا بیان شروع کر دیا گیا تھا، جو "انفاس عیسیٰ" کے تیسرے باب "تہذیبات" کی تشریح پر مشتمل ہے، جبکہ "انفاس عیسیٰ" کے پہلے دو باب باب اوّل "تعلیمات" اور باب دوم "تحقیقات" کی تشریح باقی تھی۔ اصولاً تو ترتیب سے ہر باب کی تشریح آنی چاہئے تھی، لیکن جس وقت

رمضان المبارک کی ان مجالس کو قلم بند کرنا شروع کیا تھا، اس وقت "باب سوم تہذیبات" سے متعلق بیانات کے ریکارڈ دستیاب ہوگئے تھے، اور شروع کے دو ابواب کے ریکارڈ اس وقت دستیاب نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے ان کو پہلے قلم بند کرنا شروع کر دیا تھا، لیکن بعد میں شروع کے بیانات کے ریکارڈ کی تلاش شروع کی تو الحمد للہ اس میں کامیابی ہوگئی، اور اب الحمد للہ جلد دوم باب اوّل کے بیانات پر مشتمل ہے جس میں مجاہدات کی حقیقت، اور اس کی اقسام، تصرف کی حقیقت، اللہ تک پہنچنے کے راستے، شیخ کی ضرورت، ہمت اور اخلاص وغیرہ کا بیان آگیا ہے۔ البتہ چونکہ جلد اوّل کے آخر میں "تکبر اور اس کا علاج" کا بیان چل رہا تھا۔ اس کے بعض بیانات جلد اوّل میں آنے سے چھوٹ گئے تھے۔ اس لئے جلد ثانی کے ابتدائی ۶ بیانات "تکبر اور اس کے علاج" پر مشتمل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس کاوش کو قبول فرمائے اور صدق و اخلاص کے ساتھ مزید کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

عبداللہ میمن

۲۱/ذیقعدہ ۱۴۲۲ھ

اجمالی فہرست مجالس

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
	۶۳

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
دل ایک آئینہ ہے	۱۷۱
مجلس نمبر ۲۵	۱۷۵
مجاہدہ اختیاریہ اور اضطراریہ کا فرق	۱۷۵
مجاہدہ اختیاری	۱۷۶
مجاہدہ اضطراری	۱۷۷
مجاہدہ اختیاری اپنی مرضی سے نہ کرے	۱۷۸
مجاہدہ اختیاری میں نورانیت	؍؍
مجاہدہ اضطراریہ سے قابلیت پیدا ہونا	۱۷۹
مجاہدہ اضطراری میں ترقی تیزی سے ہوتی ہے	۱۸۰
مجاہدہ اضطراریہ میں صبر داخل ہے	۱۸۱
مجاہدہ اضطراریہ میں وساوس کا احتمال نہیں	؍؍
تکلیف اور پریشانی کے وقت مجاہدہ اضطراری کو سوچنا	۱۸۲
میرا ایک واقعہ	۱۸۳
مجاہدہ اضطراریہ کا نفع	۱۸۴
معمولات چھوٹنے کے باوجود پورا ثواب	؍؍

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان

صدق اللہ العظیم

مجلس نمبر ۱۷

مخلوق کی وجہ سے عمل نہیں چھوڑنا چاہئے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲
مجلس نمبر : ۱۷
صفحات : ۱۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ؕ

مجلس نمبر ۱۷

مخلوق کی وجہ سے عمل نہیں چھوڑنا چاہئے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ ربّ الۡعَالِمِیۡنَ ۔ والعاقبة للمتقین ۔
والصّلوٰۃ والسّلام علٰی رسوله الکریم ۔ وعلٰی
آله واصحابه اجمعین ۔
أَمَّا بَعۡدُ!

تکبّر مع اللہ کی صورت

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

تکبّر میں جب غلو ہو جاتا ہے اور اس کی جڑ پختہ ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی تکبر کرنے لگتا ہے۔ مثلاً دعا میں عاجزی اور خشوع کر رہا تھا، رونے کی صورت بنا کر گڑ گڑا رہا تھا کہ سامنے سے کوئی دوسرا شخص آ گیا تو اب گڑ گڑانا

چھوڑ دیا کہ دیکھنے والے کی نظر میں سبکی نہ ہو، یہ تکبر مع اللہ
ہے کہ اس کو اللہ کے سامنے عاجزی اور ذلت کی صورت
بنانے سے بھی دوسروں کی نظر میں ذلت و عار آتی ہے،
پس مخلوق کے لئے کسی عمل عبادت کو ترک کرنا تکبر ہے۔
(انفاس عیسی ص ۱۵۷)

تکبر مع الناس اور تکبر مع الخلق تو برا ہے، ہی لیکن اللہ جل شانہ کے ساتھ تکبر کرنا بدترین قسم کا تکبر ہے۔ مثلاً ایک شخص دعا میں روتا ہے اور گڑگڑاتا ہے یا رونے کا منہ بناتا ہے، یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ عمل پسندیدہ عمل ہے، لیکن کسی اور کے سامنے اپنی دعا میں یہ عمل کرتے ہوئے اگر انسان یہ محسوس کرے کہ میری ذلت ہو رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنے میں اپنی خفت محسوس کر رہا ہے۔ العیاذ باللہ۔ یہ بہت خطرناک قسم کا تکبر ہوا۔

مخلوق کے لئے عمل کا ترک

مذکورہ ارشاد کے آخر میں حضرت والا نے یہ اصول بیان فرمادیا کہ ”پس مخلوق کے لئے کسی بھی عمل عبادت کو ترک کرنا تکبر ہے“۔ جس طرح مخلوق کے لئے عمل کرنا ریاکاری اور دکھاوا ہے، یعنی مخلوق کے خاطر عمل کرنا کہ مخلوق مجھے دیکھ کر مجھے عبادت گزار سمجھے، جس طرح یہ عمل ریا ہے بلکہ شرک کے قریب پہنچ جاتا ہے، اسی طرح ترک عمل للخلق بھی جائز نہیں، اس لئے یہ

ترکِ عمل یا تو ریا ہو گا یا تکبر میں داخل ہو گا۔

تکبر مع اللہ کی مثال

مثلاً نماز کا وقت آ گیا اور آپ اس وقت ایسی جگہ پر ہیں جہاں نماز کا ماحول نہیں، اب اگر آپ وہاں نماز پڑھنے سے اس لئے شرمائیں کہ لوگ مجھے نماز پڑھتا دیکھ کر معلوم نہیں کیا سمجھیں گے۔ العیاذ باللہ۔ تو یہ ترک عمل لِلخلق ہے جو جائز نہیں۔ آج کل بہت کثرت سے یہ صورت پیش آتی رہتی ہے، مثلاً جو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں، انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جہاز میں نماز معاف ہے اور نماز کو چھوڑنے کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ سب لوگ تو بیٹھے ہیں، اب اگر میں ان سب کے سامنے کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا تو ایک بھدی صورت پیدا ہو جائے گی۔ العیاذ باللہ۔ نماز تو اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے، اب جو شخص اس وقت نماز کو ترک کر رہا ہے وہ مخلوق کے سامنے اس عاجزی کا اظہار نہیں کرنا چاہ رہا ہے، اس لئے کہ اس سے میری ھیٹی ہو گی، تو یہ صورت "تکبر مع اللہ" ہے۔

ایسے مقامات پر نماز نہ چھوڑے

غیر مسلم ملکوں میں میرا اکثر جانا ہوتا ہے، وہاں بکثرت یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں غیر مسلموں کی آمد و رفت ہے یا جہاں غیر مسلم کثرت سے موجود ہیں، وہاں بعض مسلمان نماز پڑھنے سے کتراتے ہیں، اس

لئے کتراتے ہیں کہ اگر ہم یہاں نماز پڑھیں گے تو ہم ان کے سامنے تماشہ بن جائیں گے۔ اب اس ڈر سے نماز چھوڑنا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ غیر مسلم لوگ ہمارا مذاق اُڑائیں اور ہمیں تماشہ سمجھیں، اور اس نماز کی ہیئت کو ذلت کی ہیئت سمجھ کر ترک کرنا اور دوسرے لوگوں کے سامنے اس ہیئت میں آنے سے پرہیز کرنا یہ "تکبر مع اللہ" ہے۔ واقعۃً بعض جگہیں ایسی ہیں کہ اگر آدمی وہاں نماز پڑھے تو ایک تماشہ بن جاتا ہے اور لوگ آکر دیکھتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

اندلس کے ائیر پورٹ پر نماز

اب تو چونکہ مسلمان ہر جگہ پہنچ گئے ہیں، اس لئے الحمد للہ نماز اتنی اجنبی نہیں رہی، مجھے تو ایسی ایسی جگہوں پر نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا جہاں ایک انسان بھی کلمہ گو نہیں تھا، لیکن سب سے زیادہ حسرت مجھے اندلس میں ہوئی، وہ اندلس جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی، اور آٹھ سو سال تک جس کی فضاؤں میں اذان کی آوازیں گونجتی رہیں، جب میں وہاں ائیر پورٹ پر اترا تو نماز کا وقت تھا، نماز پڑھنے کے لئے ایک گوشہ تلاش کیا تاکہ وہاں نماز ادا کریں، میرے ساتھ ایک دوست بھی تھے، چنانچہ ایک گوشہ میں ہم دونوں نے نماز شروع کر دی، وہ گوشہ ایسا نہیں تھا جو بہت نمایاں ہو، اس لئے کہ آدمی نماز پڑھنے کے لئے ایسا گوشہ تلاش کرتا ہے جو ذرا آڑ میں ہو، لیکن میں نے دنیا میں لوگوں کے لئے نماز کو اتنی انجانی اور اجنبی محسوس نہیں کی جیسی وہاں محسوس کی، پہلے تو ہمیں نماز پڑھتا دیکھ کر دو چار آدمی کھڑے ہوگئے، پھر وہ

لوگ دوسروں کو بلا بلا کر لائے کہ دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے، پھر تو باقاعدہ ہمیں دیکھنے کے لئے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، گویا کہ آج تک انہوں نے یہ نظارہ دیکھا ہی نہیں تھا۔

مجھے حسرت اس بات کی ہوئی کہ مجھے امریکہ میں اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں جو کفر کے بڑے بڑے مراکز ہیں، ان میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، لیکن کہیں بھی نماز اتنی اجنبی محسوس نہیں کی گئی جتنی اندلس کے ائرپورٹ پر محسوس کی گئی۔

اب اگر آدمی اس وجہ سے نماز چھوڑ دے کہ اگر میں یہاں نماز پڑھوں گا تو یہ لوگ تماشہ بنائیں گے اور برا سمجھیں گے یا نماز پڑھنے سے میری خفت ہو گی، تو یہ خطرناک خیال ہے اور یہ "تکبّر مع اللہ" ہے۔

ایسے موقع پر نماز مؤخر کر دے

بعض جگہ نماز کو مؤخر کرنا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے سے کہیں اسلام کی غلط نمائندگی نہ ہو جائے، مثلاً ایک شخص ریل گاڑی میں سفر کر رہا ہے یا جہاز میں سفر کر رہا ہے، اور نماز پڑھنے کی اتنی جگہ ضروری ہے جس میں آدمی سجدہ کر سکے، لیکن نماز پڑھنے کے لئے اتنی جگہ حاصل کرنے کے لئے دوسرے کو تکلیف پہنچانی پڑے گی یا کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانا پڑے گا، تو اگر اس تکلیف سے دوسرے کو بچانے کے لئے آدمی نماز مؤخر کر دے تو یہ مؤخر کرنا درست ہے، اس لئے کہ دوسرے کو تکلیف دے کر نماز پڑھنے سے

غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی غلط نمائندگی ہوگی، اور لوگ یہ سمجھیں گے کہ اسلام ایسا مذہب ہے جو لوگوں کو تکلیف دیتا ہے، لہٰذا اس وجہ سے نماز کا مؤخر کرنا صحیح ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

دوسری انتہاء

بہرحال! ایک انتہاء تو یہ ہے کہ لوگ جہازوں میں نماز پڑھنے سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ کہیں دوسروں کے سامنے تماشہ نہ بن جائیں اور نماز پڑھنے سے کہیں ہماری خفت نہ ہو۔ العیاذ باللہ۔ یہ تو تکبّر مع اللہ ہے۔ دوسری انتہاء وہ ہے جو اس واقعہ سے سامنے آتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ جہاز میں سفر کر رہا تھا، جہاز بھی چھوٹا تھا اور سفر بھی صرف ایک گھنٹے کا تھا، نماز کا وقت آگیا تھا، لیکن منزل پر پہنچ کر جہاز سے اتر کر آرام سے نماز پڑھ سکتے تھے، مگر میرے کچھ دوست جو میرے ساتھ تھے، ان کا اصرار یہ تھا کہ نماز جہاز ہی میں پڑھنی ہے، یہاں وضو کرنا ہے، اذان دینی ہے اور پھر جماعت سے نماز پڑھنی ہے۔ چنانچہ جب وضو کرنے کا ارادہ کیا تو جہاز کے عملہ نے منع بھی کیا کہ یہاں وضو کرنا مشکل ہوگا، لیکن وہ لوگ نہیں مانے اور اصرار کیا کہ ہم تو وضو کریں گے۔ چنانچہ دو آدمیوں نے غسل خانے میں جا کر اس شان سے وضو کیا کہ غسل خانے کا سارا فرش گیلا ہو گیا اور اس میں پانی بھر گیا۔ حالانکہ آدمی جب وضو کرے تو اس طرح وضو کرنا چاہئے کہ بعد میں آنے والے کو غسل خانے کے استعمال سے تکلیف نہ ہو، لیکن ان حضرات نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

اس کے بعد اذان دی اور پھر کہا کہ ہم تو جماعت سے نماز پڑھیں گے، اب کوئی آرہا ہے، کوئی جارہا ہے، ان سب کے درمیان انہوں نے صف بنا کر نماز شروع کر دی، چونکہ بہر حال جہاز کے عملے کے لوگ مسلمان تھے، انہوں نے ان کی رعایت تو کی، لیکن ہر ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ دیکھو انہوں نے کیا حرکت کی ہے۔ اب اگر ایک گھنٹہ کے بعد آرام سے منزل مقصود پر پہنچ کر وضو کر کے نماز پڑھ لیتے تو اس میں کیا حرج ہو جاتا، لیکن اس عمل کے نتیجے میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں غسل خانہ الگ خراب کیا۔ اب جو شخص بھی غسل خانہ میں جارہا ہے وہ ان کو برا کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے یہ حرکت کی ہے، لوگوں کا راستہ الگ بند کیا۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ ابھی نماز کو رہنے دو، اور میں بھی جہاز سے اتر کر نماز پڑھوں گا، لیکن ان لوگوں نے بالکل نہیں سنی، یہ دوسری انتہاء ہے۔

ہوائی جہاز میں وضو کرنے کا طریقہ

اس دوسری انتہاء میں ہم جیسے لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان باتوں کا خیال نہیں ہوتا۔ جہاز کا عملہ ہمیشہ لوگوں کو جہاز میں وضو کرنے سے منع کرتا ہے، اگر کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص غسل خانہ میں جا کر وضو کرے گا تو اس کو روک دیتے ہیں، اس لئے کہ ان کو معلوم ہے کہ جب یہ شخص وضو کرے گا تو سارا غسل خانہ خراب کر کے آئے گا۔ میں جہازوں میں اکثر سفر کرتا رہتا ہوں، اور جہاز کے غسل خانہ میں ہمیشہ وضو کرتا ہوں، مجھے آج

تک کسی نے وضو کرنے سے منع نہیں کیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ میں اس بات کا اہتمام کرتا ہوں کہ جب میں وضو کر کے باہر نکلوں تو فرش پر پانی کی ایک چھینٹ بھی باقی نہ رہے اور غسل خانے کا واش بیسن بالکل صاف ستھرا رہے، تاکہ بعد میں آنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

لہٰذا اگر ہم صفائی کا ذرا اہتمام کریں تو کوئی مشکل کام نہیں، غسل خانے میں تو لئے موجود ہوتے ہیں اور ٹیشو پیپر، ٹوئیلیٹ پیپر ہوتے ہیں، آدمی فرش اور واش بیسن کو ان سے صاف کر لے، لیکن ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ بس ہم تو للہ فی اللہ وضو کر کے آگئے، اب بعد میں آنے والے پر کیا گزرے گی، اس سے ہمیں کوئی بحث نہیں۔

دوہرا گناہ

حالانکہ اس گندگی کے نتیجے میں دوسروں کو تکلیف دینے کا گناہ الگ ہوگا، اور لوگوں کو اسلام سے اور دین کے شعائر سے متنفر کرنے کا گناہ الگ ہوگا۔ العیاذ باللہ۔ حدیث شریف میں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں:

یَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا وَاَبْشِرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا۔

(صحیح بخاری، کتاب العلم، باب ماکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یتخولھم بالموعظة والعلم)

لوگوں کے لئے دین کو آسان کرو اور مشکل مت بناؤ،

لوگوں کو خوشخبری سناؤ اور ان کے اندر نفرت مت پیدا کرو۔

آج ہم نے ان چیزوں کو دین سے خارج ہی کر دیا ہے، آج ہماری مسجدوں کے غسل خانوں اور بیت الخلاء کو جا کر دیکھو تو ان کا یہ حال ہوتا ہے کہ اندر داخل ہونا مشکل ہے، اور داخل ہونا اس لئے مشکل ہوتا ہے کہ یہاں تو متقی اور پارسا لوگ رہتے ہیں، یہاں رہنے والے علماء کرام ہیں اور صوفیاء عظام ہیں، ان کو صفائی ستھرائی سے کوئی تعلق نہیں، اس لئے ان کا غسل خانہ گندہ ہے اور اس میں داخل ہونا مشکل ہے۔ ان علماء کو یہ خیال ہی نہیں ہے کہ یہ بھی کوئی گناہ کا کام ہے یا کوئی ناجائز کام ہے۔

یہ حرکت گناہ کبیرہ ہے

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کا واقعہ یاد آیا، وہ یہ کہ ایک مرتبہ ہم نے غسل خانہ کو استعمال کیا اور اس کو صاف کئے بغیر اور پانی بہائے بغیر باہر آگئے، جب والد صاحبؒ کو پتہ چلا تو آپ نے ہمیں بلایا اور پوچھا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ تم نے یہ معمولی حرکت کی؟ تمہاری یہ حرکت گناہ کبیرہ ہے، اس لئے کہ دوسروں کو تکلیف پہنچانا گناہ کبیرہ ہے، اور تم یہ سمجھ کر آگئے کہ ہم نے کوئی بُرا کام نہیں کیا۔

غیر مسلموں کی ترقی کا سبب

دیکھئے! یہ جو کافر اور غیر مسلم ہیں، ان کا کفر باعث نفرت ہے، لیکن انہوں نے کچھ چیزیں ایسی اختیار کرلیں جو ہماری تھیں، ان چیزوں کے اختیار کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں عروج اور ترقی دیدی۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے کہ باطل میں یہ طاقت نہیں کہ وہ ابھر سکے، اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقاً۔ (سورۂ اسراء، آیت ۸۱) باطل تو ڈوبنے کے لئے اور ذلیل ہونے کے لئے ہے، اس میں ابھرنے کی طاقت نہیں، لہٰذا اگر تم کبھی یہ دیکھو کہ باطل ابھر رہا ہے، عزت حاصل کر رہا ہے تو سمجھ لو کہ کوئی نہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے جس نے اس باطل کو ابھار دیا ہے، حق کے سہارے کے بغیر باطل کبھی نہیں ابھر سکتا۔

لہٰذا یہ جتنی ترقی یافتہ قومیں جو آج کی دنیا میں ترقی کرتی نظر آرہی ہیں، چاہے وہ امریکہ ہو یا یورپ ہو یا کوئی اور ہو، یہ ترقی ان کو ان کے کفر کی وجہ سے اور باطل کی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے، بلکہ انہوں نے کچھ اچھے کام اختیار کر لئے، مثلاً محنت، امانت، دیانت، حسن معاشرت وغیرہ جو اصل میں اسلام کی تعلیمات تھیں، ان کو اختیار کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ترقی دیدی، اور فرمایا کہ ٹھیک ہے تم نے اچھا کام کیا، اس کا صلہ ہم تمہیں دنیا میں دیدیتے ہیں، آخرت میں تو تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔

وَمَا لَهُ فِي الآخِرَةِ مِنْ نَصِيْبٍ۔ (سورۂ شوریٰ، آیت ۲۰)

ایک سبق آموز واقعہ

میں ایک مرتبہ برطانیہ میں ریل کا سفر کر رہا تھا اور برمنگھم سے ایڈمنبرا جا رہا تھا، پانچ چھ گھنٹے کا سفر تھا، راستے میں مجھے غسل خانہ استعمال کرنے کی ضرورت پیش آئی، جب وہاں گیا تو میں نے دیکھا کہ غسل خانہ پر "مشغول" کی تختی لگی ہوئی ہے، میں واپس اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد میں پھر گیا تو دیکھا کہ پھر بھی "مشغول" کی تختی لگی ہوئی ہے میں پھر اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا، تھوڑی دیر کے بعد جب گیا تو میں نے دیکھا کہ اب "خالی" کی تختی لگی ہوئی ہے، لیکن ایک خاتون باہر انتظار میں کھڑی ہیں، میں سمجھا کہ شاید ان خاتون کو پتہ نہیں ہے کہ یہ غسل خانہ خالی ہے، اس لئے میں نے ان خاتون سے کہا کہ غسل خانہ خالی ہے، آپ جانا چاہیں تو چلی جائیں۔ اس خاتون نے کہا کہ ہاں، یہ خالی ہے، مگر میں انتظار کر رہی ہوں، میں نے پوچھا کہ اب کس کا انتظار ہے؟ خاتون نے کہا کہ میں ابھی اندر سے فارغ ہو کر باہر نکلی ہوں، لیکن جس وقت میں فارغ ہوئی، عین اس وقت گاڑی اسٹیشن پر رک گئی، اور قانون یہ ہے کہ جس وقت اسٹیشن پر گاڑی رکی ہوئی ہو، اس وقت "فلش" کرنا منع ہے، اس لئے میں اس وقت "فلش" نہیں کر سکی، اب میں گاڑی کے روانہ ہونے کا انتظار کر رہی ہوں، تاکہ جب یہ اسٹیشن سے روانہ ہو جائے تو اس کے بعد فلش کروں اور پھر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھوں، اس لئے انتظار میں کھڑی ہوں۔

ہمارا طرزِ عمل

جب میں نے اس خاتون کی یہ بات سنی تو مجھے بڑی عبرت ہوئی کہ دیکھو! یہ وہ تعلیم ہے جو ہمارے حضرت والد صاحبؒ نے فرمائی تھی کہ بغیر فلش کئے بیت الخلاء سے واپس آجانا گناہ کبیرہ ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ دوسروں کو تکلیف پہنچتی ہے۔ اس خاتون نے ایک تو اس بات کا اہتمام کیا کہ اسٹیشن پر "فلش" نہ ہو۔ ہمارے یہاں کوئی شخص اس کا اہتمام کرے گا؟ حالانکہ ہر غسل خانے پر یہ عبارت لکھی ہوتی ہے کہ "جب تک گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی ہو، اس وقت تک اس کو استعمال نہ کیا جائے" لیکن کوئی دھیان نہیں کرتا۔ یہ اس لئے لکھتے ہیں کہ پلیٹ فارم پر ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں، اگر گاڑی کھڑی ہونے کے وقت کوئی شخص غسل خانہ استعمال کرے گا تو پلیٹ فارم پر گندگی پھیلے گی اور اس سے لوگوں کو تکلیف ہوگی اور صحت کے لئے بھی نقصان دہ ہے، مگر ہم میں سے کوئی اس کا لحاظ نہیں کرتا۔

ایک عمل میں کئی گناہ

اور پھر اس کا لحاظ نہ کرنے کو کبھی کوئی شخص یہ بھی نہیں سمجھتا کہ میں نے کوئی گناہ کیا ہے، حالانکہ اس ایک عمل میں کئی گناہ شامل ہیں۔ ایک گناہ تو یہ ہے کہ جب آپ کی وجہ سے ایسی جگہ پر گندگی پھیلی جو لوگوں کی گزرگاہ ہے، تو اس کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی۔ دوسرا گناہ یہ ہے کہ یہ گاڑی آپ کی ملکیت

نہیں ہے، بلکہ آپ کرایہ دے کر اس کو سفر کرنے کے لئے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا جن شرائط پر آپ کو گاڑی استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے، ان شرائط کی پابندی آپ کے اوپر لازمی ہے، اگر آپ ان شرائط کی خلاف ورزی کریں گے تو یہ عقد اجارہ کی خلاف ورزی ہوگی، لہٰذا ان شرائط کے خلاف آپ کے لئے اس گاڑی کو استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

حق العبد کے ضیاع کا گناہ

اور ان دونوں گناہوں کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اب اگر تمہارے اس عمل سے بہت سے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی اور تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا تو پھر کس کس سے معافی مانگو گے؟ اس لئے یہ گناہ بڑا سنگین ہے، لیکن اس گناہ کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ہم لوگ دوسری انتہاء کو پہنچے ہوئے ہیں، اس کی بڑی فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں صحیح فکر عطا فرمائے اور صحیح فہم عطا فرمائے آمین۔

مساجد کے استنجاء خانوں کا حال

اسلام جو لطافت کا، طہارت کا، نظافت کا دین تھا، آج ہم نے اپنے طرز عمل سے اس دین کو گندگی کا دین بنادیا ہے۔ برطانیہ میں خاص طور پر یہ منظر نظر آتا ہے کہ آپ پورے ملک میں کہیں بھی چلے جائیں، چاہے کسی آفس میں چلے جائیں، یا کسی تفریح گاہ پر چلے جائیں، ہر جگہ آپ کو صاف ستھرے غسل خانے

ملیں گے۔ الا ماشاء اللہ۔ لیکن اگر کسی مسجد کے غسل خانے میں چلے جائیں تو "العیاذ باللہ" اس میں داخل ہونا مشکل ہے۔ سوائے ان چند مساجد کے جو بہت اچھی بنی ہوئی ہیں، ان میں صفائی ستھرائی کا نظام اچھا ہے، باقی اکثر مساجد میں صفائی کا نظام خراب ہے۔ اور اس وقت صرف لندن شہر میں ڈھائی تین سو مسجدیں ہیں، جبکہ ایک وقت وہ تھا کہ نماز پڑھنے کے لئے جگہ نہیں ملتی تھی، لیکن ان میں صفائی کا اہتمام نہیں ہے۔ پورے لندن میں سب سے گندہ علاقہ مسجد کے غسل خانوں کا ہے، اس کے ذریعے ہم اسلام کی غلط نمائندگی کر رہے ہیں، جو دین طہارت کا، نظافت کا اور لطافت کا دین تھا، اس کو ہم نے گندگی کا دین بنا کر پیش کر دیا۔

ایک انگریز مسلمان کا قصہ

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک قصہ سنایا کرتے تھے کہ دہلی کی جامع مسجد میں ایک انگریز مسلمان ہو گیا، اب مسلمان ہونے کے بعد نماز پڑھنے کے لئے جامع مسجد میں آنے لگا، اس نے دیکھا کہ وضو خانے کی نالی گندی ہو رہی ہے، چند روز تک تو وہ دیکھتا رہا، جب کسی اور نے صفائی نہیں کی تو ایک دن وہ جھاڑو لے کر آیا اور پانی ڈال کر اس کی صفائی شروع کر دی۔ ایک صاحب وہاں سے گزرے اور انہوں نے دیکھا کہ وہ انگریز نالی صاف کر رہا ہے، تو ان صاحب نے کہا کہ "یہ انگریز مسلمان تو ہو گیا لیکن ابھی انگریزیت کی خوبو نہیں گئی۔" مطلب یہ تھا کہ یہ جو صفائی کر رہا ہے یہ انگریزیت کی خوبو ہے۔ العیاذ باللہ۔

بھائی! ہم لوگوں نے اپنا یہ گندہ حلیہ بنا رکھا ہے، یہ فی نفسہ ناجائز تو ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے ذریعہ سے اسلام کی غلط تصویر لوگوں کے سامنے آرہی ہے، جس کے نتیجے میں لوگ دین کے قریب آنے کے بجائے اور دور ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ہمیں صفائی کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہئے تاکہ اسلام کی غلط نمائندگی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۱۸

دوسروں کو حقیر سمجھنے کا علاج

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۱۸

صفحات : ۱۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر۱۸

دوسرے کو حقیر سمجھنے کا علاج

الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبة للمتقین
والصّلاة والسّلام علی رسوله الکریم وعلٰی
آله واصحابه اجمعین۔ أَمَّا بَعْدُ!

دوسرے کو حقیر سمجھنا

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

اگر کسی بات میں دوسرے کو گھٹا ہوا دیکھو تو اس وقت یہ سوچو کہ ہم بھی کسی بات میں اس سے گھٹے ہوئے ہیں یا نہیں؟ ہر شخص میں خوبیاں بھی ہوتی ہیں اور برائیاں بھی، اگر اس شخص میں ایک برائی ہے تو ممکن ہے کہ ہم میں بہت سی برائیاں ہوں، یا ہم میں ایک ہی برائی ہو لیکن اس

برائی سے بدتر ہو جو اس کے اندر ہے، پھر کس طرح ہم اس کو گھٹا ہوا سمجھتے ہیں اور کیوں دوسرے کو اپنے آپ سے کم درجہ سمجھتے ہیں اور کیوں سلام میں ابتداء کرنے سے عار آتی ہے؟

(انفاس عیسیٰ، ص۱۵۸)

غیر اختیاری خیال کے آنے پر مؤاخذہ نہیں

کبھی کسی شخص کے بارے میں خیال آجائے، اور یہ خیال بعض اوقات آجاتا ہے کہ یہ شخص فلاں چیز میں مجھ سے گھٹا ہوا ہے اور میں ان سے بڑھا ہوا ہوں، تو تنہا اس خیال کا آجانا کوئی بری بات نہیں اور اس غیر اختیاری خیال پر اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ بھی نہیں ہے، لیکن بار بار اس خیال کا لانا اور اس خیال کا دل میں بٹھانا اور پھر اس خیال کے مقتضیٰ پر عمل کرنا، یہ سب تکبر میں داخل ہیں، لہٰذا اس کا علاج بھی ضروری ہے۔

ذہین طالب علم کے دل میں اپنی برتری کا خیال

مثلاً چند طلباء ایک جماعت میں پڑھتے ہیں، ایک طالب علم بڑا ذہین اور زیرک ہے، اچھی استعداد کا مالک ہے اور ہر امتحان میں اول نمبر پر آتا ہے، دوسرا طالب علم کند ذہن ہے، پڑھائی میں کمزور ہے، اب جو طالب علم پڑھائی میں تیز ہے، ذہین ہے، زیرک ہے، اس کے دل میں یہ خیال آئے گا کہ میں اس کے مقابلے میں اچھی استعداد والا ہوں، لیکن ساتھ ہی وہ یہ سوچے کہ اگرچہ اس

ایک وصف میں یہ وہ مجھ سے گھٹا ہوا ہے اور میں اس سے بڑھا ہوا ہوں، لیکن نہ جانے اس کے اندر کتنے اوصاف ایسے ہوں جس میں یہ مجھ سے فائق ہو، اور یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کونسا وصف زیادہ مقبول ہو جائے اور میں اس سے پیچھے رہ جاؤں، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرے اندر بہت سی خرابیاں ہوں اور ان کے بارے میں مجھے پتہ بھی نہ ہو، یا میرے اندر ایک خرابی ہو، لیکن وہ خرابی اس طالب علم کی استعداد کی کمزوری کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہو۔

کمزور طالب علم میں نیکی کی برتری حاصل ہے

دیکھئے، اگر ایک طالب علم پڑھائی میں کمزور ہے، لیکن نیک ہے اور اپنے فرائض وواجبات کو ٹھیک ٹھیک بجالاتا ہے، گناہوں سے بچتا ہے، اور ایک طالب علم بڑا ذہین، بڑا زیرک اور بڑا صاحب استعداد ہے اور ہر امتحان میں اول آتا ہے، لیکن گناہوں کے اندر مبتلا ہے یا وہ نمازوں میں کوتاہی کرتا ہے، ایسے طالب علم کے جو اچھے اوصاف ہیں وہ اکارت اور بیکار ہیں، اس لئے کہ جب عمل صحیح نہیں تو علمی استعداد موجود ہونے سے کیا حاصل؟ اگرچہ یہ طالب علم علمی استعداد کے وصف میں دوسروں سے بڑھا ہوا ہے، لیکن اس کے اندر ایک خرابی ایسی ہے جس نے اس کے اچھے وصف پر پانی پھیر دیا۔

اصل خرابی "بے دین" ہونا ہے

آج کل لوگ دینی خرابی کو خرابی ہی نہیں سمجھتے، العیاذ باللہ، حالانکہ اصل خرابی اور کمزوری یہی ہے۔ ایک صاحب اپنے بیٹے کا تعارف مجھ سے کرا رہے تھے، کہنے لگے میرا یہ بیٹا بڑا ذہین اور بڑا زیرک ہے، پڑھائی میں بہت تیز تھا، اور اب اس کو فلاں ملک میں اعلیٰ درجے کی ملازمت مل گئی ہے، اور وہاں پر اس نے سارے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے، میں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ مبارک کرے۔ پھر کہنے لگے، البتہ یہ تھوڑا سا بے دین ہو گیا ہے۔ ان صاحب نے بے دین ہونے کی خرابی کو اس طرح بیان کیا کہ جیسے یہ کوئی بڑی خرابی نہیں ہے، گویا کہ اصل معاملات میں تو یہ ٹھیک ہے، بس یہ ذرا سی کمزوری ہو گئی ہے۔

"بے دین" ہونے کی مثال

میں نے کہا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک گاؤں کے لوگ ایک حکیم صاحب کو ایک شخص کے معائنے کے لئے لائے، وہ حکیم صاحب آئے اور اس کا سر سے لے کر پاؤں تک چاروں طرف سے معائنہ کیا، دیکھنے کے بعد حکیم صاحب کہنے لگے کہ یہ تو بالکل ٹھیک ٹھاک آدمی ہے، اس کے سارے اعضاء بالکل ٹھیک ہیں، اس کے ہاتھ بھی ٹھیک ہیں، کان بھی ٹھیک ہے، ناک بھی ٹھیک ہے، بس ذرا سی روح نکل گئی ہے۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ آپ نے اپنے بیٹے کے بارے میں جو تعریف کی، اس پر یہ مثال بالکل صادق آتی ہے کہ

اس کے اندر سب باتیں تو ٹھیک ہیں، بس ذرا سا بے دین ہو گیا ہے۔ العیاذ باللہ، حالانکہ دین کی خرابی اور بدعملی کی خرابی ایسی ہے جو ساری خرابیوں پر بھاری ہے۔ لہٰذا جس شخص کو تم گھٹیا سمجھ رہے ہو، کیا پتہ تمہارے اندر ایک خرابی ایسی ہو جو اس کی خرابی پر بھاری ہو جائے۔

کمتر لوگ اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوں گے

اور اگر بالفرض اس کے مقابلے میں تمہارے اندر عیوب کم بھی ہوں، لیکن کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کون مقبول ہے، جو لوگ بظاہر دیکھنے میں معمولی قسم کے لوگ نظر آتے ہیں، لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رُبَّ أشعث مدفوع بالأبواب، لو أقسم على الله لأبرَّه۔

(مسلم، کتاب البر والصلۃ، باب فضل الضعفاء والخاملین)

یعنی ایسا شخص جس کے بال پراگندہ ہیں اور ایسا ہے کہ اگر وہ لوگوں کے دروازوں پر جائے تو لوگ دھکے دے کر نکال دیں، لیکن اگر وہ شخص اللہ تعالیٰ پر قسم کھالے، مثلاً وہ یہ کہے کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ ایسا ضرور ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم پوری فرمادیتے ہیں۔ اگرچہ عام لوگوں کی نظروں میں وہ شخص بے حقیقت ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی بات کو نہیں

ٹالتے ہیں کہ جب میرے بندے نے قسم کھالی ہے تو اب میں اس کو جھوٹا نہیں کروں گا۔

جنّت کے اعلیٰ درجات والے لوگ

جنّت میں جن لوگوں کو اعلیٰ ترین درجات ملنے والے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں کہ:

الذین اذا غابوا لم یفتقدوا

(ابن ماجہ، کتاب الفتن، باب من ترجی لہ السلامۃ من الفتن)

یعنی وہ ایسے لوگ ہیں جب وہ کہیں چلے جائیں اور غائب ہو جائیں تو ان کو کوئی ڈھونڈنے والا بھی نہ ہو اور کوئی پوچھنے والا بھی نہ ہو، مثلاً ایک شخص روزانہ نماز پڑھنے مسجد میں آتا تھا، اگر کسی دن نہ آئے تو کوئی یہ نہ پوچھے کہ فلاں شخص روزانہ آتا تھا، آج کہاں چلا گیا؟ اور اگر وہ کہیں نکاح کا رشتہ لے کر چلے جائیں تو لوگ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیں کہ یہ تو مولوی آدمی ہے۔ ایسے لوگوں کو جنّت میں اعلیٰ ترین درجات ملنے والے ہیں۔

کسی کے ظاہر پر مت جاؤ

لہٰذا کسی شخص کے ظاہر پر مت جاؤ کہ ظاہری اعتبار سے یہ شخص کیسا ہے، کچھ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی کیا قدر و قیمت ہو؟ اس لئے فرمایا کہ کسی انسان کو حقیر مت سمجھو، اور یاد رکھو کہ کسی مسلمان پر حقارت کی نگاہ ڈالنا گناہ

کبیرہ اور حرام ہے اور یہ ایسا ہی حرام ہے جیسے شراب پینا اور زنا کرنا حرام ہے۔ اس لئے اگر کبھی اپنے کسی کمال کا خیال آئے اور دوسرے شخص کے کسی نقص کا خیال آئے تو فوراً اس کا علاج اس طرح کرو کہ یہ سوچو کہ کیا معلوم اس کے اندر اور کوئی خوبیاں ہوں جو مجھے معلوم نہیں، کیا معلوم کہ میرے اندر ایسی برائیاں ہوں جو اس کی برائی سے زیادہ سنگین ہوں، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ شخص کتنا مقبول ہو۔

اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض لوگ

اور جو لوگ بظاہر دیکھنے میں بڑے باعزت اور باوقعت نظر آتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک پرکاہ کے برابر بھی ان کی وقعت نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کا مصداق بننے سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان ابغضكم اِلَيّ وأبعدكم مني مجلسا يوم القيامة الثرثارون والمتشدقون والمتفيهقون۔

(ترمذی، کتاب البر والصلۃ، باب ماجاء فی معالی الاخلاق)

یعنی وہ لوگ جن سے مجھے نفرت ہے اور جو قیامت کے دن مجھ سے دور ہوں گے یہ وہ لوگ ہیں جو زیادہ بولنے والے ہیں اور باچھیں چیر کر بات کرنے والے اور تکبر کرنے والے ہیں، یعنی جو مجلسیں گرم کرنے والے اور بڑے فصیح و بلیغ مشہور ہیں، جو شعلہ بیان اور آتش نوا مشہور ہیں، لوگ ان کے ارد گرد جمع ہیں،

اور وہ لوگ باچھیں چیر چیر کر لوگوں سے باتیں کر رہے ہیں، اور وہ لوگ جو لوگوں سے اپنی فصاحت و بلاغت کا لوہا منوائے ہوئے ہیں اور فصاحت و بلاغت اور حسن کلام کی وجہ سے لوگوں میں مقبولیت ہے، عام لوگ ان کو پسند کرتے ہیں اور ان کی تعریف کرتے ہیں کہ یہ بڑے عالم، بڑے فقیہ، بڑے واعظ ہیں، بڑے خطیب ہیں، بڑے باغ و بہار اور مجلسی ہیں، لیکن ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین ہیں۔ العیاذ باللہ۔

کسی پر کوئی حکم مت لگاؤ

لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ تو ظاہری خوبیاں مقبولیت کے لئے معیار ہیں اور نہ ہی ظاہری نقائص اللہ تعالیٰ کے یہاں غیر مقبول ہونے کی علامت ہیں، کس بات پر انسان فیصلہ کرے؟ کس چیز پر حکم لگائے؟ اس لئے ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہئے اور کسی بھی انسان کی ظاہری حالت دیکھ کر کوئی حکم مت لگاؤ۔ نہ تو کسی کی تعریف کرو اور نہ کسی کی برائی کرو۔

کافر کو بھی حقیر مت سمجھو

انسان ابتداء میں جب دین پر چلنا شروع کرتا ہے تو اس وقت اس کے اندر جوش و خروش ہوتا ہے، اس کے نتیجے میں ساری مخلوق پر لعنت ملامت شروع کر دیتا ہے، ساری مخلوق کو یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب جہنمی ہیں، بس میں ہی جنتی ہوں، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ارے مسلمان تو مسلمان، کسی کافر کو بھی

قطعی طور پر جہنمی مت کہو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسلام کی توفیق دیدے اور ایک لمحے میں اس کا بیڑہ پار ہو جائے۔

کافر پر "مخلّد فی النار" ہونے کا حکم مت لگاؤ

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک اور باریک بات ارشاد فرمائی جو سمجھنے کی ہے، فرمایا کہ اگر کسی شخص کے ظاہری اقوال سے ایسی باتیں صادر ہو رہی ہیں جو کفر کی حد تک پہنچ رہی ہیں، تو مفتی کا کام یہ ہے کہ اس کے اوپر فتویٰ دیدے کہ یہ باتیں کفر کی ہیں اور دنیا میں اس کے ساتھ کافروں جیسا معاملہ کیا جائے گا، بشرطیکہ مفتی نے پوری احتیاط سے کام لیا ہو وہ احتیاط یہ ہے کہ اگر کسی کے کلام میں ننانوے احتمالات کافر ہونے کے ہوں اور ایک احتمال مسلمان ہونے کا ہو، تب بھی کافر ہونے کا فتویٰ نہیں دینا چاہئے۔ لیکن اس کے بارے میں کفر کا فتویٰ دیے جانے کے باوجود یہ مت کہو کہ اس کی وجہ سے وہ "مخلّد فی النار" ہو گیا، اس لئے کہ بیشک ظاہری اعتبار سے اس کی بات کفر تھی، لیکن کیا معلوم کہ باطنی طور پر اسکے قول کی ایسی تاویل ہو جو اس کو اللہ تعالیٰ کے یہاں کفر سے بری کر دے۔

ایک شخص کی مغفرت کا واقعہ

اس کی مثال میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ صحیح بخاری کی حدیث پیش فرماتے ہیں، جس میں پچھلی امتوں کے ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے کہ پچھلی

امتوں میں ایک شخص تھا، جب اس کے انتقال کا وقت قریب آیا تو اس نے وصیت کی کہ جب میں مر جاؤں تو میری لاش کو آگ میں جلا دینا اور لاش جلنے کے بعد جب راکھ ہو جائے تو جس دن بہت تیز ہوا چل رہی ہو، اس دن اس راکھ کو ہوا میں اڑا دینا۔ لوگوں نے اس سے پوچھا کہ ایسی وصیت کیوں کر رہے ہو؟ اس نے کہا کہ بات یہ ہے کہ میں بہت گناہ گار آدمی ہوں، اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں، کیونکہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آ گیا تو اللہ تعالیٰ مجھے سخت سزا دیں گے، اس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں۔ چنانچہ اس کے مرنے کے بعد اس کی وصیت کے مطابق عمل کر لیا گیا۔

جب اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ شخص اولاً ہمارے وجود پر ایمان لایا، دوسرے یہ کہ یہ شخص ہم سے ڈر بھی گیا اور ایسا ڈرا کہ اس نے لوگوں سے کہا کہ اگر میں اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ گیا تو وہ مجھے سخت عذاب دیں گے، اس کی ان باتوں کی وجہ سے ہم اس کی مغفرت کرتے ہیں۔

ظاہری کفر کے باوجود مغفرت کی وجہ

اب بظاہر تو اس کی یہ وصیت کفر تک پہنچتی ہے، اس لئے کہ اس نے کہا تھا کہ میں یہ وصیت اس لئے کر رہا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ نہ آؤں، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اللہ تعالیٰ کی قدرت کا انکار کر رہا ہے کہ اگر ہوا میں میرے جسم کی راکھ اڑا دی جائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ مجھے جمع نہیں کر سکیں گے، یہ کھلا کفر ہے۔ لیکن چونکہ اس وصیت کا منشا اللہ تعالیٰ کا ڈر اور خوف تھا، اس لئے

اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص سے ظاہراً کفر بھی صادر ہو گیا ہو، اس کے اوپر فتویٰ بھی کفر کا ہوگا، اس لئے کہ مفتی کا کام ہی یہ ہے کہ اس کے اوپر کفر کا حکم لگائے، لیکن اس کے "مخلّد فی النار" ہونے کا حکم نہ لگائے۔

"منصور حلاّج" پر کفر کا فتویٰ

دیکھئے! "منصور حلاّج" جن کا "انا الحق" کہنے کا واقعہ مشہور ہے، یہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد بلکہ شاید ان کے خلیفہ بھی تھے، جب ان سے "انا الحق" کا کلمہ صادر ہوا جو ظاہراً کفر کا کلمہ تھا تو علماء نے ان کے اوپر کفر کا فتویٰ دیدیا، حالانکہ اندرونی طور پر وہ ہرگز کافر نہیں تھے، ان پر تو کفر کی پرچھائیں بھی نہیں پڑی تھیں، بلکہ غلبہ حال میں ان سے ایسا کلام صادر ہوا تھا اور اس کی تاویلیں موجود تھیں، لیکن چونکہ فتنہ پھیل رہا تھا، اس لئے علماء کرام نے کفر کا فتویٰ دیدیا۔

پھانسی کے وقت حضرت جنید بغدادیؒ سے گفتگو

جب ان کو پھانسی دینے کا وقت آیا تو بہت بڑی مخلوق ان کی پھانسی دینے کا نظارہ کرنے کے لئے آئی تھی، ان میں حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل تھے، جب منصور حلاّج نے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا تو ان سے کہا کہ یہ ساری مخلوق جو جمع ہے یہ تو حقیقت حال سے بے خبر ہے، ان کو

تو کچھ معلوم نہیں ہے، اس لئے میں ان کو معذور سمجھتا ہوں، لیکن اے جنید! آپ کو تو حقیقت کا پتہ ہے کہ میں کیا کہتا ہوں اور میری مراد کیا ہوتی ہے، اس لئے آپ کیوں آئے؟ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں اس لئے آیا ہوں کہ تمہارے خلاف جو فتویٰ دیا گیا ہے وہ صحیح ہے اور تمہارا یہی انجام ہونا چاہئے۔ حالانکہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے کہ اندر سے منصور کی مراد کچھ اور ہے۔

علماء دین کے چوکیدار ہیں

لیکن اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحبان اور فقہاء کو دین کا پاسبان بنایا ہے، ان کا فرض ہے کہ جو بات حق ہے وہ بتادیں، اگر کسی نے کفر کی بات کی ہے تو وہ کہدیں گے کہ یہ کفر ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ دین کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں، جس کو چاہا کافر بنادیا اور جس کو چاہا مسلمان بنادیا، میں نے کہا ہم ٹھیکیدار تو نہیں ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین کا چوکیدار ضرور بنایا ہے، اور چوکیدار کا کام یہ ہے کہ وہ شناخت کے بغیر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ دے، حتیٰ کہ اگر وزیر اعظم بھی آجائے گا تو اس کو بھی روک لے گا کہ پہلے شناختی کارڈ دکھاؤ اور اپنی شناخت کراؤ کہ آپ وزیر اعظم ہیں، تب اندر جانے دوں گا ورنہ اندر نہیں جانے دوں گا۔ حالانکہ وہ وزیر اعظم ہے اور یہ چوکیدار ہے، اسی طرح ہم بھی دین کے چوکیدار ہیں، لہٰذا اگر کوئی دین کے اندر داخل ہونا چاہے لیکن وہ ان صفات کا حامل نہ ہو تو ہمارا حق ہے کہ اس کو دین کے اندر داخل

ہونے سے روک دیں۔

کفر کے فتویٰ کے بعد جہنمی ہونے کا حکم مت لگاؤ

لہٰذا جو مفتیان کرام کسی شخص کے بارے میں صحیح طور پر کفر کا فتویٰ دے رہے ہیں، ان پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن فتویٰ دینے کے بعد اللہ تعالیٰ اس شخص کے ساتھ کیا معاملہ فرمائیں گے؟ وہ جنّت میں جائے گا یا جہنّم میں جائے گا؟ اگر وہ جہنّم میں جائے گا تو وہاں پر ہمیشہ رہے گا یا اللہ تعالیٰ اس کو کسی وقت جہنّم سے نکال دیں گے؟ یہ فیصلے ہم نہیں کر سکتے اور ان فیصلوں میں ہمیں پڑنا بھی نہیں چاہئے، کیا معلوم کہ ایک شخص ظاہری اعتبار سے کافر نظر آرہا ہے، لیکن اس کے پاس کوئی ایسی تاویل ہو جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس پر فضل کا معاملہ فرمادیں۔ اس لئے کسی بھی انسان کو کسی بھی لمحے حقیر سمجھنا تکبر کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۱۹

خاص وضع اختیار کرنا

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۱۹

صفحات : ۱۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر۱۹

خاص وضع اختیار کرنا تکبّر ہے

الحمد للّٰہ رب العالمین۔ والعاقبۃ للمتقین۔
والصّلاۃ والسّلام علی رسولہ الکریم۔ وعلیٰ
آلہ واصحابہ اجمعین۔ أَمَّا بَعْدُ!

وضعداری میں غلو بھی کبر ہے

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

وضع داری میں غلو بھی کبر ہے، وضع کیا چیز ہے؟ قطع کیا چیز ہے؟ اور آن کیا چیز ہے؟ یہ سب شیطانی دھندے ہیں، اپنے آپ کو اتنا بڑا ہی کیوں سمجھے کہ اس کے لئے خاص وضع مقرر ہو، بندہ کا حق تو یہ ہے کہ جس وردی اور جس وضع میں سرکار رکھیں اسی میں رہے، اپنی رائے اور

ارادے کو بالکل فنا کردے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۷)

بعض لوگوں کا یہ مذاق ہوتا ہے کہ لوگوں میں اپنا امتیاز ظاہر کرنے کے لئے خاص وضع بنالیتے ہیں، مثلاً ایک شخص نے اپنا خاص لباس مقرر کرلیا، اب جب ملاقات کریں گے تو اسی لباس میں، جب باہر نکلیں گے تو اسی لباس میں، اور ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ اپنا ایک امتیاز پیدا ہو اور لوگوں میں یہ شہرت ہوجائے کہ یہ آدمی ہمیشہ یہ لباس پہنتا ہے۔

حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ بھی کبر کا ایک شعبہ ہے۔

خاص لباس کا اہتمام نہ کریں

دیکھئے! بغیر اہتمام کے کوئی خاص لباس آدمی پہنتا رہے تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں، لیکن یہ اہتمام کہ جب بھی کپڑے پہنوں تو ایسا ہی لباس ہو، دوسرا نہ ہو، ٹوپی جب بھی پہنوں تو ایسی ہو، میرا حلیہ ہمیشہ ایسا ہی ہو، وضع کے اس اہتمام کا منشا بسا اوقات کبر ہوتا ہے اور یہ منشا ہوتا ہے کہ میں اوروں سے ممتاز نظر آؤں۔ ارے بھائی! کہاں کا امتیاز؟ کہاں کی وضع قطع؟ ہونا یہ چاہئے کہ!

یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

کونسی صورت کبر میں داخل ہے؟

اسی لئے ہمارے بزرگوں نے کسی خاص لباس کا اہتمام نہیں فرمایا، بلکہ

کبھی کچھ پہن لیا، کبھی کچھ پہن لیا، تاکہ یہ کبر میں شامل نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کسی خاص لباس کا اہتمام کرنا ہمیشہ کبر ہوتا ہے، اس لئے کہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ آدمی کو کسی خاص اہتمام کے بغیر ایک لباس پہننے کی عادت پڑی ہوئی ہے اور وہ پہنتا چلا جارہا ہے، تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن ایسا کرنا کہ اس کے خلاف ہی نہ ہو اور اس کے خلاف ہونے کو اپنی توہین سمجھے تو یہ صورت کبر کے اندر داخل ہو جاتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ بے تکلف رہو، کسی خاص لباس پہننے کا تکلف نہ کرو، بلکہ اگر بے تکلفی میں ایک لباس پہن رہے ہو تو پہنتے رہو، بے تکلفی میں دوسرا لباس مل گیا تو وہ پہن لیا تو کوئی مضائقہ نہیں، لہٰذا ایک لباس کا اہتمام کرنا یہ تکبر میں داخل ہو جاتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سادہ لباس پہنتے تھے، مگر وہ لباس قاعدہ کا ہوتا تھا، اور آپ خوش پوش تھے اور عام طور پر سفید لباس پہنتے تھے۔ حضرت والا کی بڑی اہلیہ حضرت سے بہت محبت کرتی تھیں، ایک مرتبہ رمضان المبارک میں انہوں نے حضرت والا کے لئے ایک اچکن سیا، چونکہ شوقین تھیں، اس لئے انہوں نے اچکن کے لئے بہت شوخ قسم کے کپڑے کا انتخاب کیا جس پر پھول بوٹے بھی بنے ہوئے تھے، پورے رمضان اس کو خود سیتی رہیں اور حضرت والا کو خبر بھی نہ ہونے دی، بس عید سے ذرا پہلے

اس کو تیار کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کیا اور کہا کہ یہ اچکن میں نے آپ کے لئے سیا ہے، حضرت والا دیکھ کر حیران رہ گئے کہ یہ ایسا شوخ کپڑا تو میں نے آج تک کبھی نہیں پہنا، لیکن حضرت والا نے ان پر کچھ ظاہر نہیں کیا، بلکہ ان کی تعریف کی کہ تم نے تو ماشاء اللہ بہت اچھا سیا ہے اور بڑی محنت سے سیا ہے، اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے۔ اہلیہ نے کہا کہ میں نے یہ اس لئے سیا ہے کہ آپ اس کو پہن کر عید گاہ جائیں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ میں نے سوچا کہ اب اس کو پہن کر عید گاہ جاؤں تو مشکل، نہ پہنوں تو مشکل، اگر پہن کر جاؤں تو لوگ باتیں بنائیں گے کہ مولانا صاحب کو دیکھئے کیسا شوخ لباس پہن کر عید گاہ میں آگئے، اور اگر نہ پہنوں تو ان کا دل ٹوٹے گا، اس لئے کہ انہوں نے سارا رمضان بڑی محنت سے اس کو سیا ہے۔ آخر میں حضرت نے یہ فیصلہ کیا کہ ان کا دل توڑنا مناسب نہیں، اگر میں اس کو پہن کر عید گاہ جاؤں گا اور لوگ برا سمجھیں گے تو سمجھتے رہیں، زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ لوگ باتیں کریں گے کہ مولانا صاحب کیسا شوخ لباس پہن کر آگئے، چلو کہنے دو۔

چنانچہ آپ اس کو پہن کر عید گاہ تشریف لے گئے، جب عید کی نماز سے فارغ ہوئے تو ایک صاحب نے کہا کہ حضرت! یہ اچکن تو آپ پر زیب نہیں دیتا۔ حضرت نے فرمایا: ہاں بھائی! تم صحیح کہتے ہو، اچھا ایسا کرو کہ تم ہی اس کو لے جاؤ، چنانچہ وہ اتار کر اس کو دیدیا۔

عبدیت کا پیکر تھے

اب آپ اندازہ لگائیں کہ اتنے بڑے آدمی کو اپنی طبیعت کے خلاف لباس پہن کر اتنے بڑے مجمع میں جانا پڑ جائے تو اس پر کیا گزرے گی؟ لیکن آپ نے دل شکنی سے بچنے کے لئے یہ سب گوارہ کر لیا۔ اگر کوئی ہم جیسا وضع قطع کا پابند ہوتا تو وہ اپنی اہلیہ کو یہ جواب دیتا کہ تمہاری محنت اکارت جائے، میں تو یہ پہن کر نہیں جاؤں گا، میں لوگوں کے سامنے ذلیل و خوار ہو جاؤں گا، لیکن چونکہ آپ نے اپنے نفس کو اللہ کے لئے مٹایا ہوا تھا اور اپنے آپ کو فنا کیا ہوا تھا اور عبدیت کا پیکر بنایا ہوا تھا، اس لئے ان کے نزدیک عام کپڑا پہننا اور شوخ لباس پہننا سب برابر تھا۔ بہر حال! کسی بھی خاص وضع پر آدمی کو نہ تو اتنا اہتمام ہو اور نہ اصرار ہو کہ آدمی اس وضع کا غلام بن جائے۔

تکبر کا علمی علاج

حضرت نے تکبر کا علمی علاج بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

تکبر کا علمی علاج تو یہ ہے کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور یوں سمجھے کہ مجھے تو اپنے عیوب کا یقین کے ساتھ علم ہے اور دوسرے کے عیوب کا ظن کے ساتھ علم ہے اور جو شخص معیوب یقینی ہو وہ معیوب ظنی سے بدتر ہے، اس لئے مجھے اپنے کو سب سے کمتر سمجھنا چاہئے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۸)

انسان کو اپنے عیوب کا تو سو فیصد یقین کے ساتھ علم ہے، اس میں تو کوئی شبہ نہیں، دوسرے کے عیب کے بارے میں جو علم ہوگا، وہ ظنّی ہوگا، اگرچہ ظن غالب ہی سہی۔ اب یہ دیکھیں کہ معیوب یقینی بدتر ہے یا معیوب ظنی؟ ظاہر ہے کہ معیوب یقینی بدتر ہے، اس لئے متکبر اپنے بارے میں یہ سوچے کہ میں معیوب یقینی ہوں، لہٰذا میں اس سے بدتر ہوا، اس لئے مجھے اپنے کو دوسروں سے کمتر سمجھنا چاہئے۔ یہ تو ہے علمی علاج۔

تکبّر کا عملی علاج

اور عملی علاج یہ ہے کہ جس کو تم اپنے سے چھوٹا سمجھتے ہو، اس کے ساتھ تعظیم و تکریم سے پیش آؤ۔ اور یہ عملی علاج جزو اعظم ہے، اس کے بغیر تنہا علمی علاج کافی نہیں، تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ جب تک عملی علاج نہ کیا جائے گا تکبر دور نہ ہوگا۔

(ایضاً)

آپ کے دل میں دوسرے شخص کی ناقدری ہے، جس کی وجہ سے اس کو تم کمتر سمجھ رہے ہو، لہٰذا اب تم **بتکلّف** اس کے ساتھ تعظیم و تکریم کا معاملہ کرو، اس سے تکبر دور ہوگا۔ ایک صاحب کے خط کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو لکھا کہ تم مسافروں کے پیر دبایا کرو، اس سے تمہارا تکبر زائل ہوگا۔

بزرگوں کی مختلف ادائیں

ہمارے بزرگوں کی ادائیں بھی عجیب تھیں اور ان کے رنگ بھی مختلف تھے، حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ بہت خوش پوشاک تھے، صاف ستھرے اور اچھے کپڑے پہنتے تھے، بقول شخصے کہ: حضرت تو دولہا بنے رہتے تھے۔ جبکہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر فنائیت کا رنگ غالب تھا، وہ کپڑوں کا بہت زیادہ اہتمام نہیں کیا کرتے تھے، کبھی دوپلی پہن لی، کبھی پاجامہ پہن لیا، کبھی تہبند باندھ لیا، یہاں تک کہ کوئی آپ کو پہچان نہیں سکتا تھا کہ آپ شیخ الہند ہیں۔

حضرت شیخ الہند کی تواضع

رمضان المبارک میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں ساری رات تراویح پڑھنے کا معمول تھا، بیس رکعت تراویح میں ساری رات گزارتے تھے، دس پارے روزانہ پڑھے جاتے اور ہر تیسرے دن قرآن شریف ختم ہوتا تھا، مختلف حفاظ تراویح میں سنایا کرتے تھے، ان حفاظ میں ایک حافظ مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے، حضرت والا کو ان کی تلاوت بہت پسند تھی، اس لئے اکثر ان کو کھڑا کر دیا کرتے تھے۔

ایک دن مولانا فخر الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت خراب ہو گئی، اس لئے انہوں نے معذرت کر دی کہ آج میں طبیعت کی خرابی کی وجہ سے

تراویح نہیں پڑھا سکوں گا، اس روز تراویح مختصر ہوئی اور تراویح کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے نفلیں پڑھنی شروع کر دیں۔ مولانا فخر الدین صاحب فرماتے ہیں کہ مسجد کے ساتھ ایک حجرہ تھا، میں اس میں جا کر لیٹ گیا، رات کو میں نے اچانک محسوس کیا کہ کوئی میری ٹانگیں دبا رہا ہے، میں نے سوچا کہ شاید کسی طالب علم کو خیال آگیا ہوگا کہ یہ بیمار ہے، چلو ان کی ٹانگیں دبا کر ان کی کچھ خدمت کر لیں، اور مجھے ٹانگیں دبوانا اچھا لگا، اس لئے میں چپ چاپ لیٹا رہا اور مڑ کر نہیں دیکھا کہ کون دبا رہا ہے، جب کچھ دیر گزر گئی تو میں نے مڑ کر دیکھا کہ کون ہے، تو دیکھا کہ پاؤں دبانے والے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تھے، ان کو دیکھ کر میرے اوپر بجلی سی گری اور میں نے کہا کہ حضرت! یہ کیا؟ فرمایا کہ اس میں کیا حرج ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، میں نے سوچا کہ ذرا ٹانگیں دبا دوں، اس سے تمہیں آرام آجائے گا۔ حالانکہ مولانا فخر الدین صاحبؒ حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد تھے۔

یہ دار العلوم دیوبند ویسے ہی مشہور نہیں ہو گیا، اور یہ اکابر دیوبند ویسے ہی "اکابر دیوبند" نہیں بن گئے، بلکہ انہوں نے صحابہ کے زمانے کی یادیں تازہ کی ہیں، آج لوگ "مسلک دیوبند" کا مطلب ہی نہیں سمجھتے کہ "مسلک دیوبند" کیا ہے؟

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور تواضع

"ارواح ثلاثہ" میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہمارے

سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اپنے شاگردوں سے علاج کے خاطر ان سے کہتے کہ جوتے اٹھاؤ، لیکن جب کسی طالب علم کو دیکھتے کہ وہ متواضع ہے اور اس کے اندر تکبر نہیں ہے تو اس طالب علم کے جوتے خود اٹھا لیتے۔

ایک مرتبہ سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش شروع ہو گئی تو طلبہ اپنی اپنی کتابیں اٹھا کر اندر جانے لگے تو حضرت والا طلبہ کے جوتے سمیٹ کر اندر لے گئے۔ بے نفسی اور تواضع میں ان حضرات نے صحابہ کرامؓ کی یادیں تازہ کر دی تھیں اور اپنے آپ کو مٹایا ہوا تھا۔

ہمارے دماغوں میں کبر کا، علم کا، دولت کا، صحت کا، اوصاف میں کمال کا جو خنّاس بھرا ہوا ہے اس نے سارا معاملہ خراب کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ خنّاس ہمارے اندر سے نکال دے۔ آمین۔

اتحاد قائم نہ ہونے کی وجہ تکبر ہے

آج ہمارے اندر اتفاق اور اتحاد قائم نہیں ہوتا، جبکہ ہر شخص یہ کوشش کرتا ہے کہ اتحاد ہو جائے لیکن اتحاد ہو کر نہیں دیتا، اور اگر اتحاد ہو بھی جاتا ہے تو چند روز کے بعد ہی چوراہے پر ہنڈیا پھوٹ جاتی ہے اور سارا اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کے بارے میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اتحاد قائم ہونے کی دو شرطیں ہیں، جب تک یہ دونوں شرطیں نہیں پائی جائیں گی، اس وقت تک اتحاد قائم نہیں ہو سکتا،

ایک اخلاص، دوسرے تواضع، لہٰذا دو متکبروں میں کبھی اتحاد نہیں ہو سکتا، اگر اتحاد ہوگا تو وہ وقتی ہوگا اور ذاتی مفادات کے لئے ہوگا، جب وہ مفادات پورے ہو جائیں گے، بس پھر اتحاد ختم ہو جائے گا۔

دو متکبّروں میں اتحاد کی مثال

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دو متکبروں کے درمیان جو ذاتی مفادات کے لئے اتحاد قائم ہوتا ہے، اس کی مثال "گدھا کھجاور" جیسی ہے، جب گدھے کی کمر میں خارش ہوتی ہے تو وہ خود سے تو اپنا جسم کھجا نہیں سکتا، اس لئے وہ دوسرے گدھے سے کہتا ہے کہ تیری کمر میں بھی کھجال ہو رہی ہے اور میری کمر میں بھی کھجال ہو رہی ہے، اس لئے تو میرے قریب آ جا، پھر ہم دونوں آپس میں مل کر کمر سے کمر رگڑتے ہیں، اس کو "گدھا کھجاور" کہتے ہیں۔ اسی طرح دو متکبروں کے درمیان اتحاد بھی درحقیقت "گدھا کھجاور" ہے، اس لئے کہ یہ اپنی ذاتی اور وقتی مفاد کی خاطر اتحاد کر لیتے ہیں، جب اپنا مفاد پورا ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے کو لات مار کر الگ ہو جاتے ہیں، اور حقیقی اتحاد اخلاص اور تواضع کے بغیر قائم ہو ہی نہیں سکتا، اور سارے جھگڑوں کی بنیاد بھی یہی تکبّر ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل سے ہم سب کو اس سے نجات عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۰

چھوٹے پر زیادتی کی معافی مانگنا

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۰

صفحات : ۱۹

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۲۰

چھوٹے پر زیادتی کی صورت میں معافی کا طریقہ

الحمد للّٰہ رب العالمین۔ والعاقبة للمتقین۔ والصّلاۃ والسّلام علی رسولہ الکریم۔ وعلٰی آلہ واصحابہٖ اجمعین۔ أَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم صریح الفاظ میں (اپنے سے چھوٹے سے) معافی مانگیں گے تو یہ گستاخ ہو کر زیادہ نافرمانی کرے گا، بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ہم معافی مانگیں گے تو یہ شرمندہ ہوگا، مگر یہ عذر اس وقت ہیں جب اس سے تعلق رکھنا چاہیں، توان صورتوں

میں صرف اس کو خوش کر دینا امید ہے کہ معافی کے قائم مقام ہو جائے گا۔ اور بعض اوقات اس سے (آئندہ) تعلق ہی نہیں رکھنا، جیسے ملازم کو موقوف کر دیا، یا ملازم خود (ملازمت) چھوڑ کر جانے لگا، تو اس وقت ضروری ہے کہ زیادتی ہو جانے کی صورت میں اس سے صریح معافی مانگی جائے، کیونکہ یہاں وہ دونوں عذر موجود نہیں، اس میں اگر رکاوٹ ہو تو میرے نزدیک اس کا سبب ضرور "کبر" ہے، گو اپنے کو بڑا نہ سمجھے، مگر کبر کے مقتضیٰ پر عمل تو ہوا، غایت سے غایت (زیادہ سے زیادہ) کبر اعتقادی نہ ہوگا، مگر کبر عملی تو ضرور ہے، اگر کوئی (شخص) کبر کی تقسیم کو تسلیم نہ کرے تب بھی ظلم تو ہوا، جس سے معافی مانگنا واجب ہے، لہٰذا معافی نہ مانگنے میں اگر کبر کا گناہ نہ ہوا تو ظلم کا (گناہ) تو ہوا۔

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۵۸)

چھوٹے پر زیادتی ہو جاتی ہے

یہ مسئلہ اکثر لوگوں کو بکثرت پیش آتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص افسر ہے اور لوگ اس کے ماتحت کام کرتے ہیں، اس کو یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح باپ کو اپنے بیٹے کے ساتھ یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح استاد کو اپنے

شاگردوں کے ساتھ یہ مسئلہ پیش آتا ہے، اسی طرح شیخ کو اپنے مریدوں کے ساتھ پیش آتا ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات اپنے ماتحت کو یا اپنے بیٹے کو یا اپنے شاگرد کو یا اپنے مرید کو کسی غلطی پر تنبیہ کرنے میں زیادتی ہو جاتی ہے، جتنی تنبیہ کرنی چاہئے تھی اس سے زیادہ کر دی، یا جتنا اس کو ڈانٹنا چاہئے تھا اس سے زیادہ ڈانٹ دیا، یا جتنی سزا دینی چاہئے تھی اس سے زیادہ دیدی، یا سزا کا موقع نہیں تھا، لیکن اس کو غلط سزا دیدی۔ اس طرح کے واقعات بکثرت پیش آتے ہیں۔

معافی مانگنے کا نقصان

اب سیدھی بات تو یہ ہے کہ جس کے ساتھ تم نے زیادتی کی ہے، اس سے معافی مانگ لو کہ مجھ سے غلطی ہو گئی ہے، مجھے معاف کر دو۔ لیکن بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر میں اس طرح صریح الفاظ میں اس سے معافی مانگوں گا تو اس کے اندر اور زیادہ نافرمانی کا جذبہ پیدا ہو جائے گا، یہ اور گستاخ ہو جائے گا اور غلط راستے پر چل پڑے گا۔

آدمی آدمی میں فرق

دیکھئے! آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے، کوئی آدمی تو ایسا ہوتا ہے کہ اگر اس سے کوئی بڑا آدمی جھک کر بات کر لے اور دب کر بات کر لے تو پانی پانی ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں ہمیشہ کے لئے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ لیکن بعض آدمی ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ کسی بڑے نے جھک کر بات

کرلی یادب کر بات کرلی تو وہ اور شیر ہو جاتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں وہ اور زیادہ سرکشی پر اتر آتے ہیں۔ "متنبی" شاعر بعض اوقات بڑی حکیمانہ باتیں کہتا ہے، چنانچہ وہ کہتا ہے:

إِذَا أَنْتَ أَكْرَمْتَ الْكَرِيْمَ مَلَكْتَهُ

وَإِنْ أَنْتَ أَكْرَمْتَ اللَّئِيْمَ تَمَرَّدَا

یعنی اگر تم کسی شریف آدمی کی عزت کرو گے اور اس کا اکرام کرو گے تو وہ تمہارا غلام بن جائے گا اور تم اس کے مالک بن جاؤ گے، اور اگر تم کسی کمینے کے ساتھ عزت کا معاملہ کرو گے تو وہ سرکش ہو جائے گا۔ آگے کہتا ہے:

وَضْعُ النَّدٰى فِيْ مَوْضَعِ السَّيْفِ بِالْعُلٰى

مُضِرٌّ كَوَضْعِ السَّيْفِ فِيْ مَوْضَعِ النَّدٰى

یعنی جس جگہ تلوار استعمال کرنی چاہئے تھی، اگر تم نے وہاں سخاوت کا برتاؤ کیا تو یہ بھی اتنا ہی مضر ہے جتنا کہ سخاوت کے موقع پر تلوار کا استعمال مضر ہے۔ بہرحال، آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے، کسی آدمی کے ساتھ اگر آپ تواضع سے پیش آئیں تو وہ بچھ جائے گا اور پھر کبھی بھی سرکشی پر آمادہ نہیں ہوگا، اور بعض وہ ہوتے ہیں کہ اگر ان کے ساتھ تواضع کے ساتھ پیش آؤ تو وہ الٹا سرکش بن جاتے ہیں۔

اس لئے بعض اوقات دل میں خیال آتا ہے کہ اگر میں اپنے سے چھوٹے سے معافی مانگوں گا تو وہ سرکش ہو جائے گا اور زیادہ نافرمانی پر اتر آئے گا، اس کے

دماغ میں اور زیادہ خنّاس پیدا ہو جائے گا۔

دو میں سے ایک بات کا فیصلہ کرلو

ایسی صورت کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ پہلے دو باتوں میں سے ایک بات کا فیصلہ کرلو، وہ یہ کہ جس چھوٹے کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا ہے، آئندہ اس سے تعلق باقی رکھنا ہے یا نہیں؟ مثلاً اپنے کسی نوکر کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آگیا، تو پہلے یہ فیصلہ کرو کہ آئندہ اس کو اپنے پاس بطور ملازم کے رکھنا ہے یا اس کو ملازمت سے علیحدہ کرنا ہے۔

اس کے ساتھ حسن سلوک کرلو

اگر اس کو ملازمت پر برقرار رکھنا ہے تو اس صورت میں نوکر سے صریح الفاظ میں معافی مانگنے کے بجائے کسی اور عنوان سے اس کی دلداری کر دی جائے، مثلاً اس کو کوئی ہدیہ یا تحفہ دیدیا، یا اس سے ہنسی مذاق کی میٹھی بات کرلی، یا اس کی دعوت کر دی، تاکہ اس کے نتیجے میں وہ یہ سمجھے کہ میرے ساتھ حسن سلوک کیا گیا ہے، ایسا حسن سلوک کر کے سابقہ زیادتی کی تلافی کرلی جائے۔

ورنہ معافی مانگ لو

اور اگر یہ ارادہ ہے کہ اب اس کو ملازمت پر نہیں رکھنا، بلکہ اس کی ملازمت سے چھٹی کرنی ہے اور اب اس کے ساتھ تعلق برقرار نہیں رکھنا، تو اس صورت میں چونکہ گستاخ یا سرکش ہو جانے کا اندیشہ فضول اور بے کار ہے، اس

لئے اس صورت میں صراحتاً اس نوکر سے معافی مانگنی چاہئے۔ چنانچہ جب اس ملازم کو رخصت کرو تو اس سے صاف صاف کہدو کہ جو ہم سے زیادتی ہوئی ہو وہ ہمیں معاف کر دو، اور خاص طور پر اس زیادتی کا بھی ذکر کر دو کہ فلاں وقت میں مجھ سے زیادتی ہوئی تھی اور مجھ سے غلطی ہوئی تھی، مجھے معاف کر دو۔

یہ تکبر کی بیماری کا علاج ہے

جب تم اپنے ملازم سے یہ کہو گے کہ فلاں وقت مجھ سے جو زیادتی ہوئی تھی، مجھے معاف کر دو۔ ان الفاظ کو زبان سے نکالتے وقت متکبر کے دل پر آرے چل جاتے ہیں، لیکن تکبر کا علاج ہی یہ ہے کہ ملازم کو رخصت کرتے وقت صریح الفاظ میں اس سے یہ الفاظ کہے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا کہ جب صریح لفظوں میں معافی ہو جائے گی تو پھر انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں مؤاخذہ نہیں ہوگا کہ تم نے اپنے ماتحت کو ناحق سزا دی تھی یا ناحق ڈانٹا تھا۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ تکبر کی بیماری کا علاج ہو جائے گا۔

حضور ﷺ کا معافی مانگنا

اس کائنات میں کوئی شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت اور منصب کے برابر ہو سکتا ہے؟ بلکہ دنیا و آخرت میں کوئی منصب، کوئی عہدہ، کوئی رتبہ، کوئی حیثیت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب اور عہدہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مجمع عام میں

کھڑے ہو کر اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر کسی سے معاملہ کرتے وقت مجھ سے کوئی زیادتی ہو گئی ہو یا میں نے کسی کی جان، کسی کا مال، کسی کی عزّت اور آبرو پر کوئی زیادتی کی ہو تو آج میں یہاں سب کے سامنے موجود ہوں، اگر وہ چاہے تو مجھ سے بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے۔

ایک صحابی رضی اللہ عنہ کا بدلہ لینا

ایک صحابیؓ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بدلہ لینا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کس چیز کا بدلہ لینا ہے؟ ان صحابیؓ نے عرض کیا کہ ایک دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کمر پر مارا تھا، اس کا بدلہ لینا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے تو یاد نہیں ہے کہ میں نے کسی کو مارا ہو، لیکن اگر تمہیں مارنا یاد ہو تو بدلہ لے لو، ان صحابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری کمر پر مارا تھا، اس وقت میری کمر ننگی تھی، میری کمر پر کوئی کپڑا نہیں تھا، برابر بدلہ تو اس وقت ہو گا جب آپ کی کمر پر بھی کپڑا نہ ہو، اس وقت تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی کمر پر چادر ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی کمر سے چادر ہٹالی اور فرمایا کہ اب بدلہ لے لو۔ چنانچہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمر مبارک سے چادر ہٹائی تو مہر نبوت نظر آنے لگی۔ وہ صحابیؓ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت کی طرف گئے اور مہر نبوت کو جا کر بوسہ دیا اور کہا کہ میرا مقصد تو مہر نبوت کا بوسہ لینا تھا، بدلہ لینا میرا مقصود نہیں تھا۔ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو کر یہ اعلان فرما رہے ہیں کہ اگر

کسی کے ساتھ میں نے زیادتی کی ہے تو وہ بدلہ لے لے یا مجھے معاف کر دے تو ہما شما کس شمار و قطار میں ہیں۔

بہر حال! انسان یہ کہتے ہوئے کیوں شرمائے کہ میری غلطی پر مجھے معاف کر دو۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب اس ملازم اور نوکر سے تعلق نہیں رکھنا تو صاف صاف الفاظ میں اس سے معافی مانگ لو اور معافی مانگنے میں کبھی شرم کو آڑے نہ آنے دو۔

معافی کا دروازہ بند ہونے سے پہلے معافی مانگ لو

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے ذمے دوسرے کا کوئی جانی یا مالی حق ہو، وہ آج اس شخص سے معاف کرا لے جس کا حق ہے، قبل اس کے کہ وہ وقت آجائے کہ معافی کا دروازہ بند ہو جائے۔ آج تو تم اس کی خوشامد کر کے معاف کرالو گے یا کوئی معاوضہ دے کر معاف کرالو گے، لیکن ایک وقت ایسا آنے والا ہے جب تمہارے پاس اس کو پیش کرنے کے لئے نہ دینار ہوگا اور نہ درہم ہوگا، آخرت میں تو وہاں کی کرنسی استعمال ہوگی اور وہاں کی کرنسی نیکیاں ہیں، وہاں پر تو حق کی معافی کے لئے یا تو اپنی نیکیاں اس کو دینی پڑیں گی یا اس کے گناہ اپنے اوپر لینے پڑیں گے، اس کے حق کو ادا کرنے کا اور اس کے وبال سے بچنے کا اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوگا۔ لہٰذا وہ وقت آنے سے پہلے پہلے معاف کرالو۔

حضرت تھانوی کا معافی مانگنا

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی معافی مانگنے کی سنّت پر عمل کرتے ہوئے وفات سے چند سال پہلے ایک رسالہ لکھا تھا، اس رسالے کا نام تھا "العذر والنذر" اس رسالے میں لکھا تھا کہ ساری عمر میرا جن لوگوں سے تعلق رہا، نہ جانے مجھ سے کس کی کیا کیا حق تلفی ہوئی ہو، میں آج ان حقوق کی ادائیگی کے لئے تیار ہوں، اگر کسی کا مالی حق میرے ذمے ہے اور مجھے ادا کرنا یاد نہیں رہا تو مجھے یاد دلا کر وہ حق وصول کر لے، اور اگر کسی کا جانی حق ہے تو اگر وہ مجھ سے بدلہ لینا چاہتا ہے تو بدلہ لے لے، معاف کرنا چاہتا ہے تو معاف کر دے، میں آپ سب سے معافی کا طلب گار ہوں۔ پھر یہ رسالہ خط کی شکل میں اپنے سارے متعلّقین کو بھیجا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا معافی مانگنا

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وفات سے تقریباً دو سال پہلے معافی کا ایک مضمون مجھ سے لکھوایا اور پھر اس کو "کچھ تلافی مافات" کے نام سے "البلاغ" میں بھی شائع کیا اور فرداً فرداً بھی اپنے متعلقین کے پاس بھیجا اور اس کے ذریعہ اپنے تمام متعلقین سے معافی مانگی۔

لہٰذا یہ معافی مانگ لینا ہیٹی کی بات نہیں، اس سے انسان کی عزّت میں کمی

نہیں آتی، بلکہ اس کے ذریعہ انسان آخرت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتا ہے، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے ذریعہ تکبّر کا خاتمہ ہو تا ہے۔

ہدیہ دیکر نوکر کو خوش کردو

اور اگر اس ملازم اور نوکر سے آئندہ تعلق باقی رکھنا ہے تو اس صورت میں صراحتًا اس سے معافی مانگنے کی صورت میں اگر اس کے سرکش ہونے کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں اس کے ساتھ کسی عنوان سے اس کی دلداری کرلو، مثلاً اس کو کوئی ہدیہ دیدو یا کوئی تحفہ دیدو اور اس کا دل خوش کردو۔

نوکر اور ماتحت کے بارے میں اتنی تاکید کیوں؟

"نوکر" اور "ماتحت" ایسے لوگ ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے، ورنہ اکثر و بیشتر انسان اپنے ماتحتوں کے معاملے میں انصاف سے تجاوز کر جاتا ہے، اس لئے کہ وہ ماتحت اپنی گرفت اور اپنے پنجے میں ہو تا ہے، ہم جب چاہیں اس کو ڈانٹ سکتے ہیں، جب چاہیں اس کی خبر لے سکتے ہیں، تو چونکہ ماتحت پر انسان کو قدرت حاصل ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں وہ اس قدرت کو حدود کے اندر رہ کر استعمال کرنے سے قاصر رہتا ہے اور اس قدرت کو غلط استعمال کر جاتا ہے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر اس کی طرف توجہ دلائی۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے غلام کو مار رہے تھے، اب ظاہر ہے کہ کسی واقعی غلطی پر ہی سزا دے رہے ہوں گے، بلاوجہ تو سزا نہیں دے رہے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو مارتے ہوئے دیکھا تو ارشاد فرمایا:

لَلّٰهُ أَقْدَرُ عَلَيْكَ مِنْكَ عَلَيْهِ

یعنی جتنی قدرت تمہیں اس غلام پر حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو اس سے زیادہ قدرت تم پر حاصل ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ذرا اس بات کا دھیان کرو کہ اس قدرت کو صحیح اور برمحل اور مناسب حدود میں استعمال کر رہے ہو یا نہیں؟ اگر اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر قدرت کا مظاہرہ کرنے پر آجائیں تو تمہارا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔

حضرت تھانویؒ کا معمول

بہر حال! ان چھوٹوں اور ماتحتوں کے ساتھ معاملات کرنے میں تکبر کے بڑے امکانات ہیں، لہٰذا اس پر اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہئے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ جب میں کبھی اپنے کسی چھوٹے سے مؤاخذہ کرتا ہوں اور اس کو ڈانٹنے کی نوبت آجاتی ہے تو الحمدللہ کبھی اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی کہ ایک طرف تو اس کو ڈانٹ رہا ہوتا ہوں اور دوسری طرف دل میں اللہ تعالیٰ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ یا اللہ! مجھ سے

ایسا مؤاخذہ نہ فرمائیے گا۔ اب بتائیے جس شخص کے دل میں ہر وقت آخرت کی یہ فکر لگی ہوئی ہو، وہ کیسے حد سے تجاوز کرے گا۔

بھائی نیاز کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ: حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے، جن کا نام "بھائی نیاز" تھا، وہ حضرت کے بہت قریب رہتے تھے، اس وجہ سے ذرا منہ چڑھے خادم تھے، اور جو کسی بڑے کا منہ چڑھا ہوتا ہے وہ دوسروں پر ناز بھی کیا کرتا ہے، بقول کسی کے:

بنا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

شاہ کا مصاحب دوسروں پر ناز کرتا ہے۔ اس لئے حضرت والا کے پاس جو آنے جانے والے مہمان ہوتے، بعض اوقات ان کے ساتھ نامناسب انداز میں پیش آتے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی اطلاع ہو گئی کہ یہ بھائی نیاز آنے جانے والوں کے ساتھ درشتی کا معاملہ کرتے ہیں، حضرت نے ان کو بلایا اور سخت لفظوں میں ان سے کہا: میاں نیاز! تم آنے والوں کے ساتھ لڑتے جھگڑتے رہتے ہو اور ان کے ساتھ بے تہذیبی سے بات کرتے ہو۔ جواب میں انہوں نے کہا کہ: حضرت! جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔ دیکھئے کہ ایک نوکر اور خادم اپنے آقا سے کہہ رہا ہے کہ "جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو" اب اس وقت تو اور زیادہ اس نوکر کو ڈانٹنا چاہئے تھا لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ "استغفر اللہ"

"استغفر اللہ" کہتے ہوئے دوسری طرف چلے گئے۔

میں نے یک طرفہ بات سن کر ڈانٹا

بعد میں لوگوں کے سوال کرنے پر حضرت والا نے بتایا کہ جب بھائی نیاز نے مجھ سے کہا کہ "جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو" اس وقت مجھے تنبہ ہوا کہ میں نے یک طرفہ بیان سن کر ان کو ڈانٹنا شروع کر دیا تھا، ابھی میں نے صرف لوگوں کی بات سنی تھی کہ انہوں نے لوگوں کے ساتھ یہ زیادتی کی ہے، مجھے یہ چاہئے تھا کہ میں ان کا بیان بھی سنتا اور ان سے پوچھتا کہ لوگ تمہارے بارے میں یہ کہہ رہے ہیں، بتاؤ! یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ ان کے بیان کو سننے کے بعد ڈانٹنے کا فیصلہ کرتا، لیکن میں نے یک طرفہ بات پر ڈانٹنا شروع کر دیا، اس وجہ سے مجھ سے غلطی ہوئی، اس لئے میں استغفار کرتا ہوا چلا گیا۔

بھائی نیاز کے قول کا مطلب

حضرت بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنانے کے بعد فرمایا کہ میرا خیال یہ ہے کہ بھائی نیاز کا یہ مطلب نہیں تھا کہ حضرت جھوٹ نہ بولیں اور اللہ سے ڈریں، بلکہ ان کا مقصد یہ تھا کہ جن لوگوں نے آپ سے شکایت لگائی ہے ان کو چاہئے کہ وہ جھوٹ نہ بولیں اور اللہ سے ڈریں۔ لیکن جلدی میں زبان سے براہ راست حضرت والا سے خطاب کرتے ہوئے کہدیا کہ جھوٹ نہ بولو، اللہ سے ڈرو۔

اللہ کی حدود کے آگے رک جانے والے

لیکن اس واقعہ میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جب ایک خادم کو ڈانٹا تو فوراً اس وقت ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں نے یک طرفہ بیان پر فیصلہ کر دیا، یہ مجھ سے غلطی ہوئی، لہٰذا اس پر استغفار کرتے ہوئے چلے گئے۔ اس کو کہا جاتا ہے کہ:

كَانَ وَقَّافاً عِنْدَ حُدُوْدِ اللّٰهِ

یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود کے آگے ٹھہر جانے والے تھے۔ یہ تھے "حکیم الامّت"۔ ویسی ہی "حکیم الامّت" نہیں بن جاتے، پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کا فیض چار دانگ عالم میں پھیلایا۔ آج ہم نے چند ظاہری رسوم کا نام "دین" رکھ لیا ہے، حالانکہ یہ بھی سب دین کا حصّہ ہے کہ کس وقت کس سے کیا معاملہ کیا جائے اور کس حد میں کیا کیا جائے؟ یہ ترازو اپنے میں لگانی پڑتی ہے کہ کہیں ایک طرف پلّہ جھکے نہیں، بلکہ توازن کے ساتھ سارے کام انجام پائیں۔

بدلہ میں برابری آسان نہیں

بہر حال! چھوٹوں کے ساتھ معاملات کرنے میں خون کے گھونٹ پینے پڑتے ہیں۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ:

دو گونہ رنج و عذاب جانِ مجنون را

ایک طرف اس کا خیال رکھنا ہے کہ ہماری طرف سے کوئی زیادتی نہ ہو جائے اور اگر کوئی زیادتی ہو تو اس کی معافی تلافی ہو جائے۔ اور دوسری طرف یہ ہے کہ وہ

سرکش نہ بنے، انتظام خراب نہ ہو۔ ان دونوں کے درمیان توازن رکھنا بس یہی حدود اللہ کو قائم کرنا ہے۔ اور یہ کام عموماً کسی شیخ کی صحبت اور تربیت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا، بلکہ اس کے بغیر آدمی پھسل جاتا ہے۔ ہاں اگر کسی کی باقاعدہ تربیت ہوئی ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ کس جگہ پر کیا طرز عمل اختیار کرنا ہے اور کتنا اختیار کرنا ہے، اگر کسی کو ڈانٹنا بھی ہے تو کتنا ڈوز دینا ہے، اور اس سے زیادہ دینے میں کس طرح زیادتی ہو جائے گی۔ یہ ترازو ویسے ہی دل میں پیدا نہیں ہو جاتی، اگر میں اس کو دو اور دو چار کر کے لفظوں میں بیان کرنا چاہوں تو بیان نہیں کر سکتا، بلکہ یہ ایک ذوق اور ملکہ ہے، وہ ذوق اور ملکہ جب دل میں پیدا ہو جاتا ہے تو وہ بتاتا ہے کہ اس جگہ اتنے ڈوز کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں، اس سے زیادہ کرو گے تو زیادتی ہو جائے گی۔ قرآن کریم میں یہ جو فرمایا کہ:

فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ۔

(سورۃ البقرہ، آیت ۱۹۴)

یعنی جتنی زیادتی کسی نے تم پر کی ہے، تم بھی اتنی ہی زیادتی اس پر کر سکتے ہو۔ اس آیت پر عمل کرنا بہت مشکل کام ہے، کیونکہ جانچ تول کر یہ کرنا کہ میں اتنا بدلہ لوں جتنا اس نے کیا ہے، یہ آسان کام نہیں۔

اولیاءؒ کے مختلف الوان ہوتے ہیں

''ارواح ثلاثہ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے کسی بزرگ سے سوال کیا کہ حضرت میں نے سنا ہے کہ اولیاء اللہ

کے مختلف الوان ہوتے ہیں اور ان کی مختلف شانیں ہوتی ہیں، لہٰذا میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا مختلف الوان ہوتے ہیں اور کیا شانیں ہوتی ہیں؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ تم اسی چکر میں مت پڑو، اپنے کرنے کا جو کام ہے وہ کئے جاؤ، ان صاحب نے اصرار کیا کہ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

ان بزرگ نے فرمایا کہ اچھا ایسا کرو کہ فلاں گاؤں میں ایک مسجد ہے، اس مسجد میں جاؤ، وہاں تمہیں تین بزرگ ذکر اللہ میں مشغول نظر آئیں گے، تم جاکر تینوں کو پیچھے سے ایک ایک مکّہ مار دینا، پھر دیکھنا کہ وہ کیا کرتے ہیں، جو وہ کریں مجھے آکر بتانا۔ چنانچہ وہ صاحب گاؤں کی مسجد میں گئے، جاکر دیکھا تو واقعۃً تین بزرگ ذکر اللہ میں مشغول تھے، اس نے جاکر پہلے ایک کو پیچھے سے مکہ مارا، ان صاحب نے پیچھے مڑکر ان کو بھی ایک مکہ اتنی زور کا مارا اور پھر ذکر اللہ میں مشغول ہوگئے۔ دوسرے کو جاکر مکّہ مارا تو انہوں نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں کہ کس نے مارا اور کیوں مارا، بلکہ اپنے ذکر میں مشغول رہے۔ جب تیسرے شخص کو مارا تو انہوں نے پلٹ کر ان کا ہاتھ دبانا شروع کر دیا کہ تمہارے ہاتھ میں چوٹ تو نہیں لگی۔

جب یہ صاحب واپس ہوئے تو ان بزرگ نے پوچھا کہ کیا ہوا؟ انہوں نے ساری تفصیل بتادی کہ تینوں نے علیحدہ علیحدہ معاملہ کیا، ان بزرگ نے فرمایا کہ تم بزرگوں کے الوان جاننا چاہ رہے تھے، یہ مختلف الوان تھے، پہلے بزرگ جنہوں نے تم سے بدلہ لیا، یہ بتاؤ کہ انہوں نے اتنی ہی زور کا مکہ مارا جتنی زور کا تم نے مارا تھا، یا زیادہ زور کا مارا؟ ان صاحب نے کہا کہ نہیں، اتنی ہی زور کا مارا تھا،

فرمایا کہ انہوں نے یہ سوچا کہ جتنی زیادتی اس نے میرے ساتھ کی، میں نے بھی اتنا ہی بدلہ لے لیا۔

پہلے بزرگ نے بدلہ کیوں لیا

لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ بعض اللہ کے ولی لوگوں سے بدلہ اس لئے لیتے ہیں تاکہ یہ شخص آخرت کے مؤاخذہ سے بری ہو جائے، اس لئے بدلہ نہیں لیتے کہ اس نے مجھے تکلیف پہنچائی، بلکہ اس لئے بدلہ لیتے ہیں کہ اگر میں اس سے یہاں بدلہ لے لونگا تو یہ آخرت کے مؤاخذہ سے بری ہو جائے گا، اسی لئے ان بزرگ نے بدلہ لیا، لیکن اتنا ہی لیا جتنا لینا چاہئے تھا، اس سے زیادہ نہیں لیا۔

دوسرے بزرگ نے بدلہ کیوں نہیں لیا

دوسرے بزرگ جو تھے انہوں نے سوچا کہ بدلہ لینے کے چکر میں کون پڑے، کیونکہ اگر ایک انچ بھی زیادہ بدلہ لے لیا تو الٹی اپنی گردن پکڑی جائے گی، کیوں خواہ مخواہ اس چکر میں پڑوں اور جس کام میں لگا ہوا ہوں، اس سے اپنا وقت ضائع کروں، اللہ کے ذکر میں لگا ہوا ہوں، اسی میں لگا رہوں، کوئی اگر مارتا ہے تو مارتا رہے۔

تیسرے بزرگ کا عمل

تیسرے بزرگ نے اپنے آپ کو اتنا مٹایا ہوا تھا کہ نہ صرف یہ کہ ان کو

اپنی چوٹ کی پروا نہ ہوئی، بلکہ الٹا مارنے والے کے ہاتھ دبانے لگے کہ آپ کو چوٹ تو نہیں لگی۔ بہر حال! بزرگوں کے یہ مختلف رنگ اور مختلف طریقے تھے، اور تینوں طریقے جائز تھے، پہلا طریقہ بھی جائز تھا، اس لئے کہ برابر کا بدلہ لینا جائز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَجَزَآؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ـ

(سورۃ الشوریٰ، آیت ۴۰)

اور دوسرا طریقہ یعنی معاف کرنا بھی جائز ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ـ

(سورۃ الشوریٰ، آیت ۴۳)

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت بھی یہی تھی کہ معاف فرمادیا کرتے تھے، اپنی ذات کے لئے کبھی بدلہ نہیں لیا۔ اور تیسرا طریقہ اس سے زیادہ افضل اور اعلیٰ تھا کہ اپنی فکر کے بجائے مارنے والے کی فکر کر رہے تھے۔

خلاصہ

بہر حال! بندوں کے حقوق کا معاملہ بڑا نازک ہے، اس میں ہر وقت انسان کو ڈرتے رہنا چاہئے کہ کہیں مجھ سے زیادتی نہ ہو جائے۔ آج لوگ کس بے دردی سے اور بے مہابا انسانوں کے حقوق پر، ان کی جان پر، ان کے مال پر، ان کی آبرو پر ڈاکے ڈالتے ہیں، وہ جان مال آبرو جس کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان کی جان اور مال اور آبرو بیت اللہ سے زیادہ

حرمت والی ہے، اگر کسی نے مسلمان کی جان مال پر حملہ کیا تو وہ ایسا ہے جیسے اس نے کعبہ کو ڈھادیا۔ العیاذ باللہ۔

ایک صاحب کا واقعہ

ایک صاحب اپنا قصہ بیان کر رہے تھے کہ وہ دفتر سے گھر جا رہے تھے، پیسوں کا تھیلہ ہاتھ میں تھا، دو صاحبان راستے میں آگئے، پہلے پستول دکھایا اور ایک تھپڑ مارا، دو گالیاں دیں، اور پھر کہا کہ جو کچھ ہے وہ ہمارے حوالے کر دو۔ مطلب یہ ہے کہ صرف مال لینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جان، مال اور آبرو، تینوں پر حملہ کیا، اور یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ہم کیا کام کر رہے ہیں، یہ نہیں سوچتے کہ آخر ہمیں مرنا بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے بھی جانا ہے، اور یہ زندگی جس میں ہم جی رہے ہیں، معلوم نہیں ہے کہ ایک دن کی ہے یا زیادہ کی ہے، جو آدمی دوسروں پر پستول لئے پھرتا ہے اس کی زندگی بھی موہوم ہے، پتہ نہیں صبح موت کو دیکھے یا شام کو دیکھے، اس دنیا سے جانا یقینی ہے، لیکن اس کے باوجود یہ کام کر رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو ہدایت عطا فرمائے اور فکر عطا فرمائے۔ اور ہمیں بھی حقوق العباد کی فکر کرنی چاہئے کہ اپنی ذات سے دوسرے کو تکلیف نہ پہنچے، نہ جسمانی، نہ مالی اور نہ آبرو کی، اور اگر دوسروں کو ہم سے تکلیف پہنچی ہو تو فوراً اس کو معاف کرانے کی فکر کرنی چاہئے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسکی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۲۱

تکبّر کا علاج "ذلت نفس"

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲
مجلس نمبر : ۲۱
صفحات : ۱۰

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

مجلس نمبر ۲۱

تکبر کا ایک علاج "ذلّت نفس"

الحمدللّٰه رب العالمین ۔ والعاقبة للمتقین۔
والصّلوٰة والسّلام علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ آله
واصحابه اجمعین۔ أمَّا بَعۡدُ!

انانیت کا علاج ذلّتِ نفس ہے

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

"یہ "انانیت" بڑا حجاب ہے، اس کا علاج بدون ذلّتِ نفس نہیں ہو سکتا۔"

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵۹)

یعنی تکبر کا اصل سبب "انانیت" ہوتا ہے، انانیت کے معنیٰ ہیں "اپنے آپ کو بڑا سمجھنا" اس کے نتیجے میں انسان یہ چاہتا ہے کہ میری عزت کی جائے، لوگ میری تعظیم کریں، مجھے بڑا سمجھیں، میرا اکرام کریں۔ لہٰذا اس "انانیت" کا علاج

اس کی ضد کو اختیار کرنے سے ہوگا، وہ یہ کہ اس نفس کو تھوڑا سا ذلیل کیا جائے، کیونکہ جب اس نفس کو ذلیل اور پامال کیا جائے گا تو پھر یہ اعتدال پر آجائے گا، اسی کا نام "مجاہدہ" ہے۔ مجاہدہ کا مطلب بھی یہ ہے کہ وہ نفس جو بے اعتدالیوں کا عادی بن چکا ہے، اس کو اعتدال پر لانے کے لئے کوئی ایسا کام کیا جائے جو اس نفس پر شاق گزرے، جب وہ شاق کام کرے گا تو رفتہ رفتہ وہ اعتدال پر آجائے گا۔

مجاہدہ کی حقیقت

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! مجاہدہ کی حقیقت کیا ہے؟ اور مجاہدہ میں تو بعض اوقات جائز اور مباح کام بھی ترک کرنے پڑتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو وہ کام حلال اور جائز قرار دیے ہیں، لیکن ان جائز کاموں کو بھی مجاہدہ کے اندر ترک کرایا جاتا ہے۔ جواب میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مثال بیان فرمائی کہ یہ ایک ورق ہے، تم اس کا ایک کونا موڑ دو، اب ورق کو سیدھا کرو۔ لیکن اب سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو مخالف سمت میں موڑ دو، اب سیدھا ہو جائے گا۔ پھر فرمایا کہ یہ ہمارا نفس گناہوں اور بے اعتدالیوں کی طرف مڑا ہوا ہے، اس کو اگر سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، یہ اس وقت سیدھا ہوگا جب اس کو تم مخالف سمت میں موڑ دو گے، اور مخالف سمت میں موڑنے کے لئے جائز اور

مباح کام بھی اس سے چھڑانے پڑیں گے، پھر یہ نفس معتدل ہو جائے گا، اس کا نام ''مجاہدہ'' ہے۔

کھانے میں پانی ملانا

چنانچہ بعض صوفیاء کرام سے جو یہ منقول ہے کہ وہ اپنے مریدوں سے کہتے ہیں کہ کھانے میں پانی ملا کر کھاؤ، عام حالات میں یہ حکم نہیں ہے، بلکہ عام حالات میں تو وہ حکم ہے جو قرآن کریم کے اندر منقول ہے:

يٰٓاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا ۝

(سورۃ المؤمنون، آیت ۵۱)

یعنی اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو، اچھا کھاؤ اور اچھا عمل کرو۔ لیکن چونکہ نفس غلط جانب میں مڑا ہوا ہے، اس لئے اس کو اعتدال میں لانے کے لئے ایسے مجاہدات کی ضرورت ہوتی ہے جس میں مباحات بھی ترک کرائے جاتے ہیں۔

''ذلّتِ نفس'' بذاتِ خود مقصود نہیں

یہی معاملہ ''ذِلّتِ نفس'' کا ہے کہ عام حالات میں اپنے نفس کو ذلیل کرنا پسندیدہ نہیں، نفس کی بھی ایک عزت ہے، اور یہ نفس بھی اللہ تعالیٰ کی ایک عطا ہے، اس لئے بلا وجہ اس کو ذلیل کرنا پسندیدہ نہیں، لیکن جب نفس تکبر کرنے لگے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے، اور اپنی بڑائی اس کے دل میں آنے لگے تو

ان بیماریوں کو ختم کرنے کے لئے کبھی کبھی نفس کو ذلیل بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کو ذلیل کرنے کے لئے مشائخ مختلف تدبیریں بتاتے ہیں، اور یہ تدبیریں ہر شخص کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض اوقات ذلتِ نفس کے لئے نمازیوں کی جوتیاں سیدھی کرائی جاتی ہیں کہ مسجد کے باہر جو جوتیاں رکھی ہیں، ہر نماز کے وقت ان کو سیدھا کیا کرو۔ بعض اوقات ذلتِ نفس کے لئے یہ تدبیر بتائی جاتی ہے کہ متکبر نماز کے بعد مسجد میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے کہ بھائیو! میرے اندر تکبر کا مرض ہے، آپ دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے تکبر کا یہ مرض دور کر دے۔ جب متکبر مسجد میں کھڑے ہو کر یہ اعلان کرے گا کہ میرے اندر تکبر کی بیماری ہے تو پھر اس کے اندر وہ بیماری کہاں باقی رہے گی۔

ذکر بذات خود مقصود ہے

حضرت علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، انہوں نے آکر کہا کہ حضرت! میں بہت ذکر کرتا ہوں، لیکن ذکر سے کچھ نفع نہیں ہوتا، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ ذکر کرنا سب بیکار جا رہا ہے۔ یہ بات سمجھ لیں کہ ویسے تو ذکر کسی حال میں بیکار نہیں ہوتا، بشرطیکہ اخلاص کے ساتھ ہو، لوگ ذکر کے بعد اس کے نتائج اور ثمرات کے منتظر رہتے ہیں، ان ثمرات اور نتائج کی طرف زیادہ التفات نہیں کرنا چاہئے، ہمارے بزرگوں کا یہ مذاق نہیں تھا، بلکہ حضرت حاجی صاحب اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے کا مذاق یہ ہے کہ ذکر بذات خود مقصود ہے، ذکر کے بعد اس کے ثمرہ اور نتیجہ کا منتظر رہنا درست نہیں، بلکہ

ذکر ہی کو بذات خود مقصود سمجھ کر انسان کرتا رہے، کیفیات وغیرہ کی طرف ذہن کو نہ لیجائے کہ دیکھیں ذکر سے کیا کیفیت طاری ہو رہی ہے، بلکہ اگر کیفیت پیدا ہو رہی ہے تو اس کو ہونے دے، اس کی طرف توجہ نہ کرے۔

"ذکر" سے مقابلے کی قوت پیدا ہوتی ہے

لہٰذا اس مرید نے یہ جو کہا کہ ذکر سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس کے ذکر میں اخلاص کی کمی ہو، کیونکہ اگر اخلاص نہ ہو تو ذکر واقعۃً بیکار ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ذکر کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ذکر کرنے کے نتیجے میں آدمی کے اندر گناہوں کے تقاضے سے مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے، اگر انسان ذاکر ہے تو اس کے لئے گناہوں کے تقاضے کا مقابلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے، مثلاً شیطان نے بھکایا کہ یہ گناہ کرلو، یا نفس نے آمادہ کیا کہ یہ گناہ کرلو، اب عام حالات میں انسان نفس اور شیطان کے دفاع میں کمزور پڑ جاتا ہے اور بعض اوقات نفس و شیطان کے آگے ہتھیار ڈال دیتا ہے، لیکن ذکر انسان کے اندر نفس و شیطان کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا کر دیتا ہے۔

ذکر اللہ ایک انرجی ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ اللہ کا ذکر "انرجی" ہے، کس چیز کے لئے انرجی ہے؟ نفس و شیطان کا مقابلہ کرنے کے لئے "انرجی" ہے، کیونکہ ذکر کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے

نتیجے میں نفس و شیطان کے ساتھ لڑائی کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے حضرات مشائخ فرماتے ہیں کہ صبح کے وقت فجر کے بعد ذکر کیا کرو۔ ویسے تو کسی بھی وقت ذکر ہو سکتا ہے، لیکن فجر کے بعد یا فجر سے پہلے ذکر کرنے کا جو طریقہ مقرر فرمایا، اس کی کئی وجوہات ہیں۔

صبح کے وقت ذکر کی وجہ

ایک وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صبح کے وقت میں نمو اور نشو ونما کی خاص صلاحیت رکھی ہے، مثلاً صبح کے وقت میں پھول کھلتے ہیں، کلیاں بھی صبح چٹکتی ہیں، پرندے اس وقت بیدار ہوتے ہیں، لہٰذا اس وقت جب کوئی شخص ذکر کرے گا تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ ذکر اس کے اندر روحانی نمو پیدا کرے گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جب آدمی صبح کے وقت بیدار ہوا، اب تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنی کارزار زندگی میں اترنے والا ہے، زندگی کے معرکے میں اترنے والا ہے، جہاں قدم قدم پر اس کو نفس و شیطان کے دواعی سے سابقہ پیش آئے گا، کبھی آنکھ کو غلط استعمال کرنے کا داعیہ دل میں پیدا ہوگا، کبھی کان کو غلط استعمال کرنے کا داعیہ دل میں پیدا ہوگا، کبھی دل میں زبان کو غلط استعمال کرنے کا داعیہ پیدا ہوگا، کبھی دل میں کسی اور گناہ کا داعیہ پیدا ہوگا، چنانچہ کارزار زندگی میں چاروں طرف گناہوں کے محرکات پھیلے ہوئے ہیں، جن سے بچنے کے لئے انسان کو کشتی لڑنی پڑے گی۔

تکبر کے نتیجے میں ذکر سے فائدہ نہیں ہوتا

لہٰذا جب تم نفس و شیطان کے ساتھ مقابلے کے لئے دنگل میں اتر رہے ہو تو کچھ طاقت اور توانائی پیدا کر کے جاؤ، اور یہ طاقت اور توانائی اللہ کے ذکر سے پیدا ہو گی، اس لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ صبح اٹھ کر نماز فجر سے پہلے یا نماز فجر کے بعد اللہ کا ذکر کر لیا کرو تا کہ نفس و شیطان سے مقابلہ آسان ہو جائے، یہ بھی ذکر کا ایک فائدہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید یہ بتانا چاہتے ہوں کہ میں ذکر کر رہا ہوں، لیکن اس کے باوجود گناہوں سے حفاظت نہیں ہو پا رہی ہے۔ حضرت علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی طرف توجہ کی تو پتہ چلا کہ ذکر سے نفع نہ ہونے کی وجہ "تکبر" ہے، اور جب آدمی کے اندر "تکبر" ہوتا ہے تو پھر اس کو ذکر سے فائدہ نہیں ہوتا بلکہ الٹا نقصان ہوتا ہے۔

فنِ طب کا ایک اصول

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مثال سے سمجھایا ہے، فرمایا کہ "خمیرہ گاؤزبان" یا "خمیرہ مروارید" جسم میں تقویت پیدا کرنے کے لئے کھائے جاتے ہیں، لیکن یہ اس وقت تقویت دیتے ہیں جب انسان کے جسم کے اندر کوئی بیماری نہ ہو۔ اور اگر جسم کے اندر کوئی بیماری موجود ہے تو "فن طب" کا اصول یہ ہے کہ بیماری کے وقت میں جو طاقت کی چیز جسم کے اندر پہنچے گی وہ "خلط غالب" کی طرف مستحیل ہو جائے گی، مثلاً اگر جسم کے اندر بلغم بن رہا ہے تو اس وقت اگر تقویت کی چیز کھاؤ گے تو اس سے بلغم ہی بنے گا، اور اس خمیرہ سے

فائدہ پہنچنے کے بجائے الٹا نقصان ہوگا۔ اسی لئے تمام اطباّء کا اس پر اتفاق ہے کہ جس وقت آدمی کی طبیعت اعتدال پر نہ ہو، اس وقت مقویات کا استعمال نقصان دہ ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر کسی کے اندر "تکبر" کی بیماری موجود ہے اور شیخ نے اس کو ذکر کرنے کو کہدیا تو چونکہ پہلے سے تکبّر موجود ہے، اس لئے اس ذکر کے نتیجے میں اور زیادہ خنّاس پیدا ہو جائے گا، اور اب اس بات کا بھی تکبر پیدا ہو جائے گا کہ میں تو بڑا عابد زاہد بھی ہوں، اس وجہ سے ایسے شخص کا علاج دوسرے طریقے سے کیا جاتا ہے۔

تکبر کا ایک علاج

بہر حال! حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے توجہ کی تو پتہ چلا کہ یہ بیچارہ "تکبر" میں مبتلا ہے، اور اس کی وجہ سے اس کو ذکر سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے، اس لئے حضرت نے سوچا کہ پہلے اس کی بیماری کا علاج کرنا چاہئے، چنانچہ آپ نے اس مرید سے فرمایا کہ تم ایسا کرو کہ اخروٹوں کا ٹوکرا اٹھاؤ اور فلاں محلّے میں چلے جاؤ اور یہ اعلان کرو کہ جو شخص مجھے ایک دھول (مکہ) لگائے گا، اس کو ایک اخروٹ ملے گا، اس مرید نے یہ سن کر کہا کہ "اللہ اکبر، میں ایسا کروں؟" علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ "کمبخت، یہ اللہ کا نام وہ ہے کہ اگر سو سال کا کافر بھی کہے تو مسلمان ہو کر جنّت میں چلا جائے گا، مگر تو نے جس موقع پر یہ نام لیا ہے اس سے تو کافر ہو گیا، کیونکہ "اللہ اکبر" سے تو اللہ تعالیٰ کی عظمت اور کبریائی

بیان کی جاتی ہے، اور تو نے اس لفظ کو اپنی عظمت کے اظہار کے لئے استعمال کیا ہے، اس لئے کہ تمہارا مقصد یہ تھا کہ اللہ اکبر میں اتنا بڑا آدمی، میرا اتنا اونچا مرتبہ اور میں ایسا کام کروں کہ لوگوں کے سامنے یہ اعلان کروں کہ جو آدمی مجھے ایک دھول مارے گا میں اس کو ایک اخروٹ دوں گا، لہٰذا چونکہ تو نے یہ کلمہ اپنی عظمت کی خاطر استعمال کیا ہے، اس لئے تیرے اوپر اندیشہ کفر کا ہے۔

اپنی طرف سے علاج تجویز مت کرو

بہر حال، حضرت فرما رہے ہیں کہ بعض اوقات نفس کو تھوڑا سا ذلیل کر کے اس "انانیت" کا علاج کرنا پڑتا ہے، البتہ یہ نفس کی تذلیل ہر شخص کے لئے اس کے مناسب بتائی جاتی ہے، اس لئے کوئی شخص اپنا علاج اپنی تجویز سے کبھی نہ کرے، کیونکہ اس سے بعض اوقات نقصان ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات تو تذلیل نفس کا ایک ذرا نشتر بھی کافی ہو جاتا ہے، کیونکہ شریف آدمی کے لئے معمولی سی مہمیز بھی کافی ہو جاتی ہے، لفظوں کا معمولی سا تازیانہ بھی کافی ہو جاتا ہے اور اسی سے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے اور اس کا تکبر دور ہو جاتا ہے۔ لہٰذا جب کسی کو یہ معلوم ہوا کہ نمازیوں کے جوتے سیدھے کرنا تذلیل نفس کا ذریعہ ہے، تو اس نے خود اپنی مرضی سے یہ علاج شروع کر دیا یاد رکھئے! ایسا نہیں کرنا چاہئے بلکہ اپنے معالج اور اپنے شیخ کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کرنا چاہئے، وہ جانتا ہے کہ اس شخص کے لئے کونسا طریقہ فائدہ مند ہوگا۔

کبر کی وجہ اللہ کی عظمت کا دل میں نہ ہونا ہے

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

ہمارے اندر تکبر اس وقت تک ہے، جب تک حق تعالیٰ کی عظمت دل میں نہیں آئی اور اگر عظمت حق دل میں آجائے تو پھر یہ حال ہوگا ۔

چوں سلطان عزت علم برکشد
جہاں سر بجیب عدم درکشد

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۵۹)

یعنی تکبر کا فساد اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ابھی تک اللہ جل شانہ کی عظمت دل میں نہیں بیٹھی، اس وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی عظمت ہوتی تو پھر کیسے اپنے آپ کو بڑا سمجھ سکتا تھا، اس وقت تو پرکاہ کے برابر بھی اپنی وقعت نہ سمجھتا، لہٰذا دل میں جتنی اللہ تعالیٰ کی عظمت کم ہوگی، اتنا ہی دل میں تکبر ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی عظمت جتنی دل میں پیوست ہوگی، اتنا ہی تکبر کم ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اس تکبر کا علاج یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی عظمتِ شان کا تصور اور دھیان ہر وقت کرے، اس کی قدرت کاملہ کا، اس کے علم کامل کا، اس کی رحمت کاملہ کا تصور کرے، اس سے تکبر دل سے چلا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۲۲

رمضان کیلئے اعمال مؤخر کرنا

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۲

صفحات : ۱۹

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

مجلس نمبر ۲۲

رمضان کیلئے نیک اعمال کو مؤخر کرنا

الحمدللّٰه رب العالمین ۔ والعاقبة للمتقین۔
والصّلوٰة والسّلام علیٰ رسوله الکریم ۔
وعلیٰ آله واصحابه اجمعین ۔ أمّا بَعْدُ!

الحمد للہ، ''کبر اور خود رائی'' سے متعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جو ارشادات تھے، ان کا بیان بقدر ضرورت مکمل ہو گیا، اب رمضان المبارک کا ایک ہی دن باقی ہے، رمضان المبارک سے متعلق حضرت والا کا ایک ارشاد مذکور ہے، خیال ہوا کہ آج اسی کو بیان کر دیا جائے۔ یہ بڑے کام کا ارشاد ہے:

تاخیر اعمال الی رمضان

حضرت والا نے فرمایا کہ:

''اللہ اور رسول کو تاخیر طاعات مطلوب نہیں، بلکہ تسارع و

تسابق الی الخیر مطلوب ہے" چنانچہ جا بجا:

فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ۔ (سورۃ البقرۃ، آیت ۱۴۸)

يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرَاتِ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۱۴)

نص میں وارد ہے، اسی طرح حدیث "تضاعف ثواب فی رمضان" کا مطلب "تعجیل اعمال فی رمضان" ہے، نہ کہ "تاخیر اعمال إلیٰ رمضان" یعنی رمضان کے اندر طاعات کے اندر جلدی کی جائے، یعنی جن طاعات کی ہمت ہو سکے اور جس عمل صالح کی توفیق ہو سکے اس کو جلدی سے رمضان ہی میں کرلو، رمضان کے بعد کے لئے مؤخر نہ کرو، کیونکہ رمضان میں ثواب زیادہ ہے۔ پس اگر ۲۸؍ شعبان کو زکوٰۃ کا سال پورا ہوتا ہو تو ۲۸؍ شعبان کو زکوٰۃ ادا نہ کرنا، بلکہ رمضان کے لئے اس کو ملتوی کرنا عدم تفقہ اور مقصد شارح نہ سمجھنے کی دلیل ہے، ارے تم کو کیا خبر کہ مساکین پر کیا گزر رہی ہے، تم کو یکم رمضان کا انتظار ہے اور اس غریب کو روح کی ایک ایک گھڑی کا انتظار ہے۔

علاوہ اس کے رمضان میں کمیۂ ثواب بڑھتا ہے اور تعجیل وسبقت فی الخیر میں کیفیۂ ثواب زیادہ ہوتا ہے، اور کیفیت میں کمیت سے زیادہ مطلوبیت ہے، چنانچہ اس کی نظیر علماء

کرام کے کلام میں بھی ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ حدیث میں ہے: محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے ۲۵ نمازوں کا ثواب ملتا ہے، اور جامع مسجد میں ۵۰۰ نمازوں کا، مگر محلّے والوں کے لئے یہ جائز نہیں کہ محلّے کی مسجد چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنے جایا کریں، اگر ایسا کریں گے تو گناہ ہوگا، اس کی وجہ یہ ہے کہ جامع مسجد کی نماز کا ثواب اس کے حق میں کمیۃً زیادہ ہے مگر محلّے کی مسجد کا ثواب کیفیۃً زیادہ ہے، کیونکہ اس کے ذمے اسی مسجد کی آبادی واجب ہے، تو یہ شخص مسجد میں نماز بھی پڑھتا ہے اور واجب عمارت کو بھی ادا کرتا ہے، اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے واجب عمارت ادا نہ ہوگا، کیونکہ اس کے ذمے اس مسجد کی عمارت و آبادی واجب نہیں، بلکہ یہ واجب جامع مسجد کے محلّے والوں کے ذمے ہے۔

اوپر جو بحث تاخیر حسنہ الی رمضان کی ہے، اس کے تتمہ میں یہ بھی سمجھ لیجئے کہ کیا عجب ہے کہ اس وقت ضرورت کے وقت جو مسکین کو سہارا مل گیا، اس کی دعا عرش سے کتنی اوپر گئی ہوگی اور اس دعا سے تم کو کیا کچھ ملا ہوگا، اور مان لو کہ اس وقت رمضان سے کم ہی ثواب ملا تو تم کو کیا خبر ہے کہ رمضان تک تم زندہ رہو یا نہ رہو، اگر تم

کہو کہ ہم وصیّت کر جائیں گے کہ رمضان میں اتنی رقم دیدی جائے تو وصیّت کا ثواب اپنے ہاتھ سے دینے کے برابر نہیں، دوسرے کیا بھروسہ کہ ورثاء ادا بھی کریں گے۔

(انفاس عیسیٰ ص)

لوگوں کی ایک غلطی

اس ملفوظ میں حضرت والا نے بڑی اصولی بات بیان فرمادی جو بکثرت مغالطوں اور غلطیوں کا سبب بنتی ہے، چنانچہ بہت لوگوں کو دیکھا کہ ان پر زکوٰۃ فرض ہو گئی ہے مگر اس انتظار میں رو کے بیٹھے ہیں کہ جب رمضان آئے گا تو اس وقت زکوٰۃ نکالیں گے، یا مثلاً کچھ صدقہ کرنے کی نیت ہے لیکن رو کے بیٹھے ہیں کہ جب رمضان آئے گا تو اس وقت صدقہ کریں گے، اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ رمضان میں نفل کام کا ثواب فرض کے برابر ملے گا اور فرض ادا کرنے پر ستر گنا ثواب ملے گا۔ اس حدیث کی وجہ سے لوگ زکوٰۃ اور صدقہ کی ادائیگی کو رمضان کے لئے مؤخر کر دیتے ہیں کہ جب رمضان آئے گا تو اس وقت ادا کریں گے۔

تضاعف ثواب والی حدیث کا مطلب

حضرت والا نے دو لفظوں میں اس حدیث کی تشریح فرمادی کہ اس حدیث کا مقصود "تعجیل اعمال فی رمضان" ہے، نہ کہ "تاخیر اعمال الی رمضان"

یعنی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں جب نیکی کا اتنا زیادہ ثواب ہے اور تمہارے دل میں کسی نیکی کے کرنے کا خیال آرہا ہے تو اس نیکی کو ابھی فوراً رمضان کے اندر ہی کرلو اور اس کو مت ٹالو، کیونکہ رمضان میں نیک کام کرنے کا ثواب زیادہ ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر رمضان سے پہلے کسی نیکی کا خیال آیا ہے تو اس خیال کو ٹال دو کہ یہ نیکی رمضان میں کریں گے، تاکہ اس وقت ثواب زیادہ ملے۔

لہٰذا جس وقت جس نیکی کے کرنے کا خیال آئے، چاہے وہ نفل کام ہو یا فرائض کی ادائیگی ہو، اسی وقت اس کو کرلو۔

نیک کاموں میں جلدی مطلوب ہے

حضرت نے دلیل اس کی یہ بیان فرمائی کہ قرآن کریم میں کئی جگہوں پر یہ حکم آیا ہے کہ:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ۔

(سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۳)

دوسری جگہ ہے:

فَاسْتَبِقُوْا الْخَیْرٰتِ۔

(سورۃ البقرۃ، آیت ۱۴۸)

یعنی دوڑ دوڑ کر جنت کے اعمال کی طرف جاؤ اور ان کو جلدی کرو، دیر مت کرو۔ اب قرآن کریم تو ہمیں یہ حکم دے رہا ہے، لیکن ہم انتظار کر رہے ہیں کہ جب

رمضان آئے گا تو اس وقت یہ عمل کروں گا، قرآن وسنت کی نصوص کے بالکل خلاف ہے۔

زکوٰۃ کس وقت واجب ہوتی ہے؟

خاص طور پر زکوٰۃ کے مسئلے میں لوگوں کو بہت غلط فہمی ہوتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہم رمضان ہی میں زکوٰۃ نکالیں گے، چاہے ان کی زکوٰۃ کا سال ربیع الاوّل کے مہینے میں پورا ہو جاتا ہو۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہر آدمی کے لئے زکوٰۃ ادا کرنے کی وہ تاریخ ہے جس تاریخ میں وہ پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا تھا، پھر جب آئندہ سال وہی تاریخ آئے گی تو اس دن اس پر زکوٰۃ فرض ہو جائے گی، مثلاً ایک شخص یکم ربیع الاوّل کو نصاب زکوٰۃ مال کا مالک بن گیا، تو اگلے سال یکم ربیع الاوّل ہی کو اس پر زکوٰۃ فرض ہو گی، اب اس شخص کو آئندہ ہمیشہ یکم ربیع الاوّل ہی کو اپنے اموالِ زکوٰۃ کا حساب لگانا چاہئے، یہ نہ ہو کہ صاحبِ نصاب تو آپ یکم ربیع الاوّل کو بنے اور حساب یکم رمضان المبارک کو لگا رہے ہیں، یہ طریقہ درست نہیں۔

زکوٰۃ کا حساب لگانے میں غلطی

لیکن آج کل لوگ بہت کثرت سے دو غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ بہت سے لوگ حساب لگانے کی تاریخ مقرر کرنے میں غلطی کرتے ہیں، مثلاً صاحب نصاب بننے کی تاریخ یکم ربیع الاوّل تھی، لیکن خود اپنی طرف سے زکوٰۃ کا

حساب کرنے کی تاریخ یکم رمضان مقرر کرلی تو اس کے نتیجے میں سارا حساب خراب ہو جاتا ہے، کیونکہ جب زکوٰۃ فرض ہونے کی تاریخ آپ کی یکم ربیع الاوّل تھی، اس دن تو آپ نے حساب نہیں لگایا، اور پھر ان پیسوں کو خرچ کرتے رہے، یہاں تک کہ یکم رمضان المبارک تک اس میں سے آدھی رقم خرچ ہو گئی، اس وقت آپ زکوٰۃ کا حساب لگانے بیٹھ گئے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدھی رقم کا حساب ہی نہیں ہوا۔

ایک مثال

مثلاً یکم ربیع الاوّل کو آپ کی زکوٰۃ کا سال پورا ہوا، اس وقت آپ کے پاس ایک لاکھ روپے تھے، تو آپ پر ایک لاکھ روپے کی زکوٰۃ ڈھائی ہزار روپے واجب ہو گئی، لیکن آپ نے یکم ربیع الاوّل کو حساب نہیں لگایا، یہاں تک کہ رمضان المبارک آ گیا، اور اس وقت تک اس رقم میں سے پچاس ہزار روپے خرچ کر لئے، اور اب یکم رمضان کو آپ کے پاس صرف پچاس ہزار روپے باقی رہ گئے، اور اس دن آپ نے زکوٰۃ کا حساب لگا کر پچاس ہزار روپے کی زکوٰۃ ساڑھے بارہ سو روپے ادا کر دی، اور اس طرح وہ پچاس ہزار روپے جو آپ نے خرچ کر لئے، نہ تو اس کا حساب لگایا اور نہ اس کی زکوٰۃ ادا کی، حالانکہ ان پچاس ہزار روپے پر بھی زکوٰۃ فرض ہو چکی تھی۔ اور ان پچاس ہزار روپے کا حساب بھی نہیں لگایا، حالانکہ اگر حساب لگایا ہوتا تو پھر اس بات کی توقع تھی کہ چلو ابھی تو زکوٰۃ ادا نہیں کی، لیکن آئندہ کسی وقت اس کی زکوٰۃ ادا کر دے گا، لیکن جب

حساب ہی نہیں لگایا تو اب آئندہ زندگی میں ادائیگی کے ذریعہ اس کی تلافی بھی نہیں ہو پائے گی، یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ جس تاریخ کو آدمی صاحبِ نصاب بنا، اسی تاریخ میں آئندہ ہر سال حساب لگانا ضروری ہے، اس میں غلطی کرنے سے بہت بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔

زکوٰۃ کی رقم کو روک کر رکھنا

بعض حضرات یہ کرتے ہیں کہ حساب تو صحیح تاریخ پر کر لیتے ہیں، مثلاً یکم ربیع الاوّل ہی کو حساب کر لیا اور اپنے پاس لکھ کر رکھ لیا کہ ڈھائی ہزار روپے زکوٰۃ میرے اوپر فرض ہے اور اس رقم کو علیحدہ کر کے رکھ دیا، لیکن اس رقم کو روکے بیٹھے ہیں کہ جب رمضان کا مہینہ آئے گا تو اس وقت دیں گے، کیونکہ رمضان میں اس پر ستر گناہ ثواب ملے گا، اس لئے اس وقت ادا کر دیں گے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں اسی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔

مال زکوٰۃ میں مسکین کا حق متعلق ہو گیا

اس میں پہلی بات یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ مسکین کا حق ہے، جس وقت تم پر زکوٰۃ فرض ہو گئی تو اس کے بعد اس زکوٰۃ کی رقم میں تمہارا حق ہی باقی نہیں رہا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَفِیْٓ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔

(سورۃ الذاریات، آیت ۱۹)

یعنی ان کے مال میں سوالی اور غیر سوالی سب کا حق تھا۔

لہٰذا جب یہ مسکین کا حق ہے تو اب یہ ایک طرح سے تمہارے اوپر قرض اور دین ہے، اس لئے تمہیں چاہئے کہ تم اس کو فوراً صاحب حق تک پہنچاؤ، دیر کرنا ٹھیک نہیں۔

مسکین پر فاقے اور تم پر عیّاشی

دوسری بات یہ ہے کہ تمہیں تو یہ عیّاشی سوج رہی ہے کہ ستر گنا ثواب ملنا چاہئے اور جو مسکین اور مستحق زکوٰۃ ہے، اس کے اوپر فاقے پڑ رہے ہیں، اس کی جان کے لالے پڑ رہے ہیں۔ لہٰذا تم اس کو زکوٰۃ وقت پر پہنچا دو تاکہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔

کمیت اور کیفیت کا فرق

تیسری بات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بیان فرمائی کہ یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے کہ رمضان المبارک میں ستر گنا ثواب ملے گا، یہ گنتی کے حساب سے ہے، لیکن ایک اور چیز ہوتی ہے جس کو "کیفیت" کہا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات کسی چیز کی کمیت اور گنتی تو زیادہ نہیں ہوتی، لیکن اس کی کیفیت اور فائدہ زیادہ ہوتا ہے، آج کل کیفیت کو "کولیٹی"

اور کمیت کو ''کاؤنٹیٹی'' کہا جاتا ہے، مثلاً ایک شخص کے پاس کپڑے کے دس تھان ہیں، لیکن وہ معمولی کپڑا ہے، اور دوسرے شخص کے پاس ایک تھان کپڑا ہے، لیکن وہ مخمل ہے، اب گنتی کے اعتبار سے اگرچہ پہلا شخص افضل ہے، لیکن کیفیت اور کولیٹی کے اعتبار سے دوسرا شخص افضل ہے۔

ایک مثال

دیکھئے: بلّی کے ایک وقت میں بہت بچے ہوتے ہیں، اور شیرنی کا ایک وقت میں ایک بچہ ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ بلّی نے شیرنی سے کہا کہ تو جنگل کی رانی اور ملکہ اور بیٹا تیرا ایک، اور میں تو ہر سال درجنوں بچے پیدا کر دیتی ہوں۔ شیرنی نے جواب دیا: خالہ جان! یہ تمہارے بچے بلّی ہیں، اور میرا بچہ ہے تو ایک، لیکن وہ شیر ہے۔ لہٰذا گنتی تو بلّی کے بچوں کی زیادہ ہے، لیکن کیفیت اور طاقت کے اعتبار سے شیر کا ایک ہی بچہ بلّی کے بہت سے بچوں پر حاوی ہے۔ اس لئے کمیت اور گنتی کے اندر بڑھوتری بسا اوقات اتنا فائدہ نہیں دیتی جتنی کیفیت کے اندر بڑھوتری فائدہ دے جاتی ہے۔ اسی طرح آپ نے رمضان میں زکوٰۃ ادا کرنے کے لئے اس رقم کو روکے رکھا تاکہ ستر گنا ثواب ملے، اور یہ ستر گنا گنتی ہے، لیکن اگر بروقت کسی حاجت مند کی حاجت پوری کر دی اور اس سے اس کو فائدہ پہنچ گیا تو اس میں اگرچہ ثواب کی گنتی شاید کم ہو، لیکن اس ثواب کی کیفیت بہت اعلیٰ اور زیادہ ہو گی۔

محلّے کی مسجد چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنا

پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا، فرمایا کہ محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے پچیس گنا ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے پانچ سو گنا ثواب ملتا ہے۔ لیکن شریعت کا حکم یہ ہے کہ محلّے کی مسجد میں نماز پڑھو، کیونکہ محلّے کی اس مسجد کو آباد کرنا تمہاری ذمہ داری ہے، اس لئے کہ تم اہل محلّہ ہو، اب اگر سارے محلّے کے لوگ پانچ سو کا ثواب حاصل کرنے کے چکر میں جامع مسجد چلے جائیں اور محلّے کی مسجد خالی ہو جائے تو وہ گناہ گار ہوں گے، کیونکہ اہل محلّہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے محلّے کی مسجد آباد کریں۔ تو اگرچہ جامع مسجد میں ثواب کی گنتی زیادہ ہے، لیکن محلّے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے ثواب کی کیفیت زیادہ ہے، اس لئے گنتی کے چکر میں مسنون عبادت کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔

حضرت شیخ الہندؒ کا ایک جملہ

حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے "آپ بیتی" میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا دلچسپ جملہ لکھا ہے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، حالانکہ تمام فقہاء حنفیہ یہ فرماتے ہیں کہ وتر کے بعد دو رکعتیں بھی کھڑے ہو کر پڑھنا ہی افضل ہے، کیونکہ کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب زیادہ ہے اور بیٹھ کر پڑھنے میں آدھا ثواب ہے۔

لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔ فقہاء حنفیہ فرماتے ہیں کہ چونکہ بیٹھ کر پڑھنا جائز تھا، اس لئے جائز ہونے کو بتانے کے لئے آپ ﷺ نے ان دو رکعتوں کو بیٹھ کر پڑھا، لیکن قاعدہ وہی ہے کہ کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب پورا اور بیٹھ کر پڑھنے میں ثواب آدھا ہوگا۔ کسی نے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ حضرت! کتابوں میں تو یوں لکھا ہے کہ کھڑے ہو کر پڑھنے میں ثواب زیادہ ہے، لیکن آپ ہمیشہ بیٹھ کر پڑھتے ہیں؟ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ بات تو ٹھیک ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح پڑھیں، اس طرح پڑھنے میں جی زیادہ لگے، بڑے ثواب کم ہو، یعنی ثواب کی گنتی چاہے کم ہو جائے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح نماز پڑھی، اس طرح پڑھنے میں ثواب کی کیفیت اعلیٰ ہو جاتی ہے۔

اس لئے بہت سی جگہوں پر گنتی نہیں دیکھی جاتی، بلکہ اس کی کیفیت دیکھی جاتی ہے، لہٰذا جب وقت کا تقاضہ کسی عمل کے کرنے کا ہو، اس وقت وہ عمل کر لو، اس عمل کو ستر گنا اضافے کے چکر میں ٹال نادین کی سمجھ کی بات نہیں۔

رمضان تک زندہ رہنے کی گارنٹی ہے؟

پھر تمہارے پاس کونسی گارنٹی لکھی ہوئی ہے کہ تم رمضان تک زندہ رہو گے، کیا معلوم کہ رمضان سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ کے پاس سے بلاوا آجائے، اور اگر یہ خیال ہو کہ ہم زکوٰۃ ادا کرنے کی وصیت کر جائیں گے تو بھائی وصیت کے

بعد بھی کیا بھروسہ ہے کہ وارثین ضرور ادا کریں گے۔ اس لئے رمضان کے انتظار میں کوئی کام مت ٹالو، بلکہ جو وقت کا تقاضہ ہے وہ کر گزرو۔

وقت کے تقاضے پر عمل کرنا دین ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے، یہ دیکھو کہ اس وقت مجھ سے دین کا کیا مطالبہ ہے، وہ کر گزروں۔ مثلاً باپ بیمار ہے اور تمہارے علاوہ دوسرا کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے، اگر تم گھر کو چھوڑ کر پانچ منٹ کے لئے جاؤ گے تو باپ کو تکلیف ہوگی، ایسے وقت ایک دوسرا مطالبہ بھی ہے کہ جب نماز کا وقت آجائے تو آدمی مسجد جا کر جماعت سے نماز ادا کرے، اور جماعت سے نماز پڑھنے کا ستائیس گنا ثواب زیادہ ہے۔ لیکن نماز کے وقت باپ یہ کہہ رہا ہے کہ میری طبیعت خراب ہے، آج تم مسجد نہ جاؤ، گھر پر ہی نماز پڑھ لو۔ تو اب وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ گھر پر ہی نماز پڑھے، باپ کی خدمت کرے، اور جماعت کے ستائیس گنا ثواب کو چھوڑ دے، کیونکہ وقت کا تقاضہ یہی ہے۔

اپنا شوق پورا کرنا دین نہیں

میرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑا خوبصورت جملہ فرمایا کرتے تھے کہ "اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں" مثلاً یہ شوق ہو گیا کہ صف اوّل میں نماز پڑھیں گے، باپ گھر میں مر رہا ہے، اس کو

مر تا ہوا چھوڑ کر اپنا شوق پورا کرنے کے لئے سب سے پہلے مسجد میں صف اوّل میں پہنچ گئے۔ یہ دین نہیں، بلکہ اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ صف اوّل کو چھوڑو اور باپ کی خدمت کرو۔ بہر حال، وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا نام دین ہے، یہ دیکھو کہ اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہو رہا ہے، وہ مطالبہ پورا کرو۔

کیا نیک کام رمضان کے ساتھ خاص ہیں؟

حضرت والا نے اس ملفوظ میں زکوٰۃ سے متعلق ایک اصول بیان فرمایا۔ لیکن یہ بات صرف زکوٰۃ کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہی اصول تمام اعمال کے اندر جاری ہے، ہم لوگ رمضان میں تو اعمال کے اندر تھوڑا بہت اہتمام کرتے ہیں، چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جتنے نیک کام ہیں، سب رمضان کے لئے اٹھا کر رکھ دیے ہیں، نفلیں پڑھیں گے تو رمضان میں، تلاوت کریں گے تو رمضان میں کریں گے، رات کو اٹھیں گے تو رمضان میں اٹھیں گے، اور اشراق اور چاشت کے نوافل پڑھیں گے تو رمضان میں پڑھیں گے، اس طرح ہم نے سارے کام اٹھا کر رمضان کے لئے رکھ دیئے۔ اور ادھر جیسے ہی رمضان ختم ہوا، ادھر سارے اعمال ختم، اب نہ تو تلاوت ہے، نہ ذکر ہے، نہ نوافل ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہے، اور نہ گناہوں سے بچنے کا وہ اہتمام ہے۔ رمضان میں گناہ کرتے ہوئے ذرا شرم آجاتی ہے کہ بھائی! رمضان کا مہینہ ہے، ذرا آنکھ کی حفاظت کرلیں، ذرا کان کی حفاظت کرلیں، ذرا زبان کی حفاظت کرلیں، لیکن رمضان گزرتے ہی گناہوں کی چھٹی مل گئی، اب نہ

گناہوں سے بچنے کا اہتمام ہے اور جو نیک کام رمضان میں شروع کئے تھے، نہ ان کو باقی رکھنے کا اہتمام ہے۔

رمضان ایک تربیتی کورس

اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کو ایک تربیتی کورس بنایا ہے، جب تم اس تربیتی کورس سے گزر گئے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے خاص ملکات مثلاً روزے سے، تراویح سے، اعتکاف سے، ذکر سے، تسبیح اور تلاوت سے تمہارے اندر جو جِلا پیدا فرمادی، اس کو اب برقرار رکھنا تمہارا کام ہے۔ لہٰذا رمضان کے بعد جب تم عام زندگی کے اندر داخل ہو تو اس جذبے کو برقرار رکھنا تمہارا کام ہے۔

دل کو گناہ کے داغ سے بچاؤ

دیکھے ایک سفید کپڑا ہے جو ابھی ابھی دھوبی کے پاس سے دھل کر آیا ہے، اگر اس پر ذرا سا بھی دھبہ لگ جائے گا تو وہ نمایاں ہوگا۔ اسی طرح رمضان کے اندر تمہارا دل گناہوں سے دھل کر بالکل صاف ہوگیا، اب اس دل کو گناہوں سے بچانے کی کوشش کرو، تاکہ اس صاف دل پر گناہوں کا کوئی داغ نہ لگ جائے، **معصیتوں** اور نافرمانیوں کے داغ نہ لگ جائیں، ان سے دل کو بچاؤ۔

رمضان کے بعد تلاوت جاری رکھو

اور رمضان المبارک میں اللہ تعالیٰ نے جن عبادات کی توفیق دی تھی،

اب رمضان کے بعد اس مقدار میں نہ سہی، لیکن اس کا کچھ حصّہ تو باقی رہے۔ رمضان المبارک میں تلاوت کی توفیق ہوگئی تھی، اب اس کی کیا وجہ ہے کہ سارے سال قرآن کریم بند پڑا رہے، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ قرآن کریم رمضان کے لئے رکھا ہوا ہے۔ لہٰذا یہ طے کرلو کہ رمضان کے بعد بھی کوئی دن تلاوت قرآن سے خالی نہیں گزرے گا، ورنہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ رمضان المبارک میں تو خوب تلاوت کرتے رہے ہیں، اس کے بعد اس کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا کہ جب رمضان کا چاند دیکھیں گے تو اس وقت دوبارہ اٹھائیں گے، یہ بڑی محرومی کی بات ہے، لہٰذا قرآن کریم کی روزانہ تلاوت کا معمول بنایا جائے۔

رمضان کے بعد بھی عبادات پر قائم رہو

رمضان المبارک میں الحمدللہ جماعت سے نماز پڑھنے کا اہتمام ہو جاتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب آئندہ سال تک مسجد کی چھٹی ہوگئی، بلکہ یہ کوشش کرو کہ اللہ تعالیٰ نماز باجماعت پڑھنے کی آئندہ بھی توفیق عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے جو فرائض وواجبات ہمارے اور آپ کے ذمے عائد کئے ہیں، وہ ایسے نہیں ہیں کہ جن کا کرنا ہمارے لئے مشکل ہو اور آدمی ان کو ادا نہ کرسکے، اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ فرض ہی کیوں فرماتے۔ لہٰذا جتنے بھی کام ہیں، چاہے وہ فرائض کی ادائیگی ہو یا گناہوں سے بچنا ہو، وہ سب ہماری وسعت اور اختیار میں ہیں، جو کام ہمارے اختیار میں نہیں تھا، اللہ تعالیٰ نے وہ کام فرض ہی

نہیں کیا، بات صرف ہمّت کی ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمّت میں بڑی طاقت رکھی ہے، اس ہمّت کو استعمال کر کے اپنی آئندہ زندگی بھی اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور احکام شریعت کے مطابق گزارو۔

صبح کے وقت اللہ سے معاہدہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم صبح کے وقت بیدار ہو تو نماز فجر پڑھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک معاہدہ کرلو، وہ یہ کہ:

اِنَّ صَلاَ تِی وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○

(سورۃ الانعام، آیت ۱۶۲)

اے اللہ! آج کے دن میں جو کام بھی کروں گا، آپ کی رضا کی خاطر کروں گا، یہاں تک کہ کھانا کھاؤں گا تو آپ کی رضا کی خاطر کھاؤنگا، روزی کماؤں گا تو آپ کی رضا کی خاطر کماؤں گا، گھر میں داخل ہوں گا تو آپ کی رضا کی خاطر داخل ہوں گا، بیوی بچوں سے بات کروں گا تو آپ کی رضا کی خاطر کروں گا، سوؤں گا تو آپ کی رضا کی خاطر سوؤں گا۔ صبح اٹھ کر اللہ تعالیٰ سے یہ معاہدہ کرو، اور اللہ تعالیٰ سے کہو کہ میں اس لئے کھانا کھا رہا ہوں کہ آپ نے میرے اوپر نفس کا حق رکھا ہے، میں اس لئے سو رہا ہوں کہ آپ نے میرے اوپر نفس کا حق رکھا ہے، بیوی بچوں سے اس لئے باتیں کر رہا ہوں کہ آپ نے میرے

ذمے ان کا حق رکھا ہے، روزی اس لئے کما رہا ہوں کہ آپ نے یہ میرے ذمے فرض قرار دیا ہے۔ جب اس نیت سے یہ سب کام کرو گے تو یہ سب عبادت بن جائیں گے۔

معاہدہ کا فائدہ

اور پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! آپ کے ساتھ میں نے جو معاہدہ کیا ہے، آپ کی توفیق کے بغیر اس معاہدے پر قائم نہیں رہ سکتا، اس لئے اس معاہدے کی تکمیل کی توفیق بھی آپ ہی عطا فرمایئے۔ اور اس معاہدہ کرنے اور دعا کرنے کے بعد کارزارِ زندگی میں نکل جاؤ۔ اس معاہدہ کا فائدہ یہ ہوگا کہ جب کسی غلط کام کا داعیہ سامنے آئے گا تو اس وقت دل میں کھٹک پیدا ہوگی کہ میں نے صبح اللہ تعالیٰ سے یہ معاہدہ کیا تھا، کہیں مجھ سے اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ ہو جائے۔

رات کو سوتے وقت جائزہ

پھر رات کو جب سونے لگو تو اس وقت دن بھر کا جائزہ لے لو اور یہ سوچو کہ میں نے صبح کو اللہ تعالیٰ سے یہ معاہدہ کیا تھا، سارے دن کے کام اس معاہدہ کے مطابق ہوئے یا نہیں؟ اگر سب کام اس معاہدے کے مطابق ہوئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کہو "الحمد للہ" اور اگر کسی موقع پر اس معاہدے کی خلاف ورزی ہوئی ہے تو اس پر استغفار کرو اور کہو کہ اے اللہ! میں نے آپ

سے معاہدہ کیا تھا، لیکن مجھ سے غلطی ہوگئی اور میں بہک گیا اور فلاں موقع پر میرا قدم ڈگمگا گیا، فلاں جگہ میری آنکھ بہک گئی، فلاں موقع پر زبان بہک گئی۔

اَللّٰھم انی استغفرك واتوب اليك۔ اَللّٰھم اِنی استغفرك وأتوب اليك۔ استغفر اللّٰه العلى العظيم۔

چند بار دل سے استغفار کرلو اور یہ عمل کر کے پھر سو جاؤ۔ اور روزانہ صبح وشام یہ عمل کرو، صبح اٹھ کر اللہ تعالیٰ سے معاہدہ کرو اور رات کو سوتے وقت دن بھر کے اعمال کا جائزہ لے لو، انشاء اللہ رفتہ رفتہ سب گناہ چھوٹ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۳

مجاہدہ کی حقیقت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۳

صفحات : ۲۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مجلس نمبر ۲۳

مجاہدہ کی حقیقت

الحمد لله ربّ العالمين، والعاقبة للمتقين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم، وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين، امابعد!

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

مجاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ معاصی کو تو مطلقاً ترک

کرے اور یہ نفس کی مخالفت واجب ہے، اور مباحات میں تقلیلاً مخالفت کرے اور یہ مخالفت مستحب ہے، مگر ایسا مستحب ہے کہ مخالفت واجبہ کا حصول کاملہ اس مخالفت مستحبہ پر موقوف ہے، جیسے بہت سونا، بہت کھانا، بہت عمدہ کپڑے پہننا، بہت باتیں کرنا، لوگوں سے زیادہ ملنا ملانا، سوان میں تقلیل کرے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۲۔۱۳)

حضرت والا نے ان مختصر لفظوں میں "مجاہدہ" کی حقیقت بھی بیان فرمادی اور اس کے درجات بھی بیان فرمادیئے کہ کونسا مجاہدہ واجب ہے؟ اور کونسا مجاہدہ مستحب ہے؟ اور کس حد تک مستحب ہے؟

مجاہدہ کا مفہوم

اس کی تفصیل یہ ہے کہ "مجاہدہ" کے عرفی معنی ہیں "نفس کے تقاضوں کی مخالفت کرنا" جس کام کو انسان کا نفس چاہ رہا ہو، دل میں خواہش ابھر رہی ہو کہ یہ کام کروں، نفس کی اس خواہش کو کچل کر اور اس کے چاہنے کو چھوڑ کر نفس کو اس کام سے باز رکھنا یہ "مجاہدہ" ہے۔ خواہشات نفس کی مخالفت ہی کو صوفیاء کرام "مجاہدہ" کہتے ہیں۔ اور یہ لفظ "مجاہدہ" قرآن کریم سے ماخوذ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

جو لوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کریں گے ہم ان کو
اپنے راستے کی ضرور ہدایت دیں گے۔

عربی زبان میں لفظ ''مجاہدہ'' کے معنی ہیں، محنت کرنا، کوشش کرنا، اسی مفہوم کا اطلاق صوفیاء کرام کی مروّجہ اصطلاح میں اس کوشش اور جدوجہد پر کیا جاتا ہے جو نفس کی خلاف ورزی میں کی جاتی ہے۔ البتہ مختصر طور پر اسے صرف مخالفت نفس سے تعبیر کرلیا جاتا ہے۔

مجاہدہ واجبہ

نفس کے تقاضوں کی خلاف ورزی بعض حالات میں واجب ہے اور بعض حالات میں مستحب ہے۔ یعنی اگر نفس کسی گناہ کی طرف بلا رہا ہے اور کس گناہ کا تقاضہ دل میں پیدا کر رہا ہے، تو اس تقاضے کی مخالفت کر کے اس کو کچلنا اور مجاہدہ کرنا یہ واجب ہے۔ مثلاً فرض کریں کہ دل میں یہ شدید تقاضہ پیدا ہوا کہ یہ نگاہ کسی نامحرم کو دیکھ کر اس سے لذّت حاصل کرے، اس سے مزہ لے، اب اس تقاضے اور داعیے کی مخالفت کرنا اور اس تقاضے کو کچلنا واجب ہے، اور اس تقاضے پر عمل کرلینا اور اس تقاضے کے آگے ہتھیار ڈالدینا جائز نہیں۔

یا مثلاً دل میں تقاضہ پیدا ہوا کہ میں فلاں کی غیبت کروں، مجلس جمی ہوئی ہے اور دوسروں کا تذکرہ کرتے ہوئے مزہ آرہا ہے، گفتگو چل رہی ہے، اب دل میں تقاضہ پیدا ہو رہا ہے کہ میں فلاں کی غیبت کروں، یہاں

اس تقاضے کی مخالفت کرنا واجب ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں انسان کا نفس کسی گناہ پر آمادہ کر رہا ہو، اس وقت اس کی مخالفت کرنا اور مجاہدہ کرنا فرض ہے۔

مجاہدہ مستحبہ

لیکن اگر نفس کسی ایسی چیز کا تقاضہ پیدا کر رہا ہے جو گناہ اور حرام نہیں ہے، ناجائز نہیں ہے، بلکہ وہ مباح ہے، لیکن وہ مباح ایسا ہے کہ اس کے بارے میں بزرگوں کا تجربہ یہ ہے کہ وہ مباح انسان کو رفتہ رفتہ گناہ کی طرف کھینچ کر لے جاتا ہے، ایسے تقاضے کی بھی مخالفت کرنی چاہئے۔ البتہ ایسے موقع پر نفس کی مخالفت کرنا واجب تو نہیں ہے لیکن مستحب ضرور ہے، محض اس لئے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ تقاضہ رفتہ رفتہ کسی گناہ کے اندر مبتلا کر دے۔

اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اللہ جلّ جلالہ تک پہنچنا "مجاہدہ" کے بغیر نہیں ہو سکتا، مجاہدہ تو کرنا پڑے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے کی ہدایت کو "مجاہدہ" پر موقوف کیا ہے، جب مجاہدہ کرو گے تو ہم تمہیں راستہ کی ہدایت دیں گے، مجاہدہ کے بغیر وصول نہیں ہو سکتا۔

اپنے نفس کو چھوڑ دو

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ انہوں نے خواب میں اللہ جل شانہ کی زیارت کی۔ بیداری کے عالم میں رہتے ہوئے اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنا ممکن نہیں، البتہ خواب میں اللہ تعالیٰ زیارت کرا دیتے ہیں، کس طرح کراتے ہیں؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی جانے، ہمیں کیا معلوم۔ بہر حال! اس زیارت کے موقع پر حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ:

كَيْفَ السَّبِيْلُ إِلَيْكَ ؟

یا اللہ! آپ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا:

اُتْرُكْ نَفْسَكَ وَتَعَال

اپنے نفس کو چھوڑ دو اور ہمارے پاس چلے آؤ۔

یعنی اپنے نفس کی مخالفت کرو اور اس کے تقاضوں کو دباؤ، جب یہ عمل کرو گے تو ہم تک پہنچ جاؤ گے۔

اصلی مجاہد

حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

المجاهد من جاهد نفسه

(ترمذی، فضائل الجهاد، باب ماجاء فی فضل من مات مرابطاً، حدیث نمبر ۱۶۲۱)

فرمایا کہ اصل "مجاہد" وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے، لڑائی کے میدان میں دشمن سے لڑنا بھی "جہاد" ہے، لیکن اصلی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے اس طرح جہاد کرے کہ نفس کی خواہشات، نفس کی آرزوئیں، نفس کے تقاضے ایک طرف بلا رہے ہیں اور انسان نفس کے ان تقاضوں اور آرزوؤں کو پامال کر کے دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے تو اس کا نام "مجاہدہ" ہے۔ لہٰذا جو شخص بھی اپنی اصلاح کی طرف قدم بڑھانا چاہے اور اللہ جل شانہ کی طرف قدم بڑھانا چاہے تو اس کو "مجاہدہ" کرنا ہی پڑتا ہے۔ یعنی اپنے نفس کی مخالفت کرنا اور نفسانی خواہشات کے خلاف زبردستی کر کے محنت کر کے کوشش کر کے کڑوا گھونٹ پی کر عمل کرنا، اور کسی طرح اپنے نفس کی خواہشات کو دبا کر اور کچل کر اس کی خلاف ورزی کرنا، اس کا نام "مجاہدہ" ہے۔

انسان کا نفس لذّتوں کا خوگر ہے

ہمارا اور آپ کا نفس یعنی وہ قوت جو انسان کو کسی کام کے کرنے کی طرف ابھارتی ہے، وہ نفس دنیاوی لذّتوں کا عادی بنا ہوا ہے، لہٰذا جس کام میں اس کو ظاہری لذّت اور مزہ آتا ہے اس کی طرف یہ دوڑتا ہے، یہ اس کی جبلّت اور خصلت ہے کہ ایسے کاموں کی طرف انسان کو مائل کرے، یہ

انسان سے کہتا ہے کہ یہ کام کرلو تو مزہ آجائے گا، یہ کام کرلو تو لذّت حاصل ہو جائے گی، لہٰذا یہ نفس انسان کے دل میں خواہشات کے تقاضے پیدا کرتا رہتا ہے، اب اگر انسان اپنے نفس کو بے لگام اور بے مہار چھوڑ دے اور جو بھی لذّت کے حصول کا تقاضہ پیدا ہو، اس پر عمل کرتا جائے، اور نفس کی ہر بات مانتا جائے، تو اس کے نتیجے میں پھر وہ انسان انسان نہیں رہتا بلکہ جانور بن جاتا ہے۔

خواہشات نفسانی میں سکون نہیں

نفسانی خواہشات کا اصول یہ ہے کہ اگر ان کی پیروی کرتے جاؤ گے اور ان کے پیچھے چلتے جاؤ گے اور اس کی باتیں مانتے جاؤ گے، تو پھر کسی حد پر جاکر قرار نہیں آئے گا، انسان کا نفس کبھی یہ نہیں کہے گا کہ اب ساری خواہشات پوری ہو گئیں، اب مجھے کچھ نہیں چاہئے، یہ کبھی زندگی بھر نہیں ہوگا، اس لئے کہ کسی انسان کی ساری خواہشات اس زندگی میں پوری نہیں ہو سکتیں، اور اس کے ذریعہ کبھی قرار اور سکون نصیب نہیں ہوگا، یہ اصول کہ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں نفس کے ہر تقاضے پر عمل کرتا جاؤں اور ہر خواہش پوری کرتا جاؤں تو کبھی اس شخص کو قرار نہیں آئے گا، کیوں؟ اس لئے کہ اس نفس کی خاصیت یہ ہے کہ ایک لطف اٹھانے کے بعد اور ایک مرتبہ لذّت حاصل کرلینے کے بعد یہ فوراً دوسری لذّت کی طرف بڑھتا ہے، لہٰذا اگر تم چاہتے ہو کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے چل چل کر

سکون حاصل کرلو، تو ساری عمر کبھی سکون نہیں ملے گا، تجربہ کر کے دیکھ لو۔

یہ پیاس بجھنے والی نہیں

آپ نے ایک بیماری کا نام سنا ہو گا جس کو "جوع البقر" کہتے ہیں، اس بیماری کی خاصیت یہ ہے کہ انسان کو بھوک لگتی رہتی ہے، جو دل چاہے کھالے، جتنا چاہے کھالے، مگر بھوک نہیں مٹتی۔ اسی طرح ایک اور بیماری ہے جس کو "استسقاء" کہا جاتا ہے، اس بیماری میں انسان کو پیاس لگتی رہتی ہے، گھڑے کے گھڑے پی جائے، کنویں بھی ختم کر جائے، مگر پیاس نہیں بجھتی۔ یہی حال انسان کی خواہشات کا ہے، اگر ان کو قابو نہ کیا جائے اور ان پر کنٹرول نہ کیا جائے، اور جب تک ان کو شریعت اور اخلاق کے بندھن میں نہ باندھا جائے، اس وقت تک اس کو "استسقاء" کی بیماری کی طرح لطف ولذّت کے کسی بھی مرحلے پر جا کر قرار نصیب نہیں ہوتا، بلکہ لذت کی وہ ہوس بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

تھوڑی سی مشقّت برداشت کرلو

اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نفسانی خواہشات کے پیچھے مت چلو، ان کا اتباع مت کرو، اس لئے کہ یہ تمہیں ہلاکت کے گڑھے میں لے جا کر ڈال دیں گی، بلکہ ان کو ذرا قابو

میں رکھو، اور ان کو کنٹرول کر کے شریعت کی معقول حدود کے اندر رکھو، اگر تم ان کو قابو میں رکھنا چاہو گے تو شروع شروع میں یہ نفس تمہیں ذرا تنگ کرے گا، تکلیف ہوگی، صدمہ ہوگا، دکھ ہوگا، ایک کام کو دل چاہ رہا ہے مگر اس کو روک رہے ہیں، دل چاہ رہا ہے کہ ٹی وی دیکھیں اور اس میں جو خراب خراب فلمیں آرہی ہیں وہ دیکھیں، یہ نفس کا تقاضہ ہو رہا ہے، اب جو آدمی اس کا عادی ہے اس سے کہو کہ اس کو مت دیکھ، اور اس نفسانی تقاضہ پر عمل نہ کر، اگر وہ نہیں دیکھے گا اور آنکھ کو اس سے روکے گا، تو شروع میں اس کو دقت ہوگی اور مشقت ہوگی، برا لگے گا، اس لئے کہ وہ دیکھنے کا عادی ہے، اس کو دیکھے بغیر چین نہیں آتا، لطف نہیں آتا۔

یہ نفس کمزور پر شیر ہے

لیکن ساتھ میں اللہ تعالیٰ نے اس نفس کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اگر کوئی شخص اس مشقت اور تکلیف کے باوجود ایک مرتبہ ڈٹ جائے کہ چاہے مشقت ہو یا تکلیف ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، تب بھی یہ کام نہیں کروں گا، جس دن یہ شخص نفس کے سامنے اس طرح ڈٹ گیا، بس اس دن سے یہ نفسانی خواہش خود بخود ڈھیلی پڑنی شروع ہو جائے گی، یہ نفس اور شیطان کمزور کے اوپر شیر ہیں، جو اس کے سامنے بھیگی بلی بنا رہے اور اس کے تقاضوں پر چلتا رہے، اس کے اوپر یہ چھا جاتا ہے اور غالب آجاتا ہے، اور جو شخص ایک مرتبہ پختہ ارادہ کر کے اس کے سامنے ڈٹ گیا کہ میں یہ

کام نہیں کروں گا، چاہے کتنا تقاضہ ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، پھر یہ نفس ڈھیلا پڑ جاتا ہے، اور اس کام کے نہ کرنے پر پہلے دن جتنی تکلیف ہوئی تھی، دوسرے دن اس سے کم ہوگی، اور تیسرے دن اس سے کم، اور ہوتے ہوتے وہ تکلیف ایک دن بالکل رفع ہو جائے گی اور نفس اس کا عادی بن جائے گا۔

نفس دودھ پیتے بچے کی طرح

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت بڑے بزرگ گزرے ہیں، جن کا "قصیدہ بردہ" بہت مشہور ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں ایک نعتیہ قصیدہ ہے، اس میں انہوں نے ایک عجیب و غریب حکیمانہ شعر کہا ہے۔

النفس کا لطفل ان تھملہ شبّ علی
حب الرضاع و ان تفطمہ ینفطم

یہ انسان کا نفس ایک چھوٹے بچے کی طرح ہے جو ماں کا دودھ پیتا ہے، اور وہ بچہ دودھ پینے کا عادی بن گیا، اب اگر اس سے دودھ چھڑانے کی کوشش کرو تو وہ بچہ کیا کرے گا؟ روئے گا، چلائے گا، شور کرے گا۔ اب اگر ماں باپ یہ سوچیں کہ دودھ چھڑانے سے بچے کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے، چلو چھوڑو، اسے دودھ پینے دو، اور وہ دودھ پیتا رہے۔ تو علامہ بوصیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر بچے کو اس طرح دودھ پینے کی حالت میں چھوڑ دیا تو نتیجہ

یہ ہوگا کہ وہ جوان ہو جائے گا اور اس سے دودھ نہیں چھوٹ پائے گا۔ اس لئے کہ تم اس کی تکلیف، اس کی فریاد اور اس کی چیخ و پکار سے ڈر گئے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سے دودھ نہیں چھڑا سکے، اب اگر اس کے سامنے روٹی لاتے ہیں، تو وہ کہتا ہے کہ میں تو نہیں کھاؤں گا، میں تو دودھ ہی پیؤں گا۔ لیکن دنیا میں کوئی ماں باپ ایسے نہیں ہوں گے جو یہ کہیں کہ چونکہ بچے کو دودھ چھڑانے سے تکلیف ہو رہی ہے، اس لئے دودھ نہیں چھڑاتے۔ ماں باپ جانتے ہیں کہ دودھ چھڑانے سے روئے گا، چلائے گا، رات کو نیند نہیں آئے گی، خود بھی جاگے گا، ہمیں بھی جگائے گا، لیکن پھر بھی دودھ چھڑاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ بچے کی بھلائی اسی میں ہے، اگر آج اس کو دودھ نہ چھڑایا گیا تو ساری عمر یہ کبھی روٹی کھانے کے لائق نہیں ہوگا۔

اس کو گناہوں کی چاٹ لگی ہوئی ہے

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ انسان کا نفس بھی بچے کی مانند ہے، اس کے منہ کو گناہ لگے ہوئے ہیں، گناہوں کا ذائقہ اور اس کی چاٹ لگی ہوئی ہے، اگر تم نے اس کو ایسے ہی چھوڑ دیا کہ چلو کرنے دو، گناہ چھڑانے سے تکلیف ہوگی، نظر غلط جگہ پر پڑتی ہے اور اس کو ہٹانے میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، زبان کو جھوٹ بولنے کی عادت پڑ گئی ہے، اگر جھوٹ بولنا چھوڑیں گے تو بڑی تکلیف ہوگی۔ اور اس زبان کو مجلسوں کے اندر بیٹھ کر غیبت کرنے کی عادت پڑ گئی ہے، اگر اس کو روکیں گے تو بڑی دقت ہوگی۔

نفس اِن باتوں کا عادی بن گیا ہے، رشوت لینے کی عادت پڑ گئی ہے، اللہ بچائے سود کھانے کی عادت پڑ گئی۔ اور بہت سے گناہوں کی عادت پڑ گئی ہے، اور اب ان عادتوں کو چھڑانے سے نفس کو تکلیف ہو رہی ہے، اگر نفس کی اس تکلیف سے گھبرا کر اور ڈر کر بیٹھ گئے، تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ساری عمر نہ کبھی گناہ چھوٹیں گے اور نہ قرار ملے گا۔

سکون اللہ کے ذکر میں ہے

یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں قرار اور سکون نہیں ہے، ساری دنیا کے اسباب و وسائل جمع کر لئے، لیکن اس کے باوجود سکون نصیب نہیں، چین نہیں ملتا۔ مغربی معاشرے میں پیسے کی ریل پیل، تعلیم کا معیار بلند، لذت حاصل کرنے کے سارے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے ہیں کہ جس طرح چاہو لذت حاصل کرلو، لیکن اس کے باوجود یہ حال ہے کہ خواب آور گولیاں کھا کھا کر اس کی مدد سے سو رہے ہیں۔ کیوں؟ دل میں سکون و قرار نہیں، سکون کیوں نہیں ملا؟ اس لئے کہ گناہوں میں سکون کہاں تلاش کرتے پھر رہے ہو۔ یاد رکھو! ان گناہوں اور نافرمانیوں اور معصیتوں میں سکون نہیں، سکون تو صرف ایک چیز میں ہے، اور وہ ہے:

اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

اللہ کی یاد میں اطمینان اور سکون ہے۔

(سورۃ الرعد، آیت ۲۰)

اس واسطے یہ سمجھنا دھوکہ ہے کہ نافرمانیاں کرتے جائیں گے اور سکون ملتا جائے گا۔ یاد رکھو! زندگی بھر نہیں ملے گا، اس دنیا سے تڑپ تڑپ کر جاؤ گے، اگر نافرمانیوں کو نہ چھوڑا تو سکون کی منزل حاصل نہ ہوگی۔

سکون اللہ تعالیٰ انہیں لوگوں کو دیتے ہیں جن کے دل میں اس کی محبّت ہو، جن کے دل میں اس کی یاد ہو، جن کا دل ان کے ذکر سے آباد ہو۔ ان کے سکون اور اطمینان کو دیکھو کہ ظاہری طور پر پریشان حال بھی ہیں، فقر و فاقے بھی گزر رہے ہیں، لیکن دل کو سکون اور قرار کی نعمت میسّر ہے، لہٰذا اگر دنیا کا بھی سکون حاصل کرنا چاہتے ہو تو ان نافرمانیوں اور گناہوں کو تو چھوڑنا پڑے گا، اور گناہوں کو چھوڑنے کے لئے ذرا سا مجاہدہ کرنا پڑے گا، نفس کے مقابلے میں ذرا سا ڈٹنا پڑے گا۔

اللہ کا وعدہ جھوٹا نہیں ہو سکتا

اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ بھی فرمالیا کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

جو لوگ ہمارے راستے میں یہ مجاہدہ اور محنت کرتے ہیں کہ ماحول کا، معاشرے کا، نفس کا، شیطان کا اور خواہشات کا تقاضہ چھوڑ کر وہ ہمارے حکم پر چلنا چاہتے ہیں، تو ہم کیا کرتے ہیں:

لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس کا ترجمہ فرماتے ہیں کہ "ہم ان کے

ہاتھ پکڑ کر لے چلیں گے" یہ نہیں کہ دور سے دکھادیا کہ یہ راستہ ہے، بلکہ فرمایا کہ ہم اس کا ہاتھ پکڑ کر لے جائیں گے۔ لیکن ذرا کوئی قدم تو بڑھائے، ذرا کوئی ارادہ تو کرے، ذرا کوئی اپنے اس نفس کے مقابلے میں ایک مرتبہ ڈٹے تو سہی، پھر اللہ تعالیٰ کی مدد آتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، جو کبھی جھوٹا نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا "مجاہدہ" اسی کا نام ہے کہ ایک مرتبہ آدمی ڈٹ کر ارادہ کرلے کہ یہ کام نہیں کروں گا، دل پر آرے چل جائیں گے، خواہشات پامال ہو جائیں گی، دل و دماغ پر قیامت گزر جائے گی، لیکن یہ گناہ کا کام نہیں کروں گا، جس دن نفس کے سامنے ڈٹ گیا، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس دن سے ہمارا محبوب ہو گیا، اب ہم خود اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے جائیں گے۔

اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے

اس لئے اصلاح کے راستے میں سب سے پہلا قدم "مجاہدہ" ہے، اس کا عزم کرنا ہوگا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئیؒ صاحب قدس اللہ سرہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؎

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں پامال ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے

جو آرزوئیں دل میں پیدا ہو رہی ہیں، وہ چاہے برباد ہو جائیں، چاہے

ان کا خون ہو جائے، اب میں نے تو ارادہ کرلیا ہے کہ اب تو اس کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے، اب اس دل میں اللہ جل جلالہ کے انوار کا نزول ہو گا، اب اس دل میں اللہ تعالیٰ کی محبّت جاگزیں ہو گی، اب یہ گناہ نہیں ہوں گے۔ پھر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کیسی رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اور آدمی اس راہ پر چل پڑتا ہے۔

یاد رکھو! شروع شروع میں تو یہ کام کرنے میں بڑی دقت ہوتی ہے کہ دل تو کچھ چاہ رہا ہے، اور اللہ کی خاطر اس کام کو چھوڑتے ہیں، اس میں بڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن بعد میں اس تکلیف میں ہی مزہ آنے لگتا ہے اور لطف آنے لگتا ہے، جب یہ خیال آتا ہے کہ میں نفس کو جو کچل رہا ہوں اور آرزوؤں کا جو خون کر رہا ہوں، یہ اپنے مالک اور خالق کی خاطر کر رہا ہوں، اس میں جو مزہ اور کیف ہے آپ ابھی اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

ماں یہ تکلیف کیوں برداشت کرتی ہے؟

ماں کو دیکھئے! اس کی کیا حالت ہوتی ہے کہ سخت سردی کا عالم ہے، اور کڑکڑاتے جاڑے کی رات ہے، لحاف میں لیٹی ہوئی ہے، اور بچہ پاس پڑا ہے، اس حالت میں اس بچے نے پیشاب کر دیا، اب نفس کا تقاضہ تو یہ ہے کہ یہ گرم گرم بستر چھوڑ کر کہاں جاؤں، یہ تو جاڑے کا موسم ہے، گرم گرم بستر چھوڑ کر جانا تو بڑا مشکل کام ہے، لیکن ماں یہ سوچتی ہے کہ اگر میں نہ گئی تو بچہ گیلا پڑا رہے گا، اس کے کپڑے گیلے ہیں، اس طرح گیلا پڑ رہے گا تو

کہیں اس کو بخار نہ ہو جائے، اس کی طبیعت خراب نہ ہو جائے۔ وہ بے چاری اپنے نفس کا تقاضہ چھوڑ کر سخت کڑا کے کے جاڑے میں باہر جاکر ٹھنڈے پانی سے اس کے کپڑے دھو رہی ہے، اور اس کے کپڑے بدل رہی ہے، یہ کوئی معمولی مشقت ہے؟ معمولی تکلیف ہے؟ لیکن ماں یہ تکلیف برداشت کر رہی ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اپنے بچے کی فلاح اور اس کی صحت ماں کے پیش نظر ہے، اس لئے وہ اس سخت جاڑے میں اپنے نفس کے تقاضے کو پامال کرکے یہ سارے کام کر رہی ہے۔

محبّت تکلیف کو ختم کر دیتی ہے

ایک عورت کا کوئی بچہ نہیں ہے، کوئی اولاد نہیں ہے، وہ کہتی ہے بھائی کسی طرح میرا علاج کراؤ تاکہ بچہ ہو جائے اور اولاد ہو جائے، اور اس کے لئے دعائیں کراتی پھر رہی ہے کہ دعا کرو اللہ میاں سے مجھے اولاد دے دے، اور اس کے لئے تعویذ گنڈے اور خدا جانے کیا کیا کراتی پھر رہی ہے، ایک دوسری عورت اس سے کہتی ہے کہ ارے! تو کس چکر میں پڑی ہے؟ بچہ پیدا ہوگا تو تجھے بہت سی مشقتیں اٹھانی پڑیں گی، جاڑے کی راتوں میں اٹھ کر ٹھنڈے پانی سے کپڑے دھونے ہوں گے، تو وہ عورت جواب دیتی ہے کہ میرے ایک بچے پر ہزار جاڑوں کی راتیں قربان ہیں، اس لئے کہ اس بچے کی قدر و قیمت اور اس کے دولت ہونے کا احساس اس کے دل میں ہے، اس واسطے اس ماں کے لئے ساری تکلیفیں راحت بن گئیں۔ وہ ماں جو اللہ

سے مانگ رہی ہے کہ یا اللہ! مجھے اولاد دے دے، اس کے معنی یہ ہیں کہ اولاد کی جتنی ذمہ داریاں ہیں، جتنی تکلیفیں ہیں، وہ دے دے، لیکن وہ تکلیفیں اس کی نظر میں تکلیفیں ہی نہیں بلکہ وہ راحت ہیں، اب جو ماں جاڑے کی رات میں اٹھ کر کپڑے دھو رہی ہے، اس کو طبعی طور پر تکلیف تو ضرور ہو رہی ہے، لیکن عقلی طور پر اسے اطمینان ہے کہ میں یہ کام اپنے بچے کی بھلائی کی خاطر کر رہی ہوں، جب یہ اطمینان ہوتا ہے تو اس وقت اسے اپنی آرزوؤں کو کچلنے میں بھی لطف آنے لگتا ہے۔

اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح فرماتے ہیں:

از محبت تلخہا شیریں شود

کہ جب محبت پیدا ہو جاتی ہے تو کڑوی سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی معلوم ہونے لگتی ہیں، جن کاموں میں تکلیف ہو رہی تھی، محبّت کی خاطر ان میں بھی مزہ آنے لگتا ہے، لطف آنے لگتا ہے کہ میں یہ کام محبّت کی وجہ سے کر رہا ہوں، محبّت کی خاطر کر رہا ہوں۔

مولیٰ کی محبّت لیلیٰ سے کم نہ ہو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں محبّت کی بڑی عجیب حکایتیں لکھی ہیں۔ لیلیٰ مجنون کا قصّہ لکھا ہے کہ مجنون لیلیٰ کی خاطر کس طرح دیوانہ بنا اور کیا کیا مشقتیں اٹھائیں، دودھ کی نہر نکالنے کے ارادہ سے چل کھڑا ہوا اور کام شروع بھی کر دیا، یہ ساری مشقتیں اٹھا رہا ہے، کوئی اس سے کہے کہ

تو یہ جو کام کر رہا ہے، یہ بڑی مشقت کا کام ہے، اسے چھوڑ دے، تو وہ کہتا ہے کہ ہزار مشقتیں قربان، جس کی خاطر یہ کام کر رہا ہوں اس کی محبت میں کر رہا ہوں، مجھے تو اسی نہر کھودنے میں مزہ آرہا ہے، اس لئے کہ یہ میں اپنی محبوب کی خاطر کر رہا ہوں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود
گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود

مولیٰ کا عشق حقیقی کب لیلیٰ کے عشق سے کم ہو سکتا ہے، مولیٰ کے لئے گیند بن جانا زیادہ اولیٰ ہے۔ لہٰذا جب آدمی محبّت کی خاطر یہ تکلیفیں اٹھاتا ہے تو پھر بڑا لطف آنے لگتا ہے۔

تنخواہ سے محبّت ہے

ایک آدمی ملازمت کرتا ہے، جس کے لئے صبح سویرے اٹھنا پڑتا ہے، اچھی خاصی سردی میں بستر پر لیٹا ہوا ہے اور جانے کا وقت آگیا تو بستر چھوڑ کر جا رہا ہے، نفس کا تقاضہ تو یہ تھا کہ گرم گرم بستر میں پڑا رہتا، لیکن گھر چھوڑ کر اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر جا رہا ہے، اور سارا دن محنت کی چکی پینے کے بعد رات کو کسی وقت گھر واپس آتا ہے۔ اور بیشمار لوگ ایسے بھی ہیں جو صبح اپنے بچوں کو سوتا ہوا چھوڑ کر جاتے ہیں اور رات کو واپس آکر سوتا ہوا پاتے ہیں، غرض وہ شخص یہ سب تکلیفیں برداشت کر رہا ہے، اب اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ ارے بھائی! تم ملازمت میں بہت تکلیف اٹھا

رہے ہو، چلو میں تمہاری ملازمت چھڑادیتا ہوں۔ وہ جواب دے گا: نہیں بھائی نہیں، بڑی مشکل سے تو یہ ملازمت لگی ہے، اس کو مت چھڑوانا۔ اس کو صبح سویرے اٹھ کر جانے میں ہی مزہ آرہاہے، اور اولاد کو بیوی کو چھوڑ کر جانے میں بھی مزہ آرہاہے، کیوں؟ اس لئے کہ اس کو اس تنخواہ سے محبت ہے جو مہینے کے آخر میں ملنے والی ہے، اس محبت کے نتیجے میں یہ ساری تکلیفیں شیریں بن گئیں، اب اگر کسی وقت ملازمت چھوٹ گئی تو روتا پھر رہا ہے کہ ہائے وہ دن کہاں گئے جب صبح سویرے اٹھ کر جایا کرتا تھا، اور لوگوں سے سفارشیں کراتا پھر رہاہے کہ مجھے ملازمت پر دوبارہ بحال کر دیا جائے۔ اگر محبّت کسی چیز سے ہو جائے تو اس راستے کی ساری تکلیفیں آسان اور مزے دار ہو جاتی ہیں، اسی میں لطف آنے لگتا ہے۔

اسی طرح گناہوں کو چھوڑنے میں تکلیف ضرور ہے، شروع میں مشقّت ہوگی، لیکن جب ایک مرتبہ ڈٹ گئے اور شریعت کے مطابق عمل شروع کر دیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد بھی ہوگی، اور پھر انشاء اللہ تعالیٰ اس تکلیف میں مزہ آنے لگے گا، اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مزہ آنے لگے گا۔

عبادت کی لذّت سے آشنا کردو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ نے ایک مرتبہ بڑی عجیب و غریب بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ انسان کے اس نفس کو لذت اور مزہ چاہئے، اس کی خوراک لذت اور مزہ ہے، لیکن لذت اور مزے کی

کوئی خاص شکل اس کو مطلوب نہیں کہ فلاں قسم کا مزہ چاہئے اور فلاں قسم کا نہیں چاہئے، بس اس کو تو مزہ چاہئے، اب تم نے اس کو خراب قسم کے مزے کا عادی بنا دیا ہے، خراب قسم کی لذتوں کا عادی بنا دیا ہے، ایک مرتبہ اس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور عبادت کی لذت سے آشنا کردو، اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی گزارنے کی لذت سے آشنا کردو، پھر یہ نفس اسی میں لذت اور مزہ لینے لگے گا۔

مجھے تو دن رات بے خودی چاہئے

غالب کا ایک مشہور شعر ہے، خدا جانے لوگ اس کا کیا مطلب لیتے ہوں گے، لیکن ہمارے حضرتؒ نے اس کا بڑا اچھا مطلب نکالا ہے، وہ شعر ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

شراب سے مجھ کو کوئی تعلق نہیں، مجھے تو دن رات لذت کی بے خودی چاہئے، تم نے مجھے شراب کا عادی بنا دیا تو مجھے شراب میں بے خودی حاصل ہوگئی، شراب میں لذت آنے لگی، اگر تم مجھے اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے ذکر اور اس کی اطاعت کا عادی بنا دیتے تو یہ بے خودی مجھے اللہ کے ذکر میں حاصل ہو جاتی، میں تو اسی میں خوش ہو جاتا، لیکن یہ تمہاری غلطی ہے کہ تم نے مجھے ان چیزوں کے بجائے شراب کا عادی بنا دیا۔

نفس کو کچلنے میں مزہ آئے گا

اسی طرح یہ مجاہدہ شروع میں تو بڑا مشکل لگتا ہے کہ بڑا کٹھن سبق دیا جارہا ہے کہ اپنے نفس کی مخالفت کرو، اپنے نفس کی خواہشات کی خلاف ورزی کرو۔ نفس تو چاہ رہا ہے کہ غیبت کروں، مجلس میں غیبت کرنے کا موضوع چھڑ گیا، اب جی چاہ رہا ہے کہ اس میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لوں، اب اس وقت اس کو لگام دینا کہ نہیں، یہ کام مت کرو، یہ بڑا مشکل کام لگتا ہے۔ لیکن یاد رکھئے کہ دور دور سے یہ مشکل نظر آتا ہے، جب آدمی نے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ یہ کام نہیں کروں گا، تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے اور فضل و کرم سے مدد بھی ہوگی، اور پھر تم نے اس آرزو اور خواہش کو جو کچلا ہے، اس کچلنے میں جو مزہ آئے گا، انشاء اللہ ثم انشاء اللہ اس کی حلاوت اس غیبت کی لذت سے کہیں زیادہ ہوگی۔

ایمان کی حلاوت حاصل کرلو

حدیث میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص کے دل میں تقاضہ پیدا ہوا کہ نگاہ غلط جگہ پر ڈالوں، اور کون شخص ہے جس کے دل میں یہ تقاضہ نہیں ہوتا، اب دل بڑا کسمسا رہا ہے کہ اس کو دیکھ ہی لوں، لیکن آپ نے اللہ تعالیٰ کے ڈر اور خشیت کے خیال سے نظر کو بچالیا اور نگاہ نہیں ڈالی، بڑی تکلیف ہوئی، دل پر آرے چل گئے، لیکن

اسی تکلیف کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ایمان کی ایسی حلاوت عطا فرمائیں گے کہ اس کے آگے دیکھنے کی لذت ہیچ ہے۔ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا وعدہ ہے اور حدیث میں موجود ہے۔

(مسند احمد، جلد ۵ ص ۲۶۴)

یہ وعدہ صرف نگاہ کے گناہ کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ ہر گناہ چھوڑنے پر یہ وعدہ ہے، مثلاً غیبت میں بڑا مزہ آرہا ہے، لیکن ایک مرتبہ آپ نے اللہ جل جلالہ کے خیال سے غیبت چھوڑ دی اور غیبت کرتے کرتے رک گئے، اللہ کے ڈر کے خیال سے غیبت کا کلمہ زبان پر آتے آتے رک گیا، پھر دیکھو کیسی لذت حاصل ہوتی ہے۔ اور جب انسان گناہوں کی لذتوں کے مقابلے میں اس لذت کا عادی ہوتا چلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے ساتھ تعلق مضبوط سے مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے۔

حاصل تصوّف

حضرت حکیم الامّت قدس اللہ سرہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی، یاد رکھنے کے لائق ہے، فرمایا: "وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب کسی اطاعت کے کرنے میں سستی پیدا ہو، مثلاً نماز کا وقت ہو گیا، لیکن نماز کو جانے میں سستی ہو رہی ہے، "اس سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے، اور جب گناہ سے بچنے میں دل سستی کرے تو اس سستی کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے" پھر فرمایا کہ: "بس اسی سے تعلق مع اللہ

پیدا ہوتا ہے، اسی سے تعلق مع اللہ میں ترقی ہوتی ہے۔ اور جس شخص کو یہ بات حاصل ہو جائے، اس کو پھر کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا نفسانی خواہشات پر آرے چلا چلا کر اور ہتھوڑے مار مار کر جب اس کو کچل دیا، تو اب وہ نفس کچلنے کے نتیجے میں اللہ جل جلالہ کی تجلّی گاہ بن گیا۔

دل تو ہے ٹوٹنے کے لئے

ہمارے والد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک مثال دیا کرتے تھے۔ اب تو وہ زمانہ چلا گیا، پہلے زمانے میں یونانی حکیم ہوا کرتے تھے، وہ کشتہ بنایا کرتے تھے، سونے کا کشتہ، چاندی کا کشتہ، سنکھیا کا کشتہ، اور نہ جانے کیا کیا کشتے تیار کرتے تھے اور کشتہ بنانے کے لئے وہ سونے کو جلاتے تھے اور اتنا جلاتے تھے کہ وہ سونا راکھ بن جاتا تھا، اور کہتے تھے کہ سونے کو جتنا زیادہ جلایا جائے گا، اتنی ہی اس کی طاقت میں اضافہ ہوگا، اب جلا جلا کر جب کشتہ تیار کیا تو وہ کشتہ طلا تیار ہوگیا، کوئی اس کو ذرا سا کھالے تو پتہ نہیں کہاں کی قوت آجائے گی، تو جب سونے کو جلا جلا کر مٹا مٹا کر پامال کر کر کے راکھ بنا دیا تو اب یہ کشتہ تیار ہوگیا۔ ہمارے حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ان خواہشات نفس کو جب کچلو گے اور کچل کچل کر پیس پیس کر راکھ بنا کر فنا کر دو گے، تب یہ کشتہ بن جائے گا، اس میں اللہ جل جلالہ کے ساتھ تعلق کی قوت آجائے گی، اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت آجائے گی، اب دل اللہ تعالیٰ کی تجلّی گاہ بن جائے گا، اس دل کو جتنا

توڑو گے، اتنا ہی یہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب بنے گا ؂

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

تم اس پر جتنی چوٹیں لگاؤ گے، اتنا ہی یہ بنانے والے کی نگاہ میں محبوب ہو گا، بنانے والے نے اس کو اسی لئے بنایا ہے کہ اسے توڑا جائے، اس کی خاطر اس کی خواہشات کو کچلا جائے، اور جب وہ کچل جاتا ہے تو کیا سے کیا بن جاتا ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب قدس اللہ سرہ کیا اچھا شعر پڑھا کرتے تھے کہ ؂

یہ کہہ کے کاسہ ساز نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

اور کچھ بنائیں گے، یعنی جو وہ چاہیں گے وہ بنائیں گے۔ لہٰذا یہ نہ سمجھو کہ خواہشات نفس کو کچلنے سے جو چوٹیں لگ رہی ہیں، اور جو تکلیف ہو رہی ہے، وہ بے کار جارہی ہیں، بلکہ اس کے بعد جب یہ دل اللہ تعالیٰ کی محبت کا محل بنے گا اور اللہ تعالیٰ کے ذکر اور ان کی یاد کا محل بنے گا، اس وقت اس کو جو حلاوت نصیب ہوگی، خدا کی قسم اس کے مقابلے میں گناہوں کی یہ ساری لذتیں خاک در خاک ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں، اللہ تعالیٰ یہ دولت ہم سب کو نصیب فرمائیں۔ بس! شروع میں تھوڑی سی محنت اور مشقت اٹھانی پڑے گی، اور اسی کا نام مجاہدہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسی بات کو حدیث شریف میں اس طرح بیان فرمایا کہ:

المجاهد من جاهد نفسه

مجاہد در حقیقت وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے، اپنے نفس کی خواہشات کو اللہ کی خاطر کچلے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اپنے نفس کی خواہشات کے ہاتھوں میں کھلونہ بننے سے بچائے، اور ان خواہشات نفس کو قابو کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۲۴

مجاہدہ مستحبہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۴

صفحات : ۱۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۲۴

مجاہدہ مستحبّہ

اور چار چیزوں میں قلّت

الحمدللّٰه ربّ العالمين، والعاقبة للمتقين، والصلاة والسلام على رسوله الكريم، وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين، امابعد!

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

مجاہدہ کی حقیقت یہ ہے کہ معاصی کو تو مطلقاً ترک کرے اور یہ نفس کی مخالفت واجب ہے اور مباحات

میں تقلیلاً مخالفت کرے اور یہ مخالفت مستحب ہے۔ الخ

(انفاس عیسیٰ ص ۱۳)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے "مجاہدہ" کی حقیقت بیان فرمادی ہے۔ وہ ہے نفس کے تقاضوں کی مخالفت کرنا، یہ مخالفت بعض حالات میں واجب ہوتی ہے، مثلاً اگر نفس کسی گناہ کی طرف بلا رہا ہے اور کسی گناہ کا تقاضہ پیدا کر رہا ہے، تو اس تقاضے کی مخالفت کر کے اس کو کچلنا اور مجاہدہ کرنا واجب ہے۔ اصل "مجاہدہ" یہی ہے۔

جائز کاموں سے رکنا بھی مجاہدہ ہے

لیکن چونکہ ہمارا نفس لذتوں کا، خواہشات کا اور راحتوں کا عادی ہو چکا ہے اور اتنا زیادہ عادی ہو چکا ہے کہ اگر اس کو اللہ کے راستے کی طرف اور شریعت کی طرف موڑنا چاہیں تو آسانی سے نہیں مڑتا، بلکہ دشواری پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس نفس کو رام کرنے کے لئے اور اللہ کے بتائے ہوئے احکام کے تابع بنانے کے لئے اس کو بعض مباح اور جائز کاموں سے بھی روکنا پڑتا ہے، اس لئے کہ جب نفس کو جائز کاموں سے روکیں گے تو پھر اس کو لذتوں کو چھوڑنے کی عادت پڑے گی، اور پھر اس کے لئے ناجائز امور سے بچنا بھی آسان ہو جائے گا۔ صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اس کو بھی "مجاہدہ" کہا جاتا ہے۔ یہ "مجاہدہ مستحبہ" ہے۔

مثلاً خوب پیٹ بھر کر کھانا کوئی گناہ کا کام نہیں، لیکن صوفیاء کرام

فرماتے ہیں کہ خوب پیٹ بھر کر مت کھاؤ، اس لئے کہ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ نفس غافل ہو جائے گا اور لذتوں کا خوگر ہو جائے گا، اس لئے نفس کو عادی بنانے کے لئے کھانے میں تھوڑی سی کمی کر دو، یہ بھی ''مجاہدہ'' ہے۔

جائز کاموں میں مجاہدہ کیوں؟

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ صوفیاء کرام بعض جائز کاموں سے بھی روک دیتے ہیں اور ان کو چھڑا دیتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جائز قرار دیا ہے؟ حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ دیکھو اس کی مثال یہ ہے کہ یہ کتاب کا ورق ہے، اس ورق کو موڑو، موڑ دیا، اچھا اس کو سیدھا کرو، اب وہ ورق سیدھا نہیں ہوتا، بہت کوشش کر لی، لیکن وہ دوبارہ مڑ جاتا ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس ورق کو مخالف سمت میں موڑ دو، یہ سیدھا ہو جائے گا، پھر فرمایا کہ یہ نفس کا کاغذ بھی گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے، معصیتوں کی طرف مڑا ہوا ہے، اب اگر اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہو گا، اس کو دوسری طرف موڑ دو، اور تھوڑے سے مباحات بھی چھڑا دو، جس کے نتیجے میں یہ بالکل سیدھا ہو جائے گا اور راستے پر آ جائے گا، یہ بھی ''مجاہدہ'' ہے۔

چار مجاہدات

چنانچہ صوفیاء کرام کے یہاں چار چیزوں کا مجاہدہ کرانا مشہور ہے،
۱۔ تقلیل طعام، کم کھانا۔ ۲۔ تقلیل کلام، کم بولنا۔ ۳۔ تقلیل منام، کم سونا۔
۴۔ تقلیل الاختلاط مع الانام، لوگوں سے کم ملنا۔

کم کھانا

۱۔ تقلیل طعام، کم کھانا۔ پہلے زمانے میں صوفیاء کرام کم کھانے پر بڑے بڑے مجاہدے کرایا کرتے تھے، یہاں تک کہ فاقہ کشی تک نوبت آ جاتی تھی، لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ نے فرمایا کہ یہ زمانہ اب اس قسم کے مجاہدوں کا نہیں ہے، اب تو لوگ ویسے ہی کمزور ہیں، اگر کھانا کم کر دیں گے تو اور بیماریاں آ جائیں گی، اور اس کے نتیجے میں کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے جو عبادت کرتا تھا، اس سے بھی محروم ہو جائے۔ اس لئے فرمایا کہ آج کے دور میں انسان ایک بات کی پابندی کرلے تو پھر تقلیل طعام کا مقصد حاصل ہو جائے گا، وہ یہ کہ جب کھانا کھانے بیٹھے تو کھانا کھاتے وقت ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اس وقت دل میں یہ تردد پیدا ہوتا ہے کہ اب مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ کچھ اور کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ بس جس وقت یہ تردد کا مرحلہ آئے، اس وقت کھانا چھوڑ دے، اس سے تقلیل طعام کا منشا پورا ہو جائے گا۔

اور یہ جو تردد پیدا ہوتا ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں؟ یہ عقل اور نفس کے درمیان لڑائی ہوتی ہے، کیونکہ کھانا کھانے میں مزہ آرہا ہے، تو اب نفس یہ تقاضہ کر رہا ہے کہ اور کھانا کھا کر مزہ لے لے، اور عقل کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اب مزید کھانا مت کھا، اب مزید کھائے گا تو کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔ نفس اور عقل کے درمیان یہ لڑائی ہوتی ہے، اور اس لڑائی کا نام تردد ہے، لہٰذا ایسے موقع پر نفس کے تقاضے کو چھوڑ دو اور عقل کے تقاضے پر عمل کرلو۔

وزن بھی کم اور اللہ بھی راضی

یہ مضمون میں نے حضرت والد ماجد مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ سے اور حضرت ڈاکٹر عبدالحیٔ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کئی بار سنا، اور مواعظ میں بھی پڑھا، لیکن بعد میں ایک ماہر ڈاکٹر کا مضمون نظر سے گزرا، جس میں لکھا تھا کہ:

آج کل لوگ اپنے بدن کا وزن کم کرنے کے لئے طرح طرح کے نسخے استعمال کرتے ہیں، کسی نے روٹی چھوڑ دی، کسی نے دوپہر کا کھانا چھوڑ دیا۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو "ڈائیٹنگ" کہتے ہیں۔ یورپ میں اس کا بہت رواج ہے، یہ چیز وہاں وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے، اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جسم کا وزن کم ہو جائے۔ اور خاص طور پر خواتین میں اس کا اتنا رواج ہے کہ گولیاں کھا کھا کر وزن کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور بعض اوقات

اس میں مر بھی جاتی ہیں۔

اس کے بعد وہ ڈاکٹر لکھتا ہے کہ میرے نزدیک وزن کم کرنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آدمی نہ تو کسی وقت کا کھانا مستقل چھوڑے، نہ روٹی کم کرے، بلکہ ساری عمر اس کا معمول بنالے کہ جتنی بھوک ہے، اس سے تھوڑا سا کم کھاکر کھانا بند کردے۔ اس کے بعد اس ڈاکٹر نے بعینہ یہ بات لکھی ہے کہ جس وقت کھانا کھاتے ہوئے یہ تردد ہو جائے کہ کھانا کھاؤں یا نہ کھاؤں، اس وقت کھانا چھوڑ دے، جو شخص اس پر عمل کرے گا، اس کو کبھی بدن بڑھنے کی اور معدے کے خراب ہونے کی شکایت نہیں ہوگی اور نہ اس کو ڈائیٹنگ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔

یہی بات حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کئی سال پہلے لکھ گئے تھے۔ اب چاہو تو وزن کم کرنے کی خاطر اس پر عمل کرلو اور چاہو تو اللہ کو راضی کرنے کی خاطر اس مشورے پر عمل کرلو، لیکن اگر نفس کے علاج کے طور پر اللہ کو راضی کرنے کے لئے یہ عمل کروگے تو اس کام میں اجر وثواب بھی ملے گا اور وزن بھی کم ہو جائے گا، اور اگر صرف وزن کم کرنے کی خاطر کروگے تو شاید وزن تو کم ہو جائے گا، لیکن اجر و ثواب نہیں ملے گا۔

نفس کو لذّت سے دور رکھا جائے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تو ہمارے لئے یہ عمل کتنا آسان کر

دیا، ورنہ پہلے زمانے میں تو صوفیاء کرام خدا جانے کیا کیا ریاضتیں کرایا کرتے تھے۔ صوفیاء کرام کے یہاں لنگر ہوا کرتے تھے، اس لنگر کے اندر شوربا بنتا تھا، خانقاہ میں جو مریدین ہوا کرتے تھے، ان کو یہ حکم ہوتا تھا کہ جس کے پاس ایک پیالہ شوربے کا آئے تو وہ اس شوربے میں ایک پیالہ پانی ملائے اور پھر کھائے، تاکہ نفس کو لذت گیری کی قید سے آزاد کیا جائے۔ اس کے علاوہ ان سے فاقے بھی کرواتے تھے۔ لیکن وہ زمانہ اور تھا، اور آج کل کا زمانہ اور ہے، جیسے طب کے اندر زمانے کے بدلنے سے علاج کے طریقے بدل جاتے ہیں، اسی طرح حکیم الامت قدس اللہ سرہ ہمارے زمانے کے لحاظ سے اور ہمارے مزاجوں کا لحاظ رکھتے ہوئے نسخے تجویز کر گئے، تقلیل طعام کا یہ نسخہ ہمارے لئے تجویز کر گئے جس سے تقلیل طعام کا منشا حاصل ہو جائے گا۔

پیٹ بھرے کی مستیاں

پورا پیٹ بھر کر اس طرح کھانا کہ پیٹ کا کوئی حصہ خالی نہ رہے، اگرچہ فقہی اعتبار سے ناجائز نہیں، حرام نہیں، لیکن یہ انسان کے لئے جسمانی اور روحانی دونوں قسم کی بیماریوں کا سبب اور ذریعہ ہے، اس لئے کہ جتنی معصیتیں اور نافرمانیاں ہیں، وہ سب بھرے ہوئے پیٹ پر سوجھتی ہیں، اگر آدمی کا پیٹ بھرا ہوا نہ ہو تو یہ گناہ اور نافرمانیاں نہیں سوجھتیں، اس لئے حکم یہ ہے کہ پیٹ بھرے ہونے سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے۔ اسی کا نام "تقلیل طعام" کا مجاہدہ ہے۔

کم بولنا "ایک مجاہدہ" ہے

دوسری چیز ہے "تقلیل کلام" بات کم کرنا۔ یعنی صبح سے شام تک یہ ہماری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے، اور اس پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے، جو منہ میں آرہا ہے انسان بول رہا ہے، یہ صورت حال غلط ہے، اس لئے کہ جب تک انسان اس زبان کو لگام نہیں دے گا اور اس کو قابو نہیں کرے گا، اس وقت تک یہ گناہ کرتی رہے گی۔ یاد رکھئے! حدیث شریف میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان کو اوندھے منہ جہنم میں ڈالنے والی چیز اس کی زبان ہے، اس لئے کہ جب زبان کو آزاد چھوڑ رکھا ہے، اس پر روک ٹوک نہیں ہے، تو پھر وہ زبان جھوٹ میں مبتلا ہوگی، غیبت میں مبتلا ہوگی، دل آزاری میں مبتلا ہوگی، ان گناہوں کے سبب وہ جہنم میں جائے گا۔

زبان کے گناہوں سے بچ جائے گا

اس لئے انسان کو "تقلیل کلام" کا مجاہدہ کرنا پڑتا ہے کہ بات کم کرے، زبان سے فضول بات نہ نکالے، ضرورت کے مطابق بات کرے، اور بولنے سے پہلے یہ سوچے کہ یہ بات کرنا میرے لئے مناسب ہے یا نہیں؟ کہیں گناہ کی بات تو نہیں، اور بلاوجہ زبان چلانے سے بچے، اس طرح آہستہ آہستہ انسان کم بولنے کا عادی ہو جاتا ہے، پھر یہ ہوتا ہے کہ بولنے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن اس نے اپنی اس خواہش کو دبا دیا تو اس کے نتیجے میں

زبان پر قابو پیدا ہو جاتا ہے، اور پھر وہ جھوٹ، غیبت اور اس طرح کے دوسرے گناہوں میں مبتلا نہیں ہوتا۔

جائز تفریح کی اجازت ہے

یہ جو فضول قسم کی مجلس آرائی ہوتی ہے، جس کو آج کل کی اصطلاح میں گپ شپ کہا جاتا ہے، کوئی دوست مل گیا تو فوراً اس سے کہا کہ آؤ ذرا بیٹھ کر گپ شپ کریں، یہ گپ شپ لازماً انسان کو گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ ہاں! شریعت نے ہمیں تھوڑی بہت تفریح کی بھی اجازت دی ہے، نہ صرف اجازت دی ہے بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

روّحوا القلوب ساعةً فساعةً

(کنزالعمال، ۵۳۵۴)

یعنی دلوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے آرام بھی دیا کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر قربان جایئے کہ ہمارے مزاج، ہماری نفسیات اور ہماری ضروریات کو ان سے زیادہ پہنچاننے والا اور کون ہوگا، وہ جانتے ہیں کہ اگر ان سے کہا گیا کہ اللہ کے ذکر کے علاوہ کچھ نہ کرو، ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہو، تو یہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ فرشتے نہیں ہیں، یہ تو انسان ہیں، ان کو تھوڑے سے آرام کی بھی ضرورت ہے، تھوڑی سی تفریح کی بھی ضرورت ہے، اس لئے تفریح کے لئے کوئی بات کرنا، خوش طبعی کے ساتھ ہنس بول لینا، نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ پسندیدہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت ہے، لیکن اس میں زیادہ منہمک

ہو جانا کہ اسی میں کئی کئی گھنٹے برباد ہو رہے ہیں، قیمتی اوقات ضائع ہو رہے ہیں، تو یہ چیز انسان کو لازمی طور پر گناہ کی طرف لیجانے والی ہے۔ اس لئے فرمایا جارہا ہے کہ تم باتیں کم کرنے کی عادت ڈالو۔ اور یہ بھی "مجاہدہ" ہے۔

مہمان سے باتیں کرنا سنّت ہے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، وہ باتیں بہت کرتے تھے، جب کبھی آتے تو بس ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیتے اور رکنے کا نام نہ لیتے، ہمارے سب بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ اگر کوئی شخص مہمان بن کر ملنے کے لئے آتا تو اس کا اکرام کرتے، اس کی بات سنتے، اور حتی الامکان اس کی تشفی کی کوشش کرتے، یہ کام ایک مصروف آدمی کے لئے بڑا مشکل ہے، جن لوگوں کی زندگی مصروفیات سے بھری ہو، وہ جان سکتے ہیں کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب آپ سے کوئی شخص ملنے کے لئے آتا، اور آپ سے بات کرنا شروع کرتا تو آپ ﷺ اس کی طرف سے کبھی منہ نہیں موڑتے تھے جب تک وہ خود ہی منہ نہ موڑلے، اس کی بات سنتے رہتے تھے، چنانچہ حدیث کے الفاظ ہیں کہ:

حتی یکون هو المنصرف

(شمائل ترمذی، باب ماجاء فی تواضع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

حتیٰ کہ وہ خود ہی نہ چلا جائے، یہ کام بڑا مشکل ہے، اس لئے کہ بعض لوگ لمبی بات کرنے کے عادی ہوتے ہیں، ان کی پوری بات پوری توجہ سے سننا ایک مشکل کام ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی وجہ سے ہمارے بزرگوں کا یہ طریقہ رہا ہے کہ آنے والے کی بات سنتے اور اس کی تشفّی کرتے۔

اصلاح کا ایک طریقہ

لیکن اگر کوئی شخص اصلاح کی غرض سے آتا تو اس پر روک ٹوک ہوتی تھی۔ بہر حال! وہ صاحب آکر باتیں شروع کر دیتے اور حضرت والد صاحب مسکینیت سے اس کی باتیں سنتے رہتے، ایک دن ان صاحب نے آکر حضرت والد صاحب سے بیعت کی درخواست کی کہ حضرت! میں آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرنا چاہتا ہوں، میرے لئے کوئی وظیفہ کوئی تسبیح بتا دیجئے، حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارے لئے کوئی تسبیح اور وظیفہ نہیں ہے، تمہارا کام یہ ہے کہ زبان کو قابو میں کرو، اس پر تالا ڈالو، تم جو ہر وقت بولتے رہتے ہو، زبان نہیں رکتی، یہ غلط ہے۔ آئندہ جب آؤ تو بالکل خاموش بیٹھے رہو، زبان سے کوئی لفظ نہ نکالنا۔ اب اس پابندی کے نتیجے میں ان صاحب پر قیامت گزر گئی، یہ خاموش بیٹھنے کا مجاہدہ ان کے لئے ہزار مجاہدوں سے بھاری تھا۔ اب یہ ہوتا کہ بار بار ان کے دل میں بولنے کا تقاضہ پیدا ہوتا، لیکن پابندی کی وجہ سے نہ بولنے پر مجبور تھے۔ اور اسی علاج کی وجہ

سے اللہ تبارک و تعالیٰ نے سارا طریق طے کرا دیا۔ اس لئے کہ حضرت والد صاحب یہ سمجھ گئے تھے کہ ان کی بنیادی بیماری یہ ہے، جب یہ قابو میں آجائے گی تو سب کام آسان ہو جائے گا، چنانچہ کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے ان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ ہر ایک کی بیماری الگ الگ ہے، لہٰذا حالات کو دیکھ کر شیخ علاج تجویز کرتا ہے کہ اس کے لئے کونسا علاج مفید ہوگا، بہر حال یہ "تقلیل کلام" کا مجاہدہ ہے۔

کم سونا

تیسرا مجاہدہ ہے "تقلیل منام" یعنی کم سونا، اس میں بھی پہلے تو نہ سونے کا مجاہدہ ہوتا تھا، چنانچہ جیسا کہ مشہور ہے کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھا کرتے تھے، لیکن بزرگوں نے فرمایا کہ کم سونے کی حد یہ ہے کہ آدمی کو دن رات میں کم از کم چھ گھنٹے ضرور سونا چاہئے، چھ گھنٹے سے کم نہ کرے، ورنہ بیمار ہو جائے گا۔ اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اگر کسی کو بے وقت سونے کی عادت ہے تو وہ اس کو ختم کرے، یہ بھی کم سونے کی حد میں داخل ہے، اور یہ بھی "مجاہدہ" ہے۔

لوگوں سے تعلقات کم رکھنا

چوتھا مجاہدہ ہے "تقلیل الاختلاط مع الانام" یعنی لوگوں سے میل جول کم کرنا، اور بہت زیادہ میل جول سے پرہیز کرنا، اس لئے کہ انسان کے

جتنے زیادہ تعلقات ہوں گے، اتنا ہی گناہوں میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رہے گا۔ تجربہ کر کے دیکھ لو، آج کل تو تعلقات بڑھانا باقاعدہ ایک فن اور ہنر بن گیا ہے، جس کو "پبلک ریلیشن" Public Relation کہا جاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ تعلقات زیادہ پیدا کرو، اور اپنا اثر ورسوخ بڑھاؤ، اور ان تعلقات کی بنیاد پر اپنا کام نکالو، لیکن ہمارے بزرگوں نے اس سے منع فرمایا ہے کہ بلاضرورت تعلقات نہ بڑھائے جائیں، بلکہ تعلقات کو کم کیا جائے۔

دل ایک آئینہ ہے

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل کو ایک آئینہ بنایا ہے، جو تصویر انسان کے سامنے سے گزرتی ہے، اس کا عکس دل پر جم جاتا ہے، لہٰذا جب انسان کے تعلقات زیادہ ہوں گے تو اس میں پھر اچھے لوگ بھی آئیں گے اور برے بھی آئیں گے، اور جب برے کاموں میں مصروف لوگ ملاقات کریں گے تو ان کے کاموں کا عکس دل پر پڑے گا اور اس سے دل خراب ہوگا، اس لئے فرمایا کہ دوسرے لوگوں سے بلا ضرورت زیادہ نہ ملو، دوسرے لوگوں سے تعلقات جتنے کم ہوں گے، اتنا ہی اللہ جل شانہ سے تعلق میں اضافہ ہوگا۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ؎

تعلق حجاب است و بے حاصلی
چوں پیوندھا بگسلی واصلی

یعنی یہ تعلقات اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے میں حجاب اور پردے بن جاتے ہیں، دنیا کی جتنی محبتیں بڑھیں گی کہ اس سے بھی محبّت ہے، اس سے بھی محبّت ہے، اتنا ہی اللہ تبارک و تعالیٰ سے تعلق میں کمی آئے گی، البتہ جو حقوق العباد ہیں، وہ بے شک ادا کرنے ہیں، ان میں کوتاہی نہیں کرنی ہے، لیکن بلاوجہ تعلقات نہیں بڑھانا چاہئے، اسی کا نام "تقلیل الاختلاط مع الانام" ہے۔

بہرحال، یہ مجاہدات اس لئے کرائے جاتے ہیں تاکہ ہمارا یہ نفس قابو میں آجائے اور ناجائز کاموں پر اکسانا چھوڑ دے، اس لئے یہ مجاہدات ہر انسان کو کرنے چاہئیں۔ اور بہتر یہ ہے کہ یہ مجاہدات کسی رہنما کی نگرانی میں کرے، خود اپنی مرضی اور اپنے فیصلے سے نہ کرے، اس لئے کہ اگر انسان خود سے یہ فیصلہ کرے گا کہ میں کتنا کھاؤں، کتنا نہ کھاؤں، کتنا سوؤں، کتنے لوگوں سے تعلقات رکھوں، کن لوگوں سے تعلقات نہ رکھوں تو اس میں بے اعتدالی ہو سکتی ہے، لیکن جب کسی رہنما کی رہنمائی میں یہ کام کرے گا تو انشاء اللہ اس کے فوائد حاصل ہوں گے اور ہر کام اعتدال میں رہ کر ہوتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۵

مجاہدہ اختیاریہ و اضطراریہ کا فرق

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۵

صفحات : ۱۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

مجلس نمبر ۲۵

مجاہدہ اختیاریہ اور اضطراریہ کا فرق

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العالمین ۔ والعاقبة للمتقین ۔
والصّلاة والسّلام علی رسوله وعلیٰ آله
واصحابه اجمعین ۔

أمّا بعد!

• حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

مجاہدہ اختیاریہ میں تو فعل کا غلبہ ہے، اس لئے اس میں انوار زیادہ ہوتے ہیں، کیونکہ انوار کا ترتب عمل پر ہوتا ہے۔ اور مجاہدہ اضطراریہ میں فعل کم ہوتا ہے، اس لئے اس میں نورانیت کم ہوتی ہے، لیکن ''انفعال'' کا غلبہ ہوتا ہے، اس لئے قابلیت میں قوت بڑھتی ہے۔

اور اس انفعال اور قابلیت کی خود اعمال اختیاریہ کے
راسخ ہونے کے لئے سخت ضرورت ہے، اسی لئے
بزرگوں نے ایسے مجاہدات بہت زیادہ کرائے ہیں۔
(انفاس عیسیٰ ص ۱۳)

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ "مجاہدہ" کے معنی ہیں "نفس کی مخالفت کرنا اور نفس کے تقاضوں کو اللہ کے لئے کچلنا۔ اس ملفوظ میں حضرت والا مجاہدہ کی دو قسمیں بیان فرما رہے ہیں: ایک مجاہدہ اختیاری، دوسرے مجاہدہ اضطراری۔

مجاہدہ اختیاری

مجاہدہ اختیاری یہ ہے کہ جب کسی طالب نے کسی شیخ کی طرف اپنی اصلاح کے لئے رجوع کیا تو اس شیخ نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ اس طالب کو فلاں قسم کا مجاہدہ کرانا چاہئے، چنانچہ وہ شیخ اس طالب کو اس کام میں لگا دیتا ہے۔ جیسے شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے کا قصہ ہے کہ جب وہ اپنی اصلاح کے لئے اپنے باپ کے ایک اجازت یافتہ شیخ کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان کو حمام جھونکنے پر لگا دیا، اب وہ حمام کی آگ جلا کر نمازیوں کے لئے پانی گرم کر رہے ہیں۔ یہ "مجاہدہ اختیاری" تھا، اس لئے کہ ان کا حمام جھونکنا کوئی ضروری نہیں تھا، لیکن شیخ نے ان کو اس کام پر لگا دیا۔ یا مثلاً کسی شیخ نے کسی طالب سے یہ کہہ دیا کہ تم روزانہ سو رکعت نفل پڑھا

کرو، تو یہ مجاہدہ اختیاری ہے، کیونکہ اپنے اختیار سے شیخ وہ کام اس طالب سے لے رہے ہیں۔

مجاہدہ اضطراری

دوسرا مجاہدہ اضطراری ہوتا ہے، جس میں انسان کے اپنے اختیار اور ارادے کو دخل نہیں ہوتا، لیکن غیر اختیاری طور پر حالات ایسے پیدا ہو جاتے ہیں جس کی وجہ سے انسان کو اپنے نفس کی مخالفت کرنی پڑتی ہے، یا اس کو کوئی تکلیف یا کوئی صدمہ والی بات پیش آجاتی ہے، یا کسی بات کا غم لاحق ہو جاتا ہے، یہ سب "مجاہدہ اضطراریہ" ہیں۔ مثلاً کسی قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا، اور اس کی وجہ سے صدمہ ہوا، اس میں بھی نفس کی مخالفت ہوئی، اس لئے کہ نفس تو یہ چاہ رہا تھا کہ وہ مزید زندہ رہتا، لیکن اس کا انتقال ہو گیا، تو یہ مجاہدہ اضطراری ہے۔ یا نفس تو چاہ رہا تھا کہ صحت اور تندرستی برقرار رہے، کوئی بیماری نہ آئے، لیکن کوئی بیماری لاحق ہو گئی جس کی وجہ سے تکلیف پہنچی، یہ "مجاہدہ اضطراری" ہے۔

بہر حال! ایک مجاہدہ وہ ہے جو انسان اپنے اختیار سے انجام دیتا ہے، اس کے سامنے دو راستے کھلے ہوتے ہیں، چاہے وہ اس عمل کو کرے چاہے نہ کرے، یہ مجاہدہ اختیاری ہے۔ دوسرا مجاہدہ وہ ہے جو اپنے اختیار سے نہیں ہوتا، بلکہ حالات ایسے آجاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے انسان کو غم، تکلیف اور صدمہ پہنچتا ہے، یہ مجاہدہ اضطراری ہے۔

مجاہدہ اختیاری اپنی مرضی سے نہ کرے

البتہ یہ مجاہدہ اختیاری خود اپنی رائے سے اور اپنی مرضی سے نہیں کرنا چاہیئے، مثلاً آپ نے وعظ کے اندر یہ سن لیا کہ مجاہدہ ضرور کرنا چاہیئے اور نفس کو کچلنا چاہیئے، چنانچہ خود اپنی رائے سے یہ تجویز کرلیا کہ میں فلاں مجاہدہ کروں گا، یاد رکھئے کہ اپنی مرضی سے مجاہدہ کرنے سے اور زیادہ خرابی کا اندیشہ ہے، اس لئے مجاہدہ اختیاری ہمیشہ اپنے شیخ کی نگرانی اور اس کے حکم کے مطابق کرنا ضروری ہے، اپنی طرف سے نہ کرے۔ ہمارے دارالعلوم میں بھی ایک مرتبہ بعض طلباء نے اپنی مرضی سے مجاہدہ کرنا شروع کر دیا، کسی نے یہ مجاہدہ اختیار کرلیا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا، کسی نے یہ اختیار کرلیا کہ میں صرف ایک کھجور سے افطار کروں گا، اس طرح کے مجاہدات کرنے شروع کر دیے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فائدہ ہونے کے بجائے الٹا نقصان ہوا۔ لہٰذا مجاہدہ اختیاریہ ہمیشہ کسی شیخ کی نگرانی میں کرنا چاہیئے۔

مجاہدہ اختیاری میں نورانیت

بہرحال! مجاھدہ اختیاریہ ہو یا اضطراریہ، دونوں سے ترقی ہوتی ہے، اور دونوں کے ذریعہ طالب اللہ تعالیٰ کی رضا کی منزل کے قریب پہنچتا ہے۔ البتہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے دونوں مجاہدوں کا فرق بیان فرمایا ہے، فرمایا کہ مجاہدہ اختیاریہ چونکہ انسان اپنے فعل اور اپنے اختیار سے انجام دیتا

ہے اور اپنے اختیار کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے نفس کو کچلتا ہے، اس وجہ سے اس مجاہدہ میں نورانیت زیادہ محسوس ہوتی ہے، انوار زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ اور "مجاہدہ اضطراریہ" میں اس نے اپنے اختیار سے کچھ نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے خود بخود حالات ایسے پیدا ہوگئے کہ اس کی وجہ سے اس کو صدمہ اور تکلیف اور غم پہنچا، اس لئے اس مجاہدہ میں ظاہری اعتبار سے نورانیت کم ہوتی ہے، کیونکہ نورانیت کے نتیجے میں انسان کی طبیعت میں انشراح اور انبساط ہوتا ہے، جبکہ مجاہدہ اضطراریہ میں تو صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے، اس لئے اس مجاہدہ میں اس قسم کی نورانیت تو حاصل نہیں ہوتی۔

مجاہدہ اضطراریہ سے قابلیت پیدا ہونا

لیکن چونکہ یہ مجاہدہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، اس وجہ سے اس مجاہدہ کے نتیجے میں انسان کے اندر قابلیت زیادہ پیدا ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اچھے اعمال کی قابلیت پیدا فرمادیتے ہیں۔ اس کی وجہ حضرت والا نے یہ بیان فرمائی کہ مجاہدہ اختیاریہ کے اندر "فعل" ہے اور مجاہدہ اضطراریہ کے اندر "انفعال" ہے، "انفعال" کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر اللہ تعالیٰ کے فعل کو دخل ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فعل کا انفعال اور اثر ہے، اور "انفعال" کے نتیجے میں اس کے اندر قابلیت زیادہ پیدا ہو جاتی ہے، البتہ دونوں مجاہدے فائدے سے خالی نہیں۔

مجاہدہ اضطراری میں ترقی تیزی سے ہوتی ہے

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ سے سنا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ یوں تو مجاہدہ اختیاری اور اضطراری دونوں مفید اور کار آمد ہیں، لیکن ترقی جتنی تیزی سے مجاہدہ اضطراری میں ہوتی ہے، مجاہدہ اختیاری میں نہیں ہوتی۔ ایسا کیوں ہے؟ اس لئے کہ مجاہدہ اضطراری کو تم نے خود اپنی مرضی سے اختیار نہیں کیا تھا، بلکہ اللہ جل شانہ کی تجویز اور اختیار سے ہوا، اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان حالات سے گزارا، جب تم نے ان حالات پر صبر کیا، ان کو قبول کیا اور ان پر تفویض سے کام لیا، تو اس کے نتیجے میں ترقی بہت تیزی سے ہوتی ہے، البتہ بظاہر دیکھنے میں اس کے اندر نورانیت نظر نہیں آتی۔

فرض کریں کہ ایک شخص اپنے اختیار سے نوافل پڑھ رہا ہے اور مجاہدہ کر رہا ہے، اور ساری رات نوافل پڑھتے ہوئے گزار رہا ہے، جب اس نے یہ مجاہدہ کیا تو اس کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں انبساط اور انشراح اور سرور پیدا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک نیک کام کی توفیق دی۔ دوسری طرف وہ شخص ہے جس کو کسی عزیز کے انتقال کی خبر ملی ہو، یا کسی نے اس کو ڈانٹ پلا دی ہو، یا کسی نے اس کو کوئی اور دکھ اور تکلیف پہنچا دی ہو، ایسے شخص کو تکلیف اور صدمہ ہو رہا ہے، تو اس کو اس عمل میں نورانیت اور مزہ کیسے آئے گا؟ لیکن اللہ جل شانہ اپنے فضل سے اس کی ترقی فرما رہے ہیں تاکہ وہ

کسی طرح اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

مجاہدہ اضطراریہ میں صبر داخل ہے

وجہ اس کی یہ کہ ہے مجاہدات اضطراریہ صبر کا تقاضہ کرتے ہیں کہ انسان ان تکلیفوں پر صبر کرے، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے، اور جب صبر کرے گا تو صبر کرنے والوں کے لئے وعدہ ہے کہ:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ

یعنی اور اعمال کا اجر تو حساب کے ذریعہ دیا جائے گا اور صبر کرنے والوں کو بلا حساب اجر دیا جائے گا۔ بہرحال! اس مجاہدہ اضطراریہ سے بعض اوقات ترقیات بہت تیزی سے ہو جاتی ہیں۔

مجاہدہ اضطراریہ میں وساوس کا احتمال نہیں

مجاہدہ اختیاریہ کرنے والے کو یہ خیال بھی ہونے لگتا ہے کہ میں مجاہدہ کر رہا ہوں، اور پھر جب اس میں سرور اور نورانیت معلوم ہوتی ہے تو اس سے مزہ بھی آتا ہے، جس کی وجہ سے اس مجاہدہ میں وساوس (نفس و شیطان کی فریب کاریوں) کا احتمال بھی رہتا ہے، لیکن مجاہدہ اضطراریہ میں یہ وساوس نہیں ہوتے، اس لئے انسان مجاہدہ اضطراریہ سے سیدھا منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ سے اپنی طرف سے مجاہدہ اضطراریہ طلب نہ کرے، بیماری اور تکلیف اور صدمہ اللہ تعالیٰ سے نہ مانگے، بلکہ یہ دعا کرے

کہ یا اللہ! میں بیماری اور تکلیف سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، لیکن جب بیماری آ جائے، یا کوئی اور تکلیف یا مصیبت آ جائے تو اس وقت صبر کرے، اور یہ سوچے کہ یہ مجاہدہ اضطراری کرایا جارہا ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ترقی دینا چاہتے ہیں۔

تکلیف اور پریشانی کے وقت مجاہدہ اضطراری کو سوچنا

اس دنیا میں انسان کو جتنے صدمے پیش آتے ہیں، ان صدموں کے وقت اگر انسان ذرا خیال کرلیا کرے کہ تکلیف اور صدمہ تو مجھے پہنچ گیا، لیکن یہ مجاہدہ اضطراری ہو رہا ہے، اور مجاہدہ اختیاری کرنے کی تو مجھے توفیق ہوتی نہیں کہ مجاہدہ اختیاری کر کے کوئی ترقی حاصل کروں، اس کا موقع مجھے نہیں ملتا، میرا نفس مجھے یہ مجاہدہ نہیں کرنے دیتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس مجاہدہ اضطراری کے اندر لگا دیا، اور اس کے ذریعہ نہ جانے میرے کتنے گناہ معاف ہو رہے ہیں، کتنے درجات بلند ہو رہے ہیں اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو رہا ہے۔ علماء کرام نے فرمایا کہ صبر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا جتنا قرب حاصل ہوتا ہے اور کسی چیز سے نہیں ہوتا۔ اس لئے جب بھی کوئی صدمہ، پریشانی اور تکلیف آئے تو اس وقت انسان یہ سوچ لے کہ یہ مجاہدہ اضطراری ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور اس کے اندر میرا فائدہ ہے اور میری ترقی ہو رہی ہے، اس کو سوچنے سے انشاء اللہ وہ تکلیف اور غم بھی ہلکا ہو جائے گا اور منجانب اللہ جو ترقی ہونی ہے وہ بھی ہوگی۔

میرا ایک واقعہ

جب ''وفاقی شرعی عدالت'' میں میرا تقرر ہوا، تو عارضی طور پر مجھے دارالعلوم چھوڑ کر اسلام آباد جانا پڑا، جانے کی مرضی نہیں تھی، چنانچہ رمضان اور شعبان کی چھٹیوں میں تقریباً ڈیڑھ مہینہ وہاں گزارا، اس سے پہلے کبھی اتنے عرصہ تک دارالعلوم چھوڑنے کی نوبت نہیں آئی تھی، اس لئے اس سفر سے مجھے بہت اذیت ہوئی، اور ایک ایک لمحہ وہاں گزارنا مشکل ہوگیا۔ یہ ساری صورت حال میں نے اپنے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو لکھ کر بھیجی۔ جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ:

> یہ سب مجاہدہ اضطراری ہو رہا ہے، فکر نہ کرو، سب ٹھیک ہو جائے گا، انشاء اللہ۔

بعد میں جب حضرت والا سے ملاقات ہوئی تو حضرت والا نے فرمایا کہ دیکھیں: مجاہدہ اضطراری اس طرح ہوتا ہے کہ آدمی نہیں چاہتا کہ وہ کام ہو، مگر اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تخلیق سے وہ کام ہو جاتا ہے، اگر اس پر انسان صابر رہے اور راضی برضا رہے تو اس مجاہدہ اضطراری سے بعض اوقات انسان کی ترقی بہت تیز رفتاری سے ہوتی ہے۔

بہرحال! اللہ تعالیٰ سے مصیبت، تکلیف اور غم اور صدمہ نہ مانگے، بلکہ ان چیزوں سے پناہ مانگے، لیکن جب یہ چیزیں آجائیں تو اس وقت یہ سوچے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ میرے درجات بلند

فرمانا چاہتے ہیں۔

مجاہدہ اضطراریہ کا نفع

آگے ارشاد فرمایا کہ:

"مجاہدہ اضطراریہ" سے عمل میں قلّت بھی ہو جائے اور محض فرائض و واجبات ہی پر اکتفاء ہوتا رہے تب بھی مجاہدہ کاملہ کا ثواب ملتا ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۳)

مثلاً مجاہدہ اضطراریہ میں کوئی صدمہ آگیا، کوئی پریشانی لاحق ہوگئی، اس صدمہ اور پریشانی کی وجہ سے نوافل وغیرہ کے معمولات چھوٹ گئے اور صرف فرائض و واجبات پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے، تو بظاہر معمولات کے چھوٹنے اور نوافل کے کم ہونے کی وجہ سے عمل میں قلت ہوئی، لیکن اللہ جل جلالہ اس مجاہدہ اضطراریہ کی برکت سے مجاہدہ کاملہ کا ثواب عطا فرمائیں گے۔

معمولات چھوٹنے کے باوجود پورا ثواب

مثلاً گھر میں والدین میں کوئی بیمار ہوگیا، اب ان کی تیمارداری میں وقت گزر رہا ہے اور تلاوت کا موقع نہیں مل رہا ہے، تسبیح پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا ہے، ایسے موقع پر بعض اوقات بہت صدمہ ہوتا ہے کہ اس کام

میں لگنے کی وجہ سے ہماری تلاوت چھوٹ گئی اور ہمارے معمولات چھوٹ گئے۔ اس پر حضرت فرمار ہے ہیں کہ یہ بات دل سے نکال دو، کیوں؟ اس لئے کہ یہ جو تکلیف تم پر آئی ہے، اس نے تم سے یہ عبادت چھڑائی ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے تم کو محروم نہیں کریں گے، بلکہ کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ اور زیادہ عطا فرمادیں۔

وقت کے تقاضے کو دیکھو

بس دین کی صحیح فہم یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ کس وقت کا کیا تقاضہ ہے؟ اس وقت میں وہ کام انجام دے۔ ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنا شوق پورا کرنے کا نام "دین" نہیں، کسی شخص کو کسی چیز کا شوق ہو جاتا ہے، کسی کو کسی چیز کا شوق ہو جاتا ہے، بس اب شوق کو پورا کر رہے ہیں۔ "دین" اس کا نام نہیں، بلکہ دین نام ہے "اتباع" کا، کہ اس وقت میں مجھ سے کیا تقاضہ ہو رہا ہے؟ اس تقاضے کو انجام دوں۔ بس یہ دین ہے۔

مفتی بننے کا شوق

ایک طالب علم میرے پاس آئے اور کہا کہ مجھے "درجہ تخصص" میں داخل ہونے کا بڑا شوق ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ والدین کی کیا مرضی ہے؟ اس نے کہا والدین کا کہنا یہ ہے کہ نہ پڑھو، وہ تو منع کرتے ہیں، لیکن

مجھے بڑا شوق ہے، اگر میں نے نہیں پڑھا تو میرا یہ شوق پورا نہیں ہوگا۔ میں نے کہا کہ والدین کی اطاعت واجب ہے اور مفتی بننا کوئی واجب اور فرض عین نہیں، اگر والدین پڑھانا نہیں چاہتے، بلکہ وہ اپنی ضرورت و مصلحت سے کسی ایسے مشغلے میں لگانا چاہتے ہیں جو مباح ہے، حرام اور ناجائز نہیں ہے، تو اس صورت میں والدین کے حکم کی تعمیل واجب ہے، مفتی بننا واجب نہیں۔

یا مثلاً والدین بیمار پڑے ہیں، ان کو تمہاری خدمت کی ضرورت ہے، لیکن آپ اپنا شوق پورا کرنے کے لئے اس طلب علم میں گھر سے نکل گئے جو فرض عین نہیں، بلکہ فرض کفایہ ہے، جیسے پورا عالم بننا اور "شہادت عالمیہ" حاصل کرنا فرض عین نہیں، اگر والدین بیمار ہیں اور ان کو تمہاری خدمت کی ضرورت ہے تو پھر وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کی خدمت کرو اور دین کی صرف ضروری معلومات حاصل کرلو۔

تبلیغ یا جہاد کا شوق

یا مثلاً جہاد میں جانے کا شوق ہوگیا، اب اس کی فکر نہیں ہے کہ والدین اجازت دے رہے ہیں یا نہیں، حالات اس کے لئے سازگار ہیں یا نہیں، اور میرے لئے اس وقت کونسی بات زیادہ مناسب ہے، اس کی کوئی فکر نہیں، بس جہاد کے لئے چل پڑے۔ یا مثلاً تبلیغ میں جانے کا اور چلّہ لگانے کا شوق ہوگیا، اب گھر میں ماں باپ بیمار ہیں یا بیوی بیمار ہے، اس کی کوئی پروا نہیں، یہ دین پر عمل نہ ہوا، یہ تو اپنا شوق پورا کرنا ہوا، اس لئے کہ

اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں۔ لہٰذا یہ دیکھو کہ کس وقت شریعت کا کیا تقاضہ ہے، اس تقاضہ کو پورا کرو۔ انہی باتوں کی وجہ سے لوگ ناراض ہو جاتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ یہ ہمیں مفتی بننے نہیں دیتا، یہ جہاد کرنے نہیں دیتا، یہ تبلیغ کا دشمن ہے۔

ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے

خوب سمجھ لیں کہ ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے، ہر وقت کا ایک تقاضہ ہوتا ہے، اگر اس وقت میں وہ کام کریں گے تو وہ کار ثواب ہوگا اور بڑی فضیلت کا باعث ہوگا، اور اگر اس کام کو بے وقت اور بے محل انجام دیا جائے گا تو وہ غلو ہے اور دین سے خارج ہے، وہ محض اپنا شوق پورا کرنا ہے، وہ تبلیغ نہیں ہے، بس اپنا شوق ہے، وہ دین کا کام نہیں۔ دین تو یہ ہے کہ یہ دیکھو اس وقت کا شرعی تقاضہ کیا ہے؟

معمولات چھوٹنے پر صدمہ مت کرو

اگر والدین بیمار ہیں اور ان کی خدمت کی وجہ سے تلاوت چھوٹ گئی، تسبیحات چھوٹ گئیں، یا بیوی بیمار ہے، اس کی خدمت کی وجہ سے یہ چیزیں چھوٹ گئیں، تو ان کے چھوٹنے پر کوئی صدمہ کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ اس وقت کا شرعی تقاضہ ہی ان کی خدمت کرنا تھا، لہٰذا ان شاء اللہ تلاوت اور تسبیحات کا پورا اجر ملے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے دین کی صحیح فہم فرمائے اور اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۶

اللہ تک پہنچنے کے راستے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۳۶

صفحات : ۱۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر۲۶

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبّ العالمين ۔ والعاقبة للمتقين ۔ والصّلاة والسّلام على رسوله الكريم ۔ وعلى آله وأصحابه اجمعين ۔

أمّا بعد!

حضرت والا نے فرمایا:

طرق الوصول الى الله تعالىٰ بعدد انفاس الخلائق ۔ جس طرح وصول کی ایک صورت یہ ہے کہ حرم میں نماز پڑھو، یہ بھی ایک صورت ہے کہ کسی عذر سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۳)

بزرگوں کا یہ مقولہ عربی زبان میں مشہور ہے کہ "طرق الوصول الی اللّٰہ تعالیٰ بعدد انفاس الخلائق" اللہ جل شانہ تک پہنچنے کے طریقے اتنے ہی ہیں جتنے مخلوقات کے سانس (یعنی جس طرح ہر انسان کا سانس الگ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے راستے بھی الگ ہیں، ہر انسان کو ایک ہی لگا بندھا طریقہ بتانا مشکل ہے)

یعنی تمام انسانوں کے لئے کوئی ایک ہی ذریعہ لازم نہیں ہے، سینکڑوں ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے وصول کے لئے پیدا فرمار کھے ہیں، اگر ایک انسان کو حرم شریف کی حاضری کا موقع نصیب ہے تو وہ اس حاضری سے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے اور جسے اس کا موقع نہیں ملا تو وہ خود کو محروم نہ سمجھے، اس کے لئے حرم کی حاضری کا شوق اور حسرت ہی ذریعہ تقرب بن سکتی ہے۔

فرائض و واجبات ادا کرنا، اور معاصی اور گناہوں سے اجتناب کرنا، یہ وہ چیز ہے جو سب کے لئے مشترک ہے، لیکن اس مقصود کو حاصل کرنے کے لئے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضا تک پہنچنے کے لئے ہر ایک کے لئے الگ الگ نسخے تجویز کئے جاتے ہیں، اس کے لئے کسی رہبر اور رہنما اور شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو یہ بتاتا ہے کہ اس شخص کے لئے مناسب طریقہ کونسا ہے؟

عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنا

اسی بات کو حضرت والا نے ایک مثال سے سمجھایا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ایک راستہ یہ ہے کہ حرم میں نماز پڑھو، اسی طرح ایک راستہ یہ بھی ہے کہ عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو۔ فرمایا کہ وصول دونوں صورتوں میں ہے، حرم میں نماز پڑھنے میں بھی وصول ہے، اور عذر کی حالت میں گھر میں نماز پڑھ رہا ہے اور حرم کو ترس رہا ہے، یہ بھی وصول ہے۔ عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنے والا یہ نہ سمجھے کہ میرا راستہ الگ ہو گیا ہے، بلکہ عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھنا بھی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں ہی ہے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنَّ للّٰہ یُحِب أن تؤتی رخصہ کمایحب أن تؤتی عزائمہ۔ (کنز العمال، حدیث نمبر ۵۳۳۴)

اللہ تعالیٰ اپنی رخصتوں پر عمل کرنے کو اسی طرح پسند فرماتے ہیں جس طرح عزیمت پر عمل کرنے کو پسند فرماتے ہیں۔ لہٰذا یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ صرف عزیمت پر عمل کرنے کی صورت میں ہی "وصول" نصیب ہو گا، بلکہ رخصت پر عمل کرنے سے بھی "وصول" کی نعمت سے سرفراز ہو جائے گا۔ اگر جائز عذر ہے اور شریعت کے مطابق ہے اور اس پر واقعی اطمینان ہے کہ یہ عذر کی حالت ہے تو اس وقت رخصت پر عمل کرنے میں بھی انشاء اللہ

وہی ثواب اور انوار و برکات حاصل ہوں گے جو عزیمت پر عمل کرنے کی صورت میں حاصل ہوتے ہیں۔

قضاء کے وقت وہی انوار و برکات

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر رمضان المبارک میں کسی عذر شرعی کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا، (مثلاً بیماری کی وجہ سے، یا خواتین کی طبعی مجبوری کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا) تو کوئی نقصان نہیں، اس لئے کہ جب تم عام دنوں میں اس روزے کی قضاء کرو گے تو اس دن وہ سارے انوار و برکات حاصل ہوں گے جو رمضان المبارک کے انوار و برکات تھے، کیونکہ ہم نے تم کو اس دن روزہ رکھنے سے معذور کر دیا تھا، تو کیا اس کی وجہ سے ہم تم کو رمضان کی فضیلت سے اور رمضان کی برکات اور آثار سے محروم کر دیں گے؟ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اچھی امید نہ ہوئی، بلکہ امید یہی رکھنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ اس قضاء کے اندر وہی برکات اور وہی اجر و ثواب عطا کریں گے۔

دین "اتباع" کا نام ہے۔

جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ سارا دین "اِتباع" کے گرد گھومتا ہے، جیسے وہ کہیں ویسے کرو، اپنی عقل مت چلاؤ۔

چوں کہ بر میخت بہ بندد بستہ باش

چوں کشاید چابک و برجستہ باش

جب تک انہوں نے باندھ رکھا ہے تو تم بھی بندھے پڑے رہو، جب وہ کھول دیں تو خوب چھلانگیں لگاؤ۔

اس لئے اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے، اسی حال میں خوش رہو۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

لہٰذا جس حال کی اللہ تعالیٰ نے توفیق دی ہے بس اسی میں راضی رہو۔

اتباع اور تفویض اختیار کرلو

بس دو چیزیں اختیار کرلو: ایک "اتباع" دوسرے "تفویض"۔ اوامر و نواہی میں "اتباع" ہو اور حالات میں "تفویض" ہو۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو امر آرہا ہے اس کی اتباع کریں، جو نہی آرہی ہے اس کی اتباع کریں، اور دنیا میں جو حالات پیش آرہے ہیں اس میں "تفویض" اختیار کریں، تفویض کے معنیٰ ہیں اللہ تعالیٰ کے حوالے کرنا، اللہ پر بھروسہ کرنا کہ جو کچھ انجام ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہوگا اور خیر ہی ہوگا، اگر یہ دو چیزیں حاصل ہو جائیں بس سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قوی ہوگیا۔

نیک کام کی حسرت

اس ملفوظ کے آخر میں فرمایا کہ ”عذر کی وجہ سے گھر میں نماز پڑھو اور حرم کو ترستے رہو“۔ یہ ترسنا بھی اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، یعنی انسان کسی وجہ سے کوئی نیک عمل نہیں کرپایا، لیکن دل میں اس کے نہ کرنے کی حسرت ہو رہی ہے کہ کاش میرے اندر ایسی طاقت ہوتی اور میں بھی یہ نیک کام کرلیتا، یا میرے حالات ایسے ہوتے کہ میں اس فضیلت کو حاصل کرلیتا۔ یہ ”حسرت“ بھی بعض اوقات انسان کو بہت بلندی تک پہنچا دیتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور لوہار کا قصہ

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ فرمایا؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا کرم فرمایا، بڑے اونچے درجے عطا فرمائے، لیکن ہمارے گھر کے سامنے جو لوہار رہتا تھا، اس کو جو درجہ ملا وہ درجہ ہمیں نصیب نہ ہوا۔ حالانکہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ اتنے بڑے بزرگ، محدّث، فقیہ، صوفی، اللہ کے خاص نیک بندے تھے، اس کے باوجود ان کا درجہ لوہار کا سا درجہ نہ ہوا۔ لوگوں نے جاکر لوہار کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارے شوہر میں کیا ایسی خاص بات تھی جس کے نتیجے میں وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے بھی آگے بڑھ گیا اور حضرت

عبداللہ بن مبارکؒ اس کے درجے پر حسرت کر رہے ہیں؟ اس کی بیوی نے کہا کہ وہ کوئی خاص عمل تو نہیں کرتا تھا، سارا دن لوہا پیٹتا رہتا تھا، البتہ اس کے اندر دو باتیں تھیں، ایک یہ کہ جب اذان کی آواز اس کے کان میں آجاتی تو فوراً اپنا کام بند کر دیتا تھا، حتیٰ کہ اگر ہتوڑا مارنے کے لئے سر پر اٹھایا ہوا ہے، اسی وقت اذان کی آواز کان میں پڑی تو اس ہتوڑے سے چوٹ مارنا گوارا نہیں کرتا تھا، اس اٹھے ہوئے ہتوڑے کو پیچھے کی طرف ہی پھینک دیتا تھا اور اٹھ کر نماز کے لئے مسجد چلا جاتا تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ ہمارے گھر کے سامنے حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے، وہ اپنے مکان کی چھت پر رات کو اس طرح کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے جس طرح لکڑی کھڑی ہوئی ہو، میرا شوہر ان کو دیکھ کر بڑی حسرت کے ساتھ یہ کہتا تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو معاش سے فراغت عطا فرمائی ہے، اس کے نتیجے میں ساری رات کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں، اگر ہمیں بھی فراغت ہوتی تو ہم بھی رات کو کچھ عبادت کر لیا کرتے، لیکن معاش کی فکر کی وجہ سے سارا دن لوہا کوٹنے میں گزر جاتا ہے، پھر تھکاوٹ کی وجہ سے رات کو جاگنے کی ہمت نہیں ہوتی، ورنہ ہم بھی تہجد کی کچھ رکعتیں پڑھ لیا کرتے۔ یہ حسرت کیا کرتے تھے، لوگوں نے یہ سن کر کہا کہ بس یہی باتیں تھیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ درجہ عطا فرمایا جو حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کو نصیب نہ ہوا۔ بہر حال یہ حسرت بھی انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔

جسم وطن میں اور دل حرم میں

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جسم ہندوستان میں ہو اور دِل حرم شریف میں ہو، یہ بہتر ہے اس سے کہ جسم حرم شریف میں ہو اور دِل ہندوستان میں ہو۔ یعنی جسم تو یہاں ہے اور دل میں خواہش ہو رہی ہے کہ کاش ہم بھی حرمین شریفین کی نعمتوں سے بہرہ ور ہو رہے ہوتے، کاش کہ ہمیں بھی وہاں جانے کا موقع مل جائے تو ہم بھی وہاں پہنچ جائیں، یہ جذبہ، یہ خواہش، یہ حسرت، یہ تمنا دل میں ہے اور جسم اپنے وطن میں ہے،یہ صورت بہتر ہے اس سے کہ آدمی حرم میں بیٹھا ہوا ہے اور اپنے وطن کو یاد کر رہا ہے۔

حضرت مولانا بدر عالم رحمۃ اللہ علیہ کی ہجرت مدینہ

حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے بزرگوں میں سے گزرے ہیں، یہ ہجرت کر کے مدینہ طیّبہ چلے گئے تھے۔ آج کل تو ہجرت کرنا کوئی مشکل نہیں ہے۔ اس لئے کہ آج لوگ پیسے کمانے کے لئے ہجرت کرتے ہیں، کیونکہ وہاں پیسے بہت ملتے ہیں۔ اصل ہجرت تو اس زمانے کی تھی جب وہاں پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، صرف اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے لئے ہجرت ہوتی تھی۔ بہر حال! آپ نے اس طرح ہجرت فرمائی کہ ایک عرصے تک وہاں اس حال میں رہے کہ آپ

کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ عقل حیران ہوتی ہے کہ وہ وقت آپ نے کس طرح گزارا ہوگا؟

چنانچہ خود اپنا واقعہ سنایا کرتے تھے کہ جب میں پہلی مرتبہ مدینہ منورہ گیا تو وہاں کسی سے جان پہچان تو تھی نہیں، ایک کمرے میں جو تنگ و تاریک تھا، قیام کیا، وہاں مجھے بخار آگیا، اب وہاں پر نہ کوئی آنے والا نہ جانے والا، نہ مجھے کوئی دیکھنے والا، شدید بخار میں مبتلا، اور تین دن مجھ پر اس طرح گزرے کہ ایک دانہ بھی میرے منہ میں نہیں گیا، شدید بخار کی وجہ سے خود اٹھ کر بھی حرم نہیں جاسکتا تھا، کمزوری کی وجہ سے وہاں پر نماز پڑھنا مشکل ہو رہا تھا، تین دن کے بعد ایک شخص میرا نام "بدر عالم" "بدر عالم" پکارتا ہوا آیا، اپنے ساتھ کچھ دوا اور کھانا بھی لایا۔ حضرت مولانا نے اس شخص سے پوچھا کہ تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میرا نام "بدرعالم" ہے اور میں یہاں پر ہوں؟ اس شخص نے بتایا کہ میں نے ایک خواب دیکھا اور خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی، آپ ﷺ نے یہ نام بتایا اور کہا کہ جاکر ان کو دیکھو، وہ فلاں جگہ پر بیمار پڑا ہوا ہے، اور اس کی خبر گیری کرو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ مقام عطا فرمایا تھا۔

مدینہ میں رہتے ہوئے خارج مدینہ کی ضرورت

بہر حال! جب حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے تو ان کے پاس حضرت مولانا مفتی محمد حسن صاحب رحمۃ

اللہ علیہ نے خط لکھا، اس خط میں حضرت مفتی صاحب نے ایک جملہ یہ لکھ دیا کہ "آپ کو یہاں کی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا تکلّف مجھے ارشاد فرمادیں، میں وہ چیز بھیجنے کو اپنی سعادت سمجھوں گا۔" حضرت مولانا بدر عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے اس جملے کے جواب میں لکھا کہ:

مدینہ میں رہتے ہوئے خارج مدینہ کی ضرورت!!

اَمَّا اِلَیْكَ فَلَا۔

یعنی میں مدینہ میں رہتے ہوئے بھی اب اس بات کی فکر کروں کہ فلاں چیز فلاں جگہ ملتی ہے، یہ چیز وہاں سے منگواؤں، اس بات کو میری غیرت گوارا نہیں کرتی۔

اور "اَمَّا اِلَیْكَ فَلَا" سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا جارہا تھا تو حضرت جبرئیل امین علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ اگر میری کچھ ضرورت ہو تو میں کچھ مدد کروں؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں فرمایا:

اَمَّا اِلَیْكَ فَلَا۔

آپ کی مجھے کوئی ضرورت نہیں، ہاں مجھے اللہ جل جلالہ کی رحمت اور کرم کی ضرورت ہے، میں اس کا محتاج ہوں۔

اسی طرح حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ نے حضرت مفتی صاحبؒ کو

یہ جملہ لکھ دیا۔

مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں

بہر حال! اگر مدینہ میں آدمی رہے اور اس طرح رہے جس طرح حضرت مولانا بدر عالم صاحبؒ رہتے تھے، تب تو مزہ ہے، یہ نہ ہو کہ رہے تو مدینہ میں، دل لگا ہوا ہو پاکستان اور ہندوستان میں، اس سے بہتر یہ ہے کہ آدمی یہاں پاکستان میں رہے اور دل مدینہ کی طرف لگا رہے۔ امیر مینائی نے بڑا خوبصورت شعر کہا ہے ؎

مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہو جائے

کسی نے ان سے پوچھا کہ یہ کیا آپ نے کہا کہ مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں، ارے واپس ہی کیوں آؤں؟ وہیں کیوں نہ رہ پڑوں۔ انہوں نے کہا کہ مزہ اس میں ہے کہ مدینہ جاؤں، پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں۔ اسی لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ صورت بہتر ہے اس سے کہ آدمی وہاں رہے اور یہاں کے بارے میں سوچتا رہے۔

ہمّت کو استعمال کریں

ارشاد فرمایا کہ:

اختیاری امور میں کوتاہی کا علاج بجز ہمّت اور استعمالِ

اختیار کے کچھ نہیں، اسی پر مدار ہے تمام اصلاحات کا،
اور یہی ہے اصل علاج تمام کوتاہیوں کا۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۳)

آج لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب ہم کسی شیخ کے پاس جائیں گے تو وہ ایسی نظر ڈالے گا یا وہ ایسی پھونک مار دے گا جس سے دِل چل جائے گا اور دنیا بدل جائے گی، اور ہماری زندگیوں میں انقلاب آجائے گا۔ یاد رکھئے! یہ سب وقتی اثرات سے زیادہ کچھ نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اپنی ہمّت کو استعمال کئے بغیر اصلاح نہیں ہو سکتی۔

اگر صرف نظر ڈال دینے سے اور پھونک مارنے سے کام چلا کرتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جہاد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی، اور کسی تبلیغ و دعوت کی ضرورت نہ ہوتی، بس آپ ﷺ ایک نظر ڈال دیتے اور لوگ مسلمان ہو جاتے، لیکن آپ نے ایسا نہیں کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ تصرف کرنا اور نظر ڈال دینا اور پھونک مار دینا یہ معمول کے طریقے نہیں ہیں۔

"تصرفات" کی ایک مثال

البتہ بعض اوقات ان "تصرفات" سے فوری اور وقتی اثرات کے ذریعہ اصلاح حال میں کچھ مدد مل جاتی ہے، لیکن اس کی وجہ سے ہمیشہ کے لئے انسان کی کایا نہیں پلٹ جاتی، اگر کسی نے نظر ڈال دی، یا کوئی تصرف کر

دیا تو اس کے نتیجے میں آدمی اصلاح کے راستے پر چلنا شروع تو کر دیتا ہے، لیکن آگے بڑھنے کے لئے اور مستقل چلتے رہنے کے لئے اپنی ہمّت ہی کو استعمال کرنا ہوگا۔ ان "تصرفات" کی مثال ایسی ہے جیسے مثلاً گاڑی کا "سیلف اسٹاٹر" خراب ہو گیا، یا گاڑی کی بیٹری کمزور ہو گئی، اب اس گاڑی کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، لیکن وہ اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے، اب اس کو دھکا لگا کر اسٹارٹ کرنا ہوگا، چنانچہ دھکا لگانے کے نتیجے میں اس کی بیٹری میں تھوڑی سی قوت پیدا ہو گئی اور گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ اب آگے وہ اپنی بیٹری اور انجن کی قوّت سے چلے گی، لیکن اگر بیٹری میں اور انجن میں جان ہی نہیں ہے تو پھر کتنے بھی دھکے لگاتے رہو، وہ گاڑی چل کر نہیں دے گی۔

اسی طرح کسی بزرگ کا تصرف کر دینا یا توجہ ڈالدینا، یہ درحقیقت دھکا لگانا ہے، اس کے نتیجے میں انسان کے اندر کچھ نشاط اور جوش عمل پیدا ہو جاتا ہے، جس کی وجہ سے کچھ عمل کرنے کی توفیق ہو جاتی ہے۔ لیکن آگے عمل کو خود ہی جاری رکھنا ہوگا، یہ نہیں ہو سکتا کہ محض تصرف اور توجہ کے نتیجے میں ساری زندگی عمل ہوتا رہے، بلکہ آگے اپنے اختیار سے ہی عمل کرنا ہوگا۔

کوتاہی اور سستی کا علاج

یاد رکھئے! کوتاہی کا علاج اور سستی کا علاج بجز استعمال ہمّت کے کچھ اور

نہیں۔ کسی کام کے کرنے سے سستی ہو رہی ہے، اس کا راستہ یہ ہے کہ عزم اور ہمّت کر کے اس سستی کا مقابلہ کرے، اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں۔ کوئی شخص یہ چاہے کہ سستی کے علاج کے لئے کوئی نسخہ گھول کر پلا دیا جائے تو ایسا کوئی نسخہ آج تک وجود میں نہیں آیا۔ لوگ پوچھتے رہتے ہیں کہ حضرت! نماز میں بڑی کوتاہی اور سستی ہو جاتی ہے، اس کے لئے کوئی وظیفہ بتا دیجئے۔ ارے بھائی! اس کے لئے سب سے بڑا وظیفہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہمّت دی ہے، اس ہمّت کو استعمال کرو، جب اس ہمّت کو استعمال کرو گے تب تمہارا کام بنے گا، جھاڑ پھونک سے یہ کام نہیں بنا کرتا، ہمّت سے کام بنتا ہے۔

انسان کی ہمّت میں طاقت

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمّت میں بڑی طاقت رکھی ہے، اتنی طاقت رکھی ہے کہ کوئی حد و حساب نہیں، اللہ تعالیٰ اس ہمّت کے ذریعہ بڑے بڑے کام کرا دیتے ہیں جو انسان کے تصور میں نہیں آسکتے، اس ہمّت کے نتیجے میں انسان چاند تک پہنچ گیا، ورنہ پہلے چاند پر جانے کو ناممکن سمجھا جاتا تھا، لیکن جب ہمّت کی تو پہنچ گیا، لہٰذا جب ہمّت کر کے انسان چاند پر پہنچ سکتا ہے تو اپنے نفس پر کیوں قابو نہیں پا سکتا اگر قابو کرنا چاہے۔

میرا ایک شعر ہے کہ:

کمندیں ڈال رکھی ہیں میری ہمّت نے تاروں پر

مگر ابتک دلِ ناداں کی نادانی نہیں جاتی

یعنی ہمّت نے تو تاروں پر کمندیں ڈال رکھی ہیں، اور چاند پر اور مریخ پر اور زہرہ پر پہنچ گیا، مگر اس دل پر اب تک قابو نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا جب انسان ان چیزوں پر قابو پاسکتا ہے تو اس نفس اور دل پر قابو کیوں نہیں پاسکتا؟ بس انسان اس کا مراقبہ کرے اور اپنی ہمّت کو تازہ کرے، یہی راستہ ہے، اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں ہمّت عطا فرمائے اور ہمارے اعمال و اخلاق کی اصلاح فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۷

تصرف کی حقیقت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸ ۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۷

صفحات : ۱۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر ۲۷

تصرّف کی حقیقت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین ۔ والعاقبة للمتقین ۔ والصّلاة والسّلام علی رسوله الکریم۔ وعلی آله وأصحابهٖ اجمعین ۔ أمّا بعد!

حضرت والا کا ارشاد ہے کہ:

اگر یہ خیال ہو کہ بعض بزرگوں کی توجہ سے بڑے بڑے بدکاروں کی خود بخود اصلاح ہو گئی ہے تو یہ ایک قسم کا تصرف ہے اور ایسا تصرف نہ اختیاری ہے اور نہ بزرگی کے لئے لازم ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۴)

جیسا کہ پہلے عرض کیا تھا کہ انسان کو عمل کرنے کے لئے اپنی ہمّت کو اور اپنے ارادے اور اختیار کو استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، یہ جو تصوّر ہے کہ جب ہم کسی شیخ کے پاس جائیں گے تو وہ ایسی نگاہ ڈال دے گا کہ اس کے نتیجے میں ہماری زندگی کی کایا پلٹ جائے گی۔ یہ بات اس عموم کے ساتھ درست نہیں۔

حافظ شیرازی کا واقعہ

البتہ دل میں یہ خیال آتا ہے کہ بعض بزرگوں کے واقعات ایسے ملتے ہیں کہ بڑے بڑے بدکار لوگ ان کے پاس پہنچے، ان بزرگ نے ان پر توجہ ڈالی، اس کے نتیجے میں ان بدکاروں کی اصلاح ہوگئی۔ مثلاً حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ویسے ہی جنگل میں آوارہ پھرا کرتے تھے، بچپن ہی سے شعر بہت کہتے تھے، ان کے والد حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے، ایک مرتبہ حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ اپنے مرید کے گھر آئے تو انہوں نے اپنی ساری اولاد کو حضرت کے سامنے پیش کیا اور ان کے لئے دعا کرائی، حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ نے سب کے سروں پر ہاتھ پھیرا اور سب کو دعائیں دیں۔

حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ جنگل میں آوارہ پھرا کرتے تھے، حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ نے پوچھا کہ تمہارا ایک لڑکا اور بھی تو ہے، وہ کہاں ہے؟ ان کے والد نے کہا کہ وہ تو کہیں جنگل میں آوارہ پھر رہا ہوگا،

آپ نے فرمایا کہ اس کو بھی بلاؤ، ان کے والد نے ایک آدمی بھیجا، یہ جنگل میں پھر رہے تھے، اس نے جا کر ان کو پکڑا اور ان سے کہا کہ تمہارے والد بلا رہے ہیں، شاید یہ بھی بتا دیا کہ ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں، ان سے تمہارے لئے دعا کرانی ہے۔

یہ سن کر حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ قاصد کے ہمراہ چلے آئے، جب گھر میں داخل ہوئے اور دیکھا کہ شیخ نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہیں تو ان کو دیکھ کر یہ شعر پڑھا:

آناں کہ خاک را بنظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

وہ لوگ جو اپنی ایک نظر سے مٹی کو کیمیا بنا دیتے ہیں، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ ایک سرسری سی نظر ہمارے اوپر بھی ڈال دیں۔

شیخ نے وہیں بیٹھے بیٹھے جواب میں فرمایا:

نظر کردم، نظر کردم، نظر کردم

بس! ایک نظر ڈالنا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی برکت سے اس صاحبزادے کو جو جنگلوں اور بازاروں میں آوارہ گھوم رہے تھے، کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اور اب اونچے درجے کے صوفیاء کرام میں ان کا شمار ہوتا ہے، ان کی ساری شاعری تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جیسے بزرگ نے ان کے دیوان کی شرح "عرفان حافظ" کے نام سے

لکھی ہے۔ ان کے دیوان کا نام "دیوان حافظ" ہے۔

"تصرّف" اختیاری نہیں

اب یہ جو کچھ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہوا، بظاہر تو یہ ہوا کہ حضرت نجم الدین صغریٰ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نگاہ ڈال دی اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے انقلاب برپا کر دیا۔ چنانچہ آج بھی لوگوں کی یہ تمنا ہوتی ہے کہ ہمیں بھی ایسا ہی کوئی نگاہ ڈالنے والا اور کوئی تصرف کرنے والا مل جائے تو اس سے ہمارا کام بن جائے۔

اس کے جواب میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ:

> اگر یہ خیال ہو کہ بعض بزرگوں کی توجہ سے بڑے بڑے بدکاروں کی خود بخود اصلاح ہو گئی، تو یہ ایک قسم کا تصرف ہے (یعنی کسی بزرگ نے اگر ایسا کیا تو یہ محض تصرف خیالی ہے) اور ایسا تصرف نہ اختیاری ہے اور نہ بزرگی کے لئے لازم ہے۔

یعنی کسی بزرگ کے اختیار میں نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہیں تصرف کر دیں، یا اس تصرف کرنے کا کوئی خاص طریقہ ہو، یا کسب کے ذریعہ یہ فن اور ملکہ حاصل ہو جائے، پھر جب چاہیں جس پر چاہیں تصرف کر کے اس کے حالات بدل دیں۔ یاد رکھئے! ایسا نہیں ہے۔

بلکہ یہ تصرف کرنا یا اس کو حاصل کرنا کسی کے اختیار میں نہیں ہے،

بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دَین ہوتی ہے، جس کو چاہتے ہیں عطا فرمادیتے ہیں، اور اس وقت عطا فرماتے ہیں جب اپنے کسی خاص بندے کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں۔ جیسے قرآن کریم کے اندر ارشاد ہے:

اَللّٰهُ يَجْتَبِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ وَيَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ۔

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں تو کسی بزرگ کو ذریعہ بنادیتے ہیں، اور اس کی نگاہ میں اور اس کے خیالات میں تاثیر پیدا فرمادیتے ہیں، ورنہ خود سے ان بزرگ کے اندر یہ طاقت نہیں ہے کہ اپنے اندر تصرف کا ملکہ پیدا کریں۔ لہٰذا اصل میں تو تصرف کرنے والے اللہ تعالیٰ ہیں، البتہ بزرگ کو ذریعہ اور واسطہ بنا دیتے ہیں۔ اس لئے یہ "تصرف" اختیاری نہیں۔

تصرف بزرگی کے لئے لازم نہیں

دوسری بات یہ ہے کہ یہ "تصرف" بزرگی کے لئے لازم نہیں۔ لہٰذا یہ نہ سمجھا جائے کہ جو بھی بزرگ ہوگا اس کو ضرور "تصرف" کرنا آتا ہوگا۔ کتنے اولیاء اللہ ایسے گزرے ہیں جن کو تصرف کرنا نہیں آتا تھا، اس کی وجہ سے ان کے کمال میں کوئی نقص نہیں آیا۔ اصل کمال یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتوں کی اتباع ہو، سارے کمالات کا مرجع اور ماویٰ اور تمام کمالات کا منتہا یہ ہے کہ ہر گوشہ زندگی میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتوں کی اتباع ہو، تصرف حاصل ہوا یا نہیں؟ کوئی کشف ہوا یا

نہیں، کوئی الہام آیا کہ نہیں آیا، کوئی خواب نظر آیا کہ نہیں آیا، کوئی کرامت ظاہر ہوئی یا نہیں؟ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اگر عطا ہو جائے تو اللہ کی نعمت ہے، اگر عطا نہ ہو تو کوئی پریشانی کی اور نقص کی بات نہیں۔ لہٰذا اگر کسی بزرگ میں یہ بات موجود نہ ہو تو آدمی یہ نہ سمجھے کہ اس کی بزرگی میں نقص ہے۔

بلکہ ہمارے بزرگ تو ان خوارق سے دور ہٹتے ہیں اور ان کو پسند نہیں کرتے، ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ یہ خوارق ان سے ظاہر ہی نہ ہوں تو بہتر ہے، اس لئے کہ ان میں خطرات بہت ہیں، کیونکہ آج اگر کسی کو ذرا کشف ہو جائے گا تو وہ اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا سے کیا سمجھ بیٹھے گا اور اس کے دماغ میں کیسا خناس پیدا ہو جائے گا، اور پھر لوگوں پر اپنی بڑائی جتانے لگے گا اور اس کی وجہ سے کبر اور عجب پیدا ہو جائے گا، اس طرح وہ گناہ کبیرہ میں مبتلا ہو جائے گا۔

حضرت حاجی صاحبؒ کا ایک واقعہ

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ کھانا کم تھا، اور کھانے والے زیادہ تھے، تو آپ نے اپنا رومال اس کھانے پر ڈال دیا جس کی برکت سے وہ کھانا پورا ہو گیا۔

حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت حاجی صاحبؒ کے دوست اور ہمعصر تھے اور ایک ہی خانقاہ میں بیٹھتے تھے، ان کو جب رومال

ڈالنے کے بارے میں پتہ چلا تو حاجی صاحب سے کہا کہ واہ، اب آپ کا رومال سلامت چاہئے، اب دنیا میں کسی کو کسی چیز کی قلت نہیں ہوا کرے گی، گویا کہ انہوں نے اس عمل پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ آپ نے یہ اچھا کام نہیں کیا، اس سے لوگوں کا عقیدہ خراب ہو جائے گا کہ بس رومال ڈالو اور چیزوں میں اضافہ کرالو۔ اس پر حضرت حاجی صاحبؒ نے ندامت کا اظہار کیا کہ واقعۃً مجھ سے غلطی ہوئی، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ لہٰذا ہمارے حضرات ان چیزوں سے بچتے تھے۔

کشف و کرامات سے گمراہی کی طرف

چنانچہ جہاں کہیں لوگوں میں کشف، کرامات، الہامات کا ذوق پیدا ہو جاتا ہے تو اگرچہ شروع میں تو حدود سے تجاوز نہ ہو، لیکن جب آگے بڑھتے ہیں تو اس کے نتیجے میں گمراہی میں مبتلا ہو ہی جاتے ہیں۔

پیراں نمی پرند مریداں می پرانید

یعنی پیر اگر گمراہ نہیں ہوتے تو مرید آگے چل کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ چند سال پہلے ایک صاحب کے ساتھ ایسے واقعات پیش آئے تو وہاں پر شروع شروع میں ایسی کوئی خرابی کی بات نظر نہیں آتی تھی، لیکن جب ان باتوں پر زیادہ زور دیا گیا تو اس کے نتیجے میں وہ گمراہی کے راستے پر پڑ گئے۔ اس لئے ہمارے حضرات ان کشف و کرامات کے چرچے اور ان کی

طرف توجہ رکھنے کو پسند نہیں فرماتے۔

اللہ تعالیٰ ظرف کے مطابق دیتے ہیں

جس سے بعض لوگوں کو یہ بھی خیال گزرا کہ شاید ان حضرات میں یہ چیزیں تھی ہی نہیں، اور بالفرض اگر یہی مان لیا جائے کہ آج کل کے بزرگوں میں یہ چیزیں ہیں ہی نہیں تو اس سے بھی یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ چیزیں اختیاری نہیں ہیں۔ اب رہا یہ اعتراض کہ پہلے زمانے میں جو اولیاء اللہ ہوتے تھے، وہ تو بڑے کشف و کرامات والے بزرگ ہوتے تھے، ان کے کشف کے ایک سے ایک واقعات سننے میں آتے تھے، اب کوئی اللہ کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا، اب تو نہ کشف ہے نہ کرامت ہے، ایسے اللہ والے کہاں سے لائیں، ایسا بزرگ تو اب ملتا نہیں ہے۔ اس کا جواب وہ ہے جو غالب نے ایک مصرعہ میں کہا ہے کہ:

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

ممکن ہے کہ آج کل ایسی کیفیات کے عمومی اظہار سے بزرگوں کو خود چاہے نقصان نہ ہو مگر عوام الناس کو اس سے نقصان کا خطرہ زیادہ ہے، اس لئے ان کیفیتوں میں کمی کر دی گئی ہو۔ پھر یہ چیزیں فضیلت، شرافت اور بزرگی کا معیار بھی نہیں ہیں اور نہ بزرگی کے لئے یہ چیزیں لازم ہیں۔ لہٰذا جب کسی بزرگ کے پاس جاؤ تو یہ سوچ کر مت جاؤ کہ ان کو یہ چیزیں حاصل ہوں گی۔

تصرف کے اثر کو بقا نہیں

آگے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

بہت سے بزرگوں میں تصرف مطلق نہیں ہوتا، نیز تصرف کے اثر کو بقا نہیں ہوتی۔

جیسے پہلے عرض کیا تھا کہ "تصرف" کے اثر سے وقتی طور پر ذرا سی گرمی پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اس اثر کو بقا نہیں ہوتا، آگے کام اپنی ہمّت اور اختیار سے چلے گا اور اپنے عمل سے چلے گا، "تصرف" کا عمل صرف گاڑی کو دھکا لگانے کی طرح ہے، "تصرف" نے تو ایک دھکا لگا دیا، لیکن آگے گاڑی اپنے انجن کی طاقت سے چلے گی۔

تصرف کی مثال

پھر آگے حضرت والا نے "تصرف" کی ایک مثال دیتے ہوئے فرمایا:

اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص تنور کے پاس بیٹھ گیا تو جب تک وہاں بیٹھا ہوا ہے تمام بدن گرم ہے، مگر جیسے ہی وہاں سے ہٹا پھر ٹھنڈا کا ٹھنڈا، بخلاف اس کے جو (اپنی) ہمّت اور (اپنے) اعمال کے ذریعے اثر ہوتا ہے وہ باقی رہتا ہے۔

اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے کشتہ طلا کھا کر

اپنے اندر حرارت غریزی پیدا کرلی تو اگر وہ شملہ پہاڑ پر بھی چلا جائے گا تب بھی وہ حرارت بدستور باقی رہے گی۔

(انفاس عیسی ص ۱۵)

"تصرف" اور اپنی "ہمت" دونوں کو دو مثالوں کے ذریعہ سمجھا دیا کہ "تصرف" کے نتیجے میں جو حرارت پیدا ہوتی ہے وہ عارضی ہوتی ہے، وہ فنا ہو جانے والی ہے، جیسے تنور کے پاس بیٹھنے والے کے جسم میں حرارت تو پیدا ہوئی لیکن وہ حرارت عارضی ہے، جلد ختم ہو جائے گی۔ اسی تصرف کے نتیجے میں یہ ہوتا ہے کہ کچھ دیر کے لئے ذرا سا نشاط پیدا ہوگا پھر ختم ہو جائے گا، آگے عمل پھر اپنی ہمت سے ہی کرنا ہوگا۔ اور مجاہدہ اور ریاضت کے ذریعہ اور اپنی ہمت کے ذریعہ جو عمل کیا جاتا ہے اس کو بقا ہوتی ہے، وہ پائیدار ہوتا ہے، وہ جلدی فنا نہیں ہوتا۔

ہمّت اور اعمال کی مثال

اس کو بھی دوسری مثال کے ذریعہ سمجھایا کہ جیسے کسی شخص نے سونے کا کشتہ کھا کھا کر اپنے اندر حرارت غریزی پیدا کرلی ہو تو اگر وہ شملہ پہاڑ پر بھی چلا جائے گا تب بھی اس کی حرارت بدستور باقی رہے گی۔ اس لئے اس فکر میں نہیں پڑنا چاہئے کہ کوئی تصرف کر دے، بلکہ سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ سنّت کا جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، اس پر

عمل کرنا شروع کردو۔ کسی نے خوب کہا ہے کہ:

بر صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

سنّت کے راستے پر چلنے سے گمراہی کا کوئی خطرہ نہیں، بس اس کو اختیار کرلو۔

اتباعِ سنّت سے وصول تیزی سے ہوتا ہے

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مختلف بزرگوں نے جو مختلف راستے اختیار کئے ہیں، اور مختلف قسم کے مجاہدات، مختلف قسم کی ریاضتیں اپنے اپنے تجربات سے اختیار کی ہیں اور مختلف قسم کے تصرفات اختیار کئے ہیں، ان راستوں کے ذریعہ "وصول الی اللہ" دیر سے ہوتا ہے۔ ایک راستہ اتباعِ سنّت کا ہے، اتباعِ سنّت کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی کوئی کتاب جیسے مثلاً "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" سامنے رکھو اور اس میں دیکھو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیا سنّتیں بیان کی گئی ہیں، ان میں سے ایک ایک سنّت لے کر اس پر عمل کرتے رہو، اور جس سنّت پر عمل کرنے کی عادت نہیں ہے اس کی عادت ڈالتے جاؤ۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "اتباعِ سنّت" کے راستے سے وصول تیزی سے ہوتا ہے۔

اتباعِ سنّت میں "محبوبیت" کی شان

پھر اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ "اتباعِ سنّت" کی خاصیت "محبوبیت" ہے۔ جیسے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبّت کرتے ہو تو میری اتباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبّت کریں گے، اور تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن جاؤ گے۔ پہلے فرمایا کہ اگر تم اللہ سے محبّت کرتے ہو، پھر آگے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔

لہٰذا اتباعِ سنّت کے اندر محبوبیت کی شان پائی جاتی ہے، اور وہ مخلوق کی محبوبیت نہیں ہے، بلکہ اللہ جلّ شانہ کی محبوبیت ہے۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جس وقت کوئی مسلمان بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت اتباعِ سنّت کی نیت سے اپنا بایاں پاؤں داخل کر رہا ہے اور یہ دعا پڑھ رہا ہے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ

اس وقت وہ مسلمان اللہ تعالیٰ کا محبوب بن رہا ہے۔ لہٰذا جو شخص اتباعِ سنّت کر رہا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بن رہا ہے، گویا کہ اللہ "محب" اور وہ شخص "محبوب" اور محبّت کی خاصیت ہے جذب کرنا، یعنی محبّ محبوب کو اپنی طرف کھینچتا ہے اور محبوب محبّ کو اپنی طرف کھینچتا ہے، اس لئے جب

انسان اتباعِ سنّت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا محبوب بن جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، اس طرح جذب کے ذریعہ اس کو وصول الی اللہ حاصل ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کھینچ لیں گے تو اس کے ذریعہ وصول جلدی ہوگا، اس کے مقابلے میں اگر انسان خود چل کر جائے تو وصول دیر سے ہوگا۔ اس لئے فرمایا کہ اتباعِ سنّت میں وصول تیزی سے ہوتا ہے، اور دوسرے ذرائع جو صوفیاء کرام نے اخیار کئے ہیں، وہ سب طریقے بھی جائز اور مباح ہیں، لیکن ان کے ذریعہ وصول اتنی تیزی سے نہیں ہوتا۔

ایک ایک سنّت پر عمل کرتے جاؤ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ارے میاں! تصوف کی ان اصطلاحات کے پھیر میں مت پڑو، سیدھا سیدھا عمل کرو، وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جو سنّتیں منقول ہیں، ان میں سے ایک ایک سنّت کو سیکھتے جاؤ اور ان پر عمل کرتے جاؤ، انشاء اللہ منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ اسی لئے ہمارے بزرگوں کی تعلیم و تربیت کا خلاصہ "اتباعِ سنّت" ہے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے میں نے تمہارے لئے ایک ڈائری بنا دی ہے اور اس میں سب سنّتیں لکھ دی ہیں کہ اس طرح سونا ہے، اس طرح جاگنا ہے، اس طرح اٹھنا ہے، اس طرح بیٹھنا ہے، اس طرح کھانا ہے، اس طرح پینا ہے،

اس طرح باتیں کرنی ہیں۔

تمام سنّتوں پر عمل کرو

البتہ میں سب حضرات سے ایک بات اور عرض کرتا ہوں کہ اتباع سنت کی کچھ باتیں تو مشہور ہیں، مثلاً یہ کہ جب مسجد میں داخل ہوں تو دایاں پاؤں پہلے داخل کرو، اور جب باہر نکلو تو بایاں پاؤں پہلے داخل کرو۔ کھانا داہنے ہاتھ سے کھاؤ، کھانے سے پہلے ہاتھ دھولو، بسم اللہ پڑھ کر شروع کرو، بیٹھ کر پانی پیو، تین سانس میں پانی پیو، پانی پینے کے بعد الحمد للہ کہو، وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتیں ہیں، اور قابل تقلید ہیں، سب میں بڑی فضیلت ہے۔ لیکن سنّتیں صرف ان کے اندر محدود نہیں ہیں، بلکہ لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں، ہمارے اخلاق کیسے ہونے چاہئیں، حلم اور بردباری اختیار کرنا، غصہ نہ کرنا، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا یہ سب بھی سنّتیں ہیں۔ لہٰذا اخلاق سے متعلق، معاملات سے متعلق، معاشرت سے متعلق بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتیں ہیں۔ مثلاً یہ بھی سنت ہے کہ جب تولو تو جھکتا ہوا تولو، اور دوسرے کو بڑھتا ہوا دو، اور اگر دوسرے سے کوئی حق لینا ہے تو اس کے خاطر تھوڑا حق چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دو، اور جب دوسرے کو دینا ہے تو زیادہ کرکے دو، دینے میں اپنے دل کو کشادہ رکھو۔ یہ سب بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّتیں ہیں۔ لہٰذا جس طرح ان مشہور سنّتوں پر عمل کرنے کا

جتنا اہتمام کرتے ہیں، اتنا ہی ان سنّتوں پر بھی عمل کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ سب کو بھی ان سنّتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۸

جبلی صفاتِ رذیلہ کی اصلاح

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۸

صفحات : ۱۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۲۸

جبلّی صفات رذیلہ کی اصلاح

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ العٰلمین ۔ والعاقبة للمتقین ۔ والصّلاۃ والسّلام علی رسوله الکریم ۔ وعلٰی آله وأصحابهٖ اجمعین ۔ أمّا بعد!

مادہ جبلّی فعل اختیاری

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

اگر یہ شبہ ہو کہ جبلّت تو کسی کی بدل نہیں سکتی، پھر جبلّی صفات رذیلہ کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے؟ تو خوب سمجھ لو کہ مادہ جبلّی ہوتا ہے، مگر فعل اختیار میں ہے، پس مادہ بیشک زائل نہیں ہوتا، مگر اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنا نہ کرنا اختیار میں ہے، اور اسی کا انسان مکلّف ہے، اور بار بار اس مقتضیٰ کی مخالفت کرنے سے وہ مادہ

بھی ضعیف ہو جاتا ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۵)

اس ملفوظ سے حضرت والا یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ بعض اوقات یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر جتنی صفات رذیلہ ہوتی ہیں، بسااوقات انسان کے اندر ان صفات کا مزاج ڈھلا ہوا ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ صفات جبلّی ہیں۔

غصہ جبلّی صفت ہے

مثلاً کسی شخص کے بارے میں مشاہدے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کے اندر غصہ زیادہ ہے، اب غصہ کا زیادہ ہونا جبلّی صفت ہے، بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر غصہ بہت کم ہوتا ہے، فطری اور پیدائشی طور پر وہ نرم مزاج ہوتے ہیں، ان کو غصہ بہت کم آتا ہے۔ اور بعض افراد ایسے ہوتے ہیں جن کے اندر پیدائشی اور طبعی طور پر غصہ زیادہ ہوتا ہے، جبلّی طور پر وہ غصہ ور آدمی ہے۔ جبلّی صفت اس کو کہتے ہیں جو کبھی زائل نہ ہو، وہ صفت انسان کے اپنے اختیار سے باہر ہوتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ صفت کیسے زائل ہو؟ اور اس کو انسان کیسے ختم کرے؟

حضرت والا اس شبہ کا جواب دے رہے ہیں کہ یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ ان صفات کو بذات خود زائل کرنے کا انسان مکلّف نہیں، بلکہ انسان اس بات کا مکلّف ہے کہ اس جبلّی صفات کے جو ناجائز تقاضے دل میں پیدا ہوتے ہیں، ان تقاضوں پر اپنے اعضاء اور جوارح سے عمل نہ کرے

اور یہ انسان کے اختیار میں ہے۔

مثلاً اگر کسی شخص میں غصہ زیادہ ہے تو یہ اس کے اختیار میں نہیں کہ وہ غصہ بالکلیہ ختم ہو جائے، وہ غصہ تو ایک جبلّی صفت ہے جو ختم نہیں ہو سکتی، وہ تو باقی رہے گی، لیکن اس انسان کے اختیار میں یہ ہے کہ جب غصہ آئے تو اس غصہ کا کوئی غیر شرعی مظاہرہ اپنے ہاتھ اور زبان سے نہ کرے۔ بس انسان اس کا مکلّف ہے اور یہ اختیار میں ہے۔

غصہ کے مقتضیٰ پر عمل

اسی وجہ سے غصہ کا آنا بھی کوئی گناہ نہیں اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنا بھی ہمیشہ گناہ نہیں ہوتا، لیکن غصہ کے مقتضیٰ پر عمل کرنا اس وقت جب کہ وہ غصہ بے محل ہو، یہ گناہ ہے۔ مثلاً ایک شخص نے آپ کے اوپر حملہ کر دیا، اب آپ کو اپنی جان بچانے کے لئے اور اپنا مال بچانے کے لئے اس کا دفاع کرنے کی ضرورت ہے، اور اس حملہ کرنے کے نتیجے میں جو غصہ آیا ہے، اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اب اگر اس موقع پر آدمی تواضع سے کام لینے لگے تو یہ درست نہیں، بلکہ اس موقع پر غصہ کے مقتضیٰ پر حد کے اندر رہتے ہوئے عمل کرنا جائز ہے۔

لیکن جہاں غصہ کے مقتضیٰ پر عمل کرنا جائز نہیں، یا جائز تو ہے مگر مناسب نہیں، مثلاً ابتداءً جو سالک شیخ سے تعلق قائم کرتا ہے تو شیخ اس کو یہ بتاتا ہے کہ تم غصہ بالکل مت کرنا، نہ تو جائز غصہ کرنا اور نہ ہی ناجائز

غصہ کرنا، یعنی جہاں غصہ کرنے کا جائز محل ہو، وہاں بھی غصہ نہ کرنا، کیونکہ ابھی اگر جائز جگہ پر بھی تم غصہ کرو گے تو اندیشہ اس بات کا ہے کہ کہیں ناجائز غصے میں نہ پڑ جاؤ، کیونکہ ابھی غصہ پر قابو پیدا نہیں ہوا ہے، اس لئے شیخ کہتا ہے کہ تم غصہ بالکل مت کرو۔ اب اس سالک کے لئے جائز محل میں غصہ کرنا جائز تو ہے لیکن غصہ پر ضبط کی تربیت کے لحاظ سے مناسب نہیں۔ اسی لیے شیخ نے غصہ کرنے سے منع کیا ہے۔

اس وقت غصہ پر عمل مت کرو

بہر حال! غصہ کا آنا کوئی مذموم نہیں، لیکن غصہ آنے کے بعد اس غصے کے تقاضے پر عمل کرنا بسا اوقات مذموم ہے، مثلاً غصہ آیا اور دل چاہا کہ فلاں کو ایک تھپڑ کھینچ کر ماروں اور تھپڑ مار دیا حالانکہ مارنے کا حق نہیں تھا یا مارنے کا حق تو تھا لیکن جتنا مارنے کا حق تھا، اس سے زیادہ مار دیا۔ یہ ہے غصہ کے مقتضیٰ پر ناجائز عمل اور یہ گناہ ہے۔ لہٰذا جب غصہ آیا تھا اور اس کے نتیجے میں دل میں جو ہیجان پیدا ہوا تھا، اس ہیجان کے پیدا ہونے پر کوئی مؤاخذہ نہیں، وہ ہیجان کوئی گناہ نہیں، لیکن اس ہیجان پر جو مظاہرہ کیا کہ زور سے تھپڑ مار دیا، اب یہ گناہ ہو گیا۔

غصہ میں بچے کو مارنا

مثلاً ایک استاد کو یہ حق تھا کہ وہ اپنے شاگرد کو تادیباً مار لے، لیکن اس کو صرف یہ حق تھا کہ وہ تادیباً اتنا مارے جس میں ایلام اور تکلیف نہ ہو، اس

سے زیادہ مارنا جائز نہیں تھا، لیکن جب استاذ کو غصہ آیا تو اس کے نتیجے میں اس نے شاگرد کو اتنا مار دیا کہ اس کے بدن پر نیل پڑ گئے، یا اس شاگرد کو حد سے زیادہ تکلیف پہونچ گئی، تو یہ حرام کا ارتکاب ہوا، اور یہ ایسا حرام ہے کہ اس کی معافی بھی آسان نہیں، کیونکہ بسا اوقات وہ شاگرد نابالغ بھی ہوتا ہے، جو اگر معاف کر بھی دے تو بھی معاف نہیں ہوتا، اس لئے یہ بڑا خطرناک گناہ سرزد ہوا جس کا محرک یہی غصہ تھا۔

اب دیکھئے کہ اس ہیجان کا پیدا ہونا تو گناہ نہیں تھا، لیکن ہیجان آنے پر بچے کو زور سے ڈنڈی مار دی، اب یہ گناہ ہو گیا، یہ حرام فعل ہو گیا۔ لہٰذا اس ہیجان کے مقتضیٰ پر عمل کرنا حرام ہے، اور اس مقتضیٰ پر عمل کرنا نہ کرنا اختیار میں ہے۔ دیکھئے! غصہ آنا نہ آنا اختیار میں نہیں، کیونکہ وہ جبلّی ہے، لیکن مارنا نہ مارنا اختیار میں ہے، بس یہی امتحان ہے کہ جب غصہ آیا تو اس غصّے کے مقتضیٰ پر عمل کیا یا نہیں؟ اگر عمل کر لیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نفس کے آگے آپ نے ہتھیار ڈال دیے، لیکن اگر نفس کے آگے ڈٹ گیا اور یہ تہیّہ کر لیا کہ چاہے کتنا بھی غصہ آئے، لیکن نہیں ماروں گا، تو بس اس نے غصّے پر قابو پا لیا۔

غصہ کے وقت یہ سوچا کرو

اسی طرح طبیعت میں ہیجان اور اشتعال پیدا ہوا اور دل چاہا کہ فلاں شخص کو خوب گالیاں دوں، اس کے ماں باپ کو اور اس کے خاندان کو

گالیاں دوں اور سب کو برا بھلا کہوں، لیکن یہ سوچا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور اپنے آپ کو بُرا بھلا کہنے سے روک لیا، یہ روکنا اس کے اختیار میں تھا، تو اس روکنے پر اس کو اجر ملے گا، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ۔

بہرحال جتنے رذائل جبلّیہ ہیں، ان کا زائل کرنا چونکہ انسان کے اختیار میں نہیں، اس لئے ان کو زائل کرنے کا انسان مکلّف بھی نہیں، بس انسان اس بات کا مکلّف ہے کہ ان جبلّی صفات کو اپنے اختیار سے بے محل استعمال نہ کرے۔

"حسد" ایک فطری جذبہ ہے

اسی طرح "حسد" ایک فطری اور جبلّی جذبہ ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر ہمارے دل میں اس بات کا داعیہ اور خواہش پیدا ہو رہی ہے کہ اس شخص سے یہ نعمت زائل ہو جائے، اس کو یہ نعمت کیوں مل گئی؟ اس کا بنگلہ اتنا اچھا کیوں بن گیا؟ اس کو اتنے پیسے کیوں حاصل ہوگئے؟ اس کو اتنی شہرت کیوں مل گئی؟ اس کو ایسا منصب کیوں مل گیا؟ یہ منصب اس سے چھن جائے، ان خواہشات کا نام "حسد" ہے۔ اب غور سے سنو!

غیر اُختیاری طور پر ان خواہشات کا دل میں پیدا ہو جانا گناہ نہیں،

مثلاً غیر اختیاری طور پر دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ فلاں شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا، اگر یہ مجھ سے آگے نہ بڑھتا تو اچھا تھا (خوب اچھی طرح سمجھ لو، اس لئے کہ یہ نازک بات ہے) یہ خواہش جو غیر اختیاری طور پر دل میں پیدا ہو رہی ہے، یہ بذات خود کوئی گناہ نہیں، لیکن جب یہ خواہش پیدا ہوئی تو اس خواہش کو بروئے کار لانے کے لئے کوئی عمل کر لیا۔ مثلاً یہ دعا کر لی کہ یا اللہ! اس کی یہ دولت چھن جائے۔ بس یہ گناہ اور حرام کام ہو گیا، اس لئے کہ اس خواہش کے داعیے اور مقتضیٰ پر عمل کر لیا۔ یا مثلاً اس کی کسی سے شکایت کر دی کہ فلاں آدمی کو تم نے ملازم رکھ لیا، وہ تو صحیح آدمی نہیں ہے، تم اس کو ملازمت سے نکال دو، بس یہ عمل حرام ہو گیا۔ یا کسی سے اس کی برائی کر دی کہ وہ تو ایسا ہے، یا کسی بہانے سے اسے رسوا کرنے کی کوشش کر ڈالی، بس یہ حرام ہے۔

لہٰذا محض دل میں خواہش کا پیدا ہونا، یا کسی کو دولت حاصل ہونے پر دل میں اس کی طرف سے غیر اختیاری طور پر کراھیت کا پیدا ہونا بذات خود حرام نہیں جب تک انسان اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کرے، لہٰذا خواہش جو دل میں پیدا ہو رہی ہے، یہ "حسد" ہے لیکن یہ حسد حرام کی حد تک نہیں پہنچا۔

خواہش کا زیادہ دیر دل میں رہنا

البتہ اس خواہش کا زیادہ عرصے تک دل میں رہنا بڑا خطرناک ہے، خطرناک اس لئے ہے کہ جب زیادہ عرصے تک دل میں یہ خواہش رہے گی تو

کسی نہ کسی وقت انسان کو ایسے فعل پر آمادہ کردے گی جو حرام ہوگا، اور بہت ممکن ہے کہ اس وقت آدمی کو اس کا احساس بھی نہ ہونے پائے کہ میرا یہ فعل میرے جذبہ حسد کی کارفرمائی ہے، اس لئے اس خواہش کو ختم کرنا بھی ضروری ہے، کیونکہ ابھی تو اس کا زہر نکلا ہوا ہے، لیکن کسی نہ کسی وقت یہ ڈس لے گا، لہٰذا اس خواہش کے مخالف عمل کرے۔

مثلاً دل میں تو یہ خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ کسی نہ کسی طرح یہ دولت اس سے چھن جائے، لیکن ہاتھ اٹھا کر یہ دعا کرو کہ یا اللہ! آپ نے اس کو جو دولت عطا فرمائی ہے، اس میں اور زیادہ برکت عطا فرما، اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما۔ جس وقت حسد کرنے والا یہ دعا کرے گا اس وقت اس کے دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ آرے چلانا ہی مطلوب ہے اور اسی سے انسان کا درجہ بلند ہوتا ہے، اسی سے وہ ترقی کرتا ہے اور اس کے روحانی مدارج اسی سے بڑھتے ہیں۔

خواہشات کے خلاف عمل کرو

اور دل میں جو خواہش پیدا ہو رہی تھی، جب اس کے مخالف عمل کرے گا۔ اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے گا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ وہ خواہش بھی کمزور اور ضعیف ہو جائے گی، اور جب کمزور ہو جائے گی تو پھر یہ خطرہ نہیں رہے گا کہ کہیں یہ خواہش اس آدمی کو چت نہ کردے۔ بس تمام رذائل کی اصلاح کا یہی سارا فلسفہ ہے، اسی لئے یہ کہا جاتا

ہے کہ "رذائل" کا ازالہ مقصود نہیں کہ ان رذائل کا مادہ ہی بالکل ختم ہو جائے، یہ نہ ہو سکتا ہے اور نہ ہو گا، بلکہ اِمالہ مقصود ہے کہ صحیح محل پر ان کا استعمال ہو، غلط جگہ پر استعمال نہ ہو (البتہ اسی امالہ کو بعض اوقات مجازاً ازالہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ جب حسد کے مقتضٰی پر عمل نہیں کیا گیا تو گویا حسد ہے ہی نہیں، زائل ہو گیا)۔

صفات رذیلہ ناگزیر ہیں

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب قدس اللہ سرہ نے "حجۃ اللہ البالغۃ" میں لکھا ہے کہ انسان کے اندر جتنی صفات رذیلہ ہیں، یہ سب بقاء نوع انسانی کے لئے ناگزیر ہیں، یہ اگر نہ ہوں تو انسان کی نسل ہی باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں کہ اگر انسان کی طبیعت میں غصہ بالکل نہ ہو تو وہ مرے گا، اس لئے کہ جب کوئی درندہ اس پر حملہ کرے گا تو اس کو غصہ ہی نہیں آئے گا، شیر، سانپ، بچھو اس پر حملہ کریں گے اور وہ اپنی جگہ پر بیٹھا رہے گا، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ مرے گا۔ یا مثلاً دشمن نے حملہ کر دیا، لیکن اس کو غصہ ہی نہیں آ رہا ہے، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ انسان نہیں ہے بلکہ پتھر ہے، نتیجہ یہ ہو گا کہ دشمن اس کو ختم کر دے گا، اس لئے اپنے دفاع کے لئے غصہ ضروری چیز ہے۔

شہوت ناگزیر ہے

اسی طرح فرمایا کہ "شہوت" بھی ناگزیر ہے، اس کے بغیر بقاء نوع

انسانی نہیں، اگر محل پر شہوت نہ ہو، شوہر کو بیوی کے ساتھ شہوت نہ ہو تو کیا نسل چلے گی؟ نہیں چلے گی، اس لئے بقاء نوع انسانی کے لئے ان سارے رذائل کا ہونا ضروری ہے۔ خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ان کا غلط جگہ پر استعمال ہو، مثلاً غصہ کا غلط جگہ پر استعمال ہو یا شہوت کا غلط جگہ پر استعمال ہو، تو اس وقت یہ رذائل برے ہیں۔

لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ ان رذائل کو زائل نہیں کرنا بلکہ ان کو "مائل" کرنا ہے اور ان کو قابو میں کرنا ہے، تاکہ صحیح جگہ پر ان کا استعمال ہو جائے۔

اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ فلاں شخص کے اندر غصہ زیادہ ہے، وہ کیسے قابو پائے گا؟ وہ ضرور قابو پائے گا، اس لئے کہ غصہ پر قابو پانا اختیار میں ہے، غصہ کا آنا اختیار میں نہیں، لہٰذا جب غصہ آئے تو اس کو قابو میں کرنے کے لئے وہ طریقے اختیار کرے جو قرآن و حدیث میں آئے ہیں۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر غصہ کے وقت تم کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ، اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ، کیونکہ غصہ "ناری" ہے اور "نار" (آگ) کا خاصہ یہ ہے کہ وہ طالب بلندی ہوتی ہے اور اوپر کی طرف جاتی ہے، اسی لئے جب انسان کو غصہ آتا ہے تو اگر وہ لیٹا ہوا ہے تو بیٹھ جائے گا، اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو کھڑا ہو جائے گا، تم اس کے برخلاف کام کرو کہ اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ، اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ، تاکہ وہ غصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ دوسرا طریقہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک

حدیث میں بیان فرمایا، وہ یہ کہ ٹھنڈا پانی پی لو۔ یہ بھی غصہ کا علاج ہے۔

غصہ کم کرنے کا علاج

غصہ کو ختم کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس وقت یہ تصور کرو کہ مجھ کو اس شخص پر اتنی زیادہ قدرت نہیں ہے جتنی اللہ تعالیٰ کو مجھ پر قدرت حاصل ہے۔ یہ وہ مراقبہ ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بتایا، وہ ایک مرتبہ اپنے غلام کو مار رہے تھے، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مارتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ:

للّٰه اقدر عليك منك عليه

یعنی اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتے ہیں جتنی قدرت تم اس پر رکھتے ہو۔ تم اس پر اتنا غصہ کر رہے ہو، اگر اللہ میاں نے تم پر اتنا غصہ کر لیا تو تمہارا کیا حشر بنے گا؟ لہٰذا جب غصہ آئے، اگر اس وقت یہ طریقے اختیار کرو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غصہ جب آیا تھا تو اس وقت وہ غیر اختیاری تھا، لیکن جب اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ ہوا تو تم اس کے شر سے بچ گئے، اور غصہ جو ایک رذیلہ تھا وہ مائل ہو گیا اور اپنے صحیح محل پر برقرار رہا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۹

شیخ کی ضرورت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۲۹

صفحات : ۱۲

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر ۲۹

شیخ کی ضرورت

اور شیخ کی دعا اور توجہ کی حقیقت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ والعاقبة للمتقین۔
والصّلاة والسّلام علی رسوله الکریم ۔
وعلی آله وأصحابه اجمعین۔
أمّا بعد!

حضرت والا نے فرمایا کہ:

شیخ کی دعا اور برکت کو بھی بڑا دخل ہے اصلاح میں،

لیکن اس کا درجہ محض اعانت کا ہے نہ کہ کفایت کا، جیسے عرق سونف کا مرتبہ مسہل میں کہ محض عرق سونف بلا مسہل کے کار آمد نہیں۔ یا طبیب اور مریض کی مثال لے لو، اگر مریض دوا نہ پیے تو طبیب کی محض شفقت اور توجہ سے مریض ہرگز اچھا نہیں ہوگا۔ یا استاذ اور شاگرد کی مثال لے لو کہ محض استاذ کی توجہ سے سبق یاد نہیں ہوسکتا بلکہ شاگرد کے یاد کرنے ہی سے یاد ہوگا۔ شیخ کا اصل کام راستہ بتانا ہے، باقی راستہ کا قطع کرنا سالک ہی کا کام ہے، جیسے اندھے کو سوانکھا راہ بتاتا ہے، گود میں اٹھا کر اس کو نہیں لے جاتا، راستہ تو خود اس کے چلنے ہی سے قطع ہوگا۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵)

لوگوں کی ایک غلط فہمی

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب کسی شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھیں گے، کسی پیر کے دامن سے وابستہ ہو جائیں گے، کسی سے بیعت کرلیں گے تو بس کام ہو جائے گا، اب اس کے بعد کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، بلکہ خود بخود ہماری اصلاح بھی ہو جائے گی اور خود بخود اللہ تعالیٰ کے یہاں مقرّب بن جائیں گے اور سیدھے جنّت میں بھی پہنچ جائیں گے۔

شیخ کی توجہ اور دعا کا درجہ

حضرت والا اس غلط فہمی کے ازالہ کے لئے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہر چیز میں اعتدال رکھنا اور ہر چیز کو اپنی حد میں رکھنا ضروری ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ شیخ کی توجہ اور دعا میں مرید کے لئے بڑی برکت ہے، نہ تو اس کو بے فائدہ سمجھنا چاہئے اور نہ ہی اس سے بے التفاتی ہونی چاہئے اور نہ ہی اس کی ناقدری کرنی چاہئے، اس لئے کہ شیخ کی دعائیں ملنا اور شیخ کی توجہات کا نصیب ہونا بھی بڑی نعمت ہے۔

لیکن حضرت والا نے دو لفظوں میں اس کی حقیقت بیان فرمادی کہ:
"لیکن اس کا درجہ محض اعانت کا ہے نہ کہ کفایت کا۔" یعنی کام تو خود ہی کرنا ہوگا، لیکن شیخ کی دعا، اس کی توجہ، اس کی ہدایات اس کام کے لئے مدد و معاون ہو جاتی ہیں، اور اس سے ذرا حوصلہ بڑھ جاتا ہے، اور ہمت میں ذرا تقویت آجاتی ہے اور مدد مل جاتی ہے، لیکن کام خود ہی کو کرنا ہوگا، راستہ خود ہی طے کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر کی صرف توجہ اور شفقت علاج کے لئے کافی نہیں

پھر اس کی مثال دی کہ جیسے ایک ڈاکٹر ہے، آپ اس کے پاس علاج کرانے کے لئے گئے، اب وہ ڈاکٹر آپ کے ساتھ کتنی ہی شفقت کرنے والا اور محبت کرنے والا ہو، وہ آپ پر کتنی بھی توجہ دے، لیکن محض اس ڈاکٹر

کی توجہ کرنے سے اور محبّت اور شفقت کرنے سے آپ کی بیماری دور نہیں ہوگی، جب تک اس کی بتائی ہوئی دوا استعمال نہیں کروگے۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرا ڈاکٹر بڑا ماہر ہے اور نبض شناس ہے اور بڑا شفیق ہے، اس لئے مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، چنانچہ اس نے جاکر ڈاکٹر کو اپنا حال بتا دیا، اور واپس گھر آکر بیٹھ گیا، اور اس کی بتائی ہوئی دوا پی نہیں، ایسا شخص کبھی ساری زندگی بھی صحت یاب نہیں ہوسکے گا، صحت یاب اس وقت ہوگا جب اس ڈاکٹر کے شفقت سے لکھے ہوئے نسخے کو استعمال کریگا اور اس کی بتائی ہوئی دوائیں اس کو خود بازار سے لانی ہوں گی، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ازراہ شفقت وہ دوائیں اپنے پاس سے دیدے اور اس کو خریدنی نہ پڑے، لیکن اس دوا کو استعمال تو اس کو ہی کرنا ہوگا، جب تک دوا کو استعمال نہیں کریگا، محض شفقت سے فائدہ نہیں ہوگا۔

راستہ خود طے کرنا پڑے گا

اسی طرح شیخ روحانی معالج ہوتا ہے، وہ "روح" کی بیماریوں کا علاج کرتا ہے، وہ امراض باطنہ کو پکڑتا ہے، پھر ان کا علاج تجویز کرتا ہے۔ اب اگر شیخ چاہے کتنا ہی شفیق اور مہربان ہو، کتنا ہی تم سے محبّت کرنے والا ہو، لیکن محض اس شفقت اور محبت سے کام نہیں چلے گا جب تک تم خود راستے پر نہیں چلو گے اور قدم نہیں بڑھاؤ گے اور جب تک اس کے بتائے ہوئے علاج کے مطابق کام نہیں کروگے۔ لہٰذا چلنا انسان کو خود ہی ہوتا ہے، خود

ہی عمل کرنا پڑتا ہے، اور آخرت کی جزا اور سزا بھی انسان کے اپنے عمل ہی پر ہوگی۔ البتہ شیخ راستہ دکھا دیتا ہے، راستہ متعیّن کر دیتا ہے اور علاج کا طریقہ سکھا دیتا ہے، البتہ اس راستے پر چلنا خود ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا شیخ کی توجہ اور دعا کو بالکل بیکار بھی مت سمجھو کہ سب کچھ میں کر رہا ہوں، شیخ تو کچھ بھی نہیں کر رہا ہے، ایسا بھی نہیں ہے، اس لئے کہ شیخ کی دعا اور توجہات کی برکت سے اللہ تعالیٰ سالک کی ہمت میں قوّت عطا فرما دیتے ہیں اور اعمال صالحہ میں نشاط اور ذوق و شوق پیدا کر دیتے ہیں۔

نیک عمل کو شیخ کی توجہ کا اثر سمجھو

اللہ تعالیٰ نے شیخ کا واسطہ اس لئے بھی رکھا ہے کہ اس کے تعلق کی نسبت سے بعض مکائد نفس کا علاج ہو جاتا ہے، مثلاً اپنا کوئی عمل اچھا معلوم ہوا کہ میں نے آج فلاں اچھا عمل کیا، فلاں عبادت انجام دیدی، تو شیطان اس کے دل میں یہ بڑائی کا خیال ڈالتا ہے کہ آج تو نے کمال کر دیا اور تو نے بڑے بڑے اولیاء اللہ والی صورت اپنے اندر پیدا کر لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص کبر اور عجب کے مرض میں مبتلا ہو کر اپنے عمل کو اکارت کر دیتا ہے۔ اب ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ شیخ کے تعلق کو نفس کے اس کید سے بچنے کا ذریعہ بنا دیتے ہیں، وہ اس طرح کہ آدمی اس نیک عمل کو اپنے شیخ کی طرف منسوب کرے کہ الحمدللہ! مجھے نیک عمل کی جو توفیق ہوئی، وہ میرے شیخ کی برکت سے ہوئی، میرے شیخ کی توجہ اور دعا سے ہوئی، یعنی شیخ کی توجہ

اور دعا کی برکت سے میری ہمّت میں قوت پیدا ہوئی، اور اس قوت کے نتیجے میں اس عمل کی توفیق ہوئی۔ لہٰذا جب شیخ سے تعلق ہوگا تو اس نیک عمل کو شیخ کی طرف منسوب کردو گے، اس کے نتیجہ میں وہ نفس کا کید وہیں ختم ہو جائے گا۔

یہ سب حاجی صاحب کا فیض ہے

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو کئی مرتبہ دیکھا کہ کبھی عام وعظ کی مجلس میں اور کبھی خاص ملفوظات کی مجلس میں بیان فرما رہے ہوتے، اور بیان کے دوران جب کوئی بہت باریک اور دقیق بات یا اعلیٰ درجے کا کوئی نکتہ بیان فرماتے کہ جس سے سننے والے بھی جھوم اٹھتے تو اس کے بعد فوراً فرماتے کہ یہ سب میرے حاجی صاحب کا فیض ہے، یہ سب میرے حاجی صاحب کا فیض ہے، اور والہانہ انداز میں اس کو بار بار دھراتے اور اس کے ذریعہ اپنا علاج فرماتے، تاکہ نکتہ بیان کرنے کے بعد دماغ میں یہ خیال نہ آ جائے کہ میں نے آج بڑی اچھی اور عمدہ بات کہدی، اس خیال کا فوراً علاج فرماتے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے شیخ کو مکائد نفس سے بچانے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ لہٰذا جب کبھی اپنا کوئی عمل اچھا معلوم ہو، اس کو اپنی طرف منسوب کرنے کے بجائے اپنے شیخ کی طرف منسوب کردو کہ یہ جو کچھ ہے وہ میرے شیخ کا فیض ہے۔

عمل خود کرو پھر اس کو شیخ کی طرف منسوب کرو

ہمارے حضرت والا نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ وعظ فرما رہے تھے، وعظ کے دوران آپ کے اوپر ایک حال طاری ہو گیا اور جوش میں آکر زور زور سے یہ فرمانے لگے "یہ اس حاجی کا فیض ہے، یہ اس حاجی کا فیض ہے۔" لہٰذا خوب سمجھ لو کہ نہ تو شیخ کے واسطے کی ناقدری کرو کہ شیخ تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہیں، سب کچھ میں ہی کر رہا ہوں، اور نہ یہ سمجھو کہ جو کچھ کرے گا شیخ ہی کرے گا، مجھے کچھ نہیں کرنا اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے، یہ دونوں انتہائی غلط ہیں، اور حق ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔ عمل خود کرو، اپنے اختیار کو استعمال کرو، اپنی ہمت کو استعمال کرو، اور اس ہمت کی تقویت کے لئے شیخ کی برکت اور دعا کو معین سمجھو۔

تمہیں ایسا ہی سمجھنا چاہئے

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید تھے، وہ ایک دن حضرت حاجی صاحبؒ کے پاس آئے اور اپنے اچھے حالات بیان کئے، اور کہا کہ حضرت! یہ سب آپ کا فیض ہے۔ حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ تمہیں ایسا ہی سمجھنا چاہئے، البتہ میں اس کی حقیقت بتاتا ہوں، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب اچھائی تمہارے اندر موجود تھی، میری رہنمائی کی وجہ سے اب وہ ظاہر ہو گئی، باقی تمہیں یہی سمجھنا چاہئے کہ یہ حاجی صاحب کا فیض

ہے۔ پھر ایک قصہ سنایا۔

ایک قصّہ

وہ یہ کہ ایک عورت اپنی پڑوسن کے گھر آگ لینے گئی۔ پہلے زمانے میں لکڑی اور کوئلہ جلایا جاتا تھا، اگر چولہا ٹھنڈا ہے تو اس کو گرم کرنے میں بہت دیر لگتی تھی، ایسے موقع پر اگر کسی پڑوسن کے چولہے میں آگ ہوتی تو وہ عورت اس کے چولہے سے ایک انگارہ اٹھا کر لے آتی، اس سے چولہا سلگانے میں آسانی ہو جاتی تھی۔ لہٰذا یہ عورت بھی اپنی پڑوسن کے گھر گئی اور پڑوسن سے کہا کہ بی! میرے گھر میں آگ نہیں ہے، اگر اجازت ہو تو تمہارے چولہے سے آگ لے لوں، پڑوسن نے کہا کہ میرا چولہا تو ٹھنڈا ہے اس میں تو آگ ہے ہی نہیں۔ اس عورت نے کہا کہ بہن! اگر اجازت ہو تو چولہے کو کرید کر دیکھ لوں، ہو سکتا ہے کہ کوئی چنگاری مل جائے، پڑوسن نے کہا کہ کرید کر دیکھ لو، چنانچہ اس عورت نے کڑچھے سے چولہے کو کریدا تو اندر سے ایک چھوٹی سی چنگاری نکل آئی، اس عورت نے کہا کہ بس میرا تو کام بن گیا، اور وہ چنگاری لے کر چلی گئی۔

یہ قصہ سنانے کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ چنگاری اس کے چولہے میں موجود تھی، اگر چنگاری نہ ہوتی تو یہ عورت ہزار مرتبہ بھی اپنا کڑچھا چلاتی تب بھی چنگاری نہ نکلتی، لہٰذا چنگاری تو پہلے ہی موجود تھی، لیکن وہ چنگاری اس کے کڑچھا چلانے سے نکلی، اگر یہ

کڑچھانہ چلاتی وہ چنگاری بھی رفتہ رفتہ بجھ کر ختم ہو جاتی۔

شیخ کڑچھا چلانے والا ہے

اسی طرح شیخ درحقیقت چولہے میں کڑچھا چلانے والا ہے، وہ چنگاری تو خود مرید کے اندر موجود ہوتی ہے، لیکن اگر شیخ اس کے اندر کڑچھانہ چلاتا تو وہ چنگاری وہیں پڑے پڑے ختم ہو جاتی، اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا جاتا، لیکن شیخ کڑچھا چلا کر اس کو فائدہ مند اور نافع بنا دیتا ہے۔ لہٰذا شیخ بیکار بھی نہیں، اس لئے کہ کڑچھا وہی چلا رہا ہے، اگر وہ کڑچھانہ چلاتا تو چنگاری کیسے نکلتی، اور شیخ فاعل حقیقی بھی نہیں، کیونکہ چنگاری تو پہلے سے موجود تھی، بس شیخ نے اس کو نکال کر اس سے کام لیا۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کتنی خوبصورت مثال سے اس بات کو سمجھا دیا۔

شیخ کو نعمت عظمیٰ سمجھے

میں نے اپنے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے بارہا سنا کہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ اور آپ کے عاشق تھے، ایک دن حضرت مفتی صاحب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمانے لگے کہ حضرت! یوں خیال ہوتا ہے کہ اگر ساری عمر اللہ جل شانہ کے حضور سجدے میں پڑا رہوں اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لئے کہ اس خانقاہ سے وابستگی ہو گئی تو بھی حق شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے سنا تو کوئی تردید نہیں فرمائی، اور فرمایا کہ

ہاں بھئی آپ کو ایسا ہی سمجھنا چاہئے، کیونکہ طالب کا فائدہ اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو شیخ کا تابع اور ممنونِ احسان سمجھے، اور یہ سمجھے کہ یہ شیخ میرے لئے نعمت عظمیٰ ہیں۔ بہر حال اسی کا نام ہے "اعتدال" کہ آدمی نہ اس طرف جھکے اور نہ اُس طرف جھکے، اور اسی کا نام سنّت اور شریعت اور طریقت کا امتزاج ہے جس کے اندر ہر چیز اس کی حد پر ہو، اس حد سے آگے نہ بڑھے، یہی ساری طریقت ہے۔

شریعت، سنّت اور طریقت

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی اچھی بات فرمایا کرتے تھے جو یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ دیکھو شریعت نام ہے حقوق کا، کس کے حقوق کا؟ اللہ کے حقوق اور بندوں کے حقوق کا، اور ساری شریعت انہی دو چیزوں کے درمیان دائر ہے۔ "سنّت" نام ہے حدود کا، یعنی ان حقوق کو کس طرح ادا کیا جائے؟ اور کن حدود میں رہ کر ادا کیا جائے؟ یہ چیز سنّت سے معلوم ہوتی ہے۔ "طریقت" نام ہے "حفظ حدود" کا، یعنی حقوق کی جو حدودؔ ہیں، ان کی کیسی حفاظت کی جائے کہ آدمی کا ایک قدم بھی نہ آگے بڑھے اور نہ ایک قدم پیچھے ہو، بس حد پر جاکر آدمی رک جائے، یہ حفظ حدود "طریقت" کے ذریعہ انجام پاتی ہیں، یعنی شیخ کے پاس جاکر آدمی کا مزاج اس طرح بن جاتا ہے کہ ان حدود کی حفاظت کرنا اس کو آجاتا ہے۔

بہر حال وہ تین جملے فرمایا کرتے تھے کہ:

شریعت .... نام ہے حقوق کا

سنّت .... نام ہے حدود کا

طریقت .... نام ہے حفظ حدود کا

لہٰذا پیری مریدی کا جو سارا سلسلہ ہے کہ شیخ کے پاس جانا اور اپنی اصلاح کرانا، ان سب کا مقصد "حفظ حدود" ہے یعنی کتنا کام کروں، اور کہاں جا کر رک جاؤں، اس سے آگے نہ بڑھوں۔ اور یہ ایسی چیز ہے جس کو دو اور دو چار کر کے دو ٹوک طریقے سے بتانا مشکل ہے، جب تک اس کا تجربہ نہ کرایا جائے اور اس کی مشق نہ کرائی جائے اور اس کی عادت نہ ڈالوائی جائے۔

شیخ کو اس کے مقام پر رکھو

تو شیخ کا مقام بھی یہی ہے کہ اگر شیخ کی ناقدری ہو جائے، اللہ بچائے بڑے وبال کی بات ہے، اور اگر شیخ کو اس کے مرتبہ سے آگے بڑھا دیا جائے اور اس کو خدا بنا دیا جائے، اللہ بچائے، یہ شرک کا مقام ہے، ان دونوں حدوں کے درمیان رہ کر کس طرح چلے؟ یہ بھی شیخ ہی بتاتا ہے، جس طرح حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بتائی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی فہم عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۳۰

ہمت اور اخلاص

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۳۰

صفحات : ۱۷

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر ۳۰

ہمّت اور اخلاص

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ والعاقبۃ للمتقین۔
والصّلاۃ والسّلام علی رسولہ الکریم۔ وعلٰی
آلہ واَصحابہٖ اجمعین۔

اَمّا بعد!

استحضار و ہمت کا نسخہ اصلاح کیلئے اکسیر ہے

حضرت والا نے فرمایا کہ:

"اخلاص و ہمّت" خلاصہ تصوف ہیں، ان دونوں میں بھی اصل چیز "ہمت" ہے، کیونکہ اخلاص پیدا کرنے کے لئے بھی ہمت ہی کی ضرورت ہوگی، اور "ہمّت"

کا معین "استحضار" ہے اور "استحضار" کی صورتیں مختلف ہیں، جو صورت شیخ تجویز کردے اس پر عمل کرے، مثلاً ہر کوتاہی پر دس رکعت نفل یا کم و بیش نفل بطور جرمانہ ادا کرنا، تاکہ جب دوسرا موقع کوتاہی کا پیش آئے تو جرمانہ کے خوف سے "استحضار" کی کیفیت پیدا ہو جائے، اور جب "استحضار" ہو جائے تو فوراً ہمت سے کام لے اور تقاضائے نفس کو مغلوب کرے، اگر "استحضار" اور "ہمّت" سے کام لے گا تو انشاء اللہ کوتاہیوں سے محفوظ رہے گا اور رفتہ رفتہ اصلاح ہو جائے گی، اور ہر روز مطالعہ "نزہۃ البساتین" سے بھی قوت استحضار و ہمّت کو پہنچتی ہے۔

جو گر حضرت نے فرمایا ہے استحضار و ہمّت کا
سراسر نسخہ اکسیر ہے اصلاح امّت کا

(انفاس عیسیٰ ص ۱۵)

اخلاص کی اہمیت

اس ملفوظ میں حضرت والا نے جو دو چیزوں کا بیان فرمایا ہے وہ سارے "تصوف اور طریقت" کا خلاصہ ہیں، جن کی تحصیل اس راستے میں کرنی پڑتی ہے، اور ہم "تصوف و طریقت" جس کو کہتے ہیں وہ حقیقت میں

دین کا راستہ ہے، گویا کہ دین کے راستے پر چلنے کے لئے دو چیزیں انتہائی ضروری ہیں، ان کے بغیر دین کا راستہ قطع نہیں ہو سکتا، ایک اخلاص، یعنی ہر عمل خالصۃً اللہ کے لئے ہو، اللہ کی خوشنودی اور اللہ کی رضاجوئی کے لئے ہو، اس عمل میں ریاکاری کے، شہرت، حبّ جاہ کے، تعریف پسندی کے وساوس نہ ہوں۔ اور یہ اخلاص تمام اعمال کی روح ہے، اگر اخلاص حاصل نہیں العیاذ باللہ، تو سارے اعمال اکارت ہیں، بے کار ہیں، مثلاً نماز پڑھ رہا ہے لیکن دکھاوا مقصود ہے، یا مثلاً روزے رکھ رہا ہے لیکن اس کے ذریعہ لوگوں کی تعریف حاصل کرنا منظور ہے، یا مثلاً تلاوت کر رہا ہے لیکن اس کے ذریعہ حُبِّ جاہ مقصود ہے، تو یہ سارے اعمال اکارت ہیں، ان اعمال کا کوئی وزن نہیں، ایک دمڑی کے برابر ان کی قیمت نہیں۔ بہر حال! ایک چیز تو ہے ”اخلاص“ اس کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں۔

دوسری چیز ”ہمت“

دوسری چیز ”ہمت“ ہے، ”اخلاص“ کے ساتھ عمل صالح کرنے کی اور اطاعت باری تعالیٰ کرنے کی اور گناہوں سے بچنے کی ہمت ہو۔ اور سارے تصوف اور طریقت کا خلاصہ یہی ہے کہ اپنے اعمال کے اندر ”اخلاص“ پیدا کرنا اور ”ہمت“ پیدا کرنا۔ اگر یہ دو چیزیں پیدا ہو گئیں تو سمجھو کہ میدان مار لیا اور منزل حاصل ہو گئی۔ یہ بات حکیم الامتؒ کہہ رہے ہیں، جو اس میدان تصوف کی خاک چھاننے کے بعد اپنی پوری زندگی کے

تجربات کا، اپنے علم و معرفت کا، اپنی ریاضت اور مجاہدات کا نچوڑ بتا رہے ہیں کہ دو چیزیں حاصل کرنے کی ہیں، ایک "اخلاص" اور دوسری "ہمت"۔

صدق اور اخلاص

اگر اس بات کو دوسرے الفاظ سے تعبیر کیا جائے تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ "صدق" اور "اخلاص" یہ دو چیزیں مطلوب ہیں۔ "اخلاص" کے معنی یہ ہیں کہ نیت خالص اللہ کے لئے ہو، اور "صدق" کے معنی یہ ہیں کہ وہ عمل صحیح ہو، مستقیم ہو اور شریعت میں اس عمل کا جو طریقہ بتایا گیا ہے اس طریقے کے مطابق ہو، یعنی سنّت کے مطابق ہو۔ اس کا نام "صدق" ہے۔

مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے، تکبیر تحریمہ کے لئے ہاتھ اٹھایا، اور اس طریقے پر ہاتھ اٹھائے جس طرح اٹھانا مسنون ہے، اور سنّت کے مطابق قیام کیا، سنّت کے مطابق رکوع کیا، سنّت کے مطابق سجدہ کیا، سارے اعمال سنّت کے مطابق انجام دیے، اسی کا نام "صدق" ہے۔ اور اس نماز پڑھنے سے مقصود اللہ جل شانہ کی رضاجوئی ہے، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنی مقصود ہے، دکھاوا مقصود نہیں، ریاکاری مقصود نہیں، اسی کا نام "اخلاص" ہے، ان دونوں چیزوں کے ملنے سے عمل میں جان پڑتی ہے، اگر "اخلاص" نہ ہو، صرف "صدق" ہو، مثلاً بہت خشوع اور خضوع سے نماز پڑھی اور سارے اعمال سنّت کے مطابق انجام دیے، اس میں صدق تو پایا

گیا لیکن دل میں کھوٹ تھا، اخلاص نہیں تھا، اس لئے وہ عمل اکارت گیا۔

”صدق“ بھی ضروری ہے

اور اگر ”اخلاص“ ہے اور عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے علاوہ کچھ مقصود نہیں، لیکن اس عبادت کا طریقہ غلط اختیار کرلیا، وہ طریقہ سنّت کے مطابق نہیں، شریعت کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں، مثلاً نماز جلدی جلدی اٹھک بیٹھک کر کے پڑھ لی، اور جس طرح تعدیل ارکان کرنا تھا، ویسا نہیں کیا، تو اس نماز کے اندر ”اخلاص“ تو تھا، اس لئے کہ مقصود اللہ کو راضی کرنا تھا، لیکن وہ نماز سنّت کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے مقبول نہیں۔ ایسی نماز پڑھنے والے کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”قم فصلّ فانك لم تصل“ کھڑے ہوکر دوبارہ نماز پڑھو، اس لئے کہ تم نے نماز پڑھی ہی نہیں۔ لہٰذا نہ تنہا نیّت کی درستی کافی ہے، نہ تنہا عمل کی درستی کافی ہے، بلکہ جب دونوں کا امتزاج ہوگا، یعنی نیت بھی درست ہوگی اور عمل بھی درست ہوگا، تب وہ عمل وزنی ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگا۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیّ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جتنی ”بدعات“ ہیں، ان سب کے اندر ”اخلاص“ پایا جاتا ہے، اس لئے کہ عام طور پر جو لوگ ”بدعات“ کرتے ہیں، وہ اس عمل کو نیکی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے وہ عمل کرتے ہیں، لیکن

چونکہ طریقہ صحیح نہ ہونے کی وجہ سے اس کے اندر "صدق" نہیں، اس لئے وہ عمل اکارت اور بیکار ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالاً ○ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا۔

(سورۂ الکہف، آیت ۱۰۳، ۱۰۴)

ان اعمال کے کرنے والوں کی نیت درست تھی، لیکن طریقہ چونکہ درست نہیں تھا، اس لئے وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول نہیں ہوا۔ بہرحال، یہ دونوں چیزیں یعنی "اخلاص" اور "صدق" دونوں مطلوب ہیں۔

صدق اور اخلاص کے حصول کا ذریعہ

اور ان دونوں کو حاصل کرنے کے لئے "ہمّت" کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ہمّت کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان کا نفس اس کو دوسرے راستے پر لے جا رہا ہے تو اس نفس کو روک کر اور اس کے تقاضے کی مخالفت کر کے آدمی سیدھے راستے پر رہے اور سیدھا عمل اختیار کرے، اسی کا نام "ہمّت" ہے۔ مثلاً دل میں یہ شدید تقاضہ پیدا ہو رہا ہے کہ اپنی نگاہ کو ایسی جگہ پر ڈالوں جس سے لذّت حاصل ہو، نفس کے اس تقاضے کو روکا اور اس کی مخالفت کی، اس مخالفت کرنے کا نام "ہمّت" ہے۔ اس لئے کہ یہ مخالفت ہمّت سے ہوتی ہے، جتنے بھی اعمال ہیں چاہے، وہ ایجابی ہوں جیسے اوامر کو

بجالانا، یا سلبی ہوں جیسے نواہی سے بچنا، ان سب میں "ہمت" کے استعمال کی ضرورت ہے، جب ہمت سے کام لے گا تو وہ کام ہوگا، ورنہ وہ کام نہیں ہوگا۔

مثلاً روزہ رکھنے کے لئے اور سحری کھانے کے لئے اٹھنا ہے، مگر شدید نیند آرہی ہے، سردی لگ رہی ہے، اٹھنا مشکل ہو رہا ہے، اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے، لیکن ہمت کر کے اٹھا اور یہ سوچا کہ اگر نہیں اٹھونگا تو سحری نکل جائے گی، سحری نکل جانے کے نتیجے میں یا تو روزہ جائے گا یا وہ روزہ ناقابل برداشت ہوگا، یہ سوچ کر اس نے ہمت کی اور نفس کا جو تقاضہ تھا اس کو پامال کیا، اس کی مخالفت کی، اور اٹھ کر سحری کھا کر روزہ رکھ لیا، اسی کا نام ہمت ہے، اسی طرح پورے دین پر عمل کرنے کے لئے بھی ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔

اصل "ہمت" ہی ہے

اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ سارے اعمال کا خلاصہ اخلاص اور ہمت ہے۔ پھر آگے فرمایا کہ ان دونوں چیزوں میں بھی اصل "ہمت" ہی ہے، کیونکہ اخلاص پیدا کرنے کیلئے بھی "ہمت" کی ضرورت ہوتی ہے، اخلاص بھی "ہمت" کے بغیر پیدا نہیں ہوتا، اس لئے کہ جب انسان مثلاً نماز پڑھنے کے لئے جاتا ہے تو اب نفس و شیطان اس کے دل میں ایک چرکہ لگاتے ہیں کہ آج جب تو نماز کے لئے کھڑا ہوگا اور لوگ تجھے دیکھیں گے تو

تجھے متقی پرہیزگار اور بڑا عابد و زاہد سمجھیں گے، چنانچہ وہ خود بھی لوگوں کو دکھانے کے لئے اپنی نماز میں اور زیادہ خشوع و خضوع پیدا کرے گا۔ اب شیطان اور نفس نے لوگوں کو دکھانے کی جو بات دل میں ڈال دی ہے اس سے نجات کے لئے بھی "ہمت" کی ضرورت ہے، وہ "ہمت" یہ کہ دل میں یہ سوچے کہ اس مخلوق کو چھوڑو، اس لئے کہ مخلوق کی تعریف اور مخلوق کی مذمت کا کیا اعتبار، اگر یہ خوش ہو جائیں تو کیا اور برائی کریں تو کیا؟ اس طرح سوچ کر دکھاوے کا جو خیال دل میں آیا تھا اس کو نکالے، لیکن اس کے لئے بھی ہمت کی ضرورت ہے، ورنہ نفس کا تقاضہ تو یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی تعریف سے مزہ لو، لیکن اس تقاضے کو دل سے نکالنے کیلئے ہمت کرنی پڑتی ہے۔

تعریف سے دل میں گھمنڈ پیدا ہوتا ہے

لوگ جب کسی کی تعریف کرتے ہیں کبھی اس کے علم کی تعریف کر دی، کبھی اس کے عمل کی تعریف کر دی، کبھی اس کے اخلاق کی تعریف کر دی، تو جس کی تعریف کی جاتی ہے اس کو بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اتنے سارے لوگ میرے علم کی تعریف کر رہے ہیں، اس تعریف کے نتیجے میں رفتہ رفتہ دل میں یہ گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے کہ اتنے سارے بلاوجہ تو تعریف نہیں کر رہے، ضرور میرے اندر علم ہوگا، تبھی تو یہ لوگ میری تعریف کر رہے ہیں۔ لہٰذا اس تعریف کے ذریعہ انسان گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس

لئے یہ تعریف بڑی خراب چیز ہے، اگر اس کا علاج نہ کیا جائے تو یہ انسان کو خراب کر دیتی ہے، اسی لئے فرمایا گیا کہ:

أُحْصُوْا فِيْ وُجُوْهِ الْمَدَّا حِيْنَ التُّرَابَ

یعنی تعریف کرنے والوں کے منہ میں مٹی ڈال دو۔

دل میں پیدا ہونے والے گھمنڈ کا علاج

لہٰذا اگر کوئی تمہاری تعریف کرے، اس کے نتیجے میں دل میں گھمنڈ پیدا ہو رہا ہو تو اس کا علاج کرے، اس کا علاج یہ ہے کہ دل میں فوراً اس کا استحضار کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندے پر میرے محاسن ظاہر فرما دیئے ہیں، اگر کہیں میرے عیوب اس پر ظاہر ہو جاتے تو یہ شخص مجھ سے نفرت کرتا۔ اور ساتھ میں یہ سوچے کہ اس کی تعریف سے مجھے کیا حاصل ہو گا؟ ایک مرتبہ جب اس نے تعریف کی تو سن کر بڑا مزہ آیا، لیکن وہ مزہ سننے کے بعد ختم ہو گیا، لہٰذا اس مزے کو برقرار رکھنے کے لئے اس تعریف کرنے والے سے کہو کہ ذرا ایک مرتبہ اور میری تعریف کر دیں، کیا اس سے یہ درخواست کر سکتے ہو؟ نہیں کر سکتے، البتہ اس نے جو ایک مرتبہ تعریف کی، بیٹھے ہوئے اس کا تصور کرتے رہو کہ اس نے کتنی اچھی بات کہی تھی، کیسا مزہ آیا تھا، لیکن اس تصور سے کونسا دنیا کا یا دین کا فائدہ حاصل ہو گا؟ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ تعریف کرنے پر ایک بہت اچھا شعر سنایا کرتے تھے، اگر انسان اس کا استحضار کر لے تو تعریف کے فتنے سے

ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے۔ فرماتے کہ ؎

سرد ہو جاتی ہے حُبِّ جاہِ دنیا جس کے بعد
اک ذرا سی بات ہے اے دل کہ پھر کیا اس کے بعد؟

یعنی جب کوئی شخص تعریف کر رہا ہو کہ آپ کا علم بہت اعلیٰ ہے، آپ بڑے اعلیٰ درجے کے مفتی ہیں، آپ اچھے مقرر ہیں، آپ اچھے مصنف ہیں، آپ نے بڑی اچھی کتاب لکھی، آپ نے بڑا اچھا درس دیا، آپ نے بڑا اچھا وعظ کہا۔ اس وقت یہ ذرا سی بات سوچ لو کہ اے دل پھر کیا ہے اس کے بعد؟ یعنی اس کی تعریف کے بعد کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں، جو تعریف اس نے کی تھی وہ ہوا میں اڑ گئی۔

مزہ تو اس وقت ہے

ارے مزہ تو اس وقت ہے جب اللہ تعالیٰ یہ فرمادیں کہ:

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ○ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ○ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ○ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ○

(سورۃ الفجر، آیت ۲۷ تا ۳۰)

مزہ تو اس وقت ہے، اس کو سوچو اور اس کی فکر کرو، یہ کیا کہ دوسرے کی تعریف پر خوش ہو گیا کہ فلاں نے مجھے اچھا کہدیا، فلاں نے میری تعریف کر دی، لیکن چونکہ انسان کا نفس عجلت پسند ہے، اس لئے جو

فوری تعریف ہو رہی ہے، اس کی طرف بھاگتا ہے، اس کی طرف اس کو کشش اور میلان ہوتا ہے، پھر اس کشش اور میلان کے نتیجے میں انسان یہ چاہتا ہے کہ میں اور اچھا کام کروں تاکہ اور اپنی تعریف سنوں، اب نفس دوبارہ تعریف کرانے کے لئے وہ کام کرارہا ہے۔ لہٰذا نفس کو اس خیال سے ہٹانے کے لئے اور اس کو سیدھے راستے پر لانے کے لئے "ہمت" کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ "ہمت" اس لئے اصل ہے کہ "اخلاص" کے حاصل کرنے کیلئے ہمت کی ضرورت ہے، اگر "ہمت" نہ ہو تو اخلاص بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا خلاصہ یہ نکلا کہ انسان "ہمت" حاصل کرنے کی فکر کرے اور اس کو اپنے اندر پیدا کرے۔

"ہمت" کے اندر بڑی طاقت ہے

دیکھو! اللہ تعالیٰ نے انسان کی "ہمت" میں بڑی زبردست طاقت رکھی ہے، یہی "ہمت" ہے جس نے انسان کو چاند پر پہنچا دیا، سو سال پہلے چاند پر جانے کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، اس وقت اگر یہ کہا جاتا کہ چاند پر چلے جاؤ، تو سامنے والا سن کر یہ جواب دیتا کہ تو پاگل ہو گیا ہے، تیرا دماغ خراب ہے۔ اس زمانے میں انسان کے ہوا میں اڑنے کو ناممکن اور محال سمجھا جاتا تھا۔

ہوا میں اڑنے کا ایک واقعہ

چنانچہ عربی کی مشہور لغت ہے "صحاح" اس کے مصنف اسماعیل بن حماد جوہری گزرے ہیں، جو عربی لغت کے امام مانے جاتے ہیں، ان کو بعض لوگوں نے "عقلاء المجانین" میں شمار کیا ہے، یعنی وہ تھے تو بڑے عاقل، پھر بھی حماقت کرلی، ان کے دماغ میں یہ احمقانہ خیال آیا کہ میں ہوا میں اڑوں، چنانچہ انہوں نے پہلے تو ہوا میں اڑنے کی ریاضت اور مشق کی، کچھ عرصہ تک مشق کرنے کے بعد ایک دن انہوں نے یہ اعلان کر دیا کہ آج میں جامع مسجد کے مینار کے اوپر سے لوگوں کو اڑ کر دکھاؤں گا، چنانچہ اعلان سن کر ہزاروں افراد وہاں جمع ہوگئے، اور یہ مینار پر چڑھ گئے اور وہاں سے اپنے اڑنے کا مظاہرہ کرنا چاہا۔ اسی مظاہرے کے دوران دھڑام سے نیچے گرے اور وہیں انتقال ہوگیا۔ اسی لئے لوگ کہتے ہیں کہ "عقلاء المجانین" میں سے تھے۔ بہرحال اس زمانے میں اڑنے کی کوشش کو حماقت سمجھا جاتا تھا، لیکن اسی ہمت نے ترقی کی، ترقی کرتے کرتے انسان نے اڑنا شروع کر دیا۔

ہوا میں سب سے پہلا اڑنے والا انسان مسلمان تھا

سب سے پہلا انسان جو ہوا میں اڑا وہ ترکی کا ایک مسلمان تھا۔ لوگوں نے یہ غلط مشہور کر رکھا ہے کہ سب سے پہلے رائٹ برادران نے ہوائی جہاز ایجاد کیا، لیکن صحیح یہ ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے اڑنے کا جو حقیقی

مظاہرہ کیا ہے وہ خلافت عثمانیہ کے دور میں ترکی کے ایک مسلمان نے کیا، آج بھی اس کے پر استنبول میں "برج غلاطہ" میں لٹکے ہوئے ہیں، جن پروں سے اس نے اڑنے کا مظاہرہ کیا تھا، ان سے آٹھ میل کی مسافت اڑ کر طے کی، بُرج غلاطہ سے اڑا اور "آبنائے باسفورس" کو عبور کیا، آٹھ میل اڑنے کے بعد اپنی پرواز ختم کی۔ وہ دنیا میں اڑنے والا سب سے پہلا انسان تھا۔

"ہمّت" نے کہاں پہنچادیا

وہ کس طرح اڑا؟ ہمّت کے ذریعہ، پھر اسی ہمّت نے اور ترقی کی تو ہوائی جہاز کی شکل اختیار کرلی۔ ابتداء میں ہوائی جہاز ایسے ہوتے تھے کہ اس میں بیٹھنا بھی مشکل تھا، اسی ہمّت نے اور ترقی کی تو پنکھے کا جہاز ایجاد ہوگیا، اور ہمّت نے ترقی کی تو "جیٹ" جہاز ایجاد ہوگیا، اور ہمّت نے ترقی کی تو "کنکارڈ" ایجاد ہوگیا، ہمّت نے اور ترقی کی تو انسان خلا میں پہنچ گیا۔ بہرحال، اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمّت میں بڑی طاقت رکھی ہے، اب یہ انسان کا کام ہے کہ اس ہمّت کو جہاں چاہے لگادے، چاہے اچھے کام میں لگا دے، چاہے برے کام میں لگادے۔

"ہمّت" کرشمے دکھائے گی

لیکن تم اس "ہمّت" کو اچھے کام میں لگاؤ اور اس "ہمّت" کے ذریعہ

اپنی نفسانی خواہشات کو مسخر کرو، ناجائز اٹھنے والے تقاضوں کو دبانے میں اس ہمّت کو استعمال کرو، پھر دیکھو کہ یہ "ہمّت" تمہیں کیا کیا کرشمے دکھاتی ہے۔

ہمّت کیسے پیدا ہو؟

پھر اس ہمّت کو پیدا کرنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اہل ہمّت کی صحبت اختیار کرو، ان کے پاس اٹھو بیٹھو، رفتہ رفتہ ان کی "ہمّت" تمہاری طرف بھی منتقل ہو جائے گی۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اہل ہمّت کے حالات پڑھو، اس کے ذریعہ ان کی ہمّت تمہاری طرف منتقل ہو گی۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ ہمّت کا استحضار کرو، مثلاً یہ کہ کسی عبادت میں کوتاہی ہو جانے پر اپنے لئے کچھ سزا مقرر کرلو، اسی طرح گناہ ہو جانے پر سزا مقرر کرلو، مثلاً یہ کہ اگر میں نے فلاں گناہ کرلیا، اور ہمّت کر کے اس گناہ سے نہ رکا تو میں اتنی رکعتیں نفل پڑھوں گا یا اتنے پیسے صدقہ کروں گا۔ البتہ یہ سزا نہ تو بہت زیادہ ہو کہ آدمی اس سزا پر عمل ہی نہ کر سکے، اور نہ اتنی معمولی سزا ہو کہ اس کی اہمیت ہی معلوم نہ ہو بلکہ گناہ ہو جانے پر چار رکعت یا چھے رکعت مقرر کرلو۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جب نفس اس گناہ پر اکسائے گا تو اس وقت یہ خیال آئے گا کہ اگر میں نے یہ گناہ کرلیا تو مجھے چھے رکعتیں پڑھنی پڑیں گی، اور اس کے نتیجے میں اس گناہ سے بچنے کی ہمّت میں پختگی پیدا ہو جائے گی۔

شیخ کی ضرورت

لیکن ہر آدمی کی "ہمت" کو بڑھانے اور اس سے کام لینے کا طریقہ الگ ہوتا ہے، ایک ہی نسخہ ہر ایک کو گھونٹ کر نہیں پلایا جاسکتا، اس لئے شیخ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس آدمی کی ہمت کو کام میں لانے کے لئے کونسا طریقہ مناسب ہوگا؟ اگر تم اپنی خود رائی سے کرو گے تو بعض اوقات ٹھوکر کھاؤ گے۔ اور کسی شیخ سے تعلق رکھنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے لئے تمہارے مناسب حال ایک طریقہ متعیّن کر دیتا ہے جو تمہاری "ہمت" کو کام میں لانے کے لئے مناسب ہوگا۔

خلاصہ

آج کی گفتگو کا خلاصہ یہ نکلا کہ سارے دین پر عمل کرنے کے لئے سب سے بنیادی چیز "ہمّت" ہے، اور اس "ہمّت" کو تقویت دینے کے لئے اہل ہمّت کی صحبت میں اٹھنا بیٹھنا چاہئے اور اہل ہمّت کے حالات اور ان کے ملفوظات پڑھنا چاہئے۔ اس کے ذریعہ رفتہ رفتہ انسان کے اندر خود بخود "ہمّت" پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ سب کام کسی شیخ کی نگرانی مین ہی کرنا چاہئے، اس کے بغیر بعض اوقات غلطی ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو ہمّت عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۳۱

اعمال میں رسوخ پیدا کریں

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۳۱

صفحات : ۲۰

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

مجلس نمبر۳۱

اعمال میں رسوخ پیدا کریں

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ والعاقبۃ للمتقین والصّلاۃ والسّلام علٰی رسولہ الکریم ۔ وعلی آلہ واصحابہٖ اجمعین۔

أمّا بعد!

حال کی دو قسمیں

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

"تصوّف میں" رسوخ اعمال اختیاریہ مطلوب ہے، نیز مامور بہ محبّت عقلی ہے نہ کہ طبعی۔

حال کے دو معنی ہیں: ایک تو کیفیت غیر اختیاریہ، دوسرے رسوخ اعمال اختیاریہ۔ دوسرے معنی میں حال کا ترتب لازم ہے، کیونکہ وہ موعود ہے۔

ففی الحدیث: کذلك الایمان اذاخالطه بشاشة القلوب (ایمان کی یہی صورت ہوتی ہے جب اس کی بشاشت دلوں میں بیٹھ جائے)

(حدیث ہرقل، بخاری، باب بدء الوحی)

وفی کلام اللّٰہ تعالیٰ:

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ (جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت پر ڈالنا چاہتے ہیں، اس کے سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں)

(سورۃ الانعام، آیت ۱۲۵)

اور تصوّف میں یہی حال مطلوب ہے، جب کوئی شخص اعمال صالحہ بتکلّف اختیار کرتا ہے تو رفتہ رفتہ ان اعمال میں سہولت ہونے لگتی ہے اور ایک کیفیت راسخہ پیدا ہو جاتی ہے، اور گویہ کیفیت رسوخ بذاتہ غیر اختیاری ہے، لیکن بایں معنی اختیاری ہے کہ اس کے اسباب اختیاری

ہیں یعنی اعمال صالحہ، مثلاً محبّت حق تعالیٰ کے ساتھ پیدا کرنا واجب ہے۔ کیونکہ نصوص میں اسکی تحصیل کا امر ہے، بخلاف شوق و ذوق کے کہ اس کی تحصیل کا کہیں بھی امر نہیں۔ جس محبّت کی تحصیل مامور بہ ہے وہ عقلی ہے، اور محبّت عقلی اختیاری ہے، بخلاف محبّت طبعی کے کہ وہ غیر اختیاری ہے، اس لئے مامور بہ بھی نہیں۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۶)

غیر اختیاری کاموں پر مؤاخذہ نہیں

حضرت والا نے اس ملفوظ میں دو مضمون بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ یہ قاعدہ کلّیہ ہے کہ انسان ان کاموں کا مکلّف ہوتا ہے جو اس کے اختیار میں ہیں، جو کام انسان کے اختیار سے باہر ہیں وہ انسان کی تکلیف یعنی ذمہ داری سے خارج ہیں، انسان ان کی بجاآوری کا پابند نہیں اور نہ انسان کو ان کی تحصیل کا حکم دیا گیا۔ قرآنِ کریم کا صاف ارشاد ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلاَّ وُسْعَهَا۔

(سورۂ بقرہ: آیت ۲۸۶)

یعنی اللہ تعالیٰ کسی نفس کو کسی ایسے کام کا مکلّف نہیں کرتے جو اس کے اختیار سے باہر ہو، اختیاری امور کا انسان مکلّف ہے، غیر اختیاری امور کا

مکلف نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی غیر اختیاری کام ایسا ہے جس کو انسان نہیں کر سکا تو اس پر انسان کی پکڑ اور موٴاخذہ نہیں ہوگا کہ تم نے یہ عمل کیوں نہیں کیا، کیونکہ وہ عمل اس کے اختیار سے باہر تھا۔

”حال“ کی پہلی قسم، کیفیت غیر اختیاریہ

ذکر و شغل کے اثرات کی وجہ سے انسان پر طاری ہونے والی کیفیات کو صوفیاء کی اصطلاح میں ”حال“ کہتے ہیں۔ جیسے یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں چیز اس کا حال ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں کہ اس حال کی دو قسمیں ہیں:

حال کی ایک قسم ہے کسی کیفیت غیر اختیاریہ کا پیدا ہو جانا۔ مثلاً یہ کہ جب اللہ تعالیٰ کا نام آئے یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام آئے تو اس کو سن کر بے اختیار گریہ طاری ہو جائے۔ چنانچہ بعض اللہ کے بندے ایسے ہوتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام گرامی آتے ہی ان کی طبیعت میں ایسی رِقّت پیدا ہوتی ہے کہ اس سے گریہ طاری ہو جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ یہ ایک حال اور کیفیت ہے، لیکن یہ کیفیت غیر اختیاری ہے، اس لئے کہ انسان کے اختیار میں نہیں کہ جب چاہے اپنے اوپر گریہ طاری کرلے اور جب چاہے آنسو بہا دے اور جب چاہے رک جائے، عام طور پر یہ فعل انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔ یا مثلاً بعض اللہ کے بندوں پر کسی خاص موقع پر وجد طاری ہو جاتا ہے۔ اس کو بھی ”حال“ غیر اختیاری کہا جاتا ہے۔

"حال" کی دوسری قسم، اعمال میں رسوخ

"حال" کی دوسری قسم یہ ہے کہ اعمال صالحہ میں ثابت قدمی اور رسوخ پیدا ہو جائے، اس کو بھی صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "حال" کہا جاتا ہے، لیکن یہ حال بالمعنی الثانی ہے، یعنی کسی عمل صالح کے اندر اتنا رسوخ پیدا ہو گیا اور اتنی پختگی اور ثابت قدمی آ گئی کہ وہ عمل صالح انسان کی طبیعت ثانیہ بن گیا، مثلاً نماز ہے، جب بچپن میں اس کو پڑھنا شروع کیا تھا تو اس وقت بہت بھاری معلوم ہوتی تھی، اور پڑھنے کو دل نہیں چاہتا تھا، کبھی پڑھی کبھی نہیں پڑھی، لیکن والدین نے اور استادوں نے زبردستی نماز پڑھنے پر لگا دیا، اب رفتہ رفتہ نماز پڑھنے کی عادت پڑ گئی اور اس میں رسوخ پیدا ہو گیا، اور اس درجہ کا رسوخ پیدا ہو گیا کہ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ایک لاکھ روپے لے لو اور نماز چھوڑ دو، تو انشاء اللہ نمازی آدمی نماز نہیں چھوڑے گا، چاہے اس کو کوئی کتنا ہی لالچ دیدے یا اس کے گلے پر تلوار رکھ دے، یا نفس میں کیسا ہی تقاضہ سستی اور کاہلی کا آ جائے۔ اسکو "رسوخ" اور "ثابت قدمی" بھی کہا جاتا ہے اور اسی کو "حال بالمعنی الثانی" کہا جاتا ہے، یعنی نماز اس شخص کا "حال" بن گئی، طبیعت ثانیہ بن گئی، اب وہ نہیں چھوٹے گی۔

"حال" کی پہلی قسم مطلوب نہیں

حضرت والا فرماتے ہیں کہ "حال" کی پہلی قسم یعنی غیر اختیاری

کیفیات کا صادر ہونا، مثلاً گریہ طاری ہو رہا ہے، دل اُمڈ رہا ہے، سرور طاری ہو رہا ہے، عبادت میں لطف آ رہا ہے، یہ چیزیں نہ تو بذات خود مطلوب ہیں، نہ ہی آخرت میں ان کے بارے میں سوال ہو گا کہ ہمارا نام آنے پر تم کیوں نہیں روئے؟ تمہارے آنسو کیوں جاری نہیں ہوئے؟ اس کا سوال آخرت میں نہیں ہو گا، اس لئے کہ یہ حال غیر اختیاری کیفیت ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو نماز کے اندر مزہ نہیں آتا تو کوئی بات نہیں، اس لئے کہ وہ مزہ مطلوب ہی کب ہے، اگر ساری عمر تمہیں نماز کے اندر مزہ نہ آیا، لیکن پھر بھی سنّت طریقے پر نماز پڑھتے رہے تو تمہارا کوئی گھاٹا نہیں، اس لئے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ یہ نہیں پوچھیں گے کہ تمہیں نماز میں مزہ کیوں نہیں آیا؟ اور چونکہ تمہیں نماز میں مزہ نہیں آیا، لہٰذا ہم تمہیں جہنم میں بھیج رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کریں گے، اس لئے کہ مزہ آنا نہ آنا غیر اختیاری فعل ہے، اور غیر اختیاری فعل پر باز پرس اور پکڑ نہیں، اور چونکہ غیر اختیاری ہے اور آخرت میں اس پر پکڑ نہیں، اس لئے اس کے حصول کی فکر میں بھی زیادہ نہیں پڑنا چاہئے۔

احوال محمود ہیں مطلوب نہیں

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس مسئلے کو واضح کر گئے، ورنہ تصوّف کے اسرار و رموز کے اندر یہ حقیقت چھپ گئی تھی اور لوگوں نے ان کیفیات کو اور ان احوال کو ہی مقصود بنا لیا

تھا، اور یہ سمجھا جارہا تھا کہ تصوّف کا مقصد ہی یہ ہے کہ یہ احوال اور کیفیات طاری ہوں، عبادت میں مزہ آئے، گریہ طاری ہو، آنسو جاری ہوں، دل چلنے لگے وغیرہ، ان سب چیزوں کو مقصود اصلی بنالیا گیا تھا۔ لیکن حضرت والا نے دودھ کا دودھ، پانی کا پانی کردیا اور دو لفظوں میں بات صاف فرمادی، تاکہ نہ افراط رہے اور نہ تفریط رہے۔ چنانچہ فرمایا کہ یہ احوال مطلوب نہیں، اگرچہ محمود ہیں، یعنی اگر اللہ تعالیٰ کسی کو یہ احوال عطا فرمادیں تو یہ کوئی بری بات نہیں، اچھی بات ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، لیکن مطلوب اور مقصود نہیں۔ اس لئے ان کے پیچھے مت پڑو، اگر حاصل ہو جائیں تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرو، اگر حاصل نہ ہوں تو بھی اللہ کا شکر ادا کرو کہ الحمدللہ عمل کی توفیق ہوگئی۔

نماز میں مزہ تلاش مت کرو

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ حضرت! نماز پڑھتے ہوئے ساری عمر گزر گئی مگر نماز میں مزہ ہی نہیں آیا، کچھ علاج فرمادیں۔ حضرت نے جواب میں لکھا کہ نماز میں مزہ آنا کوئی ضروری نہیں، تم مزہ کی خاطر نماز پڑھ رہے ہو یا اللہ تعالیٰ کی بندگی کی خاطر نماز پڑھ رہے ہو کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لئے نماز پڑھ رہا ہوں۔ ارے اگر مزہ کی خاطر نماز پڑھی جارہی ہے تو وہ نماز ہی کیا ہوئی!! نماز تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور اس کی بندگی کی خاطر پڑھی جائے، چاہے اس نماز میں

مزہ آئے یا نہ آئے، تکلیف ہو یا مشقّت ہو۔

میں اس شخص کو مبارک باد دیتا ہوں

اسی لئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو ساری عمر کبھی نماز میں مزہ نہ آیا ہو، لطف نہ آیا ہو اور اس پر کبھی سرور کی کیفیت طاری نہ ہوئی ہو، میں اس شخص کو مبارکباد دیتا ہوں۔ کیوں؟ اس لئے کہ اگر اس کو نماز کے اندر مزہ آتا یا نماز کے اندر اس کو کوئی کیف و سرور حاصل ہو جاتا تو خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ اسی کو مقصود سمجھ بیٹھتا اور اسی کو حاصل نماز سمجھ لیتا، اس کے نتیجے میں وہ گمراہی میں مبتلا ہو جاتا، اللہ تعالیٰ نے اس کو احوال و کیفیات سے دور رکھ کر گمراہی سے بچالیا۔ بہر حال! عبادات کی ادائیگی میں ان سرور اور کیفیات کے پیچھے مت پڑو، ان کیفیات کی وجہ سے یا تو عجب اور ناز پیدا ہو جاتا ہے یا اس کو اصل مقصود سمجھ لینے سے کسی وقت اس میں کمی آ جانے پر خود کو ناکام اور محروم سمجھ بیٹھتا ہے، دونوں صورتوں میں نقصان ہے۔ اس لئے کیفیات ہر شخص کے لئے موزوں بھی نہیں، لہٰذا ان کی فکر ہی نہ کی جائے۔ بس اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سنّت ہے، اس پر سیدھے سیدھے عمل کرتے چلے جاؤ، اس فکر میں مت پڑو کہ رونا آیا کہ نہیں آیا، دل چلا کہ نہیں چلا، وجد طاری ہوا کہ نہیں ہوا، مزہ آیا کہ نہیں آیا۔

نفسانیت اور روحانیت کا فرق

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن بڑی عجیب بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ "نفسانیت" اور "روحانیت" ان دونوں میں بڑا باریک فرق ہے، اور یہ پہچاننا بڑا مشکل ہے کہ کیا چیز نفسانیت ہے اور کیا چیز روحانیت ہے، کس چیز میں نفسانیت آرہی ہے اور کس چیز میں روحانیت ہو رہی ہے۔ پھر یہ فرق سمجھانے کے لئے ہم سے ایک سوال کیا کہ ایک شخص ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے، اور اس کے بیٹے جوان ہیں جو کما رہے ہیں، کھا رہے ہیں، بیٹیوں کی شادی کر دی، اور یہ فارغ البال ہے، پنشن مل رہی ہے اور اچھے طریقے سے گزارا ہو رہا ہے، کوئی فکر نہیں، کوئی مشغلہ نہیں۔ اس کا معمول یہ ہے کہ اذان سے بھی پہلے نماز کے لئے تیار ہو کر وضو کر کے تحیۃ الوضوء پڑھتا ہے، اور اذان سنتا ہے، فوراً ہی مسجد میں پہنچتا ہے، پھر اطمینان سے تحیۃ المسجد پڑھتا ہے، پھر سنتیں پڑھتا ہے، اور پھر اطمینان سے جماعت کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، یہاں تک کہ نماز کی جماعت کا وقت آجاتا ہے تو فرض نماز جماعت کے ساتھ اطمینان سے خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرتا ہے، اور اس کو اپنی نماز میں بڑا لطف آتا ہے، اور اس کو نماز میں عجیب نورانیت، سرور اور سکون محسوس ہوتا ہے، ایک حال یہ ہے۔

ٹھیلے والے کی نماز

دوسری طرف ایک شخص وہ ہے جو ٹھیلہ لگاتا ہے، اور صبح سے شام تک آوازیں لگاکر اپنا سامان بیچتا ہے اور اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے، اس ذریعہ سے حلال روزی کماتا ہے، مگر جب اذان کی آواز آئی تو اس کو نماز کی فکر لگ گئی، اس نے چاہا کہ میں جلدی گاہکوں کو نمٹاؤں اور پھر نماز ادا کروں، چنانچہ کبھی ایک کو سامان دے رہا ہے کبھی دوسرے کو سامان دے رہا ہے، یہاں تک کہ عین نماز کا وقت آگیا تو اس نے گاہکوں سے کہا کہ میں ابھی نماز پڑھ کر آتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے جلدی سے ٹھیلہ ایک طرف کھڑا کیا اور اس پر کپڑا ڈالا اور بھاگا بھاگا مسجد گیا، جلدی جلدی سے وضو کیا اور صف میں جاکر کھڑا ہو گیا اور حواس باختگی کے عالم میں ''اللہ اکبر'' کہہ کر نیت باندھ لی۔ اب نماز میں کھڑا ہوا ہے، لیکن دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، اور دل میں یہ خیالات آرہے ہیں کہ کوئی ٹھیلہ پر چوری نہ کرلے، کہیں گاہک نہ بھاگ جائیں وغیرہ، اور نماز بھی پڑھ رہا ہے، جماعت کے بعد جلدی سے اس نے دو سنتیں پڑھیں اور بھاگا بھاگا جاکر دوبارہ ٹھیلہ لگالیا۔ ایک یہ حال ہے۔

روحانیت کس میں زیادہ ہے؟

پھر حضرت والا نے پوچھا کہ بتاؤ کہ پہلا شخص جو ریٹائر منٹ کی زندگی گزار رہا ہے، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، یا اس ٹھیلے والے کی نماز میں

روحانیت زیادہ ہے؟ بظاہر یوں لگتا ہے کہ وہ پہلا شخص جو اذان سے پہلے سے گھر سے نکلا ہوا ہے، اس نے اطمینان سے تحیۃ الوضوء پڑھی، تحیۃ المسجد پڑھی، سنتیں پڑھیں، اور پھر خشوع و خضوع کے ساتھ دل لگا کر اس نے فرض نماز ادا کی، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔ دوسری طرف وہ ٹھیلے والا جس نے بھاگا دوڑی میں نماز ادا کرلی، اس کی نماز میں بظاہر روحانیت نہیں ہے۔ لیکن میں یہ سچ کہتا ہوں کہ اس دوسرے شخص کی نماز میں روحانیت پہلے شخص کی نماز سے کہیں زیادہ ہے، اور اس پہلے شخص کو نماز میں جو کیفیات حاصل ہو رہی ہیں، وہ حقیقت میں نفسانی کیفیات ہیں، وہ حظِ نفسانی ہیں، اگرچہ وہ جائز اور محمود حظ نفسانی ہے، مگر روحانیت تو محض عمل سے حاصل ہوتی ہے، اس میں وہ دونوں برابر ہیں۔ بلکہ ٹھیلے والا شخص اس پہلے شخص سے بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنے مشاغل اور مصروفیات کے باوجود اللہ کے دربار میں آکر کھڑا ہو گیا، چاہے وہ مختصر وقت کے لئے ہی آگیا ہو مگر تعمیل حکم میں آیا، اس لئے اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔

دوسرے شخص کے عمل میں رسوخ ہے

بہر حال! پہلے شخص کو نماز میں جو "حظ" حاصل ہو رہا تھا وہ "حال" بالمعنی الاوّل ہے اور یہ حال مطلوب اور مقصود نہیں اور مامور بہ نہیں۔ اور دوسرے شخص کا جو عمل ہے اس میں "رسوخ" ہے، اس کو اپنے عمل میں اتنا رسوخ حاصل ہو گیا کہ اپنے شواغل اور مصروفیات کے باوجود ان سب کو

چھوڑ کر نماز ادا کر رہا ہے، یہ "حال" بالمعنی الثانی ہے، یہ مطلوب اور مقصود ہے اور مامور بہ ہے، اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، پہلی چیز حاصل ہو یا نہ ہو، اس کا مطالبہ نہیں، اگر ہو جائے تو اللہ کا شکر ادا کرے، اگر نہ ہو تو کوئی پرواہ نہیں۔

عمل میں تسلسل سے رسوخ حاصل ہو جاتا ہے

اب یہ دوسری چیز کیسے حاصل ہوتی ہے؟ اس کے بارے میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ دوسری چیز یعنی "رسوخ" اصلاً غیر اختیاری ہے، لیکن اس اعتبار سے اختیاری ہے کہ اس کے اسباب اختیاری ہیں، اس لئے جب انسان کسی عمل کو کرنا شروع کر دیتا ہے، اور پھر مسلسل اس کو کرتا رہتا ہے تو اس کو اس عمل میں "رسوخ" حاصل ہو جاتا ہے، جیسے میں نے اوپر نماز کی مثال دی کہ نماز پڑھتے پڑھتے رسوخ حاصل ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً روزہ رکھنا بڑا مشکل تھا، لیکن روزے رکھتے رکھتے رسوخ پیدا ہو گیا، اب روزہ دار سے کہو کہ اپنا روزہ توڑ دے تو کبھی بھی وہ روزہ توڑنے کے لئے تیار نہیں ہو گا، اس لئے کہ اب رسوخ پیدا ہو گیا۔

عمل کرنا شروع کر دے

اس رسوخ کے پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ عمل کرنا شروع کر دے، چاہے دل لگے یا نہ لگے، چاہے اس کو کرتے وقت دل کہیں ہو اور دماغ کہیں ہو، لیکن پھر بھی لگا رہے، اور اس فکر میں نہ رہے کہ میرا دل و دماغ کہاں

ہے؟ ارے دل و دماغ جہاں جاتے ہیں، جانے دے، لیکن عمل کرتا رہے، عمل نہ چھوڑے۔ مثلاً نماز کے لئے مسجد میں آرہا ہے، اب اس وقت دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، پھر بھی مسجد میں آجا، آنے کو مت چھوڑ۔ اسی طرح جتنے اعمال صالحہ ہیں، ان سب کو کرنا شروع کردے، چاہے ان کے کرنے کے وقت دل کسمسائے اور تلملائے، دل پر آرے چلیں، مشقت اور محنت معلوم ہو، کوئی لطف و لذت کوئی جوش و خروش نہ ہو، لیکن ان سب کے باوجود ان اعمال کو کرے، اور کرتا رہے، کرتا رہے، یہاں تک کہ چند روز کے بعد ان اعمال میں "رسوخ" پیدا ہو جائے گا، اور حال بالمعنی الثانی حاصل ہو جائے گا۔ اور صوفیاء کی اصطلاح میں حال بالمعنی الثانی کا دوسرا نام "مقام" ہے، اور جب کسی شخص کو کسی عمل میں "رسوخ" حاصل ہو جاتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ اس کو اس عمل میں "مقام" حاصل ہو گیا، مثلاً فلاں کو "صبر" کا مقام حاصل ہو گیا، فلاں کو توکّل کا مقام حاصل ہو گیا، فلاں کو شکر کا مقام حاصل ہو گیا، مثلاً جب کوئی اچھی بات سامنے آئی تو اس نے فوراً اللہ کا شکر ادا کیا، اور ایسا بار بار کرتا رہا، یہاں تک کہ شکر کے اندر اس کو رسوخ پیدا ہو گیا اور شکر کرنا اس کی طبیعت ثانیہ بن گیا۔ اس ملفوظ میں حضرت والا نے ایک بات تو یہ بیان فرمائی ہے۔

اللہ کی محبّت غیر اختیاری ہونے کے باوجود مامور بہ کیوں ہے؟

دوسرے اس ملفوظ میں حضرت والا نے ایک اشکال کا جواب دیا ہے،

اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے تو یہ اصول بیان فرمایا کہ اختیاری امر مامور بہ ہے اور غیر اختیاری کا انسان مکلّف نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی محبّت کا دل میں پیدا کرنا جو مامور بہ ہے اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت مامور بہ ہے، یہاں تک آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمادیا:

لا یؤمن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ و ولدہ والناس اجمعین۔

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب حب الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین سے اور اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ لہٰذا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب محبت غیر اختیاری چیز ہے تو اس کو زبردستی کیسے اپنے دل میں پیدا کریں؟

مامور بہ محبّت طبعی نہیں عقلی ہے

اس کا جواب حضرت والا نے اس ملفوظ میں دیدیا کہ جو محبت مامور بہ ہے وہ محبّت طبعی نہیں، بلکہ محبّت عقلی ہے، یعنی جب عقل سے وہ سوچے گا کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ محبّت کے لائق کون ہونا چاہئے؟ تو اس کی عقل اس کو اسی نتیجے پر پہنچائے گی کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ محبّت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونی چاہئے، چاہے دل میں طبعی طور پر محبّت کے جذبات اس طرح امڈتے ہوئے محسوس نہ ہوں جس طرح

والدین اور اولاد کے لئے محبت کے جذبات دل میں امڈتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اگر بالفرض کسی کا یہ حال ہو تو وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کافر ہو گیا، بلکہ وہ سوچے کہ الحمدللہ مجھے اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے محبت عقلی حاصل ہے، اگرچہ محبّت طبعی اس درجے کی نہیں ہے۔

ایک صحابیؓ کا واقعہ

روایت میں آتا ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث سنائی کہ:

لا یؤمن أحد کم حتی اکون أحب الیه من والده وولده و الناس اجمعین۔

تو ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! مجھے اور سب چیزوں سے تو آپ ﷺ زیادہ محبوب نظر آتے ہیں، لیکن مجھے یہ شبہ ہے کہ شاید آپ مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب نہیں، اس لئے پھر تو میں مؤمن بھی ہوں یا نہیں؟ یہ سن کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہی حدیث دوبارہ ارشاد فرمائی اور ان صحابیؓ کے سینے پر ہاتھ مارا، اس وقت ان صحابیؓ نے فرمایا: ''الآن'' ''الآن'' یا رسول اللہ ﷺ! اب ہو گیا۔

جملہ ''الآن'' کی توجیہ

علماء کرام نے ان صحابیؓ کے اس جملے کی مختلف توجیہات کی ہیں، عام

طور پر جو توجیہ کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ان کے سینے پر ہاتھ مارنے سے پہلے وہ محبّت حاصل نہیں تھی، لیکن ہاتھ مارنے کے بعد وہ محبّت حاصل ہوگئی۔ اس لئے انہوں نے فرمایا "الآن" اب مجھے وہ محبّت حاصل ہوگئی۔

بہترین توجیہ

لیکن ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی عجیب توجیہ فرمائی ہے، وہ یہ کہ ایسا نہیں تھا کہ ہاتھ مارنے سے پہلے، العیاذ باللہ، وہ صحابی کافر تھے اور ہاتھ مارنے کے بعد مسلمان ہوگئے، اور ہاتھ مارنے سے پہلے محبت کا درجہ حاصل نہیں تھا، اب حاصل ہوگیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب تک مؤمن نہیں تھے، ابھی مؤمن ہوئے، ایسا نہیں ہے، بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ اس حدیث سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود یہ تھا کہ ایک مؤمن کے دل میں محبّت عقلی کا ہونا واجب ہے، اور ایمان محبّت عقلی پر موقوف ہے، آپ کا مقصد یہ بیان کرنا نہیں تھا کہ محبّت طبعی پر ایمان موقوف ہے، اور ان صحابیؓ کو جو اشکال ہوا، وہ اس لئے ہوا کہ وہ یہ سمجھے کہ محبّت سے مراد محبّت طبعی ہے، اور محبّت طبعی اس درجے کی حاصل نہیں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر جو مارا، اس سے یہ بتلانا مقصود تھا کہ تم اس جملے کا صحیح مطلب نہیں سمجھ رہے ہو، اس لئے کہ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میری محبّت طبعی سب چیزوں سے زیادہ ہونی چاہئے، بلکہ میرا مقصد یہ ہے

کہ محبّت عقلی زیادہ ہونی چاہئے۔ اس کے جواب میں ان صحابی نے فرمایا "الآن" یعنی اب بات میری سمجھ میں آگئی کہ کس قسم کی محبت مطلوب ہے۔

لہٰذا "الآن" کا یہ مطلب نہیں کہ محبت کا یہ درجہ پہلے حاصل نہیں تھا، اب حاصل ہو گیا، کیونکہ یہ مطلب لینے کی صورت میں یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت سے پہلے وہ صحابی مسلمان نہیں تھے اور اب مسلمان ہوئے اور یہ بات بڑی خطرناک ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ "الآن" کے معنی یہ ہیں کہ اب میں حدیث کا مفہوم سمجھا کہ محبّت سے مراد محبت طبعیؔ نہیں بلکہ محبّت عقلی ہے۔

محبّت عقلی اختیاری ہے

یہ محبّت عقلی اختیاری ہے، اور محبّت طبعی غیر اختیاری ہے۔ اس لئے یہ محبّت طبعی مامور بہ نہیں اور ایمان کیلئے موقوف علیہ نہیں اور محبّت عقلی مامور بہ ہے۔ اب محبّت کو حاصل کرنے کا راستہ کیا ہے؟

محبّت حاصل کرنے کا آسان راستہ

حضرت والا نے "نشر الطیب" میں اس کا راستہ بتا دیا، وہ یہ کہ آدمی پہلے یہ دیکھے کہ اس کائنات میں دوسرے سے محبّت کرنے کے کیا کیا اسباب ہوتے ہیں؟ مثلاً محبت کا سبب یا تو "مال" ہوتا ہے یا "جمال" ہوتا ہے، یا "کمال" ہوتا ہے یا "نوال" ہوتا ہے۔ کسی سے محبّت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ

خوبصورت ہے، کسی سے محبّت اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے اندر علمی یا عملی کمالات ہیں، کسی سے محبّت اس لئے ہوتی ہے کہ وہ بہت سخی ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر یہ تمام اسبابِ محبّت بدرجہ کمال اس طرح موجود تھیں کہ کائنات میں کسی اور کے اندر ثابت نہیں ہیں۔

آپ ﷺ کا جمال دیکھو تو ایسا، کمال دیکھو تو ایسا، نوال دیکھو تو ایسا، اور جب آدمی ان کمالات میں غور کرے گا تو لازماً اس سے عقلی محبّت پیدا ہوگی، چاہے طبعی محبت اس درجے کی پیدا نہ ہو، یا اگر ہو بھی تو محسوس نہ ہو۔

غیر اختیاری امور کے پیچھے مت پڑو

بہرحال! اس ملفوظ کا خلاصہ یہ ہوا کہ غیر اختیاری امور کے پیچھے مت پڑو، لیکن اختیاری امور میں کوتاہی نہ کرو، اور جب عمل صالح کرنے کا وقت آجائے تو اس کو مت چھوڑو، اور اعمال میں لگے رہو، اگر ساری عمر بھی کیفیات پیدا نہ ہوں تو بھی تمہارا کوئی نقصان نہیں، لیکن عمل میں لگے رہو، یہاں تک کہ "رسوخ" حاصل ہو جائے، یہ پختگی اور دوام ہی مطلوب ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۳۲

حصول نسبت کا طریقہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۲

مجلس نمبر : ۳۲

صفحات : ۲۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

مجلس نمبر ۳۲

حصولِ نسبت کا طریقہ

الحمدللّٰہ رب العالمین ۔ والعاقبة للمتقین ۔
والصّلاة والسّلام علٰی رسوله الکریم ۔
وعلٰی آله واصحابه اجمعین ۔
أمّا بعد!

حصول نسبت کی ترتیب و حقیقت

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

حصول نسبت کی ترتیب اور حقیقت یہ ہے کہ
اول بہ تکلف اعمال ظاہرہ و باطنہ کی اصلاح کرے،
بالخصوص اعمال باطنہ کی اصلاح زیادہ اہم اور دشوار ہے،

جب اعمال صالحہ ظاہرہ اور باطنہ پر ایک معتد بہ مدّت تک مواظبت رہتی ہے تو رفتہ رفتہ ان اعمال میں سہولت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک کیفیت راسخہ پیدا ہو جاتی ہے۔اس سہولت کے لئے تمام مراقبات، ریاضات، مجاہدات، اذکار اور اشغال مقرر کئے گئے ہیں، باقی اصل چیز اصلاح اعمال ظاہرہ و باطنہ ہی ہے، جس پر نسبتِ حقیقی مرتب ہوتی ہے۔

جب بندہ اعمال صالحہ ظاہرہ و باطنہ پر مداومت کرتا ہے تو حق تعالیٰ کو اس کے ساتھ رضائے دائمی کا تعلق پیدا ہو جاتا ہے اور یہی حقیقت ہے "نسبت مع اللہ" کی۔ اور صرف ذکر دائم یا دوام حضور یا ملکہ "یاد داشت" جس کو کہتے ہیں وہ نسبت کی حقیقت نہیں، البتہ حصول نسبت میں معین بہت ہے، کیونکہ جس کو ہر وقت حق تعالیٰ کا دھیان رہتا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہونا مستبعد ہے۔ یہ تو نسبت کی حقیقت ہے۔

حق تعالیٰ کو بندے کے ساتھ ایک خاص تعلق رضا کا ہو جانا جس کا خاصّہ ایک خاص انجذاب ہے جس کے لوازم میں سہولت اطاعت اور حضور دائم ہے، اور یہ محض موہوب ہے، کیونکہ کسی عمل صالح میں یہ قابلیت

نہیں کہ وہ رضائے الٰہی کے حصول کے لئے کافی ہو سکے، گو عادۃ اللہ یہ ہے کہ محض اپنے فضل سے اپنی رضا کو اعمال صالحہ پر مرتب فرما دیتے ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی وجہ سے جنّت میں نہ جائے گا، بلکہ محض حق تعالیٰ کے فضل سے جائے گا۔ اور یہ نسبت مع اللہ عادۃً پھر کبھی زائل نہیں ہوتی، جیسے بالغ ہونے کے بعد صفت بلوغ کبھی زائل نہیں ہوتی۔ اسی مسئلے کو صوفیاء نے بعنوان ''فناء'' تعبیر کر کے فرمایا ہے کہ:

''الفانی لایردّ''

یعنی فانی اور واصل کبھی مردود نہیں ہوتا۔

اگر یہ شبہ ہو کہ بعد وصول و حصول نسبت کے بھی تو معاصی کا صدور ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے پھر رضائے دائمی کا تحقق کہاں رہا؟ تو سمجھ لو کہ گہری دوستی کے بعد یہ ضروری نہیں کہ کبھی باہم شکر رنجی بھی نہ ہو، گاہے گاہے شکر رنجی بھی ہو جاتی ہے، لیکن تدارک کے بعد پھر ویسا ہی تعلق ہو جاتا ہے، بلکہ دراصل اس خفگی کے زمانے میں بھی دوستی کا اصل تعلق بدستور قائم رہتا ہے، وہ زائل نہیں ہوتا، شکر

رنجی محض عارضی ہوتی ہے۔

مثلاً تکمیل صحت کے بعد ضروری نہیں کہ اس حالت میں کبھی زکام بھی نہ ہو، یا کبھی اگر بد پرہیزی کرلے، مثلاً گڑ کھالے تو اس سے نقصان نہ ہو، بدپرہیزی سے نقصان ضرور ہوگا، لیکن محض عارضی تدارک کے بعد پھر وہی حالتِ غالبہ صحت کی عود کر آئے گی۔ یا مثلاً درسیات کے فراغ کے بعد یہ ضروری نہیں کہ کبھی کسی مقام پر اٹکے ہی نہیں، کہیں کہیں بعد فراغ بھی اٹکتا ہے، لیکن ذرا توجہ سے پھر چل نکلتا ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷)

یہ حضرت والا کا طویل ملفوظ ہے، اور سارے تصوف اور طریقت کا جو مقصود سمجھا جاتا ہے یعنی اللہ جلّ شانہ سے "نسبت کا حصول" اس ملفوظ میں حضرت والا نے اس "نسبت" کا مطلب اور اس کی حقیقت اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ بیان فرمایا ہے۔

آپ نے سنا ہوگا کہ فلاں بڑے "صاحبِ نسبت" بزرگ ہیں، یا بڑے "صاحب نسبت و لی اللہ" ہیں، فلاں کو "نسبت" حاصل ہوگئی ہے۔ یا جیسے آپ نے صوفیاء کے تذکروں میں یہ سنا ہوگا کہ ایک بزرگ کی جب دوسرے بزرگ سے ملاقات ہوئی تو ایک بزگ نے دوسرے بزرگ کی

"نسبت" معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ان کی "نسبت" کس معیار کی ہے؟ کس درجے کی ہے؟ وغیرہ۔

"نسبت" حاصل ہونے کا مطلب

حضرت والا اس "نسبت" کی حقیقت بیان فرمارہے ہیں کہ "نسبت" حاصل ہونے کے معنی درحقیقت یہ ہیں کہ اللہ جل شانہ اس بندے سے راضی ہیں اور اس کی عبادات اور طاعات کو قبول فرمارہے ہیں، اور بحیثیت مجموعی اس بندے کے اعمال کو پسند فرماتے ہیں، جب یہ کیفیت حاصل ہو جائے تو کہا جائے گا کہ اس کو "نسبت مع اللہ" حاصل ہوگئی۔

"نسبت" حاصل ہونے کی دو علامتیں

لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ فلاں بندے کو "نسبت" حاصل ہوگئی اور یہ کیسے معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہیں؟ تو نسبت حاصل ہونے اور اللہ تعالیٰ کے بندے سے راضی ہونے کی دو علامتیں ہیں، ایک "کثرت ذکر" دوسری "دوامِ طاعات" دوام طاعات کا مطلب یہ ہے کہ شریعت کے عائد کردہ جو فرائض و واجبات ہیں ان کو پابندی سے بروقت انجام دے رہا ہے، اور جن چیزوں سے شریعت نے روک دیا ہے ان سے ہر حالت میں رکا ہوا ہے، ظاہری و باطنی ہر طرح کے گناہوں سے اجتناب کررہا ہے، نسبت کی ایک علامت یہ ہے۔ اور دوسری چیز کثرت ذکر ہے،

"کثرت ذکر" کا مطلب یہ ہے کہ اس کی زبان اور اس کا دل بیشتر اوقات اللہ جل جلالہ کی طرف متوجہ رہتے ہوں، یا تو وہ زبان سے ذکر میں مشغول ہے، یا اس کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف اس طرح لگا ہوا ہے کہ اگر خیال ہے تو اللہ تعالیٰ کا، اگر فکر ہے تو اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کی، اس کی زبان پر کبھی ذکر ہے، کبھی کلمہ شکر ہے، کبھی کلمہ صبر ہے، کبھی استغفار ہے، کبھی استعاذہ ہے، ہر وقت کسی نہ کسی بہانے اللہ تعالیٰ سے رشتہ جڑا ہوا ہے، جب دیکھو اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگ رہا ہے اور چلتے پھرتے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے، اور اس کی کیفیت یہ ہے کہ:

"دل بیار دست بکار"

ہاتھ کام میں لگے ہوئے ہیں، دیکھنے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ شخص دنیا کے کام میں لگا ہوا ہے، لیکن اس کا دل اللہ جل شانہ کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ یہ بڑے اعلیٰ درجے کی کیفیت ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو یہ کیفیت عطا فرمادے۔ آمین۔ ہر وقت کے دھیان کی اسی کیفیت کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں "ملکۂ یاد داشت" بھی کہا جاتا ہے، اس لئے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں بسی ہوئی ہے، اسی کا دھیان دل میں جما ہوا ہے۔

یہ دل ایک ہی ذات کی تجلّی گاہ ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دل اپنے لئے بنایا ہے، اور تمام اعضاء کو تم دنیا کے کاموں

میں لگادو، لیکن یہ دل تو صرف ایک ہی ذات کی تجلّی گاہ ہے، اسی ذات کو اس کے اندر جلوہ افروز ہونا چاہئے، کسی اور کو دل میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لو کنت متّخذاً لا تخذت أبابکر خلیلاً

(ترمذی، کتاب المناقب، باب مناقب أبی بکرؓ)

یعنی اگر دنیا میں کسی کو صحیح معنی میں دلی دوست بنانا ہوتا تو میں "ابوبکر" (رضی اللہ عنہ) کو بناتا، لیکن چونکہ دنیا میں کسی کو دلی دوست بنانا ہی نہیں، ایسا دوست جو "خلیل" ہو، یعنی جو دوسروں سے غافل کردے اور جس کا خیال دل میں سمایا ہوا ہو، جس کی ہر وقت دھن لگی ہوئی ہو، ایسا دوست میں دنیا میں کسی کو بنانا ہی نہیں چاہتا، ایسا دوست تو وہ ایک ہی ذات ہے جو دل میں بیٹھی ہوئی ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ "دل" انہی کے لئے ہے، انہی کی "تجلّی گاہ" اور انہی کی "فرودگاہ" ہے، اس میں وہ کسی اور کو برداشت نہیں کرتے کہ اس کے اندر کوئی سما جائے۔ ٹھیک ہے کہ جب تم دنیا کے اندر زندگی گزار رہے ہو، تو لوگوں سے تعلقات رکھو، دنیاوی ضروریات پوری کرو، اپنی خواہشات کو جائز حدود کے اندر رہ کر پورا کرو، لیکن اس دل کے اندر سوائے اللہ جل شانہ کے کوئی اور نہ سمائے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے یہ دولت عطا فرمادے۔ آمین۔

خوبصورت دعا، خوبصورت شعر

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کتنی خوبصورت دعا مانگا کرتے تھے کہ:

اَللّٰھُم اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَ شْیَاءِ اِلَیَّ
وَ اجْعَلَ خَشْیَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْیَاءِ عِنْدِیْ

اے اللہ! تمام اشیاء کی محبتوں پر اپنی محبت کو غالب فرما، اور تمام چیزوں کے خوف پر اپنے خوف کو غالب فرما۔ میں نے بھی کسی وقت ایک شعر کہا تھا کہ:

آتی متاعِ قلب کو رکھنا سنبھال کے
قسمت سے اس گھر پہ دل اس دلربا کا ہے

یعنی اس دل پر تو اس کا دل آیا ہوا ہے، اس لئے اس کو سنبھال کر رکھنا، یہ اِدھر اُدھر پھینکنے کی چیز نہیں ہے۔

یہ اللہ کی رضامندی کی علامت ہے

بہرحال! اگر یہ "کثرت ذکر" حاصل ہو جائے جس کا نام "ملکہ یاد داشت" ہے، تو یہ ایک علامت ہے حصول "نسبت" کی، اور جب یہ دونوں چیزیں یعنی دوام طاعات اور کثرت ذکر حاصل ہو جائے یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہو گئی ہے، اور جب اللہ تعالیٰ

کی رضا حاصل ہو گئی تو اور کیا چاہیے؟ کیونکہ اس کائنات میں اس سے بڑا مقصود اور اس سے بڑا انعام کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ راضی ہو جائیں۔ یہ ہے حصول "نسبت" کی حقیقت، جس کو مختصراً یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ "نسبت" سے مراد "رضائے باری تعالیٰ" ہے جس کی علامت "ملکۂ یاد داشت اور دوام طاعت" ہے۔

"نسبت" حاصل کرنے کا طریقہ

اس "نسبت" کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تمام اعمال صالحہ جن میں اعمال صالحہ ظاہرہ بھی داخل ہیں جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ، اور اعمال صالحہ باطنہ بھی داخل ہیں جیسے شکر، صبر، توکل، تواضع وغیرہ، یہ تمام اعمال بہ تکلف اور بمشقت کرتا رہے، یعنی ان کے انجام دینے میں اگرچہ تکلف اور مشقت ہو رہی ہو، اور دل نہ چاہ رہا ہو، لیکن زبردستی نفسانی خواہشات کو کچل کر اور دل کو موڑ کر یہ اعمال کرتا رہے، یہ اعمال کرنے کے نتیجے میں خود رفتہ رفتہ حالت راسخہ پیدا ہو جاتی ہے، اور اس حالت راسخہ پر "ملکۂ یاد داشت" مرتب ہو جاتا ہے، پھر "ملکۂ یاد داشت" پر "نسبت" بھی مرتب ہو جاتی ہے۔

اس طریق کا سنہری اصول

لہٰذا "نسبت" حاصل کرنے کے لئے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ

انسان اعمال صالحہ بہ تکلف کرتا رہے۔ اور اس طریق کا سنہری اصول یہ ہے کہ جس طاعت میں سستی ہو رہی ہو اسی طاعت کو انجام دو، اور جس معصیت سے بچنے میں سستی ہو رہی ہو اسی معصیت سے زبردستی بچنے کا اہتمام کرو، اور طے کرلو کہ چاہے دل پر آرے ہی چل جائیں لیکن یہ کام نہیں کروں گا، بس جس دن یہ کام شروع کردیا بس اس دن سے کامیابی کے راستے پر چل پڑے۔

نفس و شیطان کمزور ہیں

یاد رکھو! شیطان کا مکر ویسے تو بڑا طاقتور معلوم ہوتا ہے، لیکن قرآن کریم نے فرمادیا:

اِنَّ کَیْدَ الشَّیْطٰنِ کَانَ ضَعِیْفاً۔

(سورۂ نساء، آیت ۷۶)

یعنی شیطان کا مکر بڑا کمزور ہے۔ اسی طرح نفس کا مکر بھی ضعیف ہے۔ ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس نفس اور شیطان کے سامنے ڈٹ گیا، یہ اس کے آگے پگھل جاتے ہیں، یہ نفس و شیطان کمزوروں پر شیر ہیں اور مضبوط آدمی کے آگے رام ہیں، جو آدمی ان کے سامنے ہتھیار ڈال دے تو یہ اس پر سوار ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہے میرا شکار، اور پھر اس کو ڈھا دیتے ہیں، اور جو آدمی ان کے سامنے ڈٹ گیا کہ نہیں، میں اس کی بات نہیں مانوں گا، اس کے آگے یہ چھوئی موئی ہو جاتے

ہیں۔

بہر حال، اصل کام ان کے سامنے ڈٹنے کا ہے، اور ڈٹنے میں تھوڑی محنت اور مشقت اور تکلیف ہوتی ہے، لیکن ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اس کے سامنے ڈٹ کر دیکھو۔ اپنی خواہشات کو کچل کر دیکھو، اور خواہشات کے کچلنے سے جو تمہیں تکلیف ہوگی وہ تکلیف خود تمہارے درجات کی بلندی کا باعث ہوگی اور یہ مجاہدہ تمہیں کہاں سے کہاں پہنچادے گا۔

"نفس" دودھ پیتے بچے کی طرح ہے

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ نے "قصیدہ بردہ" میں نفس کی کیا خوبصورت مثال بیان فرمائی ہے۔ فرمایا کہ:

اَلنَّفْسُ کَالطِّفْلِ اِنْ تُهْمِلْهُ شَبَّ عَلٰی
حُبِّ الرِّضَاعِ وَاِنْ تُفْطِمْهُ يَنْفَطِمِ

یعنی نفس کی مثال دودھ پیتے بچے جیسی ہے، اگر تم بچے کو دودھ پینے کی حالت پر چھوڑ دو تو وہ بچہ بوڑھا ہو جائے گا مگر دودھ پینا نہیں چھوڑے گا، اس لئے کہ اس کا نفس دودھ پینے کی محبت میں لگا ہوا ہے، اور جب ماں باپ اس کو دودھ چھڑاتے ہیں تو وہ روتا ہے، چیختا ہے، اس کو تکلیف ہوتی ہے، اور ماں اس کا دودھ چھڑانے کے لئے پستانوں پر ایلوا وغیرہ کڑوی چیز لگا لیتی ہے، تاکہ بچے کو اس سے نفرت پیدا ہو، اب اگر ماں باپ اس کے چیخنے چلانے پر ہتھیار ڈالدیں اور یہ سوچیں کہ یہ تو بہت چیختا ہے، خود بھی نہیں

سوتا، ہمیں بھی نہیں سونے دیتا، لہٰذا اس کا دودھ نہیں چھڑاتے، اس کو دودھ پینے دو، تو اس صورت میں وہ بچہ بوڑھا ہو جائے گا مگر دودھ پینا نہیں چھوڑے گا، لیکن اگر ماں باپ نے یہ پختہ ارادہ کرلیا کہ اس کا دودھ چھڑوانا ہے، چاہے یہ چیخے یا چلائے، روئے یا کچھ بھی کرے، ہم اس کو دودھ نہیں دیں گے، اگر تین دن تک یہ کرلو گے تو چوتھے دن اس کا دودھ چھوٹ جائے گا۔

نفس کے سامنے ڈٹ جاؤ

انسان کے نفس کا بھی یہی معاملہ ہے، اگر تم اس کو اس کی خواہشات کے پورا کرنے میں ڈھیل دیتے رہو گے تو تمہیں اپنے چکر میں مبتلا رکھے گا، لیکن جس دن تم اس کے سامنے ڈٹ گئے کہ مجھے اس کی خواہشات کو چھڑانا ہے، اس دن یہ چھوڑ ہی دے گا۔ اور جب یہ نفس خواہشات کو کچلنے کا عادی بنے گا اور اس کچلنے کے نتیجے میں جو جلا پیدا ہو گی، وہ تمہیں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچادے گی، لیکن ایک مرتبہ ڈٹ کر اس کا مقابلہ کرنا ہو گا۔ لہٰذا یہ جتنے مجاہدات اور مراقبات ہوتے ہیں ان کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان اپنے نفس پر قابو پانے کی کوشش کرے، اور جیسے جیسے انسان اپنی خواہشات پر چوٹیں مارتا ہے اور ان کو کچلتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنا مقام قرب عطا فرماتے رہتے ہیں۔

نفسانی خواہشات تقویٰ کے لئے ایندھن ہے

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

شہوتِ دنیا مثالِ گلخن است

کہ ازو حمام تقوی روشن است

کہ دنیا کی ان خواہشات کی مثال ایندھن یعنی لکڑی جیسی ہے، اس لئے دل میں جو خواہشات پیدا ہو رہی ہیں ان کو بیکار مت سمجھو، ان کو خراب مت سمجھو، یہ بڑے کام کی چیز ہے، وہ یہ کہ یہ خواہشات "ایندھن" ہے، اس کو جلاؤ، جتنا اس کو جلاؤ گے اتنا ہی اس سے تقویٰ کا حمام روشن ہوگا، تمہارے دل میں تقویٰ کی روشنی پیدا ہوگی۔ لہٰذا ان خواہشات کو بیکار مت سمجھو، دل میں جو خواہشات ابھر رہی ہیں کہ یہ کام کرلوں، یہ کام کرلوں، آنکھ کو غلط جگہ پر استعمال کرلوں، زبان سے غیبت کرلوں، کان کو غلط استعمال کرلوں، ان کو بیکار مت سمجھو،

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں

کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

ان کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اور مصلحت جان کر پیدا فرمایا ہے، وہ یہ کہ ان کو جلاؤ، جب ان کو جلاؤ گے تو تمہارے دل میں تقویٰ پیدا ہوگا، اگر ان خواہشات کو دبانے میں دل پر چوٹیں لگیں تو لگنے دو، صدمہ پہنچے تو پہنچنے دو، تکلیف ہوتی ہے تو ہونے دو ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

جتنا یہ دل ٹوٹے گا اتنا ہی اس بنانے والے کی نگاہ میں عزیز ہوگا، یہ کام کر کے دیکھو، پھر اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ وہ حلاوت عطا فرمائیں گے کہ اس کا کوئی جواب نہیں، اس کے آگے گناہوں کی حلاوتیں اور لذتیں ہیچ در ہیچ ہیں۔

"نسبت" حاصل ہونے کے بعد زائل نہیں ہوتی

بہر حال، تکلف کے ساتھ اعمال صالحہ ظاہرہ اور باطنہ کو انجام دیتے رہنا، یہ عمل انسان کو "کثرت ذکر" اور "دوام طاعت" کی طرف لے جاتا ہے، اور یہ دونوں چیزیں حصول "نسبت مع اللہ" کی علامتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اور اپنے فضل سے یہ "نسبت" ہم سب کو عطا فرما دے، آمین۔ اور جب یہ "نسبت" ایک مرتبہ حاصل ہو جائے تو پھر جاتی نہیں، البتہ درمیان میں بعض اوقات کچھ گرد و غبار آجاتا ہے، مثلاً کچھ غلطی ہو گئی، کہیں بھول چوک ہو گئی، کوئی گناہ سرزد ہو گیا، تو اس وقت درمیان میں عارضی قسم کی خلش آجاتی ہے، پھر کچھ دنوں کے بعد توبہ استغفار کے نتیجے میں یہ خلش اور رنجش ختم بھی ہو جاتی ہے۔

دیکھئے! کوئی شخص کتنا بھی بڑے سے بڑا ولی اللہ ہو جائے، وہ معصوم نہیں ہوتا، ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی کبھی کوئی غلطی سرزد ہو جائے۔ اس غلطی کے سرزد ہونے سے دل میں عارضی تکدّر پیدا ہو جاتا ہے، لیکن جب

وہ توبہ و استغفار کرلیتا ہے تو وہ کدورت صاف ہو جاتی ہے۔ بہر حال! اس ملفوظ میں حضرت والا نے "نسبت" کی حقیقت، "نسبت" کی علامت، "نسبت" کے حصول کا طریقہ اور اس کا نتیجہ بیان فرمایا ہے۔

نسبت کے تحقّق کے لئے رضائے تام شرط ہے

فرمایا کہ:

"نسبت" متحقّق ہوتی ہے کامل رضائے حق پر، نہ کہ مطلق رضائے حق پر، کیونکہ رضا تو ہر فعل حسن پر مرتب ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص زنا کرے اور اس کے بعد نماز بھی پڑھے تو زنا پر ناراضی مرتب ہوگی لیکن نماز پر رضا بھی مرتب ہوگی، افعال قبیحہ و حسنہ پر اپنی اپنی جگہ برابر ناراضی اور رضا مرتب ہوتی رہتی ہے، لیکن "نسبت" کے تحقق کے لئے رضائے تام شرط ہے۔

(انفاس عیسی، ص ۱۸)

یعنی یہ نہیں کہ بعض گناہ تو چھوڑ دیے اور بعض گناہ ابھی باقی ہیں، بعض اعمال واجبہ کو انجام دے رہا ہے اور بعض اعمال چھوڑ رکھے ہیں۔ اس پر "نسبت" حاصل نہیں ہوتی، اگرچہ جو اچھے اعمال کر رہا ہے وہ اعمال رضا کا سبب تو ہیں، اللہ تعالیٰ اس پر راضی بھی ہیں، لیکن ساتھ میں وہ ناراضی کے

کام بھی کر رہا ہے، اس لئے رضائے تام اس کو حاصل نہیں، اور جب رضائے تام حاصل نہیں تو اس پر "نسبت" کا بھی تحقق نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ نسبت کے تحقق کے لئے رضائے تام شرط ہے۔

رضائے ناتمام کی مثال

آگے فرمایا کہ:

"رضاء ناتمام کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے مرض کی حالت میں عارضی افاقہ ہو جائے، گو وہ بھی بسا غنیمت ہے۔

(انفاس عیسی، ص ۱۸)

اگر مرض میں عارضی طور پر تھوڑی بہت صحت حاصل ہو جائے تو وہ صحت بھی نہ ہونے سے بہتر ہے، اسی طرح ایک آدمی گناہ ہی گناہ کر رہا ہے، نیکی کرتا ہی نہیں، اس کے مقابلے میں وہ شخص یقیناً بہتر ہے جو گناہ بھی کرتا ہے اور نیکی بھی کرتا ہے ؎

این ہم کن آں ہم کن تا غلبہ کرا باشد

لیکن اصل بات یہ ہے کہ انسان گناہ کرے ہی نہیں، جو کام بھی اس سے سرزد ہو وہ اللہ کی رضا کے مطابق ہو، یہ ہے رضائے کامل، اس کے بغیر "نسبت" حاصل نہیں ہوتی۔

اعمال صالحہ میں لگے رہو

بہر حال، یہ سب الفاظ تو طریقت کی "اصطلاحات" ہیں، ان کو محض جان لینے سے کام نہیں چلتا، اسی لئے فن سلوک کی اصطلاحات کے بارے میں ہمارے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ میاں "اصطلاحات" کے پھیر میں مت پڑو، بس سیدھی سیدھی بات کیا کرو، اور سیدھی بات کا خلاصہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ میں لگے رہو، اعمال ظاہرہ بھی ٹھیک ٹھیک ادا ہوں اور اعمال باطنہ بھی ٹھیک ٹھیک ادا ہوں، گناہوں سے اجتناب ہو اور طاعت کی بجا آوری ہو، بس اس میں لگے رہو، اور جب ان میں سستی ہو تو اس کا مقابلہ کرو اور تکلیف ہو تو اس کو برداشت کرو، جب یہ کرتے رہو گے تو انشاء اللہ رفتہ رفتہ منزل تک پہنچ جاؤ گے اور "نسبت مع اللہ" حاصل ہو جائے گی۔

نتائج اور ثمرات کی فکر میں مت پڑو

نتائج اور ثمرات کی فکر میں زیادہ مت پڑو کہ ہر وقت سوچتے رہو کہ اب میں کہاں پہنچا؟ اب کہاں پہنچا؟ بلکہ کام کرتے جاؤ، بالآخر خود بخود مطلوب حاصل ہو جائے گا، چاہے تمہیں پتہ چلے یا نہ چلے کہ "نسبت" حاصل ہو گئی، ارے آم کھانے سے مطلب یا پیڑ گننے سے؟ اگر تمہیں پتہ نہ چلے کہ "نسبت" حاصل ہوئی یا نہیں؟ لیکن ہو گئی تو اللہ کا کرم ہے۔

بچہ کس طرح بالغ ہو جاتا ہے

ہمارے حضرت مثال دیا کرتے تھے کہ دیکھو، بچہ روزانہ بڑا ہوتا ہے، اب اگر کوئی شخص اپنے بچے کو اسکیل سے روزانہ ناپا کرے کہ آج کتنا بڑا ہوا، کل کتنا بڑا ہوا، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ شخص مایوس ہو جائے گا اور کہے گا کہ میرا بچہ تو بڑا ہی نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ بچے کے بڑھنے کا عمل اتنا غیر محسوس ہے اور اتنا کم ہے کہ وہ اسکیل میں آتا ہی نہیں، لیکن کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ بچہ بڑا نہیں ہو رہا ہے، روزانہ بڑا ہو رہا ہے، اگرچہ اس کے بڑھنے کی رفتار دھیمی ہے، لیکن بڑھ رہا ہے اور بڑھتے بڑھتے اچانک ایک دن وہ "بالغ" ہو جائے گا، اور اس بچے کو پتہ بھی نہیں ہوگا کہ میں بالغ ہو گیا۔ اس لئے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بچے کو "بالغ" ہونے کی اصطلاح اور تعریف معلوم نہیں ہوتی، اس لئے وہ یہ نہیں کہتا کہ میں آج بالغ ہو گیا، اس لئے کہ عام طور پر کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میں فلاں تاریخ کو بالغ ہوا تھا، کیونکہ اس کو پتہ ہی نہیں کہ بالغ کیا ہوتا ہے اور نابالغ کیا ہوتا ہے۔ تو دیکھئے! اصطلاح معلوم نہ ہونے کے باوجود وہ رفتہ رفتہ "بالغ" ہو گیا۔ اسی طرح فرمایا کہ عمل صالح کرتے جاؤ اور اسی میں لگے رہو، انشاء اللہ ایک دن "نسبت" حاصل ہو جائے گی، چاہے تمہیں پتہ چلے یا نہ چلے، اور جس دن اللہ تعالیٰ نے یہ "نسبت" اور تعلق مع اللہ کی دولت عطا فرما دی تو بس بیڑا پار ہے۔

خلاصہ

البتہ حضرت والاؒ کے ارشاد سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ محض ملکۂ یاداشت حاصل ہو جانے پر بے فکر نہ ہو جانا چاہئے جب تک کہ دوام طاعت اس کے ساتھ ساتھ نہ پیدا ہو جائے، بہت سے لوگوں کو اسی سے دھوکہ ہوگیا ہے، نسبت مع اللہ نہ تو گناہوں کے ارتکاب کرتے رہنے کے ساتھ قائم ہوتی ہے نہ محض حضوری کی وقتی کیفیات کے ساتھ۔ بس خلاصہ یہ ہے کہ عمل میں لگے رہو، اور اس فکر میں مت پڑو کہ کیا نتائج اور ثمرات مرتب ہو رہے ہیں، بلکہ اس کی فکر کرو کہ جو تم عمل کر رہے ہو وہ درست ہو اور صحیح راستے پر ہو، اور وہ سنت کے مطابق ہو، اس میں لگے رہو، انشاء اللہ تعالیٰ سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جلد ۳

اصلاحی مجالس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- ذکر کے مختلف طریقے
- معمولات کی پابندی
- ذکرِ الٰہی کے چند آداب
- ملکۂ یادداشت کا مطلب
- حصولِ قرب کا مختصر راستہ
- ذکر میں دل نہ لگنے کے اسباب
- درس و تدریس کے ساتھ اصلاحِ اعمال

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین
والصّلاة والسّلام علٰی رسوله الکریم، وعلی
کل من تبعهم باحسان الی یوم الدین، أمابعد

اللہ کے فضل وکرم سے "اصلاح مجالس جلد ۳" بھی تیار ہو کر آپ کے سامنے آچکی ہے۔ الحمد للہ اس جلد کے اختتام پر "انفاس عیسیٰ" کے باب اوّل "تعلیمات" سے متعلق مجالس کا بیان بھی پورا ہو گیا، اور اب انشاء اللہ چوتھی جلد سے انفاس عیسیٰ کے باب دوم "تحقیقات" اور باب سوم "تہذیبات" سے متعلق مجالس کے بیانات پر مشتمل ہو گی، اللہ تعالیٰ اس کام کو صدق واخلاص سے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور تمام رکاوٹوں کو دور فرمائے۔ آمین۔

عبداللہ میمن

۲/ذی الحجہ ۱۴۲۲ھ

اجمالی فہرست مجالس

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر
ذکر رگ و پے میں سرایت کر چکا تھا	۳۹
ذکر مسنون کیلئے اجازت کی ضرورت نہیں	″
ذکر میں مشقت خود نافع ہے	۴۰
ذکر میں زبردستی لگے رہو	۴۱
دل گھبرانے کا کوئی علاج نہیں	۴۲
یہ مشقت اور بار فائدے سے خالی نہیں	″
ایسے ذکر میں نورانیت زیادہ ہوتی ہے	۴۳
روحانیت اور نورانیت کی حقیقت	۴۴
ان کی کوئی حقیقت نہیں	″
اللہ سے رابطہ استوار کر لو	۴۵
تمہیں یہاں پر "حرم" حاصل ہو جائے گا	۴۶
ہر حالت میں ذکر میں مشغول رہو	″
مجلس نمبر ۳۴	۴۹
ذکر کے مختلف طریقے	″
مشقت کے باوجود ذکر میں لگا رہے	۵۱

عنوان	صفحہ نمبر
یہ احداث فی الدّین اور بدعت ہے	۶۳
ذکر میں ضرب لگانا مقصود نہیں	۶۴
اصل مقصود ان کا نام لینا ہے	″
ایک قوم ان طریقوں کو بدعت کہتی ہے	۶۵
دوسری انتہا	″
فکر سے اُنس ہو جانا ذکر ہی کی برکت ہے	۶۶
فکر ذکر کا نتیجہ ہے	۶۷
ذکر مت چھوڑنا	۶۸
ذکر قلبی کے باوجود ذکر لسانی نہ چھوڑے	″
جاہل پیروں کا یہ خیال گمراہی ہے	۶۹
شیخ عبد القادر جیلانیؒ کا واقعہ	۷۰
ذکرِ سانی کو جاری رکھنا چاہئے	۷۱
مجلس نمبر ۳۵	۷۳
نماز میں آنکھیں بند کرنا	″
آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا سنّت ہے	۷۶

عنوان	صفحہ نمبر
حضرت شیخ الھندؒ اور اتباع سنت	۷۷
مبتدی کو آنکھیں بند کرنے کی اجازت	۷۸
زیادہ قیود وحشت کا باعث ہوتی ہیں	۷۹
ایک خان صاحب کو راستے پر لانے کا واقعہ	۸۰
بے وضو نماز کی اجازت دینے کا اعتراض	۸۳
مجلس نمبر ۳۶	۸۵
معمولات کی پابندی	"
اپنے معمول سے زائد ذکر کرنے کا حکم	۸۷
بہترین عمل	۸۸
مداومت کے مفید ہونے پر مثال	"
معمول تھوڑا مقرر کرو لیکن پابندی سے کرو	۸۹
زائد ذکر کو معمول میں داخل نہ کرو	۹۰
اسی ذکر کو دوبارہ دھرالو	۹۱
حضرت گنگوھیؒ کا ایک ملفوظ	"
"چک ڈور" کی مثال	۹۲

صفحہ نمبر	عنوان
۱۰۵	آذان کی آواز پر کام بند..............................
"	"حسرت" نے آگے بڑھا دیا..............................
۱۰۶	ذکر کے ذریعہ فرحت پیدا نہ ہونے کا شکوہ..............................
۱۰۷	یہ توفیق بھی نعمت ہے..............................
۱۰۸	لذّت اور کیفیت مقصود نہیں..............................
"	عمل درست ہونے کی فکر کریں..............................
۱۰۹	بیت اللہ پر پہلی نظر پڑنے پر رونا نہ آنا..............................
"	ثمرات کا انتظار خود رکاوٹ ہے..............................
۱۱۱	خود نماز ہی مقصود ہے..............................
"	یہاں تو عین منزل ہے تھکن سے چور ہو جانا..............................
۱۱۲	وہ شخص قابل مبارک باد ہے..............................
۱۱۵	**مجلس نمبر ۳۸**
"	**ذکر الٰہی کے چند آداب**
۱۱۷	باوضو ذکر کرنا..............................
۱۱۹	ذکر کیلئے تیمّم بھی کر سکتے ہیں..............................

عنوان	صفحہ نمبر
مجلس نمبر ۳۹	۱۳۱
ملکۂ یادداشت کا مطلب	〃

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
استغفار شیطان کے زہر کا تریاق	۲۰۹
جنوبی افریقہ میں ایک زہریلی جھاڑی	″
توبہ کرنے والا گناہوں سے پاک	۲۱۰
سحری کے وقت استغفار کیوں؟	۲۱۱
خلاصہ	۲۱۲
مجلس نمبر ۴۳	۲۱۳
اوراد و وظائف سے مقصود "عبدیت" ہے	″
"ورد" کا مقصود اصلی "عبدیت" ہے	۲۱۵
رخصتوں پر عمل کرنا بھی پسندیدہ ہے	۲۱۶
رخصت پر عمل کرنے سے دل تنگ نہ ہو	۲۱۷
یہ روزہ کس کے لئے رکھ رہے ہو؟	″
سفر میں روزہ رکھنا	۲۱۸
جیسا وہ کہیں وہ کرو	۲۱۹
حضور ﷺ آسانی اختیار فرماتے	″
توڑنا ہے حُسن کا پندار کیا؟	۲۲۰

عنوان	صفحہ نمبر
مجلس نمبر ۴۶	۲۶۳
درس و تدریس کے ساتھ اصلاحِ اعمال	″

عنوان	صفحہ نمبر
معراج کے تذکرے میں "عبد" کا لفظ لانا	۲۹۱
یہ بے ادبی کے الفاظ ہیں	۲۹۲
یہ تکلیف تمہیں کس بلند مقام پر پہنچارہی ہے	؍؍
ایک مسلمان اور ایک یہودی کا قصہ	۲۹۳
فرشتوں نے اپنا اپنا کام کرلیا	۲۹۴
یااللہ! بات سمجھ میں نہیں آئی	۲۹۵
کافروں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے	؍؍
مسلمانوں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے	۲۹۶
حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کو نوازنے کا انداز	۲۹۷
تکالیف پر رضامندی، درجات کی بلندی کا ذریعہ	۲۹۸
موت کی دعا کے بجائے یہ دعا کریں	۲۹۹
تین سبق	۳۰۰
اپنی طرف سے تجویز مت کرو	۳۰۱
حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ	؍؍
ہمارا حکم اور ہمارا فیصلہ ہی سب کچھ ہے	۳۰۲
بیماری میں سابقہ عمل کا ثواب ملتا رہتا ہے	۳۰۴
بینائی کی دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں	۳۰۵

صفحہ نمبر	عنوان

مجلس نمبر ۳۳

ذکر اللہ کی اہمیت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۳۳

صفحات : ۱۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر ۳۳

ذکر اللہ کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ والعاقبة للمتقین۔
والصّلاة والسّلام علیٰ رسوله الکریم۔ وعلی
آله واصحابه اجمعین۔

أمّا بعد!

انفاس عیسیٰ کا معمول

ہر سال رمضان المبارک میں ظہر کی نماز کے بعد حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "انفاس عیسیٰ" سے ملفوظات سنانے کا معمول ہے، لیکن اس سال اسفار کی وجہ سے یہ سلسلہ اب

تک شروع نہ ہوسکا، اور اب صرف چند روز باقی ہیں، اس لئے خیال آیا کہ اس کتاب کا کوئی ایک حصّہ لے لیا جائے اور اس پر کچھ بیان ہو جائے۔ میرا ذہن اس طرف گیا کہ یہ رمضان المبارک کا آخری عشرہ چل رہا ہے، یہ عشرہ پورے رمضان کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اللہ جلّ جلالہ نے اس عشرے میں رحمتوں کے دروازے کھولے ہوئے ہیں، ہر طرف سے رحمتوں کی بارش برس رہی ہے، طاق راتوں میں شب قدر ہونے کا احتمال ہے، اور حدیث شریف میں اس عشرے کو "عتق من النیران" قرار دیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اس عشرے میں بندوں کو جہنّم سے رہائی کا پروانہ عطا فرماتے ہیں۔

رمضان کے آخری عشرہ میں آپ ﷺ کی کیفیت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب رمضان المبارک کا آخری عشرہ داخل ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال ہوتا کہ:

شَدَّ مِیْزَرَہٗ وَاَحْیَا لَیْلَہٗ وَاَیْقَضَ اَھْلَہٗ

اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ آپ اپنی ازار باندھ لیتے تھے، لیکن اس سے ایک محاورہ کی طرف اشارہ ہے، اور وہ ہے کسی کام کے لئے کمر کس لینا، یعنی آپ کمر کس لیتے تھے، اور عبادت میں زیادہ سے زیادہ محنت اور مشقت اٹھانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ وَاَحْیٰ لَیْلَہٗ اور اپنی رات کو زندہ رکھتے، یعنی رات کے وقت جاگتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جاگ کر رات گزارتے۔ وَاَیْقَضَ اَھْلَہٗ اور اپنے گھر والوں کو بھی عبادت کے لئے بیدار کرتے۔

عام دنوں میں تہجد کے وقت کیفیت

عام دنوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو اس بات کا اہتمام فرماتے کہ گھر والوں کی نیند میں خلل نہ آئے، چنانچہ حدیث شریف میں یہ الفاظ ہیں کہ:

قام رویداً وفتح الباب رویداً

جب آپ بستر سے کھڑے ہوتے تو آہستہ سے کھڑے ہوتے، کہیں ایسا نہ ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی آنکھ کھل جائے، اور جب دروازہ کھولتے تو بہت آہستہ سے کھولتے تاکہ ان کی نیند میں خلل نہ آئے۔ اپنے گھر والوں کی نیند کا اتنا احساس تھا، لیکن جب رمضان المبارک کا عشرہ اخیرہ داخل ہوتا تو اپنے گھر والوں کو اہتمام سے بیدار فرماتے کہ یہ عبادت کا وقت ہے، اس وقت میں اللہ کی عبادت کرو۔ بعض روایات میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ وَکَثُرَ صَلَاتَہٗ یعنی ان ایام میں آپ ﷺ نماز کی کثرت فرماتے۔ اور عبادت کا یہ اہتمام صرف طاق راتوں میں نہیں ہوتا تھا بلکہ پورے عشرے کی تمام راتوں میں یہ اہتمام فرماتے۔

آخری عشرہ کس طرح گزارا جائے؟

بہرحال! یہ عشرہ اخیرہ اسی کام کے لئے ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں گزارا جائے، نماز بھی ذکر کا ایک شعبہ ہے، عبادات بھی ذکر کا شعبہ

ہیں، اور مقصد یہ ہے کہ رمضان المبارک کا یہ عشرہ اخیرہ اللہ جل شانہ کی یاد میں گزرے اور ذکر قلبی اور ذکر لسانی میں یہ وقت گزرے۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس آخری عشرہ کی راتوں کو جلسوں میں، تقریروں میں اور تقریبات اور دعوتوں میں ضائع کرنا بڑی خطرناک بات ہے، یہ راتیں جلسے اور تقریروں کی نہیں ہیں، بلکہ یہ محض عمل کرنے کی راتیں ہیں، بس انسان ہو اور گوشہ تنہائی ہو، اور اپنے مالک کے ساتھ رابطہ قائم ہو، وہ ہو اور ان کا اللہ ہو، تیسرا کوئی نہ ہو، اس طریقے سے اس عشرے کو گزارو، اور ذکر میں گزارو، زبان سے ذکر ہو، دل سے ذکر ہو، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، ہر حالت میں اللہ کا ذکر ہو، بلکہ بازار میں، دفتر میں، گھر کے کام کاج میں مصروف ہو، تب بھی زبان پر اور دل میں اللہ کا ذکر ہو اور یہ کیفیت ہو کہ:

دل بیار دست بکار

یعنی ہاتھ تو کام کاج میں لگا ہو اور دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو۔

ایمان والوں سے خطاب

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا۔

(سورۃ الاحزاب، آیت ۴۱)

اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو۔

بعض طلبہ یہ سمجھتے ہیں کہ ذکر کرنا تو صوفیوں کا کام ہے، مولویوں کو اور علماء کو ذکر سے کیا کام؟ علماء کرام کا کام تو یہ ہے کہ وہ وعظ کریں، تبلیغ کریں، تدریس کریں، سبق پڑھیں پڑھائیں، مطالعہ کریں، تکرار کریں وغیرہ، ذکر سے مولوی کا کیا کام؟ ذکر کرنا تو صوفیوں کا کام ہے، لہٰذا جب خانقاہ میں جائیں گے تو وہاں ذکر کریں گے۔ ارے بھائی! یہ آیت جو میں نے پڑھی اس میں تو تمام ایمان والوں سے خطاب ہو رہا ہے، اب یہ بتائیں کہ مولوی ایمان والوں میں داخل ہے یا نہیں؟ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے عموم کے اندر سب داخل ہیں، لہٰذا یہ سمجھنا کہ ہم تو طالب علم ہیں، ہم تو کتاب پڑھیں گے، مطالعہ کریں گے، تکرار کریں گے، ذکر نہیں کریں گے۔ یاد رکھئے! یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

ذکر میں کثرت مطلوب ہے

اور پھر اس آیت میں فرمایا کہ اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، جس کا مطلب یہ ہے کہ صرف ایک دو مرتبہ ذکر کر لینا کافی نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے نام کی رٹ لگاؤ، اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت تمہاری زبان پر ذکر جاری رہے۔ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! قیامت کے روز درجہ کے اعتبار سے افضل درجہ کس بندے کا ہوگا؟ آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا کہ:

الذاکرون اللّٰہ کثیراً والذاکرات۔

(ترمذی۔ کتاب الدعا۔ باب نمبر ۵)

جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے مرد اور عورتیں ہیں۔

دھیان کے بغیر ذکر کرنا

بعض لوگوں کے دلوں میں یہ شبہ ہوتا ہے کہ یہ کیسا ذکر ہے کہ دل و دماغ تو کہیں اور مشغول ہیں اور زبان سے ذکر کر رہا ہے، سبحان اللہ، الحمدللہ، لا الہٰ الا اللہ کی تسبیحات پڑھ رہا ہے، لیکن دھیان کہیں، فکر کہیں، دل کہیں، دماغ کہیں، تو ایسے ذکر سے کیا فائدہ؟ یاد رکھئے! یہ شیطان کا دھوکہ ہے، ارے اگر صرف زبان کو اللہ کے ذکر کی توفیق ہو رہی ہے، چاہے دل دماغ کہیں اور مشغول ہیں، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، یہ بھی بڑی دولت ہے۔ ارے یہ دولت کیا کم ہے کہ جسم کے تمام اعضاء میں سے ایک عضو تو ان کی یاد میں مشغول ہے۔

زبان پر ذکر ہو دل میں خیالات ہوں

چنانچہ اس پر لوگوں کے درمیان ایک شعر مشہور ہے کہ:

برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

یعنی زبان پر تسبیح جاری ہو اور دل میں گائے اور گدھے کا خیال آرہا ہو، ایسی تسبیح کا کیا اثر اور کیا فائدہ؟ کسی شاعر نے یہ شعر کہدیا، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے یہ شعر کہا ہے وہ حقیقت شناس نہیں ہے، حقیقت تو یہ ہے کہ:

برزبان تسبیح و در دل گاؤ خر

ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر

یعنی اگر زبان پر تسبیح جاری ہے، اور دل میں گائے اور گدھے کا خیال آرہا ہے، اللہ کے فضل سے ایسی تسبیح بھی اپنا اثر رکھتی ہے۔ زبان کا ذکر اس راہ کی پہلی سیڑھی ہے، اگر ز بان اللہ کے ذکر سے تر نہیں ہوگی تو پھر دل کبھی اللہ کے ذکر سے آباد نہیں ہوگا۔ جو شخص اس پہلی سیڑھی کو قطع نہیں کرے گا، اس کے دل میں اللہ کی یاد کیسے سمائے گی؟ اس لئے زبان سے ذکر کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف بڑھنے کا، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ رابطہ استوار کرنے کا پہلا زینہ ہے، اگر زبان سے ذکر نہیں ہے تو گویا پہلی سیڑھی ہی موجود نہیں، اس لئے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ زبان سے ذکر کا کیا فائدہ جب دل ہی متوجہ نہیں ہے۔ بلکہ زبان سے ذکر کرتے رہو چاہے دل لگے یا نہ لگے، جمعیت خاطر پیدا ہو یا نہ ہو، لیکن تم ذکر کرتے رہو، تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ کے نام کی رٹ لگاؤ، رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ اسی کے ذریعہ دل کو بھی متوجہ فرمادیں گے۔ اگر فرض کریں کہ ساری عمر دل اس طرف متوجہ نہیں ہوا، تب بھی زبان سے ذکر بھی فائدے سے خالی نہیں۔

ذکر اللہ ایک توانائی ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ذکر ایک انرجی اور توانائی ہے، لہٰذا صبح اٹھنے کے بعد ناشتہ کرنے سے پہلے یہ انرجی اور توانائی حاصل کرلو، اس لئے کہ اللہ کا ذکر دلوں میں توانائی پیدا کرتا ہے، ارادوں میں توانائی پیدا کرتا ہے، ہمّت میں طاقت عطا کرتا ہے، اور اس کے نتیجے میں انسان کے اندر شیطان اورنفس سے مقابلے کے لئے ہمت پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا نفس و شیطان کو شکست دینے میں ذکر کو بڑا دخل ہے، پھر یہ ذکر کرنے والا شیطان سے مغلوب نہیں ہوتا، اور اسی زبانی ذکر ہی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اللہ کے ذکر نے گناہ سے روک دیا

جس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے گناہ کا موقع آیا اور تمام اسباب جمع ہو گئے، تو اس وقت اس گناہ سے ذکر نے روک دیا، اس لئے کہ جب زلیخا نے کہا "هَيْتَ لَكَ" تو جواب میں انہوں نے فرمایا "معاذ اللّٰه" اللہ کی پناہ۔ اس موقع پر اللہ کی پناہ کے احساس نے یہ طاقت دی اور اتنے دلربا ماحول میں جس میں انسان کے پھسل جانے کا ننانوے فیصد احتمال موجود تھا، اس اللہ کے ذکر نےان کو گناہ سے روک دیا۔

ذکر رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا

اس کے بعد اگلا جملہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ فرمایا:

اِنَّهُ رَبِّیٓ اَحْسَنَ مَثْوَایَ

حضرات مفسّرین نے اس جملہ کی دو تفسیریں کی ہیں۔ بعض حضرات نے تو فرمایا کہ "رَبِّی" سے مراد عزیز مصر ہیں، زلیخا جس کی بیوی تھی، اور بعض حضرات نے فرمایا کہ "رَبِّی" سے مراد "اللہ جل شانہ" ہیں، اور اشارہ اس جملے سے اس طرف فرمایا کہ اگرچہ تم نے دروازے بند کر دیے ہیں اور دروازوں پر تالے ڈال دیے ہیں اس خیال سے کہ اس عمل کا کسی کو پتہ نہ چلے، لیکن میرا ایک پروردگار ہے جو مجھے اس حالت میں بھی دیکھ رہا ہے، جس نے مجھے بہترین ٹھکانہ دیا ہے۔ تو "اِنَّه' رَبِّی" کا خیال ذکر کی برکت سے آرہا ہے، وہ ذکر جو ان کی رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا، اور اللہ تعالیٰ کی یاد ان کے دل ودماغ میں پیوست ہو چکی تھی، اس کے نتیجے میں وہ اس گناہ سے بچ گئے۔ بہرحال! یہ ذکر ایک توانائی اور انرجی ہے جس کو صبح کے وقت کاروبار زندگی میں داخل ہونے سے پہلے حاصل کر لینا چاہئے۔

ذکر مسنون کیلئے اجازت کی ضرورت نہیں

عام طریقہ تو یہ ہے کہ جب انسان کسی شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے تو شیخ اس کو کچھ ذکر اور تسبیحات بتاتا ہے کہ صبح کے وقت یہ ذکر کر لیا کرو

اور شام کے وقت یہ ذکر کرلیا کرو۔ لیکن بعض تسبیحات وہ ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادی ہیں، ان تسبیحات کو پڑھنے کے لئے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں، مثلاً روزانہ ایک تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلاَ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" ایک تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَبِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ" ایک تسبیح "استغفار" کی اور ایک تسبیح "درود شریف" کی۔ یہ چار تسبیحات ہر انسان روزانہ پڑھ سکتا ہے، لہٰذا جن حضرات کے معمولات میں یہ تسبیحات شامل نہیں ہیں، وہ اپنے معمولات میں ان کو شامل کرلیں۔

بہرحال! اس کتاب "انفاس عیسیٰ" میں حضرت والا نے "ذکر" کے بارے میں چند ملفوظات ذکر فرمائے ہیں، اس لئے خیال آیا کہ اس رمضان میں "ذکر" کے بارے میں ملفوظات پڑھ کر اس کی کچھ تشریح عرض کردی جائے۔

ذکر میں مشقت خود نافع ہے

ایک شخص نے حضرت والا کو خط میں اپنا حال لکھا کہ:

ذکر طبیعت پر بہت بار معلوم ہوتا ہے، جب کرنے بیٹھے جی گھبرا اٹھتا ہے۔

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ:

"بار" ایک مشقت ہے، مشقت میں اگر جی نہ لگے تو سمجھ

لو کہ خود مشقت بھی نفع میں جی لگنے سے کم نہیں، جس طرح سے بھی ہو حتی الوسع پورا کرلیا کیجئے، شدہ شدہ سب دشواری مبدل بآسانی ہو جائے گی۔

(انفاس عیسیٰ، ص ۶۳)

جب آدمی ذکر کرنا شروع کرتا ہے تو پہلے مرحلے میں اس کا دل بہت الجھتا ہے اور اس کو مشقت معلوم ہوتی ہے، اور جب ذکر کرنے بیٹھتا ہے تو دل گھبرانے لگتا ہے۔ بعض لوگوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ جب ذکر کرنے بیٹھے تو دل گھبرا گیا اور طبیعت اس میں نہیں چلی اور دل نہیں لگا، تو وہ لوگ ہمت ہار بیٹھتے ہیں اور ذکر چھوڑ بیٹھتے ہیں، ایسے لوگ محروم رہ جاتے ہیں۔

ذکر میں زبردستی لگے رہو

ذکر کا طریقہ یہ ہے کہ جب ذکر کرنے بیٹھے تو اب دل لگے یا نہ لگے، دل چاہے یا نہ چاہے، دل گھبرائے یا وحشت ہو، لیکن پھر بھی ذکر میں لگا رہے، اور دل سے کہدے کہ چاہے تو گھبرائے یا پریشان ہو، مجھے تو یہ کام کرنا ہے۔ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ اپنے نفس سے یہ کہدیا کرد کہ ؎

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے تیرے قابل مجھے

ایک مرتبہ اس دل سے یہ کہدو کہ تو اس سے بھاگ رہا ہے اور گھبرا

رہا ہے، مجھے کوئی پرواہ نہیں، میں تو یہ کام کروں گا۔ جس دن آدمی نے یہ عزم کر لیا تو پھر انشاء اللہ چند ہی روز میں یہ گھبراہٹ اور پریشانی ختم ہو جائے گی، لیکن اگر اس گھبراہٹ کی وجہ سے بھاگ کھڑا ہوا اور ذکر چھوڑ بیٹھا تو پھر دوبارہ ذکر کی طرف لوٹنا مشکل ہو جاتا ہے۔

دل گھبرانے کا کوئی علاج نہیں

لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ حضرت! اس کا کوئی علاج بتایئے کہ ذکر میں دل گھبرائے نہیں اور دل ذکر میں لگ جایا کرے۔ یاد رکھئے! اس کا کوئی علاج نہیں، کوئی ایسی گولی اور سفوف نہیں ہے اور کوئی ایسا معجون نہیں ہے کہ وہ اگر کھلا دیا جائے تو اس کے نتیجے میں ذکر میں دل لگ جایا کرے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ دل لگے یا نہ لگے، لیکن اپنی ہمت کو استعمال کر کے انسان لگا رہے۔ دیکھئے! اس ملفوظ میں حضرت والا نے ذکر میں دل نہ لگنے کے بارے میں اور ذکر میں بار محسوس ہونے کے بارے میں کیا جواب ارشاد فرمایا:

یہ مشقت اور بار فائدے سے خالی نہیں

فرمایا کہ "بار" ایک مشقت ہے، یعنی طبیعت پر ذکر کرنے سے جو بار ہوتا ہے وہ ایک مشقت ہے، اور مشقت میں اگر جی نہ لگے تو سمجھ لو کہ خود مشقت بھی نفع میں جی لگنے سے کم نہیں، یعنی اگر ذکر کرنے میں مشقت ہو رہی ہے اور اس میں جی نہیں لگ رہا ہے تو اس دل نہ لگنے کی صورت میں یہ

سوچو کہ یہ جو مشقت ہو رہی ہے، یہ بھی فائدہ دینے میں دل لگنے سے کم نہیں۔ کیونکہ اگر ذکر میں دل لگتا اور خوب خشوع اور خضوع کے ساتھ دل لگا کر ذکر کرتے اور اس سے جو فائدہ حاصل ہوتا، اس مشقت کا فائدہ بھی اس سے کم نہیں۔

ایسے ذکر میں نورانیت زیادہ ہوتی ہے

بلکہ حضرت والا نے بعض جگہ لکھا ہے کہ اس مشقّت والے ذکر کا فائدہ دل لگا کر ذکر کرنے کے فائدے سے بڑھ جاتا ہے، کیونکہ جس شخص کو ذکر میں لطف اور مزہ آرہا ہے اور دل لگ رہا ہے، اس کے ذکر کے اندر تو یہ احتمال موجود ہے کہ شاید یہ حظ نفس کے لئے ذکر کر رہا ہو اور مزہ اور لطف کی خاطر ذکر کر رہا ہو، بخلاف اس شخص کے جس کو ذکر کرنے میں مشقّت ہو رہی ہے، اس کو ذکر کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے علاوہ اور کچھ مقصود نہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ مشقّت کے ساتھ ذکر کرنے والا نفع اور ثواب میں دوسروں سے آگے بڑھ جائے۔ اس لئے کبھی یہ نہ سوچو کہ مشقّت کے ساتھ ذکر کرنے میں کیا فائدہ؟ ارے اس میں بھی بڑا فائدہ ہے، یہ جو تم اس حال میں ذکر کر رہے ہو کہ تمہارا دل کہیں ہے اور دماغ کہیں ہے اور ذکر میں دل نہیں لگ رہا ہے پھر بھی زبردستی دل لگا رہے ہو، یہ ذکر اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ بعض اوقات ایسے ذکر میں نورانیت اور روحانیت کیف اور مزے والے ذکر سے زیادہ ہوتی ہے۔

روحانیت اور نورانیت کی حقیقت

ایک مرتبہ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس بارے میں تفصیل سے بیان فرمایا کہ یہ روحانیت اور نورانیت کیا چیز ہے؟ چنانچہ فرمایا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی اچھا خواب نظر آجائے، اور کوئی کشف ہو جائے، اور عبادات میں مزہ آنے لگے تو یہ نورانیت اور روحانیت کی دلیل ہے۔ حالانکہ ان چیزوں کا نورانیت اور روحانیت سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ نورانیت اللہ کے حکم کی اتباع میں ہے، جس دن اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر جھکا دیا، اس دن نورانیت حاصل ہو گئی، چاہے ساری عمر نماز پڑھنے میں مزہ نہ آیا ہو، لیکن اس شخص کو نورانیت مکمل حاصل ہے۔

ان کی کوئی حقیقت نہیں

ہمارے یہاں ایک صاحب جو شیخ طریقت کہلاتے ہیں، جن کے مریدوں کی تعداد بھی بیشمار بتائی جاتی ہے، انہوں نے لکھا ہے کہ: "جو شیخ اپنے مرید کو مسجد حرام میں نماز نہ پڑھوا سکے وہ شیخ بننے کے لائق نہیں" یعنی وہ شیخ مرید کے سامنے "مسجد حرام" منکشف کرائے اور اس مرید کو اس میں نماز پڑھوادے، جو پیر ایسا نہ کرسکے وہ پیر بننے کے لائق نہیں۔ چنانچہ ان باتوں کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ یہ مراقبات، یہ مکاشفات وغیرہ یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان کو

تقرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ یاد رکھیۓ! ان چیزوں کی کوئی حقیقت نہیں، اگر کسی کو یہ چیزیں حاصل ہو جائیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ مگر یہ بہت نازک نعمت ہے، بسا اوقات یہ ایک امتحان بھی ہوتی ہے، اس کے حاصل ہونے کے بعد گمراہی کے راستے پر پڑ جانے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، بہت سے لوگوں کو شیطان نے انہی چیزوں سے بہکا دیا۔ اس لئے کبھی ان کے حاصل کرنے کی فکر میں نہ پڑو، یہ مقصود چیزوں میں سے نہیں، زیادہ سے زیادہ محمود ہے، طبیعت کی پسندیدہ کیفیت ہے۔

اللہ سے رابطہ استوار کرلو

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کرلو، کیا اللہ تعالیٰ وہاں حرم میں بیٹھے ہوۓ ہیں؟ یا بیت اللہ شریف میں بیٹھے ہوۓ ہیں؟ ارے اللہ تعالیٰ تو جس طرح حرم میں موجود ہیں، اسی طرح یہاں بھی موجود ہیں، جس دن تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کرلیا، بس اسی دن تمہیں تمہارا حرم حاصل ہو گیا۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

ہر شب شب قدر است اگر قدر بدانی

تم شب قدر تلاش کرتے ہو، ارے ہر رات شب قدر ہے اگر تم اس کی قدر پہچانو، جس رات تم نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رابطہ استوار کرلیا، وہ رات تمہاری شب قدر ہو گئی۔

تمہیں یہاں پر"حرم" حاصل ہو جائے گا

اس لئے یہ سمجھنا کہ اگر ہم حرم نہ گئے اور حرم میں نماز نہ پڑھی تو ہمیں کچھ حاصل نہ ہوا، یہ بات ٹھیک نہیں۔ ارے بھائی! اگر اللہ تعالیٰ حرم لے جائے تو یہ اس کا کرم اور احسان ہے، اور اگر تم وہاں نہ جاسکے، اس لئے کہ قانونی پیچیدگیاں ہیں یا اخراجات کا انتظام نہیں ہے یا اس کے اندر سفر کی طاقت نہیں ہے، تو کیا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہیں محروم فرمادیں گے؟ ارے وہ جذبہ جو تمہیں حرم لے کر جارہا تھا، اگر اس جذبے کو صدق و اخلاص سے یہاں بیٹھ کر استعمال کرو تو تمہیں یہاں پر ہی حرم حاصل ہو جائے گا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی صاحب ایمان کو محروم نہیں فرماتے۔

ہر حالت میں ذکر میں مشغول رہو

خوب سمجھ لیجئے! ان کشف و کرامات کا براہ راست دینداری سے کوئی تعلق نہیں، حق تعالیٰ کا قرب اس پر موقوف نہیں، اصل دین یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو، اسی کی تعمیل میں اس کا ذکر ہو، اور اللہ تعالیٰ سے رابطہ اور تعلق ہو، اس تعلق کو استوار کرنے کی فکر ہو۔ خواہ ذکر کرنے میں مشقت ہو، طبیعت پر بار ہو، دل نہ لگے، پھر بھی بیٹھ جاؤ اور اللہ کے ذکر میں مشغول ہو جاؤ، اس اطاعت کے نتیجے میں دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کیسی نورانیت اور برکت عطا فرماتے ہیں کہ رفتہ رفتہ یہ ذکر و اذکار بھی سہولت سے پورے ہونے

لگیں گے اور اس کا اصل فائدہ رجوع الی اللہ اور تعلق مع اللہ حاصل ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس کی توفیق عطا فرمائے اور آپ حضرات کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۳۴

ذکر کے مختلف طریقے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۳۴

صفحات : ۲۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۴۳

ذکر کے مختلف طریقے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ والعاقبة للمتقین۔

والصّلاۃ والسّلام علیٰ رسولہ الکریم۔

وعلیٰ آلہ واصحابہٖ اجمعین۔

أمّا بعد!

مشقّت کے باوجود ذکر میں لگارہے

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ جب انسان ابتداءً ذکر کرنا شروع کرتا ہے تو طبیعت پر مشقت ہوتی ہے اور بار ہوتا ہے۔ یہ کیفیت صرف ذکر کے

ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ ہر نئے کام کو شروع کرنے کے بعد ابتداءً اس کام کو کرتے ہوئے مشقت معلوم ہوتی ہے، اسی طرح ذکر اللہ کے آغاز میں بھی جب انسان اپنے آپ کو ذکر اللہ کا عادی بنانا چاہتا ہے تو بعض اوقات ذکر کرنے سے دل الجھتا ہے اور طبیعت پر بار محسوس ہوتا ہے۔

لیکن اس کا علاج یہ ہے کہ اس مشقت کو برداشت کیا جائے، اس بار کو اٹھایا جائے، اور گھبرا کر ذکر کو نہ چھوڑا جائے، بلکہ دل لگے یا نہ لگے، طبیعت الجھے یا سلجھے، ہر حالت میں ذکر کے اندر انسان مشغول رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ دل لگنے لگے گا۔

نماز پڑھنے میں ابتداءً مشقت ہوتی ہے

دیکھئے! بچپن میں جب ماں باپ نے کہا تھا کہ نماز پڑھو، اور ان کے کہنے پر نماز شروع کر دی تھی، کیا اس وقت نماز میں تمہارا دل لگتا تھا؟ نہیں! اس وقت تمہارا دل نہیں لگتا تھا، بلکہ دل بھاگتا تھا اور طبیعت نماز پڑھنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھی۔ جب ماں باپ نماز پڑھنے پر اصرار کرتے تو دل میں یہ خیال آتا کہ یہ ہم پر ظلم کر رہے ہیں، تو اس وقت نماز پڑھنا مشقت معلوم ہوتا تھا، لیکن رفتہ رفتہ وہ مشقت جزو زندگی بن گئی، اور اب یہ حالت ہو گئی کہ اگر کوئی شخص کسی نمازی سے یہ کہے کہ تو ایک لاکھ روپے لے لے اور ایک وقت کی نماز چھوڑ دے، تو وہ نمازی ایک نماز بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوگا، اب اسے نماز پڑھے بغیر چین نہیں آتا۔

ذکر جزوِ زندگی بن جاتا ہے

اسی طرح "ذکر" کا حال ہے کہ ابتداءً ذکر میں مشقت ہوتی ہے، وہ بوجھ معلوم ہوتا ہے، لیکن جب رفتہ رفتہ وہ ذکر معمول کے اندر شامل ہو جاتا ہے اور اس کی عادت پڑ جاتی ہے تو وہ ذکر جزوِ زندگی بن جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ اس ذکر کو زندگی کا ایسا حصّہ بنا دیتے ہیں کہ اس کے بغیر چین نہیں آتا۔

حافظ ابن حجرؒ اور ذکر اللہ

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ جو جلیل القدر محدّث اور عالم تھے، اور علم و فضل کا بہت اونچا مقام رکھتے تھے اور صحیح بخاری کی شرح "فتح الباری" کے مصنف تھے، ان کا یہ حال تھا کہ جس وقت وہ فتح الباری لکھتے اور لکھنے کے دوران قلم پر قط لگانے کی ضرورت پیش آتی۔ چونکہ اس زمانے میں لکڑی کے قلم ہوتے تھے، لکھتے لکھتے جب ان کی نوک خراب ہو جاتی تو چاقو سے اس پر قط لگانا پڑتا تھا۔ تو جب حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ کو کتاب لکھنے کے دوران قلم پر قط لگانے کی ضرورت پیش آتی تو جتنا وقت قلم پر قط لگانے میں گزرتا، اتنا وقت بھی خالی گزارنا گوارہ نہیں تھا، اس لئے اس وقت کو ذکر اللہ میں گزارتے۔ لہٰذا جب ذکر انسان کا جزوِ زندگی بن جاتا ہے تو اس کے بغیر انسان کو چین نہیں آتا۔

ذکر کا ایک طریقہ "ذکر جہری"

بعض حضرات صوفیاء نے اس مبتدی کے لئے جس کی طبیعت ابھی ذکر اللہ سے مشقت محسوس کر رہی ہے، ذکر کے کچھ خاص طریقے بیان فرمائے ہیں کہ اس طرح ذکر کیا کرو، اس طرح ذکر کرنے سے ذکر میں دل لگے گا اور گھبراہٹ نہیں ہوگی، ورنہ اندیشہ یہ ہے کہ گھبراہٹ کے نتیجے میں وہ ذکر کرنا چھوڑ دے گا۔

ان طریقوں میں سے ایک طریقہ "ذکر جہری" ہے، کیونکہ اگر وہ اکیلا چپکے چپکے ذکر کرے گا تو اس سے دل الجھے گا اور دل گھبرائے گا، اس لئے اس سے کہا کہ تو ذرا بلند آواز سے ذکر کرلے اور تھوڑا سا لحن بھی اس میں شامل کرلے، اس کے نتیجے میں ذکر کے اندر اس کا دل لگ جائے گا۔ مثلاً اگر آہستہ آواز میں "لا الٰہ اِلا اللہ" کا ذکر کرتا ہے تو اس کا دل نہیں لگتا، لیکن جب بلند آواز سے اور لحن سے ذکر کرے گا تو اس کا دل لگ جائے گا۔ دل لگانے کی خاطر بزرگوں نے یہ تجویز کیا کہ ذکر جہری کرو اور لحن سے کرو۔

ذکر کا ایک طریقہ "ضرب" لگانا

کسی کو "ضرب" کا طریقہ بتا دیا کہ ذکر کرتے وقت "ضرب" لگاؤ۔ ضرب لگانے کا مطلب ہے مارنا، چوٹ لگانا، یعنی ذکر کرتے وقت کسی جگہ پر زور ڈالنا اور اس پر چوٹ مارنا۔ عملی طور پر اس کی بہت سی شکلیں اپنے

تجربات سے مفید سمجھ کر اہل تربیت نے اختیار کی ہیں، انہی میں ایک یہ ہے کہ جس وقت تم "لَاۤ اِلٰـهَ" کہو، اس وقت گردن اور چہرہ کو دل کے قریب لے جاؤ، اور پھر گردن کو داھنی طرف سے پیچھے کی طرف کرو، اور اس وقت یہ تصور کرو کہ دل میں اللہ تعالیٰ کے علاوہ جتنی چیزوں کی محبّت ہے، اس محبت کو دل سے نکال کر پیچھے کی طرف پھینک رہا ہوں۔ اور پھر "الا اللّٰه" کہتے وقت گردن اور چہرے کو دوبارہ دل کے قریب لاکر جھٹکا دو، اور اس وقت یہ تصور کرو کہ میں اللہ کی محبّت کو دل میں داخل کر رہا ہوں۔ یہ طریقہ بزرگوں نے اس لئے تجویز کیا کہ جب ذاکر اس "ضرب" کے اندر مشغول ہوگا تو اس کا دل ذکر میں لگ جائے گا، اور جب بار بار اور روزانہ یہ تصور کر کے ذکر کرے گا اور اس طرح ضرب لگائے گا تو انشاء اللہ ایک وقت آئے گا کہ دل سے غیر اللہ کی محبت نکل جائے گی اور اللہ کی محبّت دل میں داخل ہو جائے گی۔

"رگ کیماس" پکڑ کر ذکر کرنا

بہر حال! بزرگوں اور مشائخ نے ذکر کے جو خاص طریقے تجویز کئے ہیں یہ بطور علاج کے ہیں، یہ طریقے نہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور نہ ہی ثابت کرنے کی ضرورت ہے۔ بعض حضرات نے اور طریقے بھی تجویز کیے ہیں، مثلاً بعض مشائخ نے فرمایا کہ جب ذکر کرنے بیٹھو تو چار زانو ہو کر بیٹھ جاؤ، اور پھر داہنے پاؤں کے انگوٹھے اور

ساتھ والی انگلی سے بائیں طرف کے گھٹنے کے اندر کی رگ جس کو ”رگ کیماس“ کہتے ہیں، اس کو پکڑلو، اس رگ کو پکڑنے سے دل جمعی پیدا ہو جائے گی اور فضول خیالات اور وساوس نہیں آئیں گے۔ اب یہ بات تجربہ کی ہے اور تجربہ کی بنیاد پر یہ طریقہ بتادیا۔

ذکر کا ایک طریقہ ”پاس انفاس“

اسی طرح ذکر کا ایک خاص طریقہ ”پاس انفاس“ کہلاتا ہے، اس طریقے میں یہ ہوتا ہے کہ ہر سانس کی آمد و رفت میں ذکر اللہ کو اس طرح جذب کرلیا جاتا ہے کہ ہر سانس کے ساتھ اللہ کا ذکر زبان سے جاری ہو جاتا ہے، سانس آرہا ہے تو اللہ کا ذکر ہو رہا ہے، سانس جارہا ہے تو اللہ کا ذکر ہو رہا ہے، ہر سانس کی رفتار کے ساتھ اللہ کا نام نکل رہا ہے۔ اس طریقے کی مشائخ کے یہاں مشق کرائی جاتی تھی جس کے نتیجے میں یہ چیز حاصل ہو جاتی تھی۔

ذکر کے وقت ہر چیز کے ذکر کرنے کا تصور

اسی طرح ”سلطان الاذکار“ کا نام آپ نے سنا ہوگا، یہ بھی ذکر کا ایک خاص طریقہ ہے، جس میں تمام لطائف کے ساتھ ذکر کی آواز نکلتی ہے واللہ اعلم۔ اسی طرح حضرات صوفیاء کرام نے ایک طریقہ یہ نکالا کہ جب ذکر کرنے بیٹھو تو یہ تصور کرو کہ یہ دیوار بھی میرے ساتھ ذکر کر رہی ہے،

یہ چھت بھی ذکر کر رہی ہے، یہ دروازہ بھی ذکر کر رہا ہے، یہ پنکھا بھی ذکر کر رہا ہے، یہ زمین بھی ذکر کر رہی ہے، یہ آسمان بھی ذکر کر رہا ہے، یہ ساری کائنات ذکر کر رہی ہے۔ اس تصور سے ذکر کے اندر ایک خاص نشاط اور کیفیت حاصل ہو جاتی ہے۔

حضرت داؤدؑ کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کا ذکر کرنا

قرآن کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر کا واقعہ آتا ہے کہ جب وہ ذکر کرتے تھے تو پہاڑ اور پرندے بھی ساتھ میں ذکر کرتے تھے، فرمایا کہ:

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ۔

(سورۃ الانبیاء آیت ۷۹)

یعنی ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا تھا جو ان کے ساتھ ذکر کیا کرتے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام جب "سُبْحَانَ اللّٰہ، سُبْحَانَ اللّٰہ" کی تسبیح پڑھتے تو پہاڑ بھی اور پرندے بھی ان کے ساتھ "سُبْحَانَ اللّٰہ، سُبْحَانَ اللّٰہ" کہتے۔

پہاڑوں اور پرندوں کے ذکر سے حضرت داؤد علیہ السلام کا فائدہ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "مسائل السلوک" میں لکھا ہے کہ پہاڑوں اور پرندوں کے ذکر کرنے کو اللہ تعالیٰ

نے ان انعامات میں شمار فرمایا ہے جو انعامات اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر فرمائے تھے، تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پہاڑ اور پرندے ذکر کرتے تھے تو اس سے حضرت داؤد علیہ السلام کو کیا فائدہ پہنچتا ہے جس کی وجہ سے ان چیزوں کو بطور انعام کے ذکر فرمایا کہ:

وَسَخَّرْنَا مَعَ دَاوُدَ الْجِبَالَ يُسَبِّحْنَ وَالطَّيْرَ۔

پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ یوں تو ذکر بڑی نعمت ہے، چاہے وہ ذکر کسی حالت میں بھی ہو، چاہے تنہائی میں ذکر ہو، لیکن اگر ذکر کرنے والے کے ساتھ کوئی جماعت بھی ذکر کرنے میں شامل ہو جائے تو اس کے ذکر میں نشاط پیدا ہو جاتا ہے، کیف پیدا ہو جاتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کا دل ذکر میں خوب لگنے لگتا ہے۔ لہٰذا یہ جو پہاڑوں اور پرندوں کو مسخر کر دیا گیا اور ان سے یہ کہدیا گیا کہ تم بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ ذکر کرو، اس میں حضرت داؤد علیہ السلام پر انعام یہ ہے کہ ان کو ذکر میں نشاط پیدا ہو جائے۔ اسی لئے صوفیاء کرام نے حضرت داؤد علیہ السلام کے اس واقعے سے ذکر کا ایک طریقہ یہ نکالا کہ جب تم ذکر کرو تو یہ تصور کرو کہ یہ درو دیوار، یہ پہاڑ، یہ پرندے، یہ درخت بھی میرے ساتھ ذکر کر رہے ہیں اور اس تصور کی مشق کرو، اور مشق کی کثرت کے بعد یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ واقعۃً یہ سب چیزیں میرے ساتھ ذکر کر رہی ہیں، اس کے نتیجے میں اپنی طبیعت ذکر کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔

ذکر کے یہ طریقے علاج ہیں

بہر حال! حضرات صوفیاء کرام نے ذکر کے جو خاص طریقے بیان فرمائے ہیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ ذکر میں انسان کا دل لگ جائے، اور یہ طریقے بطور علاج کے بیان فرمائے ہیں۔ اس لئے یاد رکھئے کہ یہ خاص طریقے نہ مقصود ہیں، نہ مسنون ہیں، اور نہ ان طریقوں کو مسنون سمجھنا جائز ہے، مثلاً ہمارے تمام مشائخ کے یہاں دوازدہ تسبیح (بارہ تسبیح) بہت معروف ہے، یہ دوازدہ تسبیح ضرب لگا کر کی جاتی ہے، مگر یہ خاص طریقہ نہ مقصود ہے اور نہ مسنون ہے، اگر کوئی شخص اس کو مسنون سمجھ لے تو یہ طریقہ بدعت ہو جائے گا، بلکہ اس کے جائز ہونے کی شرط یہی ہے کہ اس کے بارے میں یہ تصور رکھا جائے کہ یہ طریقہ مبتدی کو صرف علاج کے طور پر بتایا جاتا ہے، تاکہ اس کا دل ذکر میں لگ جائے اور خیالات میں یک سوئی پیدا ہو جائے۔

"ضرب" لگا کر ذکر کرنے پر اعتراض

آج کل لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، چنانچہ بعض لوگ ضرب لگا کر ذکر کرنے کو بدعت کہتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ آپ ﷺ نے اس طرح ضرب لگا کر ذکر فرمایا ہو اور نہ کسی صحابی سے ضرب لگا کر ذکر کرنا ثابت ہے، اور

جب ایسا ذکر ثابت نہیں ہے اور تم لوگ ایسا ذکر کر رہے ہو، لہٰذا یہ ذکر بدعت ہے۔

پھر جوشاندہ پینا بدعت ہوگا

چنانچہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے تمام مشائخ بدعتی ہیں (معاذ اللہ) اس لئے کہ یہ مشائخ ضرب لگاکر ذکر کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اور اس طرح ذکر کرنا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ جب تمہیں نزلہ زکام ہوتا ہے تو تم "جوشاندہ" پیتے ہو؟ کہنے لگے کہ ہاں پیتا ہوں، میں نے پوچھا کہ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جوشاندہ پینا ثابت ہے؟ یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی جوشاندہ پیا؟ یا کسی صحابیؓ سے جوشاندہ پینا ثابت ہے؟ کہنے لگے کہ جوشاندہ پینا تو ثابت نہیں، میں نے کہا کہ جب ثابت نہیں تو آپ کا جوشاندہ پینا بدعت ہوگیا، اس لئے کہ آپ کا دعویٰ اس کے بغیر ثابت نہیں ہوسکتا کہ یوں کہا جائے کہ جو چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو وہ بدعت ہے، تو چونکہ جوشاندہ پینا بھی ثابت نہیں، لہٰذا یہ بھی بدعت ہے۔

درحقیقت صحیح بات یہ ہے کہ ذکر کرنے کے یہ سارے طریقے علاج ہیں، یعنی جس شخص کا ذکر میں دل نہیں لگتا اور ذکر میں اس کی طبیعت مائل نہیں ہوتی، تو اس کے علاج کے لئے یہ طریقہ بتایا گیا کہ تم اس طریقے سے

ذکر کرلو، تاکہ ذکر میں تمہارا دل لگ جائے، گویا کہ جوشاندہ پلایا جارہا ہے۔

یہ طریقے بدعت ہو جائیں گے

ہاں! اگر کوئی شخص ذکر کے کسی خاص طریقے کے بارے میں یہ کہدے کہ یہ طریقہ سنّت ہے، یا یہ طریقہ مستحب ہے، یا یہ طریقہ زیادہ افضل ہے تو پھر وہ طریقہ بدعت ہو جائے گا، کیونکہ افضلیت کا مدار، استحباب کا مدار، اور سنّیت کا مدار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت پر ہے، جو چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، وہ سنّت نہیں ہو سکتی، وہ افضل نہیں ہو سکتی، البتہ نافع ہو سکتی ہے۔

افضل طریقہ صرف سنّت کا طریقہ ہے

یعنی جو چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، وہ "نافع" ہو سکتی ہے، اور "انفع" بھی ہو سکتی ہے، لیکن جو چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں وہ "افضل" نہیں ہو سکتی، ہمارے بزرگوں نے افراط اور تفریط سے ہمیشہ احتراز کیا ہے۔ اس لئے ذکر کے ان خاص طریقوں کے بارے میں نہ تو یہ کہا کہ یہ بدعت ہیں، ان کو اختیار نہ کرو، اور نہ یہ کہا کہ یہ طریقہ "افضل" ہے۔

ذکر خفی افضل ہے

یاد رکھئے! ذکر کے اندر افضل طریقہ ہمیشہ ہر حالت میں قیام قیامت

تک ذکر خفی ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، ذکر جتنا آہستہ آواز سے ہوگا اتنا ہی افضل ہوگا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَةً۔

(سورۃ الاعراف، آیت ۵۵)

اپنے رب کو عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارو۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَاذْکُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعاً وَّخِیْفَةً وَّدُوْنَ الْجَھْرِ مِنَ الْقَوْلِ۔

(سورۃ الاعراف، آیت ۲۰۵)

اپنے رب کو اپنے دل میں پکارو عاجزی کے ساتھ اور ڈرتے ہوئے، اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ۔

اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ زور سے ذکر کرنا پسندیدہ نہیں، پسندیدہ ذکر وہ ہے جو آہستہ آواز کے ساتھ ہو۔

ذکر جہری جائز ہے افضل نہیں

یہ اصول ہمیشہ کا ہے، ابدی ہے اور قیام قیامت تک کبھی نہیں ٹوٹ سکتا کہ افضل ذکر "ذکر خفی" ہے، ذکر جتنا آہستہ کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا، البتہ "ذکر جہری" جائز ہے، ناجائز نہیں۔ لہٰذا "ذکر جہری"

کبھی ”ذکر خفی“ سے افضل نہیں ہو سکتا، البتہ علاج کے طور پر ذکر جہری کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ذکر جہری کو افضل سمجھنے لگے یا کوئی شخص ذکر جہری کو مقصود سمجھ لے، یا ذکر جہری کو مسنون سمجھ لے، یا ذکر جہری نہ کرنے والے پر نکیر کرنے لگے، تو پھر یہی چیز بدعت بن جاتی ہے، اسی کا نام بدعت ہے۔ اس راستے میں اسی افراط اور تفریط سے بچ کر گزرنا ہے، اس لئے ہمارے اس آخری دور کے بزرگ ذکر جہری کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کرتے بلکہ ذکر خفی کی تلقین فرماتے ہیں۔

یہ احداث فی الدّین اور بدعت ہے

بات دراصل یہ ہے کہ جب کام آگے بڑھتا ہے تو اپنی حد پر نہیں رہتا، اب ذکر کے مندرجہ بالا طریقے صوفیاء کرام نے بطور علاج بتائے تھے، لیکن رفتہ رفتہ یہ طریقے خود مقصود بن گئے، اب ہر سلسلہ والوں نے اپنے لئے ذکر کا ایک طریقہ مقرر کر لیا ہے کہ فلاں سلسلے میں ”پاس انفاس“ کے طریقے سے ذکر ہوتا ہے اور فلاں سلسلے میں ”سلطان الاذکار“ ہوتا ہے، اور فلاں سلسلے میں فلاں طریقے سے ذکر ہوتا ہے، یہ اس سلسلے کی خصوصیات بن گئیں، اب اس سلسلے سے وابستہ لوگ باہر کے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ آپ جس طریقے سے ذکر کرتے ہیں وہ طریقہ صحیح نہیں یا افضل نہیں، صحیح اور افضل طریقہ وہ ہے جو ہمارے شیخ نے بتایا ہے۔ اس طرح سے جو چیز مقصود نہیں تھی وہ مقصود قرار پاگئی، اسی کا نام ”احداث فی الدّین“

ہے، اسی کا نام "بدعت" ہے، اس کی جڑ کاٹنی ہے۔

ذکر میں ضرب لگانا مقصود نہیں

چنانچہ حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

طریق خاص سے ضرب نہ مقصود ہے اور نہ موقوف علیہ مقصود، جس طرح بے تکلّف بن جائے کافی ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ٦٣)

یعنی ضرب لگا کر ذکر کرنے کا جو طریقہ ہے، یہ نہ تو خود مقصود ہے اور نہ ہی ذکر کا جو مقصود ہے وہ اس ضرب پر موقوف ہے کہ اس ضرب کے بغیر وہ مقصود حاصل نہ ہوتا ہو، بلکہ ضرب کے بغیر بھی مقصود حاصل ہو جاتا ہے۔ ارے مقصود تو ان کا ذکر ہے اور ان کا نام لینا ہے جس طرح بھی بن پڑے، چاہے ضرب سے ہو یا بغیر ضرب کے ہو، لہٰذا ان قیود میں زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں۔

اصل مقصود ان کا نام لینا ہے

ایک صاحب میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور کہا کہ حضرت! تسبیحات تو پڑھتا ہوں، لیکن دوازدہ تسبیح نہیں ہو پاتیں، اس کو اس خاص طریقے سے پڑھنے کا وقت نہیں ملتا۔ حضرت نے ان صاحب سے پوچھا کہ طریقہ مقصود ہے یا ذکر مقصود ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ حضرت اصل مقصد تو ذکر ہے، طریقہ مقصود نہیں ہوتا۔ آپ

نے فرمایا کہ تم دوازدہ تسبیح خاص طریقے کے بغیر پڑھا کرو۔ پھر فرمایا کہ میں بعض اوقات خاص طریقہ کے بغیر دوازدہ تسبیح پڑھ لیتا ہوں جو اطمینان سے ۱۵ منٹ میں پوری ہو جاتی ہے، اس لئے کہ اگر خاص طریقے سے ضرب لگا کر پڑھا جائے تو اس کے لئے چالیس منٹ چاہئیں۔ بہرحال! ضرب لگا کر ذکر کرنا نہ تو مقصود ہے نہ مسنون ہے، اگر موقع ہو تو کرلو ورنہ سیدھے سادھے طریقے سے جس طرح بن پڑے ذکر کرلو اور اللہ کا نام لے لو، اس لئے اصل مقصود تو ان کا نام لینا ہے۔

ایک قوم ان طریقوں کو بدعت کہتی ہے

یہ تفصیل اس لئے عرض کردی کہ ہمارے دور میں افراط و تفریط چل رہی ہے، ایک قوم وہ ہے جو صوفیاء کرام کے ان طریقوں کو علی الاطلاق بدعت کہتی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ تصوف بھی بدعت ہے اور یہ خانقاہیں بھی بدعت ہیں اور یہ چلہ کشی بھی بدعت ہے اور ذکر کرنے کے یہ خاص طریقے بھی بدعت ہیں۔

دوسری انتہا

دوسری طرف ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس نے ذکر کے ان خاص طریقوں کو ہی مقصود بالذات بنا دیا، چنانچہ یہ جاہل پیر اپنی خانقاہیں بھی کھول کر بیٹھ گئے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ جس نے "پاس انفاس" کے

طریقے سے ذکر نہیں کیا وہ تصوف کے حروف ابجد سے بھی واقف نہیں، گویا کہ "پاس انفاس" ہی مقصود بالذات ہے۔ یہ دوسری انتہا ہے۔

ہمارے بزرگوں نے تو اللہ کے فضل و کرم سے ہمیں اعتدال کا راستہ دکھا دیا اور اس پر ہمیں چلا دیا، اس اعتدال کے راستے میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط ہے۔ اور یہ بتا دیا کہ یہ راستہ جائز ہے لیکن بذات خود مقصود نہیں، اس پر عمل کرو۔

فکر سے اُنس ہو جانا ذکر ہی کی برکت ہے

ایک شخص نے حضرت والا کو اپنا حال لکھا کہ:

دل چاہتا ہے کہ ذکر چھوڑ دوں اور بیٹھ کر سوچتا رہوں، اور ذکر میں طبیعت کم لگتی ہے۔

حضرت والا نے جواب میں لکھا کہ:

یہ جو لکھا ہے کہ ذکر چھوڑ دوں اور بیٹھ کر سوچتا رہوں، سو یہ برکت ذکر ہی کی ہے کہ "فکر" سے اُنس ہو گیا، ذکر کو ہرگز نہ چھوڑنا ورنہ بناء کے انعدام سے مبنیٰ کا انعدام ہو جائے گا، خواہ دل لگے یا نہ لگے، معمولات پر استقامت رکھیں۔

(انفاس عیسیٰ، ص ٦٣)

فکر ذکر کا نتیجہ ہے

"ذکر ہی کا ایک نتیجہ "فکر" ہے، جیسے قرآن کریم میں فرمایا کہ:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰماً وَّ قُعُوْداً وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِی خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ -

(سورۂ آلِ عمران، آیت ۱۹۱)

وہ لوگ جو کھڑے اور بیٹھے اور پہلو کے بل لیٹنے کی حالت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اور آسمان و زمین کے پیدا کرنے میں فکر کرتے رہتے ہیں۔ اس آیت میں نیک لوگوں کی ایک صفت "ذکر" بیان فرمائی اور دوسری صفت "فکر" بیان فرمائی، جس سے اس طرف اشارہ فرما دیا کہ "ذکر" کے ساتھ ساتھ فکر بھی ہونی چاہئے، ذکر کا لازمی نتیجہ "فکر" ہونی چاہئے، یعنی کثرت ذکر کے نتیجے میں انسان اللہ جل شانہ کی عظمت، اس کی قدرت، اس کا جلال اور اس کی محبّت کے خیالات میں گم ہو جاتا ہے، اسی کا نام "فکر" ہے، یہ "فکر" ذکر کا ثمرہ اور نتیجہ ہوتا ہے۔

حضرت والا نے فرمایا کہ تمہیں جو یہ خیال آرہا ہے کہ ذکر چھوڑ دوں اور بیٹھ کر سوچتا رہوں، یہ بھی در حقیقت ذکر ہی کی برکت ہے کہ اس ذکر کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کی عظمت کا، اس کے جلال کا، اس کی قدرت کا اور اس کی محبت کا جو خیال دل میں پیدا ہو گیا، یہ ذکر ہی کا ثمرہ ہے، لیکن چونکہ یہ برکت ذکر ہی کی ہے، اس لئے ذکر کو ہرگز نہ چھوڑنا، ورنہ بناء یعنی بنیاد کے

انہدام سے مبنی کا یعنی اس بنیاد پر قائم عمارت کا انہدام ہو جائے گا۔

ذکر مت چھوڑنا

یعنی دل میں یہ جو خیال آرہا ہے کہ دن رات بیٹھے بیٹھے اللہ تعالیٰ کی قدرت اور جلال اور محبّت کو سوچتا رہوں اور یہ حالت ہو جائے کہ:

دل ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

یہ کیفیت بڑی اچھی ہے، لیکن یہ کیفیت "ذکر" ہی کی برکت سے حاصل ہوئی ہے، اب اگر تم نے ذکر چھوڑ دیا تو رفتہ رفتہ "فکر" کی یہ کیفیت بھی ختم ہو جائے گی۔ لہٰذا یہ مت سوچنا کہ میں چونکہ "فکر" کی کیفیت تک پہنچ گیا ہوں، اس لئے اب ذکر کی ضرورت نہیں، اس کو چھوڑ دوں۔

ذکر قلبی کے باوجود ذکر لسانی نہ چھوڑے

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ "ذکر" سے مراد "ذکر لسانی" ہے اور "فکر" سے مراد "ذکر قلبی" ہے، جب انسان اللہ جلّ جلالہ کی قدرت، اس کی عظمتِ شان اور اس کے جلال میں گم ہوتا ہے تو اسی کا نام ذکر قلبی ہے، گویا کہ دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ دھوکہ ہوتا ہے کہ جب ذکر لسانی کرتے کرتے دل میں اللہ تعالیٰ کا خیال جم گیا اور اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت اور محبّت کا خیال دل میں جم گیا تو مقصود

حاصل ہو گیا، اور مقصود کے حاصل کرنے کا جو زینہ اور ذریعہ تھا یعنی ذکر لسانی، اب اس کی ضرورت نہ رہی، لہٰذا انہوں نے ذکر لسانی چھوڑ دیا۔ یاد رکھئے! یہ شیطان کا دھوکہ ہے، کیونکہ جب ذکر لسانی چھوڑ دیا تو رفتہ رفتہ ذکر قلبی بھی چھوٹ جائے گا، اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ "بناء کے انہدام سے مبنیٰ کا انہدام ہو جائے گا"۔

جاہل پیروں کا یہ خیال گمراہی ہے

چنانچہ جاہل پیروں کا ایک طبقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہم تو اب درویش اور فقیر ہو گئے ہیں اور اب تو ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں گم ہیں، لہٰذا اب ہمیں نہ نماز کی ضرورت، نہ روزے کی ضرورت، نہ تلاوت کی ضرورت، نہ تسبیحات کی ضرورت۔ اس لئے کہ نماز کا مقصود تو "وصول اِلی اللہ" تھا، یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا، اب جب ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اللہ تعالیٰ کا خیال جم گیا، تو اب ہمیں نماز کی ضرورت نہیں، اب ہم مسجد جائیں یا نہ جائیں، نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یاد رکھئے! یہ گمراہی ہے، اور یہ گمراہی یہاں سے پیدا ہوئی کہ "ذکر قلبی" کو اس درجہ کا مقصود قرار دیدیا کہ اس کے نتیجے میں ظاہری عبادات کو بیکار سمجھا جانے لگا، یہی گمراہی ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ سے بارہا سنا، انہوں نے یہ واقعہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے سنا تھا، وہ یہ کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، اس دوران کمرے میں ایک زبردست قسم کا نور چمکا، اور اس نور نے حضرت کو اور آس پاس کی تمام اشیاء اور پورے کمرے کو اپنے گھیرے میں لے لیا، اور اس نور میں سے آواز آئی کہ اے عبدالقادر! تو ہمارے ساتھ تعلق کے اس مقام تک پہنچ گیا کہ اب تیرے ذمے نہ نماز فرض ہے اور نہ روزہ فرض ہے، اب تو جو چاہے کر، اب تو ہمارے قرب کے مقام تک پہنچ گیا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ مردود دور ہو جا، ارے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قرب کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کے باوجود ان سے تو نماز ساقط نہیں ہوئی، مجھ سے کیسے ساقط ہو جائے گی؟ اس سے پتہ چلا کہ تو شیطان ہے اور مجھے بہکانے آیا ہے۔ بس یہ کہنا تھا کہ وہ نور غائب ہو گیا۔

اس کے بعد دوسرا نور ظاہر ہوا، اس میں سے آواز آئی اے عبدالقادر! آج تجھے تیرے علم نے بچا لیا، ورنہ یہ وہ داؤ ہے جس کے ذریعہ میں نے بڑے بڑے صوفیاء کو شکست دیدی اور ان کو گمراہ کر دیا۔ شیخ عبدالقادر

جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا مردود! دور ہو جا، مجھے میرے علم نے نہیں بچایا بلکہ مجھے میرے اللہ نے بچایا ہے، مجھے پھر دھوکہ دیتا ہے۔ یہ دوسرا داؤ پہلے داؤ سے زیادہ خطرناک اور نازک تھا، اس لئے کہ اس کے ذریعہ ان کو اپنے علم پر ناز میں مبتلا کرنا مقصود تھا، لیکن آپ اس داؤ سے بچ گئے، اور آپ نے فرمایا کہ مجھے اللہ کے فضل و کرم نے بچایا ہے۔

ذکرِ لسانی کو جاری رکھنا چاہئے

بہر حال! یہ بات کہ چونکہ ذکر قلبی ہمارے دل و دماغ میں پیوست ہو چکا ہے، لہٰذا اب ذکر لسانی سے مستغنی ہو گئے، اب ہم نماز سے مستغنی ہو گئے، یہ سب گمراہی ہے۔ اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ ہر وقت دل میں فکر رہنے لگی، اللہ جل شانہ کی طرف دھیان رہنے لگا، جس کو صوفیاء کرام "تعلق مع اللہ" اور "نسبت" اور "ملکہ یاد داشت" سے تعبیر کرتے ہیں، لیکن یہ سب چیزیں ذکر لسانی کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہیں، اس لئے یہ نہ ہو کہ اب ذکر لسانی چھوڑ بیٹھو، بلکہ ذکر لسانی کو ہرگز مت چھوڑنا، ورنہ بناء کے انہدام سے مبنیٰ کا انہدام ہو جائے گا، خواہ دل لگے یا نہ لگے، لیکن پھر بھی زبردستی بیٹھ کر ذکر کرتے رہو اور معمولات پر استقامت رکھو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۳۵

نماز میں آنکھیں بند کرنا

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۳۵

صفحات : ۱۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ؕ

مجلس نمبر ۳۵

نماز میں آنکھیں بند کرنا

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبّ العالمین ۔ والعاقبة للمتقین والصّلاۃ والسّلام علٰی رسوله الکریم ۔ وعلٰی آله واصحابهٖ اجمعین۔

أمّا بعد!

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

مبتدی کو اجازت ہے کہ خواہ آنکھ کھول کر نماز پڑھے یا بند کر کے نماز پڑھے، اکثر صفراوی یا سوداوی قیود سے متوحش ہوتے ہیں، خصوص جبکہ اس کے ساتھ ضعف

بھی منضم ہو جائے اور ضعف مقتضی تکثیر قیود کو نہیں بلکہ مقتضی تقلیل قیود کو ہے، قیود سے جو اصل مقصود ہے "تأثر" خود وہی کام ضعف دیتا ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۳)

آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا سنّت ہے

نماز کے بارے میں اصل مسئلہ یہ ہے کہ نماز آنکھیں کھول کر پڑھنی چاہئے۔ نماز پڑھنے کا مسنون طریقہ بھی یہی ہے کہ جب آدمی نماز پڑھے تو آنکھیں بند نہ کرے بلکہ کھلی رکھے۔ اگرچہ فقہاء نے یہ بھی فرمادیا ہے کہ اگر کسی شخص کو آنکھیں بند کئے بغیر خشوع حاصل نہ ہوتا ہو تو اس صورت میں آنکھیں بند کرلینا بھی جائز ہے، لیکن افضل ہر حالت میں یہی ہے کہ آنکھیں کھلی رکھے۔ اسی لئے بعض بزرگوں نے یہ فرمایا کہ چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں آنکھیں بند نہیں فرماتے تھے بلکہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھا کرتے تھے، اس لئے اتباع سنّت کی برکت آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے میں ہے، چاہے نماز میں دل لگے یا نہ لگے، اس درجے کا خشوع حاصل ہو یا حاصل نہ ہو، خیالات آئیں یا نہ آئیں، اتباع سنّت کا ثواب اسی میں ہے کہ آدمی آنکھیں کھول کر نماز پڑھے، اگرچہ آنکھیں بند کرکے بھی نماز پڑھنا جائز ہے مگر افضل نہیں۔

بزرگوں نے فرمایا کہ اصل بات تو اتباع سنّت کی ہے جو نور اتباع

سنّت میں ہے، وہ نور دوسرے کاموں میں نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا چاہے نماز میں دل لگے یا نہ لگے، خشوع پیدا ہو یا نہ ہو، اتباع سنّت چونکہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے میں ہے، اس لئے ہم تو آنکھیں کھول کر نماز پڑھیں گے۔

حضرت شیخ الھندؒ اور اتباع سنّت

حتیٰ کہ شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب قدس اللہ سرہ وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، کھڑے ہو کر نہیں پڑھتے تھے، حالانکہ فقہاء کرام نے صاف صاف لکھا ہے کہ اگر نوافل کھڑے ہو کر پڑھیں تو پورا ثواب ہے، اگر بیٹھ کر پڑھیں تو آدھا ثواب ہے، اور وتر کے بعد کی دو رکعتوں کے بارے میں فقہاء یہی لکھتے ہیں کہ بیٹھ کر پڑھنے میں آدھا ثواب ہے۔ لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ یہ جو دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے، کھڑے ہو کر کیوں نہیں پڑھتے؟ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ روایات میں کثرت سے یہ آیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وتر کے بعد کی دو رکعتیں بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے، اس لئے میں بھی بیٹھ کر پڑھ لیتا ہوں۔ کسی نے پھر پوچھا کہ حضرت! ثواب کے بارے میں کیا حکم ہے؟ اس لئے کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر بیٹھ کر نماز پڑھیں تو آدھا ثواب ملتا ہے اور کھڑے ہو کر نماز پڑھیں تو پورا ثواب ملتا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ثواب تو آدھا ہی ملتا ہے، اس لئے کہ قاعدہ یہی ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

نے یہی قاعدہ بیان فرمایا ہے، اور فقہاء نے بھی یہی قاعدہ بیان فرمایا ہے۔ پھر سوال کیا کہ حضرت! جب بیٹھ کر پڑھنے سے آدھا ثواب ملتا ہے تو آپ پورا ثواب لینے کے لئے کھڑے ہو کر کیوں نہیں پڑھتے؟ جواب میں ایک جملہ ارشاد فرمایا کہ:

بھائی بات یہ ہے کہ اتباع سنّت کے کام میں جی زیادہ لگے، پڑے ثواب کم ہو۔

یعنی اگر ثواب کم ملے تو اس میں کچھ حرج نہیں، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ کام جس طرح کیا ہے، اس طرح کرنے میں طبیعت زیادہ لگتی ہے اور وتر کے بعد کی نفلوں کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیٹھ کر پڑھنا ثابت ہے، اس واسطے بیٹھ کر پڑھنے میں طبیعت زیادہ لگتی ہے، ٹھیک ہے ثواب کم ملتا ہے تو کم ملے۔

بہر حال! ہمارے بزرگوں کا یہ مزاج ہے کہ جس کام میں اتباع سنّت ہو اس کو پکڑلو، اور آنکھوں کو کھلا رکھ کر نماز پڑھنا سنّت ہے، چاہے اس درجے کا خشوع حاصل نہ ہو، لیکن پھر بھی اتباع سنّت کا جو نور اس میں ہے وہ آنکھیں بند کرنے میں نہیں ہے، یہ تو عام اصول ہے۔

مبتدی کو آنکھیں بند کرنے کی اجازت

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ ایک شخص نیا نیا دین کی طرف آیا اور اس نے نماز پڑھنی شروع کی، اب اگر تم اس

پر بہت زیادہ قیدیں اور شرطیں لگادو گے اور اس سے کہو گے کہ دیکھ بھائی! آنکھ بند کر کے نماز نہ پڑھنا، آنکھیں کھول کر نماز پڑھنا، چونکہ وہ شخص مبتدی ہے، اس لئے اگر تم اس پر زیادہ قیدیں شرطیں لگادو گے تو وہ بھاگ جائے گا اور اس کی طبیعت میں دین سے توحش پیدا ہو جائے گا۔ لہٰذا مبتدی پر زیادہ قیدیں شرطیں نہیں لگانی چاہئیں، اور اس کو اس بات کا پابندی نہیں کرنا چاہئے کہ وہ آنکھیں کھول کر ہی نماز پڑھے۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ:

> مبتدی کو اجازت ہے، خواہ آنکھ کھولے ہوئے نماز پڑھے یا بند کر کے۔

زیادہ قیود وحشت کا باعث ہوتی ہیں

پھر آگے اس کی وجہ بیان فرمائی کہ:

> اکثر صفراوی یا سوداوی قیود سے متوحش ہوتے ہیں۔

یعنی جس شخص کا مزاج سوداوی یا صفراوی ہے، اگر اس کے اوپر زیادہ پابندی عائد کی جائے کہ یہ کام اس طرح کرو اس طرح نہ کرو، اور یہ کام اس طرح نہ کرو، اس طرح کرو تو اس پابندی کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں وحشت پیدا ہو جاتی ہے، اور جو کام وہ پہلے اچھا خاصا کر رہا تھا، اس کو بھی چھوڑ بیٹھتا ہے، اس لئے مبتدی پر زیادہ قیود نہیں لگانی چاہئیں، خاص طور پر اگر اس شخص کی طبیعت میں ضعف اور کمزوری بھی ہو، جیسے آج کل لوگوں

کے اندر سو فیصد ضعف موجود ہے، تو ایسی صورت میں قیود انسان کے لئے پریشان کن بن جاتی ہیں اور طبیعت میں دلجمعی باقی نہیں رہتی۔ اس لئے جو انسان ضعیف اور کمزور ہو، اس پر سے قیود کم کرنی چاہئیں نہ یہ کہ قیود اور زیادہ بڑھادی جائیں، کیونکہ قید لگانے سے جو فائدہ اس کو حاصل ہوتا، مثلاً یہ قید اس پر لگادی جائے کہ تم آنکھیں کھول کر ہی نماز پڑھا کرو، تو اس صورت میں آنکھیں کھول کر نماز پڑھنے سے اتباع سنّت کا جو فائدہ اس کو حاصل ہوتا، وہی فائدہ اس کو جسمانی کمزوری کے باوجود عبادت کرنے میں حاصل ہو جائے گا، اور وہ جسمانی کمزوری اس فائدے کی تلافی کر دیتی ہے، اس لئے مبتدی پر زیادہ قیود لگانے کی فکر نہیں کرنی چاہئے، اس کو ذرا عبادت کی طرف گھیر گھار کر لے آؤ، جب عبادت کا عادی بن جائے، اس وقت قیود لگا دینا۔ دراصل ابتدائی حالات میں کسی قسم کی رعایت دینا اس عمل کی طرف لانے کے لئے ہی ہوتا ہے، ان آداب و شرائط کی نفی کر دینا یا ان کی اہمیت ختم کر دینا مقصود نہیں ہوتا، تربیت کرنے والے اسے خوب سمجھتے ہیں۔

ایک خان صاحب کو راستے پر لانے کا واقعہ

چنانچہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ کسی گاؤں میں گزر رہے تھے، وہاں دیکھا کہ ایک مسجد ویران پڑی ہے، لوگوں سے پوچھا کہ یہ مسجد ویران پڑی ہے، تم لوگ اس کو آباد کیوں نہیں کرتے؟ لوگوں نے کہا کہ یہاں ایک خان صاحب رہتے ہیں، وہ

اس علاقے کے سردار ہیں، ان کو دین سے کوئی تعلق نہیں، نہ نماز سے کوئی تعلق، نہ روزے سے کوئی تعلق، ہر وقت شراب و کباب کا مشغلہ رہتا ہے اور نشہ میں دھت پڑے رہتے ہیں، بازاری عورتوں کا آنا جانا ہے، نماز کی طرف دھیان نہیں، ان کی وجہ سے پوری بستی خراب ہوگئی ہے، اگر خان صاحب نماز کے لئے مسجد میں آجائیں تو ساری بستی نماز پڑھنا شروع کر دے گی۔

مولانا صاحب نے فرمایا کہ مجھے انکا پتہ بتاؤ اور ان سے میری ملاقات کراؤ۔ لوگوں نے خان صاحب کا مکان بتا دیا کہ فلاں مکان ہے۔ چنانچہ مولانا صاحب ان کے گھر دعوت دینے پہنچے اور ملاقات ہوئی تو مولانا صاحب نے فرمایا کہ بھائی خان صاحب! آپ ماشاءاللہ مسلمان ہیں، یہاں آپ کے محلے کی مسجد ویران پڑی ہے، اگر آپ مسجد میں نماز کے لئے چلے جایا کریں تو لوگ بھی آپ کو دیکھ کر مسجد میں آجایا کریں گے اور مسجد آباد ہو جائے گی، اور آپ کے نامہ اعمال میں بڑا خزانہ جمع ہو جائے گا۔ مولانا صاحب نے بات جو اس انداز سے کہی کہ خان صاحب کی طبیعت پر کچھ اثر ہوا، لیکن خان صاحب کہنے لگے کہ میں نماز پڑھنے کو تیار ہوں، البتہ مجھ سے وضو نہیں ہو سکتا، وضو کرنا میرے بس کا کام نہیں۔ دوسرے یہ کہ مجھ سے شراب نہیں چھوٹتی، تیسرے یہ کہ یہ عورتوں کے آنے جانے کا مشغلہ یہ مجھ سے نہیں چھوٹتا، اب ایسی حالت میں میں کیا نماز پڑھوں!! اس لئے میں نماز کے لئے نہیں جاتا۔ مولانا صاحب پہلے تو بڑے سٹپٹائے کہ ان کو کیا

جواب دوں، پھر کہنے لگے اچھا یہ بتاؤ کہ تم نماز پڑھنے کو تیار ہو؟ خان صاحب نے کہا کہ ہاں! میں نماز پڑھنے کو تیار ہوں، لیکن مجھ سے وضو نہیں ہو سکتا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ اچھا بغیر وضو کے نماز پڑھ لیا کرو، اور دوسرے مشغلے بھی اس کے ساتھ چلتے رہیں تب بھی کوئی بات نہیں۔ خان صاحب نے تعجب سے پوچھا کہ بغیر وضو کے نماز!! مولانا صاب نے فرمایا کہ ہاں! بغیر وضو کے نماز پڑھ لیا کرو، لیکن نماز کے لئے مسجد میں چلے جایا کرو۔ خان صاحب نے کہا کہ اگر اتنا آسان معاملہ ہے تو ٹھیک ہے، میں چلا جایا کروں گا۔ مولانا صاحب نے فرمایا کہ وعدہ کرو کہ نماز کے لئے مسجد جاؤ گے، خان صاحب نے وعدہ کر لیا کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جاؤں گا۔

مولانا صاحب نے یہاں تو خان صاحب سے وعدہ لے لیا اور بلاوضو نماز پڑھنے کی اجازت بھی دیدی، لیکن ان کے گھر سے باہر نکل کر سیدھے اسی مسجد میں پہنچے اور جاکر دو رکعتیں پڑھیں، اور پھر نماز کے بعد سجدے میں جاکر خوب روئے اور گڑگڑائے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا کہ میں اس سے یہ کہدیتا، آگے آپ کا کام ہے۔

جب نماز کا وقت آیا تو خان صاحب کو یاد آیا کہ میں نے وعدہ کر لیا ہے، اس لئے مجھے نماز کے لئے مسجد میں جانا چاہئے، چنانچہ جانے کا ارادہ کر لیا، اور جب گھر سے نکلنے لگے تو دل میں خیال آیا کہ آج تو پہلی بار نماز کے لئے جارہا ہے، اگرچہ مولوی صاحب نے تو اجازت دیدی کہ بغیر وضو کے پڑھ لینا، لیکن تم پہلی مرتبہ اتنے عرصے کے بعد جارہے ہو، کم از کم

آج تو وضو کرہی لو، اور صرف وضو ہی نہیں بلکہ آج پہلے دن غسل کر کے جاؤ، پھر بعد میں چاہو تو بغیر وضو کے پڑھتے رہنا۔ چنانچہ غسل کیا، اچھے پاک صاف کپڑے پہنے، خوشبو لگائی اور گھر سے نکل کر مسجد پہنچے، اور جب نماز پڑھی تو بس دل کی کایا ہی پلٹ گئی، اور جب واپس آئے تو شراب و کباب کے جو مشغلے تھے، اللہ تعالیٰ نے اس کی نفرت دل میں ڈال دی، اس کے بعد خان صاحب ایسے پکے نمازی بنے کہ باوضو پنج وقتہ نماز پڑھنے لگے۔

بے وضو نماز کی اجازت دینے کا اعتراض

اب زاہد خشک اس پر اعتراض کرے گا کہ مولانا صاحب نے خان صاحب کو بغیر وضو کے نماز پڑھنے کی اجازت دیدی، حالانکہ بعض اوقات بے وضو کے نماز پڑھنا کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والوں نے یہ نہیں دیکھا کہ ان مولانا صاحب نے ایک طرف تو خان صاحب کو بلاوضو کے نماز پڑھنے کی اجازت دی، تو دوسری طرف انہوں نے مسجد میں آکر سجدہ میں گر کر اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگیں کہ یا اللہ! یہاں تک تو میں لے آیا، آگے آپ کے قبضہ قدرت میں ہے۔

بات دراصل یہ تھی کہ بعض اوقات مبتدی پر سے قیدیں اور شرطیں ہٹا دینا اس کو صحیح راستے پر لانے کے لئے مفید ہوتا ہے، البتہ یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں کہ تم بھی بغیر وضو کے نماز پڑھنے کا فتوی دیدو، بلکہ وہ اللہ کے بندے جس کے قول اور فعل میں اللہ تعالیٰ تاثیر عطا فرما دیتے

ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ فہم اور بصیرت بھی عطا فرماتے ہیں، اور درد اور سوز بھی عطا فرماتے ہیں، انہی کو ایسی بات زبان سے نکالنے کا حق ہوتا ہے، جیسے حافظ شرازیؒ کا مشہور شعر ہے۔

بمئے سجادہ رنگین کن گرد پیر مغاں گوید

کہ سالک بے خبر نبود زراہ ورسم منزلہا

یعنی لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ مصلے کو شراب سے رنگ دو، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن یہ شعر درحقیقت اسی قسم کے مواقع کے بارے میں کہا گیا ہے۔

بہر حال! مبتدی جو ابھی اس راستے پر آیا ہے، اس پر زیادہ قیدیں شرطیں لگانے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی نماز میں خشوع و خضوع پیدا کرنے کی طرف متوجہ ہوا ہے اور خیالات کو منتشر ہونے سے بچانے کے لئے اور یک سوئی پیدا کرنے کے لئے کسی وقت آنکھیں بند کر کے نماز پڑھنے کو اس کا دل چاہے تو وہ آنکھیں بند کر کے نماز پڑھ لے، اس کی اجازت ہے۔ انشاء اللہ ایسا شخص جب یکسوئی کا عادی ہو جائے گا تو آنکھیں کھلی رکھ کر بھی یکسوئی کے ساتھ نماز کی ادائیگی کرنے لگے گا، البتہ سنت اور افضل ہر حالت میں اسی کیفیت کو سمجھتا رہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کا فہم عطا فرمائے اور سنت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۳۶

معمولات کی پابندی

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر

مجلس نمبر :

صفحات :

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۳۶

معمولات کی پابندی

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ العالمین۔ والعاقبۃ للمتقین۔ والصّلاۃ والسّلام علیٰ رسولہ وعلیٰ آلہ واصحابہٖ اجمعین۔ امّا بعد!

اپنے معمول سے زائد ذکر کرنے کا حکم

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

اگر معمول سے زیادہ ذکر کو طبیعت چاہے تو کرلے، لیکن اس زائد کو لازم نہ سمجھے، اور جب بعد چندے امید دوام ہو جائے تو التزام کرلے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۳)

بہترین عمل

یہ وہی بات ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حدیث میں ارشاد فرمائی، اور اسی کی بنیاد پر تمام بندگانِ دین کا معمول یہ رہا ہے کہ انسان کم سے کم معمولات مقرر کرے جس کو پابندی سے نبھا سکتا ہو، چاہے ایک تسبیح مقرر کرے، لیکن پابندی سے کرے، نہ یہ کہ ایک دن تو پچاس تسبیح پڑھ لیں اور دوسرے دن چھٹی کر لی۔ تھوڑا کرے، لیکن پابندی سے کرے، اس میں زیادہ ثواب ہے، زیادہ افضل بھی ہے اور زیادہ مفید بھی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ کسی نے حضرت عائشہ اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہما سے سوال کیا کہ کونسا عمل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو زیادہ پسند تھا، ان دونوں نے جواب دیا:

ما دیم علیه وان قلّ

آپ کا پسندیدہ عمل وہ ہے جس کی پابندی کی جائے، چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔

(ترمذی، کتاب الادب، باب نمبر ۷۳ حدیث نمبر ۲۸۵۶)

مداومت کے مفید ہونے پر مثال

دیکھئے! ایک نل میں سے ایک ایک قطرہ پانی ٹپک رہا ہے، لیکن مسلسل ٹپک رہا ہے، اس کے نیچے چاہے کتنا بھی سخت پتھر ہو، وہ قطرہ ایک نہ ایک

دن اس پتھر میں سوراخ کر دے گا، اگر وہ پابندی سے ٹپکتا رہا۔ دوسری طرف اگر آپ نے پورے پریشر سے نلکا کھولا، اور پانی پوری قوت کے ساتھ بہتا رہا، تھوڑی دیر کے بعد آپ نے وہ نلکا بند کر دیا، تو اب وہ پانی تو بہت تیزی سے بہہ گیا، لیکن اس نے پتھر میں کوئی اثر نہیں کیا۔ حالانکہ ایک قطرے نے تو پتھر میں سوراخ کر دیا، لیکن اس تیز دھار نے کوئی سوراخ نہیں کیا، اس لئے کہ وہ ایک قطرہ اگرچہ مقدار کے اعتبار سے تھوڑا تھا، لیکن پابندی کے ساتھ تھا، اس لئے اس نے یہ اثر کر دیا۔ بالکل اسی طرح اگر ایک دن تو جوش میں آکر خوب عبادت کرلی اور خوب ذکر کرلیا، لیکن اگلے دن غائب، اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں۔ بہرحال! نفلی اعمال میں جس عمل کی پابندی ہو سکے، وہ زیادہ کار آمد، زیادہ فائدہ مند اور زیادہ افضل ہے، چاہے وہ تھوڑا ہی کیوں نہ ہو۔

معمول تھوڑا مقرر کرو لیکن پابندی سے کرو

اسی لئے بزرگوں نے فرمایا کہ جب انسان ذکر و تسبیح کا اپنا کوئی معمول بنائے تو تھوڑا معمول بنائے، تاکہ اس کی پابندی کر سکے، مثلاً اگر روزانہ ایک تسبیح پڑھ سکتے ہو تو بس ایک تسبیح کا معمول بنالو، یا مثلاً اگر روزانہ ایک پارہ تلاوت کر سکتے ہو تو اس کا معمول بنالو، اگر ایک پارہ نہیں پڑھ سکتے تو آدھے پارے کا معمول بنالو، آدھا پارہ نہیں پڑھ سکتے تو پاؤ پارے کا معمول بنالو، پاؤ پارہ نہیں پڑھ سکتے تو ایک رکوع روزانہ پڑھنے کا معمول بنالو، لیکن جو معمول

بناؤ پھر اس کو پابندی سے پورا کرو۔ یہ گنڈے دار عمل کرنا کہ آج عمل کیا، کل چھوڑ دیا، پرسوں پھر کرلیا، اس سے اگلے دن پھر چھوڑ دیا، اس سے کوئی قابل ذکر فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

قَلِيْلٌ تَدُوْمُ عَلَيْهِ اَرْجٰى مِنْ كَثِيْرٍ مُمْلُوْلٍ۔

یعنی وہ تھوڑا عمل جس کو تم پابندی کے ساتھ کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس عمل کی زیادہ امید ہے بنسبت اس زیادہ عمل کے جو گنڈے دار ہو، کہ آج کیا اور کل چھوڑ دیا، پرسوں کیا اور ترسوں چھوڑ دیا۔

زائد ذکر کو معمول میں داخل نہ کرو

لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب ابتداء میں کسی نے ذکر کرنا شروع کیا، تو شروع شروع میں ذکر کے اندر دل لگا، اور ذکر کی وجہ سے دل میں نشاط پیدا ہوا، تو اب دل چاہا کہ اور زیادہ ذکر کروں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اگر معمول سے زیادہ ذکر کرنے کو دل چاہ رہا ہے تو بہت اچھی بات ہے اور زیادہ کرلو، لیکن اس زیادہ ذکر کو اپنے معمول میں داخل نہ کرو، معمول میں صرف اس ذکر کو داخل رکھو جس کی پابندی تم سے ہوسکتی ہے۔ مثلاً آج زیادہ ذکر کرنے کو دل چاہ رہا ہے، تو آج زیادہ ذکر کرلو، لیکن معمول اسی کو رکھو جو ہمیشہ سے کرتے چلے آرہے ہو۔ البتہ اگر اس زائد ذکر کی پابندی ہونے لگے تو پھر بعد میں اس کو بھی معمول میں

داخل کرلینا۔

اسی ذکر کو دوبارہ دھرالو

بزرگوں کا طریقہ یہ رہا ہے کہ جب کوئی شخص کسی شیخ سے رجوع کرتا ہے اور شیخ اس کو کچھ ذکر بتادیتا ہے کہ یہ ذکر روزانہ کرلیا کرو، جب وہ ذکر کرتا ہے اور ذکر میں نشاط محسوس ہوتا ہے تو وہ شیخ سے کہتا ہے کہ مجھے مزید ذکر بتایئے، اور ذکر کرنے کو دل چاہ رہا ہے، تو ایسے موقع پر ہمارے بزرگ اس کو نیاذکر بتانے کے بجائے اس سے کہتے ہیں کہ تم پرانا ذکر دوبارہ دھرالو۔ مثلاً ''لا اِلٰہ اِلا اللہ'' سو مرتبہ پڑھتے ہو، اس کو دوسو مرتبہ پڑھو، تاکہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں آکر ذکر زیادہ تو کرالیا، لیکن چند روز کے بعد سست پڑگئے اور اس کو پھر چھوڑ دیا۔

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو یہ چاہتے ہیں کہ سب کچھ ایک ہی رات میں کرلیں، رمضان المبارک کی راتوں میں تو خاص طور پر یہ جوش آتا ہے کہ آج رات جو کچھ عبادت کرنی ہے کرلو، چنانچہ ساراجوش اسی ایک رات میں ٹھنڈا کرلیا اور اگلے دن پڑ کے سوگئے، اور پھر فرض نمازوں کا بھی اہتمام نہیں رہا، چہ جائیکہ تہجد اور دوسرے نوافل کا اہتمام ہوتا۔

حضرت گنگوہیؒ کا ایک ملفوظ

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ میں نے اپنے والد ماجد

رحمۃ اللہ علیہ سے سنا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم عبادت کر رہے ہو، چاہے وہ عبادت نماز ہو، ذکر ہو، تلاوت قرآن ہو، اس عبادت کو جی بھرنے سے ذرا پہلے چھوڑ دو، اور عبادت کے اس شوق کو بالکل انتہاء تک نہ پہنچاؤ، بلکہ اس وقت عبادت چھوڑ دو جبکہ ابھی مزید عبادت کرنے کی خواہش دل میں موجود ہے۔ جیسے کھانے کے اندر بھی بزرگوں نے یہ بتلایا کہ کھانا اس وقت چھوڑ دو جبکہ ابھی تھوڑی سی خواہش کھانے کی موجود ہو، پیٹ بھر کر اتنا مت کھاؤ کہ سانس لینے کی گنجائش بھی نہ رہے۔ اسی طرح نفلی عبادت اس وقت چھوڑ دو جب مزید عبادت کرنے کی خواہش ابھی باقی ہو، بالکل انتہا تک نہ پہنچاؤ۔

"چک ڈور" کی مثال

حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ اس کی مثال "چک ڈور" سے دیا کرتے تھے، جس سے بچے کھیلا کرتے تھے۔ آج کل تو اس کا رواج نہیں رہا، ہمارے دیوبند میں اس کو "چک ڈور" کہا کرتے تھے، اور یہاں پر شاید اس کو "چکئی" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک گول سا پہیہ ہوتا تھا، جس پر دھاگہ لپیٹا جاتا تھا اور پھر اس کو دور پھینکتے تھے، پھر واپس کھینچتے تھے۔ حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ "چکئی" کا قاعدہ یہ ہے کہ اس کے اوپر دھاگہ لپٹا ہوا ہوتا ہے، جب اس "چکئی" کو پھینکتے ہیں تو اس کا دھاگہ کھل جاتا ہے، اگر تم نے "چکئی" کو پھینکتے وقت پورا دھاگہ کھول دیا تو

اب ''چکئی'' واپس نہیں آئے گی اور خود بخود اس پر دھاگہ دوبارہ نہیں لپٹے گا، ''چکئی'' اس وقت واپس آتی ہے جب اس میں تھوڑا سا دھاگہ لپٹا ہوا باقی رہ جائے، اس وقت اس کو کھینچنے سے وہ چکئی واپس بھی آجاتی ہے اور دھاگہ بھی دوبارہ اس پر لپٹ جاتا ہے۔

خواہش باقی رہتے ہوئے عبادت چھوڑ دو

یہ مثال بیان کرنے کے بعد حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ اسی طرح اگر تم نے عبادت کے دوران سارا دھاگہ کھول دیا اور اتنی عبادت کرلی کہ اب جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور مزید عبادت کرنے کی خواہش باقی نہ رہی، تو اب تم دوبارہ عبادت کی طرف واپس نہیں لوٹو گے۔ اور اگر تم نے عبادت کو اسی وقت چھوڑ دیا جب کہ ابھی عبادت کرنے کی تھوڑی سی خواہش باقی ہے تو تم پھر عبادت کی طرف واپس آجاؤ گے۔

دل عبادت میں اٹکا ہونا بہتر ہے

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ کی بیان کردہ اس مثال کو بیان فرمانے کے بعد فرماتے تھے کہ یہ اچھی بات ہے کہ کوئی انسان دنیا کے کام میں لگا ہوا ہو، لیکن اس کا دل عبادت میں اٹکا ہوا ہو کہ مجھے اس کام سے جلد فرصت ملے تو میں جاکر عبادت کروں۔ یہ صورت زیادہ بہتر ہے بنسبت اس کے کہ تم عبادت تو کر رہے ہو، لیکن دل دنیا کی

طرف لگا ہوا ہے کہ جلدی سے عبادت سے فراغت ہو تو جاکر اپنے کام دھندے میں لگوں۔

تھوڑی حسرت باقی رکھو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ بکثرت یہ شعر پڑھا کرتے تھے، اور جب میری حرمین شریفین میں حاضری ہوتی ہے اور وہاں سے واپسی کے موقع پر آخری مرتبہ دعا وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد واپسی ہوتی ہے تو اس وقت بکثرت یہ شعر یاد آجاتا ہے کہ ؎

کہہ چکا جی بھر کے جو کچھ ان سے کہنا تھا مجھے
پھر بھی ابتک حسرتِ شرحِ تمنّا دل میں ہے

یعنی جو ان سے کہنا تھا وہ کہہ تو دیا، لیکن مزید کہنے کی حسرت بھی دل میں باقی ہے۔ چنانچہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہی تو فرماتے تھے کہ تھوڑی سی حسرت اپنے دل میں باقی رکھو، ایک ہی مرتبہ میں ساری حسرت ختم نہ کردو، تاکہ یہ حسرت دوبارہ تمہیں عبادت کی طرف کھینچ کر لے آئے۔

شیخ کی ضرورت

لیکن اس مقصد کے لئے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اس بات کا فیصلہ کرتا ہے کہ اس کے لئے کیا چیز مفید ہے؟ اس کو کس موقع پر عبادت

سے روک دینا چاہئے اور کس موقع پر عبادت کرنے کی اجازت دینی چاہئے؟ اگر انسان خود اپنی مرضی سے کرتا رہے تو بعض اوقات وہ بھٹک جاتا ہے۔ کئی لوگوں کو دیکھا کہ وہ ایک دم سے عبادت کے جوش میں آگئے، اب رات بھر کھڑے ہوکر نوافل پڑھ رہے ہیں، اور دن بھر میں ایک قرآن شریف ختم کرلیا اور بہت ساری تسبیحات پڑھ لیں، ایک ہفتہ تک یہ جوش برقرار رہا، یہاں تک کہ لوگوں کی انگلیاں اس کی طرف اٹھنے لگیں کہ فلاں صاحب تو اب نمازی عبادت گزار تہجد گزار بن گئے ہیں، ایک ہفتہ کے بعد اب مسجد میں بھی نظر نہیں آرہے ہیں، جماعت میں بھی حاضر نہیں ہوتے، اب سب جوش ٹھنڈا ہوگیا۔ اس لئے شیخ کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس کو اعتدال میں رکھتا ہے۔

خاموشی سے اپنے اندر تبدیلی لاؤ

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا عجیب جملہ ارشاد فرمایا کہ: "اپنے اندر تبدیلی اس طرح لاؤ کہ تمہاری طرف انگلیاں نہ اٹھیں"۔ اگر اپنے اندر تبدیلی لانے میں انگلیاں اٹھ گئیں تو یہ فتنہ ہے اور اس میں اندیشہ اس بات کا ہوتا ہے کہ یہ اپنی سابقہ حالت پر واپس لوٹ جائے گا۔ تبدیلی اس طرح لاؤ جیسے دیکھتے دیکھتے بچہ بالغ ہوجاتا ہے، اگر بچے کو روزانہ فیتے سے ناپو کہ آج کتنا بڑا ہوا، کل کتنا بڑا ہوا، اور کتنا فرق واقع ہوا تو فیتے کے ذریعہ کوئی فرق نہیں معلوم ہوگا، لیکن رفتہ رفتہ وہ جوان ہوجائے گا،

کس دن کتنا بڑھا وہ معلوم نہیں، لیکن روز بڑھ رہا ہے، یہاں تک کہ جوان ہو گیا۔ لہٰذا تبدیلی اس طرح لاؤ کہ انگلیاں نہ اٹھیں، اس لئے کہ انگلیاں اٹھنے سے اس شخص کے تکبر اور عجب میں مبتلا ہونے کا بھی اندیشہ رہتا ہے۔

اتنا معمول بناؤ جس کی پابندی کر سکو

بہر حال، جب اپنا کوئی معمول بناؤ تو ایسا بناؤ جس کی تم پابندی کر سکو، اگرچہ وہ تھوڑا ہو، جوش میں آکر زیادہ معمول نہ بنالو۔ اس لئے کسی رہبر اور کسی رہنما اور کسی مرشد کی ضرورت ہوتی ہے، جو یہ بتاتا ہے کہ اتنا معمول بناؤ، اس سے زیادہ نہ بناؤ، وہ جانتا ہے کہ تمہارے لئے کیا فائدہ مند ہے اور کیا نقصان دہ ہے۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ کسی اللہ والے سے تعلق قائم کئے بغیر، اس کی طرف رجوع کئے بغیر اور اس سے رہنمائی حاصل کئے بغیر عادۃً اصلاح نہیں ہوتی، اس لئے بار بار اس کی تاکید کی جاتی ہے کہ کسی اللہ والے سے تعلق قائم کریں، اور پھر اس کی رہنمائی میں اس راستے پر چلیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۳۷

معمولات چھوٹنے پر حسرت اور ندامت

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸- لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۳۷

صفحات : ۱۷

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۳

معمولات چھوٹنے پر حسرت اور ندامت

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبّ العالمین ۔ والعاقبة للمتقین
والصّلاة والسّلام علیٰ رسوله الکریم وعلیٰ
آله واصحابه اجمعین ۔

أمّا بعد!

ایک صاحب نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ:

میرا ایک مرض جو کہ سب سے بڑھ کر ہے، وہ کم ہمتی ہے کہ مجھ سے کوئی کام نہیں ہوتا۔

جواب میں حضرتؒ نے لکھا کہ:

جتنا بھی ہو جائے، وہ بھی بے کئے ہوئے کی ندامت
سے مل کر محروم نہ رہنے دے گا۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۳)

فرائض میں سستی کا علاج

ان صاحب نے اپنا جو مرض لکھا ہے وہ حقیقۃً ہم میں سے تقریباً اکثر لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ کام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی اور کم ہمتی کا شکوہ رہتا ہے۔ حضرت کا جواب سمجھنے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ کام کرنے کی ہمت نہ ہو سکنا یہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک یہ کہ ایک شخص کو اپنے فرائض و واجبات ادا کرنے ہی کی ہمت نہیں ہے، مثلاً نماز فرض ہے، اب اس فرض کو ادا کرنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ یا مثلاً روزہ فرض ہے، لیکن روزہ رکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔ اس کا علاج تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے ساتھ زبردستی کرے اور زبردستی کر کے اس فرض کو انجام دے، اگرچہ اس کام کو کرنے کا دل نہیں چاہ رہا ہے لیکن زبردستی اپنے آپ کو کھینچ کر لے جائے۔

گناہوں سے بچنے کا علاج

یہی حال گناہوں سے بچنے کا ہے، جو صریح اور کھلے گناہ ہیں، ان سے بچنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے، تو اس کا علاج اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو مستحضر کرے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کا تصور کرے، اور زبردستی اپنے آپ کو اس گناہ سے بچائے اور دور کرے۔ لہٰذا

فرائض و واجبات کی ادائیگی اور محرمات سے اجتناب اور گناہوں سے پرہیز کرنے میں ہمّت نہیں ہو رہی ہے تو ان کا علاج یہ ہے کہ زبردستی کرے، چاہے جان چلی جائے، چاہے کچھ ہو جائے، میں تو یہ فرض ادا کروں گا اور اس گناہ سے بچونگا، اس کے علاوہ کوئی ایسا نسخہ نہیں ہے جو انسان کو گھول کر پلا دیا جائے اور اس کے نتیجے میں فرائض و واجبات خود بخود ادا ہونے لگیں، ہمّت تو استعمال کرنی پڑے گی۔ یہ پہلی قسم ہے۔

معمولات کی ادائیگی میں کم ہمتی

دوسری قسم یہ ہے کہ ایک آدمی ہے جو اپنی بساط کی حد تک صرف فرائض و واجبات ادا کرتا ہے، وقت پر نماز ادا کرتا ہے، روزے رکھتا ہے، گناہوں سے حتی الامکان پرہیز کی کوشش کرتا ہے، البتہ نوافل اور اذکار کی ہمّت نہیں ہوتی، جو معمولات مقرر کر رکھے ہیں ان کی پابندی نہیں ہو پا رہی ہے، کسی دن معمول پورا کر لیا، کسی دن چھوٹ گیا، یا اس کا دل چاہتا ہے کہ میں زیادہ اذکار اور زیادہ نوافل ادا کروں، لیکن اس کے لئے ہمّت نہیں ہو پاتی، یا رات کو آخری وقت میں اٹھ کر تہجد پڑھنے کو دل چاہتا ہے، لیکن آنکھ نہیں کھلتی، نہیں اٹھ پاتا، اس لئے عشاء کی نماز اور وتر کے درمیان چار رکعت تہجد کی نیت سے پڑھنے پر اکتفا کر لیتا ہے۔ یہ سوال ایسا ہی شخص کر رہا ہے کہ میرے اندر کم ہمتی ہے، کوئی کام نہیں ہوتا، مقصد اس کا یہ ہے نوافل اور ذکر و اذکار زیادہ کرنے کی ہمّت نہیں ہوتی۔

”ندامت“ محروم نہ ہونے دیگی

اس شخص کا جواب دیتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ:

جتنا بھی ہو جائے، وہ بھی بے کئے ہوئے کی ندامت سے مل کر محروم نہ رہنے دے گا۔

یعنی جتنا بھی نفلی عمل بن پڑا اس کو کرلیا، مثلاً ہزار مرتبہ کلمہ طیّبہ نہ پڑھ سکا، سو مرتبہ پڑھ لیا، یا جن تسبیحات کا معمول تھا، وہ نہ پڑھ سکا، صرف نماز کے بعد تسبیح فاطمی پڑھنے پر اکتفا کرلیا، یا مثلاً رات کو تہجد کے لئے نہیں اٹھا جارہا ہے، اس لئے عشاء کے بعد چار رکعت تہجد کی نیت سے پڑھ لیں۔ یہ شخص جتنا کچھ عمل کر رہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس کو اس پر ندامت بھی ہو رہی ہے کہ افسوس مجھ سے کچھ نہیں بن پڑ رہا ہے۔ میں تو کچھ کر نہیں پا رہا ہوں، تو اس شخص کا یہ تھوڑا سا عمل بے کئے ہوئے کی ندامت سے مل کر انشاء اللہ محروم نہیں رہنے دے گا۔

یہ حسرت بڑی نعمت ہے

اس لئے کہ یہ ندامت، یہ پشیمانی، یہ حسرت کہ مجھ سے زیادہ عمل نہیں ہو پا رہا ہے، یہ بھی بڑی چیز ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس ندامت اور حسرت کی بنیاد پر بھی عطا فرما دیتے ہیں۔ ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ حسرت نایاب بھی بڑی دولت ہے، یعنی اس

بات کی حسرت کہ مجھ سے یہ کام نہ ہو سکا۔ یہ ساری باتیں نوافل کے بارے میں ہیں، فرائض میں صرف حسرت سے کام نہیں چلتا جب تک اس فرض کو ادا نہ کرلے، البتہ نوافل میں یہ بات ہے کہ اگر نفل کام کے نہ ہونے کی حسرت ہو رہی ہے کہ کتنے اللہ کے نیک بندے ہیں جو راتوں کو اٹھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں اور تہجد کی نماز ادا کرتے ہیں، تلاوت کرتے ہیں، لیکن مجھ سے یہ عمل نہیں ہوپاتا۔ یہ حسرت بھی بڑی دولت اور بڑی نعمت ہے۔

عذر قوی کے ساتھ حسرت باعث اجر ہے

اگر یہ "حسرت" عذر قوی کے ساتھ ہو پھر تو یقیناً یہ "حسرت" اصل عمل کے ثواب تک پہنچا دیتی ہے۔ مثلاً یہ حسرت کہ معذوری کی وجہ سے بستر پر پڑا ہوں، بیمار ہوں، بستر سے اٹھ نہیں سکتا، اگر یہ بیماری نہ ہوتی اور میں تندرست ہوتا تو خوب نوافل ادا کرتا، خوب ذکر و اذکار کرتا، ہائے افسوس کہ مجھ سے یہ نوافل ادا نہیں ہو رہے ہیں، چونکہ یہ حسرت عذر کی وجہ سے ہے، اس لئے یقیناً یہ عذر عمل تک پہنچا دے گا، اور اس کو وہی ثواب ملے گا جو تندرستی کی حالت میں کھڑے ہو کر نوافل پڑھنے میں ملتا۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ اور لوہار کا واقعہ

اور ایک صورت یہ ہے کہ نوافل پڑھنے سے عذر تو کوئی نہیں ہے،

البتہ کم ہمّتی ہے اور کم ہمّتی کی وجہ سے حسرت ہو رہی ہے کہ اگر ہمّت ہوتی تو یہ عمل کرلیتا، یہ حسرت کرنے والا بھی انشاء اللہ محروم نہیں رہے گا۔
میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، بہت بڑے محدّث اور فقیہ تھے، جب ان کا انتقال ہوگیا تو کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیسا معاملہ فرمایا؟ جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم کا معاملہ فرمایا اور بڑے اونچے درجات عطا فرمائے، البتہ مجھے وہ درجہ نہ مل سکا جو درجہ اللہ تعالیٰ نے اس لوہار کو عطا فرمایا جو میرے گھر کے سامنے رہتا تھا، وہ لوہار مجھ سے آگے بڑھ گیا۔

خواب دیکھنے والا شخص جب بیدار ہوا تو اس کو جستجو ہوئی کہ وہ کون لوہار تھا اور کیا عمل کرتا تھا؟ جس کی وجہ سے وہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ سے آگے بڑھ گیا، چنانچہ وہ شخص اس محلّے میں گیا اور معلومات کیں، تو پتہ چلا کہ واقعۃً حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کے سامنے ایک لوہار رہتا تھا اور اس لوہار کا انتقال ہو چکا ہے۔ چنانچہ وہ اس لوہار کے گھر گیا اور اس کی بیوی سے پورا خواب بیان کیا اور اس کے بعد اس سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کونسا ایسا نیک عمل کرتا تھا جس کے نتیجے میں وہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے بھی آگے بڑھ گیا؟

اذان کی آواز پر کام بند

اس کی بیوی نے جواب دیا کہ وہ سارا دن لوہا کوٹتا رہتا تھا، کوئی خاص نیک عمل تو نہیں کرتا تھا، البتہ دو باتیں اس کے اندر تھیں، ایک یہ کہ جس وقت وہ لوہا پیٹ رہا ہوتا، اس دوران اگر اذان کی اواز کان میں پڑتی تو فوراً کام بند کر کے مسجد کی طرف نماز کے لئے چلا جاتا تھا، یہاں تک کہ اگر اس نے لوہا پیٹنے کے لئے ہتوڑا سر سے اوپر اٹھایا ہوا ہوتا اور اس وقت اذان کی آواز کان میں پڑ جاتی تو اتنا گوارہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے ذریعہ ایک ضرب اور لگادوں، بلکہ اس ہتوڑے کو پیچھے کی طرف پھینک دیتا تھا اور نماز کے لئے چلا جاتا تھا۔ ایک بات تو یہ تھی۔

"حسرت" نے آگے بڑھا دیا

دوسرے یہ کہ ہمارے گھر کے سامنے ایک بزرگ حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے، وہ رات بھر اپنے گھر کی چھت پر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کھڑے رہتے تھے، اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لکڑی کھڑی ہے، میرا شوہر ان کو اس طرح رات بھر عبادت کرتے دیکھ کر یہ حسرت کیا کرتا تھا کہ دیکھو یہ حضرت عبداللہ بن مبارک اتنے بڑے محدّث اور اتنے بڑے بزرگ ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں فراغت عطا فرمائی ہے، جس کی وجہ سے یہ رات بھر کھڑے ہو کر عبادت کرتے رہتے ہیں، اگر ہمیں بھی

فراغت ہوتی تو ہم بھی ان کی طرح رات کو عبادت کیا کرتے۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس لوہار کو اس حسرت کی وجہ سے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے آگے بڑھا دیا، اس لئے یہ "حسرت" بھی بڑی دولت ہے۔ بہر حال! اگر نوافل اور ذکرواذکار وغیرہ زیادہ نہ بن پڑیں تو کم از کم دل میں ان کے نہ کرنے کی حسرت ہی پیدا ہو جائے تو پھر وہ آدمی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے محروم نہیں رہتا۔ اسی لئے حضرت والا نے جواب میں لکھا کہ "جتنا بھی ہو جائے وہ بھی بے کئے ہوئے کی ندامت سے مل کر محروم نہ رہنے دے گا" انشاء اللہ تعالیٰ۔

اس جواب سے اس طرف بھی اشارہ ہو گیا کہ جتنا کچھ ہو سکے کر لیا جائے، پورا نہ سہی ادھورا ہی ہو، کامل کے خیال میں ناقص کو بھی چھوڑا نہ جائے، پھر اس کی تکمیل نہ ہونے کی حسرت سے پورے عمل کا ہی اجر ملنے کی توقع ہے۔

ذکر کے ذریعہ فرحت پیدا نہ ہونے کا شکوہ

ایک اور صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ:

کچھ ذکر و تلاوت تو کرنے لگا ہوں، تہجد بھی بعد عشاء جاری ہے، لیکن ہنوز قلب میں فرحت پیدا نہیں ہوئی۔

(انفاس عیسیٰ، ص ٦٤)

بہت سے لوگوں کو یہ شکوہ رہتا ہے کہ ہم ذکر بھی کرتے ہیں، تلاوت بھی کرتے ہیں، لیکن کوئی فرحت، سرور اور انبساط محسوس نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ میرا یہ عمل بے کار ہے یا کوئی شقاوت قلبی اور سنگ دلی ہے جس کی وجہ سے انبساط نہیں ہو رہا ہے یا خدا جانے کیا ہے، اور پھر اس کے نتیجہ میں وہ پریشان ہو جاتا ہے، اور بعض اوقات مایوسی تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔

یہ توفیق بھی نعمت ہے

اس کے جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ:

"رحمت" تو پیدا ہو گئی ہے جو رہبری کر رہی ہے،
"فرحت" خود اس کی لونڈی ہے، اپنی باری میں وہ بھی
حاضر ہو جائے گی۔

(ایضاً)

یعنی اصل چیز تو اللہ تعالیٰ کی رحمت یعنی عمل کی توفیق ہے، یہ عمل کرنے کی جو توفیق ہو رہی ہے یہ بڑی نعمت ہے، اس کی قدر کرو اور اس پر شکر ادا کرو، یہ رحمت تمہاری رہبری کر رہی ہے، باقی رہی "فرحت" وہ تو اس رحمت کی لونڈی ہے، جب اس کی باری آئے گی تو وہ بھی حاضر ہو جائے گی، یہ بھی کیا ضروری ہے کہ وہ بھی حاضر ہو، کوئی ضروری نہیں، اگر ساری عمر فرحت حاصل نہ ہو تو بھی کوئی گھاٹا نہیں۔

لذّت اور کیفیت مقصود نہیں

حضرت حاجی صاحبؒ اور حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں یہ بات ''دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی'' کی طرح واضح ہو چکی، اب اس میں کوئی ابہام باقی نہیں رہا، وہ یہ کہ عمل بذات خود مقصود ہے، اس عمل کے ذریعہ حاصل ہونے والی کیفیات مقصود نہیں، مثلاً عمل کے نتیجے میں لذت آرہی ہے اور مزہ آرہا ہے، رِقّت طاری ہو رہی ہے، رونا آرہا ہے، یہ چیزیں بذات خود مقصود نہیں، اگر حاصل ہو جائیں تو اللہ کی نعمت ہیں، اگر حاصل نہ ہوں تو کوئی گھاٹا نہیں۔ اصل مقصود عمل ہے، اس لئے عمل کرلو، چاہے وہ تلاوت ہو، نماز ہو، ذکر ہو، یا کوئی اور عمل ہو، بس وہ حاصل ہو جائے۔

عمل درست ہونے کی فکر کریں

بعض لوگ اس سلسلے میں بڑے پریشان ہوتے ہیں کہ ذکر کرتے کرتے اتنے دن ہو گئے لیکن آج تک کبھی رونا نہیں آیا، کبھی رقت طاری نہیں ہوئی، میں تو بڑا شقی القلب ہوں، میں تو بڑا مردود ہوں۔ یاد رکھئے! یہ رونا آنا نہ آنا غیر اختیاری معاملہ ہے، اس پر نجات کا مدار نہیں، اصل چیز یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو، وہ راستہ درست ہے یا نہیں؟ جو عمل تم کر رہے ہو وہ عمل درست ہے یا نہیں؟

بیت اللہ پر پہلی نظر پڑنے پر رونا نہ آنا

بہت سے لوگوں سے یہ سن رکھا ہے کہ جب بیت اللہ شریف پر پہلی نظر پڑتی ہے تو آدمی ہنستا ہے یا روتا ہے، یہ بات لوگوں کے درمیان مشہور ہو چکی ہے۔ اب ایک شخص وہاں پہنچا اور بیت اللہ پر نظر پڑی تو نہ ہنسی آئی اور نہ رونا آیا، اب وہ شخص بہت پریشان ہو رہا ہے کہ میں تو شیطان ہوں، میں تو مردود ہو چکا ہوں، اس لئے کہ مجھے تو نہ ہنسی آئی اور نہ ہی رونا آیا۔ یاد رکھئے! وہاں پر ہنسنے اور رونے کی کوئی حقیقت نہیں، ارے جب وہاں پہنچ گئے اور بیت اللہ شریف پر نگاہ پڑ گئی، اور وہاں پر حاضر ہو کر طواف کرنے کی توفیق ہو گئی تو بس یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے، چاہے رونا آئے یا نہ آئے، اگر رونا آئے تو نعمت ہے، رونا نہ آئے تب بھی غم کی کوئی بات نہیں، اور اس کی وجہ سے محرومی نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ یہ کیفیات مقصود ہی نہیں، ان کی طرف زیادہ دھیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اصل یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ جو عمل مامور بہ ہے وہ ادا ہو رہا ہے یا نہیں؟

ثمرات کا انتظار خود رکاوٹ ہے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَاءَ تْكَ سيئتك فأنت مؤمن۔

(مسند احمد: ج ۵ ص ۲۵۲)

یعنی تیری نیکی تجھے خوش کرے، اور تیری برائی تجھے بری معلوم ہو تو تم مؤمن ہو۔ یہ حدیث سن کر بعض لوگوں کو یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمیں عبادت کرنے کے بعد اس قسم کی علامات نظر آنی چاہئیں، کچھ نشاط حاصل ہونا چاہئے، کچھ خوشی حاصل ہونی چاہئے، لیکن ہمیں تو عبادت کرنے کے بعد اس قسم کی علامات نظر نہیں آتیں۔

اول تو یہ یاد رکھئے کہ یہ نتائج اور ثمرات انتظار کرنے سے نہیں ملتے، بلکہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ثمرات کا انتظار بذات خود ایک حجاب اور پردہ ہے، جب تک یہ انتظار لگا رہے گا اس وقت تک یہ حاصل نہیں ہوں گے۔ اس انتظار کی مثال ایسی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ:

صَلی الحائك رکعتین و انتظر الوحی۔

کہ ایک مرتبہ جولاہے نے دو رکعتیں پڑھ لیں اور اب انتظار میں بیٹھا ہے کہ میرے اوپر کب وحی نازل ہوتی ہے۔ اس لئے ان ثمرات کا انتظار نہ ہونا چاہئے، کیونکہ یہ عمل بذات خود مقصود ہے، جب آپ نے نماز پڑھ لی تو یہی عمل ہے اور یہی مقصود ہے اور یہی نتیجہ اور ثمرہ ہے، نماز کے ادا ہو جانے کے بعد آگے اور کسی چیز کی انتظار کی ضرورت نہیں۔

دوسرے یہ کہ اس حدیث شریف میں جس خوشی اور برے لگنے کا تذکرہ ہے، اس سے مراد عقلی طور پر کسی اچھے عمل کو اچھا سمجھنا اور برے عمل کو برا سمجھنا ہے، طبعی اثر بھی پیدا ہو جائے تو بہت بہتر ہے اور اگر طبعی

اثر محسوس نہ ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

خود نماز ہی مقصود ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ۔

(الم نشرح، آیت ۸)

یعنی جب تم دوسرے کاموں سے فارغ ہو جاؤ تو تھکو، یعنی اپنے آپ کو عبادت میں تھکاؤ، لمبا قیام کرو، لمبا رکوع کرو، لمبا سجدہ کرو۔ اس آیت میں نماز کے اندر تھکنے کو بذات خود مقصود قرار دیا، یہی عمل ہے اور یہی مقصود و مطلوب ہے، اس میں کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات میں اس کو بہت وضاحت سے بیان کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کے اندر مایوسی کی کیفیت پیدا نہ ہو، جب عمل کی توفیق ہو گئی تو یہ توفیق خود اللہ تعالیٰ کا ایک انعام ہے، بس اب اور کسی چیز کو تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہاں تو عین منزل ہے "تھکن سے چور ہو جانا"

اسی مضمون کو ادا کرنے کے لئے کسی زمانے میں میں نے ایک شعر کہا تھا، ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس شعر کو بڑا پسند فرمایا تھا، وہ یہ کہ:

قدم ہیں راہِ الفت میں تو منزل کی ہوس کیسی؟
یہاں تو عین منزل ہے "تھکن سے چور ہو جانا"

یعنی جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے صحیح راستے پر جا رہے ہیں، صراطِ مستقیم پر قدم ہے، تو اب یہ ہوس کہ ہمیں کشف ہونا چاہئے، الہام ہونا چاہئے، نور نظر آنا چاہئے اور کیفیات ہونی چاہئیں، یہ سب باتیں بیکار ہیں۔ ارے یہاں تو عمل کرنا اور عمل کے اندر اپنے آپ کو تھکانا ہی مقصود ہے، اس لئے فرحت حاصل ہونے کی زیادہ فکر میں نہ پڑنا چاہئے، اس لئے کہ بعض اوقات یہ فرحت، یہ نشاط، یہ حلاوت الٹا نقصان دہ ہو جاتی ہے، مثلاً نماز میں بڑا کیف اور سرور حاصل ہو رہا ہے، مزہ آرہا ہے، فرحت حاصل ہو رہی ہے تو اس کے نتیجے میں دماغ کے اندر کچھ گھمنڈ پیدا ہو جاتا ہے کہ میں بھی کچھ ہو گیا ہوں اور میں بھی کسی مقام تک پہنچ گیا ہوں، اور اس گھمنڈ کے آتے ہی وہ عمل اکارت چلا گیا۔ اس لئے بعض اوقات اس سرور اور کیفیت کے پیدا ہونے سے نقصان ہو جاتا ہے۔

وہ شخص قابل مبارک باد ہے

بخلاف اس شخص کے جو عمل کو مشقت سے انجام دے رہا ہے، اس میں تھک رہا ہے، اور اس کو عمل کے اندر کوئی سرور اور مزہ نہیں آرہا ہے، تو انشاء اللہ وہ شخص گھمنڈ پیدا ہونے کے خطرہ سے بچ جائے گا۔ اسی لئے حضرت گنگوہی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ:

جس شخص کو ساری عمر کبھی نماز میں مزہ نہ آیا ہو لیکن نماز پڑھتا رہا ہو، میں اس کو مبارکباد دیتا ہوں، اس لئے کہ مزہ نہ آنے کے باوجود پڑھنا یہ اس کے اخلاص اور للّٰہیت کی دلیل ہے، اس میں کوئی نفسانی خواہش شامل نہیں ہے۔

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ فرحت حاصل ہونے کی فکر میں زیادہ نہ پڑو، بس جو کام کر رہے ہو اس میں لگے رہو، فرحت تو عمل کی لونڈی ہے، جب اس کے آنے کا وقت آئے گا تو اس وقت میں وہ بھی حاضر ہو جائے گی، اور بغیر انتظار کے آ جائے گی اور اگر نہ آئی تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، اس لئے کہ مقصود عمل ہے، وہ حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۳۸

ذکر الٰہی کے چند آداب

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۳۸

صفحات : ۱۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ؕ

مجلس نمبر ۳۸

ذکرِ الٰہی کے چند آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ العالمین۔ والعاقبة للمتقین
والصّلاة والسلام علیٰ رسوله الکریم۔ وعلیٰ
آله واصحابه اجمعین۔

أمّا بعد!

باوضو ذکر کرنا

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

باوضو ذکر کرنے سے برکت زیادہ ضرور ہوتی ہے لیکن وضو رکھنا ضروری نہیں، اس لئے کہ اگر کسی کا وضو نہ

ٹھیرتا ہو اور بار بار وضو کرنے سے تکلیف ہو تو تیمم کر لیا
کرے، مگر اس تیمم سے نماز و مسِ مصحف جائز نہیں۔
(انفاس عیسیٰ ص ٦٤)

اس ملفوظ میں کئی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ پہلی بات یہ ارشاد فرمائی کہ مسئلہ یہ ہے کہ بغیر وضو کے ذکر کرنا جائز ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر کے لئے کوئی شرط اور کوئی قید نہیں لگائی، اس کو اتنا آسان کر دیا کہ انسان جب بھی اور جس حالت میں بھی اللہ تعالیٰ کا نام لینا چاہے تو اس کو نام لینے کی اجازت ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کا نام لینے کی اجازت ہی نہ ہوتی، وضو کر کے کیا، اگر اپنے منہ کو مشک و عنبر سے بھی دھو لیتے تب بھی اجازت نہ ہوتی۔

ہزار بار بشویم دھنم بمشک و گلاب
ھنوز نامِ تو گفتن کمالِ بے ادبی ست

یعنی اگر میں ہزار بار بھی اپنے منہ کو مشک و گلاب سے دھو لوں، پھر بھی آپ کا نام لینا بے ادبی اور گستاخی ہے۔ اصل بات تو یہ ہے، لیکن ان کا کرم یہ ہے کہ نام لینے کی نہ صرف اجازت دیدی بلکہ اس کے ساتھ کوئی قید و شرط بھی نہیں لگائی، نہ مسجد میں آنے کی قید، نہ مصلے پر بیٹھنے کی قید، نہ وضو کرنا ضروری، نہ غسل کرنا ضروری، حتی کہ اگر انسان ناپاکی کی حالت میں ہے یا کوئی عورت حیض و نفاس کی حالت میں ہے تو اگرچہ نماز پڑھنے اور تلاوت کرنے کی اس حالت میں اجازت نہیں ہے لیکن ذکر کی اس حالت میں بھی اجازت ہے۔ قرآن کریم

میں فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ

(سورۂ آل عمران، آیت ۱۹۱)

یعنی کھڑے ہونے کی حالت میں، بیٹھنے کی حالت میں، اور بستر پر لیٹے ہونے کی حالت میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ تم کھڑے ہو یا لیٹے ہو یا بیٹھے ہو، جس حالت میں بھی ہو، ہمیں پکار لو، اتنا آسان فرما دیا۔

لہٰذا ذکر کے لئے وضو کرنا کوئی شرط تو نہیں لیکن محبت کا تقاضہ تو ہے، جب انسان اس ذات کا ذکر کرے تو باوضو ہو کر کرے، اس لئے کہ باوضو ہو کر ذکر کرنے میں برکت زیادہ ہوگی، اس میں انوار زیادہ ہوں گے، اس کا فائدہ زیادہ ہوگا، اس لئے حتی الامکان وضو کر کے ذکر کرے۔

ذکر کیلئے تیمّم بھی کر سکتے ہیں

ہاں البتہ اگر کوئی عذر ہے اور اس عذر کی وجہ سے وضو نہیں ٹھیرتا، تو ایسے شخص کے لئے حضرت فرماتے ہیں کہ وضو نہ ٹھیرنے کی وجہ سے ذکر کو نہ چھوڑے بلکہ ذکر کرتا رہے، البتہ چونکہ باوضو ذکر کرنے سے انوار و برکات زیادہ ہوتے ہیں، اس لئے جب وضو ٹوٹ جائے دوبارہ کر لے، پھر ٹوٹ جائے تو پھر وضو کر لے، اور اگر بار بار وضو کرنے میں تکلیف ہوتی ہو تو ذکر کرنے کے لئے تیمّم کر لے، لیکن ایسے تیمّم سے نماز پڑھنا اور قرآن شریف چھونا جائز نہیں ہوگا۔

کن اعمال میں تیمّم کرنا جائز ہے

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ وہ اعمال جن کو بلا وضو ادا کرنا جائز ہے، لیکن ادب کے خیال سے وہ اعمال وضو کے ساتھ کئے جاتے ہیں، ان اعمال میں اگر انسان کسی وجہ سے بجائے وضو کے تیمّم کرلے تو انشاء اللہ وضو کے بجائے تیمّم بھی کافی ہو جائے گا۔ مثلاً آپ درسی کتاب کا سبق پڑھتے ہیں تو قرآن کریم کے علاوہ دوسری کتاب کا سبق بلا وضو پڑھنا اصلاً جائز ہے اور ان کتابوں کو چھونا بھی جائز ہے، لیکن ادب کا تقاضہ یہ ہے کہ تمام درسی کتابوں کا سبق بھی وضو کے ساتھ پڑھے، اور اگر کسی وقت وضو کا موقع نہیں ہے تو اس کے لئے تیمّم کرلے، تو یہ تیمّم بھی انشاء اللہ کافی ہو جائے گا۔ البتہ اگر کوئی یہ چاہے کہ میں اس تیمّم سے نماز پڑھ لوں، تو یاد رکھئے کہ اس تیمّم سے نماز نہیں ہوگی۔ یہی معاملہ ذکر کا ہے کہ اگر بار بار وضو ٹوٹ رہا ہے اور وضو کرنے میں تکلیف ہو رہی ہے تو ذکر کرنے کے لئے تیمّم کرلے، اس لئے کہ بار بار تیمم کرنے میں کوئی مشقت نہیں ہے، البتہ اس تیمّم سے نماز پڑھنا اور قرآن شریف چھونا جائز نہیں ہوگا۔

نماز سے جی چرانے کا علاج

ایک شخص نے حضرت والا کو لکھا کہ:

نماز پڑھنے میں جی بہت جان چراتا ہے۔

یعنی دل نہیں مانتا اور دل نماز پڑھنا نہیں چاہتا۔ جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ:

اس کا تو کچھ حرج نہیں مگر جی چرانے پر عمل نہ کیا جائے، نفس کی مخالفت کر کے نماز کو اہتمام سے پڑھا جائے اور کچھ نوافل بھی معمول کر لیا جائے۔ جتنے میں کسی ضروری کام کا حرج نہ ہو۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۴)

یعنی جی چرانے میں تو کوئی حرج نہیں، وہ تو اسی کام کے لئے ہے کہ ہر اچھے عمل سے جان چرائے، اور غلط کاموں کی طرف انسان کو مائل کرے، اس لئے اس میں تو کچھ حرج نہیں، باقی اس کے جی چرانے پر عمل نہ کیا جائے، بلکہ نفس کی مخالفت کر کے نماز کو اہتمام سے پڑھے، جی لگنے کی زیادہ فکر میں نہ پڑے۔

ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ کا تصور کرے

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ:

تسبیح کے وقت اَولیٰ تو تصور مذکور کا ہے یعنی حق تعالیٰ شانہ کا، لیکن اگر یہ خیال نہ جمے تو پھر ذکر کا اس طرح سے کہ یہ قلب سے ادا ہو رہا ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۴)

اس ملفوظ میں ذکر کا طریقہ بیان فرمایا کہ جب انسان ذکر کرے تو اصل

تو یہ ہے کہ ذکر کے وقت اس ذات کا تصور کرے جس کا ذکر کر رہا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا، جیسا کہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ
فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاه فانه يَرَاكَ

(بخاری شریف، کتاب الایمان، باب سوال جبرئیل)

یعنی اس طرح ذکر کرے گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے، اور اگر یہ تصور نہ آسکے تو کم از کم یہ تصور جمائے کہ وہ ذات جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، وہ ذات مجھے دیکھ رہی ہے۔ تو اصل یہ ہے کہ جس کا ذکر ہو رہا ہے یعنی اللہ جل شانہ، اس کا تصور جمائے، جب "اللہ، اللہ" کہہ رہے ہو تو اس وقت ذہن اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، جب "سبحان اللہ" کہہ رہے ہو تو توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہو، جب "الحمد للہ" کہہ رہے ہو تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تصور ہو۔

ابتداءً ذکر کے الفاظ کا تصور بھی کر سکتے ہیں

لیکن ابتداء میں ہم جیسے مبتدیوں کے لئے اللہ تعالیٰ کا یہ تصور جمانا بسا اوقات مشکل ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کا تصور کیسے جم سکتا ہے جب کہ وہ ذات "لایحدّ ولا یتصور" ہے، وہ ذات تو تصور میں آ ہی نہیں سکتی، اس لئے شروع شروع میں ذکر کرتے وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اور اس کی قدرت کا اور اس کی عظمت کا تصور بھی نہیں جمتا۔ اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ

شروع میں مبتدی کو چاہئے کہ وہ "ذکر" ہی کا تصور کرے، یعنی جو الفاظ زبان سے نکال رہا ہے، ان الفاظ کی طرف دھیان لگائے۔ مثلاً جب وہ "اللہ اللہ، سبحان اللہ سبحان اللہ" زبان سے نکال رہا ہے تو اس کو یہ پتہ ہو کہ میں یہ الفاظ زبان سے نکال رہا ہوں۔ جب ابتداء میں وہ "ذکر کے الفاظ کا تصور قائم کرے گا تو رفتہ رفتہ بالآخر انشاءاللہ "مذکور" یعنی اللہ تعالیٰ کا تصور بھی قائم ہو جائے گا۔

ذکر کے وقت دوسرے تصورات

بعض صوفیاء کرام نے بعض اذکار کے ساتھ علیحدہ علیحدہ تصورات قائم فرمائے ہیں، جیسے دوازدہ تسبیح میں بزرگوں سے منقول ہے کہ "اِلا اللہ" کی چار تسبیحات اس طرح پڑھے کہ پہلی تسبیح میں " لاَ مَعْبُودَ اِلا اللّٰه" کا تصور کرے، اور دوسری تسبیح میں "لا محبوب اِلا اللّٰه" کا تصور کرے۔ تیسری تسبیح میں "لا مقصود اِلا اللّٰه" کا تصور کرے، اور چوتھی تسبیح میں "لا موجود الا اللّٰه" کا تصور کرے۔ لیکن ان کے بارے میں ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب عارفی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی کرلے تو ٹھیک ہے، لیکن ان تصورات کا زیادہ اہتمام کرنے کی ضرورت نہیں، ان تصورات کے بغیر بھی تسبیح پڑھ لی جائے تب بھی کافی ہے، اصل مقصود یہ ہے کہ جب انسان ذکر کرے تو ذرا دھیان سے ذکر کرے، اس سے انشاءاللہ رفتہ رفتہ مقصود حاصل ہو جائے گا۔

ذکر میں لذت نہ آنا زیادہ نافع ہے

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

ذکر میں لطف ولذّت کا حاصل ہونا ایک نعمت ہے، اور نہ ہونا دوسری نعمت ہے، جس کا نام "مجاہدہ" ہے، یہ دوسری نعمت "انفع" ہے گو "الذ" نہ ہو۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۵)

یعنی اگر ذکر کے دوران آدمی کو لذت حاصل ہو رہی ہے تو یہ نعمت ہے، اگرچہ مقصود نہیں ہے، اور اگر لذت حاصل نہیں ہو رہی ہے تو یہ دوسری نعمت ہے، اس کا نام "مجاہدہ" ہے، یہ بھی ایک نعمت ہے، بلکہ یہ نعمت زیادہ نافع ہے، اس لئے کہ جب مزہ نہیں آرہا ہے اور اس کے باوجود ذکر کر رہا ہے، تو اس کے نتیجے میں وہ مشقت اٹھا رہا ہے، اس لئے اس کو ذکر کا ثواب الگ مل رہا ہے اور "مجاہدہ" کا فائدہ الگ ہو رہا ہے، کیونکہ نفس کے تقاضے کے خلاف کوئی کام کرنا "مجاہدہ" ہے، اور نفس کے تقاضے کے خلاف کام کرنے کی عادت ڈالنے سے انسان کو اپنے نفس پر قابو حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا جب مزے کے بغیر ذکر کرنے میں یہ تین فائدے ہیں تو یہ ذکر زیادہ نافع ہے، لہٰذا ایسے ذکر کو بیکار نہیں سمجھنا چاہئے، ذکر میں مزہ اور لطف آئے تو نعمت، نہ آئے تو نعمت۔

ذکر کے فوائد دو چیزوں پر موقوف ہیں

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

ذکر کا اثر موقوف ہے تقلیل کلام، تقلیل اختلاط مع الانام و قِلت التفات الی التعلقات پر۔ ان چیزوں کے حصول کے لئے مواعظ کا مطالعہ اور مثنوی کا مطالعہ (گو سمجھ میں نہ آئے) کرنا چاہئے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۵)

حضرت فرمارہے ہیں کہ "ذکر" کے جو فوائد اور ثمرات بزرگ بتاتے ہیں، وہ اس وقت حاصل ہوتے ہیں جب انسان "ذکر" کے ساتھ ساتھ دو کام اور کرے، ایک تقلیل کلام، یعنی گفتگو کم کرے اور فضول باتوں سے اجتناب کرے، ضرورت کے مطابق بولے، زیادہ نہ بولے۔ اور بعض مرتبہ اسی سے نفس کی آزادروش کا علاج ہو جاتا ہے۔

بولنے پر پابندی کے ذریعہ ایک صاحب کا علاج

مجھے یاد ہے کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک صاحب آیا کرتے تھے، جو بہت بولتے تھے، جب باتیں شروع کر دیں تو اب رکنے کا نام نہیں ہے، ایک سوال کے بعد دوسرا سوال کرلیا، پھر تیسرا سوال کرلیا، مسلسل بولتے رہتے تھے۔ حضرت والد صاحب چونکہ بہت متواضع اور مسکین آدمی تھے، اس لئے بہت زیادہ روک ٹوک نہیں کرتے تھے، چنانچہ ان صاحب کی باتوں کو برداشت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ان صاحب نے حضرت والد صاحب سے بیعت اور اصلاحی تعلق قائم کرنے کی درخواست کردی کہ حضرت! میرا

دل چاہتا ہے کہ آپ سے اصلاحی تعلق قائم کرلوں اور آپ سے بیعت ہو جاؤں، اور آپ مجھے کچھ ذکر اور نوافل بتادیا کریں۔ حضرت والد صاحب نے ان سے فرمایا کہ اگر تم تعلق قائم کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک ہے، لیکن تمہارے لئے نفل اور ذکر وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر میں کیا کروں؟ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ تمہارا کام یہ ہے کہ تم اپنی زبان پر تالہ ڈال لو، یہ تمہاری زبان جو ہر وقت قینچی کی طرح چلتی رہتی ہے، اس کو بند کرو، اور ضرورت کے مطابق بات کرو، ضرورت سے زائد ایک لفظ بھی زبان سے نہ نکالو، یہی تمہارا علاج ہے، یہی تمہارا وظیفہ ہے، اور یہی تمہاری تسبیح ہے۔ بس ان صاحب پر یہ پابندی لگنی تھی کہ ان پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ اس لئے کہ جو شخص ساری عمر زیادہ بولنے کا عادی رہا ہو، اس پر ایک دم سے بریک لگادیا جائے تو اس کے لئے یہ بڑا سخت مجاہدہ ہوگا۔ چنانچہ اس شخص کیلئے تنہا کم بولنے کا یہی "مجاہدہ" کام کر گیا۔ لہٰذا اس راہ میں "تقلیل کلام" کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالاَ یَعْنِیْهِ۔

(ترمذی، کتاب الزہد، باب نمبر ۱۱)

یعنی انسان کے اسلام کے حُسن میں سے ہے کہ وہ لایعنی اور فضول باتوں سے بچے، بس بوقت ضرورت بولے۔ فرمایا کہ جب تک ذکر کے ساتھ "تقلیل کلام" کی صفت نہیں ہوگی، اس وقت تک دنیا میں ذکر کے فوائد کماحقہ حاصل نہیں ہوں گے، البتہ آخرت کا اجر انشاء اللہ مل جائے گا۔

تعلّقات کم کرو

دوسری چیز ہے "تقلیل اختلاط مع الأنام" یعنی لوگوں سے تعلقات کم کرے۔ لوگوں سے بہت زیادہ تعلقات بڑھانا، لوگوں کے ساتھ مجلس آرائی کرنا، ہر وقت ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا، جو آج کل ایک مستقل فن بن گیا ہے، جس کو "پبلک ریلیشن" کہا جاتا ہے، اس فن میں یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگوں سے کس طرح زیادہ سے زیادہ تعلقات بڑھائے جائیں؟ لیکن اصلاح اعمال واخلاق کی اس راہ میں لوگوں سے تعلقات بڑھانا مضر ہے، بالخصوص ضبط نفس کی مشق کے ابتدائی دور میں، ہاں! اگر کسی سے تعلق ہو تو وہ صرف اللہ کے لئے ہو، گھر والوں سے تعلق ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو، دوستوں سے تعلق ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو، عام مسلمانوں سے تعلق ہو تو وہ اللہ کے لئے ہو، باقی اپنے ذاتی مفاد کے لئے لوگوں سے زیادہ تعلق بڑھانے سے اور ان سے میل جول رکھنے سے ذکر کے فوائد کماحقہ حاصل نہیں ہوتے۔

آنکھ، کان، زبان بند کرلو

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چشم بند و گوش بند و لب ببند
گر نہ بینی نور حق بر من بخند

یعنی تین کام کرلو، ایک یہ کہ آنکھ کو بند کرلو، کس چیز سے بند کرلو؟ ناجائز جگہ پر

نظر پڑنے سے بند کرلو۔ اور دوسرے یہ کہ کان کو بند کرلو، کس چیز سے؟ ناجائز، حرام اور فضول باتیں سننے سے بند کرلو۔ اور تیسرے یہ کہ ہونٹ یعنی زبان کو بند کرلو، کس چیز سے؟ فضول اور ناجائز باتیں کرنے سے بند کرلو۔ اس کے بعد بھی اگر نورِ حق نظر نہ آئے تو میرے اوپر ہنس دینا، یعنی ان تین چیزوں کے بند کرنے کے نتیجے میں لازماً نور حق نظر آئے گا۔ بہر حال! ذکر کے جو فوائد ہیں، مثلاً نور حق کا نظر آنا، یہ اس لئے حاصل نہ ہوا کہ ذکر کے ساتھ جو کام کرنا چاہئے تھا یعنی "تقلیل کلام، اور "تقلیل اختلاط مع الانام" وہ نہیں ہوا، اس کے نتیجے میں ذکر کے فوائد بھی حاصل نہ ہوئے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ اگر ذکر کے فوائد حاصل کرنے ہیں تو ذکر کے ساتھ ساتھ ان چیزوں پر بھی عمل کرنا ہوگا۔

تعلّقات کی طرف التفات زیادہ نہ ہو

تیسری چیز ہے "قِلّت التفات الی التعلقات" یعنی ایک طرف تو لوگوں سے تعلقات ہی کم رکھو، اور اگر کسی سے تعلق ہو بھی تو اس تعلق کی طرف التفات زیادہ نہ ہو، مثلاً یہ نہ سوچے کہ اس کام کو کرنے سے فلاں ناراض ہو جائے گا، یا فلاں راضی ہو جائے گا، اس فکر میں مت پڑو، ارے مخلوق کے راضی ہونے یا ناراض ہونے کی فکر میں مت پڑو، فکر اس کی کرو کہ خالق راضی ہو جائے۔ اگر یہ تین باتیں حاصل ہو جائیں تو پھر انشاء اللہ ذکر کے فوائد حاصل ہو جائیں گے۔

ان تین چیزوں کو حاصل کرنے کا طریقہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تین چیزیں، یعنی "تقلیل کلام" (کم گوئی) اور "تقلیل اختلاط مع الانام" (کم آمیزی) اور "قِلت التفات الی التعلقات" (تعلقات سے قدرے بے توجہی) یہ سب چیزیں کس طرح حاصل ہونگیں؟ اس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ بیان فرمایا کہ مواعظ کا مطالعہ کیا جائے اور مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی "مثنوی" کا مطالعہ کیا جائے، ساتھ میں یہ بھی فرمادیا کہ چاہے وہ "مثنوی" سمجھ میں بھی نہ آئے، تب بھی اس کا مطالعہ کیا جائے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بعض بندوں کے کلام میں تاثیر رکھ دیتے ہیں۔

"مثنوی" کلام وہبی ہے

کہا جاتا ہے کہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر و شاعری سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ خواجہ شمس الدین تبریزی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یا اللہ! آپ نے میرے دل پر جو علوم وارد فرمائے ہیں، اس کے لئے کوئی زبان عطا فرمایئے، چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ان کے مرید ہوئے، اور پھر ان کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے "مثنوی" جاری فرمادی۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی شعر نہیں کہے تھے لیکن شیخ کی دعا کے بعد ان کی زبان پر یہ اشعار جاری ہوگئے اور مثنوی کے دفتر کے دفتر لکھ دئے، اور جب اللہ تعالیٰ کو منظور نہ ہوا شعر آنا بند ہوگئے،

یہاں تک کہ آخر میں انہوں نے ایک حکایت لکھنی شروع کی تھی، وہ حکایت بھی پوری نہیں ہوئی، اور درمیان میں ہی شعر آنا بند ہو گئے، اور اس حکایت کو ادھورا ہی چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر کئی صدیوں کے بعد ہندوستان کے مفتی الٰہی بخش صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے یہ اشعار جاری فرما دیئے۔ چنانچہ اسی جگہ سے آگے انہوں نے اشعار کہنا شروع کئے، اور اس آخری دفتر کو پورا فرمایا، اسی وجہ سے وہ "خاتم مثنوی" کہلاتے ہیں۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے اس کلام کو ان کی زبان پر جاری فرمایا تو جاری ہو گیا اور جب بند کیا تو بند ہو گیا۔ بہر حال یہ الفاظ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہیں، اس میں ایک خاص برکت اور اثر ہے، یہ تاثیر بھی اللہ تعالیٰ ہی ڈالتے ہیں۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مثنوی کا مطالعہ کرو، چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے، کیونکہ اس کو پڑھنا فائدے سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۳۹

ملکۂ یادداشت کا مطلب

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳
مجلس نمبر : ۳۹
صفحات : ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

مجلس نمبر ۳۹

”ملکۂ یادداشت“ کا مطلب

اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ

الحمدللہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، والصّلاة والسّلام عِلٰی رسوله الکریم، وعلیٰ آله وأصحابه أجمعین، امابعد!

نماز کے اندر نہ ذکر لسانی چاہئے نہ ذکر قلبی

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

نماز میں نہ ذکر لسانی کرے اور نہ قلبی، خود توجہ الی الصلاۃ اس میں مطلوب ہے۔ ”قلب جاری ہونا“ کوئی اصطلاح فن کی نہیں، مطلوب ذکر میں ”ملکۂ یادداشت“

ہے، خواہ اس کا کچھ ہی نام ہو۔

(انفاس عیسیٰ ص۶۶)

یعنی نماز کے اندر جو ذکر ہے اور جو قرأت ہے، بس نماز کے اندر اسی کو ادا کرنا چاہئے، اس کے علاوہ نماز کے اندر کسی اور ذکر کی نہ تو ضرورت ہے اور نہ گنجائش ہے۔ اور نماز کے جو ارکان ایسے ہیں جن میں انسان خاموش رہتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص امام کے پیچھے سرّی نماز پڑھ رہا ہے جیسے ظہر کی نماز کی نیت باندھ کر امام کے پیچھے کھڑا ہو گیا، تو اب صرف امام کو قرأت کرنی ہے اور مقتدی کو خاموش رہنا ہے۔ ایسے موقع کے بارے میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ اس موقع پر ذکر لسانی اور ذکر قلبی کی ضرورت نہیں، بلکہ اس موقع پر نماز کی طرف متوجہ رہے، مثلاً جب ظہر کی نماز کی نیت امام کے پیچھے باندھ لی تو اب امام کے پیچھے قرأت کرنا تو جائز نہیں، لیکن اس وقت دل دل میں سورۃ کا تصور کرلے، البتہ اگر اس وقت کسی ذکر کا تھوڑا بہت تصور آ جائے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، مثلاً ''سبحان اللہ'' کا تصور آ جائے، یا ''الحمد للہ'' کا تصور آ جائے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، لیکن باقاعدہ اس تصور کا اہتمام نہ کرے، بلکہ اس وقت صرف نماز کی طرف توجہ رکھے، اس لئے کہ نماز کے اندر خود ''توجہ الی الصلاۃ'' مطلوب ہے۔ لہٰذا اس مطلوب کو حاصل کرنا چاہئے۔

قلب جاری ہونا

"قلب جاری ہونا کوئی اصطلاح فن کی نہیں" جیسے لوگ کہتے ہیں کہ فلاں کا قلب جاری ہو گیا۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ یہ اصطلاح فن کی نہیں ہے، لوگوں نے اپنی طرف سے یہ اصطلاح بنالی ہے، اور خدا جانے وہ لوگ قلب جاری ہونے کا کیا مطلب لیتے ہیں، اصل چیز جو مطلوب ہے وہ "ملکۂ یاد داشت" ہے اور ذکر میں مطلوب بھی یہی ملکۂ یاد داشت ہے، اب اس کا نام کچھ بھی رکھ لیں۔

"ملکۂ یاد داشت" کا مطلب

"ملکۂ یاد داشت" کا مطلب یہ ہے کہ دل ہر وقت اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہے اور اکثر و بیشتر اوقات دل اللہ کا ذکر کرے یا اس کی طرف متوجہ رہے، اور اس کے نتیجے میں غیر اللہ سے توجہ ہٹی ہوئی ہو، اسی کو "ملکہ یاد داشت" کہا جاتا ہے، اسی کے نتیجے میں بالآخر "نسبت مع اللہ" حاصل ہو جاتی ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو "نسبت" حاصل ہو گئی، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کثرت ذکر اور دوام طاعت حاصل ہو گئی، یعنی وہ شخص کثرت سے ذکر کرتا ہے، اور اکثر اوقات اس کو اللہ جل شانہ کا دھیان رہتا ہے اور طاعت پر مداومت کئے ہوئے ہے، جو فرائض اور واجبات اور سنتیں ہیں ان کو صحیح طور پر بجالاتا ہے اور گناہوں سے اجتناب کرتا ہے، یہ سب چیزیں "نسبت مع

اللہ'' حاصل ہونے کی علامتیں ہیں۔

بہر حال! ذکر کا اصل مقصد ''ملکۂ یاد داشت'' کا حصول ہے کہ انسان کام کچھ بھی کر رہا ہو، لیکن دل اللہ تعالیٰ کی طرف لگا ہوا ہو۔ اس وقت یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ ؎

دست بکار دل بیار

ایسا نہیں ہے کہ یہ چیز حاصل نہ ہو، بلکہ جب اللہ تعالیٰ عطا فرما دیتے ہیں تو حاصل ہو جاتی ہے۔

خالق اور مخلوق دونوں سے تعلق پر تعجب

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب عارفی قدس اللہ سرہ سے سنا، وہ اپنے شیخ حکیم الامّت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد نقل کرتے تھے کہ ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ پہلے مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوتا تھا کہ حضور نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ جل شانہ کے ساتھ جس طرح ہر آن اور ہر وقت براہ راست تعلق قائم تھا، وحی نازل ہو رہی ہے، اور ہر وقت اللہ جل شانہ کا دھیان اور خیال مستحضر ہے، اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کی تجلیات ہر وقت آپ پر ہو رہی ہیں، مجھے پہلے اس پر تعجب ہوتا تھا کہ جس شخص کی یہ کیفیت ہو وہ کیسے دنیا والوں سے بات کر لیتا ہے؟ وہ کیسے ازواج مطہرات کے ساتھ خوش طبعی کی باتیں کر لیتا ہے؟ وہ کیسے بچوں کے ساتھ کھیل لیتا ہے؟ ایسی

ذات کو تو دوسری مخلوقات کی طرف دھیان نہیں ہونا چاہئے۔

پھر فرمایا کہ لیکن اب الحمد للہ معلوم ہو گیا کہ یہ دونوں کام جمع ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ اب خود میری کیفیت یہ ہے کہ الحمد للہ ہر وقت اللہ جل شانہ کے ساتھ رشتہ جڑا ہوا ہے اور اس کے باوجود دنیا والوں سے تعلق بھی قائم ہے، دنیا والوں سے ملنا جلنا بھی ہو رہا ہے، اب دیکھنے والا یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ شخص بیوی بچوں کے ساتھ ہنس بول رہا ہے، دوست و احباب کے ساتھ خوش طبعی کی باتیں کر رہا ہے، لیکن حقیقت میں اس کا دل اللہ تبارک و تعالیٰ کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ اور یہ کیفیت اس کو حاصل ہے کہ:

دست بکار دل بیار

بہر حال! اسی کا نام "ملکۂ یاد داشت" ہے کہ انسان کو ہر وقت اللہ تعالیٰ کا تصور اور دھیان رہے، اسی کے ساتھ تعلق رہے، اور اگر دوسروں کے ساتھ تعلق ہو تو وہ تبعاً اور ضمناً ہو اور اسی ذات کے واسطے سے ہو۔

مبتدی اور منتہی کی حالت یکساں ہوتی ہے

ایک جگہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی: فرمایا کہ مبتدی اور منتہی دونوں کی ظاہری حالت یکساں ہوتی ہے، یعنی جس شخص نے ابھی اس راستے میں قدم رکھا ہے، اس کی ظاہری حالت، اور وہ شخص جو راستہ قطع کر کے اعلیٰ مقامات پر پہنچ چکا، اس کی ظاہری حالت دیکھنے میں برابر ہوتی ہے، مبتدی بھی بیوی بچوں سے ہنس بول رہا ہے، اور منتہی بھی

بیوی بچوں کے ساتھ ہنس بول رہا ہے، جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت اپنی بیوی کو گیارہ عورتوں کا قصہ سنا رہے ہیں کہ گیارہ عورتیں تھیں، جنہوں نے آپس میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ ہر عورت اپنے اپنے شوہر کا حال بیان کرے اور کوئی بات نہ چھپائے، اور ہم آپ بھی بیوی بچوں کو کہانیاں سناتے ہیں۔ اب دیکھنے میں مبتدی اور منتہی کی حالت یکساں ہے، لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

درمیان والے کی حالت

اور جو راستے کے درمیان میں ہوتے ہیں، ان کی حالت دونوں سے مختلف ہوتی ہے، ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ وہ اگر ذکر کے اندر مشغول ہیں اور ان کے صاحبزادے ان سے ملنے کے لئے گئے اور جاکر کہا "السلام علیکم" اب والد صاحب اس وقت حالت استغراق میں ہیں، اب وہ اپنے صاحبزادے سے پوچھ رہے ہیں کہ تو کون ہے؟ کیا نام ہے؟ گویا کہ صاحبزادے کو پہچاننے سے بھی انکار کر دیا۔

حالانکہ ان کی اولاد ہے، لیکن اس کو نہیں پہچان رہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے تصور میں اس درجہ استغراق اور اس درجہ محو ہیں کہ اپنی اولاد بھی پہچانی نہیں جارہی ہے۔ اب بظاہر یہ استغراق والا شخص بہت اعلیٰ درجے پر نظر آتا ہے کہ وہ اس درجہ اللہ تعالیٰ کی ذات میں مستغرق ہے کہ دوسرے کو پہچان بھی نہیں رہا ہے۔

آپ کا بچوں سے پیار کرنا

دوسری طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عالم ہے کہ مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے ہیں، حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد میں آ گئے، آپ منبر سے اترے اور جا کر ان کو گود میں اٹھالیا اور ان کو پیار کر رہے ہیں۔

تیرے دل سے رحمت نکال دی

ایک اعرابی تھے جن کا نام اقرع بن حابس تھا، انہوں نے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بچوں کو پیار کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے کہا کہ میرے دس بچے ہیں، میں نے آج تک کسی بچے کو پیار نہیں کیا اور آپ پیار کر رہے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تیرے دل سے رحمت نکال دی جس کے نتیجے میں تو بچوں سے پیار نہیں کرتا تو میں کیا کروں؟ مطلب یہ تھا کہ رحمت کا تقاضہ یہ ہے کہ بچوں سے پیار کیا جائے۔ بہر حال! مبتدی اور منتہی دونوں کی حالت بظاہر دیکھنے میں یکساں اور ادنیٰ معلوم ہوتی ہے، اور جو درمیان میں ہے اور عالم استغراق میں ہے اس کی حالت اعلیٰ معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

تینوں حالتوں کی مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ان تینوں حالتوں کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں۔ فرمایا کہ ایک دریا ہے، ایک آدمی دریا کے اِس کنارے دریا پار

کرنے کے ارادے سے کھڑا ہے، اور دوسرا شخص دریا کے اُس کنارے کھڑا ہے اور دریا پار کر چکا ہے، اور تیسرا شخص دریا کے بیچ میں موجوں سے کھیل رہا ہے اور تیر رہا ہے اور ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ اب بظاہر دیکھنے میں یہ شخص جو اِس کنارے پر کھڑا ہے اور وہ شخص جو اُس کنارے پر کھڑا ہے دونوں برابر اور یکساں نظر آرہے ہیں، اس لئے کہ یہ بھی خشکی میں ہے اور وہ بھی خشکی میں ہے، لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، اس لئے کہ جو شخص دریا کے اس کنارے پر ہے، اس نے تو ابھی تک دریا میں قدم رکھا ہی نہیں ہے، اور جو شخص دوسرے کنارے پر ہے وہ تو دریا کی موجوں کو چیرتے ہوئے اور ان سے کھیلتے ہوئے دوسرے کنارے تک پہنچ چکا ہے۔ البتہ وہاں پہنچنے کے بعد اس کی ظاہری حالت اس شخص کی طرح ہو گئی جو اس کنارے پر کھڑا ہے، لیکن وہ سارے مراحل سے گزر چکا ہے۔

اور جو درمیان میں ہے اور موجوں سے کھیل رہا ہے، وہ دونوں کے مقابلے میں بڑا زبردست نظر آرہا ہے۔ اسی لئے فرمایا کہ مبتدی اور منتہی دونوں کی حالت دیکھنے میں ایک جیسی ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں دونوں کے درمیان فرق ہوتا ہے، وہ فرق یہ ہوتا ہے کہ مبتدی بھی بیوی بچوں سے ہنس بول رہا ہے اور منتہی بھی بیوی بچوں سے ہنس بول رہا ہے، لیکن مبتدی اپنے نفس کے حظ کے خاطر ہنس بول رہا ہے اور لذت حاصل کرنے کے لئے ہنس بول رہا ہے، اسلئے کہ ان سے براہ راست تعلق قائم ہے۔ منتہی جو بیوی بچوں کے ساتھ ہنس بول رہا ہے، وہ اللہ جل شانہ کے تعلق کی وجہ سے ہنس بول رہا ہے، اصل

تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، اور اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان بیوی بچوں کے حقوق ادا کرو، ان حقوق کی ادائیگی کے لئے ان کے ساتھ ہنس بول رہا ہے۔ اور ہمارا اور آپ کا تعلق بیوی بچوں سے براہ راست ہے، ان سے محبت اور تعلق ہے، ان سے لذت اندوزی اور لطف اندوزی کا جذبہ ہے، اس کی وجہ سے یہ سب کام کر رہے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات سے اور بچوں سے اور دوسروں سے جو تعلق قائم فرما رہے ہیں، وہ سارا تعلق اللہ جل شانہ کے واسطے سے ہے۔

ایک بزرگ کا جنّت سے اعراض کرنا

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب ان کا انتقال کا وقت قریب آیا تو ان کے سامنے جنّت پیش کی گئی، جنّت کے باغات اور محلّات کی سیر کرائی گئی اور ان سے کہا گیا کہ یہ تمہارا مقام ہے جو مرنے کے بعد تمہیں ملنے والا ہے۔ ان بزرگ نے جنّت دیکھ کر منہ دوسری طرف موڑ لیا اور یہ شعر پڑھا۔

إن كَانَ مَنْزِلَتِيْ بِالْحُبِّ عِنْدَ كُمْ

مَاقَدْ رَأَيْتَ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِيْ

یعنی اگر میری محبّت کا صلہ یہی باغات اور محلّات، پھل، فروٹ، یہ درخت، یہ سبزہ وغیرہ ہیں، جو آپ مجھے دکھا رہے ہیں، تو میں نے اپنی عمر ضائع کر دی۔ مجھے یہ چیزیں نہیں چاہئیں، اس لئے کہ میری محبّت کا مقصود یہ جنّت نہیں

تھی، یہ جنّت کے محلات اور باغات نہیں تھے، بلکہ میری محبت کا مقصود تو آپ تھے، آپ کا دیدار تھا، آپ کی رضامندی تھی، آپ کا وصال اور آپ کا قرب تھا۔ اس طرح جنّت سے اعراض کیا۔ ایک حالت یہ ہے۔

حضور ﷺ کا جنّت طلب کرنا

دوسری طرف حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت ہے کہ جب دعا مانگ رہے ہیں تو فرمار ہے ہیں:

اَللّٰھُمَ اِنی أسئلك رضاك والجنّة

اے اللہ! میں آپ کی رضامندی اور جنّت چاہتا ہوں۔

اب وہ بزرگ تو جنّت سے منہ موڑ رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مجھے یہ جنّت نہیں چاہئے، مجھے تو آپ کی رضا چاہئے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے جنّت مانگ رہے ہیں۔

ہمارے اور حضور ﷺ کے جنّت کی طلب میں فرق

یہ فرق در حقیقت مبتدی اور منتہی اور درمیان والے کا ہے، ہم بھی اللہ تعالیٰ سے جنّت مانگتے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی جنّت مانگا کرتے تھے، البتہ جو درمیان میں ہیں، انہوں نے کہہ دیا کہ ہمیں جنّت نہیں چاہئے۔ لیکن ہمارے جنّت مانگنے میں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جنّت مانگنے میں فرق ہے، ہم تو اس لئے جنّت مانگ رہے ہیں کہ وہاں پر نفس کی

خواہشات پوری ہوں گی، بڑے مزے کے کھانے ہوں گے، پھل ہوں گے، رہنے کے لئے محلات ہوں گے، باغات ہوں گے، بڑی خوش منظر جگہ ہو گی، ان چیزوں کی وجہ سے ہم جنت مانگ رہے ہیں۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جنت کی ذاتی لذتوں کی وجہ سے جنت نہیں مانگ رہے تھے، بلکہ جنت اس لئے مانگ رہے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رضا کی علامت ہے، باری تعالیٰ کی خوشنودی کا ایک نشان اور مظہر ہے، اس لئے جنت مانگ رہے تھے۔

نگاہ دینے والے ہاتھ پر تھی

دوسری وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا جنت مانگنے سے اس جنت کی ذات مقصود نہیں تھی بلکہ جس ذات کی طرف سے وہ جنت مل رہی تھی وہ ذات عزیز تھی۔ میں اُس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں وہ یہ کہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں جب عید کا دن آتا تو ہم سب بھائی حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حضرت والد صاحب ہم سب کو عیدی دیا کرتے تھے، سب اولاد برسر روزگار، کھاتی پیتی، ایسی کہ دوسروں کو بھی عیدی دے، لیکن عید کے روز جب والد صاحب کے پاس سب جمع ہوتے تو خوب مچل مچل کر عیدی مانگا کرتے تھے، والد صاحب فرماتے کہ اس مرتبہ بیس روپے لے لو، ہم کہتے کہ نہیں اب گرانی کا زمانہ آگیا ہے، اب کے بار پچیس روپے لیں گے یا تیس روپے لیں گے، اب پانچ دس روپے پر جھگڑا ہوتا تھا، بڑا مزہ آتا تھا، حضرت والد صاحب فرماتے

کہ تم سب چور ڈاکو جمع ہو گئے ہو اور مجھے لوٹ لو گے، ہم کہتے کہ نہیں، ہم تو پچیس روپے ہی لیں گے۔

حالانکہ اس وقت ہم میں سے کوئی بھائی ایسا نہیں تھا جو ذرا دیر میں پچیس روپے خرچ نہ کر سکتا ہو۔ اگر کوئی مانگنے آئے تو دن میں دس مرتبہ پچیس روپے نکال کر دیدیں۔ لیکن والد صاحبؒ سے پچیس روپے وصول کرنے کے لئے لڑ رہے ہیں، مچل رہے ہیں، اگر نہیں مل رہے ہیں تو باقاعدہ اصرار کر کے لے رہے ہیں۔ کیوں؟ کیا یہ پچیس روپے مقصود تھے کہ اگر یہ پچیس روپے مل جائیں گے تو بڑا مزہ آئے گا اور اس سے فلاں چیز خرید کر کھائیں گے؟ اس لئے پچیس روپے لے رہے ہیں۔ بلکہ بات دراصل یہ تھی کہ وہ پچیس روپے بذات خود مقصود نہیں تھے، بلکہ وہ پچیس روپے اس لئے عزیز تھے کہ وہ دینے والا ہاتھ عزیز تھا، کہ اس ہاتھ سے جو چیز ملے گی وہ عظیم الشان ہو گی، اس لئے نگاہ اس روپے پر نہیں، بلکہ نگاہ اس دینے والے ہاتھ پر تھی، اس لئے مچل مچل کر مانگا کرتے تھے۔

جنّت رضائے خداوندی کی ایک علامت ہے

بہرحال! جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ الْجَنَّۃَ

اے اللہ! میں آپ سے جنّت کا سوال کرتا ہوں۔

یہ جنّت کا مانگنا، جنّت کی ذاتی لذتوں کی وجہ سے نہیں تھا، بلکہ دینے والی ذات کی

وجہ سے تھا کہ یا اللہ! یہ جنت چونکہ آپ کی رضا کا نشان ہے، یہ آپ کی رضا کی علامت ہے، اور آپ نے جنت کو اپنی رضا کا مظہر بنایا ہے، اس لئے ہم محتاج بن کر جنت مانگ رہے ہیں، ہم اس سے استغناء ظاہر نہیں کر سکتے۔

مچل مچل کر مانگو

بندگی کا تقاضہ یہی ہے کہ جب کہا جا رہا ہے کہ ہم سے مانگو تو پھر مچل مچل کر مانگو۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چوں طمع خواھد زمن سلطانِ دین
خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں

جب وہ کہہ رہے ہیں کہ طمع اور لالچ کرو، کیا اس وقت بھی تم استغناء اور بے نیازی کا مظاہرہ کرو گے؟ ارے اس وقت قناعت کا طریقہ اختیار نہیں کرنا بلکہ اس وقت تو محتاج بن کر مانگو۔

حضرت ایوبؑ کا سونے کی تتلیاں جمع کرنا

حضرت ایوب علیہ السلام ایک مرتبہ غسل فرما رہے تھے، غسل کے دوران آسمان سے سونے کی تتلیاں گرنی شروع ہو گئیں، اب حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کرنا چھوڑ دیا اور تتلیاں پکڑنی شروع کر دیں۔ اللہ تعالیٰ نے پوچھا کہ یہ کیا کر رہے ہو؟ تم سونے کے پیچھے بھاگ رہے ہو؟ کیا اب تک دنیا کی حرص دل میں ہے؟ سبحان اللہ! اس وقت انہوں نے کیا خوب صورت

جواب دیا، فرمایا کہ:

اَللّٰھُمَّ لاَ غِنیً بِیْ عَنْ بَرَکَتِكَ

اے اللہ! جب آپ نازل فرما رہے ہیں تو آپ کی نازل کی ہوئی برکت سے مجھے کبھی استغناء نہیں ہو سکتا، میں تو آپ کی اس برکت کا محتاج ہوں، جب آپ نازل فرما رہے ہیں تو میں تو محتاج بن کر اس کے پیچھے دوڑوں گا۔ لہٰذا جب اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں تو عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ محتاج بن کر اس کو لے لو۔

ان کی طرف سے روزانہ اعلان ہو رہے ہیں

ان کی طرف سے تو روزانہ رات کو یہ اعلان ہو رہا ہے کہ ہے کوئی مغفرت مانگنے والا جس کی میں مغفرت کروں؟ ہے کوئی رزق مانگنے والا جس کو میں رزق دوں؟ ہے کوئی مبتلائے مصیبت جس کو میں عافیت دوں؟ ان کی طرف سے یہ اعلان ہو رہے ہیں اور آپ جواب میں فرما رہے ہیں کہ مجھے ضرورت نہیں، میں تو مستغنی ہوں۔ معاذ اللہ۔ ارے آپ کس ذات سے استغناء ظاہر کر رہے ہیں، اور یہ کہہ رہے ہیں کہ جو وہ خود دیں گے تو لے لوں گا، خود سے نہیں مانگوں گا، ارے جب وہ کہہ رہے ہیں کہ مانگو تو پھر مانگنا ہی ضروری ہے، یہی عبدیت کا تقاضہ ہے۔

ان کی رحمت سے استغناء نہ ہو

اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ؎

چیزیکہ بے طلب رسد آن دادۂ خدا است
اورا تو رد مکن کہ فرستادۂ خدا است

جب اللہ تعالیٰ کوئی چیز بے طلب کے عطا فرمادیں تو اس کو رد نہ کرو، اس لئے کہ وہ چیز اللہ کی بھیجی ہوئی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے استغناء نہیں ہوا کرتا، اور یہ استغناء عبدیت کا تقاضہ نہیں ہے۔

وہ بزرگ مغلوب الحال تھے

لہٰذا وہ بزرگ جنہوں نے جنّت کو دیکھ کر منہ پھیر لیا تھا، ان کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ مغلوب الحال تھے، ان کے بارے میں بھی کوئی گستاخی کا کلمہ نہیں نکالنا چاہئے، اور غلبۂ حال میں یہ جملہ انہوں نے کہہ دیا، ورنہ بندے کا کام یہ نہیں ہے، بندے کا کام یہ ہے کہ وہ یہ کہے:

اَللّٰھُمَّ اِنی أسئلك رضاك والجنّة۔

یعنی اے اللہ! مجھے آپ کی رضا چاہئے اور جنّت چاہئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے جنّت مانگے۔

بہرحال! حضرت والا نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ ذکر میں اصل مقصود

"ملکہ یاد داشت" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر کا اس طرح دل میں جم جانا اور بیٹھ جانا کہ چلتے پھرتے ہر وقت ان کی یاد اور ان کی فکر دل میں موجود رہے۔

چار چیزوں کی عادت ڈال لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ "ملکہ یادداشت" ویسے تو بڑے بڑے مجاہدات اور ریاضتوں کے بعد حاصل ہوتا ہے، لیکن صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ایک "طریق القلندر" ہوتا ہے، اس کے ذریعہ چپکے چپکے بیٹھے بیٹھے یہ "ملکہ یادداشت" حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ "طریق القلندر" یہ ہے کہ چار چیزوں کی عادت ڈال لو:

۱۔ موافق طبیعت امور پر شکر

جو بھی موافق طبیعت کوئی کام سامنے آئے اس پر شکر ادا کرو، مثلاً ہوا کا جھونکا آیا اور اچھا لگا، کہو:

الحمدللّٰہ، اللّٰھُمَّ لکِ الحمد ولك الشکر۔

گھر میں داخل ہوئے، بیوی بچوں کو بعافیت پایا، کہو:

اللّٰھُمَّ لك الحمد ولك الشکر

دستر خوان پر بیٹھے، کھانا سامنے آیا، کہو:

اللّٰھُمَّ لك الحمد ولك الشکر

بچہ کھیلتا ہوا اچھا معلوم ہوا، کہو:

اللّٰهُمَّ لك الحمد ولك الشكر

ہر وقت چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے اس کی رٹ لگاؤ۔

۲۔ خلاف طبیعت کاموں پر صبر

جو کام طبیعت کے خلاف سامنے آئے، اس پر صبر کرو، مثلاً بجلی چلی گئی، ناگواری ہوئی، کہو:

اِنَّا للّٰه وانا اليه راجعون

گرمی لگ رہی ہے، کہو:

اِنَّا لِلّٰهِ وانا اليه راجعون

کوئی تکلیف پہنچی، کہو:

اِنَّا لِلّٰهِ وانا اليه راجعون

پاؤں میں کانٹا چبھا، کہو:

اِنَّا لِلّٰهِ وانا اليه راجعون

اس کی عادت ڈالو۔

۳۔ ماضی کے گناہوں پر استغفار

جب ماضی میں کئے ہوئے کسی گناہ کا یا کسی برائی کا خیال آئے تو اس پر استغفار کرو۔ کہو:

استغفر اللّٰه ربِّی من کل ذنب وأتوب الیه۔

گزشتہ کل مجھ سے یہ گناہ ہوا تھا، کہو:

استغفر اللّٰه ربِّی من کل ذنب وأتوب الیه۔

فجر کی نماز نہیں پڑھی، کہو:

استغفر اللّٰه ربِّی من کل ذنب وأتوب الیه۔

فلاں وقت جھوٹ بولا تھا، کہو:

استغفر اللّٰه ربِّی من کل ذنب وأتوب الیه۔

۴۔ مستقبل کے اندیشوں پر استعاذہ

مستقبل میں کسی اندیشے اور خطرے کا خیال آئے تو استعاذہ کرو اور کہو:

اللّٰهم انی اعوذ بك من شره

مال خرید لیا اور اب تجارت میں نقصان ہونے کا اندیشہ اور خیال آرہا ہے، کہو:

اللّٰهم انی اعوذ بك من شره

کل کیا ہوگا، پرسوں کیا ہوگا، کہو:

اللّٰهم انی اعوذ بك من شره

یااللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں۔

ہر وقت اللہ سے مانگتے رہو

لہٰذا یہ چار کام کرتے رہو، شکر، صبر، استغفار، استعاذہ۔ اور پانچواں کام

یہ ہے کہ دعا کرتے رہو اور ہر وقت اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے اللہ میاں سے کچھ نہ کچھ مانگتے رہو، مثلاً آپ کسی سے ملاقات کے لئے جارہے ہیں، کہو: یا اللہ! میں فلاں آدمی سے ملاقات کے لئے جارہا ہوں، یا اللہ! وہ مل جائے۔ گرمی لگ رہی ہے، کہو: یا اللہ! گرمی لگ رہی ہے، اس کو دور فرمادے۔ یا اللہ! پیاس لگ رہی ہے، پانی عطا فرمادے۔ ہر چیز اللہ سے مانگو، سبق پڑھنے جارہے ہو، کہو: یا اللہ! سبق کو آسان فرمادے، سبق سمجھ میں آجائے اور استاذ صحیح وقت پر آجائیں۔ سبق پڑھانے جارہے ہو تو کہو: یا اللہ! اچھے طریقے سے سبق پڑھانے کی توفیق عطا فرمادے۔ یا اللہ! صحیح بات دل میں ڈال دے، تاکہ طلبہ کو اچھی طرح سمجھادوں۔ جو کام کرنے جارہے ہو، جاتے جاتے دعا کرتے چلے جاؤ۔ دعا کی کثرت کرو۔

چپکے سے دعا کر لیتا ہوں

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ تعالیٰ سرہ فرماتے ہیں کہ جب کبھی کوئی شخص آکر یہ کہتا ہے کہ ایک مسئلہ پوچھنا ہے یا ایک بات پوچھنی ہے تو حضرت فرماتے ہیں کہ کبھی تخلف نہیں ہوتا کہ جیسے ہی کسی نے کہا کہ ایک مسئلہ پوچھنا ہے فوراً اللہ تعالیٰ سے دل دل میں دعا کر لیتا ہوں کہ یا اللہ! معلوم نہیں کیا مسئلہ پوچھے گا، یا اللہ! یہ جو سوال کرے اس کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دے۔ یہ ہے "ملکۂ یادداشت" لہٰذا چھوٹی چھوٹی بات پر چھوٹے چھوٹے کاموں پر اللہ تعالیٰ سے دعا کر لیا کرو۔

ملکۂ یاد داشت حاصل کرنے کا چٹکلہ

یہ "ملکۂ یاد داشت" حاصل کرنے کا چٹکلہ ہے، اس پر عمل کرنے سے اور اس کی پابندی کرنے سے اللہ تعالیٰ اس کو آسان فرما دیتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں "ملکۂ یاد داشت" حاصل ہو جاتا ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کہاں کرو گے وہ مجاہدات اور ریاضتیں جیسے پہلے لوگ کیا کرتے تھے، اس ملکۂ یاد داشت کو حاصل کرنے کے لئے کیا کچھ پاپڑ بیلنے پڑتے تھے، مہینوں اور سالوں خانقاہوں میں جا کر رہتے تھے، اور مشائخ ان سے مشقت والے کام کروایا کرتے تھے، اب تمہارے اندر مشقت برداشت کرنے کی طاقت کہاں؟ اگر کسی شیخ نے ذرا سی مشقت ڈال دی تو اسی وقت بھاگ کھڑے ہو گے، اب وہ طاقت اور وہ قویٰ نہیں رہے، اس لئے کہاں وہ مجاہدات اور ریاضتیں کرو گے۔

لیکن اس چٹکلے پر عمل کر لو، یعنی شکر ادا کرو، صبر کرو، استغفار کرو، اور استعاذہ کرو، اور دعا کی کثرت کرو، اور چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے دعا کی رٹ لگاؤ اور اس کی عادت کر لو، تو اس کے نتیجے میں "ملکۂ یاد داشت" کا مقصود فی الجملہ حاصل ہونے لگتا ہے، اس سے پھر اکثر اوقات اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۴۰

اللہ کا راستہ کمزوروں کیلئے بھی ہے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۴۰

صفحات : ۱۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

مجلس نمبر ۴۰

اللہ تعالیٰ کا راستہ کمزوروں کے لئے بھی ہے

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، والصّلاة والسّلام علیٰ رسوله الکریم، وعلیٰ آله وأصحابه أجمعین، امابعد!

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

اگر کوئی رمضان شریف تک کے لئے اپنے معمولات بڑھالے اور آئندہ دوام کی امید نہ ہو تو یہ خلاف دوام نہیں، کیونکہ اوّل ہی سے دوام کا قصد نہیں، حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اعمال رمضان میں زیادہ ہو جاتے تھے۔

(انفاس عیسیٰ ص ٦٦)

معمولات کی پابندی ضروری ہے

صوفیاء کرام، بزرگان دین اور علماء کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ انسان جو معمول بنائے اس کی پابندی کرے، تھوڑا عمل ہو لیکن اس کو پابندی اور دوام کے ساتھ کیا جائے، اس میں زیادہ ثواب ہے بنسبت اس عمل کے جو زیادہ ہو لیکن گنڈے دار ہو کہ کبھی کر لیا اور کبھی چھوڑ دیا۔ اس لئے بزرگوں کی تعلیم یہ ہوتی ہے کہ معمول جتنا کم سے کم رکھے، اتنا ہی بہتر ہے، اس لئے کہ اس کی پابندی انسان آسانی سے کر سکتا ہے، اور یہ فرماتے ہیں کہ ایک دم سے بہت زیادہ معمولات اپنے اوپر لازم نہ کرو، مختصر کرو، لیکن اس کی پابندی کرو، تمام بزرگان دین اس کی بہت تاکید فرمایا کرتے تھے۔

حدیث سے استدلال

اس تاکید فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ جب آدمی ایک نفلی کام شروع کرے اور پھر چھوڑ دے، تو یہ طریقہ بے برکتی کا سبب ہوتا ہے، اور تقریباً ناجائز ہے۔ اس کی اصل ایک حدیث ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا:

یا عبداللّٰه لا تکن مثل فلان، کان یقوم من اللیل فترك قیام اللیل۔

(صحیح بخاری، کتاب التہجد، باب مایکرہ من ترک قیام اللیل)

اے عبداللہ! تم فلاں شخص کی طرح مت ہونا جو رات کو

تہجد پڑھا کرتا تھا، پھر بعد میں اس نے تہجد پڑھنا چھوڑ دیا۔

اس حدیث میں اس کی ممانعت فرمائی کہ آدمی نفلی کام شروع کر کے اس کو چھوڑ دے۔

نوافل شروع کرنے کے بعد واجب ہو جاتے ہیں

آپ نے فقہ میں پڑھا ہو گا کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی نفلی عبادت جب تک شروع نہیں کی، اس وقت تک وہ واجب نہیں، اور اس کے ترک کرنے میں کوئی گناہ نہیں، لیکن جب شروع کر دی تو اب اس کی تکمیل واجب ہے۔ مثلاً آپ نوافل پڑھنا چاہ رہے ہیں، اگر ان نوافل کو نہ پڑھیں تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے یہاں گرفت نہیں ہو گی، لیکن اگر آپ نے "اللہ اکبر" کہہ کر دو رکعت نفل کی نیت باندھ لی تو اب دو رکعتوں کو پورا کرنا واجب ہے، ان کو چھوڑنا جائز نہیں، اگر ان کو بلا عذر توڑے گا تو گناہ ہو گا، اور اگر کسی عذر سے توڑے گا تو گناہ نہیں ہو گا، لیکن اس کی قضا دونوں صورتوں میں واجب ہو گی، حالانکہ وہ نفلی عبادت تھی۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس طرح ایک نفلی عبادت شروع کرنے کے بعد اس کی تکمیل واجب ہو جاتی ہے، اسی طرح ایک معمول شروع کرنے کے بعد اس کی پابندی بھی واجب ہو جاتی ہے، پھر اس معمول کو ترک کرنا جائز نہیں ہوتا۔

معمولات کی پابندی تو بڑا مشکل ہے

البتہ چھوڑنے کا مطلب بھی اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے، اس میں بھی بہت سے لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا ہے۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بڑی سخت پریشانی کی بات ہے کہ اگر نفلی عبادت شروع کر دی اور کسی دن وہ چھوٹ گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے چھوٹنے سے گناہ ہوا اور یہ پابندی کے خلاف ہوا، اس پریشانی کا حل بھی حضرت والا نے ہی بیان فرما دیا، کسی اور جگہ نظر سے نہیں گزرا۔

معمول ترک کر دینے کا صحیح مطلب

حضرت والا نے فرمایا کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ کسی معمول کو شروع کرنے کے بعد ترک مت کرو، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ احیاناً بھی کسی وقت وہ معمول ترک نہ ہو، اس لئے کہ احیاناً اور کبھی کبھار وہ معمول چھوٹ جائے تو وہ ترک میں داخل نہیں، بلکہ "ترک" کا مطلب یہ ہے کہ انسان آئندہ ہمیشہ کے لئے اس معمول پر عمل نہ کرنے کا قصد کر لے، کیونکہ جب وہ کام معمول میں داخل کیا تھا، اس وقت یہ ارادہ کیا تھا کہ آئندہ ہمیشہ یہ کام کروں گا، اب اس کا ترک اس طرح ہوگا کہ آدمی یہ قصد کر لے کہ اب آئندہ یہ معمول چھوڑتا ہوں، آئندہ یہ کام نہیں کروں گا۔ تب یہ "ترک" میں داخل ہوگا اور اس حدیث کا مصداق ہوگا جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ:

لا تکن مثل فلان، کان یقوم من اللیل فترك۔

اور اس وقت ترک کا وبال آئے گا۔ لیکن اگر ایک شخص نے معمول بنایا اور پھر کسی دن کمزوری کی وجہ سے یا سستی کی وجہ سے یا غفلت کے سبب وہ معمول چھوٹ گیا تو وہ ترک میں داخل نہیں، انشاء اللہ، اس کے چھوڑنے پر وبال نہیں ہوگا، اس لئے کہ اس کا ارادہ یہ ہے کہ چلو آج یہ معمول رہ گیا کل کو یہ معمول ادا کرلوں گا، لہٰذا یہ معمول کے ترک میں داخل نہیں ہے۔ حضرت والا نے یہ بات ارشاد فرما کر ہم جیسے کمزوروں کے لئے معاملہ آسان فرمادیا، ورنہ معمول چھوٹ جانے سے بڑا ڈر لگتا تھا۔

رمضان میں معمولات بڑھانے پر اندیشہ

بہر حال! صوفیاء کرام نے اور بزرگان دین نے جب یہ فرمایا ہے کہ جو معمول تم نے بنایا ہے اس کی پابندی کرو۔ تو اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب رمضان المبارک کا مہینہ آتا ہے تو رمضان المبارک میں زیادہ عبادت کرنے کو دل بھی چاہتا ہے اور موقع بھی ہوتا ہے اور کرنے کی توفیق بھی ہو جاتی ہے، لیکن بعض اوقات یہ خیال ہوتا ہے کہ اگر اس عبادت کو صرف رمضان کے اندر کیا اور رمضان کے بعد اس کو جاری نہ رکھ سکے تو کہیں اس ترک والی حدیث کے مصداق میں شامل نہ ہو جائیں اور اس کی وجہ سے ترک کی بے برکتی نہ ہو جائے۔

صرف رمضان میں اس پر عمل کروں گا

حضرت والا اس اشکال کا جواب دے رہے ہیں کہ اگر رمضان میں معمولات کے اندر کچھ اضافہ کرلیا ہے، مثلاً رمضان میں عام دنوں کے مقابلے میں نوافل زیادہ پڑھ رہے ہو یا تلاوت زیادہ کر رہے ہو، یا عام دنوں سے زیادہ ذکر کر رہے ہو، یا عام دنوں سے زیادہ تسبیحات پڑھ رہے ہو، تو عام دنوں میں اس معمول پر برقرار نہ رہنے میں کچھ حرج نہیں۔ رمضان میں اس معمول پر عمل کرتے وقت دل میں یہ سوچ لو کہ میں صرف رمضان کی حد تک اس پر عمل کر رہا ہوں، دوام کا قصد نہیں ہے۔ جب دوام کا قصد نہیں تو وہ کام معمول میں شامل نہیں، اور جب معمول میں شامل نہیں تو اگر آئندہ اس پر عمل جاری نہ رکھ سکے تو انشاء اللہ ترک کی بے برکتی حاصل نہیں ہوگی، اس لئے اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔

حدیث سے استدلال

پھر حضرت والا چونکہ ہر بات کی دلیل بھی دیدیتے ہیں، اس لئے اس کی دلیل بھی بیان فرمادی کہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يجتهد في العشر الأواخر مالا يجتهد في غيره۔

(صحیح مسلم، کتاب الاعتکاف، باب الاجتهاد فی العشر الاواخر)

یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے آخری عشرہ میں عبادت کے اندر اتنی محنت فرمایا کرتے تھے کہ عام دنوں میں اتنی محنت نہیں فرماتے تھے، رمضان میں ہمیشہ آپ کی عبادت زیادہ ہوا کرتی تھی۔ اور عشرہ اخیرہ کے بارے میں تو ایک حدیث شریف میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم اذا دخل العشر شد مئزره وأحيى ليله' وأيقظ أهله۔

(صحیح بخاری، کتاب فضل لیلۃ القدر، باب العمل فی العشر الا واخر)

یعنی رمضان المبارک میں آپ ﷺ اپنی ازار (عبادت کے لئے) کس لیتے تھے اور رات کا احیا فرماتے اور گھر والوں کو جگاتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خاص رمضان المبارک کے زمانے میں اگر کوئی شخص اپنے کچھ معمولات بڑھالے جو عام دنوں میں وہ معمولات میں داخل نہیں ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ ذہن میں یہ رہے کہ میں صرف رمضان کی حد تک یہ معمولات کر رہا ہوں، دوام مقصود نہیں۔

کمزور کا تھوڑا عمل بھی کافی ہے

آگے ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

قوی کے عمل کثیر میں جو اثر ہے ضعیف کے عمل قلیل

میں وہی اثر ہے، ضعیف کو اسی عمل قلیل سے بھی انشاء اللہ مقصود میں کامیابی ہو جاتی ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ٦٦)

ایک آدمی بڑا قوی ہے، ہٹا کٹا صحت مند ہے، وہ زیادہ عمل کرتا ہے، جبکہ دوسرا شخص بہت کمزور دبلا پتلا ہے، اس سے زیادہ عمل نہیں ہو پاتا، اس لئے وہ تھوڑے عمل ہی پر اکتفا کر لیتا ہے۔ اس کے بارے میں حضرت فرماتے ہیں کہ قوی کے عمل کثیر میں جو اثر ہے ضعیف کے عمل قلیل میں وہی اثر ہے، ضعیف کو اس عمل قلیل ہی سے انشاء اللہ مقصود میں کامیابی حاصل ہو جائے گی۔ بندہ کتنا بھی عمل کر لے، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تو اس کی کوئی حیثیت نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں کثرت اور قلت کوئی حقیقت نہیں رکھتی، اصل چیز "اخلاص اور للّٰھیت" ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلاً ؀

(سورۃ ملک آیت ۲)

یعنی اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جس نے موت و حیات کو اس لئے پیدا فرمایا تاکہ تمہارا امتحان لے کہ تم میں سے کون اچھا عمل کرتا ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے "اَحْسَنُ عَمَلاً" فرمایا "اَكْثَرُ عَمَلاً" نہیں فرمایا، کہ تم میں سے کون زیادہ عمل کرتا ہے، بلکہ یہ فرمایا کہ کس کا عمل اچھا ہے، یعنی اخلاص کس کے عمل میں زیادہ ہے۔ لہٰذا جو شخص اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے، للّٰھیت

کے ساتھ، ایمان کے ساتھ اور طلب رضا کی خاطر عمل کر رہا ہے، لیکن ضعیف اور کمزور ہونے کی وجہ سے تھوڑا عمل کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی نواز دیں گے۔

حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ سناتے ہوئے فرمایا کرتے تھے کہ بعض اوقات کمزور کی حسرتِ نایافت اصل عمل سے بڑھ جاتی ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جب رات کو تہجد پڑھنے کے لئے اپنے گھر کی چھت پر کھڑے ہوتے، تو ان کے بارے میں پڑوسیوں کا بیان یہ ہے کہ ان کو دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے چھت پر ایک لکڑی کھڑی ہے، جیسے لکڑی کے اندر کوئی حس اور حرکت نہیں ہوتی، ایسی ہی ان کی حالت ہوتی تھی۔

جب ان کا انتقال ہو گیا تو کسی نے ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کیا معاملہ فرمایا؟ جواب میں حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بڑے کرم اور رحمت کا معاملہ فرمایا، اور بڑے اونچے درجات عطا فرمائے، لیکن ہمارے گھر کے سامنے جو لوہار رہتا تھا، اس کو جو درجہ ملا، وہ درجہ ہمیں نصیب نہ ہوا۔

جس شخص نے وہ خواب دیکھا تھا جب وہ بیدار ہوا تو اس کو بڑا تعجب ہوا کہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ جو اتنے بڑے محدّث، اتنے بڑے مفسّر، فقیہ اور

صوفی بزرگ تھے، وہ پیچھے رہ گئے، اور وہ لوہار جو ایک معمولی درجے کا مسلمان تھا، ان سے آگے نکل گیا، جاکر معلوم کرنا چاہئے کہ وہ لوہار ایسا کونسا عمل کرتا تھا جس کے نتیجے میں وہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے آگے نکل گیا۔ چنانچہ وہ شخص گیا اور اس کی بیوی سے پوچھا کہ تمہارا شوہر کونسا خاص عمل کرتا تھا جس کے نتیجے میں وہ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے بھی آگے بڑھ گیا۔ اس کی بیوی نے کہا کہ اس کا کوئی خاص عمل تو مجھے معلوم نہیں، نہ وہ زیادہ نوافل پڑھتا تھا، نہ زیادہ تسبیحات پڑھتا تھا۔

عبادت کی حسرت

البتہ اس کے اندر دو باتیں تھیں: ایک یہ کہ کبھی کبھار وہ مجھ سے کہا کرتا تھا کہ یہ ہمارے گھر کے سامنے اتنے بڑے بزرگ حضرت عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ رہتے ہیں اور یہ ساری رات اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے رہتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے فراغت عطا فرمائی ہے، معاش کی کوئی فکر نہیں ہے، اس لئے ساری رات عبادت کرتے ہیں، کتنے نیک اور مقرب بندے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اس معاش کی فکر سے بے نیاز کردیں تو ہم بھی رات کو کچھ عبادت کرلیا کریں۔ ایک تو یہ حسرت ظاہر کرتا تھا۔

احترام اذان

دوسرے یہ کہ وہ سارا دن لوہا پیٹتا رہتا تھا، لیکن لوہا پیٹنے کے دوران جب اذان کی آواز کان میں پڑتی تو اگر اس وقت اس نے اپنا ہتوڑا مارنے کے

لئے سر کے اوپر اٹھایا ہوا ہوتا، تو اذان کی آواز سننے کے بعد یہ گوارہ نہیں کرتا تھا کہ ایک ضرب اور لگادے، بلکہ اس ہتوڑے کو پھینک کر نماز کی تیاری میں لگ جاتا، بس یہ دو باتیں تھیں اور کوئی خاص نیک عمل نہیں تھا۔ اس شخص نے کہا کہ بس ان باتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو نواز دیا کہ تم عبداللہ بن مبارکؒ کے مقام تک پہنچنے کی حسرت کر رہے ہو، چلو ہم تمہیں ان سے بھی آگے بڑھادیتے ہیں۔ بہر حال! اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قوی کا عمل کثیر اور ضعیف کا عمل قلیل بعض اوقات دونوں برابر ہو جاتے ہیں اور بعض اوقات ضعیف کا عمل قلیل اس سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

حسرت نایافت بڑی دولت ہے

اس لئے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ حسرت نایافت بھی زبردست چیز ہے اور بہت بڑی دولت ہے۔ انسان یہ حسرت ہی کر لے کہ میں ان جیسی عبادت نہیں کر سکتا، میں کہاں اور وہ کہاں، اگر کسی اللہ والے کو دیکھ کر دل میں یہ حسرت ہی آجائے تو کچھ بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس حسرت پر ہی نواز دے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف طاقت وروں کے ہیں، ضعیفوں کے نہیں، یا اللہ تعالیٰ صرف تندرستوں کے ہیں، بیماروں کے نہیں، یا اللہ میاں صرف جوانوں کے ہیں، بوڑھوں کے نہیں۔ ارے اللہ میاں تو ہم جیسے کمزوروں کے بھی ہیں، سب کے اللہ میاں ہیں، لہٰذا اگر کوئی کمزور ہے تو بندگی کے ساتھ اور شکستگی کے ساتھ اللہ تعالیٰ

کے سامنے اپنی ٹوٹی پھوٹی عبادت ہی پیش کردے اور اللہ میاں سے کہدے کہ: اے اللہ! میں تو یہ حقیر پونجی لے کر آیا ہوں، آپ ہی اس کا پورا بدلہ دیجئے۔ اور اللہ میاں سے یہ کہدے کہ:

وما جهد المقل الاّ الدموع۔

یہ "جہد المقل" ہی پیش کردے اور اپنی بے بسی کے آنسو ہی ٹپکادے اور یہ کہے:

اَللّٰهُمّ هذا الجهد و عليك التكلان۔

جو کچھ عمل بن پڑا وہ تو حاضر ہے، باقی بھروسہ تو آپ کی ذات پر ہے اور آپ کی عطا پر ہے۔ ارے آدمی اپنے عمل کے نقص کو دیکھے یا اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کو دیکھے۔

اپنا مراقبہ چھوڑو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو تم ہر وقت اپنا مراقبہ کرتے رہتے ہو کہ میں ایسا میں ویسا اور میرا عمل ایسا، کب تک تم اپنا مراقبہ کرتے رہو گے، اپنا مراقبہ چھوڑو اور ان کی رحمت کا مراقبہ کرو کہ ان کی رحمت کس کس طرح سے انسان کو ڈھانپ لیتی ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی صاف گوئی

میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے، اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے اور ان کے خاص مریدین میں سے تھے۔ آج بھی میرے پاس حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے وہ خطوط محفوظ ہیں جو میرے دادا رحمۃ اللہ علیہ کے نام ہیں۔ جب میرے والد صاحب دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوگئے تو میرے دادا نے ان سے فرمایا کہ اب تمہیں کسی اللہ والے سے تعلق قائم کرنا چاہئے، چنانچہ میرے دادا میرے والد صاحب کو لے کر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون حاضر ہوئے، اور جاکر والد صاحبؒ نے صاف صاف کہدیا کہ حضرت! ارادہ تو حضرت شیخ الہند (رحمۃ اللہ علیہ) سے بیعت ہونے کا ہے لیکن چونکہ وہ سفر میں ہیں اور نیک کام میں تاخیر کرنے کو دل نہیں مانتا، اس لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوگیا ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس میں کوئی تعارض تو ہے نہیں، حضرت شیخ الہند (رحمۃ اللہ علیہ) جب واپس آجائیں تو ان سے بیعت ہو جانا، کام ابھی شروع کردو۔

اللہ کا راستہ قوی ضعیف سب کے لئے ہے

میرے والد صاحبؒ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! کسی اللہ والے کے پاس جاتے ہوئے اور ان سے بیعت کی درخواست کرتے ہوئے اور اصلاحی تعلق قائم کرتے ہوئے یہ ڈر لگتا ہے کہ میں بہت کمزور ہوں اور مجھ سے یہ بہت زیادہ مجاہدات اور ریاضتیں اور

عبادات نہیں بن پڑتیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا! واہ بھائی واہ! آپ نے تو عجیب بات فرمائی، کیا اللہ میاں صرف اقویاء کے ہیں، ضعفاء کے نہیں؟ کیا اللہ میاں تک پہنچنا صرف اقویاء کا کام ہے، ضعفاء کا کام نہیں؟ ہم آپ کو اتنا کام بتائیں گے جتنا آپ آرام سے کر سکیں گے، ہر ایک کو ایک ہی نسخہ نہیں دیا جاتا، بلکہ ہر ایک مریض کے لئے نسخے الگ الگ ہوتے ہیں۔ پھر کچھ معمولات بیان فرمائے کہ یہ تھوڑے سے معمولات کر لیا کرو۔

ضعیف بھی محروم نہیں رہے گا

بہرحال! ضعیف یہ نہ سمجھے کہ میں ضعف کی وجہ سے محروم رہ گیا۔ ارے ضعف کی وجہ سے کوئی محروم نہیں ہوتا، اگر کوئی محروم ہوتا ہے تو وہ اپنی بدعملی کی وجہ سے محروم ہوتا ہے۔ اپنی غفلت کی وجہ سے ہوتا ہے، اپنی بے دھیانی کی وجہ سے ہوتا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص ضعیف ہے تو وہ اگر تھوڑا بھی عمل کر لے تو انشاء اللہ منزل مقصود پر پہنچ جائے گا۔

ضعیف صحابہ کرامؓ کا ایک اشکال

چند فقراء صحابہؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! صحابہ کرام میں جو ہمارے اغنیاء اور مالدار دوست ہیں، ہم ان کو دیکھتے ہیں کہ وہ بہت صدقہ خیرات کرتے ہیں، اور ان کا دامنِ سخاوت ہر وقت لوگوں کے لئے بچھا ہوا ہے، لہٰذا وہ تو بڑے اونچے درجات کما رہے ہیں، اس لئے کہ صدقہ کے ایک دانے کا ثواب سات سو گنا

تک بڑھ جاتا ہے، اور ہمارے پاس پیسے وغیرہ نہیں ہیں، ہم کس طرح صدقہ کریں، لہٰذا وہ اغنیاء تو ہم سے درجات میں آگے بڑھ جائیں گے اور ہم ان کے برابر نہیں پہنچ سکتے۔ ہم کیا کریں؟

تسبیح فاطمی کی فضیلت

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسا نسخہ بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو ان سے آگے بڑھ جاؤ گے اور تمہارے بعد والے تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ وہ نسخہ یہ ہے کہ تم ہر نماز کے بعد ۳۳ مرتبہ سبحان اللہ اور ۳۳ مرتبہ الحمدللہ اور ۳۴ مرتبہ اللہ اکبر پڑھ لیا کرو، تم ان سے بھی آگے بڑھ جاؤ گے۔ اب دیکھئے کہ یہ عمل چھوٹا سا ہے، لیکن آپ نے فرمایا کہ اس کے ذریعہ تم ان سے بھی آگے بڑھ جاؤ گے، وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کے دلوں میں اس بات کی حسرت ہو رہی ہے کہ یہ لوگ فلاں نیک کام کر رہے ہیں، میں نہیں کر پا رہا ہوں، اور ساتھ میں یہ کہ اپنے بس میں جتنا کام ہے وہ کر رہے ہیں۔ جب یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نواز دیتے ہیں۔

تم اپنے حصے کا کام کر لو

لہٰذا ضعیف کو اپنے ضعف کی وجہ سے کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے، بلکہ ضعف کے لحاظ سے اپنے بس میں جتنا ہو اتنا عمل کر گزرے۔ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے، آپ زر سے لکھنے کے

قابل ہے، وہ یہ کہ:

اپنے حصّے کا کام تم کرلو، اللہ تعالیٰ اپنے حصّے کا کام ضرور کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھئے

دیکھئے! حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ کی دعوت دی گئی، اور آپ کو معلوم تھا کہ دروازے بند ہیں اور ان پر تالے پڑے ہوئے ہیں، باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، لیکن جب یہ دیکھا کہ گناہ کے اندر مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے تو دروازے کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے، پھر اللہ تعالیٰ سے مانگا کہ میرے بس میں اتنا تھا کہ گناہ سے بچنے کے لئے دروازے تک بھاگ جاؤں اتنا کرلیا، آگے آپ کے بس میں ہے۔ جب انہوں نے اپنے حصّے کا کام کرلیا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے حصے کا کام کر دیا کہ تالے ٹوٹ گئے اور دروازے کھل گئے۔

تم دوڑو تو سہی

اسی واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید
خیرہ یوسف وار می باید دوید

اگرچہ تمہیں اس عالم میں کوئی رخنہ اور کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے، اس فحاشی کے ماحول سے اور معصیتوں اور گناہوں کے ماحول سے کہاں بھاگیں، کوئی رخنہ نظر نہیں آتا، نکلنے کا راستہ نظر نہیں آتا، لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح جتنا ہو سکے دوڑو، جب تم دوڑو گے تو اللہ تعالیٰ خود راستہ پیدا فرمادیں گے۔ اپنے حصے کا کام تم کرلو، اللہ تعالیٰ اپنے حصے کا کام ضرور کریں گے۔ یہ اصول لوح دِل پر نقش کرنے کے قابل ہے۔

ایک سبق آموز واقعہ

حضرت والد صاحبؒ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کے جہاد آزادی کے زمانے میں انگریزوں کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم وستم ہو رہے تھے، اس وقت ایک مسلمان اپنے گھر کے اندر محصور ہوگئے، ان کے چاروں طرف انگریزوں کا قبضہ تھا، اگر باہر نکلیں تو موت یقینی، اس لئے گھر میں پڑے تھے، اور گھر میں کوئی اور بھی نہیں تھا، وہ اکیلے تھے، اب گھر میں پڑے پڑے فاقوں کی نوبت آگئی، نہ کھانے کو کچھ تھا، نہ پینے کو کچھ تھا، کئی دن اس طرح گزر گئے کہ ایک قطرہ پانی کا حلق میں نہیں گیا۔ فاقوں کی وجہ سے اتنی شدید کمزوری کہ اٹھنے کے قابل نہ رہے، نڈھال پڑے ہوئے تھے، آخر کار یہ سوچا کہ حتی الامکان کچھ کوشش کرنا بھی تو انسان کے ذمے ضروری ہے، کیا کروں؟ قریب میں ایک پیالہ پڑا ہوا تھا، اس پیالے کو لیٹے لیٹے تھوڑا تھوڑا سرکا سرکا کے صحن تک لے آئے، اور جب صحن تک پیالہ آگیا تو اب وہاں پر دعا

کی یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا کہ میں اس پیالے کو اٹھا کر صحن تک لے آؤں، بادل لا کر بارش برسانا آپ کا کام ہے، ورنہ میں تو پیاس کی وجہ سے مر رہا ہوں۔ فرماتے ہیں کہ جس وقت انہوں نے وہ پیالہ وہاں رکھا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی تو تھوڑی ہی دیر میں گرج اور چمک کے ساتھ بادل آگئے اور بارش برسی اور وہ پیالہ پانی سے بھر گیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو موت سے بچالیا۔

خلاصہ

بات یہی ہے کہ جب بندہ اپنی استطاعت کا انتہائی کام کر گزرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا، آگے آپ کے اختیار میں ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کرم ہوتا ہے اور رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اس لئے ضعیف اور کمزور کو بھی مایوس نہ ہونا چاہئے، وہ بھی اپنی حصے کا کام اپنی استطاعت کے مطابق کر لے، اور پھر اللہ تعالیٰ سے رحمت کی امید رکھے تو انشاء اللہ منزل مقصود حاصل ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۴۱

حصول قرب کا مختصر راستہ

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴

مجلس نمبر : ۴۱

صفحات : ۱۸

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

مجلس نمبر ۱۴

اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا مختصر راستہ

اتّباعِ سنّت

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبۃ للمتقین، والصّلاۃ والسّلام علیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین، امابعد!

گھر میں بال بچوں کے ساتھ ذکر کرنا

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

اگر بال بچوں کے ساتھ گھر رہ کر ذکر نہ ہوتا ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ بالقصد ایسا اہتمام کرے کہ اگر گھر کے علاوہ دوسری جگہ میسّر ہو تب بھی گھر ہی میں ذکر

کرے۔ رائفین کا معمول ہے کہ گھوڑا جس چیز سے چمکتا ہو اس سے دور کرنے کا اہتمام نہیں کرتے کہ ہمیشہ کی مصیبت ہے، بلکہ ایسی چیز کے سامنے آنے اور دیکھنے کا خوگر کرتے ہیں، یہاں تک کہ چمک نکل جاتی ہے۔

البتہ جس جگہ امر مانع ایسا ہو کہ اس سے ملابست کی ضرورت نہ ہوگی، وہاں اسلم یہی ہے کہ اس مانع سے مباعدت اختیار کی جائے۔ خوب سمجھ لو۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۷)

ایسا مانع دور کر دینا چاہئے

اس ملفوظ میں حضرت والا یہ فرما رہے ہیں کہ بعض اوقات ذکر کرنے سے دو قسم کے موانع ہوتے ہیں، ایک مانع تو عارضی قسم کا ہوتا ہے، اگر اس مانع کو دور کر دیا تو اس سے معمولات زندگی میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوتا، اس صورت میں تو مناسب یہ ہے کہ آدمی اس مانع کو دور کرلے۔

مثلاً ایک شخص ایک گھر میں رہتا ہے، اس گھر کا ایک حصہ ایسا ہے جہاں شور وشغب ہوتا رہتا ہے، بچے کھیلتے کودتے ہیں اور شور مچاتے پھرتے ہیں، اگر آدمی اس جگہ پر بیٹھ کر ذکر کرے گا تو اس کو جمعیت خاطر اور سکون حاصل نہیں ہوگا، ایسی صورت میں اس شخص کو چاہئے کہ ذکر کرنے کے لئے گھر کے اندر ایسی جگہ کا انتخاب کرے جہاں شور وشغب زیادہ نہ ہو اور دوسری جگہوں

کے بنسبت وہاں نسبتاً سکون ہو۔ یہ مانع ایسا ہے کہ اس کو دور کر دینا چاہئے، اس لئے کہ اس مانع کو دور کر دینا ممکن ہے۔

اس صورت میں گھر میں ہی ذکر کرے

لیکن اگر مانع ایسا ہے کہ انسان کے لئے اپنی طبعی زندگی میں اس مانع سے چھٹکارا حاصل کرنا مشکل ہے، مثلاً پورا گھر شور و شغب کا شکار ہے اور ہر وقت بچے شور مچاتے رہتے ہیں اور گھر چھوٹا ہے، جس کی وجہ سے گھر میں کوئی گوشہ عافیت نہیں ہے، تو ایسی صورت میں کیا وہ شخص ذکر کے وقت گھر چھوڑ کر مسجد میں یا کسی دوسری جگہ چلا جائے اور وہاں جاکر ذکر کرے، یا گھر میں ہی بیٹھ کر ذکر کرے؟

ایسے شخص کے لئے حضرت فرما رہے ہیں کہ وہ شخص گھر میں بیٹھ کر ذکر کرے، گھر چھوڑ کر نہ جائے، کیونکہ یہ ایک مستقل عمل ہے، کب تک گھر چھوڑ کر جائے گا۔ اس لئے گھر میں ہی ذکر کرے اور نفس کو اسی تشتت کی فضا میں ذکر کرنے کا عادی بنائے، اور اسی پراگندگی کی فضا میں ذکر کرنے کا عادی بنائے، اس کے لئے مسجد میں جاکر ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

ایک مثال

اس کی بڑی اچھی مثال حضرت والا نے یہ دی کہ یہ جو گھوڑا سدھانے والے اور پالنے والے سائس ہوتے ہیں، ان کا معمول یہ ہوتا ہے کہ جب گھوڑا

کسی خاص چیز کو دیکھ کر بدکتا ہے، فرض کریں کہ گھر میں گھوڑا بھی ہے اور کتا بھی ہے، اب گھوڑا کتے کو دیکھ کر بدکتا ہے، یا کوئی توبڑا رکھا ہے اس کو دیکھ کر گھوڑا بدکتا ہے، تو سائیسوں کا معمول یہ ہے کہ جس توبڑے کو دیکھ کر گھوڑا بدک رہا ہے تو گھوڑے کو رام کرنے کے لئے اس توبڑے کو سامنے سے نہیں ہٹاتے، کیونکہ آج وہ اس توبڑے سے بدک رہا ہے اور تم نے اس توبڑے کو اس کے سامنے سے ہٹا دیا تو کل وہ کسی اور چیز سے بدکے گا، اس کو بھی ہٹانا پڑے گا، پرسوں تمہارے بچے کو دیکھ کر بدکے گا، تو کیا بچے کو بھی گھر سے نکال دو گے؟ وہ تو روز کی ایک مصیبت بن جائے گی۔ لہٰذا اس کا علاج یہ ہے کہ گھوڑے کو اس چیز سے مانوس کرے، چنانچہ وہ سائس وہی توبڑا بار بار اس کے سامنے لے کر جائے گا جس کے نتیجے میں وہ رفتہ رفتہ اس توبڑے سے مانوس ہو جائے گا، مانوس ہونے کے نتیجے میں پھر نہیں بدکے گا۔

نفس کو اس شور و شغب کا عادی بناؤ

اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ جب اسی گھر میں تمہیں رہنا ہے، مستقل طور پر تم اس گھر سے بھاگ نہیں سکتے، تو اس نفس کو اسی شور و شغب میں ذکر کرنے کا عادی بناؤ۔ اگر اسی حالت میں ذکر کرنے سے یکسوئی میسّر آجائے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور اگر یکسوئی میسّر نہ آئے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن رفتہ رفتہ اس کے اندر یکسوئی آنے لگے گی اور انسان کا نفس اسی کا عادی بن جائے گا۔

غیر معمولی راستہ اختیار کرنا مضر ہے

خلاصہ یہ ہے کہ دل جمعی اور اطمینان حاصل کرنے کے لئے کوئی غیر معمولی راستہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ غیر معمولی راستہ اختیار کرنا مضر ہے۔ اپنے معمول کی زندگی میں یکسوئی حاصل کرنے کے لئے جتنی تھوڑی بہت فکر کر سکتے ہو کرلو، جیسے میں نے ابھی بتایا کہ گھر کے جس حصے میں شور و شغب زیادہ ہے اس کو چھوڑ دو، اور جس حصے میں شور و شغب کم ہے وہاں بیٹھ کر ذکر کرلو، لیکن گھر چھوڑ کر نہ بھاگو۔ یہ سب تجربے، حکمت اور دانائی کی باتیں ہیں، حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ تو اتنے مراحل سے خود بھی گزرے ہوئے تھے، اور دوسروں کو بھی ان مراحل سے گزارا ہوا تھا، نہ جانے سیکڑوں بلکہ ہزاروں کو ان مراحل سے گزار دیا، اس لئے یہ باتیں ان کے تجربات کا نچوڑ ہیں، ورنہ یہ باتیں سالہا سال پریشان ہونے کے بعد حاصل ہوتی ہیں، لیکن حضرت والا نے دو چار لفظوں میں یہ چٹکلے بتا دیئے۔

یکسوئی کی زیادہ فکر مت کرو

بہر حال! ذکر بذات خود مقصود ہے، ذکر میں اس بات کی فکر کرنا کہ اس میں یکسوئی ہے یا نہیں؟ اس کی بہت زیادہ فکر نہیں کرنی چاہئے، تھوڑی بہت فکر کر لینے میں کوئی حرج نہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت والا کو لکھا کہ مجھے ذکر میں یکسوئی نہیں ہوتی۔ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ:

"چاہے یکسوئی بقدر یک سوئی نہ ہو
تب بھی ذکر فائدے سے خالی نہیں"

لہٰذا اس فکر میں مت پڑو کہ یکسوئی حاصل ہے یا نہیں۔ ارے جس ذات کا ذکر زبان سے جاری ہو رہا ہے، اس کے انوار و برکات اور اس کے فوائد انشاء اللہ حاصل ہوں گے اور پھر رفتہ رفتہ یکسوئی بھی حاصل ہو جائے گی۔

مفید ترین ذکر

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

زیادہ قرب "لاالٰہ الااللہ" میں ہے کہ یہ ماثور ہے، اور دوسرے اذکار "الااللہ یا اَللّٰہُ اَللّٰہ" مصلحت یکسوئی کے لئے تجویز ہوتے ہیں، واقعی تجربہ سے ذکر ماثور اوفق بالطبائع ہے اور اس لئے انفع بھی ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ٦٧)

ذکر ماثور اوفق بالطبع ہوتا ہے

حدیث شریف میں بھی ہے کہ "افضل الذکر "لَا اِلٰـهَ اِلاَّ اللّٰه" ہے۔ حضرت والا یہ ملفوظ "دوازدہ تسبیح" کے سیاق میں ارشاد فرمارہے ہیں کہ "دوازدہ تسبیح" میں پہلے "لَا اِلٰـهَ اِلاَّ اللّٰه" کی تسبیح پڑھی جاتی ہے اور اس کے بعد پھر "اِلاَّ اللّٰه" کی تسبیح ہوتی ہے، پھر اس کے بعد "اَللّٰهُ اَللّٰه" کی تسبیح پڑھی

جاتی ہے، پھر اَللہ اَللہ کی تسبیح پڑھی جاتی ہے۔ ان تمام تسبیحات میں قرب سب سے زیادہ "لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ" سے حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ ذکر ماثور ہے، اور دوسرے اذکار یعنی "اِلاَّ اللّٰہ" یا "اَللہُ اَللہ" وغیرہ یہ مصلحت یکسوئی کی خاطر تجویز کئے گئے ہیں، باقی تجربہ سے یہ بات ثابت ہے کہ ذکر ماثور اوفق بالطبائع ہے، یعنی جو اذکار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، یا آپ کا اس ذکر کو کرنا یا دوسروں کو بتانا ثابت ہیں، وہ ذکر جتنا مفید ہوتا ہے اور طبیعت کے موافق ہوتا ہے، دوسرا ذکر نہیں ہوتا، اس لئے ایسا ذکر مفید بھی زیادہ ہے۔

ذکر مسنون میں نور اور برکت ہوتی ہے

جتنے وظائف، اوراد اور معمولات وغیرہ ہیں، ان میں سے جو سنّت کے قریب ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، ان میں جو نور وبرکت ہے اور ان میں جو نفع ہے، وہ دوسرے اذکار اور اوراد میں نہیں۔ ویسے تو بزرگوں سے بہت سے اوراد واذکار ثابت ہیں، ان اذکار کے اپنے خواص بھی ہیں جن سے انکار نہیں ہو سکتا، نہ اوراد کو ناجائز اور برا کہہ سکتے ہیں، لیکن جو سنّت کا نور ماثور اذکار میں حاصل ہو سکتا ہے، وہ دوسرے اذکار میں حاصل نہیں ہو سکتا۔

بعض لوگوں کی طبیعت

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی طبیعت ماثور اذکار میں نہیں لگتی، اس لئے وہ اِدھر اُدھر کے دوسرے اذکار کے چکر میں لگے رہتے ہیں، بعض درود

لکھی اور ''درود تاج'' میں اور بعض ''دعا گنج العرش'' وغیرہ میں لگے رہتے ہیں، ان کی طرف ان کی طبیعت بہت مائل ہوتی ہے اور اذکار ماثورہ کی طرف ان کی طبیعت متوجہ نہیں ہوتی، حالانکہ یہ غیر ماثور اذکار ہیں، ان میں سے بعض میں تو خلاف شرع امور ہوتے ہیں، البتہ بعض میں خلاف شرع امور نہیں ہوتے، مثلاً ''حزب البحر'' ہے، اس میں کوئی خلاف شرع امر نہیں ہے اور بزرگوں کا اس کو پڑھنے کا معمول رہا ہے، لیکن جو نور ادعیہ ماثورہ میں ہے یعنی جو ادعیہ ماثورہ قرآن کریم سے ثابت ہیں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، ان سے بہتر دعا کوئی نہیں ہو سکتی، ان میں جو نور، جو برکت، جو نفع ہے وہ دوسرے اذکار میں نہیں۔

ادعیہ ماثورہ سے باہر جانے کی ضرورت نہیں

واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ مانگ کر تشریف لے گئے، دنیا اور آخرت کی کوئی ضرورت اور کوئی حاجت اور کوئی نفع کی چیز ایسی نہیں ہے جو ان ادعیہ ماثورہ میں نہ آگئی ہو، اس لئے ان ادعیہ ماثورہ سے باہر جانے کی ضرورت ہی کیا ہے، اگر دن رات آدمی انہی دعاؤں کے پڑھنے کا معمول بنالے تو بس یہی کافی ہیں۔ یہی معاملہ ذکر کا ہے، جو اذکار ماثور ہیں، ان میں جو نور، جو برکت اور جو نفع ہے وہ دوسرے اذکار میں نہیں۔

اتباعِ سنّت کا راستہ زیادہ مختصر ہے

صوفیاء کرام کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، کسی سلسلے میں کوئی راستہ اختیار کیا جاتا ہے، کسی سلسلے میں کوئی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، سب کا مقصود "وصول الی اللہ" ہے اور تعلق مع اللہ قائم کرنا ہے، لیکن راستے الگ الگ ہیں، کوئی راستہ مختصر ہے اور کوئی لمبا ہے۔ حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ہم نے تو یہ دیکھا کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے میں جتنا مختصر راستہ "اتباع سنت" کا ہے، کوئی اور راستہ اتنا مختصر نہیں۔ جو دوسرے راستے مجاہدات، مراقبات، ریاضتوں، اور اشغال کے صوفیاء کرام نے تجویز کئے ہیں، ان کے نافع ہونے سے انکار نہیں، اور نہ ہی ان کی تنقیص مقصود ہے، لیکن اللہ تعالیٰ تک پہنچانے میں جتنا زود اثر اتباع سنّت کا راستہ ہے، کوئی اور راستہ اتنا زود اثر نہیں۔

اتباعِ سنّت میں محبوبیت کی شان

وجہ اس کی یہ ہے کہ اتّباع سنّت میں محبوبیت کی شان پائی جاتی ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ۔

(سورۂ آل عمران:۳۱)

آپ فرمادیجئے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبّت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتّباع کرو، اللہ تعالیٰ تم سے محبّت کرنے لگیں گے۔

اس آیت سے پتہ چلا کہ اتبّاع سنّت کرنے والے سے اللہ تعالیٰ محبّت فرماتے ہیں۔ یہ بات طے شدہ اور منصوص ہے کہ جو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کی اتباع کرے گا، اس میں محبوبیت کی شان پیدا ہو جائے گی، اور محبوبیت کی خاصیت "جذب" ہے یعنی محبّ محبوب کے لئے جاذب ہوتا ہے، محبّ محبوب کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتا ہے، اس لئے جو شخص اتبّاع سنّت کا کام کرے گا، وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب بنے گا اور پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف کھینچ لیں گے، یہ "جذب" کا طریقہ جلد منزل پر پہنچا دیتا ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ

(سورۃ الشوریٰ:۱۳)

یعنی اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

لہٰذا اتباع سنّت میں محبوبیت ہے، اور محبوبیت میں جذب کا خاصہ ہے، تو اللہ تعالیٰ اتباع سنّت کرنے والے کو "جذب" فرما لیتے ہیں، اس کے نتیجے میں راستہ جلد قطع ہو جاتا ہے۔

ایک بزرگ اور ایک بادشاہ کا واقعہ

حضرت والا نے ہی ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک بادشاہ اپنے قلعہ کی برج میں بیٹھا تھا، نیچے سے ایک بزرگ گزر رہے تھے، بادشاہ کے دل میں خیال آیا کہ ان بزرگ سے کچھ استفادہ کرنا چاہئے، چنانچہ بادشاہ نے ان بزرگ کو آواز دی کہ حضرت کچھ ہماری طرف بھی نگاہ فرمالیں، ان بزرگ نے فرمایا کہ میں

تمہاری طرف کیسے نگاہ ڈالوں، تمہاری طرف آنے کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے، اس لئے کہ اتنے بڑے قلعہ کا چکر لگا کر دروازے تک پہنچوں، پھر چوکیداروں اور پھر پہرے داروں سے اجازت لے کر اندر آؤں، پھر تم تک پہنچوں، یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔

بادشاہ نے کہا کہ میرے تک پہنچنا کوئی مشکل نہیں، یہ کہہ کر اس نے اوپر سے ایک ٹوکری لٹکا دی اور ان بزرگ سے کہا کہ آپ اس ٹوکری میں بیٹھ جائیں، چنانچہ وہ بزرگ اس ٹوکری میں بیٹھ گئے، بادشاہ نے اپنے خادموں سے وہ ٹوکری اوپر کھچوالی۔

اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا طریقہ

جب وہ بزرگ اوپر پہنچے تو انہوں نے بادشاہ سے فرمایا کہ اب بتایئے کیا بات ہے؟ اس بادشاہ نے کہا کہ مجھے یہ بتائیں کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ ان بزرگ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے پاس اس طرح پہنچ جاؤ جیسے میں تمہارے پاس پہنچ گیا، تم نے پکارا، میں نے عذر ظاہر کیا کہ اتنا لمبا چوڑا راستہ قطع کر کے کیسے آؤں، تو تم نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو شخص مجھ تک آنا چاہتا ہے، وہ مجھے پکارے اور یہ کہے کہ یا اللہ! میں آپ تک پہنچنا چاہتا ہوں، تو پھر اللہ تعالیٰ اس بندے کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

بندہ کی مشیت پر اللہ تعالیٰ کھینچ لیتے ہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آیت:

اَللّٰہُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَآءُ

کے ظاہری معنی تو ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں جس کو چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ "یشاء" کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ رہی ہے، لیکن اس آیت میں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ "یشاء" کی ضمیر "مَن" کی طرف لوٹ رہی ہو، اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ "اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں جو یہ چاہے کہ اسے کھینچ لیا جائے۔" لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کے پاس پہنچ جاؤں تو اس کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پکارے اور اللہ تعالیٰ سے اس کا قرب مانگے تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

یہ قلندری راستہ ہے

لہٰذا یہ کھینچنے کا راستہ مختصر ترین راستہ ہے، اس کے مقابلے میں مجاہدات اور ریاضتوں کا جو راستہ ہے، وہ دور کا راستہ ہے۔ فارسی کا مشہور شعر ہے ؎

صنمارہ قلندر سزاوار بمن نمائی

کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

یعنی مجاہدایت و ریاضتوں کا جو راستہ ہے یہ تو لمبا چوڑا راستہ ہے جو میرے بس کا

نہیں، مجھے تو قلندر والا راستہ بتائیے۔ قلندر والے راستے سے مراد محبت کا راستہ اور اتباع سنّت والا راستہ ہے۔ اس اتباع سنّت کے ذریعہ جب محبّت پیدا ہو گی تو وہ محبّت انسان کے اندر اسٹیم بھر دے گی، پھر وہ اسٹیم اس کو تیزی سے راستہ قطع کرادے گی۔ دیکھئے! ریل کا انجن ہے جو فولاد کا ہے اور بہت بھاری ہے، لیکن جب اس کے اندر اسٹیم بھر دی تو اب وہ انجن خود بھی تیزی سے دوڑتا ہے اور پوری گاڑی کو دوڑاتا ہوا لے جاتا ہے۔

اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ دل کے اندر محبّت کی اسٹیم بھر دیں تو پھر وہ راستہ بہت تیزی سے قطع ہو جائے گا۔

اتباع سنّت کا راستہ خاموشی والا راستہ ہے

اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ اتباع سنّت کا راستہ قریب کا راستہ ہے اور جلدی منزل تک پہنچانے والا ہے، البتہ اس راستے میں شور وشغب نہیں ہے، جس کی وجہ سے دیکھنے والے کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ شخص کوئی لمبا چوڑا راستہ قطع کر رہا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص بیٹھا ذکر و شغل میں مصروف ہے یا مراقبہ کر رہا ہے، چلّہ کاٹ رہا ہے تو دیکھنے والے کو بھی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کچھ کر رہا ہے، لیکن یہ جو قلندر والا راستہ ہے اور اتباع سنّت والا راستہ ہے، اس میں دیکھنے والے کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس نے کوئی عمل کیا ہے، مثلاً ایک شخص نے مسجد سے نکلتے وقت بایاں پاؤں باہر نکال دیا تو اب کسی کو کیا پتہ چلا کہ اس نے کیا عمل کیا لیکن اتباع سنّت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو گیا۔ **ہوا کا جھونکا آیا**، اس

پر آپ نے دل میں کہدیا "اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ" اب کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کیا سے کیا ہو گیا اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے، ایک لمحے میں اللہ تعالیٰ کی اہم عبادت انجام پاگئی اور وہ ہے "شکر" کی عبادت۔

یہ راستہ شیطانی دسائس سے مامون ہے

بہر حال! اتباع سنت کا راستہ ایسا ہے کہ دیکھنے والے کو کچھ پتہ نہیں لگتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ شیطان کے جو دسائس ہیں یعنی حبّ مال، حبّ جاہ، تکبر، خود پسندی، عجب، ریاکاری، وہ اس راستے میں کم ہوتے ہیں۔ اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اپنے اندر اس طرح تبدیلی لاؤ کہ انگلیاں نہ اٹھیں، ایسا نہ ہو کہ کل تو یہ حال تھا اور آج ایک انقلاب عظیم برپا ہو گیا، کیا سے کیا ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ لوگ اس کی طرف اشارہ کریں گے کہ اس آدمی میں اچانک انقلاب آگیا، یہ انگلیاں اٹھنا فتنہ ہے، اس لئے کہ انگلیاں اٹھنے کے نتیجے میں انسان کے اندر عجب، تکبر، خود پسندی پیدا ہو جاتی ہے۔

چپکے چپکے تبدیلی لاؤ

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس طرح تبدیلی لاؤ جس طرح بچہ بالغ ہو جاتا ہے، کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ بچہ کس دن بالغ ہوا، ایک ایک دن گزرتا چلا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے بچہ بالغ ہو گیا، کسی کو پتہ نہیں چلا کہ کونسا وقت اور کونسا دن تھا جب وہ بالغ ہوا۔ اس طرح تبدیلی

لاؤ۔

حضورؐ کی نقل اتارو

اور یہ تبدیلی اس طرح آتی ہے کہ ہر چیز میں اس بات کا اہتمام کرو کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کے مطابق ہو، اور سچی بات تو یہ ہے کہ سارے دین کا، سارے احکامات کا، ساری شریعت اور طریقت کا حاصل اگر کچھ ہے تو وہ "اتباع سنّت" ہے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے مبعوث اسی لئے فرمایا تھا کہ تم ان کو دیکھو اور ان کی نقل اتارو، اور ان کی اتباع کرو۔

روزانہ اپنا جائزہ لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دین پر اور شریعت پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ ارے کوئی مشکل نہیں، اپنا ایک لائحہ عمل بنالو اور روز اپنا جائزہ لو، اور میں نے تمہارے لئے "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" کے نام سے ایک ڈائری بنادی ہے، روز اس کو دیکھتے جاؤ کہ کس کس کام میں ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کر رہے ہیں اور کس کام میں نہیں کر رہے ہیں، جس کام میں سنّت کا اتباع نہیں کر رہے ہیں، ایک ایک کر کے ان میں بھی اتباع کرتے چلے جاؤ، اس طرح رفتہ رفتہ بالغ ہو جاؤ گے اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا کہ کیا سے کیا ہو گیا۔

پانی کا قطرہ پتھر میں سوراخ کر دیتا ہے

دیکھئے! اگر نل سے پانی ٹپک رہا ہو اور نیچے پتھر رکھا ہوا ہو، پانی ٹپکتے ہوئے ایک دن گزرا، دو دن گزرے، ایک ہفتہ گزرا، ایک مہینہ گزر گیا، رفتہ رفتہ وہ پانی اس پتھر میں سوراخ کر دے گا۔ اگر اس قطرے کو دیکھو تو اس میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ پتھر کے اندر سوراخ کر دے، اور نہ کسی کو یہ پتہ چلتا ہے کہ پانی کا کونسا قطرہ تھا جس نے پتھر میں سوراخ کیا، لیکن مجموعی طور پر سارے قطرے مل کر اس پتھر میں سوراخ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اتباع سنّت والے اعمال بظاہر دیکھنے میں بہت چھوٹے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں، لیکن ان کا مجموعہ مل کر سوراخ کر دیتا ہے، اور پھر وہ دین دل میں جا گزیں ہو جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے بزرگوں نے دوسرے راستوں کو چھوڑ کر اتباع سنّت کا راستہ اپنایا ہے اور اسی کو اپنا مقصود زندگی بنایا ہے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ اور ظاہری اور باطنی ترقی کی انتہاء

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مجدّد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنایا کرتے تھے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب میں نے علوم ظاہرہ کی تکمیل کر لی، تو میں نے سنا کہ کچھ علوم باطنہ بھی ہوتے ہیں جو صوفیاء کرامؒ کے پاس ہیں، میں نے سوچا کہ وہ بھی دیکھنے چاہئیں کہ وہ کیا ہیں۔ چنانچہ میں صوفیاء کرام کے پاس گیا، معلوم ہوا کہ صوفیاء میں چار قسم کے سلسلے ہیں، چشتیہ، نقشبندیہ، سہروردیہ، قادریہ، اور پھر ہر ایک کی الگ شاخیں ہیں، میں نے ہر

ایک سلسلہ والوں کے پاس جا کر ان کے علوم حاصل کئے اور ہر ایک سلسلے والوں نے جو طریقے مقرر کئے ہوئے تھے ان طریقوں کو نہ صرف یہ کہ دیکھا بلکہ ہر ایک طریقے کو برتا اور اس پر عمل کیا یہاں تک کہ اللہ تبارک و تعالیٰ نے مجھے ایک بہت اونچا مقام عطا فرمایا، پھر اس میں ترقی کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچا کہ علماء ظاہر تو اسے کیا سمجھیں گے، علماء باطن بھی اس کو سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

حضرت مجدّد الف ثانیؒ کی دعا

لیکن میں سب مقامات طے کرنے کے بعد ایک دعا کرتا ہوں اور جو شخص اس دعا پر آمین کہے گا، انشاءاللہ اس کے حق میں بھی یہ دعا قبول ہو جائے گی۔ وہ دعا یہ ہے کہ:

اے اللہ! مجھے اتبّاع سنّت کی توفیق عطا فرمایئے، آمین۔

اے اللہ! مجھے اتبّاع سنّت پر زندہ رکھئے، آمین۔

اے اللہ! مجھے اتبّاعِ سنّت پر موت عطا فرمایئے، آمین۔

بہر حال! اذکار میں جو ماثور اذکار ہیں اور دعاؤں میں جو ماثور دعائیں ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، ان میں جو نور اور برکت ہے، وہ نور اور برکت دوسرے اذکار میں نہیں۔

درود ماثور پڑھنے چاہئیں

آج لوگ دوسرے درود کی تلاش میں رہتے ہیں، حالانکہ حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم نے درود شریف کے بہت سے طریقے بتا دیئے، جس پر علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے پوری کتاب لکھدی، اس کتاب کا نام ہے "القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع" اس کتاب میں درود شریف کے سیکڑوں الفاظ جمع فرما دیئے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، اس لئے اپنی طرف سے درود شریف گھڑنے کی ضرورت نہیں۔ لہٰذا ماثور اذکار اور ماثور دعائیں اور ماثور درود ہی پڑھنے چاہئیں، ان میں بڑی برکت ہے۔

مبتدی کو ذکر اور منتہی کو تلاوت

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ:

مبتدی کے لئے ذکر سے زیادہ شغف مناسب ہے، منتہی کے لئے تلاوت ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ٦٧)

ابتداء میں چونکہ مبتدی کا دل نہیں لگتا، اس کے لئے ذکر کرنا مناسب ہے، اس لئے کہ اس میں اس کا دل لگ جاتا ہے، لیکن منتہی کے لئے تلاوت مناسب ہے کہ وہ جتنی تلاوت کی کثرت کرے گا، اتنا ہی اس کے لئے فائدہ مند ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۴۲

استغفار اور معمولات کی ادائیگی

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۴۲

صفحات : ۱۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

مجلس نمبر ۴۲

استغفار اور معمولات کی ادائیگی

الحمدللّٰه ربّ العالمين، والعاقبة للمتقين،
والصّلاة والسّلام علىٰ رسوله الكريم، وعلىٰ
آله وأصحابه أجمعين، امابعد!

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

اگر رات کو بیدار ہونے کا یقین نہ ہو تو بعد عشاء سب معمولات کو ادا کر لینا احسن ہے۔

(انفاس عیسیٰ، ص ٦٧)

رات کو جب آنکھ کھلے استغفار کر لو

یعنی بعض مرتبہ تہجد کی نماز کے ساتھ بعض معمولات مقرر کر لئے جاتے ہیں، ان کے بارے میں سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ آدمی آخری شب میں اٹھ کر تہجد پڑھنے کی اور معمولات ادا کرنے کی عادت ڈالے، لیکن حکیم

الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہم جیسے کمزوروں کے لئے بڑے آسان نسخے تجویز فرمائے ہیں، چنانچہ جن لوگوں کو آخری شب میں اٹھنے کی عادت نہیں ہے یا کسی وجہ سے ان کے لئے آخری شب میں اٹھنا مشکل ہے تو ایسے لوگوں کے لئے ایک طریقہ تو ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بتایا کہ جب کبھی رات کے وقت آنکھ کھلے تو اس وقت اٹھ کر بستر پر تھوڑی دیر بیٹھ جائے اور کچھ دعا کرلے اور کم از کم تین بار یہی دعا کرلے۔

اَللّٰھم اغفرلی ۔ اَللّٰھم اغفرلی ۔ اَللّٰھم اغفرلی ۔

اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ رات کے وقت اللہ تعالیٰ کا مُنادی آواز لگاتا ہے کہ ہے کوئی مغفرت طلب کرنے والا جس کی میں مغفرت کروں۔ اب منادی تو آواز لگارہا ہے، لیکن آدمی بے نیاز ہو کر بیٹھا رہے اور کچھ نہ مانگے، یہ بڑی ناقدری کی بات ہے۔ اس لئے جب رات کو آنکھ کھلے اور نماز وغیرہ نہ بھی پڑھی جاسکے تو کم از کم تھوڑی دیر بیٹھ کر دعا ہی کرلے، اور دعا مانگنے کے بعد پھر سو جائے، لیکن اس بات کا التزام کرلے کہ جب بھی آنکھ کھلے گی تو یہ کروں گا۔ لہٰذا جو شخص اس بات کا التزام کرلے گا اس کو انشاء اللہ ایک نہ ایک دن تہجد پڑھنے کی ضرور توفیق ہو جائے گی۔

ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچتی ہے

اللہ تعالیٰ نے نیکیوں میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی

کو کھینچتی ہے، لہٰذا جب آنکھ کھلی اور اٹھ کر بیٹھ گیا اور دعا کر لی اور دل میں ایمان ہے تو اس وقت اس کو یہ خیال ضرور آئے گا کہ اب میں اٹھ تو گیا ہوں، نیند بھی ہو گئی ہے، چلو دو چار رکعت پڑھ ہی لو، اس طرح اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ توفیق عطا فرما دیتے ہیں۔

عشاء کے ساتھ تہجد پڑھنے کا ثبوت

دوسرا طریقہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ اگر رات کو اٹھنے کی ہمت نہیں ہوتی تو عشاء کے فرض اور سنّت کے بعد اور وتر سے پہلے کچھ رکعتیں تہجد کی نیت سے پڑھ لیا کرے۔ یہ طریقہ ہمارے سارے بزرگ بتاتے چلے آئے ہیں، یہ طریقہ بے اصل نہیں ہے، بلکہ خود حضرت والا نے اس ملفوظ کے تحت معجم کبیر کے واسطے سے یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ:

عن ایاس بن معاویة المزنی أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم قال: لَابُدَّ مِنْ صَلَاۃٍ بلیل ولو ناقة ولو حلب شاۃ، وما کان بعد صلاۃ العشاء الآخرۃ فھو من اللیل۔

(المعجم الکبیر للطبرانی، ج۱، ص۲۷۱، حدیث نمبر۷۸۷)

حضرت ایاس بن معاویہ المزنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رات کو تھوڑی بہت نماز ضرور پڑھو، چاہے اتنی دیر کے لئے کیوں

نہ ہو جتنی دیر میں بکری کا دودھ دھویا جاتا ہے، یعنی چاہے تھوڑی دیر کے لئے ہو۔اور عشاء کے بعد جو نماز پڑھی جائے گی وہ رات میں ہی شمار ہو گی۔

کچھ عبادت رات کی تاریکی میں

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اعمال بیان فرمائے جن سے انسان کو جنّت حاصل ہوتی ہے، کئی اعمال بیان کرنے کے بعد آخر میں ایک خوبصورت لفظ ارشاد فرمایا:

وَشَیْءٌ مِنَ الدُّلْجَةِ۔(۱)

(صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب الدّین یسر)

یعنی تھوڑا سا حصّہ رات کے اندھیرے میں۔ یعنی رات کے اندھیرے میں اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو کر کچھ عرض معروض کر لینا بھی ان اعمال میں داخل ہے جو انسان کو جنت میں پہنچا دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ "شیء من الدلجة" آخر شب میں نہ ہو تو اول شب میں ہی کر لے، عشاء کے بعد ہی کر لے، چنانچہ اوپر جو

(۱) پوری حدیث اس طرح ہے:

عن أبی هريرة رضی اللّٰه تعالیٰ عنه عن النبی صلی اللّٰه تعالیٰ علیه وسلم قال: ان الدين يسر ولن يشادالدين أحد الاّغلبه، فسد دوا وقاربوا وا بشروا استعينوا بالغدوة والرَّوحة وشئی من الدلجة۔

حدیث بیان کی اس میں صاف صراحت ہے کہ:

وَمَا کَانَ بَعْدَ صَلاَۃِ الْعِشَاءِ الآخِرَۃِ فَھُوَ مِنَ اللَّیْلِ

یعنی جو عشاء کے بعد کا وقت ہے وہ سب رات کا حصّہ ہے۔ لہٰذا عشاء کے بعد جو بھی عبادت کی جائیگی وہ رات ہی کے قیام میں شمار ہو گی۔

تہجّد کا اصل وقت

اسی لئے فقہاء کرام نے فرمایا کہ تہجد میں افضل یہ ہے کہ اس کو آخری شب میں پڑھا جائے، اور اگر رات کے دو حصّے کئے جائیں تو نصف ثانی افضل ہے۔ بہر حال، افضل یہ ہے کہ آدھی رات کے بعد تہجد کی نماز پڑھی جائے، اور زیادہ افضل یہ ہے کہ کچھ دیر سو کر اٹھنے کے بعد تہجد کی نماز پڑھی جائے، اس لئے کہ یہ لفظ تہجد "ھجود" سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں "رات کو سونا" (مصباح اللغات: لفظ "ھجد") لہٰذا سو کر اٹھنے کے بعد تہجد پڑھنا افضل ہے۔ لیکن اگر کسی وجہ سے رات کو اٹھ کر پڑھنا مشکل ہو تو اول شب میں ہی پڑھ لے، تاکہ اس کی فضیلت سے محروم نہ رہے، البتہ یہ نیت رکھے کہ اگر آخر شب میں آنکھ کھل گئی تو اس وقت بھی پڑھ لوں گا، ورنہ یہ رکعات اس کے قائم مقام ہو جائیں گی۔

وتر کے بعد کی دو رکعتوں کی اہمیت

وتر کے بعد جو دو رکعتیں نفل پڑھی جاتی ہیں، ان کے بارے میں ایک

حدیث میں آیا ہے کہ ان کو اس لئے پڑھا جاتا ہے کہ اگر آخر شب میں آنکھ نہ کھل سکے تو انسان تہجد سے محروم نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اول شب میں تہجد کی نیت سے چند رکعات پڑھنے سے بھی انشاء اللہ تہجد کی فضیلت اور ثواب حاصل ہو جائے گا۔

یہ رکعات بھی تہجد کے قائم مقام ہیں

میں نے ایک مرتبہ اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ حضرت! دل یہ چاہتا ہے کہ "شَیْءٌ مِنَ الدُّلْجَة" کی توفیق ہو جائے، لیکن اپنی طبعی کمزوری اور نیند کی بے قاعدگی کی وجہ سے موقع نہیں ملتا۔ حضرت نے جواب میں لکھا کہ عشاء کے ساتھ تو آپ پڑھ لیتے ہیں اور وہ "شَیْءٌ مِنَ الدُّلْجَة" کے قائم مقام ہے۔ بہرحال! اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جو بھی مل جائے وہ نعمت ہے، اگر آخر شب میں اٹھنے کا موقع نہیں ملتا، تو اول شب میں ہی چند رکعات پڑھ لینی چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے قیام اللیل ہی کی توفیق عطا فرمائے اور اس کی برکات سے محروم نہ فرمائے۔ آمین۔

عشاء کے بعد معمولات پورے کر لو

ساتھ میں حضرت والا نے یہ بھی فرمادیا کہ وہ معمولات جو تہجد ہی میں ادا کرنے کے ہیں، مثلاً بعض بزرگوں نے فرمایا کہ دوازدہ تسبیح کا سب سے اچھا وقت تہجد کا وقت ہے، اس وقت پڑھنا سب سے زیادہ نافع ہوتا ہے، لیکن اگر تہجد کے وقت اٹھنا نہیں ہوتا تو عشاء کے بعد ہی ان معمولات کو پورا کر لے، انشاء

اللہ یہ تہجد کے وقت پڑھنے کے قائم مقام ہو جائے گا۔

معمولات پورے نہ ہو سکنے پر توبہ استغفار

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

اگر بوجہ کثرت کاروبار کے معمولات واوراد پورا نہ کر سکے تو جتنا ہو سکے کرتا رہے، جو کمی رہ جائے استغفار و ندامت سے اس کی تلافی کرے، کام بنانے کے لئے یہی کافی ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۸)

یعنی انسان جتنے معمولات اور اوراد مقرر کرے تو یہ سوچ کر مقرر کرے کہ مجھے یہ معمولات نبھانے ہیں، لہٰذا اتنے ہی مقرر کرے جتنے نبھا سکے۔ لیکن چونکہ ہر انسان کے ساتھ کچھ نہ کچھ عوارض لگے ہوئے ہیں، لہٰذا اگر کسی عارض کی وجہ سے انسان اپنا معمول پورا نہ کر سکے تو اس کی وجہ سے مایوس نہ ہو، بلکہ جتنا کر سکتا ہو وہ کرلے اور باقی کے چھوٹنے پر استغفار اور ندامت کرے۔

معمول میں کمی کردو، ناغہ مت کرو

ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جو معمول مقرر کر لیا ہے تو اب اس کو چھوڑو مت، البتہ بوقت ضرورت اس کی تعداد میں کمی کرلو، مثلاً معمول میں سو مرتبہ پڑھنا تھا، اب کسی عارض کی وجہ سے سو مرتبہ پڑھنا مشکل ہو رہا ہے تو پچاس مرتبہ پڑھ لو، پچاس مرتبہ بھی پڑھنا مشکل ہو رہا ہے تو ۳۳ مرتبہ پڑھ لو، ۳۳ مرتبہ بھی مشکل ہو تو گیارہ مرتبہ پڑھ لو، گیارہ مرتبہ مشکل ہو رہا

ہے تو ۷ مرتبہ پڑھ لو، ۷ مرتبہ مشکل ہو رہا ہو تو ۳ مرتبہ پڑھ لو، اور یہ طے کرلو کہ اس وقت تک بستر پر نہیں جاؤنگا جب تک تین تین مرتبہ یہ معمول پورا نہیں کرلوں گا۔ لیکن چھوڑو نہیں، اس لئے کہ چھوڑنے میں بڑی بے برکتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہ امید رکھو کہ اللہ تعالیٰ اس کم مقدار سے بھی کام بنادیں گے۔

باقی کی تلافی استغفار سے کرلو

ایک طرف تو کم مقدار پر عمل کرلو، اور دوسری طرف یہ کرو کہ معمول کی جس مقدار کو چھوڑ دیا ہے، اس پر ندامت، استغفار، شکستگی اور عاجزی کا اظہار کرو، اور اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! مجھ سے اس پر عمل نہیں بن پڑا، تو پھر یہ عاجزی، شکستگی اور استغفار باقی کی تلافی کردیگا۔ یہ "استغفار" بڑی عجیب و غریب چیز ہے، جو عمل انسان سے چھوٹ جائے، مقدار میں چھوٹ جائے، یا کیفیت کے اعتبار سے چھوٹ جائے، مثلاً کوئی عبادت جتنی کرنی تھی اتنی نہیں کی، یا جیسی کرنی تھی ویسی نہیں کی، تو دونوں کی تلافی "استغفار" سے ہو جاتی ہے۔

عبادت کے بعد تحمید و استغفار

میں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک ارشاد اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا۔ کسی کتاب میں نظر سے نہیں گزرا، لیکن ظاہر ہے کہ کسی کتاب ہی سے حضرت نے نقل کیا ہوگا۔ وہ یہ کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

جو شخص کوئی بھی عبادت کرنے کے بعد یہ دو جملے کہہ دے، ایک "الحمد للہ" اور دوسرے "استغفر اللہ" تو شیطان کہتا ہے کہ اس نے میری کمر توڑ دی۔

مثلاً نماز پڑھی اور نماز کے بعد "الحمد للہ" اور "استغفر اللہ" کہدیا تو شیطان کہتا ہے کہ اس نے میری کمر توڑ دی، کیوں؟

شیطان کے ایک داؤ کا علاج "استغفار"

وجہ اس کی یہ ہے کہ شیطان کے داؤ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک داؤ یہ ہوتا ہے کہ جب انسان نماز پڑھ کر فارغ ہوتا ہے تو شیطان اس سے یہ کہتا ہے کہ تو نے کیا نماز پڑھی، تو نے تو ٹکریں ماریں، تو کیا اور تیری نماز کیا، یہ تیری نماز تو کچھ بھی نہیں ہے، کیونکہ نماز کے اندر تیرا دھیان کہیں تھا، تیرا دل کہیں تھا، نہ تجھ سے نماز کے آداب پورے ہوئے، نہ شرائط پوری ہوئیں، اس لئے اس نماز سے تجھے کوئی اجر و ثواب حاصل نہیں ہوگا، تیری یہ نماز بیکار ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان سب باتوں کے ذریعہ شیطان اس کے اندر نماز سے مایوسی پیدا کر دیتا ہے۔ اس مایوسی کا علاج یہ ہے کہ نماز کے بعد کہو "استغفر اللہ" یعنی اے اللہ! اس نماز میں جو کوتاہی ہوئی میں اس سے مغفرت مانگتا ہوں، اس پر استغفار کرتا ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو کوتاہی ہوئی تھی، اللہ تعالیٰ اس کو کامل بنادیں گے، اس لئے کہ یہ استغفار ہر کوتاہ عمل کو کامل بنانے والا ہے۔

دوسرے داؤ کا علاج "تحمید"

شیطان کا دوسرا داؤ یہ ہوتا ہے کہ جب انسان عبادت کر لیتا ہے تو اس کو تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ واہ، تو نے بڑی اچھی اور اعلیٰ درجے کی عبادت انجام دی، اور اب تو اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں میں شامل ہو گیا۔

عربی میں ایک مقولہ مشہور ہے کہ:

صَلَّى الْحَائِكُ رَكْعَتَيْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْيَ۔

ایک مرتبہ ایک جولاہے نے دو رکعتیں نماز کی پڑھ لیں، اور پھر وحی کے انتظار میں بیٹھ گیا کہ کب میرے اوپر وحی نازل ہوتی ہے۔ اسی طرح ہم جیسے آدمی کو جب تھوڑی بہت عبادت کی توفیق ہو جاتی ہے تو دماغ میں یہ خنّاس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کا بھی علاج یہ ہے کہ جب عبادت کر لو تو کہو، "الحمد للہ" ارے ہم کیا اور ہماری عِبادت کیا، انہی کی توفیق سے یہ عبادت انجام پائی ہے، ہماری کیا حقیقت کہ ہم سے کوئی عبادت انجام پا جائے ؎

جو کچھ ہوا ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا تیرے کرم سے ہوگا

اللہ تعالیٰ کی مرضی کے بغیر ذرہ نہیں ہل سکتا، اس لئے عبادت کے بعد کہو "الحمد للہ" اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے عبادت کی توفیق عطا فرما دی۔ بہر حال! ہر عبادت کے بعد کہو "الحمد للہ، استغفر اللہ"۔ الحمد للہ کے ذریعہ اللہ

تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کرو، اور استغفر اللہ کے ذریعہ اپنی کوتاہی پر استغفار کرو کہ ہم سے صحیح طور پر عبادت انجام نہیں پائی۔ بس یہ دو چیزیں جمع کرلو تو اس پر شیطان کہتا ہے کہ اس نے میری کمر توڑ دی، اب میرے لئے اس موقع پر بہکانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

ہر نماز کے بعد تین مرتبہ استغفار

یہ تو حدیث میں موجود ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے بعد تین مرتبہ استغفار کیا کرتے تھے، "استغفر اللہ، استغفر اللہ، استغفر اللہ"۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ استغفار کرنے کا کونسا موقع ہے؟ کیونکہ استغفار تو کسی گناہ کے بعد کیا جاتا ہے نہ کہ عبادت کے بعد، لیکن یہاں نماز پڑھنے کے فوراً بعد استغفار پڑھا جارہا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ استغفار کے ذریعہ اس بات کا اقرار ہورہا ہے کہ یا اللہ! جیسی نماز پڑھنی چاہئے تھی، ویسی نماز ہم سے بن نہیں پڑی، اے اللہ! اس پر ہماری مغفرت فرما۔

ایک دن میں ستّر مرتبہ استغفار

بہرحال! یہ استغفار بڑا عجیب تریاق اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ ہر وقت استغفار کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "میں دن میں ستّر مرتبہ استغفار کرتا ہوں"۔ علماء نے فرمایا کہ یہ ستّر کا عدد تکثیر کے لئے ہے، تحدید کے لئے نہیں، یعنی میں بہت کثرت سے

استغفار کرتا ہوں۔ تو جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو گناہوں سے معصوم تھے، وہ کثرت سے استغفار فرماتے تھے تو ہم آپ کو تو ہر وقت استغفار کرنا چاہئے، اس لئے کہ ہم تو ہر وقت گناہوں اور خطاؤں میں مبتلا رہتے ہیں، ورنہ کم از کم عبادت کی کوتاہیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کا علاج یہ استغفار ہے۔

استغفار سے مدارج کی ترقی

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ استغفار ایسی چیز ہے کہ بعض اوقات بندہ اس کے ذریعہ اتنے مدارج اور اتنے درجات حاصل کرتا ہے کہ اگر انسان کوتاہی نہ کرتا تو شاید اس کو اتنے مدارج نہ ملتے جتنے مدارج کوتاہی کر کے پھر اس پر استغفار کرنے سے مل جاتے ہیں۔

ایسی تیسی میرے گناہوں کی

ہمارے ایک بزرگ تھے حضرت بابا نجم احسن صاحب قدس اللہ سرہ، جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز صحبت تھے، بڑے عجیب بزرگ تھے، وہ شعر بھی بڑے اچھے کہا کرتے تھے، اور ان کے شعر کہنے کا انداز ایسا بے تکلفی کا ہوتا تھا جیسے کسی زمانے میں ''داغ'' اور ''میر'' کا بے تکلف شاعری کا انداز ہوتا تھا۔ ان کا ایک بڑا پیارا شعر ہے، فرماتے تھے ؎

دولتیں مل گئی ہیں ''آہوں'' کی
ایسی تیسی میرے گناہوں کی

''آہ'' سے مراد استغفار ہے، یعنی جب مجھے استغفار کی دولت مل گئی تو اب یہ گناہ میرا کیا کریں گے۔

شکستگی پسندیدہ چیز ہے

ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ غلطی ہو جانے کے بعد جب انسان سچے دل سے استغفار کرتا ہے اور اس استغفار کرنے کے نتیجے میں قلب میں جو شکستگی پیدا ہوتی ہے اور جو عاجزی اور عبدیت پیدا ہوتی ہے، اس عبدیت اور شکستگی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس بندے کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں۔ بعض اوقات غلطی کرائی جاتی ہے، اس لئے کرائی جاتی ہے تاکہ اس کے اندر شکستگی پیدا ہو۔ اس لئے یہ استغفار بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔

ہمارے حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ ایک آدمی بیٹھا ہوا رو رہا ہے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی، تو اللہ تعالیٰ کو یہ رونا بڑا پسند ہے، اور پھر وہ شخص اللہ تعالیٰ کی ستّاری اور غفّاری کا مورد بنتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ''ستّار'' اور ''غفّار'' ہونے کی جو صفات ہیں وہ اس وقت ظاہر ہوتی ہیں۔

شیطان کا تہجد کے لئے اٹھانے کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ روزانہ پابندی سے تہجد پڑھا کرتے تھے، ایک روز تہجد کے وقت آنکھ نہ کھلی اور سوتے رہ گئے اور تہجد کی نماز چھوٹ گئی، جب صبح بیدار

ہوئے تو بڑا صدمہ ہوا کہ آج میری تہجد کی نماز چھوٹ گئی، اور اس کے نتیجے میں سارا دن روتے رہے اور توبہ استغفار کرتے رہے۔ جب اگلی رات کو سوئے تو تہجد کے وقت ان کو بیدار کرنے کے لئے کوئی شخص پہنچ گیا، آپ بیدار ہوئے اور اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں شیطان ہوں، آپ نے فرمایا کہ تہجد کے لئے بیدار کرنے سے تیرا کیا تعلق؟ کہنے لگا کہ ان باتوں کو چھوڑو، بس جلدی سے اٹھ جاؤ اور تہجد پڑھ لو۔ آپ نے فرمایا کہ آخر تم کیوں اٹھا رہے ہو، تم تو نماز سے روکنے والے اور بہکانے والے ہو؟ اس پر شیطان نے جواب دیا کہ میں نے گزشتہ کل آپ کو بہکا کر سلا دیا تھا اور اس کے نتیجے میں آپ کی تہجد قضا ہو گئی تھی، لیکن اس کی وجہ سے آپ سارا دن روتے رہے اور استغفار کرتے رہے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے درجات اتنے بلند کر دیے کہ تہجد پڑھنے سے بھی وہ درجات نہیں ملتے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ آج میں خود آپ کو اٹھا دوں تا کہ مزید درجات بلند نہ ہوں۔

استغفار کار آمد چیز ہے

بہر حال! یہ استغفار بڑی کار آمد چیز ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ گناہ کرتے رہو اور پھر اس پر استغفار کرتے رہو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی غلطی ہو جائے یا کوتاہی ہو جائے، اور ہر انسان سے ہو ہی جاتی ہے تو اس وقت پھر استغفار کو اپنا معمول بنا لو، اور چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے ہر وقت استغفار کرتے رہو، اور اس وقت تک انسان کی تکمیل نہیں ہوتی جب تک وہ استغفار کو اپنا

معمول نہ بنالے۔ اس لئے جب کبھی عبادات میں، خیالات میں، تصور میں کوتاہی ہو جائے تو فوراً کہو:

'استغفر اللّٰہ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ۔

یہ استغفار ہر زہر کا تریاق ہے۔

استغفار شیطان کے زہر کا تریاق

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو پیدا کرنے کے نتیجے میں ایک زہر پیدا کیا، اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ زہر تو پیدا کریں اور تریاق پیدا نہ کریں، لہٰذا اس شیطان کے زہر کے ساتھ "استغفار" کا تریاق پیدا فرمایا، اور فرمایا کہ جب یہ شیطان تمہیں ڈسے تو تم یہ تریاق استعمال کرلو۔

جنوبی افریقہ میں ایک زہریلی جھاڑی

اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی بیماری پیدا فرماتے ہیں تو اس کا علاج بھی پیدا فرماتے ہیں، جب کوئی زہر پیدا فرماتے ہیں تو اس کا "تریاق" بھی پیدا فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاؤن سے ہم لوگ کار میں سفر کر رہے تھے، راستے میں نماز کا وقت آگیا، اتنے میں ایک خوبصورت منظر سامنے آیا، ہم نے سوچا کہ یہاں اتر کر نماز ادا کرلیں، کار سے اترے، ساتھی وضو وغیرہ کی تیاری میں مشغول ہوگئے، میں اس خوبصورت منظر سے لطف اندوز ہونے کے لئے قریب کے درخت اور جھاڑیوں کی طرف چلا گیا، وہاں

ایک جھاڑی اگی ہوئی تھی جس کے پتے بہت خوبصورت تھے، جب میں نے اس کے پتے توڑنے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو میرے ایک ساتھی ایک دم سے میری طرف لپکے کہ نہیں مولانا، اس کو ہاتھ مت لگائیے، میں نے پوچھا کہ کیوں؟ انہوں نے بتایا کہ یہ بہت زہریلی جھاڑی ہے، اگر اس کو ہاتھ لگادیں تو ہاتھ میں زہر پھیل جاتا ہے، اور بچھو کے کاٹنے سے جیسی لہریں اٹھتی ہیں اس کو ہاتھ لگانے سے ویسی لہریں اٹھتی ہیں، یہ اتنی خطرناک ہے، اس لئے ہم نے آپ کو اس سے روکا۔

میں نے کہا کہ یہ تو بڑی خطرناک جھاڑی ہے، اب اس وقت تو آپ نے مجھے اس کے بارے میں بتادیا، لیکن اگر انجان آدمی آکر اس کو ہاتھ لگادے گا تو اس کے سارے جسم میں زہر چڑھ جائے گا۔ میرے رفقاء سفر نے کہا کہ یہ بات تو ہے، لیکن جہاں یہ جھاڑی اگتی ہے، اسی کی جڑ میں ایک اور جھاڑی ضرور اگتی ہے اور وہ اس کے زہر کا تریاق ہے، لہٰذا اگر کسی شخص کو اس جھاڑی کے ہاتھ لگانے سے زہر چڑھ جائے تو وہ نیچے والی جھاڑی کو ہاتھ لگادے تو وہ زہر ختم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر زہر کا تریاق پیدا فرمایا ہے۔

توبہ کرنے والا گناہوں سے پاک

اسی طرح یہ شیطان بھی ایک زہر ہے، جب اس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تو اس کا تریاق بھی پیدا فرمایا، اور وہ تریاق بہت آسان ہے، اس کو حاصل کرنے کے لئے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر انسان ذرا توجہ کرکے، سچے

دل سے، ندامت قلب سے، اور آئندہ گناہوں کو چھوڑنے کا عزم کر کے یہ کہدے:

اَسْتَغْفِرُاللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَـیْهِ۔

توبس سارازہر ختم ہو جائے گا۔ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:

التائب من الذنب کمن لا ذنب له۔

(کنزالعمال، حدیث نمبر۱۰۱۷۶)

گناہوں سے توبہ کرنے والا شخص اس شخص کی طرح ہے
جس کا کوئی گناہ نہ ہو۔

توبہ کے بعد اس کے نامہ اعمال سے وہ گناہ مٹادیا جاتا ہے، وہ گناہ جس سے سچے دل سے توبہ کرلی، اب وہ نامہ اعمال میں باقی نہیں، اس لئے یہ استغفار بہت عمدہ چیز ہے۔

سحری کے وقت استغفار کیوں؟

قرآن کریم کی جب آیت نازل ہوئی:

کَانُوْا قَلِیْلاً مِّنَ الَّیْلِ مَا یَهْجَعُوْنَ ○
وَبِالْاَسْحَارِهُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ۔

(سورۃ الذاریات، آیت ۱۷۔۱۸)

یعنی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے رات کو بہت کم سوتے ہیں
اور ساری رات کھڑے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول

رہتے ہیں اور پھر سحری کے وقت وہ استغفار کرتے ہیں۔

تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ سحری کے وقت استغفار کرنے کا کیا مطلب ہے؟ ساری رات تو عبادت کی، کوئی گناہ تو نہیں کیا جس سے وہ استغفار کرتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس عبادت سے استغفار کر رہے ہیں کہ یا اللہ! ہم نے عبادت تو کی، لیکن آپ کی عبادت کا حق ادا نہ ہوا، اس سے استغفار کر رہے ہیں، اور جب یہ کہدیا کہ ہم سے حق ادا نہ ہوا تو وہ عبادت بھی قبول ہو گئی۔

خلاصہ

اس لئے ہر وقت استغفار کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے، جب بھی ماضی کے کسی فعل کا خیال آئے، اس پر استغفار کر لو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۴۳

اوراد و وظائف

سے مقصود "عبدیت" ہے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۴۳

صفحات : ۱۳

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ط

مجلس نمبر ۳۴

اوراد و وظائف سے مقصود "عبدیت" ہے

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین،
والصّلاة والسّلام علیٰ رسوله الکریم، وعلیٰ
آله وأصحابه أجمعین، امابعد!

"ورد" کا مقصود اصلی "عبدیت" ہے

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

ورد سے جو مقصود اصلی ہے وہ خود مرض میں بھی حاصل ہے یعنی "عبدیت"

(انفاس عیسیٰ، ص ٦٨)

بعض اوقات کسی عذر مثلاً بیماری کی وجہ سے انسان کے معمولات چھوٹ جاتے ہیں، بعض لوگوں کو ان معمولات کے چھوٹ جانے کا صدمہ ہوتا ہے، اگر یہ بات صرف "صدمہ" کی حد تک ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، لیکن بعض اوقات یہ بات بے چینی اور پریشانی کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔

اس کے بارے میں حضرت والا فرما رہے ہیں کہ معمولات چھوٹ جانے پر پریشانی ٹھیک نہیں، اس لئے کہ ان سارے ذکر و اذکار، اوراد اور معمولات کا حاصل "بندگی" اور اظہارِ عبدیت ہے۔ لہٰذا اگر بیماری کی وجہ سے وہ معمولات چھوٹ گئے تو اس بیماری کی حالت میں انسان کے اندر جو شکستگی اور عاجزی آجاتی ہے، اس شکستگی کی وجہ سے خود "عبدیت" پیدا ہو رہی ہے اور خود بخود حاصل ہو رہی ہے۔

رخصتوں پر عمل کرنا بھی پسندیدہ ہے

اللہ تبارک و تعالیٰ نے جتنی بھی رخصتیں عطا فرمائی ہیں، ان سب کا یہی حال ہے، حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اِنّ اللّٰهَ يحبّ أن تؤتى رخصة كما يحب أن تؤتى عزائمه۔

(کنز العمال، حدیث نمبر ۵۳۳۴)

یعنی اللہ تعالیٰ جس طرح عزیمت پر عمل کرنے کو پسند فرماتے ہیں، اسی طرح رخصتوں پر بھی عمل کرنے کو پسند فرماتے ہیں۔ اس لئے کہ عزیمت اللہ جل شانہ کی عظمت کا حق ہے، اور رخصت انسان کی "عبدیت" کا حق ہے اور "بندگی" کا اظہار ہے۔ اللہ جل شانہ کے سامنے انسان کیا بہادری دکھائے گا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے تو شکستگی اور عبدیت اور عاجزی کا اظہار کرنا چاہئے اور "رخصت" پر عمل کرنے سے انسان کے اندر عاجزی، عبدیت اور شکستگی کی

کیفیت پیدا ہوتی ہے اور یہ کیفیت انسان کو کہیں سے کہیں پہنچادیتی ہے، لہٰذا رخصتوں پر عمل کرنے سے کبھی دل تنگ نہ کرنا چاہئے۔

رخصت پر عمل کرنے سے دل تنگ نہ ہو

انسان اس بات کا تو اطمینان کرلے کہ آیا رخصت پر عمل کرنے کا موقع ہے یا نہیں؟ اور اس وقت شرعاً رخصت پر عمل کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں؟ لیکن جب یہ اطمینان ہو جائے کہ شرعی اعتبار سے رخصت پر عمل کرنے کی گنجائش ہے تو اب رخصت پر عمل کرنے سے دل تنگ نہ کرے، اس موقع پر صدمہ کرنے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالیٰ کو یہی پسند ہے۔

یہ روزہ کس کے لئے رکھ رہے ہو؟

یہ روزہ تم کس کے لئے رکھ رہے ہو؟ اگر اپنی ذات کے لئے اور اپنی خوشی کے لئے روزہ رکھ رہے ہو، اگر اپنا شوق پورا کرنے کے لئے روزہ رکھ رہے ہو، اور پھر بیماری کی وجہ سے روزہ چھوٹ جائے تو ضرور اس بات پر صدمہ کرو کہ بیماری آگئی اور اس کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا۔ لیکن اگر یہ روزہ اللہ کے لئے رکھ رہے ہو اور اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ بیماری میں روزہ چھوڑ دو تو پھر روزہ کا جو مقصود ہے وہ حاصل ہے، کھا کر وہ مقصود حاصل ہے جو نہ کھانے سے حاصل ہوتا ہے، اس لئے کہ جب اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ کھاؤ، تو اب کھانا ہی چاہئے، اس لئے کہ دین کی حقیقت "اتباع" ہے، اس اتباع میں

دل تنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور یہ روزہ نہ رکھنا بھی بعض حالات میں پسندیدہ ہو جاتا ہے، اور بعض حالات میں "واجب" ہو جاتا ہے، لیکن آپ نے یہ عزم کر رکھا ہے کہ چاہے بیماری آئے چاہے کچھ ہو جائے، میں تو روزہ رکھوں گا۔ یاد رکھئے! یہ چیز اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اتباع کے خلاف ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بہادری دکھانا ہے کہ ہم بڑے بہادر ہیں کہ بیماری میں بھی روزہ رکھ رہے ہیں۔

سفر میں روزہ رکھنا

اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا:

لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصِّيَامُ فِي السَّفَرِ۔

(نسائی، کتاب الصوم، باب مایکرہ من الصیام فی السفر)

سفر کی حالت میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں۔

اس سفر سے مراد وہ سفر ہے جس میں مشقت زیادہ ہو، ایسے سفر میں روزہ رکھنا کوئی نیکی کا کام نہیں۔ اب ذرا سوچئے! ایک طرف تو روزہ کے فوائد بیان کئے جا رہے ہیں اور اس پر اجر و ثواب بیان کیا جا رہا ہے اور یہ اعلان کیا جا رہا ہے کہ یہ روزہ میرے لئے ہے، میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ اسی روزے کے بارے میں فرمایا کہ اب روزہ رکھنا کوئی نیکی نہیں، کیوں؟ اس لئے کہ اب ہمارا حکم نہیں ہے، جب ہمارا حکم نہیں تو اب روزہ رکھنا کوئی فضیلت کا کام نہیں،

کوئی نیکی کا کام نہیں۔

جیساوہ کہیں وہ کرو

بہر حال، اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری دکھانا کوئی اچھی بات نہیں، جب اللہ تعالیٰ نے خود بیماری دیدی، خود عذر دیدیا تو اس کا حق یہ ہے کہ اس وقت میں رخصت پر عمل کرو۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چوں کہ بر میخت ببندد بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

یعنی جب باندھ کر ڈال دیں تو اب بندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ بندھے پڑے رہو، ہاں جب وہ کھول دیں تو پھر خوب دڑنگیاں لگاؤ، اس وقت اللہ تعالیٰ نے تمہیں رخصت عطا فرمادی ہے، اس رخصت پر عمل کرو، لہٰذا رخصت پر عمل کرنے سے کبھی دل تنگ نہ کرو۔

حضور ﷺ آسانی اختیار فرماتے

بعض لوگوں کی طبیعت سخت کوشی کی ہوتی ہے، وہ یہ چاہتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ مشقت کا کام کریں، اور مشقت کو ڈھونڈتے ہیں، اس لئے ڈھونڈتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں فضیلت زیادہ ہے، اس میں ثواب زیادہ ہے۔ یہ بات بہت سے بزرگوں سے بھی منقول ہے، لہٰذا ان کی شان میں کوئی ایسا کلمہ نہیں کہنا چاہئے جو گستاخی کا ہو، لیکن سنّت کا یہ طریقہ نہیں ہے، سنّت وہ ہے جو

حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت بیان فرمائی گئی کہ:

ماخيّر رسول الله صلى الله عليه وسلم بين أمرين قطّ الاّ اخذ أيسرهما۔

(صحیح بخاری، کتاب الانبیاء، باب صفۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

یعنی جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دو چیزوں کے درمیان اختیار دیا جاتا تو آپ ان میں سے آسان تر کو اختیار فرماتے۔ اور یہ آسان تر کو اختیار کرنا کیا "معاذ اللہ" آپ کی تن آسانی کی وجہ سے تھا؟ یا آپ مشقت سے بچنے کے لئے ایسا فرماتے تھے؟ یا دنیاوی راحت اور آرام پانے کے لئے تھا؟ ظاہر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اس بات کا تصور بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ تن آسانی کے لئے آسان راستہ اختیار فرماتے تھے۔ بلکہ اصل بات یہ تھی کہ آسان راستہ اختیار کرنے میں عبدیت اور بندگی زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری نہیں دکھانی بلکہ شکستگی کا اظہار کرنا ہے کہ میں عاجز بندہ ہوں میں تو آسان راستہ اختیار کرتا ہوں۔ یہ بندگی ہے، اس بندگی کے اظہار کے لئے آسان راستہ اختیار فرماتے، اگر مشقت والے راستے کو اختیار فرماتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اپنی بہادری دکھاتے۔

توڑنا ہے حُسن کا پندار کیا؟

ہمارے بڑے بھائی تھے، بھائی ذکی کیفی مرحوم، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین، بڑے اچھے شعر کہا کرتے تھے، ان کا دیوان بھی

"کیفیات" کے نام سے چھپ گیا ہے، اس بات کو انہوں نے ایک شعر میں بیان کیا ہے، آج لوگ ان کے اس شعر کو سمجھتے نہیں ہیں، فرمایا:

اس قدر بھی ضبطِ غم اچھا نہیں
توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟

کیا تم حسن کا پندار توڑنا چاہتے ہو کہ تم مجھے جتنی بھی مشقتیں دو، میں اس کو برداشت کرلوں گا، العیاذ باللہ، اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری نہیں دکھانی، وہاں تو شکستگی پسند ہے۔

ایک بزرگ کا قصّہ

ایک مرتبہ ایک بزرگ دوسرے بزرگ کی عیادت کے لئے گئے، وہ بزرگ درد اور تکلیف میں مبتلا تھے، ان کو جاکر دیکھا کہ وہ اسی درد اور تکلیف کی حالت میں "الحمد للہ الحمد للہ" کا ورد کر رہے ہیں۔ جو بزرگ ان کی عیادت کے لئے گئے تھے، انہوں نے جاکر کہا کہ آپ کا یہ مقام تو بہت اونچا ہے کہ آپ اس حالت میں بھی شکر ادا کر رہے ہیں، لیکن ایک بات بتادوں کہ جب تک تم "الحمد للہ الحمد للہ" کا ورد جاری رکھو گے، صحت حاصل نہیں ہوگی، اور یہ درد اور تکلیف دور نہیں ہوگی۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر کیا کروں؟ انہوں نے فرمایا کہ تھوڑا سا ہائے ہائے کرو، اور اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! یہ تکلیف دور فرما دیجئے۔

پیغمبرانہ عمل

جیسا کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا تھا:

اَنِّی مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرَّاحِمِیْنَ۔

(سورۃ الانبیاء، آیت ۸۳)

بیشک مجھے یہ تکلیف پہنچی ہے اور آپ سب مہربانوں سے زیادہ مہربان ہیں۔

یہ ہے پیغمبرانہ عمل، جب تکلیف ہو یہ کہو کہ یا اللہ! مجھے یہ تکلیف ہے، اپنی رحمت سے دور فرما دیجئے، اللہ تعالیٰ کو پکارو، اپنی تکلیف ان کو بتاؤ۔ یہ "الحمد للہ الحمد للہ" کا ورد کر کے تم ان کے سامنے اپنی بہادری جتا رہے ہو کہ میں کتنا ہی بیمار ہو جاؤں، پھر بھی ہائے ہائے نہیں کروں گا، یہ نہ ہو، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کا اظہار کرو، اسی کا نام "بندگی" ہے۔ جب وہ یہ چاہ رہے ہیں کہ اپنی تکلیف ہمارے سامنے بیان کرو، تو اب بیان کرنے میں اظہار عبدیت اور بندگی ہے، ہاں یہ بیان شکوہ کے طور پر نہ ہو، بلکہ اپنی عاجزی کے اظہار کے لئے ہو کہ یا اللہ! میں تو عاجز بندہ ہوں، آپ صحت عطا فرما دیجئے۔

بندگی کا تقاضہ

بہر حال! بندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی عزیمت پر بھی عمل کرے اور رخصت پر بھی عمل کرے، اور رخصت پر عمل کرتے وقت دل تنگ نہ کرے،

اور اگر بالفرض طبعی صدمہ ہو اور یہ طبعی صدمہ ہوتا ہے، اس لئے کہ ایک شخص ساری عمر روزہ کا پابند رہا، اب بیماری کی وجہ سے روزے چھوٹ گئے، تو روزے کے چھوٹنے پر صدمہ تو ہوگا، یہ صدمہ برا نہیں ہے، بلکہ اس صدمہ پر اور اجر و ثواب ہوگا، انشاء اللہ، لیکن اس رخصت پر عمل کرنے میں دل تنگ نہ کرے، اس کا نام عبدیت اور بندگی ہے۔

انسان کا اعلیٰ ترین مقام

یاد رکھئے! انسان کا اعلیٰ ترین مقام جس سے اعلیٰ مقام انسان کے لئے کوئی اور نہیں ہو سکتا، وہ "عبدیت" کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ کی "بندگی" کا مقام ہے، اس سے اونچا کوئی مقام نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بے شمار اوصاف بیان فرمائے، فرمایا:

اِنَّا اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّراً وَّنَذِیْراً ○ وَدَا عِیاً اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَا جاً مُّنِیْراً ○

(الاحزاب، آیت ۴۵-۴۶)

اے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے بیشک آپ کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔

دیکھئے، اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے کیسے کیسے اوصاف بیان فرمائے، اور کیسے کیسے انداز سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو تعبیر فرمایا، لیکن قرآن کریم میں جہاں ''معراج'' کا ذکر فرمایا کہ ہم نے ان کو اپنے پاس بلایا اور اونچے مقامات کی سیر کرائی، وہاں پر جو لفظ بیان فرمایا، وہ یہ تھا:

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلاً مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔

(سورۃ الاسراء، آیت ۱)

یعنی پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو لے گئی رات کے وقت مسجد حرام سے۔

اس موقع پر نہ شَاهِداً کا لفظ بیان فرمایا، نہ مُبَشِّراً کا، نہ دَاعِیاً کا نہ سِرَاجاً کا لفظ، نہ مُنِیْراً کا لفظ بیان فرمایا، بلکہ یہاں صرف ایک لفظ ''عبد'' کو بیان فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو لے گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کے لئے سب سے اونچا مقام ''عبدیت'' کا مقام ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی، اپنی شکستگی اور اپنی عاجزی کے اظہار کا مقام ہے۔

اللہ تعالیٰ شکستہ دلوں کے ساتھ ہوتے ہیں

اسی وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ:

ان اللہ مع المنکسرۃ قلوبھم۔

یعنی اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دلوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔

مثلاً بیماری کی وجہ سے روزہ چھوٹ گیا، اور روزہ چھوٹ جانے کے صدمہ کی وجہ سے دل ٹوٹا اور دل شکستہ ہوا، اللہ تعالیٰ اس دل شکستگی کے ساتھ ہوتے ہیں اور شکستہ دل کو نواز دیتے ہیں۔ یہ دل کا ٹوٹنا، چاہے صدموں سے ہو، چاہے غموں سے ہو، یا افکار کی وجہ سے ہو، یا خوف خدا سے ہو، یا فکر آخرت سے ہو، کسی طرح بھی ہو، جب دل ٹوٹتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا مورد بنتا ہے۔ دل پر جو دن رات چوٹیں پڑتی رہتی ہیں کہ کبھی کوئی تکلیف آگئی، کبھی کوئی صدمہ آگیا، کبھی کوئی پریشانی آگئی، یہ دل کو توڑا جارہا ہے، کیوں توڑا جارہا ہے؟ یہ اس لئے توڑا جارہا ہے کہ اس دل کو اپنی رحمتوں کا اور اپنے فضل و کرم کا مورد بنانا ہے۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے کہ یہ آئنہ ہے وہ آئنہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئنہ ساز میں

یہ دل جتنا ٹوٹے گا، اتنا ہی اس کے بنانے والے کی نگاہ میں عزیز ہو گا۔

اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک شعر سنایا کرتے تھے، حضرت والا کو شعر بھی بہت منتخب یاد تھے، فرماتے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کے دل کو توڑتے ہیں تو درحقیقت اس شخص کو کہیں بلندیوں تک پہنچانا مقصود ہوتا ہے، یہ صدمے، یہ غم، یہ افکار جو انسان پر آتے ہیں، یہ مجاہدہ اضطراری ہوتا ہے، اور مجاہدہ اضطراری انسان کی اتنی تیزی سے ترقی کراتا ہے

کہ عام حالات میں اتنی تیزی سے ترقی نہیں ہو سکتی۔

اس پر ایک شعر سناتے:

یہ کہہ کے کاسہ ساز نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

جب یہ دل ٹوٹ کر بنتا ہے تو کچھ اور ہی بنتا ہے، اس وقت وہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلّیات کا اور اس کی رحمتوں کا مورد بنتا ہے۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ غزل کا ایک شعر سنایا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ شعر تو غزل کا ہے لیکن اس میں یہی مضمون آیا ہے، فرمایا:

بتانِ ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

یعنی اللہ تعالیٰ اس ٹوٹے ہوئے دل میں اپنی تجلّی فرماتے ہیں۔ اس لئے ان صدموں سے، ان غموں سے اور جو آنسو گر رہے ہیں، ان سے ڈرو نہیں، یہ دل جو ٹوٹ رہا ہے، یہ آہیں جو نکل رہی ہیں، ان سے گھبراؤ نہیں، اگر دل میں اللہ جلّ جلالہ پر ایمان ہے، اور اللہ تعالیٰ کی تصدیق دل میں ہے تو سب آہیں اور کراہیں تمہیں کہیں سے کہیں پہنچا رہی ہیں۔

وادیٔ عشق بسے دور و دراز ست ولے
طے شود جادۂ صد سالہ بآھے گاھے

یعنی وادی عشق اگرچہ بہت دور ہے، لیکن بعض اوقات سو سال کا راستہ ایک آہ میں طے ہو جاتا ہے۔ اس لئے اپنے اندر شکستگی پیدا کرو، اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو جائے گا اور منزل تک پہنچ جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے اندر یہ عاجزی اور شکستگی پیدا فرمادے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۴۴

ذکر میں دل نہ لگنے کے اسباب

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۴۴

صفحات : ۱۴

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

مجلس نمبر ۴۴

ذکر میں دل نہ لگنے کے اسباب

الحمدللّٰہ رب العالمین ۔ والعاقبۃ للمتقین۔ والصّلوٰۃ والسّلام علٰی رسولہ الکریم۔ وعلٰی آلہ واصحابہ اجمعین ۔ أَمَّا بَعْدُ!

ذکر میں فائدہ ”قصد“ پر موقوف ہے

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

صرف دل سے ذکر کرنا بھی نافع ہے جب بقصد ہو ورنہ بلا قصد نفع مقصود حاصل نہیں ہوتا، قلب اور زبان دونوں کو جمع کرنا زیادہ نافع ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۸)

یعنی اگر زبان سے ذکر نہیں ہو رہا ہے، صرف دل سے ذکر ہو رہا ہے، اور دل سے

ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ذکر کے الفاظ کا تصوّر دل میں لائے اور دل دل میں وہ الفاظ دھراتا رہے، اگرچہ زبان نہ ہلے، تو اگر قصد اور ارادے سے دل دل میں وہ الفاظ دہرارہا ہے تو یہ بھی نافع ہے، لیکن اگر بلا قصد الفاظ دھرارہا ہے تو پھر مقصود حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِیْمَاناً وَ اِحْتِسَاباً غُفِرَلَہٗ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِہٖ۔

(صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب من صام رمضان ایماناً و احتساباً)

یعنی جو شخص ایمان کے ساتھ اور ثواب کی امید کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے گا تو اس کے تمام پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے۔

اس حدیث میں روزے کے نتیجے میں گناہوں کی مغفرت کی دو شرطیں بیان فرمائیں، ایک یہ کہ وہ شخص مؤمن ہو، دوسرے یہ کہ "احتساب" ہو، احتساب کے معنی ہیں کہ ثواب کی نیت سے روزہ رکھا ہو، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور ثواب حاصل کرنے کی نیت سے روزہ رکھے گا تو اس وقت یہ فائدہ حاصل ہوگا۔

لذّت کے حصول کیلئے روزہ رکھنا

اس لئے اگر کسی شخص نے صرف روزہ رکھنے کی نیت سے روزہ رکھا تو فقہی اعتبار سے روزہ ہو جائے گا، لیکن اس روزے کا مقصود چونکہ اللہ تعالیٰ کو

راضی کرنا اور ثواب **حاصل** کرنا نہیں تھا، اس لئے اس روزے پر اجر و ثواب مرتّب نہیں ہوگا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ بیان فرمایا کہ ایک صاحب مجھے ملے جو بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بہت موڈرن تھے، وہ دین کے دوسرے ارکان پر تو عامل نہیں تھے، لیکن روزے کے بہت پابند تھے۔ ایک دن ذکر آیا تو میں نے ان سے کہا کہ ماشاء اللہ آپ روزہ بڑی پابندی سے رکھتے ہیں۔ جواب میں وہ صاحب کہنے لگے کہ اگر شریعت نے روزہ رکھنے کا حکم نہ بھی دیا ہوتا، تب بھی انسان کی صحت کے لئے سال بھر میں ایک ماہ روزہ رکھنا ضروری ہے، میں اس لئے روزہ رکھتا ہوں کہ ایک ماہ تک روزہ رکھنے کے نتیجے میں صحت بہت عمدہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ افطار کے وقت کھانے میں جو لذّت آتی ہے، وہ سارے سال کسی اور وقت کھانے میں نہیں آتی، ان دو وجہ سے میں روزہ رکھتا ہوں۔ اب دیکھئے! وہ شخص سارا مہینہ روزہ رکھ رہا ہے، لیکن اس کا مقصد افطار کی لذّت حاصل کرنا ہے، اور اپنی صحت اور تندرستی حاصل کرنا ہے، لہٰذا وہ روزہ ''احتساب'' یعنی طلب ثواب کے لئے اور طلب اجر کے لئے نہ ہوا، ایسے روزے پر وہ فضیلت مرتّب نہیں ہوگی جس کا حدیث میں بیان ہوا ہے۔ اور چونکہ روزہ رکھے کا قصد تھا، اس لئے اگر کسی مفتی سے پوچھا جائے گا کہ یہ روزہ ہوا یا نہیں؟ وہ مفتی یہی جواب دے گا کہ روزہ ہو گیا، لیکن اگر ''صوفی'' سے پوچھو تو یہ جواب دے گا کہ وہ روزہ نہیں ہوا، یعنی اس روزے کا جو مقصود تھا وہ حاصل نہیں ہوا۔

زبان اور دل دونوں سے ذکر کرے

اسی لئے حضرت والا نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ "ذکر" بھی اسی وقت نافع ہوتا ہے جب بالقصد کیا جائے، اگر ویسے ہی زبان ذکر کرنے کے لئے چل پڑی اور اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود نہیں تھا، تو اس ذکر سے نفع حاصل نہیں ہوگا۔ پھر آگے حضرت والا نے فرمایا کہ:

قلب اور زبان دونوں کو ذکر میں جمع کرنا زیادہ نافع ہے۔

یعنی زیادہ نفع اس میں ہے کہ زبان بھی ذکر کرے اور قلب میں بھی اس ذکر کا تصور جمائے، ایسا ذکر زیادہ فائدہ مند ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں دو عضو اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول ہیں، اگر صرف "قلب" سے ذکر کرتا تو صرف ایک عضو مشغول ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ قلب کا حال یہ ہے کہ اگر زبان اس کے ساتھ ذکر نہ کرے تو یہ بہت جلد پھسل جاتا ہے، ابھی ذکر کرنا شروع کیا، اچانک دل میں کوئی خیال آیا، بس وہ دل پھسل گیا۔ لیکن اگر زبان بھی ذکر کر رہی ہے تو جب تک انسان اس کو روکنے کا قصد نہیں کرے گا، اس وقت تک وہ چلتی رہتی ہے، لہٰذا زبان سے ذکر کرنے کے نتیجے میں ذکر کے اندر استقامت، استقلال اور دوام پیدا ہوتا ہے۔ اس لئے بزرگ فرماتے ہیں کہ انسان اس دھوکے میں نہ رہے کہ بس صرف قلبی ذکر میں مشغول رہنا کافی ہے، بلکہ ذکر قلبی کے ساتھ ذکر لسانی بھی جاری رکھے۔

ذکر میں دل نہ لگنے کے اسباب

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

دل نہ لگنے کی بہت صورتیں ہیں، کبھی تو کسی کام کے تعلق کی وجہ سے پریشانی ہو جاتی ہے، کبھی کسی عضو میں کچھ مرض ہوتا ہے جس کی وجہ سے دل کی بھی پریشانی ہو جاتی ہے، کبھی بھوک، کبھی گناہ کا ارتکاب، ان اسباب میں سے جس کا دفعیہ اختیار میں ہو، اسے تو دفع کر کے ذکر میں مشغول ہو، بھوک ہو، کھانا میسر ہو، کھالے، تعلق اگر ناجائز ہے تو چھوڑ دے پھر ذکر میں مشغول ہو، اگر اس پر بھی دل نہ لگے تو کچھ پروانہ کرے، ذکر کو مقصود سمجھ کر پورا کر لے، انشاء اللہ ذکر کی برکت سے حالت کی اصلاح ہو جائے گی۔

(انفاس عیسیٰ ص ۶۸)

کام پہلے کر لو اور ذکر بعد میں کرو

بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم ذکر کرتے ہیں لیکن ذکر میں دل نہیں لگتا۔ اس کے بارے میں حضرت والا فرمارہے ہیں کہ ذکر میں دل نہ لگنے کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ذکر میں دل اس لئے نہیں لگتا کہ دل میں کسی کام کے کرنے کا تقاضہ ہے، اس تقاضے کی وجہ سے دل نہیں لگتا،

ایسے وقت انسان یہ کرے کہ جس کام کا تقاضہ ہے پہلے اس کام کو پورا کرے، پھر اطمینان سے بعد میں ذکر کرے۔ دیکھئے! نماز ہو یا ذکر ہو یا اوراد و ظائف ہوں یا دوسری عبادات ہوں، حتی الامکان فراغتِ ذہن کے ساتھ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، لہٰذا اگر طبیعت میں کسی کام کا تقاضہ ہے تو پہلے اس کو پورا کرلے پھر عبادت کرے، اسی وجہ سے شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر پیشاب یا پاخانے کی حاجت ہے تو پہلے اس سے فراغت حاصل کرلو، یا مثلاً بھوک تیز لگ رہی ہے تو پہلے کھانا کھالو۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا عمل

روایت میں آتا ہے کہ

وکان ابن عمر یوضع له الطعام و تقام الصلاة فلایأتیها حتی یفرغ وإنه یسمع قراءة الامام۔

(بخاری، کتاب الأذان، باب اذاحضر الطعام و اقیمت الصلاة، حدیث نمبر ۶۷۳)

بعض اوقات جماعت کھڑی ہو جاتی اور امام تلاوت شروع کر دیتے اور اس کی تلاوت کی آواز کانوں میں آرہی ہوتی لیکن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما بیٹھے کھانا کھاتے رہتے۔ اور کھانے سے فارغ ہونے کے بعد نماز میں شامل ہوتے۔ کسی نے ان سے کہا کہ حضرت! جماعت کھڑی ہوئی ہے اور آپ کھانے میں مشغول ہیں؟ جواب میں انہوں نے فرمایا:

لأن أجعل طَعامی صلاةً أحبّ إلیّ من أن اجعل

صلاتی طعاماً

یعنی میں اپنے کھانے کو نماز بنالوں، یہ صورت بہتر ہے بنسبت اس کے کہ نماز کو کھانا بنالوں۔ اس لئے کہ اگر شدید بھوک ہونے کی حالت میں جاکر نماز میں کھڑا ہو جاؤں گا تو دل ودماغ تو کھانے میں لگا رہے گا، نماز میں دل نہیں لگے گا۔ اس کے برخلاف اگر میں جماعت کھڑی ہونے کی حالت میں کھانا کھارہا ہوں گا، تو دل نماز کی طرف لگا ہوگا کہ جلدی سے کھانے سے فارغ ہو جاؤں اور جاکر جماعت میں شامل ہو جاؤں، اب یہ کھانا بھی نماز بن جائے گا۔ اور کھانے کو نماز بنالوں یہ بہتر ہے بنسبت اس کے کہ نماز کو کھانا بنالوں، اس لئے میں کھانا کھارہا ہوں۔

نماز فارغ ہونے کی چیز نہیں

ایک جملہ ہماری اور آپ کی زبانوں پر بکثرت آتا ہے اور اس کی طرف دھیان نہیں جاتا، لیکن ایسی باتوں کی طرف بزرگوں کی نگاہ جاتی ہے، عام آدمی کی نگاہ نہیں جاتی۔ ہماری زبانوں پر اکثر یہ جملہ رہتا ہے کہ ذرا نماز سے فارغ ہو جائیں تو پھر اطمینان سے کھانا کھائیں گے، یا ذرا نماز سے فارغ ہو جائیں تو پھر اطمینان سے بات کریں گے۔ ایک مرتبہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے میں نے یہ جملہ کہہ دیا کہ ذرا نماز سے فارغ ہو جائیں تو پھر کچھ بات کریں گے۔ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ کیا تم نے کہدیا کہ نماز سے فارغ ہو جائیں تو پھر بات کریں گے۔ یاد رکھئے! نماز فارغ ہونے کی چیز نہیں،

تمہاری بات کا مطلب یہ ہے کہ نماز ایک بوجھ ہے، اس سے جلد از جلد فارغ ہونا چاہتے ہو، اور اصل کام تمہارا وہ ہے جس کی طرف تم بعد میں متوجہ ہونا چاہتے ہو، مثلاً اگر تم نے یہ کہا کہ ذرا نماز سے فارغ ہو جائیں پھر کھانا کھائیں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل مقصود تو کھانا ہے، نماز تو ایک بوجھ ہے جس کو جلد از جلد ٹلا کر اس سے فارغ ہونا چاہتے ہو۔ فرمایا کہ یہ بے ادبی کی بات ہے اور بالکل غلط بات ہے۔ قرآن کریم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ فرمایا جا رہا ہے:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ

(سورۃ الانشراح، آیت ۷)

یعنی جب آپ ﷺ اور کاموں سے فارغ ہو جائیں تو اب ہمارے سامنے کھڑے ہو کر تھکئے، نماز میں اور دوسری عبادت وغیرہ میں۔ لہٰذا اور کاموں سے فارغ ہو کر نماز کی طرف متوجہ ہوں، نہ یہ کہ نماز سے فارغ ہو کر اور کاموں کی طرف متوجہ ہوں۔ حالانکہ سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے کام کیسے تھے، کیا وہ روپے پیسے جمع کر رہے تھے؟ یا کوئی ملازمت کر رہے تھے؟ یا کوئی مال و جائیداد بنا رہے تھے؟ ایسا نہیں تھا، بلکہ آپ ﷺ کی ساری مصروفیات دین ہی کی مصروفیات تھیں، کہیں جہاد کی مصروفیت، کہیں تعلیم کی مصروفیت، کہیں تربیت کی مصروفیت، کہیں امور سیاست اور امور مملکت کی مصروفیت، کہیں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی دلداری، کہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حاجت روائی وغیرہ، یہ سب کام بھی دین کے کام تھے، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ

نے ان سے فرمایا کہ ان سب کاموں سے فارغ ہو کر ہماری طرف متوجہ ہو جاؤ۔

نماز حسن لعینہ ہے

وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ سب کام حسن لغیرہ تھے، اور ہمارے سامنے کھڑے ہو کر ہماری تسبیح و تقدیس بیان نا یہ حسن لعینہ ہے، وہ کام مقصود لغیرہ تھے اور یہ کام مقصود لعینہ ہے۔ دین کے دوسرے کاموں میں اور عبادات میں یہی فرق ہے، اس لئے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ مقصود لغیرہ سے فارغ ہو کر مقصود لعینہ کی طرف آؤ۔ لہٰذا یہ کہنا بے ادبی ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر کھانا کھائیں گے، اس لئے کہ نماز فارغ ہونے کی چیز نہیں بلکہ کھانے سے فارغ ہو کر نماز پڑھو، پہلے ذہن کو کھانے سے فارغ کرو، پھر مقصود اصلی کی طرف جاؤ۔

شیخ حسن مشاطؒ کا معمول

مکہ مکرمہ میں میرے ایک شیخ تھے، حضرت شیخ مشاط مالکی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ ۱۹۶۳ء میں جب میں مکہ مکرمہ حاضر ہوا تو اس وقت وہاں کافی طویل قیام کرنے کا موقع ملا، وہ روزانہ عصر کے بعد حرم شریف میں حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے، ان کے درس میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، بڑے اللہ والے بزرگ تھے، عربوں میں ایسے بزرگ بہت کم دیکھے ہیں، اتباع سنّت اور بہترین اخلاق کے پیکر تھے، ان کی طرف لوگوں کا رجوع بہت تھا، کوئی ان سے مسئلہ پوچھ رہا ہے، کوئی مشورہ کر رہا

ہے، کوئی دوسری باتیں کر رہا ہے۔ میں نے ان کا یہ معمول دیکھا کہ مغرب کی نماز کے بعد فوراً دو سنتیں پڑھتے اور اس کے بعد آنے والے لوگوں سے ملاقات کرتے، ان کے سوالات کا جواب دیتے، یہاں تک کہ بعض اوقات آدھا گھنٹہ گزر جاتا۔ جب سب لوگوں کو جواب دے کر فارغ ہو جاتے اور سب لوگوں کو رخصت کر دیتے تو پھر کھڑے ہو کر "اللہ اکبر" کہہ کر اوّابین شروع فرما دیتے۔

اس معمول میں دو فائدے

ورنہ عام طریقہ یہ ہے کہ جب کوئی اوّابین پڑھنا چاہے تو مغرب کے بعد دو سنتیں پڑھنے کے بعد چھ رکعت اوّابین ساتھ ہی پڑھ لے، اگر لوگ انتظار کر رہے ہیں تو کرتے رہیں۔ لیکن ان کا یہ معمول تھا اور اس میں دو فائدے تھے، ایک فائدہ تو یہ تھا کہ حاجت مندوں کی حاجت جلدی رفع ہو جائے اور وہ جلدی فارغ ہو جائیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے انتظار کی حالت میں نماز میں مشغول ہوں گے تو پھر اطمینان اور خشوع کے ساتھ نماز میں دل نہیں لگے گا، اس لئے ان کو نماز سے پہلے فارغ کر دیا، جب اکیلے رہ گئے تو اب اوّابین شروع کر دیں۔ بہر حال، جس چیز سے دل مشغول ہو، انسان پہلے اس سے فارغ ہو جائے۔

نمازی کا انتظار کس جگہ کیا جائے؟

دیکھئے! یہ ادب بھی یاد رکھنے کا ہے، اکثر لوگ اس میں کوتاہی کرتے ہیں،

وہ یہ کہ ایک آدمی نماز یاذکر میں مشغول ہے اور آپ کو اس سے کچھ کام ہے، تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس کو کام ہوتا ہے وہ سر پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے یا اس کے پاس جاکر اس انداز سے بیٹھ جاتا ہے جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہم تمہارے انتظار میں ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے والے کا دھیان اس طرف لگ جاتا ہے کہ ایک شخص میرا انتظار کر رہا ہے، اور اس کا قلب اس کی طرف مشغول ہو جاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں نماز کی طرف کماحقہ دھیان نہیں رہتا۔ اس لئے یہ بڑی بے ادبی کی بات ہے، اس میں ایک طرف تو اس نماز کی بے ادبی ہے اور دوسری طرف اس نماز پڑھنے والے کو تکلیف پہنچانا ہے۔ ادب یہ ہے کہ جس شخص سے آپ کو کام ہو اور وہ نماز کے اندر مشغول ہو تو آپ اتنی دور بیٹھ کر انتظار کریں جس سے اس کو پتہ بھی نہ چلے کہ کوئی میرا انتظار کر رہا ہے اور جب وہ سلام پھیر لے تو اس وقت اس سے رابطہ کر لیں، پہلے سے بالکل قریب جاکر بیٹھ جانا بے ادبی کی بات ہے۔ یاد رکھئے! یہ سب دین کے آداب ہیں، دین سے خارج نہیں ہیں، ان کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی دوسری عبادات کی پابندی ضروری ہے۔

پہلے دوسرے کام پھر نماز

بہر حال! اگر بھوک کی وجہ سے نماز میں دل نہیں لگ رہا ہے تو پہلے کھانا کھالو پھر نماز پڑھو، اگر پیاس لگی ہوئی ہے تو پہلے پانی پی لو پھر نماز پڑھو، اگر نیند آ رہی ہے اور تم نفل پڑھنا چاہ رہے ہو یا تلاوت کرنا چاہ رہے ہو تو حدیث شریف

میں آتا ہے کہ پہلے سو جاؤ پھر نیند سے فارغ ہو جاؤ اور جب طبیعت بحال ہو جائے تو پھر نماز شروع کردو۔

غیر اختیاری الجھن کی صورت میں ذکر نہ چھوڑو

لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ نماز کے وقت ذہن پر ایسی الجھن سوار ہوتی ہے جس کا دفع کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا، مثلاً سر میں درد ہو رہا ہے اور اس درد کی وجہ سے ذکر میں دل نہیں لگ رہا ہے یا کوئی اور ایسی بات ہے جو غیر اختیاری ہے تو ایسی صورت میں دل لگنے کی چنداں فکر مت کرو، اس لئے کہ ایسے موقع پر دل نہ لگنے سے کوئی نقصان نہیں، کیونکہ ذکر بذات خود مقصود ہے، چاہے دل لگے یا نہ لگے، بس ذکر کو مقصود سمجھ کر کرتے رہو، انشاء اللہ اس ذکر کی برکت سے حالت کی اصلاح ہو جائے گی۔

طبیعت گھبرانے پر ذکر جلدی ختم کردو

اگلے ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

> ذکر و تلاوت میں جب طبیعت زیادہ گھبرانے لگے تو جلدی ختم کر دیا جائے، یہ "عذر" ہے اور "عذر" کی احکام میں تخفیف ہو جاتی ہے۔
>
> (انفاس عیسیٰ ص ۶۸)

یعنی ذکر کرتے وقت دل بہت زیادہ گھبرانے لگے تو ذکر جلدی ختم کر دینا چاہئے، البتہ تھوڑا بہت دل گھبرانے کی تو پروا نہیں کرنی چاہئے، بلکہ اس وقت تو

زبردستی ذکر میں مشغول رہے لیکن زیادہ گھبراہٹ کے وقت ذکر چھوڑ دے۔

اکتاہٹ ہونے سے پہلے ذکر موقوف کردو

ایک حدیث شریف کا مضمون ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو جب تک ملال اور اکتاہٹ پیدا نہ ہو، اس سے پہلے پہلے ذکر کرتے رہو۔ حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جو بھی عبادت کرو تو اس عبادت کے جوش اور خواہش کو انتہاء تک نہ پہنچاؤ، بلکہ اس وقت عبادت کو چھوڑ دو جبکہ ابھی کچھ خواہش باقی ہو۔ اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ یہ جو "چک ڈور" ہوتی ہے (جس کو آج کل "چکئی" یا "لٹو" کہتے ہیں) جس سے بچے کھیلتے ہیں، اس کے اوپر دھاگہ لپیٹ دیتے ہیں اور اس کو پھینکتے ہیں، پھر اس کو اپنی طرف کھینچتے ہیں، وہ کھچتی ہوئی چلی آتی ہے، "چک ڈور" کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر پھینکتے وقت اس کے اوپر لپٹا ہوا پورا دھاگہ کھول دیا تو وہ واپس نہیں آتی، لہٰذا جب تھوڑا سا دھاگہ اس کے اوپر لپٹا ہوا رہ جائے اس وقت اس کو کھینچنا پڑتا ہے، اس وقت وہ واپس آجاتی ہے۔ حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ یہ مثال دے کر فرماتے تھے کہ یہی معاملہ عبادات کا ہے، جب طبیعت میں عبادت کی تھوڑی سی خواہش باقی ہو، اس وقت عبادت کرنا چھوڑ دو، ساری خواہش اور جوش کو ایک مرتبہ میں ٹھنڈا مت کردو، اس لئے کہ اگر ایک مرتبہ میں تم نے سارا جوش ٹھنڈا کرلیا تو اب دوبارہ عبادت کرنے کی طرف طبیعت راغب نہیں ہوگی۔ اس لئے

حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ اکتاہٹ سے پہلے پہلے عبادت کو چھوڑ دو، پھر اللہ تعالیٰ دوبارہ توفیق دیدیں گے، اور طبیعت میں بشاشت آجائے تو دوبارہ شروع کردو۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۴۵

دین احکامات ماننے کا نام ہے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۴۵

صفحات : ۱۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر۴۵

دین خواہشات کے بجائے احکامات کے ماننے کا نام ہے

الحمدللّٰہ رب العالمین والعاقبة للمتقین
والصّلوٰة والسّلام علیٰ رسوله الکریم
وعلیٰ آله واصحابه اجمعین۔ أَمَّا بَعْدُ!

اذان کے وقت ذکر موقوف کردینا چاہئے

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

ذکر کی حالت میں اگر اذان ہونے لگے تو ذکر موقوف کرکے جواب ہی دینا زیادہ مناسب ہے اور اس کو مخل ذکر

نہ سمجھا جائے۔ سنن کی برکت سے ذکر کا معدن منور ہوتا ہے۔ اور اس سے ذکر میں زیادہ اعانت ہوتی ہے۔

(انفاس عیسیٰ، ص ٦٩)

یعنی اگر انسان ذکر میں یا تلاوت میں مشغول ہو اور اس دوران اذان ہونے لگے تو اس وقت اس ذکر اور تلاوت کو موقوف کر کے اذان کا جواب دینا چاہئے اور اذان کے جواب کو مخل ذکر نہ سمجھنا چاہئے کہ اس اذان کے جواب کی وجہ سے ہمارا ذکر رک گیا، اس لئے کہ اتباعِ سنّت کے لئے آپ ذکر سے رک گئے تو اس کے نتیجے میں ذکر کا معدن اسی سے منور ہو رہا ہے۔ اس لئے اذان کا جواب ذکر کے اندر مخل نہیں بلکہ ذکر کے اندر مزید معین ہے اور ذکر کو زیادہ پُر نور بنانے والا ہے، کیونکہ جب اذان کے جواب دینے کے لئے رک گئے تو یہ اتباعِ سنّت میں رُکے اور اتّباعِ سنّت میں جو نور ہے وہ اس ذکر کو بھی مزید منور کر دے گا۔

تقاضۂ وقت پر عمل کرنے کا نام دین ہے

اس کے ذریعہ وہی بات سامنے آتی ہے جو ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو! تقاضۂ وقت پر عمل کرنے کا نام "دین" ہے، جس وقت جس کام کا تقاضہ ہو، اس وقت وہ کام کرے، اسی کا نام "دین" ہے، یہ نہ ہو کہ اپنی طرف سے تجویز کر لیا کہ ہم تو فلاں کام کریں گے، اب فلاں کام کرنے کی فکر ہے، اگر درمیان میں کسی دوسرے کام کا تقاضہ آگیا

تو دل کڑھ رہا ہے اور رنجیدہ ہو رہا ہے کہ میں نے جو کام تجویز کیا تھا وہ نہ ہوا۔

یہ بڑے کام کی بات ہے، خاص طور پر ہم جیسے لوگ جو طالب علمی کا دعویٰ کرتے ہیں اور لکھنے پڑھنے میں مشغول رہتے ہیں، ان کے لئے خاص طور پر یہ بات بڑے کام کی ہے۔

تصنیف کے وقت ملاقات کرنے پر طبیعت میں گرانی

مجھے بہت سی مصروفیات اور مشاغل رہتے ہیں، جس کی وجہ سے اپنا ایک "نظام الاوقات" بنا رکھا ہے کہ فلاں وقت میں یہ کام کروں گا اور فلاں وقت میں یہ کام کروں گا، تصنیف کا بھی ایک وقت مقرر کر رکھا ہے کہ یہ دو گھنٹے کتب خانہ میں تصنیف کے کام میں لگاؤں گا، اب اس تصنیف کے وقت میں اگر کوئی شخص ملاقات کے لئے آجاتا تو طبیعت پر بڑی گرانی ہوتی کہ اس نے میرے کام میں خلل ڈال دیا، یا کوئی دوسری ضرورت اس وقت سامنے آجاتی تو طبیعت پر بار محسوس ہوتا تھا اور بڑی تکلیف اور مشقت دل پر محسوس ہوتی تھی۔

یہ تصنیف کس لئے کر رہے ہو؟

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے اس بارے میں عرض کیا کہ میرے ساتھ ایسا ہوتا ہے۔ حضرت والا نے ایسی بات ارشاد فرمائی کہ الحمد للہ وہ دن ہے اور آج کا دن ہے، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دل میں ٹھنڈک ڈال دی۔ حضرت والا نے فرمایا کہ تمہیں یہ تکلیف اس وجہ

سے ہوتی ہے کہ تم نے اپنی طرف سے یہ تجویز کر لیا کہ فلاں وقت فلاں کام میں ہی ضرور صرف کرنا ہے، اگر اس وقت میں یہ کام کر لیا تب تو کامیابی ہے اور ورنہ ناکامی ہے۔ ارے بھائی! بتاؤ کہ یہ تصنیف کا جو کام کر رہے ہو یہ اللہ کے لئے کر رہے ہو یا اس کے ذریعہ مصنّف بننے اور اپنی تصنیف کو مکمل کرنے کا شوق ہے، اگر تمہیں مصنّف بننے اور اپنی تصنیف کو مکمل کرنے کا شوق ہے تو پھر تمہارا یہ رنج، یہ صدمہ، یہ تکلیف بالکل برحق ہے، اس لئے کہ تمہاری یہ تصنیف پوری نہ ہو سکی، کیونکہ درمیان میں کسی نے رکاوٹ ڈال دی، لیکن اگر اس کتاب کے لکھنے سے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی ہے، تو پھر جب تک وہ لکھنے میں خوش ہیں، اس وقت تک لکھتے رہو، اور جب کوئی مہمان ملاقات کے لئے آ گیا تو اب وہ اس میں خوش ہیں کہ تم اس مہمان کا اکرام کرو، اس لئے کہ مہمان کا اکرام کرنا سنّت ہے۔ یا لکھنے کے دوران کوئی عارض پیش آ گیا، مثلاً اس وقت والدین کی خدمت کا کوئی مسئلہ پیش آ گیا یا بیوی بچوں کی خدمت کا کوئی مسئلہ پیش آ گیا، یا شاگردوں کی خدمت کا کوئی مسئلہ پیش آ گیا، یا کسی بڑے نے اس وقت بلا لیا، تو اب اس وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ تصنیف کے کام کو چھوڑو اور وہ کام کرو، اب ان کی رضا اس میں ہے۔ لہٰذا تمہارا کیا نقصان ہے، جو کام تم پہلے کر رہے تھے، اس میں بھی رضا حاصل تھی، اور اب وہ کام چھوڑ کر دوسرا کام کر لیا تو یہ بھی ان کی رضا کے مطابق ہے، اور مقصود تو ان کی رضا ہے، چاہے اُس سے حاصل ہو یا اس سے حاصل ہو۔ حضرت والا نے جب یہ بات ارشاد فرمائی تو اس کے بعد سے الحمد للہ دل میں ٹھنڈک پڑ گئی۔

وہ بھی اللہ کیلئے یہ بھی اللہ کیلئے

انسان بہر حال انسان ہے، جب اس نے اپنا ایک نظام الاوقات بنا رکھا ہے، اگر اس میں خلل واقع ہوتا ہے تو اس سے تکلیف تو اب بھی ہوتی ہے، لیکن یہ تکلیف طبعی ہوتی ہے، عقلی تکلیف نہیں ہوتی، عقلی طور پر دل مطمئن ہے کہ الحمد للہ وہ کام بھی اللہ کے لئے کر رہے تھے اور یہ کام بھی اللہ کے لئے کر رہے ہیں۔ اس لئے جس وقت اللہ تعالیٰ جس کام کی توفیق دیدے یہ ان کا کام ہے۔ بہر حال، یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہ دیکھو کہ اس وقت کا شرعی تقاضہ کیا ہے۔

اپنا شوق پورا کرنے کا نام دین نہیں

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بڑے کانٹے کی بات ان کے دل پر القاء فرماتے ہیں۔ وہ ایک بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے، فرماتے کہ بھائی! اپنا شوق پورا کرنے کا نام "دین" نہیں، بلکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا نام "دین" ہے۔ یہ نہ ہو کہ ہمیں فلاں کام کرنے کا شوق ہو گیا، اب تو ہم وہی کام کریں گے، مثلاً عالم بننے کا شوق ہو گیا کہ مدرسہ میں جا کر عالم بنیں گے، اس سے قطع نظر کہ تمہارے لئے عالم بننا جائز بھی ہے یا نہیں؟ یا مثلاً گھر میں ماں بیمار پڑی ہے یا باپ بیمار پڑا ہے اور کوئی دوسرا شخص دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے،

لیکن آپ ماں باپ کو بیمار چھوڑ کر مدرسہ میں چلے آئے، یہ دین نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے، دین کا کام یہ ہے کہ ایسے وقت میں پڑھنا چھوڑ دو اور ماں کی اور باپ کی خدمت کرو۔

مُفتی بننے کا شوق

یا مثلاً "مُفتی" بننے کا شوق ہو گیا، میرے پاس بہت سے طلبہ آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں "تخصّص" پڑھنے کا شوق ہے، "فتویٰ" سیکھنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ والدین کا کیا منشا ہے؟ جواب دیتے ہیں کہ والدین تو ہمارے تخصّص پڑھنے پر راضی نہیں ہیں۔ اب دیکھئے کہ والدین تو راضی نہیں ہیں اور یہ "مُفتی صاحب" بننا چاہتے ہیں، یہ دین نہیں ہے، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔

تبلیغ کرنے کا شوق

یا مثلاً تبلیغی سفر کرنے کا شوق ہو گیا۔ ویسے تو تبلیغ کرنا بڑے ثواب کا اور بڑی فضیلت کا کام ہے، لیکن اس وقت گھر میں بیوی بیمار پڑی ہے اور دوسرا کوئی محرم دیکھ بھال کرنے والا نہیں ہے، اس وقت تبلیغ کے لئے سفر میں جانا اور چلّہ لگانا دین نہیں، یہ اپنا شوق پورا کرنا ہے۔ کیونکہ اس وقت دین کا اور وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ اس بیمار کی تیمارداری کرو، اس کا خیال کرو، یہ دنیا نہیں ہے بلکہ یہ بھی دین کا تقاضہ ہے۔

ایسے وقت میں جماعت کی نماز چھوڑ دو

حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس کی ایک بڑی اچھی مثال دیا کرتے تھے کہ ایک شخص ویرانے میں اور جنگل میں ہے، آس پاس قریب میں کوئی آبادی نہیں ہے، اس ویرانے میں میاں بیوی اکیلے ہیں، اب شوہر صاحب کو مسجد جاکر جماعت سے نماز پڑھنے کا شوق ہو گیا، بیوی اس سے کہتی ہے کہ یہ ویرانہ ہے، جنگل ہے، اگر تم نماز پڑھنے کے لئے دور آبادی میں چلے جاؤ گے تو میں یہاں جنگل میں اکیلی رہ جاؤں گی اور مجھے تو یہاں جنگل میں اکیلے ڈر لگ رہا ہے اور ڈر کی وجہ سے میری جان نکلی جارہی ہے، اس لئے آج تم نماز یہاں ہی پڑھ لو۔ لیکن شوہر صاحب تو چونکہ جماعت سے نماز پڑھنے کے شوقین تھے، اس لئے وہ بیوی کو اکیلے چھوڑ کر مسجد کی طرف روانہ ہو گئے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ یہ دین پر عمل نہیں ہے، بلکہ اپنا شوق پورا کرنا ہے، کیونکہ اس وقت کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اسی جگہ قریب میں نماز پڑھتا اور بیوی کی یہ تکلیف دور کرتا۔ یہ صورت اس وقت ہے جہاں ویرانہ ہے اور کوئی آبادی نہیں ہے اور نہ کوئی دوسرا دیکھ بھال کرنے والا ہے، لیکن جہاں آبادی کے اندر یہ صورت ہو، وہاں جماعت سے نماز پڑھنے کے لئے مسجد میں ہی جانا چاہئے۔

بہر حال! کسی کو جہاد کرنے کا شوق ہے، کسی کو تبلیغ کرنے کا شوق ہے، کسی کو مولوی بننے کا شوق ہے، کسی کو مفتی بننے کا شوق ہے، اور اس شوق کا نتیجہ یہ ہے کہ دوسروں کے جو حقوق اپنے ذمے ہیں، ان کی ادائیگی کا کوئی خیال نہیں

کہ اس وقت میں ان حقوق کا تقاضہ کیا ہے۔

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھئے۔ اس سے بڑی سعادت دنیا میں کوئی ہو نہیں سکتی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہو، ''صحابیت'' کا وہ مقام جو کسی کو اس کے بغیر میسّر آ ہی نہیں سکتا کہ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرے، ''صحابیت'' کا یہ مقام ان سے چھڑا دیا گیا، کیوں چھڑا دیا گیا؟ ماں کی خدمت کی وجہ سے چھڑا دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مقام عطا فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ نصیحت فرما رہے ہیں کہ ''اویس قرنی'' ایک بزرگ ہیں جو قرن سے تشریف لائیں گے، جب تمہاری ان سے ملاقات ہو تو ان سے اپنے حق میں مغفرت کی دعا کرانا۔

شیخ کی ضرورت ایسے موقع پر ہوتی ہے

یہ مقام اتباع سے اور وقت کے تقاضے پر عمل کرنے سے حاصل ہوتا ہے، یہ نہیں کہ دل میں کسی عمل کا شوق پیدا ہو گیا اور وہ عمل کرنا شروع کر دیا، اس کے لئے کسی رہنما کی اور شیخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ کسی شیخ سے تعلق قائم کرو، یہ درحقیقت اسی واسطے ہے، ایسے موقع پر وہ صحیح رہنمائی کرتا ہے، ورنہ آدمی افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

میں ان کاموں کا مخالف نہیں ہوں

یہ باتیں جو میں بتارہا ہوں، ان باتوں کو کوئی شخص میری طرف منسوب کر کے اس طرح آگے نقل کردے گا کہ وہ صاحب تو یہ کہہ رہے تھے کہ مفتی بننا بُری بات ہے، وہ تو تبلیغ کے مخالف ہیں، وہ تو تبلیغ کے خلاف کہہ رہے تھے کہ تبلیغ میں چلّہ لگانے نہیں جانا چاہئے، اور وہ تو یہ کہہ رہے تھے کہ جہاد میں نہیں جانا چاہئے۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ سب اپنے اپنے وقت میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے کام ہیں، یہ دیکھو کہ کس وقت کیا تقاضہ ہے؟ اس وقت کیا مطالبہ ہو رہا ہے، اس مطالبے کے مطابق عمل کرو، اس تقاضے پر عمل کرو، یہ نہ ہو کہ اپنے دماغ سے ایک راستہ تجویز کرلیا کہ مجھے تو یہ کرنا ہے اور پھر اس کے مطابق چل کھڑے ہوئے، یہ دین نہیں ہے، دین یہ ہے کہ ہر موقع پر یہ دیکھو کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں؟ وہ کس بات کا حکم دے رہے ہیں؟

کسی نے خوب کہا ہے ؎

میرے محبوب میری ایسی وفا سے توبہ

جو تیرے دل کی کدورت کا سبب بن جائے

بظاہر دیکھنے میں تو وہ وفا معلوم ہو رہی ہے، لیکن جو تیرے دل کی کدورت کا سبب بن جائے وہ کیسی وفا ہے؟ وہ تو بے وفائی ہے۔

سہاگن وہ جسے پیا چاہے

لہٰذا اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ میرے اس عمل سے وہ راضی ہیں یا نہیں؟ میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہندی زبان کی ایک مثل ہے کہ:

سہاگن وہ جسے پیا چاہے

اس مثل کے پیچھے ایک واقعہ ہے، وہ یہ کہ ایک لڑکی کو دلہن بنایا جارہا تھا، اس کو سنگھار کر کے سجایا جارہا تھا، اب میک اپ کے بعد جو کوئی اس لڑکی کو دیکھتا اس کی تعریف کرتا کہ تو بہت خوبصورت لگ رہی ہے، تیرا چہرہ اتنا خوبصورت ہے، تیرا جسم اتنا خوبصورت ہے، تیرے کپڑے اور تیرا زیور بہت خوبصورت ہے۔ سب اس کی تعریف کرتے، لیکن وہ لڑکی سب کی تعریف سن کر کسی خوشی کا اظہار نہ کرتی اور سنی ان سنی کر دیتی۔ کسی نے اس لڑکی سے کہا کہ یہ تیری سہیلیاں تیری اتنی تعریف کر رہی ہیں، اس سے تجھے کوئی خوشی نہیں ہو رہی ہے؟ اس لڑکی نے جواب دیا کہ ان کی تعریف کرنے سے کیا خوش ہوں، اس لئے کہ ان کی تعریف تو ہوا میں اڑ جائے گی، بات تو اس وقت ہے کہ جس کے لئے مجھے سنوارا جارہا ہے، وہ میری تعریف کرے اور وہ پسند کر لے کہ ہاں یہ خوبصورت ہے، تب تو فائدہ ہے، اور اس کا اثر یہ ہوگا اس سے میری زندگی سنور جائے گی۔ لیکن اگر یہ سہیلیاں تو میری تعریف کر کے چلی گئیں اور جس کے لئے مجھے سنوارا گیا تھا، اس نے مجھے ناپسند کر دیا، تو پھر اس دلہن بننے کا اور

اس سنگھار کا کیا فائدہ؟

اس ذات کی پسندیدگی کو دیکھو

یہ واقعہ سنا کر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ دیکھو کہ جس کے لئے وہ کام کر رہے ہو، اس کو پسند ہے یا نہیں؟ اگر لوگوں نے آپ کو کہدیا کہ آپ بڑے مفتی صاحب ہیں، یا آپ بڑے مولانا صاحب ہیں، یا لوگوں نے یہ کہدیا کہ یہ شخص بڑا مبلّغ ہے، تبلیغ میں بڑا وقت لگاتا ہے، اللہ کے راستے میں نکلا ہوا ہے، یا کسی کے بارے میں کہدیا کہ یہ شخص بڑا مجاہد اعظم ہے، بتایئے کہ لوگوں کے اس کہنے سے کیا حاصل ہوا؟ کچھ نہیں، بات اس وقت ہے کہ جس کے لئے یہ سب کام کر رہے ہو، وہ یہ کہدے کہ ؎

بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

اس وقت فائدہ ہے، اس لئے کہ ان اعمال سے ان کو ہی راضی کرنا مقصود ہے۔

ذکر کو روک کر اذان کا جواب دو

اور جب ان کو راضی کرنا مقصود ہے تو آدمی کو یہ دیکھنا چاہئے کہ اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہو رہا ہے۔ لہٰذا یہ جو کہا جارہا ہے کہ جب اذان ہو رہی ہو تو ذکر چھوڑ دو اور مؤذن کی آواز سنو اور اس کا جواب دو۔ اگر آپ یہ سوچیں کہ اس میں تو وقت ضائع ہو رہا ہے، اگر اس وقت میں ذکر کرتا تو کئی تسبیحات پڑھ لیتا، لیکن جب یہ حکم دیدیا کہ اب ذکر سے رک جاؤ، تو اب رک جانا چاہئے،

اس رکنے میں ہی فائدہ ہے۔

سب کچھ ہمارے حکم میں ہے

یہ "حج" اللہ تعالیٰ نے بڑے عجیب و غریب عبادت بنائی ہے، اس حج کو ذرا غور سے دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اس میں قدم قدم پر اللہ تعالیٰ نے قاعدوں کے بت توڑے ہیں۔ مثلاً مسجد حرام میں ایک نماز کا ثواب ایک لاکھ نمازوں کے برابر ہے، لیکن ۸/ ذی الحجہ کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ مسجد حرام کو چھوڑو اور منیٰ جاؤ، وہاں ایک دن قیام کرو، اب منیٰ میں نہ حرم ہے، نہ کعبہ ہے، نہ وقوف ہے، نہ رمی ہے، نہ کوئی اور کوئی کام ہے، بس یہ حکم ہے کہ وہاں پانچ نمازیں ادا کرو، ایک لاکھ نمازوں کا ثواب چھوڑو اور وہاں جنگل میں جاکر نمازیں پڑھو۔ اس حکم کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ بذات خود نہ کعبہ میں کچھ رکھا ہے، نہ حرم میں کچھ رکھا ہے، نہ مسجد حرام میں کچھ رکھا ہے، جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے۔ جب ہم نے کہا کہ مسجد حرام میں نماز پڑھو تو اس وقت ایک نماز پر ایک لاکھ نمازوں کا ثواب ہے اور جب ہم نے کہا کہ مسجد حرام کی نماز کو چھوڑو، تو اب اگر وہاں نماز پڑھو گے تو ثواب کے بجائے الٹا گناہ ہوگا، اس لئے کہ تم نے ہمارے حکم کی خلاف ورزی کی۔

اصل مقصود اطاعت خداوندی ہے

نماز وقت پر پڑھنے کی کتنی تاکید آئی ہے، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد

ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰباً مُّوْقُوْتاً۔

(سورۃ النساء، آیت ۱۰۳)

بیشک نماز مؤمنین پر اپنے مقررہ وقتوں میں فرض ہے۔

اس آیت میں نماز کو وقت کے ساتھ پابند کیا گیا ہے کہ نماز کا وقت گزرنے نہ پائے۔ حدیث میں فرمایا کہ مغرب میں تعجیل کرو، جتنا جلدی ہو سکے اس کو پڑھ لو، مغرب کی نماز میں تاخیر نہ ہو۔ لیکن عرفات کے میدان میں آفتاب غروب ہو چکا ہے مگر حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ ابھی نماز مت پڑھو، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بار بار یاد دلا رہے ہیں:

اَلصَّلَاۃُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ، اَلصَّلَاۃُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ

جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلصَّلَاۃُ أَمَامَکَ

نماز آگے ہے، یعنی نماز یہاں نہیں پڑھنی بلکہ آگے میدان مزدلفہ میں جا کر پڑھنی ہے۔ اس کے ذریعے یہ سبق دیدیا کہ تم یہ مت سمجھ لینا کہ اس مغرب کے وقت میں کچھ رکھا ہے، اور یہ مت سمجھ لینا کہ اس وقت کی تاکید میں کچھ رکھا ہے، بلکہ جو کچھ ہے وہ ہمارے حکم میں ہے، جب ہم نے کہا تھا کہ مغرب کی نماز جلدی پڑھو تو جلدی پڑھنا ضروری تھا، اور جب ہم نے کہا کہ مغرب کا وقت گزار دو اور اس کو عشاء کی نماز کے ساتھ ملا کر پڑھو، تو اب تمہارے ذمے اسی طرح پڑھنا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج کی عبادت میں قدم قدم پر معمول کے

قاعدوں کو توڑا ہے، تاکہ ظاہری قیود کو بت نہ بنالیا جائے۔ اس کے ذریعہ اس بات کی تربیت دی جارہی ہے کہ کسی چیز کو اپنی ذات میں مقصود نہ سمجھو، نہ نماز اپنی ذات میں مقصود ہے، نہ روزہ اپنی ذات میں مقصود ہے، نہ کوئی اور عبادت اپنی ذات میں مقصود ہے، بلکہ اصل مقصود اللہ جل شانہ کی اطاعت ہے۔

افطار میں جلدی کیوں؟

دیکھئے! شریعت کا ایک حکم یہ ہے کہ جب روزہ کے افطار کا وقت آجائے تو افطار میں جلدی کرو اور بلا وجہ افطار میں تاخیر کرنا مکروہ ہے۔ تاخیر کرنا اس لئے مکروہ ہے کہ اب تک ہم نے کھانے پینے سے منع کر رکھا تھا، جس کی وجہ سے اب تک بھوکا رہنا باعث ثواب تھا، پیاسا رہنا باعث ثواب تھا، اس کی بڑی فضیلت تھی، اس پر بڑا اجر تھا، اور اس کے بارے میں یہ کہا جارہا تھا کہ یہ روزہ میرے لئے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔ لیکن جب ہم نے کہہ دیا کہ کھاؤ تو اب کھانے میں تاخیر کرنا گناہ ہے، اس لئے اب اگر تاخیر کرو گے تو اپنی طرف سے روزے کے وقت میں اضافہ کرو گے۔

سحری میں تاخیر افضل کیوں؟

اسی طرح سحری کھانے میں تاخیر کرنا افضل ہے۔ اگر کوئی وقت سے پہلے سحری کھاکر سو جائے تو یہ سنّت کے خلاف ہے، بلکہ اُس وقت سحری کھانی چاہئے جب آخری وقت ہو، اس لئے کہ اگر سحری پہلے سے کھاکر سو گیا تو گویا کہ

اس نے روزے کے وقت میں اپنی طرف سے اضافہ کر دیا۔ بہر حال! ہمارے دلوں میں یہ بات آ جائے کہ سارا دین "اتباع" میں ہے کہ ان کی اتباع کی جائے، ارے تم تو ان کے "بندے" ہو اور "بندے" کے معنی یہ ہیں کہ جو وہ کہیں وہ کرے۔

"نوکر" اور "غلام" کی تعریف

حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک ہوتا ہے "نوکر"، جو خاص وقت اور خاص ڈیوٹی کا ہوتا ہے۔ مثلاً نوکر کے ذمے جھاڑو دینا ہے یا مثلاً یہ نوکر آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے، آٹھ گھنٹے کے بعد اس کی چھٹی۔ دوسرا ہوتا ہے "غلام" جس کے لئے نہ کوئی خاص وقت ہے اور نہ خاص کام ہے، وہ تو حکم کا پابند ہے، آقا جو حکم دیدے وہ اس کے کرنے کا پابند ہے، مثلاً اگر آقا غلام سے کہہ دے کہ تم یہاں قاضی بن کر بیٹھ جاؤ اور فیصلے کرو تو وہ قاضی بن جائے گا، اور اگر اس غلام سے کہہ دے کہ پاخانہ اٹھاؤ تو وہ پاخانہ اٹھائے گا، اس کے لئے نہ کسی وقت کی قید ہے اور نہ کام کی قید ہے وہ تو چوبیس گھنٹے کا غلام ہے، یہ ہے غلام۔

"بندہ" کی تعریف

لیکن "غلام" سے آگے بھی ایک درجہ اور ہے، وہ ہے "بندہ"۔ "غلام" اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا، لیکن "بندہ" اپنے آقا کی عبادت کرتا ہے اور اس کی پرستش بھی کرتا ہے اور یہ بندہ اپنی مرضی کا نہیں ہوتا، بلکہ بندہ تو اپنے آقا کی

مرضی کا ہوتا ہے، آقا جو حکم دیدے وہ اس کو کرنا پڑتا ہے، اپنی طرف سے کوئی کام تجویز نہیں کرتا۔ تمام "بدعات" کی جڑ بھی اسی سے کٹتی ہے، اس لئے کہ اپنی تجویز کو دخل دینے سے بدعات پیدا ہوتی ہیں، اپنی تجویز کو ختم کردو اور ان کی مرضی اور حکم پر چلو تو اسی کا نام "دین" ہے۔

خلاصہ

بہر حال! خلاصہ یہ ہے کہ ہر وقت کے تقاضے کو دیکھو کہ اس وقت کا تقاضہ کیا ہے؟ اس وقت اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے کیا چاہ رہے ہیں؟ وہ کرو۔ اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ اذان کا جواب دینا مخل ذکر نہیں، بلکہ اس وقت کا تقاضہ یہی ہے کہ ذکر کو روک دو اور اذان کا جواب دو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

درس و تدریس

کے ساتھ اصلاحِ اعمال

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳

مجلس نمبر : ۴۶

صفحات : ۱۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

مجلس نمبر ۴۶

درس و تدریس کے ساتھ اصلاح اعمال

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین،
والصّلاۃ والسّلام علٰی رسولہ الکریم، وعلٰی
آلہ وأصحابہ أجمعین، امابعد!

کثرت ذکر اور اصلاح اعمال رکن طریق ہیں

حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

اس طریق میں دو چیزیں ہیں ایک کثرت ذکر، دوسرے اصلاح اعمال، سو کثرت ذکر تو حالت طالب علمی میں مناسب نہیں اور جو مقصود ہے کثرت ذکر سے، وہ ان کو

مشغولی علم سے حاصل ہو جاتا ہے بشرط تقویٰ، باقی رہا اصلاح اعمال، وہ ہر حال میں فرض ہے، اور طالب علمی کی حالت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، سو اس کا سلسلہ شروع کر دینا چاہئے، اس کی ترتیب یہ ہے کہ اول "قصد السبیل" کو دوبار بغور مطالعہ کر کے اس سے جو حاصل طریق کا ذہن میں آئے، اس سے اطلاع دے، پھر طریقہ اصلاح کا پوچھے۔

(انفاس عیسیٰ، ص ۶۹)

کسی شیخ کی طرف رجوع کرنے کا مقصد

جب کسی اللہ والے کی طرف اور کسی شیخ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو رجوع کرنے سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ دو چیزیں حاصل ہوں، ایک "کثرتِ ذکر" حاصل ہو جائے، جس سے ہر وقت ذہن اور دھیان اللہ جل شانہ کی طرف ہو جائے اور زبان ہر وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں تر رہے، ایک تو کثرتِ ذکر کی یہ نعمت حاصل ہو جائے۔ دوسری چیز "اصلاح اعمال" ہے، یعنی اعمال درست ہو جائیں، گناہوں سے حفاظت ہو جائے، معصیتوں اور منکرات سے حفاظت ہو جائے، فرائض و واجبات، سُنن اور مستحبات پر عمل ہونے لگے، اعمال کی طرف رغبت ہو جائے، ان کو کرنے کی توفیق ہو جائے، بہر حال! کسی شیخ کی طرف رجوع کرنے سے یہ دو چیزیں حاصل کرنی اصل مقصود ہوتی ہیں۔

زمانہ طالب علمی میں کثرت ذکر مناسب نہیں

لیکن ایک شخص جو علم دین کے کاموں میں مصروف ہے اور وہ اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ کی طرف رجوع کر رہا ہے تو کیا وہ طالب علم بھی شیخ کی طرف رجوع کرنے کے بعد انہی دونوں چیزوں کے حصول کی فکر میں مشغول ہو جائے؟ اس کے لئے حضرت والا نے فرمایا کہ ”کثرتِ ذکر“ تو حالت طالب علمی میں مناسب نہیں“ یعنی کوئی طالب علم حالت طالب علمی میں درس و مطالعہ اور تکرار کے بجائے وظیفے پڑھ رہا ہے تو اس کے لئے یہ مناسب نہیں، اس کو تو یہ چاہئے کہ اپنے سبقوں کی طرف اور اپنے مطالعہ اور تکرار کی طرف متوجہ رہے تاکہ اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔

مشغولی علم سے کثرتِ ذکر کا مقصود حاصل ہے

البتہ اس پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ جب وہ شخص کثرتِ ذکر نہیں کرے گا تو کثرتِ ذکر کا جو مقصود ہے، وہ اس سے محروم ہو جائے گا؟ اس کے جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے کہ وہ ذکر کے فوائد سے محروم ہو جائے گا، بلکہ کثرتِ ذکر سے جو مقصود ہے، وہ اس شخص کو مشغولی علم ہی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ البتہ اس کے حصول کے لئے دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ ”تقویٰ“ ہو، یعنی اس کے اندر گناہوں سے بچنے کا اہتمام ہو، آنکھ کی حفاظت، کان کی حفاظت، زبان کی حفاظت کا اہتمام ہو۔ دوسرے یہ کہ ”اخلاص“ ہو، کہ میں جو یہ علم حاصل کر رہا ہوں، یہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے حاصل کر رہا ہوں، میں اگر پڑھا

رہا ہوں، تو اللہ تعالیٰ کے لئے پڑھا رہا ہوں تو اس صورت میں یہ درس و تدریس اور یہ پڑھنا پڑھانا کثرت ذکر کے قائم مقام ہو جائے گا اور اس کے ذریعہ کثرت ذکر کا مقصود حاصل ہو جائے گا۔

طالب علم کو کچھ ذکر ضرور کرنا چاہئے

لیکن طالب علم کو یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ اب ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ یہ بات "کثرت ذکر" کی ہو رہی ہے، مطلق ذکر کی بات نہیں ہو رہی ہے، یعنی یہ درس و تدریس اور یہ مطالعہ انشاء اللہ کثرت ذکر کے قائم مقام ہو جائے گا، لیکن کچھ ذکر پھر بھی کرنا ہوگا۔ لِكُلِّ مَقَامٍ مَقَالٌ ۔ ہر جگہ کا اور ہر موقع کا ایک تقاضہ ہے، لہٰذا یہ سمجھنا کہ چونکہ ہم درس و تدریس میں لگے ہوئے ہیں، اس لئے ہمیں ذکر و نوافل کی ضرورت نہیں، یہ سمجھنا درست نہیں۔ حدیث شریف میں ہے:

تدارس العلم ساعة من الليل خير من إحياء ها ۔

(سنن الدارمی، المقدمة، باب العمل بالعلم وحسن النية۔ حدیث نمبر ٢٦٨٠)

یعنی علم کی مشغولی اور اس کا تکرار رات کے کسی ایک حصے میں کر لینا ساری رات جاگنے سے بہتر ہے۔ اگر کوئی شخص ساری رات تہجد پڑھ رہا ہے، اس کے مقابلے میں یہ بہتر ہے کہ وہ رات کے ایک حصہ میں یہ علمی کام کرلے، بشر طیکہ اس کے اندر اخلاص ہو۔ لہٰذا اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ساری عمر تہجد کی نماز نہ پڑھے، بس بیٹھا تکرار ہی کرتا رہے، اگر یہ مطلب ہوتا تو پھر

صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور بزرگانِ دین میں سے کوئی بھی نفلی عبادت کا اہتمام نہ کرتے، حالانکہ یہ حضرات نفلی عبادات کا بہت اہتمام کیا کرتے تھے۔

”علم“ کو مقصودِ زندگی بنانے والوں کی حالت

درحقیقت یہ بتانا مقصود ہے کہ دو طبقے تھے، ایک طبقہ وہ تھا جس نے اپنا مقصودِ زندگی علم کو بنایا تھا، اور دوسرا طبقہ وہ تھا جس نے اپنا مقصودِ زندگی نفلی عبادت کو بنایا تھا، لیکن ایسا نہیں تھا کہ جس نے اپنا مقصودِ زندگی علم کو بنایا تھا، وہ نفلی عبادات سے بالکل کورا اور بے نیاز تھا، بلکہ تھوڑی بہت نفلی عبادت اپنے حالات کے مطابق وہ بھی کرتا تھا ذکر وہ بھی کرتا تھا، نوافل وہ بھی پڑھتا تھا، تہجد وہ بھی پڑھتا تھا، لیکن صبح سے شام تک صرف اسی ایک کام میں نہیں لگا رہتا تھا۔

کس عالم کو عابد پر فضیلت حاصل ہے؟

لیکن آج کل کے علماء کو یہ حدیث بہت یاد رہتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فضل العالم علی العابد کفضلی علی أدناکم۔

(ترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ)

یعنی عالم کو عابد پر ایسی فضیلت ہے جیسے مجھے تم میں سے ادنیٰ شخص پر فضیلت ہے۔

اور دوسری حدیث میں ہے کہ:

فقيه واحد أشد على الشيطان من ألف عابد۔

(ترمذی، کتاب العلم، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ)

یعنی ایک فقیہ شیطان پر ہزار عابد سے زیادہ سخت اور بھاری ہے۔

اس قسم کی احادیث ہم جیسے لوگوں کو بہت یاد رہتی ہیں، لیکن خوب سمجھ لیجئے کہ ان احادیث میں عالم سے مراد وہ عالم ہے جو مشغولیت علم کے ساتھ ساتھ نفلی عبادت بھی کچھ نہ کچھ انجام دیتا ہو۔ اور عابد سے مراد وہ عابد ہے جس نے عبادت میں مشغولیت کے ساتھ علم سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھا ہوا ہے۔

حدیث میں عالم اور عابد سے کون مراد ہیں؟

اس بات کو علامہ ابن خلدونؒ نے اپنے مقدمہ میں اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھی ہے، حالانکہ ابن خلدونؒ عابد کی حیثیت سے مشہور نہیں ہیں، بلکہ وہ تو ایک عام مؤرخ کی حیثیت سے مشہور ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ: اس حدیث میں "عالم" سے مراد وہ عالم ہے جس نے اپنا دن رات کا مشغلہ علم کو بنا رکھا ہے، لیکن وہ عبادات سے بے بہرہ نہیں۔ اور "عابد" سے مراد وہ عابد ہے جس نے اپنا دن رات کا مشغلہ عبادت کو بنا رکھا ہے، اور علم سے وہ بالکلیہ بے بہرہ نہیں۔ کیونکہ اگر کوئی عابد ایسا ہے جس کا علم میں کوئی حصہ نہیں تو اس کی عبادت بیکار ہے، اسی طرح اگر کوئی عالم ایسا ہے جس کا عبادت میں کوئی

حصہ نہیں تو اس کا علم بے کار ہے۔

"علم" عمل اور طاعت کے بغیر بیکار ہے

اسی طرح ابن خلدون یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی عالم ایسا ہے جو خالص علم میں مشغول ہے، عبادت کی طرف اس کا بالکل دھیان نہیں اور اصلاح اعمال و اخلاق کی طرف دھیان نہیں، دوسری طرف وہ عابد ہے جو صرف عبادات میں مشغول ہے اور علم کی طرف بالکل دھیان نہیں، اگر ان دونوں کا تقابل کیا جائے تو ان میں عابد عالم سے افضل ہے۔ لہٰذا حدیث میں جس عابد اور عالم کا ذکر ہے اس سے مراد وہ عالم اور عابد ہیں جو دونوں کے جامع ہوں، ورنہ نرا علم تو شیطان کے پاس بھی تھا، وہ بھی بہت بڑا عالم تھا، اس لئے اگر کوئی شخص نرا علم لے کر بیٹھ گیا، اب اُس کا نہ عبادت میں کوئی حصہ ہے، نہ ہی گناہوں سے بچنے کی اس کو کوئی فکر ہے، نہ معصیتوں سے اجتناب کا کوئی اہتمام ہے، بلکہ اپنی خواہشات کے پیچھے پڑا ہوا ہے تو ایسا علم کس کام کا جو اس کو گناہوں سے نہ بچائے۔ ایسے شخص کے لئے قرآن کریم کی آیت ہے:

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا
فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ۝

(سورۃ الاعراف، آیت ۱۷۵)

یعنی ان لوگوں کو اس شخص کا حال پڑھ کر سنائیے جس کو ہم نے اپنی آیتیں دی تھیں، پھر وہ ان آیتوں کو چھوڑ نکلا، پھر

شیطان اس کے پیچھے لگ گیا، سو وہ گمراہ لوگوں میں
ہو گیا۔

لہٰذا ایسا عالم جس کا ذکر اس آیت میں ہے، عابد سے کیسے افضل ہو سکتا ہے؟ بلکہ ایسے عالم سے تو عابد ہی افضل ہے۔ بہر حال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو یہ فرمایا کہ کثرت ذکر سے جو مقصود ہے وہ ان کو مشغولی علم سے حاصل ہو جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہے، وہ تھوڑا بہت تو ذکر کرے، لیکن وہ کثرت ذکر جو عابد کیا کرتا ہے، اس کا یہ مطالعہ، تکرار، یہ درس و تدریس، یہ تصنیف و تالیف، یہ فتویٰ نویسی کثرت ذکر کے قائم مقام ہو جائے گا۔

آپ کو "قلت" سے مقصود حاصل ہے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ خط میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ "حضرت! دن رات کاغذ کالے کرنے میں وقت گزر جاتا ہے، آپ کی خانقاہ میں دیکھتا ہوں کہ لوگ آکر کس طرح سے ذکر و اذکار میں مشغول ہوتے ہیں اور مجاہدات اور ریاضتیں کرتے ہیں، مجھ سے یہ سب نہیں بن پڑا، میں ان چیزوں سے محروم ہوں، تھوڑے سے معمولات ہیں، بس وہ ادا کر لیتا ہوں۔

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ: "جو مقصود ان کو کثرت سے حاصل ہے، الحمد للہ، وہ آپ کو قلت سے حاصل ہے۔" وجہ اس کی یہ ہے کہ بزرگوں

نے فرمایا کہ:

کُلِّ مطیع لِلّٰہ فھو ذاکر۔

جو شخص اللہ کی اطاعت کا کوئی بھی کام کر رہا ہے، وہ در حقیقت اللہ کا ہی ذکر کر رہا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اخلاص اور تقویٰ عطا فرمائے تو یہ سب کام بھی ذکر میں داخل ہیں۔

”قطبی“ پڑھ کر ایصال ثواب

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا یہ واقعہ سنا کہ آپ کے پاس ایک شیخ اپنے کسی عزیز کے لئے ایصال ثواب کرانے کے لئے آیا، حضرت شیخ الھندؒ اس وقت ”قطبی“ کا سبق پڑھا رہے تھے، فرمایا کہ ہم یہ قطبی کا سبق پڑھ کر تمہارے عزیز کے لئے ایصال ثواب کر دیں گے۔ انہوں نے تعجب سے پوچھا کہ حضرت! قطبی پڑھ کر ایصال ثواب؟؟ ایصال ثواب تو قرآن کریم یا بخاری شریف وغیرہ پڑھ کر ہوتا ہے۔ حضرت نے جواب میں فرمایا کہ ہمارے نزدیک قطبی میں اور بخاری میں کوئی فرق نہیں، اس لئے کہ بخاری شریف پڑھنے سے جو مقصود ہے، قطبی پڑھنے سے بھی وہی مقصود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ جو ثواب بخاری شریف پڑھنے سے ملتا ہے وہی ثواب قطبی پڑھنے پر بھی عطا فرمائیں گے، اگر نیت درست ہو۔

زمانہ طالب علمی میں اصلاح اعمال

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ:

باقی رہا اصلاح اعمال، وہ ہر حال میں فرض ہے، طالب علمی کی حالت بھی اس سے مستثنیٰ نہیں، سو اس کا سلسلہ شروع کر دینا چاہئے۔

یعنی طالب علم ہو، یا غیر طالب علم ہو، اپنے اعمال کی اصلاح تو ہر ایک کو کرنی ہے۔ چنانچہ آپ نے سنا ہو گا کہ جب کوئی طالب علم کسی بزرگ کے پاس بیعت ہونے کے لئے جاتا ہے تو وہ بزرگ ان کو بیعت نہیں کرتے، بلکہ اس سے یہ فرماتے ہیں کہ جب تم فارغ ہو جاؤ گے اس وقت دیکھیں گے۔ لیکن دوسری طرف یہ بھی سنا ہو گا کہ بعض طالب علموں کا بزرگوں سے تعلق ہوتا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ ایسی "بیعت" جس کے لوازم میں وظائف واوراد کی کثرت ہوتی ہے، وہ طالب علم کو نہیں کرتے، کیونکہ اس کے نتیجے میں اس کے درس، مطالعہ اور تکرار میں حرج ہو گا، اور اس کا ذہن ان اوراد و وظائف کی طرف متوجہ ہو جائے گا، لیکن جہاں تک اپنے اعمال اور اخلاق کی اصلاح کرانے کا تعلق ہے، اس تعلق میں طالب علم اور غیر طالب علم سب برابر ہیں۔

ابتداءً "قصد السبیل" کا مطالعہ

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ:

اس کی ترتیب یہ ہے کہ اول "قصد السبیل" کا دو بار بغور مطالعہ کر کے اس سے جو حاصل طریق کا ذہن میں آئے، اس سے اطلاع دے، پھر طریقہ اصلاح کا پوچھے۔

یعنی حضرت والا کا ایک رسالہ ہے "قصد السبیل" اس رسالے میں حضرت نے خلاصہ بیان فرما دیا ہے کہ کسی شیخ اور بزرگ سے تعلق قائم کرنے کا اور اس تصوف کا مقصد کیا ہے؟ چونکہ اس رسالے میں کچھ فارسی اور عربی کے الفاظ بھی تھے، جس کی وجہ سے عام لوگوں کو اس کے پڑھنے میں دشواری ہوتی تھی، اس لئے میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ نے اس رسالے کی تسہیل کر دی ہے، اور اس کا نام "تسہیل قصد السبیل" رکھ دیا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس رسالے کو دو مرتبہ پڑھ لو، تاکہ بات ذہن میں بیٹھ جائے، اس کے پڑھنے سے یہ سمجھ میں آجائے گا کہ اس طریق اور تصوف کا حاصل کیا ہے؟ جب طریق اور تصوف سمجھ میں آجائے تو اب اپنے مصلح کو اور شیخ کو اطلاع کرتے رہو کہ میں یہ عمل کر رہا ہوں اور یہ میرے حالات ہیں، اور شیخ سے مشورہ لیتے رہو اور ہدایات طلب کرتے رہو۔

"مکاتبت" کے ذریعہ اصلاح کا آغاز

ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے "تجدید" کا مقام عطا فرمایا تھا، انہوں نے اس تصوف اور طریقت کے راستے میں "مراسلت" اور "مکاتبت" کا عجیب و غریب سلسلہ جاری فرما دیا۔ پہلے مکاتبت اور مراسلت کا

ایسا اہتمام وانتظام نہیں تھا، بس یہ تھا کہ شیخ کی خدمت میں جاؤ اور ان کی صحبت میں بیٹھو، اور ان کے پاس رہ کر اپنی اصلاح کراؤ، چلّے لگاؤ، مراقبات کرو، تب جاکر اصلاح ہوتی تھی۔ جب حضرت والا نے یہ دیکھا کہ لوگوں کے پاس اب وقت کہاں؟ فرصت کہاں؟ کہاں جاکر اپنی اصلاح کرائیں گے، اس طرح یہ لوگ اپنی اصلاح سے محروم رہ جائیں گے، اس لئے آپ نے فرمایا کہ شیخ سے "مراسلت اور مکاتبت" قائم کرو، یہ مراسلت "صحبت" کے قائم مقام ہو جاتی ہے، بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے شیخ کے پاس اس کی صحبت میں وقت گزار رہا ہو، تب بھی بعض اوقات کوئی بات زبان سے کہنے میں دشواری معلوم ہوتی ہے، اس لئے شیخ سے جو بات کہنی ہو، وہ اس کو لکھ کر دیدو، پھر شیخ اس کو لکھ کر ہدایت اور رہنمائی کر دیتا ہے، پھر اس کی ہدایت پر عمل کرو، اس میں بڑی برکت ہے۔

"تربیت السالک" مکاتبت کا نمونہ ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "تربیت السالک" تصوف کے باب میں عجیب و غریب نرالی چیز ہے، بڑے بڑے لوگ جو اپنے اپنے حالات لکھ بھیجتے تھے، حضرت والا اس کا حل لکھ کر بھیجتے، یہ کتاب اس منتخب مکاتبت اور مراسلت کا مجموعہ ہے۔ ہم جیسے لوگ اس کی کیا قدر پہچانیں، جس پر حالات گزر رہے ہوں، جس کو سابقہ پیش آیا ہو، وہ اس کی قدر جان سکتا ہے کہ اس کے اندر کیسے "جواہر" موجود ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت والا نے دودھ کا دودھ

اور پانی کا پانی نکھار کر رکھ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کو دین کی، تصوف کی، شریعت کی اور طریقت کی عجیب فہم عطا فرمائی تھی۔ بہر حال! یہ ''مراسلت'' اور ''مکاتبت'' بڑی کار آمد چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے اس میں بڑی برکت عطا فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

صحت کی دعا کرنا سنّت ہے

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳
مجلس نمبر : ۴۷
صفحات : ۲۵

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ط

مجلس نمبر ۷۴

صحت کی دعا کرنا سنّت ہے

الحمدللّٰه رب العالمين ۔ والعاقبة للمتقين۔ والصّلوٰة والسّلام علٰى رسوله الكريم۔ وعلٰى آله واصحابه اجمعين ۔ أَمَّا بَعۡدُ!

ایک بیمار کا خط

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ:

"اب پروردگار عالم ساتھ ایمان کے بلالیں، بلا بصارت زندگی بیکار ہے، تلاوت و مواعظ وغیرہ سے محرومی کا سخت رنج ہے"

(انفاس عیسیٰ ص ۷۸)

ان صاحب کی آخر عمر میں بینائی جاتی رہی تھی اور بینائی کا چلے جانا بلاشبہ سخت مصیبت کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حفاظت میں رکھے۔ خاص طور پر وہ شخص جو اچھا بھلا دیکھنے والا اور مطالعہ کرنے والا ہو، اگر اس کی بینائی جاتی رہے تو بڑی سخت تکلیف کی بات ہے۔ اس تکلیف پر انہوں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ بس اب تو یہ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان کے ساتھ اپنے پاس بلالیں، کیونکہ جب آنکھ ہی نہ رہی تو اب زندگی سے کچھ فائدہ نہیں، اب تو قرآن کریم کی تلاوت بھی نہیں کرسکتے، مواعظ بھی نہیں پڑھ سکتے، ان سب سے محرومی ہوگئی ہے۔

صحت کی دعا عبدیت کی علامت ہے

حضرت والا نے جواب میں لکھا کہ:

"صحت کی دعا تو سنّت ہے اور علامت "عبدیت" کی ہے، مگر یہ کہنا کہ اب پروردگار عالم ساتھ ایمان کے بلالیں، بلا بصارت زندگی بیکار ہے" یہ نہایت بے ادبی ہے اور بعید از "عبدیت" ہے، ہم کو رائیں لگانے کا کیا حق ہے، حضرت حق سے جو پیش آئے خیر ہے، تلاوت و کتب بینی میں ثواب اور رضا منحصر نہیں، اوّل تو صحت کی حالت میں تطوّع پر مداومت کرنے والے کو مرض میں بدون عمل کیے بھی ثواب عملِ سابق کا ملتا رہتا ہے۔ دوسرے

بعض اوقات صبر کا اجر عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے، البتہ
بینائی کی دعا خود رائی نہیں، اس کی اجازت ہے، دعا مانگے
اور دل سے مانگے اور ساتھ میں یہ سمجھے کہ اگر اس کے
خلاف واقع ہو اوہ بھی خیر ہے، اس پر بھی راضی رہے۔

(ایضاً)

بیماری میں دعا کرنے کا ثبوت

دو باتیں الگ الگ ہیں، دونوں کی حقیقت سمجھنے کی ضرورت ہے، پہلی بات تو یہ کہ جب آدمی بیمار ہو یا تکلیف میں ہو تو اس بیماری کی حالت میں صحت مانگنا کہ یا اللہ! مجھے صحت عطا فرمادے، یہ دعا کرنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ سنّت ہے، اس لئے یہ دعا مانگنی چاہئے۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْاَمَانَةَ
وَحُسْنَ الْخُلْقِ وَالرِّضَا بِالْقَدَرِ۔

(کنز العمال، ج ۲، ص ۱۸۳، حدیث نمبر ۳۶۵۰)

اے اللہ! میں آپ سے صحت، عفّت، امانت، حسن اخلاق
اور رضا بالقدر کا سوال کرتا ہوں۔

اور ایک مرتبہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف کے عالم میں تھے تو آپ ﷺ نے ان الفاظ سے دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ تَعْجِیْلَ عَافِیَتِكَ وَصَبْراً عَلٰی بَلِیَّتِكَ وَخُرُوْجاً مِنَ الدُّنْیَا اِلٰی رَحْمَتِكَ

(کنز العمال، ج ۲، ص ۱۹۰، حدیث نمبر ۳۶۹۸)

اس دعا میں صرف یہ نہیں کیا کہ عافیت مانگ رہے ہیں، بلکہ جلدی مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! جلدی سے عافیت دیدیجئے اور مصیبتوں پر صبر عطا فرمایئے۔ لہٰذا تعجیل عافیت کی دعا مانگنا بھی سنّت ہے اور اس میں ثواب بھی ہے۔ اور عبدیت اور بندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ سے تکلیف کے ازالے کی دعا کرے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا مظاہرہ کرنا اچھی بات نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عبدیت، شکستگی، عاجزی کا مظاہرہ کرنا مطلوب ہے، یہ نہ ہو کہ سینہ تان کر کہیں کہ اور بیماری لاؤ، ہم تو برداشت کریں گے، یہ عبدیت کا تقاضہ نہیں۔ عبدیت کا تقاضہ یہ ہے کہ جب بیماری آئے تو اللہ تعالیٰ سے صحت مانگے کہ یا اللہ! مجھے صحت عطا فرمادے، جیسے حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا:

اِنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ۔

(سورۂ ص، آیت ۴۱)

دوسری جگہ فرمایا:

اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ۔

(سورۃ القمر، آیت ۱۰)

مجھ کو یہ تکلیف پہنچ رہی ہے، اور آپ سب مہربانوں سے

زیادہ مہربان ہیں۔

بہر حال، صحت مانگنا انبیاء علیہم السلام کی سنّت ہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ ایک بزرگ بیمار ہو گئے، دوسرے بزرگ ان کی عیادت کے لئے تشریف لے گئے، انہوں نے جاکر دیکھا کہ وہ بیمار بزرگ تکلیف میں ہیں، لیکن اس تکلیف کے عالم میں "الحمد للہ، الحمد للہ" کا ورد کر رہے ہیں، نہ تو آہ آہ کر رہے ہیں اور نہ ہی صحت کی دعا کر رہے ہیں۔ جو بزرگ عیادت کرنے کے لئے گئے تھے، انہوں نے کہا کہ دیکھو بھائی! اگر تم نے اس طرح "الحمد للہ" کا ورد جاری رکھا تو صحت حاصل نہیں ہو گی، اگر صحت چاہتے ہو اور یہ چاہتے ہو کہ یہ تکلیف دور ہو جائے تو تھوڑا ہائے ہائے کرو، اور اللہ تعالیٰ سے صحت مانگو اور کہو کہ یا اللہ! میں عاجز اور کمزور ہوں، مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہوتی، آپ مجھ سے اس تکلیف کو دور فرما دیجئے اور صحت عطا فرما دیجئے۔ بہر حال، اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی اور شکستگی کا اظہار کرنا مطلوب ہے، نہ یہ کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا اظہار کرے۔

اس قدر بھی ضبط غم اچھا نہیں

ہمارے بڑے بھائی تھے، محمد ذکی کیفی صاحب، اللہ تعالیٰ ان کے

درجات بلند فرمائے، آمین، شعر بہت اچھے کہتے تھے، ایک شعر میں انہوں نے یہی بات بیان فرمائی ہے، فرمایا کہ:

اس قدر بھی ضبط غم اچھا نہیں

توڑنا ہے حسن کا پندار کیا؟

ضبطِ غم ویسے تو اچھی چیز ہے، لیکن اس قدر بھی ضبط غم نہ ہو کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادر بن جائے، کیا اللہ تعالیٰ کا پندار توڑنا چاہتے ہو کہ آپ مجھے کتنی بھی تکلیف دیں، لیکن میں بڑا بہادر ہوں، میں سب برداشت کروں گا۔ یاد رکھو! یہ بندگی کا تقاضہ نہیں ہے، بندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگے کہ یا اللہ! مجھے صحت عطا فرمادیجئے۔

بھوک کی وجہ سے ایک بزرگ کا رونا

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنایا کرتے تھے کہ ایک بزرگ بیٹھے رو رہے تھے، کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت! کیوں رو رہے ہیں؟ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اس لئے رو رہا ہوں کہ بھوک لگ رہی ہے، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہوں کہ یا اللہ! بھوک لگ رہی ہے، کھانا کھلا دیجئے۔ کسی نے کہا کہ آپ تو بچوں کی طرح رو رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ اللہ میاں نے مجھے اسی لئے بھوک دی ہے تاکہ میں رو رو کر اس سے مانگوں اور اس کے سامنے عاجزی کا اظہار کروں۔

بیماری میں ہائے ہائے کرنا

بہر حال، بیماری کی حالت میں صحت کی دعا کرنا تو سنّت ہے، بشرطیکہ وہ ایسے طریقے سے نہ ہو کہ اس میں شکوہ پنہاں ہو، معاذ اللہ۔ بیماری کی حالت میں ہائے ہائے کرنے میں کوئی حرج نہیں، تکلیف کے اظہار میں کوئی حرج نہیں، لیکن تکلیف کا اظہار ایسے الفاظ سے نہ ہو کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ ہو، کیونکہ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یا اللہ! فیصلہ آپ ہی کا برحق ہے، مشیت آپ ہی کی درست ہے، لیکن میں کمزور ہوں، عاجز ہوں، اس تکلیف کو برداشت نہیں کرپارہا ہوں، اے اللہ! اس تکلیف کو دور فرمادیجئے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا تکالیف پر صبر

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ کو دیکھا کہ آپ کو شدید دل کی تکلیف تھی، اس کے ساتھ ساتھ پاؤں میں نقرس کا درد، اور پھر اس کے علاوہ جسم پر پھنسیاں بھی نکل آئیں، جس کو ڈاکٹر ہرپیز کی پھنسیاں کہتے ہیں، جو ڈاکٹر اور اطباء آکر ان پھنسیوں کو دیکھ رہے تھے، وہ بتاتے تھے کہ یہ پھنسیاں ایسی ہیں کہ جب جسم پر نکل آتی ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جسم پر کسی نے انگارہ رکھ دیا ہو، اور پوری ٹانگ ان پھنسیوں سے بھری ہوئی تھی اور سینے پر بھی نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس دوران حضرت والد

صاحبؒ کو دیکھنے کے لئے چھ سات بڑے بڑے اطباء اور ڈاکٹر آئے جن میں حکیم سعید صاحب بھی تھے، جب یہ حضرات دیکھ کر باہر تشریف لائے تو انہوں نے کہا کہ ہمیں اس پر حیرت ہے کہ مفتی صاحب کیسے اس کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں؛ اس لئے کہ یہ پھنسیاں تو بالکل انگاروں کی طرح تکلیف دہ ہوتی ہیں۔

رحم کی دعا پر استغفار

ابھی اپنی ان تکالیف کے اندر مبتلا تھے کہ اسی حالت میں ہمارے بڑے بھائی صاحب "بھائی ذکی کیفی مرحوم" کے انتقال کی خبر آئی، جو جوان اور محبوب بیٹے تھے۔ آپ اندازہ لگائیں کہ ایک طرف دل کی تکلیف، دوسری طرف نقرس کا درد، تیسرے ہرپیز کی پھنسیاں، اور چوتھے جوان بیٹے کے انتقال کی خبر۔ اس وقت بے ساختہ زبان پر یہ الفاظ آئے یا اللہ! فضل فرما، یا اللہ! رحم فرما۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد فرمایا کہ یہ میں نے کیا کہدیا کہ یا اللہ! رحم فرما، اس کا تو مطلب یہ ہے کہ اب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحم نہیں ہو رہا ہے، یہ تو معاذ اللہ شکوہ کی بات ہوگئی، اس میں شکوہ کا شائبہ پیدا ہو گیا، حالانکہ ہم تو ہر وقت اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش میں زندگی گزار رہے ہیں، یا اللہ! میں ان الفاظ پر آپ سے استغفار کرتا ہوں، استغفر اللہ، استغفر اللہ، پھر یہ دعا فرمائی کہ یا اللہ! یہ بیماری بھی آپ کی نعمت ہے، لیکن یا اللہ! ہم کمزور ہیں، عاجز ہیں، اس نعمت کو برداشت کرنے کی طاقت ہمارے اندر نہیں ہے، اے اللہ! اس بیماری کی نعمت کو صحت کی نعمت سے تبدیل فرما۔

دعا میں شکوہ کا رنگ نہ ہو

آپ اندازہ لگائیں کہ جس شخص پر یہ تکالیف اور پریشانی گزر رہی ہو، اس وقت ذہن کا اس بات کی طرف جانا کہ میرا یہ جملہ "یا اللہ! رحم فرما" کہیں غلط نہ ہو گیا ہو، یہ اسی شخص کا ذہن اس طرف جا سکتا ہے جس کا رابطہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا ہو، ہر کس و ناکس کا ذہن اس طرف نہیں جا سکتا۔ اس کے ذریعہ ادب سکھا دیا کہ صحت کی دعا مانگو، لیکن اس طرح نہ مانگو کہ اس میں شکوہ کا رنگ پیدا ہو جائے، بلکہ اپنی کمزوری اور اپنی عاجزی کا اظہار کرتے ہوئے صحت کی دعا کرو، اپنی شکستگی کا اظہار کرتے ہوئے مانگو، پھر انشاء اللہ اس دعا پر اللہ تعالیٰ ثواب بھی عطا فرمائیں۔ اسی لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: صحت کی دعا تو سنّت ہے اور علامت "عبدیت" کی ہے۔

حضور ﷺ کی شان میں توصیف کے کلمات

یاد رکھئے! انسان کا اعلیٰ ترین مقام جس سے اعلیٰ مقام کوئی اور نہیں ہو سکتا، وہ "عبدیت" کا مقام ہے، یعنی انسان اللہ کا بندہ بن جائے۔ دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کتنے عنوانات سے فرمایا کہ تعریف اور توصیف کا کوئی کلمہ نہیں چھوڑا۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا:

يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا
وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا

مُّنِيْرًاO

(سورۃ الاحزاب، آیت ۴۵)

اے نبی ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اس شان کا رسول بنا کر بھیجا ہے کہ آپ گواہ ہوں گے اور آپ بشارت دینے والے ہیں اور ڈرانے والے ہیں اور اللہ کی طرف اس کے حکم سے بلانے والے ہیں اور آپ ایک روشن چراغ ہیں۔

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

لَقَدْ جَآءَ كُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ
مَاعَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ
رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌO

(سورۃ التوبۃ، آیت ۱۲۸)

یعنی تمہارے پاس ایک ایسے پیغمبر تشریف لائے ہیں جو تمہاری جنس سے ہیں، جن کو تمہاری مضرت کی بات نہایت گراں گزرتی ہے، جو تمہاری منفعت کے بڑے خواہش مند رہتے ہیں، مؤمنین کے ساتھ بڑے ہی شفیق مہربان ہیں۔

مختلف عنوانات سے اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی توصیف فرمائی ہے، کہیں "يَا اَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ" فرما رہے ہیں، اور کہیں "يَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ"

فرمارہے ہیں، کہیں ''کملی والے'' کہہ کر خطاب کر رہے ہیں، کہیں ''چادر والے'' کہہ کر خطاب کر رہے ہیں، محبّت اور پیار کا اور تعظیم و تکریم کا کوئی عنوان نہیں چھوڑا۔

معراج کے تذکرے میں ''عبد'' کا لفظ لانا

لیکن جب اللہ تعالیٰ نے معراج کے موقع پر آپ کو قرب کا سب سے اعلیٰ مقام عطا فرمایا، جہاں پر آپ ﷺ کو ہم کلامی کا شرف عطا فرمایا اور اس مقام پر پہنچایا کہ جبرئیل امین بھی وہاں نہ جاسکے، تو قرآن کریم میں جہاں اس بلند مقام کے عطا کرنے کا ذکر فرمایا، وہاں آپ ﷺ کے لئے صرف ایک لفظ ''عبد'' کا ذکر فرمایا، چنانچہ ارشاد فرمایا:

سُبْحَانَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِالْحَرَامِ۔

(سورۂ بنی اسرائیل، آیت ۱)

یعنی پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندے کو رات کے وقت مسجد حرام سے لے گئی۔

اب یہاں پر نہ ''شاہداً'' کا لفظ ارشاد فرمایا، نہ ''مبشراً'' نہ ''نذیراً'' لائے، یہاں صرف ''بعبدہ'' کا لفظ لائے کہ اپنے بندے کو لے گئے، اس سے اشارہ اس طرف فرمادیا کہ ''بندگی'' سے زیادہ اونچا کوئی دوسرا مقام نہیں ہوسکتا، چاہے کوئی انسان کتنا ہی آگے بڑھ جائے، لیکن اس کی معراج یہ ہے کہ وہ اللہ

تعالیٰ کا بندہ بن جائے۔ لہٰذا انسان کا اعلیٰ ترین مقام "عبدیت" ہے، اور یہ "عبدیت" اس طرح حاصل ہوتی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے روئے، گڑگڑائے، شکستگی اور عاجزی کا اظہار کرے۔

یہ بے ادبی کے الفاظ ہیں

بہر حال! حضرت والا نے فرمایا کہ "صحت کی دعا کرنا تو سنت ہے اور علامت عبدیت کی ہے۔ مگر یہ کہنا کہ اب پروردگار عالم ساتھ ایمان کے بلالے، بلا بصارت زندگی بیکار ہے، یہ نہایت بے ادبی ہے۔ یہ الفاظ اکثر و بیشتر لوگوں کی زبان پر آجاتے ہیں کہ اب تو اللہ میاں ایمان کے ساتھ اٹھالے، اب تو زندگی بیکار ہے۔ ان الفاظ کے بارے میں فرمایا کہ یہ بہت بے ادبی کی بات ہے اور عبدیت سے بہت بعید ہے۔ ارے ہم کو رائے قائم کرنے کا کیا حق ہے کہ ہم زندگی کے بارے میں یہ رائے قائم کریں کہ اب تو زندگی بیکار ہے، اس کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں فضول زندہ رکھا ہے، معاذ اللہ۔

یہ تکلیف تمہیں کس بلند مقام پر پہنچا رہی ہے

تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے لئے زندگی بہتر ہے یا موت بہتر ہے، کیا معلوم کہ اس آنے والی زندگی میں کوئی ایک عمل ایسا ہو جائے جس سے بیڑہ پار ہو جائے، کیا معلوم کہ یہ تکلیف جس کی وجہ سے تم کراہ رہے ہو اور یہ تمنا کر رہے ہو کہ مجھے موت آجائے تو بہتر ہے، یہی تکلیف تمہیں معلوم نہیں کس بلند

مرتبے پر پہنچا رہی ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں معاملات بڑے عجیب ہوتے ہیں، کوئی ان کو سمجھ نہیں سکتا۔

ما پروریم دشمن و ما می کشیم دوست

کسے را چرا و چوں نہ رسد در قضاءِ ما

یعنی ہم دشمنوں کو پالتے ہیں اور دوستوں کو مار دیتے ہیں، کسی کو ہمارے فیصلے میں چوں و چرا کرنے کی گنجائش نہیں۔ اچھے خاصے دشمن خدا اور دشمن دین کو ڈھیل دی جارہی ہے، وہ چاند پر جھنڈے گاڑ رہے ہیں، اور جو اپنے پیارے اور محبوب ہیں، ان کو آروں سے چروایا جارہا ہے۔

ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی بندے کو کسی خاص مقام تک پہنچانا چاہتے ہیں، لیکن وہ شخص اپنے اعمال کے ذریعہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکا تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں، کبھی جسم میں، کبھی جان میں، کبھی خیالات میں، کبھی جذبات میں تکلیف دیدیتے ہیں، پھر اس تکلیف کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کو کہاں سے کہاں پہنچادیتے ہیں۔

ایک مسلمان اور ایک یہودی کا قصّہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصّہ لکھا ہے کہ ایک شہر میں ایک یہودی تھا اور ایک مسلمان تھا، دونوں بستر مرگ پر مرنے کے قریب تھے، یہودی کے دل میں مچھلی کھانے کی خواہش پیدا ہوئی کہ کاش کہ کہیں سے مچھلی

مل جائے تو کھاؤں اور مسلمان کے دل میں زیتون کا تیل کھانے کا دل چاہا، اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے سے فرمایا کہ فلاں شہر میں ایک یہودی ہے، اس کا مچھلی کھانے کو دل چاہ رہا ہے، تم ایسا کرو کہ ایک مچھلی پکڑ کر اس کے گھر کے اندر جو تالاب ہے اس میں ڈال دو، تاکہ وہ مچھلی وہاں سے نکلوا کر کھالے۔ اور ایک فرشتے کو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ فلاں مسلمان کو زیتون کھانے کا دل چاہ رہا ہے اور اس کے گھر کی الماری میں زیتون موجود ہے، تم جا کر وہ زیتون ضائع کر دو۔ چنانچہ وہ دونوں فرشتے اللہ تعالیٰ کا حکم بجالانے کے لئے روانہ ہو گئے۔

فرشتوں نے اپنا اپنا کام کر لیا

راستے میں دونوں فرشتوں کی ملاقات ہو گئی، ایک فرشتے سے دوسرے نے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ ایک یہودی کا مچھلی کھانے کو دل چاہ رہا ہے، اس کے تالاب میں مچھلی ڈال دوں، تاکہ وہ اس کو کھالے۔ دوسرے فرشتے نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ فلاں مسلمان کو زیتون کا تیل کھانے کو دل چاہ رہا ہے، تم جا کر اس کے تیل کو ضائع کر دو، تاکہ وہ اس کو نہ کھا سکے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم تو بہر حال حکم ہے، اس کو ماننا ضروری ہے، چنانچہ دونوں فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق اپنا اپنا کام کر لیا۔

یا اللہ! بات سمجھ میں نہیں آئی

جب وہ دونوں فرشتے اپنا اپنا کام کر کے واپس ہوئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پہنچے اور عرض کیا کہ یا اللہ! یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی، ایک طرف یہودی ہے جو کافر ہے، اس کی خواہش تو آپ اس طرح پوری کرا رہے ہیں کہ اس کے تالاب میں مچھلی موجود بھی نہیں تھی، اس کے باوجود اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے اس کے تالاب میں مچھلی ڈلوادی۔ دوسری طرف مسلمان ہے جس کے گھر میں زیتون کا تیل موجود تھا، اس کے باوجود آپ نے اس کے تیل کو ضائع کرادیا، تاکہ وہ اپنی خواہش پوری نہ کرسکے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

کافروں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ یہ جو غیر مسلم اور کافر ہیں ان کے ساتھ میرا معاملہ یہ ہے کہ یہ جو کچھ دنیا میں اچھے کام کرتے ہیں، مثلاً کوئی صدقہ خیرات کر دیا، دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آگئے، کوئی خیراتی کام کر دیئے وغیرہ، میں یہ چاہتا ہوں کہ ان کے اچھے کاموں کا بدلہ دنیا میں ہی چکا دیا جائے، اور جب یہ میرے پاس آئیں تو ان کی اچھائیوں کا حساب دنیا میں بے باک ہو چکا ہو، اور میرے ذمے آخرت میں ان کی نیکی کا بدلہ کوئی نہ ہو، اس لئے میں ان کی نیکیوں کا بدلہ دنیا میں دیتا رہتا ہوں۔ یہ

یہودی بھی بہت سے اچھے کام کرتا تھا، ان تمام اچھے کاموں کا بدلہ میں دنیا میں دے چکا تھا، صرف ایک اچھے کام کا بدلہ اس کو دنیا میں نہیں ملا تھا، اور اب یہ یہودی ہمارے پاس آنے والا تھا، اس لئے ہم نے چاہا کہ اس کی یہ آخری خواہش اور پوری کر دی جائے تاکہ اس کے نتیجے میں اس کا حساب کتاب برابر ہو جائے، لہٰذا اس کی اس خواہش کو پورا کر کے ہم نے اس کا حساب کتاب برابر کر دیا، اب یہ ہمارے پاس آئے گا تو ہمارے ذمے اس کی کسی نیکی کا بدلہ دینا باقی نہیں ہو گا۔

مسلمانوں کے ساتھ دوسرا معاملہ ہے

اور مسلمانوں کے ساتھ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں گناہ کرتا ہے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس کے گناہوں کا حساب دنیا ہی میں بیباق ہو جائے، تاکہ جب وہ ہمارے پاس آئے تو گناہ کا کوئی حساب اس کے کھاتے میں نہ ہو اور ہمیں اس کو عذاب دینے کے لئے جہنم میں نہ بھیجنا پڑے۔ لہٰذا اگر کسی مسلمان کے ذمے کوئی گناہ باقی ہوتا ہے تو ہم تکلیفوں کے ذریعہ اور بیماریوں کے ذریعہ اس کے گناہ ختم کر دیتے ہیں۔ اسی طرح اس مسلمان کے اور سارے گناہ تو معاف ہو گئے تھے، صرف ایک گناہ باقی رہ گیا تھا، ہم نے چاہا کہ اس کا یہ گناہ بھی باقی نہ رہے، تاکہ جب یہ ہمارے پاس آئے تو پاک صاف ہو کر ہمارے پاس آئے، اس لئے جب اس کے دل میں زیتون کا تیل کھانے کی خواہش ہوئی تو ہم نے اس کا زیتون کا تیل ضائع کرا دیا اور اس کے دل پر ایک چوٹ اور لگا

دی اوراس کے نتیجے میں اس کا وہ گناہ بھی ختم ہو گیا، اور اب وہ ہمارے پاس دھلا دھلایا پاک صاف ہو کر آئے گا۔ لہٰذا کہاں تک انسان اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا ادراک کرے گا۔

حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ کو نوازنے کا انداز

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا، اتفاق سے کسی کتاب میں نہیں دیکھا، اور تلاش بھی کیا لیکن نہیں ملا، آپ حضرات بھی تلاش کیجئے گا، مل جائے تو مجھے اسکا حوالہ بتادیں۔ وہ قصہ یہ ہے کہ جس وقت حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیمار تھیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے، حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنی تکلیف کا اظہار کر رہی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ یہ تمہاری تکلیف جان لیوا تکلیف ہے، تم اب بچو گی نہیں، اسی بیماری میں تمہارا انتقال ہو جائے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بہت رحیم وکریم تھے، بڑے شفیق اور مہربان تھے، اور پھر عام لوگوں کو بھی یہ حکم ہے کہ جب آدمی کسی کی عیادت کے لئے جائے تو جاکر اس کو تسلی دے، نہ یہ کہ اس کو یہ کہے کہ تم اس بیماری میں مر جاؤ گے، پھر حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیوی تھیں، اور بیوی بھی ایسی ہمدرد اور غمگسار تھیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر ان کو

یاد فرمایا۔ ایسی بیوی سے آپ نے یہ جملہ کیسے فرمادیا کہ تم اس بیماری میں بچو گی نہیں، بلکہ مر جاؤ گی؟

حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ علماء کرام نے اس کے بارے میں فرمایا کہ بات دراصل یہ تھی کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو آخرت میں جنّت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنا تھا، لیکن اعمال کے ذریعہ وہ ابھی تک اس مقام تک نہیں پہنچ سکی تھیں، اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جنّت میں اپنے ساتھ رکھنے کی خاطر یہ عمل کیا کہ ان کے سامنے ایسے الفاظ کہے، تاکہ اس کے ذریعہ ان کے دل پر چوٹ لگے اور اس چوٹ لگنے کے نتیجے میں ان کے درجات بلند ہو جائیں اور آخرت میں یہ میرے پاس آجائیں۔

تکالیف پر رضامندی، درجات کی بلندی کا ذریعہ

بہر حال! یہ تکلیف اور یہ بیماری جو تمہیں دنیا میں پہنچ رہی ہے، تمہیں کیا معلوم کہ یہ تمہارے حق میں فائدہ مند ہے یا نقصان دہ ہے، لیکن حقیقت میں ان کے آخرت میں فائدہ مند ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں، بشرطیکہ تم اس پر راضی رہو۔ لہٰذا اپنی طرف سے یہ کہنا کہ اب تو زندگی بیکار ہے، یہ بہت غلط بات ہے اور بے ادبی کا جملہ ہے، اسی وجہ سے موت کی تمنا کرنے سے منع کیا گیا ہے، ارے کیا معلوم کہ اگر وہ موت جس کو تم مانگ رہے ہو، وہ ابھی آگئی، اور مرنے کے بعد سیدھے مقام غضب میں پہنچ گئے، تو بتایئے موت آنے کا

کیا نتیجہ ہوا؟

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

موت اس وقت قابل محبت ہے جب اس کے ذریعے سے اللہ جل شانہ کا مقام رضا حاصل ہو، اس وقت بیشک موت محبوب چیز ہے، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ مرنے کے بعد کہاں پہنچو گے، اس لئے موت کی تمنا مت کرو۔

موت کی دعا کے بجائے یہ دعا کریں

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا تلقین فرمائی، وہ تو یہ ہے کہ:

اَللّٰھُمَّ بِعِلْمِكَ الْغَیْبَ وَقُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ
اَحْیِنِی مَاعَلِمْتَ الْحَیَاۃَ خَیْراً لِّیْ وَتَوَفَّنِیْ اِذَا
عَلِمْتَ الْوَفَاۃَ خَیْراً لِّیْ

(کنز العمال، حدیث نمبر ۳۶۱۱)

یعنی اے اللہ! آپ کے علم غیب کا واسطہ دیکر اور مخلوق پر آپ کی قدرت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں کہ یا اللہ! جب تک آپ کے علم میں میرے لئے زندگی بہتر ہو، مجھے زندہ رکھئے، اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو، اس وقت مجھے موت دیدیجئے۔

یہ دعا کرنی چاہئے، نہ یہ کہ یہ کہا جائے کہ بس اب تو مجھے موت ہی آ جائے تو اچھا ہے، اب تو زندگی سے دل بیزار ہو گیا ہے، اب تو بس اللہ تعالیٰ اپنے پاس بلالے۔ یہ سب بے ادبی کی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی رائے چلانا ہے۔

تین سبق

بہرحال، اس ملفوظ سے تین سبق ملے، پہلا سبق یہ ملا کہ صحت کی دعا کرنا سنّت ہے، دوسرا سبق یہ ملا کہ ایسے انداز سے دعا نہ کرے جس میں شکوہ و شکایت کا انداز ہو، تیسرا سبق یہ ملا کہ تکلیف کی شدّت کی وجہ سے یا بیماری کے طول کی وجہ سے یہ دعا کرنا کہ مجھے موت آ جائے، یہ دعا کرنا درست نہیں۔ دعا وہ کرے جو حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ یا اللہ! جب تک زندگی بہتر ہو، اس وقت تک زندہ رکھئے، اور جب میرے حق میں موت بہتر ہو، اس وقت موت عطا فرما دیجئے۔ یا پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگی ہوئی یہ دعا کرے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ تَعْجِیْلَ عَافِیَتِكَ وَصَبْراً عَلٰی بَلِیَّتِكَ وَخُرُوْجاً مِنَ الدُّنْیَا اِلٰی رَحْمَتِكَ۔

(کنز العمال، حدیث نمبر ۳۶۹۸)

اے اللہ! میں آپ سے جلدی کی عافیت اور مصیبت پر صبر اور دنیا سے آپ کی رحمت کی طرف خروج کا سوال

کرتا ہوں۔

لہٰذا یہ دعا کرنی چاہئے اور براہ راست موت کی دعا نہیں کرنی چاہئے۔

اپنی طرف سے تجویز مت کرو

بہر حال، ان صاحب نے خط میں یہ لکھا تھا کہ رنج اس بات کا ہے کہ آنکھ جاتی رہی، اب تلاوت نہیں کر سکتا، مواعظ نہیں پڑھ سکتا، اس کا بڑا سخت رنج ہے۔ اس کے جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ تلاوت اور کتب بینی میں ثواب اور رضا منحصر نہیں، تم نے اپنی طرف سے تجویز کر لیا کہ مجھے تو ثواب تلاوت قرآن کریم ہی کے ذریعہ حاصل ہو گا، اور چونکہ اب آنکھیں نہ رہیں تو اب میں ثواب سے محروم ہو گیا۔ ارے یہ تو اللہ جل شانہ کے ساتھ بدگمانی ہے، یہ بدگمانی مت کرو، البتہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی رہو، اسی پر اللہ تعالیٰ اجر عطا فرمائیں گے۔

حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ

بڑے قاری صاحب حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو ساری عمر مجسّم تلاوت تھے، روئیں روئیں میں قرآن کریم بسا ہوا تھا، ان کی کیفیت بالکل اس دعا کے مطابق تھی:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْقُرْآنَ الْعَظِیْمَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَنُوْرَ بَصَرِیْ وَجِلَاءَ حُزْنِیْ وَذَھَابَ ھَمِّیْ۔

اے اللہ! قرآن عظیم کو میرے دل کی تازگی، میری آنکھوں کے لئے نور، میرے غم اور پریشانی کو دور کرنے کا سبب بنا دیجئے۔ اگر قاری صاحب کو دیکھا نہ ہوتا تو یقین نہ آتا کہ ایسا انسان بھی دنیا میں ہو سکتا ہے، قرآن کریم ان کی زندگی میں رچا بسا ہوا تھا، اور رگ و پے میں سرایت کیا ہوا تھا، ہر وقت سراپا تلاوت تھے، کوئی لمحہ تلاوت سے خالی نہیں ہوتا تھا۔

لیکن آخر میں فالج کا حملہ ہوا، اور زبان بند ہو گئی، اب وہ شخص جس کی زبان ہر وقت تلاوت سے تر رہتی تھی، اس کی زبان بند ہو گئی، جب میں ان کو اس حالت میں دیکھتا تو کبھی کبھی بڑا دل دکھتا اور صدمہ ہوتا کہ یا اللہ! جس نے ساری عمر تلاوت قرآن میں گزاری، اب اس کی زبان بند ہو گئی، یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اب آخری وقت میں لیٹے لیٹے تلاوت ہی کرتے رہیں۔ بہر حال، ان کو دیکھ کر بڑی حسرت ہوتی تھی، لیکن فوراً میرے دل میں دوسرا خیال آیا کہ درحقیقت اللہ جل شانہ اس کے ذریعے یہی تو دکھانا چاہتے ہیں کہ نہ تلاوت میں کچھ رکھا ہے، اور نہ ترک تلاوت میں کچھ رکھا ہے، ہم جس حالت میں رکھیں، بندے کے لئے اسی میں خیر ہے، جب ان کو تلاوت کا ذوق تھا اور زبان سے ہر وقت تلاوت جاری تھی، اس وقت اللہ تعالیٰ تلاوت کے ذریعہ ان کے درجات بلند فرما رہے تھے، اور اب جبکہ تلاوت جزو زندگی بن گئی تو ان کی زبان بند کر دی گئی، اب ان کو اس خاموشی پر اور زبان بندی پر وہی اجر مل رہا ہے جو تلاوت پر مل رہا تھا، بلکہ شاید تلاوت سے زیادہ اب اجر مل رہا ہے، اس لئے کہ تلاوت میں تو ان کو لذت آنے لگی تھی، اور اب تو تلاوت کے لئے

زبان بند کر دی گئی، اب تلاوت کے لئے دل چاہ رہا ہے اور حسرت ہو رہی ہے، مگر زبان نہیں کھلتی، تو اب تلاوت کا ثواب ان کو الگ مل رہا ہے اور تلاوت نہ کرنے پر حسرت کا ثواب الگ مل رہا ہے، اس طرح ہم نے ان کے درجات کی بلندی کا ڈبل سامان کر دیا۔ یہ سب کام اللہ تعالیٰ کی حکمتوں سے ہو رہے ہیں، کون اس میں دخل دے سکتا ہے۔

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چونکہ برمیخد ببندد بستہ باش
چوں کشاید چابک و برجستہ باش

یعنی جب اللہ تعالیٰ تمہیں کہیں باندھ کر ڈال دیں تو بندھے پڑے رہو، تمہاری عبادت یہی ہے، اس لئے کہ یہ ان کی طرف سے ہے۔

ہمارا حکم اور ہمارا فیصلہ ہی سب کچھ ہے

لہٰذا تمہارے دل میں یہ جو خیال پیدا ہو رہا ہے کہ مجھ سے تلاوت نہیں ہو رہی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا شوق پورا نہیں ہو رہا ہے، اس لئے اس کا صدمہ ہو رہا ہے۔ ارے اگر مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا ہے تو پھر تلاوت بند ہونے کے وقت بھی وہی رضا حاصل ہو گی جو رضا تلاوت کے وقت حاصل تھی، اس لئے یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ کس عمل سے خوش ہیں۔ حضرت قاری فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ میں بڑی عبرت ہے، میں ان کو دیکھ کر یہ سوچتا کہ یہ شخص جس نے ساری عمر قرآن کریم کی تلاوت میں گزاری، لیکن آج اللہ

تعالیٰ یہ جلوہ دکھا رہے ہیں کہ دیکھو! وہ شخص جو ہمارے کلام کا ایسا عاشق تھا، ہم نے اس کی زبان بند کر دی کہ قرآن کا ایک لفظ نہ پڑھ سکے۔ یہ سب اس لئے کیا تاکہ دنیا کو دکھا دیں کہ کسی چیز میں کچھ نہیں رکھا، سب کچھ ہمارے حکم اور ہمارے فیصلے میں ہے، ہم جو فیصلہ کریں اور جو حکم دیں حقیقت میں وہ دین ہے۔

بیماری میں سابقہ عمل کا ثواب ملتا رہتا ہے

آگے فرمایا کہ:

> اول تو صحت کی حالت میں تطوع پر مداومت کرنے والے کو مرض میں بدون عمل کئے بھی ثواب عمل سابق کا ملتا رہتا ہے، دوسرے بعض اوقات صبر کا اجر عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے۔

یعنی ایک شخص صحت کی حالت میں ایک نفلی عبادت کا عادی ہے، مثلاً وہ روزانہ ایک پارہ تلاوت قرآن کرتا ہے، اب بیمار ہو گیا اور بیماری کی وجہ سے تلاوت نہیں کر سکتا، تو جتنے دن بیماری کی وجہ سے تلاوت نہیں کرے گا تو اس کو روزانہ ایک پارہ تلاوت کرنے کا ثواب ملتا رہے گا، دوسرے بعض اوقات صبر کا اجر عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے، مثلاً ایک شخص عمل کرنے کا اتنا عادی ہو گیا کہ وہ عمل اس کی زندگی کا جز بن گیا کہ اس کی رگ و پے میں سما گیا، اب اللہ تعالیٰ نے کوئی مجبوری ایسی پیدا کر دی کہ اب وہ اس عمل کو نہیں کر سکتا، تو اب وہ شخص عمل نہ ہو سکنے پر جو صبر کر رہا ہے اس صبر کا اجر اصل عمل کے اجر سے بڑھ جاتا ہے،

چنانچہ خود تلاوت کرنے پر اس کو اتنا اجر نہ ملتا جتنا اس کو صبر کرنے پر مل رہا ہے۔

بینائی کی دعا کرنے میں کوئی حرج نہیں

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ "البتہ بینائی کی دعا خود رائی نہیں" یعنی یہ دعا کرنا کہ یا اللہ! بینائی عطا فرما دیجئے، اس میں کوئی حرج نہیں، اس کی اجازت ہے۔ لہٰذا دعا مانگے اور دل سے مانگے اور ساتھ میں یہ سمجھے کہ اگر اس کے خلاف واقع ہوا وہ بھی خیر ہے، اس پر بھی راضی رہے" یعنی دعا کرنے کے باوجود بینائی نہ ملی تو یہ سمجھے کہ میرے لئے بہتری اسی میں ہے۔

حضرت تھانویؒ اور فہم دین

اللہ تعالیٰ نے حکیم الامّت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دین کی جو فہم عطا فرمائی تھی، جس کے نتیجے میں دین کی ایک ایک بات واضح فرمادی، حقیقت یہ ہے کہ اب ان جیسی فہم کا آدمی نظر نہیں آتا، انہوں نے تجزیہ کر کے چھان پھٹک کر ایک ایک چیز الگ کر دی اور دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ کر کے چلے گئے اور صدیوں کے لئے راستہ واضح کر دیا۔ اب اسی ملفوظ کے اندر دیکھئے کہ ایک چھوٹی سے بات تھی، لیکن اس میں کتنے سبق سکھا دیئے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

دنیا و آخرت دونوں

اللہ سے مانگیں

جسٹس مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہم العالی

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۳
مجلس نمبر : ۴۸
صفحات : ۱۳

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

مجلس نمبر ۴۸

دنیاو آخرت دونوں اللہ سے مانگیں

الحمدللّٰه رب العالمین ۔ والعاقبة للمتقین۔
والصّلوٰة والسّلام علیٰ رسوله الکریم۔
وعلیٰ آله واصحابه اجمعین ۔ أَمَّا بَعۡدُ!

دنیاوی مقاصد کی دعا نہ مانگنا بے ادبی ہے

ایک صاحب نے حضرت والا کو خط میں لکھا کہ:

دعا فرمادیں کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے مطالب پورا کریں یا نہ کریں، لیکن مقصود حقیقی یعنی رضاء مولیٰ ہمیشہ نصیب رکھیں۔

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ:

یہ کہنا بے ادبی ہے، ہم کو دنیا کے مطالب کی بھی حاجت

ہے، دعا یہ کرنی چاہئے کہ دارین کے مطالب پورے ہوں۔

(انفاس عیسیٰ ص ۷۸)

یعنی یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے مقاصد پورے کریں یا نہ کریں، اس کی تو ہمیں پروا نہیں، بس اللہ تعالیٰ وہاں کی رضا عطا فرمادے، یہ کہنا بے ادبی ہے۔ ارے ہم تو دنیا کے مطالب کے بھی محتاج ہیں، دعا یہ کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ دارین کے مقاصد پورے فرمادیں۔ دنیا کے مقاصد بھی مانگنا ضروری ہے، اگر تین دن کھانا نہ ملے تو ساری اکڑ فوں نکل جائے گی اور حالت خراب ہو جائے گی۔ ارے ہم تو روٹی کے محتاج، کھانے کے محتاج، پانی کے محتاج، صحت کے محتاج، ہر چیز کے محتاج ہیں، اس لئے اپنی ساری حاجتیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرو، دنیا کی حاجتیں بھی پیش کرو اور آخرت کی حاجتیں بھی پیش کرو۔

ایک بزرگ کا سبق آموز واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ سے یہ واقعہ سنا کہ ایک بزرگ تھے، اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر میں اس درجہ مستغرق ہوئے اور ذکر اللہ میں ان کو اتنا مزہ آیا کہ ایک مرتبہ غلبہ حال میں ان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ:

وَلَيْسَ لِىْ فِىْ سِوَاكَ حَظٌّ

فَكَيْفَ مَا شِئْتَ فَاخْتَبِرْنِىْ

اللہ تعالیٰ حفاظت میں رکھے، آمین۔ یہ بڑا خطرناک جملہ تھا۔ یعنی فرمایا کہ اے اللہ! مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں لذت نہیں، کسی چیز میں حظ نہیں، بس آپ کے ذکر و فکر میں لذت آتی ہے۔ آگے فرمایا کہ آپ جس طرح چاہیں مجھے آزما کر دیکھ لیجئے۔ اللہ تعالیٰ کو آزمانے کی دعوت، استغفر اللہ، نعوذ باللہ، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے پیشاب بند کر دیا، اب مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا ہے، درد اور تکلیف ہے لیکن پیشاب خارج نہیں ہو رہا ہے۔

انسان کو تو پیشاب کی بھی حاجت ہے

اس کے ذریعہ ان کو یہ دکھایا گیا کہ تم یہ کیا دعویٰ کر رہے تھے کہ آپ کے سوا کسی چیز میں مجھے حظ نہیں، ارے تمہیں تو پیشاب میں بھی حظ ہے، تمہیں تو پیشاب کی بھی حاجت ہے، اگر یہ بند ہو جائے تو تمہاری زندگی اجیرن بن جائے۔ سمجھ گئے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی، توبہ کی اور استغفار کیا، ان کے پاس چھوٹے بچے قرآن شریف پڑھنے آیا کرتے تھے، ان بچوں سے کہتے کہ ارے بچو!

اُدْعُوْا لِعَمِّکُمُ الْکَذَّابِ

اپنے جھوٹے چچا کے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اس لئے کہ اس نے یہ جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں حظ اور مزہ نہیں ہے۔

ہر ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگی جائے

بہر حال، وہ ذات ایسی نہیں ہے کہ اس سے استغناء برتا جائے، نہ دنیا کے معاملے میں اور نہ ہی آخرت کے معاملے میں، ارے ہم تو اس کے سامنے دنیا کی حاجات بھی پیش کریں گے اور آخرت کی حاجات بھی پیش کریں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے کہ آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے کیا چیز نہیں مانگی، ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگی، دنیا کا رزق بھی مانگا، صحت بھی مانگی، فقر سے پناہ مانگی، کسل سے پناہ مانگی، بزدلی سے پناہ مانگی، اور دنیا کی تمام حاجات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش فرمائیں، اس لئے یہ کہنا کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے مطالب پورے کریں یا نہ کریں، بس رضاء مولیٰ ہمیشہ نصیب رہے۔ یہ کہنا بے ادبی اور گستاخی کی بات ہے۔

جامع دعا کر لینا کافی ہونا چاہئے

ایک صاحب نے حضرت والا کو لکھا کہ:

> رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ایک جامع دعا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی دعائیں ہیں، اب میں خیال کرتا ہوں کہ جب ہم نے ایک باغ مانگ لیا جس میں گلاب، لیموں، نارنگی وغیرہ کل اشیاء موجود ہیں، پھر علیحدہ علیحدہ لیموں، نارنگی

مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟

(انفاس عیسیٰ ص ۷۸)

یہ دعا رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً الخ یہ اتنی جامع دعا ہے کہ اس میں کیا چیز چھوٹی ہوئی ہے کہ یا اللہ! دنیا میں بھی اچھائی دیجئے اور آخرت میں بھی اچھائی دیجئے اور جہنم کے عذاب سے ہمیں بچالیجئے۔ اس دعا میں دنیا و آخرت کی ساری ضرورتیں جمع ہوگئیں۔ تو ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ جب ہم نے اللہ تعالیٰ سے ایک باغ مانگ لیا جس میں گلاب بھی ہے، لیموں بھی ہے، نارنگی بھی ہے، پھر علیحدہ علیحدہ گلاب، لیموں، نارنگی مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ مطلب یہ تھا کہ جب یہ جامع دعا موجود ہے جس میں دنیا و آخرت کی ساری ضرورتیں آگئیں تو بس اب ہر وقت یہی دعا کرتے رہیں، دوسری دعائیں کرنے کی کیا ضرورت ہے، مثلاً یہ کہ یا اللہ! رزق بھی دیدے، یا اللہ! صحت بھی دیدے، یا اللہ! پیسے بھی دیدے، یا اللہ! روزگار بھی دیدے، یا اللہ! قرضہ ادا کرادے، یہ الگ الگ چیزیں مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟

علیحدہ علیحدہ دعائیں کرنے میں خشوع زیادہ ہوتا ہے

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ:

حق تعالیٰ کے دربار میں خشوع و خضوع بڑی چیز ہے، تجربہ یہ ہے کہ خاص خاص چیزوں کے مانگنے میں زیادہ خشوع ہوتا ہے، اسی واسطے احادیث میں جامع دعاؤں کے

علاوہ خاص خاص مقاصد کی بھی دعائیں آئی ہیں۔

(انفاس عیسیٰ ص ۷۸)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر ہر چیز علیحدہ علیحدہ بھی مانگی

مثلاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ الْخَیْرَ کُلَّه، وَاَعُوْذُبِكَ مِنَ الشَّرِّ کُلِّهٖ۔

یعنی اے اللہ! میں آپ سے تمام خیر کا سوال کرتا ہوں اور تمام شر سے پناہ مانگتا ہوں۔

دیکھئے! اس ایک دعا میں سب کچھ مانگ لیا، لیکن اس کے باوجود آپ یہ دعا بھی کر رہے ہیں کہ یا اللہ! صحت دیدے، یا اللہ! عفت دیدے، یا اللہ! امانت دیدے، یا اللہ! حسن اخلاق دیدے، یا اللہ! رضا بالقدر دیدے، یہ تمام چیزیں علیحدہ علیحدہ مانگ رہے ہیں۔ اس لئے کہ ہر ایک چیز کے مانگنے کا مزہ اور لطف الگ ہے، چھوٹی چھوٹی چیز مانگنے کا ایک کیف ہوتا ہے اور جب انسان اپنی متعین حاجت کو مانگتا ہے تو اس کو دل لگا کر مانگتا ہے اور زیادہ گڑگڑا کر زیادہ خشوع کے ساتھ مانگتا ہے۔

دعا کی تعداد میں اضافہ

دوسری بات یہ ہے کہ انسان ہر ہر چیز کے لئے جتنی مرتبہ دعا کرے گا

اتنا ہی دعا کی تعداد میں اضافہ ہو گا۔ مثلاً

رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

اب اگر اسی دعا کو دہرانے کا ارادہ کیا تو دو مرتبہ دہرا لو گے، تین مرتبہ یا چار مرتبہ دہرا لوگے، دس مرتبہ دہرا لوگے، لیکن اس کے برخلاف انسان کو جتنی حاجتیں مطلوب ہیں، ان حاجتوں میں سے ایک ایک کا تصور کر کے جب انسان اللہ تعالیٰ سے مانگے گا کہ یا اللہ! روٹی دیدے، یا اللہ! رزق دیدے، یا اللہ! روزگار دیدے، یا اللہ! مجھے نماز کی توفیق دیدے، یا اللہ! مجھے ذکر کی توفیق دیدے، یا اللہ! مجھے تلاوت کی توفیق دیدے وغیرہ، جب اس طرح ہر ہر چیز کو علیحدہ علیحدہ مانگے گا تو دعا کی تعداد میں اضافہ ہو گا۔

ہر ہر دعا مستقل عمل صالح ہے

اور جتنی مرتبہ دعا کرے گا، اتنا ہی اجر زیادہ لکھا جائے گا، کیونکہ ہر دعا ایک مستقل عمل صالح ہے، ہر دعا ایک مستقل حسنہ ہے، لہٰذا کثرت سے دعا کرنا چاہئے۔ اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! میرے جوتے کا تسمہ ٹوٹ گیا ہے، مجھے دوسرا عطا فرما دیجئے، تاکہ مقصود بھی حاصل ہو اور ثواب بھی ملے، اس لئے صرف جامع دعاؤں پر اکتفا کرنا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ ایک ایک چیز اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرو۔ اللہ تعالیٰ کے دربار میں اختصار

مطلوب نہیں، وہاں پر تو جتنی تفصیل ہو اتنی ہی بہتر ہے،

حضور ﷺ کا لگاتار دعائیں کرنا

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے کہ جب آپ اللہ تعالیٰ سے مانگنا شروع فرماتے ہیں تو کئی دعائیں ایک ساتھ ملاتے چلے جاتے ہیں۔ مثلاً آپ نے ایک دعا یہ فرمائی:

اَللّٰهُمَّ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا، وَاَكْرِمْنَا وَلَا تُهِنَّا،
وَأَعْطِنَا وَلَا تَحْرِمْنَا، وَاٰثِرْنَا وَلَا تُؤْثِرْ عَلَيْنَا،
وَارْضِنَا وَارْضَ عَنَّا۔

(کنز العمال، حدیث نمبر ۳۶۳۰)

اس دعا کا ایک ایک جملہ اپنی اپنی جگہ پر جامع ہے، لیکن اس کے باوجود ایک ہی دعا میں کئی جملے حرف عطف کے ذریعہ ملا دیئے۔ ان کا ترجمہ یہ ہے کہ اے اللہ! زیادہ عطا فرما اور کمی نہ فرما، عزت عطا فرما اور ذلت سے بچا، ہمیں عطا فرما اور محروم نہ فرما، اور ہمیں ترجیح دیجئے اور دوسروں کو ہم پر ترجیح مت دیجئے، ہمیں راضی کر دیجئے اور ہم سے راضی ہو جائیے۔

ایک اور دعا میں آپ ﷺ نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُكَ الصِّحَّةَ وَالْعِفَّةَ وَالْاَمَانَةَ
وَحُسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضَا بِالْقَدْرِ۔

(کنز العمال، ج ۲/ ص ۱۸۳/ حدیث نمبر ۳۶۵۰)

یعنی اے اللہ! میں آپ سے صحت، عفت، امانت، حسن
اخلاق اور رضا بالقضاء کا سوال کرتا ہوں۔

لہٰذا کوئی ایسی دعا نہیں ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی چیزیں جمع نہ فرمائی ہوں۔ اس لئے کہ دعا کے اندر تفصیل مقصود ہے، اختصار مقصود نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق کا مظاہرہ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ سے مانگے اور خوب مانگے۔ بہر حال، دعا میں اختصار پسندیدہ نہیں بلکہ تفصیل پسندیدہ ہے اور اس کے ساتھ ساتھ جامع دعا بھی کرنی چاہئے۔

صبح کے وقت کی دعائیں

مثلاً جب صبح کے وقت اٹھیں تو یہ دعا کرنی چاہئے اور اس کو اپنے معمول میں داخل کرنا چاہئے:

اَللّٰهُمَّ بِكَ اَصْبَحْنَا وَبِكَ اَمْسَيْنَا وبِكَ نَحْيٰى
وَبِكَ نَمُوْتُ وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ۔

اے اللہ! ہمیں آپ ہی کی توفیق سے صبح نصیب ہوئی اور
آپ ہی کی توفیق سے شام ملی، آپ ہی کی قدرت سے
جیتے ہیں اور آپ ہی کی قدرت سے مریں گے اور آپ
ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

اور یہ دعا پڑھیں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّىْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ وَخَيْرَ مَا

بَعْدَهٗ وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ هٰذَا الْيَوْمِ وَشَرِّمَا
بَعْدَهٗ، اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خَيْرَهٰذَا الْيَوْمِ وَفَتْحَهٗ
وَنَصْرَهٗ وَنُوْرَهٗ وَبَرَكَتَهٗ وَهُدٰهُ۔

اے اللہ! میں آج کے دن کی اور اس کے بعد کی بھلائی آپ سے مانگتا ہوں، اور آج کے دن کے شر اور اس کے بعد کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں، اے اللہ! میں آپ سے آج کے دن کی بھلائی اس کی فتح و کامیابی، اس کا نور، اس کی برکت اور اس کی ہدایت مانگتا ہوں۔

اور یہ دعا پڑھیں:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ اَوَّلَ هٰذَا النَّهَارِ صَلاَحاً وَاَوْسَطَهٗ
فَلاَحاً وَآخِرَهٗ نَجَاحاً۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ خَيْرَ
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ يَااَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ
اَسْئَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَاتَجِيْئُ بِهِ الرِّيَاحَ۔

اے اللہ! اس دن کے اول حصّے کو نیکی بنایئے، درمیانی حصّے کو فلاح کا ذریعہ اور آخری حصّے کو کامیابی بنایئے۔ یا ارحم الراحمین! میں دنیا و آخرت کی بھلائی آپ سے مانگتا ہوں۔ اے اللہ! میں ان چیزوں کی بھلائی مانگتا ہوں جن کو ہوائیں لاتی ہیں۔

یہ تمام دعائیں فجر کی نماز کے بعد پڑھ لیا کرو، یہ جامع دعائیں ہیں، ان دعاؤں میں سبھی کچھ آگیا، سارے دن کی خیر حاصل ہوگئی اور سارے دن کی برائیوں سے پناہ مل گئی۔ لیکن یہ نہ سوچیں کہ اب تو ہم یہ دعائیں کر چکے، اب مزید کسی دعا کی ضرورت نہیں، بلکہ پورے دن میں جب بھی کوئی ضرورت پیش آئے تو اس وقت پھر دعا کریں کہ یا اللہ! یہ دیدے، یا اللہ! یہ ضرورت بھی پوری فرمادے، مانگتے رہو، اور اس کثرتِ دعا کے نتیجے میں تعلق مع اللہ مضبوط ہوتا ہے، اور سارے تصوّف اور سلوک کی جان تعلق مع اللہ کا قوی ہونا ہے، جتنا انسان اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا، جتنا زیادہ پکارے گا، اتنا ہی اللہ تعالیٰ سے رابطہ مستحکم ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

رمضان کی عبادات پر شکر ادا کریں

بہر حال، رمضان المبارک کا مہینہ اب ختم ہو رہا ہے، اس مبارک مہینے میں جو اعمال کی توفیق ہوئی، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے، اس کا کرم ہے کہ اس نے ہمیں ان عبادات کی توفیق عطا فرمائی، ورنہ ہم تو ناقص درناقص درناقص ہیں، لیکن توفیق ان کی تھی، انہوں نے ہمیں روزہ رکھنے کی توفیق عطا فرمائی، تراویح پڑھنے کی توفیق دی، تلاوت قرآن کریم کی توفیق دی، اور جب انہوں نے ہی ان عبادات کے کرنے کی توفیق دی تو ان اعمال کو قبول بھی ضرور فرمائیں گے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ سے کبھی بدگمانی مت کیا کرو کہ یہ عبادت قبول نہیں ہوگی،

ارے جب عمل کی توفیق دی ہے تو انشاء اللہ ضرور قبول فرمائیں گے۔

اپنی کوتاہیوں پر استغفار کریں

جہاں تک ان عبادات میں کوتاہیوں کا تعلق ہے، تو بھائی، کب تک اپنی کوتاہیوں کا مراقبہ کرتے رہو گے؟ ارے ان کی رحمت کا مراقبہ کرو، ان کی رحمت کے مقابلے میں تمہاری کوتاہیاں کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ البتہ جو کوتاہی ہو جائے اس پر استغفار کر لیا کرو کہ یا اللہ! اس عبادت میں جو کوتاہی ہوئی ہے، میں اس سے استغفار کرتا ہوں،

استغفر اللّٰه، استغفر اللّٰه رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ
وَاَتُوْبُ اِلَیْهِ۔

استغفار کے نتیجے میں وہ کوتاہی دور ہو جائے گی۔

ہم بڑے خوش قسمت ہیں

عید کی نماز کے بعد جب ہم حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں جایا کرتے تھے تو اس وقت اس قدر کھلے ہوتے تھے جیسے گلاب کا پھول کِھلا ہوتا ہے، اور اس وقت فرماتے کہ الحمد للہ، ہم سب بڑے خوش قسمت ہیں، اللہ تعالیٰ سے پوری امید رکھو کہ ہم سب کی اللہ تعالیٰ نے مغفرت فرمادی ہے، اور ہم سب اس وقت ایسی حالت میں ہیں جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہماری سیئات کو بھی حسنات سے تبدیل کر دیا ہے۔

رمضان کے بعد کی زندگی بھی درست رکھیں

بہر حال، اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر کرلو اور اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرلو اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھو، انشاء اللہ بیڑا پار ہو جائے گا۔ جہاں تک حق ادا کرنے کا تعلق ہے تو حق پورا تو آج تک کوئی ادا نہ کر سکا اور نہ آئندہ ادا کر سکے گا۔ یہ ایامِ رمضان امید کے ایام ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان امیدوں کو سچا کر دکھائے اور رمضان کے بعد کی زندگی کو اللہ تعالیٰ استوار کر دے، آمین۔ یہ نہ ہو کہ رمضان میں تو ساری عبادتیں ہوگئیں، روزہ کی عبادت بھی ہوگئی، تراویح کی عبادت بھی ہوگئی، اعتکاف کی عبادت بھی ہوگئی، تلاوت کی عبادت بھی ہوگئی اور جیسے ہی عید کا چاند نظر آیا بس ساری عبادتیں چھوٹ گئیں۔ پھر وہی گناہ اور **معصیتیں**، وہی زندگی دوبارہ شروع ہوگئی جو رمضان سے پہلے تھی، ایسا نہ ہو، اللہ تعالیٰ سے اس کی بھی دعا مانگنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ کی زندگی استوار فرمادے اور اپنی رضا کے مطابق بقیہ زندگی گزار دے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جلد ۴

اصلاحی مجالس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- خیالات آنے اور لانے کا فرق
- غصہ کے تقاضے پر عمل مت کرو
- بیوی سے محبّت حبِّ دنیا نہیں
- غفلت کا علاج - مسنون دعائیں
- دنیا بُری نہیں، اس کی محبّت بُری ہے
- مالداری اور مفلسی اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے
- طالبِ دنیا راحت میں نہیں ہوتا۔
- کون سی جاہ مذموم ہے؟

حضرت مولانا مُفتی محمد تقی عُثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین
والصّلاة والسّلام علیٰ رسوله الکریم، وعلی
کل من تبعهم باحسان الی یوم الدین، أمابعد

اللہ کے فضل وکرم سے ''اصلاح مجالس جلد چہارم'' بھی تیار ہوکر آپ کے سامنے آچکی ہے۔ الحمدللہ یہ جلد ''انفاس عیسیٰ'' کے باب دوم ''تحقیقات اور باب سوم تہذیبات'' سے متعلق مجالس کے بیانات پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ ناشر اور مرتب اور دیگر حضرات کو اس کام کو صدق واخلاص سے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور تمام رکاوٹوں کو دور فرمائے۔ آمین۔

عبداللہ میمن

۱۰ر جمادی الثانی ۱۴۳۴ھ

اجمالی فہرست مجالس

فہرست مضامین

عُجب اور اس کا علاج

صفحہ نمبر	عنوان

غصہ کے تقاضے پر عمل مت کرو

عنوان	صفحہ نمبر

| **غصّہ کو قابو میں کرنے کا طریقہ** | |

حسد اور اس کا علاج (۱)

عنوان	صفحہ نمبر

حسد اور اس کا علاج (۲)

صفحہ نمبر	عنوان

کینہ اور بغض اور اس کا علاج

صفحہ نمبر	عنوان
۲۲۲	تیسرے نمبر کا انسان
۲۲۳	چوتھے نمبر کا انسان
۲۲۴	دمشق کے ایک بزرگ کا واقعہ
۲۲۵	جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا
۲۲۵	ان کا یہ عمل قابل تقلید نہیں
۲۲۶	وقعت کردار کی وجہ سے ہونی چاہئے
۲۲۶	یہ نازک کام ہے
۲۲۷	ایک دولت مند کے گھمنڈ کا واقعہ
۲۲۸	دنیا ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں
۲۲۹	دنیا ایک ضرورت ہے
۲۲۹	امام زہریؒ اور دنیا کی بے وقعتی
۲۳۰	حضرت لیث بن سعدؒ اور دنیا
۲۳۱	حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ
۲۳۱	ایک چور کا واقعہ
۲۳۲	اللہ تعالیٰ کے انتقام سے ڈرو
۲۳۲	چور اور میاں جی میں جھگڑا
۲۳۳	دنیا مانگو مگر اس کی عظمت سے بچو

مالداری اور مفلسی اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے

عنوان	صفحہ نمبر

دنیا کی محبّت عقلیہ ممنوع ہے

عنوان	صفحہ نمبر
عشق تو ایک ہی ذات سے ہونا چاہئے	۲۸۹
اب تو آ جا اب تو خلوت ہوگئی	۲۸۹
خلاصہ	۲۹۰

حُبِّ جاہ اور اس کا علاج: حُبِّ جاہ کی حقیقت

کونسی جاہ مذموم ہے؟

مجلس نمبر ۴۹

وساوس اور خیالات اور ان کا علاج

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴
مجلس نمبر : ۴۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

مجلس نمبر ۴۹

وساوس اور خیالات اور ان کا علاج

الحمدللّٰہ رب العالمین والعاقبة للمتقین
والصّلوٰة والسّلام علٰی رسوله الکریم
وعلٰی آله واصحابه اجمعین۔ أَمَّا بَعْدُ!

چونکہ یہ کتاب "انفاس عیسیٰ" بڑی جامع کتاب ہے، اور بہت سے ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب بے شمار ملفوظات پر مشتمل ہے، اس لئے بالاستیعاب اس کو پڑھ کر اس کی تشریح کرنا تو مشکل ہے۔ لہٰذا میں صرف منتخب حصّہ پڑھ کر اس کی تشریح بیان کر دیتا ہوں تاکہ ضروری ضروری باتوں کا بیان ہو جائے۔ اس لئے آج میں اس کتاب کا نیا باب شروع کر رہا ہوں، جو "وساوس" سے متعلق ہے۔

وساوس کا علاج "عدم التفات"

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

وساوس کا علاج عدم التفات ہے اور بس، لیکن "عدم التفات" کو مقصود بالغیر سمجھ کر کام میں نہ لائے بلکہ اس کو مقصود بالذات سمجھے، خواہ اندفاع وساوس اس پر مرتب ہو یا نہ ہو۔

اسی طرح "راحت" کو مقصود بالذات نہ سمجھا جائے، بلکہ اس پر آمادہ رہنا چاہئے کہ اگر تمام عمر اس سے بھی زیادہ کلفت ہو تو وہ بھی محبوب کا عطیہ ہے۔ "لأ نه ليس بمعصية ولا اختيارى وكل ماكان كذالك فهو نعمته" اور عبدیت یہی ہے۔

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطافست

اس شعر کو کبھی کبھی پڑھ لیا کرے۔

(انفاس عیسیٰ، ص۹۰)

کوئی شخص وساوس سے خالی نہیں

حضرت والا نے اس ملفوظ میں وسوسہ کا اور ایک کثیر الورود شبہ کا علاج فرمایا ہے۔ لوگوں کو وسوسے اور خیالات فاسدہ بہت آتے رہتے ہیں، بعض اوقات ایسے خیالات اور وساوس آتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں انسان یہ سوچتا ہے کہ اس کی وجہ سے میں کہیں کافر تو نہیں ہو گیا، کوئی شخص شاید ایسا نہیں ہے

جس کو بُرے بُرے خیالات اور وسوسے نہ آتے ہوں، بلکہ وسوسے آتے ہیں، اور اس سے لوگ پریشان ہوتے ہیں، خاص کر وہ شخص جس نے دین کے راستے پر چلنے کا ابھی قصد کیا ہے اور قدم بڑھایا ہے، ایسے شخص کو بہت زیادہ وسوسے آتے ہیں، اور اس کے دل میں بہت سے خطرات گزرتے ہیں۔

دین پر چلنے والے کو وسوسے زیادہ آتے ہیں

جس شخص کا دین کی طرف اور اصلاح کی طرف دھیان ہی نہیں ہے، اور دن رات دنیاوی مشاغل میں منہمک ہے، فسق وفجور میں مبتلا ہے، ایسے شخص کو وسوسے نہیں آتے، وسوسے اس شخص کو آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر اور دین کے راستے پر چل پڑتا ہے، اس کو طرح طرح کے وسوسے آتے ہیں۔ ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ میرا ایمان بھی باقی رہا یا نہیں؟ کبھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں وسوسے آئیں گے، کبھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وسوسے آئیں گے، کبھی قرآن کریم اور حدیث کے بارے میں وسوسے آئیں گے، اور کبھی شریعت کے احکام کے بارے میں وسوسے آئیں گے۔ اگر ایسے موقع پر انسان کی صحیح رہنمائی نہ ہو تو انسان گمراہی کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

ان کی طرف توجہ نہ کی جائے

ان "وساوس" کا علاج حضرت والا یہ بیان فرمارہے ہیں کہ ان کا علاج

اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ وساوس آتے ہیں تو آنے دو، کوئی پرواہ ہی نہ کرو، اس طرف دھیان ہی نہ دو کہ دل میں کیا وسوسہ آ رہا ہے اور کیا جا رہا ہے۔

"وساوس" ایمان کی علامت ہیں

یہ بات یاد رکھیں کہ یہ "وساوس" خود ایمان کی علامت ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابیؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ﷺ! بعض اوقات میرے دل میں ایسے وسوسے اور ایسے خیالات آتے ہیں کہ ان خیالات کو زبان پر لانے کے مقابلے میں جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے گوارہ ہے، اس لئے میں کیا کروں؟ سبحان اللہ! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا جواب دیا، فرمایا:

ذاك صريح الايمان

(صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسۃ فی الایمان)

یہ کھلی ایمان کی علامت ہے۔ یعنی ایسے وسوسوں کا اور ایسے خیالات کا آنا تو کھلے ایمان کی علامت ہے، مؤمن ہی کے دل میں ایسے وسوسے آسکتے ہیں، اور جو کافر ہو یا جو فسق و فجور میں مبتلا ہو، اس کو ایسے وسوسے نہیں آتے۔

چور اسی گھر میں آتا ہے جہاں دولت ہو

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث کی

تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ چور اسی گھر میں آتا ہے جہاں کچھ مال ہو، جہاں مال ہی نہ ہو وہاں چور کیوں جائے گا، جس گھر کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہاں مال ہے، اس گھر میں چور داخل ہوگا۔ لہٰذا دل میں یہ چور (شیطان) اس لئے آرہا ہے کہ اس کو معلوم ہے کہ اس دل میں کچھ ہے، اگر اس دل میں اللہ پر اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ ہوتا تو اس چور کو آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا جب وسوسے اور خیالات آئیں تو پہلے اس بات پر شکر ادا کرو کہ الحمد للہ ایمان موجود ہے، ورنہ یہ خیالات آتے ہی نہیں۔

خیالات پر پریشانی ایمان کی موجودگی کی علامت

اور ایمان کے موجود ہونے کی دلیل اس طرح ہے کہ جب آپ کے دل میں یہ خیالات آتے ہیں تو آپ کو پریشانی ہوتی ہے اور ان خیالات کا آنا آپ کو برا معلوم ہوتا ہے، اگر دل میں ایمان نہ ہوتا تو پریشانی کیوں ہوتی، اگر ایمان نہ ہوتا تو دل میں ان خیالات کے آنے پر برا کیوں لگتا، ان خیالات سے تکلیف کیوں ہوتی، معلوم ہوا کہ دل میں ایمان ہے۔

وساوس کیوں آتے ہیں

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس پریشانی کے موقع کے لئے ایک تسلّی کا جملہ ارشاد فرمادیا، وہ یہ کہ:

اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ لِیَحْزُنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْئًا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔

(سورۃ المجادلۃ، آیت ۱۰)

یعنی شیطان کی طرف سے جو وسوسے آتے ہیں، یہ در حقیقت شیطان کی طرف سے سرگوشی ہے، تاکہ مؤمنوں کو اس سرگوشی کے ذریعہ غم میں مبتلا کرے۔ آگے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ سرگوشی کرنا مؤمنوں کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچاسکتا مگر اللہ کے حکم سے۔ لہٰذا جب یہ وسوسے آکر پریشان کریں تو اس وقت یہ تصور کرو کہ یہ تو ایمان کی علامت ہیں۔ یہ شیطان اپنی سی کوشش کر رہا ہے، اس سے کہدو کہ چل تو بھی اپنی سی کوشش کرلے، ہم بھی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اگر تم ان خیالات کی طرف متوجہ ہوگئے اور ان کی طرف التفات شروع کر دیا کہ اس وسوسے کو دور کروں اور اس خیال کو دور کروں، تو پھر تم اس دھندے میں رہ جاؤ گے، آگے تمہاری ترقی نہیں ہو پائے گی اور شیطان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

وساوس وخیالات کی مثال

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال کے ذریعے ان خیالات کے بارے میں سمجھا رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ ان خیالات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو بادشاہ کے دربار سے بلاوا آیا کہ آج فلاں وقت تم دربار میں آنا، ہم تم کو ملاقات کا موقع بھی دیں گے اور تمہیں انعامات سے بھی نوازیں گے۔ اب یہ شخص تیار ہو کر بادشاہ کے دربار کی طرف چل دیا، راستے میں ایک کتا دائیں

طرف سے بھونک رہا ہے ایک کتا بائیں طرف سے بھونک رہا ہے، اور اس کو وقت پر بادشاہ کے دربار میں پہنچنا ہے، بتایئے عقل کی بات کیا ہے؟ کیا وہ کتوں سے لڑنے بیٹھ جائے، ان کو بھونکنے سے روکے اور ان کا پیچھا کرے اور ان کو بھگائے اور ان کو گھر تک چھوڑ کر آئے؟ اگر وہ ان دھندوں میں لگ گیا تو پھر تو دربار میں پہنچنے کا وقت ہی نکل جائے گا، وقت پر نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لئے عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کتوں کو بھونکنے دو اور تم جہاں جا رہے ہو اور جس منزل پر پہنچنا چاہتے ہو، اس کی فکر کرو، ان کتوں کے بھونکنے کی فکر ہی مت کرو، اور اگر تم ان کتوں کے پیچھے پڑو گے تو دربار میں حاضری کا شرف کھو بیٹھو گے۔

اسی طرح تم یہ جو عبادات کر رہے ہو اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو رہے ہو، یہ عبادت اللہ تعالیٰ کے دربار میں باریابی ہے، اب باریابی کے وقت دل میں جو خیالات اور وسوسے آرہے ہیں، دراصل یہ کتے بھونک رہے ہیں، اگر تم نے ان کی طرف التفات شروع کر دیا اور ان کو بھگانے کی فکر میں لگ گئے اور اپنا دھیان اس طرف لگا دیا تو پھر شیطان کا مقصد حاصل ہو جائے گا اور تم دربار کی باریابی سے محروم ہو جاؤ گے۔

وساوس کے وقت اپنے کام میں مشغول رہو

اس لئے ان وساوس اور خیالات کا علاج ہی یہ ہے کہ ان کی طرف التفات ہی نہ کرو۔ اور "التفات" نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس فکر میں مت

پڑو کہ کیا وسوسہ آرہا ہے اور کیا وسوسہ جارہا ہے، کیا خیال آرہا ہے اور کیا جارہا ہے، بلکہ اپنے کام میں لگے رہو، مثلاً خیالات آرہے ہیں اور تمہیں نماز پڑھنی ہے تو تم اپنی نماز میں لگ جاؤ۔ خیالات آرہے ہیں اور تمہیں اس وقت تلاوت کرنی ہے تو تلاوت میں لگ جاؤ۔ کسی دوسرے کام کا وقت ہے تو اس دوسرے کام میں لگ جاؤ اور ان خیالات کو اپنے اعمال پر اثر انداز نہ ہونے دو، یہ علاج ہے ان خیالات کا، اگر ان خیالات اور وساوس کی طرف تم لٹھ لے کر دوڑو گے تو یہ اس کا علاج نہیں۔

وساوس کا ایک اور علاج

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کہیں اندھیرا ہو رہا ہو تو اس کا یہ علاج نہیں ہے کہ آدمی اس اندھیرے کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑے کہ یہ اندھیرا بھاگ جائے، اس طرح کبھی بھی اندھیرا نہیں جائے گا، اندھیرے کا علاج یہ ہے کہ ایک چراغ جلا دو، جس جگہ پر اس چراغ کی روشنی پہنچے گی وہاں سے اندھیرا خود بخود بھاگ جائے گا اور اس اندھیرے کی ظلمت خود بخود دور ہو جائے گی۔ اسی طرح یہ شیطانی خیالات اور وساوس بھی اندھیرا ہیں، ان کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں بھاگنا، بلکہ ان کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کا چراغ جلاؤ، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت کا چراغ جلاؤ اور ان کی طرف التفات نہ کرو، بس یہ وساوس اور خیالات خود دور ہو جائیں گے۔

دوسرے خیال کی طرف متوجہ ہو جاؤ

اگر یہ خیالات بہت زیادہ آرہے ہیں تو اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو بھگانے کی فکر کرنا تو پھر بھی ٹھیک نہیں، اس لئے کہ ان کو جتنا بھگاؤ گے یہ اتنا ہی اور آئیں گے۔ ان کا علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی اور کام میں لگالو یا کسی اور خیال کی طرف اپنے آپ کو متوجہ کرلو۔ اس لئے کہ فلسفہ کا قاعدہ ہے کہ:

اَلنَّفسُ لَاتَتَوَجَّهُ إِلٰی شَیْئَیْنِ فِیْ آنٍ وَاحِدٍ

یعنی انسان کا نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوا کرتا۔

لہٰذا اگر دل میں وسوسے آرہے ہیں اور اس وقت تم نے اس کو دوسرے خیال میں مشغول کر دیا یا دوسرے کام میں مشغول کر دیا تو پہلا خیال اور وسوسہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

وساوس دور کرنے کیلئے کوئی وظیفہ نہیں

چنانچہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے پہلا جملہ یہی ارشاد فرمایا کہ ”وساوس کا علاج عدم التفات ہے اور بس“ یعنی اور کوئی علاج نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وساوس بہت آرہے ہیں، کوئی وظیفہ بتادو جس کے نتیجے میں وسوسے نہ آئیں۔ حضرت فرمارہے ہیں کہ اس کے لئے کوئی وظیفہ نہیں، کوئی علاج نہیں،

بس یہی علاج ہے کہ ان کی طرف التفات نہ کرو۔

صحت مقصود ہوتی ہے نہ کہ دوا

پھر آگے ایک دقیق بات ارشاد فرمائی کہ "لیکن عدم التفات کو مقصود بالغیر سمجھ کر کام میں نہ لاوے بلکہ اس کو مقصود بالذات سمجھے، خواہ اندفاع وساوس اس پر مرتب ہو یا نہ ہو"۔ یعنی یہ جو میں نے کہا کہ ان وساوس کا علاج "عدم التفات" ہے، اس عدم التفات کو یہ نہ سمجھو کہ یہ "مقصود بالغیر" ہے، لہٰذا علاج کرنے کے بعد اس کی فکر لگ گئی کہ اس کے ذریعہ شفا ہوئی یا نہیں؟ دیکھئے جب آدمی کسی بیماری کے لئے دوا کھاتا ہے تو کیا وہ دوا خود مقصود بالذات ہوتی ہے؟ نہیں، بلکہ اس دوا سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ صحت حاصل ہو جائے۔ چونکہ "صحت" دوا کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی، اس لحاظ سے دوا بھی مقصود ہے، لیکن مقصود بالغیر ہے، چونکہ دوا مقصود بالغیر ہے، اس لئے آدمی دوا کھانے کے بعد اس انتظار میں رہتا ہے کہ کب مجھے صحت ہو جائے، لہٰذا اگر کسی بیماری کے لئے ایک دن دوا کھائی، دو دن دوا کھائی، تین دن دوا کھائی، لیکن اس دوا سے فائدہ حاصل نہ ہوا تو وہ اس دوا کو کھانا چھوڑ دے گا، کسی دوسرے ڈاکٹر سے رجوع کرے گا، اس لئے کہ دوا کھانا خود مقصود نہیں تھا، شفا مقصود تھی، جب دوا سے شفا حاصل نہیں ہو رہی ہے تو دوا کھانی چھوڑ دی۔

"عدم التفات کا علاج" خود مقصود بالذات ہے

حضرت والا فرمارہے ہیں کہ وساوس کا جو علاج بتایا ہے کہ ان وساوس کی طرف التفات نہ کرو، شفا سے بے نیاز ہو کر یہ دوااور یہ علاج استعمال کرتے رہو، کیونکہ یہ علاج "مقصود بالغیر" نہیں، بلکہ "مقصود بالذات" ہے۔ اس لئے کہ اگر آپ نے میرے اس علاج پر ایک دن عمل کیا، دو دن تک عمل کیا، تین دن تک عمل کیااور پھر بھی وساوس آتے رہے تو تم یہ کہو گے کہ یہ علاج غلط تھا، حالانکہ یہ علاج غلط نہیں ہے، بلکہ یہ علاج ابدی اور دائمی ہے۔ اگر بالفرض علاج کرنے کے باوجود وساوس آرہے ہیں تو یہ نہ سمجھو کہ علاج بیکار ہے، اس لئے کہ یہ علاج بذات خود مقصود ہے، لہٰذا اس علاج کو مت چھوڑنا بلکہ اس پر عمل کرتے رہنا، چاہے ساری عمر وسوسے آتے رہیں، لیکن اس کی طرف سے اپنا دھیان ہٹاتے رہو، پھر وسوسے آئیں، پھر دھیان ہٹاتے رہو، ساری عمر یہ عمل کرتے رہو، بس اس کا یہی علاج ہے۔

"راحت" خود مقصود بالذات نہیں

اسی طرح آگے ایک اور دقیق بات یہ ارشاد فرمائی کہ "راحت" کو مقصود بالذات نہ سمجھا جائے" یعنی تمہیں ان وساوس اور خیالات کو دفع کرنے کی فکر ہو رہی ہے، اس سے تمہارا کیا مقصود ہے؟ اگر تمہارا مقصود یہ ہے کہ چونکہ ان وسوسوں کے آنے سے ہر وقت دماغ پر پریشانی رہتی ہے، اور جب یہ وسوسے

آنا بند ہو جائیں گے تو "راحت" حاصل ہو جائے گی۔ اس کے بارے میں حضرت فرمارہے ہیں کہ اس "راحت" کو مقصود نہ بنانا، بلکہ بذات خود مقصود ہی یہ ہے کہ ان وساوس اور خیالات سے توجہ کو ہٹایا جائے اور کسی دوسرے مفید کام میں انسان اپنے آپ کو لگائے، کیونکہ اگر تم نے "راحت" کو مقصود بنالیا تو پھر تو تم نے نفسانی حظ کو مقصود بنالیا۔

پھر اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر پر راضی رہو

اور اگر ان وساوس کی طرف عدم التفات کے باوجود وساوس آتے ہیں اور ان وساوس کے آنے سے تکلیف ہوتی ہے اور صدمہ ہوتا ہے اور رنج ہوتا ہے، تو پھر اس تکلیف اور صدمہ پر بھی راضی رہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور تقدیر یہی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہی ہے، اگر وہ یہی چاہتے ہیں کہ میں ساری عمر وسوسوں کے اندر مبتلا رہوں اور ہمیشہ وسوسے آتے رہیں تو پھر میں کیا کروں! جب ان کی رضا وسوسوں کے آنے میں ہے تو پھر میری بھی رضا اسی میں ہے۔

نہ تو ہے ہجر ہی اچھا نہ وصال اچھا ہے
یار جس حال میں رکھے وہی حال اچھا ہے

وہ جس حال میں رکھ رہے ہیں وہی میرے لئے بہتر ہے۔ لہٰذا وسوسہ آنے کی تکلیف اور صدمہ پر بھی راضی رہو۔

بدرد وصاف ترا حکم نیست دم درکش
کہ آنچہ ساقی ماریخت عین الطافست

یعنی تجھے یہ حکم نہیں ہے کہ جو شربت تجھے پینے کو مل رہا ہے، اس میں یہ دیکھے کہ وہ گدلا ہے یا صاف ہے؟ بلکہ ہمارے ساقی نے جو کچھ عطا فرمایا ہے وہ عین اس کا کرم ہے۔ تمہیں اس کی حکمت معلوم ہو یا نہ ہو، مصلحت معلوم ہو یا نہ ہو، جو کچھ اس نے تمہارے لئے تجویز کیا ہے وہ ان کا کرم ہی کرم ہے۔

تیرے لئے یہی مناسب تھا

بہت سے لوگوں کو یہ اشکال ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو تو بالکل وسوسے نہیں آتے، وہ تو بہت اطمینان سے رہتا ہے اور اس کا تعلق فلاں شیخ سے ہے، یہ ان سے بیعت ہے، اور دوسری طرف میں ہوں کہ مجھے تو بہت وسوسے آتے ہیں، کیا میں ہی وسوسے کے لئے رہ گیا ہوں؟ مجھے ہی یہ وسوسے اور خیالات آنے ہیں؟ یاد رکھئے! یہ بے صبری ہے، ارے تیرے لئے یہی مناسب تھا جو تیرے ساتھ ہو رہا ہے، اور اس کے لئے وہی مناسب تھا جو اس کے ساتھ ہو رہا ہے، یہ بھی ان کا کرم ہے اور وہ بھی ان کا کرم ہے۔ اس شخص کے لحاظ سے وہ کرم ہے اور تمہارے لحاظ سے یہ کرم ہے، اگر تو ان وساوس پر صبر کر لے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے نہ معلوم کیا درجات تیرے لئے رکھے ہوئے ہیں۔

میرے پیمانے میں حاصل میخانہ

لہٰذا دوسروں کی طرف مت دیکھو کہ ان کو کیا مل رہا ہے، تمہیں جو کچھ مل رہا ہے وہ تمہارے لئے ٹھیک ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس مفہوم کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے، فرمایا ؎

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مئے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

یعنی مجھے اس سے کیا غرض کہ کس کو کیا ملا ہوا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے میرے پیمانہ میں مجھے عطا فرمایا ہے، میرے لئے تو وہ سارے میخانے کا حاصل ہے۔

صبر کرنے کا ثواب علیحدہ ملے گا

بہر حال! جو کرنے کے کام ہیں وہ کئے جاؤ اور جو غیر اختیاری خیالات اور وساوس آتے ہیں، ان کی طرف التفات نہ کرو، ان وساوس کے آنے سے جو تکلیف اور صدمہ ہو رہا ہے، اس کے بارے میں یہ سوچو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، یہ ان کا فیصلہ ہے، ان کی قضا ہے، ان کی تقدیر ہے، میں اس پر راضی ہوں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہو گا کہ یہ وسوسے تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے، دوسرے یہ کہ ان وسوسوں کے آنے سے جو تکلیف ہو رہی ہے، اس پر اجر ملے گا اور ثواب ملے گا اور تمہارے درجات بلند ہوں گے، لہٰذا ان وسوسوں سے فائدہ ہی فائدہ ہے، نقصان کوئی نہیں۔ اور جب تم اس پر راضی ہو جاؤ گے

اور یہ کہو گے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ میرے لئے مقرر فرمایا ہے، میں اس پر راضی ہوں تو پھر "رضا بالقضا" کا اجر بھی تمہارے اعمال نامہ میں لکھا جائے گا، اس کے علاوہ صبر کا اجر بھی تمہارے لئے لکھا جائے گا۔

دنیا میں تکلیف ضرور پہنچتی ہے

یاد رکھو! اس دنیا میں مکمل راحت کسی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی، چاہے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگالے، چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا امیر کبیر انسان ہو، اس لئے کہ یہ دنیا راحت کاملہ کی دنیا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں، ایک عالم وہ ہے جس میں راحت ہی راحت ہے، جس میں تکلیف کا اور غم کا اور صدمہ کا نام و نشان نہیں ہو گا، وہ عالم جنّت ہے۔ دوسرا عالم وہ ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، غم ہی غم اور صدمہ ہی صدمہ ہے، جس میں راحت اور سکون کا نام و نشان نہیں ہے، وہ عالم جہنّم ہے۔ اور یہ عالم دنیا جس میں ہم اور آپ گزر رہے ہیں، اس میں راحت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے، اس میں غم بھی ہے اور خوشی بھی ہے، یہاں کی کوئی راحت خالص نہیں ہے، بلکہ ہر راحت کے ساتھ تکلیف کا کانٹا لگا ہوا ہے، یہاں کی کوئی خوشی خالص نہیں ہے، بلکہ ہر خوشی کے ساتھ غم کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں یہاں اس دنیا میں صرف راحت ہی راحت حاصل کروں، مجھے کوئی صدمہ نہ پہنچے، کوئی تکلیف نہ پہنچے، تو ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو، بڑے سے بڑا حاکم ہو، بڑے سے بڑا دولت مند ہو، بڑے سے

بڑا دانشور ہو، بڑے سے بڑا عالم ہو، بڑے سے بڑا ہنر مند ہو، اس کو لے آؤ اور اس سے پوچھو کہ کیا تمہیں کبھی بھی تکلیف نہیں پہنچی؟ وہ شخص کبھی یہ نہیں کہے گا کہ مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی، کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور پہنچی ہے۔

لہٰذا جب اس دنیا میں تکلیف پہنچنی ہی ہے تو اب چاہو تو اس تکلیف پر صبر کرلو، چاہو تو بے صبری کرلو، چاہو تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ اور یہ کہہ دو کہ جو تکلیف ان کی طرف سے پہنچ رہی ہے، میں اس پر راضی ہوں، تو اس کے نتیجے میں تم اس بشارت کے مستحق ہو جاؤ گے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے کہ:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔

(سورۃ الزمر، آیت ۱۰)

بیشک صبر کرنے والوں کو بے شمار اجر ملے گا۔

لہٰذا اس دنیا میں جتنا سکون "رضا بالقضا" یعنی اللہ کے فیصلے پر راضی ہونے کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے، اتنا سکون کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہو سکتا۔

حضرت بہلول مجذوبؒ کا واقعہ

حضرت بہلول مجذوب رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ بہت اچھا حال ہے، بہت مزہ آرہا ہے۔ لوگوں نے پوچھا کہ کیا مزہ آرہا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ارے میاں! اس شخص کے مزہ

کا کیا حال پوچھتے ہو کہ دنیا میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں، میرا تو حال یہ ہے کہ دنیا میں جو کام ہو رہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت! آج تک دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں گزرا کہ اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ ہوتا ہو، حتی کہ انبیاء علیہم السلام کی مرضی کے خلاف بھی کام ہوتے تھے، آپ کو ایسا مقام کہاں سے مل گیا کہ آپ کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہیں ہوتا؟ انہوں نے فرمایا کہ بات اصل میں یہ ہے کہ میں نے اپنی مرضی مٹا کر مولیٰ کی مرضی کے تابع بنادیا ہے، جو ان کی مرضی وہ میری مرضی، جو وہ چاہتے ہیں میں بھی وہی چاہتا ہوں، اور جب کائنات میں کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا تو میری مرضی کے خلاف بھی نہیں ہوتا، سکون کی یہ حالت اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے عطا فرمائی ہے۔

"رضا بالقضا" میں سکون ہے

بہر حال! "رضا بالقضا" سے بڑھ کر کوئی اور سکون کا راستہ نہیں، اب یا تو اس ذریعہ سے سکون حاصل کر لو یا عمر بھر راحت کے لئے تڑپتے رہو، وہ میسّر نہیں آئے گی۔ خلاصہ یہ کہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ اگر بالفرض وساوس کی طرف عدم التفات کے باوجود وسوسے ختم نہ ہوں، بلکہ پھر بھی مسلسل آتے رہیں تو اس سے مت گھبراؤ اور پریشان مت ہو، بلکہ ان وسوسوں کے آنے پر راضی ہو جاؤ اور یہ سوچو کہ جب میرے اللہ نے میرے لئے یہ مقدر کر دیا ہے تو میں اس پر خوش ہوں، البتہ ان وساوس کے تقاضوں پر عمل

مت کرو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو صحیح فہم عطا فرمائے، اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۵۰

خیالات آنے اور لانے کا فرق

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۴
مجلس نمبر : ۵۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر ۵۰

خیالات آنے اور لانے کا فرق

الحمد للّٰہ رب العالمین والعاقبة للمتقین
والصّلاة والسّلام علی رسوله الکریم وعلٰی
آله واصحابه اجمعین۔ أَمَّا بَعْدُ!

"ذہین" شخص کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی

حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

عاقلوں کو خاص کر صاحب ذکاوت مفرط کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا دماغ ہر وقت حرکت فکریہ میں رہتا ہے، اسی لئے اس کو "کیفیات" حاصل نہیں ہوتیں۔
(انفاس عیسیٰ، ص ۹۰)

عام طور پر جو لوگ زیادہ ذہین ہوتے ہیں اور جن میں ذکاوت زیادہ ہوتی

ہے، ان کو نہ "کشف" ہوتا ہے، نہ "الہام" ہوتا ہے اور نہ ہی دوسری کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ اس لئے کہ "کشف"، "الہام" اور "کیفیت" یکسوئی چاہتی ہیں، یعنی جب آدمی اپنا دل دماغ ایک طرف لگائے اور اس وقت آدمی کے دماغ میں اِدھر اُدھر کی کوئی بات نہ آئے، تب جا کر یہ چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔ اور جو آدمی ذکی اور ذہین ہے، اس کا دماغ تو ہر وقت حرکت میں رہتا ہے، اگر وہ عالم ہے تو اس کے دماغ میں کوئی علمی مسئلہ حرکت کر رہا ہو گا، اگر کوئی پڑھا لکھا آدمی ہے تو اس کے اپنے فن سے متعلق کوئی بات اس کے ذہن میں گردش کر رہی ہو گی، اور اگر کسی علمی بات میں دماغ مشغول نہیں ہو گا تو پھر اپنے دنیاوی معاملات میں اس کا دماغ مشغول ہو گا، جس کی وجہ سے اس کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، اور جب یکسوئی حاصل نہیں ہوتی تو پھر اس کے دل میں یہ کیفیات بھی پیدا نہیں ہوتیں۔

یکسوئی حاصل کرنے کا پہلا مرحلہ

یہ کیفیات، یہ تصرفات، یہ کشف، یہ چیزیں وہبی ہیں، اور کسی حد تک کسبی بھی ہیں، خاص طور پر "تصرفات خیالیہ" تو کسبی ہیں، اگر انسان مشق کرے تو مشق کرنے کے نتیجے میں انسان کے خیال میں قوت تصرف پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کی مشق کا طریقہ یہ ہے کہ رات کے وقت آسمان پر ستاروں کو دیکھو اور پھر ان میں سے ایک ستارے کا انتخاب کر لو، اور پھر اس ستارے کی طرف ٹکٹکی باندھ کر بے تکان دیکھتے رہو اور اس طرح دیکھو کہ نگاہ اس کی طرف جمی

رہے۔ رفتہ رفتہ یہ ہوگا کہ آس پاس کے ستارے جو پہلے نظر آرہے تھے وہ رفتہ رفتہ نظر آنا بند ہو جائیں گے اور صرف ایک ہی ستارہ نظر آسمان پر آئے گا، تجربہ کر کے دیکھ لو۔ یکسوئی حاصل کرنے کا یہ پہلا سبق ہے اور اس طریقے کے ذریعے پہلے مرحلے میں نگاہ کو ایک چیز پر مرتکز ہونے کا عادی بنایا جاتا ہے۔

دوسرا مرحلہ

جب نگاہ ایک چیز پر مرتکز ہونے کی عادی ہو جاتی ہے تو پھر دوسرے مرحلے میں "خیال" کو اس بات کا عادی بنایا جاتا ہے کہ وہ صرف ایک چیز پر مرتکز ہو جائے، اور اس وقت کسی دوسری چیز کا خیال ذہن میں بالکل نہ آئے، جب انسان "خیال" کو مرتکز کرنے کا عادی ہو جاتا ہے تو پھر اس انسان کے خیال میں ایک قوت پیدا ہو جاتی ہے، اس قوت کا نام "تصرف" ہے، اور پھر تصرف بعض اوقات انسان کو کشف کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا اشکال اور حضرت تھانویؒ کا جواب

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب ہم حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھانہ بھون جاتے تو حضرت والا وہاں پر کسی لکھنے کے کام میں لگا دیتے، کبھی کسی مضمون لکھنے میں، کبھی کوئی فتویٰ لکھنے میں لگا دیتے، اس کے نتیجے میں بعض اوقات یہ ہوتا کہ خانقاہ میں دوسرے حضرات جس مقدار میں ذکر و اذکار کیا کرتے تھے، اس مقدار میں ذکر کرنے کی نوبت نہیں

آتی تھی، تواس وقت ہمیں یہ حسرت ہوتی تھی کہ خانقاہ کے دوسرے حضرات تو ذکر و اذکار میں لگے ہوئے ہیں اور ہم مضمون نویسی اور فتویٰ نویسی میں لگے ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا وصی اللہ صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ جو صاحبِ ذکر و شغل بزرگ تھے، وہ ہر وقت ذکر و شغل میں رہتے تھے، تو حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! یہ مولانا وصی اللہ صاحب تو میرے ہم سبق ہیں، لیکن ان کے حالات بہت اعلیٰ ہیں اور میں ایسے ہی بیکار ہوں، مجھے کچھ کرنے کی توفیق ہی نہیں ہوتی اور یہ شعر پڑھا ؎

ما و مجنوں ہم سبق بودیم در دیوان عشق

او بصحرا رفت وما درکوچہا رسوا شدیم

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا کہ: میاں! تم کس فکر میں پڑ گئے، یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے، کسی کو تو ''صحراء'' دیا جاتا ہے اور کسی کو ''سہرا'' دیا جاتا ہے۔

ایک ہی رات میں اس کوچے کی سیر کرادی

حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت! الحمد للہ آپ کی مجالس میں بیٹھ کر اس کشف وکرامت، الہام، کیفیات کی حقیقت تو خوب سمجھ میں آگئی، اور ان کی اہمیت دل سے نکل گئی کہ یہ چیزیں مطلوب اور مقصود نہیں ہیں، لیکن کبھی کبھی

دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اس کوچے کی بھی کچھ سیر کی جائے۔ حضرت نے فرمایا کہ ان میں کیا رکھا ہے، لیکن اگر تمہیں سیر کرنی ہے تو چلو تمہیں کسی دن اس کی سیر کرادیں گے۔ پھر ایک دن مجھے ایک عمل بتایا اور فرمایا کہ رات کو تہجد کی نماز کے بعد یہ عمل کرنا۔ چنانچہ میں نے تہجد کے بعد جب وہ عمل کیا تو مجھے عجیب وغریب مناظر نظر آئے، مثلاً میں نے یہ دیکھا کہ "گاندھی" کا سر کٹا رکھا ہے، یہ اس زمانے کی بات ہے جب گاندھی زندہ تھا اور اس وقت پاکستان نہیں بنا تھا۔ جب اگلے دن حضرت سے ملاقات ہوئی تو حضرت نے پوچھا کہ ہاں بھائی! کچھ سیر ہوئی؟ میں نے کہا کہ ہاں! فلاں چیز نظر آئی تھی، حضرت نے پوچھا کہ اور سیر کرنے کو دل چاہتا ہے یا بس؟ میں نے کہا کہ حضرت! بس کافی ہے۔ حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ہی رات میں اس کوچے کی سیر کرادی۔

یہ وقت اللہ کے ذکر میں لگادو

بہرحال! یہ کیفیات، یہ تصرفات، یہ کشف، جس طرح وھبی ہیں، اسی طرح کسبی بھی ہیں، اگر آدمی کوشش کر کے ان چیزوں کو حاصل کرنا چاہے تو یہ چیزیں حاصل ہو بھی جاتی ہیں۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ارے میاں! تم جتنا وقت ان کاموں کی مشق کرنے پر صرف کرو گے، مثلاً یہ کہ تم نے تارے پر نگاہ جمائی ہوئی ہے، یا بیل پر جمائی ہوئی ہے، یا گائے پر جمائی ہوئی ہے، اتنا وقت تم اللہ کے ذکر پر صرف کیوں نہیں کردیتے، کیونکہ یہ

فضول مشغلہ ہے، آخرت میں ذرہ برابر اس کا فائدہ نہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ عمل جائز ہے، لیکن کوئی فضیلت کی اور اجر کی چیز نہیں۔ اس لئے جتنا وقت تم ان پر لگانا چاہتے ہو، اتنا وقت اللہ کے ذکر میں لگادو، اگر ایک مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہہ دو گے تو میزان اعمال کا آدھا پلڑا بھر جائے گا، اس لئے کیوں ان فضول کاموں میں اپنا وقت صرف کرتے ہو؟

ذکر مقصود ہے، یکسوئی مقصود نہیں

بہر حال! یہ کیفیات ''کسبی'' بھی ہیں، لیکن اس کے لئے یکسوئی کی ضرورت ہوتی ہے، اور ذہین آدمی کو چونکہ یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، اس لئے اس کو کیفیات حاصل نہیں ہوتیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو جب کوئی شخص یہ لکھتا کہ حضرت! ذکر تو کرتا ہوں، مگر یکسوئی حاصل نہیں ہوتی، جواب میں حضرت والا لکھتے:

ذکر کرتے رہو، چاہے یکسوئی بقدر یک سوئی حاصل نہ ہو۔

یعنی ایک سوئی کے برابر بھی اگر یکسوئی حاصل نہ ہو، تب بھی ذکر کرتے رہو، کیونکہ ذکر مقصود ہے اور یہ غیر اختیاری کیفیات مقصود نہیں، لہٰذا جو شخص ذہین ہوتا ہے اس کو یہ کیفیات حاصل نہیں ہوتیں۔

نماز میں لشکر کی ترتیب

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ:

اِنِّی لَاُجَھِّزُ جَیْشِیْ وَاَنَا فِی الصَّلٰوۃِ۔

(بخاری، کتاب العمل فی الصَّلٰوۃِ۔ باب یفکر الرجل الشئی فی الصَّلٰوۃ)

یعنی نماز کے اندر میں اپنے لشکر کی ترتیب دیتا ہوں۔ جب میں نماز میں کھڑا ہوتا ہوں تو جو لشکر کسی مہم پر روانہ کرنا ہوتا تو اس کی ترتیب دیتا ہوں کہ کونسی صف آگے ہوگی اور کونسی صف پیچھے ہوگی، کس کو کہاں کھڑا کرنا ہے اور کس کو کہاں کھڑا کرنا ہے۔ یہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نماز تھی، ہما شما کی نماز نہیں تھی۔ بہر حال! اگر یکسوئی حاصل نہیں ہے تو اس کی وجہ سے بہت زیادہ فکر اور تشویش میں پڑنے کی ضرورت نہیں، ارے! جس طرح بن پڑے عبادت کئے جاؤ، عمل میں کوتاہی نہ کرو، عمل کو مت چھوڑو، عمل کو بے کار نہ سمجھو، جس عمل کی توفیق ہو رہی ہے، اس کی ناقدری نہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ اس عمل کی توفیق ہو رہی ہے، اس لئے کہ جتنا شکر ادا کرو گے اتنا ہی زیادہ توفیق ہوگی۔

توفیق خداوندی پر نظر ہو

ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ اپنی طرف مت دیکھو، بلکہ اس کی طرف دیکھو کہ اللہ جل شانہ نے عمل کی توفیق عطا فرمائی، ورنہ کتنے لوگ ہیں جن کو یہ توفیق حاصل نہیں، لہٰذا پہلے اس کا شکر تو ادا کرو اور کہو، اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے اس کی توفیق عطا فرمادی۔ اور اگر تم اس عمل کی ناقدری میں لگ جاؤ گے اور یہ کہو گے کہ ہماری نماز کیا ہے، یہ تو ٹکریں مارنا ہے،

ارے سوچو تو سہی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ نعمت عطا فرمائی تھی اور تم اس کی ناقدری کر رہے ہو اور اس کو ٹکریں مارنا کہہ رہے ہو، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیشانی ٹیکنے کی جو توفیق ہوئی، کیا یہ توفیق تمہارے عمل کی وجہ سے ہوئی؟ نہیں، بلکہ اللہ جل شانہ نے توفیق عطا فرمائی، لہٰذا اس توفیق پر اس کا شکر ادا کرو، ناشکری مت کرو، البتہ اس عمل میں جو کوتاہی ہوئی ہے اس پر استغفار کرو۔

عمل مطلوب ہے

لہٰذا نہ کیفیات مطلوب ہیں، نہ غیر اختیاری حالات مطلوب ہیں، نہ لذتیں مقصود ہیں، نہ یکسوئی مطلوب ہے، بلکہ عمل مطلوب ہے کہ قدم اس راستے پر بڑھتے رہیں، ان کے راستے پر قدم ہوں، چاہے وہ عمل دل سے ہو یا بے دلی سے ہو، ہاں اپنی سعی کوشش کرتے رہو کہ اس عمل میں خشوع پیدا ہو، اس لئے کہ کوشش کرنا فرض ہے، حاصل ہونا فرض نہیں، لہٰذا اگر کوشش کے باوجود خشوع حاصل نہ ہو تو تمہارے اوپر کوئی مؤاخذہ نہیں۔

وساوس بجلی کے تار کی مانند ہیں

آگے حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

> شیطان کی مثال ”بجلی کے تار“ جیسی ہے کہ اس کو ہاتھ ہی نہ لگاؤ، نہ جلب کے لئے نہ دفع کے لئے، ورنہ تم کو لپٹ جائے گا، بلکہ اس کو منہ بھی نہ لگاؤ، اس کی طرف

التفات بھی نہ کرو، یہی علاج ہے وساوس کا جو منجانب شیطان ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص۹۰)

دیکھئے! ایک بجلی کا تار سامنے پڑا ہوا ہے اور اس کے اندر کرنٹ دوڑ رہا ہے، اگر کوئی شخص جاتے ہوئے یہ سوچے کہ یہ تار میرے راستے میں رکاوٹ بن رہا ہے، لہٰذا اس کو ہاتھ سے پیچھے کر دوں۔ اگر وہ ایسا کرے گا تو وہ تار اس کو پکڑ لے گا، لہٰذا اس تار کو نہ تو حاصل کرنے کے لئے پکڑو اور نہ دفع کرنے کے لئے پکڑو، بلکہ راستہ کترا کر دوسری طرف سے نکل جاؤ، کیونکہ اگر اس کو دفع کرنے کے لئے بھی پکڑا تو وہ وہیں پکڑ لے گا۔ یہی حال شیطان کی طرف سے آئے ہوئے وسوسوں کا ہے کہ نہ ان کو حاصل کرنے کی فکر کرو اور نہ ان کو دفع کرنے کی فکر کرو، بلکہ اس سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے کترا کر، دوسری طرف دھیان لگا کر، دوسری طرف متوجہ ہو کر اور اس کی طرف سے بے التفاتی کرتے ہوئے نکل جاؤ، بس یہی طریقہ بچنے کا ہے، اس کے علاوہ کوئی علاج نہیں۔

وساوس کے آنے یا لانے کا شک

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ:

بعض دفعہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وسوسہ خود آتا ہے یا میں لاتا ہوں، معیار بتلایا جائے۔

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ:

معیار کی حاجت نہیں، جب آمد اور آورد میں شک ہے اور ادنیٰ درجہ یقینی ہے تو "الیقین لا یزول بالشّك" اس کو آمد ہی سمجھنا چاہئے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۹۰)

خیالات کا لانا منع ہے

بات دراصل یہ ہے کہ خیالات کا خود بخود آنا منع نہیں، لیکن خیالات کا لانا منع ہے، مثلاً آپ نماز پڑھ رہے ہیں، اب اگر نماز میں خیالات لائے بغیر خود بخود خیالات آرہے ہیں اور اپنی طرف سے دھیان نماز کے الفاظ کی طرف لگایا ہوا ہے تو یہ بذات خود منع نہیں، لیکن آدمی نماز کے اندر سوچ سوچ کر خیالات لائے، یہ منع ہے۔ اور یہ مسئلہ حضرت والا نے بہت سے مقامات پر بیان فرمایا ہے کہ خیالات کا آنا منع نہیں، خیالات کا لانا منع ہے۔ اگر کوئی شخص حضرت والا سے عرض کرتا کہ حضرت! نماز میں دل نہیں لگتا تو جواب میں حضرت والا فرماتے کہ نماز میں دل لگانا فرض ہے، دل لگنا فرض نہیں۔ یعنی اپنی طرف سے دل لگانے کی کوشش کرنا ضروری ہے، لیکن لگنا ضروری نہیں، لہٰذا اگر دل لگانے کی کوشش کے باوجود خیالات آتے ہیں تو آنے دو، اس پر مؤاخذہ نہیں۔

یہ خیالات خود آئے ہیں

اس پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! بعض خیال کے بارے میں

یہ شک ہو جاتا ہے کہ یہ خیال اور وسوسہ خود آیا ہے یا میں لایا ہوں، اس کا پتہ کیسے چلایا جائے؟ اس کا کیا معیار ہے؟ اس پر حضرت والا نے جواب میں لکھا کہ معیار کی حاجت نہیں، جب "آمد" اور "آورد" میں شک ہے اور ادنیٰ درجہ یقینی ہے تو "اَلْیقین لا یَزُوْلُ بِالشَّكِّ" کے قاعدے سے ان کو "آمد" ہی سمجھنا چاہئے۔ یعنی اگر یہ یقین ہو جائے کہ یہ خیال میں خود لایا ہوں تو اس سے اجتناب کرو اور اس پر استغفار کرو، اور اگر یہ پتہ چل جائے کہ یہ خیال خود بخود آیا تھا، میں لایا نہیں تھا، تو اس پر زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، انشاء اللہ اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ لیکن جہاں شک ہو کہ پتہ نہیں کہ یہ خیال خود آیا تھا یا میں لایا تھا تو اس کے بارے میں سمجھنا چاہئے کہ یہ خیال خود بخود آیا ہے، یعنی اس پر زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔

اختیاری کام میں لگے رہو

خلاصہ یہ ہے کہ یہ جو نماز کے اندر ہمیں اکثر و بیشتر فکر رہتی ہے۔ اور یہ فکر رہنی بھی چاہئے۔ کہ ہماری نماز میں خیالات بہت آتے ہیں اور وسوسے اور خطرات آتے ہیں، تو معلوم نہیں کہ ہماری نماز قبول بھی ہوئی یا نہیں؟ اس کے بارے میں یہ اصول ہے کہ ایک کام تو اپنے اختیار سے کرنے کا ہے، وہ کام تو کرنا ضروری ہے اور اس کی فکر بھی ضروری ہے، اس سے غفلت اور بے فکری نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ جس طرح نماز مطلوب ہے، نماز کے اندر خشوع بھی مطلوب ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○

(سورۃ المؤمنون، آیات ۱۔۲)

ان آیات میں "فلاح" کو صرف "صلوٰۃ" پر مرتب نہیں فرمایا، بلکہ اس کے ساتھ "خشوع" کی بھی قید لگائی، لہٰذا "خشوع" ایسی چیز نہیں کہ آدمی اس سے بے فکر ہو کر بیٹھ جائے، بلکہ اس کی تحصیل بقدر امکان فرض ہے، جس طرح نماز میں قیام فرض ہے، رکوع فرض ہے، سجدہ فرض ہے، اسی طرح خشوع بھی فرض ہے، اور اس کے حصول کے لئے کوشش کرنا بھی ضروری ہے۔

خشوع کا کونسا درجہ مطلوب ہے

لیکن کوشش کس طرح کی جائے؟ اس کے بارے میں لوگ افراط و تفریط میں مبتلا ہیں۔ جب خشوع کا لفظ آتا ہے کہ نماز میں خشوع ہونا چاہئے تو ذہن فوراً حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف چلا جاتا ہے، اور خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی طرف چلا جاتا ہے کہ ان جیسا خشوع حاصل کرنا چاہئے کہ جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے تو اس طرح کھڑے ہوتے جس طرح کوئی لکڑی کھڑی ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہیں اور دل میں کوئی دوسرا خیال آتا ہی نہیں۔ ارے بھائی! اتنا اونچا اڑنے کی فکر نہ کرو، بلکہ اپنی حد میں رہو اور اپنی حد کے اندر رہتے ہوئے خشوع کی فکر کرو۔ کبھی ہمارا ذہن حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف چلا جاتا ہے کہ ان کو نماز کے

دوران پرندے کا خیال آگیا جو گھنے باغ کے درختوں میں اس طرح الجھ گیا تھا کہ اس کو باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا تھا، نماز کے بعد ان کو اس خیال کے آنے پر انتہائی صدمہ ہوا کہ اس پرندے نے میرے خیال کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہٹا کر اپنی طرف متوجہ کر دیا اور اس کی تلافی کے لئے انہوں نے اپنا وہ باغ اللہ کی راہ میں صدقہ کر دیا۔

اپنی بساط کی حد تک کوشش کر لو

ارے بھائی! کہاں ابو طلحہ کا خشوع اور کہاں ہم۔ اب آدمی اس واقعہ سے سبق حاصل کرنے کے بجائے مایوس ہونے لگتا ہے کہ ہم کہاں اس مقام تک پہنچ سکتے ہیں، ہمیں تو خشوع حاصل ہو ہی نہیں سکتا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جتنا خشوع حاصل کر سکتے تھے اس کو حاصل کرنے کی بھی کوشش چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ بڑے بڑے بزرگان دین کے اس قسم کے جتنے واقعات ہیں، ان واقعات کو ضرور پڑھا کرو، تاکہ اس کے نتیجے میں تمہاری ہمت میں کچھ قوت پیدا ہو اور ان کے ذریعہ عبرت حاصل ہو، لیکن یہ مت سمجھنا کہ اس مقام تک پہنچنا تمہارے ذمے فرض ہے، بلکہ تم اپنی بساط کو دیکھو اور اپنی بساط کی حد تک جتنا کر سکتے ہو وہ کر لو۔

ابراہیم بن ادہمؒ جیسا زہد حاصل کرنے کی فکر

یا مثلاً حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ پڑھ لیا کہ وہ بادشاہی

اور تمام سامان اور اسباب چھوڑ کر چل پڑے اور سوائے ایک تکیے اور پیالے کے کچھ ساتھ نہ لیا، آگے چل کر جب ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ چلو سے پانی پی رہا ہے تو انہوں نے سوچا کہ یہ پیالہ بھی فضول ہے، اس کو بھی پھینک دیا، اور آگے چلے تو دیکھا کہ ایک آدمی سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر سو رہا ہے تو انہوں نے سوچا کہ یہ تکیہ بھی فضول ہے، اس کو بھی پھینک دیا۔ اب اگر کوئی شخص اس واقعہ کو سن کر یہ سوچے کہ نجات کا راستہ وہ ہے جو حضرت ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا، تو پھر تو ہمارا کباڑا ہو گیا، ہماری تو ساری دنیا ماری گئی۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ان کے واقعات کو ضرور پڑھو، لیکن دنیا کی حقیقت سمجھنے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کے لئے پڑھو، مگر یہ مت سمجھو کہ تمہارے لئے مدار نجات وہی ہے، بلکہ تمہارے لئے مدار نجات وہ ہے جو تمہاری اپنی بساط کے مطابق ہے۔

اس خشوع کی فکر میں مت پڑو

بہرحال! خشوع کا وہ مقام جو حضرت ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل تھا یا خشوع کا وہ مقام جو حضرات صحابہؓ کو حاصل تھا کہ سینے پر تیر لگ رہے ہیں، لیکن نماز جاری ہے یا خشوع کا وہ مقام جو اولیاء اللہ اور بزرگان دین کو ملا، اگر وہ مقام تمہیں نہیں مل سکتا اور نہیں ملا تو جو تمہارے کرنے کا کام ہے اتنا تو کرو۔

زبان سے نکلنے والے الفاظ کی طرف دھیان دو

وہ کام کیا ہے؟ وہ کام یہ ہے کہ نماز پڑھتے وقت جو الفاظ زبان سے نماز کے اندر ادا ہو رہے ہیں، ان کی طرف دھیان رکھو، مثلاً جب زبان سے "الحمد للہ رب العالمین" پڑھ رہے ہو تو دھیان بھی انہی الفاظ کی طرف رکھو، اور آپ کو یہ معلوم رہنا چاہئے کہ میں زبان سے "الحمد للہ ربّ العالمین" کہہ رہا ہوں۔ جب یہ کام کرلیا تو بس تمہارے ظرف اور تمہاری بساط کی حد تک خشوع حاصل ہو گیا اور زیادہ اونچی پرواز کی فکر مت کرو۔ یہ نہ ہو کہ جب نماز کی نیت باندھی اور تکبیر تحریمہ کہی تو ایک سوئچ اون ہو گیا اور مشین چل پڑی اور اب کچھ پتہ نہیں کہ کس وقت کیا ہو رہا ہے اور پوری نماز اسی طرح ختم ہو گئی، اب یہ بھی یاد نہیں کہ پہلی رکعت میں کونسی سورت پڑھی تھی اور دوسری رکعت میں کونسی سورت پڑھی تھی، یہ چیز خشوع کے خلاف ہے۔ خشوع یہ ہے کہ اپنی طرف سے کوشش کر کے دماغ کو ان الفاظ کی طرف لگاؤ جو تم زبان سے ادا کر رہے ہو۔

دھیان کو دوبارہ لے آؤ

اگر تم نے کوشش کی اور اس کوشش کے نتیجے میں دماغ اس طرف متوجہ ہوا اور

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝

پڑھنے تک یہ توجہ برقرار رہی، پھر اچانک دل میں کوئی اور غیر اختیاری خیال آگیا اور

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ○

بے توجہی سے پڑھ لیا، تو یہ غیر اختیاری خیال آنا خشوع کے منافی نہیں اور اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں، بشرطیکہ جس وقت تمہیں تنبیہ ہو جائے اور یہ خیال آئے کہ میں تو بھٹک گیا تو پھر واپس ان الفاظ کی طرف آجاؤ جو تم پڑھ رہے تھے۔ لہٰذا جب:

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ○

پڑھتے وقت تنبّہ ہو گیا تو اب دھیان کو دوبارہ اس طرف لے آؤ۔ پھر اگر دوبارہ بھٹک جائے تو پھر واپس آجاؤ، پھر بھٹک جائے پھر واپس آجاؤ، اگر اسی طرح کرتے ہوئے نماز پوری کرلی تو خشوع حاصل ہے، البتہ اپنی طرف سے خیالات نہ لاؤ۔

خیالات لانے کا مطلب

خیالات لانے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً آپ کو کسی کاروباری مسئلے میں سوچنا ہے اور آپ نے سوچا کہ کوئی اور وقت تو ملتا نہیں، چلو نماز پڑھتے وقت سوچ لیں گے اور اس وقت غور کرلیں گے، اب جب نماز میں کھڑے ہوئے تو باقاعدہ اس کاروباری مسئلے پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ صورت حرام اور ناجائز ہے، اس لئے کہ اس میں اپنی طرف سے قصد کر کے خیالات لا رہے ہیں جو

ناجائز ہے۔

دینی خیال لانا جائز ہے

لیکن یہاں ایک بات اور عرض کر دوں جو بڑے کام کی بات ہے، وہ یہ کہ ان خیالات کا لانا ناجائز ہے جو خالص دنیاوی ہوں، لیکن طاعت اور عبادت کا خیال سوچ کر اور قصد کر کے لانا بھی جائز ہے، یہ گناہ اور ناجائز نہیں۔ مثلاً ایک شخص عالم ہے اور وہ نماز میں قصد کر کے کسی فقہی مسئلے کے بارے میں سوچ رہا ہے اور جان بوجھ کو خیال لا رہا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ صورت ناجائز نہیں، اس لئے کہ وہ خیال لانا منع ہے جو "ماسویٰ اللہ" ہو، اور جو خیال اللہ ہی کے لئے ہو وہ ماسوی اللہ میں داخل نہیں، لہٰذا اس کا لانا ناجائز نہیں۔ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جو عمل بیان کیا کہ:

اِنِّی لَاُجَهِّزُ جَيْشِیْ وَاَنَا فِی الصَّلٰوۃِ۔

(بخاری، کتاب العمل فی الصّلوۃ، باب یفکر الرجل الشئی فی الصّلوۃ)

کہ میں نماز کے اندر لشکر کو ترتیب دیتا ہوں۔ ان کا یہ عمل بھی اسی پر محمول ہے کہ وہ ماسوی اللہ میں داخل نہیں، کیونکہ یہ لشکر کی ترتیب جہاد جیسی عظیم الشّان عبادت کے لئے ہو رہی ہے جو اللہ جل شانہ کی رضاجوئی کے لئے ہو رہا ہے، اس لئے وہ ماسویٰ اللہ نہیں۔ لہٰذا لشکر کی ترتیب کا خیال قصداً لانا بھی ناجائز نہیں۔

نماز میں مسئلہ سوچنا

لہٰذا عالم شخص کو نماز میں مسئلہ سوچنا جائز تو ہے، لیکن سوچنا نہیں چاہئے، کیونکہ ہر کام کا ایک موقع ہوتا ہے، لہٰذا ہمیں تو اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ دوسرا خیال نہ آئے، اسی طاعت کی طرف توجہ رہے، لیکن اگر کبھی ضرورت پڑ جائے، مثلاً وقت نہیں ہے اور نماز ہی میں سوچنا پڑ گیا تو بھی گناہ نہیں۔

امام غزالیؒ اور ان کے بھائی کا واقعہ

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ جو بہت بڑے صوفی بھی تھے، بڑے عالم بھی تھے اور فقیہ بھی بڑے تھے، ان کے ایک بھائی تھے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا نام "محمد" تھا، ان کی دس پشتوں تک سب کا نام محمد ہی محمد تھا، محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد بن محمد الغزالی، اور ان کے بھائی کا نام "احمد الغزالی" تھا۔ امام غزالیؒ تو جامع شریعت و طریقت تھے، ان کے بھائی صرف صوفی تھے، علوم ظاہرہ کی طرف توجہ کم تھی، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھایا کرتے تھے، لیکن ان کے بھائی احمد غزالیؒ ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتے تھے، ایک دن ان کی والدہ نے ان کے بھائی سے کہا تو تم ان کے پیچھے نماز کیوں نہیں پڑھتے؟ جواب میں کہا کہ بس میں اپنی نماز الگ پڑھ لیتا ہوں، ماں نے اصرار کیا کہ نہیں، تم ان کے پیچھے نماز پڑھا کرو۔

چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھانے کھڑے ہوئے اور یہ ان کے

پیچھے نیت باندھ کر کھڑے ہو گئے، اور پھر درمیان نماز میں نیت توڑ کر بھاگ گئے۔ ان کی والدہ نے پوچھا کہ تم نے یہ کیا حرکت کی؟ انہوں نے جواب دیا کہ مجھ سے ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جاتی، اس لئے کہ یہ نماز میں بھی حیض و نفاس کے مسائل سوچتے رہتے ہیں، لہٰذا میں ان کے پیچھے نماز نہیں پڑھتا۔ وہ ماں بھی امام غزالی کی ماں تھی، انہوں نے فرمایا کہ خدا کے بندے! اگر وہ نماز کے اندر حیض و نفاس کے مسائل سوچتا ہے تو شریعت کے مسائل حل کر رہا ہوتا ہے، وہ بھی طاعت اور عبادت ہے اور تو نماز کے اندر اس کی عیب جوئی میں لگا رہتا ہے، تجھے نماز کے اندر اس کی عیب جوئی کے خیالات آتے ہیں، لہٰذا تو تو نماز کے اندر حرام کام کا ارتکاب کر رہا ہے، اب بتا اس کی نماز بہتر ہے یا تیری نماز بہتر ہے؟ تب ان کو تنبّہ ہوا کہ واقعۃً میں غلطی پر تھا۔

خلاصہ

بہر حال، حضرت والا فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نماز کے اندر طاعت کا خیال جان بوجھ کر لائے تو یہ جائز ہے، اور اگر طاعت کا خیال نہیں ہے تو قصداً لانا تو جائز نہیں، خود بخود آجائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ اپنی طرف سے اس کی کوشش کرو کہ جب "اللہ اکبر" کہہ کر نماز شروع کرو تو اپنا دھیان ان الفاظ کی طرف لگاؤ جو تم زبان سے ادا کر رہے ہو اور سوچ سوچ کر پڑھو، پھر اگر درمیان میں دھیان اِدھر اُدھر چلا جائے تو پھر واپس آجاؤ، پھر بھٹک جائے تو پھر واپس آجاؤ، اس طرح بار بار کرتے رہو، انشاء اللہ مشق ہو

جائے گی، پھر غیر اختیاری خیالات کم آئیں گے، اور جو خیالات آئیں گے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی خیالات سے اور وساوس سے حفاظت فرمائے، اور ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۵۱

عُجب اور اس کا علاج

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۴
مجلس نمبر : ۵۱

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر ۱۵

عُجب اور اس کا علاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

تمہید

گزشتہ کئی روز سے ''تکبر'' کا بیان چل رہا تھا، الحمدللہ اس کے بارے

میں کافی تفصیل سے بیان ہو گیا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس ''تکبر'' سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ آگے حضرت مولانا عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''عُجب'' کا عنوان لگایا ہے اور اس کے تحت بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات بیان فرمائے ہیں۔ دیکھئے! تصوّف اور طریقت کی اصطلاح میں تین الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ ایک عُجب، دوسرے کِبر، تیسرے تکبّر، بظاہر دیکھنے میں یہ تینوں ایک جیسے الفاظ ہیں لیکن تینوں کے مصداق میں باریک فرق ہے۔

''عُجب'' کی تعریف

سب سے پہلے انسان کے اندر ''عُجب'' پیدا ہوتا ہے اور اس عُجب کی انتہا تکبّر پر ہوتی ہے۔ ''عُجب'' کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کسی وصف کی طرف نگاہ کر کے اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو دوسرے سے اچھا سمجھے اور اس وصف کے سلسلے میں عطاءِ حق تعالیٰ کی طرف نگاہ نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص عالم ہے، اب اس کے دل میں اپنے عالم ہونے کا احساس پیدا ہوا کہ میں عالم ہوں اور عالم ہونے کی بنیاد پر اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھا اور اس علم کے اللہ تعالیٰ کی عطاء اور نعمت ہونے کی طرف نگاہ نہیں کی، چاہے اس کے ساتھ دوسروں کی تحقیر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتیں عُجب میں داخل ہیں۔ لہٰذا محض اپنے کسی اچھے وصف کا استحضار اللہ تعالیٰ کی عطاء اور نعمت ہونے کے استحضار کے بغیر کرنا یہ ''عُجب'' ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''عُجب'' کے اندر دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا صرف اپنی ذات سے تعلق ہوتا ہے۔

عُجب، کِبر اور تکبّر میں فرق

اسی ''عُجب'' کے نتیجے میں انسان کے اندر ''کِبر'' پیدا ہو جاتا ہے، ''کِبر'' کا مطلب یہ ہے کہ دل میں یہ خیال آنا کہ چونکہ میرے اندر یہ وصف موجود ہے، لہٰذا میں بڑا ہوں۔ ''عُجب'' کے اندر اپنی اچھائی کی طرف نگاہ ہوتی ہے اور ''کبر'' کے اندر اپنی بڑائی کی طرف نگاہ ہوتی ہے، لہٰذا دوسروں سے اپنے کو بڑا سمجھ لینا ''کِبر'' ہے۔ پھر اس بڑا سمجھنے کے نتیجے میں دوسروں پر اپنی بڑائی کا اظہار کرنا ''تکبّر'' ہے، مثلاً اپنی اکڑ دکھا رہا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھ رہا ہے اور دوسروں کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کر رہا ہے، یہ سب ''تکبّر'' کے اندر داخل ہے۔

چوتھی چیز ''استکبار''

پھر اس کے بعد ایک چوتھا درجہ ہے جس کو قرآن کریم نے ''استکبار'' کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے، ''استکبار'' کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان ''تکبّر'' کے نتیجے میں دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے تو اب ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ کرتا ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا اور خود اپنی مرضی سے جو چاہتا ہے فیصلے کرتا ہے اور بعض اوقات ظلم کے فیصلے بھی کر گزرتا ہے، یہ ''استکبار'' ہے۔ قرآن کریم نے یہ لفظ فرعون وغیرہ کے لئے استعمال کیا ہے، اس ''استکبار'' کے اندر حق کو قبول کرنے سے عناد پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

آمین۔

عُجب کا علاج

بہرحال! سب سے پہلے انسان کے اندر ''عُجب'' پیدا ہوتا ہے اور یہی عُجب آگے ترقی کر کے کِبر اور تکبّر اور استکبار پیدا کرتا ہے، اس لئے جب عُجب انسان کے اندر پیدا ہو تو پہلے ہی مرحلے میں اس کا علاج کرے۔ اس کے علاج کے سلسلے میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ایک ملفوظ میں فرماتے ہیں:

> عمل میں دو حیثیت ہیں، ایک اپنا کمال، اس اعتبار سے (یعنی اپنا کمال سمجھ کر) اس پر نظر نہ کرنی چاہئے، دوسرا یہ کہ یہ خدا کی نعمت ہے، اس اعتبار سے اس پر مسرت مامور بہ ہے۔ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (انفاس عیسیٰ ص ۱۶۲)

علم کو عطاء حق سمجھو

اگر کوئی شخص کوئی عمل کر کے اس عمل کو اپنا کمال سمجھ کر خوش ہو رہا ہے کہ یہ میرا کمال ہے اور عطاء حق تعالیٰ پر نظر نہیں تو ''عُجب'' ہے اور گناہ ہے، اور اگر اس عمل کو اللہ تعالیٰ کی عطا سمجھ کر خوش ہو رہا ہے کہ میرے اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے تو یہ خوشی محمود اور مطلوب ہے جس کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (سورۃ یونس: آیت ۵۸)

گویا کہ اس کے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ میرا تو کوئی کمال نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے یہ چیز عطا فرمادی اور اس فضل پر خوش ہو رہا ہے تو یہ خوشی نہ صرف یہ کہ عُجب اور کبر نہیں بلکہ یہ خوشی مامور بہ ہے، کیونکہ اس آیت میں فَلْيَفْرَحُوْا امر کا صیغہ ہے۔

نیک کام کرنے پر خوشی ایمان کی علامت ہے

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اذا سرتك حسنتك و ساء تك سَيِّئَتُك فَاَنتَ مؤمن۔

یعنی جب تمہیں اپنے کسی اچھے عمل پر خوشی ہو اور بُرے عمل پر رنج ہو تو یہ تمہارے مؤمن ہونے کی علامت ہے۔ لہٰذا اگر نماز پڑھ کر خوشی ہوئی اور کہا کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تو اس میں کوئی حرج نہیں بلکہ یہ ایمان کی علامت ہے، اسی طرح روزہ رکھ کر خوشی ہوئی کہ الحمدللہ! اللہ تعالیٰ نے مجھ سے روزہ رکھوالیا، یا اعتکاف کرکے خوشی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اعتکاف کرنے کی توفیق عطا فرمادی تو یہ خوشی پسندیدہ ہے، اس میں کوئی خرابی نہیں۔

یہ خوشی نقد خوشخبری ہے

ایک صحابیؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم! جب میں کوئی اچھا عمل کرتا ہوں تو دل میں خوشی ہوتی ہے، اس خوشی پر مجھے خیال ہوتا ہے کہ کہیں یہ عُجب تو نہیں ہے؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ذلك عاجل بشرى المؤمن۔

یہ خوشی مؤمن کے لئے نقد خوشخبری ہے۔ یعنی یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نقد انعام مل گیا کہ اس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے بشاشت پیدا کردی، یہ کوئی عُجب اور تکبر نہیں، اس سے نہیں گھبرانا چاہئے جب تک اس عمل کو حق تعالیٰ کی عطا سمجھتے رہو، جیسے کہ صحابہؓ نے فرمایا تھا کہ:

لولا الله ما اهتدينا   وَلاَ تصدقنا ولا صلينا

اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق نہ ہوتی تو ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے، نہ ہم ہدایت یافتہ ہوتے، نہ صدقہ خیرات کرتے، نہ نماز پڑھتے۔ لہٰذا ان اعمال کو عطاءِ حق سمجھتے رہو اور ان پر خوش ہوتے رہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اور اگر اس بات پر خوشی ہو رہی ہے کہ میں تو کمال تک پہنچ گیا اور اس عمل کے کرنے میں اللہ تعالیٰ کی عطاء پر نظر نہیں بلکہ اس کو اپنا استحقاق اور اپنا کمال سمجھتا ہے اور اس کے نتیجے میں دوسروں کی تحقیر کرتا ہے تو یہ خوشی وہ ہے جس کو قرآن کریم میں ''لاتفرح'' کے الفاظ کے ذریعہ منع کیا گیا ہے۔

خوشی مطلوب، خوشی ممنوع

اور اس آیت میں فرمایا کہ: فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا

خوش ہونے کا حکم دیا گیا تو ایک خوشی مطلوب اور مقصود اور مامور بہ ہے اور ایک خوشی ممنوع عنہ اور حرام ہے، جو خوشی مامور بہ ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عمل کی جو توفیق عطا فرمائی، اس پر نظر کر کے خوش ہونا لیکن اپنے کمال پر خوش ہونا کہ میرا یہ کمال ہے کہ میں نے یہ عمل سرانجام دیا تو یہ اتراہٹ ہے اور ممنوع عنہ اور حرام ہے۔

فرق کیلئے ''شیخ'' کی ضرورت

لیکن ان دونوں خوشیوں میں فرق انسان خود نہیں کر سکتا، بلکہ اس کے لئے کسی شیخ کی اور معالج کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بتاتا ہے کہ یہاں پہلی قسم کی خوشی ہے، اس لئے فکر کی بات نہیں، جیسا کہ ان صحابیؓ کے دل میں شک پیدا ہوا کہ یہ خوشی جو میرے دل میں پیدا ہو رہی ہے، یہ پہلی خوشی ہو رہی ہے یا دوسری خوشی ہو رہی ہے، مامور بہ خوشی ہو رہی ہے یا منہی عنہ خوشی ہو رہی ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا، آپ نے فرمایا کہ ''ذلك عاجل بشری المؤمن'' یہ پہلی قسم کی خوشی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب پر اطمینان ہو گیا کہ الحمد للہ یہ خوشی بُری نہیں ہے۔ اگر دوسری قسم کی خوشی ہوتی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کا علاج فرماتے۔

آج کل ''شیخ'' بنانے کے مقاصد

شیخ کی ضرورت ان کاموں میں پڑتی ہے، لیکن آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شیخ اس لئے بنائے جاتے ہیں کہ اس سے وظیفے پوچھے جائیں کہ کیا

پڑھیں؟ اگر کوئی خواب دیکھو تو اس کی تعبیر شیخ سے پوچھو، اور اس سے یہ پوچھو کہ قرض ادا کرنے کی کیا دعا ہے؟ اور رزق بڑھانے کے لئے اور روزگار ملنے کی کیا دعا ہے؟ بس شیخ ان کاموں کے لئے ہوتا ہے، صبح سے لے کر شام تک انہی کاموں کے چکر ہوتے ہیں اور اسی کا نام پیری مریدی رکھ لیا ہے۔

یاد رکھئے! ان کاموں کا پیری مریدی سے کوئی تعلق نہیں، نہ تعویذ گنڈے، نہ دعائیں نہ وظیفے اور نہ خواب کی تعبیر، ان کا شیخ سے کوئی تعلق نہیں، اصل چیز پوچھنے کی یہ ہے کہ عمل کرنے پر مجھے جو خوشی ہو رہی ہے، یہ میری خوشی مقبول ہے یا نہیں؟ یہ خوشی عُجب اور گناہ تو نہیں ہے؟ اور پھر شیخ کے بتانے پر عمل کرو، پیری مریدی کا اصل مقصد یہ ہے۔ آج کل یہ باتیں تو پوچھتے نہیں، لیکن وظیفے اور ذکر اذکار پوچھتے رہتے ہیں۔

توفیق الٰہی پر شکر کرنا چاہئے

چنانچہ آگے حضرت والا فرماتے ہیں:

کام کرنے والوں کو چاہئے کہ اپنے اعمال کو اپنا کمال نہ سمجھیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا احسان سمجھ کر شکر کریں کہ انہوں نے ہم سے کام لے لیا ورنہ ہماری کیا طاقت تھی۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ھمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

(انفاس عیسیٰ ص ۱۶۲)

جو کچھ بھی کام ہو رہا ہے، مثلاً عبادت ہو رہی ہے، خدمت خلق ہو رہی ہے، کوئی علمی خدمت ہو رہی ہے، کوئی وعظ ہے، کوئی تبلیغ ہے، کوئی فتویٰ ہے، کوئی تصنیف ہے، کوئی تدریس ہے، جو کوئی خدمت ہو رہی ہے، اس کو اپنا کمال نہ سمجھو بلکہ اللہ تعالیٰ کی توفیق پر شکر ادا کرو کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے اس کی توفیق عطاء فرما دی، ورنہ کتنے لوگ ہیں جو جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، میری حقیقت ہی کیا تھی کہ میں یہ عمل کرتا، جب انسان یہ سوچتا ہے تو اس سے تکبر اور عجب پیدا نہیں ہوتا۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی
منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

یہ کیا احسان جتاتے ہو کہ میں نے فلاں خدمت انجام دیدی، یا فلاں خدمت انجام دیدی، فلاں تقریر کر دی، فلاں فتویٰ لکھ دیا، فلاں کتاب لکھدی، احسان تو اللہ تعالیٰ کا مانو کہ اس نے تمہیں اس خدمت پر لگا دیا۔ ارے کتنے لوگ ہیں جن کو ان اعمال کی توفیق نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس کام پر لگا دیا، کیا یہ ناز کی بات ہے؟ یہ کوئی فخر کرنے کی بات ہے؟ یا دوسروں پر بڑائی جتانے کی بات ہے؟ ارے یہ تو اللہ جل شانہ کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں اس کام پر لگا دیا، اس لئے اس کام پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

مثلاً کوئی عبادت انجام دے لی، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، اعتکاف کرلیا، تراویح پڑھ لی، تلاوت کرلی، ذکر کرلیا، تو ان عبادات کے کرنے پر احسان کس لئے جتاتے ہو؟ ارے یہ تو اس کا کرم ہے کہ اس نے تمہیں ان

عبادات کی توفیق دیدی، اس توفیق پر اس کا شکر ادا کرو۔

شکر کے نتیجے میں مزید توفیق ہوگی

لہٰذا اس عبادت کی ناقدری نہ کرو اور ناشکری بھی مت کرو بلکہ شکر ادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے اس عبادت کی توفیق عطاء فرمادی اور یہ سوچو کہ اگر اس کی توفیق نہ ہوتی تو میں نہ جانے کس حال میں ہوتا۔ جب یہ سوچو گے اور شکر ادا کرو گے تو پھر نہ تو عُجب قریب آئے گا اور نہ تکبر قریب آئے گا اور شکر ادا کرنے کی بدولت اللہ تعالیٰ مزید عبادات کی اور اچھے کاموں کی توفیق عطاء فرمائیں گے۔

"شکر ادا کرنا" قلندری عمل ہے

لیکن اس کام کی مشق کرنی پڑتی ہے، لہٰذا جب بھی کسی نیک کام کی توفیق ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ چنانچہ ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ بعض اعمال قلندری ہوتے ہیں اور یہ "شکر" بھی قلندری عمل ہے یعنی شکر ایسا عمل ہے کہ دیکھنے میں کوئی بڑا عمل نہیں، آپ نے چپکے سے کہہ دیا "الحمدللہ" کسی کو پتہ چلا کہ آپ نے کیا عمل کیا؟ یا یہ کہہ دیا:

اَللّٰھُمَّ لك الحمد و لك الشکر

کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ آپ نے کیا کیا، لیکن اندر ہی اندر ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہوگیا اور اس کے نتیجے میں تمہارا درجہ کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور دیکھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلا۔

میان عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

شکرادا کرنے کی مشق کرو

ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ زبان پر شکر کا رٹا لگایا کرو، مثلاً گرمی لگ رہی تھی، ایک ہوا کا جھونکا آیا تو کہو اَللّٰھُمَّ لك الحمد و لك الشکر، گھر میں داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا معلوم ہوا اور اس سے دل خوش ہوا تو کہو اَللّٰھُمَّ لك الحمد ولك الشکر، بھوک لگ رہی تھی، کھانا سامنے آیا تو کہو اَللّٰھُمَّ لك الحمد و لك الشکر، دل ہی دل میں کہتے جاؤ اور اس کی عادت ڈالو کہ ہر وقت تمہارا دل اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی نعمت پر شکر کر رہا ہو۔ جب بار بار اس کی مشق کرو گے تو یہ بات حاصل ہو جائے گی، پھر یہ ہوگا کہ آدمی کام بھی کر رہا ہے اور دل اللہ تعالیٰ کے شکر میں مشغول ہے۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

جگر پانی کیا ہے مدتوں غم کی کشاکشی میں
کوئی آسان ہے کیا خوگر آزار ہو جانا

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے سالہا سال مشق کی ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی کسی نہ کسی نعمت پر شکر ادا ہوتا رہے، اندر ہی اندر اپنے مالک سے اپنے خالق سے اپنے آقا سے رشتہ جڑا ہوا ہے اور کسی دوسرے کو پتہ بھی نہیں ہے۔

''شکر'' رذائل کی جڑ کاٹتا ہے

یہ ''شکر'' ایسا تریاق ہے جو بیشمار رذائل کی جڑ کاٹتا ہے اور بے شمار فضائل اس کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں، اس لئے اس ''شکر'' کی عادت ڈالو، یہ قلندری عمل ہے، اس کے اندر بہت بڑے مجاہدات اور ریاضتیں نہیں ہیں، بہت مختصر سا کام ہے کہ صبح سے لے کر شام تک ہر عمل پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے چلے جاؤ، مثلاً آپ مسجد سے باہر نکلے اور دروازے پر جوتے آسانی سے مل گئے تو کہو اَللّٰھُمَّ لك الحمد و لك الشکر، کسی سے ملاقات کے لئے گئے اور اس شخص سے ملاقات ہوگئی تو دل دل میں کہو اَللّٰھُمَّ لك الحمد و لك الشکر، جو بھی مقصد حاصل ہو جائے، چاہے وہ چھوٹے سے چھوٹا ہی کیوں نہ ہو، اس پر اللہ جل شانہ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ لوگ اس شکر کی قدر نہیں کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ بہت معمولی سا عمل ہے، لیکن یہ عظیم تریاق ہے، اس پر عمل کر کے دیکھو، جوں جوں انسان اس کی مشق کرے گا اور اس پر عمل کرے گا تو پھر یہ عجب اور تکبر پاس نہیں پھٹکے گا۔ اور شیطان بھی یہ گر جانتا تھا کہ جو بندہ شکر کرتا رہے گا وہ میرے قبضے میں نہیں آئے گا، اسی وجہ سے اس نے کہا تھا کہ:

وَلَاتَجِدُ اَکْثَرَھُمْ شٰکِرِیْنَ۔ (سورۃ الاعراف، آیت ۱۷)

اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے مجھے اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۵۲

غصّہ اور اس کا علاج

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۴
مجلس نمبر : ۵۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

مجلس نمبر۵۲

غصّہ اور اس کا علاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا إِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ!

’’غصّہ‘‘ اُمّ الامراض ہے

رمضان المبارک میں کئی سالوں سے ظہر کی نماز کے بعد حضرت تھانوی

رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''انفاس عیسیٰ'' پڑھنے کا معمول چلا آرہا ہے اور اس میں رذائل کا بیان چل رہا ہے، اب یہاں جوش اور غصہ کا بیان شروع ہو رہا ہے، یہ ''غصہ'' بھی رذائل میں سے ہے، بلکہ بعض حضرات صوفیاء نے فرمایا کہ یہ ''اُمّ الامراض'' ہے، یعنی یہ غصہ خود تو بیماری ہے اور نہ جانے کتنی بیماریاں پیدا کرتا ہے، اس غصہ کے نتیجے میں بے شمار گناہ سرزد ہوتے ہیں، مثلاً غصہ میں بے قابو ہو کر گالی گلوچ شروع کر دی، نامناسب الفاظ استعمال کرنا شروع کر دیے، غصہ اور آگے بڑھا تو مار پٹائی شروع کر دی اور اس میں حد سے آگے بڑھ گیا۔

غصہ کے ساتھ جمع ہونے والے امراض

اور پھر انسان دوسرے پر اس وقت غصہ کرتا ہے جب اپنے آپ کو اس سے بہتر سمجھتا ہے، کیونکہ اگر انسان اپنے آپ کو کمتر سمجھے تو اس کو کبھی غصہ نہیں آئے گا، اس لئے اس غصہ کے ساتھ ''کبر اور عُجب'' بھی جمع ہو جاتا ہے، کبھی اس کے ساتھ ''بغض'' بھی جمع ہو جاتا ہے، لہٰذا بے شمار باطنی امراض اس کے نتیجے میں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس وجہ سے حضرات صوفیاء کرام کے پاس جب کوئی شخص علاج کے لئے جاتا تھا تو وہ سب سے پہلے اس غصہ کا علاج کیا کرتے تھے۔

دو جبلّی چیزیں

انسان کی جبلّت میں دو بنیادی چیزیں ہیں، ایک غصہ، دوسرے شہوت،

چاہے وہ شہوت بطن کی ہو یا فرج کی ہو۔ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ سارے گناہوں، ساری معصیتوں اور سارے گناہوں کی جڑ یہی دو چیزیں ہیں، اسی وجہ سے حضرات صوفیاء کرام سب سے پہلے غصّے کا علاج کرتے ہیں، کیونکہ اگر غصّہ قابو میں نہ ہوگا تو وہ نہ جانے کتنے گناہوں میں اور کتنے ضلالت کے گڑھوں میں جا کر گرے گا۔

مختصر نصیحت کا مطالبہ کرنا

ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ "عِظْ و أوجز" نصیحت فرمایئے اور مختصر فرمایئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر بُرا نہیں منایا کہ نصیحت بھی طلب کر رہے ہو اور اوپر سے شرطیں بھی لگاتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر نصیحت طلب کرنے والا یہ کہہ دے کہ مجھے مختصر نصیحت فرما دیجئے تو اس میں ناراضگی کی کوئی بات نہیں بلکہ یہ اس کا حق ہے، کیونکہ اگر اس نے آپ سے نصیحت طلب کی اور اس کے پاس وقت کم تھا، اب آپ نے اس کے سامنے ڈھائی گھنٹے کی تقریر کر دی، حالانکہ اس کو سفر میں جانا تھا اور وہ جلدی میں تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بیچارہ نصیحت طلب کرنے کے نتیجے میں مصیبت میں مبتلا ہوگیا، اور جب اس کے دماغ پر جلدی جانے کا بوجھ ہوگا تو وہ کیا آپ کی نصیحت سنے گا اور کیا سمجھے گا اور کیا اس پر عمل کرے گا، اس لئے بات کرنے والے کو چاہئے کہ مخاطب کے حال کا لحاظ کرے۔ اور اس حدیث میں تو خود مخاطب نے یہ کہہ دیا کہ میرے پاس وقت کم ہے، اس لئے مجھے مختصر نصیحت فرما دیجئے۔

غصّہ مت کرنا

چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مختصر نصیحت فرمائی کہ: "لَا تَغْضَبْ" غصّہ مت کرنا۔ یہ مختصر نصیحت فرمادی، اس سے پتہ چلا کہ یہ غصّہ ہی درحقیقت بہت سی بُرائیوں کا سرچشمہ ہے، اسی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری بُرائیوں اور بداعمالیوں اور ساری معصیتوں میں سے اس کا انتخاب فرمایا، حالانکہ آپ چاہتے تو یہ فرما سکتے تھے کہ دیکھو جھوٹ مت بولنا، غیبت نہ کرنا، زنا نہ کرنا، چوری نہ کرنا وغیرہ، لیکن ان تمام چیزوں کو چھوڑ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ غصّہ مت کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی بہت بڑی بُرائی ہے اور یہ سب گناہوں کا باپ ہے جس کے نتیجے میں انسان اور بہت سے گناہوں کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے۔

غصّہ ضروری بھی ہے

یہ غصّہ ایسی چیز ہے کہ بعض اوقات اس کی ضرورت ہوتی ہے، اگر یہ غصّہ بالکل نہ ہو تو انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا، مثلاً کوئی دشمن یا کوئی درندہ آپ کے اوپر حملہ آور ہو گیا، اب اگر اس وقت آپ کو غصّہ نہ آئے بلکہ پڑے رہیں اور مار کھاتے رہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ ہی ختم ہو جائیں گے۔

ایک صاحب بہادر کا قصّہ

ہمارے والد صاحبؒ ایک قصّہ سنایا کرتے تھے کہ ایک صاحب بہادر

تھے، کسی بڑے عہدے پر تھے، ہر کام نوکر سے کرانے کے عادی تھے، خود کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ ایک دن صبح بیدار ہوئے تو دیکھا کہ گھر کے اندر بندر آ گئے، ایک بندر ان کا سوٹ اٹھا کر لے گیا، ایک بندر ان کی پتلون اٹھا کر لے گیا، ایک بندر ان کا ہیٹ اٹھا کر لے گیا، اب صاحب بہادر بستر پر پڑے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے اور آوازیں دے رہے تھے کہ ارے بھائی! کوئی مردوا (مرد) ہے جو ان بندروں کو روکے، اتنے میں ان کا کوئی دوست آ گیا، اس نے آ کر کہا کہ جناب! آپ بھی تو مردوے (مرد) ہیں، صاحب بہادر نے کہا کہ ہاں بھائی! خوب یاد دلایا، چنانچہ جلدی سے بستر سے اٹھے اور بندروں کے پیچھے دوڑے، اتنی دیر میں وہ بندر سب چیزیں لے کر جنگل کی طرف بھاگ چکے تھے۔ لہٰذا یہ طرز عمل کہ بستر پر لیٹے ہیں اور اپنی مدافعت نہیں کر رہے ہیں، یہ صورت بھی انسان کی فطرت کے خلاف ہے، بلکہ انسان کی فطرت کا تقاضہ یہ ہے کہ جب اس پر کوئی حملہ آور ہو تو وہ اپنی مدافعت کرے اور اس پر غصہ کرے۔

غصہ کرنا عبادت بھی ہے

لہٰذا غصہ ہر جگہ برا نہیں ہوتا بلکہ بعض جگہ پر صحیح اور برحق ہوتا ہے بلکہ عبادت ہوتا ہے، مثلاً اگر کوئی شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے۔ نعوذ باللہ۔ اس وقت اگر مسلمان کو غصہ نہ آئے تو اس سے زیادہ بے غیرتی اور کیا ہوگی؟ اس موقع پر غصہ کرنا ہی عبادت ہے۔ لہٰذا بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں پر غصہ کا استعمال درست ہوتا ہے بلکہ بہتر ہوتا ہے

بلکہ واجب بھی ہوتا ہے، اور بہت سے مواقع ایسے ہیں جہاں پر غصہ کا استعمال برا ہے بلکہ گناہ اور معصیت ہے۔

سالک ابتداءً بالکل غصہ نہ کرے

لیکن جب کوئی مرید اپنی تربیت کرانے کے لئے کسی سے تعلق قائم کرتا ہے تو شیخ اس مرید سے کہتا ہے کہ تم فی الحال غصہ بالکل مت کرنا، کیونکہ تم اس میں تمیز نہیں کر سکو گے کہ کہاں غصہ کرنا حق ہے اور کہاں ناحق ہے، لہٰذا ابھی تو تم یہ مشق کرو کہ کسی بھی موقع پر غصہ مت کرو۔ اسی کا نام ''مجاہدہ'' ہے، یعنی کسی محظور سے بچنے کے لئے سدِّ ذریعہ کے طور پر کسی مباح چیز کو بھی ترک کر دینا، یہی مجاہدہ ہے۔ حضرت مولانا یعقوب صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ''مجاہدہ'' کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں کہ ایک کاغذ کو ایک طرف موڑ دو، پھر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرو گے تو وہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کے سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو مخالف سمت کی طرف موڑ دو، جب اس کو مخالف سمت کی طرف موڑ دو گے تو یہ کاغذ سیدھا ہو جائے گا۔

نفس کو دوسری سمت میں موڑ دو

اسی طرح ہمارا نفس بھی گناہوں کی طرف مڑ گیا ہے، اگر اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ سیدھا نہیں ہوتا، لہٰذا اس نفس کو دوسری طرف موڑ دو، یعنی اس سے کچھ مباح کام بھی چھڑاؤ، مباح کاموں کے چھڑانے کے نتیجے میں وہ نفس اعتدال پر آ جائے گا، اسی کا نام مجاہدہ ہے۔ اس لئے حضرات

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ابتداءً تم بالکل بھی غصہ مت کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غصہ رفتہ رفتہ قابو میں آ جائے گا، اس کے بعد جب غصہ کو استعمال کروگے تو وہ صحیح جگہ پر استعمال ہوگا، غلط جگہ پر استعمال نہیں ہوگا۔ بہر حال! اسی غصہ کے بارے میں اور اس کو کم کرنے کے لئے حضرت والا نے کچھ تدبیریں بیان فرمائی ہیں، ان کی تھوڑی سی تشریح عرض کر دیتا ہوں۔

غصہ کا پہلا علاج، اپنے عیوب کو سوچنا

چنانچہ حضرت والا نے غصہ کا پہلا علاج یہ بیان فرمایا کہ:

بہ تکلّف ضبط کر کے اپنے عیوب سوچنے لگا کیجئے،

انشاء اللہ اشتعال کم ہو جائے گا۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۰)

کسی صاحب نے حضرت والا کو خط میں لکھا تھا کہ میرے اندر اشتعال بہت پیدا ہوتا ہے اور ذرا سی بات پر غصہ آ جاتا ہے۔ اس کا علاج حضرت والا نے یہ تجویز فرمایا کہ جب غصہ آ رہا ہو اور کسی بات پر اشتعال ہو رہا ہو تو اس وقت غصہ کو بہ تکلّف ضبط کر کے اپنے عیوب سوچا کریں، کیونکہ غصہ کے اندر تھوڑا سا عُجب یعنی اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر سمجھنے کا پہلو ہوتا ہے اور دوسرے کو حقیر سمجھتا ہے، اسی وجہ سے غصہ کرتا ہے، لہٰذا اس کا علاج یہ فرمایا کہ اپنے عیوب کو سوچے کہ میرے اندر کیا کیا عیوب ہیں اور یہ سوچے کہ اس وقت جو غصہ آ رہا ہے، یہ بھی انہی عیوب کا ایک فرد ہے، اگر میں درست ہوتا تو مجھے اتنی شدّت سے غصہ نہ آتا، اس طرح اپنے عیوب سوچنے سے غصہ اور اشتعال کم ہو جائے گا۔ البتہ اسکے لئے فکر کی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ جس شخص کو فکر ہی نہیں

کہ کتنا غصہ آیا اور غصہ کے نتیجے میں میری زبان سے کیا بات نکل گئی، کیا فعل مجھ سے سرزد ہوگیا، تو ایسا مرض تو ناقابل علاج ہے۔ بہرحال! غصہ کے علاج کا پہلا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اندر فکر پیدا کرو، جب انسان کے اندر فکر پیدا ہو جاتی ہے تو اس کے بعد جو علاج بتائے جاتے ہیں وہ کارگر ہوتے ہیں، اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ جب غصہ آئے تو اپنے عیوب کو سوچ لو تو انشاء اللہ غصہ کم ہو جائے گا۔

غصہ کا دوسرا علاج، مغضوب علیہ کو دور کر دینا

دوسرا علاج حضرت والا نے یہ ارشاد فرمایا کہ:

جس پر غصہ آئے، اس کے پاس سے فوراً خود ہٹ جائے
یا اس کو اپنے پاس سے ہٹا دے جیسا موقع ہو۔ (ایضا)

غصہ کی خاصیت یہ ہے کہ جس پر غصہ آتا ہے، اسی کے قریب جانے کی فکر کرتا ہے، اس سے غصہ کے اندر اور ترقی ہوتی ہے، اس لئے حضرت فرما رہے ہیں کہ جس پر غصہ آئے، اس کے پاس سے فوراً یا تو خود ہٹ جاؤ یا اس کو سامنے سے ہٹا دو، کیونکہ سامنے ہونے کی وجہ سے غصہ زیادہ آئے گا۔

حضور ﷺ سے یہ علاج کرنا ثابت ہے

یہ علاج خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، چنانچہ حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنہوں نے غزوہ اُحد کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب چچا حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قتل کر دیا تھا، بعد میں اللہ

تعالیٰ نے حضرت وحشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اسلام لانے کی توفیق دیدی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم میرے سامنے مت بیٹھا کرو، کیونکہ تمہارے سامنے آنے سے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غم تازہ ہو جاتا ہے، اس کے نتیجے میں غصہ آنے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ جس پر غصہ آرہا ہے، اس کو اپنے سامنے سے ہٹادو۔

غصہ کے وقت سزامت دو

اسی طرح اگر اپنے سے چھوٹے پر جائز غصہ بھی آرہا ہو، مثلاً اپنی اولاد پر یا اپنے شاگرد پر غصہ آرہا ہو، تو اس اشتعال کی حالت میں نہ اس کو ڈانٹو اور نہ اس کو سزا دو، کیونکہ اشتعال کے وقت حدود پر قائم نہیں رہو گے، اس لئے اشتعال کے وقت معاملے کو ٹلا دو اور تھوڑا سا وقت گزار دو، یہاں تک کہ اشتعال ٹھنڈا پڑ جائے، اشتعال ٹھنڈا ہو جانے کے بعد اس کو اپنے پاس بلاؤ اور اس وقت اس کی غلطی بتاؤ، اس وقت اگر ڈانٹنے کی ضرورت ہو تو ڈانٹ بھی دو، اس وقت کی ڈانٹ چونکہ اشتعال کی حالت میں نہیں ہوگی، اس لئے وہ حد کے اندر رہے گی اور اشتعال کے وقت حد سے آگے بڑھنے کا اندیشہ رہتا ہے۔

غصہ کا تیسرا علاج، عذاب الٰہی کا استحضار

غصہ کا تیسرا علاج حضرت والا نے یہ بیان فرمایا کہ:

''استحضار عذابِ الٰہی کا کرے''

یعنی اللہ جل شانہ کے عذاب کا استحضار کرے۔ یہ علاج بھی حدیث شریف سے

ماخوذ ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے غلام کو ڈانٹ رہے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو اس حالت میں دیکھا تو فرمایا:

لَلّٰہ أقدر علیک مِنک علیه

یعنی جتنی قدرت تمہیں اس غلام پر حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو تم پر اس سے زیادہ قدرت حاصل ہے، تم اس غلام کو تو سزا دے رہے ہو، اگر اللہ تعالیٰ تمہیں عذاب دینے پر آجائے تو تمہارا کیا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے استحضار سے غصہ میں کچھ کمی واقع ہوتی ہے اور اشتعال ٹھنڈا پڑتا ہے۔ آگے حضرت والا نے فرمایا کہ "اپنے گناہوں کو یاد کر کے استغفار کی کثرت کرنے لگے" یہ اسی پہلے علاج کا حصہ ہے جو اوپر بیان فرمایا کہ اپنے عیوب کو سوچا کرے اور استغفار کرے۔ بہرحال! حضرت نے اس ملفوظ میں غصّے کے تین علاج بیان فرمائے، اگر کوئی شخص غصہ کے وقت ان پر عمل کرے تو انشاء اللہ وہ غصہ اس کے لئے مضر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۵۳

غصہ کے تقاضے پر عمل مت کرو

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴
مجلس نمبر : ۵۳

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

مجلس نمبر ۵۳

غصّہ کے تقاضے پر عمل مت کرو

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِيۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَ نُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَأَشۡهَدُاَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا۔

أَمَّا بَعۡدُ!

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ:

اگر آپ کو کوئی کچھ کہتا ہے اور اعتراض کرتا ہے تو تن
بدن میں آگ لگ جاتی ہے۔

جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ:

مگر غصہ سے آگے انتقام تک مت بڑھنا ولو باللسان۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷۰)

یعنی اگر غصہ آیا تو آنے دو، مگر اس کے تقاضے پر عمل مت کرنا اور انتقام مت لینا اگرچہ وہ انتقام زبان سے ہی کیوں نہ ہو، یعنی زبان سے بھی انتقام لینے کی فکر مت کرنا۔

معاف کرنا افضل ہے

شریعت نے بعض جگہ غصے کو استعمال کرنے کی اجازت دی ہے اور غصہ کرنا وہاں جائز اور مباح ہے، مثلاً حدود کے اندر رہتے ہوئے بدلہ لے لینا۔ (مگر تربیت کے لئے اور ناجائز حد تک پہنچنے سے اپنے آپ کو بچانے کے لئے یہ مجاہدہ کرایا جاتا ہے کہ جائز انتقام بھی مت لو، گویا غصہ کے مقتضیٰ پر کسی وقت بھی عمل مت کرو اگرچہ حد کے اندر رہتے ہوئے انتقام لینا جائز ہے) لیکن افضل ہر حالت میں معاف کر دینا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ

وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط

(سورۂ آل عمران، آیت ۱۳۴)

یہ ایسے لوگ ہیں جو نیک کاموں میں خرچ کرتے ہیں
ہر حال میں، فراغت میں بھی اور تنگی میں بھی اور غصہ کو
ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں۔

لہٰذا معاف کر دینا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، اس کے فضائل بہت زیادہ ہیں، اس لئے مبتدی سے کہا جاتا ہے کہ تم انتقام مت لو بلکہ صبر کرو اور جس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے، اس کو معاف کر دو، اس کے نتیجے میں تمہیں صبر کرنے کا ثواب الگ ملے گا اور معاف کرنے کا ثواب الگ ملے گا۔

بزرگوں کی مختلف شانیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''ارواحِ ثلاثہ'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک شخص نے ایک مرتبہ اپنے شیخ سے کہا کہ حضرت! میں نے سنا ہے کہ صوفیاء اور اولیاء کی شانیں مختلف ہوتی ہیں، ان کے مزاج مختلف ہوتے ہیں اور ان کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کی مختلف شانیں کیا ہوتی ہیں؟ ان کے شیخ نے پہلے تو یہ جواب دیا کہ یہ سب چھوڑو، تم کس چکر میں پڑ گئے، بس جو تمہارا کام ہے، اس کام میں لگو۔ اس نے اصرار کیا کہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ جب اس نے زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے فرمایا کہ دھلی میں قطب صاحب کا مزار ہے، اس کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد ہے، اس مسجد میں جاؤ،

اس میں تمہیں تین آدمی بیٹھے ذکر کرتے ہوئے نظر آئیں گے، تم جاکر ان تینوں کی کمر پر ایک ایک مکہ مار دینا اور پھر جو کچھ وہ کریں، وہ مجھے آکر بتانا۔

چنانچہ یہ صاحب اس مسجد میں گئے، دیکھا تو واقعی تین آدمی بیٹھے ہوئے ذکر کر رہے ہیں، ان صاحب نے جاکر پہلے ایک شخص کو پیچھے سے مکہ مارا، انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کس نے مارا اور کیوں مارا، بس اپنے ذکر کے اندر مشغول رہے۔ اس کے بعد دوسرے صاحب کے پاس گئے اور ان کو مکہ مارا تو وہ پیچھے مڑے اور ان کو بھی مکہ مارا اور پھر اپنے ذکر میں لگ گئے۔ جب تیسرے شخص کو مکہ مارا تو وہ پیچھے مڑے اور میرا ہاتھ سہلانے لگے کہ تمہارے ہاتھ میں چوٹ تو نہیں لگی۔

بدلہ لینے میں وقت کیوں ضائع کروں

اس کے بعد وہ صاحب اپنے شیخ کے پاس واپس آگئے اور بتایا کہ میرے ساتھ بڑا عجیب وغریب معاملہ ہوا، وہ یہ کہ جب پہلے شخص کو مکہ مارا تو انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہی نہیں۔ شیخ نے پوچھا کہ وہ کیا کر رہے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ ذکر کر رہے تھے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ جب تم نے مکہ مار دیا تو پھر وہ کیا کرتے رہے؟ انہوں نے بتایا کہ وہ ذکر کرتے رہے۔ فرمایا کہ انہوں نے یہ سوچا کہ اگر کسی نے میری کمر پر مکہ مار دیا تو اب تو مار دیا، اب وہ مکہ واپس تو لوٹ نہیں سکتا، جو تکلیف پہنچنی تھی وہ پہنچ گئی، اب میں خواہ مخواہ بدلہ لے کر اور دوسرے کو تکلیف پہنچا کر اپنا وقت کیوں خراب کروں، جتنا وقت بدلہ لینے

میں صرف ہوگا، اگر وہ وقت میں ذکر میں لگا دوں تو اس سے جو ثواب اور جو فضیلت حاصل ہوگی، وہ بدرجہا بہتر ہے اس سے کہ میں انتقام لوں، کیونکہ انتقام لینے سے مجھے کیا حاصل ہوگا، اس لئے انہوں نے اس طرف توجہ ہی نہیں کی بلکہ اپنے کام میں لگے رہے۔

برابر کا بدلہ لے لیا

دوسرے صاحب جنہوں نے پلٹ کر تم سے بدلہ لیا، یہ بتاؤ کہ انہوں نے اتنا ہی زور کا مکہ مارا جتنے زور کا تم نے مارا تھا یا اس سے زیادہ زور کا مکہ مارا؟ اس نے کہا کہ انہوں نے اتنا ہی زور کا مارا جتنے زور کا میں نے مارا تھا۔ شیخ نے فرمایا کہ یہ وہ صاحب ہیں جنہوں نے شریعت کے مطابق انتقام لیا اور اس آیت پر عمل کیا:

وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ

(سورۃ النحل، آیت ۱۲۶)

اور اگر تم بدلہ لو تو بدلہ اسی قدر لو جس قدر کہ تم کو تکلیف پہنچائی جائے۔

بدلہ لینے میں تمہارا فائدہ تھا

ان صاحب نے جو بدلہ لیا، وہ بھی تمہارے فائدے کے لئے لیا، اپنی نفسانی خواہش کی تکمیل کے لئے نہیں لیا۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ

جب کسی اللہ کے بندے کو تکلیف پہنچائی جاتی ہے اور وہ اس کا انتقام نہیں لیتا بلکہ صبر کرتا ہے تو اس صبر کے نتیجہ میں یہ ہوتا ہے کہ جو زیادتی کرنے والا ہوتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آجاتا ہے، جس کو اردو کے محاورے میں ''صبر پڑنا'' کہا جاتا ہے، اور کسی اللہ والے کا صبر پڑنا بڑا خطرناک ہوتا ہے، اس لئے ان بزرگ نے سوچا کہ اگر میں نے صبر کیا تو کہیں اس کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے، لہٰذا انہوں نے بدلہ لے لیا۔

ایک اشکال

البتہ اس پر یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا تو مطلب یہ ہوا کہ بزرگ لوگ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں بھی زیادہ شفیق اور مہربان ہوتے ہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں کہ:

من آذیٰ لی ولیاً فقد آذنته بالحرب

یعنی جو شخص میرے ولی کو ایذاء اور تکلیف دے، میرا اس کے ساتھ اعلان جنگ ہے جبکہ دوسری طرف ان بزرگ نے زیادہ شفقت کرتے ہوئے اس تکلیف پر صبر کرلیا اور اس کو معاف کر دیا، لہٰذا وہ بزرگ اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ مہربان اور شفیق ہو گئے!

اشکال کا جواب

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا

کہ دیکھو! اگر شیرنی کو کوئی شخص چھیڑے تو وہ درگزر کر جاتی ہے، لیکن اگر کوئی شیرنی کے بچے کو چھیڑے تو پھر شیرنی نہیں چھوڑتی۔ اسی طرح بسا اوقات اللہ تعالیٰ اپنے حقوق میں ہونے والی کوتاہی کو معاف فرما دیتے ہیں اور درگزر فرما دیتے ہیں، لیکن اگر کوئی شخص اللہ کے اولیاء کی شان میں گستاخی کرے تو اس کو اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرماتے۔ اس لئے فرمایا:

من آذیٰ لی ولیاً فقد آذنته بالحرب

اس حدیث پر کلام

یہ حدیث امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی صحیح بخاری میں لائے ہیں لیکن کوئی حدیث پوری بخاری شریف میں ایسی نہیں ہے جس کی سند پر محدّثین نے اتنا زیادہ کلام کیا ہو جتنا کلام اس حدیث کی سند پر کیا ہے، یہاں تک کہ بعض محدّثین نے یہ کہہ دیا کہ اس حدیث کو اپنی صحیح بخاری میں نقل کرنے میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ سے غلطی ہوگئی ہے، اس لئے کہ یہ حدیث ان کے معیار پر پوری نہیں اترتی، لیکن اس کے باوجود اس حدیث کو اپنی کتاب میں لائے ہیں۔ اس کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ ایسا نہیں ہے کہ یہ حدیث بالکل موضوع اور بہت ضعیف ہے، البتہ امام بخاری کی شرائط پر پوری نہیں اترتی، لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ ہے کہ بعض اوقات اپنی شرائط کو ان مقامات پر نظرانداز کر جاتے ہیں جہاں خارجی قرائن سے ان کو یہ یقین ہوتا ہے کہ حدیث درست ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ کا جواب

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیو بند کے بانیوں میں ہیں اور دارالعلوم کے سب سے پہلے سرپرست تھے، جنہوں نے سنّت اور بدعت کے درمیان حد فاصل قائم کی، ایک مرتبہ وعظ فرما رہے تھے اور اس وعظ میں قوّالی کے خلاف بیان تھا اور بڑے زور وشور سے بیان ہو رہا تھا، وعظ کے دوران ایک صاحب کھڑے ہو گئے اور اس نے کہا کہ آپ یہ فرما رہے ہیں کہ قوّالی ناجائز ہے اور حرام ہے لیکن حضرت نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ تو قوّالی سنتے تھے۔ جواب میں حضرت گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت نظام الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ کو دلیل معلوم ہوگی، ہمیں معلوم نہیں، ہمیں جو معلوم ہے ہم اس کے مکلّف ہیں۔ دیکھئے! ایک طرف تو قوّالی کے خلاف اتنی جوشیلی تقریر ہو رہی ہے اور اسی دوران جب ایک بڑے بزرگ کا نام آ گیا تو اس طرح جواب دیا۔

بزرگوں کیلئے ثقیل کلام مت نکالو

بات دراصل یہ ہے کہ بزرگوں سے اختلاف جتنا چاہو کرلو، تمہیں اختلاف کرنے کا حق ہے، لیکن ان کے لئے زبان سے کوئی ثقیل کلمہ نہ نکالو، کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا مقام ہو، اللہ تعالیٰ نے اس کو کیا درجہ عطاء فرمایا ہو۔ لہٰذا جس کے بارے میں شبہ بھی ہو کہ یہ اللہ والا ہے، اس کے خلاف

کوئی ثقیل کلمہ بھی زبان سے نہ نکالو۔

بہرحال! غصہ کرنے کا ایک محل ہے، وہ ہے جائز انتقام لینا، اس حد تک انسان غصہ کرسکتا ہے، لیکن پھر بھی معافی بہتر ہے اور خاص طور پر شروع میں تربیت کے لئے تو انسان کے لئے مناسب یہ ہے کہ جائز انتقام بھی نہ لے۔

غصہ آنا غیر اختیاری ہے

چنانچہ حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

سرعت غضب امر طبعی ہے، اختیار سے خارج ہے، اس پر ملامت نہیں، البتہ اس کے مقتضیٰ پر عمل جب کہ حدود سے تجاوز ہو جائے مذموم ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷۰)

یعنی غصہ کا آ جانا غیر اختیاری ہے اور جتنا درجہ غیر اختیاری ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ بھی نہیں۔ اس لئے کہ کوئی بھی ایسی چیز جو انسان کے اختیار سے باہر ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ اور گرفت نہیں، گرفت ہمیشہ اس کام پر ہوتی ہے جس کو انسان اپنے اختیار اور قصد سے کرے، لہٰذا جو غیر اختیاری غصہ آ گیا اور طبیعت کے اندر ایک اوٹن پیدا ہوگئی، اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن اگر اس غصے کے مقتضیٰ پر عمل کرتے ہوئے کسی کے ساتھ زبان سے یا ہاتھ سے بدسلوکی کرو گے تو اس پر گرفت ہو جائے گی، لہٰذا جب تک غصہ کے مقتضیٰ پر عمل نہیں ہوگا اس وقت تک انشاء اللہ اس

غصہ سے کوئی نقصان نہیں ہوگا۔

حد سے تجاوز کرنا مذموم ہے

لیکن عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جب غصہ آتا ہے اور اس غصے کے اندر تیزی ہوتی ہے تو اس تیزی کے نتیجے میں آدمی کے اندر ایک بجلی سی بھر جاتی ہے، اور اس کے نتیجے میں آدمی بعض اوقات ایسی حرکتیں کرتا ہے جو حدود سے تجاوز ہو جاتی ہیں۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت والا اس ملفوظ میں فرمارہے ہیں کہ ”سرعت غضب امر طبعی ہے اور اختیار سے خارج ہے، اس پر ملامت نہیں، البتہ اس کے مقتضیٰ پر عمل جب کہ حدود سے تجاوز ہو جائے، مذموم ہے۔“

غصہ کا علاج: ہمت کا استعمال

آگے اس غصہ کا علاج بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اور اس کا علاج بجز ہمت کے کچھ نہیں۔

(ایضاً)

مثلاً کسی پر غصہ آیا اور دل چاہا کہ میں اس کا منہ نوچ ڈالوں، یہ جو دل چاہ رہا ہے، اس دل چاہنے پر عمل نہ کرو اور اپنے آپ کو زبردستی کر کے اس سے روکو اور یہ تہیہ کرلو کہ میں اپنے اس غصہ کے تقاضے پر عمل نہیں کروں گا، عزم کرے اور ہمت کو کام میں لائے کہ چاہے دل اس کام کے کرنے کو کتنا ہی چاہ رہا ہو

لیکن میں یہ کام نہیں کروں گا۔ اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لیس الشدید بالصرعة

یعنی پہلوان وہ نہیں جو دوسرے کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جس کو غصہ آرہا ہو اور اس وقت وہ اپنے نفس کو قابو میں کرے۔

ہمّت کو کام میں لانے کی تدبیریں

بہرحال! غصہ کو قابو کرنے کے لئے اصل چیز تو "ہمّت" ہے، البتہ اس ہمّت کو کام میں لانے کے لئے کچھ تدبیریں معاون ہو جاتی ہیں، اگر وہ تدبیریں اختیار کرلی جائیں تو پھر ہمّت میں پختگی آ جاتی ہے اور آدمی غصہ کا مقابلہ کرلیتا ہے۔ ان تدبیروں کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا کہ:

> اس ہمّت میں مغضوب علیہ سے فوراً دور چلا جانا اور اعوذ باللہ پڑھنا اور اپنی خطاؤں اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے احتمال کو یاد کرنا، یہ بھی بہت معین ہے۔

(ایضاً)

پہلی اور دوسری تدبیریں

پہلی تدبیر یہ بیان فرمائی کہ جس پر غصہ آرہا ہے، اس سے دور چلے جاؤ

یا اس کو اپنے سامنے سے دور کردو، اس سے غصہ کے اندر کمی آ جاتی ہے۔
دوسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ:

اَعُوْذُ باللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔

پڑھنا، یہ قرآن کریم کا بتایا ہوا نسخہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ۔ (سورہ الاعراف، آیت ۲۰۰)

یعنی جب شیطان کی طرف سے حملہ ہو تو اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو اور پڑھو:

اَعُوْذُ باللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔

غصہ کا ایک اور علاج: درود شریف پڑھنا

عربوں میں ایک بڑا اچھا دستور چلا آ رہا تھا، اب اس کا رواج کم ہو گیا ہے، وہ یہ کہ جب دو آدمیوں میں لڑائی ہو جاتی اور ایک سخت غصے میں ہوتا تو دوسرا اس سے کہتا کہ صَلِّ عَلَی النَّبِی (صلی اللہ علیہ وسلم) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھو۔ تجربہ یہ تھا کہ سامنے والے کو چاہے کتنا ہی غصہ آ رہا ہو، جب اس سے یہ کہا جاتا کہ ''صَلِّ عَلَی النَّبِی'' تو وہ فوراً درود شریف پڑھتا اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ اور غصہ ختم ہو جاتا اور صلح ہو جاتی۔ یہ بہت اچھا رواج تھا، عربوں کی بداوت کے اندر ایسے اچھے رواج تھے، لیکن جوں جوں وہاں نئی تہذیب اور تمدن آ رہا ہے، یہ چیزیں رخصت ہوتی جا رہی ہیں، یہ بھی غصہ دور کرنے کی ایک اچھی تدبیر تھی۔

ہمّت کو کام میں لانے کی تیسری تدبیر اللہ تعالیٰ کے غضب کو سوچنا

تیسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ اپنی خطاؤں اور اللہ تعالیٰ کے غضب کے احتمال کو یاد کرو کہ جتنا میں اس شخص پر غصّہ کر رہا ہوں، میں کہیں زیادہ اس بات کا مستحق ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر غصّہ کریں، اس لئے کہ میری خطائیں اور میرے گناہ بہت زیادہ ہیں، اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر غصّہ کرنے لگیں تو میرا کیا حال ہو؟ یہ تدبیر بہت معین ہے۔

تکلّف کر کے نرمی اختیار کرو

آگے ارشاد فرمایا:

> اور نرمی وغیرہ مدّت تک تکلّف سے سوچ سوچ کر اختیار کرنی چاہئے، مدّت کے بعد ملکہ ہوگا ہمّت نہ ہارے۔
>
> (ایضاً)

یعنی باقاعدہ تکلّف کر کے لوگوں کے ساتھ بات چیت میں نرم لہجہ اختیار کرو اور نرم برتاؤ کرنے کی مشق کرو اور مسلسل کرو، یہ نہیں کہ دو روز تین روز کرلیا اور پھر چھٹی ہوگئی، ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ تو جنم روگ ہے اور ساری زندگی اس پر عمل کرنا ہوگا۔ اس لئے ہر وقت اس کا دھیان رکھے اور ہمّت نہ ہارے، البتہ اس طرح کرتے کرتے کچھ عرصہ گزر جائے گا تو اس کے بعد ملکہ پیدا ہو جائے گا اور پھر غصّہ جاتا رہے گا اور غصّہ کے مواقع پر بھی غصّہ نہیں آئے گا۔

غصہ کے وقت کی سات تدبیریں

آگے ایک ملفوظ میں ارشاد فرمایا کہ:

جس وقت غصہ آوے، امور ذیل کی پابندی کریں:

(۱) یہ خیال کریں کہ میں بھی حق تعالیٰ کا خطاوار ہوں، اگر وہ بھی اسی طرح غصہ کریں تو میرا کہاں ٹھکانہ ہو۔

(۲) اگر میں اس کو معاف کر دوں گا تو اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف کر دیں گے۔

(۳) اس وقت بے کار نہ رہیں، فوراً کسی کام میں لگ جائیں، خصوصاً مطالعہ کتب میں۔

(۴) اس جگہ سے ہٹ جائیں۔

(۵) ''اعوذ باللہ'' پڑھنے کی کثرت کریں۔

(۶) پانی پی لیں۔

(۷) وضو کر لیں۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷۱)

اس ملفوظ میں حضرت والا نے غصہ دور کرنے کی چند تدابیر بیان فرمائی ہیں۔

میں بھی اللہ تعالیٰ کا خطاوار ہوں

پہلی تدبیر یہ ہے کہ اس وقت یہ سوچے کہ میں بھی اللہ تعالیٰ کا خطاوار

ہوں، جس طرح میں اس شخص پر غصہ کر رہا ہوں، اگر اللہ تعالیٰ بھی میری خطاؤں کی وجہ سے میرے اوپر غصہ کریں تو میرا کہاں ٹھکانہ ہوگا؟ یہ سوچنے سے وہ غصہ جاتا رہے گا۔

اللہ تعالیٰ مجھے معاف کر دیں گے

دوسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ اس وقت آدمی یہ سوچے کہ میں جس شخص پر غصہ کر رہا ہوں، اگر میں اس کو معاف کر دوں گا تو اللہ تعالیٰ مجھ کو معاف فرما دیں گے، اگر میں نے انتقام اور بدلہ لے لیا تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ لیکن اگر میں نے معاف کر دیا اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مجھے آخرت میں معاف کر دیں تو اس میں سے کون سا سودا نفع کا ہے؟ ظاہر ہے کہ دوسرا سودا نفع بخش ہے۔

ایک صحابیؓ کے معاف کرنے کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بہت غصے میں آئے اور کہا کہ فلاں شخص نے میرا دانت توڑ دیا ہے، میں اس سے قصاص لوں گا اور بدلہ میں اس کا دانت توڑوں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو سمجھایا کہ اس کا دانت توڑنے سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا، تم پیسے لے لو اور صلح کر لو۔ اس نے کہا کہ میں صلح نہیں کرتا، میں تو اس کا دانت توڑوں گا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اچھا اس کا دانت توڑ لے، شرعاً تمہیں حق ہے۔ جب وہ دانت توڑنے کے

ارادے سے اس کی طرف چلا تو غالباً حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو روک لیا اور اس سے فرمایا کہ تم اس کا دانت توڑنے تو جارہے ہو، لیکن ایک بات سنتے جاؤ، اس نے کہا کہ کیا بات ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ اب تک تو تم مظلوم ہو، لیکن اگر تم نے دانت توڑتے ہوئے زیادہ زور کی چوٹ ماردی تو اس کے نتیجے میں تم ظالم بن جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں تمہاری پکڑ ہو جائے گی، اور اگر تم اس کو معاف کردو گے تو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص ہمارے بندے کی کسی زیادتی کو معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو معاف فرمائیں گے جب اس کو معافی کی سب سے زیادہ ضرورت ہوگی۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیا آپ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات سنی ہے؟ ان صحابیؓ نے جواب دیا جی ہاں! میں نے خود یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ میں نے اس کو معاف کردیا۔

اب کہاں تو وہ شخص جوش وخروش میں تھا، صلح کرنے کے لئے تیار نہیں تھا، پیسہ لینے پر تیار نہیں تھا، معاف کرنے پر تیار نہیں تھا، بلکہ اس بات پر مصر تھا کہ دانت توڑوں گا، لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث شریف سن لی تو سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا، یہ ہے مؤمن کی شان۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنا آسان اور سیدھا راستہ بتادیا کہ اگر تم معاف کردو گے تو آخرت میں تمہاری معافی ہوجائے گی۔

کسی کام میں لگ جاؤ

اس ملفوظ میں تیسری تدبیر یہ بتائی کہ اس وقت بیکار نہ رہیں، یعنی انسان کو جب غصہ آ رہا ہو تو وہ فارغ نہ بیٹھے بلکہ کسی نہ کسی کام میں لگ جائے، خصوصاً مطالعہ کتب میں مشغول ہو جائے۔ چوتھی تدبیر یہ ہے کہ اس جگہ سے ہٹ جائیں۔ پانچویں تدبیر یہ ہے کہ ''اعوذ باللّٰہِ من الشیطٰن الرجیم'' پڑھنے کی کثرت کریں۔ چھٹی تدبیر یہ ہے کہ غصّے کے وقت پانی پی لیں۔ ساتویں تدبیر یہ ہے کہ غصّے کے وقت وضو کر لیں۔

غصّہ دور کرنیکی ایک اور تدبیر: اپنے کو پستی کی طرف لیجانا

ایک اور تدبیر یہ ہے کہ اگر آدمی غصہ کے وقت کھڑا ہوا ہے تو بیٹھ جائے اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو لیٹ جائے، کیونکہ غصہ دماغ کی طرف چڑھتا ہے اور طالب علو ہے، چنانچہ جس شخص کو غصہ آتا ہے تو وہ اگر لیٹا ہوا ہے تو بیٹھ جائے گا اور اگر بیٹھا ہوا ہے تو کھڑا ہو جائے گا اور اگر کھڑا ہے تو چلنا شروع کر دے گا، یہ غصہ کی خاصیت ہے۔ لہٰذا اس غصّے کا علاج بالضد کرو، وہ یہ کہ اگر غصّے کے وقت تم کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ۔ یہ تمام علاج ہیں، ان علاجوں پر عمل کرنے سے انشاء اللہ ہمّت پیدا ہوگی اور ہمّت کے ذریعہ غصہ پر قابو پانا آسان ہوگا۔

غصّہ کو قابو کرنے کے لئے اصل چیز ''ہمّت'' ہی ہے، لہٰذا چاہے تم پانی

پی لو یا چاہے اعوذ باللہ پڑھ لو، جب تک دل میں تحمل کا ارادہ ہی نہیں کرو گے اور عزم اور ہمّت سے کام نہیں لو گے تو اس وقت تک کچھ نہیں ہوگا۔ بہرحال! اپنی طرف سے یہ عزم اور ہمّت کرو کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے، غصّے کے مقتضیٰ پر عمل نہیں کروں گا، باقی یہ تمام تدابیر اس ہمّت کے لئے معاون بن جاتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اس غصّہ کو ہمّت کے ذریعہ قابو کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۵

غصّہ کو قابو میں کرنے کا طریقہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۴

مجلس نمبر : ۵۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

غصّہ کو قابو میں کرنے کا طریقہ

مجلس نمبر ۵۴

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ـ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا ـ أَمَّا بَعْدُ!

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے غصّہ کے بارے میں ایک اصولی بات ایک ملفوظ میں ارشاد فرمائی ہے، وہ یہ کہ:

> غصّہ میں جوش کا دفعتًا آنا تو غیر اختیاری ہے، اس پر ملامت نہیں، لیکن بعد کو اس پر قائم رہ کر اس کے مقتضٰی پر عمل کرنا اختیاری ہے اور اختیاری فعل کا ترک بھی اختیاری ہے، پس اس کے مقتضٰی پر عمل نہ کرنا اختیاری ہے

اور بار بار اس کے مقتضیٰ پر عمل نہ کرنے سے تقاضا جوش
کا بھی مضمحل ہو جائے گا۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۱)

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ غصہ آنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن اس غصے کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے کسی کو ڈانٹ دیا، کسی کو جھڑک دیا، کسی کو مار دیا، اب اس پر مؤاخذہ ہوگا۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اس غصے کا علاج ہی یہ ہے کہ جب غصہ آئے تو اس کے تقاضے پر عمل نہ کرو، خواہ غصے کے اندر کتنا ہی جوش آ رہا ہو، لیکن اس جوش کی بنیاد پر کوئی بات زبان سے نہ نکالے، کوئی قدم آگے نہ بڑھائے بلکہ اس تقاضے کو دبائے، اور بار بار اس تقاضے کو دبائے گا تو رفتہ رفتہ اس جوش میں بھی کمی آ جائے گی اور غصے کا جو اُبال ہوتا تھا وہ بھی کم ہو جائے گا۔ غصہ کا علاج ہی یہی ہے کہ جتنا اس غصے کو پیو گے، اتنا ہی یہ قابو میں آئے گا اور جتنا اس غصے کے تقاضے پر عمل کرو گے اتنا ہی اس غصے میں اضافہ ہوگا۔

غصے کا گھونٹ اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے "احیاء العلوم" میں یہ حدیث نقل فرمائی ہے کہ اللہ جل شانہ کو انسان کا کوئی گھونٹ پینا اتنا محبوب نہیں ہے جتنا غصے کا گھونٹ پینا محبوب ہے۔ یعنی پانی کا گھونٹ پینا، شربت کا گھونٹ پینا، دودھ کا گھونٹ پینا سب جائز ہے، لیکن غصے کا گھونٹ پینا محبوب ہے، اس لئے کہ غصہ کا گھونٹ پینے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اللہ جل شانہ کے ڈر سے اور اس کی عظمت کے تصور سے اپنے غصے کو دبائے اور اس کو پی جائے اور اس غصے کے تقاضے کو کچل دے اور اس کی خواہش کو پورا نہ کرے، یہ عمل اللہ تعالیٰ کو بے انتہا محبوب ہے۔

دل توڑنے کیلئے ہے

یہی مجاہدہ درحقیقت مطلوب ہے، جب اس دل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی خاطر چوٹیں پڑتی ہیں تو پھر یہ دل اللہ تبارک وتعالیٰ کی تجلی گاہ بن جاتا ہے ۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

جتنا یہ دل ٹوٹے گا، اتنا ہی یہ دل اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں محبوب ہوتا چلا جائے گا، اس دل پر جتنی چوٹیں پڑیں گی، اتنی ہی اس دل پر اللہ تعالیٰ کی تجلّیات کا نزول ہوگا، اللہ تعالیٰ نے دل کے اندر جو خواہشات پیدا کی ہیں، یہ اسی لئے پیدا کی ہیں تا کہ ان کو توڑا جائے، اس لئے نہیں ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حفت الجنة بالمكاره

یعنی جنّت کو مکروہات سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ مکروہات ان کاموں کو کہا جاتا ہے جن کو دل پسند نہیں کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر ان پر عمل کر رہا ہے اور اس کے نتیجے میں دل پر چوٹ مار رہا ہے، مثلاً غصہ آیا لیکن اللہ تعالیٰ کی خاطر اس غصّے کو پی گیا، یا مثلاً دل میں شہوت کی نظر ڈالنے کا تقاضہ پیدا ہوا، لیکن اللہ تعالیٰ کی خاطر نظر جھکالی، ان کاموں کے نتیجے میں دل کی خواہشات کو کچلا جارہا ہے، اس کچلنے کے نتیجے میں یہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلّی گاہ بن جاتا ہے۔

نفس کی خواہشات کو کچل دو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آدمی ایک مرتبہ یہ طے کرلے کہ:

آرزوئیں خون ہوں یا حسرتیں برباد ہوں
اب تو اس دل کو بنانا ہے ترے قابل مجھے

آدمی یہ عزم کرلے کہ دل میں جتنی خواہشات اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو رہی ہیں، ان کو کچلنا ہے اور ان کو پامال کرنا ہے اور پامال کرنے کے نتیجے میں ان پر قابو حاصل کرنا ہے۔ اور جب بندہ ایک مرتبہ یہ کام کرلیتا ہے اور اپنی خواہشات کو کچلتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ خواہشات مضمحل ہو جاتی ہیں اور کمزور پڑ جاتی ہیں۔ یاد رکھو! یہ خواہشات مرتے دم تک ختم نہیں ہوں گی بلکہ باقی رہیں گی، لیکن ان کے جوش و خروش میں اور ان کی شدّت میں کمی آجاتی ہے۔

حلاوت ایمانی نصیب ہوتی ہے

اور جب اس دل پر بار بار چوٹ پڑنے کے نتیجے میں اس کی خواہشات کمزور پڑ جاتی ہیں تو اللہ تعالیٰ حلاوتِ ایمان عطا فرما دیتے ہیں اور اپنی معرفت عطا فرماتے ہیں اور اس حلاوت ایمان اور معرفت کی جو لذّت حاصل ہوتی ہے، اس کے مقابلے میں خواہشات کی لذّت ہیچ در ہیچ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو حلاوت ایمان اور اپنی معرفت عطا فرما دے۔ آمین۔ اس

حلاوت کے آگے گناہوں کی اور خواہشات کی لذّت کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔

یہ حلاوت مُفت نہیں ملتی

لیکن یہ حلاوت مُفت میں نہیں ملتی بلکہ پہلے ان خواہشات نفس پر چوٹ مارتے رہو، مارتے رہو، اور چوٹ مارنے سے شروع شروع میں بڑی تکلیف ہوگی، بڑی مشقت ہوگی، لیکن اس مشقت کو برداشت کر کے چوٹیں مارتے رہو، مارتے رہو، رفتہ رفتہ یہ دل ٹوٹ ٹوٹ کر اللہ تعالیٰ کی تجلّی گاہ بن جائے گا۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت خوبصورت شعر پڑھا کرتے تھے کہ۔

یہ کہہ کے کاسہ ساز نے پیالہ پٹک دیا
اب اور کچھ بنائیں گے اس کو بگاڑ کے

جس ذات نے بڑا خوبصورت پیالہ بنایا، اسی ذات نے یہ کہتے ہوئے اس پیالہ کو پٹک دیا کہ اب اس کو بگاڑ کر اور کچھ بنائیں گے۔ اس دل پر چوٹیں ماریں، اس پر ہتوڑے چلائے، یہ سب کیوں کیا، تاکہ اس کو بگاڑ کر اور کچھ بنائیں گے۔

برباد دل پر تجلّیات کا نزول

کسی نے اس پر بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ:

بتانِ مہوش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
جسے برباد کرتے ہیں اسی کے دل میں رہتے ہیں

لہٰذا خواہشات کو کچل کچل کر جب دل کو برباد کر دیا جاتا ہے تو اس دل پر اللہ تعالیٰ کا نزول اجلال ہوتا ہے اور ان کی تجلّیات ظاہر ہوتی ہیں۔

دل پر ذرا نشتر لگائیے

حضرات صوفیاء کرام اور اولیاء کرام، ان سے بھی آگے صحابہ کرامؓ، ان سے بھی آگے انبیاء کرام علیہم السلام، ان کے جو قلوب مجلّٰی مزکّٰی مصفّٰی ہوتے ہیں، وہ بھی اسی طرح ہوتے ہیں کہ یہ حضرات اپنی خواہشات کو توڑتے ہیں اور ان کو کچلتے ہیں، کیونکہ جب خواہشات کو کچلا جاتا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ اس دل کو مجلّٰی مزکّٰی بنا دیتے ہیں، اس دل میں پھر اللہ تعالیٰ کی معرفت کا نور آتا ہے، اس کے بعد پھر ان گناہوں کی خواہشات مضمحل ہو جاتی ہیں اور ان کا جوش وخروش ماند پڑ جاتا ہے، مگر اس کے لئے ابتداء میں ان خواہشات سے کشتی لڑنی پڑتی ہے۔ میں نے بھی اسی موضوع پر ایک شعر کہا تھا کہ:

کتنے غنچے مضطرب ہیں دل میں کھلنے کیلئے
اپنے ہاتھوں سے ذرا نشتر لگا کر دیکھئے

اس دل پر جتنے نشتر لگاؤ گے، اتنے ہی غنچے کھلیں گے، اتنے ہی اس میں کمالات پیدا ہوں گے اور اتنے ہی اس میں انوارات اور تجلّیات حاصل ہوں گی۔

رفتہ رفتہ یہ غصّہ قابو میں آجائے گا

اس ملفوظ میں حضرت والا یہی فرما رہے ہیں کہ غصّہ کا علاج یہی ہے کہ اگر غصّہ آگیا تو آنے دو، لیکن اس کے بعد دل میں جو یہ تقاضہ پیدا ہوا کہ اٹھ

کراس کو ایک تھپڑ ماروں یا اس کو گالی دوں یا اس کو بُرا بھلا کہوں، اس تقاضے کو زبرستی دبا جاؤ اور یہ سوچو کہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے اس تقاضے کو دبا رہا ہوں تو پھر اس غصّے کو پامال کرنے میں بھی لذت اور حلاوت حاصل ہوگی انشاء اللہ اور جتنا یہ عمل کرتے جاؤ گے، اتنا ہی یہ نفس قابو میں آتا جائے گا۔

انسان کا نفس دودھ پیتے بچے کی طرح ہے

قصیدہ بردہ میں علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

النفس کا لطفل اِن تھملہ شب علی

حب الرضاع وإن تفطمہ ینفطم

یعنی انسان کا نفس چھوٹے بچے کی طرح ہے جو ابھی دودھ پیتا ہے، وہ بچہ کبھی یہ چاہے گا کہ میں دودھ چھوڑ دوں؟ نہیں، کیونکہ اس کو تو دودھ پینے کی عادت پڑی ہوئی ہے، اس لئے وہ ماں کا دودھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے، دودھ پیتے پیتے دو سال ہو چکے ہیں، اب اگر ماں باپ یہ سوچیں کہ اگر اس بچے کا دودھ چھڑائیں گے تو اس کو بہت تکلیف ہوگی، روئے گا، چلّائے گا، خود بھی پریشان ہوگا اور ہمیں بھی پریشان کرے گا، لہٰذا دودھ نہ چھڑاؤ، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بچہ جوان ہو جائے گا اور دودھ پینے کی عادت نہیں جائے گی۔ لیکن اگر ماں باپ اس کا دودھ چھڑانے کی کوشش کریں گے تو وہ بچہ دودھ چھوڑ بھی دے گا، ایک دن، دو دن، تین دن تک روئے گا، چلّائے گا، پریشان کرے گا، لیکن بالآخر چھوڑ دے گا، ہر بچے کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے۔

نفس کو بے مہار مت چھوڑو

علامہ بوصیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کا نفس بھی بچے کی طرح ہے، اگر تم نے اس نفس کو بے مہار چھوڑ دیا کہ جو خواہش ہو رہی ہے، اس پر عمل کر رہے ہو اور اس کی ہر خواہش پوری کر رہے ہو تو یہ نفس تمہیں ہلاکت کے گڑھے میں لے جا کر گرادے گا اور تم کبھی بھی گناہوں سے نجات نہیں پاسکوگے، لیکن اگر تم نے اس کو قابو کرلیا اور اس سے زبردستی گناہ چھڑانے کی کوشش کرلی تو یہ نفس گناہ چھوڑ بھی دے گا، بات ساری کوشش کی ہے۔ یہی معاملہ غصّے کا ہے کہ اس کے تقاضے کو دباتے رہو تو رفتہ رفتہ غصہ کا جوش مضمحل ہو جائے گا۔

غصّہ کا بہترین علاج

بعض اوقات غصّے کو قابو میں کرنے کے لئے اور علاج بھی مفید ہو جاتے ہیں، لیکن وہ علاج بڑے سخت ہیں، وہ علاج حضرت والا نے اس ملفوظ میں بیان فرمائے ہیں، فرمایا کہ:

> اگر طبعی طور سے غصہ زیادہ آجاتا ہو اور ذرا سی بات پر حد سے زیادہ غصہ آجاتا ہو کہ اس وقت عقل نہ رہتی ہو تو اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ جس پر غصہ کیا جائے، غصہ فرو ہونے کے بعد مجمع میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، پاؤں پکڑے، بلکہ اس کے جوتے اپنے سر پر

رکھ لے، ایک دوبار ایسا کرنے سے نفس کو عقل آ جائے
گی۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۱)

یعنی جس شخص پر بہت زیادہ غصہ کرلیا اور حدود سے تجاوز کر گئے تو اس کا ایک علاج یہ ہے کہ جب غصہ ختم ہو جائے تو مجمع میں اس سے معافی مانگے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کردو، اس کے سامنے ہاتھ جوڑے، اس کے پاؤں پکڑے، اس کے جوتے سر پر رکھ لے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا جب اگلی مرتبہ غصہ کا موقع آئے گا تو اس وقت نفس یہ سوچے گا کہ یہ تو اچھی خاص مصیبت ہے، پہلے تو صرف غصّے کو پینا ہی تھا، اب تو مجمع کے سامنے ذلّت اٹھانی پڑتی ہے، اس ڈر سے غصّے کے تقاضے کی شدّت میں کمی آ جائے گی، ایک دو بار ایسا کرنے سے انشاء اللہ نفس کو عقل آ جائے گی۔

اپنی ماں کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگو

میرے ایک دوست ہیں جو مغلوب الغضب ہیں، غصّے کے بہت تیز ہیں، یہاں تک کہ اگر ماں نے بھی کچھ کہہ دیا تو ماں پر غصہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھ سے بار بار پوچھتے رہتے ہیں کہ فجر کی نماز میں کیا ذکر کروں، ظہر کی نماز میں کیا تسبیحات پڑھوں۔ میں نے اس سے کہا کہ تم کچھ مت کرو، پہلا کام یہ کرو کہ ماں کے پاس جاکر اس کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگو اور کہو کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کردو۔ میری یہ بات سن کر تعجب سے کہنے لگے کہ اچھا حضرت! میں معافی مانگوں، یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو تمہیں کرنا ہوگا، جاکر معافی مانگو اور پاؤں پکڑو اور یہ کام سب بہن بھائیوں کے

سامنے کرو، کہنے لگے کہ بڑا مشکل ہے۔ میں نے کہا کہ کچھ بھی ہو جائے، لیکن تم یہ کام کرو۔ ان کو یہ عمل بہت شاق گزر رہا تھا کہ میں اپنے تمام بہن بھائیوں کے سامنے ماں سے معافی مانگوں۔ لیکن انہوں نے جا کر یہ کام کیا، جب واپس آئے تو مجھ سے کہا کہ کیا بتاؤں، اس وقت میرے سینے پر سانپ لوٹ گئے، آرے چل گئے۔ میں نے کہا کہ میرا بھی یہی مقصد تھا۔ جب دو چار مرتبہ یہ کام ان سے کرایا تو طبیعت اعتدال پر آ گئی۔

بہرحال! انسان کا نفس ان کاموں کو سخت محسوس کرتا ہے، لیکن بعض اوقات یہی کرنا پڑتا ہے، جب انسان یہ کڑوی گولی نگل لیتا ہے تو اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے شفا ہوتی ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ اس مرض سے نجات عطا فرما دیتے ہیں۔

شیخ کی نگرانی میں علاج کرے

مگر یہ کام بھی کسی شیخ کی نگرانی میں کرنے چاہئیں، خود اپنی رائے سے نہ کرے، بعض اوقات اپنی رائے سے کرنے سے بھی نقصان ہو جاتا ہے اور الٹا اثر پڑ جاتا ہے، کیونکہ شیخ جانتا ہے کہ کتنی خوراک دوا دی جائے، اگر ضرورت سے زیادہ دوا دیدی تو مصیبت ہو جائے گی اور اگر کم دوا دیدی تو فائدہ نہیں کرے گی، اس لئے شیخ کے ذریعہ یہ علاج کرنا چاہئے۔

غصہ کا ایک اور علاج

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غصہ کے علاج کے لئے اس بات کا کثرت سے استحضار کرنا بھی مفید ہوتا ہے، وہ بات یہ ہے کہ:

تجربہ کر کے دیکھا گیا ہے کہ غصہ روکنا ہمیشہ اچھا ہوا
اور جب اس کو جاری کیا گیا تو اس کا انجام ہمیشہ برا ہوا
اور دل کو قلق بھی ہمیشہ ہوا۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۲)

یعنی زمانہ ماضی کو یاد کرو کہ جتنی مرتبہ غصے کو روکا تو اس کا انجام اچھا ہی ہوا، غصہ روکنے سے نقصان نہ ہوا، اور جب کبھی غصہ کیا اور اس کے تقاضے پر عمل کیا تو بکثرت ایسا ہوا کہ بعد میں ندامت اور شرمندگی ہوئی، اگر آدمی کے اندر ذرا بھی سلامتی طبع ہو تو غصہ کرنے کے بعد قلب میں ظلمت محسوس ہوتی ہے اور کدورت اور ندامت محسوس ہوتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے کیا خوبصورت بات ارشاد فرمائی کہ:

مادخل الرفق فی شئی اِلا زانه
وما نزع من شئی الا شانه

یعنی نرمی جس چیز میں بھی داخل ہو جائے، اسے زینت بخشے گی اور جس چیز سے بھی نکال دی جائے تو اسے عیب دار بنا دے گی۔ لہٰذا نرمی جہاں بھی ہوگی، زینت کا سبب ہوگی، اس لئے جب غصہ کرنے سے بکثرت نقصان ہوتا ہے اور ندامت ہوتی ہے اور غصہ نہ کرنے سے نہ نقصان ہوتا ہے اور نہ ہی ندامت ہوتی ہے تو پھر آدمی کو وہی کام کرنا چاہئے جس سے آدمی کو ندامت نہیں ہوتی۔

غصہ کے وقت بچے کو نہیں مارنا چاہئے

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

غصّے میں بچوں کو ہرگز نہ مارا جائے (چاہے استاذ ہو یا

باپ ہو) بلکہ غصہ فرو ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دی جائے، اور بہتر سزا یہ ہے کہ بچوں کی چھٹی بند کر دی جائے، اس کا ان پر کافی اثر ہوتا ہے، ملاّ جی مارنے میں اس واسطے آزاد ہیں کہ ان سے باز پرس کرنے والا کوئی نہیں، بچے تو باز پرس کے اہل نہیں اور والدین کا مقولہ ہے کہ ہڈی ہماری اور چمڑا میاں جی کا۔

مگر یاد رکھو جس حق کا مطالبہ کرنے والا کوئی نہ ہو، اس کا مطالبہ حق تعالیٰ کی طرف سے ہوگا، یہاں تک کہ اگر کافر ذمی پر کوئی حاکم ظلم کرے تو حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کی طرف سے مطالبہ کریں گے۔ (انفاس عیسی ص ۱۷۳)

بچوں کو مارنا بڑا خطرناک معاملہ ہے

بچوں کو مارنے کا معاملہ بڑا خطرناک ہے۔ ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اور گناہوں کی معافی توبہ کے ذریعہ ممکن ہے، لیکن اگر بچوں پر ظلم کیا جائے تو اس کی معافی کا معاملہ بھی بڑا مشکل ہے، کیونکہ یہ حق العبد ہے اور حق العبد صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتا جب تک وہ بندہ معاف نہ کرے جس بندے کی حق تلفی کی گئی ہے، اور یہاں پر بندہ نابالغ ہے اور نابالغ کی معافی بھی معتبر نہیں، حتیٰ کہ اگر وہ نابالغ زبان سے بھی یہ کہہ دے کہ میں نے معاف کیا، تب بھی وہ معافی معتبر نہیں،

اس لئے اس کی معافی بڑی مشکل ہے، لہٰذا بچوں کو مارنے اور ان پر سختی کرنے میں ڈرتے رہنا چاہئے۔

مدارس میں بچوں کے مارنے پر پابندی

ہمارے مدارس کے جو قاری صاحبان ہیں وہ اس کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو عافیت عطا فرمائے۔ آمین۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ اصول بنا دیا تھا کہ مکتب میں کسی قاری صاحب کو مارنے کی اجازت نہیں تھی، جب کوئی قاری صاحب پٹائی کرتے تو آپ اس سے باز پرس فرماتے اور کبھی سزا بھی دیتے تھے، ایک مرتبہ آپ نے یہاں تک فرما دیا کہ اب اگر مجھے پتہ چلا کہ کسی قاری صاحب نے بچے کو مارا ہے تو میں مسجد کے صحن میں قاری صاحب کو کھڑا کر کے اسی بچے سے پٹواؤں گا جس کو مارا ہے۔ یہ سختی اس لئے فرمائی کہ یہ معاملہ بڑا خطرناک ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

غصہ ختم ہونے کے بعد سوچ سمجھ کر سزا دو

اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں کو پڑھانے والے استادوں کا کام بہت مشکل ہے، بچوں کو قابو کرنا بڑا دشوار ہوتا ہے اور کبھی نہ کبھی مارنے کی نوبت آ ہی جاتی ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ کوئی اور علاج کارگر نہ ہو رہا ہو اور پٹائی کی نوبت آ ہی جائے تو اس کے بارے میں حضرت فرما رہے ہیں کہ غصے کی حالت میں نہ مارو بلکہ اس وقت طرح دے جاؤ اور جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس وقت سوچ سمجھ کر سزا دو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اتنی ہی سزا دو گے جتنی سزا کی

ضرورت ہوگی اور حد سے تجاوز نہیں کرو گے، اور اگر غصّے میں مارنا شروع کردو گے تو جہاں ایک طمانچہ کی ضرورت تھی، وہاں دس لگ جائیں گے، اس کی وجہ سے ایک تو فی نفسہٖ گناہ ہوا کہ جتنی مارنے کی ضرورت تھی، اس سے زیادہ مار دیا۔ دوسرے یہ کہ نقصان ہوا، کیونکہ جو چیز حد سے زیادہ ہوتی ہے وہ حقیقت میں نقصان دہ ہوتی ہے، تیسرے یہ کہ بعد میں ندامت بھی ہوئی۔

اس لئے اس ملفوظ میں حضرت نے بڑے گر کی بات فرمادی کہ اس وقت سزا دو جب غصہ ٹھنڈا پڑ جائے، جب طبیعت میں اشتعال ہو رہا ہو، اس وقت سزا مت دو۔

اختتامیہ

غصّہ کے بارے میں یہ چند اصول ہیں جو حضرت والا نے بیان فرما دیے اور یہ بھی بتا دیا کہ کونسی چیز مضر ہے اور کونسی چیز مضر نہیں اور اس غصّے کے شر سے بچنے کا کیا طریقہ ہے، اب ہر انسان کو اپنے حساب سے ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، اور عمل کرنے کا بہترین راستہ یہ ہے کہ کسی شیخ سے اس نیت سے رابطہ رکھے کہ مجھے ان رذائل کی اصلاح کرانی ہے اور پھر ان سے مشورہ لیتا رہے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ رفتہ رفتہ ان رذائل کو دور فرما دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہمارے رذائل کو دور فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۵۵

حسد اور اس کا علاج

(۱)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقامِ خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقتِ خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۴

مجلس نمبر : ۵۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

مجلس نمبر ۵۵
حسد اور اس کا علاج
(۱)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔ أَمَّا بَعْدُ!

تمہید

گزشتہ تین دن سے غصہ کا بیان چل رہا تھا، اب آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ''حسد'' کا بیان شروع فرمارہے ہیں، یہ حسد بھی بڑی خراب باطنی بیماری ہے، یہ بڑی خطرناک بھی ہے اور اس کا چلن بھی بہت زیادہ ہے، یعنی یہ بیماری کثرت سے پیدا ہو جاتی ہے، خاص طور پر ہمارے طبقے میں یعنی طالب

علموں کے طبقے میں یہ بیماری بہت زیادہ ہے، لہٰذا بہت زیادہ اہتمام کے ساتھ اس کے ازالے کی فکر کرنی چاہئے۔

تین چیزیں اور ان کا حکم

چنانچہ حسد کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے جو ملفوظات ہیں، وہ ایک ایک پڑھ لیتے ہیں اور ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی ہو جائے گی۔ ایک ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ:

> ایک تو کیفیت انسانیہ ہے جس میں انسان ''معذور'' ہے، ایک عمل ہے مقتضی پر، اس میں انسان مازور (گناہ گار) ہے، ایک مخالفت ہے اس مقتضی کی، اس میں انسان ''ماجور'' ہے، یعنی حسد کے غلبہ سے کسی کی مذمت کا تقاضہ ہو تو اس کی مدح کرو، اگر اس سے اعراض کو دل چاہے تو اس سے ملو، اس کی تعظیم کرو، اس کو ابتداء بالسلام کرو اور اس کے ساتھ احسان کرو۔
>
> (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۲)

حسد کس کو کہتے ہیں؟

حسد کے تمام مباحث کو اس مختصر سے ملفوظ میں سمیٹ دیا، سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ حسد کس کو کہتے ہیں؟ ''حسد'' اسے کہتے ہیں کہ دوسرے کسی شخص کو جو اچھائی حاصل ہے، اس کی اچھائی سے رنجیدہ ہو کر اس کے زوال کی تمنا کرنا۔

حسد کی مثالیں

مثلاً میرا ایک ہم جماعت ہے، ہم دونوں ایک ساتھ پڑھتے ہیں، میرا ساتھی امتحان میں اول آ جاتا ہے، اس کے نمبر زیادہ آتے ہیں، اب میرے دل میں یہ خیال آیا کہ اس کے نمبر کیوں زیادہ آتے ہیں؟ وہ مجھ سے کیوں آگے بڑھ گیا؟ اب دل میں یہ خواہش ہے کہ اس کے نمبر کم آئیں، وہ آئندہ اوّل پوزیشن حاصل نہ کر سکے؛ چاہے میں پوزیشن حاصل کروں یا نہ کروں، اس سے کوئی بحث نہیں، لیکن یہ اوّل نہ آئے۔ یہ خیال اور جذبہ ''حسد'' ہے۔

یا مثلاً ایک شخص بڑا مالدار ہے، اب آپ کے دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ اس کے پیسے کم ہو جائیں، اس کی آمدنی کم ہو جائے، یہ جذبہ ''حسد'' ہے۔ یا مثلاً ایک شخص کی عزت اور شہرت ہے، لوگ اس کی طرف زیادہ رجوع کرتے ہیں، اب دل میں یہ کڑھن ہو رہی ہے کہ لوگ اس کی طرف کیوں مائل ہیں؟ اور دل میں یہ خیال آ رہا ہے کہ اس کی عزت اور شہرت ختم ہو جائے، یہ ''حسد'' ہے۔

رشک کرنا جائز ہے

ایک ''غبطہ'' ہوتا ہے، جس کو اردو میں ''رشک'' کہتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ جب دوسرے شخص کے پاس کوئی نعمت دیکھی تو خیال آیا کہ اس شخص کے پاس یہ نعمت ہے، اللہ تعالیٰ یہ نعمت مجھے بھی عطا فرما دے اور اس کے پاس بھی یہ نعمت رہے۔ مثلاً اس کی صحت اچھی ہے، اللہ تعالیٰ میری صحت بھی اچھی کر دے۔ اس کے پاس دولت ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی دولت عطا فرما دے۔ یا مثلاً فلاں کے

پاس علم زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی علم عطا فرما دے۔ یہ "رشک" ہے، اس میں دوسرے کی نعمت کو دیکھ کر اپنے لئے بھی اسی نعمت کے حصول کی خواہش ہوتی ہے۔ یہ "رشک" کرنا منع نہیں، جائز ہے، جبکہ "حسد" میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ مجھے یہ نعمت ملے یا نہ ملے، لیکن اس کے پاس سے زائل ہو جائے، یہ "حسد" ہے۔

صرف دل کا رنجیدہ ہونا گناہ نہیں

یہ "حسد" بڑی خراب چیز ہے۔ اگر صرف دل میں یہ خیال آ گیا کہ یہ شخص مجھ سے فلاں چیز میں آگے بڑھ گیا ہے اور اس خیال کے نتیجے میں دل میں تکلیف اور صدمہ اور رنج ہو رہا ہے، لیکن اس رنج اور صدمہ کا کوئی اثر اپنے عمل سے ظاہر نہیں ہونے دیا تو یہ صدمہ اور رنج غیر اختیاری طور پر پیدا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ یہ "کیفیت انسانیہ" ہے جس میں انسان معذور ہے بشرطیکہ صرف دل کے اندر تک رہے، نہ اس رنج کا کوئی اثر اپنے کسی عمل سے ظاہر ہو اور نہ اس رنج کے مقتضی پر عمل ہو، اس حد تک کوئی گناہ نہیں۔

دل کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے

ہاں! گناہ اس وقت ہوگا جب اس "حسد" کے نتیجے میں اس کی بدخواہی میں کوئی کام کر گزرے۔ مثلاً دل میں خیال آیا کہ یہ شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا ہے، اب میں لوگوں کے سامنے اس کی بُرائی بیان کروں تاکہ اس کی عزت میں کمی آئے، یا کوئی ایسی تدبیر اختیار کرے جس کے نتیجے میں اس کی دولت کم ہو

جائے، اس کی صحت کم ہو جائے، اس کا علم کم ہو جائے، لوگوں پر اس کے اثرات کم ہو جائیں۔ یا اس کے لئے بدعا کرے کہ یا اللہ! اس کی فلاں نعمت اس سے زائل ہو جائے، یا لوگوں کے سامنے اس کی غیبت کرے، یا مجمع کے سامنے اس کو ذلیل کرنے کی فکر کرے، یا جب اس سے ملاقات ہو تو اس کو سلام نہ کرے وغیرہ، جب ''حسد'' کے نتیجے میں حسد کرنے والا یہ اعمال کرے گا تب یہ ''حسد'' گناہ اور معصیت کی شکل اختیار کرے گا۔ لیکن جب تک ''حسد'' کے نتیجے میں صرف دل میں ایک صدمہ اور تکلیف پیدا ہوئی ہے، اس حد تک یہ ''حسد'' گناہ اور معصیت نہیں کیونکہ یہ بات غیر اختیاری طور پر پیدا ہوئی ہے۔

البتہ دل کا خیال بھی خطرناک ہے

لیکن ''احیاء العلوم'' میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب یہ حسد دل میں پیدا ہوا اور دوسرے کے خلاف دل میں ایک کڑھن پیدا ہوئی کہ یہ مجھ سے آگے کیوں بڑھ گیا، اگرچہ غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے انسان اس میں معذور ہے اور یہ براہ راست گناہ نہیں، لیکن یہ خیال اور کڑھن بھی بڑی خطرناک ہے، کیونکہ اگر یہ خیال دل میں کچھ عرصہ تک باقی رہا تو یہی خیال بالآخر اس کو معصیت اور گناہ میں مبتلا کر دے گا اور اس کے نتیجے میں اس سے کوئی نہ کوئی بدخواہی کا عمل دوسرے کے خلاف سرزد ہو جائے گا۔ لہٰذا چاہے ''حسد'' کا خیال بلا اختیار آیا ہو لیکن اس ''حسد'' کو دل میں رکھنا اور اس کی پرورش کرنا بڑا خطرناک ہے، اس لئے نہ اس خیال کی پرورش کرو اور نہ اس کو دل میں باقی رکھو۔

خیال کے علاج کیلئے تین کام کرو

بلکہ اس موقع پر اس کے علاج کے لئے تین کام کرو۔ پہلا کام یہ ہے کہ جو خیال دل میں آیا ہے، اس کو بُرا سمجھو کہ یہ خیال جو میرے دل میں آیا ہے، یہ بُری بات ہے، کسی مسلمان کے بارے میں ایسی بات سوچنا بہت بُرا ہے، اس طرح اس خیال کی بُرائی کا تصور کرو۔ دوسرا کام یہ کرو کہ جس آدمی کے بارے میں یہ خیال پیدا ہوا ہے، اس کے محاسن اور اس کی اچھائیوں کا استحضار کرو، خاص طور پر ان اچھائیوں کا جن کا تعلق تمہاری ذات سے ہو، مثلاً اگر تم کو اس کے ذریعہ کسی موقع پر کسی درجہ میں نفع پہنچا ہے تو گویا کہ اس کا تمہارے اوپر احسان ہے، اگر ایسا ہوا ہے تو خاص طور پر اس احسان کا استحضار کرو۔

تیسرا کام یہ کرو کہ اگرچہ تمہارے دل میں اس کے ''حسد'' کا خیال آ رہا ہے اور حسد کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کو تکلیف پہنچے، اس کو نیچا دکھایا جائے، اس کی بُرائی ہو، لیکن بہ تکلّف اور زبردستی اس کے حق میں دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما۔ یہ دعا کرنا بہت ہی کڑوا گھونٹ ہے، کیونکہ دل تو چاہ رہا ہے کہ وہ ذلیل وخوار ہو، لوگوں کے دلوں میں اس کی وقعت کم ہو اور وہ آگے ترقی نہ کرے، لیکن آپ اس کے لئے دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ! اس کو اور زیادہ ترقی درجات عطا فرما، اس کے علم میں ترقی عطا فرما، اس کی دولت میں ترقی عطا فرما، اس کی صحت مین ترقی عطا فرما، اور جب وہ سامنے آئے تو اس سے ابتداء بالسلام کرو اور اس کی تعظیم واکرام کرو اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریف اور اچھائی بیان کرو، ایسا کرنے سے آپ کے سینے پر سانپ لوٹ

جائیں گے، لیکن حسد کا علاج یہی ہے۔

ورنہ وہ خیال ہلاکت میں ڈال دے گا

بہرحال مندرجہ بالا تین کام کرو، اگر حسد کرنے والا شخص یہ تین کام نہیں کرے گا تو پھر جو غیر اختیاری خیال دل میں آیا تھا، وہ بالآخر معصیت پر منتج ہو کر رہے گا اور وہ خیال تمہیں ہلاکت میں ڈال دے گا اور اگر مندرجہ بالا تین کام کر لئے تو انشاء اللہ وہ جو غیر اختیاری خیال آیا تھا، وہ معاف ہو جائے گا۔ اب دوبارہ حضرت والا کا ملفوظ دیکھ لیں۔ حضرت فرمارہے ہیں کہ:

ملفوظ کی تشریح

''ایک تو کیفیت انسانیہ ہے'' اس کیفیت انسانیہ سے مراد وہ غیر اختیاری خیال ہے جو دل میں آ گیا، مثلاً کسی کے تم سے آگے بڑھنے سے تمہارے دل پر چوٹ لگ گئی، اس میں انسان معذور ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر مؤاخذہ نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس خیال کے مقتضیٰ پر عمل کرے، مثلاً اس کے درپے آزار ہوگیا، اس کی چغلیاں شروع کر دیں، اس کی غیبت شروع کردی اور اس کو ذلیل وخوار کرنے کے لئے اس کے پیچھے پڑ گیا، اس کے اندر انسان مازور یعنی گناہ گار ہے۔

تیسرا یہ کہ اس کے مقتضیٰ کی مخالفت کرے، مثلاً دل میں تو یہ خیال آ رہا ہے کہ کسی طرح اس کو ذلیل وخوار کروں، لیکن اس تقاضے کے برخلاف اس کی تعریف کر رہا ہے اور اس کے لئے دعا کر رہا ہے، اس عمل کے نتیجے میں انسان ''ماجور'' ہے، یعنی ایسا کرنے پر اس کو اجر وثواب ملے گا۔

خیال کی مخالفت کا نتیجہ

نفس کے اس خیال کی مخالفت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ شیطان تمہارے دل میں حسد کا خیال اس لئے لایا تھا تاکہ تمہیں جہنم میں پہنچا دے، کیونکہ حسد کے نتیجے میں جو اعمال تم کرتے، وہ اعمال تم کو تباہ کر دیتے اور جہنم میں پہنچا دیتے، لیکن تم نے یہ کیا کہ جب حسد کا خیال آیا تو تم نے اس خیال کے تقاضے کی خلاف ورزی شروع کر دی، مثلاً اس کے حق میں دعا شروع کر دی اور اس کی تعریف شروع کر دی، تو خیال اوّلاً تمہیں معصیت میں مبتلا کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن اس کے مقتضیٰ کے خلاف عمل کرنے کے نتیجے میں بالآخر نیکیوں اور ثواب کا خزانہ تمہارے نامہ اعمال میں جمع ہو جائے گا۔

کیا گناہ اچھی چیز ہے؟

ہمارے ایک بزرگ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز صحبت تھے، وہ بڑی عجیب وغریب باتیں کیا کرتے تھے، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ گناہ بڑی اچھی چیز ہے، ہم نے کہا کہ حضرت! گناہ اور اچھی چیز ہونا، سمجھ میں بات نہیں آئی، فرمایا کہ ہاں! گناہ بڑی اچھی چیز ہے، اس لئے کہ جب گناہ کا تقاضہ دل میں پیدا ہو اور انسان زبردستی کر کے اس گناہ سے بچے تو اس کے درجات کہیں سے کہیں پہنچ جاتے ہیں، اگر گناہ نہ ہوتے تو یہ درجات نہ بڑھتے، کیونکہ گناہ انسان کے دل میں جو معصیت اور نافرمانی کا تقاضہ پیدا کرتا ہے اور پھر انسان اس تقاضے کی مخالفت کرتا ہے اور اس کو کچلتا ہے تو اس کے درجات میں کہیں سے کہیں ترقی ہو جاتی ہے۔

دو شخصوں میں موازنہ کریں

دیکھئے! ایک وہ شخص ہے جس کے دل میں گناہ کا خیال ہی نہیں آیا، نہ اس کو گناہ کرنے کے مواقع میسّر آئے اور وہ گناہوں سے بچتا ہوا گزر گیا تو انشاء اللہ وہ عذاب سے نجات پا جائے گا۔ لیکن دوسرا شخص وہ ہے کہ قدم قدم پر اس کے دل میں گناہوں کے تقاضے اور داعیے پیدا ہو رہے ہیں، گناہوں کے مواقع بھی میسّر آ رہے ہیں، ایک قدم آگے بڑھتا ہے تو اس کے سامنے گناہ کا ایک تقاضہ آ کر کھڑا ہو جاتا ہے، وہ کسی طرح اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا کر آگے بڑھتا ہے، جب دوسرا قدم بڑھاتا ہے تو پھر ایک گناہ کا تقاضہ پیدا ہوتا ہے، پھر وہ اپنے آپ کو کسی طرح اس سے بچا کر آگے بڑھا تو ایک داعیہ اور پیدا ہو گیا، اس طرح زندگی گناہوں کے تقاضوں سے مقابلہ کرتے ہوئے قبر تک پہنچ گیا۔ فرمایا کہ یہ جو دوسرا شخص ہے جو گناہوں کی کشمکش سے گزرتا ہوا اور اپنے دامن کو گناہوں سے بچاتا ہوا قبر تک پہنچا ہے، اس کا درجہ پہلے شخص کے مقابلے میں کہیں آگے ہے۔ یہ کیوں آگے بڑھ گیا؟ یہ گناہوں کی وجہ سے آگے بڑھ گیا۔ اس لئے حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ گناہ بڑی اچھی چیز ہے، کیونکہ گناہوں کے تقاضوں کو کچلنے سے درجات بلند ہوتے ہیں۔

انگریزوں کے کباب لذیذ بنیں گے

شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جنہوں نے انگریزوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی اور جہاد کیا، ان کو انگریزوں سے

بڑی نفرت تھی، ان کی ہر چیز سے نفرت تھی اور یہ نفرت غلبہ حال تک پہنچی ہوئی تھی۔ کسی صاحب نے آکر کہا کہ حضرت! آپ ہر وقت انگریزوں کی بُرائی ہی بیان کرتے رہتے ہیں، آخر ان میں کوئی اچھائی بھی تو ہوگی؟ دنیا میں کوئی بُری چیز ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو، تو ان انگریزوں میں بھی کوئی تو اچھائی ہوگی؟ کبھی آپ ان انگریزوں کی اچھائی بھی بیان کر دیا کریں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ ہاں بھائی! ان انگریزوں کے کباب بنا کر کھائے جائیں تو بڑے لذیذ ہوں گے، ان میں یہ ایک اچھائی ہے۔

خلاصہ

بہرحال! گناہوں کی اچھائی یہ ہے کہ ان گناہوں کے تقاضوں کو کچلا جائے اور ان کے تقاضوں کو دبایا جائے تو اس سے انسان کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اسی طرح حسد کا جو خیال تمہارے دل میں آیا تھا، یہ اگرچہ تمہیں گناہ کے اندر مبتلا کرنے کے لئے آیا تھا، لیکن جب اس خیال کے تقاضے کے خلاف تم نے عمل کیا تو یہ اُلٹا تمہاری ترقی درجات کا سبب بن گیا، اسی طرح گناہوں کے جتنے داعیے اور تقاضے ہیں، وہ بالآخر انسان کی ترقی درجات کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس لئے اگر تمہارے دل میں حسد کے خیالات آتے ہیں تو ان کو ترقی درجات کے حصول کا ذریعہ بنالو تو پھر انشاء اللہ اس حسد کے خیال سے کوئی ضرر نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۵۶

حسد اور اس کا علاج

(۲)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۴

مجلس نمبر : ۵۶

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

مجلس نمبر ۵۶

حسد اور اس کا علاج

(۲)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

حاسد خود حسد کی آگ میں جلتا رہتا ہے

گزشتہ کل حسد کا بیان شروع کیا تھا، اور میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بیماری بڑی خطرناک ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ ''حسد'' کو صوفیاء کرام نے آگ سے تشبیہ دی ہے، کیونکہ ''حسد'' کے نتیجے میں انسان کے دل میں ''جلن'' پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً کسی دوسرے کو اچھی حالت میں دیکھا اور اس کو اپنے سے بڑھتا ہوا دیکھا تو طبیعت میں ایک جلن پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حسد کے بارے میں ایک عربی شاعر نے کہا ہے ؎

النار تا کل بعضها ان لم تجد ما تا کل

جس کا مفہوم یہ ہے کہ حسد کی مثال آگ جیسی ہے اور آگ کی خاصیت یہ ہے کہ جب اس کو دوسری چیز کھانے کو ملے تو تب تو یہ اس کو کھاتی رہے گی، مثلاً لکڑی کو آگ لگی ہوئی ہے تو وہ آگ لکڑی کو کھاتی رہے گی، لیکن جب لکڑی ختم ہو جائے گی تو آگ کا ایک حصّہ خود اپنے دوسرے حصّے کو کھانا شروع کر دے گا، یہاں تک کہ وہ آگ بھی ختم ہو جائے گی، اسی طرح حسد کی آگ بھی ایسی ہے کہ حسد کرنے والا پہلے تو دوسرے کو خراب کرنے اور دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جب حاسد دوسرے کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تو پھر خود حسد کی آگ میں جل جل کر بیمار ہو جاتا ہے اور اس کو ظاہری بیماری لگ جاتی ہے، کتنے لوگ ہیں جو اس حسد کی آگ میں جل جل کر خود ختم ہو گئے۔

''حاسد'' اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض کرنے والا ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''حسد'' بہت بڑا گناہ ہے، اس لئے کہ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ ''حسد'' کرنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تقسیم پر اعتراض کر رہا ہے، مثلاً یہ کہ فلاں کو مجھ سے کیوں آگے بڑھا دیا گیا؟ فلاں کو آپ نے یہ نعمت کیوں عطا کر دی؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو جو چیز دی ہے، وہ ہم نے اپنی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ کس شخص کو کیا چیز دی جائے اور کتنی مقدار میں دی جائے۔ لہٰذا یہ ان کی حکمت کا فیصلہ ہے، اب تم اعتراض کر رہے ہو کہ فلاں کو یہ نعمت اتنی کیوں دی گئی؟ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلاَ تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ

(النساء:۳۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تم میں سے بعض کو بعض پر جو فضیلت عطا فرمائی ہے، اس کی تمنا مت کرو، کیونکہ یہ غیر اختیاری چیزیں ہیں، ان کے اندر تمنا مت کرو کہ یہ چیز اس کو کیوں مل گئی اور مجھے کیوں نہیں ملی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے

یہ تو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا نظام ہے، کسی کو اچھی صحت دیدی لیکن اس کے پاس پیسہ نہیں، دوسرے کو پیسے کی نعمت دے دی لیکن صحت اچھی نہیں، کسی کو علم

کی دولت دیدی لیکن پیسے کی دولت نہیں دی، کسی کو عزت اور شہرت کی دولت دیدی اور دوسری نعمت مثلاً اولاد کی نعمت اس کو میسّر نہیں ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے فیصلے سے یہ نعمتیں مقرر فرمائی ہیں کہ کس کو کیا نعمت دی جائے، تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو۔

اپنی نعمتوں کی طرف نظر کرو

''حسد'' کے اندر حاسد کو اپنی نعمت کی طرف نظر نہیں ہوتی بلکہ دوسرے کی نعمت کی زوال کی خواہش ہوتی ہے۔ لہٰذا حسد کرنے والا اگر یہ سوچے کہ فلاں کو یہ نعمت ملی ہوئی ہے، مجھے اس کے بجائے دوسری نعمت ملی ہوئی ہے، اس پر غور کرے گا تو حسد کی بیماری دل سے نکل جائے گی، مثلاً یہ کہ فلاں کو پیسے کی نعمت ملی ہوئی ہے لیکن مجھے اللہ تعالیٰ نے علم کی نعمت دی ہے۔ بقول کسی کے:

رضینا بقسمة الجبّار فینا

لنا عِلم و للجھّال مال

یعنی اللہ تعالیٰ نے ہمارے درمیان جو تقسیم فرمائی ہے، اس پر ہم راضی ہیں کہ جاہلوں کو مال کی نعمت دیدی اور ہمیں ان کے مقابلے میں علم کی دولت دیدی۔ لہٰذا آدمی کیوں غمگین اور رنجیدہ ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہئے۔ بہرحال! حسد کے اندر سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہوتا ہے، اس لئے اس سے بچنا چاہئے۔

ان خیالات کو بُرا سمجھو

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ بعض اوقات دل میں ''حسد'' کے غیر اختیاری خیالات آجاتے ہیں، ان غیر اختیاری خیالات کے آنے میں انسان ایک درجے میں معذور ہے اور اس میں گناہ بھی نہیں۔ لیکن یہ غیر اختیاری خیالات بھی خطرناک ہیں، کیونکہ کسی وقت بھی یہ انسان کو گناہ کے اندر مبتلا بھی کر دیتے ہیں، لہٰذا ان کا علاج کرنا ضروری ہے، ان خیالات کا علاج یہ ہے کہ ان کو بُرا سمجھو اور ان کے مقتضٰی کے خلاف پر عمل کرو۔ چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

> اختیاری کی ضد بھی اختیاری ہوتی ہے، پس جو امور حسد سے ناشی ہیں، ان کی ضد کو اپنے اختیار سے عمل میں لاؤ، اس طرح کہ بجائے غیبت کے محسود کی مدح زبان سے کیا کرو، گو نفس کو ناگوار ہو، مگر زبان پر تو اختیار ہے، اور اس سے نیاز مندی کے ساتھ ملاقات و کلام کرو، اور اس کے ضرر پر زبان سے رنج ظاہر کیا کرو، اس کے سامنے بھی اور دوسروں کے سامنے بھی، اور وہ اگر سامنے آجائے تو اس کی تعظیم کیا کرو، کبھی کبھی اس کو ہدیہ دیا کرو، ایک مدت تک ایسا کرنے سے حسد زائل ہو جائے گا، کم از کم بیس بار اس معاملہ کو واضح کیا

جائے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۴)

یعنی جس کام کا کرنا اختیار میں ہے، اس کا چھوڑنا بھی اختیار میں ہوگا، لہٰذا حسد کے نتیجے میں جو خیال دل میں پیدا ہو رہا ہے کہ میں اس کو ماروں، اس کو بُرا بھلا کہوں، اس کی اہانت کروں، اس کو لوگوں میں بدنام کروں، اس کی غیبت کروں، حسد کی وجہ سے ان اعمال کو کرنے کا دل میں خیال پیدا ہو رہا ہے اور یہ سب اعمال اختیاری ہیں اور حرام ہیں، لہٰذا ان کی ضِد بھی اختیاری ہے۔

جس سے حسد ہو رہا ہے اس کی تعریف کرو

مثلاً دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ اس کو بدنام کروں، لیکن بجائے بدنام کرنے کے اس کی تعریف لوگوں کے سامنے کرو، یہ بھی اختیار میں ہے، اور جب اختیار میں ہے تو اپنے اختیار سے اس کو عمل میں لاؤ۔ اس لئے حضرت تھانویؒ فرما رہے ہیں کہ ''جو امور حسد سے ناشی ہیں، ان کی ضد کو اپنے اختیار سے عمل میں لاؤ، اس طرح کہ بجائے غیبت کے محسود کی مدح زبان سے کیا کرو'' یعنی جس سے دل میں حسد پیدا ہو رہا ہے، اس کی بُرائی کرنے کے بجائے اس کی تعریف کرو، دل تو اس پر آمادہ نہیں ہوگا، لیکن دل کو قابو کر کے زبردستی اس کی تعریف کرو، گو نفس کو ناگوار ہو۔

اب دل تو چاہ رہا ہے کہ میں اس کو گالی دوں یا ایسا بُرا بھلا کہوں کہ یہ ساری دنیا میں بدنام ہو جائے، لیکن اس حاسد سے الٹا یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کی تعریف کرو، تعریف کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ اس کی کوئی مصنوعی تعریف کرو

بلکہ اس کی حقیقی تعریف کرو، کیونکہ دنیا میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کے اندر کوئی قابل تعریف پہلو نہ ہو، لہٰذا اس محسود کے اندر قابل تعریف پہلو کو تلاش کر کے پھر اس کی تعریف کرو کہ ماشاء اللہ اس کے اندر یہ بہت اچھا وصف موجود ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا چور کے پاؤں چومنا

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے واقعہ لکھا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کسی راستے سے گزر رہے تھے، دیکھا کہ ایک آدمی سولی پر لٹکایا ہوا ہے، اس کا دایاں ہاتھ بھی کٹا ہوا ہے اور اس کا بایاں پاؤں بھی کٹا ہوا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے لوگوں سے پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس نے پہلی مرتبہ جب چوری کی تو اسکا دایاں ہاتھ کاٹ دیا گیا تھا، جب دوسری مرتبہ اس نے چوری کی تو اس کا بایاں پاؤں کاٹ دیا گیا تھا، اس کے بعد پھر بھی باز نہ آیا اور پھر اس نے چوری کی تو اب اس کے نتیجے میں اس کو سولی پر لٹکایا جا رہا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ آگے بڑھے اور اس چور کے پاؤں کو جو لٹک رہا تھا، اس کو بوسہ دیا۔

لوگوں نے کہا کہ حضرت! آپ جیسا انسان اتنے بڑے چور اور ڈاکو کے پاؤں کو بوسہ دے؟ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ نے کیوں بوسہ دیا؟ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس شخص کے اندر ایک بہت عمدہ وصف ہے، وہ ہے ''استقامت'' میں نے اس کے اس وصف کو بوسہ دیا ہے،

اگرچہ اس شخص نے اس ''استقامت'' کے وصف کو غلط جگہ استعمال کیا اور گناہ کے کام میں استعمال کیا، یہ اس کی غلطی ہے، لیکن ''استقامت'' کا وصف بذات خود قابل تعریف وصف ہے، اگر یہ شخص اس وصف کو کسی صحیح کام میں لگالیتا تو یہ کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔

ہر انسان کے اندر کوئی خوبی ہوتی ہے

لہٰذا ہر انسان کے اندر کوئی نہ کوئی خوبی کی بات ہوتی ہے۔ اقبال شاعر بعض اوقات بڑی حکیمانہ بات بھی کہہ دیتا ہے، چنانچہ ایک بچوں کی نظم میں بڑی اچھی بات کہی کہ ؎

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

لہٰذا دنیا میں جتنی چیزیں ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے پیدا فرمائی ہیں۔

محسود کی مدح کرو

لہٰذا جس شخص سے تمہارے دل میں حسد پیدا ہو رہا ہے، اس کے اندر کوئی اچھائی تلاش کرو، اس کی کوئی خوبی تلاش کرو، پھر لوگوں کے سامنے اس کی اس اچھائی کو اور خوبی کو بیان کرو، ایسا کرنے سے دل پر آرے چلیں گے، لیکن چلنے دو، کیونکہ جو ''حسد'' کی بیماری دل میں پیدا ہو رہی ہے، اس کا علاج ہی دل پر آرے چلانا ہے، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ''بجائے

غیبت کے محسود کی مدح زبان سے کیا کرو گو نفس کو ناگوار ہو، مگر زبان پر تو اختیار ہے۔" ایک کام تو یہ کرو۔

محسود سے نیاز مندی کے ساتھ ملاقات کرو

دوسرا کام یہ کرو کہ "اس سے نیاز مندی کے ساتھ ملاقات اور کلام کرو"۔ مثلاً دل تو چاہ رہا ہے کہ اس کا منہ نوچ لوں، لیکن جب ملاقات ہو تو اس سے نیاز مندی اور عاجزی کے ساتھ ملاقات کرو اور اس سے بات چیت بھی نرمی کے ساتھ کرو۔

محسود کے ضرر پر رنج ظاہر کرو اور اسکی تعظیم کرو

تیسرا کام یہ کرو کہ: "اس کے ضرر پر زبان سے رنج ظاہر کیا کرو"۔ یعنی اگر اس محسود کو کوئی صدمہ یا کوئی رنج یا کوئی تکلیف پہنچ جائے تو اس تکلیف پر خود بھی اظہار رنج کرو، اس کے سامنے بھی کرو اور دوسرے لوگوں کے سامنے بھی کرو۔ چوتھا کام یہ کرو کہ "جب وہ سامنے آجائے تو اس کی تعظیم کیا کرو"۔

محسود کو ہدیہ دیا کرو

پانچواں کام یہ کرو کہ "کبھی کبھی اس کو ہدیہ دیا کرو" تاکہ اس کے دل میں بھی تمہاری محبت پیدا ہو، اور تمہارے دل میں بھی اس کی محبت پیدا ہو۔ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے لئے دوسرے سب کام کرنا تو گوارہ ہو جاتا ہے لیکن پیسے خرچ کرنا طبیعت پر بڑا بھاری ہوتا ہے، بقول کسی کے "گر جان

طلبی حاضر است، گر زر طلبی سخن دریں است'' لہٰذا پیسہ جیب سے نکالنا بڑا بھاری ہوتا ہے، لیکن یہ کڑوا گھونٹ بھی پیو۔ اب تم اس کو ہدیہ دو گے تو یہ ہوگا کہ جیب سے پیسے بھی نکلیں گے اور ایسے شخص کے پاس جائیں گے جس سے سخت نفرت ہے، اور جب یہ سب کام ''حسد'' کی مخالفت میں کرو گے تو اس کے نتیجے میں انشاء اللہ یہ حسد کی بیماری زائل ہو جائے گی۔

یہ کام بار بار کرنے سے حسد دور ہوگا

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ: ''ایک مدت تک ایسا کرنے سے ''حسد'' زائل ہو جائے گا، کم از کم بیس بار اس معاملے کو واضح کیا جائے۔'' یعنی بیس مرتبہ یہ کام کرو۔ چونکہ ایک صاحب نے خط میں حضرت والا کو لکھا تھا کہ مجھے فلاں آدمی سے ''حسد'' ہے، اس پر حضرت والا نے اس کا علاج فرمایا کہ اس کی تعریف کرو، اس کی تعظیم کرو، اس کو ہدیہ دو، اور کم از کم بیس مرتبہ یہ عمل کرو تو انشاء اللہ یہ حسد زائل ہو جائے گا۔

حسد اور حقد میں فرق

ایک اور خط کے جواب میں حضرت والاؒ نے لکھا کہ:

اگر کسی کے نقصان کی خبر سننے یا بُرائی کی خبر سننے سے دل خوش ہو تو یہ ''حسد'' کا مادّہ ہے، اور اگر اس شخص سے رنج پہنچا ہو تو ''حقد'' کا مادہ ہے، مگر ''مادہ'' پر مواخذہ نہیں، اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا جائے تو مواخذہ ہے

اور عمل اختیاری ہے، اس سے بچنا اختیاری ہے، لیکن
مادہ کو مضمحل کرنا ضروری ہے تاکہ بڑھ نہ جائے، اس کی
تدبیر یہی ہے کہ شرمندہ ہوں اور حق تعالیٰ سے توبہ
کریں اور دعا کریں کہ اس کو (اللہ تعالیٰ) دفع کریں
اور اس شخص کی اعانت کریں، خواہ مال سے، یا بدن
سے یا دعا سے، اس سے وہ ''مادہ'' کالعدم ہو جائے گا۔
(انفاس عیسیٰ ص ۱۷۴)

اس خط میں حضرت والا نے ''حسد'' اور ''حِقد'' میں فرق بیان فرمایا ہے، چنانچہ فرمایا کہ ''اگر کسی کے نقصان کی خبر سننے سے دل خوش ہو'' مثلاً کسی کے گھر میں چوری ہوگئی یا ڈاکہ پڑ گیا تو اب دل خوش ہوا کہ اچھا ہوا اس کے پیسے کم ہو گئے۔ یا مثلاً کسی کو تجارت میں نقصان ہو گیا تو دل خوش ہوا کہ چلو اچھا ہوا، یہ بہت اکڑ رہا تھا تو یہ زوال نعمت پر خوش ہونا، یہ بھی حسد کا ایک حصہ ہے، اگر اس طرح دل خوش ہو تو یہ ''حسد'' ہے۔

یہ کینہ ہے

اور اگر کسی شخص سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی اور اس تکلیف پہنچنے کے نتیجے میں دل میں اس شخص کی نفرت پیدا ہوگئی، اور اس نفرت کی وجہ سے اس کو صدمہ پہنچنے سے تمہیں خوشی ہوتی ہے، اس کو تکلیف پہنچنے سے تمہیں راحت حاصل ہوتی ہے، تو یہ صورت '' حِقد'' کہلائے گی۔ گویا کہ تمہارے دل میں ''کینہ'' ہے، کیونکہ ''کینہ'' کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے تمہیں تکلیف پہنچائی، اس کے

نتیجے میں تمہارے دل میں اس سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوا، لیکن دل میں جس طرح کا انتقام لینے کی خواہش تھی، ویسا انتقام تم نہ لے سکے اور اس کے نتیجے میں تمہارے دل میں گھٹن پیدا ہوگئی، اور اس گھٹن نے اس آدمی کی نفرت تمہارے دل میں پیدا کردی، اور اب اس کی برائی اور تکلیف سے دل میں خوشی کا جذبہ پیدا ہوگیا اور اس کی بدخواہی دل میں پیدا ہوگئی، اس کا نام ''کینہ'' ہے۔ اسی کا بیان آگے انشاء اللہ تعالیٰ مستقل آئے گا۔ بہرحال! حضرت والا یہاں پر ''حسد'' اور ''کینہ'' کے درمیان فرق بیان فرما رہے ہیں کہ اگر صرف یہ بات ہو کہ اس کی بُرائی سے خوشی ہو تو یہ حسد ہے اور اگر اس شخص سے رنج پہنچا ہے، اور اس کے نتیجے میں یہ صورت پیدا ہوئی ہو تو یہ ''حِقد'' اور ''کینہ'' ہے۔

مادہ کو کمزور کرنا ضروری ہے

آگے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ ''مگر مادہ پر مواخذہ نہیں''۔ یعنی دل میں جو غیراختیاری خیال پیدا ہوا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت نہیں، اگر اس کے مقتضیٰ پر عمل کیا جائے تو مواخذہ ہے۔ یعنی دل میں حسد کا خیال آنے کے بعد کوئی ایسا بدخواہی کا عمل کرنا جس سے اس کو تکلیف پہنچے، اس کو رنج اور صدمہ پہنچے تو اس پر مؤاخذہ ہے۔ اور عمل اختیاری ہے اور اس سے بچنا بھی اختیاری ہے لیکن مادہ کو مضمحل کرنا ضروری ہے تاکہ بڑھ نہ جائے۔ یعنی صرف مادہ کا پیدا ہونا گناہ نہیں لیکن اس مادہ کو کمزور کرنا بڑا ضروری ہے تاکہ بڑھے نہیں۔ ''اس کی تدبیر یہی ہے کہ شرمندہ ہو اور حق تعالیٰ سے توبہ کرے،

اور اللہ تعالیٰ سے اس کے دفع ہونیکی دعا کرے اور اس شخص کی اعانت کرے خواہ مال سے یا بدن سے یا دعا سے، اس سے وہ مادہ کالعدم ہو جائے گا۔"

شیطان کی حکایت

اللہ بچائے یہ "حسد" بڑی خراب چیز ہے، خاص طور پر ہمارے اہل علم کے طبقے میں زیادہ پایا جاتا ہے، کیونکہ یہ علم ایسی چیز ہے کہ اس کے اندر ترفع کی شان ہے، اس وجہ سے دوسرے شخص کو علم میں آگے بڑھتا ہوا اور ترقی کرتا ہوا دیکھ کر اور اس کی مقبولیت دیکھ کر بعض اوقات اس کی طرف سے دل میں حسد پیدا ہو جاتا ہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک شخص نے خواب میں شیطان کو ایک بنجارے کی شکل میں دیکھا۔ "بنجارہ" اس کو کہتے ہیں جو اپنا سامانِ تجارت ایک گٹھری میں باندھ کر اور اپنے کندھے پر لاد کر گاؤں گاؤں محلّے محلّے اس سامان کو بیچتا پھرتا ہے۔ نظیر اکبر آبادی کی مشہور نظم ہے جس میں وہ یہ کہتا ہے کہ:

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا
جب لاد چلے گا بنجارہ

بہرحال! خواب میں دیکھا کہ شیطان ایک بنجارے کی طرح بہت ساری گٹھریاں اپنے کندھے پر لادے جا رہا ہے، وہ گٹھریاں بھی عجیب و غریب تھیں، کسی گٹھری میں پاخانہ بھرا ہوا ہے، کسی گٹھری میں پیشاب بھرا ہوا ہے، کسی گٹھری میں پیپ وغیرہ، ساری دنیا کی نجاستیں اس کے پاس موجود تھیں اور ہر گٹھری پر کچھ نہ کچھ لکھا ہوا ہے، کسی پر لکھا ہے "حسد" کسی پر "کینہ" کسی پر "حُبِ مال"

کسی پر ''حبِ جاہ'' وغیرہ۔

کسی شخص نے شیطان سے پوچھا کہ تم یہ لے کر کہاں جا رہے ہو؟ شیطان نے کہا کہ یہ سامانِ تجارت ہے، اس کو بیچنے جا رہا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ سب گندگی ہے، یہ کون تیرے سے خریدے گا؟ شیطان نے کہا کہ مجھے اپنے مال کی منڈیاں معلوم ہیں کہ کس منڈی میں میرا مال فروخت ہوگا، یہ ''حبِ مال'' تاجروں کے علاقے میں لے جا کر فروخت کروں گا، وہ مجھ سے یہ مال خرید لیں گے، یہ ''حبِ جاہ'' اور ''حسد'' اس کی منڈیاں علماء ہیں، جب علماء کے پاس لے جاؤں گا تو وہ اس کو ہاتھوں ہاتھ خرید لیں گے۔ العیاذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

عِلم سے حب جاہ اور حسد پیدا ہو جاتا ہے

بہرحال! اگر علم کے ساتھ اخلاص نہ ہو تو اس علم کے نتیجے میں ''حُبّ جاہ'' پیدا ہوتی ہے اور حبّ جاہ'' کے نتیجے میں ''حسد'' پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ جب دوسرے کو علم کے اندر آگے بڑھتا ہوا دیکھے گا تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ یہ مجھ سے کیوں آگے بڑھ گیا؟ اس کی شہرت کیوں زیادہ ہوگئی؟ اس کی طرف لوگوں کا رجوع کیوں زیادہ ہونے لگا؟ اگر علم کے ساتھ اخلاص ہو کہ وہ علم اللہ تعالیٰ کے لئے ہو تو پھر ''حسد'' اور ''حب جاہ'' پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا، بلکہ کوئی دوسرا علم کے اندر آگے بڑھ جائے گا تو خوشی پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے اخلاص عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلویؒ کا اخلاص

حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے آمین۔ یہ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے اور دونوں کو آپس میں ایک دوسرے سے بڑی محبت تھی اور اس درجے کی محبت تھی کہ حضرت والد صاحب کی ہر کتاب کے دو نسخے رکھا کرتے تھے، اور چونکہ تصنیف و تالیف کا سلسلہ بھی تھا، اس لئے حضرت والد صاحبؒ اپنی کتاب کا جو نام رکھتے تھے، وہ بھی اپنی کتاب کا وہی نام رکھتے تھے، چنانچہ والد صاحب نے قرآن کریم کی تفسیر لکھی اور اس کا نام "معارف القرآن" رکھا، انہوں نے بھی قرآن کریم کی تفسیر لکھی اور اس کا نام بھی "معارف القرآن" رکھدیا، حضرت والد صاحبؒ نے ایک کتاب "دعاوی مرزا" کے نام سے لکھی، انہوں نے بھی ایک کتاب "دعاوی مرزا" کے نام سے لکھی، کئی کتابیں ایک ہی نام کی لکھیں۔

حسد کی وجہ سے تعلقات کی خرابی

لاہور میں قیام تھا، ایک مرتبہ میں لاہور گیا اور ان سے ملاقات کے لئے پہنچا تو مجھ سے فرمایا کہ "مولوی شفیع" سے میرا سلام کہیو"۔ لفظ "مولوی" سے آگے مولانا کا لفظ کبھی نہیں بولتے تھے، پھر فرمانے لگے کہ مولوی شفیع سے ہمارا باون سال کا تعلق ہے اور الحمد للہ اس باون سالہ تعلق کے دوران کبھی دل میں ایک دوسرے کے خلاف بال بھی نہیں آیا" پھر فرمانے لگے کہ یہ بتاؤں کہ ایک

دوسرے کے خلاف بال بھی کیوں نہیں آیا؟ فرمایا کہ بال اس لئے نہیں آیا کہ مولویوں کے درمیان جو تعلّقات خراب ہوتے ہیں، اس کی وجہ ''حسد'' ہوتی ہے کہ فلاں ہم سے آگے کیوں نکل گیا؟ اس حسد کی وجہ سے کدورتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں تعلّقات خراب ہوتے ہیں، الحمدللہ! میرا مولوی شفیع سے اس قسم کا حسد کبھی ہوا ہی نہیں۔

بے مثال دوستی کا نمونہ

پھر فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤں کہ ہمارے درمیان ''حسد'' کیوں نہیں ہوا؟ میں نے کہا بتا دیں، فرمایا کہ تم نے ''کافیہ'' پڑھا؟ میں نے کہا جی ہاں! پڑھا، فرمایا کہ اس میں توابع کا بیان آتا ہے، وہ تم نے پڑھا؟ میں نے کہا جی ہاں! پڑھا، فرمایا کہ اس توابع میں ایک نعت ہوتی ہے، وہ پڑھی؟ میں نے کہا کہ جی ہاں! پڑھی، فرمایا کہ نعت کی دو قسمیں ہوتی ہیں، ایک متبوع کی نعت اور ایک متعلق متبوع کی نعت، مثلاً اگر ''زیدنِ العالم'' کہو تو ''عالم'' زید کی نعت اور اس کی صفت ہے، اور کبھی متعلق متبوع کی نعت ہوتی ہے، جیسے ''زیدنِ العالم غلامہ'' اس میں ''عالم'' اگرچہ اصلاً غلام کی نعت ہے، لیکن جب ترکیب کرو گے تو یوں کہو گے ''زید'' موصوف ''العالم غلامہ'' صفت، حالانکہ ''العالم'' زید کی صفت نہیں ہے بلکہ اس کے متعلق یعنی غلام کی صفت ہے، مگر پھر بھی ترکیب میں اس کو ''زید'' ہی کی صفت کہا جاتا ہے۔

یہ ساری تفصیل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ مولوی صاحب! جب

مولوی شفیع کا کوئی علمی کارنامہ میرے سامنے آوے تو میں یوں سمجھوں کہ میں "زیدن العالم اخوہ" کی قبیل سے ہوں اور جو تصنیف انہوں نے کی ہے، وہ حقیقت میں تو ان کی ہے لیکن ان کے واسطے سے میری بھی ہے، اس وجہ سے ہمارے درمیان طویل عرصے کی دوستی کے باوجود کبھی دل میں حسد پیدا نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ یہ جذبہ ہم سب کو عطا فرمادے، آمین۔

علم کے ساتھ اخلاص اور خادمیت کا جذبہ

لہٰذا علم کے اندر اخلاص ہونا چاہئے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے علم حاصل کرنا چاہئے، یہ علم اس لئے نہیں ہے کہ اس کے ذریعے دوسروں پر فضیلت جتائی جائے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیا خوبصورت بات ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ کیا یہ علم اللہ تعالیٰ نے دوسروں پر جتلانے کے لئے دیا ہے؟ ارے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایک نعمت دی ہے، اس نعمت کو صحیح مصرف پر استعمال کرو، اس علم کا صحیح مصرف یہ ہے کہ اس علم کے ذریعہ دوسروں کو نفع پہنچاؤ اور اس کے ذریعہ دوسروں کی خدمت کرو، تم خادم ہو اور دوسری مخلوق مخدوم ہے، علم کے ساتھ یہی خدمت کا جذبہ انسان کے اندر پیدا ہونا چاہئے، نہ یہ کہ اس کے ذریعہ دوسروں پر اپنی فضیلت جتائی جائے۔

پھر حسد پیدا نہیں ہوگا

اور جب یہ اخلاص پیدا ہو جائے گا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کوئی دوسرا شخص علم کے اندر تم سے آگے بڑھتا نظر آئے گا اور اس کے ذریعہ لوگوں کو

فائدہ پہنچتا نظر آئے گا تو تم یہی سمجھو گے کہ میرا ہی مقصد حاصل ہو رہا ہے، لہٰذا اس پر خوش ہونا چاہئے، نہ یہ کہ اس پر رنجیدہ ہوں۔

شہرت خراب چیز ہے

یہ ''شہرت اور حبِّ جاہ اور مقبولیت'' دین کے اعتبار سے تو یہ خراب چیز ہے، حقیقت یہ ہے کہ دنیا کی راحت کے اعتبار سے بھی بڑی خراب چیز ہے، اس کے نتیجے میں آدمی کسی کام کا نہیں رہتا، آدمی ایسی فضول چیز کو حاصل کرنے کی طرف کیوں توجہ کرے اور اس کی وجہ سے دوسروں سے کیوں حسد کرے۔ ارے بھائی! اگر لوگ تمہارے مقابلے میں دوسروں کی طرف زیادہ متوجہ ہو رہے ہیں تو تمہیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تمہارا کام آدھے سے زیادہ دوسرا انجام دے رہا ہے، اسلئے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، نہ یہ کہ اس سے حسد کرنے بیٹھ جاؤ۔

خلاصہ

بہرحال! اگر دل میں یہ اخلاص رہے تو پھر حسد کی جڑ کٹ جاتی ہے، اور اس حسد سے بچنے کا بڑا ذریعہ یہ ہے کہ ہر عمل میں اخلاص پیدا کرو، جوں جوں اخلاص پیدا ہوگا، انشاء اللہ یہ حسد زائل ہوگا، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۵۷

کینہ اور بُغض اور اس کا علاج

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۴

مجلس نمبر ۵۷

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ط

مجلس نمبر ۵۷

کینہ اور بُغض اور اس کا علاج

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِيۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَ نُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَأَشۡهَدُاَنۡ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا ۔

أَمَّا بَعۡدُ!

گزشتہ دو روز سے ''حسد'' کا بیان چل رہا تھا، الحمدللہ وہ مکمل ہوگیا۔

آگے حضرت والا ایک اور باطنی بیماری حقد یعنی کینہ کا بیان شروع فرمارہے ہیں۔

کینہ رکھنے پر وعید

یہ "کینہ" بھی انسان کے دل کی ایک بہت بڑی بیماری ہے، یہ اتنی بڑی بیماری ہے کہ ایک حدیث میں حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

> شب برأت میں اللہ تعالیٰ بے شمار انسانوں کی مغفرت فرماتے ہیں اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے جسم پر جتنے بال ہیں، ان بالوں کی مقدار کے برابر انسانوں کی مغفرت فرماتے ہیں۔

"قبیلہ بنی کلب" بہت بڑا قبیلہ تھا جو ہزارہا افراد پر مشتمل تھا اور ہر شخص کے پاس بکریوں کے ریوڑ تھے، ان کی بکریاں بھی ہزاروں بلکہ لاکھوں کی مقدار میں ہوں گی، آپ نے فرمایا کہ اس قبیلے کی بکریوں کے جسم پر جتنے بال ہیں، اتنے انسانوں کی مغفرت اللہ تعالیٰ اس رات میں فرماتے ہیں لیکن دو آدمیوں کی مغفرت نہیں فرماتے۔

پاجامہ نیچے لٹکانا

دیکھئے! رحمت کا دروازہ اس رات میں کھلا ہوا ہے، رحمت کے پروانے تقسیم ہورہے ہیں، لیکن اس رات میں دو آدمیوں کی مغفرت نہیں ہوتی، ایک

وہ شخص جس کی شلوار یا پاجامہ یا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹکا ہوا ہو۔ العیاذ باللہ۔ کیونکہ یہ تکبر کی علامت ہے اور جو آدمی اس رات میں بھی تکبر سے باز نہ آئے، اللہ تعالیٰ کے سامنے عاجزی کرنے اور گڑگڑانے کے بجائے تکبر کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو ہماری مغفرت کی ضرورت نہیں، اس لئے ہم اس کی مغفرت نہیں کرتے۔

کینہ رکھنا

دوسرا وہ شخص جس کے دل میں دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ ہو، بغض ہو، اللہ تعالیٰ اس کی بھی مغفرت نہیں فرماتے، چاہے وہ نمازیں پڑھ رہا ہو، چاہے وہ سجدے کر رہا ہو، چاہے وہ روزے رکھ رہا ہو یا رات کو جاگ رہا ہو، شب برأت اور شب قدر میں بھی اس کی مغفرت نہیں ہوتی۔ یہ کینہ اور بغض اتنی خراب چیز ہے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے خزانے لٹ رہے ہیں، اس وقت بھی یہ شخص محروم ہے جس کے دل میں کینہ ہے، اس لئے اس سے ڈرنا چاہئے اور اس کی فکر کرنی چاہئے کہ کسی مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ نہ ہو۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ ؂

کفر است در طریقتِ ما کینہ داشتن
آئین ما است سینہ چوں آئینہ داشتن

ہمارے طریقے میں دوسرے مسلمان کی طرف سے دل میں کینہ رکھنا کفر ہے، اور ہمارا طریقہ یہ ہے کہ ہمارا سینہ آئینہ کی طرح صاف شفاف ہو، اس میں کسی دوسرے مسلمان کی طرف سے کینہ نہ ہو۔

''کینہ'' کسے کہتے ہیں؟

''کینہ'' کیا ہے؟ اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''کینہ'' وہ ہے جو اختیار و قصد سے کسی کی بُرائی اور بدخواہی دل میں رکھی جائے اور اس کو ایذاء پہنچانے کی تدبیر بھی کرے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷۴)

اپنے اختیار سے کسی شخص کی بدخواہی دل میں پال لی اور اس کی تدبیر بھی کر رہا ہے کہ اس کو تکلیف پہنچے، اس کا نقصان ہو اور اس کے درپے آزار ہو جائے۔ اس کو ''کینہ'' کہا جاتا ہے۔

کینہ کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

یہ ''کینہ'' اکثر اس طرح پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص سے آپ کو کوئی رنج یا کوئی تکلیف پہنچی، اس رنج اور تکلیف پہنچنے کے نتیجے میں آپ کو اس پر غصہ آیا اور دل چاہ رہا ہے کہ میں بھی اس کو کوئی رنج اور تکلیف پہنچاؤں، لیکن جس شخص نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہے وہ ایسا آدمی ہے کہ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، کیونکہ وہ یا تو عمر میں تم سے بڑا ہے یا مرتبے میں تم سے بڑا ہے اور تمہارا اس کے اوپر بس نہیں چلتا، اور بس نہ چلنے کی وجہ سے تم اس سے انتقام نہیں لے سکتے اور تمہارے پاس انتقام لینے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ لہٰذا ایک طرف تو غصہ

آ رہا ہے اور طبیعت میں اس کے خلاف اوٹن ہو رہی ہے اور اس کے خلاف دل میں جذبات پیدا ہو رہے ہیں اور دوسری طرف ان جذبات کے نکلنے کا کوئی راستہ بھی نہیں ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دل کے اندر گھٹن پیدا ہو رہی ہے، وہ گھٹن انسان کے اندر ''کینہ'' پیدا کر دیتی ہے۔ چنانچہ وہ سوچتا ہے کہ اس وقت تو مجھے بدلہ لینے کا موقع نہیں ہے، لیکن جب کبھی موقع ملا تو میں اس کو چھوڑوں گا نہیں، یہ کینہ ہے۔

یہ خیال گناہ نہیں

اور اگر دل میں اتنا خیال ہو کہ جب مجھے موقع ملے گا تو جتنی تکلیف اس نے پہنچائی تھی، میں بھی اتنی تکلیف پہنچا دوں گا، تو یہ گناہ کی بات نہیں، کیونکہ شریعت نے یہ حق دیا ہے کہ اگر کس دوسرے شخص نے تمہیں تکلیف پہنچائی ہے تو تم بھی اس کو اتنی ہی تکلیف پہنچا سکتے ہو۔

غصہ میں انسان حد پر نہیں رہتا

لیکن یہ غصہ اور یہ گھٹن انسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کر دیتی ہے کہ اگر میرا قابو چل گیا تو اس نے جتنی تکلیف مجھے پہنچائی ہے، اس سے دس گنی تکلیف میں اس کو پہنچاؤں گا، کیونکہ جو آدمی حدود کا پابند نہیں ہوتا، وہ کبھی حد پر نہیں رہتا۔ جو لوگ آپس میں گالی گلوچ کرتے ہیں، ان کا طریقہ یہ ہے کہ جب ایک نے یہ گالی دی کہ تو احمق اور بے وقوف ہے تو دوسرا جواب میں فوراً یہ کہے گا کہ تو بے وقوف، تیرا باپ بے وقوف، تیرا دادا بے وقوف، وہ کبھی ایک پر

اکتفا نہیں کرے گا بلکہ باپ دادا تک پہنچ جائے گا۔ جس شخص کے اخلاق کا تزکیہ نہ ہوا ہو، وہ کبھی حد پر قائم نہیں رہتا۔ جیسا کہ عربی کا مقولہ ہے:

الجاهل إمّا مفرِط أو مفرّط

جاہل کا جذبہ صرف ایک مرتبہ ''بیوقوف'' کہہ دینے سے ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ اور آگے بڑھتا ہے۔ اسی طرح جب دوسرے کو تکلیف پہنچانے کا موقع آ جائے تو اس میں حد پر نہیں رہے گا، مثلاً کسی نے اس کو ایک ہاتھ مارا تو وہ جواب میں دو ہاتھ مار دے گا۔

انتقام لینے کا جذبہ کینہ ہے

لہٰذا جب آگے بڑھنے کا جذبہ موجود ہے تو وہ دل میں یہ ٹھانے ہوئے ہے کہ جب کبھی انتقام کا موقع ملے گا تو اس کو چھوڑوں گا نہیں، یہ بدخواہی جو دل میں پیدا ہو رہی ہے، اسی کا نام ''کینہ'' اور ''بغض'' ہے، اس ''کینہ'' کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جہاں اس کو تکلیف پہنچانے کا موقع ہوگا تو اس کو تکلیف پہنچا دے گا، جہاں بدنام کرنے کا موقع آئے گا وہاں بدنام کر دے گا، جہاں اس کی غیبت کرنے کا موقع ملے گا، تو اس کی غیبت کر دے گا جہاں زبان سے اس کی دل آزاری کا موقع ملے گا تو زبان سے دل آزاری کرے گا، طنز و طعنہ کے تیر اس کے اوپر برسائے گا، ان سب کاموں کا سبب بُغض اور کینہ ہے، اس کینہ اور بغض کا ازالہ ضروری ہے۔

انسان کے پاس ترازو نہیں

دیکھئے! اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حق دیا ہے کہ جس شخص نے آپ کو جان

بوجھ کر تکلیف پہنچائی ہے تو آپ اس سے انتقام لے سکتے ہیں، مگر اتنا ہی انتقام لے سکتے ہیں جتنی تکلیف اس نے پہنچائی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ یہ حد مقرر ہے، اس سے آگے بڑھنا جائز نہیں، لیکن یہ کیسے پتہ چلے کہ کس موقع پر انسان سرحد پار کر گیا؟ اس لئے کہ انسان کے اپنے پاس ایسا کوئی ترازو نہیں ہے جس سے وہ یہ پتہ چلائے کہ میں کس موقع پر حد پر قائم رہا اور کس موقع پر حد سے آگے بڑھ گیا، کہاں میں نفسانی جذبے کو ٹھنڈا کرنے کے لئے انتقام لے رہا ہوں اور کہاں میں اللہ کیلئے بدلہ لے رہا ہوں، اس کا پتہ نہیں چلتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا سبق آموز واقعہ

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک یہودی نے ان کے سامنے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کا کلمہ کہہ دیا۔ العیاذ باللہ۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہاں برداشت کرنے والے تھے، انہوں نے اس کو پکڑ کر زمین پر گرایا اور اس کے سینے پر سوار ہو گئے، جب یہودی نے دیکھا کہ اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو اس نے نیچے پڑے پڑے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا، جب یہودی نے تھوکا تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو چھوڑ کر کھڑے ہو گئے، لوگوں نے کہا کہ اب تو اور زیادہ سزا دیے جانے کے لائق تھا اور آپ نے اس کو چھوڑ دیا؟ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اب تک تو میں اس سے اس لئے لڑ رہا تھا کہ اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تھی، لہٰذا میری اس کے ساتھ جو لڑائی تھی، وہ اپنی ذات کے لئے نہیں تھی بلکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تھی، لیکن جب اس نے میرے منہ پر تھوک دیا تو مجھے غصہ

آیا اور اس سے انتقام لینے کا جذبہ پیدا ہوا، لہٰذا اب اگر میں اس سے انتقام لیتا تو اپنی ذات کے لئے انتقام لیتا اور اپنی ذات کے لئے میں انتقام لینا نہیں چاہتا۔

صحابہ کرامؓ تزکیہ شدہ تھے

یہ تھے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یُزَکِّیھِمْ" یعنی اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے تزکیہ کے لئے بھیجا تھا۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا ایسا تزکیہ کیا جیسا کہ آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے واقعہ میں دیکھا۔

بہرحال! آدمی جب دوسرے سے انتقام لیتا ہے تو عام طور پر حد پر نہیں رہتا بلکہ حد سے آگے بڑھ جاتا ہے، اور اگر انتقام نہ لے سکا تو اس کے نتیجے میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ آمین۔ یہ کینہ بڑی خطرناک بیماری ہے۔

"کینہ" کا علاج

اس کا علاج بھی وہی ہے جو حسد کا علاج ہے یعنی اپنے نفس پر جبر کر کے لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو اور اس کے حق میں دعاء خیر کرو کہ یا اللہ! دنیا و آخرت میں اس کے درجات بلند فرما، یا اللہ یہ شخص جس کی طرف سے میرے دل میں بُرائی کے پہاڑ کھڑے ہوئے ہیں، اس کو دنیا میں بھی ترقی عطا فرما اور آخرت میں بھی ترقی عطا فرما۔ اس طرح کرنے کے نتیجے میں سینے پر سانپ لوٹ جائیں گے، کیونکہ دل میں اس کی طرف سے کینہ، بغض اور

بدخواہی ہے اور دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ اس کا منہ نوچ ڈالوں، لیکن زبان سے اس کی تعریف کر رہے ہو اور اس کے لئے دعا کر رہے ہو کہ یا اللہ! اس کے درجات بلند فرما۔ لیکن اس بیماری کا علاج بھی یہی ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَمَا يُلَقّٰهَا اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ (حم سجدہ، آیت ۳۵)

یعنی یہ کام وہی کرسکتا ہے جس نے اپنے آپ کو صبر کا عادی بنایا ہو اور یہ کام وہی کرسکتا ہے جو بڑا صاحب نصیب ہو۔ اس کے ذریعہ خوشخبری دے دی کہ جو شخص یہ کام کرے گا وہ بڑا صاحب نصیب ہوگا۔

جنّت کے لئے قربانی دینی پڑتی ہے

بھائی! جنّت اس قدر سستی نہیں ہے، اس کے لئے تھوڑی سی قربانی دینی پڑتی ہے۔ بعض اوقات جان کی قربانی دینی پڑتی ہے، بعض اوقات مال کی قربانی دینی پڑتی ہے اور بعض اوقات جذبات کی قربانی دینی پڑتی ہے اور جذبات کی قربانی بعض اوقات جان و مال کی قربانی سے زیادہ سخت ہوتی ہے، لیکن یہ جذبات کی قربانی اللہ تعالیٰ کے لئے دینی پڑتی ہے، بقول کسی کے:

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

لہٰذا جس آدمی کی طرف سے دل میں نفرت پیدا ہو رہی تھی، اسی کے حق میں دعا کی اور جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتے ہیں کہ میرے بندے نے میری خاطر یہ کام کیا،

اس نے میری خاطر اپنی نفسانی خواہشات کو کچلا، اپنے جذبات کو قربان کیا اور اپنے دل کی آرزوؤں اور تمناؤں کو خون کیا تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو بلند مقامات تک پہنچا دیتے ہیں۔

اس کے اندر اچھائی تلاش کرو

بہر حال! پہلا کام یہ کرو کہ تمہارے دل میں اس کی طرف سے جو بُرائی آ رہی ہے، اس کو بُرا سمجھو کہ میرے دل میں جو بات آ رہی ہے، وہ اچھی نہیں ہے، ایسا نہیں ہونا چاہئے۔ اور اس بُرے خیال کو دور کرنے کا ایک طریقہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا:

لایفرك مؤمنٌ مؤمنة اِن کرہ منها خلقا رضی منها آخر۔

(مسلم، کتاب الرضاع باب الوصیة بالنساء)

یعنی کوئی مومن مرد کسی مؤمنہ عورت کے ساتھ بغض نہ رکھے۔ دراصل یہ میاں بیوی کے تعلقات کے بارے میں ارشاد ہے کہ کوئی شوہر اپنی بیوی سے بغض نہ رکھے، کیونکہ اگر اس کی کوئی بات ناپسندیدہ ہے تو اس کی کوئی بات پسندیدہ بھی ہوگی۔

اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بغض دور کرنے کا طریقہ بتادیا کہ جس شخص کی طرف سے دل میں بغض پیدا ہو رہا ہے، اس کی اچھائیوں کی طرف نگاہ کرو اور اس کی اچھائیاں سوچ سوچ کر یاد کرو، یعنی یہ سوچو کہ میرے دل میں اس کی طرف سے جو بغض پیدا ہو رہا ہے، وہ اس کے

فلاں وصف کی وجہ سے ہو رہا ہے، لیکن اس کے اندر صرف یہی ایک وصف نہیں ہے بلکہ اس کے اندر تو اور بہت سے اچھے اوصاف بھی ہیں، پھر ان اچھے اوصاف کو یاد کرو، اس کے نتیجے میں اس بغض میں کمی آئے گی۔

کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

یاد رکھئے! دنیا میں کوئی بھی آدمی ایسا نہیں ہے جس کے اندر کوئی نہ کوئی اچھائی نہ ہو، اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں جو چیزیں بنائی ہیں، ان میں نہ کوئی سراپا سیاہ ہے اور نہ کوئی سراپا سفید ہے بلکہ ہر ایک میں کچھ عیوب بھی ہیں اور کچھ اچھائیاں بھی ہیں، کائنات میں یہی نظام چل رہا ہے۔

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

لہٰذا ایک کام یہ کرو کہ جن عیوب کی وجہ سے تمہارے دل میں کسی کی طرف سے بغض اور کینہ پیدا ہوا ہے، ان عیوب کو تھوڑی دیر کے لئے فراموش کردو اور ان اچھائیوں کی طرف نگاہ کرو جو اس کے اندر موجود ہیں۔

کینہ سے متعلق وعیدوں کی طرف نظر کرو

دوسرا کام یہ کرو کہ اس بغض اور کینہ رکھنے پر قرآن و حدیث میں جو وعیدیں آئی ہیں، مثلاً یہ کہ شب برأت میں بھی اس شخص کی مغفرت نہیں ہوگی جس کے دل میں دوسرے کی طرف سے بغض اور کینہ ہوگا، وغیرہ، ان وعیدوں کی طرف نظر کرو۔ پھر عمل میں اس بات کا اہتمام کرو کہ اس شخص کے خلاف کوئی

کلمہ زبان سے نہ نکلے اور کوئی قدم عملاً اس کے خلاف نہ اٹھے اور اس کے حق میں دعاء خیر کرو اور لوگوں کے سامنے اس کی تعریف کرو۔

یہ بات بغض میں داخل نہیں

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہئے کہ بعض اوقات دل میں دوسرے کی طرف سے بغض اور کینہ نہیں ہوتا لیکن لوگ اس کو بغض سمجھ لیتے ہیں، بات یہ ہے کہ ''بغض'' اس وقت متحقق ہوتا ہے جب انسان دوسرے کی بدخواہی پر کمربستہ ہو جائے اور جان بوجھ کر اس کو تکلیف پہنچانے کی فکر میں لگ جائے اور تکلیف بھی پہنچائے، تب تو اس کو ''بغض'' کہیں گے۔ لیکن اگر صرف یہ بات ہے کہ اس آدمی سے ملنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے اور اس سے طبیعت نہیں ملتی ہے اور اس کے گھر ملاقات کرنے کے لئے جانے کو دل نہیں چاہتا تو یہ ''بغض'' نہیں بلکہ یہ طبیعت کا نہ ملنا ہے اور عدم مناسبت ہے۔ لہٰذا اگر کسی سے ملنے کو دل نہیں چاہتا تو نہ ملو، البتہ اس کے جو حقوق واجب ہیں، وہ ادا کرتے رہو، مثلاً جب سلام کرنے کا موقع آئے تو اس کو سلام کرو، وہ اگر سلام کرے تو اس کا جواب دو، اگر بیمار ہو جائے تو اس کی بیمار پرسی کرلو، اگر اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے جنازے میں شریک ہو جاؤ، اگر اس کے یہاں کوئی شادی یا غمی ہو تو اس میں شریک ہو جاؤ، بس، یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس سے میل جول رکھا جائے اور صبح شام اس کے ساتھ مجلسیں جمائی جائیں اور ہنسی مذاق کیا جائے، یہ سب فضول باتیں ہیں، ان کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن یہ بات ضروری ہے کہ اس کی بدخواہی نہ ہو۔

انقباض طبعی کینہ نہیں

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں بیان فرما رہے ہیں کہ:

> اگر کسی سے رنج کی کوئی بات پیش آئے اور طبیعت اس سے ملنے کو نہ چاہے تو یہ کینہ نہیں بلکہ انقباض طبعی ہے جو گناہ نہیں۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۴)

یعنی انسانی طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں، مزاج الگ ہوتے ہیں، ایک آدمی کا مزاج دوسرے سے نہیں ملتا تو یہ کوئی فرض نہیں کہ دوسرے سے ضرور ملا جائے، اس لئے یہ بغض اور کینہ نہیں۔

دوسرے کے نقصان سے دل میں فرحت

دیکھئے! جو لوگ اپنے شیخ سے اصلاح کراتے ہیں، وہ لوگ اپنے حالات اپنے شیخ کو لکھتے رہتے ہیں کہ میرے ساتھ اس قسم کی بات پیش آرہی ہے، یہ کوئی بیماری ہے یا نہیں؟ اگر یہ بیماری ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟ شیخ سے یہی باتیں معلوم کی جاتی ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ:

> اپنے مخالف کو کوئی نقصان کسی سے پہنچ جاتا ہے تو قلب میں ایک فرحت محسوس ہوتی ہے۔
>
> (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۵)

یہ ہے شیخ سے اصلاح کرانے کا طریقہ کہ جو حالات دل پر گزر رہے ہیں، ان کی اطلاع شیخ کو کی جائے، چنانچہ ان صاحب نے یہ محسوس کیا کہ جب میرے مخالف کو کوئی نقصان پہنچ جاتا ہے، مثلاً اس کے گھر میں آگ لگ گئی یا اس کے گھر میں چوری ہوگئی یا اس کی بدنامی ہوگئی تو اس سے دل میں ایک فرحت اور خوشی محسوس ہوتی ہے، آپ بتائیں کہ یہ فرحت ہونا گناہ ہے یا نہیں؟ اگر یہ گناہ اور بیماری ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟

یہ فرحت قابل دفع ہے

جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ:

عقلاً اور اعتقاداً اس کا استحضار کیا جائے کہ یہ فرحت قابل دفع ہے اور دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس فرحت کو دفع فرمادیں۔ (ایضاً)

حضرت والا کا ایک ایک لفظ ٹکا ہوا ہوتا ہے، فرمایا کہ ایک کام تو یہ کرو کہ تمہیں دوسرے کے نقصان سے جو فرحت ہو رہی ہے، عقلاً اور اعتقاداً اس بات کا دھیان کرو کہ دل میں اس خوشی کا پیدا ہونا اچھی بات نہیں بلکہ بُری بات ہے۔ ''عقلاً'' اور ''اعتقاداً'' کے الفاظ اس لئے بیان فرمائے کہ ''طبعاً'' جو خوشی ہو رہی ہے وہ غیر اختیاری ہے، وہ انسان کے اختیار میں نہیں، اور غیر اختیاری پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ نہیں، لیکن عقلی اور اعتقادی طور پر یہ سمجھے اور اس کا دھیان کرے کہ مجھے یہ جو خوشی ہو رہی ہے، یہ بہت بُری ہے، مجھے یہ خوشی نہیں ہونی چاہئے، یہ خوشی قابل دفع ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہئے۔ دوسرا

کام یہ کرو کہ دعا کرو کہ یا اللہ تعالیٰ! یہ خوشی بُری بات ہے، سچی بات یہ ہے کہ مجھے یہ خوشی ہونی نہیں چاہئے تھی لیکن اے اللہ! میرے قابو سے باہر ہے، اپنی رحمت سے میری یہ خوشی دور فرمادے۔

غیر اختیاری خیال گناہ نہیں لیکن بُرا ہے

دیکھئے! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے دل میں یہ جو خوشی پیدا ہو رہی ہے، یہ بہت بڑا گناہ ہے، کیونکہ غیر اختیاری طور پر انسان کے دل میں جو خیال آجاتا ہے، وہ گناہ نہیں ہوتا، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پکڑ نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہ اختیار سے باہر ہے، لیکن اگر اس نے اس خیال کو دل میں جمالیا اور بٹھالیا اور اس کے بارے میں یہ تصور نہ کیا کہ یہ گناہ ہے اور یہ خیال دل میں بیٹھ کر کینہ میں تبدیل ہو جائے گا اور اس کے نتیجے میں تم سے گناہ سرزد ہو جائیں گے، پھر غیبت ہوگی، دل آزاری ہوگی اور بدگوئی ہوگی۔ لہٰذا اس خیال کا علاج یہ کرو کہ دل سے اس کو بُرا سمجھو کہ یہ خیال جو میرے دل میں آرہا ہے، یہ بہت بُرا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! میرے دل سے یہ خیال نکال دیجئے۔ یہ دو کام تو فوراً کرلو اور اس بات کا اہتمام کرلو کہ اس خیال کے نتیجے میں اس کے خلاف کوئی عمل نہ ہو۔

تکلیف پہنچنے کو اپنی بدعملی کا نتیجہ سمجھنا

ایک صاحب نے حضرت کو خط میں لکھا کہ:

آرزو ہے کہ مخالف کی مخالفت کو اپنی حرکات ناشائستہ و

اعمال سیئہ کا نتیجہ سمجھوں۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۵)

کینہ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کوئی مخالف کوئی تکلیف پہنچائے، اس لئے وہ صاحب یہ لکھتے ہیں کہ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری طبیعت ایسی بنا دے کہ جب بھی کسی شخص سے کوئی تکلیف پہنچے تو میرے دل میں اس کے خلاف جزبات پیدا ہونے کے بجائے میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ میاں! دنیا میں جو تکلیف کسی انسان کو پہنچتی ہے، وہ اس کی بدعملی کی وجہ سے پہنچتی ہے، قرآن کریم میں ہے کہ:

وما اصابکُم مِنْ مُصِیبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ۔ (الشوریٰ: ۳۰)

یعنی جو تکلیف اور مصیبت تمہیں پہنچتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے پہنچتی ہے۔ جب یہ بات ہے تو اب اگر دوسرا شخص مجھے برا بھلا کہہ رہا ہے یا دوسرا شخص مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے تو درحقیقت وہ تکلیف بھی میری کسی بدعملی کی وجہ سے پہنچی ہے، اگر میں برا عمل نہ کرتا تو یہ آدمی مجھے یہ تکلیف نہ پہنچاتا، چاہے وہ تکلیف کسی انسان سے پہنچے یا کسی جانور سے پہنچے یا زید عمر بکر سے پہنچے، وہ تکلیف میرے کسی بدعمل کا نتیجہ ہے، اسی طرح اگر کوئی شخص مجھے مار رہا ہے تو حقیقت میں وہ مجھے نہیں مار رہا ہے بلکہ میرے کسی برے عمل کی وجہ سے مجھے مارا جا رہا ہے۔

جلّاد بادشاہ کے حکم کا تابع ہے

اگر بادشاہ جلّاد کو حکم دے کہ فلاں شخص کو سو کوڑے مارو تو اب بظاہر تو وہ

جلاد مار رہا ہے لیکن حقیقت میں تو بادشاہ کے حکم کی وجہ سے مار رہا ہے۔ لہٰذا جس شخص کو کوڑے مارے جا رہے ہیں، اس کے دل میں یہ بات ہوگی کہ میرا اصل دشمن یہ جلاد نہیں بلکہ بادشاہ ہے، اس لئے اگر کبھی یہ شخص انتقام لینے کا ارادہ کرے گا تو جلاد سے انتقام نہیں لے گا، کیونکہ جب بادشاہ نے مارنے کا حکم دیدیا تو اب جلاد کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ مارنے سے رک جاتا، اس کو تو حکم کے مطابق عمل کرنا تھا، اس کی تو یہ ڈیوٹی تھی۔

"تقدیر" اس سے یہ کرا رہی ہے

لہٰذا اگر دل میں یہ بات آ جائے کہ یہ شخص جو مجھے تکلیف پہنچا رہا ہے، اس کی کیا مجال تھی کہ مجھے تکلیف پہنچاتا، یہ تو درحقیقت "تقدیر" اس سے یہ عمل کروا رہی ہے، اور تقدیر اس لئے کروا رہی ہے کہ میں نے کوئی برا عمل کیا تھا، اس کی سزا مجھے دنیا میں مل رہی ہے، لہٰذا میں تکلیف پہنچانے والے کو کیوں بُرا سمجھوں۔ جب یہ بات دل میں ہوگی تو پھر دوسرے کی طرف سے بُرائی اور کینہ دل میں نہیں آئے گا۔

یہ سوچنا اختیاری ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں تحریر فرمایا:

اس کا استحضار اختیاری ہے، تکرار استحضار سے اس میں رسوخ ہو جائے گا۔ (ایضاً)

یعنی اس بات کا دل میں دھیان کرتے رہنا کہ مجھے جو کچھ تکلیف پہنچ رہی ہے،

وہ میرے بُرے اعمال کی وجہ سے پہنچ رہی ہے، یہ دھیان کرنا انسان کے اختیار میں ہے اور تکرار استحضار سے اس میں رسوخ ہو جائے گا، یعنی بار بار جب یہ دھیان کرے گا تو رفتہ رفتہ یہ بات دل میں پیوست ہو جائے گی۔

حضرت ذوالنّون مصریؒ کا واقعہ

حضرت ذوالنّون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ ''رسالہ قشیریہ'' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ راستے میں جا رہے تھے، کوئی بے وقوف آپ کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے پیچھے پڑ گیا، اس بیوقوف کے ہاتھ میں ڈنڈا تھا، وہ اس نے حضرت ذوالنّون مصریؒ کے سر پر مارنا شروع کر دیا، اس وقت حضرت کی زبان پر پہلا جملہ جو آیا، وہ جملہ یہ تھا کہ:

اِضْرِبْ رأساً طالماعصی اللّٰہ۔

یعنی اس سر کو مارو، کیونکہ اس سر نے بہت عرصے تک اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے۔ لہٰذا جو مار پڑ رہی تھی، اس کو اپنی بدعملی کی طرف منسوب کیا۔

میں ہی سب سے زیادہ بدعمل ہوں

انہی ذوالنّون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا دوسرا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ لوگ ان کے پاس آئے اور آ کر کہا کہ حضرت! بارش نہیں ہو رہی ہے، قحط پڑا ہوا ہے، دعا فرما دیں کہ اللہ تعالیٰ اس قحط کو دور فرما دیں۔ جواب میں فرمایا کہ یہ بارش بدعملیوں کی وجہ سے نہیں ہو رہی ہے اور مجھ سے زیادہ بدعمل اس بستی میں کوئی اور نہیں، لہٰذا میں اس بستی سے نکل جاتا ہوں، شاید میرے نکلنے کے بعد اس بستی

پر اللہ تعالیٰ کی رحمت آ جائے اور بارش ہو جائے۔ اپنے آپ کو بدترین خلائق سمجھ رہے ہیں۔

یہ سب کام کسی اور کے اشارے پر ہو رہے ہیں

بہر حال! یہ بات صحیح ہے کہ کسی کی مجال نہیں ہے کہ وہ دوسرے کو نقصان پہنچائے، نہ کسی انسان کی مجال ہے، نہ کسی جانور کی یہ مجال ہے، نہ کسی جن کی یہ مجال ہے، جو کچھ ہو رہا ہے وہ کسی اور کی طرف سے ہو رہا ہے اور حکمت کی بنیاد پر ہو رہا ہے، چونکہ ہماری اور آپ کی سمجھ میں وہ حکمت نہیں آتی، اس لئے اس نقصان اور تکلیف پر واویلا کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

دنیا ہی میں پاک صاف کرنا چاہتے ہیں

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص شیر کے پنجرے میں آ جائے تو وہ شخص بے اختیار ہوگا، سوائے تسلیم و رضا کے کوئی چارہ کار نہیں ہوگا کہ تجھے کھانا ہے تو کھالے، پھاڑنا ہے تو پھاڑ لے، اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں۔ اسی طرح ہر انسان کو یہ سوچنا چاہئے کہ اس کائنات میں سب کام مالک الملک والملکوت کی تقدیر سے ہو رہا ہے، اگر کوئی تمہیں پتھر بھی مار رہا ہے تو وہ کسی کی اذن سے مار رہا ہے، کسی کی مشیت سے مار رہا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ مشیت کیوں ہوئی؟ وہ مشیت اس لئے ہوئی کہ تم نے بدعملی کی تھی، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ تمہیں دنیا ہی میں سزا دیدیں تاکہ آخرت میں عذاب نہ دینا پڑے۔ کیونکہ دو ہی راستے تھے، یا تو آخرت میں جہنم میں ڈالتے یا دنیا ہی میں سزا دیدیتے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے تم پر رحمت فرمائی کہ آخرت کے عذاب کے

بدلے دنیا میں ہی سزا دیدی تاکہ یہیں حساب کتاب صاف ہو جائے۔

یہ سوچنا کینہ کو ختم کردیگا

لہٰذا دوسرا شخص تمہیں جو تکلیف پہنچا رہا ہے، یہ کسی کی تقدیر کے تحت ہے، لہٰذا اس آدمی سے بغض اور کینہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے، اگر کینہ رکھنا ہے تو اپنی بداعمالیوں سے کینہ رکھو، اپنی بداعمالیوں سے بغض رکھو جن کی وجہ سے اس کو تمہیں تکلیف پہنچانے کا یہ حوصلہ پیدا ہوا، اگر یہ خیال کرو گے تو پھر انشاء اللہ دل میں کسی دوسرے کی طرف سے بغض اور کینہ پیدا نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۵۸

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

بیوی سے محبّت حبِّ دنیا نہیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب . بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۴
مجلس نمبر : ۵۸

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

مجلس نمبر ۵۸

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

بیوی سے محبّت حبِّ دنیا نہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

بیوی سے محبت محمود ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی سالک کے خط کے جواب میں تحریر فرمایا:

بیوی کی محبت دنیا تو ہے مگر مباح بلکہ محمود، مگر اس شرط سے کہ غافل عن الدین نہ کرے، بیوی کے ساتھ محبت کا زیادہ ہونا عین مطلوب ہے، جب تقویٰ بڑھتا ہے تو بیوی سے محبت بڑھ جاتی ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷۵)

ہر وہ چیز جو گناہ پر آمادہ کرے "دنیا" ہے

وہ دنیا جس کی قرآن وحدیث میں مذمت آئی ہے اور جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ "حبّ الدنیا رأس کل خطیئة" اور جس کے بارے میں فرمایا گیا کہ:

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

(الحدید: ۲۰)

یعنی دنیاوی زندگی دھوکہ کا سامان ہے وغیرہ، ان سب سے مراد دو صورتوں میں سے ایک ہے، ایک یہ کہ دنیا کے ساتھ ایسا تعلق ہو جائے کہ وہ تعلق انسان کو کسی گناہ پر آمادہ کر دے۔ اور گناہ کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ اپنے ذمے جو فرائض اور واجبات ہیں، ان کے ترک پر آمادہ کر دے۔

مباحات میں انہماک ''دنیا'' ہے

دوسری صورت یہ ہے کہ اگرچہ دنیا کے ساتھ تعلق نے انسان کو براہ راست گناہ پر آمادہ تو نہیں کیا لیکن مباحات میں اس درجہ تک انہماک پیدا کر دیا کہ اب صبح سے لے کر شام تک دنیا کے مباحات کے علاوہ کسی اور چیز کا خیال ہی دل میں نہیں آتا، ہر وقت وہی مباحات دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کا خیال کبھی دل میں نہیں آتا۔ اگرچہ اس دوسری صورت کو فتویٰ کے اعتبار سے گناہ اور معصیت نہیں کہہ سکتے، کیونکہ کسی معصیت کا ارتکاب ابھی تک نہیں ہوا، لیکن تجربہ یہ ہے کہ یہ انہماک بالآخر انسان کو معصیت تک لے جاتا ہے، اس لئے دنیا کے اندر ایسا انہماک بھی نہ ہونا چاہئے۔

پھر دنیا مضر نہیں

اگر دنیا کے ساتھ ساتھ مندرجہ بالا دو صورتیں نہ ہوں، یعنی نہ تو کسی معصیت کا ارتکاب ہو اور نہ دنیا کے اندر ایسا انہماک ہو کہ ہر وقت دنیا کی فکر دل و دماغ پر چھا جائے تو پھر یہ دنیا مضر ہونے کے بجائے اور زیادہ فائدہ مند ہو جاتی ہے، اور پھر وہ دنیا آخرت کا اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا زینہ بن جاتی ہے۔ لہٰذا انسان ان دو صورتوں سے بچے، پھر دنیا مضر نہیں۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

چیست دنیا از خدا غافل شدن
نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دنیا کی تعریف ہے اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جانا، یہ کپڑا، یہ سونا، یہ بیوی اور یہ بچے دنیا نہیں، اگر اللہ تعالیٰ سے اور آخرت سے غفلت ہے تو یہ دنیا مذموم ہے اور اگر یہ غفلت نہیں ہے تو پھر خواہ مال و دولت کے انبار لگے ہوئے ہوں، تب بھی وہ دنیا مذموم نہیں۔

کیا اہل دنیا سب کافر ہیں؟

ایک بزرگ کا شعر ہے کہ ؎

اہل دنیا کافرانِ مطلق اند
ہر دم اندر بق بق و در چق چق اند

اس شعر پر اشکال ہوتا ہے کہ ان بزرگ نے اہلِ دنیا کو کافر قرار دیدیا کہ یہ سب کافر ہیں اور ہر وقت دنیا کے بارے میں بق بق اور چق چق میں لگے رہتے ہیں۔

اس شعر کی ایک توجیہ تو یہ ہے کہ اہل دنیا سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے دنیا سے اتنا تعلق قائم کیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور واقعی کفر اختیار کر لیا۔

دوسری توجیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب و غریب فرمائی

ہے، فرمایا کہ اس شعر میں یہ جو کہا کہ ''اہل دنیا کافران مطلق اند'' اس میں لفظ ''اہلِ دنیا'' خبر مقدم ہے اور ''کافران مطلق اند'' مبتدا مؤخر ہے، لہٰذا اس شعر کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اہل دنیا مطلق کافر ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

''کافرانِ مطلق اہلِ دنیا ہیں''

''غفلت'' کا نام دنیا ہے

بہرحال! دنیا کی مال و دولت اور دنیا کے اسباب کا نام ''دنیا'' نہیں، بلکہ دنیا نام ہے اللہ تعالیٰ سے غفلت کا، اللہ تعالیٰ کے دین سے غفلت کا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے سے غفلت کا۔ اگر یہ غفلت نہ ہو تو پھر یہی دنیا آخرت کے لئے معین بن جاتی ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہی تو اپنے نفس کے حقوق ادا کرنے کا حکم دیا ہے، اپنی بیوی کے حقوق، اپنے بچوں کے حقوق اور ملنے جلنے والوں کے حقوق ادا کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے، اب اگر ان حقوق کی ادائیگی کی خاطر دنیا کما رہے ہو تو یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہو رہی ہے۔ لہٰذا یہ کمانا کوئی غفلت نہیں اور دنیائے مذموم نہیں، بلکہ ایسی دنیا کے بارے میں فرمایا:

وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔ (سورۃ الجمعۃ، آیت ۱۰)

یعنی اللہ تعالیٰ کا فضل تلاش کرو۔ دنیا کو ''فضل اللہ'' سے تعبیر فرمایا، کیونکہ جب انسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ حقوق کی ادائیگی کے لئے دنیا تلاش کر رہا ہے تو وہ فضل اللہ ہے، وہ دنیائے مذموم نہیں، بلکہ دین ہے اور آخرت کے

لئے معین ہے۔

بیوی سے محبّت عین دین ہے

اور حضرت والا نے یہ جو فرمایا کہ بیوی سے محبّت عین مطلوب ہے، اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَّرَحْمَةً۔

(سورۃ الروم، آیت ۲۱)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے درمیان محبّت اور شفقت پیدا فرمائی۔ لہٰذا اس محبّت کو خود اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں اس کا حکم دیا ہے، چنانچہ آپ نے فرمایا:

خیارکم خیار کم لنساء هم وانا خیار کم لنسائی۔

(ترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء فی حق المرأۃ علی زوجہا)

یعنی تم (لوگوں) میں بہتر وہ ہے جو اپنی بیویوں کے لئے بہتر ہو اور میں اپنی بیویوں کے لئے تم میں سب سے بہتر ہوں۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا:

وَاسْتَوْصُوْا بِالنِّسَاءِ خَيْرًا

(بخاری، کتاب النکاح، باب المدارۃ مع النساء)

یعنی عورتوں کے بارے میں اچھا سلوک کرنے کی وصیّت کو قبول کرلو۔ لہٰذا جب ان احکام کی تعمیل میں کوئی شخص اپنی بیوی سے محبّت کر رہا ہے تو وہ دنیا نہیں بلکہ

عین دین ہے اور مطلوب ہے۔

تقویٰ بڑھنے سے بیوی سے محبت زیادہ ہوتی ہے

لہٰذا حضرت والا نے فرمایا کہ جب انسان کے اندر تقویٰ بڑھتا ہے تو بیوی سے محبت بڑھ جاتی ہے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے حقوق میرے ذمے عائد کئے گئے ہیں، لہٰذا میں ان کو ادا کرنے کا پابند ہوں، اس لئے جب وہ اس نیت سے ان حقوق کو ادا کرے گا تو ثواب ملے گا۔

ہماری اور ان کی محبت میں فرق

اسی وجہ سے جتنے اولیاء کامل ہوتے ہیں، وہ اپنے بیوی بچوں سے محبت بھی بھرپور کرتے ہیں، اور ہم بھی اپنے بیوی بچوں سے محبت کرتے ہیں، البتہ ہم اتنی محبت نہیں کرتے جتنی محبت وہ کرتے ہیں، لیکن ہماری محبت میں اور اولیاء کرام کی محبت میں بڑا فرق ہے، اگرچہ دیکھنے میں ایک جیسی محبت معلوم ہوتی ہے کہ ہم بھی محبت کر رہے ہیں اور وہ بھی محبت کر رہے ہیں، ہم بھی بچوں سے کھیل رہے ہیں اور وہ بھی بچوں سے کھیل رہے ہیں، ہم بھی بیوی سے تعلق کا اظہار کر رہے ہیں اور وہ بھی کر رہے ہیں، لیکن حقیقت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

ان کی محبت اداء حقوق کیلئے ہے

وہ فرق یہ ہے کہ ہم لوگ دنیاوی لذّت کی وجہ سے محبت کرتے ہیں، مثلاً ہم لوگ اگر بچوں سے کھیل رہے ہیں تو اس لئے کھیل رہے ہیں کہ اس میں مزہ

آ رہا ہے، یا بیوی سے ہم تعلق اس لئے قائم کئے ہوئے ہیں کہ وہ موجب لذّت ہے۔ اور اولیاء اللہ اس لئے محبّت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا حق ہم سے وابستہ کر دیا ہے اور ان اولیاء اللہ کو ان کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہی نور محسوس ہوتا ہے اور وہی برکات محسوس ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرتے وقت محسوس ہوتے ہیں۔ اس لئے ہمارے تعلق اور ان کے تعلق میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کا ازواج مطہرات سے خوش طبعی پر تعجب

میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک دن حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے لگے کہ پہلے مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہوتا تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن سے کس طرح ایسی خوش طبعی کی باتیں کرلیا کرتے تھے جیسا کہ روایات میں آتی ہیں۔ مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ دوڑ لگا رہے ہیں اور اپنے کندھے کے پیچھے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو کھڑا کر کے حبشیوں کے کرتب دکھا رہے ہیں اور رات کو گیارہ عورتوں کی کہانی سنا رہے ہیں۔ جس ذات کا رابطہ اللہ جل شانہ کے ساتھ قائم ہو، جس پر وحی نازل ہو رہی ہو، ملائکہ اس پر اتر رہے ہوں اور ملأ اعلیٰ کے ساتھ اس کا رشتہ جڑا ہوا ہو، وہ ذات ایسی دنیا کی حقیر چیزوں کی طرف کیسے متوجہ ہو جاتی ہے؟ اس پر مجھے تعجب ہوتا تھا۔

یہ دونوں باتیں جمع ہو سکتی ہیں

بعد میں فرمایا کہ الحمدللہ، اب سمجھ میں آنے لگا کہ یہ دونوں کام ایک ساتھ ہو سکتے ہیں، اس لئے کہ بیوی بچوں کے ساتھ جو معاملہ ہو رہا ہے، درحقیقت اس کی نوعیت بدلی ہوئی ہے، اس طرح کہ وہ معاملات بھی ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی تجلّیات کا مظہر ہیں، کیونکہ جب نیت درست کر لی تو اب دنیا کے سارے کاموں میں بھی وہی نور ہے جو خالص عبادات میں ہے۔

قطبی پڑھ کر ایصال ثواب کرنا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ سنا کہ وہ ایک دن قطبی کا سبق پڑھا رہے تھے جو منطق کی کتاب ہے، درس کے دوران ایک صاحب نے آکر کہا کہ میری والدہ کا انتقال ہو گیا ہے، ایصال ثواب کی درخواست ہے۔ حضرت نے ہاتھ اٹھائے اور دعا شروع کر دی کہ یا اللہ! ہم جو یہ سبق پڑھ رہے ہیں، اس کا ثواب ان کو پہنچا دیجئے۔ وہ صاحب بڑے حیران ہوئے کہ قطبی کا بھی ایصال ثواب ہوتا ہے، قرآن شریف یا حدیث شریف پڑھ کر ایصال ثواب کرتے تو بات سمجھ میں آجاتی، یہ قطبی پڑھ کر ایصال ثواب کیسے؟ حضرت نے فرمایا کہ میاں! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے نیت درست ہو تو میرے نزدیک بخاری شریف اور قطبی کے ثواب میں کوئی فرق نہیں، جو ثواب بخاری شریف میں ہے،

وہی ثواب قطبی میں بھی ہے۔ انشاء اللہ۔

ملاّ حسن کے درس میں دل سے اللہ اللہ جاری تھا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے پاس منطق کی کتاب ''ملاّ حسن'' کا سبق پڑھا کرتے تھے، اس سبق میں ہم اپنے کانوں سے سنا کرتے تھے کہ ان کے قلب سے ''اللہ اللہ'' کی آواز آرہی ہے۔ منطق کے سبق میں یہ بات ہوتی تھی جس کو کہنے والوں نے ''گندگی'' تک کہدیا، گویا کہ اس سبق میں بھی انوار و برکات تھے، کیونکہ نیت درست تھی اور طریقہ درست تھا۔

اتباعِ سنّت کو اختیار کرلو

اللہ تعالیٰ ہماری نیتوں کو درست فرما دے، آمین۔ ہر چیز میں اتباع سنّت کی نیت ہو،کیونکہ ''سنّت'' تمام زندگی کے کاموں پر حاوی ہے، جو کچھ کرو گے کہیں نہ کہیں سنّت سے رشتہ مل جائے گا، لہٰذا ہر کام میں اتباع سنّت کی نیت کرو تو بالآخر دنیا کے سارے کام بھی دین بن جائیں گے اور ان کے اندر بھی وہ انوار و برکات حاصل ہوں گے جو عبادات میں ہوتے ہیں اور پھر وہ دنیائے مذموم میں داخل نہ ہوں گے۔

اس کیلئے مشق کی ضرورت ہے

لیکن اس کے لئے مشق کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مدتوں میں نے اتباع سنت کی مشق کی ہے، مثلاً کھانا سامنے آیا، کھانا لذیذ ہے، بھوک لگی ہوئی ہے، کھانے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن ایک لمحہ کے لئے دل میں یہ ارادہ کیا کہ دل چاہنے پر کھانا نہیں کھائیں گے، پھر دوسرے لمحے یہ بات ذہن میں لائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ذمے ہمارے نفس کا حق رکھا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ جب کھانا سامنے آتا تو شکر کرتے ہوئے کھانا تناول فرمالیا کرتے تھے، اب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں کھاؤں گا، پھر ''بسم اللہ'' پڑھ کر کھانا شروع کر دیا۔ چونکہ نیت درست ہوگئی، اس لئے اب وہ کھانا دنیا نہ رہا بلکہ دین بن گیا۔

ہر عمل کو دین بنالیں

یا مثلاً گھر کے اندر داخل ہوئے اور بچہ کھیلتا ہوا اچھا لگا، دل چاہا کہ اس کو گود میں اٹھا کر پیار کروں، لیکن ایک لمحہ کے لئے رک گئے اور یہ سوچا کہ دل کے چاہنے پر یہ کام نہیں کریں گے، پھر دوسرے لمحے یہ خیال لائے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے ساتھ پیار فرماتے تھے، اب میں بھی آپ کی اتباع میں بچے کو اٹھا کر پیار کروں گا، پھر بچہ کو گود میں اٹھا کر پیار کرلیا تو یہ عمل

بھی اتباعِ سنت کے نتیجے میں دین بن گیا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کے معمولات میں کوئی کام ایسا نہیں ہے جس کو حسنِ نیت سے اتباعِ سنت اور دین کا کام نہ بنایا جاسکے، جب اتباعِ سنت کی نیت سے وہ کام کرو گے تو وہی دنیا دین بن جائے گی، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور فضل سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۵۹

غفلت اور اس کا علاج

غفلت کا علاج ۔ مسنون دعائیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴
مجلس نمبر : ۵۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر ۵۹

غفلت اور اس کا علاج

غفلت کا علاج "مسنون دعائیں"

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

کونسی غفلت مذموم ہے؟

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

غفلت مذموم سے مراد یہ ہے کہ بے شغلی کی حالت میں حق تعالیٰ سے بے توجہ رہے اور ایسا شغل جو مانع ہو توجہ الی اللہ سے بلاضرورت اختیار کرے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷۶)

یہ جو بار بار کہا جاتا ہے کہ انسان کو اللہ جل شانہ سے غفلت نہ ہونی چاہئے، اس سے کیا مراد ہے؟ کس قسم کی غفلت نہ ہونی چاہئے؟ اس ملفوظ میں حضرت والا نے اس غفلت کی تشریح فرمائی ہے کہ دو چیزیں اس غفلت کے اندر داخل ہیں۔

فراغت کے وقت توجہ الی اللہ نہ ہونا غفلت ہے

ایک یہ کہ بے شغلی کی حالت میں حق تعالیٰ سے بے توجہ رہے۔ یعنی جب آدمی بالکل فارغ بیٹھا ہوا ہے، کوئی کام نہیں کر رہا ہے، اس فارغ وقت میں اللہ تعالیٰ کا کبھی بھی خیال نہ آئے اور اس بے شغلی اور فراغت کی حالت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر وفکر یا اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والی چیزوں کے ذکر وفکر کا خیال نہ آئے، بلکہ فراغت کی حالت میں بس دنیا ہی کی طرف متوجہ رہے، دنیاوی مال و دولت کی طرف، دنیاوی اسباب کی طرف، دنیاوی لذّتوں کی طرف اور

دنیاوی شہوات کی طرف متوجہ رہے، اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ نہ ہو، ایک حالت تو یہ ہے۔

توجہ الی اللہ سے مانع مشغلہ اختیار کرنا غفلت ہے

دوسری حالت یہ ہے کہ انسان قصد و اختیار سے ایسا مشغلہ اختیار کرے جو توجہ الی اللہ سے مانع ہو۔ توجہ الی اللہ میں سب سے زیادہ مانع اللہ تعالیٰ کی معصیت، گناہ اور مبادی گناہ اور مقدمات گناہ ہوتے ہیں، ان کو کوئی انسان بلاضرورت اختیار کرلے تو یہ حالت بھی غفلت کے اندر داخل ہے۔ مثلاً ایک کام مباح ہے، لیکن اس بات کا اندیشہ ہے کہ اس مباح کام میں مشغول ہونے سے توجہ الی اللہ ختم ہو جائے گی اور غالب گمان یہ ہے کہ یہ مباح کام میں مشغولی گناہ کے اندر بھی مبتلا کردے گی۔

غافلوں میں بیٹھنا غفلت ہے

فرض کریں کہ ایک بے فکر آزاد منش اور آخرت سے غافل لوگوں کا اجتماع ہے اور کوئی شخص بلاضرورت اس اجتماع میں جانے کا ارادہ کرلے، جبکہ یہ بھی معلوم ہے کہ یہ ایسے لوگوں کا اجتماع ہے جو آخرت سے غافل ہیں اور اس اجتماع میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ اور آخرت کے ذکر و فکر ہونے کا کوئی امکان نہیں بلکہ یہ خیال ہے کہ لوگ وہاں پر معصیتوں میں مبتلا ہوں گے تو اس صورت میں اگر کوئی شخص بلاضرورت اپنے اختیار سے وہاں چلا گیا تو اس نے

خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری، اس شخص کا یہ عمل بھی غفلت کے اندر داخل ہے۔

دنیاوی کام غفلت پیدا کرتے ہیں

انسان کی فطرت اور سرشت اس طرح کی بنائی گئی ہے کہ وہ ابتداءً گناہوں اور معصیتوں کی طرف مائل ہوتی ہے، اور یہی گناہ کا میلان انسان کو فرشتوں سے ممتاز کرتا ہے، اگر یہ میلان نہ ہو تو پھر انسان اور فرشتے میں کوئی فرق باقی نہ رہے، اور ساتھ میں انسان کو یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اس دنیا کے اندر رہو اور اس کو برتو اور کھاؤ اور کماؤ، بیوی بچوں کے ساتھ بھی رہو، لیکن خبردار! گناہ مت کرنا۔ لیکن جب آدمی دنیا کے کاموں کے لئے نکلتا ہے تو دنیا کے کاموں کی خاصیت یہ ہے کہ وہ رفتہ رفتہ انسان کے اندر غفلت پیدا کرتے ہیں۔

دعائیں پڑھنا غفلت سے نکال دیتا ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر قربان جایئے کہ آپ نے ایک ایسا طریقہ بتا دیا کہ اگر اس پر عمل کرو گے تو پھر دنیا کے یہ کام تمہیں غافل نہیں کر پائیں گے۔ وہ طریقہ یہ بتا دیا کہ ہر قدم پر اور ہر کام سے پہلے ایک ایک دعا تلقین فرما دی، فرمایا کہ جب صبح کو بیدار ہو تو یہ دعا پڑھو، جب گھر سے نکلو تو یہ دعا پڑھو، جب بازار میں جاؤ تو یہ دعا پڑھو، جب کھانا سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو، جب کھانا

کھا چکو تو یہ دعا پڑھو، جب پانی پیو تو یہ دعا پڑھو، جب بیت الخلاء میں جاؤ تو یہ دعا پڑھو، جب بیت الخلاء سے باہر نکلو تو یہ دعا پڑھو، جب سونے کے لئے بستر پر لیٹو تو یہ دعا پڑھو، یہاں تک فرمایا کہ جب میاں بیوی کے تعلّقات قائم کرو تو یہ دعا پڑھو۔ یہ تمام مسنون دعائیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہیں، ان کا مقصد یہ ہے کہ یہ جو انسان دنیا کے کام دھندوں میں لگنے کی وجہ سے غفلت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس کو اس غفلت سے بچایا جائے۔ جو آدمی ہر کام سے پہلے ایک دعا پڑھ رہا ہے تو ایسے شخص کو یہ دنیا اللہ تعالیٰ سے کیسے غافل کر دے گی، ایسے شخص کو یہ دنیا غافل نہیں کر سکتی، کیونکہ وہ تو ہر موقع پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کر رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے کا نام غفلت ہے

بات دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بھلا دینے اور اللہ تعالیٰ تک لے جانے والے اعمال و افعال کو بھلا دینے کا نام ''غفلت'' ہے، اس غفلت کا بہترین علاج ''مسنون دعائیں'' ہیں، یہ مسنون دعائیں معمولی چیز نہیں ہیں، لیکن ہم جیسے لوگوں نے جب یہ پڑھ لیا کہ یہ مسنون دعائیں پڑھنا مستحب ہے، اور ''مستحب'' کے بارے میں یہ اصول پڑھ لیا کہ جس کے کرنے سے ثواب ہوتا ہے اور نہ کرنے سے کوئی گناہ نہیں ہوتا، لہٰذا ہمیں مسنون دعائیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس وجہ سے مولوی صاحبان کو ان دعاؤں کے پڑھنے کا اہتمام نہیں ہوتا، کیونکہ دل میں اس کی اہمیت نہیں۔ یہ صورت کسی

ر

طرح بھی مناسب نہیں۔

مستحب اور مندوب کام بھی کرنے چاہئیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے تھے کہ ایک مرتبہ اذان ہورہی تھی، ایک عالم صاحب نے بات چیت شروع کردی، کسی نے کہا کہ حضرت اذان ہورہی ہے، ذرا بات چیت موقوف کرلیں، تو جواب میں ان عالم صاحب نے فرمایا کہ ہاں! ہمیں سب پتہ ہے، اذان کا جواب دینا کوئی فرض و واجب نہیں ہے۔ گویا کہ جو چیز فرض و واجب نہیں وہ قابل اہتمام بھی نہیں، اس کی کوئی فضیلت ہی نہیں۔ ایسا علم بڑا خوشکی والا علم ہے جو صرف ضابطے کے کام کرادے، آگے محبت کے جو تقاضے ہیں اور عشق کے جو تقاضے ہیں، ان کی طرف دھیان نہیں۔

تبلیغ میں نکلنے سے دعائیں یاد ہوجاتی ہیں

لوگ تبلیغی جماعتوں میں جاتے ہیں، وہاں چند دن رہنے سے دعائیں یاد ہوجاتی ہیں، اس لئے کہ وہاں ہر آدمی دعائیں خود بھی پڑھتا ہے اور دوسروں کو بھی سکھاتا ہے۔ لیکن عام طور پر لوگوں کو دعائیں یاد نہیں ہوتیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ فکر نہیں، ارے بھائی! جب دین سیکھنے کے لئے نکلو گے اور اس دین کے جو اہم تقاضے ہیں، ان پر عمل کرو گے تو دعائیں یاد ہوجائیں گی، اللہ تعالیٰ نے یہ فضل فرمایا کہ ان دعاؤں کو فرض و واجب نہیں کیا، کیونکہ اگر فرض و واجب ہوجاتیں تو تم مشقت میں مبتلا ہوجاتے، لیکن ان دعاؤں کا فائدہ بڑا دوررس

ہے، اس کا انسان اندازہ نہیں کر سکتا۔

مسنون دعائیں اللہ تعالیٰ کا انعام ہیں

اولاً یہ دعائیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک مرحلے پر مانگیں ہیں، ایسی دعائیں ہیں کہ اگر انسان ساری عمر سجدے میں پڑا رہے تب بھی اس کو ایسی دعائیں مانگنے کی توفیق نہ ہو، اگر ان دعاؤں میں سے ایک دعا بھی صحیح معنی میں قبول ہوگئی تو انسان کا بیڑہ پار ہو جائے۔ اور پھر ان دعاؤں کے پڑھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ذریعہ سے انسان کو اللہ تعالیٰ کے ذکر کی توفیق ہو جاتی ہے اور دنیاوی کاموں میں مشغول ہونے کی وجہ سے جو غفلت میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، اس غفلت سے انسان کو بچاتی ہیں۔

غفلت بڑی بلا ہے

لہٰذا یہ ''غفلت'' بہت بڑی بلا ہے، اللہ بچائے، اگر انسان سے غلطی ہو جائے یا گناہ سرزد ہو جائے تو اس میں اتنی تشویش کی بات نہیں، توبہ کرلو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ معاف ہو جائے گا، لیکن ''غفلت'' کہ گناہ کئے جا رہا ہے اور تنبہ نہیں ہو رہا ہے اور نہ کبھی یہ خیال آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوں گا تو کیا جواب دوں گا؟ آخرت کی فکر نہیں۔ یہ سب ''غفلت'' کا نتیجہ ہے، اس لئے یہ ''غفلت'' بہت بڑی بلا ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی اس سے حفاظت فرمائے، آمین۔ اس بلا سے بچنے کا بہترین طریقہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دعاؤں کی صورت میں ہمیں بتا دیا، یہ دعائیں اس بلا سے نکالتی ہیں، یہ دعائیں معمولی چیز نہیں۔ لہٰذا ان دعاؤں کا اہتمام کریں، خود بھی یاد کریں اور بچوں کو بھی یاد کرائیں کہ ہر ہر مرحلہ پر کیا دعا مانگنی چاہئے، دعاؤں کی کتابیں چھپی ہوئی ہیں، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ''مناجات مقبول'' کے نام سے چھپی ہوئی ہے، میرا بھی ایک رسالہ ''پُرنور دعائیں'' کے نام سے چھپا ہوا ہے، اس میں مسنون دعاؤں کو جمع کر دیا ہے۔ جو آدمی بھی ان دعاؤں کے پڑھنے کا عادی ہوگا اور اس کی زبان پر یہ دعائیں چڑھی ہوئی ہوں گی، وہ شخص کبھی بھی غفلت کا شکار نہیں ہوگا۔ انشاء اللہ تعالیٰ۔

انگلینڈ میں اسکول کے بچے اور مسنون دعائیں

ایک مرتبہ میرا ''انگلینڈ'' جانا ہوا، انگلینڈ کے صوبہ اسکاٹ لینڈ کا ایک شہر ہے گلاسگو، وہاں جانا ہوا، وہاں کے لوگوں نے یہ پروگرام رکھا کہ پورے ''اسکاٹ لینڈ'' میں مسلمانوں کے جتنے اسکول ہیں، ان سب کا کنونشن بلایا جائے اور اس کنونشن میں تمام بچوں کو جمع کیا جائے، اور مجھے بھی دعوت دی کہ آپ اس کنونشن کی صدارت کریں اور اس میں کچھ نصیحتیں فرما دیں، میں نے منظور کرلیا۔ چنانچہ اس کنونشن میں پورے اسکاٹ لینڈ کے اسکولوں کے مسلمان بچے جمع ہوئے جو ڈھائی تین ہزار کے قریب تھے اور ایک بہت بڑا اجتماع تھا، میں بھی وہاں پہنچ گیا، مجھ سے انتظامیہ کے لوگوں نے کہا کہ یہ تقریباً

تین ہزار بچے ہیں، ہم نے تمام اسکولوں کی ایک فیڈریشن بنا رکھی ہے، وہ فیڈریشن مسلمان بچوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لئے کام کرتی ہے، اور ہم نے ان مسلمان بچوں میں دین کی عظمت اور محبّت پیدا کرنے کے لئے بہت سے کام کئے ہیں۔ ایک کام یہ کیا ہے کہ ہم نے ان بچوں کو مسنون دعائیں یاد کرائی ہیں، یہ تین ہزار بچے آپ کے سامنے بیٹھے ہیں، آپ کسی بھی بچے سے جس وقت کی دعا چاہیں سن لیں۔

چنانچہ میں نے ایک بچے سے پوچھا کہ سوتے وقت کی کیا دعا ہے؟ اس نے فوراً کھڑے ہوکر دعا پڑھنی شروع کردی، دوسرے بچے سے بازار جانے کی دعا پوچھی تو اس نے وہ دعا فوراً سنا دی، وغیرہ، ہزاروں بچے تھے اور ہر بچے کو ساری دعائیں ازبر یاد تھیں، اور یہ بچے برطانیہ جیسے ملک کے رہنے والے تھے، اور مدرسوں کے بچے نہیں تھے بلکہ اسکولوں کے بچے تھے، مجھے خوشی بھی ہوئی اور رشک بھی آیا کہ یہ چیز تو ہمارے دینی مدارس کے طلبہ میں بھی موجود نہیں ہے جو چیز ان کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہے۔

بچپن میں دعائیں سکھادیں

یاد رکھئے! جس بچے کو ابتدائی عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں پڑھنے کی توفیق ہوگئی اور اس کی عادت پڑگئی تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ بڑے سے بڑا شیطان بھی اس کو گمراہ نہیں کرسکے گا، جب وہ بچہ زندگی کے معرکہ میں داخل ہوگا تو یہ دعائیں انشاء اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت کریں گی۔ بہر حال!

''غفلت'' سے بچنے کا بہترین نسخہ ''مسنون دعائیں'' ہیں، اس کا اہتمام کرنے کی ہم سب کو فکر کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۶۰

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

دنیا بری نہیں، اس کی محبّت بُری ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴
مجلس نمبر : ۶۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ؕ

مجلس نمبر ۶۰

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

دنیا بری نہیں، اس کی محبّت بُری ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِیْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

دنیا کمانا منع نہیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

کسب دنیا ممنوع نہیں، البتہ اس کی محبّت اور دل میں اس کی وقعت کرنا ممنوع ہے خواہ پیرایہ مذمت ہی میں ہو، کیونکہ جس چیز کی دل میں کچھ وقعت نہ ہو، اس کا ذکر مذمت سے بھی نہیں کیا جاتا۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷۶)

یعنی کسب حلال کرنا اور دنیا کمانا منع نہیں، البتہ دو چیزیں منع ہیں، ایک دنیا کی محبّت کا دل میں پالنا، یہ ممنوع ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے کہ دنیا کی طبعی محبّت جو غیر اختیاری طور پر انسان کے دل میں ہوتی ہے، وہ ممنوع نہیں، البتہ دنیا کی محبّت کا اتنا زیادہ ہونا ممنوع ہے جو یا تو انسان کو گناہ اور معصیت پر آمادہ کردے یا انہماک میں مبتلا کردے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دعا

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں جب کسریٰ کے خزانے ان کے پاس آئے اور مسجد نبوی میں سونے چاندی کے ڈھیر لگا دئے گئے، اس وقت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دعا فرمائی کہ یا اللہ! ہم آپ سے یہ دعا تو نہیں کرتے کہ اس مال کی محبّت کو بالکلیہ ہمارے دل سے ختم فرمادے، کیونکہ آپ نے خود قرآن کریم میں فرمادیا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ۔ (سورۂ آل عمران، آیت ۱۴)

یعنی انسان کے لئے شہوات کی محبت کو مزین کر دیا گیا ہے، یعنی عورتوں کی محبت، اولاد کی محبت، سونے چاندی کے ڈھیروں کی محبت، نشان زدہ گھوڑوں کی محبت، مویشیوں کی محبت، کھیتیوں کی محبت، گویا کہ یہ بات انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ ان چیزوں کی کچھ نہ کچھ محبت اس کے دل میں ہوگی، لہٰذا اس محبت کو بالکلیہ زائل کرنے کی دعا تو نہیں کرتے، البتہ یہ دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! یہ دنیا کی محبت کسی دینی فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ نہ بنے اور یہ محبت کسی گناہ پر آمادہ نہ کرے۔

دنیا کو دل و دماغ پر سوار کرنا بُرا ہے

بہرحال! اس دنیا کی وہ محبت جو طبعی ہے اور غیر اختیاری ہے، وہ مذموم نہیں، لیکن اس محبت کو دل میں اس طرح پالنا کہ ہر وقت دل و دماغ میں اسی دنیا کا تصور ہے، ہر وقت اسی کا خیال ہے، ایک تو ایسی محبت منع ہے۔

دنیا کی ''وقعت'' دل سے نکال دو

دوسرے یہ کہ دل میں دنیا کی ''وقعت'' پیدا کرنا منع ہے۔ وقعت کا

مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کو بہت اہم سمجھنا اور یہ سمجھنا کہ یہ دنیا اور اس کی اشیاء بڑی عظیم دولت ہیں، یا وہ صورت ہو جائے جیسی قارون کا خزانہ دیکھنے والوں کی ہوگئی تھی، قارون کا خزانہ دیکھ کر انہوں نے کہا:

یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ، اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ۔ (سورۃ القصص: آیت ۷۹)

یعنی کاش! ہمیں بھی ایسا ہی خزانہ مل جاتا جیسا خزانہ قارون کو ملا، یہ تو بڑا خوش نصیب ہے۔ ان کمبختوں کو دنیا تو کچھ نہیں ملی، لیکن یہ حسرت کر کے گناہ میں مبتلا ہوگئے۔ اس دنیا کی وقعت ان کے دلوں میں اتنی زیادہ تھی کہ دنیا کے مال و دولت ہونے کو خوش نصیبی قرار دیدیا۔

وہ شخص بڑا بد نصیب ہے

دیکھئے! اگر کسی شخص کو دنیا مل گئی اور اس نے اس دنیا سے نفع اٹھالیا اور مزے اڑا لئے اور اس سے کچھ لذت حاصل کر لی، چلو اگر گناہ بھی کر لیا تو کچھ لذت تو حاصل کر لی، لیکن وہ شخص بڑا بد نصیب ہے جس کو ملا تو کچھ نہیں اور دنیا کی حسرت ہی کرتا رہا، اور ایسی حسرت کی جس کے نتیجے میں دنیا کی وقعت اور عظمت اس کے دل میں پیدا ہوگئی، یہ وقعت اور عظمت بھی بڑی خراب چیز ہے۔

نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم

کسی نے خوب کہا کہ "بئس الفقیر علی باب الامیر" "فقیر" سے مراد درویش اور صوفی ہے یعنی جو صوفی کسی امیر کے دروازے پر کھڑا ہو، وہ بُرا صوفی ہے، اس لئے بُرا ہے کہ وہ "خسر الدنیا والآخرۃ" کا مصداق ہے کہ دنیا میں بھی کچھ نہ ملا، دوسروں کا محتاج رہا، اور چونکہ وہ امیر کے دروازے پر کھڑا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ اس کے دل میں امیر کی امارت کی "وقعت" ہے جس کے نتیجے میں اس کو آخرت میں بھی کچھ نہیں ملے گا۔

دنیا کی وقعت بڑا فتنہ ہے

وہ تو بہت ہی گھٹیا انسان ہوگا جو مال کی محبّت میں کسی گناہ کا ارتکاب کرلے، الحمدللہ اس بات سے تو اکثر مسلمان محفوظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔ لیکن "وقعت" والی بات ایسی ہے کہ اس میں بہت سے پاک باز لوگ بھی مبتلا ہیں، مثلاً جو مالدار ہے، اس کے مال کی وجہ سے اور اس کے پیسوں کی وجہ سے دل میں اس کی بڑی عزت ہے، اس کے پیچھے پھر رہا ہے، اس کے ساتھ تعلّقات بڑھانے کی فکر میں ہے، اس کے ساتھ تعلّقات پر فخر کرتا ہے کہ اتنے بڑے بڑے آدمی میرے حلقہ اعتقاد میں اور حلقہ ارادت میں ہیں، یہ "وقعت" والا فتنہ اتنا بڑا فتنہ ہے کہ ہم لوگ بکثرت اس کے اندر مبتلا ہو جاتے ہیں۔

مالداروں سے دوستی پر فخر کرنا

آج کل ہمارا علماء کا طبقہ اس کے اندر بہت مبتلا ہے، بڑے فخر سے یہ بیان کرتے ہیں کہ فلاں شخص تو ہمارا بے تکلف دوست ہے، اس کے ہاں ہمارا آنا جانا ہے۔ یہ فخر کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ وہ آدمی مالدار اور دولت مند ہے اور اس کے مال و دولت کی وجہ سے دل میں اس کی وقعت ہے، اور لوگوں کے سامنے جب یہ بیان کرتا ہے کہ میرا اس سے تعلق ہے اور میرا اس کے پاس آنا جانا ہے یا اس کا میرے پاس آنا جانا ہے اور اس سے تکلفی ہے تو اس بیان کرنے سے اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ مجھے بڑا سمجھیں کہ اس کے تو اتنے بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات ہیں۔ یہ سب اس بات کی علامت ہے کہ دل میں دنیا کی ''وقعت'' ہے، چنانچہ اگر کوئی آدمی فقیر و مسکین ہے، اس کے ساتھ اپنے تعلقات کو دوسروں کے سامنے بیان نہیں کرتا کہ میرا فلاں کے ساتھ تعلق ہے، وہ بڑا متقی پرہیزگار آدمی ہے، میں اس کے پاس آتا جاتا ہوں، اور دولت مند لوگوں سے تعلق کا ذکر ہو رہا ہے، معلوم ہوا کہ دولت کی وقعت دین سے بھی زیادہ ہے۔

سورۃ عبس کی ابتدائی آیات کا نزول کیوں ہوا؟

قرآن کریم کی یہ آیت: عَبَسَ وَ تَوَلّٰی اَنْ جَآءَہُ الْاَعْمٰی۔

تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا۔
(سورۃ عبس: ۱-۲)

یہ آیت کب نازل ہوئی تھی؟ یہ اس موقع پر نازل ہوئی تھی جب ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رؤساء کفار بیٹھے ہوئے تھے اور آپ ﷺ ان کو اسلام کی دعوت فرما رہے تھے، اتنے میں حضرت عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کوئی مسئلہ پوچھنے کے لئے تشریف لے آئے۔ آپ ﷺ نے سوچا کہ یہ تو اپنا آدمی ہے، ہر وقت ان سے بات کی جاسکتی ہے، اور یہ لوگ رؤساء ہیں، دور سے آئے ہوئے ہیں، اگر ان کے دماغ میں اسلام کی صحیح سمجھ آگئی تو یہ اپنے قبیلہ والوں کے لئے بھی مؤثر ہوں گے۔ یہ سوچ کر آپ نے ان رؤساء کی طرف التفات فرمایا اور ان صحابی کی طرف سے بے التفاتی فرمائی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عتاب ہوا اور یہ آیت نازل ہوئی، حالانکہ بظاہر بالکل صحیح بات تھی کہ یہ صحابی تو گھر کے آدمی ہیں، جس وقت چاہیں گے مسئلہ پوچھ لیں گے، لیکن یہ رؤساء جو کفر کے اندر مبتلا ہیں، میری نصیحت کے نتیجے میں شاید کفر سے باز آجائیں، لیکن بظاہر چونکہ رؤساء کی طرف التفات ہو رہا تھا اور غریب آدمی کی طرف سے بے التفاتی ہو رہی تھی، اس پر بھی عتاب ہوا، حالانکہ ذرہ برابر بھی اس بات کا دور دور تک شائبہ نہیں تھا کہ آپ کے دل میں دنیا کی دولت کی وقعت ہے، پھر بھی عتاب ہوگیا۔ جہاں دنیا کی وجہ سے لوگوں کی وقعت کی جا رہی ہو، مال و دولت کی وجہ سے وقعت کی جا رہی ہو، اللہ بچائے، یہ خطرناک بات ہے۔

سب سے زیادہ خوش نصیب انسان

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انسان کے بہت سے مراتب ہیں۔ انسانوں میں سب سے زیادہ خوش نصیب شخص وہ ہے جس کو دنیا تو ملی لیکن دنیا کی محبّت نہ ملی، یعنی جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا خوب فراوانی کے ساتھ عطاء فرمائی، لیکن محبّت نہ دی، دنیا کی حقیقت بھی اس کے ذہن نشین ہے کہ یہ دنیا ناپائیدار چیز ہے اور دھوکہ کا سامان ہے اور دنیا بھی خوب اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمائی ہے، یہ شخص سب سے زیادہ خوش نصیب ہے۔

دوسرے نمبر کا انسان

دوسرے نمبر پر وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے نہ تو دنیا دی اور نہ ہی دنیا کی محبّت دی، فقر و فاقہ کے اندر زندگی گزار رہا ہے، لیکن دنیا کی طلب بھی دل میں نہیں ہے، وہ ایسا ہے بقول شخصے:

لنگ کے زیر و لنگ کے بالا
نے غمِ دزد و نے غمِ کالا

یہ شخص دوسرے نمبر پر ہے۔

تیسرے نمبر کا انسان

تیسرے نمبر پر وہ شخص ہے جس کو دنیا بھی ملی اور دنیا کی محبّت بھی ملی،

اگرچہ دنیا کی محبت کی وجہ سے ممنوع امور اور گناہ کے دائرے میں داخل ہوا لیکن گناہ کے ساتھ کچھ لذت تو اٹھائی، دنیا کے مزے تو اڑائے، چلو دنیا تو ملی، آخرت نہ ملی۔

چوتھے نمبر کا انسان

چوتھے نمبر کا انسان سب سے خطرناک اور محروم ہے، یہ وہ شخص ہے جس کو دنیا کی محبت تو ملی لیکن دنیا نہ ملی، یعنی دنیا کی طلب ملی، دنیا کی خواہش ملی، دنیا کی محبت ملی، لیکن دنیا کا مال و دولت، جاہ و منصب وغیرہ کچھ نہیں ملا، گویا کہ صرف حسرت ہی حسرت ملی کہ اگر مجھے یہ مال مل جاتا تو یہ کر لیتا، ایسی گاڑی مل جاتی، ایسی کوٹھی مل جاتی، لیکن ساری عمر خالی ہاتھ گزار دی، ملا کچھ بھی نہیں، یہ ہے:

خَسِرَ الدُّنیَا وَالْآخِرَۃ

دنیا و آخرت دونوں گنوا دی،

(سورۃ الحج:۱۱)

اس لئے کہ دنیا کی طلب اور محبت کی وجہ سے گناہ گار ہو گیا، اس طرح آخرت گئی اور چونکہ مال و دولت نہیں ملا، اس لئے نہ دنیا کی لذت اٹھائی اور نہ مزے اڑائے، اس طرح دنیا بھی نہ ملی۔ بہرحال! دلوں میں جو دنیا کی وقعت پیدا ہو گئی ہے، وہ اتنی خطرناک ہے کہ یہ ''وقعت'' کہیں ہمیں اور آپ کو ''خسر الدنیا و الآخرۃ'' کا مصداق نہ بنا دے۔

دمشق کے ایک بزرگ کا واقعہ

شام کے شہر ''دمشق'' میں ایک بزرگ بڑے اللہ والے تھے، درویش صفت تھے، مسجد میں پڑے ''اللہ اللہ'' کرتے رہتے تھے، لوگ ان کے پاس ملاقات اور دعا کے لئے آیا کرتے تھے، آہستہ آہستہ ان کی خبر دمشق کے گورنر تک پہنچ گئی کہ یہ بڑے اللہ والے بزرگ ہیں اور مستجاب الدعوات ہیں، لوگ ان کے پاس دعائیں کرانے آتے ہیں، جو دعا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ قبول فرمالیتے ہیں۔ گورنر کے دل میں خیال آیا کہ جاکر ملاقات کرنی چاہئے اور دعا کرانی چاہئے۔ یہ جو بادشاہ اور بڑے بڑے عہدوں والے جب کسی بزرگ کے پاس جاتے ہیں تو ان کا مقصد اپنی اصلاح کرانا نہیں ہوتا بلکہ اس بات کی دعا کرانا پیش نظر ہوتا ہے کہ ہماری حکومت قائم رہے وغیرہ۔ بہرحال! وہ گورنر ایک اپنے لاؤلشکر کے ساتھ ان بزرگ کے پاس آ گیا، وہ بزرگ تکیہ لگائے ہوئے اور پاؤں پھیلائے ہوئے لیٹے ہوئے تھے، جب وہ گورنر قریب آیا تب بھی وہ اپنے پاؤں پھیلائے لیٹے رہے، لوگوں نے بتایا کہ گورنر صاحب آئے ہیں، مگر وہ جس حالت میں لیٹے ہوئے تھے، ویسے ہی لیٹے رہے، گورنر کو بڑا تعجب ہوا، اس لئے کہ اس نے آج تک کبھی یہ منظر نہیں دیکھا تھا کہ میں کسی کے پاس ملاقات کے لئے جاؤں اور وہ پاؤں پھیلا کر لیٹا رہے، میری تعظیم میں کھڑا نہ ہو، نہ اکرام کرے۔ بہرحال! گورنر نے ملاقات کی اور سلام کیا اور دعا کی درخواست کی، ان بزرگ نے لیٹے لیٹے ہی سلام کا جواب دیا اور دعا دی اور کچھ

نصیحت کے ایسے کلمات کہے جو دنیا کی بے ثباتی اور آخرت کی فکر پر مشتمل تھے، اس کے دل پر ان نصیحتوں کا اثر ہوا اور اس کے بعد وہ گورنر چلا گیا۔

جو پاؤں پھیلاتا ہے وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا

اس گورنر نے واپس جاکر اشرفیوں کی ایک تھیلی ہدیہ کے طور پر ان بزرگ کی خدمت میں بھیجی، جب تھیلی لانے والا شخص آیا تو ان بزرگ نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ ان صاحب نے کہا کہ گورنر صاحب نے آپ کے لئے یہ تھیلی بھیجی ہے، ان بزرگ نے فرمایا کہ اس کو واپس لے جاؤ اور ان سے کہہ دینا کہ:

اِن الذی یمدّ رِجلہ لا یمدّ یدہ

کہ جو آدمی پاؤں پھیلاتا ہے، وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا، یہ کہہ کر واپس کر دیا۔

ان کا یہ عمل قابل تقلید نہیں

اس واقعہ کے بارے میں ایک بات کی وضاحت کر دوں، وہ یہ کہ جب وہ گورنر ملاقات کے لئے آیا تو وہ بزرگ پاؤں پھیلائے لیٹے رہے اور کوئی حرکت نہیں کی، یہ درحقیقت اللہ والوں پر مختلف قسم کے واردات ہوتے ہیں جن میں ہر بات قابل تقلید نہیں ہوتی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ آنے والے کا اکرام کیا جائے، چاہے وہ گورنر ہو یا فقیر ہو۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:

اکرموا کریم کل قوم

یعنی اگر کوئی شخص صاحب منصب ہے تو اس کے منصب کی وجہ سے بھی اس کا اکرام کرو۔ لیکن چونکہ ان اللہ والوں پر بعض اوقات تکوینی طور پر واردات ہوتے ہیں کہ اس وقت اس شخص کے ساتھ یہی طرز عمل فائدہ مند ہوگا، اس کی وجہ سے وہ اللہ والے اس کے مطابق عمل کر لیتے ہیں، لیکن ان کا وہ طرز عمل قابل تقلید نہیں ہوتا، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی بڑے شخص کی آمد کے موقع پر تم بھی پاؤں پھیلا کر لیٹ جاؤ۔ سنت جو قابل اتباع اور قابل تقلید ہے، وہ یہ ہے کہ ''اکرموا کریم کل قوم'' یعنی ہر قوم کے معزز آدمی کا اکرام کرو۔

وقعت کردار کی وجہ سے ہونی چاہئے

ان بزرگ نے یہ جملہ جو کہا کہ ''جو پاؤں پھیلاتا ہے، وہ ہاتھ نہیں پھیلاتا'' اس کے معنی یہ ہیں کہ دل میں دنیا کی کوئی وقعت نہیں ہے، اگر تمہاری وقعت ہوگی تو وہ تمہارے عمل کی وجہ سے اور تمہارے کردار کی وجہ سے اور تمہارے تقویٰ کی وجہ سے ہوگی، لیکن تمہارے مال کی وجہ سے نہیں ہوگی، تمہاری دولت کی وجہ سے اور تمہارے منصب کی وجہ سے نہیں ہوگی۔ بس دل میں دنیا کی وقعت نہ ہو۔

یہ نازک کام ہے

دونوں کے درمیان توازن قائم کرنا بڑا نازک کام ہے، ایک طرف اس

حدیث ''اکرموا کریم کل قوم'' پر بھی عمل ہو جائے اور دوسری طرف دل میں دنیا کی وقعت بھی نہ ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق ہی سے دونوں کے درمیان توازن حاصل ہوسکتا ہے اور بزرگوں کی صحبت سے اور ان کے سامنے رگڑے کھانے سے یہ توازن حاصل ہوسکتا ہے۔

ایک دولت مند کے گھمنڈ کا واقعہ

صدر ایوب خان صاحب کا زمانہ تھا اور الیکشن ہورہے تھے، اس الیکشن میں ایک بہت بڑے سرمایہ دار دولت مند بھی کھڑے ہوگئے، ان کے حلقے میں ''لسبیلہ'' بھی آگیا جہاں اس وقت ہمارا مکان تھا، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا علاقے میں ایک اثر تھا، اس لئے ان کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ حضرت مفتی صاحب کے پاس جا کر حمایت حاصل کی جائے، چنانچہ ایک دن وہ سرمایہ دار صاحب اپنے پورے لشکر کے ساتھ گھر کے دروازے پر پہنچ گئے اور گھنٹی بجائی، میں دروازے پر گیا اور ملاقات کی تو انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ میں فلاں ہوں، اور اس انداز سے اپنا نام بتایا کہ اس کا خیال تھا کہ میرا نام سن کر یہ اچھل پڑے گا کہ اتنا بڑا آدمی ملاقات کے لئے آیا ہے۔ میں نے نام سن کر کہا کہ فرمایئے کیا بات ہے؟ پھر اس نے دوبارہ کہا کہ میں فلاں ہوں اور مفتی صاحب سے ملنا ہے، میں نے کہا کہ یہ وقت تو مفتی صاحب سے ملنے کا نہیں ہے۔ یہ جواب سن کر اس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا کہ میں کسی کے گھر پر جاؤں اور وہ یہ کہدے کہ یہ ملنے کا وقت نہیں ہے۔ اس نے

پھر کہا کہ میں اتنی دور سے ملاقات کے لئے آیا ہوں، میں نے کہا کہ آنے سے پہلے آپ کو چاہئے تھا کہ وقت معلوم کر لیتے کہ ملاقات کے اوقات کیا ہیں۔ بہرحال! وہ بڑا سیخ پا ہوا اور کہا کہ آپ کون ہیں؟ میں نے کہا کہ میں ان کا بیٹا ہوں، اس نے کہا کہ میں مفتی صاحب سے شکایت کروں گا، آپ نے میرے ساتھ بداخلاقی کی ہے، میں نے کہا کہ جب آپ ملاقات کے لئے تشریف لائیں تو شکایت کر دیجئے گا۔ چنانچہ پھر اس نے وقت لیا اور دوبارہ ملاقات کے لئے آیا۔

اس وقت اس نے آکر شکایت بھی کی کہ میں پچھلی مرتبہ بھی آیا تھا لیکن ملاقات نہیں ہوئی، اور پھر یہ پیش کش کی کہ آپ کا دارالعلوم کہاں ہے؟ میں دارالعلوم میں یہ بنوا دوں گا اور وہ بنوادوں گا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے، "الحمد للہ" اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ مسلمان ایک ایک دو دو روپیہ جو چندہ دیتے ہیں، اس سے کام چل جاتا ہے اور اس میں بڑی برکت ہے، اس کے علاوہ ہمیں کوئی حاجت نہیں، بڑا ہی ناکام اور نامراد ہو کر واپس گیا۔ بہرحال! اس کے دماغ میں یہ بات تھی کہ میرا نام سنتے ہی اس پر لرزہ طاری ہو جائے گا، اس قسم کی کیفیت اس پر طاری تھی۔

دنیا ایک مچھر کے پر کے برابر بھی نہیں

اگر دنیا کی حقیقت ذہن نشین ہو جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی کہ:

لو كانت الدنيا تعدل عند الله جناح بعوضة
ماسقى كافراً منها شربة

(ترمذی، کتاب الزھد، باب ماجاء فی ھوان الدنیا علی اللہ)

یعنی اگر یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے ایک پر کے برابر بھی وقعت رکھتی ہوتی تو اللہ تعالیٰ کسی کافر کو اس دنیا کا ایک گھونٹ بھی نہ دیتا۔ بس دنیا کی یہ حقیقت ذہن نشین ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے دل میں یہ حقیقت بٹھا دے۔ آمین۔

دنیا ایک ضرورت ہے

البتہ دنیا ایک ضرورت ہے، ضرورت کے تحت ہم دنیا کو استعمال کر سکتے ہیں، جیسے بیت الخلاء ہے، گھر کے اندر اس کی ضرورت ہے، لیکن بیت الخلاء کی اتنی وقعت نہیں کہ ہر وقت وہ بیت الخلاء دل و دماغ پر چھا جائے، یہی معاملہ دنیا کے ساتھ کرنا نہیں چاہئے کہ اس کی ضرورت تو ہے اور ضرورت کے تحت اس کو برتنا بھی ہے لیکن اس کی عظمت اور وقعت دل میں نہیں ہونی چاہئے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہئے کہ یا اللہ! ہمیں دنیا دے ضرورت کے مطابق بلکہ خواہش کے مطابق بھی دے، لیکن اس کی محبّت اور وقعت نہ دے۔

امام زہریؒ اور دنیا کی بے وقعتی

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے محدّثین میں سے ہیں،

ان کے حالات بیان کرتے ہوئے ان کے شاگرد کہتے ہیں۔

ما رأیت احداً الدنیا أهون عنده منه

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے مال و دولت بھی عطاء فرمایا تھا، لیکن اس کے باوجود ان کے شاگرد فرماتے ہیں کہ میں نے آج تک ایسا آدمی نہیں دیکھا جس کی نظر میں دنیا اتنی بے حقیقت ہو جتنی بے حقیقت امام زہری رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں تھی، پھر آگے فرماتے ہیں۔

کانت الدراهم عنده بمنزلة البعر

دراہم ان کی نظر میں ایسے تھے جیسے بکری کی مینگنیاں یعنی ان دراہم کی کوئی وقعت ہی نہیں تھی، دراہم آئیں تو اچھا ہے نہ آئیں تو بھی کوئی پرواہ نہیں۔ اور جب دراہم آتے تو لوگوں میں ان کو اس طرح تقسیم کر دیتے کہ خود بالکل خالی ہاتھ ہو جاتے۔ دنیا اللہ تعالیٰ عطا فرمائے مگر اس کی محبّت اور وقعت نہ ہو۔

حضرت لیث بن سعدؒ اور دنیا

حضرت لیث بن سعد رحمۃ اللہ علیہ بڑے درجے کے محدّثین میں سے بھی ہیں اور فقہاء مجتہدین میں سے بھی ہیں، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کی روزانہ کی آمدنی کئی کلو سونے کے برابر تھی، اللہ تعالیٰ نے اتنی دولت عطا فرمائی تھی، لیکن زندگی بھر زکوٰۃ واجب نہ ہوئی، کیونکہ مال نصاب پر سال نہیں گزرنے پاتا تھا، اُدھر مال آیا، اِدھر آگے دیدیا، جو مال آیا تو کبھی کسی دوست کو بھیج دیا، کبھی کسی عزیز رشتہ دار کو بھیج دیا، کبھی کسی عالم کی خدمت میں ہدیہ پیش

کر دیا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بات فرمائی تھی کہ سب سے خوش نصیب وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ دنیا دے لیکن دنیا کی محبّت نہ دے، یہ انہی میں سے تھے، کیونکہ اِن کو دنیا ملی لیکن دنیا کی محبّت اور وقعت نہ ملی۔

حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ

حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حضرت میاں جی نور محمد رحمۃ اللہ علیہ جو ہم سب کے سید الطائفہ تھے، ان کے حالات میں لکھا ہے کہ جب بازار جاتے تو اپنے ساتھ پیسوں کی ایک تھیلی رکھ لیتے، جب کسی دکان سے کوئی چیز خریدتے تو وہ تھیلی دکاندار کو دے دیتے اور اس سے فرماتے کہ اس تھیلی میں سے اپنے پیسے لے لو۔ ان کا خیال یہ تھا کہ کون تھیلی میں سے پیسے نکال کر اس کو گننے کے چکر میں پڑے، اتنی دیر میں دس مرتبہ ''سبحان اللہ یا دس مرتبہ ''الحمدللہ'' کہہ لیں گے، اتنا وقت کیوں پیسے گننے میں صرف کیا جائے۔

ایک چور کا واقعہ

ایک مرتبہ وہ اپنی تھیلی لئے جا رہے تھے کہ کسی چور نے تاڑ لیا کہ ان کے پاس پیسوں کی تھیلی ہے، چنانچہ وہ چور پیچھے سے آیا اور ہاتھ میں سے تھیلی چھین کر بھاگ گیا، انہوں نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ وہ تھیلی کون چھین کر لے جا رہا ہے، چھین لی تو بس چھین لی، یہ اپنا ذکر کرتے ہوئے گھر آ گئے، سوچا کہ کون یہ تفتیش کرے کہ کون لے کر گیا۔ بقول شخصے!

یہ کہاں کا فسانہ سود و زیان
جو گیا سو گیا جو ملا سو ملا
کہو دل سے کہ فرصت عمر ہے کم
جو دلا تو خدا ہی کی یاد دلا

اللہ تعالیٰ کے انتقام سے ڈرو

مگر بات یہ ہے کہ اللہ کے ولی جب کسی سے انتقام نہ لیں تو ان کی طرف سے اللہ تعالیٰ انتقام لیتے ہیں، اب یہ ہوا کہ جب چور صاحب تھیلی لے کر چلے تو اس کو باہر نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملتا کہ کہاں سے نکلے، کبھی اس گلی میں گھس رہا ہے، کبھی اس گلی میں گھس رہا ہے اور باہر نکلنے کا راستہ ہی نہیں ملتا، وہی گلیاں اس کے لئے میدان تیہ بن گئیں، جب گھنٹوں گزر گئے اور راستہ نہیں ملا تو اس نے سوچا کہ میں نے جس کی یہ تھیلی چھینی ہے، شاید اللہ کا ولی ہے جس کو میں نے نقصان پہنچایا ہے، میں یہ تھیلی ان کو جا کر واپس کروں، تب شاید میری جان چھوٹے۔

چور اور میاں جی میں جھگڑا

چنانچہ وہ چور حضرت میاں جی کے گھر پر پہنچا اور دروازے پر دستک دی، آپ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کہا کہ حضرت! یہ تھیلی دینے آیا ہوں، میاں جی نے فرمایا کہ میں تو تھیلی نہیں لیتا، اس نے پوچھا کہ کیوں نہیں لیتے، یہ تو

آپ ہی کی تو تھیلی ہے؟ میاں جی نے فرمایا کہ جس وقت تو نے یہ تھیلی لی تھی، میں نے اسی وقت تیرے لئے حلال کر دی تھی، اب یہ تھیلی میں نہیں لیتا۔ اس چور نے کہا کہ خدا کے واسطے تھیلی لے لو، میں تو مصیبت میں پھنس گیا ہوں، مجھے تو نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔ میاں جی نے فرمایا کہ میں کیسے قبول کرلوں، کیونکہ یہ تھیلی اب میری رہی نہیں۔ اب دونوں کے درمیان جھگڑا ہو رہا ہے، وہ تھیلی دینا چاہ رہا ہے، وہ لینا نہیں چاہتے۔ بالآخر اس نے کہا کہ اچھا یہ تو دعا کر دیجئے کہ مجھے نکلنے کا راستہ مل جائے، انہوں نے فرمایا کہ اچھا دعا کر دیتا ہوں، چنانچہ وہ چور چلا گیا۔

دنیا مانگو مگر اس کی عظمت سے بچو

بہرحال! ضرورت کے مطابق اللہ تعالیٰ سے دنیا مانگنی چاہئے کہ یا اللہ! اتنی دنیا عطا فرما دے کہ کسی کی محتاجی نہ ہو اور جو ضروریات ہیں وہ عافیت کے ساتھ پوری ہو جائیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ یہ بھی دعا کرلو کہ جو جائز خواہشات ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ پوری فرما دیں، لیکن اس دنیا سے دل لگا کر مت بیٹھو. اور اس دنیا کی محبّت اور اس کی وقعت اور عظمت دل میں پیدا نہ کرو، اور نہ یہ کہ پیسے والے کی وقعت اور عظمت ہو اور غریبوں کی عظمت نہ ہو، دل میں دوسروں کی عظمت دین اور تقویٰ کی وجہ سے ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ قرب کی وجہ سے ہو، پیسے کی وجہ سے نہ ہو۔

حضور ﷺ کی ایک دعا

ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ:

اللّٰھم احینی مسکینا و امتنی مسکینا
واحشرنی فی زمرۃ المساکین۔

(کنز العمال: ۱۶۵۹۲)

اے اللہ! مجھے مسکینوں کی زندگی عطا فرما اور مسکینوں کی موت عطا فرما اور مسکینوں کے ساتھ ہی میرا حشر بھی فرما۔ معلوم ہوا کہ حقیقت میں عظمت کی چیز دین ہے، ہم لوگ دنیا اور دنیا والوں کی جو عظمت دل میں لے کر بیٹھ گئے ہیں، یہ بڑی خراب چیز ہے، پیسے اور دولت کی وجہ سے کسی کا امتیاز نہیں ہونا چاہیئے، اس اعتبار سے غریب اور امیر کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ ہاں! اگر امیر شخص متقی ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والا ہے تو اس وجہ سے اس کے ساتھ تعلق رکھو، پیسے اور دولت کی وجہ سے تعلق مت رکھو۔

ایک پیر صاحب کا واقعہ

بعض اوقات اہل دین کے اندر بھی یہ بات پیدا ہو جاتی ہے کہ شروع میں اگرچہ نیت صحیح ہوتی ہے لیکن بعد میں رفتہ رفتہ مالدار لوگوں کے ساتھ تعلقات کو اپنے لئے سرمایہ فخر و ناز سمجھنے لگتے ہیں، یہ بُری بات ہے۔ حضرت

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مواعظ میں ایک پیر صاحب کا قصہ لکھا ہے کہ ایک پیر صاحب کے بہت سے مرید تھے، ایک دن ایک مرید نے آ کر کہا کہ حضرت! میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے، وہ یہ کہ آپ کی انگلی مبارک پر شہد لگا ہوا ہے اور میری انگلی پر پاخانہ لگا ہوا ہے، پیر صاحب نے کہا کہ یہ بات بالکل ٹھیک ہے، اللہ تعالیٰ نے مجھے علم دیا اور تقویٰ دیا، وہ بمنزلہ شہد ہے اور تو دنیا کا کتا ہے، تیری انگلی پر پاخانہ لگا ہوا ہے، تو نے صحیح خواب دیکھا۔ مرید صاحب نے کہا کہ حضرت! ابھی خواب پورا بیان نہیں کیا، پھر میں نے یہ دیکھا کہ آپ مجھے اپنی انگلی چٹا رہے ہیں اور میں اپنی انگلی آپ کو چٹا رہا ہوں۔ العیاذ باللہ۔ مطلب یہ تھا کہ پیر صاحب تو اسے دین سکھا رہے ہیں جو بمنزلہ شہد کے ہے اور پیر صاحب مرید کی دنیا کھا رہے ہیں جو بمنزلہ پاخانے کے ہے۔ گویا کہ پیر صاحب تو اپنے مرید کو اچھی چیز دے رہے تھے، علم دے رہے تھے، دین سکھا رہے تھے، تربیت کر رہے تھے، لیکن پیر صاحب کے دل میں دنیا کی محبت تھی اور وہ مرید کی دنیا کھا رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

دنیا کی مذمّت بھی زیادہ نہ کرو

بہرحال! حضرت والاؒ اس ملفوظ میں فرما رہے ہیں کہ ”کسب دنیا ممنوع نہیں، البتہ اس کی محبّت اور دل میں اس کی وقعت کرنا ممنوع ہے“ کیونکہ دنیا کی وقعت دل میں رکھنا منع ہے۔ آگے حضرت والا نے بڑا عجیب جملہ ارشاد فرمایا جو

یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا:

خواہ پیرایۂ مذمت ہی میں کیوں نہ ہو، کیونکہ جس چیز کی
دل میں کچھ وقعت نہ ہو، اس کا ذکر مذمت سے بھی نہیں
کیا جاتا۔

یعنی وقعت کے ساتھ دنیا کی تعریف کرنا تو منع ہے ہی، بلکہ کثرت سے اس کا ذکر مذمت کے ساتھ کرنا بھی بُرا ہے۔ یعنی اس کو اپنا وظیفہ بنالیا کہ بیٹھے ہوئے ہر وقت دنیا کی بُرائی کر رہے ہیں، یہ بھی دنیا کی وقعت میں داخل ہے، اس لئے کہ اگر دنیا کی وقعت نہ ہوتی تو اس کا بار بار ذکر ہی کیوں کرتا، چاہے بُرائی سے کر رہا ہے۔

دنیا قابل ذکر چیز نہیں

ارے بھائی! یہ دنیا تو قابل ذکر شئی ہی نہیں، لہٰذا بلاوجہ اس کی بُرائی بیان کرنے میں زیادہ مشغول ہونا بھی وقعت کا حصّہ ہے، کیونکہ جس چیز کی وقعت نہ ہو، اس کا بُرائی سے بھی ذکر نہیں کیا جاتا۔ دیکھئے! ہوا میں ذرّات ہر وقت اڑتے رہتے ہیں، ان کی کوئی وقعت ہے؟ کچھ نہیں، اب آپ بیٹھ کر ان کی بُرائی میں تقریر کر رہے ہیں کہ ان ذرّات میں یہ خرابی ہے اور ان میں یہ خرابی ہے۔ کوئی عقلمند انسان ان کی خرابیاں بیان نہیں کرے گا، کیونکہ وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ ان کا ذکر کیا جائے۔ لہٰذا کیوں تم اپنے آپ کو بلاوجہ اس دنیا کی مذمت بیان کرنے میں مشغول کرتے ہو؟ ہاں! نصیحت کے طور پر اس کی

مذمت بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت کے طور پر اس دنیا کی مذمت بیان فرمائی ہے، لیکن بلاضرورت دنیا کی مذمت بیان کرنا بھی وقعت کے اندر داخل ہے۔

گناہوں کو بالکل یاد نہ کرو

گناہوں کے بارے میں بزرگوں نے فرمایا کہ گناہوں کو بالکل یاد نہ کرو، نہ اپنے قصد و اختیار سے اس کے کرنے کا خیال دل میں لاؤ اور نہ ہی اپنے قصد و اختیار سے اس کے نہ کرنے کا خیال دل میں لاؤ، مثلاً بیٹھ کر یہ سوچنے لگے کہ فلاں جگہ سے رشوت ملتی ہے، وہ نہیں لوں گا، یا فلاں جگہ بدنظری کا موقع ہے، وہ نہیں کروں گا، بیٹھے بیٹھے یہ باتیں سوچ رہا ہے، یہ بھی خطرناک ہے، کیونکہ وہ نہ کرنے کے پردے میں گناہ کو یاد کر رہا ہے اور اس کے نتیجہ میں بعض اوقات وہ گناہ اپنا داؤ مار جاتا ہے اور آدمی کو گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے۔

فتنوں کو جھانک کر بھی مت دیکھو

ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخری دور میں جو فتنے آئیں گے، ان کو جھانک کر بھی مت دیکھنا کہ ذرا دیکھیں کیا ہو رہا ہے؟ کیونکہ جو شخص جھانک کر دیکھے گا وہ فتنے اس کو بھی اچک لے جائیں گے۔ اور گناہ سے بڑا فتنہ اور کیا ہوگا، یہ گناہ ایسی چیز ہے کہ انسان اگر اس کی یاد میں مشغول ہو جائے، چاہے اثباتاً ہو، چاہے نفیاً ہو، اس مشغولیت کے نتیجے

میں وہ گناہ انسان کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے، یہ سب نفس و شیطان کے دسائس ہیں۔

گناہوں کے بارے میں معلومات بھی مت کرو

بعض اوقات نفس و شیطان انسان کے دل میں یہ خیال ڈالتے ہیں کہ فلاں گناہ کے بارے میں کچھ معلومات تو حاصل کرلیں تاکہ علی وجہ البصیرۃ اس سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی بچنے کی تلقین کریں۔ چنانچہ ایک عالم تھے، ایک مرتبہ سینما دیکھتے ہوئے کسی نے دیکھ لیا، ان صاحب نے کہا کہ حضرت! آپ یہاں کیسے؟ ان عالم صاحب نے کہا کہ میں یہاں اس لئے آیا ہوں تاکہ یہ دیکھوں کہ یہ سینما ہوتا کیا ہے؟ اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کروں تاکہ مجھے اس کی بُرائیاں پتہ چلیں اور پھر خود بھی اس سے بچوں اور دوسروں کو بھی اس سے بچاؤں۔ حالانکہ بچنے سے پہلے ہی وہ خود اس گناہ کے اندر مبتلا ہو گئے تھے۔

بہرحال! گناہ کے بارے میں نفس کا ایک دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ چلو! اس گناہ کے بارے میں معلومات حاصل کریں، اب معلومات حاصل کرنے کے لئے گئے لیکن خود شکار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، آمین۔ اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر ان فتنوں کو جھانک کر بھی دیکھو گے تو وہ تمہیں اچک لیں گے۔ لہٰذا گناہ کے پاس کبھی معلومات حاصل کرنے کے لئے بھی مت جانا۔

نفس کا ایک اور دھوکہ

گناہ کے بارے میں نفس کا ایک دھوکہ یہ ہوتا ہے کہ وہ نفس انسان سے کہتا ہے کہ اس گناہ کو ایک مرتبہ اچھی طرح کر کے حسرت پوری کرلو اور پھر توبہ کرلینا اور اس کو چھوڑ دینا، ایک مرتبہ کرنے سے ذرا دل بھر جائے گا اور حسرت نکل جائے گی۔ یاد رکھئے! یہ نفس کا بہت بڑا دھوکہ ہے، کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ جب انسان ایک مرتبہ گناہ کر لیتا ہے تو اس کے نتیجے میں گناہ کی پیاس بجھتی نہیں بلکہ اور زیادہ بھڑک جاتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب تک انسان نے وہ گناہ نہیں کیا ہوتا، اس وقت تک اس گناہ سے دل پر ایک حجاب ہوتا ہے لیکن جب وہ گناہ کرلیتا ہے تو وہ حجاب اٹھ جاتا ہے، اور پہلے گناہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی اور ایک مرتبہ کر لینے کے بعد اب اس گناہ کی جرأت پیدا ہو جاتی ہے گویا کہ پہلے دل میں جو رکاوٹ اور بند لگا ہوا تھا، وہ ٹوٹ جاتا ہے۔

گناہ کرنے سے پیاس اور بڑھتی ہے

اللہ بچائے! یہ گناہ ایسی چیز ہے کہ اس کی پیاس بجھتی نہیں، ایسا نہیں ہوتا کہ جب ایک مرتبہ کرلیں گے تو حسرت نکل جائے گی اور قصہ ختم ہو جائے گا اور جذبہ ٹھنڈا پڑ جائے گا بلکہ اور زیادہ پیاس بڑھتی ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ گناہ کی لذت کی مثال خارش جیسی ہے، اگر انسان کے جسم کو خارش لگ جائے تو کھجانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ دنیا

میں دو ہی چیزوں میں مزہ ہے، ایک کھاج میں اور ایک راج میں۔ کھجلی میں مزہ اور لذت تو بہت ہے، لیکن یہ لذت اتنی غیر صحت مند ہے کہ جتنا زیادہ کھجائیں گے اتنے زیادہ بیمار ہونگے، اور خارش کی خاصیت یہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ کھجاؤگے تو وقتی طور پر تھوڑی دیر کیلئے سکون ہوگا، لیکن تھوڑی دیر کے بعد پہلے سے زیادہ شدّت کے ساتھ وہ کھجلی بڑھےگی۔ گناہ کا بھی یہی معاملہ ہے کہ جب انسان ایک مرتبہ کرلیتا ہے تو پھر اور زیادہ شدّت کے ساتھ اس کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا کبھی نفس و شیطان کے اس دھوکے میں مت آنا کہ ایک مرتبہ گناہ کروگے تو دل بھر جائے گا اور حسرت نکل جائے گی۔ یاد رکھئے! کوئی حسرت نہیں نکلتی بلکہ اور زیادہ حسرت پیدا ہو جاتی ہے۔

گناہوں سے لاتعلق ہو جاؤ

لہٰذا گناہ کو اپنی فکر اور سوچ کا موضوع بنالینا، چاہے گناہ کی بُرائی ہی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو، یہ بھی درست نہیں۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو حضرت ڈاکٹر صاحبؒ کے متعلقین اور عاشقین میں سے تھے، انگریزی تعلیم یافتہ ہیں، ایک دن میرے پاس آئے اور آکر ایک عجیب بات کہی، کہنے لگے کہ حضرت والا نے ہمارے اندر ایک کام بڑا عجیب کر دیا۔ میں نے پوچھا کہ کیا کام؟ کہنے لگے کہ حضرت نے ہمیں گناہ سے بے تعلق کر دیا، انہوں نے انگریزی لفظ Indifferent کہا، اس کے نتیجے میں اب الحمدللہ گناہ کا خیال بھی نہیں آتا، نہ تو گناہ کی محبّت ہے اور نہ گناہ کی نفرت ہے، کیونکہ نفرت بھی ایک قسم کا تعلق

ہے، جیسے یہ آدمی سوچے کہ فلاں چیز ہم سے کوئی الگ چیز ہے، اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ لہٰذا نہ تو مدح سے اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی نفرت سے اس کا کوئی ذکر ہے۔

جواب جاہلاں باشد خاموشی

حضرت فرمایا کرتے تھے کہ گناہ کا ذکر ہی کیوں ہو، ذکر تو اس کا ہوتا ہے جس کی دل میں کچھ وقعت ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ دنیا میں ایسے ہیں جو اس غرض سے مضمون لکھتے ہیں اور یہاں دیتے ہیں کہ ان کی تردید کی جائے، تاکہ جب ہماری تردید کی جائے گی تو اس سے ہماری شہرت ہوگی، بقول شخصے! بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ وہ لوگ باقاعدہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے مضمون کی تردید کی جائے، اس لئے کہ جتنی تردید ہوگی اتنا ہی نام ہوگا اور شہرت ہوگی۔ ایسے لوگوں کا علاج یہ ہے کہ اس کو قابل اعتناء ہی نہ سمجھا جائے۔ آج کل لوگوں کا یہ حال ہے کہ جہاں انہوں نے اخبار میں کوئی مضمون دیکھا اور اس میں کوئی غلط بات دیکھی تو بس اس مضمون کو وہاں سے نکال کر ہمارے پاس بھیج دیا کہ صاحب! اس کا جواب لکھیں اور اس کی تردید کریں، اس نے گمراہی کی بات لکھدی ہے۔ ارے بھائی! یہ تردید تو اس مضمون لکھنے والے کا عین منشاء ہے، اس لئے کہ اس سے اس کی شہرت ہوگی اور لوگ یہ کہیں گے کہ جس شخص کی تردید فلاں عالم نے کی ہے، وہ کچھ تو ضرور ہوگا۔ لہٰذا تردید لکھنے میں اس کی عزت افزائی ہے۔ اس کا علاج وہ ہے جو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

جواب جاہلاں باشد خاموشی

جاہلوں کا جواب خاموشی ہے، نہ یہ کہ اس سے مناظرہ کیا جائے۔

ہر چیز کی تردید ضروری نہیں

لہٰذا ہر چیز کی نفی اور ہر چیز کی تردید مفید نہیں ہوتی، بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کو نظر انداز کردو اور نظر انداز کرنا ہی ان کا حل ہے، ان کے پیچھے پڑنے سے کچھ حاصل نہیں۔ آج کے دور میں ہر شخص کے ہاتھ میں قلم آگیا ہے اور ہر شخص کے منہ میں زبان ہے، جو شخص جو چاہتا ہے لکھ دیتا ہے، اور اخبارات ہر چیز چھاپنے کو ہر وقت تیار ہیں۔ اب انسان کس کس کے پیچھے پڑے اور کس کس کا جواب دے، اور جواب دینے کے نتیجے میں بعض اوقات اس کی اور شہرت ہو جاتی ہے۔

اس لئے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بڑی نازک بات ارشاد فرمائی کہ دل میں دنیا کی وقعت نہ ہو، نہ اثباتاً ہو نہ نفیاً ہو، یعنی نہ تو اس کا ذکر خیر سے کرو اور نہ اس کا ذکر برائی سے کرو۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۶

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

مالداری اور مفلسی اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴
مجلس نمبر : ۶۱

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ط

مجلس نمبر۶۱

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

مالداری اور مفلسی اللہ تعالیٰ کی حکمت پر مبنی ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِيۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَ نُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَأَشۡهَدُاَنۡ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا ۔

أَمَّا بَعۡدُ!

ہر فکرِ دنیا مذموم نہیں

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

دنیا کے اندر جو فکرِ مذموم ہے، وہ وہ ہے جو تحصیل دنیا کے لئے ہو اس کو مقصود بالذات سمجھ کر، اور اگر مقصود بالذات نہ سمجھے تو وہ فکر بھی جائز ہے، کیونکہ حدیث شریف میں ہے کہ "طلب الحلال فریضة" نیز جو دنیا میں فکر ترک دنیا کے لئے ہو، وہ مطلوب ہے، یعنی دنیا اور آخرت میں موازنہ کے لئے تفکر کرنا کہ ان میں سے کونسا قابل اختیار کرنے کے ہے اور کون قابل ترک ہے، یہ فکر مطلوب ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۷۶)

یعنی سوچ پر دنیا کو اس طرح سوار کرنا جس کے بارے میں حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ لاَ تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا

اے اللہ! ہماری سوچ کا محور دنیا کو نہ بنایئے۔

یہ سوچ اور فکر اس وقت مذموم ہے جب یہ سوچ تحصیل دنیا کے لئے ہو اور اسی دنیا کو مقصود بالذات سمجھ کر ہر وقت دل و دماغ پر دنیا کی سوچ کو سوار کر لیا۔ یہ سوچ بُری ہے، لیکن اگر اس دنیا کو مقصود بالذات نہ سمجھے تو پھر اس کے بارے میں سوچنا بُری بات نہیں۔ مثلاً یہ سوچنا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ذمے کچھ حقوق

عائد کئے ہیں، اپنے نفس کے حقوق، اپنے بیوی بچوں کے حقوق عائد کئے ہیں اور وہ حقوق ادا کرنے ہیں اور ان کی ادائیگی کے لئے دنیا کا حصول بھی ضروری ہے، لہٰذا میں اس نقطۂ نظر سے دنیا حاصل کر رہا ہوں، یہ سوچنا کوئی بُری بات نہیں۔

''مال'' مطلقاً خلافِ زہد نہیں

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

مال کا جمع کرنا مطلقاً خلافِ زہد نہیں، البتہ اس کو ذریعہ معاصی بنانا خلافِ زہد ہے۔ بعضوں کے لئے مالدار ہونا ہی مفید ہے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس کو مال سے قرب ہوگا اور کس کو افلاس سے، اس لئے کسی کو مال دیتے ہیں اور کسی کو مفلس رکھتے ہیں۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۷۶)

دولت کو سرکشی کا ذریعہ مت بناؤ

''زہد'' کے معنی عام طور پر کئے جاتے ہیں ''ترک دنیا'' یہ غلط ہے۔ ''زہد'' کے صحیح معنیٰ ہیں ''دنیا سے بے رغبتی'' لہٰذا مال کا جمع کرنا مطلقاً خلافِ زہد نہیں، یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ ایک آدمی بہت مالدار ہے، پھر بھی زاہد ہے، کیونکہ اس کے پاس مال تو ہے لیکن مال کی طرف رغبت نہیں اور دل میں مال کی محبّت نہیں۔ البتہ اس مال کو معاصی کا ذریعہ بنانا خلاف زہد ہے، مثلاً اس مال کو

غلط جگہوں پر خرچ کر رہا ہے، یہ خلاف زہد ہے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ كُلِّ غِنیً يُّطْغِيْنِیْ

اے اللہ! مجھے ہر ایسی مالداری سے بچایئے جو مجھے
سرکش کر دے۔

جن لوگوں کے پاس پیسہ ہے، وہ ضرور یہ دعا مانگا کریں، کیونکہ دولت کے اندر سرکشی کا خاصّہ ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق نہ ہو اور بزرگوں کی صحبت نہ ہو اور تربیت نہ ہو تو یہ پیسہ انسان کا دماغ خراب کر دیتا ہے، دماغ میں خنّاس پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، اس لئے اس مال کو ذریعہ معصیت نہیں بنانا چاہئے۔

دولت کو اعمال صالحہ کا ذریعہ بناؤ

بلکہ انسان اس مال کو شکر کا، عبادت کا، انفاق فی سبیل اللہ کا، صدقہ خیرات کا اور اعمال حسنہ کا ذریعہ بنائے تو سبحان اللہ، پھر تو وہ مال ڈبل نعمت ہے، دنیا کی بھی نعمت ہے اور آخرت کی بھی نعمت ہے۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ بعضوں کے لئے مالدار ہونا ہی مفید ہے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس کو مال کے ذریعہ قرب ہوگا اور کس کو افلاس کے ذریعہ، یعنی اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ اگر فلاں شخص کے پاس مال جائے گا تو وہ بجائے سرکش ہونے کے اس کا ہم سے قرب بڑھے گا اور اگر فلاں کے پاس مال جائے گا تو وہ

سرکش ہو جائے گا۔

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

ہر انسان کا ظرف دیکھ کر اللہ تعالیٰ اس کو عطا فرماتے ہیں، کسی کو کچھ دیا، کسی کو کچھ دیا، یہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تقسیم ہے۔

گنجے کو ناخن نہ دینا عین مصلحت ہے

بعض اوقات ہمیں ترس آتا ہے اور رحم آتا ہے کہ یہ شخص بڑا مفلس ہے اور غریب ہے، لیکن اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ اگر اس کو پیسے دیدیتے اور اس گنجے کو ناخن مل جاتے تو کیا حشر بناتا، خود بھی مصیبت میں مبتلا ہوتا اور دوسروں کو بھی مصیبت میں مبتلا کرتا اور فساد مچاتا، اس وجہ سے اس کو دولت نہیں دی، اس کے لئے مسکنت اور فقیری ہی اچھی ہے۔

کم خوش حالی دوں یا زیادہ؟

ایک واقعہ کسی کتاب میں تو نہیں پڑھا لیکن حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کے لئے کوہ طور پر جانے لگے تو راستے میں ایک شخص ملا، اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ آپ اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے جا رہے ہیں، کچھ ہمارے لئے بھی درخواست کر دینا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا کہ کیا درخواست کروں؟ اس نے کہا کہ فقر و فاقہ کا عالم ہے اور مصیبت میں مبتلا ہوں، پیسہ

پاس نہیں ہے، عیالدار ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے بھی خوش حال زندگی عطا فرمادے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے اور اللہ تعالیٰ سے کلام فرمایا، آخر میں اس شخص کی درخواست پیش کی کہ یا اللہ! راستے میں ایک شخص ملا تھا، وہ بڑا مفلس اور پریشان حال تھا، اس کی بھی دعا قبول فرمالیں اور اس کو خوش حالی عطا فرمادیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ تھوڑی خوش حالی دیں یا زیادہ دیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ جب خوش حالی دینی ہے تو زیادہ ہی دیدیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اچھا ہم نے اس کو زیادہ خوش حالی دیدی، حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آگئے۔

زیادہ خوش حالی کا مقام صرف جنّت ہے

ایک دن خیال آیا کہ جس شخص کی درخواست اللہ تعالیٰ کو پیش کی تھی، اس کو جا کر تو دیکھوں، وہ تو اب خوش حال ہوگیا ہوگا۔ چنانچہ اس کے گھر پر پہنچے اور دروازے پر دستک دی، ایک خاتون نکل کر آئی، آپ نے فرمایا کہ فلاں آدمی سے ملنا ہے، اس خاتون نے کہا کہ ا [illegible] تو انتقال ہوگیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت حیران ہوئے اور اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ یا اللہ! یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، آپ سے خوش حالی مانگی تھی، وہ تو زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ! ہم نے تم سے پوچھا تھا کہ تھوڑی خوش حالی دیں یا زیادہ دیں؟ تم نے کہا تھا کہ زیادہ دیں، اور دنیا میں زیادہ خوش حالی ہو ہی نہیں سکتی، جو خوش حالی ہوگی وہ تھوڑی ہی ہوگی، اس لئے ہم نے اس کو زیادہ خوش حالی

اس طرح دی کہ اپنے پاس بلاکر جنّت عطا فرمادی۔

دنیا اور جنّت دونوں کیوں نہیں دی؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کو دنیا میں بھی خوس حالی دیدیتے اور اس کے بعد جنّت بھی دیدیتے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ؎

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

یعنی اگر اس کو دنیا کے اندر خوش حالی مل جاتی تو پتہ نہیں اس کے کیا اعمال ہوتے، کس سرکشی میں مبتلا ہوتا، کس گمراہی کے گڑھے میں جا گرتا اور پھر جنّت بھی نہ ملتی۔

کیا غریب پر اللہ تعالیٰ کو ترس نہیں آتا؟

آپ جب غریب اور تنگ دست فقیر کو دیکھتے ہیں تو اس پر بڑا ترس کھاتے ہیں کہ اس بچارے کا بڑا بُرا حال ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو ترس آرہا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس پر ترس نہیں آرہا ہے۔ ارے وہی تم سے زیادہ جانتا ہے جس نے یہ کارخانہ بنایا ہے کہ کس پرزے کے ساتھ کیا بات مناسب ہے۔ تم کیا؟ تمہارا دماغ کیا؟ تمہاری عقل کیا؟ تمہاری سوچ و سمجھ کیا؟ تمہیں کیا معلوم کہ کس پرزے کو کس کام میں لگایا ہوا ہے اور اس سے کیا مطلوب ہے؟ کیا اس کا انجام ہونا ہے؟ یہ باتیں تو وہی علیم و خبیر جانتا ہے، وہ عالم بھی ہے اور حکیم بھی ہے، اس لئے وہی جانتا ہے کہ اس کے حق میں غریبی

اور تنگ دستی ہی مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ رحیم ہیں، رحم کے نتیجے میں اس کو زیادہ مال و دولت نہیں دی۔

اللہ تعالیٰ حاکم بھی ہیں اور حکیم بھی ہیں

اس وجہ سے بزرگوں نے فرمایا کہ جب کسی عزیز کا انتقال ہو تو اس موقع پر دو چیزوں کا مراقبہ کرنا چاہئے، ایک اللہ تعالیٰ کے حاکم ہونے کا مراقبہ کرنا چاہئے اور دوسرے اللہ تعالیٰ کے حکیم ہونے کا مراقبہ کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ حاکم ہیں، اس لئے جو اس کا فیصلہ ہے وہی معتبر ہے اور وہ حاکم بھی ''اندھیر نگری چوپٹ راج'' والا حاکم نہیں، بلکہ وہ حاکم ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی ہے، حکمت والا ہے اور حکمت والا حاکم جو فیصلہ کرے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا چاہئے، چاہے ہماری سمجھ میں وہ فیصلہ آئے یا نہ آئے، چاہے وہ فیصلہ ہمیں اچھا لگے یا بُرا لگے، چاہے ہم اس فیصلے پر خوش ہوں یا غمگین ہوں، فیصلہ ان کا ہی حق ہے اور اس پر ہی عمل کرنا چاہئے۔

بعض لوگوں کا مالدار ہونا مفید ہوتا ہے

آگے حضرت والا نے فرمایا کہ: ''بعضوں کے لئے مالدار ہونا ہی مفید ہے'' یعنی کسی کو اللہ تعالیٰ مال دے کر ترقی درجات عطا فرماتے ہیں، مال دے کر اس کو شکر کی توفیق بخشتے ہیں، وہ جتنا شکر کرے گا اتنا ہی اس کے درجات میں ترقی ہوگی۔ اور کسی کو اللہ تعالیٰ فقر دے کر اس کے درجات میں ترقی

فرماتے ہیں، چنانچہ فقر کے اندر صبر کرتا ہے تو صبر کے ذریعہ اس کے درجات بلند ہوتے ہیں۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الطاعم الشاکر بمنزلة الصائم الصابر

(ترمذی، صفة القیامة باب الطاعم الشاکر بمنزلة الصائم الصابر)

یعنی جو شخص کھائے اور شکر کرے، وہ ایسا ہے جیسے وہ شخص جو روزہ رکھے اور صبر کرے۔ لہٰذا اگر روزہ رکھ کر صبر کرو تو اس کا بھی ثواب ہے اور اگر کھا کر شکر کرو تو اس کا بھی ثواب ہے، اسی وجہ سے رمضان میں اللہ تعالیٰ یہ دونوں کام کرا دیتے ہیں کہ دن کو صائم صابر رہو اور رات کو طاعم شاکر رہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كُلُوْا مِنْ رِّزْقِ رَبِّكُمْ وَاشْكُرُوْا لَهٗ

(سورۂ سبا: آیت ۱۵)

یعنی اپنے پروردگار کا رزق کھاؤ اور شکر ادا کرو۔

رمضان میں کم کھانے کا اہتمام ٹھیک نہیں

اس وجہ سے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض بزرگوں نے جو یہ فرمایا ہے کہ رمضان میں افطار کے بعد بھی کم کھانا چاہئے، مجھے اس سے اتفاق نہیں، کیونکہ ضرورت سے زیادہ کھانا ہر حال میں منع ہے، رمضان میں بھی اور غیر رمضان میں بھی، لیکن رمضان میں رات کے وقت دوسرے دنوں کے مقابلے میں کم کھانے کا اہتمام کرنا یہ کوئی صحیح بات نہیں۔ اس

لئے کہ اصل معاملہ اتباع کا ہے، دن میں اللہ میاں نے بھوکا رہنے کو کہا تو بھوکا رہنے میں ثواب ہے اور افطار کے بعد جب اللہ میاں نے کہا کہ کھاؤ تو اب کھانے میں ثواب ہے، بندگی کا تقاضہ یہی ہے۔

افطار میں جلدی کرو

اسی وجہ سے حکم یہ ہے کہ جب افطار کا وقت ہو جائے تو کھانے میں تاخیر مت کرو بلکہ جلدی کھاؤ۔ کیوں؟ اس لئے کہ اتباع کی مشق کرائی جا رہی ہے، جب تک ہم نے کہا کہ بھوکے رہو تو اس وقت تک بھوکے رہو اور جب ہم کہیں کہ اب کھاؤ تو کھانے میں جلدی کرو، اب کھانے سے رکنا یہ معصیت ہے۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ جب انہوں نے کہہ دیا کہ کھاؤ تو اب اطمینان سے مزے لے کر کھاؤ، کمی کرنے کی ضرورت نہیں۔

رمضان میں رزق بڑھا دیا جاتا ہے

حضرت والا نے ایک بات یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ رمضان المبارک میں مؤمن کا رزق زیادہ کر دیتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ یہ عجیب بات ہے کہ اللہ تعالیٰ رزق تو رمضان میں دیں اور ہم کھائیں بعد میں، اللہ تعالیٰ نے ابھی رزق دیا ہے تو ابھی کھائیں گے، لہٰذا رمضان کی راتوں میں کھانے میں کمی کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں، عبدیت کا تقاضہ اور بندگی کا تقاضہ یہی ہے کہ جب وہ رزق دے رہے ہیں تو

مزے لے کر کھاؤ، یہی دین کا اتباع ہے۔ بہرحال! بعض اوقات اللہ تعالیٰ کسی بندے کو نعمتیں عطا فرماتے ہیں اور پھر اس نعمت پر شکر کی توفیق بھی عطا فرماتے ہیں اور اس کے نتیجے میں پھر درجات بلند فرماتے ہیں، وہی جانتے ہیں کہ کس کا مالدار ہونا فائدہ مند ہے اور کس کا فقیر ہونا فائدہ مند ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ بزرگ بھی اور دولت مند بھی

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ جو فقیہ بھی تھے، صوفی بھی تھے، محدّث بھی تھے اور مالدار بھی تھے، کسی نے ان سے کہا کہ حضرت! آپ اللہ والے بزرگ ہیں، آپ بھی یہ اتنا سارا مال و دولت رکھتے ہیں، دونوں میں کوئی مناسبت سمجھ میں نہیں آتی۔ جواب میں حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

لولا هذا لتمندل بنا هؤلاء

اگر ہمارے پاس مال نہ ہوتا تو یہ وزراء اور امراء ہمیں رومال بنا کر ہم سے ہاتھ پونچھا کرتے۔ یعنی یہ لوگ ہمیں حقیر سمجھتے اور ہمیں ہر جگہ استعمال کرتے، اب الحمدللہ ہمارے پاس پیسے موجود ہیں، اس لئے برابر کی چوٹ ہے، اس کے نتیجے میں ہم کسی کے دباؤ میں آنے والے نہیں ہیں۔

امام مالکؒ کا روزانہ نیا جوڑا پہننا

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ روزانہ کپڑے کا ایک نیا جوڑا پہنا کرتے تھے۔

تو اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو دنیا عطا فرمائی لیکن اس سے محبّت نہ ہوئی اور نہ اس کے اندر انہماک ہوا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہئے کہ اے اللہ! حسب ضرورت دنیا عطا فرمایئے۔ بلکہ میں تو اور آگے بڑھ کر کہتا ہوں کہ اے اللہ! حسب خواہش دنیا عطا فرمایئے، جائز خواہشات کی حدتک عطا فرمایئے اور فراغت کے ساتھ عطا فرمایئے لیکن اس کی محبّت اور وقعت میں دل کو مبتلا نہ فرمایئے۔ آمین۔

دنیا دے دنیا کی محبّت نہ دے

ہروقت اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرنی چاہئے، اگر یہ چیز مل گئی تو پھر سب ہی کچھ مل گیا، کیونکہ ساری بُرائیوں کی جڑ دنیا کی محبّت ہے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

حب الدنیا رأس کل خطیئة

(کنز العمال، حدیث نمبر ۶۱۱۴)

اس سے اللہ تعالیٰ نجات عطا فرمادیں گے تو انشاء اللہ سب کچھ درست ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور آپ کو بھی ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۶۲

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

طالب دنیا راحت میں نہیں ہوتا

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴
مجلس نمبر : ۶۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر۶۲

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

طالب دنیا راحت میں نہیں ہوتا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِیْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ یُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِیْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیْهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا كَثِیْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

فَاسْتَبِقُوْا الْخَيْرٰتِ میں خود ترقی کا حکم ہے، لیکن اس قید کے ساتھ کہ ترقی خیر میں ہونی چاہئے، آپ ترقی درم کے حامی ہیں خواہ دین سلامت رہے یا نہ رہے اور ہم بدون سلامت دین کے ترقی درم کو ترقی ورم سمجھتے ہیں، جس شخص کے بدن پر ورم ہو جائے، ظاہر میں وہ بھی ترقی یافتہ ہے مگر حقیقت میں وہ تنزل کی طرف جا رہا ہے۔ (انفاس عیسی ص ۱۷۹)

نیکی کے کاموں میں ترقی مامور بہ ہے

فرمایا کہ قرآن کریم نے خود حکم دیا ہے کہ:

فَاسْتَبِقُوْا الْخَيْرٰتِ۔ (البقرۃ، آیت ۱۴۸)

یعنی اچھے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اور مقابلہ کرو۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ۔ (آل عمران:۱۳۳)

یعنی ایک دوسرے سے زیادہ تیز رفتاری کا مظاہرہ کرو اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل کرنے میں اور اس جنّت کے حاصل کرنے میں جس کی چوڑائی تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ ان آیات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے خود ایک

دوسرے سے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا ''ترقی'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے مامور بہ ہے، لیکن اس کا خیال رہے کہ یہ ترقی خیر میں ہو، اچھی چیزوں میں اور نیکی کے کاموں میں ترقی ہو، ایسی ترقی محمود اور مطلوب ہے اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔

دین کے بغیر ترقی عذاب ہے

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کل لوگوں نے صرف پیسوں کی ترقی کا نام ''ترقی'' رکھ لیا ہے، چاہے دین سلامت رہے یا نہ رہے، حالانکہ یہ ترقی نہیں ہے بلکہ ایک عذاب ہے، کیونکہ جو ترقی دین کے بغیر ہو، اس کا کچھ حاصل نہیں۔ اکبر الٰہ آبادی مرحوم بہت صاحب فکر شاعر تھے، ان کا ایک شعر ہے کہ:

نہ نماز ہے نہ روزہ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
ہمیں اس سے پھر غرض کیا کوئی جنٹ کوئی جج ہے

یعنی اگر کوئی عہدہ مل گیا کہ کوئی جنٹلمین بن گیا یا کوئی جج بن گیا، لیکن دین سلامت نہ رہا، نہ نماز باقی ہے اور نہ روزہ ہے تو پھر یہ ساری دنیاوی ترقی بیکار ہے۔

ترقی درہم یا ترقی ورم

چنانچہ حضرت والا فرماتے ہیں کہ ''ہم بدون سلامت دین کے ترقی درم کو ترقی ورم سمجھتے ہیں'' درہم کی ترقی ایسی ہے جیسے جسم پر ورم آ گیا ہو، اب ورم

کے نتیجے میں بظاہر تو جسم میں اضافہ ہوا لیکن وہ بیماری اور تکلیف کا اضافہ ہے، اس ترقی کا انجام صحیح نہیں، اسی طرح اگر پیسے بڑھ گئے اور دنیا زیادہ حاصل ہوگئی اور دین خطرے میں پڑ گیا۔ العیاذ باللہ۔ تو یہ ابھار اور ترقی بمنزلہ ورم کے ہے اور بیماری ہے، یہ ترقی کوئی قابل رشک چیز نہیں جس کے حاصل کرنے کی آدمی فکر کرے۔

طالب دنیا راحت میں نہیں

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد نے فرمایا:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ دنیا آخرت کے مقابلے میں بالکل قابل نفرت ہے ہی لیکن اس سے قطع نظر وہ بھی خود اپنی حالت ذاتیہ پر نظر کر کے قابل نفرت ہے، کیونکہ طالبِ دنیا کوئی راحت میں نہیں ہے، چنانچہ اگر ان کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو چھوڑ کر ان کی اندرونی حالت کو ان کے پاس رکھو تو معلوم ہوگا کہ کوئی پریشانی سے خالی نہیں، بخلاف طالبِ آخرت کے کہ سب کے سب راحت میں ہیں۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۷۹)

آخرت کے مقابلے میں دنیا بے حقیقت ہے

اس ملفوظ میں حضرت والا نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی بات نقل کی ہے اور بڑی کام کی بات ہے، وہ یہ کہ یہ دنیا آخرت کے مقابلے میں تو کوئی

حقیقت نہیں رکھتی، کیونکہ آخرت غیر متناہی ہے اور دنیا متناہی ہے اور دنیا ایسی متناہی ہے کہ اس کی حدود کا کچھ پتہ نہیں کہ کب اور کس لمحے ختم ہو جائے۔

دنیا اپنی ذات کے اعتبار سے بھی قابل محبّت نہیں

لیکن اپنی ذات کے اعتبار سے بھی اگر دنیا کو دیکھو تو یہ کوئی قابلِ محبّت چیز نہیں ہے، اس لئے کہ ظاہری طور پر جو چیزیں اچھی نظر آتی ہیں، مثلاً روپیہ ہے، مال و دولت ہے، بنگلہ ہے، کاریں ہیں، کارخانے ہیں، یہ سب ظاہری ٹیپ ٹاپ ہیں، اور جو آدمی اس دنیا کا طالب ہوتا ہے یعنی دن رات اس فکر میں پڑا ہوا ہے اور اسی جستجو میں ہے کہ میرے پیسے بڑھ جائیں، میرا مکان زیادہ بہتر ہو جائے، میری کار زیادہ اچھی ہو جائے، ایسا طالب دنیا کبھی بھی راحت میں نہیں ہوتا، کیونکہ وہ دن رات اسی فکر میں غلطاں پیچاں رہتا ہے اور اسی ادھیڑ بن میں لگا رہتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کو راحت نصیب نہیں۔

دولت مند مصائب کا شکار ہیں

یہ جتنے بڑے بڑے سرمایہ دار نظر آتے ہیں جو ملوں کے مالک ہیں اور کارخانوں کے مالک ہیں، ان کے پاس کوٹھیاں ہیں، بنگلے ہیں، کاریں ہیں، حشم خدم ہیں، نوکر چاکر ہیں، بظاہر دیکھنے میں ایسا لگتا ہے کہ خوش عیشی کی زندگی گزار رہے ہیں، لیکن اگر ان کے اندر سے ٹٹول کر دیکھو تو نظر آئے گا کہ یہ لوگ اتنے مصائب کا شکار ہیں کہ کوئی حد و حساب نہیں، اور ان مصائب کا ہمیں علم ہی نہیں ہوتا، جب علم ہو جاتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ کس مصیبت کا شکار ہیں۔

ایک صاحب ثروت کا حال

میں آپ سے کیا بتاؤں کہ ایسے بے شمار لوگ مجھ سے رجوع کرتے ہیں جن کی دولت دیکھ کر عام آدمی تمنا کرے کہ:

یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَآ اُوْتِیَ قَارُوْنُ، اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ۔ (سورۃ القصص: آیت ۷۹)

کاش ہمیں بھی ایسی دولت مل جائے، یہ تو بڑا خوش نصیب ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو سب کچھ دیا ہوا ہے۔ ایک ایسا شخص جس کی فی گھنٹہ آمدنی ایک لاکھ روپے کے قریب ہوگی، دنیا کے مختلف ملکوں میں اس کی کوٹھیاں، کارخانے، کمپنیاں وغیرہ سب کچھ موجود ہیں، میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس شخص کے گھر میں جھانک کر دیکھو تو پتہ چلے کہ کن مصیبتوں کا شکار ہے، اس کی بیوی مجھ سے آکر کہتی ہے کہ یہ سب مال و دولت میرے لئے عذاب ہے، میں کسی جھونپڑی میں رہ کر دال روٹی کھاتی تو اس مال و دولت کے مقابلے میں میرے لئے ہزار درجہ بہتر تھا۔ اب دیکھنے والے ان کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں اور اندر ان کی یہ حالت ہے۔

دنیا کی حرص بڑھتی رہتی ہے

اگر آپ ان دولت مندوں کی اندرونی زندگی کو جھانک کر اور ٹٹول کر دیکھیں گے تو اکثر یہی نظر آئے گا کہ جس چیز کا نام "راحت" ہے، وہ ان کو حاصل نہیں، اگر پیسے مل گئے اور ان پیسوں کے ذریعہ راحت نہ ملی تو ان پیسوں

سے کیا حاصل ہوا؟ اور اگر بالفرض اس جیسی پریشانی نہ بھی ہو تب بھی یہ دنیا کی طلب ایک مستقل عذاب ہے، اس لئے کہ دنیا کا خاصہ یہ ہے کہ جتنا آدمی اس کے پیچھے بھاگتا ہے، یہ دنیا اس سے بھاگتی ہے اور یہ طالب دنیا دوڑتے دوڑتے ہانپتے ہوئے مرجاتا ہے اور وہ ہاتھ نہیں آتی، کیونکہ طالب دنیا کو کسی حد پر قرار ہی نہیں آتا، جیسا کہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے طالب دنیا کا حال بیان فرمایا کہ اگر اس کو ایک وادی سونے کی مل جائے تو یہ تمنا کرے گا کہ دو وادی مل جائیں، جب دو مل جائیں گی تو تمنا کرے گا کہ تین ہو جائیں اور ابن آدم کا پیٹ سوائے قبر کی مٹی کے کوئی اور چیز نہیں بھر سکتی۔ جب تک زندہ ہے، وہ اسی میں مبتلا رہے گا، جس آدمی کی ہر وقت یہ فکر ہو کہ فلاں چیز نہیں ملی وہ مل جائے، فلاں چیز مجھے نہیں ملی وہ مل جائے، اور ہر وقت اس کی دوڑ دھوپ میں لگا ہوا ہے، یہ خود عذاب نہیں تو اور کیا ہے۔

قناعت میں ''راحت'' ہے

''راحت'' اگر کسی چیز میں ہے تو وہ ''قناعت'' میں ہے، یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے حلال طریقے سے عطا فرمایا ہے، الحمدللہ! میرے لئے وہ کافی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مشروع اور جائز طریقوں سے جتنی دنیا طلب کرنے کی اجازت دی ہے، اتنی طلب کرتا رہوں گا، جو مل گیا اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ہے اور اس کا احسان ہے، یہ ہے ''راحت''۔ یاد رکھئے! طلب دنیا اور حبِّ دنیا کے ساتھ کبھی ''قناعت'' جمع نہیں ہو سکتی، لہٰذا جو طالب دنیا ہوگا اور جو دنیا سے محبّت رکھنے والا ہوگا، اس کو کبھی ''قناعت'' نہیں حاصل ہوگی، وہ تو کہے گا کہ اور مل جائے اور مل جائے، اور جو شخص طالب دنیا نہیں ہے وہ تو یہ

سوچے گا کہ ٹھیک ہے دنیا بھی ہماری زندگی کا ایک حصّہ ہے، اللہ تعالیٰ نے اس زندگی کے اندر ہمارے ذمے کچھ فرائض عائد کئے ہیں، ہم ان فرائض کی ادائیگی کے لئے دنیا حاصل کر رہے ہیں اور اس شخص کے دل میں دنیا کی محبّت اور طلب اس درجے کی نہیں ہے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ''قناعت'' عطا فرمائیں گے اور قناعت سے زیادہ راحت کسی چیز میں نہیں۔

راحت میں کون؟

دیکھئے! ایک شخص وہ ہے جو دال روٹی پر گزارہ کر رہا ہے، لیکن اس کا دل مطمئن ہے کہ الحمدللہ جو کچھ مجھے مل رہا ہے، وہ حلال ہے اور میرے لئے مناسب اور ٹھیک ہے، مجھے اسی میں مزہ ہے۔ اور دوسرا شخص وہ ہے جو بریانی قورمہ کھا رہا ہے اور دنیا کی ہزاروں نعمتیں استعمال کر رہا ہے لیکن اس کے دل میں ایک کانٹا لگا ہوا ہے کہ یہ تو کوئی اچھی چیز نہیں، مجھے وہ چیز ملنی چاہئے جو فلاں کے پاس ہے، میرے پاس ویسا گھر ہو جیسا فلاں کا ہے، ویسی گاڑی ہو جیسی فلاں شخص کی ہے، ہر وقت دل میں یہ فکر لگی ہوئی ہے۔ بتایئے ان دونوں میں سے ''راحت'' کے اندر کون ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ شخص راحت میں ہے جو دال روٹی تو کھا رہا ہے لیکن اس کا دل مطمئن ہے کہ الحمدللہ جو کچھ مجھے اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، وہ میرے لحاظ سے کافی ہے۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا خوبصورت شعر ہے، مجھے تو اس کو پڑھنے میں بڑا مزہ آتا ہے، فرماتے ہیں: ؎

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مئے
میرے پیمانہ میں لیکن حاصل میخانہ ہے

یعنی جو کچھ اللہ تعالیٰ نے میرے پیمانہ میں دیدیا ہے، میرے لئے تو سارے میخانہ کا حاصل وہی ہے، اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں اور اس پر مطمئن ہوں۔ جس دن انسان کے اندر یہ ذہنیت پیدا ہو جائے گی، اس دن ساری دنیا کے بکھیڑے اور روگ ختم ہو جائیں گے۔ یاد رکھئے! اس دنیا میں ''قناعت'' کے سوا راحت حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے، اور جب دل میں ''قناعت'' نہیں ہوگی تو پھر طلب دنیا اور حبِّ دنیا ہوگی اور یہ طلب دنیا انسان کو دن رات پریشانی میں مبتلا رکھے گی۔

ایک سبق آموز قصّہ

حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''گلستان'' میں ایک قصّہ لکھا ہے کہ میں ایک مرتبہ سفر کر رہا تھا، سفر کے دوران میں نے ایک تاجر کے گھر میں قیام کیا، اس تاجر نے ساری رات میرا دماغ چاٹا اور اپنی تجارت کے قصّے مجھے سناتا رہا کہ فلاں جگہ میری یہ تجارت ہے، ہندوستان میں فلاں چیز کا کاروبار ہے، ایران میں فلاں چیز کا کاروبار ہے، خراسان میں فلاں چیز کا کاروبار ہے، وغیرہ وغیرہ سارے قصّے سنانے کے بعد آخر میں کہنے لگا کہ میری تمام آرزوئیں تو پوری ہوگئی ہیں اور میری تجارت بھی پروان چڑھ گئی ہے، البتہ اب مجھے ایک آخری سفر تجارت کے لئے کرنے کا ارادہ ہے، آپ دعا کر دیجئے کہ میرا وہ سفر کامیاب ہو جائے تو اس کے بعد قناعت کی زندگی اختیار کرلوں گا

اور بقیہ زندگی دکان پر بیٹھ کر گزار لوں گا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا کہ وہ آخری سفر کہاں کا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں یہاں سے فلاں سامان خرید کر چین جاؤں گا، وہاں اس کو فروخت کروں گا، پھر چین سے چینی شیشہ خرید کر روم لے جا کر فروخت کروں گا، اس لئے کہ چینی شیشہ روم میں اچھے داموں میں فروخت ہوتا ہے، پھر روم سے فلاں سامان لے کر اسکندریہ جاؤں گا اور وہاں اس کو فروخت کروں گا، پھر اسکندریہ سے قالین ہندوستان لے جا کر فروخت کروں گا اور پھر ہندوستان سے گلاس خرید کر حلب لے جا کر فروخت کروں گا، وغیرہ وغیرہ، اس طرح اس نے ساری دنیا کے طویل سفر کا منصوبہ پیش کیا اور کہا کہ دعا کرو کہ میرا یہ منصوبہ کسی طرح پورا ہو جائے تو اس کے بعد بقیہ زندگی قناعت کے ساتھ اپنی دکان پر گزار دوں گا، یعنی یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی بقیہ زندگی دکان پر گزارے گا۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد میں نے اس سے کہا کہ ؎

آں شنیدہ ستی کہ در صحرائے غور
رختِ سالار افتادہ اسپ طور

گفت چشمِ تنگِ دنیا دار را
یا قناعت پرکند یا خاکِ گور

میں نے اس سے کہا کہ تم نے یہ قصہ سنا ہے کہ غور کے صحراء میں ایک بہت

بڑے سوداگر کا سامان اس کے خچر سے گرا ہوا پڑا تھا، اس کا خچر بھی مرا ہوا پڑا تھا اور خود وہ سوداگر بھی مرا ہوا پڑا تھا، اور وہ سامان اپنی زبانِ حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نگاہ کو یا قناعت پُر کرسکتی ہے یا قبر کی مٹی پُر کرسکتی ہے، اس کی تنگ نگاہ کو تیسری کوئی چیز پُر نہیں کرسکتی۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ دنیا انسان کے اوپر مسلط ہو جاتی ہے تو اس کے دل میں دنیا کے سوا دوسرا خیال نہیں آتا۔ یہ ہے ''حبِ دنیا'' جس سے منع کیا گیا ہے۔

ہاتھ میں اٹھنے والی کھجلی کا کیا کروں؟

خود میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا کہ پاکستان کے ایک بہت بڑے تاجر سرمایہ دار جو دنیا کے بائیس مالدار ترین لوگوں میں سے ایک ہیں۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت کچھ دیا ہے، کچھ اچھا کام بھی کر جائیں اور ایک ایسا ادارہ قائم کریں جو سود کے بغیر لین دین کرتا ہو، شروع میں وہ بحث کرتے رہے کہ سود کے بغیر کیسے کام چلے گا، میں نے ان سے کہا کہ آپ کے ماتحت ہزاروں تجارتی ادارے ہیں، اربوں کی آپ کی آمدنی ہے، اگر ایک ادارے کو غیر سودی طریقے پر چلانے کے نتیجے میں نقصان بھی ہو جائے تو اس کو اللہ کے لئے برداشت کرلیں۔ کہنے لگے: مولوی صاحب! بات تو آپ صحیح کہتے ہیں، لیکن اس ہاتھ میں جو کھجلی ہے، اس کا کیا کروں؟ واقعی ہاتھ میں پیسے بڑھانے کی کھجلی لگ جاتی ہے، اب بتایئے وہ کھجلی والا آدمی راحت میں ہے یا وہ شخص جس کو دال روٹی مل رہی ہے اور اطمینان سے فراغت کے ساتھ مطمئن ہو کر کھا رہا ہے، وہ راحت میں ہے؟

وہ مال کس کام کا جو اولاد سے ملاقات نہ کرا سکے

کیا یہ کھجلی راحت اور آرام کی چیز ہے؟ اس کھجلی کا نتیجہ یہ ہے کہ باپ کو بیٹے کی خبر نہیں، بیٹے کو باپ کی خبر نہیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک تاجر آئے اور بتایا کہ میں فلاں جگہ کام کرتا ہوں اور میرا بیٹا فلاں جگہ کام کرتا ہے اور بات چیت کے دوران معلوم ہوا کہ پندرہ سال سے بیٹے کی شکل نہیں دیکھی۔ ارے وہ مال کس کام کا جو باپ کو اولاد سے نہ ملا سکے اور جو اولاد کے ساتھ رہنے کی لذت عطا نہ کر سکے۔

بہرحال! یہ طلب دنیا بذات خود ایک عذاب ہے، جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آخرت کے مقابلے میں تو یہ دنیا عذاب ہے ہی، لیکن بذات خود طلب دنیا ایک عذاب ہے، لہٰذا اس اعتبار سے بھی یہ دنیا قابل نفرت ہے۔ اگر کوئی چیز راحت دینے والی ہے تو وہ ''قناعت'' ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مجھے جائز اور حلال اور مشروع طریقے پر جو کچھ عطا فرمایا ہے، میرے لئے تو وہی کائنات ہے، اسی میں میرے لئے مزہ اور لذت ہے۔

دنیا کے اعتبار سے نیچے والوں کو دیکھو

اسی وجہ سے دین کے معاملے میں اپنے سے اوپر والے کو دیکھو اور دنیا کے معاملے میں ہمیشہ اپنے سے نیچے والے کو دیکھو، یہ دیکھو کہ دنیا میں ہزارہا لوگ مال کے اعتبار سے تم سے کمتر ہیں اور پریشانی میں ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمہیں وسعت عطا فرمائی ہے اور ان لوگوں سے بہتر عطا فرمایا ہے اور ان پریشانیوں سے نجات عطا فرمائی ہے۔ اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ غالب

دنیا کوئی راحت میں نہیں ہے، چنانچہ اگر ان کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کو چھوڑ کر ان کی اندرونی حالت کو ان کے پاس رکھو تو معلوم ہوگا کہ کوئی پریشانی سے خالی نہیں، ہر آدمی کے اندر دنیا کا روگ لگا ہوا ہے۔

ایک مجذوب کی قناعت

آگے فرمایا کہ بخلاف طالب آخرت کے، کہ سب کے سب راحت میں ہیں'' کیوں؟ اس لئے کہ ان کو قناعت حاصل ہے اور قناعت کے نتیجے میں ان کو کوئی فکر ہی نہیں۔ ہمارے دیوبند میں ایک ٹیلہ پر ہماری ہمشیرہ کا ایک مکان تھا، وہاں ایک مجذوب پڑا رہتا تھا، ہماری ہمشیرہ اس سے کہتیں کہ فلاں چیز بازار سے لادو، وہ لے آیا کرتا تھا اور اس کے عوض میں ہمشیرہ اس کو پیسے یا کھانا دیدیا کرتی تھیں، وہ مجذوب کبھی بات مان لیتا تھا اور بازار چلا جاتا تھا اور کبھی منع کر دیتا تھا۔ ایک مرتبہ ہمشیرہ نے اس سے کہا کہ فلاں چیز بازار سے لادو، تمہیں ایک پیسہ دوں گی، اس مجذوب نے کہا کہ میں نہیں جاتا، ہمشیرہ نے پوچھا کہ کیوں نہیں جاتے؟ اس مجذوب نے کہا کہ مجھے بھوک نہیں ہے؟ مطلب یہ تھا کہ کام میں اس وقت کروں جب بھوک لگی ہو اور پیسوں کی ضرورت ہو، تاکہ ان پیسوں سے کھانا خریدوں اور بھوک مٹاؤں، ابھی تو مجھے بھوک نہیں ہے، لہٰذا مجھے کام کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

فقیری کے اندر سکون اور اطمینان ہے

آپ اس شخص کی ''قناعت'' دیکھیں کہ یہ کہتا ہے کہ جب پیسوں کی ضرورت ہوگی تو کام کروں گا، ابھی کیا ضرورت ہے، جب بھوک ہوگی تو اس

وقت مزدوری کر کے پیسہ کما لوں گا، لیکن اس شخص کے چہرے پر جو فراغت اور جو اطمینان اور سکون اور راحت کی شادابی نظر آتی تھی، وہ بڑے بڑے مالداروں کے چہروں پر نہیں دیکھی، اس لئے کہ اس کے اندر ''قناعت'' تھی اور اس فقیری کے اندر اس کو اطمینان اور سکون حاصل تھا۔ لہٰذا پتہ چلا کہ اطمینان اور راحت کے لئے دنیا کے اسباب ہونا ضروری نہیں بلکہ یہ اللہ جل شانہ کی عطا ہے، وہ اگر چاہیں تو دال روٹی میں عطا فرمادیں بشرطیکہ انسان کے اندر آخرت کی طلب ہو، اور اگر وہ نہ دے تو پھر بڑی کوٹھی اور بنگلے میں بھی نہ دے اور وہ کوٹھی اور بنگلے کے اندر بھی تڑپتا رہے۔ اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ ''بخلاف طالب آخرت کے کہ سب کے سب راحت میں ہیں''۔ اس لئے کہ اوّل تو دنیا کی حقیقت ان کے پیش نظر ہے اور دوسرے زیادہ کی طلب نہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو ''قناعت'' عطا فرما رکھی ہے، اس لئے زندگی آرام سے گزر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو قناعت کی زندگی عطا فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۶۳

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

دنیا کی محبّت عقلیہ ممنوع ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴

مجلس نمبر : ۶۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

مجلس نمبر۶۳

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

دنیا کی محبّت عقلیہ ممنوع ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ!

کسب دنیا ممنوع نہیں

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

میں کسب دنیا سے منع نہیں کرتا بلکہ حبِّ دنیا سے منع کرتا ہوں "کسب الحلال فریضة بعد الفریضة" بلکہ قُلْ اِنْ کَانَ آباؤ کم و ابناؤ کم الخ میں تو اللہ تعالیٰ کی کمال رحمیت کی شان ظاہر ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی محبّت سے بھی منع نہیں کرتے بلکہ احبّیت سے منع کرتے ہیں کہ دنیا کی محبت اللہ ورسول کی محبّت سے زیادہ ہو، جس کی علامت یہ ہے کہ اطاعت احکام میں اختلال ہو جائے، بلکہ طبعی احبّیت سے منع نہیں کرتے، صرف عقلی احبّیت سے منع فرماتے ہیں، اور احبّیت عقلیہ کا معیار یہ ہے کہ اطاعت احکام اور جہاد فی سبیل اللہ میں کمی نہ ہو، اگر یہ معیار محفوظ ہے تو پھر طبعی محبّت اگر دنیا سے یا بیوی سے یا اولاد سے زیادہ بھی ہو تو کچھ ڈر نہیں، اگر ایک شخص اپنے بیٹے کے مرنے پر زیادہ روئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے واقعہ کو سن کر زیادہ نہ روئے تو مؤاخذہ نہ ہوگا، مؤاخذہ اس پر ہوگا کہ تزاحم دین و دنیا کے موقع پر دنیا کو دین پر

ترجیح دے، اور اگر یہ نہ ہو بلکہ دنیا کی محبّت اور حرص کو دبا کر دین پر فدا کر دے، گو ترک دنیا سے حزن بھی ہو اور دل بھی دکھے تو اس پر مواخذہ تو کیا ہوتا، اس سے ثواب بڑھے گا، کمال تقویٰ یہی ہے کہ دنیا کی حرص و محبّت ہوتے ہوئے بھی اس کا مقابلہ کیا جائے۔

شہوتِ دنیا مثل گلخن است
کہ ازو حمام تقویٰ روشن است

خلاصہ یہ کہ محض حرص دنیا مذموم نہیں بلکہ اس کے مقتضیٰ پر عمل کرنا مذموم ہے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۷۸)

قرآنِ کریم کا ارشاد

قرآن کریم کی آیت ہے:

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ن اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط

(سورۃ التوبۃ، آیت ۲۴)

یعنی اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا

قبیلہ اور خاندان، اور تمہارے وہ مال و دولت جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں نکاسی نہ ہونے کا تم اندیشہ رکھتے ہو اور وہ گھر جن (میں رہنے) کو تم پسند کرتے ہو، اگر یہ سب چیزیں تمہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے اور اس کے راستے میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم بھیج دیں۔

فی نفسہٖ دنیا کی محبّت مذموم نہیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں یہ بیان فرما رہے ہیں کہ اس آیت میں وعید ان چیزوں کے زیادہ محبوب ہونے پر ہے کہ یہ چیزیں اللہ اور رسول سے زیادہ محبوب نہیں ہونی چاہئیں، معلوم ہوا کہ اگر ان چیزوں سے فی نفسہٖ محبّت ہو تو تنہا یہ محبت مذموم نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت دیکھئے کہ نہ تو کسب دنیا سے منع کیا اور نہ دنیا کی ایسی محبّت سے منع کیا جو اللہ اور اس کے رسول کی محبّت سے زیادہ نہ ہو، ایسی محبت کی بھی اجازت دیدی۔

دنیا کی محبّت زیادہ ہونے کی علامت

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے گا کہ اللہ اور اس کے رسول کی محبّت زیادہ ہے یا دنیا کی محبت زیادہ ہے؟ اس کا جواب حضرت والا نے یہ دیا کہ ”جس کی علامت یہ ہے کہ اطاعت احکام میں اختلال ہو جائے“ یعنی جب مال و دولت میں انہماک کے نتیجے میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں خلل آجائے تو سمجھ لو کہ دنیا کی محبّت بڑھ گئی، یہ مقام ڈرنے کا ہے اور گناہ ہے۔

طبعی احبّیت بھی ممنوع نہیں

آگے حضرت والا نے اور آسانی کی بات ارشاد فرمائی کہ "بلکہ طبعی احبّیت سے منع نہیں کرتے، صرف عقلی احبّیت سے منع فرماتے ہیں"۔ اس میں ہمارے آپ کے لئے اور آسانی کر دی، یعنی اگر کسی شخص کو طبعی طور پر دنیا کی کسی چیز سے زیادہ تعلق اور زیادہ محبّت ہے اور اس چیز کی طرف زیادہ شوق محسوس ہوتا ہے یا اس کی طرف طبعی میلان زیادہ ہے اور اللہ اور اس کے رسول کی طرف طبعی میلان اس درجے کا نہیں ہے تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ طبعی ہونے کی وجہ سے غیر اختیاری ہے اور غیر اختیاری ہونے کی وجہ سے اس پر مؤاخذہ اور گناہ بھی نہیں۔

عقلی محبّت اللہ اور اس کے رسول سے ہونی چاہئے

البتہ عقلی محبّت دنیا کی چیزوں کے مقابلے میں اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ ہونی چاہئے، یعنی عقل سے سوچو کہ دنیا کی یہ چیزیں فانی ہیں، ناپائیدار اور بے حقیقت ہیں، البتہ ضرورت کے تحت ان کو اختیار کیا ہوا ہے، جبکہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبّت پائیدار ہے، ہمیشہ رہنے والی ہے، اس کی کوئی انتہا نہیں، جب اتنی بات سوچ لی اور اس پر عقیدہ رکھ لیا تو بس عقلی محبّت حاصل ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی کوئی انتہا ہے کہ ایک طرف تو کسب دنیا سے منع نہیں کیا، دوسری طرف دنیا سے طبعی محبّت کی بھی اجازت دیدی، تیسری طرف دنیا سے ایسی عقلی محبّت جو احبّیت کے درجے تک نہ پہنچی ہو، اس کی بھی اجازت

دیدی۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا واقعہ

حدیث شریف میں آتا ہے کہ:

كنامع النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم وھو آخذ بید عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ عنہ، فقال لہ عمر: یا رسول اللّٰہ! لأنت أحب إلیّ من کل شئی إلّا نفسی، قال: لا والذی نفسی بیدہ حتی اکون أحب الیک من نفسک، فقال لہ عمر: فإنہ الآن واللّٰہ لأنت احب إلیّ من نفسی، قال: الآن یا عمر،

(بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب کیف کانت یمین النبی صلی اللہ علیہ وسلم)

صحابی فرماتے ہیں کہ ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے اور حضور ﷺ حضرت عمرؓ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے، حضرت عمرؓ نے فرمایا یا رسول اللہ! آپ مجھے اپنے نفس کے علاوہ ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نہیں، قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے (تم مؤمن نہیں ہوسکتے) جب تک میں تمہارے نفس سے بھی زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اللہ کی قسم اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہوگئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: اب اے عمر)

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاف گوئی دیکھئے، کیا دوسرا

کوئی شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہے گا کہ مجھے آپ سے اتنی محبت نہیں، لیکن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو حقیقی کیفیت تھی وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بیان کر دی تا کہ اگر یہ کوئی بیماری ہے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کا علاج فرما دیں گے۔

ایک اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر ہاتھ مارا تو فوراً حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا "الاٰن یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" اب آپ جان سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے۔

اچانک یہ انقلاب کیسے آگیا؟

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ایک دم کیسے انقلاب آ گیا؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو فرما رہے تھے کہ آپ مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب نہیں ہیں اور اب فرما رہے ہیں کہ اب آپ جان سے بھی زیادہ محبوب ہو گئے، یہ ایک لمحہ میں کیسے انقلاب آ گیا؟ محدّثین نے اس کی دو توجیہات کی ہیں، بعض حضرات نے یہ توجیہ کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر ہاتھ مار کر تصرف فرمایا، اس کے نتیجے میں محبت میں جو کمی تھی وہ ختم ہو گئی اور جس درجے کی محبّت کی ضرورت تھی، وہ حاصل ہو گئی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ محبّت طبعی سمجھے

دوسرے علماء نے اس کی توجیہ یہ کی ہے اور حکیم الامّت حضرت تھانوی

رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اختیار فرمایا ہے، وہ یہ کہ جب حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث سنی تو آپ یہ سمجھے کہ محبت سے مراد ''محبّت طبعی'' ہے، یعنی طبعی محبّت بھی اپنی جان، اپنے مال، والدین اور اولاد کے مقابلے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ ہونی چاہئے، اس لئے انہوں نے فرمایا کہ طبعی محبت تو مجھے اپنی جان سے زیادہ ہے۔ حالانکہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ خیال صحیح نہیں تھا بلکہ آپ کو غلط فہمی تھی، کیونکہ حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد ''محبّت طبعی'' نہیں تھی بلکہ ''محبّت عقلی'' تھی، لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے سینے پر ہاتھ مار کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ تم بات غلط سمجھے، اس لئے کہ میری مراد ''محبّت عقلی'' ہے جو تمہیں پہلے ہی سے الحمدللہ حاصل ہے، اس وقت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو اپنے غلط خیال کا تنبہ ہوا اور یہ غلط فہمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے دور ہوگئی اور آپ نے فرمایا ''الآن'' یعنی اب بات میری سمجھ میں آ گئی اور واقعتہً عقلی محبّت مجھے اپنی جان کے مقابلے میں آپ سے زیادہ ہے، یہ دوسری توجیہ تھی۔

محبّت طبعی اختیار سے خارج ہے

بہرحال! جہاں کہیں محبّت مطلوب ہے اور مامور بہ ہے، وہاں ''محبّت عقلی'' مراد ہے، ''محبّت طبعی'' مراد نہیں، کیونکہ وہ انسان کے اختیار سے خارج ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کی دو بیویاں ہیں تو اس شخص کے لئے حکم یہ ہے کہ دونوں کے درمیان مساوات کرے، اس حکم کا تو تقاضہ یہ ہے کہ محبّت بھی دونوں کے

ساتھ برابر ہونی چاہئے لیکن جو محبّت برابر ہونی چاہئے، وہ ''محبت عقلی'' ہے، ''محبّت طبعی'' ایک بیوی سے زیادہ ہوسکتی ہے اور دوسری سے کم ہوسکتی ہے، اس پر مؤاخذہ نہیں، کیونکہ یہ غیر اختیاری ہے۔ البتہ مؤاخذہ اس وقت ہوگا کہ جب ایک بیوی سے ''محبت طبعی'' زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرے جو دوسری بیوی کے ساتھ نہیں کر رہا ہے اور اس کے نتیجے میں عدم مساوات لازم آجائے تو اس پر مؤخذہ ہوگا اور پکڑ ہوگی۔

حضور ﷺ کا ازواج مطہرات کے ساتھ مساوات کرنا

دیکھئے! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تمام ازواج مطہرات کے ساتھ برابری کا سلوک اس طرح فرماتے تھے کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص اس درجے کا برابری کا سلوک نہیں کرسکتا، اور اس کے بعد فرماتے:

اَللّٰھُمَّ ھذا قسمی فیما أملك فلا تلمنی
فیما لا املك۔

یا اللہ! میرے اختیار میں جتنی برابری کرنا تھا، وہ تو میں نے کر لی اور جو برابری میرے اختیار میں نہیں، اے اللہ! اس پر مؤاخذہ نہ فرمایئے۔ چنانچہ آپ کو جتنا قلبی تعلق ازواج مطہرات میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے تھا، ویسا تعلق اور کسی سے نہیں تھا، لیکن وہ طبعی تعلق تھا، البتہ عقلی محبت اور سلوک کے اعتبار سے آپ سب کے ساتھ برابری فرمایا کرتے تھے۔ بہرحال! جہاں کہیں محبّت مامور بہ ہے وہ محبت عقلی ہے۔

”محبّت عقلی“ ضابطے کا تعلق ہے

البتہ یہ ”محبت عقلی“ ضابطے کا تعلق ہے اور روکھا سوکھا تعلق ہے، یہ جہنّم سے بچنے کے لئے کافی تو ہے لیکن روکھا سوکھا ہونے کی وجہ سے کسی بھی وقت کم ہوسکتا ہے، لہٰذا اس ”محبّت عقلی“ کو بڑھانے کے اسباب اختیار کئے جائیں جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ یہ ”محبّت عقلی“ ”محبّت طبعی“ میں تبدیل ہوتی چلی جائے اور بالآخر طبعی محبّت کے اعتبار سے بھی اللہ اور اس کے رسول ہی دوسری چیزوں کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہو جائیں۔

محبّت عقلی کو محبّت طبعی میں تبدیل کرنے کا طریقہ

اور یہ ”محبّت عقلی“ ”محبّت طبعی“ میں کس طرح تبدیل ہوتی ہے؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ انسان ”محبّت عقلی“ کے مقتضٰی پر مداومت کرے اور پابندی کرے، کیونکہ جب عقلی طور پر یہ عقیدہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے محبّت زیادہ ہونی چاہئے تو پھر اللہ اور اس کے رسول کے احکام کو مقدم کرکے اپنی خواہشات دنیویہ کو اس کے مقابلے میں کچلتا رہے کچلتا رہے تو رفتہ رفتہ یہ ”محبّت عقلی“ ”محبّت طبعی“ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

مولوی اور صوفی کی محبّتوں میں فرق

”مولوی“ اور ”صوفی“ میں یہی فرق ہے کہ ”مولوی“ کی محبت ”محبّت عقلی“ اور صوفی کی محبت ”محبّت طبعی“ ہوتی ہے۔ اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ مولوی کو

چاہئے کہ وہ کسی صوفی کے پاس جائے اور اس کی صحبت اٹھائے، اور اس سے فیض حاصل کرے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مولوی کا کتابیں پڑھنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ صرف ضابطے کا روکھا پھیکا تعلق قائم ہوتا ہے، یہ ضابطے کا تعلق اس کو جہنم سے تو بچالے گا بشرطیکہ وہ احکام پر عمل کرتا رہے، لیکن اگر اس مولوی نے اسی ضابطے کے تعلق پر اکتفا کئے رکھا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ کسی وقت دوسری چیزوں کی جو محبّت طبعی اس کے دل میں ہے، وہ غالب آ جائے اور محبّت عقلی مغلوب ہو جائے۔

محبّت عقلی کو ''محبّت طبعی'' میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں

کتاب میں تو ہم نے پڑھ لیا کہ ''محبّت عقلی'' کافی ہے اور اس پر ہم خوش ہیں کہ ہمیں ''محبّت عقلی'' حاصل ہے، اب اگر ہمیں دنیا کی محبّت زیادہ لگ رہی ہے اور بیوی بچوں کی اور مال و دولت کی محبّت زیادہ معلوم ہو رہی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ محبّت طبعی ہے۔ بات تو ٹھیک ہے، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ جب تک اس محبّت طبعی کو قابو نہیں کرو گے تو اس بات کا خطرہ رہے گا کہ یہ محبّت طبعی کسی وقت محبّت عقلی پر غالب نہ آ جائے اور کوئی گناہ نہ کرا لے، ورنہ محبت عقلی تو ہر مؤمن کو حاصل ہے، کیونکہ جو شخص اس بات پر ایمان لے آیا کہ میرا خالق اللہ تعالیٰ ہیں، میرے مالک اللہ تعالیٰ ہیں، وہی کارساز ہیں، وہی محبت کے لائق ہیں، جو آدمی ان باتوں پر ایمان لے آیا، اس کو محبّت عقلی تو حاصل ہو گئی، لیکن اس کے بعد جو گناہ سرزد ہوتا ہے، وہ اس لئے ہوتا ہے کہ محبت طبعی اس محبت عقلی پر غالب آ جاتی ہے اور گناہ کرا دیتی ہے۔ لہٰذا محنت اور

مشق اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، پھر اس مجاہدے کے نتیجے میں یہ محبّت عقلی محبّت طبعی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی محبّت طبعی کا نام "عشق" ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا ایک واقعہ

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس گئے اور وہاں چالیس دن قیام کیا اور آپ کی صحبت اٹھائی، جب چالیس دن کے بعد حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ واپس جانے لگے تو حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو رخصت کرتے ہوئے فرمایا کہ میاں رشید احمد! ہم نے جو کچھ تمہیں دینا تھا، وہ دے دیا۔ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بعد میں فرماتے تھے کہ میں نے اس وقت بہت غور کیا کہ کیا دے دیا؟ بارہ سال تک سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا دیا، بارہ سال کے بعد پتہ چلا کہ اچھا یہ چیز دی، یہ وہ چیز تھی جس کو خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی کہ:

زہد زاہد را و دین دیندار را
زرّہ دردِ دل عطار را

یعنی اے اللہ! آپ زاہد کو زہد دیدیں اور دیندار کو دین دیدیں، جس کو جو چاہیں دیں لیکن مجھے دردِ دل کا ایک ذرہ عطا فرما دیں۔ وہ دردِ دل کا ذرہ جو خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ نے مانگا اور جس کے بارے میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بارہ سال بعد پتہ چلا کہ یہ چیز دی، وہ دردِ دل کا ذرہ یہی "محبّت طبعی" ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کا مقام

جب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ واپس گنگوہ پہنچے تو ایک مدت تک عجیب عالم استغراق میں رہے اور حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط بھی نہیں لکھا، یہاں تک کہ خود حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے خط لکھا کہ مدت سے آں عزیز کی کوئی خیریت معلوم نہیں ہوئی، کس حال میں ہیں؟ جواب میں حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا کہ ''حضرت! بار بار لکھنے کا ارادہ کیا لیکن اس لئے نہیں لکھ سکا کہ میں اپنی حالت زار آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں، البتہ آپ کے فیض صحبت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ الحمدللہ! شریعت طبیعت بن گئی ہے اور مادح اور ذام یکساں ہوگئے ہیں، یعنی کوئی تعریف کرے یا کوئی برائی کرے، دونوں میں کوئی فرق ہی معلوم نہیں ہوتا اور کسی مسئلہ شرعی میں الحمدللہ کوئی اشکال باقی نہیں رہا۔

یہ مقام تو ہمیں بھی حاصل نہ ہوا

جب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ خط حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ملا تو اس خط کو پڑھ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور فرمایا کہ یہ مقام تو اب تک ہمیں بھی حاصل نہیں ہوا جو ان کو حاصل ہوگیا۔ کیسے شیخ تھے اور کیسے مرید تھے۔

شریعت طبیعت بن گئی ہے

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلی بات جو ارشاد فرمائی وہ یہ تھی کہ:

''شریعت طبیعت بن گئی ہے'' یعنی درد دل کے ذرّہ نے شریعت کو طبیعت بنا دیا ہے، جب تک مدرس تھے اور پڑھا رہے تھے اور طالب علم تھے، اس وقت تک شریعت سے عقلی محبّت تھی اور جب شیخ سے اپنی اصلاح کرالی تو اب وہ محبّت عقلی محبّت طبعی میں تبدیل ہوگئی، اب طبیعت ہی وہ کام کرنا چاہتی ہے جو شریعت کا تقاضہ ہے اور خلاف شرع کی طرف طبیعت جاتی ہی نہیں۔ قرآن کریم میں صحابہ کرامؓ کے لئے اسی نعمت کو ذکر فرمایا ہے کہ:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ (سورۃ الحجرات، آیت ۷)

یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمان کو تمہارے لئے محبوب بنا دیا اور اس کو تمہارے دلوں میں مزیّن کر دیا اور کفر وفسق کو اور نافرمانی کو تمہارے دلوں میں مکروہ اور ناپسند بنا دیا، گویا کہ محبّت عقلی کو تمہارے لئے محبّت طبعی بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ دولت عطا فرمادے۔ آمین۔

صحابہ کرام اور محبّت طبعیہ

لہٰذا حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جو محبّت ملی، وہ واقعۃً اتنی محبّت طبعی تھی کہ اس کے مقابلے میں دنیا کی ہر چیز ان کی نظر میں ہیچ در ہیچ تھی۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس آیت کے آخر میں ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

أُولٰئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ۔

ان کو ''راشد'' ہونے کی سند دیدی۔ یہ سند ان کو اس مجاہدے کی وجہ سے ملی کہ انہوں نے اپنی خواہشات کو مٹا دیا تھا اور اپنی تمناؤں کو فنا کر دیا تھا، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی جو محبت آتی ہے وہ محبّت ایسی پائیدار ہوتی ہے کہ اس کے آگے دنیا کی محبت ہیچ در ہیچ ہوتی ہے۔

عشق تو ایک ہی ذات سے ہونا چاہئے

اقبال بعض اوقات بڑی حکمت کی بات کہتا ہے، ایک شعر میں وہ کہتا ہے:

وہ عشق جس کی آگ بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزہ نہیں تپش انتظار کا

یعنی عشق مجازی کی آگ کو تو اجل کی پھونک بجھا دیتی ہے، ایسے ناپائیدار عشق کی تپش میں کوئی مزہ نہیں۔ عشق تو ایک ہی ذات سے ہونا چاہئے جو ذات لافانی ہے، اس کا عشق بھی پائیدار ہے، وہ کبھی نہیں مٹ سکتا، کبھی بجھ نہیں سکتا، یہ عشق اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان اپنی خواہشات کو اللہ کے لئے فنا کر کے اور اپنی تمناؤں کو اللہ کے لئے کچل کچل کر اس دل کو اللہ کے لئے خالی کرتا ہے تو اس کے بعد یہ عشق حقیقی حاصل ہوتا ہے۔

اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر ہے، حضرت تھانوی رحمۃ

اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میرے پاس ایک لاکھ روپے ہوتے تو میں تمہیں اس شعر پر دیدیتا، وہ عجیب شعر نہ جانے کس عالم میں کہا ہے، وہ یہ ہے کہ:

ہر تمنّا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

اس میں اشارہ اللہ جل شانہ کی طرف ہے کہ میرے دل میں دنیا کی جتنی خواہشات، آرزوئیں اور تمنّائیں تھیں، وہ سب میں نے ختم کرڈالیں، اب کوئی تمنّا دل میں باقی نہیں رہی، اب اس دل کو میں نے خلوت کدہ بنالیا ہے، اے اللہ! اب یہ دل آپ کی تجلّی گاہ بننے کا منتظر ہے۔

خلاصہ

خلاصہ یہ نکلا کہ جس شخص کے پاس بھی ایمان ہے، الحمدللہ اس کو اللہ اور اس کے رسول کی محبّت بلکہ احبیّت عقلیہ تو حاصل ہے، لیکن چونکہ وہ محبّت عقلیہ علی معرض الخطر ہے، اس لئے اس کو یہ فکر کرنی چاہیئے کہ اس کی یہ محبّت عقلی محبت طبعی میں تبدیل ہو جائے، اس کے لئے محبّت اور مجاہدہ کرنا پڑتا ہے، لہٰذا جہاں اللہ تعالیٰ کے احکام کا مقابلہ ان خواہشات سے ہو جائے، وہاں ان خواہشات کو کچلو، کچلنے کے نتیجے میں یہ خواہشات کشتہ بن جائیں گے اور ان کے کشتہ بننے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ حقیقی محبّت عطا فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو حقیقی محبّت عطا فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ٦٤

حُبِّ جاہ اور اس کا علاج

حُبِّ جاہ کی حقیقت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴
مجلس نمبر : ۶۴

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ط

مجلس نمبر۶۴

حُبِّ جاہ اور اس کا علاج

حُبِّ جاہ کی حقیقت

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِيۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَ نُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنۡ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا ۔

أَمَّا بَعۡدُ!

تمہید

پچھلے چند روز سے ''حُبِّ دنیا'' کا بیان چل رہا تھا، حُبِّ دنیا کے بارے میں حضرت والا کے مختلف ارشادات کی تشریح عرض کر دی اور بقدر ضرورت اس کا بیان الحمدللہ ہو گیا۔ آگے ''حُبِّ جاہ'' سے متعلق حضرت والا کے ارشادات ذکر کئے گئے ہیں۔ حُبِّ مال اور حُبِّ دنیا'' کی طرح ''حُبِّ جاہ'' بھی ایک بہت بڑا رذیلہ ہے اور یہ بھی باطن کی بہت بڑی بیماری ہے۔

''جاہ'' کی تعریف

''جاہ'' کے معنی ہیں ''مرتبہ'' ''اسٹیٹس'' مثلاً کوئی بلند مرتبہ حاصل ہو گیا، یا کوئی بڑا عہدہ مل گیا، یا لوگوں میں شہرت حاصل ہو گئی، مقبولیت حاصل ہو گئی، لوگ عزت کرتے ہیں، تعریف کرتے ہیں، اس کا نام ''جاہ'' ہے، یعنی لوگوں کے ذہنوں میں ایسا مرتبہ پیدا ہو جانا جس کی بنا پر لوگ عزت کریں اور لوگ تعریف کریں۔

حُبِّ جاہ ہلاک کرنے والی بیماری ہے

اس ''جاہ'' کا آغاز ''حُبِّ مدح'' سے ہوتا ہے، یعنی دل میں یہ خواہش پیدا ہونا کہ دوسرے لوگ میری تعریف کریں۔ گویا کہ ''تعریف پسندی'' سے حُبِّ جاہ کا آغاز ہوتا ہے، اور جب یہ ''حُبِّ جاہ'' آگے بڑھتی ہے تو یہ بھی ''حُبِّ مال'' کی طرح انسان کو ہلاک کر دیتی ہے۔ ایک حدیث شریف میں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ما ذئبان جائعان ارسلا فی غنم بافسد لھامن حرص المرء علی المال و الشرف لدینہ۔

(ترمذی، کتاب الزہد، باب حرص المرء علی المال والشرف لدینہ)

یعنی اگر دو بھوکے بھیڑیے بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیے جائیں تو وہ بھیڑیے اتنا فساد نہیں مچائیں گے جتنا فساد ''جاہ کی محبت'' اور ''مال کی محبت'' انسان کے دین میں مچاتی ہیں۔ ایک تو بھیڑیا اور اوپر سے بھوکا اور پھر اس کو بکریوں کے گلے میں چھوڑ دیا گیا ہو، اندازہ کریں کہ وہ بھیڑیا کتنا زبردست فساد مچائے گا اور کتنی بکریوں کو چیر پھاڑ کر دے گا۔ لیکن یہ حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال انسان کے دین میں اس بھیڑیے سے بھی زیادہ فساد مچاتے ہیں اور انسان کے دین کو تباہ کر دیتے ہیں، دل کو تباہ کر دیتے ہیں، روحانی مراتب کو ختم کر دیتے ہیں، اخلاص کو ختم کر دیتے ہیں۔

حُبِّ جاہ کا پہلا حملہ اخلاص پر

دیکھئے! اگر اعمال سے ''اخلاص'' ختم ہو جائے تو پھر کیا باقی رہے گا، اگر اخلاص نہ رہا تو پھر عبادت بھی باقی نہیں رہے گی، نماز پڑھی تو وہ بیکار، اس لئے کہ اخلاص نہیں، روزہ رکھا تو وہ بیکار، اس لئے کہ اخلاص نہیں، حج کیا یا عمرہ کیا تو وہ سب بیکار، اس لئے کہ اخلاص نہیں، لہٰذا اگر اعمال سے اخلاص نکل جائے

تو پھر کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ اور اس ''حُبِّ جاہ'' کا سب سے پہلا وار اخلاص پر ہوتا ہے، کیونکہ حُبِّ جاہ پیدا ہونے کے بعد آدمی جو بھی عمل کرتا ہے، وہ لوگوں کی تعریف حاصل کرنے کی غرض سے کرتا ہے، تاکہ لوگ میری تعریف کریں، تاکہ لوگوں میں میری شہرت ہو، تاکہ لوگوں میں میری مقبولیت ہو، جب ان اغراض کے لئے وہ اعمال کر رہا ہے تو اخلاص فنا ہو گیا اور جب اخلاص فنا ہو گیا تو ہر عبادت فنا ہو گئی۔

اخلاص ختم ہونے سے کچھ نہیں بچتا

اسی لئے اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا کہ ''حُبِّ مال'' اور ''حُبِّ جاہ'' دو بھوکے بھیڑیوں کے برابر فساد مچائیں گے، بلکہ فرمایا کہ اس سے زیادہ فساد مچائیں گے، کیونکہ وہ بھیڑیے تو صرف بکریوں کا گوشت کھائیں گے لیکن ہڈیاں چھوڑ دیں گے، ہوسکتا ہے کہ کھال چھوڑ دیں، دم چھوڑ دیں، پاؤں چھوڑ دیں، گویا کہ اکثر حصہ اگرچہ کھالیں گے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ حصہ چھوڑ دیں گے، لیکن اگر حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال انسان کے دین پر حملہ آور ہو جائیں۔ العیاذ باللہ۔ تو پھر کچھ نہیں بچے گا، اس لئے کہ ہر کام میں اخلاص ختم ہو جائے گا اور اخلاص کے ختم ہونے سے کچھ نہیں بچتا، سارا عمل اکارت ہو جاتا ہے، اس لئے فرمایا کہ یہ حُبِّ مال اور حُبِّ جاہ دو بھوکے بھیڑیوں سے زیادہ فساد مچاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

''جاہ'' ایک ناپائیدار اور غیر اختیاری چیز ہے

یہ ''جاہ'' انتہائی ناپائیدار چیز ہے بلکہ ہوائی چیز ہے، جہاں تک ''مال'' کا تعلق ہے، اس کی تو پھر بھی کچھ حقیقت ہے، پیسے رکھے ہیں، جب ضرورت پیش آئے گی تو انسان اس کے ذریعہ بازار سے چیز خرید لے گا، اپنی حاجات اور اپنی خواہشات انسان اس کے ذریعہ سے پوری کرلے گا، لیکن ''جاہ'' محض اعتباری چیز ہے اور اعتبار بھی اپنا نہیں بلکہ دوسرے کا اعتبار، یعنی دوسرا شخص مجھے ایسا سمجھے، دوسرا شخص میری تعریف کرے، یہ جاہ ہے اور دوسرے کا کام انسان کے اپنے اختیار میں نہیں، پتہ نہیں میرے اس فعل پر دوسرا تعریف کرے گا یا نہیں، لیکن تمہارے دل میں اس بات کی طلب پیدا ہوگئی ہے کہ دوسرے لوگ مجھے اچھا سمجھیں، دوسرے لوگ میرے تعریف کریں، اور تعریف کرنا دوسروں کے اختیار میں ہے تمہارے اختیار میں نہیں، اس اعتبار سے یہ ''حُبِّ جاہ'' ایک ناپائیدار اور ہوائی چیز ہے۔

منصب اور عہدہ سے ''جاہ'' کا حصول ضروری نہیں

انسان کے اختیار میں زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ کوئی منصب حاصل کرلے، کوئی عہدہ حاصل کرلے، لیکن تنہا منصب اور عہدے سے تو جاہ حاصل نہیں ہوتی، جاہ تو اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اس منصب اور عہدے کے نتیجے میں لوگوں میں وقعت پیدا ہو، ورنہ کتنے منصب اور عہدے والے ایسے ہیں کہ ان کو منصب اور عہدہ تو مل گیا مگر اس کے باوجود لوگوں کے دلوں میں ان

کی وقعت پیدا نہیں ہوئی، لہٰذا مقصد حاصل نہ ہوا۔ اس لئے یہ ''جاہ'' ایسی بے اعتبار اور بے ثبات چیز ہے کہ اس کا تعلق دوسروں سے ہے اور اس کا حاصل کرنا اپنے اختیار میں نہیں۔ اس لئے سب سے پہلے انسان کو اس نکتہ پر غور کرنا چاہئے کہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا اور ایک ایسی چیز کے پیچھے پڑ گیا جس کا تعلق دوسروں سے ہے اور اپنے اختیار میں نہیں ہے، اس فکر میں کہاں پڑ گیا؟ اس فکر کو چھوڑوں۔

دوسرے کی تعریف ہوا میں اڑ جاتی ہے

دوسرے یہ کہ اگر کسی نے تمہاری تعریف کر بھی دی، مثلاً آپ نے تقریر کی اور لوگوں نے آپ کی تعریف کر دی کہ جناب! آپ نے بہت عمدہ تقریر کی، یا یہ تعریف کی کہ آپ نے بڑا اچھا مضمون لکھا، یا آپ نے بڑا اچھا فتوی لکھا، آپ بڑے اچھے عالم ہیں، آپ نے بہت عمدہ بات کہی، یا کسی وقت کسی شخص نے آپ کی تعریف میں ایک جملہ کہہ دیا تو وہ جملہ ہوا میں اڑ گیا اور اس وقت وہ جملہ سن کر آپ کو جو لذت محسوس ہوئی کہ اس نے میری تعریف کی، وہ لذت ایک لمحہ بھر کی تھی، وہ لذت ہوا میں اڑ گئی۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس لذت کو برقرار رکھنے کا کوئی طریقہ نہیں، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ آپ اسی شخص سے کہیں کہ آپ نے جو بات فرمائی تھی، وہ بہت اچھی تھی، دوبارہ وہ بات فرما دیں، جب وہ دوبارہ کہہ دے تو پھر اس سے کہیں کہ ذرا تیسری مرتبہ یہ بات فرما دیں، نتیجہ یہ کہ چند لمحوں کے لئے اس نے

جو تعریف کی وہ ہوا میں اڑ گئی، اس لئے کہ یہ کہتے ہوئے شرم آئیگی کہ ذرا دوبارہ میری تعریف کرو۔

تعریف کو سوچ کر لطف لیتے رہو

لہٰذا تعریف کا جو جملہ کسی شخص نے تمہارے بارے میں ایک مرتبہ کہہ دیا وہ دوبارہ نہیں لوٹ سکتا، اب یہی ہو سکتا ہے کہ تم بیٹھے ہوئے تصور کرتے رہو کہ کیا اچھا وقت تھا جب فلاں شخص نے یہ جملہ کہا تھا اور اس کو سن کر بڑا لطف آیا تھا، یہ تصور کر کے مزے لیتے رہو۔ ''جاہ'' کی ساری حقیقت بس یہ ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں، اس لئے یہ بالکل بے ثبات اور ناپائیدار ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں، ہوا میں اڑ جانے والی چیز ہے۔

حُبِّ جاہ ختم کرنے کا بہترین نسخہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''جاہ'' کے بارے میں ایک شعر پڑھا کرتے تھے، یاد رکھنے کے قابل ہے اور حُبِّ جاہ کو ختم کرنے کے لئے بہترین نسخہ ہے، فرماتے تھے کہ:

گرد ہو جاتی ہے حُبِّ جاہِ دنیا جس کے بعد
اک ذرا سی بات ہے اے دل کہ پھر کیا اس کے بعد

یعنی اگر آدمی یہ سوچے کہ ''پھر کیا اس کے بعد'' تو ساری ''حُبِّ جاہ'' ختم ہو جائے، کیونکہ اگر اس نے میری تعریف کر بھی دی اور مجھے اچھا کہہ بھی دیا تو اس

تعریف کا اور اس اچھا کہنے کا کیا حاصل؟ کچھ حاصل نہیں، کیا اس تعریف کرنے سے کچھ پیسے مل گئے؟ کچھ دولت مل گئی؟ کوئی جنّت مل گئی؟ یا جہنم سے رہائی کا پروانہ مل گیا؟ کیا ملا؟ کچھ نہیں ملا، لہٰذا انسان یہ سوچے کہ اگر کسی نے میری تعریف کردی تو کیا؟ نہیں کی تو کیا؟

مخلوق کی تعریف کا کیا اعتبار

تعریف بھی ایسی مخلوق نے کی جس کی نہ تو تعریف کا کوئی بھروسہ اور نہ تنقید کا کوئی بھروسہ، آج تعریف کر رہا ہے تو کل کو گالی دے گا، آج تو اس نے تمہاری تعریف کردی لیکن کل کو جب آپ ذرا سی کوئی بات اس کی طبیعت کے خلاف کردیں گے تو وہ ساری تعریفیں دھری رہ جائیں گی اور آپ کو گالی دیتا پھرے گا، بُرا بھلا کہتا پھرے گا، اس لئے کہ جو تعریف کرتا ہے وہ کبھی نہ کبھی بُرائی بھی کرے گا، خاص طور پر وہ لوگ جو نہ تو تعریف کرتے وقت حدود کے پابند رہتے ہیں اور نہ تنقید کرتے وقت حدود کے پابند رہتے ہیں، لہٰذا کسی کی تعریف سے خوش ہونا بے کار اور بے فائدہ ہے۔

پیا جسے چاہے سہاگن وہی

بلکہ اس ذات کی تعریف حاصل کرنے کی کوشش کرو جس کے سامنے پیش ہونا ہے، کسی کے ایک شعر کا ایک مصرعہ ہے کہ ؎

پیا جسے چاہے سہاگن وہی

''پیا'' محبوب کو کہتے ہیں اور ''سہاگن'' اس عورت کو کہتے ہیں جس کی ابھی شادی ہوئی ہو یعنی ''دلہن'' کو۔ اس مصرعہ کا مفہوم یہ ہے کہ دلہن وہ ہے جس کو اس کا شوہر چاہے اور اس سے محبّت کرے۔ اس مصرعہ کا پس منظر یہ ہے کہ ایک لڑکی کی شادی ہونے والی تھی، اس کی سہیلیاں اس کا سنگھار پٹار کر کے اس کو بنا سنوار کر کے دلہن بنا رہی تھیں، اب جو خاتون اس کو دیکھنے کے لئے آئے، اس کی تعریف کرے کہ تو بہت اچھی لگ رہی ہے، تو بہت خوبصورت ہے، تو بہت حسین ہے، وہ دلہن سب کی تعریفیں سنتی لیکن خوشی کا اظہار نہ کرتی، کسی نے اس سے کہا کہ تیری سہیلیاں تیرے حسن کی اور خوبصورتی کی اتنی تعریفیں کر رہی ہیں تو تجھے اس سے خوشی کیوں نہیں ہو رہی ہے، کیا وجہ ہے؟

اس دلہن نے کہا کہ ان سہیلیوں کی تعریف سے خوش تو ہو رہی ہے لیکن ان کے تعریف کرنے سے مجھے کیا ملے گا؟ ہاں! جس کے لئے میں سنواری جا رہی ہوں اور جس کے پاس مجھے جانا ہے، وہ اگر تعریف کر دے اور یہ کہے کہ تو خوبصورت ہے، تب میرے فائدے کی بات ہوگی، تمہاری تعریف تو ہوا میں اڑ جائے گی۔ لہٰذا ''پیا جسے چاہے سہاگن وہی''

مخلوق کی تعریف سے جنّت نہیں ملے گی

ذرا سوچو! اگر کسی نے آپ کی تعریف کر دی کہ آپ بہت عمدہ نماز پڑھتے ہیں، آپ بہت خشوع وخضوع سے نماز پڑھتے ہیں، ماشاء اللہ! آپ بڑے نیک ہیں، بڑے متقی ہیں، بڑے پرہیزگار ہیں، آپ بڑے بزرگ ہیں،

بتایئے! کیا لوگوں کی اس تعریف سے جنّت مل جائے گی؟ اگر آپ کے اعمال بُرے ہیں تو اس تعریف کے نتیجے میں ان اعمال کے عذاب سے نجات ہو جائے گی؟ اس وجہ سے کہ زید عمر بکر نے آپ کی تعریف کی تھی؟ ظاہر ہے کہ جب تم اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو گے تو اس وقت ان لوگوں کی تعریفوں میں کوئی وزن نہیں ہوگا، وہاں پر تو تمہارے اپنے ان اعمال کا وزن ہوگا جو اچھے اعمال تم لے کر جاؤ گے۔

عالم کے ذریعہ جہنم دھکائی جائیگی

حدیث شریف میں آتا ہے کہ سب سے پہلے جہنم جس کے ذریعہ دھکائی جائے گی، وہ عالم ہوگا جس نے اپنے علم کو "جاہ" حاصل کرنے میں استعمال کیا ہوگا، اس عالم سے کہا جائے گا کہ "تم نے یہ علم شہرت حاصل کرنے کے لئے حاصل کیا تھا، وہ شہرت تمہیں دنیا میں مل گئی، اب ہمارے پاس تمہارے لئے کوئی بدلہ نہیں۔ العیاذ باللہ العلی العظیم۔ لہٰذا دنیا کے لوگوں کی تعریف کا کچھ حاصل نہیں، لیکن اگر وہاں پہنچنے پر مالک الملک کی طرف سے یہ خوشخبری مل جائے کہ:

يَآاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيٓ اِلٰى رَبِّكِ
رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ
جَنَّتِيْ ۝ (سورۃ الفجر، آیت ۲۷ تا ۳۰)

تب تو کامیابی ہے، نہ یہ کہ زید عمر بکر یہ کہدیں کہ تم بڑے عالم ہو، متقی ہو،

پرہیزگار ہو، اس سے کچھ حاصل نہیں۔

عالم کیلئے نفس کی نگرانی ضروری ہے

یاد رکھئے! اس علم کے اندر ترفع کی شان ہے، اگر کسی کے پاس علم ہے تو اس کی خوشبو پھیلے گی اور لوگ متوجہ ہوں گے، اس کے نتیجے میں ''حُبِّ جاہ'' کا بڑا اندیشہ ہوتا ہے، اس وجہ سے جو علم حاصل کرنے کی طرف لگا ہوا ہو، یا اس کو اللہ تعالیٰ نے علم عطا فرمایا ہو، اس کو اس میدان میں ہر وقت پھونک پھونک کر قدم رکھنے چاہئیں، کیونکہ کسی بھی وقت شیطان آکر مار سکتا ہے۔ ایک شخص اچھے خاصے اخلاص کے ساتھ ایک کام شروع کرتا ہے، لیکن درمیان میں دسائس نفس اس کو گمراہ کر دیتے ہیں، اس لئے نفس کی ہر وقت نگرانی کرنی پڑتی ہے کہ کہیں راستے سے نہ بھٹک جاؤں اور اگر خود نگرانی نہ کر سکے تو پھر کسی شیخ سے کرانی پڑتی ہے، تب جا کر اس بیماری سے حفاظت ہوتی ہے۔

''قائد'' کی تعریف

آج کل علماء کے لئے، خطباء کے لئے، سیاسی قائدین کے لئے ایک چیز بہت بڑا فتنہ بن چکی ہے، وہ ہے ''خوشنودی عوام'' یعنی یہ دیکھا جائے کہ لوگ کس بات سے خوش ہونگے؟ اور پھر وہی کام کرو جس سے لوگ خوش ہوں، تاکہ عوام میں تعریف ہو کہ اس نے بڑا اچھا کام کیا ہے۔ ''قائد'' اس کو کہتے ہیں جو رہبری کرے، رہنمائی کرے اور لوگ اس کے پیچھے چلیں، اصل قائد اور لیڈر وہ ہوتا ہے جو لوگوں کو راستہ بتائے کہ تم غلط راستے پر جا رہے ہو، صحیح راستہ

یہ ہے، اس راستے پر آؤ، وہ قائد ہے۔

آج کے قائدین

آج ''قائد'' کا مطلب الٹا ہوگیا، آج ''قائد'' وہ ہے جو عوام کے پیچھے چلے اور جس کام میں عوام خوش ہوں، قائد وہی کام کرے، حالانکہ وہ قائد جانتا ہے کہ یہ عوام غلط راستے پر جا رہے ہیں، پھر بھی اس کے اندر یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ عوام سے یہ کہہ دے کہ تم غلط راستے پر جا رہے ہو، میں جو بتا رہا ہوں، اس راستے پر آؤ، آج یہ کہنے کی جرأت نہیں ہے، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہ بات کہوں گا تو وہ مجھے گندے انڈے ماریں گے اور میرے اوپر کیلے کے چھلکے پھینکیں گے، میری بُرائی کریں گے، اور چونکہ عوام کی رضامندی حاصل کرنا ہی قائد کا مقصد ہوتا ہے، لہٰذا وہ قائد عوام کی غلط باتوں کو بھی گوارا کرتا ہے تاکہ ان کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا فرمان

حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بڑے کانٹے کی بات فرماتے تھے۔ فرماتے کہ بسا اوقات حکومت کی مرضی کے خلاف کوئی بات کر کے جیل میں چلے جانا اور وہاں کی قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر لینا آسان ہوتا ہے عوام کے گندے انڈوں اور کیلے کے چھلکوں اور ان کی گالیوں کے مقابلے میں، اس لئے کہ اگر جیل میں چلا گیا اور وہاں اے کلاس مل گئی تو وہاں اطمینان سے وقت گزارے گا اور جب جیل سے باہر سے نکلے گا تو مجاہد ملّت کے خطاب

الگ ملیں گے، اس کے برعکس عوام کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہنا یہ بڑا مشکل کام ہے، اس لئے کہ بعض اوقات عوام کے خلاف کوئی بات کہنے سے عوام قتل تک کر دیتے ہیں۔ حضرت امام حاکم شہید رحمۃ اللہ علیہ جو مشہور فقیہ ہیں، اسی میں شہید ہوئے کہ انہوں نے عوام کے خلاف کوئی بات کہہ دی، عوام کے ہجوم نے ان پر چڑھائی کر دی اور شہید کر دیا، اگر یہ نہ ہو تو کم از کم بدنامی اور عدم مقبولیت تو ہو ہی جاتی ہے۔

یہ سب ''حُبِّ جاہ'' کے شعبے ہیں

بہر حال! قائد کے اندر عوام کے پیچھے چلنے کا مرض پیدا ہو گیا ہے، یہاں تک کہ علماء کرام بھی وہ بات کہنے سے کتراتے ہیں جس سے نامقبولیت ہو، یہ سب ''حُبِّ جاہ'' کے شعبے ہیں، اس لئے کہ ہر کام کے اندر مقصود یہ ہے کہ عوام کی تعریف حاصل کی جائے، اسی وجہ سے مداہنت ہو رہی ہے، اسی وجہ سے حق بات کو الٹا کیا جا رہا ہے، حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھا اور کہا جا رہا ہے، ان سب کی بنیاد ''حُبِّ جاہ'' ہے۔

مخلوق کی خوشنودی کا خیال دل سے نکال دو

لہٰذا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ مخلوق کی خوشنودی کا خیال دل سے نکالو اور یہ دل میں بٹھاؤ کہ اگر یہ مخلوق راضی بھی ہو گئی تو کیا اور ناراض ہو گئی تو کیا، راضی تو اللہ تعالیٰ کو کرنا ہے۔ جس دن اللہ تعالیٰ دلوں میں یہ بات پیدا فرما دیں، اس دن یہ سارے ''حُبِّ جاہ'' کے فتنے ختم ہو جائیں گے اور اس کے نتیجے

میں وہ کیفیت حاصل ہو جائیگی جس کو حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا تھا کہ ''مادح اور ذام یکساں ہوگئے ہیں'' یعنی تعریف کرنے والا اور بُرائی کرنے والا برابر ہے، اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ نہ تو اس کی تعریف سے مجھے کچھ فائدہ حاصل ہوگا اور نہ اس کی بُرائی سے مجھے کچھ نقصان ہوگا۔

حُبِّ جاہ نکالنے کی فکر پیدا کرو

لیکن یہ بات کہنا تو آسان ہے مگر یہ مقام رگڑے کھانے سے حاصل ہوتا ہے، جب آدمی کسی کے سامنے رگڑے کھاتا ہے، تب یہ گندگی دل و دماغ سے نکلتی ہے۔ اس کے نکالنے کے لئے کچھ مجاہدے کرنے پڑتے ہیں، مگر سب سے پہلا قدم یہ ہے کہ یہ فکر پیدا کرو کہ ہمارے دلوں سے ''حُبِّ جاہ'' نکلنی چاہئے، جب یہ فکر پیدا ہوگی تو مجاہدے کی بھی توفیق ہوگی اور کسی کے پاس جاکر اپنی اصلاح کرانے کی بھی فکر ہوگی، لیکن جہاں فکر ہی نہیں بلکہ غفلت ہے اور دماغ میں یہ خیال ہے کہ ہم تو عالم صاحب ہیں اور عالم صاحب کے لئے ضروری ہے کہ لوگ آکر اس کے ہاتھ چومیں، اگر دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی اور اسی کو اپنا مقصد زندگی بنالیا اور اس کے خلاف اپنی فکر نہ کی تو سب کیا کرایا اکارت ہو جائے گا، نہ علم کا کوئی فائدہ ہوگا اور نہ عمل کا کوئی فائدہ ہوگا، اس لئے کہ اخلاص ہی ختم ہوگیا۔ اللہ جل شانہ اپنے فضل و کرم سے ہمارے اندر یہ فکر پیدا فرمادے اور ہمیں اس غفلت سے نکال دے اور اخلاص عطا فرمادے اور حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال ہمارے دلوں سے ختم فرمادے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۶۵

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

کونسی جاہ مذموم ہے؟

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر ۴
مجلس نمبر : ۶۵

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

مجلس نمبر ٦٥

حُبِّ دنیا اور اس کا علاج

کونسی جاہ مذموم ہے؟

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَ نُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَیۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ یَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَأَشۡهَدُاَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِیۡكَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیۡهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا كَثِیۡرًا ۔

أَمَّا بَعۡدُ!

کونسی جاہ مضر ہے؟

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

جس ''جاہ'' سے ضرر ہوتا ہے، یہ وہ جاہ ہے جو طلب سے حاصل ہو اور جو بدون طلب حاصل ہو، وہ مضر نہیں ہوتی، اس میں اللہ تعالیٰ کی امداد ہوتی ہے، اگر لوگ اس پر حسد کریں اور اس کو بُرا بھلا کہنے لگیں تو حق تعالیٰ اس کو قوی کر دیتے ہیں جس سے کوئی اذیت اس کے نزدیک اذیت نہیں رہتی، نیز ان مصائب سے جو باطنی ترقی ہوتی ہے، حق تعالیٰ اسے قلب پر منکشف فرما دیتے ہیں اور ہر واقعہ کی حکمت پر مطلع فرما دیتے ہیں، اب اسے کچھ تکلیف نہیں ہوتی۔ (انفاس عیسیٰ، صفحہ ۱۸۲)

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ ''حُبّ جاہ'' باطنی بیماریوں میں بہت ہی سنگین اور بہت ہی خطرناک بیماری ہے، یہ ایسی چیز ہے جو بہت ناپائیدار ہے اور دوسروں کے اعتبار پر موقوف ہے، اس کا علاج یہ ہے کہ اس کی ناپائیداری کا اور اس کے پیچھے لگنے کے حماقت ہونے کا استحضار کرتے رہنا چاہئے۔

دفع مضرت کیلئے جاہ ضروری ہے

اس ملفوظ میں حضرت والا یہ بیان فرما رہے ہیں کہ ہر جاہ مضر نہیں اور ہر

جاہ ناپسندیدہ نہیں، بلکہ ''جاہ'' کا کچھ حصہ ایسا ہے جو انسان کے لئے ضروری ہے، خاص طور پر وہ ''جاہ'' جو دفع مضرت کے لئے ہو اور اپنے دفاع کے لئے ہو، اگر انسان کچھ بھی ''جاہ'' نہ رکھتا ہو تو لوگ آ کر اس کو ستائیں گے اور اس پر ظلم کریں گے اور اس کے پاس ظلم کے دفاع کرنے کا کوئی راستہ نہیں ہوگا تو یہ بھی پسندیدہ بات نہیں، اتنی جاہ تو ہونی چاہئے کہ جب آدمی کوئی بات کہے تو اس کی بات کو لوگ سن لیں اور اس کے ذریعہ اپنے سے مضرت کو دفع کر سکے۔

طلب سے حاصل ہونے والی جاہ مضر ہے

''جاہ'' وہ مضر ہے جو انسان اپنی طلب اور اپنی کوشش سے حاصل کرے، مثلاً وہ یہ کوشش کرے کہ مجھے فلاں عہدہ مل جائے، فلاں منصب مل جائے، میری شہرت ہو جائے اور باقاعدہ اہتمام اور کوشش کر کے اس کو حاصل کرنے میں لگ جائے تب تو یہ مضر ہے، لیکن اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ نے اس کی طلب کے بغیر بیٹھے بٹھائے ''جاہ'' عطا فرما دی، یا بغیر طلب کے کوئی منصب عطا فرما دیا، یا لوگوں میں مقبولیت عطا فرما دی اور اس کے لئے اس نے کوئی کوشش نہیں کی تھی، اپنے قصد سے اس کے لئے کوئی اسباب اختیار نہیں کئے تھے، لیکن مِن جانب اللہ شہرت حاصل ہو گئی تو یہ مضر نہیں بلکہ مفید ہے۔

امارت کے بارے میں حدیث

اسی وجہ سے حدیث شریف میں ''امارت'' کے بارے میں حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

لا تسئل الا مارة فانك ان أتتك عن غير مسئلة اعنت عليها وان اتتك عن مسئلة وكلتَ اليها۔

یعنی امیر اور سربراہ بننے کو طلب مت کرو، کیونکہ اگر وہ امارت تمہارے سوال کے بغیر تمہیں ملے گی تو اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہاری مدد کی جائے گی اور اگر تمہارے سوال کے نتیجے میں تمہیں امارت دی جائے گی تو اللہ تعالیٰ تمہیں امارت کے حوالے کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مدد نہیں کی جائے گی، کیونکہ تم نے خود ہی طلب کی تھی، اب خود ہی اس سے نمٹو، ہماری طرف سے کوئی مدد نہیں۔ اللہ بچائے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ فرما دیں کہ ہماری طرف سے کوئی مدد نہیں، خود ہی نمٹو، اس سے بڑا عذاب اور کیا ہوگا۔

بڑوں کی طرف سے ملنے والا منصب

لہٰذا جتنے مناصب اور عہدے ہیں، انسان ان کو حاصل کرنے کے پیچھے نہ پڑے، ہاں اگر اللہ تعالیٰ بغیر طلب کے عطا فرما دیں تو اس کو قبول کرو اور یہ سمجھو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، انشاء اللہ پھر وہ منصب اور عہدہ مضر نہیں ہوگا۔ لہٰذا یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اگر کسی منصب پر بڑے بٹھا دیں کہ یہاں بیٹھ جاؤ تو وہاں بیٹھ جانا چاہئے اور خود سے منصب طلب کرنا کہ مجھے یہ منصب دیدیا جائے، فلاں منصب دے دیا جائے، اس میں ایک تو بے برکتی ہے اور

بعض اوقات اس میں معصیت بھی ہو جاتی ہے۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا ایک واقعہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ میں جس زمانے میں دارالعلوم دیوبند میں مدرس تھا، اس زمانے میں منطق کی ایک دقیق کتاب ''رسالہ میر زاہد'' ایک استاد کے سپرد ہوئی، وہ استاد سیدھے سادے تھے اور طلباء کی جماعت شریر قسم کی تھی، بعض شریر قسم کے طالب علم ہوتے ہیں جو استاد کو پریشان کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، خاص کر اگر استاد بھی سیدھا سادہ مل جائے تو اور زیادہ ان کے دماغ چڑھ جاتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ان طلباء نے استاد کو چکر دیدیا اور پریشان کر دیا، ان استاذ نے درخواست دی کہ یہ طلباء میرے قابو میں نہیں آ رہے ہیں، مجھے کوئی اور سبق دیدیا جائے۔ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ اس وقت دارالعلوم دیوبند کے صدر مدرس تھے، اس قسم کے معاملات انہی کے پاس جایا کرتے تھے، جب ان کے پاس درخواست پہنچی تو انہوں نے اساتذہ کی مجلس بلائی اور اس میں یہ مسئلہ پیش کیا کہ یہ کتاب ''رسالہ میر زاہد'' کون پڑھائے؟ طلباء کی جماعت بھی بڑی شریر قسم کی ہے اور سوالات بھی بہت کرتے ہیں، لہٰذا ایسا استاد ہونا چاہئے جو ان کو قابو کر سکے۔ چونکہ پہلے استاد نے پڑھانے سے معذرت کر لی تھی، اس لئے اس کا اثر دوسرے استادوں پر بھی پڑا، کوئی لینے کے لئے آگے نہیں بڑھا، آخر کار حضرت شاہ صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مولوی شفیع! تم یہ کتاب پڑھا لوگے؟ میں نے

عرض کیا حضرت! بات یہ ہے کہ آپ اگر مجھ سے میری اہلیت پوچھتے ہیں تو میں تو "میزان الصرف" پڑھانے کا بھی اہل نہیں، اور اگر آپ پڑھانے کے لئے دے دیں تو بخاری شریف دے دیں۔ یعنی جب آپ اپنی طرف سے دے دیں گے اور دعا بھی کریں گے تو میں وہ بھی پڑھا دوں گا، کیا عجیب جواب دیا۔ حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ بس، تم یہ پڑھاؤ۔

طلب کے بغیر ملنے والی چیز

بہر حال! حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جو بات فرمائی کہ اپنی ذات میں دیکھو تو میں کچھ اہلیت نہیں رکھتا، لیکن جب کوئی کام بڑوں نے سپرد کر دیا تو وہ منجانب اللہ ہے، اس وقت میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھتا ہوں کہ جب وہ کام بڑوں کی طرف سے سپرد ہوگا تو اللہ تعالیٰ اس میں توفیق بھی عطا فرمائیں گے اور مدد بھی فرمائیں گے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر وہ کام کرلو۔ اب جو کام وہ کرے گا اس میں نہ تو اپنی اہلیت کا خنّاس دماغ میں ہوگا اور نہ وہ کام "حُبِّ جاہ" کے تحت ہوگا، نہ اس میں تکبر ہوگا، نہ عُجب ہوگا اور نہ ریاکاری ہوگی۔

چیز یکہ بے طلب رسد آں دادۂ خداست
آں را تو رد مکن کہ فرستادۂ خداست

یعنی جو چیز بغیر طلب کے مل جائے وہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، اس کو رد مت کرو، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہے۔ بہر حال! ایسی جاہ جو بغیر طلب کے مل

جائے، وہ نہ مذموم ہے نہ مضر ہے۔

بزرگان دین صاحب جاہ تھے

جتنے اولیاء کرام اور صوفیاء کرام ہیں، علماء دین ہیں اور بزرگان دین گزرے ہیں، یہ سب صاحب جاہ تھے، یعنی مخلوق ان پر مرتی تھی، شہرت بھی حاصل تھی، لوگ عزت کرتے تھے، ہاتھ پاؤں چومتے تھے، گویا کہ ان کو ایسی جاہ اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی جو بادشاہوں کو بھی حاصل نہیں تھی۔

ہندوستان پر ایک کی حکومت ہے

ایک انگریز نے ہندوستان کے حالات پر ایک کتاب لکھی ہے، اس کتاب میں اس نے لکھا ہے کہ "ہندوستان پر حاکم کوئی بھی آ جائے لیکن اصل حکومت یہاں ایک ہی شخص کرتا ہے، وہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔" یعنی اصل حکومت جو انسانوں کے دلوں پر ہے، وہ ان کی ہے۔

دلوں پر حکومت کرنے والے

بہرحال! یہ جاہ جو اللہ تعالیٰ نے اولیاء کرام کو، بزرگان دین کو اور علماء دین کو عطا فرمائی ہے، یہ ایسی جاہ ہے جو بڑے بڑے شہنشاہوں کو نصیب نہیں، نہ ان کو ایسی جاہ مل سکتی ہے، اس لئے کہ بادشاہ تو صرف اپنے زمانے میں کر و فر کا مظاہرہ کرلے گا لیکن دلوں پر حکومت یہی لوگ کرتے ہیں۔

بنگلہ دیش پر حکومت کرنے والے بزرگ

بنگلہ دیش کے شہر سلہٹ میں ایک بزرگ کا مزار ہے جس کو ''درگاہ شریف'' کہتے ہیں۔ اب اس محلہ کا نام بھی ''درگاہ'' ہے اور وہاں کی مسجد کا نام بھی ''درگاہ'' ہے، ان کا نام حضرت شاہ جلال صاحب مجرد یمنی رحمۃ اللہ علیہ تھا، بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے اور یہ حضرت خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ہمعصر تھے، کہا جاتا ہے کہ سلہٹ کو فتح کرنے والے بھی اصل میں یہی بزرگ تھے، یمن کے رہنے والے تھے اور مجرد تھے یعنی شادی نہیں کی تھی، یمن سے ہجرت کرکے جہاد کے لئے آئے اور یہاں پر آکر جہاد کیا۔ اب یہ حال ہے کہ سارے بنگال کے لوگوں کو جو عقیدت اور محبّت اور عظمت حضرت شاہ جلال صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے ہے، وہ دنیا میں کسی سے ہو ہی نہیں سکتی۔ ایک مرتبہ شب برأت کے موقع پر میں وہاں تھا، ان کے مزار پر حاضر ہونے والوں کا یہ عالم تھا کہ میلوں تک تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔

ایسی جاہ مضر نہیں

بہر حال! یہ اولیاء اللہ دلوں پر حکومت کرتے ہیں، لہٰذا ان سے بڑی جاہ دنیا میں کسی اور کو حاصل ہی نہیں ہوسکتی، لیکن وہ جاہ چونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بغیر طلب کے ملتی ہے، اس لئے نہ صرف یہ کہ وہ مضر نہیں بلکہ وہ جاہ ممد اور معاون بن جاتی ہے، اس کے ذریعہ دین کا کلمہ آگے پھیلتا ہے، اس کے

ذریعہ لوگوں کی اصلاح ہوتی ہے، اس کے ذریعہ فیض پھیلتا ہے، لہٰذا اپنی طرف سے شہرت کی طلب نہ کرے اور نہ اپنی طرف سے اس فکر میں نہ رہے کہ میں مشہور ہو جاؤں۔

شہرت سے اپنے کو بچاؤ

بلکہ ہر شخص شہرت سے بچے اور حق الامکان اپنے آپ کو شہرت سے بچانے کی کوشش کرے۔ اسی وجہ سے حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص دنیا میں شہرت کا لباس پہنے گا تو اللہ تعالیٰ آخرت میں اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے، شہرت کا لباس پہننے کا مطلب یہ ہے کہ کوشش کر کے اپنے لئے شہرت حاصل کر رہا ہے۔

شہرت انسان کو پریشان کر دیتی ہے

اگر آدمی غور کرے تو اس کو پتہ چلے کہ یہ شہرت کوئی طلب کرنے کی چیز نہیں بلکہ یہ تو آدمی کو پریشان کر دیتی ہے، کیونکہ جب آدمی کی شہرت ہو جاتی ہے تو ہر وقت اس کا دماغ کسی نہ کسی دھندے میں مشغول رہتا ہے، وہ آرام اور چین سے گھر میں نہیں بیٹھ سکتا، کوئی شخص اس کے پاس کسی کام کے لئے آ رہا ہے، کوئی کسی مقصد کے لئے آ رہا ہے، کوئی کسی مقصد کے لئے آ رہا ہے، ہر وقت تانتا بندھا رہتا ہے، وہ اپنا کام نہیں کر سکتا، اور جو شخص مشہور نہیں ہے، اس کے پاس کوئی نہیں آتا، وہ بالکل آزاد ہے، جو چاہے کرے۔

شہرت طلب کرنا

میرے ایک دوست نے مجھے خط لکھا کہ ''میرا دل چاہتا ہے کہ میرا بھی کوئی حلقہ اثر ہو اور کچھ معتقدین ہوں۔'' میں نے ان کو لکھا کہ تمہارے دل میں کیا بلا مول لینے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے، یہ تو ایک بلا ہے، اس لئے کہ جب تمہارا حلقہ اثر ہوگا تو پھر تمہیں نہ دن میں چین ملے گا اور نہ رات میں، یہ کوئی طلب کرنے کی چیز نہیں، ہاں! اگر اللہ تعالیٰ ویسے ہی بغیر طلب کے عطا فرما دیں تو اس کو حق سمجھ کر اس کے تقاضے پورے کرو، باقی اس کو خود سے مانگنا ایسا ہے جیسے یہ خواہش کرنا کہ ''آ بیل مجھے مار، مطلب یہ ہے کہ یہ تو بیل کو دعوت دینا ہے کہ تو آ کر مجھے سینگ مار، یہ شہرت طلب کرنا اور لوگوں کے اندر نام ہونے کو طلب کرنے کی حقیقت تو یہ ہے۔

مجھ سے سبق سیکھو

مجھ سے پوچھو کہ نہ صبح چین نہ شام چین اور نہ رات میں چین، حالانکہ حلقہ احباب زیادہ نہیں ہے، لیکن جتنے تھوڑے بہت لوگ جانتے ہیں، ہر وقت کوئی نہ کوئی مسئلہ لے کر آتے رہتے ہیں۔ ایک طرف تو لوگوں کے آنے سے ہر وقت مشغولی تو رہتی ہے، مزید یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنا ذاتی اور نجی مسئلہ لے کر آتا ہے اور آ کر اپنی پریشانی کا اظہار کرتا ہے کہ وہ کس کس مصیبت میں گرفتار ہے، ان کی باتیں سن کر طبیعت پر بڑا اثر ہوتا ہے کہ یہ بے چارہ اس

مصیبت میں ہے، یہ فلاں پریشانی میں مبتلا ہے، جس کے نتیجے میں ہر وقت دل پر کوئی نہ کوئی چوٹ لگتی رہتی ہے جس سے آدمی پریشان ہو جاتا ہے۔

گوشہ نشین آرام میں ہے

اور جو آدمی گوشہ نشین ہے، نہ اس کو کوئی جانتا ہے اور نہ اس کے پاس کوئی آتا ہے، بس تنہائی میں اپنے اللہ سے لو لگائے بیٹھا ہے، اسی میں مست ہے، اس زندگی کا کیا کہنا، لہٰذا یہ شہرت کوئی طلب کرنے کی چیز نہیں۔

خدمت کا حق ادا کرو

ہاں! اگر اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے عطا فرما دیں تو پھر اس کا حق ادا کرو، پھر اس پر اتراؤ نہیں کہ میں اتنا مشہور ہو گیا ہوں اور میری طرف اتنے آدمیوں کا رجوع ہے بلکہ اس کا حق ادا کرو اور یہ سوچو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں اتنے لوگوں کی خدمت عطا فرما دی، اتنے لوگوں کا خادم بنا دیا، لہٰذا اس خدمت کا حق ادا کرو۔

دنیا کے عہدوں کا حال

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی پیاری بات فرمایا کرتے تھے، فرماتے تھے کہ دنیا کے جتنے مناصب ہیں، ان سب کا یہ حال ہے کہ اوّل تو ان کو حاصل کرنا اپنے اختیار میں نہیں، اور اگر بالفرض کوئی منصب مل جائے تو سینکڑوں لوگ اس پر حسد کرنے والے پیدا ہو جائیں گے اور تمہیں

اس منصب سے ہٹانے کی فکر کریں گے۔

مثلاً تمہارے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں ''وزیر اعظم'' بن جاؤں، اب ''وزیر اعظم'' بننا تمہارے اختیار میں نہیں، بلکہ دوسری ملازمتوں میں تو یہ ہوتا ہے کہ تقرر کرنے والی اتھارٹی اور شخصیت ایک ہوتی ہے، اب اگر اس کی خوشامد کرلو گے یا اس کو رشوت دے کر خوش کرلو گے تو وہ تمہیں اس منصب پر فائز کردے گی، لیکن ''وزیر اعظم'' کا منصب ایسا ہے کہ اس کا تقرر کرنے والا ایک شخص نہیں ہے بلکہ کروڑوں ہیں، اب ان کروڑوں کی خوشامد کرو تاکہ وہ تمہیں ووٹ دیں اور ہر ایک کو راضی کرنے کی فکر کرو، اب کہاں تک تم ان کو راضی کرتے پھرو گے، اس لئے کہ ان کو راضی کرنا اپنے اختیار میں نہیں، اور اگر بالفرض تم مشقت اور تکلیف برداشت کر کے کسی طرح ''وزیر اعظم'' بن بھی گئے تو اب ہزاروں آدمی تمہاری ٹانگ کھینچنے کی فکر میں رہیں گے کہ کسی طرح یہ اس منصب سے اتر جائے، یہ کیوں وزیر اعظم بن گیا، مجھے وزیر اعظم بننا چاہئے تھا، لہٰذا حسد کرنے والے بے شمار لوگ ہوں گے اور اتارنے والے بے شمار ہوں گے۔

خود وزیر اعظم کو اس بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ پتہ نہیں کب اسمبلی میں عدم اعتماد کی تحریک پاس ہو جائے گی اور مجھے وزیر اعظم کے منصب سے نکال باہر کریں گے، اس لئے وزیر اعظم کو ہر وقت اسمبلی کے ممبران کو بھی خوش رکھنے کی فکر رہتی ہے کہ یہ بھی راضی رہیں، لہٰذا جب تک تم وزیر اعظم ہو، حسد کرنے والے حسد کریں گے، دنیا کے جتنے مناصب ہیں، ان سب کا یہ حال ہے۔

خادمیت کا منصب اختیار کرلو

پھر فرماتے کہ میں تمہیں ایسا منصب بتاتا ہوں جس کو حاصل کرنا تمہارے اختیار میں ہے اور جب وہ منصب حاصل ہو جائے تو کوئی شخص تم سے حسد نہیں کرے گا اور کوئی شخص تمہیں اس منصب سے اتارنے کی کوشش بھی نہیں کرے گا، وہ منصب ہے ''خادمیت'' کا لہٰذا تم خادم بن جاؤ۔ ''خادمیت'' کا منصب اپنے اختیار میں ہے، اگر میں خادم بننا چاہتا ہوں تو لوگوں کی خدمت شروع کردوں، کون میرا ہاتھ روکے گا؟ کوئی نہیں، اس منصب پر مجھ سے کوئی حسد نہیں کرے گا کہ یہ کیوں خادم بن گیا؟ اور اس منصب سے معزول ہونے کا بھی اندیشہ نہیں، جب تک چاہو، اس منصب پر برقرار رہو، تمہارے مرضی ہے، لہٰذا یہ تمہاری اپنی مرضی کا منصب ہے۔

دوسرے منصب میں خدمت کا جذبہ

لہٰذا جب تمہیں دنیا کا بھی کوئی منصب حاصل ہو، اس کو بھی یہی سمجھو کہ یہ میری خادمیت کا ایک شعبہ ہے، جب تک یہ منصب میرے پاس رہے گا، اس کے واسطے سے خدمت کرتا رہوں گا اور جب یہ منصب مجھ سے چھن جائے گا تو دوسرے طریقوں سے خدمت شروع کردوں گا، اس طرح یہ منصب کبھی بھی تمہارے ہاتھ سے نہیں جائے گا۔ لہٰذا جب کوئی منصب مل جائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرکے صحیح مصرف میں اس کو خرچ کرنے کوشش کرو اور صحیح مصرف میں اس کو استعمال کرو اور اپنے آپ کو خادم سمجھتے رہو۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم جب کوئی اچھا کام کریں گے تو لوگ اس پر ضرور تعریف کریں گے اور اس تعریف سے خوشی بھی ہوگی، اس لئے کہ انسان کی فطرت ہے کہ جب کوئی دوسرا اس کی تعریف کرتا ہے تو اس پر خوشی ہوتی ہے، اسی کا نام ''حُبِّ جاہ'' ہے، لہٰذا کوئی بھی اچھا کام کریں گے تو اس کے نتیجے میں ''حُبِّ جاہ'' پیدا ہوگی۔

اس کا حل یہ ہے کہ اس کام سے پہلے اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرلو کہ یا اللہ! میں یہ کام کررہا ہوں اور اس کام پر لوگ میری تعریف کریں گے اور اس تعریف پر میرا دل بھی خوش ہوگا، لیکن حقیقت میں تو یہ تعریف میری نہیں ہوگی بلکہ آپ کی تعریف ہوگی، کیونکہ جو کچھ بھی میں کام کروں گا، وہ میرے بس میں نہیں بلکہ آپ کی دی ہوئی توفیق سے ہوگا، اور جب آپ کی توفیق سے وہ کام ہوگا تو تعریف کے لائق اور سزاوار بھی آپ ہی ہیں، میں نہیں ہوں، لہٰذا جو شخص بھی میری تعریف کرے گا، حقیقت میں وہ آپ کی تعریف ہوگی، اس لئے یا اللہ! اس تعریف کو میرے لئے فتنہ نہ بنائیے۔

ایک بزرگ کا اپنی تعریف سن کر ہنسنا

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے یہ واقعہ سنا کہ ایک بزرگ تھے، ان کا یہ معمول تھا کہ جب کوئی شخص ان کی تعریف کرتا یا کوئی تعریفی جملہ کہتا، مثلاً کوئی شخص کہتا کہ حضرت! آپ بڑے عالم ہیں تو اس تعریف پر بہت

خوشی کا اظہار کرتے اور بہت خوش ہوتے اور اس کو شاباش دیتے کہ تم نے صحیح بات کہی، یا مثلاً کسی نے ان کے تقویٰ کی تعریف کردی یا ان کی سخاوت کی تعریف کردی تو اس پر بہت خوش ہوتے۔

کسی نے ان بزرگ سے کہا کہ حضرت! اگر کسی کی تعریف کی جائے تو وہ ذرا شرماتا ہے لیکن آپ کا معاملہ عجیب ہے کہ جب آپ کی تعریف کی جاتی ہے تو آپ بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہیں اور اس پر اس کو شاباش دیتے ہیں اور اس کی پیٹھ ٹھوکتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو تعریف کرانے کا شوق ہے، یہ تو تعریف پسندی ہوئی جو ٹھیک نہیں ہے۔

یہ میرے اللہ کی تعریف ہوتی ہے

جواب میں ان بزرگ نے فرمایا کہ یہ تعریف کرنے والے بیوقوف جو تعریف کرتے ہیں، یہ حقیقت میں میری تعریف نہیں ہوتی، وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہوتی ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی تعریف پر خوش ہوتا ہوں کہ یہ شخص میرے اللہ کی تعریف کر رہا ہے، اور اس پر میں اس کو شاباش دیتا ہوں، کیونکہ میں تو کچھ نہیں، میرا وجود ہی کیا ہے، میری صلاحیت ہی کیا ہے؟ میرے اندر تو کوئی وصف قابل تعریف نہیں ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص ایک دیوار کی تعریف کر رہا ہے کہ یہ دیوار بڑی شاندار ہے، تو یہ تعریف دیوار بنانے والے کی ہوئی، معمار کی ہوئی، اسی طرح اگر کوئی شخص کسی کتاب کی تعریف کر رہا ہے کہ یہ کتاب بہت اچھی ہے، وہ حقیقت میں کتاب کی تعریف نہیں ہے بلکہ اس کتاب کے لکھنے والے کی تعریف ہے یا اس کے چھاپنے والے کی تعریف ہے۔ اسی طرح

جو کچھ میری تعریف ہو رہی ہے، وہ حقیقت میں میری تعریف نہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے، اس لئے میں اللہ تعالیٰ کی تعریف پر خوش ہوتا ہوں۔

تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں

قرآن کریم اسی آیت سے شروع ہو رہا ہے کہ "الحمدللہ رب العالمین" یعنی ساری تعریفیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں تم جس چیز کی بھی تعریف کرو گے، حقیقت میں وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہوگی، لہٰذا جب بھی کوئی شخص تمہاری تعریف کرے تو یہ سوچ لو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے یہ صفت مجھے عطا فرمائی ہے، لہٰذا حقیقت میں یہ تعریف میری نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ہے، یہ سوچنے سے "حُبِّ جاہ" کی بیماری کا علاج ہوتا ہے۔

دوسروں کی تعریف پر یہ شکر کرو

دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص تمہاری تعریف کرے تو دل میں یہ شکر ادا کرو کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے اس شخص پر میری اچھائی ظاہر فرمادی جس کے نتیجے میں یہ شخص میری تعریف کر رہا ہے، اگر آپ اس شخص پر میرے عیب منکشف فرما دیتے تو یہ شخص مجھ سے نفرت کرتا، اے اللہ! آپ کا کرم ہے کہ آپ نے میرے عیب کی پردہ پوشی فرمائی اور اس کے سامنے اچھائی ظاہر کردی۔

جاہ سے اصل مقصود دفع مضرت ہے

ایک صاحب نے حضرت والا کو خط میں لکھا کہ:

کمترین کا مذاق یہی ہے کہ گمنام رہوں اور حدیث میں جو دعا آئی ہے: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْراً وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْراً اس میں لوگوں کی نظر میں بڑا معلوم ہونے کی دعا کا امر ہے جس سے اندیشہ ترقی لذت جاہ کا ہے جو خلاف مذاق ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک صاحب نے لکھا کہ میری طبیعت تو یہ چاہتی ہے کہ گمنام رہوں، کوئی شہرت نہ ہو، لوگ مجھے نہ پہچانیں، کیونکہ شہرت میں حب جاہ کا اندیشہ ہو جاتا ہے، لیکن ان صاحب کے دل میں ایک شبہ پیدا ہوا جو بہت معقول شبہ ہے اور ہر انسان کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ حضور اقدس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعائیں فرمائی ہیں۔ ان میں ایک دعا یہ بھی ہے کہ:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْراً وَفِیْ اَعْیُنِ
النَّاسِ کَبِیْراً۔

اے اللہ! مجھے اپنی نگاہ میں تو چھوٹا بنا دے اور دوسروں
کی نگاہ میں مجھے بڑا بنا دے۔

جہاں تک اپنی نگاہ میں چھوٹا بننے کا تعلق ہے وہ بات تو سمجھ میں آتی ہے، اس لئے کہ یہ تواضع ہے جس کی دعا کی گئی ہے، لیکن یہ دعا کرنا کہ میں دوسرے

لوگوں کی نگاہ میں بڑا ہو جاؤں، یہ تو حبّ جاہ ہے۔ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ اس دعا میں تو جاہ کی طلب ہوگئی کہ اے اللہ! مجھے ایسا بنا دے کہ لوگ مجھے بڑا سمجھیں اور لوگوں کے بڑا سمجھنے کی طلب اور خواہش کا نام ہی ''حبّ جاہ'' ہے، لہٰذا اس دعا کا کیا مطلب ہے؟

جاہ کا جائز درجہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جاہ کے دو درجے ہیں، ایک جائز اور مطلوب ہے اور دوسرا ناجائز، جاہ کا جو جائز درجہ ہے، اس کی طلب بھی جائز ہے۔ جاہ کا جائز درجہ یہ ہے کہ انسان کی اتنی وقعت لوگوں کے دلوں میں ہو جس کی وجہ سے وہ لوگوں کی ایذا رسانی سے بچ سکے، کیونکہ اگر انسان لوگوں کی نظر میں بالکل بے وقعت ہو جائے تو لوگ اس کو تکلیف پہنچائیں گے، مثلاً کوئی اس کا مذاق اڑائے گا، کوئی اس کو تھپڑ مار کر بھاگ جائے گا، کوئی اس کو گالی دے گا، کوئی اس کو بُرا بھلا کہہ دے گا، اس کے برخلاف اگر انسان کی تھوڑی بہت وقعت ہو تو اس کے نتیجے میں وہ لوگوں کی ایذا رسانی سے بچ سکتا ہے، لہٰذا اس نقطۂ نظر سے جاہ کا طلب کرنا کہ میں لوگوں کی ایذا رسانی سے محفوظ ہو جاؤں اور کوئی میرے اوپر بری نگاہ نہ ڈالے اور میرے خلاف کوئی بدخواہی نہ کرے، اس نقطۂ نظر سے اگر کوئی شخص جاہ طلب کرے تو جائز ہے۔

ایک لطیفہ

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑا اچھا لطیفہ سنایا

کرتے تھے کہ ایک مولانا صاحب تھے، وہ اپنے علاقے میں معروف و مشہور تھے، لوگ ان کی عزت کرتے تھے، ایک مرتبہ وہ کسی دیہات میں چلے گئے اور رات کو گاؤں کے نواب کی حویلی میں قیام کیا، اس حویلی میں رات کے وقت چوکیدار گھومتے رہتے تھے، رات کو کسی وقت قضاء حاجت کے لئے کمرے سے باہر نکلے، بیت الخلاء ذرا فاصلے پر تھا، وہاں جانے لگے، جب بیت الخلاء کے قریب پہنچے تو چوکیدار نے ان کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ یہ کوئی چور آ گیا، چنانچہ وہ فوراً ڈنڈا لے کر وہاں پہنچ گیا اور آواز دی کہ کون ہے؟ انہوں نے فوراً جواب دیا کہ ہم ہیں بڑے مولانا صاحب، یہ جواب سن کر چوکیدار رک گیا، بعد میں مولانا صاحب نے بتایا کہ اگر میں اس وقت تواضع سے کام لیتا تو یہ ڈنڈا اسی وقت میرے سر پر پڑ جاتا، بڑے مولانا صاحب کہہ کر اپنی جان بچائی۔

اب اس موقع پر جاہ کا اظہار اپنے آپ کو دوسروں کی اذیت سے بچانے کے لئے تھا، اس لئے یہ جاہ کا اظہار جائز تھا، کیونکہ اگر اس موقع پر مولانا صاحب تواضع کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہہ دیتے کہ میں تو حقیر پر تقصیر ہوں تو بس وہ ڈنڈا ان کے سر پر پڑ چکا ہوتا۔

لوگوں کی اذیت سے بچنے کیلئے جاہ کا حصول

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جو یہ دعا مانگ رہے ہیں کہ اے اللہ! مجھے اپنی نگاہ میں تو چھوٹا بنائیے لیکن لوگوں کی نگاہ میں مجھے بڑا بنائیے۔ اس سے مقصود لوگوں کی اذیت سے اور لوگوں کے تکلیف سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا

ہے اور اس مقصد کے لئے جاہ کا حصول بُری بات نہیں۔ چنانچہ حضرت والا فرماتے ہیں۔

جاہ خود مقصود نہیں بلکہ ذریعہ ہے دفع مفسدہ کا اور وہ مفسدہ اذیت خلق ہے، اس کا دافع جاہ ہے کہ وہ مانع ہوتا ہے ظالموں کی دست درازی سے الخ۔

(انفاس عیسیٰ، ص۱۸۳)

بہرحال! لوگوں کی اذیت سے بچنے کے لئے جاہ کا حصول بُری بات نہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

جلد ۵

اِصلاحی مجالِس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- کثرتِ کلام اور اس کا علاج
- سود لینے سے بخل بڑھتا ہے
- اسراف سے بچنے کی ترکیب
- گھر سے فضول سامان نکال باہر کرو۔
- اپنے خرچ گھٹائیں
- استغفار کے لئے وقت مقرر کرلیں
- سابقہ گناہوں کو یاد رکھنے کی حقیقت
- گناہوں کی تکمیل کے لئے گناہ چھوڑنے کا عزم

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

بسم الله الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالعاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ
وَالصَّلاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْم، وَعَلٰی
کل من تبعھم بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ، أمَّابعد

اللہ کے فضل وکرم سے ''اصلاح مجالس جلد پنجم'' بھی تیار ہوکر آپ کے سامنے آچکی ہے۔ الحمدللہ یہ جلد ''انفاس عیسیٰ'' کے باب دوم ''تحقیقات اور باب سوم تہذیبات'' سے متعلق مجالس کے بیانات پر مشتمل ہے، اللہ تعالیٰ ناشر اور مرتب اور دیگر حضرات کو اس کام کو صدق واخلاص سے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ اور تمام رکاوٹوں کو دور فرمائے۔ آمین۔

عبداللہ میمن

۱۰ر جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ

اجمالی فہرست مجالس

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ٦٦

تکبر کی مختلف صورتیں

مجلس نمبر ٦٧

کثرت کلام اور اس کا علاج

عنوان	صفحہ نمبر
حضرت میاں صاحبؒ کا ایک واقعہ	۶۲
ہماری مثال	۶۳
جائز بات بھی بلا ضرورت مت بولو	۶۳
نئی نسل کو کوئی زبان نہیں آتی	۶۴
اردو بولنے والوں کے چند فقرے	۶۵
حضرت تھانویؒ کا کلام. تچا تلا ہوتا ہے	۶۵
حضرت تھانویؒ کا ایک ملفوظ	۶۶
جب اعتدال ہو تو ایسا ہی کلام نکلتا ہے	۶۷
کس مقصد سے بات کر رہے ہیں؟	۶۸
حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور جھوٹ سے پرہیز	۶۹
حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا جھوٹ سے بچنا	۷۰
حضرت گنگوہیؒ اور جھوٹ سے پرہیز	۷۱
خلاصہ	۷۲

مجلس نمبر ۶۸

بخل اور اس کا علاج

بخل مال کی محبت کا نتیجہ ہے	۷۵

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ٦٩

ہر بخل مذموم نہیں

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۰ ۷

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۷۱

اِسراف اوراس کا علاج

مجلس نمبر ۲۷

اسراف سے بچنے کی ترکیب

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۳۷

گھر سے فضول سامان نکال باہر کرو

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۴۷

اپنے خرچ گھٹائیں

مجلس نمبر ۷۵

تکبر اور خجلت کا فرق

مجلس نمبر ۶۷

گناہوں کا علاج: توبہ

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۷۷

استغفار کیلئے وقت مقرر کرلیں

صفحہ نمبر	عنوان

مجلس نمبر ۷۹

گناہوں کا تریاق۔توبہ

مجلس نمبر ۸۰

گناہوں کی تکمیل کیلئے گناہ چھوڑنے کا عزم

مجلس نمبر ٦٦

تکبر کی مختلف صورتیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر، ۵
مجلس نمبر : ٦٦

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

تکبر کی مختلف صورتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

گناہگاروں کو حقیر مت سمجھو

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

اپنے تقویٰ وطہارت پر ناز کر کے گناہگاروں کو حقیر مت
سمجھو اور ان کی خطائیں معاف کر دیا کرو، تکبر کرنے
سے اندیشہ سلب نعمت کا ہوتا ہے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۶۰)

یہ مضمون پہلے بھی آچکا ہے کہ جب آدمی دین کے راستے پر قدم رکھتا ہے تو وہ شیطان جس نے یہ قسم کھائی ہے کہ میں انسان کو سیدھے راستے سے بہکانے کے لئے اس کے آگے سے، اس کے پیچھے سے، اس کے دائیں طرف سے اور اس کے بائیں طرف سے آؤں گا، وہ شیطان دین کے راستے پر قدم رکھنے والے کا راستہ ''تکبر'' کے ذریعہ مارتا ہے، اس کے دل میں تکبر اور عجب پیدا کرتا ہے کہ تم نے تو یہ بڑا اچھا کام شروع کر دیا ہے، پھر اس تکبر کے نتیجے میں دوسرے لوگوں کی تحقیر اس کے دل میں پیدا کرتا ہے، چنانچہ اس شخص کو یہ خیال آتا ہے کہ میں تو دین کے راستے پر ہوں اور یہ سب لوگ فاسق و فاجر اور جہنمی ہیں، اس خیال کے نتیجے میں اس کے سارے اعمال غارت ہو جاتے ہیں۔

نو وارد میں یہ بیماری زیادہ ہوتی ہے

دوسروں کو حقیر سمجھنے کی بیماری نو واردوں میں بہت زیادہ پائی جاتی ہے، ''نو وارد'' وہ ہے جس کو پہلے دین کی طرف کوئی دھیان نہیں تھا، اچانک اللہ تعالیٰ نے دین پر چلنے کی توفیق دیدی تو وہ اپنے کو دوسروں سے افضل سمجھنے لگتا ہے اور دوسروں کو حقیر سمجھنے لگتا ہے اور گناہگاروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا

ہے، اس کے نتیجے میں اس کے دل میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔

گناہ سے نفرت ہو

صحیح بات یہ ہے کہ نفرت گناہ سے کرو مگر گناہ کرنے والے کی ذات سے نفرت نہ کرو، کفر سے نفرت کرو مگر کافر کی ذات سے نفرت نہ کرو، فعل سے نفرت ہو، کفر سے نفرت ہو، فسق سے نفرت ہو۔ لہٰذا جب گناہ گار کی ذات سے نفرت نہ ہوگی تو پھر اگر کسی کو کسی گناہ کے اندر مبتلا دیکھو گے تو اس پر ترس آئے گا کہ یہ بیچارہ اس بیماری کے اندر مبتلا ہے۔

گناہ گار ترس کھانے کے لائق ہے

میرے خسر جناب بھائی شرافت صاحب، اللہ تعالیٰ نے ان کو بزرگوں کی صحبت نصیب فرمائی ہے، مجھے ان کی ایک عادت بہت پسند ہے کہ جب کسی کی غلط عادت کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس طرح کرتے ہیں کہ ''وہ بیچارے نماز نہیں پڑھتے'' لفظ ''بیچارے'' ضرور لگاتے ہیں، جیسے ہم کہتے ہیں کہ فلاں بیچارہ بیمار ہے، اس طرح اس کا تذکرہ کرتے اور ہمیشہ ترحم اور ترس کھانے کا انداز اختیار کرتے۔ اس لئے کہ یہ گناہ بھی ایک بیماری ہے اور جس کو بیماری لاحق ہو، اس سے نفرت کیسی! اس پر غصہ کیوں کیا جائے، بلکہ اس پر ترس کھاؤ اور اس کے لئے دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کو اس بیماری سے نکال دے۔

تکبر سے سلب نعمت کا اندیشہ ہے

اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ دوسروں پر نفرت کی نگاہ ڈالنا اور دوسروں پر تحقیر کی نگاہ ڈالنا کسی طرح بھی جائز نہیں، کیونکہ جب آدمی دوسروں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو سلبِ نعمت کا اندیشہ ہوتا ہے، یہ جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں دین پر چلنے کی توفیق دی ہے، یہ اس کی نعمت ہے یا نہیں؟

لو لا اللّٰہ ما اھتدینا ولا تصدّقنا ولا صلّینا

اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق نہ ہوتی تو نہ ہمیں ہدایت ملتی اور نہ ہم صدقہ دے سکتے اور نہ ہم نماز پڑھ سکتے۔ جو اعمال صالحہ ہو رہے ہیں، انہی کی توفیق سے ہو رہے ہیں، اس پر شکر ادا کرو۔ کیسا ناز، کیسا تکبر، کیسا عجب، کیسی تحقیر، اگر دوسروں کی تحقیر کرو گے تو اندیشہ اس بات کا ہے کہ اعمال صالحہ کرنے کی جو توفیق تمہیں عطا فرمائی ہوئی ہے، وہ کہیں سلب نہ ہو جائے، اگر آدمی یہ عجب اور تکبر نہ چھوڑے تو بعض اوقات اعمال صالحہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

اپنے بڑے سے عبارت آرائی خلاف ادب ہے

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

جس کو اپنے سے بڑا سمجھے اس کے ساتھ عبارت آرائی کرنا ادب کے خلاف ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۶۰)

مثلاً اگر آپ کسی بڑے کو خط لکھیں تو بے تکلف لکھیں، اب آپ سوچ سوچ کر مضمون بنا رہے ہیں، عبارت آرائی کر رہے ہیں اور اس میں اپنی فصاحت اور بلاغت دکھا رہے ہیں اور یہ کوشش کر رہے ہیں کہ عبارت بڑی خوبصورت ہو، ادبی ہو اور اس میں تشبیہات اور استعارے ہوں، اس طرح کی عبارت آرائی کرنا بڑوں کو خط لکھنے کے موقع پر ادب کے خلاف ہے۔

عبارت آرائی تکبر کا نتیجہ ہے

یہ چیز درحقیقت تکبر کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ جب میرا خط بڑے کے پاس جائے تو وہ خط بڑا سجا بنا ہو، آراستہ پیراستہ ہو، تاکہ میرے بارے میں ان کا تأثر اچھا ہو کہ یہ آدمی بڑا پڑھا لکھا ہے، بڑا فصیح و بلیغ ہے اور بڑا ادیب ہے، حالانکہ جس کو خط لکھا ہے وہ بڑا ہے، تم جیسے کیسے بھی ہو، وہ تمہاری حقیقت کو جانتا ہے، اس لئے اس بناوٹ کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ سیدھے سادھے بے تکلف طور پر جو الفاظ ذہن میں آئیں، وہ لکھتے چلے جاؤ۔

ہر کام میں بے تکلفی ہو

ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق یہ تھا کہ بے تکلف کام کرو، عمل میں بھی بے تکلف رہو، بات کرنے میں بھی بے تکلف رہو، لکھنے میں بھی بے تکلف رہو، حضرت والا فرماتے ہیں کہ مجلس میں جس طرح چاہو، آرام سے بیٹھو، بے تکلف ہو کر بیٹھو، کسی خاص نشست کا اہتمام نہ کرو۔ اسی طرح بے

تکلّفی سے خط لکھو، البتہ اتنا ضرور ہے کہ بدتمیزی اور بے ادبی کی بات نہ کرو۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ بڑوں کے ساتھ عبارت آرائی مناسب نہیں ہے۔

سلام میں پہل کرنے سے عار آنا تکبر ہے

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

مجھے علماء سے شکایت ہے کہ ہم لوگ اپنے کو بہت بڑا سمجھتے ہیں کہ عوام کو پہلے سلام کرنے سے ہم کو عار آتی ہے بلکہ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ پہلے دوسرے ہم کو سلام کریں۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱٦۰)

یہ بھی تکبر کا ایک شاخسانہ ہوتا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ دوسرا ہمیں سلام کرے، ہم سلام نہ کریں۔ یہ بات خاص طور پر علماء کے اندر پائی جاتی ہے، ان کے دماغ میں یہ آجاتا ہے کہ چونکہ ہم عالم ہیں، لہٰذا ہم مقتدا ہیں اور مقتدا ہونے کی وجہ سے ساری مخلوق کا فریضہ ہے کہ وہ ہمارے ساتھ تعظیم اور تکریم کا معاملہ کرے۔

علم پر شکر کرو نہ کہ تکبر

ہمارے حضرت والا بڑی اچھی بات فرمایا کرتے تھے، وہ بات یاد رکھنے کی ہے، فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں علم دیا ہے تو یہ اس کی نعمت ہے، اب تم اس نعمت کو صحیح مصرف میں استعمال کرو، اس نعمت کو اپنی بڑائی کا ذریعہ کیوں بناتے ہو؟ حقیقت میں تم بھی ایسی مخلوق ہو جیسے ساری مخلوق

ہیں، تم میں اور ان میں کیا فرق ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان کے مقابلے میں ایک نعمت زیادہ عطا فرما دی، لہٰذا اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس کو صحیح مصرف میں یعنی خدمت خلق میں استعمال کرو، اس کے نتیجے میں تمہارے علم کا نور اور اس کا فیض پھیلے گا، اس کی خوشبو دنیا میں پھیلے گی اور اس کا فائدہ ہوگا، یہ مناسب نہیں کہ اس علم کو اپنی بڑائی کا ذریعہ بنا کر بیٹھ جاؤ، اگر اللہ تعالیٰ چاہیں تو ایک لمحہ میں یہ علم سلب کرلیں، لہٰذا کس بات پر ناز کرتے ہو؟ اس لئے اس علم پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس کو صحیح مصرف یعنی خدمت خلق میں استعمال کرو اور خادم بن جاؤ۔

دوسرے مناصب غیر اختیاری ہیں

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ بڑی قیمتی بات فرمایا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اگر اس پر عمل ہو جائے تو سارے تکبر اور غرور کی جڑ کٹ جائے۔ فرمایا کرتے تھے کہ بھائی! میں تمہیں ایک منصب بتاتا ہوں، یہ ایسا منصب ہے کہ کوئی شخص تم سے یہ منصب چھینے گا نہیں، اور اس منصب کے حاصل ہونے کے نتیجے میں تمہارے ساتھ کوئی شخص حسد نہیں کرے گا، جبکہ دنیا کے دوسرے مناصب کا حال یہ ہے کہ نہ تو ان کا حاصل کرنا اپنے اختیار میں ہے، مثلاً تم چاہو کہ صدر مملکت بن جاؤ، کیا یہ تمہارے اختیار میں ہے؟ اور پھر فرض کرو کہ اگر تم صدر مملکت بن بھی گئے تو کتنے حسد کرنے والے تم پر حسد کریں گے اور ہر وقت اس بات کا خطرہ بھی

رہے گا کہ معلوم نہیں کب یہ منصب چھن جائے۔

''خادمیت'' کا منصب اختیار کرلو

آج کل کی سیاست میں ہے کہ اگر کوئی وزیر اعظم بن گیا تو اب اس کو ہر وقت یہ فکر رہتی ہے کہ میرے نیچے سے کہیں یہ کرسی نہ کھسک جائے، اب اس کے دن رات اسی پریشانی میں بسر ہوتے ہیں اور اپنی کرسی بچانے کی فکر سوار رہتی ہے۔ حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں تم کو ایک ایسا منصب بتاتا ہوں جس کو حاصل کرنا اپنے اختیار میں ہے، اور اگر حاصل کرلیا تو اس منصب پر تم سے کوئی حسد نہیں کرے گا اور کوئی تم سے وہ منصب نہیں چھینے گا، وہ ''خادم'' کا منصب ہے کہ ہر ایک کے خادم بن جاؤ اور خادمیت اختیار کرلو اور یہ سمجھو کہ میں تو خادم ہوں، عوام کا خادم، مخلوق خدا کا خادم، اپنی بیوی بچوں کا خادم، گھر والوں کا خادم، البتہ خدمت کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔

استاد، باپ اور عالم سب خادم ہیں

جو استاد بچوں کو پڑھاتا ہے، وہ بھی خدمت کرتا ہے، البتہ اس خدمت کا انداز مختلف ہوتا ہے، لہٰذا استاد بھی خادم ہے۔ اسی طرح باپ اپنے بیٹے کی تربیت کرتا ہے وہ بھی خدمت ہے، یہاں تک کہ اگر باپ بیٹے کو مار رہا ہے تو وہ بھی خدمت ہی ہے، اگر ڈانٹ رہا ہے تو وہ بھی خدمت ہی ہے، اس لئے کہ ڈانٹنے اور مارنے سے اس کا مقصد اس کے اندر اچھے اوصاف پیدا کرنا ہے۔

لہٰذا باپ بھی خادم ہے۔

اسی طرح اگر تم عالم ہو تو یہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ علم خدمت خلق کے لئے دیا ہے، تاکہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو فائدہ پہنچاؤ، بس اس علم کا مصرف یہ ہے، نہ یہ کہ اس علم کی بنیاد پر اترانے بیٹھ جاؤ یا اس کی وجہ سے تکبر میں مبتلا ہو جاؤ۔ پس عالم بھی خادم ہے

تکبر کی حد

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

تکبر یہ ہے کہ اپنی صفات حمیدہ کو اپنا کمال سمجھے، عطاء و فضل حق پر نظر نہ کرے اور دوسروں کو حقیر سمجھے، باقی اپنی صفات کی نفی کرنا تواضع نہیں ہے، مثلاً حافظ کو اپنے حفظ کا اعتقاد جائز ہے، ہاں اس کو عطیہ الٰہی سمجھنا چاہئے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۶۲)

یہ مضمون پہلے بھی آچکا ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے کوئی قابلِ تعریف صفت عطا فرمائی ہے تو اپنے اندر اس کے موجود ہونے کا اعتقاد کرنا بذات خود یہ تکبر نہیں ہے بشرطیکہ اس کو حق تعالیٰ کی عطاء سمجھے، اپنے ذاتی کمال کا اعتقاد نہ رکھے۔ جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اپنے کو ''اکمل'' سمجھنا تکبر نہیں، ''افضل'' سمجھنا تکبر ہے، مثلاً ایک شخص اپنے بارے میں یہ سوچے کہ مجھے عربی زبان آتی ہے دوسرے کو نہیں آتی، اب آدمی اس کا کیسے

اقرار کرے کہ مجھے عربی نہیں آتی۔ یا ایک شخص نے درس نظامی پڑھا ہے اور دوسرے نے نہیں پڑھا، اب آدمی کیسے یہ کہہ دے کہ میں نے درس نظامی نہیں پڑھا، کیونکہ یہ تو واقعہ کے خلاف ہوگا، اس لئے محض اتنی بات سے تکبر نہیں ہوتا، البتہ تکبر اس وقت ہوگا جب وہ اس صفت کو یا تو اپنا ذاتی کمال سمجھے کہ مجھے جو کچھ حاصل ہوا، وہ اپنے ذاتی کمال کی وجہ سے ہوا، جیسے قارون نے دعویٰ کیا تھا کہ:

اِنَّمَا اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ۔

(سورۃ القصص: آیت ۷۸)

یا وہ شخص اس صفت کو حق تعالیٰ کا عطیہ تو سمجھتا ہے لیکن اس وصف کی بنیاد پر دوسروں کی تحقیر کرتا ہے تو یہ تکبر ہے، لیکن اگر یہ دو باتیں موجود نہیں، یعنی نہ تو اس وصف کو اپنا کمال سمجھتا ہے بلکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطاء ہے، جب چاہیں سلب فرمالیں اور نہ ہی اس وصف کی وجہ سے دوسروں کی تحقیر کرتا ہے تو انشاء اللہ وہ شخص تکبر سے محفوظ رہے گا۔

تکبر سے حفاظت کا طریقہ شکر کرنا

اس تکبر سے حفاظت کا طریقہ بھی یہی ہے کہ جب کبھی اپنی کسی اچھی صفت پر نگاہ جائے تو اس پر اللہ جل شانہ کا شکر ادا کرو کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ صفت عطا فرمائی ہے، میں اس کا مستحق نہیں تھا۔ شکر کے اندر خود اس بات کا اعتراف داخل ہے کہ اے اللہ! میں اس کا مستحق نہیں

تھا، آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ صفت عطاء فرما دی۔ جس وقت آدمی یہ تصور کرے گا تو انشاء اللہ تکبر کی جڑ کٹ جائے گی۔ اسی بات کو حضرت والا فرماتے ہیں کہ ''تکبر یہ ہے کہ اپنی صفات حمیدہ کو اپنا کمال سمجھے، عطاء و فضل حق پر نظر نہ کرے اور دوسروں کو حقیر سمجھے، البتہ اپنی صفات کی نفی کرنا تواضع نہیں''

اپنے کو ''ناکارہ اور ناچیز'' کہنا تواضع نہیں

چنانچہ بعض لوگ تواضع کرتے ہوئے اپنے آپ کو ''ناکارہ، ناچیز'' کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو ناکارہ ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ سب جھوٹ ہوتا ہے، جھوٹ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کا ناکارہ کہنے کے جواب میں کہدیا جائے کہ بیشک آپ واقعی ناکارہ ہیں تو اس وقت اس کے دل پر کیا گزرے گی، دل میں اس کا یہ جواب ناگوار ہوگا۔ یہ ناگوار ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو ناکارہ کہہ رہا تھا، یہ دل سے نہیں کہہ رہا تھا بلکہ اپنے آپ کو اس لئے ناکارہ کہہ رہا تھا تاکہ لوگ مجھے متواضع سمجھیں اور لوگ جواب میں مجھے یہ کہیں کہ نہیں حضرت! آپ تو بڑے عالم و فاضل ہیں، آپ کے درجات تو بہت بلند ہیں، دیکھئے! اس میں کتنے امراض جمع ہوگئے۔ لہٰذا یہ الفاظ کہنا کہ میں ناکارہ ہوں، یہ تواضع نہیں ہے بلکہ تواضع کا دکھاوا ہے کہ میں بہت متواضع ہوں، اس لئے اپنے کو ''ناچیز'' اور ''ناکارہ'' کہتا ہوں۔

چنانچہ ہم لوگ اپنے آپ کو ''حقیر''، ''پُرتقصیر''، ''ناکارہ''، ''آوارہ'' کے جو الفاظ لکھتے ہیں، یہ اکثر و بیشتر ان امراض کا مجموعہ ہوتا ہے، اِلاّ یہ کہ کوئی شخص

''صدق دِل'' سے یہ الفاظ استعمال کرے، اور ''صدقِ دل'' کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرا شخص ان الفاظ کے جواب میں یہ تصدیق کر دے کہ بیشک آپ ایسے ہی ہیں تو اس وقت دل پر ذرہ برابر بال نہ آئے اور طبیعت پر ناگواری نہ ہو، اگر ایسا ہو تو پھر ان الفاظ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

اپنے کو کمتر سمجھنا تواضع ہے

اصل بات یہ ہے کہ ان الفاظ کے استعمال سے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ اپنے آپ کو کمتر کہنا ''تواضع'' نہیں ہے بلکہ اپنے آپ کو کمتر سمجھنا ''تواضع'' ہے۔ جو شخص حقیقی متواضع ہوگا وہ تکلفاً یہ الفاظ استعمال نہیں کرے گا اور ایسا شخص چاہے زبان سے اپنے آپ کو ''ناکارہ'' اور ''آوارہ'' کچھ بھی نہ کہے، لیکن دل میں ہر وقت اس کو اپنے عیوب پر نظر ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو ساری مخلوق سے کمتر سمجھتا ہے۔

بزرگوں کی تواضع کا قصہ

حضرت ڈاکٹر حفیظ اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں، انہوں نے ایک مرتبہ مجھ سے بیان کیا کہ میں نے خود یہ واقعہ حضرت مفتی محمد حسن صاحب امرتسری رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک مرتبہ میں تھانہ بھون میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خانقاہ میں مقیم تھا، حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی خانقاہ میں مقیم

تھے، ایک دن حضرت مولانا خیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے بیان کیا کہ میری تو عجیب حالت ہے، سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ حالت حمیدہ ہے یا رذیلہ ہے، بتاتے ہوئے بھی شرم معلوم ہوتی ہے، لیکن چونکہ آپ سے دوستی ہے، لہٰذا دوستی کی مد میں صرف آپ کے سامنے یہ حالت بیان کرتا ہوں، وہ حالت یہ ہے کہ جب میں حکیم الأمت حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں جاکر بیٹھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس مجلس میں جتنے افراد بیٹھے ہیں، یہ سب مجھ سے افضل ہیں اور یہ سب انسان ہیں اور میں ایک بیل ہوں جو انسانوں کے اندر آکر بیٹھ گیا ہوں۔ مجھے یہ پریشانی ہے کہ میری یہ حالت معلوم نہیں اچھی ہے یا بُری ہے۔

میں نے جب ان سے یہ حالت سنی تو میں نے جواب میں کہا کہ حضرت! میری بھی یہی حالت ہوتی ہے کہ جب میں حضرت والا کی مجلس میں بیٹھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ہی سب سے کمتر ہوں اور یہ سب مجھ سے افضل ہیں۔ لہٰذا ہم دونوں نے سوچا کہ ہم دونوں جاکر حضرت والا سے اپنی یہ حالت بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس پہنچے اور جاکر عرض کیا کہ ہم دونوں کی تو یہ حالت ہے، معلوم نہیں کہ یہ حالت صحیح ہے یا غلط ہے، مناسب ہے یا نہیں؟ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی حالت سن کر فرمایا کہ ارے بھائی! تم کچھ پرواہ نہ کرو، میں بھی جب مجلس میں بیٹھتا ہوں تو مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ یہ سب لوگ مجھ سے افضل ہیں اور میں ان سب سے کمتر ہوں۔

اپنے عیوب پر نگاہ کرو

بہر حال! اپنے آپ کو ''کمتر'' کہنا تواضع نہیں بلکہ ''کمتر'' سمجھنا تواضع ہے، اور جب انسان کی نگاہ اپنے عیوب پر ہوتی ہے تو اس کی نگاہ میں ساری دنیا افضل ہو جاتی ہے، کیونکہ دوسرے لوگوں کے عیوب باطنہ کی اطلاع ہے نہیں اور اپنے عیوب باطنہ کا علم ہے اور ان کا استحضار ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو یہ وصف عطاء فرما دے۔ آمین۔

صفات کی نفی کرنا تواضع نہیں

اس لئے حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں فرمایا کہ ''اپنی صفات کی نفی کرنا تواضع نہیں'' مثلاً کوئی شخص آپ سے پوچھے کہ آپ حافظ ہیں؟ آپ تواضعاً کہیں کہ میں تو حافظ نہیں ہوں، یہ تواضع نہ ہوئی بلکہ یہ تو جھوٹ ہو گیا۔ البتہ اس صفت کے بارے میں یہ سمجھے کہ یہ جو کچھ ہے، اللہ تعالیٰ کی عطاء ہے، میرے ذاتی استحقاق کے بغیر مجھے حاصل ہو گئی ہے، یہ میرا ذاتی کمال نہیں اور اس صفت کی وجہ سے میری افضلیت لازم نہیں آتی، ہو سکتا ہے کہ دوسرے مجھ سے افضل ہوں۔

صرف تحصیل علم سے تکبر نہیں نکل سکتا

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

یہ تکبر بڑا ہی خناس ہے، جب تک یہ ہمارے اندر ہے، اس وقت تک حقوقِ علم ادا نہیں ہو سکتے، اور یہ صرف علم حاصل کرنے سے نہیں نکل سکتا، جیسے کسی کو خارش کا نسخہ یاد ہو تو محض نسخہ یاد ہونے سے خارش دفع نہیں ہو سکتی، بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس نسخے کے اجزاء جمع کرو، پھر اس کا استعمال شروع کرو، مضرات سے پرہیز کرو، اور جب تک طبیب مشورہ دے اس وقت تک نسخہ کا استعمال کرو اور پرہیز جاری رکھو، جب تک طبیب نبض دیکھ کر نہ کہہ دے کہ اب خارش کا مادہ زائل ہو گیا، اس وقت تک تدبیر کو نہ چھوڑو۔ (انفاس عیسی ص ۱۶۱)

اللہ تعالیٰ ہم سب کی اس مرض سے حفاظت فرمائے اور اس سے نجات عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۶۷

کثرت کلام اور اس کا علاج

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر، ۵

مجلس نمبر : ۶۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ؕ

کثرت کلام اور اس کا علاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

چار مجاہدات

حضرات صوفیاء کرام اور بزرگان دین کے پاس جب کوئی شخص اپنی

اصلاح کرانے جاتا تھا تو حضرات صوفیاء کرام اس شخص سے چار قسم کے مجاہدات، ریاضتیں اور مشقیں کرایا کرتے تھے۔ نمبر ایک ''تقلیل طعام'' یعنی کھانا کم کھانا۔ نمبر دو ''تقلیل کلام'' یعنی بات چیت کم کرنا۔ نمبر تین ''تقلیل منام'' یعنی کم سونا۔ نمبر چار ''تقلیل الاختلاط مع الانام'' یعنی لوگوں سے کم ملنا جلنا۔ یہ چار قسم کے مجاہدات کرانے کے نتیجے میں اس شخص کی طبیعت اعتدال پر آجاتی تھی اور اعتدال پر آجانے کے بعد یہ عادتیں قابو میں آجاتی تھیں۔ چنانچہ پھر وہ شخص کھانا حد سے زیادہ نہیں کھاتا تھا اور حد سے زیادہ بولتا نہیں تھا اور حد سے زیادہ سوتا نہیں تھا اور لوگوں سے ملنا جلنا بھی حد سے زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

حلال چیزوں کا ترک کیوں کرایا جاتا ہے؟

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان مجاہدات کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ ہماری نفسانی خواہشات اعتدال سے ہٹی ہوئی ہیں اور گناہوں کی طرف مائل ہیں، لہٰذا ان خواہشات کو اعتدال پر لانے کے لئے اور سیدھا کرنے کے لئے بعض اوقات کچھ جائز چیزوں کو بھی ترک کرنا پڑتا ہے۔ ایک شخص نے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک چیز جائز اور حلال قرار دی ہے تو پھر صوفیاء کرام ان جائز اور حلال چیزوں کو کیوں چھڑواتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ نے ان کو حلال کیا ہے تو کون ان کو حرام کرسکتا ہے؟ جواب میں حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ دراصل یہ

علاج ہے، جب تم ڈاکٹر اور حکیم کے پاس جاتے ہو تو وہ ڈاکٹر تم سے کہتا ہے کہ تمہیں شوگر کی بیماری ہے، مٹھائی مت کھانا۔ اب دیکھئے کہ مٹھائی حلال ہے لیکن ڈاکٹر نے اس کو کھانے سے روک دیا، کیوں روک دیا؟ تمہاری بیماری کی وجہ سے روک دیا، کیونکہ اگر تم مٹھائی کھاؤ گے تو تمہاری شوگر بڑھ جائے گی اور اس کے نتیجے میں تمہاری بیماری میں اضافہ ہوگا۔ لہٰذا ڈاکٹر یا حکیم مٹھائی کھانے سے جو منع کر رہا ہے وہ حلال کو حرام نہیں کر رہا ہے بلکہ تمہاری ضرورت کی وجہ سے اس کے کھانے سے منع کر رہا ہے۔

طبیعت کو اعتدال پر لانا مقصود ہے

اسی طرح جب کوئی شیخ اپنے کسی مرید سے یہ کہتا ہے کہ باتیں کم کرو، کھانا کم کھاؤ، کم سو، لوگوں سے ملنا جلنا کم کرو، تو اس کا مقصد کسی حلال کو حرام کرنا نہیں ہے بلکہ تمہارا علاج کرنا ہے اور تمہیں پرہیز کرانا ہے، تاکہ اس پرہیز کے نتیجے میں تمہاری طبیعت اعتدال پر آجائے۔ لہٰذا صوفیاء کرام جو مجاہدات کراتے ہیں، ان پر اس قسم کے اعتراضات نہیں کرنے چاہئیں۔

ایک خوبصورت مثال

پھر حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا کہ اس کی مثال یوں ہے کہ جیسے یہ کاغذ ہے، اس کاغذ کو پہلے ایک طرف موڑو، اب اس کو سیدھا کرو، تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے ہو لیکن یہ سیدھا

نہیں ہوتا، اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کاغذ کو مخالف سمت میں موڑ دو، جب مخالف سمت میں موڑ دو گے تو یہ سیدھا ہو جائے گا۔

ہمارا نفس گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے

اسی طرح ہمارا نفس بھی گناہوں کی طرف اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانیوں کی طرف مڑا ہوا ہے جس کے نتیجے میں گناہوں کے خیالات آتے ہیں، گناہوں کی خواہشات دل میں پیدا ہوتی ہیں اور گناہوں کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس نفس کا علاج یہ ہے کہ اس کو مخالف سمت میں موڑا جائے اور اس سے کچھ جائز کام بھی چھڑوائے جائیں، جب اس نفس سے جائز کام چھڑاؤ گے تو یہ اعتدال پر آجائے گا۔ لہٰذا جب کوئی شخص حضرات صوفیاء کرام کے پاس جاتا تھا تو وہ اس سے یہ فرماتے تھے کہ تم کھانا کم کھایا کرو، باتیں کم کیا کرو، لوگوں سے کم ملا کرو، کم سویا کرو، یہ چار مجاہدات کرو۔

کم کھانے اور کم سونے کی ضرورت نہیں

حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو اس طریق کے مجدد اور مجتہد ہیں، انہوں نے آجکل کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے فرمایا کہ کم کھانے کی فکر میں مت پڑو بلکہ اللہ تعالیٰ نے جو وسعت دی ہے اس کے اعتبار سے کھاؤ، لہٰذا میں تمہیں "کم کھانے" کا مجاہدہ نہیں کراتا۔ اسی طرح "کم سونے" کا مجاہدہ بھی نہیں کراتا، اس لئے کہ آج کل کے جسمانی قوی ایسے ہیں کہ اگر کھانا

کم کھاؤ گے اور کم سو گے تو بیمار پڑ جاؤ گے اور جب بیمار پڑ جاؤ گے تو جو تھوڑی بہت عبادت پہلے کر سکتے تھے وہ بھی نہیں کر سکو گے۔ اس لئے میں نہ تو تقلیلِ طعام کراتا ہوں اور نہ ہی تقلیل منام کراتا ہوں۔

کم کھانے کی حد

البتہ ''تقلیل طعام'' اور ''تقلیل منام'' کا ایک نسخہ بتاتا ہوں، تم اس پر عمل کر لو، تقلیل طعام کا نسخہ یہ ہے کہ کھانا کھانے کے دوران ہر انسان کو یہ تردّد پیدا ہوتا ہے کہ مزید کھاؤں یا نہ کھاؤں، جس وقت یہ تردّد پیدا ہو اس وقت کھانا چھوڑ دو، اس سے آگے نہ بڑھو، اگر اس پر عمل کر لیا تو انشاء اللہ تعالیٰ تقلیل طعام کی برکات حاصل ہو جائیں گی اور ڈاکٹروں کے کہنے کے مطابق کبھی بیمار نہ ہو گے۔

کم سونے کی حد

اسی طرح کم سونے کے بارے میں آج کے لوگ اگر اس طرح کا مجاہدہ شروع کر دیں جس طرح کا مجاہدہ پہلے کے لوگ کیا کرتے تھے کہ چوبیس گھنٹے میں صرف ایک گھنٹے کے لئے سو گئے، اس طرح مجاہدہ کے نتیجے میں آدمی بیمار اور پاگل ہو جائے گا اور دماغ خراب ہو جائے گا، جو تھوڑا بہت پہلے کر لیتا تھا وہ بھی چھوڑ بیٹھے گا۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کل کے دور میں اس پر عمل نہیں کرنا چاہئے بلکہ یہ کرو کہ اپنی صحت کے اعتبار سے سونے کے لئے گھنٹے مقرر کر لو کہ مجھے چوبیس گھنٹے میں اتنے گھنٹے سونا چاہئے،

مثلاً چھ گھنٹے یا سات گھنٹے اور زیادہ سے زیادہ آٹھ گھنٹے، سونے کے گھنٹے مقرر کرنے کے بعد پھر اس سے زیادہ سونے سے پرہیز کرو۔ بس یہی "تقلیل منام" ہے، ان دو مجاہدات کے بارے میں تو حضرت نے یہ تفصیل بیان فرمادی ہے۔

اس طریق کا پہلا قدم "زبان پر قابو پانا ہے"

دو مجاہدات اور ہیں۔ ایک ہے "تقلیل کلام" یعنی کم بولنا، اس پر عمل کرنا بہت ضروری ہے، جب تک انسان اس پر قابو نہیں پائے گا، اس وقت تک وہ اس طریق میں نہیں چل سکے گا، جب تک یہ زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے اور اس پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے، کوئی پابندی نہیں ہے، کوئی کنٹرول نہیں ہے، اس وقت تک اس طریق پر نہیں چل سکتا، اس طریق کا پہلا قدم یہ ہے کہ زبان کو قابو میں کرو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو گوشت کا یہ لوتھڑا عطا فرمایا ہے، یہ اتنی عظیم نعمت ہے کہ پیدائش کے وقت سے جسم میں لگی ہوئی ہے اور مرتے دم تک یہ مشین کام کر رہی ہے، اس مشین کو نہ تیل دینا پڑتا ہے، نہ اس کی سروس کرنی پڑتی ہے، نہ اس کی اوور ہالنگ کرانی پڑتی ہے، نہ اس کے پارٹس تبدیل کرنے پڑتے ہیں، اور جس دن سے یہ مشین لگی ہوئی ہے مسلسل اپنا کام کر رہی ہے، اور مشین بالکل مفت میں ملی ہوئی ہے، اس کے حاصل کرنے کے لئے کوئی پیسہ بھی خرچ نہیں کیا۔

زباں کی حرکات وسکنات

یہ ایسی مشین ہے کہ جب دماغ میں یہ خیال آتا ہے کہ مجھے یہ بات اس طرح کہنی ہے، تو اسی لمحے یہ مشین اپنی حرکت اس طرح شروع کر دیتی ہے کہ وہ بات واضح طور پر لوگ سن لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے دماغ اور اس زبان میں ایک عجیب کنکشن لگا دیا ہے کہ میرے دماغ میں جو مضمون آیا، وہ مضمون لفظوں کے سانچے میں ڈھل کر زبان کے ذریعے ادا ہو کر دوسرے آدمی کے دماغ میں پہنچ جاتا ہے، کیا زبان کی مختلف حرکتوں کا طریقہ تم نے خود ایجاد کیا تھا کہ اس زبان کو اس طرح موڑوں گا تو یہ حرف ادا ہوگا اور اس طرح موڑوں گا تو یہ حرف ادا ہوگا؟ کیا تم نے خود یہ لغت وضع کی تھی جس کے ذریعہ اظہار خیال کرتے ہو؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے اور اپنی حکمت بالغہ سے ذہن کو پہلے سکھایا اور پھر زبان کو اس طرح ذہن کے تابع کر دیا کہ اِدھر دماغ میں ایک بات آئی اور اُدھر زبان سے نکل گئی۔

دماغ اور زبان کے درمیان کنکشن

اگر دونوں کے درمیان وقفہ ہوتا کہ دماغ میں تو ایک بات آ گئی، لیکن اس کو زبان پر لانے کے لئے پہلے بٹن دبانا پڑتا تو درمیان کا یہ وقفہ عذاب بن جاتا اور مشکل پیش آ جاتی اور دنیا کا کوئی کام نہ ہو پاتا، لیکن اللہ جل شانہٗ نے اپنے فضل و کرم سے اور اپنی رحمت سے دونوں کے درمیان ایسا کنکشن قائم کر دیا

کہ اِدھر دماغ میں بات آئی اور ادھر زبان سے نکل گئی، اس کے لئے نہ کوئی سوچ آن کرنا پڑتا ہے اور نہ کوئی محنت کرنی پڑتی ہے۔

ایک عبرتناک واقعہ

ویسٹ انڈیز کا ایک جزیرہ جس کا نام ''باربڈوز'' ہے۔ ایک مرتبہ وہاں جانا ہوا، وہاں بڑی عبرت کا معاملہ تھا، ایک صاحب کو دیکھا کہ ان کی زبان تھی اور زبان حرکت بھی کرتی تھی لیکن ان کے حلق میں ایسی خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ زبان کی حرکت کے باوجود آواز نہیں نکلتی تھی، چنانچہ ان کے لئے ایک آلہ تجویز کیا گیا، ہر وقت وہ آلہ ان کے ہاتھ میں رہتا تھا، جب کوئی بات ان کو کرنی ہوتی تو پہلے وہ آلہ اپنے گلے میں سوراخ پر زور سے لگاتے، اس کے دبانے سے آواز نکلتی تھی، جو آواز نکلتی تھی وہ بھی کسی انسان کی آواز معلوم نہیں ہوتی تھی بلکہ کسی جانور کی آواز معلوم ہوتی تھی جس کو سن کر بچے بے ساختہ ہنستے تھے، البتہ اس کے ذریعہ وہ اپنی بات کم از کم دوسرے کو سمجھا دیتے تھے۔

لیکن میں ان کی بیتابی کا عالم دیکھتا تھا کہ جب ان کے دماغ میں کوئی بات آتی تو فوراً نہیں کہہ سکتے تھے بلکہ وہ آلہ نکال کر لگاتے پھر آواز نکلتی، لہٰذا دماغ میں بات آنے اور زبان سے ادا کرنے کے درمیان جو وقفہ ہوتا تھا وہ وقفہ بہت بے چینی کے ساتھ گزرتا تھا۔

ہم بے شمار نعمتوں کے مالک ہیں

ہمیں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر اس لئے نہیں ہو رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ

نے یہ نعمتیں مفت میں بے مانگے بغیر کسی محنت اور مشقت کے عطا فرما رکھی ہیں، زبان بھی دے رکھی ہے، قوت گویائی بھی دے رکھی ہے، حلق کے اندر آواز بھی دے رکھی ہے، دماغ کے ساتھ اس زبان کا کنکشن بھی جوڑ رکھا ہے، جب اور جو کلمہ زبان سے ادا کرنا چاہتے ہیں، فوراً ادا کر لیتے ہیں، اس لئے اس زبان کی قدر نہیں، اللہ بچائے، اگر ان میں سے کوئی ایک چیز ناکارہ ہو جائے یا ان میں سے ایک چیز کے عمل میں خلل واقع ہو جائے تب پتہ چلے کہ یہ کیسی عظیم نعمت تھی جو ہم سے چھن گئی ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک ایک ایک ذرہ اپنے اندر نعمتوں کی ایک کائنات رکھتا ہے، ان میں ایک زبان بھی ہے۔

اس نعمت کو گناہ میں استعمال مت کرنا

قرآن کریم میں بار بار یہ حکم آتا ہے کہ غور و فکر کیا کرو، تو اس سے مراد یہی باتیں ہیں جو غور و فکر کرنے کی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کچھ نعمتیں دے رکھی ہیں، یہ زبان جو اللہ تعالیٰ نے سرکاری مشین عطا فرما رکھی ہے جس کو ہم مسلسل استعمال کر رہے ہیں، کبھی یہ سوچنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ نے کیا نعمت دے رکھی ہے، اس کو ذرا سوچا کرو، لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے ہماری کسی محنت کے بغیر، کسی مشقت کے بغیر، کسی طلب کے بغیر، پیسہ خرچ کئے بغیر محض اپنے فضل سے عطا فرمائی تو اس کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیدیا کہ ہم تمہیں یہ مشین دے تو رہے ہیں لیکن اس مشین کو دیکھ بھال کر استعمال کرنا اور اس مشین کو گناہ میں استعمال مت کرنا۔

''زبان'' آخرت کے خزانے جمع کرنے کا ذریعہ

اگر اس مشین کو صحیح استعمال کرو گے تو یہ مشین تمہارے لئے آخرت کا خزانہ جمع کرنے کا ذریعہ بن جائے گی، اگر اس زبان سے ایک مرتبہ ''سبحان اللہ'' کہہ دو گے تو یہ کلمہ تمہارے میزان عمل کا پلڑا بھر دے گا، اگر اس زبان سے ایک مرتبہ ''الحمد للہ'' کہہ دو گے تو میزان عمل کا پلڑا بھر جائے گا، یعنی اگر اللہ جل شانہ کے کسی بھی ذکر میں اس زبان کو مشغول کرو گے تو ہم تمہارے لئے میزانِ عمل کا پلڑا بھر دیں گے اور تمہارے لئے آخرت میں نیکیوں کے خزانے جمع کر دیں گے۔ اگر اس زبان سے تم ہمارے کلام کی تلاوت کرو گے تو ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھ دیں گے، اگر صرف ''الم'' پڑھو گے تو تمہارے نامہ اعمال میں تیس نیکیاں لکھی جائیں گی۔

ذرا ان کی رحمت تو دیکھئے کہ یہ مشین ان کی دی ہوئی، اس مشین میں طاقت انہی کی دی ہوئی اور یہ کلمات بھی انہی کے سکھائے ہوئے اور انہی کی توفیق سے یہ کلمات زبان سے نکل رہے ہیں، یہ کلام بھی انہی کا ہے، اس کو نازل کرنا ایک مستقل عظیم الشان نعمت ہے، پھر بھی یہ کہا جا رہا ہے کہ ان کلمات پر تمہیں انعام دیں گے، جب اس کلام کو تم ہماری دی ہوئی مشین سے پڑھو گے تو اتنی نیکیاں تمہارے نامۂ اعمال میں لکھی جائیں گی۔ ان کی رحمتوں کا کچھ ٹھکانہ ہے؟

''زبان'' جہنّم سے نکالنے والی ہے

لہٰذا اگر اس زبان کو تم صحیح استعمال کرو گے تو یہ زبان تمہارے لئے جنّت کے محل تعمیر کر سکتی ہے، اس لئے اس زبان کو اللہ کے ذکر سے تر رکھو کیونکہ یہ زبان تمہاری آخرت کی زندگی استوار کر رہی ہے اور تمہیں جہنم سے نکال رہی ہے۔ اگر کوئی ستر برس کا کافر بھی ''اشھد ان لا الہ اِلا اللّٰہ و اشھد ان محمدارسول اللّٰہ'' پڑھ لے تو اسی لمحے وہ جہنم سے نکل کر جنّت میں پہنچ جائے گا۔ بہر حال! یہ زبان اتنا بڑا کارنامہ انجام دے رہی ہے کہ انسان کو جہنم سے نکال رہی ہے اور جنّت میں داخل کر رہی ہے، جنّت میں داخل کرنے کے اسباب جمع کر رہی ہے اور آخرت کے خزانے اکٹھے کر رہی ہے۔

یہ زبان جہنّم میں لیجانے والی ہے

اس زبان کے خالق اور مالک کی طرف سے اتنا مطالبہ ہے کہ اس زبان کو ذرا سنبھال کر استعمال کرو اور اس کو گناہ کے کاموں میں استعمال مت کرو۔ کیونکہ اگر تم نے اس کو گناہ کے کاموں میں استعمال کر لیا تو پھر جہنّم میں لے جانے والی اس سے زیادہ خطرناک بھی کوئی چیز نہیں، اس لئے کہ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کو سب سے زیادہ اوندھے منہ جہنّم میں ڈالنے والی چیز ان کی زبان ہے۔ یہ زبان انسان کو بہت تیزی سے جہنّم کی طرف لے جاتی ہے، مثلاً اگر جھوٹ بولا تو اس کی سزا جہنم، اگر غیبت کی

تو اس کی سزا جہنم، کسی کی دل آزاری کی تو اسکی سزا جہنم، جو لفظ بھی زبان سے ایسا نکلے جو اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف ہو، وہ لفظ انسان کو جہنم کی طرف لے جانے والا ہے، لہٰذا آپ سے مطالبہ یہ ہے کہ اس زبان کو قابو میں رکھو تا کہ کوئی غلط بات زبان سے نہ نکلے۔

زبان کے ذریعہ غیبت

ہوتا یہ ہے کہ انسان یہ بھول جاتا ہے کہ مجھے کیسی عظیم الشان نعمت ملی ہوئی ہے اور کس نے یہ نعمت دی ہے اور کس کام کے لئے دی ہے؟ یہ سب باتیں بھول جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ دن رات صبح سے لے کر شام تک اس زبان کو بے دھڑک استعمال کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں جائز کام کر رہا ہوں۔

لیکن جب جائز کاموں کے اندر بھی اس زبان کو بے دھڑک استعمال کیا جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں کچھ خرابی ضرور آ جاتی ہے، مثلاً آپ کسی جاننے والے کا اچھائی کے ساتھ تذکرہ کر رہے ہیں کہ فلاں صاحب تو بڑے اچھے ہیں، نیک آدمی ہیں، نماز روزے کے پابند ہیں وغیرہ، آپ تو اس کے اوصاف بیان کر رہے ہیں لیکن شیطان درمیان میں ایک پیوند لگا دیگا کہ یہ صاحب ویسے تو بڑے نیک ہیں لیکن ذرا سے بے وقوف ہیں، اب ''لیکن'' لگا کر ایک جملہ بڑھا دیا، اس ایک جملے نے اس تعریف کو غیبت میں تبدیل کر دیا، وہ غیبت جس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے

کہ:

الغیبة اَشد من الزنا

یعنی غیبت زنا سے زیادہ شدید تر ہے۔ شیطان نے اس کو غیبت کے اندر مبتلا کر دیا۔

اس زبان کو قابو میں کرو

بات دراصل یہ ہے کہ جب آدمی باتیں زیادہ کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں زبان حد سے پھسل جاتی ہے اور حد پر نہیں رہتی، اس لئے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اس زبان کو قابو میں کرو اور باتیں ہی کم کرو، جب باتیں کم کرو گے تو زبان کے پھسلنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، زبان اس لئے پھسلتی ہے کہ وہ صبح سے لے کر شام تک قینچی کی طرح چل رہی ہے اور اس پر کوئی رکاوٹ اور پابندی نہیں ہے۔ جن لوگوں کو بزرگوں کی صحبت میسّر نہیں ہوتی، ان کو زبان قابو میں کرنے کی کوئی فکر بھی نہیں ہوتی، جاکر بازاروں میں دیکھیں لوگ بے دھڑک بلا سوچے زبان سے الفاظ نکالتے ہیں، کیا ان میں سے کسی کو اس بات کی فکر ہے کہ اس زبان کو بھی قابو کرنا چاہئے، بس صبح سے لے کر شام تک ان کی زبانیں چل رہی ہیں۔

بلا ضرورت نہ بولو

اس صورت حال کو بدلنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے اوپر تھوڑی

سی پابندی لگائی جائے، اسی وجہ سے حضرات صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کم بولو اور صرف ضرورت کے وقت بولو، بلا ضرورت نہ بولو بلکہ خاموش رہو۔ اور بزرگوں نے فرمایا کہ پہلے بات کو تولو پھر بولو، اس پر عمل اس وقت ہوسکتا ہے کہ جب انسان کم بولنے کی عادت ڈالے، دل تقاضہ کر رہا ہے کہ بولو لیکن اگر بولنے کی ضرورت نہیں ہے تو خاموش ہو جاؤ، مت بولو۔

حضرت میاں صاحبؒ کا ایک واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے استاذ تھے ''حضرت میاں سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ'' بڑے عجیب و غریب بزرگ تھے، ہم نے ان کی عجیب عجیب باتیں سنی ہیں، حضرت والد صاحبؒ سے بے تکلف بھی تھے۔ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ میں ایک مرتبہ ان سے ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو وہ فرمانے لگے کہ مولوی شفیع صاحب! آج ہم عربی میں باتیں کریں گے، مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ساری عمر تو کبھی عربی میں بات نہیں کی، نہ عربی میں بات کرنے کی عادت ہے اور نہ اس کی مشق ہے، اس لئے میں نے پوچھ لیا کہ حضرت ایسا کیوں؟ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ بات دراصل یہ ہے کہ جب ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں تو زبان پر قابو رہتا نہیں، جو چاہتے ہیں بولتے چلے جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں کثرت کلام میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور عربی بولنے کی نہ تمہیں زیادہ مشق ہے اور نہ مجھے زیادہ مشق ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جو ضرورت کی بات ہوگی وہی

کریں گے اور وہ بھی ٹوٹے پھوٹے انداز میں کریں گے اور ضرورت کے بغیر کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکلے گا۔

ہماری مثال

پھر حضرت میاں سیّد اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے لگے کہ ہماری مثال اس شخص جیسی ہے جو بہت ساری پونجی لے کر گھر سے نکلا تھا، شروع میں وہ اس پونجی کو بے کھٹکے لٹاتا رہا کہ کبھی یہ چیز خرید لی اور کبھی وہ چیز خرید لی، کبھی یہ چیز کھالی اور کبھی وہ چیز کھالی، یہاں تک کہ اس پونجی کا بہت تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا جب کہ اس کی منزل ابھی بہت دور ہے، اب اس شخص کا یہ حال ہوگا کہ جو پونجی باقی رہ گئی ہے اس کو سوچ سوچ کر پھونک پھونک کر خرچ کرے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ منزل تک پہنچنے سے پہلے پہلے یہ پونجی ختم ہو جائے۔

جائز بات بھی بلاضرورت مت بولو

ہماری مثال بھی ایسی ہی ہے کہ ہم نے بھی اپنی عمر کے بہت بڑے حصے میں اس زبان کی نعمت کو بے تحاشا اور بے محابا خرچ کرنے میں ضائع کر دیا، یہ پتہ نہیں کہ کتنی عمر مزید باقی ہے، اس لئے اس کی کوشش کرلیں کہ آئندہ اس زبان کو صحیح مصرف میں استعمال کرلیں اور غلط مصرف سے اس کو بچالیں، "تقلیل کلام" کا اصل منشا یہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ شروع میں بہت کم بولو، جائز بات بھی بلاضرورت مت بولو اور رفتہ رفتہ جب کم بولنے کی عادت ہو جائے گی

اور طبیعت اعتدال پر آ جائے گی تو پھر اللہ تعالیٰ کی توفیق سے منہ سے وہی بات نکلے گی جو اعتدال کے اندر ہوں۔

جب طبیعت اعتدال کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے تو پھر جو لفظ بھی زبان سے نکلتا ہے وہ تُلا ہوا نکلتا ہے، ایک سوت ادھر یا ادھر نہیں ہوتا، کہیں مبالغہ نہیں ہوتا، کہیں حد سے زیادہ تعریف نہیں ہوتی، کہیں حد سے زیادہ مذمّت نہیں ہوتی۔

نئی نسل کو کوئی زبان نہیں آتی

بعض لوگ جب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت پڑھتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ حضرت والا بڑے ثقیل ثقیل لفظ استعمال کرتے ہیں جس کی وجہ سے بعض اوقات حضرت کی بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ پہلی بات اس سلسلے میں یہ ہے کہ حضرت والا نے جس زمانے میں یہ کتابیں لکھی ہیں اور یہ ملفوظات ارشاد فرمائے ہیں، اس زمانے میں لوگوں کی ایسی حالت نہیں تھی جو حالت آج ہے، آج تو ایسی قوم تیار ہوگئی ہے جس کو کوئی زبان آتی ہی نہیں، نہ اردو، نہ فارسی، نہ عربی، نہ انگریزی، کوئی زبان صحیح نہیں آتی، آج کا گریجویٹ اور ایم اے پاس شخص جب بات کرے گا تو یہ کہے گا کہ ''میں تشریف لایا تھا، آپ حاضر ہوئے تھے'' ''میں آپ کے پاس اس لئے تشریف لایا تھا کہ آپ میرے گھر پر حاضر ہو جائیں'' اور ''میں نے آپ سے فرمایا تھا کہ آپ نے جو عرض کیا تھا'' اس طرح کے الفاظ کا عام رواج ہے، میرے پاس اچھے خاصے پڑھے

لکھے لوگوں کے خطوط آتے ہیں، اس میں املاء کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ بہر حال! ایک ایسی نسل تیار ہو رہی ہے جس کو کوئی زبان صحیح نہیں آتی، اللہ تعالیٰ ہی اس پر رحم کرے۔

اردو بولنے والوں کے چند فقرے

جس زمانے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مواعظ اور ملفوظات ارشاد فرمائے ہیں، وہ زمانہ ایسا تھا کہ اس میں عام آدمی بھی علمی اصطلاحات سے اتنا بے خبر نہیں تھا، اس زمانے کے مڈل پاس لوگوں کے خطوط آج اٹھا کر دیکھیں تو یہ نظر آئے گا کہ اس کے اندر عربی زبان کے الفاظ اس طرح استعمال کرتے تھے کہ آج کا ایم اے اور بی اے پاس شخص بھی ان کو سمجھ نہیں سکتا۔ آج کے لوگوں کا یہ حال ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ ''میں آج ایک ضیافت میں مدعو تھا'' دوسرے شخص نے کہا کہ تم عربی بول رہے ہو یا اردو بول رہے ہو؟ اس شخص نے دوبارہ یوں کہا کہ ''آج مجھے ایک فنکشن میں انوائٹ کیا گیا ہے'' تو دوسرے شخص نے کہا کہ ہاں! اب تم نے اردو بولی، آج ہماری یہ حالت ہوگئی ہے۔ گویا ''ضیافت'' اور ''مدعو'' کے الفاظ بڑے ثقیل ہوگئے، اس وجہ سے آج کے لوگ کہتے ہیں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات میں بڑے ثقیل لفظ ہوتے ہیں۔

حضرت تھانویؒ کا کلام جچا تلا ہوتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اگر پڑھا لکھا آدمی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

کے کلام میں ذرا غور کر کے دیکھے تو یہ نظر آئے گا کہ حضرت کا کلام ایسا ٹکا ہوا ہوتا ہے کہ اس میں نہ تو ایک لفظ زائد ہوتا ہے نہ کم ہوتا ہے، اس لئے بعض اوقات ان کو اپنا کلام حدود کے اندر رکھنے کے لئے کوئی ایسا لفظ نہیں ملتا جو آسان ہو، اس وجہ سے وہ بعض اوقات اپنے کلام میں مشکل الفاظ لے آتے ہیں، لیکن یہ صرف اس لئے ایسا کرتے ہیں تاکہ بات حدود کے اندر رہے۔

حضرت تھانویؒ کا ایک ملفوظ

میرے والد ماجدؒ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ سنایا کرتے تھے کہ حضرت نے فرمایا کہ خودرائی بہت بُری بلا ہے، یعنی ہمیشہ صرف اپنی رائے پر بھروسہ کرنا اور صرف اپنے اوپر اعتماد کر کے ہر کام کا خود ہی فیصلہ کر لینا یہ بہت بُرا ہے، لہٰذا ہر کام سے پہلے مشورہ ضرور کر لیا کرو۔ اور فرمایا کہ ''جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، ان سے مشورہ کرو'' اب دیکھئے! یہ نہیں فرمایا کہ ''جب تک بڑے موجود ہوں'' بلکہ فرمایا کہ جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، پھر خود ہی اس لفظ کے بڑھانے کی وجہ بیان فرمائی کہ ''ضابطے کے بڑے'' اس لئے کہہ رہا ہوں کہ حقیقت میں کون بڑا ہے اور کون چھوٹا ہے؟ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ

(سورۃ ق:۱۳)

بڑا وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نواز دیں، جس کی مغفرت فرما دیں اور جس سے خوش

ہو جائیں، یہ نہیں ہے کہ جو شخص عمر میں بڑا ہے یا مرتبہ میں بڑا ہے، وہ ضرور اللہ تعالیٰ کے یہاں بھی بڑا ہوگا، یہ ضروری نہیں، لیکن دنیا کے اندر ضابطے میں اللہ تعالیٰ نے کچھ مرتبے بنا دیے ہیں، مثلاً باپ بیٹے سے بڑا ہے، استاذ شاگرد سے بڑا ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تک ضابطے کے بڑے موجود ہوں، ان سے مشورہ کیا کرو اور جب ضابطے کے بڑے موجود نہ رہیں تو اپنے برابر والوں سے مشورہ کیا کرو اور جب وہ بھی نہ رہیں تو اپنے چھوٹوں سے مشورہ کیا کرو۔

جب اعتدال ہو تو ایسا ہی کلام نکلتا ہے

اگر ہم اور آپ بولتے تو صرف یہ کہتے کہ بڑوں سے مشورہ کرلیا کرو، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان سے یہ لفظ اس طرح نہیں نکلا، کیونکہ دوسرے کو بڑا کہہ دینا تو ''تزکیہ علی اللہ'' ہے، اس لئے انہوں نے ایک لفظ بڑھا کر فرمایا کہ ضابطے کے بڑوں سے مشورہ کیا کرو۔ جب اللہ تعالیٰ طبیعت میں اعتدال عطا فرما دیتے ہیں تو پھر منہ سے اور قلم سے جو لفظ بھی نکلتا ہے، وہ ٹکا ہوا نکلتا ہے، نہ ایک انچ اِدھر ہوتا ہے، نہ ایک انچ اُدھر ہوتا ہے، یہی حال زبان کا ہوتا ہے، یہی حال قلم کا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب آدمی تحریر لکھے تو تحریر کے اندر یہ نہ ہو کہ آدمی جوش کتابت میں حدود سے تجاوز کر جائے اور ضرورت سے زیادہ کلمات استعمال کرلے بلکہ جو کلمہ لکھے وہ سوچ سمجھ کر لکھے۔

کس مقصد سے بات کر رہے ہیں؟

اس غرض کے لئے حضرات صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ کم بولو، جب شروع میں انسان اس طریق میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے یہ کام کرنا ہی پڑتا ہے، چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ہر قول اور ہر فعل اختیاری کسی نہ کسی غایت کے لئے مطلوب ہوتا ہے، پس ہر کام اور ہر بات میں یہ سوچنا چاہئے کہ اس کی غایت کیا ہے؟ جس کام اور جس بات کی کچھ غایت نہ ہو وہ فضول ہے، اور غایت معلوم ہو مگر مفید نہ ہو وہ بھی فضول ہے، اور اگر وہ غایت کوئی ضرر ہو لازم یا متعدی تو وہ کلام یا بات مضر ہے۔

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۸۶)

فرمایا کہ جب بھی کوئی بات کرو تو ایک لمحہ کے لئے تھوڑا سوچ لیا کرو کہ جو بات میں کرنے جا رہا ہوں، اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر مقصد صحیح ہے اور شریعت کے مطابق ہے تو ٹھیک ہے بات کرلو، لیکن اگر مقصد صحیح نہیں اور شریعت کے مطابق نہیں، یا اس بات کا نہ تو دنیا میں کوئی فائدہ ہے اور نہ آخرت میں کوئی فائدہ ہے تو پھر بلا وجہ زبان کو اس میں ملوث نہ کرو بلکہ اس کو چھوڑ دو اور رک جاؤ۔ اس کی عادت اور مشق کرنے کی ضرورت ہے، یہ تہیہ کرلو کہ زبان کو غلط استعمال نہیں کریں گے بلکہ اس کو قابو میں کریں گے، جب آدمی اللہ کے لئے تہیہ کر لیتا ہے اور ارادہ کر کے اپنا کام درست کرنا چاہتا ہے تو پھر اللہ جل شانہ کی طرف سے

مدد بھی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

وَ الَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِ یَنَّھُمْ سُبُلَنَا (سورۃ العنکبوت:٦٩)

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں کہ جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں، ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستوں پر لے جاتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں کہ اس آیت میں "ہدایت" سے مراد "ارائۃ الطریق" نہیں ہے بلکہ "ایصال الی المطلوب" ہے۔ یعنی ہاتھ پکڑ کر منزل تک لے جاتے ہیں، لیکن کوئی ارادہ تو کرے، قدم تو بڑھائے، ارادہ کرنے کے بعد پھر وہی سمجھاتے ہیں کہ کیا بولنا چاہئے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کے سفر میں مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف تشریف لے جارہے تھے، جبکہ اہل مکہ نے اعلان عام کر رکھا تھا کہ جو شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ لے آئے گا۔ العیاذ باللہ۔ زندہ یا مردہ، اس کو سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے۔ آپ اندازہ کریں کہ آج بھی سو اونٹ کی کیا قیمت ہوگی، اس زمانے میں کیا ہوگی، اتنا بڑا انعام مقرر کر رکھا تھا اور چاروں طرف ہرکارے دوڑا رکھے تھے اور چاروں طرف جاسوس بکھرے ہوئے تھے، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھپتے چھپاتے جارہے تھے، راستے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کوئی پرانا جاننے والا مل گیا جو کسی اور شہر کا رہنے والا تھا، چونکہ حضرت صدیق اکبر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر دلعزیز بھی تھے اور تاجر بھی تھے، اس لئے ان کے تعلقات لوگوں سے زیادہ تھے۔ بہرحال! وہ شخص آپ سے مل کر بہت خوش ہوا اور پھر پوچھا کہ یہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ چونکہ وہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جانتا نہیں تھا، اس لئے آپ کے بارے میں پوچھا، اب اگر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سچ بولتے ہیں کہ یہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو ان حالات میں بتانا خطرناک ہے، کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس کے ذریعہ دشمنوں تک خبر پہنچ جائے اور وہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف پہنچا دیں، اور اگر نہ بتائیں تو یہ بھی ممکن نہیں، اس لئے کہ وہ تو براہ راست سوال کر رہا ہے اور اگر یہ کہیں کہ یہ کوئی اور آدمی ہے تو جھوٹ ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ وہ تو ''صدیق اکبرؓ'' تھے، جھوٹ نہیں بول سکتے تھے، جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا انہوں نے اللہ تعالیٰ سے جواب مانگا ہوگا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب القاء ہوا کہ یوں کہہ دو: **ھادیھد ینی السبیل** یہ میرے رہنما ہیں، مجھے راستہ دکھاتے ہیں۔ دیکھئے کہ اس وقت جبکہ جان پر بنی ہوئی ہے، موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی ہے، اس وقت بھی ''صدیقؓ'' کی زبان سے کوئی کلمہ حد سے گزرا ہوا نہیں نکلا۔ جب کوئی شخص اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے تابع فرمان بنا دیتا ہے تو پھر انہی کی طرف سے ہدایت ہوتی ہے کہ اس موقع پر کیا کہا جائے۔

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ کا جھوٹ سے بچنا

حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند

کے بانی تھے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کیا تھا، چنانچہ انگریزوں کی طرف سے ان کی گرفتاری کے وارنٹ جاری ہوگئے، اس زمانے پر چوراہوں پر پھانسیاں لٹکی ہوئی تھیں، چنانچہ پولیس ان کو تلاش کر رہی تھی، حضرت مولانا دیوبند کی چھتہ کی مسجد میں تشریف فرماتے تھے، لنگی اور معمولی سا کرتہ پہنتے تھے، کوئی شخص دیکھ کر یہ پتہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ کوئی بڑے عالم ہوں گے، پولیس والے تلاش کرتے ہوئے چھتہ کی مسجد میں پہنچ گئے، پولیس والوں نے یہ سوچا کہ جب انہوں نے اتنا بڑا کام کیا ہے تو کوئی بہت بڑے عالم ہوں گے اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ جبہ قبہ اور دستار لگائے ہوئے ہوں گے، مگر حضرت مولانا چھتہ کی مسجد میں لنگی پہنے بیٹھے تھے، ان پولیس والوں کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آیا کہ یہ مولانا قاسم صاحبؒ ہیں، وہ سمجھے کہ یہ مسجد کا کوئی خادم ہے، چنانچہ انہی سے جا کر پوچھا کہ مولانا قاسم صاحب کہاں ہیں؟ حضرت مولانا اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے اور ذرا سا ہٹ کر فرمایا کہ ابھی تو یہاں تھے۔ کیونکہ اگر بتا دیں کہ میں قاسم ہوں تو پکڑے جائیں اور اگر جھوٹ بولیں تو وہ گوارہ نہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ مدد ہوئی کہ ذہن میں جواب القاء فرما دیا۔ چنانچہ پولیس والے ادھر ادھر تلاش کر کے واپس چلے گئے۔

حضرت گنگوہیؒ اور جھوٹ سے پرہیز

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ بھی جہاد آزادی

میں شریک تھے، وہ بھی پکڑے گئے اور مجسٹریٹ کی عدالت میں بلائے گئے، مجسٹریٹ نے کہا کہ تمہارے خلاف الزام یہ ہے کہ تمہارے پاس ہتھیار ہیں، بتاؤ تمہارے پاس ہتھیار ہیں؟ اب حضرت کے پاس ہتھیار تو تھے جو آپ نے تہہ خانے میں دفن کر دیے تھے، اب اگر یہ کہیں کہ ہتھیار نہیں ہیں تو جھوٹ ہوتا ہے، اگر سچ بولیں کہ ہتھیار ہیں تو پھانسی کا تختہ سامنے ہے، حالانکہ ایسے موقع پر جب آدمی کی جان پر بن جائے تو بعض اوقات جھوٹ بولنے کی بھی اجازت ہو جاتی ہے۔ حضرت کے ہاتھ میں تسبیح تھی، آپ نے وہ تسبیح اوپر کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا ہتھیار تو یہ ہے، ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ اتنے میں ایک دیہاتی آ گیا اور مجسٹریٹ سے کہنے لگا کہ ارے تم کس کو پکڑ لائے، یہ تو ہماری مسید (مسجد) کا مؤجن (مؤذن) ہے، چنانچہ مجسٹریٹ نے جب یہ دیکھا کہ یہ تو ہاتھ میں تسبیح لئے گھوم رہا ہے اور دیہاتی بھی یہ کہہ رہا ہے کہ یہ مؤذن ہے، تو اس نے آپ کو چھوڑ دیا۔ اللہ جل شانہ' کی طرف سے اس طرح مدد ہوتی ہے۔

خلاصہ

بہر حال! جب آدمی ارادہ کر لے کہ میں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس مشین کو صحیح استعمال کروں گا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق استعمال کروں گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مدد بھی ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنی طرف سے ارادہ کرلو، عزم کرلو اور اس کی فکر کرو تو پھر انشاء اللہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۶۸

بخل اور اس کا علاج

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵

مجلس نمبر : ۶۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

بخل اور اس کا علاج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ انَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔ أَمَّا بَعْدُ!

بخل مال کی محبت کا نتیجہ ہے

مختلف باطنی بیماریوں کا بیان چل رہا ہے، یہاں سے حضرت والا نے ''بخل'' کا بیان شروع فرمایا ہے۔ یہ ''بخل'' بھی باطنی بیماریوں میں سے ایک

بیماری ہے، جسے عرف عام میں کنجوسی کہتے ہیں۔ جب انسان کے دل میں مال کی اتنی محبّت ہو جاتی ہے کہ پیسے ہاتھ سے جاتے ہوئے جان نکلتی ہے تو یہ بخل ہے اور یہ بڑا مذموم وصف ہے، قرآن کریم میں جگہ جگہ اس کی مذمّت وارد ہوئی ہے۔ اس بخل کے نتیجے میں انسان اپنے فرائض و واجبات میں غفلت برتتا ہے اور گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

بخل کے نتائج

''بخل'' انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتا ہے کہ جو مال آ گیا ہے، وہ اب کہیں نہ جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں شرعی اعتبار سے خرچ کرنا ضروری ہے، مثلاً زکوٰۃ ہے، مالی حقوق واجبہ ہیں، بیوی بچوں کا نفقہ ہے، ان میں بھی انسان پھر صحیح طور پر خرچ نہیں کرتا، بخل کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے۔ دوسرا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ بس کسی طرح بھی پیسہ میرے پاس آ جائے اور پھر اسی جذبہ کے تحت انسان، جائز اور ناجائز کی پرواہ مٹا دیتا ہے، بس مال آ رہا ہے، اس کو آنے دو، چاہے وہ حلال طریقے سے آ رہا ہے یا حرام طریقے سے آ رہا ہے۔ اگر مال حرام طریقے سے آ رہا ہے اور وہ شخص مولوی بھی ہے تو اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس حرام مال کو کوئی تاویل کر کے حلال بنالے، تاکہ یہ حرام مال جو آ رہا ہے یہ کسی طرح میرے پاس رہ جائے اور دوسرے کے پاس نہ جائے۔

بخل دو دھاری تلوار ہے

لہٰذا یہ ''بخل'' ایک طرف حقوق واجبہ کی ادائیگی میں رکاوٹ بنتا ہے،

دوسری طرف معصیتوں کے ارتکاب کا داعی بنتا ہے اور حرام طریقے سے مال اور پیسہ حاصل کرنے کی فکر انسان کے اندر پیدا کرتا ہے، اس لئے یہ ''بخل'' دو دھاری تلوار ہے، اِدھر سے بھی کاٹتی ہے اور دوسری طرف سے بھی کاٹتی ہے، گناہ میں بھی مبتلا کرتی ہے اور حقوق واجبہ اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی بھی کراتی ہے، اس لئے یہ بڑی خطرناک بیماری ہے اور اس کا علاج بڑا ضروری ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں انفاس عیسیٰ میں جو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ان سے اس بیماری کے کچھ اصول معلوم ہو جاتے ہیں۔

کتاب البخلاء

اگر آدمی اس ''بخل'' کی تفصیلات اور جزئیات کو بیان کرے تو بات بڑی لمبی ہو جاتی ہے، چنانچہ علامہ جاحظؒ جو ایک ادیب آدمی ہے، اس نے اسی موضوع پر ''کتاب البخلاء'' کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے جو دو سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں بخلاء کے حالات بیان کئے ہیں کہ دنیا میں کیسے کیسے بخیل ہوتے ہیں، کیا کیا ان کے اوصاف ہوتے ہیں اور ان بخلاء کے بڑے عجیب وغریب قصے لکھے ہیں۔ اس کتاب کے پڑھنے سے بخل کی اقسام کا پتہ چلتا ہے کہ کن کن دائروں میں ''بخل'' چلتا ہے اور کیا کیا اس کی صورتیں ہوتی ہیں اور یہ کس کس طرح سے انسان کو مارتا ہے۔ یہ کتاب ادب کا شاہکار ہے۔ اس کے علاوہ ''احیاء العلوم'' میں بھی امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بخل'' پر لمبی بحث فرمائی ہے۔ لیکن یہاں ''انفاس عیسیٰ'' میں حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''بخل'' پر حضرت والا کے جو ارشادات نقل فرمائے ہیں، وہ صرف ایک صفحہ

میں آگئے ہیں جو حضرت والا کے مواعظ اور ملفوظات سے نقل کر کے یہاں جمع فرما دیے ہیں، لیکن اس ایک صفحے میں اس بیماری کے بارے میں جو بنیادی اور اصل الاصول باتیں ہیں، وہ سب یہاں جمع فرمادی ہیں۔

ایک صاحب نے حضرت والا کو خط میں لکھا کہ:

پیسہ اٹھاتے ہوئے قلب بہت تنگ ہو جاتا ہے۔

حضرت والا نے جواب دیا کہ:

اگر کوئی حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں۔

اصلاح کا طریقہ اپنے عیوب کا اظہار کرنا ہے

جو اللہ کے بندے اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ سے رجوع کرتے ہیں تو پھر اپنی ایک ایک بات اپنے شیخ کو لکھتے ہیں، کیونکہ شیخ سے رجوع کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ جو حالات تم اپنے اندر محسوس کر رہے ہو، وہ شیخ کو بتاؤ پھر شیخ دیکھ کر بتائے گا کہ واقعتہً یہ کوئی بیماری ہے یا نہیں؟ اگر بیماری ہے تو شیخ اس کا علاج کرے گا، اگر تم نہیں بتاؤ گے تو شیخ کے پاس علم غیب تو ہے نہیں، اس لئے شیخ کو اپنے حالات بتانے پڑتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ انسان کے اندر اپنی اصلاح کی فکر عطا فرما دیتے ہیں تو پھر انسان کی نگاہ اپنے حالات اور اپنے عیوب کی طرف جانے لگتی ہے اور جب تک فکر نہیں ہوتی تو پھر غفلت کی حالت میں انسان کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا ہو رہا ہے، صحیح رخ پر جا رہا ہوں یا غلط رخ پر جا رہا ہوں، دل میں جو خیالات آرہے ہیں وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں، بس کچھ پرواہ نہیں ہوتی، لیکن جب اللہ تعالیٰ فکر عطا فرماتے ہیں تو آدمی کے اندر ایک کھٹک

پیدا ہو جاتی ہے۔

دل میں کھٹک پیدا ہونا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ ''تقویٰ'' کے معنی ہیں ''کھٹک'' یعنی دل میں یہ کھٹک پیدا ہو جائے کہ میں جو کام کر رہا ہوں یہ صحیح ہے یا غلط ہے؟ جو خیال میرے دل میں آ رہا ہے؟ یہ درست ہے یا غلط ہے، یہ کھٹک ہی کامیابی کی کلید ہے، کیونکہ جب کسی کام کے وقت دل میں کھٹک پیدا ہوئی اور پھر شیخ کو اس کھٹک کی اطلاع کر دی تو اب شیخ اس کا علاج بتا دے گا۔ اب دیکھئے! اس اللہ کے بندے کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی کہ جب میں کہیں پیسہ خرچ کرتا ہوں تو دل میں بہت تنگی ہوتی ہے اور دل دکھتا ہے کہ پیسہ جا رہا ہے، تو یہ کہیں انسان بخل کی بیماری تو نہیں ہے، اگر یہ بیماری ہے تو شیخ سے اس کا علاج پوچھنا چاہئے۔

پیسے جانے کا غم گناہ نہیں

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ ''اگر کوئی حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں'' مطلب یہ ہے کہ پیسے کے جانے سے دل میں یہ غم ہو رہا ہے یا صدمہ ہو رہا ہے یا دکھ ہو رہا ہے، یہ صدمہ اور غم بذات خود کوئی گناہ نہیں، کیونکہ یہ ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، انسان کو اس پر اختیار نہیں اور اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسے عمل پر سزا نہیں دیتے جو اس کے اختیار سے باہر ہو، ہاں! اگر یہ صدمہ اور غم کسی حق واجب کی ادائیگی میں رکاوٹ بن جائے، مثلاً زکوٰۃ فرض

تھی، وہ ادا نہیں کی، صدقۃ الفطر واجب تھا، وہ نہیں دیا، بیوی بچوں کو جتنا نان و نفقہ دینا چاہئے تھا، اتنا نہیں دیا، کسی ملازم کو رکھا تھا، اس کے پورے حقوق نہیں دیے اور اس غم اور صدمہ کے نتیجے میں حق واجب فوت ہو گیا تو یہ گناہ ہے۔

صرف مال کی محبت مضر نہیں

اور اسی حق واجب فوت ہونے میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کسی معصیت کا ارتکاب کرلیا، مثلاً ناجائز اور حرام کام کے ذریعہ پیسے حاصل کرلئے، لہٰذا جب تک کسی حرام اور ناجائز کام کا ارتکاب نہ ہو تو محض دل کا تنگ ہو جانا گناہ کا سبب نہیں۔ اسی لئے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر کوئی حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں۔ کیونکہ بخل کے اصل معنی ہیں "مال کی محبت" اور قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ میں نے تمہارے دل میں مال کی محبت ڈالی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَ
الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ
الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ۔ (آل عمران:۱۴)

لوگوں کے لئے مرغوب چیزوں کی محبت مزیّن کر دی گئی ہے، مثلاً عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی، جب اللہ تعالیٰ نے محبت ڈالی ہے تو وہ محبت دل میں موجود ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ۔ (النساء:۱۲۸)

یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بنیادی طور پر بخل کا مادہ پیدا کیا ہے۔ لہٰذا محض بخل کا مادہ ہونا کوئی گناہ اور قابل مؤاخذہ بات نہیں، البتہ قابل مؤاخذہ اس وقت ہے جس انسان اس محبّت کو گناہ کے کاموں کے استعمال کرے، یا وہ محبت انسان کو گناہ پر آمادہ کر دے، یا حق واجب کو فوت کرنے پر آمادہ کردے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی دعا

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ جس وقت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ایران فتح ہوا اور کسریٰ کا محل مسلمانوں کے قبضہ میں آیا تو اس وقت مسجد نبوی میں سونے کے اتنے ڈھیر لگ گئے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس ڈھیر کے پیچھے چھپ گئے، سونے کے اس ڈھیر کو دیکھ کر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اے اللہ! ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں اس مال سے محبت نہیں ہے، نہ یہ دعا کرتے ہیں کہ یہ محبّت بالکل ختم ہو جائے، البتہ ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ اس مال کی محبّت آپ کے دین کے لئے فتنہ نہ بنے۔ یہ نہیں فرمایا کہ اس مال کی محبّت ہمارے دل سے نکال دیجئے، کیونکہ یہ مال تو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، اسی کو ''فضل اللہ'' فرمایا ہے، اسی مال کو ''خیر'' فرمایا ہے، اسی مال کو ''جعل اللہ لکم قیاماً'' فرمایا ہے، اس لئے اس مال کی نفرت مطلوب نہیں، بلکہ فی نفسہٖ یہ مال کام کی چیز ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کا قوام بنایا ہے، اس لئے نہ تو ہم اس مال کی نفرت مانگتے ہیں اور نہ اس کی محبّت کا

ازالہ مانگتے ہیں، ہاں! اے اللہ! ہم یہ مانگتے ہیں کہ یہ مال ہمیں معصیت پر آمادہ نہ کرے اور ہمارے دین کو کسی فتنہ میں مبتلا نہ کرے۔

مال کی کونسی محبّت گناہ ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ طبعی طور پر دل میں مال کی محبّت ہونا نہ گناہ ہے اور نہ مضر ہے، ہاں! اگر مال کی محبّت اتنی زیادہ ہو جائے کہ وہ انسان کو صحیح جگہ پر خرچ کرنے سے روک دے تو وہ ''بخل'' ہے اور حرام ہے اور بیماری ہے۔ اب دیکھئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان صاحب کو تسلّی دیدی کہ ''اگر حق واجب فوت نہ ہو تو کچھ غم نہیں'' لیکن یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ ہر انسان کے لئے ایک نسخہ نہیں ہوتا، طبیب اور معالج ہر مریض کے حالات دیکھ کر اس کے لئے نسخہ تجویز کرتا ہے، چنانچہ حضرت والا نے اس شخص کو دیکھا کہ یہ شخص حد اعتدال کے اندر ہے اور اعتدال سے آگے بڑھا ہوا نہیں ہے، اس لئے آپ نے اس کو تسلّی دیدی اور کسی خطرے سے متنبہ نہیں فرمایا۔

یہ خطرہ کی گھنٹی ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ جو مال کی محبّت ہے اور مال خرچ کرتے ہوئے دل دکھ رہا ہے، یہ حالت مذموم تو نہیں اور نہ گناہ ہے، لیکن اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ حالت کسی وقت آگے بڑھ کر ''بخل'' کی حد تک پہنچ جائے گی اور کسی بھی وقت حق واجب کو بھی ادا کرنے کا راستہ روک دے گی، لہٰذا جب مال خرچ کرنے سے دل دکھ رہا ہے تو یہ خطرہ کی گھنٹی ہے، اس خطرہ کی گھنٹی

کا علاج یہ ہے کہ اس محبت کو ذرا پیچھے کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ یہ سرحد سے اتنی دور رہے کہ سرحد پار کر جانے کا احتمال نہ ہو۔ چنانچہ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ اس محبت کو کم کرو یہاں تک کہ یا تو یہ دکھ بالکل ختم ہو جائے یا یہ کہ اتنا کم ہو جائے کہ وہ کالعدم ہو جائے، جب مشق کرو گے تو یہ حالت حاصل ہو جائے گی۔

دراہم امام زہریؒ کی نظر میں

امام زہری رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجے کے محدّث ہیں، ان کے ایک شاگرد ہیں امام معمر بن راشد رحمۃ اللہ علیہ، وہ شاگرد امام زہریؒ کے بارے میں فرماتے ہیں۔

مارأيت أحداً الدنيا أهون عنده مما كانت عند الزهري، كانت الدراهم عنده بمنزلة البعر۔

یعنی میں نے آج تک کوئی آدمی ایسا نہیں دیکھا جس کے دل میں دنیا اتنی بے وقعت ہو جتنی امام زہریؒ کے دل میں بے وقت تھی، دراہم ان کے نزدیک ایسے تھے جیسے مینگنیاں۔ جیسے مینگنیوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی، ایسی ہی ان کے نزدیک دراہم کی بھی کوئی قیمت نہیں تھی، یعنی دراہم کی طرف کوئی التفات ہی نہیں تھا، کوئی محبّت ہی نہیں تھی۔

میاں جی نور محمدؒ اور دنیا

حضرت میاں جی نور محمد جھنجانوی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات میں لکھا ہے کہ جب بازار جا کر کوئی چیز خریدتے تو پیسوں کی تھیلی دکاندار کو دیدیتے اور کہتے کہ تم اس چیز کی قیمت اس تھیلی میں سے لے لو، خود گن کر نہیں دیتے تھے اور یہ

سوچتے کہ جتنا وقت تھیلی میں سے پیسے نکال کر گننے میں صرف ہوگا، اتنا وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں کیوں نہ صرف کیا جائے۔ کسی چور نے دیکھ لیا کہ ان کے پاس پیسوں کی تھیلی ہے، چنانچہ وہ تھیلی کندھے پر لٹکائے جا رہے تھے کہ چور پیچھے سے آیا اور تھیلی لے کر بھاگ گیا، انہوں نے کوئی مزاحمت ہی نہیں کی، وہ تھیلی چھوڑ دی اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا کہ کون چھین کر لے جا رہا ہے۔

اب وہ چور تھیلی لے کر ان کے علاقے سے باہر نکلنا چاہتا ہے مگر اس کو راستہ ہی نہیں ملتا، وہ گلیاں اس کے لئے بھول بھلیاں بن گئیں، اب پریشانی کے عالم میں کبھی ایک گلی میں داخل ہوتا اور کبھی دوسری گلی میں داخل ہوتا، مگر باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا، آخر میں اس کو خیال آیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ اس اللہ کے ولی کے ساتھ زیادتی کرنے کا وبال ہے، چنانچہ وہ چور میاں جی کے گھر پر پہنچا اور دروازے پر دستک دی، انہوں نے اندر سے پوچھا کہ کون ہے؟ چور نے کہا کہ یہ اپنی تھیلی لے لو، میاں جی نے فرمایا کہ میں یہ تھیلی نہیں لیتا، اس لئے کہ جس وقت تو نے چھینی تھی، اسی وقت میں نے تجھے صدقہ کر دی تھی، لہٰذا اب یہ تھیلی میری ملکیت نہیں رہی۔ وہ چور کہتا ہے کہ خدا کے لئے لے لو، وہ کہتے ہیں کہ میں نہیں لیتا، آخر میں چور نے کہا کہ حضرت! مجھے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے، یہ دعا کر دو کہ راستہ مل جائے، چنانچہ انہوں نے فرمایا کہ اچھا چلا جا، میں دعا کرتا ہوں، چنانچہ وہ چور تھیلی لے کر چلا گیا۔

مال کی محبّت سے ذرا پیچھے رہو

بہرحال! ایسے بھی اللہ تعالیٰ کے بندے ہوتے ہیں کہ ان کے دل سے مال کی محبّت بالکل جاتی رہی، اب یا تو یہ صورت حال پیدا ہو جائے یا کم از کم

مال کی محبّت اتنی کم ہو جائے کہ وہ خطرے کی حد سے دور ہو جائے، اس وجہ سے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس مال کی محبّت سے ذرا پیچھے رہو۔ اس بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے دو باتیں بیان فرمائیں۔

اس کیفیت کو بُرا سمجھو اور دعا کرو

ایک یہ کہ جب تم یہ محسوس کرو کہ پیسوں کے جانے سے دل دکھ رہا ہے اور دل میں تنگی ہو رہی ہے تو ایک کام یہ کرو کہ دل کی اس کیفیت کو بُرا سمجھو کہ یہ کوئی اچھی کیفیت نہیں۔ دوسرا کام یہ کرو کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! یہ مال کی محبّت کا سانپ کہیں مجھے ڈس نہ لے اور کسی وقت میرے لئے مصیبت نہ بن جائے، لہٰذا یا اللہ! میری اس مال کی محبّت کو اعتدال سے بڑھنے سے روکئے اور حد کے اندر رکھئے۔ یہ دعا کرتے رہو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ پھر یہ محبّت نقصان دہ نہیں ہوگی۔

آپ نے اس کو تسلّی دیدی

البتہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں اس شخص کو تسلّی دیدی کہ یہ دکھ اور تکلیف بُری اور ناجائز نہیں اور اس شخص کو اس دکھ پر متنبّہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اس شخص کی خصوصیت تھی، آپ جانتے تھے کہ یہ شخص مال کی محبّت میں آگے بڑھنے والا نہیں ہے، اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس کو تسلی نہ دیتے بلکہ اس کو متنبّہ فرماتے کہ یہ دکھ ہونا تو بڑی خطرناک بات ہے، اس کی فکر کرو۔ شیخ کا اصل کام ہی یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ کس شخص کو کس وقت کیا نسخہ دیا جائے۔

یہ حُبِ اعتدال ہے

ایک اور صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ:

خرچ کرنے میں فی الجملہ گرانی معلوم ہوتی ہے، ناداری اور قرض کرنے سے خوف رہتا ہے، گو حقوق واجبہ میں کوتاہی نہیں کرتا۔

جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

یہ حُبِ مال نہیں، حُبِ اعتدال ہے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۰)

ایک صاحب نے لکھا کہ جب میں پیسے خرچ کرتا ہوں تو دل میں گرانی ہوتی ہے اور خرچ کرتے ہوئے یہ خوف رہتا ہے کہ کہیں بالکل ہی نادار نہ ہو جاؤں اور پھر قرض لینا پڑ جائے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ حقوق واجبہ کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کرتا۔ جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ یہ حُبِ مال نہیں بلکہ حُب اعتدال ہے، کیونکہ جب حقوق واجبہ میں کوتاہی نہیں ہو رہی ہے تو پھر جو مقصود تھا وہ حاصل ہے، وہ حُبِ مال جو مذموم ہے اور جو بیماری ہے اور گناہ ہے، وہ اس میں حاصل نہ ہوا، اس لئے یہ مذموم نہیں۔ البتہ پھر بھی آدمی کو چوکنا رہنے کی ضرورت ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہی محبّت رفتہ رفتہ آدمی کو گناہ میں مبتلا کرنے کا ذریعہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ٦٩

ہر بخل مذموم نہیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵

مجلس نمبر : ۶۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

بخل اور اس کا علاج

ہر بخل مذموم نہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلاَنَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

ہر کام اللہ تعالیٰ کیلئے ہونا چاہئے

باطن کی جو بیماریاں انسان کے لئے مہلک ہوتی ہیں، ان کا بیان چل رہا ہے، ان بیماریوں میں سے ایک بیماری ''بخل'' ہے جس کی تھوڑی سی تفصیل گزشتہ کل عرض کی تھی۔ اسی سلسلے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ارشاد ہے کہ:

> مَن اعطیٰ لِلّٰہ ومنع لِلّٰہ فقد استکمل الایمان
>
> اس میں ''اعطاء'' اور ''منع'' دونوں کے ساتھ ''لِلّٰہ'' کی قید ہے، جس سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں اور نہ بخل مطلقاً مذموم ہے بلکہ اگر خدا کے لئے ہوں تو دونوں محمود ورنہ دونوں مذموم، غرض اخلاق سب فطری و جبلی ہیں اور درجہ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم ہے اور نہ محمود بلکہ مواقع استعمال سے ان میں مدح و ذم آجاتی ہے۔ (انفاس عیسی، ص ۱۹۰)

''بخل'' مطلقاً مذموم نہیں

''بخل'' کے معنی ہیں ''مال کو خرچ کرنے سے روکنا'' اس کے مقابلے میں سخاوت ہے، اس کے معنی ہیں ''کھلے دل سے مال خرچ کرنا اور دل تنگ نہ کرنا'' اس کو سخاوت کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ بخل مذموم ہے یعنی بُری بات ہے اور سخاوت اچھی بات ہے اور قابل تعریف بات ہے۔ اس ملفوظ

میں حضرت والا نے فرمایا کہ یہ تصور درست نہیں، نہ تو ہمیشہ مال کو روکنا بُرا ہے اور نہ ہمیشہ مال کو خرچ کرنا اچھا ہے، بلکہ بعض اوقات مال کو روکنا بھی اچھا ہوتا ہے، قابل تعریف اور قابل ثواب ہوتا ہے اور بعض اوقات مال کا خرچ کرنا بھی اچھا نہیں ہوتا بلکہ گناہ ہوتا ہے یا کم از کم مذموم ہوتا ہے۔

صرف اللہ تعالیٰ کیلئے مال خرچ کرو

دلیل میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پیش کی کہ آپ نے اس حدیث میں اصول بیان فرما دیا کہ:

من أعطى لِلّٰه ومنع لِلّٰه فقد استكمل الايمان

(ترمذی، ابواب صفة القيامة، باب نمر ٦١)

حدیث میں اور الفاظ بھی ہیں مگر یہاں صرف انہی الفاظ کو پیش کرنا مقصود ہے، اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص اللہ کے لئے دے اور اللہ کے لئے روکے، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔ یعنی جب دے رہا ہے تو اللہ کے لئے دے رہا ہے اور اگر روک رہا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے روک رہا ہے۔ دینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جہاں بھی خرچ کر رہا ہے، چاہے وہ غریبوں، مسکینوں اور ضرورت مند لوگوں کو صدقہ دے رہا ہو، زکوٰۃ دے رہا ہو، یا اپنے بیوی بچوں کا نفقہ ادا کر رہا ہو، یا ان کے لئے کھانے پینے کا انتظام کر رہا ہو، یا اپنے نفس پر خرچ کر رہا ہو، لیکن ان سب جگہوں پر خرچ کرنے میں اللہ جل شانہ کی رضا مقصود ہو، مثلاً اگر فقیر کو پیسے دے رہا ہے تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود

ہے، دکھاوا مقصود نہیں، بیوی بچوں پر خرچ کر رہا ہے تو یہ سوچ کر خرچ کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حقوق میرے ذمے وابستہ فرمائے ہیں، لہٰذا میں ان کے حقوق کی ادائیگی کا مکلف ہوں اور میں اپنے اس فریضے کو ادا کر رہا ہوں، تو یہ خرچ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے ہوگیا اور ”من أعطی لِلّٰہ“ میں داخل ہے۔

اپنی ذات پر خرچ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کیلئے ہے

اسی طرح جو کچھ خود کھا رہا ہے، اس میں بھی اس کی یہ نیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نفس جو دیا ہے، یہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور اس نفس کا بھی میرے اوپر حق ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ان لنفسك عليك حقًا

تیرے نفس کا بھی تیرے اوپر حق ہے۔ اب اگر میں اس نفس کو نہیں کھلاؤں گا اور بھوک کی وجہ سے یہ مر جائے گا تو یہ خودکشی ہوگی اور حرام موت ہوگی، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس نفس کا مجھ پر حق رکھا ہے۔ لہٰذا میں جو کچھ اس نفس کو کھلا رہا ہوں، یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اور اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے کھلا رہا ہوں۔ یہ سب ”من اعطی لِلّٰہ“ میں داخل ہے۔

بازار سے چیز خریدنا اللہ تعالیٰ کیلئے ہے

اگر بازار میں کوئی چیز خرید رہا ہے تو بظاہر اپنے نفع کے لئے وہ چیز خرید رہا ہے، لیکن مآل کار یا تو وہ چیز اپنے نفس کے لئے خرید رہا ہوگا یا اپنے بیوی بچوں کے لئے خرید رہا ہوگا یا کسی محتاج اور ضرورت مند کو دینے کے لئے خرید رہا

ہوگا، ان تینوں باتوں میں کوئی ایک بات ضرور ہوگی اور ان تینوں باتوں میں سے ہر بات ایسی ہے کہ جس میں صحیح نیت کر لینے سے وہ عمل اللہ تعالیٰ کے لئے بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایسا دین دیا ہے جو ''ہم خرما وہم ثواب ہے'' کہ کام تو اپنے لئے یا اپنے بیوی بچوں کے لئے کر رہے ہو لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ذرا سا زاویہ نگاہ بدل لو تو یہ سب کام میرے لئے ہو رہا ہے اور ''من اعطیٰ لِلّٰہ'' میں داخل ہے۔

بیوی کے منہ میں لقمہ دینا اللہ تعالیٰ کیلئے ہے

اسی لئے حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

حتی اللقمة التی ترفعها إلی فی امرأتك وهی صدقة۔ (بخاری شریف، مناقب الانصار، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: اللّٰهم لمض لا صحابی هجرتهم)

جو ایک لقمہ تم اٹھا کر اپنی بیوی کے منہ میں دیتے ہو، یہ بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک صدقہ کے حکم میں ہے۔ یہ دین جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے، یہ مٹی کو سونا بنانے والا ہے، کھانا اپنے فائدہ کے لئے کھایا جا رہا ہے لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم یہ لکھ لیتے ہیں کہ یہ کھانا تم نے ہمارے لئے کھایا ہے لہٰذا تمہارے اس عمل کو بھی تمہارے نیک اعمال میں اور ثواب والے اعمال میں درج کر لیتے ہیں، آخرت میں جو نیکیوں کا حساب ہوگا تو یہ کھانا پینا بھی تمہارے نیک اعمال کے اکاؤنٹ میں داخل ہو چکا ہوگا۔

یہ روکنا اللہ تعالیٰ کیلئے ہے

حدیث میں دوسرا جملہ یہ ارشاد فرمایا "مَنَعَ لِلّٰہ" اگر روکے تو اللہ تعالیٰ کے لئے روکے، یعنی ایک جگہ پر پیسے دینے کا موقع آیا لیکن پیسے نہیں دیئے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے لئے روک لیا۔ مثلاً مجمع عام میں کسی کام کے لئے چندہ ہو رہا تھا اور ہر شخص آگے بڑھ کر چندہ دے رہا تھا، تمہارے دل میں یہ خیال آیا کہ چندہ دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے۔ لیکن سب لوگ تو بڑھ چڑھ کر دے رہے ہیں، اگر میں نہیں دوں گا تو ناک کٹ جائے گی اور مجمع کے اندر بدنامی ہوگی کہ سب لوگ تو دے رہے ہیں اور یہ کنجوس بیٹھا ہے، لوگ مجھے کنجوس اور بخیل کہیں گے، اس خیال کے آنے پر چندہ دینے کا ارادہ کرلیا اور جیب سے پیسے نکال لئے، پھر خیال آیا کہ اگر اس وقت میں چندہ دوں گا تو یہ دکھاوے کا چندہ ہوگا، اللہ تعالیٰ کے لئے نہ ہوگا، اس طرح چندہ دینا تو جائز نہیں اور اس پر ثواب بھی نہیں، چنانچہ دوسرا خیال آنے کے بعد وہ پیسے واپس جیب میں رکھ لئے، اب یہ واپس رکھ لینا اور چندہ نہ دینا "مَنَعَ لِلّٰہ" میں داخل ہے۔ اس لئے کہ یہ روکنا اللہ تعالیٰ کے لئے ہوا، اس نے سوچا کہ چاہے دنیا مجھے بخیل کہے، چاہے کنجوس کہے، لیکن چونکہ اس وقت دینا جائز نہیں ہے، اس لئے میں نے روک لیا، لہٰذا یہ بھی "مَنَعَ لِلّٰہ" ہوگیا۔

شادی بیاہ کے موقع پر دینا

آجکل شادی بیاہ کے موقع پر جو ہدیے اور تحفے دیئے جاتے ہیں اور اس

میں باقاعدہ لکھت پڑھت ہوتی ہے کہ کس شخص نے کس کی شادی کے موقع پر کتنا دیا تھا، اب دوسرا شخص اس سے بڑھا کر دے یا برابر کر کے دے، یہ سب ''نیوتہ'' ہے جس کو قرآن کریم نے حرام کہا ہے، لہٰذا ایسے موقع پر مت دو۔ ہاں! اگر دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ یہ میرا بھائی ہے اور اس کے گھر میں خوشی ہے، میرے اندر سے دل میں یہ داعیہ پیدا ہو رہا ہے کہ میں اس کو ہدیہ اور تحفہ پیش کروں ''سبحان اللہ'' بڑی اچھی بات ہے، تحفہ اور ہدیہ پیش کر دو، لیکن اگر ہدیہ اور تحفہ دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے، اس لئے کہ پیسے کی تنگی ہے یا اس سے کوئی خاص قریبی تعلق بھی نہیں ہے، مگر چونکہ اس شخص نے میری فلاں تقریب میں اتنے پیسے دیے تھے، لہٰذا اس شخص کی تقریب میں مجھے دینا ضروری ہو گیا، یا یہ کہ اگر میں کوئی ہدیہ تحفہ نہیں دوں گا تو سارے معاشرے میں نکوں بن جاؤں گا اور سب لوگ یہ کہیں گے کہ یہ اتنا کنجوس آدمی ہے کہ چاہے کسی کی شادی بیاہ ہو یا کوئی تقریب ہو، مگر اس کی جیب سے پیسے نہیں نکلتے، یہ سوچ کر تحفہ یا ہدیہ دیا، ایسا ہدیہ تحفہ دینا حرام اور ناجائز ہے۔

یہ صورت ''مَنَعَ لِلّٰہ'' میں داخل ہے

اور اگر اس نے یہ سوچا کہ کوئی مجھے کنجوس کہتا ہے تو کہے، کوئی بخیل کہتا ہے تو کہے، کوئی مجھے غیر مہذب کہتا ہے تو کہے، کوئی مجھے ناشائستہ کہتا ہے تو کہے، مجھے تو اپنے اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا ہے اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کے لئے میں نہیں دیتا۔ یہ نہ دینا ''مَنَعَ لِلّٰہ'' میں داخل ہے۔ یا اس شخص کو معلوم ہے کہ میں

اگر فلاں شخص کو پیسے دوں گا تو وہ اس کو ناجائز اور غلط کاموں میں استعمال کرے گا، ایسے شخص کو ہدیہ تحفہ یا پیسے دینا درست نہیں، یہ سوچ کر اس نے پیسے نہیں دیئے، یہ صورت بھی "مَنَعَ لِلّٰہ" میں داخل ہے۔

دوسروں کو دینا مشروع طریقے پر ہونا چاہئے

اس لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ نہ تو دینا ہمیشہ اچھا ہے اور نہ ہی روکنا ہمیشہ بُرا ہے بلکہ اس کا دارومدار نیت اور حالات پر ہے، بعض اوقات دینا بُرا ہے جیسا کہ ابھی چند مثالیں پیش کیں اور بعض حالات میں روکنا ثواب ہے، اصل مدار اس پر ہے کہ دینا مشروع طریقے پر ہو رہا ہے یا نہیں؟ اور یہ دینا اللہ تعالیٰ کے لئے ہو رہا ہے یا نہیں؟ مشروع طریقے پر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دینا شریعت کے مطابق ہے یا نہیں؟ جہاں شریعت کے خلاف دیا جا رہا ہے وہ دینا بیکار ہے۔ اور دیتے وقت نیت اللہ جل شانہٗ کو راضی کرنے کی ہو، دکھاوے اور نام ونمود کی نیت نہ ہو، جب دو شرطیں پائی جائیں گی تو دینا ثواب ہوگا اور جب یہی دونوں شرطیں روکنے میں پائی جائیں گی تو روکنا ثواب ہوگا۔

مال کی طرف میلان فطری ہے

حدیث میں فرمایا کہ جو شخص یہ کام کرلے اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔ ایسے شخص کو اتنی بڑی بشارت یعنی تکمیل ایمان کی بشارت دی جا رہی ہے۔ بہرحال! اس حدیث سے معلوم ہوا کہ سخاوت مطلقاً محمود نہیں اور نہ بخل مطلقاً

مذموم ہے بلکہ اگر خدا کے لئے ہوں تو دونوں محمود اور قابل تعریف ہیں اور اگر خدا کے لئے نہ ہوں تو دونوں مذموم ہیں۔ غرض اخلاق سب فطری اور جبلی ہیں اور درجہ فطرت میں کوئی خلق نہ مذموم ہے اور نہ محمود۔ جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ محض یہ بات کہ دل میں مال کی محبّت ہے یا جب ہاتھ سے پیسے جاتے ہیں تو دل میں تنگی پیدا ہوتی ہے، محض یہ باتیں انسان کی طبیعت کا حصّہ ہیں، اس لئے کہ فطری طور پر انسان کی طبیعت مال کی طرف مائل ہوتی ہے، ''مال'' کی تعریف ہی یہ ہے کہ ''مایمیل إلیه الطبع'' یعنی جس کی طرف طبیعت مائل ہو، لہٰذا مال کی طرف دل کا مائل ہونا فطرت کا ایک حصّہ ہے۔

مال کی محبّت کا صحیح استعمال اور غلط استعمال

اب اگر اس مال کی محبّت کو جائز طریقے سے استعمال کیا تو اس میں کچھ حرج نہیں، مثلاً مال کی محبّت میں تم نے حلال طریقے سے روزی کمانے کا اہتمام کیا اور اس میں اس بات کی بھی فکر کی کہ حلال طریقے سے جتنا زیادہ سے زیادہ مجھے مل جائے، تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اسی طرح جو تجارت، زراعت اور ملازمت وغیرہ ہے، یہ سب مال کی محبّت کی وجہ سے کر رہے ہو، چونکہ مال کی محبّت کو تم نے ایک جائز اور مباح کام میں استعمال کیا تو یہ مال کی محبّت بُری نہ ہوئی اور اس محبّت نے تمہارے اوپر کوئی بُرا اثر نہیں چھوڑا، لیکن اگر مال کی محبّت کو تم نے ناجائز کاموں میں استعمال کیا کہ ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنا شروع کر دیا اور مواقع واجبہ پر خرچ کرنے سے مال کو روک دیا تو یہ مال کی محبّت کا

غلط استعمال ہوا۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ مال کی محبت اپنی ذات میں نہ محمود ہے اور نہ مذموم ہے، لیکن اگر اس محبت کو صحیح استعمال کرو گے تو ٹھیک ہوگی اور اگر غلط استعمال کرو گے تو غلط ہوگی۔ البتہ جیسا کہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس محبت کو ذرا کم رکھو، بالکل سرحد پر نہ کھڑے ہو جانا ورنہ اگلا قدم تمہیں گناہ کے اندر مبتلا کر دے گا، اس لئے اس مال کی محبت کو کم کرنے کی کوشش کرو۔

دوسروں کی چیزوں کا استعمال کب جائز ہے؟

ایک اور ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

اگر دل گواہی دے کہ میرا بدون اذن کے کھانا اس شخص کو ناگوار نہ ہوگا بلکہ خوش ہوگا، وہاں بدون اذن کے بھی کھانا جائز ہے بلکہ چھین کر بھی کھا سکتا ہے بشرطیکہ وہ دوست سخی ہو بخیل نہ ہو، کیونکہ بخیل کو کسی سے محبت نہیں ہوتی، اگر ہوتی بھی ہے تو مال کے برابر نہیں، اس لئے بخیلوں کی اجازت بھی مشکوک ہے، ہاں سخی دوستوں سے اگر پوری بے تکلفی ہو تو چھین کر بھی کھانا جائز ہے۔ (انفاس عیسی: ص ۱۹۰)

اصل حکم یہ ہے کہ کسی بھی شخص کی کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر استعمال کرنا حلال نہیں، حدیث شریف میں ہے کہ:

لایحل مال امرأ مسلم إلا بطیب نفس منه

(مسند احمد، ج ۵، ص ۷۲)

اس حدیث سے پتہ چلا کہ دوسرے شخص کی چیز کے استعمال کے لئے صرف اجازت ہی نہیں بلکہ خوش دلی سے اجازت دے تب تو استعمال کرنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں۔

بلا اجازت بلکہ چھین کر کھانا بھی جائز ہے

حضرت والا اس ملفوظ میں فرما رہے ہیں کہ بعض لوگوں سے ایسی بے تکلفی کا تعلق ہوتا ہے کہ ان کے بارے میں سو فیصد پکا یقین ہوتا ہے کہ اگر میں اس کی کوئی چیز اٹھا کر کھالوں گا تو اس کو ناگوار تو کجا بلکہ یہ خوش ہوگا، ایسی صورت میں صریح لفظوں میں اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں، کیونکہ معلوم ہے کہ یہ شخص خوش ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں چھین کر کھانا بھی جائز ہے، مثلاً وہ شخص کوئی چیز کھا رہا ہے، آپ نے جھپٹا مار کر اس سے وہ چیز چھین کر کھالی تو یہ بھی جائز ہے، اس لئے کہ چھیننے سے وہ دوست ناراض کیا ہوتا بلکہ اور خوش ہوگا اور اس کو راحت ہوگی، بلکہ ہوسکتا ہے کہ ظاہری اعتبار سے وہ روکنے کی بھی کوشش کرے، لیکن وہ دوست سے راضی اور خوش ہوگا کہ اگر یہ چیز میرا دوست کھالے تو اچھا ہوگا، جب یہ یقین ہو تو چھین کر بھی لے لو تو بھی کوئی حرج نہیں۔

خوش دلی کا یقین ہونا ضروری ہے

لیکن خوش دلی کا یقین واقعی ہونا چاہئے، یہ نہیں کہ اپنی طرف سے فرض

کر کے بیٹھ گئے کہ ہمارے کھانے سے اس کو خوش ہونا چاہئے، لہٰذا میں کھاؤں گا تو میرے لئے یہ کھانا جائز ہوگا، یہ کافی نہیں، بلکہ اس کے سابقہ طرز عمل سے یہ بات واضح ہو کہ میرے کھانے سے خوش ہوتا ہے، تب تو اس کی چیز چھین کر کھالو۔

حضور ﷺ کا مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پینا

فقہاء کرام کو دیکھئے کہ وہ کس کس طرح احادیث نبویہ سے مسائل مستنبط فرماتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ جس وقت مکہ مکرمہ فتح ہوا اور فتح کے بعد آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو مسجد حرام کے برابر میں حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا گھر تھا۔ حضرت ام ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی چچازاد بہن تھیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حقیقی بہن تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر میں جا کر کچھ دیر آرام فرمایا۔ ان کے گھر میں ایک پانی کا مشکیزہ لٹکا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشکیزہ سے منہ لگا کر پانی پیا۔

پانی کی ملکیت کا شرعی حکم

اس حدیث سے فقہاء کرام نے کم از کم دو درجن احکام مستنبط فرمائے ہیں، جب کوئی حدیث فقہاء کرام تک پہنچتی تھی تو فقہاء کرام خوردبین لگا کر بیٹھ جاتے اور یہ دیکھتے کہ اس حدیث سے امت کی رہنمائی کے لئے کیا کیا احکام نکل رہے ہیں۔ بہرحال! وہ مکان جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم داخل

ہوئے وہ اُمّ ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تھا اور وہ مشکیزہ بھی انہی کا تھا، اور پانی کا قاعدہ یہ ہے کہ جب تک وہ پانی دریا یا سمندر یا بڑے تالاب میں ہے تو وہ پانی سب کے لئے مباح عام ہے کہ جو شخص جتنا چاہے پانی حاصل کرلے، لیکن اگر کوئی شخص وہاں سے پانی لے کر اپنے گھر میں لے آیا اور مشکیزے میں یا مٹکے میں رکھ لیا تو اب وہ پانی اس کی ملکیت ہوگیا، اب وہ اس پانی کو فروخت بھی کرسکتا ہے، خود بھی استعمال کرسکتا ہے، دوسرے کو ہدیۃً اور تحفۃً بھی دے سکتا ہے اور دوسرے کو حلال نہیں کہ اس کی اجازت کے بغیر وہ پانی پیئے، یہ شرعی حکم ہے۔

آپ کیلئے بلا اجازت پانی پینا جائز تھا

چنانچہ فقہاء کرام نے اس حدیث میں یہ سوال اٹھایا کہ یہ مشکیزہ حضرت اُم ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا تھا، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اجازت کے بغیر اس مشکیزے سے پانی پی لیا، یہ پانی پینا آپ کے لئے کیسے جائز ہوا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بغیر اجازت آپ کے لئے پینا اس لئے جائز ہوا کہ اگرچہ صریح لفظوں میں تو اجازت آپ نے ان سے نہیں لی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم جانتے تھے کہ اگر میں اُمّ ہانی رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر کی کوئی بھی چیز استعمال کروں گا تو وہ اپنے استعمال کرنے سے بھی زیادہ خوش ہوں گی، اس وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان کی اجازت کے بغیر ان کے مشکیزے سے پانی پینا جائز ہوگیا۔

قوم کی کوڑی کو پیشاب کیلئے استعمال کرنا

اور سنیئے! حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی جگہ سے گزر رہے تھے، وہاں پر اس قوم کا کوڑا دان تھا، لوگ اپنے گھروں کا کوڑا وہاں ڈالا کرتے تھے، اس کوڑے کے ڈھیر کے پاس جا کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب فرمایا۔فقہاء کرام نے یہاں بھی یہ سوال اٹھایا کہ یہ تو ایک قوم کی ''کوڑی'' تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اجازت کے بغیر اس کوڑی کو پیشاب کرنے کے لئے کیسے استعمال فرمایا؟ پھر اس کا جواب دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وجہ سے استعمال کیا کہ وہ کوڑی کی جگہ مباح عام تھی اور حدیث کے الفاظ "سُباطة قوم" میں لفظ "سُباطة" کی لفظ قوم کی طرف اضافت ''اضافت مِلک'' نہیں بلکہ یہ اضافت بادنیٰ ملابست ہے اور بعض حضرات فقہاء نے یہ جواب دیا کہ وہ ''کوڑی'' اگرچہ قوم کی ملکیت تھی، مگر قوم کا کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے استعمال کرنے سے ناگواری محسوس کرتا، لہٰذا قوم کی اجازت متعارفہ موجود تھی۔

سلام کے جواب کیلئے تیمّم کرنا

اور سنئے! ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم راستے میں تشریف لے جارہے تھے، ایک شخص نے راستے میں آپ ﷺ کو سلام کیا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ''۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے سلام کا جواب دینا چاہا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت وضو سے نہیں تھے، قریب ہی کسی شخص کے گھر کی

دیوار تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گھر کی دیوار پر ہاتھ مار کر تیمّم کیا اور پھر اس کے سلام کا جواب دیا ''وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'' چونکہ سلام کے جواب میں اللہ تعالیٰ کا نام آ رہا تھا، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کا نام بغیر وضو کے لیا جائے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تیمّم کر کے پھر جواب دیا۔ ایسا کرنا واجب اور ضروری نہیں تھا، محض اللہ تعالیٰ کے نام کے ادب کی خاطر تیمّم کر لیا۔ یہ بات یاد رکھئے کہ اگر کوئی شخص اس مقصد کے لئے تیمّم کر لے تو اس کے لئے اس تیمّم سے نماز پڑھنا جائز نہیں۔

تیمّم کیلئے دوسرے کی دیوار کا استعمال

اس حدیث پر فقہاء کرام نے پھر سوال اٹھا دیا کہ یہ گھر تو کسی اور شخص کا تھا، اس شخص کے گھر کی دیوار کو اس کی اجازت کے بغیر تیمّم کرنے کے لئے کیسے استعمال فرمایا؟ پھر جواب دیا کہ کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس کو اس بات سے ناگواری ہو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گھر کی دیوار کے ذریعہ تیمّم کر لیں۔ لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت متعارفہ کی وجہ سے اس دیوار کو استعمال فرمایا۔

دوسروں کی چیزوں کا استعمال شریعت کی نظر میں

ان واقعات کو بیان کرنے سے دراصل یہ بتلانا مقصود ہے کہ اسلامی شریعت اور اسلامی فقہ دوسرے شخص کی چیز کو استعمال کرنے کے معاملے میں کتنی حساس ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بھی یہ سوال پیدا ہو

رہا ہے کہ آپ نے ان چیزوں کو مالک کی اجازت کے بغیر کیسے استعمال فرمایا۔ لیکن ہمارے یہاں معاملہ ایسا بنا ہوا ہے کہ حلال و حرام کی کچھ پرواہ نہیں، خاص کر جو لوگ ساتھ ساتھ رہتے ہیں، ان میں یہ ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کی چیز استعمال کر لیتے ہیں اور اس کی فکر نہیں کہ دوسرے سے اجازت لی جائے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حدیث کی رو سے صرف اجازت بھی کافی نہیں جب تک کہ وہ اجازت خوش دلی کے ساتھ نہ ہو۔

بخیل کی اجازت مشکوک ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ "بخیل" کی اجازت بھی مشکوک ہے، مثلاً آپ نے کسی بخیل سے اس کی چیز کو استعمال کرنے کی اجازت لے لی، جب اس نے اجازت دی تو اس وقت اس کے دل پر آرے چل گئے، اس نے سوچا کہ اگر اجازت نہیں دوں گا تو بُری بات ہوگی، اب اجازت دوں تو مشکل، نہ دوں تو مشکل، اس مصیبت میں آ کر اس نے اجازت دیدی۔ اس بخیل کی یہ اجازت مشکوک ہے، معتبر نہیں، کیونکہ خوش دلی سے اجازت نہیں دی۔

بخیل سے حق واجب زبردستی لینا

لیکن یہاں ایک بات اور سمجھ لینی چاہئے، وہ یہ کہ اگر "بخیل" زبردستی اپنے دل پر پتھر رکھ کر دباؤ میں آ کر اجازت دیدے تو اس کے دو حال ہیں: ایک حال یہ ہے کہ اس "بخیل" نے دباؤ میں آ کر اگر ایسی چیز کی اجازت دی

ہے جو اس بخیل کے ذمے حق واجب تھا اور وہ بخیل دیتا نہیں تھا، لیکن آپ نے زبردستی کر کے اس سے اجازت لے لی تو اس صورت میں اس چیز کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

مثلاً بخیل کی بیوی ہے، اس بیوی کا نفقہ اس کے شوہر کے ذمے واجب ہے، اب وہ شوہر اپنے بخل کی وجہ سے بیوی کو نفقہ نہیں دیتا یا ضرورت سے کم دیتا ہے جس سے بیوی کا گزارہ نہیں ہوتا، اب بیوی نے مجمع کے اندر نفقہ کا مسئلہ اٹھا دیا اور مجمع کے دباؤ میں شوہر سے نفقہ کی اجازت حاصل کر لی، حالانکہ بیوی جانتی ہے کہ اجازت دیتے وقت اس کے دل پر سانپ لوٹ رہے ہوں گے، بہر حال! شوہر نے مجمع کے دباؤ میں آکر اجازت دیدی، لیکن چونکہ بیوی کا حق شوہر کے ذمے واجب تھا، لہٰذا اگر اس شوہر نے زبردستی خوش دلی کے بغیر بھی اجازت دیدی تب بھی بیوی کیلئے نفقہ لینا حلال ہے بلکہ ایسی حالت میں بیوی کے لئے اجازت کے بغیر بھی حلال ہے۔

شوہر کے مال سے بیوی کو خرچہ لینا

حضرت ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیوی ''ہندہ'' تھیں، وہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئیں اور کہا کہ ''یا رسول اللہ! ان اباسفیان رجل مُسیك'' یعنی میرے شوہر پیسے روک روک کر استعمال کرنے کے عادی ہیں، بخیل آدمی ہیں، میرا گزارہ نہیں ہوتا، میری اولاد کو اور مجھے خرچ نہیں دیتے، کبھی کبھار وہ اپنا روپیہ پیسہ گھر میں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں تو کیا میں

ان کے علم کے بغیر ان کے پیسوں میں سے لے لیا کروں؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خذی مایکفیكِ و ولدكِ بالمعروف

یعنی جتنا تمہارے اور تمہاری اولاد کے نفقہ کے لئے ضروری ہے، اتنا لے لیا کرو، اس میں کچھ حرج نہیں۔ اس حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت کے بغیر بھی لینے کی اجازت دیدی، اس لئے کہ حق واجب تھا۔

غیر حق واجب وصول کرنا جائز نہیں

لیکن جہاں حق واجب نہ ہو وہاں زبردستی کر کے لینا جائز نہیں۔ بعض لوگ باقاعدہ اس کی پلاننگ کرتے ہیں کہ ہمارا فلاں دوست بڑا کنجوس ہے، لہٰذا ایک دن سب مل کر اس پر دھاوا بولو اور سب مل کر اس کو زچ کرو کہ وہ کسی طرح کچھ کھلانے پلانے پر آمادہ ہو جائے، یا ہدیہ تحفہ دینے پر آمادہ ہو جائے، آج اس سے ہر قیمت پر اس کے پیسے خرچ کروانے ہیں۔ چنانچہ سب نے اس کے گھر پر دھاوا بول دیا اور سب اس کے پیچھے پڑ گئے، اب وہ بیچارہ عاجز آ گیا اور ان کی بات ماننے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا، اب دل پر پتھر رکھ کر ان کی بات مان لی اور ان پر پیسے خرچ کر دیے اور ان کھلایا پلایا، مگر اس کے دل پر قیامت گزر گئی۔ اس صورت میں جو کچھ تم نے اس بخیل سے زبردستی کھایا، وہ سب حرام ہوا، اس لئے کہ وہ شخص اگرچہ بخیل تھا، لیکن اس کے ذمے تمہارے اوپر خرچ کرنا واجب نہیں تھا، تم نے اس کو اس کی مرضی کے خلاف اور اس کی خوش

دلی کے خلاف خرچ کرنے پر مجبور کیا، لہٰذا یہ خرچ کرنا لا یحل مال امرا مسلم الا بطیب نفس منه کے اندر داخل ہو کر حرام ہو گیا۔

مدارس کیلئے چندہ کرنا

مدارس کا چندہ کرنا بھی اسی حدیث کے اندر داخل ہے، حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو لوگ اپنی وجاہت سے فائدہ اٹھا کر چندہ کرتے ہیں، وہ چندہ مشکوک ہے، اس لئے کہ جس سے چندہ کیا جا رہا ہے، جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ اتنے بڑے مولانا صاحب چندے کے لئے میری دکان پر تشریف لائے ہیں، اب دل تو چندہ دینے کو نہیں چاہ رہا ہے، مگر ان بڑے مولانا صاحب کو کیسے رد کروں۔ چنانچہ اس نے دل پر پتھر رکھ کر کچھ پیسے بطور چندہ کے ان کو دیدیے، لیکن یہ پیسے خوش دلی سے نہیں دیے اور ایسا چندہ جو خوش دلی سے نہ ہو، وہ لینا جائز نہیں۔

مجمع عام میں چندہ کرنا

اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آج کل مجمع عام میں چندہ کرنا مناسب نہیں، مجمع عام میں چندہ کرنے سے بکثرت لوگ محض سر سے بلا ٹالنے کے لئے اور لوگوں کی ملامت سے بچنے کے لئے چندہ دیدیتے ہیں، اس دینے میں اخلاص بہت کم ہوتا ہے۔ آج کل کی قید اس لئے لگا دی کہ لوگ مجمع عام میں چندہ کے جواز پر ''غزوہ تبوک'' کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ''غزوہ تبوک'' کے موقع پر مسجد نبوی میں

عام چندہ کیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن حضرات سے چندہ مانگا جا رہا تھا، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تھے، جن کے بارے میں یہ یقین تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کے لئے چندہ دینا ہوگا تو دیں گے، اگر اللہ تعالیٰ کے لئے نہیں دینا ہوگا تو نہیں دیں گے، آج ہم اپنے آپ کو صحابہ کرامؓ پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں۔ لہٰذا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مجمع عام میں چندہ کرنے کی ریت اچھی نہیں ہے، اس میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ لوگوں کی خوش دلی کے بغیر چندہ وصول کر لیا گیا ہو، لہٰذا ایسا چندہ "لَا یَحِلُّ مال امرإمسلم الا بطیب نفس منه" میں داخل ہونے کی بناء پر جائز نہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان سب باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۷

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵

مجلس نمبر : ۷۰

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ؕ

بخل اور اس کا علاج

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِيۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَ نُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنۡ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا ۔

أَمَّا بَعۡدُ!

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

سود لینے سے بخل بڑھتا ہے، کیونکہ سود لینے کا سبب ہی بخل ہے، جتنا سود لیتا ہے بخل اتنا ہی بڑھتا جاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے تن پر بھی خرچ نہیں کرسکتا۔

(انفاس عیسیٰ: ص۱۹۱)

''بخل'' کی خاصیت یہ ہے کہ جتنا مال بڑھتا جاتا ہے تو بجائے اس کے کہ مال کے بڑھنے سے اس سے استغناء پیدا ہو، اس کی حرص اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے اور مال کی محبّت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ یعنی انسان کو کتنا ہی مال مل جائے وہ اس مال پر قناعت کرنے کے بجائے اور زیادہ مال حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے، اور قاعدہ کا تقاضہ یہ ہے کہ جب مال بڑھ جائے تو طبیعت میں استغناء پیدا ہو جائے لیکن استغناء بھی نہیں ہوتا اور نہ ہی خرچ کرنے کا داعیہ زیادہ ہوتا ہے بلکہ مال کی محبّت اور بڑھ جاتی ہے۔ ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لو كان لابن آدم وا دياً من ذهب أحب أن يكون له وا ديان ولا يملأ جوف ابن آدم الا التراب۔

(صحيح بخاری، كتاب الرقاق، باب مايتقى من فتنة المال)

انسان کا پیٹ قبر کی مٹی بھریگی

یعنی اگر ابن آدم کو سونے کی بھری ایک وادی مل جائے تو وہ یہ چاہے گا کہ دو وادیاں مل جائیں، اور اگر دو وادیاں سونے کی بھری مل جائیں تو اس کی خواہش ہوگی کہ تین مل جائیں۔ پھر آخر میں خوبصورت حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا کہ:

ولا يملأ جوف ابن آدم إلا التراب۔

یعنی آدم کا پیٹ قبر کی مٹی کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں بھر سکتی۔ انسان کا پیٹ اسی وقت بھرے گا جب اس کے اندر مٹی بھرے گی، جب تک انسان قناعت پیدا نہ کرے اور مال کی محبت اس کے دل میں ترقی کرتی چلی جائے تو اس کے نتیجے میں اس کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔

ایک سوداگر کا واقعہ

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

آں شنیدہ استی کہ درصحرائے غور
رختِ سالار افتادہ اسپ طور
گفت چشم تنگ دنیادار را
یا قناعت پُرکند یا خاکِ گور

یعنی میں تمہیں ایک واقعہ سناتا ہوں کہ غور کے صحراء میں ایک بہت بڑے سوداگر

کا سامان خچر سے گرا پڑا تھا اور وہ خچر بھی مرا ہوا پڑا تھا اور خود وہ سوداگر بھی مرا ہوا تھا۔ اور وہ سامان جو بکھرا پڑا تھا، وہ زبان حال سے یہ کہہ رہا تھا کہ دنیا دار کی تنگ نگاہ کو صرف دو چیزیں بھر سکتی ہیں، یا قناعت یا قبر کی مٹی، تیسری کوئی چیز اس کو پُر نہیں کرسکتی۔ بہرحال! بخل کی خاصیت یہ ہے کہ جتنا مال بڑھتا چلا جاتا ہے، اتنی ہی حرص بڑھتی چلی جاتی ہے اور اتنی ہی مال کی محبّت بڑھتی چلی جاتی ہے اور خرچ کرنے میں اور زیادہ رکاوٹ پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔

ایک بڑے سرمایہ دار کا قول

کراچی میں ایک بہت بڑے سرمایہ دار ہیں اور پاکستان کے مشہور دو چار سرمایہ داروں میں سے ایک ہیں، ارب پتی اور کھرب پتی ہوں گے، ایک دن وہ میرے پاس آئے تو میں نے ان سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت پیسہ دیا ہے، آپ نے بہت سے کارخانے بنائے، فیکٹریاں لگائیں، سب کچھ کرلیا، اب کچھ کام نفع کی خاطر نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاطر کرلو، وہ یہ کہ تم ایک ایسا بینک قائم کرو جو سود کے بغیر کام کرے، تمہارے پاس چونکہ پیسہ ہے، اس لئے تم یہ کام کرسکتے ہو، وہ کہنے لگے کہ مولانا صاحب! وہ بینک پھر کیسے چلے گا؟ میں نے کہا کہ انشاء اللہ چلے گا، لیکن تم یہ سوچ کر قائم کرو کہ جو پیسہ تم نے اس بینک میں لگا دیا وہ گیا، جب اللہ کے فضل سے تمہارے پاس اربوں کھربوں روپیہ موجود ہے، تو اگر اس بینک کے قیام پر چند کروڑ روپے لگا دو گے تو کیا فرق پڑے گا اور چند کروڑ روپے لگا کر ان کو بھول جاؤ۔ کہنے لگے کہ

میں ان کو پھر بھول جاؤں؟ میں نے کہا کہ تم تو بھول جاؤ کہ وہ چند کروڑ روپے کہاں گئے، البتہ اللہ تعالیٰ چاہیں گے تو اس میں نفع بھی عطا فرمادیں گے لیکن تم اس کو بھول جاؤ۔ وہ آخر میں کہنے لگے کہ مولانا صاحب! بات تو آپ صحیح کہتے ہو مگر ہاتھ کی کھجلی کو میں کیا کروں!!

غریب اور امیر کے خرچ کرنے میں فرق

یہ ہے مال کو بڑھانے کی کھجلی، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ یہ ''بخل'' بھی پھر رفتہ رفتہ کھجلی کی شکل اختیار کر لیتا ہے، پھر انسان کے پاس کتنا ہی پیسہ آ جائے مگر اسکی حرص نہیں مٹتی، میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جتنا غریب آدمی دو پانچ روپے اطمینان اور خوش دلی سے چندہ دیتا ہے، وہ مالدار جس کے پاس اربوں کھربوں روپیہ ہے، وہ اتنی خوش دلی سے نہیں دیتا، حالانکہ اس مالدار کے پاس گنجائش زیادہ ہے اور اس غریب کے پاس گنجائش بالکل نہیں، یہ سب حبِّ مال کا نتیجہ ہے۔

سود کی ذہنیت بخل پیدا کرتی ہے

اس ''بخل'' کا سب سے بڑا ذریعہ سود ہے، کیونکہ سود کا مطلب یہ ہے کہ کام کچھ نہ کرو اور نہ کوئی خطرہ مول لو اور پیسے کے اوپر پیسہ بناؤ۔ یہ بخیل کا کام ہے اور سود کی ذہنیت خود انسان کے اندر بخل پیدا کرتی ہے، دنیا میں جتنی سود خور قومیں گزری ہیں، سب سے زیادہ کنجوس بھی وہی قومیں ہیں، دنیا میں

سب سے زیادہ سود خور قوم ''یہودی'' ہے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَاَخْذِهِمُ الرِّبٰی وَ قَدْ نُهُوْا عَنْهُ۔

(سورۂ نساء: آیت ۱۶۱)

اور بسبب اس کے کہ وہ سود لیتے تھے، حالانکہ ان کو اس سے ممانعت کی گئی تھی۔

آج بھی دنیا کا سارا سودی کاروبار ان یہودیوں کے ہاتھ میں ہے اور یہی سب سے زیادہ کنجوس قوم ہے اور ساری دنیا میں ان کی کنجوسی کی شہرت ہے۔

یہودی ''شائی لاک'' کا قصہ:

آپ نے ''شائی لاک'' کا قصہ سنا ہوگا، یہ روم کے بادشاہ کے زمانے کا قصہ ہے، ایک شخص یہودی تھا، اس کا نام ''شائی لاک'' تھا، ایک ضرورت مند اس کے پاس پیسے لینے آیا، شائی لاک نے کہا کہ میں سود پر قرض دوں گا، چنانچہ اس نے سود پر قرض دے دیا اور جتنا قرض دیا تھا، اس سے ڈیوڑھا سود لگا دیا اور اس سے کہا کہ اتنے دنوں کے اندر ادا کر دینا۔ قرض لینے والا غریب آدمی تھا، وہ اپنے کھانے پینے کی ضرورت کے لئے قرض لے رہا تھا، جب وہ دن پورے ہو گئے اور ادائیگی کی تاریخ آ گئی تو شائی لاک اس کے گھر پیسے وصول کرنے کے لئے پہنچ گیا۔ اس غریب نے کہا کہ میرے پاس تو اس وقت تھوڑے پیسے ہیں، چنانچہ اس نے اس کو کچھ پیسے دیدیے اور کہا کہ اور نہیں ہیں

ورنہ میں تمہیں دیدیتا، شائی لاک نے کہا کہ اچھا وہ سود اب ڈبل ہوگیا اور ادا کرنے کی تاریخ مقرر کردی۔ جب دوبارہ وہ تاریخ آئی تو شائی لاک پھر اس کے گھر پہنچ گیا، اس غریب نے کہا کہ تم نے تو سود ڈبل کر دیا، اب میں اس وقت اصل رقم تو دے سکتا ہوں مگر یہ سود کی ڈبل رقم نہیں دے سکتا، اس لئے اصل رقم لے لو، اس نے کہا کہ نہیں، میں تو پورا سود لوں گا اور اب میں تمہاری مدت نہیں بڑھاؤں گا، اس غریب نے کہا کہ میرے پاس ادا کرنے کے لئے رقم ہی نہیں ہے تو میں کیا کروں، شائی لاک نے کہا کہ میں ایک اور تاریخ مقرر کرتا ہوں، اگر اس تاریخ پر تم نے روپیہ ادا نہ کیا تو تمہارے جسم کا ایک پونڈ گوشت نکالوں گا اور اس کو کھاؤں گا اور پیسے الگ لوں گا، جب وہ تاریخ آ گئی اور وہ غریب سود ادا نہیں کرسکا تو شائی لاک اس کے گھر پر چھری چاقو لے کر پہنچ گیا۔

پیسے کے بدلے انسانی گوشت

وہ غریب آدمی پریشان ہوگیا اور کسی طرح بچتے بچاتے روم کے بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا اور بادشاہ سے کہا کہ شائی لاک میرا گوشت کاٹنے آرہا ہے، چنانچہ اس کے بعد عدالت میں مقدمہ چلا اور اس کو جیل میں بند کر دیا گیا، شائی لاک نے عدالت میں بڑی زوردار تقریر کی، اور اس تقریر میں اس نے کہا کہ میرے ساتھ آپ انصاف کریں، یہ شخص اتنے دنوں سے ٹال مٹول کر رہا ہے اور میرے پیسے نہیں دے رہا ہے، اور پھر اس نے آخر میں خود اپنی رضا

مندی سے اپنا گوشت کاٹنے کے لئے کہا تھا، اب عدالت کو چاہئے کہ وہ مجھے اس بات کی ڈگری دے کہ اس کا گوشت نکال لوں، اس لئے کہ انصاف کا تقاضہ یہی ہے۔

وہ غریب مقروض تو جیل میں بند تھا اور عدالت میں نہیں آسکتا تھا، اس لئے اس کی بیوی عدالت میں آئی اور اس نے عدالت میں تقریر کی، اس تقریر میں اس نے کہا کہ شائی لاک یہ کہتا ہے کہ انصاف دلاؤ اور اس کے کہنے کے مطابق انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ مقروض کا گوشت نکال کر کھایا جائے، میں آپ سے پوچھتی ہوں کہ اگر ہم سب لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے لگیں تو ہمارا کہاں ٹھکانہ ہوگا، اس دنیا میں انصاف ہی سب کچھ نہیں، بلکہ ایک چیز رحم بھی ہے، اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائیں گے تو تب ہم نجات پائیں گے، اس کے بغیر نجات نہیں پائیں گے۔ چنانچہ بادشاہ نے اس غریب کے حق میں رحم کی بنیاد پر فیصلہ دیا۔ بہرحال! شائی لاک کی طرح یہودی قوم ساری دنیا میں بخیل مشہور ہے۔

ہندو بنیئے سود خور قوم

دنیا میں دوسری سب سے بڑی سود خود قوم ''ہندو'' ہے۔ ہندو ''بنیا'' مشہور ہے، ہندوستان کے ہندو تاجر کو ''بنیا'' کہا جاتا ہے، ان کو ''مہاجن'' بھی کہتے ہیں، یہ سود لے کر کھانے والے ہیں، ان کی کنجوسی ضرب المثل ہے، ان کے ہاں ایک ایک پائی کا حساب و کتاب ہوتا ہے۔

ہندی کی ایک ضرب المثل

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہندی زبان کی ایک بڑے مزے کی ''ضرب المثل'' سنایا کرتے تھے، وہ یہ کہ:

لالہ جی گئے پاؤنے، چار دن میں آئے، لالہ جی کے گھر
آ گئے چار پاؤنے، لالہ جی نہ گئے نہ آئے۔

ہندو بنیے کو ''لالہ جی'' کہا جاتا تھا، ''پاؤنے'' کے معنی ہیں ''مہمان'' یعنی ''لالہ جی'' کسی کے گھر مہمان بن کر چلے گئے اور چار دن اس کے گھر قیام فرمایا اور چار دن کے بعد واپس آئے، اس طرح چار دن کے کھانے کا خرچ بچ گیا، پھر ایک دن لالہ جی کے گھر چار مہمان آ گئے، اب جو کچھ چار دن کے کھانے کی بچت ہوئی تھی وہ برابر ہوگئی، اس لئے لالہ جی نہ گئے اور نہ آئے۔ بہرحال! ان کے اس طرح کنجوسی کا حساب و کتاب جاری رہتا ہے کہ ایک پائی نہ جانے پائے، درحقیقت یہ سود کی ذہنیت یہ کنجوسی پیدا کرتی ہے۔

مالیاتی گناہ بخل پیدا کرتے ہیں

یاد رکھئے! جس شخص کو اللہ تعالیٰ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام کی پرواہ نہیں، اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ اس کے پاس جتنا پیسہ بڑھتا چلا جائے گا، اتنا ہی اس کا بخل بڑھتا چلا جائے گا، اتنی ہی اس کی حرص بڑھے گی اور پیسے خرچ کرتے ہوئے اس کی اتنی ہی جان نکلے گی۔ غریب آدمی اطمینان

سے پیسہ خرچ کر دے گا لیکن یہ بڑا سرمایہ دار جو سرمایہ پر سانپ بن کر بیٹھا ہے، وہ خرچ کرنے پر تیار نہیں ہوگا۔ یاد رکھئے! یہ مالیاتی گناہ بخل پیدا کرتے ہیں اور بخل کے نتیجے میں ''حبّ مال'' اور زیادہ بڑھتی چلی جاتی ہے۔

یہ دعا کثرت سے کریں

اس سے بچنے کا راستہ صرف ایک ہے، وہ یہ کہ آدمی اپنے آپ کو شریعت کا تابع بنائے اور قناعت دل میں پیدا کرے اور یہ دعا کرے کہ اے اللہ! جائز اور حلال طریقے سے آپ مجھے جتنا عطا فرما دیں گے، میرے لئے وہی نعمت ہے اور یہ دعا کرے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی کہ:

اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْهِ
وَاخْلُفْ عَلٰی كُلِّ غَائِبَةٍ لِّیْ مِنْكَ بِخَیْرٍ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک لفظ پر آدمی قربان ہو جائے، فرمایا کہ اے اللہ! جو کچھ رزق آپ نے عطا فرمایا ہے، مجھے اس پر قناعت عطا فرمایئے اور مجھے اس میں برکت دیدیجئے، جب تھوڑے مال میں اللہ تعالیٰ برکت عطا فرما دیتے ہیں تو پھر وہ لاکھوں کروڑوں سے زیادہ فائدہ پہنچا دیتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے رزق میں برکت نہ ہو تو پھر کروڑوں اور لاکھوں بھی بیکار ہو جاتے ہیں، ان سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ آگے فرمایا کہ اے اللہ! جو مال میرے پاس موجود نہیں ہے، اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما جو آپ کے نزدیک خیر ہو، یعنی میں کتنا بھی غور و فکر کرلوں کہ میرے لئے کیا چیز

اچھی ہے اور کیا چیز بُری ہے، لیکن میری محدود فکر اور میری محدود سوچ کبھی بھی حقیقت حال تک پہنچنے کے لئے کافی نہیں ہوسکتی، لہٰذا اے اللہ! یہ معاملہ میں آپ کے اوپر چھوڑتا ہوں، یا اللہ! جو چیز میرے پاس نہیں ہے، اس کے بدلے میں مجھے وہ چیز عطا فرما جو آپ کے نزدیک خیر ہو۔

حلال طریقے سے مال میں اضافے کی کوشش کرنا جائز ہے

لیکن یہ بھی سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ سے قناعت کی دعا تو کریں لیکن جائز اور حلال طریقے سے اس مال میں اضافے کی کوشش کرنا قناعت کے منافی نہیں، اس کی دلیل یہ ہے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تجارت کی ترغیب بھی عطا فرمائی ہے، اگر حلال طریقے سے مال بڑھانا قناعت کے خلاف ہوتا تو آپ تجارت کی ترغیب نہ دیتے، اس سے پتہ چلا کہ حلال طریقے سے مال کو بڑھانے کی اجازت ہے۔ مگر یہ سوچتے ہوئے کہ جائز اور حلال طریقے سے اللہ تعالیٰ جتنا عطا فرمائیں گے وہ نعمت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرکے استعمال کریں گے اور ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کی فکر دل میں کبھی بھی پیدا نہیں کریں گے اور اس مال کی محبت کو دل پر غالب نہیں ہونے دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۷۱

اِسراف اور اس کا علاج

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر، ۵

مجلس نمبر : ۱۷

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم ط

اِسراف اور اس کا علاج

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَ نُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا ـ مَنۡ یَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَأَشۡهَدُاَنۡ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِیۡكَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ صَلَّی اللّٰهُ تَعَالٰی عَلَیۡهِ وَعَلٰی اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا ـ

أَمَّا بَعۡدُ!

’’بخل‘‘ کی ضد ’’اِسراف‘‘

گزشتہ تین دن سے ’’بخل‘‘ کا بیان چل رہا تھا، الحمدللہ! وہ مکمل ہوگیا۔

اب آگے حضرت نے ''اسراف'' کا عنوان قائم کیا ہے، یہ ''اسراف'' ''بخل'' کی ضد ہے، کیونکہ بخل کے معنی یہ ہیں کہ جہاں آدمی کو خرچ کرنا چاہئے، وہاں خرچ نہ کرے اور ''اسراف'' کے معنی یہ ہیں کہ جہاں خرچ نہ کرنا چاہئے، وہاں خرچ کرے اور دونوں منع ہیں اور ناجائز ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ''عِبَادُالرحمٰن'' کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ إِذَا أَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا
وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَاماً۔ (الفرقان:۶۷)

یعنی رحمان کے بندے وہ ہیں کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف اور فضول خرچی کرتے ہیں اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں اور اعتدال کا راستہ ان دونوں کے درمیان ہے۔ نہ تو انسان ''اسراف'' کے اندر مبتلا ہو اور نہ ہی ''بخل'' کے اندر مبتلا ہو۔

خرچ سے پہلے سوچو

''اسراف'' کے بیان میں سب سے پہلے حضرت والا کا ایک ملفوظ نقل فرمایا ہے جو حضرت والا نے اپنے کسی مرید کے خط کے جواب میں ''تربیت السالک'' میں تحریر فرمایا تھا۔ وہ ملفوظ یہ ہے کہ:

خرچ کرنے سے قبل دو امر کا انتظام کرلیں، ایک یہ کہ پہلے سوچا کریں کہ اگر اس جگہ خرچ نہ کروں تو آیا کچھ ضرر ہے یا نہیں؟ اگر ضرر نہ ہو تو اس کو ترک کر دیں،

اور اگر ضرر معلوم ہوتا ہو تو کسی منتظم سے مشورہ کریں کہ یہ خرچ خلافِ مصلحت اور نامناسب تو نہیں، وہ جو بتلائے اس پر عمل کریں، ضرر سے مراد ضرر واقعی اور حقیقی ہے جس کا معیار شریعت ہے، وہمی اور خیالی ضرر مراد نہیں۔

مریض کے مطابق نسخہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے ''اسراف'' سے بچنے کا طریقہ لکھا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ طبیب اپنے زیرِ علاج مریض کا جائزہ لے کر اس کے حالات کے مناسب نسخہ تجویز کرتا ہے، چنانچہ اس ملفوظ میں بھی حضرت والا نے یہ فرما دیا کہ اگر کسی جگہ خرچ کرنے میں ضرر معلوم نہ ہو تو وہاں بھی کسی منتظم سے مشورہ کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس ملفوظ میں جو صاحب مخاطب تھے، وہ شاید بہت زیادہ فضول خرچی میں مبتلا ہوں گے اور ان کی رائے پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا ہوگا، اس لئے آپ نے یہ علاج تجویز فرمایا۔

ایسی صورت میں خرچ نہ کرے

ورنہ اصل بات یہ ہے کہ انسان خرچ کرنے سے پہلے سوچے کہ اگر خرچ نہ کروں تو کیا نقصان ہے، اگر خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے تو پھر خرچ کر لے، لیکن اگر خرچ نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں تو پھر خرچ کرنے کی کیا ضرورت

ہے، وہ خرچ ضرورت سے زائد ہے اور اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

نقصان کا فیصلہ کون کرے؟

لیکن اب سوال یہ ہے کہ کہاں خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے اور کہاں نقصان نہیں؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا دو اور دو چار کر کے جواب دینا مشکل ہے، کسی بھی علم و فن میں جو قاعدے اور ضابطے ہوتے ہیں، وہ ایک حد تک کام دیتے ہیں، اس حد سے آگے پھر انسان کو اپنے مذاقِ سلیم سے فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

خرچ کرنے میں فائدہ ہے یا نہیں؟

یہ تو ہے منفی طریقہ کہ خرچ کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے یا نہیں۔ ایک اس کے مقابلے میں مثبت طریقہ ہے، وہ یہ کہ خرچ کرتے وقت یہ دیکھو کہ خرچ کرنے میں فائدہ ہے یا نہیں؟ اگر خرچ کرنے میں فائدہ ہے تو خرچ کرلو، اگر فائدہ نہیں تو ترک کردو، اصل معیار یہ ہے۔ لہٰذا ''اسراف'' کے اصل معنی ہیں ''ایسا خرچ جس کا کچھ فائدہ نہ ہو'' فائدہ سے مراد عام ہے، چاہے وہ دین کا فائدہ ہو یا دنیا کا فائدہ ہو، اور دنیا کے فائدے سے بھی وہ فائدہ مراد ہے جو مشروع ہو اور جائز ہو، ناجائز فائدہ مراد نہیں۔ لہٰذا جس خرچ میں دین کا فائدہ ہو یا دنیا کا جائز اور مشروع فائدہ ہو، وہ ''اسراف'' میں داخل نہیں اور اگر کوئی ایسا خرچ ہے جس کا سرے سے کوئی فائدہ ہی نہیں یا

فائدہ ایسا ہے جس کا حاصل کرنا شرعاً جائز نہیں، ایسا خرچ اسراف میں داخل ہے۔

یہ صورت ''اسراف'' نہیں

اسی تفصیل سے یہ اصول نکلتا ہے کہ بہت سے خرچ جن کو لوگ ''اسراف'' سمجھتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہ اسراف نہیں ہوتے، مثلاً ایک آدمی اپنی حدود استطاعت میں رہتے ہوئے اپنے راحت اور آرام کے لئے یا اپنا دل خوش کرنے کے لئے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ پیسے خرچ کر کے ایک چیز خرید کر لے آتا ہے، مثلاً ایک چیز بازار میں دس روپے کی بھی مل رہی ہے اور ۱۵ر روپے کی بھی مل رہی ہے اور ۲۰ر روپے کی بھی مل رہی ہے اور وہی چیز سو روپے کی بھی مل رہی ہے، البتہ معیار اور درجات میں فرق ہے۔ اب ایک آدمی کو وہی چیز خریدنے کے لئے سو روپے خرچ کرنے کی استطاعت ہے اور اس کو وہ چیز خریدنے کے لئے کسی سے قرض لینے کی بھی ضرورت نہیں، لہٰذا وہ شخص اپنی راحت کے لئے دس روپے والی چیز کے بجائے سو روپے والی چیز خریدتا ہے تو یہ ''اسراف'' نہیں اور کوئی گناہ نہیں۔

سفر کیلئے سہولت کی سواری اختیار کرنا

اسی طرح مثلاً تمہیں سفر کر کے دوسرے شہر جانا ہے، اب تم اس کے لئے ریل گاڑی کی تھرڈ کلاس میں بھی سفر کر سکتے ہو اور سیکنڈ کلاس میں بھی سفر کر سکتے

ہو اور فرسٹ کلاس میں بھی کر سکتے ہو اور ائیر کنڈیشن میں بھی کر سکتے ہو اور ہوائی جہاز میں بھی کر سکتے ہو اور ان سب کے کرایوں میں بڑا فرق ہے۔ لیکن ایک شخص جو ائیر کنڈیشن کلاس میں سفر کرنے کی استطاعت رکھتا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں تو اپنی راحت کے لئے ائیر کنڈیشن کلاس میں سفر کروں گا تو یہ کوئی اسراف نہیں اور کوئی گناہ نہیں۔ اسی طرح کوئی شخص اپنا دل خوش کرنے کے لئے یا اپنے بیوی بچوں کا دل خوش کرنے کے لئے کچھ خرچ کر دے تو یہ اسراف میں داخل نہیں۔

رہائش میں تین درجے جائز ہیں

حضرت والا نے مکان کے سلسلے میں ایک اصول بیان فرمایا ہے جو اصول تمام چیزوں پر منطبق ہوتا ہے، فرمایا کہ مکان کے اندر چند درجات ہوتے ہیں، ایک درجہ ہے ''رہائش'' یعنی آپ کچا سا مکان بنالیں یا صرف پتھروں کا ایک مکان بنالیں اور ٹین کی چھت ڈال دیں اور اس میں رہائش اختیار کرلیں، اس میں نہ پلستر کیا اور نہ رنگ و روغن، یہ رہائش کا پہلا درجہ ہے۔ رہائش کا دوسرا درجہ ہے ''آسائش'' یعنی آرام دہ رہائش، مثلاً ایک مکان بنوایا، اس کی چھت پکی ڈالوائی اور سونے کے لئے چارپائی پر گدا بھی بچھایا تاکہ آرام اور سکون کی نیند آئے، یہ سب ''آسائش'' ہے اور جائز ہے، یہ دوسرا درجہ ہے۔ تیسرا درجہ ہے ''آرائش'' یعنی زینت اختیار کرنا مثلاً پختہ مکان بنوایا اور آرائش کے لئے اس پر پلستر بھی کرایا اور پھر رنگ و روغن بھی کرایا تاکہ

خوبصورت معلوم ہو اور باتھ روم میں ٹائل بھی لگوائے تاکہ خوبصورت معلوم ہو، یہ سب ''آرائش'' کے اندر داخل ہے، اگر حلال مال سے یہ سب کام کرایا ہے اور اس کام کے لئے کسی سے قرض وغیرہ نہیں لینا پڑا تو یہ بھی جائز ہے، یہ تینوں درجے جائز ہیں، یعنی رہائش جائز، آسائش جائز، آرائش جائز۔

چوتھا درجہ جائز نہیں

چوتھا درجہ ہے ''نمائش'' یعنی دکھلاوا، کوئی کام صرف اس لئے کیا جائے تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ یہ بڑا آدمی ہے، یہ بڑا دولت مند ہے لوگ یہ کہیں کہ اس کا مکان بڑا شاندار ہے، اس کی گاڑی بڑی شاندار ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس لئے اختیار کی ہیں تاکہ اپنی دولت کی نمائش کرے، یہ درجہ حرام ہے۔ اس ''نمائش'' میں فائدہ تو ہے، اس لئے کہ جب وہ اپنی دولت کی نمائش کرے گا تو لوگ اس کو بڑا سمجھیں گے اور بڑا سمجھ کر اس کی تعظیم کریں گے اور اس کی عزت کریں گے اور اس کا حکم مانیں گے، لہٰذا اس ''نمائش'' کے اندر فائدہ تو ہے لیکن یہ فائدہ مشروع نہیں اور شریعت کے اندر معتبر نہیں۔ لہٰذا یہ فائدہ کالعدم ہے۔

اصل معیار ''مشروع فائدہ'' ہے

دیکھئے! ''رہائش'' فائدہ ہے، ''آسائش'' فائدہ ہے، ''آرائش'' فائدہ ہے، ان تینوں اغراض کی وجہ سے جو کچھ خرچ کیا جارہا ہے، وہ ''اسراف'' میں

داخل نہیں، لیکن نمائش میں فائدہ تو ہے مگر وہ فائدہ مشروع نہیں، اس لئے وہ ''اسراف'' میں داخل ہے۔ لہٰذا اگر کوئی کام ایسا ہے جس میں کوئی فائدہ ہی نہیں، مثلاً پیسے اٹھا کر پھینک دیئے یا مثلاً ایک چیز مہنگے داموں میں خرید لی، اگر ذرا توجہ سے کام لیتا تو وہ چیز سستی مل جاتی لیکن اس نے وہی چیز خریدنے میں اپنی غفلت، بے پرواہی اور ناقدری سے زیادہ پیسے خرچ کر دیئے تو یہ اسراف ہوگیا۔

دو پیسوں کی تلاش کا واقعہ

ایک مرتبہ میں حضرت والد صاحبؒ کے ساتھ لاہور گیا ہوا تھا، اس وقت میں چھوٹا بچہ تھا، لاہور میں میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم رہتے تھے، وہاں لاہور میں کسی جگہ میں اور والد صاحب اور بھائی صاحب ہم تینوں پیدل جا رہے تھے، ایک جگہ لاہور میں ''کپورتھلہ ہاؤس'' کہلاتی تھی، رات کا وقت تھا، اندھیرا تھا، ایک جگہ پر خاردار تار لگے ہوئے تھے، آدمی بڑی مشکل سے وہاں سے نکلتا تھا۔ بڑے بھائی صاحب مرحوم جیب سے پیسے نکال رہے تھے کہ اس اندھیرے میں پیسے نکالتے ہوئے کوئی سکہ زمین پر گر گیا، اب اندھیرا بھی تھا، جلدی بھی تھی اور خاردار تار بھی لگے ہوئے تھے، اس لئے بھائی صاحب نے سوچا کہ کون اس سکّے کو اندھیرے میں تلاش کرے، چنانچہ وہ اس کو چھوڑ کر آگے بڑھنے لگے۔ حضرت والد صاحب نے بھائی سے پوچھا کہ کیا گرا؟ بھائی صاحب نے کہا کہ کچھ سکے گر گئے، والد

صاحب نے فرمایا کہ اس کو کیوں نہیں اٹھاتے؟ بھائی صاحب نے کہا کہ وہ صرف دو پیسے یا ایک آنہ تھا، والد صاحب نے فرمایا کہ دو پیسے تھے یا ایک آنہ تھا، پہلے تھوڑی دیر اس کو تلاش ضرور کرو، پھر اگر ملنے سے مایوسی ہو جائے تو خیر ہے، چھوڑ دو، لیکن تلاش ضرور کرو، چنانچہ والد صاحب نے کہیں سے ماچس منگوائی اور خود ہی ماچس جلائی اور پھر فرمایا کہ اب تلاش کرو، اب وہ دو پیسے تلاش کئے جارہے ہیں۔

اجزاء قلیلہ کی قدر بھی ضروری ہے

پھر فرمایا کہ چاہے ایک پیسہ ہو یا دو پیسے ہوں، یہ اللہ جل شانہ کی نعمت ہے، اس کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ معمولی چیز ہے، گر گیا تو بس گر گیا، پھر اس کو اس طرح چھوڑ کر چلے جانا اللہ جل شانہ کی نعمت کی ناقدری ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک ملفوظ میں فرمایا ہے کہ ''جس نعمت کے اجزاء کثیرہ سے تم انتفاع کرتے ہو، اس کے اجزاء قلیلہ کی عزت کرنا تمہارے ذمے ضروری ہے۔ یعنی جس چیز کی بہت بڑی مقدار سے تم فائدہ اٹھاتے ہو، اس چیز کی تھوڑی مقدار بھی اگر تمہارے پاس ہے تو اس کی بھی عزت کرو۔ اس لئے حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ جو پیسے گر گئے ہیں، چاہے وہ ایک آنہ ہے یا دو پیسے ہیں، اس کو تھوڑی دیر کے لئے تلاش ضرور کرو، اس پر تھوڑا وقت صرف کرو تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری نہ ہو، بغیر تلاش کئے ہوئے چھوڑ کر چلے جانا ''اسراف'' اور ناقدری ہے۔ البتہ اگر تمہیں سخاوت

کرنی ہے تو کسی ضرورت مند کو دیدو، اس کے کام آ جائے گا، وہ اسراف نہ ہوگا بلکہ صدقہ ہوگا اور وہ پیسہ صحیح جگہ پر پہنچ جائے گا۔

فائدہ غیر مشروعہ میں خرچ

جب اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چھوٹی چھوٹی نعمتوں کی قدر کرو گے اور اس پر شکر کرو گے تو اللہ تعالیٰ اور عطا فرمائیں گے اور اگر ناقدری کرو گے تو پھر وبال کا اور اس نعمت کے چھن جانے کا اندیشہ ہے۔ بہرحال پیسے گم ہونے پر تلاش نہ کرنا اس بات کی مثال ہوئی جہاں فائدے کے بغیر خرچ ہو اور پیسے ویسے ہی ضائع ہو گئے۔ اور ''نمائش'' اس صورت کی مثال ہے جس میں خرچ کرنے پر فائدہ تو ہے لیکن وہ فائدہ مشروع نہیں، شرعاً جائز نہیں، یا پیسے خرچ کر کے کوئی ایسی لذت حاصل کی جا رہی ہے جو جائز نہیں، اس میں خرچ سے فائدہ ہے لیکن فائدہ غیر مشروعہ ہے، لہٰذا وہ ''اسراف'' میں داخل ہے۔

''اسراف'' اور ''تبذیر'' میں فرق

علماء فرماتے ہیں کہ ''اِسراف'' اور ''تبذیر'' میں عموم خصوص مطلق کی نسبت ہے۔ ''اِسراف'' عام ہے اور تبذیر خاص ہے، تبذیر صرف اس صورت میں ہوتی ہے جب خرچ کا محل غیر مشروع ہو، یعنی ناجائز کام میں پیسہ خرچ کرنا ''تبذیر'' ہے، مثلاً فلم دیکھنے میں یا جوے میں پیسے خرچ کر دے تو یہ تبذیر ہے اور یہی صورتیں ''اِسراف'' میں بھی داخل ہیں، البتہ جہاں پیسہ ناجائز اور

حرام کام میں خرچ نہیں ہو رہا ہے لیکن بے فائدہ کام پر ہو رہا ہے تو اس صورت میں ''اِسراف'' تو ہے لیکن ''تبذیر'' نہیں۔ بہرحال! چونکہ ''اِسراف'' تبذیر کو بھی شامل ہے، اس لئے میں نے ''اِسراف'' کی تعریف یہ کردی کہ پیسے ایسی جگہ خرچ کرنا جہاں فائدہ نہ ہو، یا فائدہ ہو لیکن ناجائز ہو۔

مجاہدہ کیا ہے؟

جیسا کہ پہلے میں نے عرض کیا تھا کہ جب کسی آدمی کی تربیت کی جاتی ہے تو اس کی جو اصل منزل ہے اور جہاں اس کو پہنچنا ہے، اس منزل تک پہنچنے سے پہلے اس کو تیار کیا جاتا ہے، اسی تیاری کا نام ''مجاہدہ'' ہے، مثلاً مقصود اصلی تو حرام سے بچنا ہے، لیکن اس مقصود اصلی تک پہنچنے کے لئے تمہیداً بعض اوقات کچھ جائز چیزیں بھی چھڑائی جاتی ہیں، یہ اس لئے چھڑائی جاتی ہیں تاکہ حرام سے بچنے کے لئے راستہ ہموار کیا جا سکے، اسی کو ''مجاہدہ'' کہتے ہیں اسی لئے مشائخ اپنے زیرتربیت افراد سے بعض اوقات کچھ جائز چیزیں بھی چھڑواتے ہیں۔ بہرحال! ''اسراف'' کی جو اصل ممنوع حد ہے، وہ تو اس وقت آتی جبکہ خرچ کرنے میں کوئی فائدہ ہی نہ ہوتا، یا فائدہ ہوتا مگر وہ غیر مشروع ہوتا۔

خرچ نہ کرنے میں نقصان نہ ہو تو چھوڑ دو

لیکن تربیت کرنے کی غرض سے حضرت والا نے اپنے زیرتربیت افراد سے یہ کہدیا کہ خرچ کرنے سے پہلے یہ دیکھو کہ خرچ نہ کرنے میں ضرر ہے یا

نہیں؟ اگر خرچ نہ کرنے میں کوئی نقصان نہیں تو چھوڑ دو، خرچ مت کرو۔ کیونکہ یہ صورت ''سلبِ ضرورۃ عن الجانب المخالف'' اور ''اِمکان عام'' ہے۔ حالانکہ اگر غور کرو گے تو اس میں ایسی صورت نکل آئے گی جو جائز ہے، مثلاً یہ کہ خرچ نہ کرنے میں کوئی نقصان تو نہیں لیکن خرچ کرنے میں فائدہ ہے، یہاں دونوں باتیں جمع ہوگئیں، لہٰذا اس میں اِسراف کی جائز صورت بھی شامل ہوگئی لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے تربیت کی خاطر یہ حکم دیدیا کہ ''تمہارے لئے حکم یہ ہے کہ اگر نہ خرچ کرنے میں نقصان نہ ہو تو بھی چھوڑ دو، خواہ اس خاص جگہ پر اصلاً خرچ کرنا جائز ہی کیوں نہ ہو۔''

خرچ سے پہلے کسی منتظم سے مشورہ

پھر اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے ارشاد فرمایا کہ ''اگر ضرر معلوم ہوتا ہو تو کسی منتظم سے مشورہ کرو'' یعنی خرچ کرتے وقت یہ سوچو کہ اگر خرچ نہ کروں تو کوئی نقصان ہے یا نہیں؟ سوچنے پر پتہ چلا کہ اگر اس خاص موقع پر خرچ نہ کیا تو نقصان ہوگا تو اس صورت میں بھی خرچ کرنے سے پہلے کسی منتظم سے مشورہ کرو کہ یہ خرچ نامناسب اور خلافِ مصلحت تو نہیں پھر وہ جو بتلائے، اس پر عمل کرو، خود اپنی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

یہ علاج ہر شخص کیلئے نہیں

البتہ یہ علاج ہر آدمی کے لئے نہیں ہے کہ ہر آدمی خرچ کرنے سے پہلے

یہ سوچے کہ خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے یا نہیں؟ اور اگر یہ معلوم ہو جائے کہ خرچ نہ کرنے میں نقصان ہے تو پھر بھی خرچ کرنے سے پہلے منتظم سے مشورہ کرے اور پھر خرچ کرے، یہ علاج ہر آدمی کے لئے نہیں ہے، بلکہ جو آدمی ضرورت سے زیادہ اسراف میں مبتلا ہے، اس کے لئے حضرت والاؒ نے یہ علاج تجویز فرمایا ہے۔

فائدہ اور عدم فائدہ کی تعیین شیخ سے کرائے

پھر آگے حضرت والاؒ نے یہ بھی فرما دیا کہ ''ضرر'' سے مراد حقیقی اور واقعی ''ضرر'' ہے جس کا معیار شریعت ہے، وہمی اور خیالی ضرر مراد نہیں۔ بہرحال! اصل حقیقت وہ ہے جو میں نے آپ کے سامنے عرض کر دی، وہ یہ کہ بغیر فائدہ کے خرچ کرنا یا فائدہ غیر مشروعہ کے ساتھ خرچ کرنا ''اسراف'' ہے، البتہ یہ بات کہ کہاں فائدہ ہے اور کہاں فائدہ نہیں، اس کے بارے میں دو اور دو چار کی طرح کوئی اصول بتانا مشکل ہے، بعض مرتبہ آدمی یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ یہاں خرچ کرنے میں فائدہ ہے لیکن حقیقت میں فائدہ نہیں ہوتا، یہ وہ مقام ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے سامنے صورت حال بیان کر کے اس سے پوچھا جاتا ہے کہ میں یہاں پر خرچ کروں یا خرچ نہ کروں؟ اگر قاعدہ اور ضابطہ بتانے سے کام چل جاتا تو پھر شیخ کی ضرورت ہی کیا تھی، بس ''اسراف'' کی تعریف بیان کر دی جاتی اور ''اسراف'' کے فوائد و قیود بیان کر دیے جاتے، ہر آدمی اس کو پڑھ کر اس پر عمل کر لیتا، لیکن ایسا نہیں ہوتا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ

نے قرآن کریم تنہا نازل نہیں فرمایا بلکہ قرآن کریم کے ساتھ پیغمبر بھی بھیجا، اس لئے کہ انسان صرف پڑھ کر ہر بات سمجھ نہیں سکتا جب تک کسی ہادی اور رہبر کی رہنمائی نہ ہو۔

رہبر اور رہنما کی ضرورت

حضرات صحابہ کرام کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ہدایت ملی اور تابعین کو صحابہ کرامؓ کے ذریعہ ہدایت ملی، تبع تابعین کو تابعین کے ذریعہ ہدایت ملی، اسی طرح آج تک یہ سلسلہ چلا آرہا ہے، اس لئے کہ قاعدے اور ضابطے ایک حد تک ساتھ دیتے ہیں، اس سے آگے ان قاعدوں اور ضابطوں کو حالات پر منطبق کرنے کا عمل شیخ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسی مقصد کے لئے شیخ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے اور اس سے پوچھا جاتا ہے کہ یہاں پر خرچ کروں یا نہ کروں؟

وہ حقیقی ضرورت نہیں

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

اِسراف کے متعلق یہ کہتا ہوں کہ جب کوئی چیز خریدنا چاہو تو سوچ لو کہ ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ذہن میں ضرورت فوراً آجائے تو خریدلو اور اگر فوراً ضرورت ذہن میں نہ آئے تو نہ خریدو، کیونکہ جس ضرورت کو

آدھے گھنٹے تک سوچ سوچ کر پیدا کیا جائے وہ ضرورت نہیں اور اگر دل میں بہت تقاضہ ہو اور ضرورت معتد بہا سمجھ میں نہ آئے تو ایسی صورت میں چیز خریدلو اور اطمینان سے بیٹھ کر سوچتے رہو، اگر اسراف نہ ہونا متحقق ہو جائے تو کھالو ورنہ خیرات کر دو۔ (انفاس عیسیٰ: ص ۱۹۱)

یعنی اگر ایک چیز کی ضرورت فوری طور پر سمجھ میں آ جائے تو ٹھیک ہے، خریدلو، لیکن اب آدھے گھنٹے تک سوچ رہے ہیں کہ اس چیز کا کیا مصرف ہوسکتا ہے، اور پھر اس کا مصرف سمجھ میں آیا، تو سوچ سوچ کر چیز کا مصرف اور ضرورت نکالی تو حقیقت میں وہ ضرورت ہی نہیں۔ لیکن اگر ایک چیز کے خریدنے کا دل بہت چاہ رہا ہے اور پھر سوچا کہ اس کی ضرورت ہے یا نہیں؟ تو سوچنے کے بعد بھی اس کی ضرورت سمجھ میں نہیں آئی کہ کیا ضرورت ہے، اس کے بارے میں فرمایا کہ وہ چیز خریدلو اور پھر اطمینان سے بیٹھ کر سوچتے رہو، اگر "اسراف" نہ ہونا متحقق ہو جائے تو کھالو ورنہ خیرات کردو۔ اس لئے کہ اس وقت اگر نہ خریدی تو موقع نکل جائے گا، لہٰذا اس وقت خرید تو لو لیکن بعد میں سوچو کہ ضرورت کی چیز لی یا بغیر ضرورت کے چیز لے لی، اگر سوچنے کے بعد پتہ چلا کہ ضرورت ہے تو اس کو استعمال کرلو اور اگر ضرورت نہیں ہے تو اس چیز کو خیرات کردو۔

بیوی بچوں کو خوش کرنے کیلئے خرچ کرنا

آگے اسی ملفوظ میں ارشاد فرمایا کہ:

اور بیوی کو کھلا دینا بھی خیرات ہی ہے اور اگر بیوی کا جی خوش کرنے کو بلاضرورت بھی کوئی چیز خریدلو تو وہ بھی اسراف نہیں، کیونکہ تطییب قلب زوجہ بھی مطلوب ہے، بشرطیکہ اس میں طاقت سے زیادہ قرض نہ کرے۔

(ایضاً)

یعنی بیوی کا دل خوش کرنے کے لئے بلاضرورت بھی کوئی چیز خریدنا اسراف نہیں، بیوی میں بچے بھی داخل ہیں، کیوں؟ اس کی وجہ بھی بیان فرما دی کہ تطییب قلب زوجہ بھی مطلوب ہے۔ بات وہی ہے جو اوپر عرض کی کہ خرچ کرنے میں فائدہ ہونا چاہئے، اب یہ ضروری نہیں کہ اپنا ہی فائدہ ہو بلکہ دوسرے کا فائدہ بھی اس میں داخل ہے، کیونکہ دوسرے کا دل خوش کرنا اور اس کی دلداری کرنا بھی فائدہ ہے، چاہے یہ دلداری بیوی کی ہو، بچوں کی ہو، ماں باپ کی ہو، بہن بھائیوں کی ہو، یہ بھی ایک معتد بہ فائدہ ہے، اس پر جو کچھ خرچ کیا جائے وہ بھی ''اسراف'' نہیں۔

استاذ کے اکرام میں ۵۲ قسم کے کھانے

ایک مرتبہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ان کے استاذ حضرت

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تشریف لے آئے، میں نے اپنے حضرت والاؒ سے سنا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے استاذ کے اکرام کے لئے باون قسم کے کھانے تیار کرائے، جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے دسترخوان پر باون کھانے دیکھے تو فرمایا کہ بھائی تم نے یہ کیا کرلیا؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ سچی بات تو یہ ہے کہ دل تو اب بھی نہیں بھرا، دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ اور تیار کراتا۔ اب دوسرا آدمی تو ان باون قسم کے کھانوں کو دیکھ کر یہ کہے گا کہ یہ ''اسراف ہے، لیکن حقیقت میں یہاں پر استاذ کا اکرام مقصود تھا اور یہ معلوم تھا کہ کوئی چیز ضائع نہیں ہوگی بلکہ جو بچے گا وہ ضرور کسی اللہ کے بندے کے کام آئے گا، اگر خدانہ کرے ضائع ہوتا تو بیشک وہ ''اسراف'' تھا، لیکن وہاں تو اس بات کا یقین تھا کہ ضائع نہیں ہوگا ۔ اور وہاں کوئی دکھاوا تو تھا نہیں کہ باون قسم کے کھانے لوگوں کو دکھانے کے لئے تیار کرائے ہوں بلکہ اپنی طبیعت کا تقاضہ تھا اور استاذ کی خدمت اور استاذ کا اکرام مقصود تھا، اس لئے اس میں کوئی اسراف نہیں تھا۔

نیت کے فرق سے گناہ اور ثواب

اگر یہی کام آدمی اس نیت سے کرے کہ تاریخ میں ریکارڈ ہو جائے کہ فلاں شخص نے ایسی دعوت کی تھی کہ اس میں باون قسم کے کھانے تھے تو اس صورت میں یہی کام ''اسراف'' بھی ہے اور حرام بھی ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ کے موقع پر ہدیہ تحفہ دیا جاتا ہے، اگر یہ ہدیہ محبّت میں دل کے تقاضے سے دیا کہ

یہ شخص میرا قریبی عزیز ہے، دل چاہتا ہے کہ میں اس کی خدمت کروں اور کچھ دے کر اپنی خوشی کا اظہار کروں تو یہ سنّت پر عمل ہے اور اس پر بڑا اجر وثواب ہے اور یہ برکت کی چیز ہے، اور اگر یہی کام اس نیت سے کیا کہ اس ہدیہ کے دینے سے نام ہوگا کہ فلاں نے شادی کے موقع پر یہ تحفہ دیا تو یہی چیز اسراف ہے اور گناہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بخل سے بھی ہماری حفاظت فرمائے اور اسراف سے بھی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۲۷

اسراف سے بچنے کی ترکیب

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵

مجلس نمبر : ۷۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

اسراف اور اس کا علاج

اسراف سے بچنے کی ترکیب

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَ نُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشۡھَدُاَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡکَ لَہٗ وَأَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُہٗ وَ رَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا ۔

أَمَّا بَعۡدُ!

اس ملفوظ پر حضرت مولانا محمد عیسیٰ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''اسراف

سے بچنے کی ترکیب'' کا عنوان لگایا ہوا ہے، اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کسی مرید کو کچھ نصیحتیں فرمائی ہیں، وہ نصیحتیں اس ملفوظ میں درج ہیں، اگر ان نصیحتوں پر عمل کرلیا جائے تو انشاء اللہ تعالیٰ اسراف سے نجات مل جائے گی اور چونکہ یہ نصیحتیں عام نوعیت کی ہیں،اس لئے ان پر عمل کرنے سے دوسری خرابیوں سے بھی نجات مل جائے گی، چنانچہ پہلی نصیحت یہ فرمائی کہ:

(۱) اہل اللہ کا مذہب رکھو، وضعدار لوگوں کا مت رکھو، رسم ورواج کے ذرا بھی مقید نہ ہو۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۹۲)

اہل اللہ کی وضع اختیار کرو

اللہ تعالیٰ نے مباحات کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے، لیکن ان مباحات میں کچھ مباحات ایسے ہیں جن کو ہر دور کے اہل اللہ اختیار کر لیتے ہیں، پھر ان مباحاث کے اختیار کرنے میں برکت ہوتی ہے، البتہ یہ بات نہیں ہے کہ ان مباحات کے خلاف کرنے میں گناہ ہے اور نہ ہی اہل اللہ کے اختیار کئے ہوئے طریقے کا مسنون ہونا ضروری ہے، مثلاً ''لباس'' ہے، لباس کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے ''مباحات'' کا دائرہ بہت وسیع رکھا ہے، کسی خاص لباس کا اللہ تعالیٰ نے ہمیں پابند نہیں کیا کہ یہ لباس پہنو، شریعت نے ہم پر ایسی پابندی نہیں لگائی۔

رسم اور فیشن کے مقید مت بنو

اب ایک ''لباس'' وہ ہے جس کو اس دور کے علماء نے اور اہل اللہ نے

اختیار کیا ہوا ہے اور ایک لباس وہ ہے جس کو عام لوگوں نے اختیار کیا ہوا ہے، جو لباس عام لوگوں نے اختیار کیا ہوا ہے وہ بھی کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ وہ بھی مباحات کے اندر داخل ہے۔ مثلاً کسی خاص قسم کے لباس کا ایک فیشن چلا ہوا ہے، جس میں کوئی اور محظور شرعی نہیں ہے، مثلاً شلوار قمیص کا سوٹ اور اس پر واسکٹ پہنتے ہیں، اس کا فیشن چلا ہوا ہے، یہ کوئی گناہ اور ناجائز نہیں ہے بلکہ یہ بھی مباحات میں داخل ہے۔ اور جو لباس علماء کرام، بزرگان دین اور اہل اللہ نے اختیار کیا ہوا ہے، وہ بھی مباحات میں ہے، لیکن تم اس بات کی کوشش کرو کہ اہل اللہ کا طریقہ اختیار کرو اور وضع دار لوگوں کا مذہب اور طریقہ اختیار مت کرو۔ ''وضع دار'' سے مراد ہیں ''فیشن والے'' اور رسم و رواج کے مقید نہ بنو، یعنی یہ مت دیکھو کہ آج کل تو ایسے لباس کا فیشن چل رہا ہے، یہ لباس پہننا چاہئے اور فلاں لباس آوٹ آف فیشن ہو گیا ہے، اس لئے اس کو چھوڑ دینا چاہئے۔

بزرگوں کے لباس کی نقل کرنا

اب یہاں چند باتیں سمجھنے کی ہیں جس میں ہمارے یہاں افراط اور تفریط پائی جاتی ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ جو لوگ اہل اللہ کے لباس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً اہل اللہ کی دو پلی ٹوپی دیکھ کر یا ان کی گول ٹوپی دیکھ کر ان کی نقل کرتے ہیں، یا اہل اللہ کا سلیم شاہی جوتا دیکھ کر اس کی نقل کرتے ہیں یا اہل اللہ کے کرتے جیسا کرتا پہننے کی کوشش کرتے ہیں، خاص طور پر جب کوئی شخص نیا نیا دین کے قریب آتا ہے تو وہ بزرگوں کی نقل اتارنے کی

کوشش کرتا ہے۔

اب لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بزرگوں کے لباس پوشاک کی نقل کرنے اور اس کا اہتمام کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دوپلّی ٹوپی پہنی تھی؟ کیا آپ نے ایسا جوتا اور ایسی قمیص اور ایسی شلوار پہنی تھی؟ قمیض کے بارے میں تو اتنا کہہ سکتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قمیص پہنی تھی لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص ہماری قمیص سے مختلف تھی، ہماری قمیص اونچی ہوتی ہے، آپ ﷺ کی قمیص نیچی ہوتی تھی، اسی طرح شلوار پہننا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، البتہ شلوار کو پسند کرنا ثابت ہے، لیکن یہ ٹوپی اور جوتا پہننا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، یہ صدری اور یہ واسکٹ پہننا ثابت نہیں، لہٰذا لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جب یہ چیزیں پہننا سنّت نہیں ہے تو پھر لوگ ان کی طرف کیوں اتنا التفات کرتے ہیں اور ان کے پہننے کا اتنا اہتمام کیوں کرتے ہیں؟

اس کو سنّت سمجھنا غلط ہے

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اہتمام اس وجہ سے نہیں ہے کہ ان چیزوں کو پہننا سنت ہے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص دوپلّی ٹوپی یا پانچ کلی کی ٹوپی اس نیت سے پہنے کہ یہ سنّت ہے تو اس کا پہننا بدعت اور گناہ ہوگا، بلکہ یہ اہتمام اس وجہ سے ہے کہ ہر دور کے صلحاء اور علماء جو لباس اختیار کرتے ہیں، اس کے پہننے میں فائدہ ہے، وہ فائدہ یہ ہے کہ ایسا لباس پہننے کے نتیجے میں ان سے قرب ہوتا

ہے اور ان سے مشابہت حاصل ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ فال نیک ہوتی ہے کہ جب ہم نے ان کا لباس اختیار کیا ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے اخلاق اور ان کی سیرت اپنانے کی بھی توفیق عطا فرمائیں گے۔ لہٰذا اس لباس کو سنّت سمجھ کر اختیار کرنا تو غلط ہے اور اس کو ضروری سمجھ کر اختیار کرنا تو بہت ہی غلط ہے۔

حافظ محمد احمد صاحبؒ کا واقعہ

مثلاً ہمارے بزرگوں نے اس کا اہتمام کیا کہ جب بھی جوتا پہنیں گے تو سلیم شاہی پہنیں گے۔ حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، حضرت قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد تھے، اس زمانے میں ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور برطانیہ کی طرف سے حکمران مقرر ہوتا تھا، اس کو ''وائسرائے'' کہا جاتا تھا، اس نے سرکاری اعزاز کے طور پر حافظ محمد احمد صاحبؒ کو ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا تھا۔ ایک مرتبہ اس وائسرائے نے حضرت والا کو ملاقات کے لئے دہلی بلایا، اب حاکم وقت نے اعزاز کے ساتھ بلایا تھا، اس لئے آپ ملاقات کے لئے تشریف لے گئے، جب اس کے محل میں داخل ہونے لگے تو دروازے پر جو جنٹلمین دربان تھا، اس نے آپ کو روک لیا اور کہا کہ یہ جوتا جو آپ پہنے ہوئے ہیں، اس کو پہن کر اندر نہیں جاسکتے۔ آپ اس وقت دھوڑی کا جوتہ پہنے ہوئے تھے، آج کل سلیم شاہی ناگرا جو رائج ہے، یہ تو بہت نازک قسم کا ہوتا ہے، وہ دھوڑی کا جوتہ بہت موٹا ہوتا تھا۔ بہرحال! اس نے کہا کہ آپ وائسرائے سے ملنے کے لئے یہ جوتا پہن کر نہیں جاسکتے بلکہ آپ کو بوٹ پہننے پڑیں گے۔

مجھے ملاقات کا شوق نہیں

حضرت مولانا محمد احمد صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے خود تو وائسرائے سے ملنے کی درخواست نہیں دی ہے کہ میں ملاقات کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا مجھے ملاقات کرنے کی کوئی حاجت نہیں، البتہ انہوں نے ہی مجھے ملاقات کے لئے بلایا ہے، اب اگر وہ ملاقات کے لئے یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ میں اپنی مرضی کا جوتا اتار دوں اور ان کی مرضی کا جوتا پہنوں تو پھر مجھے ان کی ملاقات کی یہ دعوت قبول نہیں، میں معذرت خواہ ہوں اور اگر وہ میری مرضی کے لباس میں مجھ سے ملنے کو تیار ہیں تو پھر میں تیار ہوں، میرا یہ پیغام ان تک پہنچا دو، اگر نہیں ملنا چاہتے تو میں واپس چلا جاتا ہوں اور اپنا منہ موڑ لیا۔

اب اس دربان کی ساری جنٹلمینی دھری رہ گئی، اس نے سوچا کہ جب وائسرائے کو یہ اطلاع ملے گی کہ مولانا صاحب تشریف لائے تھے اور اس وجہ سے واپس چلے گئے تو میری اپنی کھچائی نہ ہو جائے، چنانچہ اس نے جا کر اندر اطلاع دی کہ وہ مولانا صاحب تو یہ کہہ رہے ہیں، وہ وائسرائے بھی ناراض ہوئے کہ تم نے مولانا کے ساتھ کیا حرکت کی، ان کو فوراً اندر بلا لو، چنانچہ آپ کو فوراً اندر بلوا لیا۔

آپ نے ایسا جوتا کیوں اختیار کیا؟

اب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ایسا جوتا پہننے کا اہتمام کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ یہ سنت تھا، لہٰذا کوئی یہ اعتراض نہ کرے کہ ایسا جوتا پہننا کونسا

فرض و واجب تھا، اگر اس وقت وہ دوسرے جوتے پہن کر چلے جاتے تو کوئی حرام اور گناہ نہیں تھا، لیکن دو وجہ سے اس جوتے کے پہننے کا اہتمام کیا، ایک وجہ تو یہ تھی کہ آپ نے اپنے علماء، اپنے اساتذہ، اپنے صلحاء و مشائخ کو ایسا جوتا پہنتے دیکھا تھا تو ان کی سی صورت اختیار کرنے کی کوشش کی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ بات وقار کے خلاف تھی کہ ایک طرف عالم کو بلایا جا رہا ہے اور دوسری طرف شرطیں عائد کی جارہی ہیں کہ ایسا لباس اور ایسا جوتا پہن کر آؤ ورنہ داخل نہیں ہونے دیں گے، چونکہ یہ بات وقار کے خلاف تھی، اس لئے حضرت والا نے اس کو گوارہ نہیں فرمایا۔

کیا اہتمام بدعت ہے؟

اب بعض لوگ یہاں تک کہتے ہیں کہ تم لوگ جو یہ اہتمام کرتے ہو کہ ایسا لباس ہو، ایسا کرتا ہو، ایسی شلوار ہو، ایسا جوتا ہو، ایسی ٹوپی ہو، یہ اہتمام کرنا بدعت ہے، کیونکہ سنت سے ایسا لباس، ایسا جوتا، ایسی ٹوپی ثابت نہیں اور تم ان چیزوں کا ایسا التزام کر رہے ہو جیسا التزام سنتوں کا اور واجبات کا ہوتا ہے، لہٰذا یہ "التزام مالا یلزم" ہے، اس لئے یہ بدعت ہے۔

محبوب کی شباہت

یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ اس لباس کا اور اس جوتے کا اور اس ٹوپی کا سنت یا واجب ہونے کی وجہ سے التزام نہیں کیا جا رہا ہے بلکہ اس لئے التزام کیا جا رہا ہے کہ یہ ہمارے بزرگ، ہمارے اساتذہ اور ہمارے مشائخ کا

طریقہ ہے، اگر ہم ان کا طریقہ اختیار کریں گے تو ان کی صورت بنانے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ہماری سیرت بھی ان جیسی بنا دیں گے ؎

تیرے محبوب کی یارب شباہت لیکر آیا ہوں
حقیقت اسکو تو کر دے میں صورت لیکر آیا ہوں

بزرگوں کا لباس اختیار کرنے سے یہ مشابہت مقصود ہوتی ہے اور کچھ مقصود نہیں ہوتا۔

التزام کرنا بدعت ہے

دوسری طرف بعض لوگوں نے واقعۃً ایسا سمجھ لیا ہے کہ یہ ہیئت اور یہ لباس اختیار کرنا فرض و واجب ہے یا کم از کم سنّت مؤکدہ تو ضرور ہے، اگر کوئی شخص اس لباس اور اس ہیئت سے انحراف کرے تو اس پر نکیر کی جاتی ہے، ملامت کی جاتی ہے کہ اس نے یہ لباس کیوں اختیار نہیں کیا، یہ اہتمام اور التزام واقعۃً اس ہیئت اور لباس کو بدعت بنا دیتا ہے، مثلاً یہ نکیر کرنا کہ فلاں شخص نے پنج گوشہ ٹوپی کیوں نہیں پہنی؟ اس نے فلاں قسم کا جوتا کیوں نہیں پہنا؟ اس نے فلاں طرز کا لباس کیوں نہیں پہنا؟ لہٰذا جب اس لباس اور اس ہیئت کے ترک پر اس طرح کی نکیر ہونے لگے جس طرح فرائض و واجبات کے ترک پر نکیر ہوتی ہے تو یہی لباس اور ہیئت بدعت بن جائے گا، بعض اوقات یہ بات ہمارے طبقے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ اصل بات تو وہاں سے چلی تھی کہ اہل اللہ کا لباس اختیار کرو، اس میں برکت ہے، لیکن آگے چل کر اس لباس کو اتنی اہمیت دیدی کہ وہ فرائض و واجبات کا درجہ اختیار کر گیا، اس وجہ سے وہ لباس بدعت بن

گیا، یہ بڑی خطرناک بات ہے۔

غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ بڑی عجیب بات فرمایا کرتے تھے، اور یہ بات ویسی ہی نہیں فرمائی بلکہ پہلے علماء کی کئی مجلسوں میں اس کی تصدیق کرائی اور ان علماء کے سامنے آپ نے فرمایا کہ میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے، آپ حضرات سوچ کر بتائیں کہ وہ بات صحیح ہے یا غلط ہے؟ جب آٹھ دس علماء کی مجلسوں میں اس کی تصدیق ہوگئی کہ یہ بات بالکل صحیح ہے، اس کے بعد اس بات کو بطور قاعدہ کے آپ نے لوگوں کے سامنے بیان فرمایا، چنانچہ آپ نے فرمایا کہ:

''غیر منکر پر نکیر کرنا خود منکر ہے''

یعنی جس کام کو شریعت نے منکر اور حرام اور ناجائز قرار نہیں دیا، اگر کوئی شخص وہ کام کر رہا ہے تو اس پر طعن و تشنیع کرنا اور اس کو بُرا بھلا کہنا خود منکر ہے اور قابل ترک ہے۔

زیر تربیت افراد کا معاملہ الگ ہے

یہ قاعدہ جو بیان کیا جا رہا ہے وہ عام انسانوں کے ساتھ طرز عمل کا بیان کیا جا رہا ہے، جہاں تک ان افراد کا تعلق ہے جو انسان کے زیر تربیت ہیں، جیسے استاذ کے لئے شاگرد، شیخ کے لئے مرید اور باپ کے لئے اولاد، ان کا معاملہ عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے، کیونکہ بعض اوقات ان کو مستحبات کا بھی

پابند کیا جاتا ہے اور ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ ان مستحبات کو ادا کرو اور پھر ان مستحبات کے ترک پر نکیر بھی کی جاتی ہے۔ چونکہ ان افراد کو مستحبات کے پابند بنانے کا مقصد ان کی تربیت ہے تاکہ ان کو مستحبات کے ادا کرنے کی عادت پڑے، لہٰذا زیر تربیت افراد اس قاعدے کے اندر داخل نہیں، مثلاً اگر کسی شاگرد پر یا مرید پر یا اپنی اولاد پر کسی مستحب کے ترک پر نکیر ہو رہی ہے تو یہ نکیر کرنا درست ہے۔

کیا تم خدا ہو؟

لیکن عام آدمی جو تمہارے زیر تربیت نہیں، اس کے بارے مں آپ یہ چاہیں کہ یہ بھی ایسا ہی ہو جائے جیسا میں ہوں یا جیسا میں چاہتا ہوں تو تم پہلے یہ بتاؤ کہ کیا تم خدا ہو؟ یا تم اللہ کے پیغمبر ہو؟ یا اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس بات کا ٹھیکیدار بنایا ہے کہ ہر انسان تمہارے جیسا ہو جائے؟ بلکہ شریعت نے جو دائرہ مقرر کیا ہے، اگر ایک انسان اس دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کسی مباح کام پر عمل کر رہا ہے تو تمہیں نکیر کرنے کا کوئی حق نہیں اور نہ ہی اس مباح پر عمل کرنے والے کو بُرا سمجھنے کا حق ہے۔

اہل اللہ کی نقل اتارو

بہرحال! اہل اللہ کا طریقہ اختیار کرنے کی فکر کرنی چاہئے، اسی میں برکت ہے، اسی میں خیر ہے، اسی میں حفاظت ہے اور اسی کی برکت سے اللہ تعالیٰ سیرت و کردار بھی ان جیسی بنانے کی توفیق عطا فرما دیتے ہیں بشرطیکہ اس

نیت سے اس طریقے کو اختیار کیا جائے کہ جب ہم ظاہر میں اہل اللہ کی نقل اتاریں گے تو یہ فال نیک ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں باطن میں بھی ان جیسا بنا دیں گے۔

نیت کی خرابی سے وبال کا اندیشہ

لیکن اگر بزرگوں کی نقل اس نیت سے کی جائے تاکہ ذرا ہم بھی دیکھنے میں بزرگ معلوم ہوں اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی نگاہوں میں ہماری عزت ہو تو اس نیت کے نتیجے میں الٹا وبال کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا نیت یہ ہونی چاہئے کہ ان کی صورت اختیار کرنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ ان جیسی سیرت بھی عطا فرما دیں گے۔

وضعداری اچھی چیز نہیں

دوسرا جملہ حضرت والا نے یہ ارشاد فرمایا کہ ''وضعدار لوگوں کا مت رکھو'' ''وضعداری'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے اپنا خاص طریقہ بنا لیا کہ میں ہمیشہ اس انداز کی ٹوپی پہنوں گا، ہمیشہ ایسا کرتہ پہنوں گا، ایسا پاجامہ پہنوں گا، ایسا موزہ پہنوں گا، ایسا جوتا پہنوں گا، اور پھر اس خاص لباس کا اتنا اہتمام کر لیا کہ وہ لباس اس آدمی کی پہچان بن گیا۔ یہ ہے ''وضعداری'' اس کے بارے میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ طریق سلوک کے اندر یہ چیز اچھی نہیں، کیونکہ اس کے نتیجے میں لوگوں کی انگلیاں اٹھتی ہیں اور لوگ اس کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ شخص ایسا وضعدار ہے کہ جب بھی یہ شخص ٹوپی پہنے گا تو اس انداز کی

پہنے گا، یہ شخص ہمیشہ سفید شیروانی پہنے گا، ہمیشہ ایسا جوتا پہنے گا، اس پر حضرت والا فرماتے ہیں کہ ایسا کام کیوں کرتے ہو جس کے نتیجے میں لوگوں کے درمیان تمہارا امتیاز پیدا ہو بلکہ وقت پر جیسا میسر آجائے وہ اختیار کرلو اور جس وقت جس لباس میں راحت معلوم ہو وہ پہن لو۔

اکبر الٰہ آبادی کا ایک واقعہ

اکبر الٰہ آبادی مرحوم جو مشہور شاعر گزرے ہیں، میں نے ان کے بارے میں اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک دن لوگوں نے ان کو سڑک پر اس طرح جاتے ہوئے دیکھا کہ تہبند پہنا ہوا ہے اور اس کے اوپر کالر والی شرٹ پہنی ہوئی ہے اور سر پر ہیٹ پہنا ہوا ہے، اب جو شخص بھی ان کو اس حالت میں دیکھتا تو اس کو ایک ہیولیٰ نظر آتا، اس لئے کہ لباس میں کوئی مطابقت نہیں تھی، کسی نے ان سے پوچھ لیا کہ جناب! یہ آپ کیسا لباس پہنے جارہے ہیں؟ جواب میں انہوں نے کہا کہ تمہیں کیا اعتراض ہے؟ بھائی! ہمیں جس چیز میں راحت معلوم ہوئی وہ ہم نے پہن لی، ہمیں اس وقت تہبند پہننے میں راحت معلوم ہو رہی تھی، اس لئے تہبند پہن لی اور کالر دار شرٹ پہننے میں راحت معلوم ہو رہی تھی، وہ شرٹ پہن لی اور چونکہ دھوپ تھی، دھوپ سے بچنے کے لئے سر پر ہیٹ پہن لیا، جس چیز میں راحت معلوم ہوئی وہ پہن لیا، آپ کو کیا اعتراض ہے؟

من بھاتا کھاؤ، من بھاتا پہنو

لوگوں میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ کھائے من بھاتا اور پہنے جگ بھاتا، یعنی وہ چیز کھائے جو آدمی کے دل کو اچھی لگے، یہ نہ ہو کہ اچھی تو دوسروں کو لگ رہی ہے اور کھا تم رہے ہو، یہ فضول بات ہے، لہٰذا وہ چیز کھاؤ جو تمہارے من کو بھائے، تمہارے دل کو اچھا لگے، جس کا ذائقہ تمہیں پسند ہو۔ اور پہنے وہ لباس جو ساری دنیا کو پسند ہو، اس لئے کہ جگ سے مراد زمانہ ہے، یعنی زمانہ جس لباس کو پسند کرے وہ پہنو۔ لوگوں میں یہ مقولہ مشہور ہے۔

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ مقولہ درست نہیں، بلکہ انسان کھائے بھی من بھاتا اور پہنے بھی من بھاتا، یعنی جو اصول کھانے میں ہے وہی اصول پہننے میں ہے کہ جو کھانا تمہیں پسند ہے وہ کھاؤ اور جو لباس تمہیں پسند ہے وہ پہنو، یہ نہ ہو کہ تمہیں تو کوئی اور لباس پسند آرہا تھا، لیکن زمانے نے فیشن بدل دیا، لہٰذا اب تم نے زمانے کی تقلید میں ایسا لباس پہن لیا جو تمہیں پسند نہیں تھا، یہ حماقت کی بات ہے۔

زمانے کی تقلید میں اسراف ہے

اور زمانے کی تقلید کرنے میں ''اسراف'' لازمی ہے، کیونکہ جو کپڑے پہلے بنائے تھے وہ اب بیکار ہوگئے اور ان کے استعمال کرنے کا مصرف نہیں رہا، اس لئے اب نئے کپڑے سلوائے جائیں گے، لہٰذا اس فیشن پرستی کا ایک لازمی نتیجہ ''اسراف'' ہے۔

دو باتیں اختیار کرلو

بہرحال! حضرت والا کے ملفوظات پڑھ کر جو بات سمجھ میں آئی، وہ یہ ہے کہ ہر زمانے میں علماء اور صلحاء کا لباس اور ان کا طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہئے اور یہ نیت ہونی چاہئے کہ میں ان کا لباس اس لئے اختیار کر رہا ہوں تاکہ اللہ تعالیٰ ان جیسی صورت اختیار کرنے کی برکت سے ان کی جیسی سیرت بھی عطا فرما دیں۔ لیکن اس لباس اور اس طریقہ کو سنّت اور واجب نہیں سمجھنا چاہئے، لہٰذا اگر دوسرا آدمی اس طریقے اور اس لباس کے علاوہ دوسرا طریقہ اختیار کئے ہوئے ہے اور وہ طریقہ مباحات کے دائرے میں ہے تو اس پر نہ تو نکیر کرے اور نہ ہی اس کو بُرا سمجھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کسی خاص طریقے کا ایسا التزام کہ کبھی اس سے تخلّف ہی نہ ہو، یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں، بلکہ جس وقت جیسا لباس میسّر ہو وہ لباس اختیار کرلے، کبھی ایسی ٹوپی پہن لی، کبھی ویسی پہن لی، کبھی ایسا جوتا پہن لیا، کبھی دوسرا جوتا پہن لیا، ایک لباس کا بہت زیادہ اہتمام نہ ہونا چاہئے، اس اہتمام میں ایک طرف تو ''التزام مالا یلزم'' کا خطرہ بھی ہے اور دوسری طرف اس اہتمام سے امتیاز پیدا ہوتا ہے اور یہ انسان کی بے تکلفی اور تواضع کے بھی منافی ہے۔

قرض لینے سے پرہیز کرو

دوسری نصیحت حضرت والا نے یہ فرمائی کہ:

(۲) بلاضرورت ہرگز مقروض مت بنو، گو رسم و رواج

کے خلاف کرنا پڑے، مقروض ہونے سے بڑی پریشانی
ہوتی ہے جس کا انجام بہت بُرا ہے، ہر مسلمان کو وہی
مذہب رکھنا چاہئے جو اہل اللہ کا ہے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۹۲)

اس نصیحت میں ''اسراف'' سے بچنے کا بڑا زبردست قاعدہ بیان فرما دیا، وہ یہ کہ ''قرض'' سے بھاگو اور شدید ضرورت کے بغیر قرض نہ لو، کسی وقت پیٹ پر پتھر باندھنا پڑ جائے تو وہ گوارہ کرلو لیکن قرض لینا گوارہ نہ کرو۔ اگرچہ بعض اوقات آدمی بھوک سے مجبور ہو جاتا ہے تو بہر حال لینا پڑتا ہے، اس وقت اگر کوئی لے لے تو کوئی حرام اور ناجائز نہیں، لیکن اپنی ذہنیت یہ بناؤ کہ کسی غیر اللہ کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا، نہ تو مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلانا ہے اور نہ ہی قرض کے لئے، یہ ذہنیت بنالو۔

اخراجات کم کرلو

جب تم یہ اصول بنالو گے کہ قرض نہیں لینا تو پھر خود بخود تمہیں اخراجات کم کرنے پڑیں گے، اب اس صورت میں اخراجات آمدنی کے دائرے میں کرنے پڑیں گے، کیونکہ اس سے زیادہ اخراجات کرے گا تو آدمی کو قرض لینا پڑے گا اور یہ اصول بنالیا ہے کہ قرض لے کر کوئی کام نہیں کرنا۔

استطاعت کم کام زیادہ

ہمارے معاشرے میں یہ زبردست فساد پھیلا ہوا ہے کہ آدمی کی استطاعت تو تھوڑی ہے اور اخراجات زیادہ ہیں اور وہ اخراجات چونکہ تھوڑی آمدنی میں پورے نہیں ہوتے تو اب ان کے لئے قرض لیتا ہے اور پھر قرض

درقرض ہوتے ہوتے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ یہ قرض لینے کی خرابی ہمارے اندر انفرادی سطح پر تو تھی مگر اب اجتماعی سطح پر ہمارا پورا ملک قرضوں پر چل رہا ہے۔

چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ

پہلے بزرگ کہا کرتے تھے کہ ''چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاؤ'' یعنی یہ دیکھو کہ چادر کتنی ہے، پھر جتنی چادر ہے اتنے پاؤں پھیلاؤ، اس سے آگے مت پھیلاؤ۔ آج کا اصول یہ ہے کہ پاؤں پہلے پھیلاؤ اور پھر اس کے مطابق چادر بعد میں تلاش کرو اور اگر چادر نہ ملے تو بھیک مانگو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج پوری کی پوری قوم مقروض ہے، آج ہمارے ملک کے بجٹ کا ۴۶٪ حصہ صرف قرضوں کی ادائیگی میں جاتا ہے۔ شیطان نے سود کا ایسا چرخہ چلایا ہے کہ آج پوری دنیا قرض کے اندر ڈوبی ہوئی ہے، صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ امریکہ بھی اتنے بڑے قرض میں ڈوبا ہوا ہے کہ کوئی حد وحساب نہیں، لیکن چونکہ وہ امیر ملک ہے، اس لئے فی الحال وہ اس قرض کو برداشت کر رہا ہے، مگر یہ ایک ایسا غبارہ ہے جو کسی وقت بھی پھٹ جائے گا۔ ہمارا ملک چونکہ غریب ہے، اس لئے ان قرضوں کا بوجھ ہمارے اوپر بہت زیادہ ہے، اس وقت ہماری آزادی اور ہماری عزت ہر چیز داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ بہرحال، بلاوجہ قرض نہ کرو۔

مقروض کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک جنازہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

کے پاس نماز جنازہ کے لئے لایا گیا، آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ ان پر قرض ہے؟ صحابہ کرامؓ نے بتایا کہ ان پر قرض ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ "صَلُّوْ عَلٰی صَاحِبِکُمْ" یعنی تم ہی اپنے ساتھی پر نماز پڑھ لو، میں نہیں پڑھتا۔ ایک طرف تو یہ حدیث یاد رکھنی چاہئے۔

معمولی خاتون کی قبر پر نماز جنازہ

دوسری طرف وہ حدیث یاد رکھنی چاہئے کہ ایک دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے پوچھا کہ ایک خاتون جو مسجد نبوی میں جھاڑو دیا کرتی تھی، وہ بہت دن سے نظر نہیں آ رہی ہے، کہاں گئی؟ ایک روایت میں ہے کہ مرد تھا، ایک روایت میں ہے کہ عورت تھی۔ صحابہ کرامؓ نے جواب دیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس کا انتقال ہوگیا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیں بتایا نہیں، صحابہ کرامؓ نے فرمایا کہ وہ ایسا وقت تھا کہ آپ ﷺ کو اس وقت نماز جنازہ میں شریک ہونے میں زحمت ہوتی، اس لئے آپ ﷺ کو نہیں بتایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، ایسا نہ کرو، بلکہ جب کسی کا انتقال ہو جائے تو مجھے بتاؤ۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ اچھا اس کی قبر دکھاؤ، کہاں ہے؟ چنانچہ آپ ﷺ اس کی قبر پر تشریف لے گئے اور قبر پر آپ ﷺ نے نماز جنازہ پڑھی۔ پھر آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

إن هذه القبور مملوّة ظلماً فینورها الله بصلاتی۔ (مسند احمد، ج ۲، ص ۳۸۸)

یعنی یہ قبریں اندھیرے سے بھری ہوئی ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ میری نماز پڑھنے کی

برکت سے ان میں نور پیدا فرما دیتے ہیں۔ اسی لئے علماء حنفیہ فرماتے ہیں کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت تھی، کوئی دوسرا شخص قبر پر جا کر نماز نہ پڑھے، اس لئے کہ ولی کے علاوہ دوسرے شخص کے لئے قبر پر نماز پڑھنا جائز نہیں، البتہ اگر ولی نے نماز جنازہ نہیں پڑھی تو اس کے لئے قبر پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔

دیکھئے! ایک طرف تو یہ حال ہے کہ ایک ایسی خاتون جس کی نماز جنازہ پڑھا دی گئی ہے اور اس کو دفن کر دیا گیا، البتہ آپ ﷺ کے علم میں اس کے انتقال کی خبر نہیں آئی، لیکن جب آپ ﷺ کو اس کے انتقال کا علم ہوا تو آپ ﷺ نے اس کی نماز جنازہ پڑھنے کا اتنا اہتمام فرمایا کہ قبرستان جا کر اس کی نماز جنازہ پڑھی تاکہ اللہ تعالیٰ اس کی قبر کو نور سے بھر دے۔

دوسری طرف یہ حال ہے کہ جنازہ سامنے رکھا ہے، اس لئے رکھا ہے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس پر نماز جنازہ پڑھیں، لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ان پر نماز پڑھ لو، میں نہیں پڑھتا، کیونکہ ان کے ذمے قرض ہے۔

قرض کا ذمّہ لینے کے بعد نماز جنازہ پڑھائی

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ان کا قرض میں اپنے ذمے لیتا ہوں، آپ ﷺ نے سوال کیا کہ کیا پورا قرض اپنے ذمے لیتے ہو؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں پورا قرض اپنے ذمّہ لیتا ہوں، پھر آپ ﷺ نے ان

کی نماز جنازہ پڑھائی۔

واپس کرنے کی طاقت نہ ہونے کے باوجود قرض کیوں لیا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ جو مقروض آدمی کی نماز جنازہ پڑھنے سے منع فرمایا، اس کی کیا وجہ تھی؟ بظاہر تو وہ شخص دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ستم رسیدہ تھا اور دوسروں کے مقابلے میں رحم کا زیادہ مستحق تھا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی، اس سے اس طرف توجہ دلائی کہ جب قرض واپس کرنے کی استطاعت نہیں تھی تو پھر قرض لیا ہی کیوں تھا؟ معلوم ہوا کہ بلاضرورت قرض لینا اور یہ معلوم ہوتے ہوئے قرض لینا کہ میں واپس ادا نہیں کرسکوں گا، یہ اتنی وبال کی بات ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز جنازہ سے محرومی کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا کسی شخص کو بھی حتی الامکان قرض لینے کا اقدام نہیں کرنا چاہئے۔

ہمارے معاشرے میں قرض کی وبا

آج ہمارے معاشرے کے اندر اس معاملے میں بڑی افراط و تفریط پائی جارہی ہے، افسوس یہ ہے کہ ہمارے طبقے میں جو دیندار طبقہ کہلاتا ہے، اس میں خاص طور پر یہ وبا عام ہورہی ہے، نہ تو اس کا اہتمام ہے کہ قرض ہی نہ لیں اور نہ ہی اس کا اہتمام ہے کہ اگر قرض لیا ہے تو وقت پر واپس کردیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سالہا سال گزر جاتے ہیں اور قرض واپس نہیں ہوتا۔ اس لئے میں حتی الامکان اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو قرض نہ دینا پڑے، اللہ تعالیٰ کسی

کی مدد کرنے کی جو توفیق دیتے ہیں وہ کر دیتا ہوں، لیکن قرض دینے سے بچتا ہوں، اس لئے کہ قرض دینے کے بعد اس کا حساب لکھواور پھر ہر وقت دماغ پر یہ فکر سوار ہے کہ وہ قرض واپس آئے گا اور وہ واپس آتا نہیں، ساری زندگی میں چند واقعات کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہ کوئی آدمی قرض لے کر واپس کر گیا ہو، حالانکہ قرض لے جانے والے اچھے خاصے دیندار، عالم وفاضل اور بزرگوں کی صحبت میں عمریں گزار دینے والے، قرض لے کر گئے مگر آج تک پتہ نہیں کہ وہ قرض کہاں گیا۔

آج گناہ کیلئے قرض لئے جاتے ہیں

بہر حال! اوّل تو آدمی قرض کیوں لے؟ اگر لے تو پھر وقت پر ادائیگی کا اہتمام کرے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں فرما رہے ہیں کہ ”بلاضرورت ہرگز مقروض مت بنو، گو رسم و رواج کے خلاف کرنا پڑے“ یعنی اس لئے قرض لے رہے ہیں کہ ہمارے ہاں فلاں موقع پر دعوت کی جاتی ہے۔ العیاذ باللہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرنے کے لئے قرض لے رہے ہیں۔ آگے فرمایا کہ ”مقروض ہونے سے بڑی پریشانی ہوتی ہے جس کا انجام بہت بُرا ہے، لہٰذا ہر مسلمان کو وہی مذہب رکھنا چاہئے جو اہل اللہ کا ہے۔“

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۳۷

گھر سے فضول سامان نکال باہر کرو

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸ ۔لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵
مجلس نمبر : ۷۳

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

اسراف اور اس کا علاج

گھر سے فضول سامان نکال باہر کرو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا ۔

أَمَّا بَعْدُ!

اسراف کا ایک شعبہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''اسراف'' سے بچنے کی تدابیر کے سلسلے میں جو نصیحتیں بیان فرمائی ہیں، ان میں سے بعض نصیحتوں کا بیان گزشتہ کل ہوگیا، آگے ایک اور نصیحت کرتے ہوئے حضرت والا نے فرمایا کہ:

سب سے پہلے گھر کا انتخاب کرو، جتنی چیزیں کام آتی ہوں رہنے دو اور جتنی چیزیں کام میں نہ آئیں، خارج کردو یا بیچ دو یا مساکین کو دیدو، نفلی صدقہ دینے کی ہمت نہ ہو تو زکاۃ ہی میں دیدو۔

(انفاس عیسیٰ ص ۱۹۲)

اس نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں زیادہ چیزیں جمع کرنا یا رکھنا، یہ بھی ''اسراف'' کا ایک شعبہ ہے، کشادگی کے ساتھ جتنی چیزوں کی ضرورت ہو، وہ رکھو اور باقی ضرورت سے زائد جو اشیاء گھر میں ہیں یا تو ان کو خیرات کردو یا ان کو بیچ دو اور جو پیسے آئیں وہ ضرورت میں خرچ کرو، لیکن خواہ مخواہ گھر میں چیزوں کے انبار لگانا جو کبھی استعمال میں نہیں آرہی ہیں، نہ ہی ان سے کچھ فائدہ حاصل ہو رہا ہے، یہ فضول بات ہے، لہٰذا ہر شخص کو اپنے گھر میں اس بات کا جائزہ لینا چاہئے کہ ضرورت سے زائد سامان تو نہیں ہے، اگر ہے تو وہ یا غریبوں کو دیدے یا فروخت کردے۔

ہر ایک کی ضرورت مختلف ہوتی ہے

البتہ ''ضرورت'' کا تعین کرنے میں کہ کتنے سامان کی ضرورت ہے اور کتنے سامان کی ضرورت نہیں، اس میں ہر جگہ اور ہر زمانے کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے اور ہر انسان کے حالات مختلف ہوتے ہیں، ان حالات کے لحاظ سے ضرورت کا تعین کرنا ہوتا ہے۔ میرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ اس موضوع پر بہت طویل بیان فرمایا اور اس میں فرمایا کہ ہر انسان کی ضرورت کا معیار مختلف ہوتا ہے، ایک آدمی کے تعلقات زیادہ نہیں ہیں، اس کے لئے ایک پیالہ، ایک پلیٹ، ایک پیالی بھی گھر میں ہونا کافی ہے، جبکہ ایک آدمی وہ ہے جس کے گھر میں مہمان کثرت سے آتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ اس کے لئے دس پیالے بھی اس کی ضرورت سے کم ہوں۔ ایک آدمی کے گھر میں زیادہ مہمان نہیں آتے، اس کے لئے ایک بستر بھی کافی ہے، ایک آدمی کے گھر میں مہمان بہت آتے ہیں، اس کے لئے ہوسکتا ہے کہ دس بستر بھی کم ہوں۔ لہٰذا ہر آدمی کے حالات کے لحاظ سے ضرورت کا پیمانہ بدلتا رہتا ہے۔

یہ آمدنی کافی نہیں

میں نے ایک مرتبہ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ ہمارا جو کتب خانہ ہے، اس سے الحمدللہ اتنی آمدنی ہو جاتی ہے کہ

مزید کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لئے یہ دل چاہتا ہے کہ مدرسہ کی خدمت بلا تنخواہ کے کی جائے۔ جواب میں حضرت نے پوچھا کہ کتب خانہ سے کتنی آمدنی ہوتی ہے؟ میں نے لکھا کہ ماہانہ تین ہزار ہوتی ہے۔ جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ یہ آمدنی آپ کے لئے کافی نہیں، لہٰذا ابھی بلاتنخواہ مدرسہ کی خدمت کرنے کا ارادہ مت کرو۔ بہر حال! ہر آدمی کی ضروریات کے لحاظ سے پیمانہ بدلتا رہتا ہے۔

سامان کی زیادتی سے یکسوئی میں کمی

لہٰذا اپنے حالات کے مطابق پیمانے کا لحاظ رکھتے ہوئے یہ دیکھو کہ گھر میں ضرورت سے زائد چیزیں پڑی ہیں یا نہیں؟ اگر پڑی ہیں تو ان کو ٹھکانے لگاؤ، خواہ مخواہ کیوں اپنا ذہن اور گھر والوں کا ذہن الجھاتے ہو، کیونکہ جتنا سامان زیادہ ہوتا ہے، انسان کی طبیعت میں اتنی ہی یکسوئی کم ہوتی ہے، دل جمعی کم ہوتی ہے، اس لئے کہ ذہن کبھی ایک طرف متوجہ ہوتا ہے، کبھی دوسری طرف متوجہ ہوتا ہے۔

خواجہ فرید الدین عطارؒ کا واقعہ

حضرت خواجہ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جو بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، بزرگان دین میں سے ہیں، شروع میں یہ تاجر تھے، دین سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، عبادت سے اور ذکر و اذکار سے کوئی خاص تعلق نہیں

تھا، جیسے عام تاجر ہوتے ہیں اسی طرح کے تاجر تھے، عطّار تھے یعنی عطر اور یونانی دوائیں شربت وغیرہ بیچا کرتے تھے، ایک دن دکان میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک مجذوب قسم کا آدمی آ گیا اور اس نے آ کر دکان کا اس طرح جائزہ لینا شروع کیا کہ دکان میں کبھی اوپر سے نیچے کی طرف دیکھتا ہے اور کبھی نیچے سے اوپر کی طرف دیکھتا ہے، کبھی دائیں طرف دیکھتا ہے اور کبھی بائیں طرف دیکھتا ہے، شیخ عطّار رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پوچھا کہ کیا کر رہا ہے؟ اس نے کہا کہ بس دیکھ رہا ہوں، آپ نے اس سے پوچھا کہ کچھ خریدنا بھی ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، مجھے خریدنا کچھ نہیں، بس دیکھ رہا ہوں کہ یہ کیسی شیشیاں رکھی ہیں، آپ نے پوچھا کہ بھائی! کیوں دیکھ رہا ہے؟ اس نے کہا بات دراصل یہ ہے کہ میں یہ شیشیاں دیکھ کر یہ سوچ رہا ہوں کہ موت کا وقت آئے گا تو تمہاری جان ان شیشیوں میں سے کیسے نکلے گی، اس لئے کہ موت کے وقت تمہاری جان کبھی اس شیشی میں گھسے گی اور کبھی اس شیشی میں گھسے گی، اس لئے تمہاری جان نکلنی مشکل ہوگی اور اسی وجہ سے میں تعجب سے ان شیشیوں کو دیکھ رہا ہوں۔

دل پر چوٹ لگ گئی

شیخ عطّار رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی بات پر غصہ آیا کہ اس کو یہ تعجب ہو رہا ہے کہ میری جان کیسے نکلے گی، ارے جیسے تیری جان نکلے گی، ایسی ہی میری جان بھی نکل جائیگی، تیری جان کیسے نکلے گی؟ اس مجذوب نے کہا کہ میری جان تو اس طرح نکلے گی یہ کہہ کر اس نے: ''لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کلمہ

پڑھا اور زمین پر لیٹ گیا اور چادر اوڑھ لی، تھوڑی دیر بعد دیکھا تو وہ رخصت ہو چکا تھا۔

دراصل اللہ تعالیٰ نے شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کے لئے ایک لطیفہ غیبی بھیجا تھا، بس اس مجذوب کا یہ حال دیکھ کر ان کے دل پر چوٹ لگ گئی کہ یہ مجذوب اپنی جان دے کر بڑی حکیمانہ بات کہہ گیا، واقعۃً میری جان تو ان بوتلوں اور شیشیوں میں اٹکی ہوئی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو توبہ کی توفیق عطاء فرمائی، پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے دین کے لئے کام کیا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مقام عطا فرمایا کہ آج بڑے بڑے اولیاء اللہ میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

سامان کی کمی سے بے فکری ہوتی ہے

بہرحال! انسان کے پاس جتنا ساز و سامان زیادہ ہوتا ہے، اتنا ہی اس کی تشویش بڑھتی ہے اور اتنا ہی ذہن ان چیزوں میں الجھتا ہے اور جتنا سامان کم ہوتا ہے، اتنا ہی انسان بیفکر ہوتا ہے۔

لُنگ کے زیرو لنگ کے بالا
نے غمِ دزد نے غمِ کالا

یعنی اگر انسان معمولی سامان رکھنے والا ہو تو اس کو کچھ پرواہ نہیں ہوتی، نہ اس کو چور کا ڈر، نہ ڈاکو کا ڈر۔ لہٰذا اعتدال کا راستہ یہ ہے کہ آدمی اتنا سامان رکھے جو اس کے حالات کے مطابق اس کی ضرورت کا ہو، اس سے زیادہ سامان جمع

کر کے اپنا ذہن کیوں الجھائے، اس لئے اس سامان کو ٹھکانے لگائے۔ سب سے اچھی بات تو یہ ہے کہ صدقہ کر دے، تاکہ کسی غریب کے کام آ جائے اور اگر یہ نہ کرے تو پھر بیچ کر پیسے حاصل کر لے اور پھر ان پیسوں کو کسی ضرورت کے مصرف میں خرچ کرے یا ان پیسوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے بندوں کی مدد کرے۔

یہ کنجوسی نہیں

بعض گھروں میں خواتین یہ کرتی ہیں کہ بے کار قسم کا جو سامان گھر میں پڑا ہوتا ہے، ان کو جمع کرتی رہتی ہیں، مثلاً رڈی اخبار جمع کر لیئے، بوتلیں جمع کرلیں، پھر کباڑی آتا ہے تو وہ خواتین وہ سامان اس کو بیچ دیتی ہیں۔ بہت سے لوگ خواتین کے اس عمل کو کنجوسی سے تعبیر کرتے ہیں، حالانکہ یہ کنجوسی نہیں، بلکہ حضرت والا اس ملفوظ میں جو کچھ فرما رہے ہیں، اس کا مقصد یہی ہے کہ جو ضرورت سے زیادہ سامان گھر میں جمع ہو رہا ہے، بجائے اس کے کہ اس سامان کو بے کار کر کے ڈال دو، اس کو کسی مصرف میں لاؤ، اور اگر خود کسی مصرف میں نہیں لا سکتے تو ان کو بیچ دو، اس سے پانچ دس روپے حاصل ہو جائیں گے اور یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، ان پیسوں کو اپنے کسی جائز مصرف میں خرچ کرنا چاہو تو خرچ کرلو ورنہ کسی اللہ کے بندے کو دیدو، اس کے کام آ جائیں گے۔

دستر خوان جھاڑنا ایک فن ہے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے

استاذ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے، یہ حضرت میاں صاحب کے نام سے مشہور تھے، دارالعلوم دیوبند کے بڑے درجے کے اساتذہ میں سے تھے، بڑے عجیب وغریب بزرگ تھے، مادر زاد ولی تھے، والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن ان کے گھر گیا ہوا تھا، کھانے کا وقت ہوگیا، فرمایا کہ آؤ کھانا کھالو، چنانچہ میں نے ان کے ساتھ کھانا کھالیا، جب کھانے سے فارغ ہوگئے تو میں نے سوچا کہ دسترخوان اٹھا کر باہر جھاڑ دوں، چنانچہ میں دسترخوان سمیٹنے لگا تو میاں صاحب نے پوچھا کہ کیا کرنے لگے ہو؟ میں نے کہا کہ حضرت! دسترخوان سمیٹ رہا ہوں، پوچھا کہ کس لئے؟ میں نے کہا کہ باہر جا کر جھاڑ دوں گا، پوچھا کہ تمہیں دسترخوان جھاڑنا آتا ہے کہ کس طرح جھاڑا جاتا ہے؟ میں نے کہا کہ حضرت! دسترخوان جھاڑنا بھی کوئی فن ہے کہ اس کو سیکھنا پڑتا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! اسی لئے کہتا ہوں کہ تمہیں دسترخوان جھاڑنا آتا نہیں ہے، یہ بھی ایک فن ہے، میں نے کہا کہ حضرت! یہ فن بھی سکھا دیجئے۔

اللہ کا رزق ضائع نہ جائے

فرمایا کہ دیکھو میں تمہیں سکھاتا ہوں، پھر دسترخوان پر جتنی چیزیں پڑی ہوئی تھیں، ان کے مختلف حصے کئے، ہڈیوں کو الگ کیا، اور جو گوشت کے ٹکڑے بغیر ہڈی کے تھے ان کو الگ کیا، روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو الگ کیا اور روٹی کا برادہ جو روٹی توڑتے وقت گرتا ہے اس کو اکٹھا کرلیا۔ پھر فرمایا کہ

میرے یہاں ان میں سے ہر چیز کی جگہ الگ الگ مقرر ہے، یہ ہڈیاں فلاں جگہ رکھتا ہوں، چنانچہ کتے کو پتہ ہے کہ اس جگہ ہڈیاں ہوتی ہیں، کتا وہاں آتا ہے اور وہاں سے اپنے مطلب کی ہڈیاں لے جاتا ہے، اور گوشت کی بوٹیوں کی فلاں جگہ مقرر ہے، بلّی کو معلوم ہے کہ اس جگہ پر بوٹیاں ہوتی ہیں، وہ بلّی وہاں آ کر اس گوشت کو کھالیتی ہے، اور روٹی کے ان ٹکڑوں کو اس جگہ دیوار پر رکھتا ہوں، یہاں پرندے چیل کوّے آتے ہیں اور ان ٹکڑوں کو کھالیتے ہیں، اور روٹی کا یہ برادہ ہے، میرے گھر میں چونٹیوں کا جو بل ہے، وہاں ڈال دیتا ہوں، وہ اس کو کھالیتی ہیں، پھر فرمایا کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کا رزق ہے، اس کا کوئی حصہ ضائع نہیں جانا چاہئے۔

آج کی دعوتوں کا حال

آج ہماری دعوتوں کو دیکھیں کہ وہاں کتنا کھانا ضائع ہوتا ہے، کتنے لوگ دنیا میں ایسے ہیں جو بھوک سے بیتاب ہیں، تڑپ رہے ہیں اور کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو کھانا نام کی چیز میسّر نہیں ہے، بلکہ کوئی چٹنی سے اور کوئی پیاز کے ساتھ روٹی کھا کر گزارہ کر رہا ہے، عین اسی وقت دعوتوں میں منوں کھانا ضائع ہو رہا ہے۔ العیاذ باللہ العلیّ العظیم۔ یہ سب اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں کی قدر نہیں اور ان کو استعمال کرنے کا سلیقہ نہیں کہ ان کو کس طرح استعمال کیا جائے جس کے نتیجے میں یہ بیکار نہ ہوں بلکہ اللہ تعالیٰ کی کسی مخلوق کے کام آجائے۔

کوئی چیز بیکار نہیں

اقبال مرحوم نے ایک نظم بچوں کے لئے لکھی ہے، اس نظم کا آخری شعر حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بہت ہی پسند تھا، وہ شعر یہ ہے کہ:

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوی بُرا نہیں قدرت کے کارخانے میں

اس کائنات میں جو بھی چیز ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کو کسی حکمت اور مصلحت کے تحت پیدا فرمایا ہے، اس کو بیکار اور نکما نہ سمجھو اور اس کی ناقدری نہ کرو بلکہ اس کو صحیح طور پر استعمال کرو۔

ایسی چیزیں گھر سے نکال دو

بہر حال! گھر میں جو فالتو چیزیں پڑی ہوتی ہیں، ان کا جائزہ لے کر ان کو کسی کام میں لاؤ، آج ہی گھر جا کر اس پر عمل شروع کرو اور جب اس نیت سے کرو گے کہ یہ بھی ہماری دینی تعلیم کا ایک حصّہ ہے تو انشاء اللہ تمہارا یہ عمل بھی اجر وثواب میں لکھا جائے گا۔ اگلی نصیحت میں بھی حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اسی طرح کی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ:

گھر کا معائنہ کیا کرو، گھر میں بہت سی چیزیں ایسی دیکھو گے جو سڑ رہی ہیں، کسی کو دیمک لگ رہی ہے، پس ایسی چیزوں کو اپنی مِلک سے الگ کردو تاکہ گھر میں رونق

ہو۔ (ایضاً)

گھر میں جو چیزیں پڑے پڑے سڑ رہی ہیں، خراب ہو رہی ہیں، ان کو الگ کرو، اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، اس کے نتیجے میں وہ صحیح مصرف میں استعمال ہو جائیں گی، دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ گھر میں ایسی چیزوں کے پڑے رہنے سے گھر میں بے رونقی ہوتی ہے، ان کو نکال دینے سے گھر میں رونق ہوگی اور صفائی بھی ہو جائے گی۔ یہ سب دین کا حصہ ہی ہے، جبکہ لوگ ان کو دنیاداری کی باتیں سمجھتے ہیں۔

مسلمان ہر جگہ مسلمان ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی کو صوفی بننا ہو یا ولی بننا ہو تو وہ کہیں اور چلا جائے، بہت ساری خانقاہیں کھلی ہوئی ہیں اور اگر کسی کو آدمی بننا ہو تو وہ یہاں آئے، یہاں تو آدمی بننے کے گُر سکھائے جاتے ہیں۔ مسلمان وہ نہیں ہے کہ جب تک مسجد میں مصلّے پر بیٹھا ہے، اس وقت تک تو وہ مسلمان ہے اور جب مسجد سے باہر نکلا تو اب اس کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ جو شخص مسلمان ہے وہ مسجد سے باہر بھی مسلمان ہے، گھر میں بھی مسلمان ہے، بازار میں بھی مسلمان ہے، دفتر میں بھی مسلمان ہے، ہر جگہ پر وہ مسلمان ہے، دین کی تعلیمات زندگی کے ہر ہر شعبے سے متعلق ہیں، ان سب کا اہتمام کرنا چاہئے۔

ہر کام سوچ کر کرو

آگے ایک اور نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

روزمرہ معاشرت میں یہ مقرر کرلو کہ جو کام کرو، سوچ کر کرو، بے تأمل مت کر ڈالو۔ (ایضاً)

''اسراف'' سے بچنے کا ایک راستہ یہ بھی ہے کہ ہر کام سوچ کر کرو، اس لئے کہ جب طبیعت میں ''اسراف'' ہوتا ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں جو چیز خریدنے کا خیال آیا، فوراً وہ چیز خرید لی، سوچ بچار کچھ نہیں کیا۔ اس لئے ذرا سوچو کہ یہ چیز فائدہ مند ہے یا نہیں؟ سوچنے کی عادت ڈالو، سوچے بغیر کام کرنا غفلت اور لاپرواہی ہے اور غفلت اور لاپرواہی کے نتیجے میں انسان اپنا وقت بھی برباد کر رہا ہے اور پیسہ بھی برباد کر رہا ہے۔

کیجیو وہی جو سمجھ میں آوے

آخری نصیحت حضرت والا نے یہ فرمائی کہ:

کسی کے کہنے سے کوئی کام مت کرو، بس اپنی رائے پر عمل کرو۔

سن لاکھ کوئی تجھے سناوے
کیجیو وہی جو سمجھ میں آوے

(انفاس عیسیٰ ص ۱۹۲)

یعنی دوسرے لوگوں کے کہنے سننے سے متأثر نہ ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عام لوگ جو رسم و رواج کی بنیاد پر یا فیشن کی بنیاد پر باتیں کہتے ہیں یا جو مشورے دیتے ہیں، ان مشوروں کو سنتے رہو اور ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے اڑا دو اور جس طریقے کو تم صحیح سمجھتے ہو، اس پر عمل کرو، کوئی بُرا کہتا ہے تو کہا کرے، کوئی تمہیں طعنہ دیتا ہے تو دیا کرے، لیکن تم فیما بینہ و بین اللہ جو طریقہ صحیح سمجھتے ہو اس پر عمل کرتے رہو۔

بڑے کا کہنا سننا مراد نہیں

لیکن یہاں پر کسی بڑے کا کہنا سننا مراد نہیں، جیسے شیخ اپنے مرید سے کہے کہ یوں کرو یا استاد شاگرد سے کہے کہ یوں کرو، یا باپ بیٹے سے کہے کہ یوں کرو یا سرپرست اپنے زیر سرپرست شخص سے کہے کہ یوں کرو، وہاں اس شعر پر عمل نہیں کیا جائے گا کہ:

کیجیو وہی جو سمجھ میں آوے

بلکہ وہاں تو حکم یہ ہے کہ اس بڑے کی اطاعت کرنی ضروری ہے، وہاں خود رائی پر عمل کرنا جائز نہیں، بلکہ اسی خود رائی سے آدمی برباد ہو جاتا ہے، لہٰذا جب کسی کو بڑا بنا رہے ہو تو اس کو بڑا بنانے سے پہلے سوچ لو کہ یہ بڑا بنانے کے قابل ہے یا نہیں؟ اس کی رائے قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ اس کی دیانتداری قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ یہ شخص میرا خیر خواہ ہے یا نہیں؟ اور جب یہ دیکھ لیا کہ یہ شخص میرا خیر خواہ بھی ہے اور دیانتدار بھی ہے اور اس کی رائے عقل مندی پر مشتمل بھی

ہے اور ان تین باتوں کا اطمینان ہو گیا تو پھر اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دو اور پھر جو وہ کہے اس پر عمل کرو۔

اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤ گے؟

لیکن یہاں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جو بات بیان فرما رہے ہیں، وہ دنیا کی طعن و تشنیع کی باتوں کے بارے میں فرما رہے ہیں، مثلاً آدمی یہ سوچے کہ اگر یہ کام کریں گے تو دنیا والوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ ارے بھائی! دنیا والوں کو منہ نہ دکھایا تو کیا فرق پڑے گا اور اگر ان کو منہ دکھایا اور انہوں نے تمہارا منہ دیکھ کر اپنا منہ بنالیا اور تمہیں بُرا بھلا کہہ دیا تو تمہارا کیا نقصان ہوا؟ صرف اتنی ہی بات ہوگی کہ وہ یہ کہے گا کہ یہ شخص دقیانوس ہے، اگر یہ کہیں گے تو کہنے دو، ان کی وہ بات تو ہوا میں اڑ جائے گی، تم پر اس بات کا کیا اثر پڑے گا، اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جا کر کیا منہ دکھاؤ گے، اس کی فکر کرو۔

مخلوق سے بے نیاز ہو جاؤ

اور جو آدمی ایک مرتبہ مخلوق کے کہنے سننے سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور اللہ جل شانہ کو راضی کرنے کی فکر کر لیتا ہے تو ایسا شخص ہی بالآخر دنیا سے عزت کراتا ہے اور دنیا اس کے قدموں میں آتی ہے۔ اس دنیا کا تو خاصہ ہی یہ ہے کہ اگر تم اس کے پیچھے بھاگو گے تو یہ تم سے بھاگے گی اور اگر تم اس سے منہ

موڑ کر بھاگو گے تو یہ تمہارے پیچھے بھاگے گی۔ یہ دنیا انسان کے سائے کی طرح ہے، اگر تم سائے کے پیچھے بھاگو گے تو وہ تمہارے آگے آگے بھاگتا جائے گا، کبھی اپنے سائے کو تم پکڑ نہیں سکو گے اور اگر تم سائے سے منہ موڑ کر دوسری طرف بھاگو گے تو وہ سایہ تمہارے پیچھے پیچھے بھاگے گا۔ یہی معاملہ دنیا کا ہے، چاہے دنیا کی دولت ہو یا دنیا کی عزت ہو یا شہرت ہو یا جاہ ہو یا مال ہو، کچھ بھی ہو، اس کا قاعدہ تو یہی ہے۔ لہٰذا اس بات کی تو فکر ہی چھوڑ دو کہ دنیا کیا کہے گی، اس لئے کہ تم دنیا والوں کا منہ کبھی بند نہیں کر سکتے۔

بیٹی کی شادی کا ایک واقعہ

ایک شخص اپنی بیٹی کی شادی کر رہا تھا، اس نے سوچا کہ جب بھی کوئی شخص اپنی بیٹی کی شادی کرتا ہے تو اس کے سسرال والے اکثر و بیشتر اس کو طعنے دیتے ہیں کہ تو فلاں چیز جہیز میں نہیں لائی، فلاں چیز جہیز میں نہیں لائی، اس نے سوچا کہ میں طعنہ دینے کا موقع ہی نہیں دوں گا اور دنیا کی ساری ضروریات کی چیزیں اپنی بیٹی کو دوں گا، چنانچہ اس نے ساری دنیا بھر کی اشیاء اپنی بیٹی کو جہیز میں دیدیں تاکہ کوئی کہنے والا یہ نہ کہے کہ فلاں چیز نہیں دی۔ جب بارات جہیز لے کر روانہ ہوئی تو راستے میں ایک ندی آ گئی اور راستہ ہموار کرنے کے لئے پھاوڑے کی ضرورت پیش آ گئی، اب سامان میں پھاوڑا تلاش کیا گیا تو پھاوڑا نہیں ملا، کسی نے کہہ دیا کہ لو بھائی! ان صاحب نے جہیز میں پھاوڑا تو دیا نہیں، اگر پھاوڑا دیا ہوتا تو آج یہ راستہ آسانی سے بن جاتا اور پوری بارات آرام

سے گزر جاتی۔ دیکھئے! سب کچھ کرنے کے بعد پھر بھی یہ طعنہ ملا کہ صاحب پھاوڑا نہیں دیا۔

دنیا کا منہ بند نہیں کر سکتے

لہٰذا اس دنیا کے لئے تم کچھ بھی کرلو پھر بھی تمہیں کچھ نہ کچھ ضرور کہے گی، تم اس کا منہ کبھی بند نہیں کر سکتے۔ اسی کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ کسی کے کہنے سننے سے کوئی کام مت کرو بلکہ اپنی رائے پر عمل کرو، یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا تصور کرتے ہوئے جس بات کو تم صحیح سمجھتے ہو، اس پر عمل کرو، اس کے بعد اگر تمہیں کوئی کچھ کہے تو اس کی پرواہ مت کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو ان تعلیمات پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۴۷

اپنے خرچ گھٹائیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵

مجلس نمبر : ۷۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

اسراف اور اس کا علاج

اپنے خرچ گھٹائیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ!

تمہید

کئی روز سے ''اسراف'' کا بیان چل رہا ہے، اس اسراف اور فضول خرچی کے بارے میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کئی ارشادات بیان ہوئے اوران کی تشریح عرض کی گئی۔ اب تک ''اسراف'' کے بارے میں جو تفصیل عرض کی گئی، اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ ''اسراف'' کے معنی یہ ہیں کہ یا تو آدمی ایسی جگہ پر خرچ کرے جہاں خرچ کرنے میں کوئی فائدہ نہ ہو یا فائدہ تو ہو لیکن وہ فائدہ مشروع اور جائز نہ ہو۔ اگر خرچ کرتے وقت ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت بھی پائی جائے تو اس کو ''اسراف'' کہیں گے۔

سالگرہ اور دعوتوں میں پیسہ خرچ کرنا

ہمارے یہاں آج کل جتنی رسمیں رائج ہیں جن کے اندر لوگ پیسے خرچ کرتے ہیں، مثلاً کبھی اپنی پیدائش کی سالگرہ منا رہے ہیں، کبھی شادی کی سالگرہ منا رہے ہیں، کبھی بچے کی سالگرہ کر رہے ہیں، کبھی منگنی کی دعوت کر رہے ہیں اور کبھی ختنہ کی دعوت کر رہے ہیں وغیرہ، اس طرح کی ہزار ہا رسمیں ہم لوگوں نے بنا رکھی ہیں، یہ دعوت کرنا اپنی ذات میں فی نفسہ جائز ہوتا ہے، لیکن یہ دعوتیں دو وجہ سے ناجائز ہو جاتی ہیں، ایک وجہ یہ ہے کہ ان دعوتوں کو اتنا لازم اور ضروری سمجھا جاتا ہے کہ گویا ان کے بغیر دین ہی مکمل نہیں ہوتا، اس کو ضروری سمجھنے کی وجہ سے یہ دعوتیں بدعت ہو گئیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ دعوتیں اس

لئے کی جاتی ہیں تا کہ معاشرے میں ناک نہ کٹے۔ اور پھر مالی اعتبار سے چونکہ دعوت کرنے کی طاقت نہیں ہے، اس لئے اب ان دعوتوں کے لئے دوسروں سے قرض لے رہا ہے، اب بچے کی سالگرہ کی تقریب کے لئے پیسے تو موجود نہیں لیکن سالگرہ اس لئے کرنی ہے کہ اس کا رواج ہے اور فیشن چلا ہوا ہے، اگر سالگرہ نہیں کریں گے تو خاندان میں ناک کٹ جائے گی، اگر ناک نہیں کٹے گی تو کم از کم سالگرہ کرنے کے نتیجے میں لوگوں کو یہ تو پتہ چل جائے گا کہ یہ بھی سالگرہ مناتے ہیں اور اس کے نتیجے میں شہرت حاصل ہوگی اور لوگ ہمیں فیشن ایبل سمجھیں گے۔ لہٰذا سالگرہ کی تقریب کرنے میں فائدہ تو ہے لیکن ناجائز فائدہ ہے۔

قرض لیکر دعوت کرنا جائز نہیں

یاد رکھئے! کوئی بھی مباح کام جس کے بغیر تمہارا گزارہ ہوسکتا ہو، اگر اس مباح کام کے لئے تمہیں قرض لینا پڑے تو یہ ''اسراف'' میں داخل ہے۔ آج ہمارے معاشرے میں یہ وبا پھیلی ہوئی ہے کہ ایک شخص بالکل قلیل تنخواہ کا آدمی ہے جو اس تنخواہ کے ذریعہ مشکل سے اپنے گھر کا خرچ چلاتا ہے، لیکن جب کوئی تقریب کرنے کا موقع آجائے گا تو دوسو آدمی جمع کرلے گا، اور چونکہ اپنے پاس تو پیسے نہیں ہیں، اس لئے اس تقریب کے لئے دوسروں سے قرض لے گا اور مقروض بن جائے گا۔ اب بتائیے کہ کیا دوسو آدمیوں کی دعوت کرنا تمہارے ذمے کوئی فرض و واجب تھا؟ یاد رکھئے! ایسے حالات میں جبکہ تمہارے پاس

پیسے نہیں ہیں اور دوسروں سے قرض لے کر دعوت کرنی پڑ رہی ہے، یہ دعوت کرنا بالکل ناجائز ہے اور اسراف میں داخل ہے۔

عید پر نئے جوڑے بنوانا ضروری نہیں

اب عید کا زمانہ قریب آ رہا ہے، شریعت تو صرف یہ کہتی ہے کہ جو تمہارے پاس بہتر سے بہتر کپڑا جائز اور حلال طریقے سے میسّر ہو، وہ عید کے دن پہن لو۔ اب لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ عید کے موقع پر اپنے لئے اور گھر والوں اور بچوں کے لئے ایک جوڑا نہیں بلکہ کئی کئی جوڑے بنانا عید کی لازمی سنّت ہے اور عید کا لازمی تقاضہ ہے، حالانکہ گھر میں اچھے خاصے کپڑے رکھے ہیں، ان میں کوئی خرابی نہیں ہے، اس کے باوجود عید کے موقع پر نئے کپڑے بنانا لازم اور ضروری ہے اور کپڑے بنانے کے لئے پیسے نہیں ہیں تو اس کے لئے قرض لو، بیوی بچے مرد کو اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ کہیں سے بھی پیسے لاؤ اور ہماری عید کی خریداری کراؤ، اب اگر حلال طریقے سے اتنے پیسے میسّر نہیں تو اب وہ مرد کسی سے رشوت لے گا، کسی کو دھوکہ دے گا، کسی کے ساتھ اور کوئی ناجائز کام کر کے پیسے حاصل کرے گا، اگر اور کچھ نہیں کرے گا تو کم از کم قرض لے گا اور قرض لے کر اپنے بیوی بچوں کی خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔

اس صورت حال نے ہمارے معاشرے میں زبردست فساد پھیلا رکھا ہے، اس کے نتیجے میں حلال وحرام ایک ہو رہا ہے، لوگ پریشانیوں کے دلدل

میں دھنستے چلے جارہے ہیں، یہ سب ''اسراف'' کے ان احکام پر عمل نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔

خرچ گھٹانا اختیار میں ہے اور آمدنی بڑھانا اختیار میں نہیں

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ ''اسراف'' کے سلسلے میں ایک بات بڑے کام کی ارشاد فرماتے تھے، فرماتے تھے کہ آمدنی کے اندر اضافہ کرنا تو انسان کے اپنے اختیار میں نہیں، یعنی جتنی آمدنی کا دل چاہ رہا ہے، اتنی آمدنی ہو جائے، یہ اختیار میں نہیں، زیادہ سے زیادہ انسان کوشش کرسکتا ہے، لیکن اس کوشش کے نتیجے میں آمدنی واقعۃً بڑھ جائے، یہ انسان کے اختیار میں نہیں، البتہ خرچ گھٹانا انسان کے اپنے اختیار میں ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ انسان اس کام کے پیچھے پڑا رہتا ہے جو اس کے اختیار میں نہیں، دن رات اس کی کوشش اور اس کی دوڑ دھوپ اور اس کی سوچ بچار اس طرف لگی ہوئی ہے کہ اس کی آمدنی بڑھ جائے اور جو چیز اختیار میں ہے یعنی خرچ کو گھٹانا تو اس کی طرف توجہ نہیں۔

خود کفیل بننے کی کوشش کرو

خرچ تو پہلے سے متعین کر رکھے ہیں کہ مجھے یہ خرچ ہر قیمت پر ضرور کرنے ہے، لہٰذا اس کے لئے آمدنی بڑھانی ہے اور آمدنی بڑھانا اختیار میں نہیں، اس کے نتیجہ میں تین صورتیں ہوسکتی ہیں کہ یا تو حرام طریقے سے مال کمائے یا کسی

سے قرض لے یا کسی کا زیر بار احسان ہو کر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے کوئی شخص تمہارے ساتھ چاہے کتنی خوش دلی کے ساتھ احسان کر رہا ہو، چاہے وہ تمہارا دوست ہو، عزیز ہو، قریبی ہو، بھائی ہو یا بہن ہو یا باپ ہی ہو، لیکن تمہیں چاہیئے کہ تم اپنے آپ کو خود کفیل بنانے کی کوشش کرو اور ایسے خرچ کیوں کرو جس کے نتیجے میں دوسرے کا احسان سر پر لینا پڑے بلکہ اپنے خرچ کو گھٹا کر کام چلاؤ۔

خرچ آمدنی کے دائرے میں کرلو

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بڑے گر کی بات ارشاد فرمائی کہ اپنے خرچ کو اپنی آمدنی کے دائرے میں رکھو، اگر آمدنی دال روٹی کی ہے تو دال روٹی کھاؤ، پلاؤ زردہ بنانے کی کیا ضرورت ہے، اگر آمدنی اتنی ہے کہ سال میں ایک نیا جوڑا یا دو جوڑے بنا سکتے ہو تو بس اس کے مطابق بناؤ اور اسی کو بار بار دھو کر پہنتے رہو، تین جوڑے مت بناؤ، اللہ تعالیٰ نے جتنی گنجائش دی ہے، اس کے حساب سے اپنے خرچ کو اس طرح ترتیب دو کہ اس آمدنی کے اندر پورا ہو جائے۔

جتنی چادر ہو اتنے پاؤں پھیلاؤ

یہ جو مقولہ مشہور ہے کہ ''جتنی چادر ہو اتنے ہی پاؤں پھیلاؤ'' یعنی جتنے وسائل ہیں اس کے مطابق کام کرو، آج ایسا الٹا زمانہ آ گیا ہے کہ یہ اصول بنالیا ہے کہ ''پاؤں پہلے پھیلاؤ اور چادر بعد میں تلاش کرو'' اور اگر پاؤں

پھیلانے کے بعد چادر کافی نہیں ہوتی تو دوسرے کی چادر چھینو' آج کی معاشیات کا یہی اصول ہے۔ بہرحال! آدمی اتنا خرچ کرے جتنا اس کی استطاعت میں ہو، جب آدمی کم خرچ کی عادت بنالیتا ہے تو اس کو دنیا میں نہ کہیں تکلیف ہوتی ہے اور نہ پریشانی ہوتی ہے اور نہ اس کو کوئی دبا سکتا ہے۔

حضرت مفتی صاحبؒ کا ایک واقعہ

جب پاکستان قائم ہوا تو حکومت پاکستان نے ''بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، اس وقت پاکستان کا دستور بن رہا تھا، پاکستان کے دستور میں اسلامی دفعات شامل کرنے کے لئے علماء پر مشتمل ایک بورڈ بنانا مقصد تھا، چنانچہ اس کام کے لئے حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دارالعلوم دیوبند سے بلایا، آپ تشریف لائے تو آپ کو اس بورڈ کا رکن بنا دیا، آپ نے خدمت کی نیت سے اس کی رکنیت قبول فرمالی۔

یہ ''بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ'' ایک سرکاری ادارہ تھا، ایک موقع ایسا آ گیا کہ حکومت کی طرف سے دستور کے بارے میں کچھ غلط باتیں منظر عام پر آ گئیں، اس کے بارے میں کسی وزیر سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ غلط باتیں کیسے دستور میں شامل کر دیں؟ جواب میں وزیر صاحب نے کہہ دیا کہ ہم تو ''بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ'' سے بھی مشورہ کرتے ہیں۔ ان کے جواب سے یہ تأثر مل رہا تھا کہ گویا یہ سب باتیں بورڈ کے مشورے کے بعد دستور میں شامل

کی گئی ہیں۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جب اس جواب کے بارے میں پتہ چلا تو آپ نے ایک بیان اخبار میں دیدیا کہ وزیر صاحب نے یہ جو فرمایا کہ ہم نے بورڈ سے مشورہ کیا ہے، تو بات یہ ہے کہ بورڈ سے مشورہ تو ضرور کیا، لیکن اس مشورے کے ایک جز پر بھی عمل نہیں کیا اور پھر اس پر آپ نے اس دستور کی مخالفت کی اور اس کی غلطیاں ظاہر کیں۔

یہ ''بورڈ آف تعلیمات اسلامیہ'' اسمبلی سے ملحق تھا، چنانچہ اسمبلی کے ذمہ دار حضرت والد صاحبؒ کی خدمت میں آئے اور آکر کہنے لگے کہ مفتی صاحب! آپ نے ہمارے خلاف یہ بیان دیدیا، حالانکہ آپ خود ہمارے ادارے کے آدمی ہیں، آپ کو تو ایسا بیان نہیں دینا چاہئے۔ حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ میں نے اس ادارہ کی جو رکنیت اختیار کی تھی، وہ صرف خدمتِ دین کے لئے اختیار کی تھی، ضمیر فروشی کے لئے رکنیت اختیار نہیں کی تھی کہ اگر اپنے ضمیر کے خلاف بھی کوئی کام ہو تو اس پر خاموش رہوں اور میں نے ضمیر فروشی کے لئے یہ ملازمت نہیں کی ہے، لہٰذا میں نے اپنا دینی فریضہ سمجھ کر یہ بیان دیا ہے۔ اگر آپ کو میرا یہ طریقہ پسند نہیں ہے تو میں آپ کو یہ بتادوں کہ جس دن میں نے اس بورڈ کی رکنیت قبول کی تھی، اسی دن میں نے استعفاء لکھ کر جیب میں ڈال دیا تھا کہ جب اپنی ضمیر کے مطابق کام ہوتا دکھائی نہیں دے گا تو اسی دن یہ استعفاء پیش کردوں گا۔ اس پر ان وزیر صاحب نے کہا کہ مفتی صاحب! آپ یہ تو سوچیں کہ آپ ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آگئے اور یہاں اس ملازمت کے علاوہ آپ کا نہ کوئی ذریعہ آمدنی ہے نہ کوئی تجارت

ہے، اگر اس طرح آپ اس ملازمت سے استعفاء دے کر چھوڑ دیں گے تو پھر کیسے گزارہ ہوگا؟ اس پر حضرت والد صاحب مسکرائے اور فرمایا کہ یہ جو آپ کو خوف ہے کہ ملازمت چھوٹ جانے کے بعد کیا ہوگا؟ یہ آپ اپنی ملازمت کے چھوٹ جانے سے ڈریں، اس لئے کہ آپ کا یہ جو سر سے لے کر پاؤں تک سوٹ ہے، یہ دوسو روپے کا بنتا ہے۔ اس زمانے میں دوسو روپے بڑی چیز ہوتی تھی۔ لہٰذا آپ کو ہر مرتبہ سوٹ بنانے کے لئے دوسو روپے چاہئیں اور اس کے لئے آپ کو ایسی ملازمت چاہئے جس میں ہزاروں روپے تنخواہ ملے، اس کے بغیر آپ کا گزارہ نہیں ہوگا، میرا سر سے لے کر پاؤں تک جو پورا جوڑا اور ٹوپی اور جوتا ہے، یہ ڈیڑھ روپے میں تیار ہو جاتا ہے، لہٰذا مجھے آپ کی ان تنخواہوں اور الاؤنسوں کی پرواہ نہیں، آج اگر ملازمت چھوڑ دوں گا تو اللہ تعالیٰ نے مجھے تھوڑا بہت ہنر دیا ہے، میں اس کے ذریعہ آسانی سے ڈیڑھ روپے کما لوں گا۔

انتظام سے خرچ کرنے کی عادت بنالو

یہ باتیں وہی شخص کر سکتا ہے جس نے اپنی زندگی کو کم خرچ میں ڈھال لیا ہو۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ آمدنی اگرچہ تھوڑی ہو لیکن اس کو انتظام سے خرچ کرے کہ وہ پیسہ صحیح مصرف پر اور صحیح جگہ خرچ ہو۔ چنانچہ ہم نے تو دیکھا ہے کہ انتظام کسے کہتے ہیں، آپ حضرات کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ حضرت والد صاحبؒ دارالعلوم دیوبند میں صدر مفتی تھے اور درجہ علیا کے استاد بھی تھے، جب پڑھانا شروع کیا تھا تو اس وقت آپ کی تنخواہ ماہانہ ۱۵/ روپے

تھی اور جب آپ نے دارالعلوم دیوبند کو چھوڑا تو اس وقت آپ کی تنخواہ ۶۵ر روپے ماہانہ تھی۔

ملازمت کو ٹھکرادیا

اس دوران آپ کے پاس ''مدرسہ عالیہ کلکتہ'' سے پیشکش آ گئی کہ آپ ہمارے یہاں ''صدر مدرس'' کے عہدے کے لئے تشریف لے آئیں، ہم آپ کو ۵۰۰ر روپے تنخواہ دیں گے، اس وقت کے پانچ سو روپے آج کل کے پچاس ہزار روپے سے کم نہیں ہوں گے۔ جبکہ دارالعلوم دیوبند میں اس وقت پچاس روپے ماہانہ سے بھی کم تنخواہ تھی، اس پیشکش کے جواب میں حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے متنبی کا ایک شعر لکھ کر ان کو بھیج دیا، وہ شعر یہ تھا:

من رکب الثور بعد الجواد
أنکر أطلافه و الغبب

یعنی جو شخص عمدہ گھوڑے پر ایک مرتبہ سواری کر چکا ہو، وہ بعد میں بیل پر سواری نہیں کرتا۔ یعنی دارالعلوم دیوبند میں پڑھانے کے بعد اب مدرسہ عالیہ کلکتہ میں پانچ سو روپے کی ملازمت کو اختیار کرنا گھوڑے پر سواری کرنے کے بعد بیل پر سواری کرنے کے مترادف ہے۔ چنانچہ آپ نے وہ پیشکش رد کر دی۔

۶۵ر روپے میں چار خاندانوں کی پرورش

حالانکہ آپ کا کنبہ بڑا تھا اور آپ کی کئی ہمشیرہ بیوہ ہوگئی تھیں، ان سب

کی دیکھ بھال اور ان سب کا خرچ آپ نے اپنے ذمے لے لیا تھا اور تنخواہ صرف ۵۰ یا ۵۵ روپے تھی اور آخری تنخواہ صرف ۶۵/ روپے تھی۔ اس تنخواہ میں آپ نے چار خاندان پالے اور صرف یہ نہیں کہ آرام سے اس تنخواہ میں گزارہ کیا بلکہ بہت بڑا کتب خانہ خود اپنے ہاتھوں سے خریدا ہوا چھوڑ کر گئے، چونکہ کتابوں کا آپ کو بہت شوق تھا، اس لئے کتابیں جمع کیں، آج اس کتب خانہ کی مالیت لاکھوں کی ہوگی۔

اخراجات کا بجٹ آمدنی کے مطابق ہو

فرمایا کرتے تھے کہ یہ سب کام انتظام کی وجہ سے ہوا، ہر چیز کا سوچ سمجھ کر ایک دائرہ مقرر کرلیا، ہم نے دیکھا کہ حضرت والد صاحبؒ کے پاس ایک چھوٹی سی صندوقچی تھی، اس کے اندر لفافے رکھے ہوتے تھے، ایک لفافہ پر یہ لکھا ہوتا ''گھر کا خرچ اور راشن، ایک لفافے پر لکھا ہوتا ''پھل'' گویا کہ ہم اپنی تنخواہ میں سے مثلاً ۲/ روپے یا پانچ روپے کے پھل کھائیں گے اور گھر والوں کو کھلائیں گے، اب جب تنخواہ ملی تو ۲/ روپے پھل کے لفافے میں رکھ دیئے، اب سارے مہینے انہیں دو روپے میں پھل لانے ہیں، یہ نہیں کہ کسی مہینے دس روپے کے پھل لے آئے اور کسی مہینے ایک پیسہ کا بھی پھل نہیں آیا، اس انتظام کے نتیجے میں خاص تناسب سے پورے مہینے پھل آتے۔ کپڑے کے لئے الگ لفافہ، جوتے کے لئے الگ لفافہ، ہر مد کے لئے الگ الگ لفافے ہوتے، جس لفافہ میں پیسے ختم ہو جاتے تو بس اس مد کی چھٹی ہو جاتی، مثلاً پھل

کا لفافہ اگر خالی ہوگیا تو اب مہینے کے ختم تک پھل نہیں آئیں گے، اگر کپڑے کا لفافہ خالی ہوگیا تو اب کپڑے کا باب بند ہوگیا، اب جب دوبارہ کپڑے کی مد میں پیسے آئیں گے تو اس وقت کپڑا خریدا جائے گا۔ اس انتظام کی بدولت اللہ تعالیٰ نے خوب برکت عطا فرمائی۔

خیرات وصدقات بھی ماہانہ مقرر تھے

اس کے علاوہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ساری عمر یہ معمول تھا کہ جب کوئی آمدنی ہوتی، اگر وہ محنت سے حاصل ہوئی ہے تو اس کا بیسواں حصہ اور اگر بغیر محنت کے حاصل ہوئی ہے تو اس کا دسواں حصہ نکال کر الگ لفافے میں رکھ لیتے اور خیرات کے مواقع پر اس میں سے خرچ کرتے، اس لفافے پر لکھا ہوتا ''مدّ خیرات'' اسی لفافے میں سے کسی کو ہدیہ دیدیا، کسی کو تحفہ دیدیا، کہیں مسجد میں لگادیا۔ ہم نے یہ لفافہ کبھی خالی نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ نے اس میں ایسی برکت عطا فرمائی تھی۔ اس طرح خرچ کرنے کا نتیجہ یہ تھا کہ کام آرام سے پورے ہوجاتے تھے اور کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ بہت زیادہ تنگی ہورہی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اسی تنخواہ سے بچا کر خیرات کے کاموں میں بھی خرچ کرلیتے۔ حضرت والد صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر انتظام سے خرچ کرنے کی عادت ڈالی جائے تو تھوڑے پیسے میں اللہ تعالیٰ زیادہ برکت عطا فرما دیتے ہیں اور ان پیسوں سے آدمی زیادہ فائدہ اٹھالیتا ہے اور اگر بدنظمی اور بدانتظامی ہو اور اسراف اور فضول خرچی ہو تو سونے کے ڈھیر اور قارون کا خزانہ

بھی ناکافی ہے، جب انسان کی بے جگہ خرچ کرنے اور بے محابا خرچ کرنے اور بے مصرف خرچ کرنے کی عادت پڑ جاتی ہے تو پھر بڑے بڑے خزانے بھی ناکافی ہو جاتے ہیں۔

ایک عبرت ناک واقعہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ڈھاکہ میں ایک بازار ہے جو بیگم بازار کے نام سے مشہور ہے، یہ علاقہ ایک بہت بڑے نواب صاحب کا تھا، وہ نواب صاحب بڑی جائیداد کے مالک تھے اور ان کے پاس روپیہ پیسہ سبھی کچھ تھا، ان نواب صاحب کا انتقال ہو گیا اور اولاد میں ایک بیٹا تھا اور ایک بیٹی تھی، ساری جائیداد اور سارا پیسہ ان دونوں کے پاس وراثت میں آ گیا، ایک مرتبہ بیٹی کو کپڑا خریدنے کی ضرورت ہوئی تو کپڑے کے ایک تاجر سے کہا کہ تم ہمارے ہاں تھان لے کر آؤ تاکہ ہم اس میں سے اپنے لئے کپڑا پسند کرلیں، چنانچہ وہ تاجر بہت سارے تھان لے کر آ گیا، ایک کپڑا پسند آیا تو تاجر سے کہا کہ اس تھان میں سے ایک جوڑے کا کپڑا پھاڑ دو، جب اس تاجر نے وہ کپڑا پھاڑا تو کپڑے کے پھٹنے کی جو آواز تھی وہ صاحبزادی کو بہت پسند آئی کہ یہ تو بہت خوبصورت آواز ہے، اب اس نے تاجر سے کہا کہ اور کپڑے پھاڑو، اس نے اور پھاڑ دیے، اب اس صاحبزادی کا یہ مشغلہ بن گیا کہ دن رات تاجر سے کپڑا منگواتی اور اس کو پھڑواتی اور اس کی آواز سے لطف اندوز ہوتی۔

دوسرے صاحبزادے تھے، وہ ایک مرتبہ کسی جگہ تشریف لے گئے، وہاں چراغ جلانے کی ضرورت پیش آ گئی، چنانچہ ماچس کے ذریعہ جب وہ چراغ جلایا تو ماچس جلانے کی بو صاحبزادے کو پسند آ گئی، انہوں نے دن رات یہ مشغلہ اختیار کرلیا کہ ماچس منگواتے اور اس کو جلا کر اس کی بو سونگھتے اور اس طرح ماچسوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اب دونوں اپنے اپنے مشغلوں کے اندر لگے ہوئے ہیں، آخرکار ساری دولت، ساری جائیداد ان مشغلوں کے اندر ختم ہوگئی، یہاں تک نوبت پہنچی کہ پھر وہ دونوں بہن بھائی اس بازار میں پیالہ لے کر بھیک مانگا کرتے تھے، اس لئے اس بازار کا نام ''بیگم بازار'' مشہور ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین، یہ درحقیقت فضول خرچی کا عذاب ہے۔

آمدنی کے دائرے میں خرچ کرنا کفایت شعاری ہے

خدا کرے کہ یہ بات ہماری سمجھ میں آ جائے کہ اپنے اخراجات کو اپنی آمدنی کے دائرے میں محدود رکھیں، کیونکہ آمدنی بڑھانا اختیار میں نہیں، خرچ گھٹانا اختیار میں ہے، جو اختیار میں ہے اس پر عمل کرو، اور جب انتظام سے خرچ کروگے تو انشاءاللہ تعالیٰ اس میں برکت ہوگی اور بخل کی ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی، انتظام اور کفایت شعاری اچھی چیز ہے، بخل اور کنجوسی بری چیز ہے۔ بخل کے معنی یہ ہیں کہ شریعت نے جہاں خرچ کرنے کو کہا ہے، یا تو اس جگہ پر خرچ نہیں کررہے ہو یا اس جگہ پر تنگی کررہے ہو تو یہ بخل ہے، لیکن اگر اپنی

آمدنی کے دائرے میں رہ کر خرچ کر رہے ہو تو یہ بخل نہیں بلکہ یہ کفایت شعاری ہے اور انتظام ہے۔ یہ ایک بنیادی نصیحت ہے، اگر ہم اس پر عمل کرلیں تو جو ہمارے مالی مسائل ہیں، وہ اس کے ذریعہ بہترین طریقے پر حل ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس نصیحت پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۷۵

تکبر اور خجلت کا فرق

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸ ۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک

اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵

مجلس نمبر : ۷۵

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

تکبر اور خجلت کا فرق

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِیَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ!

آگے جو ملفوظ ہے، یہ حضرت والاؒ نے ایک صاحب کے خط کے جواب میں ارشاد فرمایا ہے، فرمایا کہ:

مجمع کے سامنے جو پانی کا گھڑا یا آم کی ٹوکری وغیرہ اٹھا کر لے چلنے میں عار آتی ہے، متوسط کے لئے اس کا منشاء کبر ہوتا ہے، اس کو بتکلف اٹھانا علاجاً ضروری ہے۔ خلاف عادت فعل کرنے میں جو طبیعت شرماتی ہے، اس کو ''خجلت'' کہتے ہیں، لیکن تکبر اور خجلت کا فرق یوں ظاہر ہوسکتا ہے کہ اگر مثلاً کسی شخص کو اس بات سے گرانی ہو کہ وہ سر پر ٹوکرا رکھ کر سرِ بازار نکلے اور اس سے شبہ کبر کا ہو تو دیکھنا یہ چاہئے کہ مثلاً اگر خلاف عادت اس کو ہاتھی پر بٹھلا کر جلوس کے ساتھ بڑی شان وشوکت سے بازار میں نکالا جائے تو آیا اس کو اس سے بھی انقباض ہوگا اور شرم آئے گی یا نہیں؟ اگر اس سے بھی انقباض ہو تو ایسے شخص کو ٹوکرا اٹھانے سے جو انقباض ہے، اس کو ''تکبر'' نہ کہیں گے بلکہ ''خجلت'' کہیں گے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۹۲)

تکبر اور خجلت کی ایک مثال

اللہ تعالیٰ نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کو عجیب باریک نظر عطا فرمائی تھی۔ اس ملفوظ میں فرماتے ہیں کہ دو چیزوں میں بعض اوقات التباس ہو جاتا ہے، یعنی ایک چیز پر دوسری چیز کا گمان ہو جاتا ہے۔ ایک ہے ''تکبر'' یہ بہت

بُری چیز ہے اور بہت سے امراض باطنہ کی جڑ ہے اور دوسری چیز ہے ''خجلت'' اس کے معنی ہیں کسی کام کے کرنے سے شرم محسوس ہونا، یہ کوئی بُری بات نہیں بلکہ جائز ہے۔ فرمایا کہ اگر کسی شخص کو پانی کا گھڑا یا آم کی ٹوکری سر پر رکھ کر بازار سے جاتے ہوئے عار آتی ہے تو بعض اوقات اس عار کا آنا تکبر کی وجہ سے ہوتا ہے، کیونکہ آدمی اپنے آپ کو دوسروں کے مقابلے میں بڑا سمجھتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ یہ سامان سر پر اٹھا کر لیجانا میری شان کے خلاف ہے، یہ کبر ہے اور اپنی بڑائی دل میں ہے کہ میری شان تو بہت اونچی ہے اور یہ سامان اٹھانا میری شان سے بہت فروتر کام ہے، یہ تکبر ہے جو منع ہے اور حرام ہے، اگر کوئی شخص اس وجہ سے سامان اٹھانے سے اعراض کرے کہ یہ عمل میری شان کے خلاف ہے تو اس شخص کا علاج یہ ہے کہ یہی کام اس شخص سے زبردستی کروانا چاہئے تاکہ اس کے دماغ میں جو اپنی شان بیٹھی ہوئی ہے، وہ نکل جائے۔

یہ خجلت ہے

اور بعض اوقات اس کام سے عار آنا خجلت کی وجہ سے ہوتا ہے، یعنی چونکہ یہ کام کرنے کی عادت نہیں ہے تو خلاف عادت کام کرنے سے آدمی کو طبیعت میں شرم محسوس ہوتی ہے، اس وجہ سے نہیں کہ یہ کام میری شان کے خلاف ہے بلکہ اس وجہ سے کہ عام طور پر میں یہ کام نہیں کیا کرتا، جب اچانک مجمع کے سامنے یہ کام کروں گا تو لوگ پتہ نہیں کیا سمجھیں گے اور ایک اجنبی سی بات ہوگی، اس لئے طبیعت میں اس کام سے شرم معلوم ہوتی ہے، یہ خجلت ہے،

تکبر نہیں، اگر اس وجہ سے کوئی شخص سامان اٹھانے سے اعراض کر رہا ہے تو کوئی بُری بات نہیں۔

تکبر اور خجلت کو معلوم کرنے کا طریقہ

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے کہ اس سامان کے اٹھانے سے جو عار محسوس ہو رہی ہے، یہ شان کے خلاف ہونے کی وجہ سے اور تکبر کی وجہ سے عار محسوس ہو رہی ہے یا خلاف عادت ہونے کی وجہ سے شرم محسوس ہو رہی ہے؟ اس کا حضرت والا نے یہ امتحان بتایا کہ اس کا اس طرح امتحان لو کہ اگر وہی شخص جو ٹوکرا اٹھانے سے شرما رہا ہے، خلاف عادت اس کو ہاتھی پر بٹھا کر اس کا جلوس نکالا جائے تو آیا اس عمل سے بھی اس کو شرم آئے گی یا نہیں؟ اگر اس عمل سے بھی اس کو شرم آئے گی تو اس سے معلوم ہو جائے گا کہ اس کو ٹوکرا اٹھانے سے جو شرم آ رہی تھی، وہ واقعۃً خلاف عادت ہونے کی وجہ سے شرم آ رہی تھی، لیکن اگر یہ صورت ہو کہ ہاتھی پر بٹھا کر جلوس نکالنے پر تو خوش ہو رہا ہے کہ میرا جلوس نکل رہا ہے، لوگ میری عزت اور احترام کر رہے ہیں، حالانکہ اگر خلاف عادت ہونے کی وجہ سے ٹوکرا اٹھانے میں شرم آ رہی ہوتی تو پھر جلوس نکالتے ہوئے بھی شرم آنی چاہئے، معلوم ہوا کہ ٹوکرا اٹھانے پر جو شرم محسوس ہو رہی ہے، وہ تکبر کی وجہ سے اور اپنی شان کے خلاف سمجھنے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ یہ ہیں حکیم جو اس بات کو سمجھ رہے ہیں کہ کہاں بیماری ہے اور کہاں بیماری نہیں ہے۔ بہر حال! جہاں اس قسم کا کام کرتے ہوئے انسان اس وجہ سے کترائے

کہ یہ کام میری شان کے خلاف ہے تو سمجھ لو کہ تکبر کی بیماری اندر موجود ہے اور اس کا علاج ضروری ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ کا اپنا علاج کرنا

اور یہ علاج حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے ثابت ہے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس زمانۂ خلافت میں کہیں سے روم کا بنا ہوا جُبّہ آ گیا جو بڑا شاندار جُبّہ تھا، آپ کو خیال آیا کہ جمعہ کے روز اس جُبّہ کو پہن کر خطبہ دوں گا اور نماز پڑھاؤں گا، چنانچہ جُبّہ پہن کر مسجد نبوی میں تشریف لائے اور خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ویسے بھی بڑے وجیہ اور بلند قامت تھے اور جب جُبّہ زیب تن فرمایا تو آپ بہت خوبصورت لگ رہے تھے اور دیکھنے والوں نے بھی محسوس کیا کہ یہ جُبّہ بہت خوبصورت لگ رہا ہے، جب نماز سے فارغ ہوکر گھر تشریف لائے تو ایک پانی کی مشک اٹھائی اور اس کو پانی سے بھر کر اپنی کمر پر لادی اور مدینہ منورہ میں جو بیواؤں کے گھر تھے، ان میں پانی بھرنے لگے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے مسجد نبوی میں منبر پر بڑی شان سے خطبہ دے رہے تھے اور اب پانی بھرنے لگے، کسی نے پوچھا کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ جب میں نے وہ جُبّہ پہن کر خطبہ دیا تو بڑی شان وشوکت معلوم ہوئی اور مجھے اندیشہ ہوا کہ میرے دل میں کہیں عجب اور کبر داخل نہ ہو جائے، اس کا علاج کرنے کے لئے میں نے یہ کام کیا۔ اللہ اکبر۔ یہ اپنا علاج وہ شخص کر رہا ہے

ہیں جن کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

لو کان بعدی نبیّ لکان عمر

لیکن اپنے نفس کا ہر ہر لمحے جائزہ لے رہے ہیں کہ کہیں یہ نفس مجھے غلط راستے پر تو نہیں لے جارہا ہے، اگر لے جارہا ہے تو اس کا فوری علاج ضروری ہے۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کا اپنا علاج کرنا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مولوی قسم کے آدمی تھے، نہ ان کا سیاست سے کوئی تعلق، نہ کسی اور چیز سے تعلق، ساری زندگی قال اللہ اور قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم پڑھانے میں گزری، ساری عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث روایت کیں، پانچ ہزار تین سو چونسٹھ احادیث آپ سے مروی ہیں۔ مدینہ منورہ میں مروان بن حکم ایک مرتبہ گورنر تھا، اس کو کہیں سفر پر جانے کی ضرورت پیش آئی تو اس نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنا قائم مقام اور نائب بنادیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا فیض اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا اثر تھا کہ بہت حسن خوبی سے حکومت چلانے کے کام انجام دیے، سارا دن بیٹھ کر حکومت کرتے، معاملات نمٹاتے، عدالت کے فیصلے کرتے، معاملات کی جانچ پڑتال کرتے، ایک گورنر کو جو کام انجام دینے پڑتے ہیں وہ سب کچھ کرتے، جب شام کو ایوانِ حکومت سے اٹھ کر گھر جاتے تو لکڑیوں کا ایک گٹھا لے کر سر پر رکھتے اور مدینہ منورہ کے بازار کے درمیان سے گزرتے اور جاکر لکڑیاں فروخت کرتے تاکہ اس کو فروخت کرکے اپنی گزر

اوقات کریں۔ اور صرف اتنی بات نہیں تھی بلکہ بازار سے لکڑیوں کا گٹھا سر پر رکھ کر اس طرح اعلان کرتے ہوئے گزرتے کہ ہٹو امیر المؤمنین آرہے ہیں، ہٹو امیر المؤمنین آرہے ہیں۔ امیر المؤمنین بھی ہیں اور یہ کام بھی کررہے ہیں، کیوں کررہے ہیں؟ اس لئے کررہے ہیں کہ سارے دن بیٹھ کر جو حکومت کی ہے، اس کے نتیجے میں کہیں دماغ میں یہ خنّاس نہ پیدا ہوجائے کہ میں بہت بڑا آدمی ہوں اور دوسرے سب لوگ مجھ سے حقیر اور چھوٹے ہیں، چنانچہ اس کے علاج کے طور پر یہ کام کررہے ہیں۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا اپنا علاج کرنا

حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فاتح ایران ہیں اور کسریٰ کو شکست فاش دینے والے ہیں اور جنہوں نے اپنی تقریر سے کسریٰ کے ایوان میں زلزلہ پیدا کردیا تھا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے راز دار اور صاحب السِرّ تھے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو مدائن بھیجا کہ آپ جاکر مدائن کے گورنر بن جائیں۔ یہ مدائن ایران کا دارالحکومت تھا اور ایران اس وقت دنیا کی سپر پاور تھی۔ آپ اندازہ کرلیں کہ اس کا دارالحکومت کس شان وشوکت کا ہوگا، جیسے آج کل واشنگٹن یا ماسکو، میں نے خود کسریٰ کا وہ محل دیکھا ہے، آج بھی اس کا شکوہ انسان کو متأثر کئے بغیر نہیں رہتا جبکہ وہ محل کھنڈر ہوگیا ہے، البتہ دیواریں ابھی تک کھڑی ہیں۔ بہرحال! جب حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدائن کے گورنر بن کر گئے تو اس وقت وہ ایک گدھے پر

سوار تھے جو اس وقت بالکل ادنیٰ درجے کی سواری تھی اور ان کا بھی معمول یہ تھا کہ سارا دن حکومت کے کام انجام دیتے اور شام کے وقت بازار میں عام تاجروں کی طرح اپنا سامان فروخت کرتے تاکہ اپنا روزگار حاصل کریں، اگرچہ حکومت کے کاموں پر تنخواہ لینا جائز تھا لیکن اس تجارت کے کرنے سے اصل مقصد یہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ حکومت کرنے کے نتیجے میں تکبر اور عجب طبیعت میں پیدا ہو جائے، اس کے علاج کے طور پر آپ اس طرح عام انسانوں کی طرح تجارت کیا کرتے تھے۔

مشائخ کے تجویز کردہ علاج بدعت نہیں

لہٰذا حضرات صوفیاء کرام اور مشائخ اپنے زیر تربیت افراد کے لئے اس قسم کے جو علاج تجویز کرتے ہیں، اس کی اصل حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ان اعمال میں موجود ہے۔ بعض حضرات صوفیاء اور مشائخ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ جو علاج یہ تجویز کرتے ہیں یا جو مجاہدات اور ریاضتیں کراتے ہیں، یہ سب بدعت ہیں، لیکن میں نے آپ حضرات کے سامنے جو مثالیں پیش کیں، یہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا طریقہ تھا، وہ اپنے نفس کی اصلاح کے لئے یہ کام کیا کرتے تھے اور حضرات صوفیاء کرام نے انہیں کے طرزِ عمل سے یہ طریقے اور علاج تجویز کئے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند اور اصلاح باطن

دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی دور میں صرف کتابیں نہیں پڑھائی جاتی

تھیں بلکہ ایک ایک بات کی تربیت کی جاتی تھی، اسی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کی جو تاریخ تاسیس ہے، وہ ''در مدرسہ خانقاہ دیدیم'' ہے یعنی ہم نے مدرسہ میں خانقاہ دیکھی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ علوم پڑھانے کا مدرسہ تو ہے لیکن ساتھ میں یہ خانقاہ بھی ہے، یہاں لوگوں کو تربیت دی جاتی ہے اور اہل اللہ تیار کئے جاتے ہیں، اللہ والے تیار کئے جاتے ہیں، چنانچہ اساتذہ اپنے شاگردوں کو صرف سبق ہی نہیں پڑھاتے تھے بلکہ ان کے امراض باطنہ کی اصلاح کی بھی فکر کیا کرتے تھے۔

حضرت گنگوہیؒ اور تربیت طلباء

ہمارے سیّد الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس اللہ سرّہ کے بارے میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''ارواحِ ثلاثہ'' میں لکھا ہے کہ جب وہ کسی طالب علم کو دیکھتے کہ اس کے اندر تکبر اور عجب کی علامات ہیں تو اس کو مثلاً اس قسم کے کام پر لگاتے کہ تم لوگوں کے جوتے سیدھے کیا کرو اور جب کسی طالب علم کے اندر دیکھتے کہ اس کے اندر تواضع ہے تو خود اس کے جوتے اٹھا لیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ سبق پڑھا رہے تھے کہ بارش شروع ہوگئی، بارش کی وجہ سے اس جگہ سے اٹھنا پڑا تو طلبہ تو اپنی اپنی کتابیں اٹھا کر اندر جانے لگے اور حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ان طلباء کے جوتے سمیٹ کر اندر تشریف لے گئے۔ لہٰذا ایک طرف اپنے شاگردوں کی بھی تربیت فرما رہے ہیں اور دوسری طرف خود

اپنے عمل سے یہ بتا رہے ہیں کہ یہ کام ایسا نہیں ہے کہ تم اس کو اپنی شان کے خلاف سمجھ لو۔

مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور تواضع

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ شیخ الادب حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ کہیں سفر پر جانے لگے، حضرت والد صاحبؒ اور دارالعلوم دیوبند کے دوسرے اساتذہ جو حضرت مولانا کے شاگرد تھے وہ بھی سفر میں ساتھ تھے، جب روانہ ہونے لگے تو حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب کچھ لوگ سفر پر روانہ ہوں تو وہ اپنا ایک امیر مقرر کرلیا کریں، لہٰذا ایک کو امیر بنالیا جائے۔ حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ امیر بنانے کی کیا ضرورت ہے، امیر تو بنے بنائے ہیں، مطلب یہ تھا کہ آپ ہمارے امیر ہیں، حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تم مجھے امیر بنانا چاہتے ہو؟ ہم نے کہا کہ جی ہاں، آپ کی موجودگی میں اور کون امیر بنے گا، فرمایا کہ جب کسی کو امیر بنایا جاتا ہے تو اس کا حکم ماننا پڑتا ہے۔ اور امیر کی اطاعت کرنی پڑتی ہے، ہم نے کہا کہ انشاء اللہ ہم آپ کا حکم مانیں گے، فرمایا کہ بس ٹھیک ہے۔ چنانچہ ہم سب دارالعلوم دیوبند سے روانہ ہوکر اسٹیشن پہنچے، تھوڑی دیر کے بعد ریل آ گئی تو حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ نے دو چار بستر اٹھائے اور ریل کی طرف چل پڑے، ہم شاگردوں نے کہا کہ حضرت! یہ

کیا کر رہے ہیں؟ فرمایا کہ نہیں، امیر کا حکم ماننا ہوگا، چنانچہ استاذ صاحب سامان اٹھائے جا رہے ہیں اور شاگرد پیچھے پیچھے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد جہاں کہیں سفر میں کوئی خدمت کا موقع آتا تو مولانا آگے بڑھ کر وہ خدمت انجام دیدیتے اور جب ہم کہتے کہ یہ کام ہم کر لیتے تو فرماتے کہ نہیں، امیر کا حکم ہے، حضرت والد صاحب نے فرمایا کہ امیر کا حکم ماننے نے ہمیں سارے سفر میں زچ کر دیا۔ یہ تھے ہمارے حضرات اکابر، آج ہم لوگوں نے اپنی طرف سے اپنی شانیں بنا رکھی ہیں کہ یہ کام ہماری شان کے خلاف ہے، یہی طرز عین تکبر ہے۔

حضرت مولانا مظفر حسین صاحبؒ اور تواضع

حضرت مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے گزرے ہیں، ان کی ولایت اور ان کے علم وتقویٰ کی بڑی شہرت تھی، چنانچہ لوگ ان کی زیارت کرنے کے لئے ان کے پاس آیا کرتے تھے۔ ایک بڑے میاں نے ان کی شہرت سن کر ان کی زیارت کے لئے کاندھلہ کا سفر کیا، پیدل جا رہے تھے، ہاتھ میں کچھ سامان بھی تھا، سامان ذرا وزنی تھا، اس لئے کچھ دور چل کر سامان زمین پر رکھ دیتے اور کچھ دیر آرام کر کے پھر سامان اٹھا کر چل پڑتے، حضرت مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی اتفاق سے کسی اور شہر سے آ رہے تھے، راستے میں آپ نے دیکھا کہ ایک بڑے میاں سامان اٹھا کر جا رہے ہیں لیکن سامان بوجھل ہونے کی وجہ

سے کچھ دیر چل کر رکھ دیتے ہیں اور وہ سامان ان سے اٹھایا نہیں جا رہا ہے۔ حضرت مولاناؒ نے جب انکو اس حال میں دیکھا تو ان سے فرمایا کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ کا سامان اٹھالوں؟ بڑے میاں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، اگر آپ اٹھالیں تو بڑی مہربانی ہوگی، خیر! حضرت مولاناؒ نے وہ سامان اٹھالیا اور چل پڑے۔

راستے میں آپس میں باتیں ہونے لگیں، آپ نے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ بڑے میاں نے کہا کہ میں کاندھلہ جا رہا ہوں، مولانا نے پوچھا کہ کیوں جا رہے ہو؟ بڑے میاں نے جواب دیا کہ سنا ہے کہ وہاں ایک بڑے مولانا صاحب ہیں اور ان کا نام مولانا مظفر حسین صاحب ہے، ان کی زیارت کرنے جا رہا ہوں۔ پھر بڑے میاں نے پوچھا کہ آپ کہاں رہتے ہیں؟ حضرت مولانا نے فرمایا کہ میں بھی کاندھلہ میں رہتا ہوں۔ بڑے میاں نے پوچھا کہ آپ مولانا مظفر حسین صاحب کو جانتے ہو؟ مولانا نے فرمایا کہ ہاں! میں جانتا ہوں۔ بڑے میاں نے کہا کہ وہ تو بڑے عالم ہیں، بڑے اللہ کے ولی ہیں، متقی بزرگ ہیں، مولانا نے فرمایا کہ ہاں نماز تو پڑھتے ہیں۔ سارا راستہ اسی طرح قطع کیا۔

جب کاندھلہ شروع ہوگیا اور لوگوں نے آپ کو دیکھا کہ آپ اس طرح سامان کندھے پر رکھ کر جا رہے ہیں تو ہر آدمی سامان اٹھانے کے لئے آگے بڑھ رہا ہے، کوئی آپ کی عزت کر رہا ہے، کوئی سلام کر رہا ہے، اب بڑے میاں یہ صورت حال دیکھ کر بڑے پریشان ہوئے کہ یہ کیا قصہ ہے؟ بعد میں

بڑے میاں کو پتہ چلا کہ یہی مولانا مظفر حسین صاحب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کو اس دور میں حضرات صحابہ کرامؓ کے اخلاق کا نمونہ بنایا تھا۔

حضرت شیخ الہندؒ اور تواضع

حضرت قاری محمد طیّب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خسر صاحب بڑے نواب زادے تھے اور امیر گھرانے کے آدمی تھے، ان کے والد کو خیال آیا کہ ان کو پڑھنے کے لئے دارالعلوم دیوبند بھیج دیں، دارالعلوم دیوبند میں تو سادہ رہائش تھی، ان کے والد صاحب نے سوچا کہ دارالعلوم دیوبند میں جو رہائشی کمرے ہیں، ان میں ان کا قیام کرنا تو مشکل ہوگا، چنانچہ یہ اپنے بیٹے کو داخلہ کیلئے دارالعلوم لیکر آئے، داخلہ ہوگیا اور مسجد کے حجرے میں قیام کا انتظام ہوگیا۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے والد کے تعلقات تھے اور حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ جانتے تھے کہ یہ نواب زادے ہیں، لہٰذا شیخ الہندؒ کو گھر میں بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ یہ بیچارہ پڑھنے کے لئے آیا ہے اور مسجد کے حجرے میں قیام ہے، اب یہ اس حجرے میں فرش پر سوئے گا اور آج سے پہلے کبھی فرش پر سویا نہیں ہوگا، اس لئے اس کو فرش پر سونے میں زحمت ہوگی، چنانچہ آپ نے اپنے گھر سے ایک چارپائی اٹھائی اور اس کو کندھے پر رکھ کر اس کے حجرے تک لے گئے۔ دیکھئے! ایک طرف شیخ الہند ہیں بلکہ بقول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے "شیخ العرب والعجم" ہیں، اپنے ایک ہونے والے شاگرد کے لئے کندھے پر چارپائی اٹھائے لے جارہے ہیں، دوسری طرف

حضرت شیخ الہندؒ کو یہ خیال ہوا کہ جب یہ شاگرد مجھے دیکھے گا کہ میں چار پائی اٹھا کر لا رہا ہوں تو اس کو شرمندگی ہوگی کہ اتنے بڑے آدمی میرے خاطر چار پائی اٹھا کر لائے، اس لئے آپ نے یہ کیا کہ جب حجرے کے قریب پہنچے تو آپ نے ان سے فرمایا کہ لو میاں صاحب زادے، اپنی چار پائی اٹھاؤ، میں بھی شیخ زادہ ہوں، اپنی چار پائی خود اٹھاؤ۔ یہ الفاظ اس لئے کہے تا کہ اس کی شرمندگی کا تھوڑا سا ازالہ ہو جائے۔

عزت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے

بہر حال! کہنا یہ تھا کہ یہ جو اپنی شان بنانے والی بات ہے، بس شیطان اسی سے انسان کی راہ مارتا ہے کہ فلاں کام میری شان کے خلاف ہے۔ ارے تم کیا اور تمہاری شان کیا، یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے لوگوں کے دلوں میں تمہاری عزت پیدا فرما دی، یہ ان کا کرم ہے، اگر لوگوں کو تمہاری حقیقت حال کا پتہ لگ جائے تو لوگ تم سے نفرت کریں، تھوتھو کریں، یہ تو اللہ تعالیٰ نے پردہ پوشی فرما رکھی ہے، اللہ تعالیٰ نے ستاری فرما رکھی ہے، اس وجہ سے لوگ عزت کر رہے ہیں، یہ عزت تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے، شان بنانے سے عزت نہیں ملتی۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ۔

(سورۃ منافقون: آیت ۸)

وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ۔

(سورۃ آل عمران: آیت ۲۶)

جب وہ کسی کو عزت دیتے ہیں تو پھٹے ہوئے اور میلے کپڑوں میں عزت دیدیتے ہیں اور اگر وہ عزت نہ دیں بلکہ ذلیل کر دیں تو تاج اور تخت کی موجودگی میں ذلیل کر دیتے ہیں۔ لہٰذا یہ خیال کہ فلاں کام میری شان کے مطابق ہے اور فلاں کام میری شان کے خلاف ہے، یہ سب شیطان کا دھوکہ ہے اور تکبر اور عُجب پیدا کرنے کا راستہ ہے، اس خیال کو ختم کرو، کوئی کام شان کے خلاف نہیں، تم ہو کیا؟ ارے تم مٹی سے بنے ہو، مٹی میں واپس جاؤ گے، جب یہ بات ہے تو پھر کونسا کام تمہاری شان کے خلاف ہے۔

مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ اور تواضع

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند تھے اور حضرت والد صاحبؒ کے استاد تھے، آج ان کے فتاویٰ ''فتاویٰ دارالعلوم دیوبند'' کے نام سے دس جلدوں میں چھپے ہوئے ہیں، وہ بھی ابھی پورے نہیں چھپے۔ ان کا روزانہ کا معمول تھا کہ جب صبح گھر سے مدرسہ جاتے تو مدرسہ کے آس پاس جو بیواؤں کے گھر تھے، ان سے جا کر پوچھتے کہ بی بی اگر تمہیں بازار سے کچھ سودا منگوانا ہو تو بتا دو، میں لا دیتا ہوں۔ چنانچہ وہ بیوائیں بتا دیتیں کہ فلاں چیز بازار سے لا دیں، چار پانچ بیواؤں کے گھر سے سودا پوچھتے، پھر بازار تشریف لے جاتے اور وہاں سے سودا خریدتے، کسی کے لئے پیاز، کسی کے لئے ٹماٹر، کسی کے لئے آلو، کسی کے لئے بھنڈی، کسی کے لئے لہسن وغیرہ خریدتے اور پھر گھر

گھران کو پہنچاتے۔ بعض اوقات یہ ہوتا کہ کوئی خاتون کہتیں کہ مولوی صاحب! میں نے آپ سے فلاں چیز کہی تھی، آپ فلاں چیز اٹھا لائے، آپ فرماتے کہ اچھا بی بی کوئی بات نہیں، میں بدل کر لے آتا ہوں۔ کوئی خاتون کہتیں کہ میں نے آدھا سیر کہا تھا، آپ تین پاؤ اٹھا لائے، آپ فرماتے کہ اچھا بی بی کوئی بات نہیں، میں ابھی واپس کر آتا ہوں۔ یہ سب کام کرنے کے بعد مدرسہ میں تشریف لے جاتے اور فتوے لکھا کرتے، یہ تھے دارالعلوم دیوبند کے مفتی اعظم۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور تواضع

ہم نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ایسا ہی دیکھا، کبھی اپنی شان بنانے کا تصور ان کے ذہن میں آیا ہی نہیں، عام آدمی کی طرح ہاتھ میں پتیلی لے کر بازار میں دودھ خرید رہے ہیں۔ حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا کہ وہ دکان سے پتیلی میں دودھ خرید کر لے جا رہے ہیں، اگلے دن حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والد صاحبؒ کو بلایا اور ان سے فرمایا کہ مفتی صاحب! اب آپ مفتی دارالعلوم دیوبند ہو گئے ہیں، آپ یہ جو پتیلی لے کر بازار میں دودھ خریدنے کے لئے پھرتے ہیں، یہ اب آپ کے لئے مناسب نہیں، آپ کو تھوڑی سی احتیاط کرنی چاہئے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ تھا کہ اگرچہ خود اپنے دل میں اپنی شان نہ ہو اور وہ کام شان کے خلاف نہ ہو لیکن

بعض اوقات ایسے کام کرنے سے لوگوں کے دلوں میں اعتقاد کی کمی واقع ہو جاتی ہے اور مفتی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کا اعتقاد ہو۔ اس لئے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب آپ یہ کام نہ کیا کریں، لیکن والد صاحب کو ایسے کام کرنے میں کوئی تأمل نہیں تھا، اس لئے کہ اپنے دل میں کبھی اپنی شان بنانے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے اسی حال میں ان کو عزت عطا فرمائی اور بڑوں بڑوں کو ان کے سامنے جھکایا، اسی لباس و پوشاک میں، اسی حلیہ میں، اسی انداز زندگی میں بڑے بڑے وزراء اور امراء سب آ کر پانی بھرتے تھے، یہ عزت اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔

شان بنانے کی فکر مت کرو

میاں! عزت تو اللہ جل جلالہ کی عطا ہے، انسان کو اپنی شان بنانے سے عزت نہیں ملتی، نہ کپڑوں سے عزت ملتی ہے، نہ جوتوں سے عزت ملتی ہے، نہ ٹوپی سے عزت ملتی ہے، نہ لباس پوشاک سے عزت ملتی ہے، نہ ٹھاٹ باٹ سے عزت ملتی ہے، یہ تو اللہ جل جلالہ کی عطا ہے، جب عطا فرمانا چاہتے ہیں تو جھونپڑی میں عطا فرما دیتے ہیں۔ دیکھئے! بڑے بڑے محلات میں رہنے والے، بڑی بڑی کوٹھیوں اور بنگلوں میں رہنے والے، لوگ ان کے بنگلوں اور کوٹھیوں اور ان کی شان و شوکت کو دیکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان پر لعنت بھیجتے ہیں، یہ تو کوئی عزت نہ ہوئی بلکہ یہ تو ذلت ہے۔ بہر حال! کسی عمل کو اپنی شان کے خلاف سمجھ کر نہیں چھوڑنا چاہئے۔

تکبر بہت سے گناہوں کی جڑ ہے

اللہ بچائے، جب ایک مرتبہ دل میں تکبر اور اپنی شان کا تصور پیدا ہو جاتا ہے تو یہ اتنے امراض کی جڑ ہے اور اتنی بیماریوں کا سرچشمہ ہے کہ جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، غصہ اس سے پیدا ہوتا ہے، کینہ اس سے پیدا ہوتا ہے، حسد اس سے پیدا ہوتا ہے، ایذاء رسانی اس سے پیدا ہوتی ہے، ناانصافیاں اس سے پیدا ہوتی ہیں، خدا جانے کتنی بیماریوں کی جڑ یہ تکبر ہے، آدمی اپنے دل میں یہ سمجھتا رہتا ہے کہ میں بڑا ہوں اور حقیقت میں وہ چھوٹا ہوتا ہے۔

ایک خوبصورت دعا

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی کہ:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْراً وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْراً۔

اے اللہ! مجھے اپنی آنکھ میں چھوٹا بنا اور دوسروں کی آنکھ میں بڑا بنا۔ کیا عجیب و غریب دعا تلقین فرمائی کہ میں اپنی آنکھ میں تو چھوٹا رہوں اور اپنے آپ کو میں چھوٹا سمجھوں لیکن لوگوں کی آنکھ میں بڑا رہوں۔ کیوں بڑا رہوں؟ وہی بات جو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی کہ اگر میں لوگوں کی آنکھ میں بڑا نہ ہوں گا تو لوگ مجھے تکلیف پہنچائیں گے اور مجھے پریشان کریں گے اور اگر میں ان کی نظر میں بڑا ہوں گا تو ان کی تکلیف سے اور ان کی ایذاء سے بچا رہوں گا،

اس وجہ سے دوسروں کی نظر میں بڑا بننا مقصود ہے، گویا کہ جلبِ منفعت مقصود نہیں بلکہ دفعِ مضرت مقصود ہے تاکہ میں ان کی ایذاء سے بچا رہوں، لیکن اپنی نظر میں اپنے آپ کو ہمیشہ چھوٹا ہی سمجھتا رہوں۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے یہ چیز ہم سب کو عطا فرمادے۔ آمین۔ جب ایک مرتبہ یہ حقیقت ذہن نشین ہو جاتی ہے کہ ہم کیا اور ہماری شان کیا اور دل میں تواضع آجاتی ہے تو پھر اس کے بعد یہ بیماریاں خود بخود رفع ہو جاتی ہیں۔

تکبر کا بہترین علاج نعمتوں پر شکر

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہٗ نے تکبر کا ایک علاج بیان فرمایا، بڑے کام کا علاج ہے، ہزار مجاہدات ایک طرف اور یہ علاج ایک طرف۔ فرمایا کہ جب کبھی اپنی کسی اچھائی کی طرف دھیان جائے، اپنی جسمانی صحت کی طرف، یا اپنے علم کی طرف، اپنی عبادت کی طرف، اپنے تقویٰ کی طرف، اپنے لباس پوشاک وغیرہ کی طرف دھیان جائے اور یہ خیال ہو کہ یہ بات میرے اندر اچھی ہے تو فوراً اس پر اللہ جل شانہ کا شکر ادا کرو اور شکر کا معنی سمجھ کر شکر ادا کرو۔ شکر کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص نے تم پر کوئی احسان کیا، اس احسان کے اعتراف کا نام "شکر" ہے، اور یہ اس بات کا اعتراف ہے کہ میں اس چیز کا مستحق تو نہیں تھا لیکن آپ نے اپنی شرافت سے اور اپنے احسان سے مجھے یہ چیز عطا فرمائی۔

شکریہ کا مستحق کون؟

مثلاً ایک شخص کا دوسرے کے ذمے قرض تھا، ایک سال سے وہ قرض لئے بیٹھا تھا، سال بھر کے بعد اس نے وہ قرض لاکر واپس کیا، یہ قرض واپس کرکے اس نے کیا کوئی احسان کیا؟ نہیں، بلکہ احسان تو قرض دینے والے نے کیا تھا، جو شخص ایک سال کے بعد قرض واپس کر رہا ہے وہ شکریہ کا مستحق نہیں، کیونکہ وہ تو اپنا فریضہ ادا کر رہا ہے، شکریہ کا مستحق وہ ہوتا ہے جو اپنے فریضے سے آگے بڑھ کر کوئی اچھائی کرے، اب جو شخص ہمارے ساتھ اچھائی کا معاملہ کر رہا ہے اور ہم اس اچھائی کے مستحق اور دعویدار نہیں تھے لیکن اس نے ہمارے ساتھ یہ اچھائی کی تو اب وہ شکریہ کا مستحق ہوگا۔

شکر میں عدم استحقاق کا اعتراف

لہٰذا جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے گا، اس شکر کے اندر یہ اعتراف موجود ہوگا کہ اے اللہ! میں اس نعمت کا مستحق نہیں تھا لیکن اے اللہ! آپ نے مجھے اپنے فضل و کرم سے یہ نعمت عطا فرمائی، اگر میری صحت اچھی ہے تو آپ کا فضل و کرم ہے، میں اس کا مستحق نہیں تھا، اگر میرے پاس کوئی علم ہے تو اے اللہ! آپ کا فضل و کرم ہے، میں تو اپنی ذات میں اس علم کا اہل نہیں تھا، آپ نے اپنے فضل و کرم سے یہ علم مجھے عطا فرمایا ہے، اگر مجھے کسی عبادت کی توفیق ہوئی ہے تو وہ بھی اے اللہ! آپ کا کرم ہے۔

جو کچھ ہوا، ہوا کرم سے تیرے
جو کچھ ہوگا، تیرے کرم سے ہوگا

اور جگر صاحب کا بہت خوبصورت شعر ہے کہ:

میری طلب بھی انہی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں

لہٰذا جو کچھ توفیق ہو رہی ہے، عبادت کی، نماز کی، روزے کی، تراویح کی، تلاوت کی، ذکر کی، تسبیح کی، یہ سب انہی کی طرف سے ہو رہی ہے، کیا تمہارے بس میں تھا کہ یہ عبادات انجام دے لیتے؟ یہ کسی نے توفیق عطا فرمائی ہے تب ہی یہ عبادت ہو رہی ہے۔ لہٰذا کس بات پر ناز کرتے ہو کہ میں نے فلاں کام کرلیا، میں نے فلاں کام کرلیا، ارے تم تو لکھنے والے کے ہاتھ میں قلم کی طرح ہو، لکھ کوئی اور رہا ہے لیکن نسبت قلم کی طرف ہو رہی ہے۔

اداءِ شکر کی کثرت کرو

بہر حال! جو کچھ اعمال کی توفیق ہو رہی ہے وہ اللہ جل جلالہ کی طرف سے ہو رہی ہے:

اَللّٰهُمَّ لولاَ انتَ مَا اهْتَدَينَا وَلَا تصدقنا وَلَا صَلَّيْنَا۔

اے اللہ! اگر آپ کی توفیق نہ ہوتی تو نہ ہم ہدایت پاتے، نہ ہمیں صدقہ کرنے کی توفیق ہوتی، نہ ہمیں نماز پڑھنے کی توفیق ہوتی۔ لہٰذا جب ان کی توفیق سے سب کام ہو رہے ہیں تو میاں یہ مقام تو شکر کا ہے:

اَللّٰھُمَّ لك الحمد ولك الشكر

اسی لئے فرمایا کہ جب کوئی عبادت کرو تو عبادت کے بعد کہو:

الحمد للّٰه ، استغفر اللّٰه

اے اللہ، آپ کا کرم ہے کہ آپ نے یہ عبادت مجھ سے کروادی اور اس عبادت کے اندر مجھ سے جو کوتاہیاں ہوئیں، میں ان پر آپ سے استغفار کرتا ہوں۔

خلاصہ

لہٰذا جب کبھی کسی شخص کو اپنی کسی اچھائی کا خیال آئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اس استحضار کے ساتھ شکر ادا کرے کہ میرے بس میں نہیں تھا، جو کچھ اچھائی ہے، ان کی عطاء ہے۔ جب ان کی عطاء ہے تو پھر نہ تو ہمارے اترانے کا کوئی موقع ہے اور نہ اکڑنے کا اور ناز کرنے کا کوئی موقع ہے، سب کچھ ان کی عطاء اور ان کا فضل و کرم ہے، جب چاہیں وہ یہ اچھائی چھین لیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو اس تکبر کے عذاب سے نجات عطاء فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۷۶

گناہوں کا علاج: توبہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵
مجلس نمبر : ۷۶

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ط

گناہوں کا علاج: توبہ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَ نَسۡتَعِیۡنُـہٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُہٗ وَ نُؤۡمِنُ بِـہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ یَّهۡدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَـہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلاَ هَادِیَ لَـہٗ وَأَشۡهَدُاَنۡ لَّا اِلٰـہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَاشَرِیۡكَ لَـہٗ وَأَشۡهَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّـنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُہٗ وَ رَسُوۡلُـہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِـہٖ وَاَصۡحَابِـہٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِیۡمًا کَثِیۡرًا ۔ أَمَّا بَعۡدُ!

روزے کا مقصد تقویٰ کا حصول

اس کتاب ''انفاس عیسیٰ'' میں آگے توبہ کا بیان ہے۔ توبہ سے متعلق بہت سی باتیں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں بیان فرمائی ہیں جو بڑے

فائدے کی ہیں۔ یہ بیان ہمارے مناسبِ حال بھی ہے، کیونکہ یہ رمضان المبارک کا مہینہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کا مہینہ ہے اور اس مہینے کا صحیح فائدہ یہ ہے کہ اس ماہ مبارک میں انسان اپنے تمام پچھلے گناہوں سے تائب ہو جائے اور آئندہ کے لئے اپنی زندگی کو اللہ جلّ جلالہ کے احکام کے مطابق بنانے کا عزم تازہ کرے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يَـٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔

(سورۃ البقرہ: آیت ۱۸۳)

یعنی اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ پچھلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تمہیں تقویٰ حاصل ہو۔ پورے مہینے بھر کی جو ریاضت اور کورس ہے، اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اپنے دل میں تقویٰ پیدا کیا جائے اور تقویٰ پیدا کرنے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے دل میں یہ فکر پیدا ہو جائے کہ ماضی میں مجھ سے جو کچھ ہوا، اس سے توبہ کرلوں اور آئندہ کے لئے اس بات کا عزم کرے کہ آئندہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزاروں گا۔ اس لئے یہ توبہ کا بیان ہمارے مناسب حال ہے اور توبہ کی بہت سی جزئیات حضرت والا نے یہاں بیان فرمائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی ''توبہ''

توبہ اصلاحِ نفس کی پہلی سیڑھی ہے، مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی

اصلاح کے لئے قدم اٹھائے تو سب سے پہلے اس کا کام یہ ہے کہ وہ ''توبہ'' کی تکمیل کرے، یعنی گزشتہ زمانے میں جو گناہ اور غلطیاں اس سے سرزد ہوئیں، ان سب سے اللہ تعالیٰ کے حضور استغفار کرے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ''احیاء العلوم'' میں توبہ کا بیان شروع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اوّل اقدام المریدین التوبة'' یعنی وہ مریدین جو اپنی اصلاح نفس کا ارادہ لے کر کسی شیخ کے پاس جائیں تو ان کا سب سے پہلا کام ''تکمیل توبہ'' ہے۔ اسی لئے بزرگوں کا طریقہ یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ تعالیٰ اپنی اصلاح کی فکر عطاء فرماتے ہیں اور وہ شخص اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو اس کو سب سے پہلا کام جو تلقین کیا جاتا ہے، وہ ''تکمیل توبہ'' ہے۔ یعنی پہلے اپنے تمام سابقہ گناہوں سے سچی توبہ کرلے اور اپنے آپ کو ان گناہوں اور نجاستوں سے دھولے جن کے اندر ماضی کے ایام گزرے ہیں، جب توبہ کر کے نئی زندگی شروع کرلے گا تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت متوجہ ہوگی، اس لئے توبہ کی بڑی اہمیت ہے اور اصلاحِ نفس کی طرف جانے والی سب سے پہلی سیڑھی ہے۔

توبہ اجمالی

پھر توبہ کی دو قسمیں ہیں: ایک اجمالی توبہ اور ایک تفصیلی توبہ۔ اجمالی توبہ یہ ہے کہ اب تک جتنے گناہ ہو چکے ہیں، ایک مرتبہ بیٹھ کر ان سب سے یکبارگی اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرلے اور توبہ کرنے سے پہلے دو رکعت ''صلوٰۃ التوبہ'' کی نیت سے پڑھے اور اس کے بعد یہ کہے کہ اے اللہ! اب تک مجھ سے جتنے

گناہ ہوئے ہیں، جتنی غلطیاں ہوئی ہیں اور جتنی کوتاہیاں ہوئی ہیں، اے اللہ! میں ان سب سے معافی مانگتا ہوں اور توبہ استغفار کرتا ہوں اور پکا ارادہ کرتا ہوں کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا، یہ ہے "توبہ اجمالی" جو سب سے پہلا کام ہے۔

توبہ تفصیلی

اس کے بعد دوسرے نمبر پر "توبہ تفصیلی" ہے۔ توبہ تفصیلی یہ ہے کہ جتنے گناہ ہوئے ہیں، ان میں سے جن گناہوں کی تلافی ممکن ہے، ان گناہوں کی تلافی کی جائے۔

تلافی ممکن ہو تو تلافی کرنی ہوگی

توبہ کا قاعدہ یہ ہے کہ جس گناہ کی معافی مانگ رہے ہو، اگر اس کی کوئی تلافی ممکن ہے تو وہ تلافی کرنی ہوگی، مثلاً کسی دوسرے شخص کے پیسے کھا لئے اور اب بیٹھ کر توبہ کر رہا ہے کہ یا اللہ! مجھے معاف کر دے، یہ توبہ قبول نہیں ہوگی، اس لئے کہ جس شخص کے پیسے کھائے ہیں، جب تک اس کے پیسے نہیں لوٹاؤ گے یا جب تک اس سے معاف نہیں کراؤ گے، اس وقت تک توبہ قبول نہیں ہوگی، کیونکہ یہاں پر تلافی ممکن ہے۔ یا مثلاً کسی کا دل دکھایا یا کسی کو تکلیف پہنچائی، اس کی تلافی ممکن ہے، وہ یہ کہ اس سے جا کر معافی مانگ لو۔

یہی قاعدہ حقوق اللہ سے توبہ کرنے کے بارے میں بھی ہے، مثلاً آپ نے زکوٰۃ ادا نہیں کی، چونکہ اس کی تلافی کرنی ممکن ہے، اس لئے زکوٰۃ ادا کرنی

ہوگی، لہٰذا توبہ کے ساتھ تلافی بھی کرو۔ اسی طرح اگر نمازیں رہ گئی ہیں یا روزے رہ گئے ہیں تو پہلے ان کی تلافی کرواور پھر معافی مانگو۔

قضاءِ عمری کا حکم

آج کل یہ مسئلہ بہت زور وشور سے پھیلایا جارہا ہے کہ قضاء عمری کوئی چیز نہیں، دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ”الاسلام یجبّ ماکان قبلہ“ یعنی اگر کوئی شخص نیا مسلمان ہو تو اسلام لانے سے پہلے جو اس نے گناہ کئے تھے، اسلام لانے سے وہ سب ختم ہو جاتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص ستر سال کی عمر میں اسلام لایا تو اب اسلام لانے کے بعد گزشتہ ستر سال کی نمازیں قضاء کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جب وہ آج اسلام لایا تو اب آج ہی سے نمازیں شروع کردے۔

توبہ کو اسلام لانے پر قیاس کرنا

بعض لوگوں نے اسلام لانے پر ”توبہ“ کرنے کو بھی قیاس کرلیا، وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ساری عمر نمازیں نہیں پڑھیں، اب توبہ کرلی تو اب گزشتہ زمانے کی نمازیں قضاء کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ بات درست نہیں، اس لئے کہ توبہ کو اسلام پر قیاس کرنا درست نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شخص ابھی مسلمان ہوا ہے، وہ جب کافر تھا تو اس کفر کے زمانے میں وہ فروع کا مخاطب ہی نہیں تھا، اس کو تو یہ حکم تھا کہ پہلے اسلام لا، اس زمانے میں اس پر نماز فرض نہیں تھی، کیونکہ نماز تو اس وقت فرض ہوگی جب

وہ مسلمان ہوگا، اس لئے گزشتہ زمانے کی نمازیں اس پر قضاء کرنی ضروری نہیں۔

بخلاف مسلمان کے، اس پر تو بالغ ہوتے ہی نماز فرض ہوگئی اور جب اس نے وہ نمازیں نہیں پڑھیں تو وہ اس کے ذمے پر باقی رہیں، ایک عرصہ دراز کے بعد جب اس نے نماز چھوڑنے کے گناہ سے توبہ کی تو توبہ کا اصول یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کی ہے، اگر اس کی تلافی ممکن ہے تو تلافی کئے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی، لہٰذا اس کے ذمے ان نمازوں کی قضاء ضروری ہوگی۔ اسی طرح اگر روزے چھوڑے ہیں تو ان روزوں کی قضاء کرنی ہوگی، کیونکہ روزے اس کے ذمے باقی ہیں۔

توبہ سے نمازیں معاف نہیں ہونگی

ورنہ اس کی تو کوئی معقول وجہ نہیں کہ ایک شخص تو اسّی سال تک مسلسل نماز پڑھتا رہے اور دوسرا شخص اسّی سال تک نماز نہ پڑھے اور پھر آخر میں اللہ تعالیٰ سے توبہ استغفار کرلے کہ یا اللہ! میں توبہ استغفار کرتا ہوں اور اس توبہ کے نتیجے میں اس کی ساری نمازیں معاف ہو جائیں، یہ تو کوئی معقول بات نہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ایک دن کی نمازیں قضاء ہو جائیں تو ان کو قضاء کرلو اور پڑھ لو لیکن اگر ایک دن سے زیادہ کی نمازیں قضاء ہو جائیں تو ان کو قضاء کرنے کی ضرورت نہیں، صرف توبہ کرلو۔ یہ عجیب مسئلہ اپنی طرف سے بنالیا ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کے ہاتھ میں بڑا اچھا نسخہ آ گیا کہ جب نمازیں قضاء ہو جائیں تو ان کو ایک دن سے زیادہ کرلو اور اس کے بعد توبہ کرلو، یہ سب

فضول باتیں ہیں، کیونکہ توبہ کا اصول یہ ہے کہ جس کی تلافی ممکن ہے، اس کی تلافی کئے بغیر توبہ قبول نہیں ہوتی۔

شراب سے توبہ

مثلاً ایک شخص بہت عرصے تک شراب پیتا رہا، اب توبہ کرنے کی توفیق ہوئی تو بس توبہ کرلینا کافی ہے، کیونکہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، تلافی کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمالیں گے۔

چوری سے توبہ

یا مثلاً کسی شخص نے کچھ پیسے چوری کئے اور کھالئے، بعد میں توبہ کی توفیق ہوئی تو اس کی تلافی ممکن ہے، وہ اس طرح کہ جس کے پیسے چوری کئے تھے، اس کو پیسے واپس کرے یا اس سے معاف کرائے، اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ نہ دینے سے توبہ

یا مثلاً گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کی، اب توبہ کی توفیق ہوئی تو جب تک گزشتہ سالوں کی زکوٰۃ ادا نہیں کرے گا، اس وقت تک توبہ قبول نہیں ہوگی، یہی معاملہ نمازوں کا اور روزوں کا ہے کہ جب تک ان کو ادا نہیں کرے گا، صرف توبہ کرلینے سے معاف نہیں ہوں گے۔

نمازیں ادا کرے اور وصیّت بھی کرے

بہرحال! توبہ تفصیلی یہ ہے کہ انسان اپنی گزشتہ زندگی کا جائزہ لے کر دیکھے کہ میرے ذمے اللہ تعالیٰ کے یا بندوں کے حقوق کچھ واجب ہیں یا نہیں؟ حقوق اللہ میں نماز کو دیکھے کہ میرے ذمے کتنی نمازیں باقی ہیں، ان کو قضاء کرنے کی فکر کرے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مستقل کاپی بنائے، اس کاپی کے اندر یہ لکھے کہ میرے ذمے اتنی نمازیں باقی ہیں، اگر پوری طرح یاد نہ ہوں تو ایک احتیاطی تخمینہ لگا کر ان کی تعداد لکھے اور یہ لکھے کہ میں آج فلاں تاریخ سے ان نمازوں کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں اور ہر نماز کے ساتھ ایک سابقہ نماز کی قضاء کروں گا اور جتنی نمازیں ادا کرلوں گا وہ اس کاپی کے اندر درج کردوں گا، اگر میں ان نمازوں کو قضاء کئے بغیر مرجاؤں تو میں اپنے ورثاء کو وصیّت کرتا ہوں کہ میرے مال سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کردیں۔

بلا وصیّت فدیہ ادا کرنا واجب نہیں

اگر کوئی شخص اس طرح وصیّت نہیں کرے گا تو پھر اگرچہ یہ شخص لاکھوں روپے ترکہ میں چھوڑ کر چلا جائے، پھر بھی وارثوں کے ذمے نمازوں کا فدیہ ادا کرنا واجب نہیں ہوگا، وارثوں پر نماز روزوں کا فدیہ ادا کرنا اس وقت واجب ہوتا ہے جب مرنے والا وصیّت کر جائے، اور یہ واجب بھی کل مال کے ایک تہائی کی حد تک واجب ہوگا، ایک تہائی سے زیادہ میں وصیّت نافذ نہیں ہوگی۔

زکوٰۃ روزے ادا کرے اور وصیت کرے

یہی معاملہ روزوں کا ہے۔ اب تک زندگی میں جتنے روزے چھوڑے ہیں، ان کو کاپی کے اندر لکھ لے، اگر یقینی تعداد یاد نہ ہو تو اندازے سے ایک احتیاطی تعداد لکھ لے، پھر ان کو ادا کرنا شروع کرے اور کاپی میں لکھتا رہے کہ میں نے اتنے روزے ادا کر لئے اور اس کاپی میں یہ وصیت بھی لکھے کہ اگر اس دوران میرا انتقال ہو جائے تو میرے ترکہ میں سے بقیہ روزوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے۔ اسی طرح زکوٰۃ کا حساب کرے کہ گزشتہ سالوں میں میرے اوپر کتنی زکوٰۃ فرض ہوئی جو میں نے اب تک ادا نہیں کی، پھر اس کو کاپی کے اندر درج کرے اور اس کو ادا کرنا شروع کرے اور کاپی میں لکھتا رہے، اور یہ وصیت بھی لکھدے کہ اگر اس دوران میرا انتقال ہو جائے تو بقیہ زکوٰۃ میرے مال میں سے ادا کر دی جائے، یہ توبہ تفصیلی ہے۔ بہر حال! اصلاح نفس کے لئے جب کوئی شخص کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو اس سے یہ دونوں کام کرائے جاتے ہیں، ایک توبہ اجمالی اور ایک توبہ تفصیلی۔ توبہ کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بہت سی جزئیات یہاں بیان فرمائی ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

گناہ نہ کرنے کا عزم دھرارہ جاتا ہے

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ
ہر ہفتہ توبہ کرتا ہوں لیکن بعد ایک روز کے تمام تہیہ

وغیرہ غارت ہو جاتا ہے۔ (انفاس عیسیٰ ۱۹۴)

یہ وہ حالت ہے جو تقریباً ہر ایک کو زندگی میں پیش آتی ہے کہ توبہ کر لی اور ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ کے حضور اپنے تمام پچھلے گناہوں سے معافی مانگ لی اور تہیہ اور عزم بھی کر لیا کہ آئندہ گناہ نہیں کریں گے، لیکن اگلے دن ہی وہ سب تہیہ اور عزم غارت ہو جاتا ہے، یعنی جس وقت گناہ نہ کرنے کا عزم کیا تھا، اس وقت تو بڑا پکا عزم اور ارادہ تھا کہ آئندہ یہ گناہ نہیں کریں گے، لیکن جب کچھ وقت گزرتا ہے اور حالات اور واقعات سامنے آتے ہیں تو وہ سارا عزم دھرا رہ جاتا ہے اور آدمی دوبارہ اس گناہ کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے، اکثر و بیشتر یہ حالت ہر ایک کو پیش آتی ہے۔

توبہ کی پہلی شرط: گناہ پر ندامت

بلکہ ایک بات اور عرض کر دوں، وہ یہ کہ پہلے تو آدمی کو اس بات میں شبہ رہتا ہے کہ میری توبہ سچی ہوئی یا نہیں، اس لئے کہ توبہ کے لئے تین شرائط ہیں۔ جب یہ تین شرائط پائی جائیں تب توبہ سچی ہوتی ہے، پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کو پچھلے تمام گناہوں پر دل میں ندامت ہو، شرمندگی ہو اور اس گناہ کا اقرار اور اعتراف ہو، اگر اقرار اور اعتراف نہیں ہے اور گناہ پر ندامت اور پشیمانی نہیں ہے بلکہ سینہ زوری ہے تو پھر توبہ کہاں ہوئی۔ لہٰذا یہ بات کہ انسان گناہ کو گناہ ہی نہ سمجھے، یہ بڑی خطرناک بات ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ لہٰذا توبہ کی پہلی شرط ندامت ہے کہ یا اللہ! مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی، میں اقراری مجرم ہوں، مجھے معاف فرما دے۔

توبہ کی دوسری شرط: گناہ کا ترک

توبہ کی دوسری شرط جس کے بغیر توبہ کامل نہیں ہوتی، وہ یہ ہے کہ فوراً اس گناہ کو چھوڑ دے، اس کے بغیر توبہ نہیں ہوسکتی، یہ تو نہیں ہوسکتا کہ انسان ایک طرف توبہ کر رہا ہے اور دوسری طرف اس گناہ کو بھی کر رہا ہے، یہ تو کوئی توبہ نہ ہوئی۔

توبہ کی تیسری شرط: گناہ نہ کرنے کا عزم

تیسری شرط یہ ہے کہ آئندہ کے لئے دل میں یہ عزم اور ارادہ کر لے کہ میں آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا اور اس کے پاس نہیں پھٹکوں گا۔ بہرحال! توبہ کی یہ تین شرائط ہیں جن کے بغیر توبہ مکمل نہیں ہوتی۔

عزم نہ ہونے کا شبہ

جہاں تک پہلی شرط کا تعلق ہے کہ گناہ پر ندامت اور شرمندگی ہو، اکثر صاحبِ ایمان کو یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔ اور دوسری شرط یعنی گناہ کو چھوڑ دینا، اس پر بھی عام طور پر عمل ہو جاتا ہے۔ البتہ تیسری شرط کہ یہ عزم کرنا کہ آئندہ کبھی اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، اس شرط کے پورا ہونے میں اکثر شبہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں پکا ارادہ ہوا یا نہیں، کیونکہ توبہ کرتے وقت دل میں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ توبہ تو کر رہا ہوں لیکن میں کتنا اس توبہ پر قائم رہوں گا اور کتنا میں اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا سکوں گا، اس بارے میں دل میں شبہ رہتا

ہے، اس شبہ کی موجودگی میں عزم مکمل ہوا یا نہیں، اور جب عزم مکمل ہونے میں شبہ ہے تو توبہ مکمل ہونے میں بھی شبہ ہوا، کیونکہ عزم کے بغیر توبہ مکمل نہیں ہوتی، اس وجہ سے آدمی پریشانی کا شکار رہتا ہے۔

دھڑکا لگا رہنا توبہ کے منافی نہیں

غور سے سمجھ لیجئے کہ توبہ کے پکا اور سچا ہونے کے لئے عزم بیشک ضروری ہے، لیکن اگر دل میں ساتھ ساتھ یہ دھڑکہ لگا ہوا ہے کہ میں عزم تو کر رہا ہوں مگر پتہ نہیں میں آئندہ اس عزم پر قائم رہوں گا یا نہیں، اپنے نفس پر بھروسہ نہیں ہے، تو محض یہ دھڑکہ لگا رہنا توبہ کی تکمیل کے منافی نہیں، جب پکا ارادہ کرلیا تو دھڑکے کے باوجود وہ ارادہ پکا ہی رہے گا اور اس کی وجہ سے توبہ میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا انشاء اللہ۔

دھڑکے کی ایک مثال

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے آپ نے ایک عمارت تعمیر کی اور اپنی طرف سے اس کو پختہ بنایا، ستون پختہ بنائے، بیم پختہ بنائے، لوہا اور سمینٹ مناسب لگایا، لیکن ساتھ میں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ اگر کسی دن زلزلہ آیا تو عمارت گر جائے گی، یا کسی وقت اس کے اوپر بم گر گیا تو یہ عمارت گر جائے گی، اب زلزلہ کا بھی اندیشہ ہے، بم گرنے کا بھی اندیشہ ہے اور کوئی حادثہ پیش آجانے کا بھی اندیشہ ہے لیکن ان اندیشوں کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ عمارت پکی نہیں بنی، بلکہ عمارت تو پکی ہے، البتہ اندیشے اپنی جگہ ہیں، ان

اندیشوں کے لئے کوئی اور تدبیر اور سدِّ باب سوچو لیکن اس کی وجہ سے عمارت کو کمزور نہیں کہا جائے گا۔

آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم توبہ کیلئے کافی ہے

یہ بات میں اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں اور نہ مجھے یہ بات کہنے کی جرأت ہوتی، بلکہ یہ بات میں نے اپنے ایک بزرگ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنی ہے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجاز صحبت تھے اور بڑے عجیب وغریب صاحبِ کشف وکرامت بزرگ تھے، وہ اپنی ہر مجلس میں اس بات پر بہت زور دیا کرتے تھے کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ دین پر چلنا بڑا مشکل ہے، ارے میاں! روزانہ توبہ کرلیا کرو۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ یہ فرماتے ہیں کہ توبہ کرلیا کرو، ہمیں تو اسی میں شک رہتا ہے کہ پکی توبہ ہوئی یا نہیں؟ کیونکہ یہ پتہ نہیں چلتا کہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم پکا ہوا یا نہیں؟ اس وقت انہوں نے یہ بات ارشاد فرمائی کہ اپنی طرف سے تو گناہ نہ کرنے کا عزم کرلو، پھر یہ جو گناہ ہو جانے کا اندیشہ اور دھڑکا لگا ہوا ہے، یہ توبہ کے منافی نہیں۔ بعد میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات میں کئی مقامات پر یہ مضمون نظر سے گزرا، حضرت والا نے اس کی تصریح فرمائی ہے کہ یہ اندیشہ توبہ کے منافی نہیں، اس لئے جب ایک مرتبہ اپنی طرف سے پکا ارادہ کرلیا کہ انشاء اللہ یہ کام نہیں کروں گا تو بس توبہ ہوگئی۔

توبہ کے نتیجے میں گناہ نامہ اعمال سے مٹا دیئے جاتے ہیں

اور توبہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جس وقت تم نے یہ توبہ کرلی، اس وقت

تک تمہارے جتنے گناہ تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مٹا دیے۔ اس بارگاہ کا کرم دیکھئے کہ توبہ کے معنی صرف یہ نہیں ہیں کہ وہ گناہ معاف کر دیے اور معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ تمہارے نامہ اعمال میں درج تو ہیں لیکن اس پر تمہیں سزا نہیں دیں گے، بلکہ توبہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ تمہارے نامہ اعمال سے بھی مٹا دیے جائیں گے، اب وہ گناہ تمہارے نامہ اعمال میں لکھے ہوئے نہیں ہوں گے تاکہ آخرت میں ان گناہوں کو دیکھ کر شرمندگی بھی نہ ہو کہ میں نے فلاں کام کیا تھا۔

آج کل حساب کا جو طریقہ ہے، اس میں تین کالم ہوتے ہیں، ایک ڈیبٹ کا، ایک کریڈٹ کا، ایک بیلنس کا، یعنی یہ آمدنی ہوئی اور یہ خرچ ہوا اور یہ بیلنس ہوا، لہٰذا جتنے پیسے کسی کو دیے ہیں وہ بھی حساب میں لکھے ہوئے ہیں اور جتنے پیسے کسی سے لئے ہیں وہ بھی حساب میں لکھے ہوئے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے یہاں حساب اس طرح ہے کہ وہاں ڈیبٹ کوئی نہیں، کیونکہ جب تم نے توبہ کرلی اور اللہ تعالیٰ سے صدق دل کے ساتھ معافی مانگ لی تو اب تمہارے ڈیبٹ کے خانے میں کچھ بھی لکھا ہوا نہیں ہوگا بلکہ جو کچھ لکھا ہوگا وہ کریڈٹ کے خانے میں ہوگا اور اس پر تمہیں انشاء اللہ ثواب ملے گا۔

”سَتَّار“ ستاری کا معاملہ فرمائیں گے

بخاری شریف میں حدیث ہے کہ ایک بندے کو اللہ تعالیٰ بلائیں گے اور سرگوشی کے انداز میں اس سے کہیں گے کہ بتا تو نے دنیا میں یہ گناہ کیا تھا؟ وہ

کہے گا جی ہاں! کیا تھا، فلاں گناہ کیا تھا؟ وہ کہے گا کیا تھا، فلاں گناہ کیا تھا؟ جی ہاں! کیا تھا۔ گناہ شمار کرانے اور اقرار لینے کے بعد پھر اس بندے سے فرمائیں گے کہ میں نے دنیا میں تیری ستاری کی، تیری پردہ پوشی کی اور کسی کو ان گناہوں کے بارے میں پتہ بھی نہیں چلا، ان گناہوں کو یا میں جانتا ہوں یا تو جانتا ہے، آج میں تیرے ان گناہوں کو معاف کرتا ہوں۔ لہٰذا وہاں آخرت میں بھی کسی دوسرے کو وہ گناہ نہیں دکھائیں گے، اللہ تعالیٰ ایسی ستاری فرمائیں گے۔ بہرحال! اگر ایک مرتبہ توبہ پکی ہوگئی تو انشاء اللہ وہ گناہ معاف ہوگئے اور نامہ اعمال سے مٹا دیے گئے۔

اللہ تعالیٰ سے ہی توبہ پر استقامت طلب کرو

اب اگر اس بات کا دھڑکہ لگا ہوا ہے کہ کہیں یہ گناہ دوبارہ ہم سے سرزد نہ ہو جائے تو یہ دھڑکہ لگا کرے اور اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! میں نے توبہ کرلی، لیکن اے اللہ! جب تک آپ کی توفیق نہیں ہوگی، میں اپنے قوت بازو سے اس توبہ پر قائم نہیں رہ سکتا، آپ اپنے فضل و کرم سے مجھے اس پر استقامت عطا فرمائیے۔

اے اللہ: ہمارے اعضاء آپ کے قبضہ قدرت میں ہیں

ایک دعا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَا صِیَنَا وَجَوَا رِحَنَا بِیَدِكَ

لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَيْئًا فَإِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ بِنَا فَكُنْ اَنْتَ وَلِيَّنَا وَاهْدِنَا اِلٰى سَوَاءِ السَّبِيْلِ۔

اے اللہ! ہمارے دل، ہماری پیشانیاں اور ہمارے اعضاء وجوارح، یہ سب آپ کے قبضہ قدرت میں ہیں، ان میں سے کسی چیز کا آپ نے ہمیں مالک نہیں بنایا، نہ ہم اپنے دل کے مالک ہیں، نہ اپنی زبان کے مالک ہیں اور نہ اعضاء کے مالک ہیں، لہٰذا جب یہ سب اعضاء آپ کے قبضہ قدرت میں ہیں تو اے اللہ! آپ ہی ہمارے کارساز بن جایئے اور ہمیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرمایئے۔

اے اللہ! وہ چیز عطا فرما جو آپ کو راضی کردے

یہ بھی اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ! ہم نے توبہ تو کرلی لیکن یہ دل، یہ دماغ، یہ زبان، یہ ہاتھ، یہ پاؤں اور یہ اعضاء و جوارح سب آپ کے قبضہ قدرت میں ہیں، اے اللہ! اب آپ ہی ان کو ثابت قدم رکھئے، ہمارے بس میں نہیں اور یہ دعا کریں کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ سَأَلْتَنَا مِنْ اَنْفُسِنَا مَالَا نَمْلِكُهُ اِلَّا بِكَ فَاَعْطِنَا مِنْهَا مَايُرْضِيْكَ عَنَّا۔

اے اللہ! آپ نے ہم سے ایسی ایسی چیزوں کا مطالبہ فرمایا ہے جس کو پورا کرنے کی ہمارے اندر طاقت نہیں جب تک کہ آپ کی توفیق نہ ہو، لہٰذا اے اللہ! ہمیں وہ چیزیں عطا فرما جو آپ کو ہم سے راضی کردیں۔ اس لئے اپنی توبہ

پکّی کرلو اور جو دھڑکا لگا ہوا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کردو اور یہ کہو اے اللہ! آپ ہی اس توبہ پر ثابت قدم رکھئے۔

پختہ کار بننے کیلئے لمبا سفر درکار ہے

دوسرا مسئلہ وہ ہے جو ان صاحب نے حضرت والا سے پوچھا کہ ہر ہفتہ توبہ کرتا ہوں اور ایک دن کے بعد تمام تہیّہ غارت ہو جاتا ہے، ایک دن توبہ کی، دوسرے دن پھر گناہ میں مبتلا ہو گیا۔ یہ معاملہ بکثرت ہم سب کو پیش آتا رہتا ہے۔ حضرت والا نے ان صاحب کے جواب میں پہلے تین شعر لکھے۔

صوفی نہ شود صافی تادُر نہ کشد جامی

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامی

یہ مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے، یعنی کوئی صوفی صحیح معنوں میں صوفی نہیں ہوسکتا جب تک وہ پانی کے ساتھ تلچھٹ بھی نہ پیئے، جب صوفی پانی کے ساتھ تلچھٹ پینا گوارہ کرلیتا ہے تو بالآخر اللہ تعالیٰ اس کو صاف کر دیتے ہیں، اور انسان کے اندر جو خامی ہے اس کو دور ہونے میں اور انسان کو پختہ کار بننے میں ایک دن ایک رات کافی نہیں بلکہ اس کے لئے لمبا سفر چاہئے۔

مرتے دم تک فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا

دوسرا شعر، حضرت والا نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا نقل فرمایا کہ:

اندریں رہ می تراش و می خراش

تادمِ آخر دے فارغ مباش

یعنی اس راستے میں ہر وقت تراش وخراش کرنی پڑتی ہے اور مرتے دم تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہوکر نہیں بیٹھنا۔ یعنی یہ نہیں کہ آدمی مطمئن ہوکر بیٹھ جائے کہ اب ہماری اصلاح ہوگئی، یہ نفس جو تمہارے ساتھ لگا ہوا ہے، یہ کسی وقت بھی تمہیں ڈس جائے گا، لہٰذا کسی وقت بھی بے فکر ہوکر نہیں بیٹھنا۔ جیسے آپ نے پھلواری لگائی تو اب اس پھلواری کو قاعدے میں رکھنے کے لئے کٹائی چھٹائی کی ضرورت ہر وقت لگی رہے گی، کبھی ایک پتہ کاٹ دیا، کبھی ٹہنی کاٹ دی، کبھی پھول کاٹ دیا، اگر اس پھلواری کو ویسے ہی چھوڑ دو گے تو وہ جھاڑ جھنکار بن جائے گا۔ اسی طرح انسان کو اپنے نفس کی تراش خراش کرنی پڑتی ہے اور اس کی ہر وقت نگرانی کرنی پڑتی ہے، ایک لمحہ کے لئے بھی فارغ ہوکر نہیں بیٹھنا چاہیئے۔

آخر کار عنایت ہو ہی جاتی ہے

تیسرا شعر یہ لکھا کہ:

تادمِ آخر دمے آخر بود

کہ عنایت باتو صاحب سربود

یعنی اگر اللہ تعالیٰ آخر دم تک اپنی طرف رجوع کی توفیق عطا فرمادیں تو پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عنایت ہو ہی جاتی ہے۔

جب توبہ ٹوٹے دوبارہ عزم کرلو

یہ تین شعر لکھنے کے بعد حضرت والا نے یہ جملہ لکھا کہ:

حاصل یہ کہ فکر و کوشش جاری رکھنا چاہئے، انشاء اللہ تعالیٰ اسی طرح کامیابی ہو جائے گی۔ (ایضاً)

یعنی اس گُر کو پلّے باندھ لو، وہ یہ کہ جو بار بار توبہ ٹوٹ رہی ہے، اس سے مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا ہے، بلکہ اس کا مقابلہ اس طرح کرنا ہے کہ جب توبہ ٹوٹے پھر دوبارہ پختہ عزم کرو، پھر توبہ ٹوٹے پھر دوبارہ پختہ عزم کرلو، یہ فکر اور کوشش آخر وقت تک جاری رہنی چاہئے، مایوس ہو کر نہیں بیٹھنا چاہیئے کہ یہ میری توبہ بار بار ٹوٹ رہی ہے، لہٰذا توبہ کرنے کو چھوڑو، یہ مایوسی ٹھیک نہیں بلکہ پہلے سے زیادہ پختہ عزم کرو۔

انسان کے ارادے میں بڑی قوت ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ارادے میں بڑی قوت دی ہے، انسان نے اپنے ارادے کی طاقت سے بڑے بڑے پہاڑ سر کر لئے ہیں، ارادے کی طاقت سے چاند پر پہنچ گیا اور مریخ پر پہنچ گیا، ایٹم بنالیا، ہائیڈروجن بم بنالیا، اسی ہمت کی طاقت سے یہ سب کام کر لئے، اس ہمت کی طاقت کو نفس و شیطان کا مقابلہ کرنے کے لئے استعمال کرو، گناہ سے بچنے کے لئے اس کو استعمال کرو، اگر ایک مرتبہ گر گئے تو پھر دوبارہ تازہ دم ہو کر اٹھو اور اپنے عزم کو

تازہ کرو کہ میں پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ اس گناہ کا مقابلہ کروں گا۔

اگر ہتھیار ڈالدیے تو مارا گیا

ابتداء میں کشمکش ہوتی ہے، جب انسان قرآن و حدیث سنتا ہے یا بزرگوں کی باتیں سنتا ہے تو دل میں خیال آتا ہے کہ گناہوں کو چھوڑنا چاہئے اور صحیح راستے پر آنا چاہئے، لیکن نفس جو گناہ کا عادی بنا ہوا ہے وہ دوسری طرف لے جانا چاہتا ہے، اب نیکی کے تقاضے اور بُرائی کے تقاضے میں کشتی ہوتی ہے، نفس چونکہ موٹا ہے اور اس کے اندر گناہ کرنے کی طاقت موجود ہے جبکہ نیکی کے تقاضے کے اندر ابھی اتنی طاقت پیدا نہیں ہوئی، اس لئے جب دونوں کے درمیان کشتی ہوتی ہے تو یہ نفس نیکی کے تقاضے کو گرا دیتا ہے، اب اگر نیکی کے تقاضے نے اس نفس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے کہ اس نفس نے مجھے ڈھا دیا، اب اس نفس سے مقابلہ کرنا بیکار ہے تو یہ نیکی کا تقاضہ مارا گیا۔

پھر ہمیشہ نفس گرتا رہے گا

لیکن اگر نیکی کے تقاضے کو یہ سمجھایا کہ تو جتنی مرتبہ پٹے گا، اتنی مرتبہ تیرے اندر مزید قوت پیدا ہوگی۔ تو اب وہ نیکی کا تقاضہ نئی طاقت کے ساتھ، نئے عزم اور نئے حوصلے کے ساتھ اٹھے گا، اب جب دوبارہ نفس سے مقابلہ ہوگا تو یہ نیکی کا تقاضہ کچھ دیر اسکے مقابلے میں ڈٹا رہے گا، یہ نہیں ہوگا کہ پہلے ہی داؤ میں گر جائے بلکہ پہلی مرتبہ کی بنسبت مقابلہ بہتر ہوگا، البتہ پھر دوبارہ گر جائے گا، پھر اس گرنے کے نتیجے میں دوبارہ اسکے اندر مزید طاقت اور قوت پیدا

ہوگی، اب تیسری مرتبہ جب مقابلہ ہوگا تو یہ نفس کا ڈٹ کر برابر کا مقابلہ کرے گا، اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نیکی کا تقاضہ نفس کو بھی چت کر دے گا۔ زندگی بھر یہ ہوتا رہے گا کہ کبھی اس نے گرا دیا اور کبھی اس نے گرا دیا، کبھی یہ غالب آ گیا اور کبھی وہ غالب آ گیا، جب بار بار مقابلہ ہوتا رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے اندر اتنی طاقت عطا فرما دیں گے کہ پھر ہمیشہ نیکی کا تقاضہ نفس کو گرائے گا اور نفس ہمیشہ گرتا رہے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

مرتے دم تک نفس سے ہوشیار رہنا ہے

لیکن قاعدہ یہ ہے کہ بڑے سے بڑا پہلوان بھی غافل ہو کر نہیں بیٹھتا کہ اب چونکہ میں بہت بڑا پہلوان ہو گیا ہوں، لہٰذا اب مجھے کسرت کی اور مشق کرنے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اس کو بھی روزانہ کسرت کرنی ہے اور روزانہ بادام کھانے ہیں اور روزانہ اپنی غذا کا اہتمام کرنا ہے، اگر اس نے یہ چیزیں چھوڑ دیں تو وہ ٹھس ہو جائے گا اور کسی کا مقابلہ کرنے کی طاقت اس میں نہیں رہے گی، لہٰذا اگر طاقت حاصل کر کے پہلوان بن بھی گیا اور نفس و شیطان کو گرا بھی دیا، تب بھی اس کو ہر وقت ریاضت کی ضرورت ہے تا کہ اس کی قوت اسی درجے میں بحال رہے، اسی لئے فرمایا:

تا دم آخر دمے فارغ مباش

آخر دم تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہونے کا موقع نہیں ہے۔

جامِ مے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن

بہرحال! توبہ ٹوٹنے کا معاملہ ہر انسان کے ساتھ پیش آتا ہے، لہٰذا گھبرانے کی ضرورت نہیں، جب توبہ ٹوٹے، دوبارہ توبہ کرلو اور استغفر اللّٰہ ربّی من کل ذنب واتوب الیہ پڑھ لو۔ ایک شاعر کا بڑے مزے کا شعر ہے کہ:

جامِ مے توبہ شکن، توبہ میری جام شکن
سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

یعنی جب جام مے سامنے آتا ہے تو توبہ ٹوٹ جاتی ہے اور جب توبہ آتی ہے تو جام کو توڑ دیتی ہے، اس کے نتیجے میں میرے سامنے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے ڈھیر پڑے ہیں۔ "پیمانوں" کا لفظ شاعر نے یہاں دو معنوں میں استعمال کیا ہے، ایک تو "عہد" کے معنی میں، کیونکہ "عہد" کو بھی "پیمان" کہتے ہیں اور دوسرے "گلاس" کے معنی میں، کیونکہ شراب کے گلاس کو پیمانہ کہا جاتا ہے، اس لئے اس نے کہا کہ "سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے، یعنی ایک طرف پیمان ٹوٹ رہے ہیں اور دوسری طرف پیمانے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن بالآخر اللہ تعالیٰ "پیمان" میں اتنی طاقت عطا فرما دیتے ہیں کہ پھر "پیمانے" ہی ٹوٹتے ہیں، "پیمان" نہیں ٹوٹتے۔ اگر آدمی شروع میں گھبرا جائے کہ یہ میری توبہ ٹوٹ رہی ہے اور ہار کر بیٹھ جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نفس وشیطان نے غلبہ پالیا، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کی اس سے حفاظت فرمائے۔ آمین۔

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ

جتنی مرتبہ بھی توبہ ٹوٹے، اس کا علاج یہ ہے کہ فوراً دوبارہ عہد کو تازہ کرو اور دوبارہ توبہ کی طرف بڑھو، ان کی بارگاہ تو ایسی ہے جیسے کسی شاعر نے کہا کہ:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ
گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہ ما درگہ نومیدی نیست
صد بار گر توبہ شکستی باز آ

یعنی اور جگہوں کا تو معاملہ یہ ہے کہ اگر تم ایک مرتبہ جرم کرو گے، دو مرتبہ کرو گے، تین مرتبہ کرو گے، معاف کر دیے جاؤ گے، لیکن اگر روزانہ ہی جرم کرو گے تو وہ کان سے پکڑ کر باہر نکال دیے جاؤ گے اور یہ کہہ دیا جائے گا کہ اب یہاں مت آنا، مگر ان کی بارگاہ ایسی ہے کہ ان کی طرف سے یہ اعلان ہو رہا ہے کہ اگر سو بار بھی توبہ توڑ چکے ہو تو پھر میرے پاس واپس آ جاؤ، پھر بھی تمہاری توبہ قبول کرلوں گا۔ مرتے دم تک نزع کی آخری حالت سے پہلے پہلے تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لہٰذا گھبرانے کی ضرورت نہیں بلکہ کوشش جاری رکھنی چاہیے، انشاء اللہ اسی طرح کامیابی ہو جائے گی، ہمت نہ ہارو اور مایوس ہو کر مت بیٹھو اور کوشش کو چھوڑ کر نہ بیٹھ جاؤ، اللہ تعالیٰ ایک نہ ایک دن کامیابی عطا فرما دیں گے۔

اللہ تعالیٰ سے باتیں کیا کرو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں! اللہ تعالیٰ سے اس طرح باتیں کیا کرو کہ یا اللہ! میں اس گناہ کے سیلاب سے نہیں بچ سکوں گا، یہ میرے بس میں نہیں، میں آپ سے مانگتا ہوں کہ آپ ہی مجھے بچائیے ورنہ پھر مجھ سے مؤاخذہ نہ فرمائیے گا، ہر چیز آپ کی قدرت میں ہے، میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ اپنے اللہ میاں سے اس طرح کی باتیں کیا کرو، اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ دعا رد نہیں فرماتے۔

حضرت یونس علیہ السلام سے سبق لو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت یونس علیہ السلام کے قصے کے بیان میں اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب بات بیان فرمائی ہے، وہ کہ حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تین دن رہے۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک بات درمیان میں عرض کر دوں کہ اہل حکمت کے نزدیک اس کائنات میں کوئی خبر خبر محض نہیں بلکہ ہر خبر بمعنی انشاء ہوتی ہے، یعنی ہر خبر سے کوئی نہ کوئی امر یا نہی نکلتا ہے کہ یہ کام کرو یا یہ کام نہ کرو اور ہر خبر سے کوئی نہ کوئی سبق ملتا ہے، لہٰذا قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جتنے واقعات بیان فرمائے ہیں، ان کے اندر کوئی نہ کوئی سبق ہے۔

بہر حال! حضرت یونس علیہ السلام مچھلی کے پیٹ میں تین دن رہے، وہاں اندھیرا ہی اندھیرا تھا، اس اندھیرے میں یہ کام کیا کہ اپنے رب کو پکارا اور کہا کہ:

لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ

آگے اللہ تعالیٰ نے بڑے مزے کی بات بیان فرمائی، وہ یہ کہ:

فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ وَ كَذٰلِكَ نُنْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ (سورۂ انبیاء: آیت ۸۸)

جب اس نے ہمیں پکارا تو ہم نے اس کی پکار کو قبول کرلیا اور اس کو ہم نے اس گھٹن سے نجات دیدی اور اسی طرح ہم مؤمنوں کو نجات دیتے ہیں یا نجات دیں گے۔

کیا ہر مؤمن پہلے مچھلی کے پیٹ میں جائیگا؟

اب سوال یہ ہے کہ اس آخری جملے کا کیا مطلب ہے کہ ہم اسی طرح مؤمنوں کو نجات دیں گے، کیا ہر مؤمن پہلے مچھلی کے پیٹ میں جائے گا، وہاں جاکر یہ کلمات لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ پڑھے گا تو ہم اس کو بھی مچھلی کے پیٹ سے نجات دیدیں گے؟ ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں، بلکہ اس جملے کا مطلب یہ ہے کہ جب کبھی تم کسی بھی قسم کی ظلمت میں گھر جاؤ، گناہوں کی ظلمت میں یا ماحول کی ظلمت میں یا شر کی ظلمت میں گھر جاؤ تو ہمیں پکارو اور کہو لَا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ سُبْحَانَكَ إِنِّي كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ اور

جب تم ہمیں پکارو گے تو جس طرح حضرت یونس علیہ السلام کو ہم نے نجات دی تھی، اسی طرح ہم تمہیں بھی نجات دیں گے۔

اس ذات کو پکارو

لہٰذا ہم لوگ جو نفس کی اور گناہوں کی تاریکی میں گھرے ہوئے ہیں، اس کا حل یہ ہے کہ اسی ذات کو پکارو جس نے اس نفس کو پیدا کیا اور جو خالق نور بھی ہے اور خالق ظلمت بھی ہے، جو خالق خیر بھی ہے اور خالق شر بھی ہے، اسی کو پکارو اور کہو کہ اے اللہ! آپ نے ان کو پیدا فرمایا ہے، آپ ہی ان کو ہم سے دور فرما دیجئے، تم اس طرح پکارو گے تو اللہ تعالیٰ نجات عطا فرما دیں گے۔

حضور ﷺ ستر مرتبہ استغفار فرماتے

خلاصہ یہ کہ توبہ ایسی چیز نہیں کہ اگر کسی وقت وہ ٹوٹ جائے تو آدمی مایوس ہو کر بیٹھ جائے، نہیں، بلکہ ساری عمر یہ کام کرتے رہنا ہے۔ ارے ہم اور آپ کس شمار وقطار میں ہیں، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اپنے پروردگار سے دن میں ستّر مرتبہ استغفار کرتا ہوں، جبکہ آپ گناہوں سے معصوم ہیں اور گناہوں کا صدور آپ سے ممکن نہیں اور کوئی بھول چوک ہو بھی گئی تو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے اعلان فرما دیا ہے کہ وہ سب معاف ہے، اس کے باوجود آپ فرماتے ہیں کہ میں ستّر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

پچھلے درجات سے استغفار ہوتا تھا

بزرگوں نے فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس لئے استغفار فرماتے تھے کہ آپ کے درجات میں ہر لمحہ اور ہر لحظہ ترقی ہو رہی تھی، جب آپ اگلے درجے پر پہنچتے تو پچھلا درجہ آپ کو بمنزلہ گناہ کے نظر آتا تھا، آپ اس پر استغفار فرماتے تھے، لہٰذا ہمیں تو ہر آن استغفار کرتے رہنا چاہئے، جب غلطی ہو جائے پھر لوٹ آؤ، پھر غلطی ہو جائے تو پھر استغفار کرلو، یہی عمل کرتے رہو، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہیں غلبہ عطا فرمادیں گے انشاء اللہ اور نفس و شیطان تمہارے قابو آجائیں گے بشرطیکہ تم ان کے سامنے ڈٹ جاؤ۔

شیطان کا مکر کمزور ہے

قرآن کریم نے فرمایا:

اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطَانِ كَانَ ضَعِيْفًا

یعنی شیطان کا مکر بڑا کمزور ہے، بظاہر تو یہ بڑا فوں فاں کرتا ہے اور بڑا رعب دار معلوم ہوتا ہے لیکن جو آدمی ایک مرتبہ اس کے سامنے ڈٹ گیا، یہ وہیں غبارے کی طرح بیٹھ جاتا ہے، بس اس کے سامنے ڈٹ جانا شرط ہے۔ بعض لوگ فوں فاں بہت کرتے ہیں اور شور مچاتے ہیں اور دعوے کرتے ہیں لیکن ان کے اندر کچھ بھی نہیں ہوتا، چنانچہ اگر کوئی دوسرا آدمی ان کے مقابلے میں ڈٹ جائے تو وہ وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ روس کا سربراہ بڑی ڈینگیں مارا کرتا تھا کہ میں یہ

کردوں گا وہ کردوں گا، ساری دنیا کو تباہ و برباد کردوں گا، روزانہ اس کا ایک نیا بیان آجاتا تھا، لوگ پریشان تھے کہ معلوم نہیں یہ کیا چیز ہے، لیکن جب بیٹھا تو بتاشے کی طرح بیٹھ گیا۔ اللہ تعالیٰ نے نفس و شیطان کو ایسا ہی بنایا ہے، ان کا مقابلہ کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے اور یہ بڑے طاقت ور معلوم ہوتے ہیں لیکن ذرا سا آدمی ان کے سامنے ڈٹ جائے تو یہ بتاشے کی طرح بیٹھ جاتے ہیں، اس لئے ان سے گھبرانے کی ضرورت نہیں، جتنی مرتبہ غلطی ہو جائے اور گناہ ہو جائے، ہر مرتبہ لوٹ آؤ۔

توبہ کے معنی ہیں لوٹ آنا

توبہ کے معنی کیا ہیں؟ توبہ کے لفظی معنی ہیں "لوٹ آنا" یہ تاب یتوب توبۃً سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں لوٹ کے آجانا، یعنی گناہ کرنے کے نتیجے میں تم بھٹک گئے تھے، اب واپس لوٹ آؤ، اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جب تم لوٹو گے تو میں لوٹوں گا، یعنی جب تم توبہ کرو گے تو میں گناہ معاف کردوں گا، لہٰذا جب بھی ذرا پٹری سے اتر گئے، پھر واپس پٹری پر آجاؤ، پھر اتر گئے پھر واپس آجاؤ، یہ نہ ہو کہ بس جب پٹری سے اتر گئے تو بس اب اتر ہی گئے، اب واپس لوٹنے کی ضرورت نہیں، یہ نہ کرو بلکہ دوبارہ لوٹ آؤ۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۷۷

استغفار کیلئے وقت مقرر کرلیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱/۱۸۸۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵
مجلس نمبر : ۷۷

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم ط

گناہوں کا علاج: توبہ

استغفار کیلئے وقت مقرر کرلیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ!

استغفار کی تعداد اور وقت مقرر کرنا

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ:

استغفار جس میں کچھ بھی وقت صرف نہیں ہوتا اور نہایت آسان ہے، بہت بھولتا ہوں۔ (انفاس عیسیٰ: ص ۱۹۴)

یعنی استغفار اتنی آسان چیز ہے کہ اس میں کوئی لمبا چوڑا وقت صرف نہیں ہوتا، ایک لمحہ کے اندر آدمی یہ کہہ دیتا ہے "استغفر اللّٰہ رَبّی من کل ذنب وأتوب إليه" اتنا آسان ہونے کے باوجود میں یہ استغفار کرنا بھول جاتا ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں ان کو لکھا کہ:

اس حالت میں استغفار بعدد خاص کسی وقت مقرر کر لیجئے تا کہ اگر ہر وقت یاد نہ رہ سکے تو قلق نہ ہو۔ (ایضاً)

ویسے تو استغفار کے لئے نہ وقت مقرر ہے اور نہ تعداد مقرر ہے، اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے تو اپنی ہر غلطی پر استغفار کرنا چاہئے، لیکن ایسی حالت میں جبکہ آدمی استغفار کرنا بھول جاتا ہے تو اس کو چاہئے کہ کوئی خاص وقت مقرر کر لے کہ میں فلاں وقت استغفار کیا کروں گا اور عدد بھی متعیّن کر لے کہ اتنی مرتبہ استغفار کروں گا، مثلاً ایک تسبیح پڑھوں گا۔

استغفار کے وقت ذہن میں گناہوں کا استحضار

چنانچہ ہمارے بزرگ طالبین کو جب معمولات بتاتے ہیں تو ان میں استغفار کی ایک تسبیح ضرور شامل ہوتی ہے۔ وہ استغفار یہ ہے:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّي مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْهِ۔ یا

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْعَلِیَّ الْعَظِیْمَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔

اس استغفار کو خاص وقت میں اور خاص تعداد میں کر لینا مفید ہوتا ہے، اور یہ استغفار محض زبانی حرکت سے نہ ہو بلکہ استغفار کے وقت ذہن میں ذرا اس بات کا دھیان پیدا کرے کہ مجھ سے نہ جانے کتنی غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، نہ جانے کتنے گناہ سرزد ہوئے ہیں، بہت سے گناہ وہ ہیں جن کو میں جانتا ہوں اور بہت سے گناہ وہ ہیں جن کو میں جانتا بھی نہیں ہوں، اے اللہ! میں آپ سے ان سب گناہوں کی معافی مانگ رہا ہوں۔

حضور ﷺ کی ایک خوبصورت دعا

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا تلقین فرمائی، یہ دعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت پڑھنا ثابت ہے جب آپ حج یا عمرہ کے موقع پر صفا مروہ کی سعی کے دوران میلین اخضرین میں دوڑا کرتے تھے، وہ دعا یہ ہے:

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَاعْفُ عَنَّا وَ تَكَرَّمْ
وَتُجَاوِزْ عَمَّا تَعْلَمُ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ مَالَا نَعْلَمُ اِنَّكَ
اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ۔

اے اللہ! میری مغفرت فرمائیے اور رحم فرمائیے اور درگزر فرمائیے اور مجھ پر کرم فرمائیے اور میرے ان گناہوں سے درگزر فرمائیے جو آپ جانتے ہیں، اس لئے کہ آپ وہ جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے، بیشک آپ سب سے زیادہ معزز اور مکرم ہیں۔ اس دعا میں آپ ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جو گناہ میرے علم میں ہیں، ان کو معاف فرمائیے بلکہ یہ فرمایا کہ جو گناہ آپ کے علم میں ہیں، میں ان

سے معافی طلب کرتا ہوں، آپ اپنی رحمت سے وہ سب معاف فرما دیجئے۔ اور ساتھ میں آپ نے یہ بھی فرما دیا کہ آپ وہ سب جانتے ہیں جو ہم نہیں جانتے، نہ جانے کتنے گناہ ایسے ہیں کہ ان کے گناہ ہونے کا بھی ہمیں احساس نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نامۂ اعمال میں گناہوں کا اضافہ ہو رہا ہے اور ہمیں پتہ بھی نہیں، اس لئے روزانہ ایک تسبیح استغفار کی پڑھ لی جائے تو انشاء اللہ اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ گناہوں سے نجات بھی عطا فرمائیں گے اور اگر گناہوں کا صدور بھی ہوگا تو استغفار کی برکت سے معاف بھی فرما دیں گے۔

پہلے استغفار پھر دوسرے اذکار

پھر استغفار کے سلسلے میں مشائخ کے مذاق مختلف ہیں، بعض مشائخ تو یہ فرماتے ہیں کہ جب آدمی اپنے روزانہ کے معمولات پورے کرنے بیٹھے تو استغفار سے شروع کرے، دوسری تسبیحات بعد میں کرے، استغفار سے شروع اس لئے کرے کہ پہلے پاک وصاف ہو جائے پھر آگے بڑھے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح، تحمید، تقدیس وغیرہ یہ سب انوارات ہیں، ان انوارات کو حاصل کرنے سے پہلے ان کے قابل تو بن جائے۔ لہٰذا پہلے استغفار کرے اور پھر دوسرے اذکار کرے۔

پہلے دوسرے اذکار پھر آخر میں استغفار

جبکہ بعض دوسرے مشائخ یہ فرماتے ہیں کہ استغفار آخر میں کرے، اس لئے کہ قرآن کریم میں نیک بندوں کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

كَانُوا قَلِيلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ وَبِالْأَسْحَارِ

هُمْ یَسْتَغْفِرُوْنَ۔ (سورۃ الذاریات: آیت ۱۷، ۱۸)

یعنی اللہ تعالیٰ کے نیک بندے رات کو کم سوتے ہیں اور اللہ جل شانہ کے ذکر میں نماز میں عبادات میں رات گزارتے ہیں اور پھر سحری کے وقت استغفار کرتے ہیں تاکہ یہ استغفار ان کوتاہیوں کو بھی شامل کرلے جو ان عبادات میں پائی گئیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! رات کو ہم نے عبادت تو کی لیکن آپ کی شایانِ شان عبادت نہ ہوسکی، مَاعَبَدْنَاكَ حَقَّ عِبَادَتِكَ اور جب ان عبادات میں ہونے والی کوتاہیوں سے بھی اللہ تعالیٰ سے معافی مانگ لی گئی تو اب یہ عبادات کامل اور مکمل ہوگئیں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں قابل قبول ہوگئیں۔ بہرحال! استغفار کے بارے میں مشائخ کے مذاق مختلف ہیں، لہٰذا جس شخص کا جس مذاق کی طرف رجحان زیادہ ہو، اس مذاق کو اختیار کرلے، دونوں راستے بزرگوں کے بتائے ہوئے ہیں۔

ماتحتوں پر زیادتی کی صورت میں معافی کی تفصیل

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

شاگردوں کو ان کی کوتاہی پر بے وقوف پاگل وغیرہ کہہ دینا چنداں مذموم نہیں، اس لئے اس سے استغفار کی ضرورت نہیں کہ تمام طلبہ جماعت کے سامنے معافی چاہی جائے بلکہ بعض اوقات خلاف مصلحت ہے کہ سبب ہے ان کی جسارت وجرأت اور فسادِ اخلاق کا، البتہ زجر میں اعتدال سے تجاوز نہ ہو، وعلی هذا مریدین

وعیال وخدم ونحوھم من التابعین۔ (انفاس عیسیٰ، ص۱۹۴)

شاگردوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا

جو حضرات اکثر و بیشتر تعلیم و تدریس کے کام میں مشغول رہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے دل میں فکر عطا فرماتے ہیں، ان کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات شاگردوں کو ڈانٹنا پڑتا ہے اور بُرا بھلا کہنا پڑتا ہے، بعض اوقات تھوڑا بہت مارنا بھی پڑتا ہے اور ان افعال سے ظاہر ہے کہ دوسرے کو تکلیف پہنچتی ہے اور دوسرے کو تکلیف پہنچانا گناہ ہے اور یہ ایسا گناہ ہے کہ اس سے توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ جس کو تکلیف پہنچائی جائے، اس سے معافی مانگے، اور جب تک اس سے معافی نہیں مانگے گا اور وہ شخص معاف نہیں کرے گا، وہ گناہ اس وقت تک معاف نہیں ہوگا۔

شاگردوں سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں

اس ملفوظ میں حضرت والاؒ نے اس کا اصول بتا دیا کہ اگر استاذ شاگرد کو ڈانٹے یا بُرا بھلا کہے یا تھوڑا سا مار لے تو اس پر شاگرد سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں بلکہ بعض اوقات معافی مانگنا مضر ہوتا ہے، اس لئے کہ جو شریر طبیعت کا شاگرد ہوگا وہ اس کا الٹا اثر لے گا کہ اچھا استاذ جی بھی ہم سے معافی مانگ رہے ہیں، لہٰذا آئندہ اور زیادہ شرارت کرو اور زیادہ گستاخی کرو، کیونکہ اگر استاذ کسی وقت ڈانٹ ڈپٹ کریں گے تو بعد میں ہم سے معافی بھی مانگیں گے، اس کے نتیجے میں ان کے اندر اور زیادہ جرأت اور جسارت پیدا ہوجائے گی، اس لئے ان سے معافی مانگنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اصول ہر اس شخص میں

جاری ہوگا جو آپ کے زیر تربیت ہو، چاہے وہ شاگرد ہو، چاہے مرید ہو، چاہے بیٹا ہو۔

زیر تربیت افراد میں یہ اصول کیوں؟

زیر تربیت افراد میں یہ اصول کیوں جاری ہوگا؟ اس لئے کہ جب ایک شخص نے اپنے آپ کو آپ کی تربیت میں دیدیا اور اس نے یا اس کے سرپرست نے یہ درخواست کی کہ آپ اس کی تربیت کریں، اور شاگرد استاذ کے پاس جب پڑھنے کے لئے آتا ہے تو وہ ایک طرح سے یہ درخواست کرتا ہے کہ آپ میری تربیت کریں، اسی طرح جو مرید شیخ کے پاس آتا ہے وہ یہ درخواست لے کر آتا ہے کہ آپ میری تربیت کریں اور اس درخواست کے اندر یہ بات بھی شامل ہے کہ میں آپ کو یہ حق دیتا ہوں کہ آپ میری تربیت کی خاطر جو طریقہ مناسب سمجھیں، وہ طریقہ اختیار کریں، لہٰذا اگر میری تربیت کے لئے مجھے ڈانٹنے کی ضرورت ہو تو بیشک مجھے ضرور ڈانٹیں، اور اس تربیت کے اندر تھوڑی بہت پٹائی بھی داخل ہے بشرطیکہ وہ ضرب غیر مبرح ہو، اس سے زیادہ مارنا کسی طرح بھی حلال نہیں، کیونکہ ایسی مار کی ممانعت منصوص ہے۔ بہرحال! اگر استاذ نے کسی شاگرد کو پاگل یا بیوقوف کہہ دیا تو یہ کہنے کا حق استاذ کو حاصل ہے اور انشاء اللہ اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا، لہٰذا ان الفاظ کے کہنے پر طلبہ سے معافی مانگنے کی بھی ضرورت نہیں۔

زجر میں اعتدال پر قائم رہیں

البتہ استاذ خود اس کا خیال کرے کہ زجر کرنے میں اعتدال سے تجاوز نہ

ہو، یہ نہ ہو کہ جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ ڈانٹ دیا یا جتنی ضرورت تھی اس سے زیادہ مار دیا، ان کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ لیکن اب درمیان میں کون خط کھینچ کر بتائے کہ اتنا ڈانٹنا جائز تھا اور اس سے زیادہ ناجائز تھا، یا اتنا مارنا جائز تھا اور اس سے زیادہ مارنا ناجائز تھا، یہ خط کھینچنا انسان کے لئے آسان نہیں، بلکہ اس کے لئے شیخ کی صحبت کی ضرورت ہوتی ہے، شیخ کی صحبت میں رہ کر شیخ سے اس کے بارے میں سوال کرے کہ میں کس حد تک ڈانٹ سکتا ہوں اور کس حد تک مار سکتا ہوں، کیونکہ اس کے بارے میں دو اور دو چار کر کے کوئی اصول بتانا بڑا مشکل ہے۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے غلام کو مار رہے تھے اور ان کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کو دیکھا تو فرمایا کہ:

صدیقین واللعّانین کلاّ وربّ الکعبۃ

یعنی ایک طرف صدیق بنتے ہیں اور دوسری طرف لعنتیں بھی کر رہے ہیں، رب کعبہ کی قسم! یہ دونوں باتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بات سن کر تلافی کے طور پر اس غلام کو تو آزاد کر دیا، اس کے علاوہ اور بھی بہت سے غلام آزاد فرما دیئے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے غلام کو برا بھلا کہہ رہے

تھے اور اس دوران انہوں نے اس غلام کو اس کے وطن کی طرف نسبت کر کے کوئی تحقیر کا جملہ کہہ دیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب سنا تو آپ نے فرمایا:

إنك امرأ فيك الجاهلية۔

اے ابوذر! تم ایسے آدمی ہو کہ تمہارے اندر جاہلیت کی خوبو باقی ہے، اس لئے کہ تم نے اپنے غلام کو وطنیت کا طعنہ دیدیا۔ بہرحال! اعتدال پر قائم رہنا بہت ضروری ہے، لہٰذا احتیاط کا تقاضہ یہ ہے کہ آدمی اس حد پر پہنچنے سے پہلے رک جائے جہاں یہ شبہ ہو کہ یہ اعتدال کے اندر داخل ہے یا نہیں۔ یہ وصف اللہ تعالیٰ کی خاص توفیق اور بزرگوں کی صحبت کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے، ورنہ آدمی کے بس کی بات نہیں۔

حضرت تھانویؒ کا واقعہ

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک خادم تھے، بھائی نیاز، میں نے بھی ان کی زیارت کی ہے، سیدھے سادھے بزرگ تھے اور حضرت والا کے خادم خاص تھے اور ذرا منہ چڑھے تھے، مگر حضرت کے مزاج شناس بھی تھے، حضرت والا کے پاس جو مریدین اور اہل تعلق آیا کرتے تھے یہ ان کے ساتھ ذرا بے تکلف بھی ہو جاتے تھے اور کبھی ان کو تنبیہ بھی کر دیا کرتے تھے کہ یہ کام اس طرح کرو اور یہ کام نہ کرو۔ ایک دن کسی نے حضرت والا سے ان کی شکایت کر دی کہ یہ بھائی نیاز صاحب آپ کے بہت منہ چڑھے ہیں، جو لوگ آپ کے پاس آتے ہیں یہ ان کے ساتھ بداخلاقی سے پیش آتے

ہیں، حضرت والا کو یہ سن کر تکلیف ہوئی کہ یہاں آنے والوں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرنا بُری بات ہے۔

چنانچہ آپ نے بھائی نیاز کو بلایا اور ڈانٹا کہ بھائی نیاز! یہاں آنے والے لوگوں کے ساتھ تم بدکلامی کرتے ہو اور ان کو ڈانٹتے ہو، ایسا کیوں کرتے ہو؟ بھائی نیاز نے کہا کہ حضرت! اللہ سے ڈرو اور جھوٹ نہ بولو۔ وہ دراصل کہنا یہ چاہتے تھے کہ جو لوگ آپ سے یہ شکایت کر رہے ہیں، وہ اللہ سے ڈریں اور جھوٹ نہ بولیں، اس لئے کہ حقیقت کے خلاف شکایت کر رہے ہیں، لیکن بے خیالی میں ان کے منہ سے یہ جملہ نکل گیا کہ حضرت! اللہ سے ڈریں اور جھوٹ نہ بولیں۔ بتایئے اگر کوئی شخص اپنے نوکر کو ڈانٹے اور جواب میں نوکر یہ کہے کہ جھوٹ نہ بولو تو اور زیادہ غصہ آئے گا، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ سنا اور اپنی گردن جھکائی اور استغفر اللہ استغفر اللہ کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔

یک طرفہ بات سن کر ڈانٹنا

آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اس لئے کہ جب آپ نے اپنے نوکر کو ڈانٹا اور اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، تو اس وقت فوراً ذہن میں یہ خیال آیا کہ میں نے ایک طرف کی بات سن کر اس کو ڈانٹنا شروع کر دیا اور میں نے اس سے یہ نہیں پوچھا کہ لوگ تمہاری یہ شکایت کر رہے ہیں، اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس کا بیان سننے کے بعد کوئی فیصلہ کرنا چاہئے تھا اور یکطرفہ شکایت سن کر ڈانٹنا مناسب نہیں تھا، اس لئے بجائے اس کے کہ اپنی بات پر اڑتے آپ ''استغفر اللہ استغفر اللہ'' کہتے ہوئے تشریف لے گئے۔ یہ تھے ''کَانَ وَقَّافًا عند

حدود اللہ"، یعنی اللہ تعالیٰ کی بیان کردہ حدود کے آگے رک جانے والے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا واقعہ

یہ وصف حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان کیا گیا ہے کہ:

كَانَ وَقَّافًا عند حدود الله

یعنی اللہ تعالیٰ کی حدود کے آگے رک جانے والے تھے۔ ویسے آپ کے اندر غصہ تھا، مزاج میں تیزی تھی، لیکن جب اللہ تعالیٰ کی حد سامنے آگئی تو اب مزاج کی ساری تیزی ختم ہوگئی اور سارا غصہ بھی فرو ہوگیا۔ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد نبوی میں تشریف لائے، دیکھا کہ ایک گھر کا پرنالہ مسجد نبوی کی طرف لگا ہوا ہے، آپ نے حکم دیا کہ اس پرنالے کو توڑ دو، اس لئے کہ اس کے پانی سے مسجد نبوی خراب ہوتی ہے، چنانچہ وہ پرنالہ توڑ دیا گیا، یہ غصہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے اور مسجد نبوی کے لئے تھا۔ جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پتہ چلا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میرے گھر کا پرنالہ توڑ دیا ہے تو آپ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ناراض ہوئے اور ان سے فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کر دیا کہ ہمارے گھر کا پرنالہ توڑ دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ پرنالہ مسجد میں گر رہا تھا اور مسجد نبوی کو خراب کر رہا تھا، اس لئے میں نے اس کو توڑ دیا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ تمہیں یہ پتہ نہیں کہ اس پرنالے کو لگانے کی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اجازت دی تھی۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ اچھا! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت دی تھی؟ چنانچہ

آپ وہیں جھک کر کھڑے ہو گئے اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ آپ میری کمر پر کھڑے ہو کر دوبارہ اس پرنالے کو اسی جگہ پر لگا دیں۔ پھر فرمایا کہ خطاب کے بیٹے کی یہ مجال نہیں کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت سے لگے ہوئے پرنالے کو توڑے، چنانچہ وہ پرنالہ دوبارہ اسی جگہ لگا دیا گیا اور آج تک وہ پرنالہ مسجد نبوی میں لگا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ترکی خلافت کے دور کے لوگوں کو یہ عشق عطا فرمایا تھا کہ اب وہ نہ گھر موجود ہے نہ کوئی اور چیز موجود ہے، لیکن چونکہ وہ پرنالہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لگوایا تھا اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا اس طرح سے اکرام کیا تھا، اس لئے وہ پرنالہ اسی جگہ لگا دیا، اب تک اس پرنالہ کی جگہ پر پرنالہ لگا ہوا ہے۔ بہرحال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے یہ وصف عطا فرمایا تھا کہ: ''کَانَ وَقَّافًا عند حدود اللّٰہ''۔

یہ چیز صحبت سے حاصل ہوتی ہے

لیکن یہ بات صرف کتابیں پڑھ لینے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ کسی کے سامنے رگڑے کھانے سے حاصل ہوتی ہے، جب کسی کے در پر آدمی رگڑے کھاتا ہے تب اللہ تعالیٰ یہ صفت عطا فرما دیتے ہیں، پھر وہ اللہ تعالیٰ کی حدود کو پہچان جاتا ہے اور اس کے مطابق عمل کرتا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو یہ وصف عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۷۸

سابقہ گناہوں کو یاد رکھنے کی حقیقت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵
مجلس نمبر : ۷۸

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ط

سابقہ گناہوں کو یاد رکھنے کی حقیقت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا إِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا۔

أَمَّا بَعْدُ!

قبول توبہ کی علامت

توبہ کا بیان چل رہا ہے، ایک ملفوظ میں حکیم الامت حضرت مولانا

اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ قبول توبہ کی علامت یہ ہے کہ اس گناہ کا نقش بالکلیہ ذہن سے محو ہو جائے کہ پھر وہ یاد نہ آئے اور عام کتب طریقت میں جمہور لکھتے ہیں کہ سالک کو لازم ہے کہ ہمیشہ ہر وقت اپنے گناہوں کو پیش نظر رکھے۔ وجہ تطبیق یہ ہے کہ محو ہو جانے سے مراد یہ ہے کہ اس کا اثر خاص یعنی قلق طبعی نہ رہے، گو یاد بھی رہے اور قلق اعتقادی بھی رہے، نیز شیخ کا فرمانا کلیاً نہیں ہے، بلکہ بعض طبائع کے اعتبار سے ہے جن کے لئے قلق طبعی حاجب ہو جاتا ہے انشراح فی الطاعۃ سے۔

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۵)

شیخ محی الدین ابن عربیؒ کا فرمان

یہ دو باتیں ہیں جو مختلف بزرگوں نے فرمائی ہیں۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، حضرت والا نے ان دونوں باتوں میں تطبیق دی ہے۔ ایک بات وہ ہے جو شیخ اکبر یعنی حضرت محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے کہ توبہ کی قبولیت کی علامت یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کی گئی ہے، اس گناہ کا نقش دل سے بالکل مٹ جائے، پھر اس گناہ کا تصور، اس کا دھیان، اس کا خیال دل میں نہ آئے، ان کے نزدیک یہ توبہ کے قبول ہونے کی علامت ہے۔ بظاہر اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ جس گناہ سے توبہ کی

تھی، اگر وہ گناہ یاد رہے اور بار بار یاد آتا رہے کہ میں نے فلاں گناہ کیا تھا تو پھر وہ توبہ قبول نہیں ہوئی، یہ بات تو شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے۔

حضرات صوفیاء کا فرمان

لیکن عام طور پر حضرات صوفیاء کرام اور بزرگان دین جو بتاتے ہیں، وہ یہ ہے کہ انسان کو اپنے گناہ ہر وقت پیش نظر رکھنا چاہئے، اور جب پیش نظر رکھے گا تو وہ گناہ یاد رہیں گے۔ بہرحال! یہ حضرات فرماتے ہیں کہ گناہوں کو یاد رکھو اور شیخ اکبرؒ فرماتے ہیں کہ گناہوں کو یاد رکھنا توبہ کے عدم قبولیت کی علامت ہے، لہٰذا ان دونوں باتوں میں تعارض ہے۔

شیخ اکبرؒ کے قول کی توجیہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جو فرمایا کہ گناہ کا نقش دل سے محو ہو جائے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ گناہ یاد نہ رہے بلکہ نقش محو ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ گناہ کرنے کی وجہ سے طبعی طور پر دل میں جو رنج اور صدمہ تھا اور پریشانی تھی کہ مجھ سے کیا ہو گیا، میں نے یہ گناہ کیوں کر لیا، جب سچے دل سے توبہ کر لی تو اب توبہ کے بعد اس صدمہ اور رنج کی شدت کم ہو جانی چاہئے، یہ قبول توبہ کی علامت ہے، لیکن اگر وہ گناہ خود غیر اختیاری طور پر یاد رہتا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

توبہ کی توفیق پر شکر کرنا اور مطمئن ہونا

بلکہ اگر اس یاد کے ساتھ ساتھ دل میں اس گناہ کی عقلی بُرائی بھی آتی

ہے کہ مجھ سے یہ غلط کام ہوا تھا، میں عقلی طور پر اس کام کو بُرا سمجھتا ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی دل مطمئن ہے کہ الحمدللہ اب مجھے توبہ کی توفیق ہوگئی، اب میں اس گناہ سے نکل آیا اور اس گناہ کے عذاب سے اللہ تعالیٰ نے مجھے نکال دیا، تو اس میں کچھ حرج نہیں۔

ہمارے بزرگ حضرت بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مجازِ صحبت تھے اور شاعر بھی تھے، بڑے اچھے شعر کہتے تھے اور شعر بھی پرانے شعراء میرؔ اور دردؔ کے اشعار کی طرح کہا کرتے تھے۔

وہ ایک شعر میں فرماتے ہیں:

دولتیں مل گئی ہیں آہوں کی
ایسی تیسی میرے گناہوں کی

یعنی یاد تو آ رہا ہے کہ فلاں گناہ کیا تھا اور دل میں اس گناہ کی بُرائی بھی ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی خیال آ رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آہوں کی دولت عطا فرما دی ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرنے کی توفیق ہوگئی ہے، تو اب یہ گناہ میرا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔

لہٰذا یہ خیال آنا کہ مجھ سے گناہ اور برا کام سرزد ہوا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے توبہ کی توفیق دیدی، اس لئے اب مجھے اطمینان ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ توبہ کو قبول فرماتے ہیں، لہٰذا جب میں قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوں گا تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ مجھ سے اس پر مؤاخذہ نہیں فرمائیں گے، اس پر مجھے اطمینان ہے۔ یہ تو شیخ اکبر حضرت محی

الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا مطلب ہوا۔

گناہوں کو پیش نظر رکھنے کے تین مقصد

دوسرے حضرات صوفیاء اور بزرگان دین یہ فرماتے ہیں کہ انسان اپنے گناہوں کو پیش نظر رکھے اور ان کو یاد رکھے۔ گناہ کو یاد رکھنے کے تین مقصد ہوسکتے ہیں اور تینوں کا حکم الگ الگ ہے۔

لذّت لینے کیلئے گناہوں کو یاد رکھنا

ا۔ گناہوں کو یاد رکھنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی لذّت لینے کی خاطر اس کو یاد رکھے۔ العیاذ باللہ، مثلاً یہ کہ فلاں وقت میں نے یہ گناہ کیا تھا، اس میں کیسا مزہ آیا تھا، اب اس مزہ کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور اس گناہ کا تصور کر کے اس سے لطف اندوز ہو رہا ہے، یہ صورت بالکل ناجائز ہے، اللہ تعالیٰ ہم میں سے ہر ایک کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین۔ اور اس صورت میں اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ کہیں لذّت لینے کی خاطر دوبارہ اس گناہ کے اندر مبتلا نہ ہو جائے، اس لئے یہ صورت بہت خطرناک ہے، اس سے ہر حال میں پرہیز کرنا ضروری ہے۔

گناہ یاد کر کے توبہ کی قبولیت میں شک کرنا

۲۔ گناہوں کو یاد رکھنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اس گناہ کو اس لئے یاد کر رہا ہے کہ میں نے فلاں گناہ کر لیا ہے لیکن میری توبہ معلوم نہیں کہ

قبول ہوئی یا نہیں. لہٰذا اب گناہوں کا وظیفہ کر رہا ہے کہ میں نے فلاں وقت یہ گناہ کیا تھا اور فلاں وقت یہ گناہ کیا تھا اور یاد کر کر کے پریشان ہو رہا ہے کہ پتہ نہیں کہ ان گناہوں کی معافی ہوگی یا نہیں۔ اس طرح گناہوں کو یاد کرنا گناہ تو نہیں لیکن یہ صورت پسندیدہ اور مطلوب بھی نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ ایک مرتبہ بیٹھ کر سچے دل سے توبہ کرلو اور توبہ کی جو تین شرائط ہیں یعنی اس گناہ کو فوراً چھوڑ دینا اور اس گناہ پر نادم اور شرمندہ ہونا اور آئندہ کے لئے اس گناہ کے نہ کرنے کا عزم کر لینا، بس یہ تین شرائط پوری کرلو اور صلوٰۃ التوبہ کی دو رکعتیں پڑھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرلو اور معافی مانگ لو کہ اے اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف فرما دے۔ ایک مرتبہ اچھی طرح جی بھر کر توبہ کرلو اور معافی مانگ لو، جب ایک مرتبہ یہ کام کرلیا تو اب اس گناہ کا وظیفہ مت کرو اور جان بوجھ کر اس کو یاد کرنے کی کوشش مت کرو بلکہ اس گناہ کو بھول جانے کی کوشش کرو۔

شک وشبہ سے بے اعتمادی کا اظہار ہوتا ہے

اور پھر اس گناہ کے بارے میں یہ اندیشہ مت رکھو کہ معاف ہوا یا نہیں؟ اس لئے کہ جب اللہ جل شانہ نے وعدہ فرمالیا کہ میں تمہاری توبہ کو قبول کروں گا اور معاف کردوں گا تو اب خواہ مخواہ شکوک وشبہات دل میں لانا، یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے شایان شان نہیں، اس لئے کہ یہ شکوک وشبہات ایک طرح سے اللہ تعالیٰ پر بے اعتمادی کا اظہار کرنا ہے۔

ایک بہترین مثال

مثلاً فرض کریں کہ آپ ایک باپ ہیں اور آپ کا ایک بیٹا ہے یا آپ ایک استاذ ہیں اور آپ کا ایک شاگرد ہے، اب وہ بیٹا یا وہ شاگرد کوئی غلطی کرتا ہے اور آپ سے آ کر معافی مانگتا ہے، آپ نے اس سے کہا کہ جاؤ میں نے تمہیں معاف کر دیا اور اب تم مطمئن ہو جاؤ، لیکن وہ بیٹا یا شاگرد دوبارہ آپ سے لپٹ رہا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کردو، باپ کہہ رہا ہے کہ ٹھیک ہے غلطی ہوگئی، لیکن میں نے تمہیں معاف کر دیا، لیکن وہ بیٹا اصرار کر رہا ہے کہ مجھ سے غلطی ہوگئی، مجھے معاف کر دو، اب وہ بار بار یہی بات دہرا رہا ہے۔ اس کا یہ عمل صحیح طریقہ اور صحیح طرز عمل نہیں ہے، کیونکہ اس سے پتہ چل رہا ہے کہ اس بیٹے اور شاگرد کو آپ کی زبان پر بھروسہ نہیں ہے، آپ کہہ رہے ہیں کہ معاف کر دیا لیکن وہ کہتا ہے کہ نہیں، ابھی معاف نہیں ہوا، گویا کہ وہ آپ پر بے اعتمادی کا اظہار کر رہا ہے اور آپ کی زبان پر بھروسہ نہیں کر رہا ہے۔

معاف کرنے پر بھروسہ کرو

استاذ، باپ اور شیخ اللہ جل شانہ کے سامنے کیا حقیقت رکھتے ہیں، اللہ جل شانہ کی رحمت کاملہ ان سب سے زیادہ ہے، جب ان حضرات کے معاف کر دینے پر انسان بھروسہ کرتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ کے معاف کر دینے پر بھروسہ نہیں کرنا چاہئے. بلکہ ان سے زیادہ بھروسہ کرنا چاہئے، لہٰذا جب ایک مرتبہ توبہ کر لی اور اللہ جل شانہ نے توبہ کے بعد معاف فرمانے کا اعلان کر دیا کہ جو شخص

بھی مجھ سے توبہ کرے گا میں اس کو معاف کردوں گا، تو اب اس پر بھروسہ رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں معاف کر دیا، اب اس گناہ کو وظیفہ مت بناؤ۔

گناہ کو وظیفہ بنانے کا نتیجہ

بلکہ گناہ کو وظیفہ بنانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رفتہ رفتہ اللہ تعالیٰ سے ایک حجاب پیدا ہو جاتا ہے، یہ حجاب اچھی چیز نہیں، اس حجاب کو اٹھاؤ اور یہ یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا، البتہ آگے کی فکر کرو کہ دوبارہ وہ گناہ سرزد نہ ہو جائے اور دوبارہ غلطی نہ ہو جائے۔ بہرحال! گناہوں کو باقاعدہ اہتمام کرکے اس کو یاد کرنا اور اس کا وظیفہ بنالینا درست نہیں۔

اپنی حقیقت پیش نظر رکھنے کیلئے یاد رکھنا

۳۔ گناہوں کو یاد کرنے کی تیسری صورت یہ ہے کہ اجمالی طور پر انسان ذہن میں رکھے کہ میری حالت تو یہ ہے کہ مجھ سے ایسے ایسے گناہ سرزد ہوئے تھے، یہ اور بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے وہ گناہ معاف فرما دیے، لہٰذا میں اپنی ذات کے اعتبار سے کچھ بھی نہیں، میرا کوئی بھروسہ نہیں، کسی بھی وقت مجھ سے گناہ سرزد ہو سکتا ہے جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے بچنے کی توفیق نہ ہو۔ میں ایسا گندہ تھا، یہ تو ان کا کرم ہے کہ مجھے نواز دیا اور یہ تو ان کا انعام ہے کہ ان سب غلطیوں کے باوجود مجھے معاف کر دیا اور میری توبہ قبول فرمائی ورنہ میں تو اس لائق نہیں تھا۔ لہٰذا اپنی حقیقت پیش نظر رکھنے کی غرض سے اور اپنے آپ کو عجب سے، تکبر سے، خود پسندی سے، تعلّی سے بچانے کے لئے

گناہوں کو ذہن میں رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔

تعریف کے وقت اپنی حقیقت سوچو

اگر کوئی شخص آپ کی تعریف کرے کہ آپ بڑے اچھے ہیں، آپ بڑے عالم ہیں، آپ بڑے متقی پرہیزگار ہیں، آپ بڑے عبادت گزار ہیں، اس کا بھی علاج یہ ہے کہ انسان اس وقت یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اوپر میری اچھی حالت ظاہر کر دی، اس لئے یہ شخص میری تعریف کر رہا ہے، اگر میری حقیقت اس کو پتہ چل جائے تو یہی شخص مجھ سے نفرت کرے اور مجھ پر تھوتھو کرے، اس لئے کہ میری اصلیت تو یہ ہے کہ میں ان گناہوں میں مبتلا تھا، البتہ اللہ جل جلالہ نے اپنے فضل سے پردہ پوشی فرما رکھی ہے، اس کو میری حقیقت کا علم نہیں۔ لہٰذا جو حضرات صوفیاء کرام یہ فرماتے ہیں کہ اپنے گناہوں کو بھولو نہیں، ان کا مقصد یہ تیسری صورت ہے۔

بہرحال، گناہوں کو یاد رکھنے کے تین مقاصد ہوتے ہیں۔ نمبر ایک: لذت لینے کے لئے یاد کرنا، یہ تو گناہ ہی گناہ ہے، نمبر دو: ان گناہوں کو یاد کر کے اس میں شک کرنا کہ پتہ نہیں وہ گناہ معاف ہوئے یا نہیں، یہ صورت بھی پسندیدہ نہیں، نمبر تین: اپنی حقیقت اور اصلیت سامنے رکھنے کے لئے گناہ کو یاد کرنا، یہ تیسری صورت مناسب ہے۔

گناہ وظیفہ بنانے کی چیز نہیں

اب یہ تینوں صورتیں ایسی ہیں کہ ان کا تعلق گناہوں کو یاد کرنے سے

ہے، لیکن تینوں کے حکم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مشائخ جب اپنے مریدین کی تربیت فرماتے ہیں تو وہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اس شخص کے لئے کونسی صورت مناسب ہے۔ بعض حضرات نے دوسری اور تیسری صورت کے درمیان فرق کو نہیں سمجھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے مریدین کو یہ حکم دیدیا کہ روزانہ تہجد کے وقت اپنے ایک ایک گناہ کو یاد کیا کرو، چنانچہ ایک صاحب میرے پاس آئے اور بتایا کہ ہمارے شیخ نے یہ تعلیم دی ہے کہ تہجد میں جب اٹھو تو پہلے تہجد کی نماز پڑھو اور نماز پڑھنے کے بعد ان تمام گناہوں کو یاد کرو جو تم نے اب تک کئے ہیں اور ایک دو تین چار کر کے ان کی فہرست بناؤ اور پھر ان گناہوں سے استغفار کرو۔ میں نے کہا کہ یہ گناہوں کی بھی کوئی تسبیح ہے کہ روزانہ صبح و شام گناہوں کی تسبیح پڑھا کرو، اس کی کوئی حقیقت نہیں، سب غلط ہے، بس اجمالی طور پر اپنے گناہوں کو پیش نظر رکھے کہ میری حقیقت تو یہ تھی، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے ان گناہوں کے دلدل سے نکال دیا، لہٰذا میرے لئے یہ کوئی ناز کا موقع نہیں، فخر و تکبر اور عجب کا موقع نہیں۔

صرف توبہ کر لینا کافی ہے

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ:

اگر کسی کو دل سے حقیر سمجھا یا کسی پر حسد کیا یا کوئی اخلاق مذمومہ جس کا تعلق دوسرے سے ہو، اس کا ارتکاب دل سے کیا لیکن ہاتھ اور زبان سے کوئی قصور نہیں کیا تو یہ

بھی حقوق العباد میں داخل ہے یا نہیں اور اس کو بھی
معاف کرانا چاہئے یا نہیں؟

جواب میں حضرت والا نے فرمایا کہ:

چونکہ اس سے کسی کو ضرر نہیں پہنچا، اس لئے یہ حقوق
العباد نہیں ہوئے، صرف توبہ الی اللہ اور اصلاح آئندہ
کافی ہے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۵)

دوسرے کے متعلق دل میں بُرا خیال آنا حق العبد کا ضیاع نہیں

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے شخص کے متعلق دل میں بُرے خیالات آ گئے، مثلاً حسد کا خیال دل میں آ گیا اور یہ دل چاہا کہ یہ ذلیل ہو جائے اور اس کی جو ترقی ہو رہی ہے، وہ ترقی رک جائے، لیکن صرف دل چاہا، اس دل کے چاہنے پر آگے کوئی عملی اقدام نہیں کیا، نہ ہی کسی کے سامنے اس کی بُرائی کی، نہ کسی سے اس کی غیبت کی، نہ چغلی کی اور نہ ڈانٹ ڈپٹ کی۔ یا دل میں کسی کی طرف سے بُرائی آ گئی اور دل سے اس کو حقیر سمجھا اور کسی دوسرے مسلمان کو حقیر سمجھنا بڑے گناہ کی بات ہے، لیکن اس حقیر سمجھنے کے نتیجے میں اس کی کوئی توہین نہیں کی، اس کی کوئی بے عزتی نہیں کی، اس کو بُرا بھلا نہیں کہا، اب اگر ان باتوں کے بارے میں یہ کہا جائے کہ اس شخص نے حق العبد کو ضائع کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب تک وہ بندہ معاف نہ کرے اس وقت تک معاف نہیں ہوگا۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ ''حقوق العباد'' میں داخل نہیں، صرف توبہ کر لینا کافی ہے۔

دوسرے کی حقارت کا خیال سوچ سوچ کر لانا

اس کے بارے میں تھوڑی سی تفصیل عرض کردوں، وہ یہ کہ اگر دوسرے شخص کے بارے میں حسد کا، حقارت کا اور بُرائی کا خیال دل میں پیدا ہو رہا ہو تو یہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو اختیار کے بغیر دوسرے کے بارے میں دل میں خیال آ گیا یا باقاعدہ سوچ سوچ کر دوسرے کی حقارت کا خیال دل میں لا رہا ہے۔ اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جو فرمایا کہ اس خیال کی طرف سے توبہ کرنی چاہئے، یہ اس خیال کے بارے میں ہے جو آدمی سوچ سوچ کر دل میں لا رہا ہے، کیونکہ جب اپنے اختیار سے خیال دل میں لائے گا تو وہ گناہ ہوگا، لیکن چونکہ اس کے ذریعہ دوسرے کو کوئی نقصان اور ضرر نہیں پہنچا، اسلئے یہ حق العبد نہیں بنا، لہٰذا اس خیال کی طرف سے صرف توبہ کر لینا کافی ہے کہ یا اللہ! مجھ سے غلطی ہوگئی، معاف فرما دیجئے، امید ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیں گے، دوسرے سے معاف کرانے کی ضرورت نہیں۔

غیر اختیاری طور پر خیال آنا

دوسری صورت یہ ہے کہ غیر اختیاری طور پر دوسرے کے بارے میں خیال آ رہا ہے کہ فلاں شخص ایسا ہے، فلاں شخص ایسا ہے، چونکہ یہ خیال اختیار سے باہر ہے، اس وجہ سے ایسے خیال کا آنا گناہ تو نہیں اور اس خیال پر انشاء اللہ گرفت بھی نہیں ہوگی اور عذاب اور مؤاخذہ بھی نہیں ہوگا اور اس سے توبہ کرنے کی بھی ضرورت نہیں، لیکن یہ بھی خطرناک حالت ہے، کیونکہ یہ

حالت تمہیں کسی وقت بھی گناہ کے اندر مبتلا کر دے گی، یا تو بالآخر اپنے اختیار سے اس کی بُرائی دل میں لاؤ گے یا اس خیال کے نتیجے میں کوئی ایسا عمل تم سے سرزد ہو جائے گا جو گناہ ہوگا۔ لہٰذا یہ غیر اختیاری بھی گناہ کے قریب پہنچانے والی چیز ہے۔ اس کے دو علاج ضروری ہیں۔

اس خیال کو بُرا سمجھو

ایک علاج یہ ہے کہ تمہارے دل میں دوسرے کی حسد کا جو غیر اختیاری خیال آ رہا ہے یا تحقیر کا خیال آ رہا ہے، اس خیال کو دل سے بُرا سمجھو کہ میرے دل میں جو یہ خیال آ رہا ہے، یہ اچھا خیال نہیں، بُرا خیال ہے اور اس خیال سے بھی بچنے کی کوشش کرے۔

اس کے حق میں دعا کرو

دوسرا علاج یہ ہے کہ جس شخص کی طرف سے تمہارے دل میں حسد پیدا ہو رہا ہے، اس کے حق میں دعا کرو کہ اے اللہ! اس شخص کو دین و دنیا میں ترقی عطا فرمائیے۔ اب دل تو تمہارا یہ چاہ رہا ہوگا کہ یہ شخص مٹی میں مل جائے اور ذلیل ہو جائے، لیکن زبان سے یہ دعا کر رہے ہو کہ اے اللہ! اس کو دین و دنیا کی ترقی عطا فرمائیے، اس دعا کے وقت دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن دل پر یہی آرے چلانے مقصود ہیں۔ اور یہ سوچو کہ اس شخص کے ذلیل ہونے سے اور اس کو تکلیف پہنچنے سے میرا کیا فائدہ ہے؟ لہٰذا اس کے لئے دعا کرو کہ یا اللہ! اس کا درجہ بلند فرمائیے۔ جب یہ دو علاج کرلو گے تو پھر انشاء اللہ وہ غیر

اختیاری خیالات تمہیں آگے چل کر نقصان نہیں پہنچائیں گے اور تمہیں گناہ کے اندر مبتلا نہیں کریں گے۔

اگر توبہ کے بعد حقوق العباد کی ادائیگی کا موقع نہ ملے؟

ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

> جو شخص توبہ کر کے مر جائے اور اس کو توبہ کے بعد اداء حقوق کا موقع نہ ملے تو توبہ سے اس کے لئے حقوق العباد بھی معاف ہو جائیں گے، یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو خوش کر کے ظالم کی مغفرت فرمائیں گے۔ توبہ نہ کرنے کی حالت میں اللہ تعالیٰ کو اختیار ہے کہ خواہ اس کو سزا دیں یا بدون سزا ہی بخش دیں اور مظلوم کو جنّت کی نعمتوں سے خوش کر دیں۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۵)

حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوتے

یہ مسئلہ بار بار عرض کر چکا ہوں کہ حقوق العباد کا عام حکم یہ ہے کہ صرف توبہ کر لینے سے وہ حقوق معاف نہیں ہوتے جب تک اس کو یا تو ادا نہ کر دے یا صاحب حق اس کو معاف نہ کر دے، لہٰذا اگر آپ نے ایک گوشہ میں بیٹھ کر اللہ جل شانہ سے اپنے سارے گناہوں کی طرف سے توبہ کر لی لیکن آپ نے جو دوسرے لوگوں کے پیسے مار رکھے ہیں، وہ محض توبہ سے معاف نہیں ہوں گے، جن کے پیسے تمہارے ذمے ہیں ان کو یا تو ادا کرو یا صاحب حق سے خوش دلی

سے معاف کراؤ، زبردستی معاف کرانا بھی کافی نہیں۔ اسی طرح اس کے علاوہ اور جسمانی یا نفسانی حقوق ہیں، کسی کو کوئی تکلیف پہنچائی ہے یا کسی کا دل دکھایا ہے، ان سب حقوق کا معاملہ یہ ہے کہ جب تک وہ صاحب حق معاف نہیں کرے گا اس وقت تک یہ حقوق معاف نہیں ہوں گے، چاہے کتنی توبہ استغفار کرلو۔ بہرحال! حقوق العباد کے بارے میں عام حکم یہ ہے جو میں نے عرض کر دیا۔

اللہ تعالیٰ بندوں سے معاف کروادیں گے

لیکن اللہ جل شانہ کی بارگاہ کریم کی بارگاہ ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص ایسا ہے جس نے سچے دل سے توبہ تو کرلی اور ارادہ بھی کرلیا کہ جن لوگوں کے حقوق میرے ذمے واجب ہیں، ان تمام صاحب حقوق کو ان کے حقوق ادا کردوں گا، اگر کسی کے پیسے میرے ذمے واجب ہیں تو اس کے پیسے ادا کروں گا، اگر کسی کی میں نے بُرائی کی ہے یا کسی کی غیبت کی ہے تو اس سے معافی مانگوں گا، اگر کسی کو ستایا ہے تو اس کی تلافی کروں گا، لیکن اس شخص کو توبہ کرنے کے بعد اداء حقوق کا موقع نہ مل سکا بلکہ اداء حقوق کی کوشش شروع کی ہی تھی کہ اس کا انتقال ہوگیا۔ ایسے شخص کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ ایسی صورت میں اللہ جل جلالہ توبہ ہی سے اس کے حقوق العباد بھی انشاء اللہ معاف فرمادیں گے اور اس کا طریقہ یہ فرمائیں گے کہ اصحاب حقوق کو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہم تمہیں یہ نعمتیں دیتے ہیں، تم ہمارے اس بندے کو معاف کردو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ حقوق العباد کے بارے میں یہ جو حکم ہے کہ وہ اصحاب حقوق کے معاف کئے بغیر معاف نہیں ہوتے، یہ حکم اس وقت ہے جب اس شخص کو توبہ کرنے کے بعد اداءِ حقوق کا موقع میسّر آیا ہو اور تلافی کرنے کا موقع ملا ہو مگر پھر بھی اس نے وہ حقوق ادا نہ کئے ہوں اور ان کی تلافی نہ کی ہو تو وہ حقوق معاف نہیں ہوں گے، لیکن اگر تلافی کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تو پھر اللہ تعالیٰ اصحابِ حقوق سے معاف کرا دیں گے۔

بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ

اس کی دلیل وہ صحیح حدیث ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل کے ایک شخص کا واقعہ بیان فرمایا کہ اس شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا، اس کے بعد اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مجھ سے بہت بڑا گناہ ہوگیا، جب اللہ تعالیٰ کے پاس جاؤں گا تو میرا ٹھکانہ جہنم کے علاوہ اور کہیں نہیں ہوگا۔ چنانچہ وہ ایک پادری کے پاس گیا اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کر دیئے ہیں اور اب مجھے دل میں اپنے اس گناہ پر شرمندگی ہو رہی ہے، میں اس گناہ کے عذاب سے نکلنا چاہتا ہوں اور توبہ کرنا چاہتا ہوں، اس لئے آپ مجھے اس عذاب سے نکلنے کی تدبیر بتائیں۔ اس پادری نے ساری باتیں سن کر کہا کہ تیری جان چھوٹنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، کیونکہ تو ننانوے آدمیوں کو قتل کر چکا ہے، وہ سب مر چکے ہیں اور اب ان سے

معافی مانگنے کا کوئی راستہ نہیں، اگر ان کے بدلے میں تیرے سے قصاص لیا جائے اور تیرے کو قصاصاً قتل بھی کر دیا جائے تو ایک جان کے بدلے ایک جان ہو جائے گی، پھر اٹھانوے جانوں کا کیا ہوگا، لہٰذا تیرے بچنے کا کوئی راستہ نہیں، تو جہنمی ہے، اس شخص نے کہا کہ ننانوے قتل تو میں نے کر دیئے ہیں، ایک اور سہی، چنانچہ اس نے پادری کو قتل کر کے سو کا عدد پورا کر دیا۔

اس کے بعد وہ شخص کسی اور کے پاس گیا اور اس سے اپنا قصہ ذکر کیا، اس نے کہا کہ تو اللہ تعالیٰ سے توبہ کر اور فلاں علاقے میں نیک لوگوں کی بستی ہے تو اس بستی میں چلا جا اور وہاں پر نیک لوگوں کی صحبت اختیار کر، اس کے نتیجے میں تیری حالت بہتر ہوگی اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ تجھے معاف فرما دیں گے۔ چنانچہ وہ شخص اس خیال سے کہ اب میں وہاں جا کر اپنی زندگی میں تبدیلی لاؤں گا اور وہاں کے لوگوں کی صحبت اختیار کروں گا اور گناہوں سے معافی مانگنے کا جو طریقہ ہوگا اس کو اختیار کروں گا، یہ سب باتیں سوچ کر اس بستی کی طرف چل پڑا، ابھی راستے میں ہی تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کی روح لینے کے لئے ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب دونوں وہاں پہنچ گئے اور ان کے درمیان جھگڑا ہوگیا، ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ ہمارا آدمی ہے اور جنت میں جانے کے قابل ہے، اس لئے کہ یہ شخص توبہ کر کے گھر سے نکلا تھا، اور ملائکہ عذاب نے کہا کہ یہ ہمارا آدمی ہے، اس لئے کہ اس کی گردن پر سو آدمیوں کے قتل کا گناہ ہے، یہ جہنم کے قابل ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان فرشتوں کے درمیان یہ فیصلہ فرمایا کہ یہ دیکھو کہ یہ شخص کس بستی سے

زیادہ قریب ہے؟ چنانچہ دونوں بستیوں کے درمیان فاصلہ ناپا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ نیک لوگوں کی بستی جس کی طرف وہ جا رہا تھا، ایک ہاتھ زیادہ قریب تھا اس بستی کے مقابلے میں جس بستی سے وہ چلا تھا، اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما دیا کہ بس اس کو ملائکہ رحمت لیجائیں، یہ جنتی ہے۔

حدیث کا مطلب

علماء کرام نے اس حدیث کی تشریح میں فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اس آدمی کے ذمے سو آدمیوں کا قتل تھا، لیکن اللہ جل شانہ ان مقتولین کو اس طرح راضی فرما دیں گے کہ وہ لوگ اپنے اپنے حقوق کو اس کے حق میں معاف کر دیں گے۔ لیکن یہ صورت اس وقت ہے جب آدمی ان حقوق کی تلافی کی پوری کوشش کر چکا ہو اور پھر اسکا انتقال ہو گیا ہو، اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ راستہ نکالا ہے۔

صلوٰۃ التوبہ پڑھکر توبہ کرنے کی مصلحتیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

اگر گناہ صادر ہو جائے تو فوراً دو رکعت نماز توبہ کی نیت سے پڑھو اور پھر توبہ کرو۔ اس طرح توبہ کرنے میں متعدد مصلحتیں ہیں۔ (۱) "اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ" یعنی نیکیاں گناہوں کو زائل کرتی ہیں۔ (۲) نماز کے بعد توبہ کرنے میں دل حاضر ہوگا اور قبول

توبہ کے لئے حضور قلب ضروری ہے۔ (۳) چونکہ نفس کو
نماز سے شاق ہے، اس لئے نفس گناہوں سے گھبرائے
گا کہ کہاں کی علّت سر لگی بلکہ شیطان بھی گناہ کرانا
چھوڑ دے گا، کیونکہ وہ دیکھے گا کہ میں اس سے دس گناہ
کراؤں گا تو یہ بیس رکعتیں پڑھے گا، گناہ تو توبہ سے
معاف ہو جائے گا اور یہ بیس رکعتیں اس کے پاس نفع
میں رہیں گی۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۶)

نیکیاں بُرائیوں کو مٹا دیتی ہیں

فرمایا کہ توبہ کرنے کے لئے دو رکعت پڑھنے میں کئی فائدے ہیں، ایک فائدہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

اِنَّ الْحَسَنَاتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّئَاتِ

یعنی نیکیاں بُرائیوں کو زائل کر دیتی ہیں، برائیوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں، مثلاً کوئی صغیرہ گناہ آپ سے سرزد ہوا، آپ نے وضو کرلیا تو اس وضو کے نتیجے میں وہ گناہ معاف ہوگیا، یا نماز پڑھ لی تو وہ گناہ معاف ہوگیا۔ کیونکہ نیکیاں بُرائیوں کو زائل کرتی رہتی ہیں، لہٰذا جب صلوٰۃ التوبہ کی نیت سے دو رکعتیں پڑھو گے تو صغیرہ گناہ تو خود ہی معاف ہو جائیں گے۔

نماز کے بعد دل حاضر رہتا ہے

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ نماز کے بعد توبہ کرنے میں دل حاضر رہتا ہے اور

اس وقت خشوع وخضوع ہوتا ہے اور توبہ کے لئے حضور قلب ضروری ہے۔

شیطان گناہ کرانے سے گھبرائے گا

تیسرا فائدہ ہے کہ آئندہ بھی شیطان گناہ کرانے سے گھبرائے گا اور یہ سوچے گا کہ اگر میں نے اس سے گناہ کرا بھی لیا تو یہ شخص دو رکعت پڑھ کر توبہ کرے گا، اس کے نتیجے میں توبہ سے وہ گناہ معاف ہو جائے گا اور دو رکعتیں اس کو نفع میں حاصل ہو جائیں گی، لہٰذا شیطان یہ سوچے گا کہ بہتر یہ ہے کہ اس سے گناہ ہی مت کراؤ، اس سے گناہ نہ کرانا بہتر ہے۔ اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب بھی کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو صلوٰۃ التوبہ کی نیت سے دو رکعت پڑھ کر توبہ کرلیا کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان تمام باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، اور گناہوں سے بچتے ہوئے زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

فرمانبرداری کے ساتھ جینا

دیکھئے! جیتے وہ بھی ہیں جو نافرمانی کر کے جیتے ہیں اور جیتے وہ بھی ہیں جو فرمانبرداری کر کے جیتے ہیں، جو فرمانبرداری کر کے جیتے ہیں انہیں فرمانبرداری کر کے موت نہیں آجاتی بلکہ اگر حقیقت شناس نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ جیتے وہی ہیں جو فرمانبرداری کر کے جیتے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ
اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۔ (سورۃ الانفال، آیت ۲۴)

یعنی اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کا حکم مانو جس وقت بلائیں تم کو اس کام کی طرف جس میں تمہاری زندگی ہے۔ لہٰذا حقیقی زندگی تو وہی ہے جو ان کی اطاعت میں گزرے اور جو زندگی ان کی نافرمانی میں گزرے، وہ دیکھنے میں تو زندگی نظر آرہی ہے لیکن حقیقت میں موت سے بدتر ہے۔

زندگی کا لطف اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں ہے

واقعہ یہ ہے کہ زندگی کا لطف اور زندگی کا کیف بھی انہی لوگوں کو حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری میں زندگی گزارتے ہیں اور جو گناہ کی زندگی ہے، وہ دیکھنے میں چاہے مزے کی زندگی نظر آئے لیکن اس زندگی کے اندر سکون نہیں، وہ کھوکھلی زندگی ہے۔ اور دنیا کی کھوکھلی زندگی کی لذتوں کے شیدائی خودکشی کر کے مر رہے ہیں، اس لئے کہ باوجود ہزار لذتوں کے سکون قلب میسر نہیں۔ اور یہ سکون کس طرح حاصل ہو؟ قرآن کریم نے فرمایا:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (سورۃ الرعد، آیت ۲۸)

یعنی اطمینان تو اللہ تعالیٰ کے ذکر سے حاصل ہوتا ہے، لہٰذا پُرکیف زندگی، پُرلطف زندگی، عافیت، آرام اور راحت کی زندگی وہی ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت میں گزرے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم سب کو سکون اور راحت والی زندگی عطا فرمائے۔ آمین۔

دعا

رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَکُوْنَنَّ

مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ۔ رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَا فَنَا فِیْ اَمْرِنَا وَ ثَبِّتْ اَقْدَا مَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ ۔ یَا مصرف القلوب صرف قلوبنا علی طاعتک، اَللّٰھُمَّ اِنا نَسْئَلُکَ التوفیق لمحابک من الاعمال وَصِدْقَ التوکل علیک وَ حُسْنَ الظَّنِّ بِکَ، اَللّٰھُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَا صِیْنَا وَجَوَارِحَنَا بِیَدِکَ، لَمْ تُمَلِّکْنَا مِنْھَا شَیْئًا فَاِذَا فَعَلْتَ ذَالِکَ بنا فَکُنْ اَنْت وَلِیَّنَا وَاھْدِنَا اِلٰی سَوَاءِ السَّبِیْلِ اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ مِنْ خَیْرِ مَا سَئَلَکَ مِنْہُ عَبْدُکَ وَنَبِیُّکَ محمدٌ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و نعوذبک من شرما استعاذک منہ عبدک و نبیک محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التّواب الرحیم، وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقہ محمد وآلہ و اصحابہ اجمعین ۔ آمین برحمتک یا ارحم الراحمین ۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مجلس نمبر ۷۹

گناہوں کا تریاق۔ توبہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔ رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر؛ ۵
مجلس نمبر : ۷۹

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

گناہوں کا تریاق۔توبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔

اَمَّا بَعْدُ!

حضرت مولانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ ملفوظ

ارشاد فرمایا کہ:

حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میرے بندے اگر زمین و آسمان کے برابر بھی گناہ لے کر میرے پاس آئیں اور مجھ سے مغفرت چاہیں تو میں سب کو بخش دوں گا اور گناہوں کی کثرت کی پرواہ نہ کروں گا۔ پس عمر گزشتہ کے ضائع ہونے کا بھی علاج موجود ہے، لاعلاج کوئی مرض نہیں، وہ علاج یہ ہے کہ توبہ کرو اور توبہ کا طریقہ بھی کسی شیخ ہی سے پوچھو اور جو کچھ وہ بتلائے پھر اس میں اپنی رائے نہ لگاؤ، آج کل خود رائی کا مرض بہت پھیل رہا ہے، اسی لئے لوگوں کو راستہ نہیں ملتا۔

(انفاس عیسیٰ: ص ۱۹۷)

حسرت کے بجائے توبہ کرلو

اکثر و بیشتر لوگوں کے دلوں میں یہ خیال آتا ہے کہ ہم نے ساری عمر گناہوں میں ضائع کر دی۔ اس کا جواب حضرت والا اس ملفوظ میں یہ دے رہے ہیں کہ بیٹھے ہوئے حسرت کرتے رہنا کہ ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی، یہ حسرت کرنے سے کیا فائدہ؟ اگر آپ نے اپنی عمر ضائع کر دی ہے تو اس کا علاج بھی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کرلو، کوئی مرض لاعلاج نہیں۔

گناہ مایوسی پیدا نہ کرے

اس ملفوظ کے ذریعہ حضرت والا بتلانا چاہتے ہیں کہ گناہ کی شدّت ہو یا کثرت ہو، ان میں کوئی چیز بھی تمہارے اندر مایوسی پیدا نہ کرے۔ یعنی چاہے کتنا ہی بڑا گناہ کیا ہو یا کتنے ہی زیادہ گناہ کیے ہوں، چاہے زمین و آسمان بھر کر گناہ کیے ہوں، اس کے بعد مغفرت چاہو تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں مغفرت کردوں گا۔ صاف صاف الفاظ میں قرآن کریم کے اندر فرمایا:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ
لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ
الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ○

(سورۃ الزمر: آیت ۵۳)

یعنی اے میرے بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے یعنی گناہ کیے اور معصیتوں کا ارتکاب کیا اور کفر میں شرک میں اور بدعات کے اندر مبتلا رہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، کیوں؟ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ بے شک تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔ اس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہوگی۔

شیطان مایوسی پیدا کرتا ہے

شیطان انسان کی راہ یہاں سے مارتا ہے کہ اس کے اندر یہ خیال ڈالتا

ہے کہ تو مردود ہوگیا، تونے ایسے ایسے گناہ کئے ہیں اور اتنے زیادہ گناہ کئے ہیں کہ اب تیری نجات کا کوئی راستہ نہیں، لہٰذا اب تو جو چاہے گناہ کر، اس طرح اس کو راستے سے بھٹکا دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم سے کیسا ہی گناہ سرزد ہوا ہو اور کتنے ہی گناہ سرزد ہوئے ہوں، میرے پاس لوٹ آؤ۔

توبہ کا بار بار ٹوٹ جانا

بعض اوقات یہ خیال آتا ہے کہ ہم توبہ کرتے ہیں لیکن وہ گناہ پھر سرزد ہو جاتا ہے اور توبہ ٹوٹ جاتی ہے، پھر توبہ کرتے ہیں پھر ٹوٹ جاتی ہے، بار بار ایسا ہوتا رہتا ہے، اس سے طبیعت میں مایوسی ہونے لگتی ہے کہ میری اصلاح کی کوئی توقع نہیں، کیونکہ اللہ کے بندے توبہ کرکے اس پر ثابت قدم رہتے ہیں، لیکن میں توبہ کرتا ہوں وہ توبہ ٹوٹ جاتی ہے، پھر توبہ کرتا ہوں پھر ٹوٹ جاتی ہے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ یہ بھی کوئی مایوسی کی بات نہیں، اتنی بات تو ضرور ہے کہ اپنی طرف سے توبہ پر قائم رہنے کی پوری کوشش کرو اور کرتے رہو اور گناہ پر جرأت پیدا نہ کرو، پھر بھی اگر غلطی ہو جائے تو توبہ کرلو، پھر غلطی ہو جائے پھر توبہ کرلو۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ۔

(سورۃ البقرۃ: آیت ۲۲۲)

اس آیت میں "التَّوَّابِیْنَ" کا لفظ لائے ہیں، حالانکہ توبہ کرنے والے کو تائب کہتے ہیں، لہٰذا اصل میں "تَائِبِیْنَ" کہنا چاہئے تھا مگر اس کے بجائے "تَوَّابِیْن" کا لفظ لائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے، لہٰذا اس کے معنیٰ ہوئے بہت توبہ کرنے والے اور کثرت سے توبہ کرنے والے۔

بار بار توبہ کی کیا ضرورت ہے؟

ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان سے گناہ سرزد ہوا اور وہ ان گناہوں سے توبہ کرکے فارغ ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کے حضور سارے گناہوں سے معافی مانگ لی اور اس پر جم گیا تو اب دوبارہ توبہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایسا شخص بار بار توبہ کرنے والا نہ ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ذکر ہی ان لوگوں کا ہو رہا ہے جن سے ایک مرتبہ غلطی ہوئی اور انہوں نے توبہ کرلی، پھر دوبارہ غلطی ہوئی پھر توبہ کرلی، پھر غلطی ہوئی پھر توبہ کرلی اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہوئے۔

لہٰذا اس آیت میں "تَوَّابُ" کا لفظ خود اس بات کی طرف دلالت کر رہا ہے کہ اپنی طرف سے تو پکی توبہ کرو اور پھر اس توبہ پر پوری طرح ثابت قدم رہنے کی کوشش کرو، لیکن تم پھر دوبارہ کہیں نہ کہیں پھسلو گے اور جب پھسل جاؤ تو اس وقت گھبرانا مت اور مایوس مت ہوجانا بلکہ دوبارہ ہمارے پاس لوٹ آنا۔ کیونکہ "توبہ" کا لفظ "تَابَ یَتُوْبُ" سے نکلا ہے، جس کے معنیٰ ہیں لوٹ آنا

اور رجوع کرنا، لہٰذا اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو کثرت سے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کثرت سے لوٹتے ہیں۔ اسلئے مایوسی کے کوئی معنی نہیں، بلکہ غلطی ہو جائے تو دوبارہ لوٹ آؤ، پھر غلطی ہو جائے پھر لوٹ آؤ۔

توبہ کے نتیجے میں گناہ کم ہوتے چلے جائیں گے

بس اس بات کا اہتمام کرلو کہ کوئی غلطی توبہ کے بغیر نہ گزرے، اور نہ گناہ ہو جانے کے بعد توبہ کرنے میں دیر لگاؤ بلکہ جیسے ہی غلطی ہو جائے فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلو۔ اور فوراً توبہ کرلو۔ جب یہ کرو گے تو اس عمل کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر یہ گناہ ہونا اور پھسلنا بھی کم ہوتا چلا جائے گا، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھیں گے کہ یہ میری طرف لوٹتا ہے تو اللہ تعالیٰ ایسے اسباب پیدا فرما دیں گے کہ پھر انشاء اللہ پھسلنا بھی کم ہو جائے گا۔ چنانچہ قرآن کریم میں فرمایا:

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا۔

(سورۃ التوبہ: آیت ۱۱۸)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو لفظ اپنے لئے استعمال فرمایا وہی لفظ بندوں کے لئے استعمال فرمایا، یعنی اللہ تعالیٰ بندوں کی طرف لوٹتے ہیں اور متوجہ ہوتے ہیں تاکہ بندے توبہ کرلیں اور لوٹ آئیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنّت یہی ہے کہ جو بندہ

بار بار رجوع کرتا ہے، استغفار کرتا ہے تو پھر اس کی حفاظت کرتے ہیں اور اس کو پھسلنے نہیں دیتے۔ چنانچہ ایک حدیث میں فرمایا کہ:

مَا اَصَرَّ من استغفر

(ترمذی، کتاب الدعوات، باب نمبر ۱۱۹، حدیث نمبر ۳۵۵۴)

یعنی جو بندہ گناہوں سے استغفار کرتا رہتا ہے، وہ گناہوں پر اصرار کرنے والوں میں شمار نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے یہ "استغفار" ہر مؤمن کے ہاتھ میں ایسا تریاق دیدیا ہے کہ جب کبھی نفس و شیطان تمہیں ڈس لیں تو فوراً یہ تریاق استعمال کرلو اور استغفار کرو اور توبہ کرو۔ لہٰذا کتنی ہی مرتبہ غلطی ہوگئی ہو، اس کی وجہ سے گھبراؤ نہیں اور مایوس مت ہو جاؤ بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

دل میلا ہو جائے تو اس کو دھلوالو

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متوسلین میں سے کسی نے حضرت سے عرض کیا کہ حضرت! جب ہم آپ کی مجلس میں بیٹھتے ہیں تو بڑی روحانیت اور لِلّٰھیت معلوم ہوتی ہے اور جب مجلس سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں تو پھر وہی دنیا کے قصے شروع ہو جاتے ہیں، جبکہ توبہ بھی کرلی اور استغفار بھی کرلیا لیکن پھر گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حضرت والا نے فرمایا کہ جب تم سفید کپڑے پہنتے ہو، یہ کپڑے ہمیشہ سفید رہتے ہیں یا کبھی میلے بھی ہو جاتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ کچھ دیر کے بعد میلے ہو جاتے ہیں۔ حضرت نے پوچھا کہ جب میلے ہو جاتے ہیں تو کیا کرتے ہو؟

ان صاحب نے جواب دیا کہ وہ دھوبی کو دیدیتے ہیں، جب وہ دھودیتا ہے تو پھر وہ سفید ہو جاتا ہے۔ حضرت والا نے فرمایا کہ میں بھی دھوبی ہوں، جب تمہارے کپڑے میلے ہو جائیں تو میرے پاس آجاؤ اور کپڑے دھلوالو اور پاک صاف ہو جاؤ۔ درحقیقت یہ توبہ گناہوں کے میل کچیل کو دھوتی ہے، ایک مرتبہ میل کچیل لگ گیا، توبہ کرلو، پھر لگ گیا پھر توبہ کرلو، البتہ عام کپڑوں کا معاملہ یہ ہے کہ جتنا اس کو دھوگے، کپڑا کمزور ہوتا جائے گا، رفتہ رفتہ پھٹ جائے گا، اور گناہوں کے میل کچیل کو دل سے جتنا دھوگے، اتنا ہی یہ دل مضبوط ہوگا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے اندر قوت آئے گی، پھر انشاء اللہ گناہوں کی تعداد میں بھی کمی آئے گی اور اس کی شدت میں بھی کمی آئے گی۔

ایک خوبصورت دُعا

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ کے ساتھ دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا

استبشروا وَاِذَا اَسَاؤا استغفروا

اے اللہ! مجھے ان لوگوں میں سے بنادے جو کوئی اچھا کام کریں تو خوش ہوں، نیک کام پر ان کو خوشی ہو اور جب کبھی غلطی ہو تو استغفار کریں۔ دیکھیے! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ سے مانگ رہے ہیں کہ یا اللہ! مجھے ایسا بنا

دیجئے۔ اگر یہ عادت پڑ گئی کہ ہر غلطی پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر کے استغفار کرنا ہے تو بس کامیابی کا دروازہ کھل گیا، انشاء اللہ پھر کامیابی ہوگی۔

ایسی تیسی میرے گناہوں کی

ہمارے بزرگ تھے حضرت بابا نجم احسن صاحب قدس اللہ سرّہٗ بڑے اچھے شعر کہا کرتے تھے، ایک شعر میں انہوں نے فرمایا:

دولتیں مل گئی ہیں آہوں کی
ایسی تیسی میرے گناہوں کی

مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ دولت عطا فرمادی کہ اپنے گناہوں پر ندامت ہونے لگی، دل سے آہیں نکلنے لگیں کہ ہائے مجھ سے یہ کیا ہوگیا اور توبہ کی توفیق ہوگئی تو بس پھر گناہوں کی ایسی تیسی ہوگئی۔ بہرحال! ایک مرتبہ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور اجمالی توبہ کرلو پھر اس کے بعد پکا ارادہ کرلو کہ اے اللہ! اپنے اختیار سے گناہ نہیں کروں گا، اے اللہ! میں ارادہ تو کر رہا ہوں لیکن اس ارادہ پر ثابت قدم رہنا میرے بس کا کام نہیں جب تک آپ کی طرف سے توفیق نہ ہو، لہٰذا اے اللہ! مجھے ثابت قدم رہنے کی توفیق بھی آپ ہی عطا فرمائیے۔

اللہ تعالیٰ سے باتیں کیا کرو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ

اللہ تعالیٰ سے بے تکلفی کے ساتھ باتیں کیا کرو اور یوں کہا کرو کہ یا اللہ! میں نے توبہ تو کرلی ہے اور اپنی طرف سے پکا ارادہ بھی کرلیا لیکن اس توبہ پر ثابت قدم رہنا میرے بس کا کام نہیں جب تک آپ کی طرف سے توفیق نہ ہو، لہٰذا یا تو مجھے اس توبہ پر استقامت عطا فرمادیں یا پھر مجھ سے آخرت میں مؤاخذہ نہ فرمایئے گا۔ پھر اگر بالفرض کوشش کے باوجود کسی وقت قدم پھسل گیا تو پھر توبہ کرلو، استغفار کرلو، بس ساری عمر یہی کرتے رہو، انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ بیڑا پار ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے مجھے بھی اور آپ سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

مجلس نمبر ۸۰

گناہوں کی تکمیل کیلئے گناہ چھوڑنے کا عزم

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر۔رمضان المبارک
اصلاحی مجالس: جلد نمبر: ۵
مجلس نمبر : ۸۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

گناہوں کی تکمیل کیلئے

گناہ چھوڑنے کا عزم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَ نَسْتَعِیْنُہٗ وَ نَسْتَغْفِرُہٗ وَ نُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلاَ مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلاَ ھَادِیَ لَہٗ وَأَشْھَدُاَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَأَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَنَبِیَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُہٗ وَ رَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا ۔ أَمَّا بَعْدُ!

چند روز سے توبہ کا بیان چل رہا ہے اور اصلاح نفس کے راستے میں سب سے پہلا قدم توبہ کی تکمیل ہے۔ آگے ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ

اللہ علیہ فرماتے ہیں:

اگر توبہ کے وقت عزمِ ترک فی المستقبل نہ ہو تو عزم عمل فی المستقبل بھی نہ ہو بلکہ عزم عمل سے ذہن خالی ہو، اگر اس طرح خالی الذھن ہو کر بھی توبہ ندامت کے ساتھ ہوگئی تو توبہ صحیح ہوگئی۔ (انفاس عیسیٰ: ص ۱۹۷)

تکمیل توبہ کی تین شرطیں

اس ملفوظ میں مختصر لفظوں میں بہت بڑا مضمون حضرت والا نے بیان فرمایا ہے جس میں ہم جیسے کمزوروں کے لئے بڑی تسلی کا سامان ہے۔ توبہ کے بارے میں تمام حضرات صوفیاءؒ یہ فرماتے ہیں کہ تین چیزوں سے توبہ کی تکمیل ہوتی ہے، پہلی چیز یہ ہے کہ جو گناہ سرزد ہوا ہے، دل سے اس پر ندامت اور شرمندگی ہو کہ مجھ سے یہ غلطی ہوگئی، دوسری چیز یہ ہے کہ اس گناہ کو فوراً چھوڑ دے، مثلاً ایک شخص نے جھوٹ بولا، اب اس جھوٹ سے توبہ کرنا چاہتا ہے تو پہلے تو ندامت پیدا کرے کہ مجھ سے یہ کیسی غلطی ہوگئی کہ میں نے یہ جھوٹ بولدیا اور پھر فوراً جھوٹ بولنا چھوڑ دے، تیسری چیز یہ ہے کہ آئندہ کے لئے یہ عزم کرے کہ میں آئندہ ہرگز یہ کام نہیں کروں گا، جب یہ تین چیزیں جمع ہو جاتی ہیں تو پھر توبہ کامل ہو جاتی ہے۔

تیسری چیز کے پائے جانے میں شک

جہاں تک پہلی دو چیزوں کا تعلق ہے یعنی اس گناہ پر نادم اور شرمندہ ہونا

اور اس گناہ کو چھوڑ دینا، ان دونوں پر عام طور پر عمل ہو جاتا ہے اور ان کے بارے میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ جہاں تک تیسری چیز کا تعلق ہے یعنی آئندہ کے لئے پختہ ارادہ کرنا کہ میں آئندہ ہرگز اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، اس میں یہ شبہ رہتا ہے کہ میرا یہ عزم کامل ہوا یا نہیں؟ جبکہ آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم کرنا توبہ کا لازمی جز ہے، جب اس میں شبہ پیدا ہو گیا تو اس کے نتیجے مین توبہ مشکوک ہوگئی، اور جب توبہ مشکوک ہوگئی تو گناہ معاف نہیں ہوں گے، کیونکہ اگر توبہ صحیح ہو تو اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی کا وعدہ ہے، لیکن اگر توبہ کے صحیح ہونے میں ہی شک ہوگا تو گناہ کے معاف ہونے میں بھی شک ہو جائے گا۔ بہر حال! اس تیسری چیز کے بارے میں اکثر و بیشتر دلوں میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے۔

رات کو سونے سے پہلے توبہ کرلیا کرو

ہمارے بزرگ حضرت بابا نجم احسن رحمۃ اللہ علیہ توبہ پر بہت زور دیا کرتے تھے۔

چنانچہ میں ایک دن ان کے پاس گیا تو اس وقت ایک نوجوان اپنے کسی کام سے ان کے پاس آیا ہوا تھا، اس نوجوان میں سر سے لے کر پاؤں تک دینداری کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ حضرت بابا صاحبؒ کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص بھی ان کے پاس آتا تو اس کے کان میں کوئی دین کی بات ڈال دیتے تھے، چاہے وہ کسی بھی مقصد سے آیا ہو، لہٰذا جب وہ نوجوان واپس جانے لگا تو آپ نے اس سے فرمایا کہ:

بیٹا ایک بات سنتے جاؤ، وہ یہ کہ لوگ دین کو بہت مشکل
سمجھتے ہیں کہ دین پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ہے، ارے
کچھ بھی مشکل نہیں، بس رات کو سونے سے پہلے تھوڑی
دیر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرلیا کرو۔

وہ نوجوان آدمی تھا، نہ نماز، نہ روزہ، نہ کوئی اور عبادت کرتا تھا لیکن حضرت والا نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی کہ بس توبہ کرلیا کرو۔

اللہ والے لوگوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں

اب نیا آدمی جو ناشناس ادا ہوگا وہ تو اس واقعہ کو دیکھ کر یہ سمجھے گا کہ حضرت نے اس کو کھلی چھٹی دیدی کہ تو جو چاہے کرتا رہ، نماز بھی نہ پڑھ، روزہ بھی نہ رکھ اور گناہ بھی کرتا رہ لیکن رات کو بیٹھ کر توبہ کرلیا کر۔ یہ چھوٹ دینا ان کے لئے کیسے درست ہوا؟

بات دراصل یہ ہے کہ وہ اللہ کے بندے جن کو اللہ تعالیٰ فہم عطا فرماتے ہیں، یہ حضرات لوگوں کو شکار کرتے ہیں اور شکار کرنے کے لئے جس طرح دانہ ڈلا جاتا ہے، اسی طرح ان لوگوں کا بھی شکار کرنے کا ایک طریقہ ہے، کیونکہ اگر اس نوجوان سے یہ کہہ دیتے کہ تو روزانہ پانچ وقت نماز پڑھا کر اور یہ جو بے ہودہ لباس پہن رکھا ہے اس کو چھوڑ اور تو نے داڑھی منڈائی ہوئی ہے، اس کو چھوڑ تو وہ نوجوان پہلے دن ہی بھاگ جاتا اور کبھی واپس نہ آتا۔ اس لئے حضرت نے اس سے صرف ایک بات یہ فرمادی کہ رات کو بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرلیا کر۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑ دیا

بات دراصل یہ ہے کہ اگر اس نوجوان نے اس بات پر عمل کرلیا کہ روزانہ رات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرنے لگا تو اس کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا تعلق جڑ گیا، کیونکہ اب تک وہ غفلت میں تھا، اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق کٹا ہوا تھا اور کبھی اس کے دل میں اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال بھی نہیں آتا تھا، اب جس وقت توبہ کرے گا تو ایک لمحہ کے لئے وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑے گا اور جب روزانہ اس پر عمل کرے گا تو یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنی طرف نہ کھینچ لیں۔ کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اَللّٰهُ يَجْتَبِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِىٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ۔ (سورۃ الشوریٰ: آیت ۱۳)

عام طور پر اس آیت کا ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور منتخب کرلیتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے جس بندے کے بارے میں ارادہ فرمالیا کہ اس کو ہدایت دینی ہے اور اس کو اپنا مقرب بنانا ہے تو اس کو اللہ تعالیٰ اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔ عام طور پر یہ ترجمہ کیا جاتا ہے۔

اس آیت کا دوسرا ترجمہ

لیکن ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فرمایا کرتے تھے کہ عربی جاننے والوں سے پوچھو تو وہ بتائیں گے کہ اس آیت کا ترجمہ یہ بھی

ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جو یہ چاہتا ہے کہ مجھے کھینچ لیا جائے۔ کیونکہ لفظ "یَشَاءُ" کے فاعل کی ضمیر جس طرح "اللہ" کی طرف لوٹ سکتی ہے، اسی طرح لفظ "مَنْ" کی طرف بھی لوٹ سکتی ہے. اور "یَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ" کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف اس شخص کو ہدایت دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس سے تعلق جوڑ لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ضرور کھینچ لیں گے

لہٰذا جب ایک بندے نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جوڑ لیا، چاہے تھوڑی دیر کے لئے تعلق جوڑا ہو اور کہا کہ یا اللہ! میں توبہ کرتا ہوں اور اے اللہ! مجھے اپنی طرف کھینچ لیجئے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ کھینچ ہی لیں گے۔ بہرحال! بندے کا کام یہ ہے کہ ذرا سا اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے اور اس سے مانگے کہ اے اللہ! مجھے آپ کیوں محروم فرماتے ہیں، مجھے بھی اپنی طرف کھینچ لیجئے اور اے اللہ! اگر میرے اندر شرائط نہیں پائی جاتیں تو وہ شرائط میرے اندر پیدا کر دیجئے، اگر میرے اندر وہ تقاضے اور اوصاف نہیں ہیں تو اے اللہ! ان اوصاف کو میرے اندر پیدا کرنا آپ کی قدرت میں ہے، اے اللہ! وہ اوصاف اور تقاضے میرے اندر پیدا کر دیجئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے مانگو اور جب ایک مرتبہ اللہ تعالیٰ سے تعلق جڑ گیا تو بس یہ تبدیلی کا نقطہ آغاز ہے۔ اب جو شخص غفلت میں زندگی گزار رہا ہے، اس کو نہ تو اللہ تعالیٰ کا خیال اور نہ رسول ﷺ کا

خیال، نہ نماز کا خیال، نہ روزے کا خیال، نہ آخرت کا خیال، نہ دین کا خیال، اس شخص کو حضرت نے یہ فرما دیا کہ تو رات کو بیٹھ کر توبہ کرلیا کر، اگر اس شخص نے اس پر عمل کرلیا ہوگا تو یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ شخص واپس نہ آیا ہو اور دین کی طرف نہ آیا ہو۔ بہرحال! دوسروں کی اصلاح کے لئے بزرگ یہ طریقے اختیار کرتے ہیں، اسی طرح حضرت بابا صاحب نے اس نوجوان کے کان میں یہ بات ڈال دی اور وہ چلا گیا۔

میرے دل میں عزم کے بارے میں اشکال

میں نے حضرت بابا صاحب سے عرض کیا کہ حضرت! میرے دل میں توبہ کے بارے میں یہ اشکال رہتا ہے کہ میں نے توبہ تو کرلی لیکن کیا پتہ کہ وہ توبہ صحیح ہوئی یا نہیں؟ کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ گناہ چھوڑنے کا جو عزم کیا ہے وہ پختہ ہوا یا نہیں، اس کا اطمینان نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ سے یہ تو کہدیا کہ اے اللہ! مجھ سے گناہ سرزد ہوگیا، میں آپ سے معافی مانگتا ہوں اے اللہ! مجھے معاف فرما دیجئے، اور وقتی طور پر اس گناہ کو چھوڑ بھی دیا لیکن آئندہ ساری عمر کبھی اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، یہ عزم پکا ہوا یا نہیں؟ اس کا اطمینان نہیں ہوتا اور یہ عزم توبہ کی تیسری شرط ہے، جب اس شرط کے پائے جانے میں شبہ ہوتا ہے تو توبہ کے درست ہونے میں بھی شبہ رہتا ہے کہ یہ توبہ درست ہوئی یا نہیں؟

آئندہ گناہ ہوجانے کا اندیشہ عزم کے منافی نہیں

حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میری بات سن کر فرمایا کہ

ارے بھائی! تم نے اپنے ذہن میں عزم کا بہت بڑا لمبا چوڑا معیار قائم کر رکھا ہے، ارے بھائی! عزم کے معنی یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ارادہ کرلو کہ میں یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا، پھر اگر دل میں یہ وسوسے، خدشات اور اندیشے آرہے ہیں کہ معلوم نہیں کہ میں اس عزم پر ثابت قدم رہوں گا یا نہیں؟ میں اس عزم کو پورا کرسکوں گا یا نہیں؟ یہ اندیشے اور وسوسے عزم کی صحت کے منافی نہیں۔

مثلاً اپنی طرف سے یہ عزم کرلیا کہ یا اللہ! اب میں جھوٹ نہیں بولوں گا، اب غیبت نہیں کروں گا، اب اپنی نگاہ غلط جگہ پر نہیں اٹھاؤں گا۔ اب اس عزم کے بعد دل میں یہ وسوسہ آرہا ہے کہ پتہ نہیں میں اس عزم پر قائم رہ سکوں گا یا نہیں؟ تو اس وسوسے کو آنے دو، کیونکہ یہ وسوسہ عزم کے مکمل ہونے میں مانع نہیں، بس عزم مکمل ہوگیا۔

پھر اللہ تعالیٰ سے استقامت طلب کرو

پھر اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! میں نے تو اپنی طرف سے عزم کرلیا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اس عزم پر کیسے قائم رہوں گا، اے اللہ! آپ ہی مجھے توفیق عطا فرمایئے، آپ ہی مجھے استقامت عطا فرمایئے اور آپ ہی مجھے اس عزم پر قائم اور دائم رکھئے۔ بس توبہ مکمل ہوگئی۔ اس لئے کہ ''عزم'' کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے ارادہ کرلینا، اب اس ارادہ پر میں کتنا قائم رہوں گا اور کتنا قائم نہیں رہوں گا، اس کی پیشنگوئی تو کوئی بھی نہیں کرسکتا، یہ کسی کے بس میں نہیں، یہ اختیار سے باہر ہے اور جب اختیار سے باہر ہے تو انسان

اس کا مکلف نہیں، کیونکہ انسان اپنے اختیاری امور کا مکلف ہے۔ حضرت بابا صاحب نے ایسی بات فرما دی کہ الحمدللہ، اس سے بڑا اطمینان ہوا اور تسلی حاصل ہوگئی۔

عزم عمل سے ذہن خالی ہونا چاہئے

بعد میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ ملفوظ نظر سے گزرا جس میں وہی بات حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی ہے جو حضرت بابا صاحب نے فرمائی، فرمایا کہ:

اگر توبہ کے وقت عزمِ ترک فی المستقبل نہ ہو تو عزم عمل فی المستقبل بھی نہ ہو بلکہ عزم عمل سے ذہن خالی ہو، اگر اس طرح خالی الذہن ہو کر بھی توبہ ندامت کے ساتھ ہوگئی تو توبہ صحیح ہوگئی۔

یعنی اصل بات تو یہ ہے کہ توبہ کے وقت گناہ نہ کرنے کا ارادہ ہو کہ میں آئندہ کبھی کسی قیمت پر بھی یہ گناہ نہیں کروں گا، لیکن اگر کسی وجہ سے اس ارادہ کا استحضار نہ رہا تو کم از کم اس گناہ کے دوبارہ کرنے کا بھی ارادہ نہ ہو بلکہ عزم عمل سے ذہن خالی ہو، یعنی نہ تو یہ ارادہ ہو کہ یہ گناہ کروں گا اور نہ یہ ارادہ ہو کہ یہ گناہ نہیں کروں گا، دونوں سے ذہن خالی ہو تب بھی توبہ درست ہے۔ کیوں درست ہے؟

توبہ ''ندامت'' ہی کا نام ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ویسے ہی اپنی طرف سے بات نہیں کرتے بلکہ اس کے پیچھے کوئی دلیل ضرور ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی دلیل کے طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث کی طرف اشارہ فرمایا کہ:

الندم توبة۔

(مسند احمد، ج اول، ص ۳۷۶)

یعنی توبہ کا اصل عنصر اور اصل جوہر جس سے توبہ وجود میں آتی ہے، وہ ہے ندامت اور اللہ تعالیٰ کے سامنے پشیمان ہونا، نادم ہونا، شرم سار ہونا۔ اب ظاہر ہے کہ جو شخص اپنے گناہ پر نادم ہے تو اس کے دل میں یہ بات ہے کہ یا اللہ! میں نہیں چاہتا کہ میں یہ عمل دوبارہ کروں، بس اس ندامت کے نتیجے میں توبہ درست ہوگئی اور جب توبہ درست ہوگئی تو انشاء اللہ وہ گناہ بھی معاف ہوگیا۔ اب اس وسوسہ کے اندر مت پڑو کہ پتہ نہیں عزم مکمل ہوا یا نہیں۔

توبہ کے بعد یہ دعا کرلو

البتہ ہر توبہ کے بعد یہ دعا ضرور کرلو کہ اے اللہ! میں نے یہ توبہ تو کرلی لیکن اے اللہ! جب تک آپ توفیق نہیں دیں گے، میں اس توبہ پر قائم نہیں رہ سکوں گا، اے اللہ! اپنی رحمت سے اس توبہ پر قائم رہنے کی آپ ہی توفیق عطا فرما دیجئے۔ فرض کرو کہ پھر غلطی سے کسی وقت بھٹک گئے تو پھر توبہ کرلو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ مرتے دم تک کھلا رکھا ہے، جب تک نزع کی

کیفیت اور سکرات الموت کی کیفیت طاری نہیں ہو جاتی، اس وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے، لہٰذا غلطی ہو جائے پھر لوٹ آؤ۔

توبہ کے بھروسہ پر گناہ مت کرو

البتہ کوئی شخص اس سے یہ نہ سمجھے کہ اب گناہ کی چھوٹ ہوگئی، بس گناہ کرتے رہو اور توبہ کرتے رہو اور گناہ پر جرأت حاصل کرلو۔ یہ نہیں، بلکہ اپنی طرف سے اس بات کا پورا اہتمام کرنا ہے کہ گناہ سے بچے، آدمی اگر گناہوں پر جری ہو جائے۔ العیاذ باللہ۔ اور توبہ کی امید پر گناہ کا ارتکاب کرلے کہ بعد میں توبہ کرلوں گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے، یہ شیطان کا انتہائی خطرناک اور زہریلا داؤ ہے۔ یاد رکھئے! توبہ کے بھروسہ پر گناہ کا ارتکاب کرنا ایسا ہی ہے جیسے ''تریاق'' کے بھروسہ پر زہر پی لینا۔

بچھو کے کاٹے کا عمل

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کو سمجھانے کے لئے اپنا ایک واقعہ بیان فرمایا کرتے تھے کہ دیوبند میں سانپ، بچھو بہت ہوا کرتے تھے، آئے دن لوگوں کو کاٹتے رہتے تھے، اس لئے وہاں سانپ بچھو کے کاٹنے کے بہت سے عمل بھی ہوتے تھے، اگر وہ عمل کرلیا جائے تو وہ زہر اتر جاتا تھا۔ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی بچھو کے کاٹنے کا ایک عمل سیکھ لیا تھا، اگر کسی کو بچھو کاٹ لیتا تو حضرت والد صاحب وہ عمل فرماتے تو اسی وقت بلا تاخیر وہ درد ختم ہو جاتا اور زہر اتر جاتا، چنانچہ لوگ دور دور کے

دیہاتوں سے اپنے مریضوں کو لے کر والد صاحب کے پاس آیا کرتے تھے، آپ دم فرما دیتے، وہ درد فوراً ختم ہو جاتا۔ حضرت والد صاحب کا یہ عمل ہر جگہ مشہور ہو گیا۔

بچھو کے کاٹنے کا ایک واقعہ

حضرت والد صاحبؒ کے گھر میں ایک کوٹھری تھی جو بطور اسٹور کے استعمال ہوتی تھی، اس زمانے میں بجلی تو نہیں تھی، لالٹینوں کا زمانہ تھا، ایک دن ہماری والدہ صاحبہ اس کوٹھری سے کوئی چیز نکالنا چاہتی تھیں، گھر میں ایک لالٹین تھی جو اس وقت حضرت والد صاحب کے پاس تھی اور حضرت والد صاحب لالٹین کی روشنی میں لکھنے پڑھنے کا کام کر رہے تھے، ہماری والدہ صاحبہ نے والد صاحب سے کہا کہ میں ذرا کوٹھری میں جانا چاہتی ہوں، آپ یہ لالٹین تھوڑی دیر کے لئے مجھے دیدیں تاکہ میں فلاں چیز اٹھالاؤں۔ حضرت والد صاحب چونکہ کچھ لکھنے میں مشغول تھے، اس کو چھوڑنا گراں ہو رہا تھا، والد صاحب نے فرمایا کہ یہ تو چھوٹی سی چیز ہے، بغیر لالٹین کے اٹھالائیں۔ والدہ صاحبہ نے فرمایا کہ وہ چیز تو سامنے ہی رکھی ہے لیکن مجھے یہ خطرہ ہے کہ اگر میں نے اندھیرے میں وہاں پاؤں رکھ دیا تو کہیں مجھے کوئی بچھو نہ کاٹ لے، اس وقت حضرت والد صاحب کے منہ سے یہ بات نکلی کہ ”ارے میاں! اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو کیا ہوگا، میرے پاس آجانا، فوراً دم کر دوں گا، انشاء اللہ ٹھیک ہو جائے گا، مطلب یہ تھا کہ ویسے تو بچھو کے کاٹنے کا صرف احتمال ہی ہے، لیکن

اگر کاٹ بھی لیا تو مجھے دم کرنا تو آتا ہی ہے، دم کردوں گا۔

سارا عمل بیکار ہو گیا

اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ والدہ صاحبہ جیسے ہی کوٹھری میں داخل ہوئیں اور اندر پاؤں رکھا، بچھو نے کاٹ لیا، حضرت والد صاحب فرماتے ہیں کہ میں اٹھ کر فوراً ان کے پاس گیا اور جلدی سے وہی بچھو کے کاٹے کا عمل شروع کیا، اب میں وہ عمل کرتا ہوں لیکن وہ عمل اثر ہی نہیں کرتا۔ جس عمل سے سینکڑوں بچھوؤں کے کاٹے کا علاج کیا، وہی عمل آج کر رہا ہوں لیکن ذرہ برابر اثر نہیں ہو رہا ہے، اس عمل کی جتنی طاقت تھی وہ ساری صرف کر دی، مگر درد کی لہریں ختم ہی نہیں ہو رہی تھیں، بالآخر دوسروں سے علاج کرانے پر مجبور ہوئے، اپنا علاج سارا بیکار ہو گیا۔

کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کارگر نہیں

یہ واقعہ سنا کر فرماتے تھے کہ دیکھو! میں نے اس عمل کے بھروسے پر بچھو کے کاٹنے سے احتیاط نہ کی اور یہ خیال کیا کہ اگر بچھو نے کاٹ بھی لیا تو کیا ہے، عمل ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ایک سبق تو یہ دیا کہ یہ جتنے علاج ہیں، چاہے وہ علاج دواؤں سے ہوں یا وہ علاج عملیات سے ہوں، کوئی علاج اس وقت تک کارگر نہیں ہوتا جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو، ایک ہی دوا ایک مریض کو فائدہ کر رہی ہے اور ایک مریض کو نقصان کر رہی ہے

جبکہ دونوں کی بیماری ایک ہے۔

دوا اللہ تعالیٰ سے سوال کرتی ہے

ہمارے حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک معالج تھے ''ڈاکٹر ہاشمی صاحب'' اسی (۸۰) سال ان کی عمر تھی۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ میری ساری زندگی کی ڈاکٹری کا تجربہ یہ ہے کہ جب دوا مریض کے پیٹ میں جاتی ہے تو اندر جاکر اللہ تعالیٰ سے پوچھتی ہے کہ یا اللہ! کیا کروں؟ فائدہ کروں یا الٹی پڑ جاؤں؟ جب وہاں سے کوئی جواب ملتا ہے تو عمل کرتی ہے۔ بہرحال! حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ اس واقعہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک سبق تو یہ دیا کہ تم یہ جو اپنے عمل پر بھروسہ کئے بیٹھے ہو، یاد رکھو! اس عمل میں کچھ نہیں رکھا، کوئی وظیفہ، کوئی تعویذ، کوئی گنڈا اس وقت تک کارگر نہیں ہوتا جب تک ہمارا حکم نہ ہو، اس وظیفہ پر اور اس تعویذ پر بھروسہ کرلینا اور یہ کہنا کہ بیماری آجائے تو کیا، ہمارے پاس علاج موجود ہے، یہ بات غلط ہے۔ ایک تو اس واقعہ نے یہ سبق دیا۔

دوا کے بھروسہ پر بیماری کو دعوت مت دو

دوسرا سبق یہ دیا کہ انسان کے پاس کتنا ہی بہتر سے بہتر علاج موجود ہو، لیکن اس علاج کی موجودگی کی وجہ سے بیماری کو مت بلاؤ بلکہ بیماری سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو اور یہ دعا کرو کہ اے اللہ! ہم بیماری کے متحمل نہیں ہیں۔ بہرحال! حضرت والد صاحب اسی مضمون کو بیان کرنے کے لئے یہ واقعہ سنایا

کرتے تھے کہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرلینا، یہ ایسا ہے جیسے عمل کے بھروسہ پر بچھو سے کٹوا لینا، چونکہ دوا اور عمل موجود ہے، لہٰذا بچھو سے کٹوالوں، ارے! کیا پتہ کہ بچھو کے کاٹنے کے بعد دوا استعمال کرنے کا موقع بھی ملے گا یا نہیں؟ اور اگر دوا استعمال کرنے کا موقع مل بھی گیا تو وہ دوا کارآمد بھی ہوگی یا نہیں؟

توبہ کی مہلت ملے گی یا نہیں؟

لہٰذا جس وقت تم توبہ کے بھروسہ پر گناہ کا ارتکاب کرنے کا ارادہ کر رہے ہو، کیا پتہ کہ گناہ کے بعد توبہ کی مہلت بھی ملے یا نہ ملے؟ کیا اس بات کی گارنٹی ہے کہ گناہ کے بعد توبہ کی مہلت ضرور مل جائے گی؟ اور اگر بالفرض توبہ کی مہلت مل بھی گئی تو توبہ کی توفیق ملے گی یا نہیں؟ کیونکہ گناہ کے اندر نحوست ہوتی ہے، وہ نحوست یہی ہے کہ گناہ انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے غفلت پیدا کرتا ہے، انسان کو غافل بنا دیتا ہے، تم نے تو یہ سوچ کر گناہ کرلیا کہ بعد میں توبہ کرلوں گا، لیکن گناہ نے اپنی نحوست دکھائی اور تمہارے دل میں غفلت پیدا کردی اور گناہ کی لذت میں ایسے محو ہوئے کہ توبہ کرنے کا خیال ہی نہ آیا اور توبہ کرنے کی توفیق ہی نہ ہوئی۔

گناہ کے نتیجے میں ذوق خراب ہو جاتا ہے

پھر گناہ کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچتا ہے اور انسان کی عقل خراب کر دیتا ہے، گناہ کی وجہ سے انسان کی مَت الٹی ہو جاتی

ہے، اچھا عمل بُرا لگنے لگتا ہے اور بُرا عمل اچھا لگنے لگتا ہے۔ مثلاً اگر کسی شخص کا ذائقہ خراب ہو جائے تو اس کے نتیجے میں اچھی خاصی میٹھی چیز اسکو کڑوی لگنے لگتی ہے، اسی طرح گناہ کے نتیجے میں انسان کا ذوق خراب ہو جاتا ہے اور اس کی عقل ماری جاتی ہے، کڑوی چیز کو میٹھی اور میٹھی چیز کو کڑوی سمجھنے لگتا ہے، ایسی حالت میں پھر توبہ کی توفیق کیسے ہوگی؟ پھر انسان دوسرے گناہوں کی طرف اور بڑھ جاتا ہے۔

گناہ کا حجاب ختم ہو جاتا ہے

اور جب تک انسان گناہ نہیں کرتا تو اس کی طبیعت میں اس گناہ کو کرنے میں ایک رکاوٹ ہوتی ہے، ایک بند ہوتا ہے، جب تم نے توبہ کے بھروسہ پر اس گناہ کو ایک مرتبہ کرلیا تو وہ بند ٹوٹ گیا اور اب غلط کام کرنے کی جرأت پیدا ہوگئی، اب یہ جرأت تم سے اور گناہ کرائے گی۔ اس لئے کبھی بھی توبہ کے بھروسہ پر گناہ ہرگز مت کرو بلکہ ہر قیمت پر گناہ سے بچو۔

موت سے پہلے توبہ کا دروازہ کھلا ہے

البتہ اگر گناہ سے بچنے کی کوشش کے باوجود کسی وقت پھسل گئے اور غلطی ہوگئی اور گناہ میں مبتلا ہوگئے تو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے توبہ کا دروازہ کھول رکھا ہے اور مرتے دم تک کھلا رہے گا، جب چاہو آجاؤ اور توبہ کرلو۔ قرآن کریم نے صاف صاف فرمادیا کہ:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ

(سورۃ النسآء: آیت ۱۸)

یعنی توبہ اس شخص کی نہیں ہے جو ساری عمر اس بھروسہ پر گناہ کرتا رہا کہ جب مرنے لگوں گا تو توبہ کرلوں گا، پھر جب موت کا وقت آیا تو کہنے لگا کہ اب میں توبہ کرتا ہوں، ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔ ایسی توبہ تو فرعون نے بھی کرلی تھی جب دریا میں ڈوبنے لگا تو کہنے لگا:

آمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۔ آلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۔

(سورۃ یونس: آیات ۹۰، ۹۱)

یعنی میں اس ذات پر ایمان لاتا ہوں جس پر بنی اسرائیل ایمان لائے اور میں مسلمانوں میں سے ہوتا ہوں۔ جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اب ایمان لاتا ہے جبکہ وقت گزر چکا۔

ایسے شخص کی توبہ قبول نہیں بلکہ توبہ اس شخص کی قبول ہوتی ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓـئِكَ یَتُوْبُ

اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ۔ (سورۃ النسآء: یت ۱۷)

یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی توبہ قبول فرماتے ہیں جو نادانی میں برا کام کر گزرتے ہیں اور پھر وہ جلد ہی لوٹ آتے ہیں۔ یعنی جن سے جہالت اور نادانی میں گناہ ہو گیا تو پھر فوراً جلد از جلد لوٹ آئیں، دیر نہ کریں، یہ نہ سوچیں کہ توبہ کرلیں گے، ابھی تو بہت وقت پڑا ہے، توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور مرتے دم تک کھلا ہوا ہے، یہ مت سوچو، اس لئے کہ کیا پتہ کہ آخری وقت کب آجائے۔

توبہ ٹوٹ جائے تو دوبارہ توبہ کرلو

لہٰذا جو لوگ توبہ کرتے ہیں لیکن اس پریشانی میں رہتے ہیں کہ ہماری توبہ بار بار ٹوٹ جاتی ہے، ایسے لوگ گھبرائیں نہیں بلکہ دوبارہ لوٹ آئیں اور دوبارہ توبہ کرلیں، لیکن انکا یہ عمل گناہوں پر جرأت پیدا نہ کرے، اس لئے کہ توبہ کے بھروسہ پر گناہ کرلینا ایسا ہے جیسے تریاق کے بھروسہ پر زہر پی لیا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچے دل سے تمام گناہوں سے توبہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

اجمالی فہرست مجالس جلد نمبر ۱

اجمالی فہرست مجالس جلد نمبر ۲

اجمالی فہرست مجالس جلد نمبر ۳

اجمالی فہرست مجالس جلد نمبر۴

اجمالی فہرست مجالس جلد نمبر ۱

اجمالی فہرست مجالس جلد نمبر ۲

اجمالی فہرست مجالس جلد نمبر ۳

اجمالی فہرست مجالس جلد نمبر ۴

جلد ٦

اِصلاحی مجالِس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- ماضی کا گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار
- عبادات میں ذوق وشوق مطلوب نہیں
- اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے اسباب
- کثرت ذکر اللہ محبت پیدا کرنے کا ذریعہ
- ادعیہ ماثورہ۔کثرت ذکر اللہ کا بہترین طریقہ
- اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں
- حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ
- اعمال کے دنیاوی ثمرات
- اللہ سے اللہ کی محبت مانگی
- محبت طبعی یا عقلی
- ہر چیز اللہ کی عطا ہے
- خوف اور رجا
- مخلوق کا ڈر
- اللہ کی محبت

حضرت مولانا مُفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

میمن اسلامک پبلشرز

اصلاحی مجالس

(٦)

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

خطاب ﷺ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب ﷺ محمد عبداللہ میمن صاحب

تاریخ اشاعت ﷺ جنوری ۲۰۰۶ء

مقام ﷺ جامع مسجد دارالعلوم کراچی

باہتمام ﷺ ولی اللہ میمن صاحب

ناشر ﷺ میمن اسلامک پبلشرز

کمپوزنگ ﷺ خلیل اللہ فراز (cell:0321-2606274)

قیمت ﷺ =/ روپے

ملنے کے پتے

- میمن اسلامک پبلشرز، ۱/۱۸۸، لیاقت آباد کراچی ۱۹
- دارالاشاعت، اردو بازار، کراچی
- مکتبہ دارالعلوم کراچی ۱۴
- کتب خانہ مظہری، گلشن اقبال، کراچی
- اقبال بک سینٹر، صدر، کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ابتدائیہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ،وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ،وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ،وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔اَمَّا بَعْدُ!

اللہ جل شانہ کے فضل وکرم سے ''اصلاحی مجالس'' کی جلد ششم آپ کے ہاتھ میں ہے، یہ جلد ''انفاس عیسیٰ'' کے باب دوم تحقیقات کے عنوان ''توبہ'' کے بعض ملفوظات اور عنوان ''عشق وتعلق مع اللہ'' کے مکمل ملفوظات اور عنوان ''خوف ورجا'' کے بعض ملفوظات کی تشریح پر مشتمل ہے،اللہ تعالیٰ استاذ مکرم حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی عمر میں برکت عطا فرمائے، اور انفاس عیسیٰ کی تشریح کی تکمیل فرمادے،اور احقر مرتب اور ناشر کو صدق واخلاص کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس کام کو مزید آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے،آمین۔

محمد عبداللہ میمن

۱۸،ذی الحجہ ۱۴۲۶ھ

اجمالی فہرست مجالس

فہرست مضامین

عنوان	صفحہ نمبر
مجلس نمبر۲ ۸	
حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ	۵۳

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان

مجلس نمبر ۸۵

صفحہ نمبر	عنوان

عنوان	صفحہ نمبر
کیا محسن سے محبت نہیں ہوگی؟	۱۵۱
شکر ادا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ	۱۵۲
مجلس نمبر ۸۷	
اللہ کی محبت پیدا کرنے کے اسباب اور طریقے	۱۵۷
دوسرا طریقہ: انعامات کو سوچنا	۱۵۷
ان کے انعامات سب پر عام ہیں	۱۵۸
دوستوں کو تنگی اور دشمنوں کو فراخی	۱۵۹
ان نعمتوں کی طرف دھیان نہیں	۱۵۹
تیسرا طریقہ: اپنے برتاؤ کو سوچنا	۱۶۰
اپنی حیثیت میں غور کرو	۱۶۱
اس سے اللہ کا شکر اور محبت بڑھتی ہے	۱۶۲
ایک بزرگ اور متکبر کا واقعہ	۱۶۲
انسان کی حقیقت	۱۶۳
شکستگی مطلوب ہے	۱۶۴
اپنی نظر میں چھوٹا دوسروں کی نظر میں بڑا	۱۶۴
اوّل و آخر ”فنا ہی فنا“	۱۶۵
چوتھا طریقہ: اللہ والوں کی صحبت	۱۶۶

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر
وہ آدمی مؤمن نہیں	۲۱۹
ایمان کے بارے میں خطرہ	۲۲۰
مدارِ ایمان اللہ کی محبت یا رسول اللہ کی محبت	۲۲۰
ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے	۲۲۱
حضرت رابعہ بصریہؒ اور اللہ کی محبت	۲۲۲
دونوں کی محبت کا حاصل ایک ہی ہے	۲۲۲
کیا ایمان غیر اختیاری ہے؟	۲۲۳
ایک لمحہ میں یہ انقلاب کیسے آگیا؟	۲۲۴
محبت طبعی	۲۲۴
محبت عقلی	۲۲۵
محبت عقلی کا نتیجہ	۲۲۵
محبت عقلی کی مثال	۲۲۶
غور و فکر کے نتیجے میں حضور اقدس ﷺ سے محبت	۲۲۷
محبت عقلی مطلوب ہے	۲۲۷
حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ	۲۲۸
طبعی محبت صغریٰ و کبریٰ کی محتاج نہیں	۲۲۸
محبت عقلی کے نتیجے میں محبت طبعی	۲۲۹
حضور ﷺ کے اندر محبت کے چاروں اسباب موجود ہیں	۲۲۹

عنوان	صفحہ نمبر
	۲۴۶

عنوان	صفحہ نمبر

مجلس نمبر ۹۲

عنوان	صفحہ نمبر

خوف اور رجا

مجلس نمبر ۹۳

عنوان	صفحہ نمبر

مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ۲۸۹

عنوان	صفحہ نمبر

صفحہ نمبر	عنوان

ماضی کا گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ط

ماضی کا گناہ یاد آنے

پر دوبارہ استغفار

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَ نَسْتَعِيْنُهٗ وَ نَسْتَغْفِرُهٗ وَ نُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا ۔ مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلاَ هَادِيَ لَهٗ وَأَشْهَدُاَنْ لَّا إِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَأَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّداً عَبْدُهٗ وَ رَسُوْلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسْلِيْمًا كَثِيْرًا ۔ أَمَّا بَعْدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

''توبۃ النصوح کے بعد اگر از خود پُرانا گناہ یاد آ جائے تو
تجدید توبہ کر کے پھر کام میں لگ جائے، اس سے زیادہ
کاوش کرنا غلو ہے اور یہ قصد کرنا کہ ذرا بھی کوتاہی نہ
ہونے پائے، یہ ایک قسم کا دعویٰ اور غلو ہے، گو عقلاً محال
نہیں لیکن عادۃً محال ہے، چنانچہ حدیث شریف میں
ہے: سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا

(انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۷)

گناہ یاد آنے پر دوبارہ استغفار کرلو

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ایک بات تو وہ ہے جو تقریباً ہر آدمی کو پیش آتی ہے کہ ایک مرتبہ گناہ سے توبہ کرنے کی توفیق ہوگئی اور توبہ بھی ''توبۃ النصوح'' یعنی مکمل توبہ کرلی، اب توبہ کرنے کے بعد وہ گناہ جس سے توبہ کی تھی، وہ بار بار یاد آتا رہتا ہے اور بار بار ذہن میں اس کا تصور آتا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا کہ اپنی طرف سے قصد کر کے اور جان بوجھ کر گناہ کو یاد کرنا تو غلط بات ہے، لہٰذا قصداً تو اس گناہ کو یاد نہ کرے اور نہ توبہ کرنے کی غرض سے یاد کرے، کیونکہ ایک مرتبہ اس گناہ سے توبہ کرچکا، اور اگر اس وجہ سے گناہ کو یاد کر رہا ہے کہ اس گناہ کو کرتے وقت نفس کو بڑی لذت حاصل ہوئی تھی، اس وجہ سے گناہ کو یاد کرنا بہت زیادہ خطرناک ہے، لیکن اگر غیر اختیاری طور پر اس گناہ کا خیال آ جائے تو اس موقع پر پھر استغفار اور توبہ کی تجدید کرلے اور یہ کہے:

''اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّأَتُوْبُ اِلَيْهِ
اَللّٰهُمَّ إِنِّیْ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ اِلَيْكَ"

توبہ کرنے کی ایک وجہ

اب سوال یہ ہے کہ دوبارہ توبہ کی تجدید کیوں کر رہا ہے؟ دوبارہ استغفار کیوں کر رہا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس وجہ سے توبہ کی تجدید کر رہا ہے کہ اس نے سوچا کہ میرے دل میں دوبارہ اس گناہ کا جو تصور اور خیال آ رہا ہے، کہیں اس کے آنے میں میرے اختیار کو کوئی دخل نہ ہو، کیونکہ اگر وہ تصور بے اختیار آ رہا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی مواخذہ نہیں۔ لیکن اگر اس گناہ کے تصور کے آنے میں کچھ اختیار کو بھی دخل ہو تو وہ قابل مواخذہ ہے، اس وجہ سے دوبارہ استغفار اور توبہ کی تجدید کر رہا ہے۔ اس وجہ سے دوبارہ توبہ نہیں کر رہا ہے کہ سابق توبہ کے قبول ہونے کا یقین نہیں ہے، کیونکہ آدمی جب توبہ اور استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے یہی امید رکھنی چاہئے کہ انشاء اللہ میری توبہ قبول ہوگئی اور اس شک وشبہ کا شکار نہ ہو۔

توبہ کرنے کی دوسری وجہ

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس گناہ کے خیال اور تصور کا بار بار دل میں آنا، یہ کہیں دوبارہ مجھے گناہ کے اندر مبتلا نہ کر دے، اس وجہ سے بھی دوبارہ استغفار اور توبہ کی تجدید کر رہا ہے، کیونکہ استغفار اور توبہ کر لینے سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انشاء اللہ حفاظت رہے گی۔

گناہ ایک بڑی مصیبت ہے

جیسے بزرگ فرماتے ہیں کہ جب مصیبت آئی تھی، اس وقت تو ''اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھ لیا تھا لیکن بعد میں جب کبھی وہ مصیبت دوبارہ یاد آئے تو اس وقت پھر ''اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' کہہ لو۔ اسی طرح گناہ بھی ایک مصیبت ہے اور یہ دنیاوی مصیبتوں سے زیادہ بڑی مصیبت ہے، اسی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتَنَا فِیْ دِیْنِنَا

یعنی اے اللہ! ہماری مصیبت ہمارے دین میں نہ آئے۔ اگر وہ مصیبت ہماری دنیا پر گزر جائے تو اتنی بڑی مصیبت نہیں، اگرچہ ہم آپ سے اس کی بھی عافیت مانگتے ہیں، لیکن دین پر مصیبت نہ آئے اور گناہ اور معصیت کا ارتکاب دین پر مصیبت ہیں۔ لہٰذا جس طرح مصیبت کے یاد آنے پر ''اِنَّالِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھنے کا حکم ہے، اسی طرح جب گناہ یاد آئے تو دوبارہ توبہ و استغفار کرلو اور کہو:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَتُوْبُ اِلَیْکَ''

گناہ یاد آنے پر پناہ مانگو

ہمارے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ استغفار کے ساتھ ساتھ اس گناہ سے اللہ تعالیٰ کی پناہ بھی مانگو اور کہو کہ یا اللہ! مجھے یہ گناہ کا خیال آرہا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ مجھے پھر پھسلا دے اور گناہ کے اندر مبتلا کر دے، یا اللہ! میں آپ

کی پناہ مانگتا ہوں اور یہ کہو:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ

اے اللہ! میں اپنے نفس کے شر سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسی کیسی دعائیں تلقین فرمادیں کہ دنیا و آخرت کی حاجتوں کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگا نہ ہو۔ ایک دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ الشَّیْطٰنِ وَشِرْکِهٖ

اے اللہ! شیطان کے شر سے اور اس کے شرک سے پناہ مانگتا ہوں۔ لہٰذا جب بھی کسی گزشتہ گناہ کا خیال آئے تو اس وقت دوبارہ استغفار کرلو اور پھر ان دعاؤں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ لو۔

توبہ پر قائم رہنے کیلئے اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو

بندے کا کام یہ ہے کہ اپنی طرف سے قدم بڑھائے اور جتنا اس کے بس میں ہے اتنا کر گزرے، پھر آگے اللہ تعالیٰ کے حوالے کرکے ان سے مدد مانگ لے اور کہے کہ یا اللہ! میرے بس میں اتنا ہی تھا، اب آگے اس کی تکمیل اور اس پر ثابت قدم رکھنا آپ کے قبضۂ قدرت میں ہے، آپ ہی مجھے اس کی طاقت عطا فرمادیجئے، میں نے تو اپنی طرف سے توبہ کرلی، لیکن اے اللہ! اس توبہ کی تکمیل اور اس توبہ پر قائم رکھنا آپ کی قدرت میں ہے، اپنی رحمت سے مجھے اس پر قائم رکھئے، یہ دو کام کرلو تو بس پھر تم کامیاب ہو۔

دوبارہ توبہ کرکے کام میں لگ جاؤ

اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ ''تجدید توبہ کرکے پھر کام میں لگ جائے، اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے''۔ یعنی گناہ کا خیال آنے پر ''استغفر اللہ'' پڑھ کر اپنے کام میں لگ جائے، اس کے بعد یہ کاوش کرنا کہ یہ خیال مجھے کیوں آیا؟ یہ خیال بار بار کیوں آ رہا ہے؟ کہیں میں خبیث تو نہیں ہوگیا ہوں، یا شاید میرے اوپر شیطان کا ایسا داؤ چلا ہوا ہے کہ میں اس کے آگے مغلوب ہوگیا ہوں اور اب میری اصلاح کی کوئی توقع باقی نہیں رہی۔ اس قسم کے خیالات دل میں لانا غلو ہے، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ توبہ کرلو، ہم نے توبہ کرلی، اور جو غیر اختیاری خیالات آ رہے تھے، ان سے بھی توبہ کرلی، اب خواہ مخواہ اس گناہ کو وظیفہ مت بناؤ بلکہ اپنے کام میں لگو، اس سے زیادہ کاوش کرنا غلو ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا کہ:

اَجْمِلُوْا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوْا عَلَیْهِ

یعنی اپنے کرنے کا کام اجمالی طور پر کرلو اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔

کمال کے حصول کی فکر مت کرو

اس ملفوظ میں حضرت والا نے دوسری بات یہ ارشاد فرمائی کہ ''یہ قصد کرنا کہ ذرا بھی کوتاہی نہ ہونے پائے، یہ بھی ایک قسم کا دعویٰ اور غلو ہے۔'' یعنی یہ سمجھنا کہ میں ایسا کامل اور مکمل بن جاؤں کہ ذرا سی بھی اوچھ نہ ہو، ذرا سی بھی کہیں کسر نہ ہو، عبادت ہو تو وہ کامل اور مکمل ہو، اخلاق بھی کامل اور مکمل ہوں،

دین کے ہر معیار پر سو فیصد پورا اتروں۔ یہ فکر بھی اس بات کا دعویٰ ہے کہ میں بڑا اونچا آدمی ہوں کہ اس درجے کے کمال کا طالب ہوں، یہ بھی ایک قسم کا دعویٰ ہے۔ ارے بھائی! سیدھے سادے طریقے سے کام کرو، سو فیصد کمال کی فکر چھوڑو، اس لئے کہ یہ درجہ حاصل ہونا گو عقلاً محال نہیں لیکن عادۃً محال ہے، کیونکہ عقلاً یہ محال نہیں کہ کوئی آدمی پیغمبر جیسا عمل کرنے لگے یا وہ صحابی جیسا عمل کرنے لگے، یہ بات عقلاً محال نہیں لیکن عادۃً محال ہے، اس لئے کہ عادۃً ایسا ہوتا نہیں کہ اس جیسا کمال حاصل ہو جائے۔

سیدھے ہونے کے قریب ہو جاؤ

پھر اس کی دلیل میں یہ حدیث پیش کی کہ حدیث شریف میں فرمایا کہ:

سَدِّدُوْا وَقَارِبُوْا وَاسْتَقِیْمُوْا وَلَنْ تُحْصُوْا

(بخاری شریف)

اس حدیث میں سب سے پہلے فرمایا: "سَدِّدُوْا" سیدھے ہو جاؤ، یعنی دین کے تمام تقاضوں پر پورے اترو، تب جاکر سیدھے ہوگے ورنہ سیدھے نہیں ہوگے۔ لیکن ساتھ دوسرا لفظ ارشاد فرمایا "وَقَارِبُوْا" یعنی پورا سیدھا ہونا تو بڑا مشکل ہے، لہٰذا قریب آجاؤ۔ پھر ارشاد فرمایا: "وَاسْتَقِیْمُوْا" یعنی دوبارہ فرمایا کہ سیدھے ہو جاؤ، لیکن یہ بھی فرمایا کہ "وَلَنْ تُحْصُوْا" یعنی پورا سیدھا ہونا تو کبھی نہیں کر سکو گے بلکہ کچھ نہ کچھ کسر رہے گی، لہٰذا جب کسر رہ جائے تو اس پر استغفار کرتے رہو اور توبہ کرتے رہو۔

عبادات کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہیں

اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے، روزہ رکھنے، اعتکاف کرنے، قرآن کریم کی تلاوت کرنے، ذکر کرنے اور تسبیح کرنے کی توفیق عطا فرما دی، لیکن ان عبادتوں میں سے جس عبادت کو بھی دیکھو، وہ کوتاہیوں سے بھری ہوئی نظر آئے گی، کیا ہم نے نماز اسی طرح پڑھی جیسے پڑھنی چاہئے تھی؟ کیا نماز میں جیسا خشوع ہونا چاہئے تھا، ویسا خشوع حاصل ہوا؟ جیسا دھیان نماز میں ہونا چاہئے تھا، ویسا دھیان حاصل ہوا؟ نماز میں اعضاء اور جوارح کو جیسا خضوع حاصل ہونا چاہئے تھا، ویسا خضوع حاصل ہوا؟ جب نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری نماز کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہے۔ یا روزہ تو رکھ لیا لیکن جیسا روزہ رکھنا چاہئے ویسا روزہ رکھا؟ جس کمال کا روزہ ہونا چاہئے وہ ہوا؟ جب تلاوت کی تو کیا تلاوت کا حق ادا ہوا؟ حروف کی جیسی ادائیگی ہونی چاہئے تھی، ویسی ادائیگی ہوئی؟ الفاظ کی طرف جیسا دھیان ہونا چاہئے تھا، ویسا دھیان ہوا؟ معانی کی طرف جیسا دھیان ہونا چاہئے تھا، ویسا دھیان ہوا؟ جب نہیں ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عبادات کوتاہیوں سے بھری ہوئی ہیں۔

کوتاہیوں کی وجہ سے مایوس مت ہو جاؤ

اب ایک راستہ تو یہ ہے کہ مایوس ہو کر بیٹھ جاؤ کہ عبادت کا حق ادا کرنا ہمارے بس کا کام نہیں، نہ ہماری نماز اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے قابل ہے اور نہ روزہ اور نہ تلاوت پیش کرنے کے قابل ہے۔ لیکن حضور صلی

اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مایوس ہوکر مت بیٹھ جاؤ، کیونکہ تم مکمل سیدھے نہیں ہوسکو گے، اس لئے جتنا ہوسکے قریب آجاؤ۔

عربی زبان کی وسعت

یہ عربی زبان بھی بڑی عجیب وغریب زبان ہے، اس میں ذرا سے فرق سے معانی تبدیل ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لفظ "قَارِبُوْا" فرمایا جو باب مفاعلہ سے امر کا صیغہ ہے۔ "اُقْرُبُوْا" نہیں فرمایا، اسی طرح "اِقْتَرِبُوْا" نہیں فرمایا۔ دیکھئے: ایک ہوتا ہے "قَرُبَ۔ یَقْرُبُ" جو باب کرم سے ہوتا ہے اور ایک ہوتا ہے "اِقْتَرَبَ یَقْتَرِبُ" جو باب افتعال سے ہوتا ہے، ان کے معنی ہیں، مطلق قریب آنا۔ اور ایک ہے باب مفاعلہ سے "قَارِبُوْا" اس کے معنی میں تدریج کی خاصیت پائی جاتی ہے، لہٰذا ایک مرتبہ قریب آجانے کو "قَارِبُوْا" نہیں کہتے بلکہ اس کے معنی ہیں قریب آجانے کی کوشش کرتے رہنا اور تھوڑا تھوڑا کر کے قرب آنا، مثلاً آج ایک قدم بڑھایا، کل کو دوسرا قدم بڑھایا، پرسوں تیسرا قدم بڑھایا، یہ پورا عمل "مقاربت" کہلاتا ہے۔

زندگی بھر قریب آنے کی کوشش کرتے رہو

لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قَارِبُوْا" یعنی تدریجاً قریب آنے کی کوشش شروع کر دو اور قدم بڑھانا شروع کر دو یہاں تک کہ ہمارے قریب پہنچ جاؤ۔ اس لفظ میں درحقیقت ایک اشکال کا جواب ہے، وہ

اشکال یہ ہے کہ اس حدیث سے معلوم ہورہا ہے کہ ہم چاہے جتنی کوشش کرلیں پھر بھی سیدھے نہیں ہوسکتے اور جب سیدھے نہیں ہوسکتے تو پھر سیدھا ہونے کی فکر ہی چھوڑ دیں۔ اس کا جواب اس لفظ سے دیدیا کہ ساری عمر قریب آنے کی کوشش کرتے رہو اور سیدھے ہونے کی کوشش کرتے رہو، پورے سیدھے تو نہیں ہوسکو گے لیکن قریب آجاؤ گے، لہٰذا اس کوشش کو مت چھوڑنا، تم سے مطالبہ کوشش کرنے کا ہے، تم سے نتیجہ کا مطالبہ نہیں کہ نتیجہ حاصل ہوا یا نہیں؟ کوشش کرتے ہوئے آگے بڑھتے چلے جاؤ۔

ساری عمر تراش خراش کرنی ہے

اس بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اندریں راہ می تراش و می خراش
تادم آخر دمے فارغ مباش

یعنی اس راستے میں تو ساری عمر تراش خراش کرنی ہی ہے، ہر وقت دھیان اور فکر لگی رہے کہ کہاں غلطی ہو رہی ہے اور پھر ان غلطیوں کو درست کرتا رہے، آخری دم تک ایک لمحہ کے لئے بھی فارغ ہو کر نہیں بیٹھنا، لہٰذا کوئی یہ نہ سوچے کہ جب بالکل سیدھے نہیں ہوسکتے تو بس جیسے زندگی گزر رہی ہے، گزرنے دو، زیادہ اصلاح کی فکر ہی فضول ہے۔ اس حدیث میں اس سوچ کی تردید فرمادی کہ یہ جو کہا جارہا ہے کہ مکمل سیدھے نہیں ہوسکتے، وہ نتیجے کے بارے میں کہا جارہا ہے کہ نتیجے میں مکمل سو فیصد سیدھے نہیں ہوسکتے لیکن اس کے باوجود کوشش

میں کمی نہیں آنی چاہئے۔

منزل مقصود نہیں کوشش کرنا مقصود ہے

کیونکہ اس راستے میں منزل مقصود نہیں بلکہ کوشش بذات خود مقصود ہے، لگا رہنا مقصود ہے، یہی منزل ہے، لہٰذا نتائج کی پرواہ نہیں کرو بلکہ کوشش میں لگے رہو۔ میں بھی کبھی شعر کہہ دیتا تھا، ایک شعر کہا تھا جو حضرت والا کو بہت پسند تھا، اس میں یہی مضمون ہے:

قدم ہیں راہِ اُلفت میں تو منزل کی ہوس کیسی
یہاں تو عین منزل ہے تھکن سے چور ہو جانا

یہاں تو مقصود ہی یہ ہے کہ آدمی چلتا رہے اور چلتے چلتے تھکن سے چور ہو جائے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ (سورۃ الم نشرح)

اس آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ جب آپ دوسرے کاموں سے فارغ ہو جائیں تو عبادت کے اندر اپنے آپ کو تھکائیں۔ بہر حال! نتائج حاصل کرنا نہ تمہارے بس کا کام ہے اور نہ ہی تمہارے سوچنے کی چیز ہے بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ منزل کی طرف چلتے رہو، یہ چلنا بذات خود مقصود ہے۔

قدم بڑھاتے چلے جاؤ

لہٰذا فکر نہیں چھوڑنی بلکہ فکر بھی جاری رکھو، کوشش بھی جاری رکھو، البتہ

نتائج سے بے نیاز ہو جاؤ۔ جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتادیا اور آپ کے وارثوں نے بتادیا، اس طریقہ پر قدم رکھ کر چلتے جاؤ، منزل پر کب پہنچو گے اور کہاں پہنچو گے؟ اس کی فکر چھوڑ دو۔

بر صراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جب "صراطِ مستقیم" پر قدم رکھ دیا تو اب انشاء اللہ گمراہ نہیں ہو گے۔ لہٰذا جو کام ہو اس کو سنت کے مطابق کرتے جاؤ۔

نماز کی توفیق پر شکر ادا کرو

یہ جو دلوں میں خیالات آتے ہیں کہ میری نماز صحیح نہیں ہے، میرا روزہ صحیح نہیں ہے، یہ سب خیالات اس حد تک تو مفید ہیں کہ ان خیالات کے نتیجے میں تم اپنی نماز کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرو، لیکن ان خیالات کی وجہ سے ان عبادات کی ناقدری مت کرو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان عبادات کو ادا کرنے کی جو توفیق عطا فرمائی ہے، یہ بھی ان کا کرم ہے، اگر یہ توفیق نہ ملتی تو تم کیا کر لیتے؟ لہٰذا اس توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور کہو کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے اس عبادت کو انجام دینے کی توفیق عطا فرمادی۔ اے اللہ! آپ کا مجھ پر بڑا شکر اور احسان ہے۔ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے اس کے بھی یہی معنی ہیں:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ ھَدٰىنَا لِھٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ
لَوْلَآ اَنْ ھَدٰىنَا اللّٰهُ۔ (سورۃ الاعراف: آیت ۴۳)

یعنی تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جس نے اس کی ہدایت اور رہنمائی فرمائی، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت نہ ملتی تو ہم ہدایت پانے والے نہیں تھے۔ لہٰذا ان نیک اعمال کی توفیق ملنے پر شکر ادا کرو۔

نماز کی کوتاہیوں پر استغفار کرلو

البتہ ہماری عبادات میں، نماز میں، روزے میں بیشک کوتاہیاں بھی ہیں، ان کوتاہیوں کا علاج استغفار ہے۔ لہٰذا جب ان کوتاہیوں پر استغفار کرلو گے تو اس کے نتیجے میں کوتاہیاں مٹ جائیں گی اور صرف عبادت اور نیکی ہی نیکی باقی رہ جائے گی، کیونکہ استغفار نے اس عبادت پر پالش کردی اور اس عبادت پر کوتاہیوں کی جو گندگی لگ گئی تھی، استغفار نے اس کو صاف کردیا۔ قرآن کریم میں نیک بندوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَانُوْا قَلِيْلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَ
بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ (سورۃ الذاریات: ۱۷۔۱۸)

یعنی رات کو بہت کم سوتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہوکر عبادت کرتے تھے اور پھر سحری کے وقت استغفار کرتے تھے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا رات کو کوئی گناہ کیا تھا جس سے وہ استغفار کرتے تھے، نہیں، تو پھر وہ استغفار کیوں کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اس بات پر استغفار کرتے تھے کہ اے اللہ! رات کے وقت ہم نے عبادت تو کرلی لیکن وہ عبادت آپ کی شایانِ شان نہ ہوئی اور اس عبادت میں بیشمار کوتاہیاں ہوگئیں، بے شمار

غلطیاں ہوگئیں، اے اللہ! ان کوتاہیوں اور غلطیوں کی طرف سے آپ کے حضور استغفار کرتے ہیں۔ اس استغفار کا نتیجہ یہ ہوا کہ رات بھر جو عبادت کی تھی، اس عبادت میں جو مختلف کوتاہیاں اور خرابیاں ہوگئی تھیں اور ان کوتاہیوں کی وجہ سے اس عبادت پر جو میل کچیل آ گیا تھا، آخر میں استغفار کر کے اس میل کچیل کو دور کر دیا اور اس کی فنیشنگ کر دی اور پالش کر دی، اب وہ عمل اس قابل ہوگیا کہ اللہ تعالیٰ کے دربار میں انشاء اللہ قبول ہوگا۔ لہٰذا ہر عمل کے بعد اس عمل کی توفیق ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو اور اس عمل میں کوتاہی ہو جانے پر استغفار کرو، جب یہ دو کام کر لوگے تو انشاء اللہ تعالیٰ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہو جائے گا۔

عبادت کی توفیق قبولیت کی علامت ہے

ہمارے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ بعض لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ معلوم نہیں ہماری نماز قبول بھی ہے یا نہیں؟ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ دل میں یہ کھٹکا رہنا چاہئے اور ڈر رہنا چاہئے، اس لئے کہ ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ کرتا رہے اور ڈرتا رہے، لیکن ہمارے بزرگوں نے یہ فرمایا کہ جب ایک عمل کرنے کے بعد اسی عمل کو دوبارہ کرنے کی توفیق مل جائے تو سمجھ لو کہ پہلا عمل اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالیا، اگر پہلا عمل قبول نہ ہوتا تو دوسری بار اس عمل کی توفیق نہ ملتی، مثلاً ایک نماز ادا کی اور اس کے بعد دوبارہ نماز پڑھنے کی توفیق مل گئی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ پہلی نماز اللہ تعالیٰ کے

یہاں قبول ہوگئی۔ یا ایک روزہ رکھنے کے بعد دوسرا روزہ رکھنے کی توفیق ہوگئی تو یہ پہلے روزے کی قبولیت کی علامت ہے، لیکن ہر عمل کے بعد اس کے عدم قبولیت سے ڈرو اور ہر عمل کے بعد یہ کہو: الحمدللہ، استغفراللہ، اس کے نتیجے میں مزید عبادت کی توفیق مل جائے گی۔ بس ساری عمر یہ کرنا ہے کہ اپنی سی کوشش کئے جاؤ، کوشش میں کمی نہ کرو اور جو کوتاہیاں ہوں ان پر استغفار کئے جاؤ، انشاء اللہ منزل تک پہنچ جاؤ گے۔

آگے ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

جب تک صاحبِ عمل کو اس سے اندیشہ ہوتا رہے کہ مبادا کہیں نفس کا شائبہ نہ ہوگیا ہو، حفاظت خداوندی اس کی رفیق رہتی ہے لیکن تدارک بالاستغفار کرتے رہنا چاہئے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۸)

دین دونوں کے درمیان ہے

وہی بات بیان فرما رہے ہیں جو میں نے ابھی عرض کی کہ یہ راستہ بھی عجیب وغریب قسم کا ہے کہ بظاہر اس میں بعض باتیں متضاد معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں متضاد نہیں ہیں۔ چنانچہ ایک طرف یہ حکم ہے کہ عمل کرتے رہو اور عمل سے مایوسی نہ ہو بلکہ عمل پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو کہ ان کی توفیق سے یہ عمل میں نے انجام دیدیا اور اس عمل کی تحقیر مت کرو کہ یہ عمل کیا ہے یہ تو ٹکریں مارنا ہے وغیرہ۔ دوسری طرف یہ بھی حکم ہے کہ اس عمل پر عجب بھی نہ ہو اور عمل کے بعد دماغ میں یہ گھمنڈ نہ ہو کہ ہم نے تو بڑا کام کرلیا اور اس کے نتیجے میں عجب

کے اندر مبتلا ہو کر اپنے آپ کو اللہ والا سمجھنے لگے وغیرہ۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کو ان دونوں باتوں کے درمیان رہنا چاہئے۔

عمل کے بعد ڈرتے رہو

لہٰذا ایک طرف عمل بھی کرو اور دوسری طرف دل میں یہ اندیشہ بھی رہے کہ میرے کسی نفسانی شائبہ سے کہیں یہ عمل خراب نہ ہو گیا ہو۔ اسی بات کو ہمارے بزرگوں نے دو لفظوں میں بیان فرما دیا کہ عمل کرتا رہے اور ڈرتا رہے، جب تک یہ فکر اور اندیشہ رہے گا، اس وقت تک حفاظت خداوندی اس کی رفیق رہے گی، اور ساتھ میں اس اندیشے کا تدارک بالاستغفار کرتے رہنا چاہئے کہ اے اللہ! میں نے یہ عمل تو کر لیا لیکن مجھے یہ اندیشہ ہے کہ میرے کسی نفسانی شائبہ سے کہیں یہ عمل خراب نہ ہو گیا ہو، اے اللہ! اس نفسانی شائبہ سے استغفار کرتا ہوں۔ لہٰذا نہ تو اس عمل سے مایوس ہو اور نہ گھمنڈ میں مبتلا ہو، دونوں باتیں غلط ہیں۔

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی عجیب بات ارشاد فرمائی جو یاد رکھنے کے قابل ہے، فرمایا کہ جو شخص عمل کر کے یہ سمجھ رہا ہے کہ اس کا یہ عمل اس کو جنّت میں لے جائے گا تو وہ فضول محنت کر رہا ہے، اور جو شخص عمل کئے بغیر یہ سمجھ رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے جنّت میں چلا جائے گا تو وہ اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ

انسان عمل تو کرے لیکن اس عمل پر بھروسہ نہ ہو بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر ہو، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو کھینچنے اور دعوت دینے والا یہی عمل ہے، لہٰذا اس عمل کو تو بیکار نہ سمجھے بلکہ عمل کرے، لیکن ساتھ ساتھ اس عمل پر یہ بھروسہ نہ ہو کہ یہ عمل اس کو جنت میں لے جائے گا جب تک اللہ تعالیٰ کی رحمت شامل حال نہ ہو۔

کوئی عبادت اللہ تعالیٰ کے شایان شان نہیں

اس لئے کہ تم وہ عمل چاہے کتنا ہی اچھے سے اچھا کرلو لیکن پھر بھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کی شایانِ شان نہیں ہوسکتا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ماعبدناك حق عبادتك ماعرفناك حق معرفتك

ہم تیری عبادت نہ کر سکے کہ تیری عبادت کا حق ہے اور
ہم تجھے نہ پہچان سکے جیسا کہ تجھے پہچاننے کا حق ہے۔

لہٰذا کسی عمل میں بذات خود یہ صلاحیت نہیں کہ وہ انسان کو جنت کا مستحق بنادے، کیونکہ جو تم نے عمل کیا ہے، کیا وہ عمل اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے لائق ہے؟ چاہے وہ عمل کتنا ہی بنا سنوار کرلو، سو فیصد خشوع خضوع کے ساتھ کرلو، پھر بھی وہ عمل اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش کرنے کے لائق نہیں۔

عبادت کی توفیق اور اعضاء کس نے دیے؟

کیونکہ یہ دیکھو کہ اس عمل کے کرنے کی توفیق کس نے دی؟ جس ہاتھ

پاؤں کے ذریعہ تم نے وہ عمل کیا، وہ ہاتھ پاؤں کس نے دیے؟ وہ اعضاء و جوارح کس نے دیے؟ اگر تم نے ذکر کا عمل کیا تو جس زبان کے ذریعہ تم نے ذکر کیا وہ زبان کس نے عطا فرمائی؟ اس زبان میں گویائی کس نے بخشی؟ یہ سب تو انہیں کا دیا ہوا ہے، پھر کیا ان کی بارگاہ میں پیش کر رہے ہو؟ بلکہ ان ہی کی دی ہوئی چیز ان کی بارگاہ میں پیش کر رہے ہو۔

ایک دیہاتی کا واقعہ

ہمارے اعمال کی مثال تو دیہاتی کے پانی کے مٹکے کی طرح ہے کہ ایک دیہاتی نے بادشاہ سے ملاقات کرنے کا ارادہ کیا، اس نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا کہ بادشاہ کے لئے کیا تحفہ لے جاؤں؟ بیوی نے مشورہ دیا کہ ہمارے گاؤں سے جو نہر جا رہی ہے، اس کا پانی بہت میٹھا اور صاف شفاف ہے، بادشاہ کو شہر میں ایسا پانی کہاں نصیب ہوگا، اس لئے تم ایک مٹکا پانی کا بھر کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرو۔ اس دیہاتی کو یہ بات سمجھ میں آگئی، اس نے ایک مٹکا لیا اور اس کو پانی سے بھر کر سر پر اٹھایا اور بغداد کی طرف پیدل سفر شروع کر دیا۔ اب راستے میں دھول مٹی اس مٹکے کے اندر اور باہر پڑتی رہی، جب کئی دن کے سفر کے بعد وہ بغداد پہنچا تو اس پانی کے اوپر مٹی کی تہہ جم گئی، چنانچہ وہ بادشاہ کے محل پر پہنچا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی اور جب ملاقات ہوئی تو اس دیہاتی نے پانی کا مٹکا پیش کرتے ہوئے کہا کہ حضور! یہ میرے گاؤں کی نہر کا صاف اور میٹھا پانی ہے جو میں آپ کے لئے تحفہ لایا ہوں، بادشاہ نے جب وہ

پانی دیکھا تو اس پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی تھی اور اس میں سے بدبو اٹھ رہی تھی۔

لیکن بادشاہ نے یہ سوچا کہ اگر میں نے اس کو لوٹا دیا تو اس کا دل ٹوٹے گا، یہ بیچارہ اتنی دور سے محنت مشقت برداشت کر کے لایا ہے، اس لئے بادشاہ نے اس کی تعریف کی اور کہا کہ تم بہت اچھا تحفہ لائے ہو، چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کا مٹکا سونے اور چاندی سے بھر کر واپس کیا جائے، پھر بادشاہ نے حکم دیا کہ اس دیہاتی کو دریا دجلہ کے پاس سے واپس لے جانا تا کہ اس کو پتہ چلے کہ یہاں پر اس سے اچھا پانی میسّر ہے اور اس میں کوئی کمی نہیں ہے، جب اس دیہاتی کو دریائے دجلہ کے پاس سے گزارا گیا تو اس دریا کو اور اس کے پانی کو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہاں تو بادشاہ کے بالکل قریب اتنا شیریں اور صاف شفاف پانی موجود ہے، اس کے باوجود بادشاہ نے محض اپنی عنایت سے میرا مٹکا نہ صرف قبول کرلیا بلکہ اس کے بدلے سونا چاندی بھی عطا کیا۔

خلوص ومحبّت کا جواب

یہ واقعہ بیان کر کے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حقیقت میں وہ دیہاتی سزا کے لائق تھا کہ اتنی دور سے پانی لایا اور وہ بھی گدلا اور مٹی سے اٹا ہوا کیا وہ پانی اس لائق تھا کہ بادشاہ کو پینے کے لئے پیش کیا جائے؟ لیکن بادشاہ نے اس پانی کے گدلے اور خراب ہونے کو نہ دیکھا بلکہ اس دیہاتی کے دل کے اخلاص کو دیکھا کہ یہ دیہاتی اگرچہ فضول چیز لایا ہے لیکن خلوص کے ساتھ لایا ہے، محبّت سے لایا ہے، اس کے اس خلوص اور محبّت کا جواب یہ ہے کہ

اس کے مٹکے کو سونے چاندی سے بھر کر واپس کیا جائے۔

ہماری عبادات کے جواب میں مغفرت

جب دنیا کا ایک معمولی بادشاہ ایک انسان کے اخلاص کی قدر کرتا ہے تو بادشاہوں کے بادشاہ اور احکم الحاکمین کے دربار میں ہم جو عبادات پیش کرتے ہیں، وہ اس دیہاتی کے پانی کے مٹکے سے زیادہ بے حقیقت ہیں، ان عبادات کی حقیقت تو یہ تھی کہ اس پر الٹی سزا دی جاتی کہ تو ہمارے دربار میں جو عبادت پیش کر رہا ہے، وہ ہمارے دربار کے لائق نہیں ہے، لیکن اللہ جل شانہ اپنے فضل وکرم سے یہ دیکھتے ہیں کہ اس بندے نے خلوص کے ساتھ جو عبادت اس کے بس میں تھی وہ اس نے انجام دیدی، اب ہم اس کے مٹکے کو سونے سے بھر کر واپس کریں گے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ؕ (سورۃ الفرقان: آیت ۷۰)

یعنی اللہ تعالیٰ ان کی سیئات کو بھی حسنات سے تبدیل فرمادیں گے۔

خلاصہ

بہرحال! خلاصہ یہ ہے کہ نہ تو اپنے عمل پر ناز ہو اور نہ ہی اپنے عمل سے بے نیازی ہو بلکہ عمل کرتا بھی رہے اور ساتھ میں ڈرتا بھی رہے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی مغفرت بھی طلب کرتا رہے، بس یہ کام کرتا رہے تو انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ اس کو منزل تک پہنچا دیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے اور اپنی رحمت سے ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۲

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡم ؕ

حقوق العباد سے توبہ کا طریقہ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَ نَسۡتَعِيۡنُهٗ وَ نَسۡتَغۡفِرُهٗ وَ نُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا ۔ مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلاَ هَادِىَ لَهٗ وَأَشۡهَدُاَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِيۡكَ لَهٗ وَأَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَنَبِيَّنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُهٗ وَ رَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ تَسۡلِيۡمًا كَثِيۡرًا ۔ أَمَّا بَعۡدُ!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اعمال صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر حقوق معاف نہیں ہوتے، پس جس قدر ہو سکے ادا

کرے اور سب کے ادا کا عزم رکھے۔ اگر کچھ باقی رہ
گئے اور مر گیا تو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس کو بری
الذمہ کر دیں گے یعنی اللہ تعالیٰ مظلوم کو خوش کر کے ظالم
کی مغفرت فرما دیں گے۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۱۹۸)

گناہ صغیرہ سے معافی کا طریقہ

اس ملفوظ میں حضرت والا نے پہلی بات تو یہ بیان فرمائی کہ اعمال صالحہ یعنی نیک اعمال سے گناہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے بھی گناہ معاف ہوتے ہیں۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ نیک اعمال سے صرف گناہ صغیرہ معاف ہوتے ہیں اور توبہ سے کبیرہ گناہ بھی معاف ہو جاتے ہیں۔ گناہ صغیرہ کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکیوں کی بدولت خود بخود ان کو معاف فرماتے رہتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ جب آدمی وضو کرتا ہے تو وضو کے دوران جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو ہاتھ سے کئے ہوئے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب چہرہ دھوتا ہے تو آنکھوں کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، جب پاؤں دھوتا ہے تو پاؤں سے چل کر جس گناہ کی طرف گیا تھا، وہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان احادیث میں گناہوں سے مراد صغیرہ گناہ ہیں جو اللہ تعالیٰ اس طرح معاف فرماتے رہتے ہیں۔

عبادات سے گناہ صغیرہ معاف ہو جاتے ہیں

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی نماز کے لئے مسجد کی طرف

چلتا ہے تو ہر ہر قدم پر اللہ تعالیٰ گناہ معاف فرماتے ہیں۔ اس سے بھی مراد صغیرہ گناہ ہیں، اسی طرح نماز پڑھنے سے بھی صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھ سے بڑی سخت غلطی ہوگئی ہے، پھر ایک گناہ صغیرہ کو بیان کیا کہ مجھ سے یہ گناہ ہوگیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا کہ کیا تم نے اس گناہ کے بعد ہمارے ساتھ مسجد میں نماز نہیں پڑھی؟ انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! نماز تو پڑھی ہے، فرمایا کہ بس تمہارا وہ گناہ اس نماز پڑھنے سے معاف ہوگیا۔ پھر آپ ﷺ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ۔ (سورۃ الھود: آیت ۱۱۴)

یعنی نیکیاں بُرائیوں کو ختم کر دیتی ہیں۔ جب انسان کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کے صغیرہ گناہ معاف ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت کا یہ خودکار نظام بنا دیا ہے کہ صغیرہ گناہ خود بخود معاف ہوتے چلے جاتے ہیں، مگر یہ سب صغیرہ گناہوں کے بارے میں ہے۔

گناہ کبیرہ کیلئے توبہ ضروری ہے

کبیرہ گناہ کے بارے میں قانون یہ ہے کہ وہ توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے، یوں اللہ تعالیٰ کسی پر اپنا فضل فرما دیں اور بغیر توبہ کے معاف فرما دیں تو ان کو کون روکنے والا ہے لیکن قانون اور اصول یہ ہے کہ کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے

معاف نہیں ہوتے۔ اس ملفوظ میں حضرت والا نے یہ جو فرمایا کہ اعمال صالحہ یا توبہ سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ اعمال صالحہ سے صغیرہ گناہ اور توبہ سے کبیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

حقوق العباد اور بعض حقوق اللہ محض توبہ سے معاف نہیں ہوتے

آگے فرمایا کہ ''مگر حقوق معاف نہیں ہوتے'' حقوق سے ایک تو حقوق العباد مراد ہیں اور دوسرے وہ حقوق اللہ مراد ہیں جن کی تلافی ممکن ہو، مثلاً نمازیں چھوٹ گئی ہیں اور آدمی تندرست ہے، ان نمازوں کی قضا کرسکتا ہے، لہٰذا نمازیں معاف نہیں ہوں گی۔ یا مثلاً زکوٰۃ واجب ہوئی اور اب تک زکوٰۃ ادا نہیں کی تو وہ زکوٰۃ معاف نہیں ہوگی، حج واجب ہوگیا تھا، ادا نہیں کیا تو وہ حج معاف نہیں ہوگا، روزے واجب ہوگئے تھے ادا نہیں کیے، وہ معاف نہیں ہوں گے۔ بہر حال! توبہ کے ذریعہ وہ حقوق اللہ جن کی تلافی ممکن ہے وہ معاف نہیں ہوتے اور توبہ کے ذریعہ حقوق العباد معاف نہیں ہوتے جب تک صاحبِ حق معاف نہ کرے یا اس کا حق ادا نہ کر دیا جائے۔

تمام سابقہ حقوق واجبہ کی ادائیگی شروع کر دیں

حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اگر آدمی توبہ کر لینے کے بعد یہ سمجھ لے کہ بس، میرا مقصد حاصل ہوگیا، اب مجھے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ خیال بالکل غلط اور دھوکہ ہے، بلکہ توبہ کر لینے کے بعد یہ دیکھو کہ کیا کیا حقوق میرے ذمے واجب ہیں، چاہے وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ہوں یا بندوں کے حقوق ہوں،

توبہ کر لینے کے بعد ان حقوق کو ادا کرنے کی فکر شروع کرو۔ جس کا طریقہ میں نے توبہ کا بیان شروع کرتے وقت عرض کیا تھا کہ آدمی ایک کاپی بنا لے اور اس کاپی کے اندر یہ لکھے کہ میرے ذمے فلاں فلاں حقوق ہیں، میرے ذمے اتنی نمازیں باقی ہیں، اتنے روزے باقی ہیں، اتنی زکوٰۃ باقی ہے، فلاں فلاں لوگوں کے قرضے باقی ہیں، آج سے میں ان کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں، اگر مکمل ادائیگی سے پہلے میرا انتقال ہو جائے تو میرے ترکہ سے ان عبادات کا فدیہ اور قرضہ ادا کر دیا ہے۔

اگر تمام حقوق کی ادائیگی سے پہلے موت آ گئی

اب اگر اس شخص نے ان نمازوں کو ادا کرنا شروع کر دیا، روزوں کو اور زکوٰۃ کو ادا کرنا شروع کر دیا، لوگوں کے جو حقوق واجب تھے ان کی ادائیگی کی فکر شروع کر دی اور کوشش شروع کر دی تو اس شخص کے بارے میں حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اگر وہ شخص اس کوشش کے دوران مر گیا یعنی ابھی ساری عباداتِ سابقہ ادا نہیں ہوئی تھیں ابھی تمام حقوق کی ادائیگی کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ اس سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو معاف فرما دیں گے اور معاف کرنے کا طریقہ یہ ہوگا کہ جن بندوں کے حقوق اس کے ذمے واجب تھے، ان بندوں سے فرمائیں گے کہ یہ میرا بندہ ہے، اس نے حقوق ادا کرنے شروع کر دیے تھے اور اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی لیکن اس کی عمر ختم ہو گئی تھی جس کی وجہ سے پورے حقوق ادا

نہیں کر سکا، لیکن چونکہ اس نے اخلاص کے ساتھ ادائیگی شروع کر دی تھی، اس لئے اب ہم اور بڑی نعمتیں دے کر تمہیں راضی کر دیتے ہیں، لہٰذا اس کے حقوق معاف کر دو۔

حقوق کی معافی کا راستہ

حضرت والا نے یہاں اس ملفوظ میں یہ بات اختصار کے ساتھ بیان فرمائی ہے، لیکن ایک وعظ میں حضرت والا نے یہ بات تفصیل سے بیان فرمائی ہے، چنانچہ آپ نے وہاں پر یہ بیان فرمایا کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں جب تک ان حقوق کو یا تو ادا نہ کر دیا جائے یا صاحب حق سے معاف نہ کرالیا جائے۔ اس غلط فہمی کے نتیجے میں بعض اوقات لوگوں میں مایوسی پیدا ہو جاتی ہے کہ میرے ذمے اتنے سارے لوگوں کے حقوق واجب ہیں، اگر آج سے میں نے ان حقوق کو ادا کرنا شروع بھی کر دیا تو بھی ساری عمر کھپا دوں گا، تب بھی تمام حقوق ادا نہیں کر سکوں گا، اور جب دل میں مایوسی پیدا ہو جاتی ہے تو پھر جو کچھ تھوڑے بہت حقوق ادا کر سکتا تھا، اس سے بھی رک جاتا ہے۔

مایوس ہونا ٹھیک نہیں

اس لئے ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا مذاق تو یہ تھا کہ:

سوئے نو امیدی مرو امید ھاست
سوئے تاریکی مرو خورشید ھاست

یعنی نا امیدی اور ظلمت و تاریکی کا کوئی راستہ نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے امید کے راستے رکھے ہیں۔ اس لئے یہ خیال غلط ہے کہ حقوق العباد کی معافی کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ جب اللہ کا ایک بندہ حقوق العباد ادا کرنے کے لئے آمادہ ہوگیا اور حقوق ادا کرنے شروع کر دیئے، اپنی سی کوشش صرف کر دی، اس دوران اس کا انتقال ہوگیا تو اللہ تعالیٰ اصحاب حقوق کو راضی فرما دیں گے۔

سو انسانوں کے قاتل کا واقعہ

اس بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس مشہور واقعہ سے استدلال فرمایا جو حدیث شریف میں آتا ہے۔ وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی امت میں ایک شخص قاتل تھا، اس شخص نے ننانوے آدمیوں کو قتل کر دیا، ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کے دل میں خدا کا خوف پیدا ہوا کہ یا اللہ! میں نے یہ کیا کر دیا، ایک انسان کی جان لینا ایسا ہے جیسے پورے عالم انسانیت کی جان لے لینا اور قتل نفس کی جو سزا قرآن کریم نے بیان کی ہے، دوسرے کسی گناہ کے لئے ایسی سزا بیان نہیں فرمائی، چنانچہ فرمایا:

وَمَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّداً فَجَزَآءُهٗ جَهَنَّمُ
خٰلِدًا فِيْهَا وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهٗ وَاَعَدَّ
لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا ○ (سورۃ النسا: آیت ۹۳)

یعنی جو شخص جان بوجھ کر کسی مؤمن کو قتل کرے، تو اس کی سزا جہنم ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہے گا اور اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب اور اللہ تعالیٰ کی لعنت ہوگی

اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہ الفاظ کفر کے علاوہ اور قتل نفس کے علاوہ کسی اور گناہ کے لئے بیان نہیں فرمائے۔

سو کا عدد پورا کر دیا

بہر حال ننانوے آدمیوں کو قتل کرنے کے بعد اس کو فکر ہوئی کہ اب میں کیا کروں، چنانچہ وہ ایک عیسائی پادری کے پاس چلا گیا اور اس سے جا کر کہا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ پادری نے کہا کہ تیری نجات کا کوئی راستہ نہیں، کیونکہ ایک آدمی کو قتل کرنا بہت بڑا گناہ ہے، تو نے تو ننانوے انسانوں کو قتل کر دیا، لہٰذا تیری نجات کا تو کوئی راستہ نہیں، تو تو جہنمی ہے۔ اس شخص کو بڑا غصہ آیا کہ میں تو نجات کا راستہ پوچھنے آیا اور یہ کہتا ہے کہ کوئی راستہ نہیں، اس نے سوچا کہ ننانوے قتل تو کر دیے ہیں، ایک اور سہی تا کہ سو کا عدد پورا ہو جائے، چنانچہ اس نے اس پادری کو بھی قتل کر دیا۔

پھر کسی اور راہب کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں نے سو انسانوں کو قتل کر دیا ہے، میری نجات کا کوئی راستہ بتاؤ۔ اس راہب نے کہا کہ تم توبہ کرو اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو اور ایسا کرو کہ فلاں بستی کے لوگ بہت نیک ہیں، تم اس بستی میں جا کر رہو۔ اس راہب کا مقصد یہ تھا کہ جب یہ شخص اس بستی میں رہے گا تو نیک لوگوں کی صحبت حاصل ہوگی، اس کے ذریعہ اس کے حالات درست ہو جائیں گے اور جو گناہ اس نے کئے ہیں، اس کی تلافی کی کوشش کرے گا، چنانچہ یہ شخص اس بستی کی طرف چل پڑا۔

رحمت اور عذاب کے فرشتوں میں جھگڑا

ابھی راستے میں یہ تھا کہ اس کی موت آ گئی اور اس کا انتقال ہوگیا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس کے بارے میں ملائکہ رحمت اور ملائکہ عذاب کے درمیان جھگڑا ہوگیا، ملائکہ عذاب نے کہا کہ یہ شخص سوقتل کر کے آیا ہے، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، اس کو ہم جہنم میں لے جائیں گے۔ ملائکہ رحمت نے کہا کہ یہ شخص توبہ کر کے نیک بننے کے لئے چل پڑا تھا، لہٰذا یہ ہمارا آدمی ہے، ہم اس کو جنت میں لے جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ

جب یہ دونوں جھگڑنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جہاں سے یہ شخص چلا تھا، اس کی پیائش کرو اور جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس کی پیائش کرو اور یہ دیکھو کہ موت کے وقت کونسی جگہ سے قریب تھا؟ جس بستی سے روانہ ہوا، اس سے قریب تھا یا جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس سے قریب تھا؟ پھر جس بستی سے یہ شخص قریب ہو، اسی کا معاملہ کرو۔

چنانچہ دونوں طرف کے راستوں کی پیائش کی گئی تو وہ جس بستی کی طرف جا رہا تھا، اس طرف ایک گز زیادہ قریب تھا، گویا کہ آدھے راستے سے ایک گز آگے بڑھ گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس شخص کو رحمت والے فرشتوں کے حوالے کر دیا جائے۔

اس واقعہ سے حضرت تھانویؒ کا استدلال

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ سے استدلال فرمایا کہ اس شخص نے جو سو قتل کئے تھے، وہ حقوق العباد سے متعلق تھے، لیکن چونکہ وہ شخص حقوق العباد کی ادائیگی کا عزم کر کے چل پڑا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ اس نے شخص کی توبہ قبول فرمالی اور اس کو بخش دیا۔اور جہاں تک تعلق ہے ان بندوں کا جن کو قتل کیا تھا، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان مقتولین کے درجات بلند کر کے ان کو راضی کر دیں گے۔

پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟

اس واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ جو حکم فرمایا کہ دونوں طرف کے راستوں کی پیمائش کرو اور دیکھو کہ کونسی بستی زیادہ قریب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس کو بخشنے کا ارادہ کر ہی لیا تھا تو پیمائش کرانے کی کیا ضرورت تھی؟ فرض کرو کہ اگر اس شخص کی موت ایک دو گز پہلے آجاتی تب بھی تو اس نے توبہ کا ارادہ کر ہی لیا تھا اور اپنی سی کوشش شروع کر دی تھی، لہٰذا پیمائش کرانے اور قریب اور دور ہونے کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ اشکال میرے ذہن میں بہت عرصے سے تھا اور میں اس تلاش میں تھا کہ اس کا جواب کہیں مل جائے۔

حقوق العباد کی ادائیگی کیلئے اپنی طرف سے قدم بڑھانا شرط ہے

بعد میں اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اس کا یہ جواب ڈالا کہ اللہ تعالیٰ کے پیائش کرانے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ پیائش کرانے کے بعد فیصلہ فرمائیں گے، بلکہ اس کی معافی کا فیصلہ تو پہلے ہی فرما چکے تھے، اس پر نوازش ہو چکی تھی، لیکن بندوں کو یہ بتانے کے لئے پیائش کی گئی کہ یہ معافی کا معاملہ اس وقت ہوتا ہے جب آدمی اصلاح کے راستے پر معتد بہ راستہ چل پڑا ہو، یہ نہیں کہ کسی نے اپنی اصلاح کا اور تبدیلی لانے کا جھوٹا موٹا ارادہ کرلیا، پھر سستی کے عالم میں پڑا رہا، اس کے ساتھ معافی کا معاملہ نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا اس واقعہ کے ذریعہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اصلاح کا ارادہ کرنے کے بعد معتد بہ قدم اٹھنے چاہئیں، معتد بہ راستہ قطع ہونا چاہئے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت آئیگی۔ یہ نہ ہو کہ کسی کے وعظ و تقریر میں نصیحت کی بات سن لی اور ارادہ کرلیا کہ اس نصیحت پر ضرور عمل کریں گے، لیکن کیا کچھ نہیں، تو ایسے ارادے کا کوئی اعتبار نہیں۔ لہٰذا بندوں پر یہ بات ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ اس زمین کی پیائش کرو اور یہ دیکھو کہ اس نے معتد بہ راستہ قطع کرلیا تھا یا نہیں؟ جب پیائش کے بعد پتہ چل گیا کہ اس شخص نے معتد بہ راستہ طے کرلیا تھا، تب اس کی معافی کا فیصلہ فرمایا۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ گناہ صغیرہ کی معافی کا راستہ اللہ تعالیٰ نے اعمال صالحہ کو بنا

دیا ہے اور وہ گناہ کبیرہ جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے اور جن کی تلافی ممکن نہیں، ان کی معافی کے لئے توبہ ہے اور وہ گناہ کبیرہ جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے یا ان حقوق اللہ سے ہے جن کی تلافی ممکن ہے، ان کی معافی کا راستہ یہ ہے کہ اہتمام کر کے ان کی ادائیگی شروع کر دے اور ساتھ میں وصیّت بھی کر دے کہ اگر میں ان کو مکمل نہ کر سکا تو میرے ترکہ میں سے ان عبادات کا فدیہ اور قرضہ ادا کر دیا جائے۔ جب یہ سب کر لیا تو بندے نے اپنے حصّے کا کام کر لیا، اب اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اس کا بیڑہ پار کر دیں گے۔

گناہ کا تقاضہ گناہ نہیں

آگے ایک ملفوظ میں حضرت والاؒ نے ارشاد فرمایا:

> امور طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے، وہ بھی اس وقت جبکہ عمداً اس پر عمل کیا جائے، اور اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہو کر کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کر لی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمائیں گے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۱۹۸)

اس ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بہت اہم اصول بیان فرمایا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ گناہوں کا صدور یا تو طبعی داعیہ اور محرکات کے ذریعہ ہوتا ہے یا انسان کے اندر جو اخلاق رذیلہ ہوتے ہیں وہ انسان کو گناہ پر

آمادہ کرتے ہیں۔ اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف گناہ کے داعیے اور تقاضے کا دل میں پیدا ہو جانا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا اس غلط فہمی کو دور فرما رہے ہیں کہ محض تقاضہ کا دل میں پیدا ہو جانا گناہ نہیں جب تک انسان اس تقاضے پر عمل نہ کرے۔

غصّہ کا علاج سب سے مقدم

مثلاً غصہ کرنا بُرا ہے اور یہ ان چیزوں میں سے ہے کہ تصوّف اور طریقت میں سب سے پہلے اس کا علاج کیا جاتا ہے، یہ غصہ انسان کے باطن کو بالکل تباہ کرنے والا ہے، اس لئے جب کوئی اللہ کا بندہ اپنی اصلاح کے لئے کسی شیخ کے پاس جاتا ہے تو پہلے قدم کے طور پر اس کے غصّے کی اصلاح کی جاتی ہے تا کہ اس کا غصہ قابو میں آجائے۔

غصّہ اور شہوت کے تقاضے پر عمل کرنا گناہ ہے

اب بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ غصّے کا دل میں پیدا ہونا ہی گناہ ہے۔ حضرت والا فرمارہے ہیں کہ محض غصہ کا دل میں پیدا ہو جانا گناہ نہیں بلکہ گناہ اس وقت ہوگا جب اس غصہ کے تقاضے پر عمل کر کے کسی کے ساتھ زیادتی کرو گے۔ اسی طرح شہوت ہے، شہوت کے خیال کا دل میں خود بخود پیدا ہو جانا گناہ نہیں، لیکن اگر اس خیال کو جان بوجھ کر پیدا کرے گا یا اس خیال کو جان بوجھ کر باقی رکھے گا یا اس شہوت کے تقاضے پر کوئی ایسا عمل کر گزرے گا جو شرعاً ناجائز ہے تو گناہ گار ہوگا، مثلاً شہوت کا خیال آنے کے نتیجے میں نگاہ غلط جگہ پر ڈال

دی تو اب وہ گناہ گار ہوگا۔ سارے امراض باطنہ اور رذائل کا یہی معاملہ ہے۔

حسد کے تقاضے پر عمل کا گناہ ہے

مثلاً "حسد" ہے، آپ کے دل میں کسی شخص کی طرف سے حسد ہے، اب اس کے بارے میں کسی اچھائی کی خبر سن کر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ کیوں آگے بڑھ گیا؟ اس کے پاس پیسے کیوں زیادہ آ گئے؟ اس کے پاس دولت کیوں زیادہ ہوگئی؟ اس کی شہرت کیوں زیادہ ہوگئی؟ لوگ اس کو کیوں زیادہ ماننے لگے؟ وغیرہ۔ صرف دل میں اس خیال کا پیدا ہو جانا یہ گناہ نہیں، کیونکہ یہ خیال غیر اختیاری طور پر دل میں پیدا ہوا ہے، یہ خیال اس وقت گناہ بنے گا جب تم اس خیال کے آنے کے نتیجے میں اس شخص کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرو گے، مثلاً آپ کے دل میں یہ خیال آیا کہ فلاں شخص مجھ سے آگے بڑھ گیا، یہ تو بہت بُرا ہوا، اب تم نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کرو کہ اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا ہو جائے، مثلاً اس کی چغلی کرو، لوگوں کے سامنے اس کی بُرائی بیان کرو، اس کی غیبت کرو، تو ان کاموں کے کرنے کے نتیجے میں وہ حسد گناہ بن جائے گا، محض دل میں خیال آ جانے سے گناہ نہیں بنتا۔

حسد کے دو علاج

البتہ "حسد" کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے دل میں دوسرے کی بُرائی کا خیال آ رہا ہو، اس کو فوراً دو کام کرنے

چاہئیں ورنہ وہ حسد کے نتیجے میں گناہ کے اندر مبتلا ہو جائے گا۔ ایک کام یہ کرے کہ اس خیال کو دل میں بُرا سمجھے کہ میرے دل میں یہ جو خیال آ رہا ہے، یہ بہت برا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کرے کہ یا اللہ! یہ بُرا خیال میرے دل سے نکال دیجئے۔ دوسرا کام یہ کرے کہ جس شخص کی طرف سے یہ بُرا خیال آ رہا ہے، اس کے حق میں دعائے خیر کرے، مثلاً آپ کے دل میں اس بات کا دکھ ہو رہا ہے کہ فلاں شخص مجھ سے آگے کیوں نکل گیا، اس کے لئے یہ دعا کرے کہ یا اللہ! اس کو اور ترقی عطا فرما۔ جب تم یہ دعا کرو گے تو دل پر آرے چل جائیں گے، لیکن یہ آرے چلانے مقصود ہیں تاکہ اس بیماری کا علاج ہو۔ اگر اس کی دولت کی وجہ سے اس پر حسد ہو رہا تھا تو اس کے لئے یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور دولت عطا فرما۔ اگر اس کے منصب کی وجہ سے حسد ہو رہا تھا تو یہ دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو اور بڑا منصب عطا فرما۔ اس کو اور زیادہ ترقی عطا فرما، لہٰذا جس چیز کی وجہ سے حسد ہو رہا تھا، اس کی زیادتی کی دعا کرے، جب حسد پیدا ہو تو فوراً یہ دو کام کرے ورنہ یہ حسد کسی نہ کسی وقت آدمی کو تباہ کر دے گا۔

بہرحال! جتنے بھی بُرے اخلاق ہیں، ان سب کا اصول حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بیان فرمایا کہ "محض امورِ طبعیہ پر مؤاخذہ نہیں، بلکہ ان کے مقتضاء پر عمل کرنے سے مؤاخذہ ہوتا ہے"۔ پھر فرمایا کہ "وہ بھی اس وقت جب کہ عمداً اس پر عمل کیا جائے۔

طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر زبان سے نکلنے والے کلمات

آگے بڑی چھوٹ والی بات ارشاد فرمادی کہ ''اگر طبعی ناگواری سے مغلوب ہوکر کسی وقت کوئی کلمہ بیجا زبان سے نکل جائے اور بعد میں اس سے معذرت کرلی جائے تو حق تعالیٰ اس کو معاف فرمادیں گے''۔ یعنی ویسے تو غصہ قابو میں آ گیا ہے اور کسی شخص کی صحبت کے نتیجے میں اور اس کے آگے رگڑے کھانے کے نتیجے میں طبیعت میں ایک اعتدال پیدا ہونے لگا اور غصہ قابو میں آنے لگا، لیکن پھر بھی کسی کسی وقت وہ غصہ بے قابو ہو جاتا ہے، جیسے کسی بات پر ناگواری پیدا ہوئی، اس کے نتیجے میں ایک دم سے بھڑک اٹھا اور اس کی وجہ سے زبان سے کوئی نازیبا کلمہ نکل گیا تو ایسا ہو جاتا ہے، اس کے بارے میں یہ نہ سمجھے کہ یہ کوئی غیر معمولی اور نا قابل اصلاح بات ہوگئی۔ البتہ جب ایسا ہو جائے تو جس کے ساتھ اس قسم کا معاملہ ہوا تھا، اس سے معذرت کرلے لیکن یہ نہ سمجھے کہ اب میرا غصہ قابل اصلاح نہیں بلکہ اپنے غصہ کی اصلاح کی فکر کرے۔

ایک صحابی کو غصہ نہ کرنے کی نصیحت

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے نصیحت فرمایئے اور مختصر نصیحت فرمایئے۔ ایک تو نصیحت کی درخواست کی اور ساتھ مختصر

نصیحت کی درخواست کی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو برا نہیں مانا کہ تم نصیحت بھی طلب کرتے ہو اور ساتھ میں شرطیں بھی لگاتے ہو اور نہ اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا بلکہ آپ نے اس کی اس فرمائش کی تعمیل فرمائی۔ اس سے پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص مختصر نصیحت طلب کرے تو اس کو مختصر نصیحت کردو، اس لئے کہ اس کے پاس وقت کم ہے اور وہ یہ چاہتا ہے کہ ایک منٹ میں مجھے کوئی دین کی بات حاصل ہو جائے، اس کی اس فرمائش کو پورا کردو، اس لئے کہ دین کی باتیں ایسی بھی ہیں جو ایک منٹ یا دو منٹ میں بھی ہوسکتی ہیں۔ بہرحال! ان صحابی کی فرمائش پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نصیحت فرمائی کہ:

لَا تَغْضَبْ

غصہ مت کرنا۔ اس سے پتہ چلا کہ غصہ ان چیزوں میں سے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک اس کی اتنی اہمیت تھی کہ مختصر نصیحت کے وقت آپ نے اسی کا انتخاب فرمایا۔

ابتداءً بالکل غصہ کرنا چھوڑ دو

اسی لئے ہمارے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کے طریق میں غصہ ان چیزوں میں سے ہے جس کا سب سے پہلے علاج کیا جاتا ہے، جب کوئی شخص کسی شیخ کی خدمت میں اپنی اصلاح کے لئے جاتا ہے تو شروع میں اس سے یہ کہا جاتا ہے کہ تم غصہ بالکل مت کرو، نہ غصہ کے صحیح محل پر غصہ کرو اور نہ ہی بے محل غصہ کرو، جہاں غصہ کرنے کا حق ہے وہاں بھی

غصہ نہ کرو تا کہ تمہاری طبیعت اعتدال پر آ جائے۔ لیکن اس کے باوجود کسی وقت غیر اختیاری طور پر منہ سے نازیبا کلمات نکل جائیں تو جس کے خلاف وہ کلمات نکلے ہیں، اس سے معافی مانگ لو، معذرت کرلو کہ بھائی! میرے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے، غلطی ہوگئی، معاف کردو، جب یہ کرلو گے تو انشاء اللہ آئندہ کے لئے راستہ کھل جائے گا۔

معافی مانگنے سے شرم مت کرو

معافی مانگ لینے میں کوئی ذلت نہیں ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جان جائے مگر ناک نہ جائے، کسی طرح ناک نیچی نہ کرنی پڑے۔ یہ تصور اور خیال بہت خراب ہے، کیونکہ تکبر پر مبنی ہے، اس لئے جب کبھی ایسا ہو جائے، معافی مانگ لو، معافی مانگنے میں کیا رکھا ہے، اگر دنیا میں معافی مانگ لی تو یہاں معافی ہو جائے گی، اگر خدانخواستہ یہاں معاف نہیں کرایا اور آخرت میں جا کر حساب کتاب دینا پڑا تو اس کا بڑا خطرناک انجام ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ یہاں پر توبہ کا بیان ختم ہوگیا، اب آگے دوسرا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے "تعلق مع اللہ" انشاء اللہ کل اس کو شروع کریں گے۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اللہ تعالیٰ کی محبت

اور اس کے اسباب

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۳

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ تعالیٰ کی محبت

اور

اس کے اسباب

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین والعاقبة للمتقین والصلوٰة والسلام علی رسوله الکریم وعلی آله واصحابه اجمعین أمابعد!

محبت کے اسباب اختیاری ہیں

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے چند ارشادات اللہ تعالیٰ کے محبت اور تعلق مع اللہ سے متعلق ہیں، پہلے ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا:

''خدا کی محبت اگر چہ امر غیر اختیاری ہے، لیکن اس کے اسباب بندے کے اختیار میں ہیں، وہ یہ ہیں (۱) کثرت ذکر اللہ (۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا (۳) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا (۴) طاعت پر مواظبت کرنا (۵) حق تعالیٰ سے دعا کرنا، اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں، صرف ایک غلطی علمی محتمل

ہے، وہ قابل تنبیہ ہے، وہ یہ کہ اپنے ذہن سے کوئی درجہ محبت کا تراش کر اس کا منتظر رہنا، یہ غلطی ہوگی، بلکہ اس تدبیر کی مداومت سے جو درجہ محبت کا حاصل ہوتا ہے، وہی اس درجہ میں مطلوب ہے، پھر خواہ اس میں مزعوم ترقی ہو، خواہ ایک حالت پر رہ جائے، البتہ رسوخ میں ترقی لازم ہے، صرف لون محبت میں تفاوت ہوتا رہتا ہے"

(انفاس عیسیٰ: ص۱۹۹)

ان چند جملوں میں بڑے بڑے مضامین ارشاد فرمادئے ہیں، ان سے مقصود یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت اور اللہ جل شانہ سے تعلق حصول دین کی تمام جدوجہد کا مغز ہے، یہ جو آپ سنتے ہیں کہ حضرات اولیاء کرام اور صوفیاء کرام کی خدمت میں لوگ جاتے تھے اور وہاں مجاھدے اور ریاضتیں کرتے تھے، ان سب کا مقصود یہی تھا کہ تعلق مع اللہ پیدا ہو جائے، اور یہ تعلق مضبوط ہو جائے، بس جس دن یہ چیزیں حاصل ہوگئیں، اس دن پورا دین حاصل ہوگیا، کیونکہ محبت وہ چیز ہے جو مشکل سے مشکل کام کو آسان بنادیتی ہے۔

محبت مشکل کام کو آسان کردیتی ہے

اگر جائزہ لے کر دیکھو تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دین پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ہے، اتنی نمازیں پڑھو، اتنے روزے رکھو، اتنی زکوٰۃ دو، حج کرو، اور ان سب سے مشکل یہ ہے کہ فلاں گناہ سے بچو، فلاں گناہ سے بچو، آنکھوں کو بچاؤ، اپنے کانوں کو

بچاؤ، زبان کو بچاؤ، ان سب کو بچانا آدمی کو مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جس دن اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگئی اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوگیا، اس دن یہ سب کام آسان ہو جائیں گے، مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ع : از محبت تلخہا شیریں شود

''یعنی جب محبت پیدا ہو جاتی ہے تو کڑوی چیزیں بھی میٹھی لگتی ہیں''

ماں کو بچے سے محبت کا نتیجہ

ایک ماں کو دیکھو کہ سردی کا موسم ہے، کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا ہے، اب رات کو بچے نے بستر پر پیشاب پاخانہ کر دیا، اب سخت سردی میں بستر سے اٹھنا اور جا کر بستر وغیرہ دھونا، اس کے کپڑے دھونا کتنا مشکل کام ہے، لیکن چونکہ ماں کو بچے کے ساتھ محبت ہے، اس لئے وہ سب کام خوشی کے ساتھ آسانی کے ساتھ کر رہی ہے، اگر اس ماں سے کوئی شخص کہے کہ اس بچے کی وجہ سے تمہیں رات کو تکلیف ہوتی ہے، سردی میں تمہیں اٹھنا پڑتا ہے، اس کا بستر صاف کرنا پڑتا ہے، یہ بچہ مر جائے تو اچھا ہے، تو وہ ماں اس شخص کو اپنا دشمن سمجھے گی اور یہ کہے گی کہ میں اس طرح کی ہزاروں تکلیفیں برداشت کرنے کو تیار ہوں، لیکن کسی طرح میرا یہ جگر کا ٹکڑا مجھ سے جدا نہ ہو، چونکہ اس بچے سے ماں کو محبت ہوگئی ہے، اس لئے وہ ساری تکلیفیں اس کے لئے آسان ہوگئیں۔

تنخواہ سے محبت کا نتیجہ

ایک شخص رمضان کی رات میں عبادت کرتا ہے، سحری کے لئے بیدار ہوتا

ہے، پھر صبح سویرے اٹھ کر دفتر کی طرف بھاگتا ہے، اب بھری بس کے اندر ڈنڈا پکڑا بس کے دروازے پر لٹک کر سفر کر رہا ہے، دفتر پہنچ کر آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دے رہا ہے، اور شام کو تھکا ماندہ چلا آرہا ہے، وہ یہ ساری مشقتیں برداشت کر رہا ہے، لیکن یہ ساری مشقتیں اس کے لئے آسان ہوگئیں، کیونکہ اس کو اس تنخواہ سے محبت ہوگئی ہے جو مہینے کے آخر میں ملنے والی ہے، اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے کہ تمہیں رمضان کے مہینے میں بڑی مشقت اٹھانی پڑتی ہے، صبح ہی صبح دفتر کی طرف بسوں میں لٹک کر جانا پڑتا ہے، وہاں پر آٹھ گھنٹے کی مشقت والی نوکری کرنی پڑتی ہے، چلو میں تمہاری یہ نوکری چھڑوا دیتا ہوں، وہ اس شخص کو دشمن سمجھے گا کہ میری اچھی بھلی نوکری لگی ہوئی ہے، یہ اس کو چھڑوا رہا ہے، اس کے لئے اس تنخواہ سے محبت ہونے کی وجہ سے صبح سویرے اٹھنا اور بسوں میں لٹک کر سفر کرنا اور آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینا یہ سب کام محبوب ہوگئے، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ از محبت تلخہا شیریں شود، یعنی محبت سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی ہو جاتی ہیں۔

قلندری راستہ دکھادیں

اسی طرح دین کے جتنے کام مشکل نظر آرہے ہیں، اس کو آسان بنانے کا راستہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت دل میں پیدا ہو جائے، تعلق پیدا ہو جائے تو اس محبت کے نتیجے میں یہ سارے کام آسان ہو جائیں گے، اسی بات کو کسی نے دوسرے انداز میں اس طرح بیان کیا ہے کہ:

صنمارہ قلندر سزاوار بمن نمائی

دراز و دور دیدم راہ و رسم و پارسائی

یعنی مرید اپنے شیخ سے کہہ رہا ہے کہ مجھے تو قلندری راستہ دکھا دیجئے، کیونکہ نیکی اور پارسائی کا راستہ تو مجھے لمبا چوڑا نظر آرہا ہے کہ نمازیں پڑھو، تہجد پڑھو، اشراق پڑھو، چاشت کی نماز پڑھو، ذکر کرو، نگاہ کی حفاظت کرو، زبان کی حفاظت کرو، کان کی حفاظت کرو، ہر چیز کو بچاؤ، یہ کام تو میرے لئے بڑا مشکل ہے، مجھے تو کوئی قلندری راستہ بتا دیجئے۔

اس شعر کا صحیح مطلب

بعض لوگوں نے اس شعر کا بڑا غلط مطلب نکالا ہے، اور وہ یہ کہ شاعر کا کہنا یہ ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ جو ظاہری اعمال ہیں ان کو انجام دینا تو بڑا مشکل ہے، ان کے بجائے مجھے شورٹ کٹ (مختصر راستہ) بتا دو، جیسے آج کل کے جاہل پیر بتاتے ہیں، جس کے ذریعہ میں آسانی سے سیدھا جنت میں پہنچ جاؤں۔ ان جاہلوں نے شعر کا یہ مطلب نکالا ہے، حالانکہ یہ مطلب درست نہیں، بلکہ اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ یہ ''راہ و رسم و پارسائی'' کا یہ راستہ مجھے بڑا لمبا نظر آرہا ہے، اس لئے مجھے ایسا راہ قلندری بتا دیجئے جس سے میرے لئے یہ راستہ آسان اور مختصر ہو جائے، اگرچہ مجھے جانا اسی راستے ہے، نماز، روزہ بھی کرنا ہے، زکوٰۃ اور حج بھی ادا کرنے ہیں، لیکن مجھے کوئی ایسا طریقہ بتا دیجئے جس سے یہ اعمال میرے لئے آسان ہو جائیں، اسی کا نام ''طریق القلندر'' ہے اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک وعظ ہے جس کا نام ہی ''طریق القلندر'' ہے، وہ وعظ اسی شعر کی تشریح پر ہے،

وہ بڑا عجیب وغریب وعظ ہے، ہر ایک کو پڑھنا چاہئے۔

''طریق القلندر'' اللہ کی محبت پیدا کرنا ہے

وہ ''طریق القلندر'' محبت کا پیدا کر دینا ہے، اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق کا پیدا ہو جانا، جس دن اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوگئی اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوگیا، اس کے بعد یہ راستہ لمبا نہیں رہے گا، بلکہ یہ راستہ مختصر اور آسان ہو جائے گا، اس کی مثال یہ سمجھو کہ ایک شخص سفر سے بہت گھبراتا ہے، اس سے سفر نہیں کیا جاتا، کوئی شخص اس سے کہے کہ میرے ساتھ لاہور چلو، وہاں لاہور میں تمہارے دوست ہیں، احباب ہیں، وہ کہتا ہے کہ یہ میرے بس کا کام نہیں، میں نہیں جاتا، اس شخص کو لاہور جانا مشکل معلوم ہو رہا ہے۔

لاہور کا سفر آسان ہوگیا

اب اس شخص کو لاہور لے جانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لئے لاہور میں کوئی ایسی محبت کی چیز پیدا کر دو کہ پھر اس کے لئے یہ سفرِ آسان ہو جائے، مثلاً اس سے یہ کہا جائے کہ اگر تم لاہور جاؤ گے تو وہاں کا بادشاہ تمہیں اپنا مقرب بنالے گا اور تم اس کے مصاحب بن جاؤ گے، اور تمہاری اتنی تنخواہ ہوگی، اور یہ سہولتیں تم کو ملیں گی، اب اس سے کہا جائے کہ لاہور چلو تو وہی آدمی جو یہ کہہ رہا تھا کہ میرے لئے سفر کرنا مشکل ہے، ریل میں کیسے سوار ہوں، کیسے ۲۴ گھنٹے کا سفر کروں، اسی کو جب آپ نے ذرا سی لالچ دیدی تو چونکہ وہ لالچ ایسی ہے کہ اس کا تعلق دل سے ہے،

اس وجہ سے وہ سفر اس کے لئے آسان ہو گیا، اور وہی شخص اب کہتا ہے کہ مجھے دس مرتبہ لاہور کا سفر کرا دو، میں سفر کرنے کے لئے تیار ہوں، اس لئے کہ محبت پیدا ہو گئی۔

سارا کھیل محبت کا ہے

بہر حال، یہ سارا کھیل محبت کا ہے، اگر اللہ تعالیٰ سے دل میں محبت پیدا ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو جائے تو یہی راستہ جس کو لمبا سمجھ رہا تھا، لمحوں میں طے ہو جاتا ہے، پھر اس میں کوئی دشواری اور پریشانی باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا یہ جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ اگر بزرگوں کے پاس جائیں گے تو کیا ملے گا؟ اس بزرگ کے پاس دین کا کوئی ایسا علم ہے نہیں جو دوسروں کے پاس نہ ہو، کتابوں کے اندر بھی دین کی باتیں موجود ہیں اور اس بزرگ کے پاس کوئی ایسا عمل اور جادو منتر بھی نہیں ہے کہ اس کے ذریعہ وہ تمہیں عمل کے راستے پر ڈال دے گا، بزرگ کے پاس جا کر کیا ملتا ہے؟

اللہ والوں سے اللہ کی محبت ملتی ہے

اصل بات یہ ہے کہ ان کے پاس جانے سے اللہ کی محبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، جو کامیابی کی کنجی ہے، اگر یہ دو چیزیں حاصل ہو گئیں تو سب کچھ حاصل ہو گیا، جو لوگ بزرگوں کے پاس اور مشائخ کے پاس جاتے ہیں، وہ یہی چیزیں لینے جاتے ہیں، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے:

زھد زاھد را و دیں دیندار را
اِک ذرۂ دردِ دلِ عطّار را

یہ شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے، اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ آپ زاہد کو زہد دیتے رہیں، اور دیندار کو دین دیتے رہیں، عطّار کو تو بس دردِ دل کا ایک ذرہ عطا فرما دیجئے۔ اب بظاہر تو ان دونوں باتوں میں تضاد نظر آرہا ہے، کیونکہ ایک طرف تو یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے نہ دین چاہئے اور نہ مجھے زہد چاہئے دوسری طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے دردِ دل کا ذرہ چاہئے، لیکن حقیقت میں وہ دونوں باتوں میں تضاد کا اظہار نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ لوگ دوسرے راستے سے دین کی طرف جارہے ہیں، مجھے تو وہ چیز چاہئے کہ اس کے حاصل ہونے بعد زہد اور دینداری وغیرہ یہ سب خود بخود اس کے پیچھے چلی آئیں، وہ چیز ہے ''دردِ دل'' جس دن یہ مل گیا اس دن یہ زہد اور دینداری اس کے پیچھے خود بخود چلی آئیں گی، چنانچہ سارے مجاہدات اور ساری ریاضتوں سے مقصود اللہ جل شانہ کی ''محبت'' کا حصول ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مضبوط ہونا ہے، مشائخ کی صحبت اور ان کی تعلیم و تربیت سے بھی ان دو چیزوں کا حصول مقصود ہوتا ہے۔

تھانہ بھون میں اقطاب ثلاثہ

تھانہ بھون کی خانقاہ میں ایک زمانہ میں تین بزرگ رہتے تھے، جن کو ''اقطاب ثلاثہ'' کہا جاتا تھا، ایک حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ، دوسرے حضرت شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ، اور تیسرے حضرت حافظ ضامن

شہید رحمۃ اللہ علیہ، یہ تینوں اپنے وقت کے ''قطب'' تھے، اور ہر ایک کو اللہ تعالیٰ نے عجیب کمالات عطا فرمائے تھے، خانقاہ میں ان کے کمروں کی ترتیب یہ تھی کہ خانقاہ میں داخل ہوتے ہی سب سے پہلے حضرت حافظ ضامن شہید رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اس کے بعد حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، اس کے بعد حضرت شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا کمرہ تھا، مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ عالم بھی تھے اور باکمال صوفی بھی تھے۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کا مناظرے کا ارادہ

حضرت مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کسی فقہی موضوع پر ایک رسالہ لکھ دیا، اس زمانے میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نئے نئے دار العلوم دیوبند سے فارغ ہوئے تھے، اس لئے ان کا علم تازہ تھا، جب مولانا شیخ محمد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وہ رسالہ پڑھا تو ان کو اس سے کچھ اختلاف ہوگیا کہ اس میں فلاں بات صحیح نہیں لکھی۔ جب طالب علم نیا نیا دورۂ حدیث سے فارغ ہوتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ''ہم چوں دیگر نیست'' وہ سمجھتا ہے کہ ساری دنیا کا علم میرے پاس آگیا ہے اور ساری دنیا جاہل ہے۔ چنانچہ ان کے دماغ میں یہ خیال آیا کہ جس شخص نے یہ رسالہ لکھا ہے اس سے مناظرہ کروں گا، لوگوں سے پوچھا کہ یہ مولانا شیخ محمد تھانوی کہاں رہتے ہیں، لوگوں نے بتایا کہ تھانہ بھون میں رہتے ہیں، چنانچہ تھانہ بھون گئے اور تلاش کرتے ہوئے خانقاہ میں پہنچ گئے۔

مناظرہ کرنا بھول کر اشغال میں مشغول ہوگئے

جب خانقاہ میں داخل ہوئے تو چونکہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کو پہلے سے جانتے تھے، اس سے پہلے کئی ملاقاتیں ہو چکی تھیں، حضرت حاجی صاحب کا کمرہ خانقاہ میں پہلے پڑتا تھا، جب حاجی صاحبؒ نے حضرت گنگوہیؒ کو جاتے ہوئے دیکھا تو ان کو بلا لیا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ حضرت گنگوہیؒ نے فرمایا کہ حضرت! شیخ محمد تھانوی صاحب نے بڑی بات کتاب میں لکھ دی ہے، اس پر ان سے مناظرہ کرنے جا رہا ہوں، حضرت حاجی صاحب نے ان کو اپنے پاس بٹھالیا، اور فرمایا توبہ، توبہ، ایسی بات نہیں کرتے، وہ بزرگ آدمی ہیں، اتنے بڑے آدمی ہیں، تم ایک طالبعلم ہو کر ان سے مناظرہ کرو گے؟ یہ بڑی بے ادبی کی بات ہے، پھر حضرت حاجی صاحب نے ان کو ایسا مصروف کر دیا کہ وہ مناظرہ کرنا تو بھول گئے اور حضرت حاجی صاحب کے پاس رہ پڑے اور ان سے بیعت ہو گئے اور بیعت ہونے کے بعد ذکر و اذکار اور تعلیمات و اشغال کے اندر مشغول ہو گئے۔

جو کچھ دینا تھا وہ دے چکے

- تھانہ بھون تو اس خیال سے آئے تھے کہ مناظرہ کر کے شام کو یا آئندہ کل واپس چلے جائیں گے، اس لئے کپڑے کے ایک ہی جوڑے میں آئے تھے، اور دوسرے جوڑے نہیں لائے تھے، لیکن حضرت حاجی صاحبؒ سے بیعت ہونے کے بعد وہیں رہ گئے، اور چالیس دن وہیں قیام کیا، اور جو کپڑے پہن کر آئے تھے، اسی

کو دھو کر دوبارہ پہن لیتے، اس طرح چالیس دن گزار دیے، چالیس دن کے بعد حضرت حاجی صاحبؒ نے ان سے فرمایا کہ:

''میاں رشید احمد! ہمیں تم کو جو کچھ دینا تھا وہ دے چکے، اب اللہ کا نام لے کر واپس جاؤ، اور وہاں جا کر اپنا کام کرو، اگر کوئی خاص حالت طاری ہو تو کسی اور سے ذکر نہ کرنا، بلکہ مجھے ہی لکھنا''

اللہ کی محبت دیدی

حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جس وقت حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ فرمایا کہ ''میاں جو کچھ ہمیں تم کو دینا تھا وہ دیدیا'' اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ بڑے میاں نے چالیس دن میں کیا دیدیا، بارہ سال کے بعد سمجھ میں آیا کہ کیا دیدیا، وہ یہ کہ اللہ کی محبت دیدی، اور تعلق مع اللہ پیدا کردیا، اس صحبت کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کی محبت اور وہ تعلق مع اللہ دل میں پیدا فرمادیا جو صلاح وفلاح کی کنجی تھی۔

اولیاء کی صحبت کی قیمت

یہ جو شعر مشہور ہے کہ:

یک زمانہ صحبت باولیاء

بہتر است از صد سالہ طاعتِ بے ریا

یعنی تھوڑی دیر کے لئے اولیاء اللہ کی صحبت کا حاصل ہوجانا یہ سو سال کی بے ریا طاعت سے بہتر ہے، بے ریا کی بھی قید لگی ہوئی ہے، یعنی طاعت بھی ہو اور

بے ریا بھی ہو، اس سے بھی بہتر وہ صحبت ہے، کسی نے اس شعر پر اعتراض کیا کہ اس کے اندر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے، کیونکہ جو طاعت اخلاص کے ساتھ کی گئی ہو اور سو سال تک کی گئی ہو، پھر بھی ایک ساعت کی صحبت اس طاعت سے بہتر کیسے ہوگی؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے، بلکہ اگر شاعر ''صد لاکھ سال'' کہتا، یعنی ایک ساعت کی صحبت سو لاکھ سال کی عبادت سے بہتر ہے تو بھی مبالغہ نہ ہوتا، اس لئے اگر کوئی شخص سو لاکھ سال تک غلط رخ پر عبادت کرتا رہے، اگرچہ وہ اخلاص کے ساتھ کرتا رہے، لیکن عبادت کے اندر صرف اخلاص ہی کافی نہیں ہے، بلکہ اس عبادت کا طریقہ بھی درست ہونا چاہئے، لہٰذا اگر طریقہ صحیح نہیں تھا تو وہ سو لاکھ سال کی عبادت بے کار ہوگئی، اس کا کچھ حاصل نہیں۔

صحبت سے محبت، محبت سے نور

لہٰذا اولیاء اللہ کی صحبت سے جو چیز حاصل ہوتی ہے، وہ یہ کہ ایک تو عبادت اور طاعت کا صحیح طریقہ معلوم ہوتا ہے، اور دوسرے محبت اور تعلق مع اللہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص سو سال تک عبادت بغیر محبت کے کرے گا تو ایک طرف اس کی عبادت میں نور نہیں ہوگا، دوسرے یہ کہ وہ عبادت آسان نہیں ہوگی، لیکن صحبت کے بعد اس عبادت میں نور بھی پیدا ہو جائے گا، اور وہ عبادت آسان بھی ہو جائے گی۔ اس لئے تعلق مع اللہ پیدا کرنا ہے، جب کوئی آدمی اس طریق پر چلتا ہے تو اس کا پہلا مطلوب تعلق مع اللہ ہونا چاہئے۔

اسباب محبت اختیار میں ہیں

اب اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ اللہ کی محبت دل میں کیسے پیدا کریں؟ کیونکہ یہ محبت انسان کے اختیار میں نہیں، بلکہ یہ تو انسان کے اختیار سے باہر ہے، اس سوال کا جواب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں دیا ہے کہ:

> خدا کی محبت اگر چہ غیر اختیاری چیز ہے، لیکن اس کے اسباب اختیار میں ہیں، وہ یہ ہیں (۱) کثرت ذکر اللہ (۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا (۳) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا (۴) طاعت پر مواظبت کرنا (۵) حق تعالیٰ سے دعا کرنا، اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں...........

ان اسباب میں پہلا سبب یہ بیان فرمایا ''کثرت ذکر اللہ'' جب آدمی کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں خود بخود اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ یہ سب سے پہلا سبب ہے، آج کا ہمارا سبق یہی ہے، اس پر عمل آج ہی سے شروع کر دیں، اب وقت ختم ہو گیا، باقی اسباب کے بارے میں زندگی رہی تو انشاء اللہ کل عرض کر دوں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

کثرتِ ذکر اللہ

محبت پیدا کرنے کا ذریعہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۴

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

کثرتِ ذکر اللہ
محبت پیدا کرنے کا ذریعہ

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین والعاقبة للمتقین والصلوٰة والسلام علیٰ رسوله الکریم و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ أجمعین، امّابعد!

تمہید

گذشتہ کل حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ملفوظ آپ حضرات کو سنایا تھا، اور اس کی تشریح شروع کی تھی، اس ملفوظ میں حضرت والا نے جو باتیں بیان فرمائی ہیں وہ سارے تصوف سارے جدوجہد کا مطلوب اور مقصود ہے۔

کیا ''تصوف'' اور ''شریعت'' الگ الگ ہیں؟

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''تصوف'' کوئی اور چیز ہے اور ''شریعت'' کوئی اور چیز ہے، حالانکہ جس معنی کے اعتبار سے ان کو الگ الگ سمجھا جاتا ہے وہ بات درست نہیں، اس اعتبار سے تو بے شک ان دونوں کے درمیان فرق ہے کہ

''تصوف'' کے احکام کسی اور چیز سے متعلق ہیں اور ''شریعت'' کے احکام کسی اور چیز سے متعلق ہیں، لیکن یہ دونوں ایک دوسرے کے لئے ''تکملہ'' ہیں، ''شریعت'' طریقت کے بغیر بے روح ہے اور ''طریقت'' شریعت کے بغیر گمراہی ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص صرف ''تصوف'' اور ''طریقت'' کو لے کر بیٹھ جائے اور شریعت کے احکام کو نظر انداز کردے تو زندقہ اور گمراہی ہے، اور اگر کوئی شخص شریعت کے احکام پر تو عمل کرے لیکن طریقت کے احکام کو نظر انداز کردے اور اس کی اہمیت نہ سمجھے تو وہ شریعت بے روح ہے۔

دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم ملزوم ہیں

مثلاً ایک شخص نماز روزہ ادا کر رہا ہے جو شریعت کا حکم ہے لیکن اس نماز روزے میں اخلاص نہیں ہے، تو وہ بے جان ہے، بے روح ہے، لہٰذا شریعت اور طریقت دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم ہیں، لہٰذا دونوں کو بیک وقت حاصل کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ ''طریقت'' شریعت کے احکام میں قوت پیدا کرتی ہے۔

ایک ایک عمل کی اصلاح مشکل ہے

لیکن اگر شریعت کے تمام احکام کی ایک ایک کر کے مشق کرے اور ایک ایک کو لے کر اس کے اندر اخلاص پیدا کرے، اس کی اصلاح کرے، مثلاً پہلے نماز کو درست کرنے کی مشق کر رہا ہے، پھر روزے کی مشق کر رہا ہے، پھر زکوٰۃ کی، پھر حج کی مشق کر رہا ہے، پھر اپنی آنکھ کی حفاظت کی مشق کر رہا ہے، پھر اپنے کان کی

حفاظت کی مشق کر رہا ہے، اسی طرح اگر ایک ایک چیز کو لے کر اس کی مشق کرے گا تو زندگی ختم ہو جائے گی لیکن یہ فہرست ختم نہ ہوگی۔ لہٰذا ایک ایسی چیز کا حاصل کرنا ضروری ہے جس کے بعد تمام چیزوں کا حاصل کرنا آسان ہو جائے وہ چیز ''تعلق مع اللہ'' ہے۔

عقل مند باندی کا واقعہ

ہمارے حضرت والا نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک بادشاہ کا دربار لگا ہوا تھا، اس وقت بادشاہ فیاضی کے جوش میں آگیا، اور اس نے درباریوں سے کہا کہ اس وقت دربار میں جو کچھ تمہیں نظر آرہا ہے، سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات، فانوس وغیرہ، میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ جو شخص جس چیز پر ہاتھ رکھ دے گا، وہ چیز اس کی ہو جائے گی، بس اعلان سنتے ہی پورے دربار میں بھگدڑ مچ گئی، کوئی سونے کی طرف بھاگ رہا ہے، کوئی چاندی کی طرف بھاگ رہا ہے، کوئی ہیرے کی طرف کوئی جواہرات کی طرف بھاگ رہا ہے، کوئی فانوس اٹھا رہا ہے، ایک باندی بادشاہ کے قریب کھڑی تھی، جب سب لوگ دوسری چیزوں کی طرف دوڑے تو اس نے جلدی سے بادشاہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا، اس باندی نے یہ سوچا کہ یہ سب بے وقوف لوگ ہیں جو سونا چاندی کی طرف بھاگ رہے ہیں، میں تو جڑ اور اصل پر ہاتھ رکھ دیتی ہوں، اگر یہ مل گیا تو پھر سونا بھی میرا، چاندی بھی میری، اور ساری نعمتیں پھر میری ہیں، بس ایک یہ مل جائے۔ بادشاہ نے اس باندی سے کہا کہ سب لوگ سونا چاندی کی طرف بھاگ رہے ہیں، تو نہیں بھاگ رہی ہے؟ اس

باندی نے کہا کہ آپ نے اعلان کیا تھا کہ جو شخص جس پر ہاتھ رکھ دے گا وہ اس کا ہو جائے گا، لہٰذا میں نے تو آپ پر ہاتھ رکھ دیا، اب آپ میرے ہو گئے، اب آپ کے پاس جو سلطنت ہے، مال و دولت ہے، جاہ ہے، عزت ہے وغیرہ ان سب میں میرا حصہ بھی ہے۔

اللہ کی محبت کے بعد سب آسان ہو جائے گا

حضرات صوفیاء کرام بھی یہی کام کرتے ہیں کہ بادشاہ کے سر پر ہاتھ رکھنا سکھاتے ہیں، وہ یہ کہ ''تعلق مع اللہ'' پیدا کرو، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کرلو، جب یہ پیدا کرلو گے تو سب کچھ مل جائے گا، کیونکہ ''حب اللہ'' اور ''تعلق مع اللہ'' تمام عبادات کی بنیاد ہے، اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، یہ چیز اگرچہ دیکھنے میں غیر اختیاری ہے، لیکن اس کے پیدا کرنے کے اسباب اختیار میں ہیں، اگر وہ اسباب اختیار کرلو گے تو انشاء اللہ وہ محبت پیدا ہو جائے گی، اس محبت کے پیدا کرنے کے بہت سے اسباب حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اس ملفوظ میں ذکر فرمائے ہیں، ان میں سے ایک ایک کے بارے میں کچھ تفصیل عرض کروں گا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو یہ محبت اور تعلق مع اللہ کی دولت عطا فرما دے، آمین۔ ان میں سے ہر سبب کو بیک وقت اختیار کرنے کی ضرورت ہے، جب یہ تمام اسباب اختیار کئے جائیں گے تو انشاء اللہ وہ ''محبت'' ہمارے اپنے ظرف کے مطابق حاصل ہو گی، جب وہ حاصل ہو جائے گی تو سب کچھ حاصل ہو جائے گا۔

ذکر کی کثرت کا حکم

پہلی چیز جو تعلق مع اللہ اور اللہ کی محبت دل میں پیدا ہونے کا سبب بنتی ہے وہ ''کثرت ذکر اللہ'' ہے، ذکر اللہ کی جتنی کثرت ہوگی، اتنا ہی محبت میں اضافہ ہوگا، یہی وجہ ہے کہ خود قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا،

اے ایمان والو! اللہ کا ذکر کثرت سے کرو، اور صبح و شام اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کیا کرو۔

ذکر سے اللہ کا فائدہ ہے؟

اللہ تعالیٰ یہ جو فرما رہے ہیں کہ میرا ذکر کثرت سے کیا کرو، کیا اللہ تعالیٰ کو اپنا ذکر کرانے میں مزہ آتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کو ذکر سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے؟ جس شخص کا اللہ جل شانہ پر ایمان ہے، اس کا اس پر بھی ایمان ہے کہ وہ ذات بے نیاز ہے، ساری مخلوق ساری عمر صرف اللہ تعالیٰ کا ذکر ہی کرتی رہے، کوئی اور کام نہ کرے، سجدے میں پڑی رہے، تب بھی اس کی عظمت و جلال میں ذرہ برابر بھی اضافہ نہیں ہوگا، اور اگر ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر کمر باندھ لے، اللہ تعالیٰ کے ذکر سے غافل ہو جائے بلکہ اللہ تعالیٰ کی شان میں _ نعوذ باللہ _ گستاخیاں بھی کرے تب بھی اس کی عظمت و جلال میں اور کبریائی میں ذرہ برابر کمی واقع نہیں ہوگی۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں : لا الہ الا اللہ

یعنی جو بھی حالت ہو، لاالہ الااللہ کا کلمہ اپنی جگہ پر قائم ہے، وہ ذات بے نیاز ہے۔

جامع مسجد قرطبہ

میری اندلس کی جامع مسجد قرطبہ میں حاضری ہوئی یہ مسجد کسی زمانے میں سجدہ کرنے والوں کی جبینوں سے بسی ہوئی تھی، یہ مسجد، مسجد نبوی میں جدید اضافے سے پہلے تک دنیا کی سب سے بڑی مسقّف مسجد تھی، اس مسجد میں صرف ایک رات میں شمعوں کو جلانے کے لئے سیکڑوں قنطار تیل خرچ ہوتا تھا، سارے اندلس کے لوگ وہاں آکر نمازیں ادا کرتے تھے اور سجدے کیا کرتے تھے، جو علم کا مرکز تھا، علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے بڑے بڑے علماء اس مسجد میں درس دیا کرتے تھے، سیکڑوں سال تک وہ مسجد سجدہ کرنے والوں سے آباد رہی۔

آج اس مسجد کا حال

آج جا کر دیکھو تو وہ مسجد کلیسا بنی ہوئی ہے، اور اس میں موسیقی کی آوازیں آرہی ہیں، اور ایک چھوٹی سی جگہ مسلمانوں کے لئے مخصوص کردی گئی ہے کہ وہاں جا کر مسجد کی زیارت کرلیں، وہاں بھی نماز پڑھنے کی اجازت نہیں، جب میرا وہاں جانا ہوا تو میرے ایک دوست بھی ساتھ تھے، ہم نے آپس میں مشورہ کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو، یہاں نماز ضرور پڑھیں گے، چنانچہ ہمارے دوست نے اذان دی، عصر

کی نماز کا وقت تھا، ہم نے جماعت سے عصر کی نماز ادا کرلی، جب مسجد میں جا کر ''سبحان ربی الاعلیٰ، سبحان ربی الاعلیٰ'' کی تسبیح پڑھی تو عجیب کیفیت طاری ہوگئی۔ میں نے کہا کہ ایک وقت وہ تھا جب یہاں ہزاروں انسان سجدے میں پڑے ہوتے تھے، اور ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کی آوازیں گونجتی تھیں، اور اس مسجد کے میناروں سے اذانوں کی صدائیں بلند ہوتی تھیں، اس کا چپہ چپہ علم کے نور سے منور تھا۔ آج یہ حال ہے کہ جب ہم نے اذان دی تو چھپ چھپ کر ڈرتے ہوئے اذان دی کہ کہیں کوئی دیکھ نہ لے، اور چھپ چھپ کر نماز ادا کی، لیکن وہ ذات اُس وقت بھی ''اعلیٰ'' تھی اور اِس وقت بھی ''اعلیٰ'' ہے۔

یہ نغمہ فصلِ گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں : لا الہ الا اللّٰہ

اس کے نزدیک نہ کوئی بہار ہے، نہ کوئی خزاں ہے، جب لاکھوں انسان سجدے کررہے تھے تب بھی وہ ''لا الہ الا اللّٰہ'' تھا، اور ''سبحان ربی الاعلیٰ'' تھا، اور آج جبکہ اس آواز پر ایک قدم بھی نہیں بڑھا، وہ آج بھی ''سبحان ربی الاعلیٰ'' ہے۔

ذکر سے ہمارا ہی فائدہ ہے

لہٰذا جب اس ذات کو ذکر کرنے والے کے ذکر سے، عبادت کرنے والے کی عبادت سے، تسبیح کرنے والے کی تسبیح سے، اس کی عظمت میں، اس کے جلال میں، اس کی کبریائی میں، اس کی صمدیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا تو پھر وہ کیوں کہہ رہے ہیں کہ مجھے کثرت سے یاد کرو، کثرت سے میرا ذکر کیا کرو، اور صبح شام ہماری

پاکی بیان کیا کرو۔ دراصل بندوں کے فائدے کے لئے یہ حکم دے رہے ہیں کہ مجھے کثرت سے یاد کیا کرو، اس لئے کہ جب بندہ کثرت سے ہم کو یاد کرے گا، اور اس کے دل میں ہماری یاد سمائے گی تو اس کو ہم سے محبت پیدا ہوگی، ہم سے اس کا تعلق قائم ہوگا، اور جب ہم سے تعلق مضبوط ہوگا تو وہ تعلق اس کو گناہوں سے بچائے گا، اس کو بدعنوانیوں سے، ظلم سے، حق تلفیوں سے بچائے گا، اور اس کو جہنم سے بچائے گا، اس لئے یہ حکم دیا جارہا ہے کہ کثرت سے ہمارا ذکر کرو۔

کثرتِ ذکر کا ایک طریقہ

اب سوال یہ ہے کہ کثرت ذکر کے لئے کیا طریقہ اختیار کریں؟ اس کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صبح شام ہر وقت اللہ کا ذکر کرتے رہو، کوئی دوسرا کام ہی نہ کرو، ''اللہ اللہ'' کرو، ''سبحان اللہ سبحان اللہ'' کی تسبیح پڑھتے رہو، ''الحمدللہ الحمدللہ'' پڑھتے رہو، ''لا الہ الا اللہ'' پڑھتے رہو۔ چنانچہ پرانے زمانے میں جب لوگ بزرگوں کے پاس اپنی اصلاح کرانے کے لئے جایا کرتے تھے تو وہ بزرگ یہی طریقہ اختیار کرتے تھے کہ ان لوگوں کو ذکر کی بڑی بڑی تعداد بتادیتے، اور ان سے کہتے کہ اور سب کام دھندے چھوڑ و، بس یہ کام کرو، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اس زمانے کے اللہ والوں کے جو معمولات ہوتے تھے وہ اتنے زیادہ ہوتے تھے کہ آج ہم ان کے بارے میں سن کر حیران رہ جاتے ہیں۔

امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایک مرتبہ ایک راستے سے گزر رہے تھے

کہ ان کو دیکھ کر ایک بڑھیا نے یہ کہہ دیا کہ یہ وہ شخص ہے جو عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھتا ہے، حالانکہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھنے کا آپ کا معمول نہیں تھا، بلکہ رات کو آخیری شب میں اٹھ کر تہجد پڑھنے کا معمول تھا۔ لیکن اس بڑھیا کی یہ بات سن کر آپ کو غیرت آگئی کہ ایک بڑھیا میرے بارے میں یہ حسن ظن رکھتی ہے کہ ساری رات عبادت کرتا ہوں۔ تو بس میں آج سے ایسا ہی کروں گا، چنانچہ اس دن کے بعد سے مرتے دم تک یہی معمول رہا کہ عشاء کے وضو سے فجر کی نماز پڑھی۔ یہ درحقیقت ''اُذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا'' پر عمل ہو رہا تھا۔

روزانہ سوا لاکھ اسم ذات

جو حضرات اپنی اصلاح کے لئے مشائخ کے پاس جاتے تو وہ مشائخ ان کو ''اسم ذات'' کے ذکر کی تلقین کرتے کہ روزانہ سوا لاکھ مرتبہ اسم ذات پڑھنا ہے، اس زمانے میں یہ عام معمول ہوتا تھا۔

جس کو ہو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

جب اس گلی میں آیا ہے تو اب محنت کرے۔

مدرسہ کے اہتمام کی ذمہ داری

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ دار العلوم دیوبند کے جو مہتمم تھے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ، وہ بڑے منتظم قسم کے بزرگ تھے، اس زمانے میں دار العلوم دیوبند کا انتظام

چلانا آسان کام نہیں تھا، حضرت والد صاحب فرمایا کرتے تھے کہ وہ ایسے منظم تھے کہ ''وزیراعظم'' بننے کے لائق تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی انتظامی صلاحیت عطا فرمائی تھی، ہر وقت انتظام کے اندر مشغول رہتے تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ کسی مدرسہ کا اہتمام بڑی خراب چیز ہے، لوگ کہتے ہیں کہ ''اہتمام'' ''ھَمٌّ'' سے مشتق ہے، جس کے معنی ''فکر'' کے ہیں، اس لئے کہ مہتمم ہر وقت فکر اور تشویش میں مبتلا رہتا ہے، ہر وقت گھر کے دروازے پر کوئی نہ کوئی آرہا ہے، اور گھنٹی بجا رہا ہے، ہر وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے، نماز پڑھ کر مسجد سے نکلو تو گھر تک پہنچنا مشکل ہے، کوئی نہ کوئی آکر اپنا قصہ بیان کرنا شروع کر دیتا ہے، اس لئے یہ مدرسہ کا اہتمام بہت مشکل کام ہے۔

دیوبند کے مہتمم اور ذکر اللہ کی مقدار

یہ اہتمام ایسی چیز ہے کہ اس کے ساتھ دو چیزیں بہت مشکل سے چ[illegible]ا ہیں، ایک تصنیف و تألیف کا کام، دوسرے ذکر اللہ، مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دارالعلوم دیوبند کے مہتمم تھے، لیکن روزانہ کا بلا ناغہ یہ معمول تھا کہ سوا لاکھ [illegible]م ذات کا ورد کیا کرتے تھے، کبھی یہ معمول قضا نہیں ہوتا تھا، کیونکہ جب اس راستے کو اختیار کرنا ہے تو تھوڑی سے محنت کرنے پڑے گی، لہٰذا جب ذکر کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں آئے گی۔

اللہ کی رحمت کمزوروں پر بھی ہے

لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت جس طرح اقویاء پر ہے، بلند ہمت لوگوں پر ہے،

اسی طرح ہم جیسے کمزور اور کم ہمت لوگوں پر بھی ہے، اگر ہم جیسے کمزوروں کو بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب والا نسخہ اور وظائف بتادیتے، یا اقویاء اور بلند ہمت والے لوگوں کا نسخہ بتادیتے تو ہم جیسے کمزوروں کا تو کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، اس لئے ہر زمانے میں اسی مقصد کے لئے ''مجدد'' بھیجا جاتا ہے، وہ دین کی تجدید کرتا ہے اور مردہ سنتوں کو زندہ کرتا ہے اور لوگوں کے لئے ان کے مزاج و مذاق اور ان کی مناسبت اور ان کی صلاحیت کے مطابق نسخے تجویز کرتا ہے۔

کمزوروں والے نسخہ پر عمل کرلو

ہمارے حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اللہ تعالیٰ نے اس فن کا مجدد بنایا تھا، اگر وہ یہ کہتے کہ وہ مجاہدات اور ذکر کرو جو پہلے زمانے کے لوگ کیا کرتے تھے تو سب لوگ اس سے بھاگ جاتے، کوئی بھی اس راستے پر نہ آتا، اس لئے آپ نے فرمایا کہ تم لوگ کمزور ہو، اس لئے کمزوروں والا نسخہ لکھ دیتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا بیعت کا واقعہ

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ابتداء میں تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی تھی، جب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوگیا تو والد صاحبؒ نے سوچا کہ اب کس سے تعلق قائم کریں؟ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کا خیال ہو رہا تھا، مگر وہاں کے قواعد و ضوابط اور مجاہدات کی وجہ سے ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ کیا کریں؟ ہمارے دادا

حضرت مولانا یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ وہ حضرت تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم سبق تھے، میرے دادا جان حضرت والد صاحبؒ کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون لے گئے، وہاں جا کر والد صاحبؒ سے فرمایا کہ تم حضرت تھانوی صاحبؒ سے بیعت ہو جاؤ، والد صاحب فرماتے تھے کہ میں نے حضرت تھانوی صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت! طبیعت میں بیعت ہونے کا تقاضا بھی بہت ہے اور اپنی اصلاح کی فکر بھی ہے، لیکن میں بیعت ہونے سے اس لئے ڈرتا ہوں کہ میں بہت کمزور ہمت والا ہوں، مجھ سے کچھ ہوتا نہیں ہے، نہ مجھ سے ذکر زیادہ ہوتا ہے، نہ مجھ سے عبادت زیادہ ہوتی ہے، نہ مجھ سے مجاہدے اور ریاضتیں ہوتی ہیں، اس لئے میں ڈرتا ہوں کہ اگر بیعت ہو گیا اور کام کچھ نہ کیا تو پھر بیعت ہونے کا کیا فائدہ؟

یہ دین سب کے لئے ہے

دوسرے یہ کہ میں مصروف بہت رہتا ہوں، پڑھنے پڑھانے کا معمول ہے (اس زمانے میں حضرت والد صاحبؒ اٹھارہ سبق پڑھایا کرتے تھے) تدریس میں مصروف رہتا ہوں، کچھ فتوے لکھنے کا کام بھی ہے۔ حضرت تھانوی صاحبؒ نے حضرت والد صاحبؒ کی یہ باتیں سن کر فرمایا، ارے بھائی! تم کس فکر میں پڑ گئے، کیا دین صرف اقویاء کے لئے ہے، ضعفاء کے لئے نہیں ہے؟ کیا دین صرف طاقت ور لوگوں کے لئے ہے، کمزور لوگوں کے لئے نہیں ہے؟ اور یہ جو آپ فرما رہے ہیں کہ میں بہت مصروف رہتا ہوں تو کیا دین صرف فارغ لوگوں کے

لئے ہے؟ مصروف لوگوں کے لئے نہیں ہے؟ (حضرت والد صاحبؒ فرماتے ہیں کہ حضرت والا نے یہ دو جملے ایسے فرمادئے کہ اس سے دل میں ٹھنڈک پڑ گئی) ہم آپ کو ایسا طریقہ بتائیں گے جس میں نہ تو زیادہ محنت کرنی پڑے گی اور نہ ہی زیادہ وقت صَرف کرنا پڑے گا، البتہ ایک بات بتاتا ہوں کہ گناہوں سے بچنے کا اہتمام کریں اور گناہوں سے بچنے کے اہتمام میں قوت کی ضرورت نہیں، صرف قوت ارادہ کی ضرورت ہے، قوت جسمانی کی ضرورت نہیں، بلکہ گناہ کرنے کے لئے قوت جسمانی کی ضرورت ہوتی ہے، اور گناہوں سے بچنے میں وقت بھی صرف نہیں ہوتا، بلکہ گناہ کا ارتکاب کرنے میں وقت صرف ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فضول کاموں سے بچو، کیونکہ فضول کاموں سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور طاقت بھی بے کار صرف ہوتی ہے، اور اگر کچھ موقع مل جائے تو معمولات مقرر کرلو۔

ذاکر کون؟ ذکر کا وسیع مفہوم

اب یہ دیکھئے کہ پرانے حضرات صوفیاء فرماتے تھے کہ سوا لاکھ مرتبہ اسم ذات پڑھو، اور حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ یہ تلقین فرمارہے ہیں کہ اگر موقع مل جائے تو کچھ معمولات مقرر کرلو، یہ فرق ہے کیوں ہوگیا؟ بات دراصل یہ ہے کہ کرنے کے لئے جو کام بتایا وہ ''طریق القلندری'' ہے، وہ یہ کہ چاہے زبان سے ذکر ہو یا نہ ہو، لیکن ہر وقت اللہ تعالیٰ سے تمہارا تعلق جڑا ہوا ہو، اس لئے کہ ذکر صرف اس کا نام نہیں کہ زبان سے ''سبحان اللہ، الحمد للہ'' پڑھ لیا، بلکہ حقیقت میں ذکر اس کو کہتے ہیں کہ اللہ جل شانہ کو کسی بھی عنوان سے یاد کرنا، یہ ذکر ہے، مثلاً اگر

آپ شکر کر رہے ہیں تو وہ ذکر ہے، صبر کر رہے ہیں اور انا للّٰہ وانا الیہ راجعون پڑھ رہیں ہیں تو یہ ذکر ہے، اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ رہے ہیں تو یہ ذکر ہے، کوئی دعا کر رہے ہیں کہ یا اللہ! میرا فلاں کام کر دیجئے، یہ ذکر ہے، یہ سب ذکر ہیں، بلکہ بزرگوں نے تو یہاں تک فرما دیا ''کل مطیع للّٰہ فھو ذاکر'' جو شخص اللہ کی اطاعت کا جو کام بھی کر رہا ہے، وہ ذاکر ہے، اگر نیت صحیح کر لو، اخلاص پیدا کر لو، اپنا قبلہ درست کر لو تو جو سبق پڑھا رہے ہو وہ بھی ذکر ہے، جو مطالعہ کر رہے ہو، وہ بھی ذکر ہے، اگر کوئی شخص اللہ کی مخلوق کی خدمت کی نیت سے ڈاکٹری کر رہا ہے، وہ بھی ذکر ہے، اگر تجارت کر رہے ہو، دکان پر بیٹھے ہو اور اللہ کے لئے، اخلاص کے ساتھ، شریعت کے دائرے میں رہ کر، اپنے حقوق کی ادائیگی کی خاطر، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق تجارت کر رہے ہو، تو وہ بھی ذکر ہے، کیونکہ ''کل مطیع للّٰہ فھو ذاکر'' میں داخل ہے۔

زمانہ ماضی پر استغفار کرو

چنانچہ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ میں تمہیں چار اعمال بتاتا ہوں (حقیقت یہ ہے کہ اس سے بہتر، اس سے آسان اور اس سے مفید نسخہ کون بتائے گا) وہ یہ کہ جب ماضی کا اور گزرے ہوئے زمانے کا تصور آئے تو اس کے نتیجے میں تمہیں گناہ یاد آئیں گے کہ میں نے فلاں وقت میں یہ گناہ کیا تھا، فلاں جگہ یہ غلطی کی تھی، لہٰذا ماضی کا تصور آنے پر استغفار پڑھو اور یہ کہو ''اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ'' اس لئے کہ اگر واقعۃً کوئی گناہ کیا تھا اور اب یاد آ رہا ہے تو اس کی

طرف سے توبہ کرنی ہی ہے، یا بعض کام اگرچہ گناہ تھے، لیکن تمہیں پتہ بھی نہیں تھا کہ یہ گناہ ہیں، اس لئے اب تک تم نے ان کی طرف سے استغفار بھی نہیں کیا تھا، لہٰذا اب ان کی طرف سے استغفار کرلو، اس لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے استغفار کے اندر یہ دعا فرمائی کہ:

وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ، فَإِنَّكَ تَعْلَمُ مَا لَا نَعْلَمُ

یعنی اے اللہ! ہمارے ان گناہوں کی مغفرت فرما دیجئے جو آپ کے علم میں ہیں کیونکہ بہت سے گناہ ایسے ہیں جو آپ جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے۔ اس لئے ماضی کا تصور آنے پر استغفار کرو۔

زمانہ حال پر شکر یا صبر

جو زمانہ حال ہے، جو اس وقت گزر رہا ہے، یہ زمانہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو اس زمانے میں کوئی ایسا واقعہ پیش آرہا ہے جس سے تمہیں راحت اور خوشی حاصل ہو رہی ہے، یا ایسا واقعہ پیش آرہا ہے جو طبیعت کے لئے ناگوار ہے اور اس پر تمہیں تکلیف ہو رہی ہے۔ اگر خوشی اور راحت کا واقعہ پیش آرہا ہے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو "اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ" مثلاً اس وقت ہم آرام سے مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں، پنکھے چل رہے ہیں، گرمی کی تکلیف نہیں ہے، اور دین کی طلب میں اللہ والوں کی صحبت میں بیٹھے ہوئے ہیں، اس پر دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرو، اور کہو اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔ اگر اس وقت بجلی چلی جائے، اور پنکھے بند ہو جائیں، اور گرمی کی تکلیف ہو جائے تو اس پر صبر کرو، اور کہو

''انـالِلّٰه وَاِنَّا اِلَيهِ رَاجِعُونَ'' بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کلمات کسی کے مرنے پر ہی پڑھے جاتے ہیں، یہ خیال غلط ہے، بلکہ ہر تکلیف پہنچنے پر اور ناگواری کا واقعہ پیش آنے پر'' اِنَّالِلّٰه وَاِنَّا اِلَيهِ رَاجِعُونَ'' پڑھو، اور یہ دعا کرو یا اللہ! اس پریشانی کو دور فرمادیں، اس گرمی کو دور فرمادیں۔

دل ہی دل میں شکر

بہرحال! حال کے زمانے میں یا تو کوئی خوشگوار حالت پیش آرہی ہوگی یا ناخوشگوار حالت پیش آرہی ہوگی، اگر خوشگوار حالت ہے تو اس پر دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، زبان سے بھی شکر ادا کرلیں تو بہت اچھا ہے،'' اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ'' ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب تم نے دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کردیا تو جانے تم نے کیا سے کیا کردیا، اس لئے کہ کسی کو پتہ نہیں کہ اندر ہی اندر تم نے کیا عبادت انجام دیدی۔ کیونکہ اگر تم وضو کرکے دو رکعت نفل ادا کروگے تو ہزاروں لوگ تمہیں دیکھ لیں گے، جس کی وجہ سے ریا کا بھی اندیشہ ہے، اور نام و نمود کا خطرہ بھی ہے، لیکن یہاں تو جب دل ہی دل میں یہ کہہ دیا کہ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ تو تم کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

میانِ عاشق و معشوق رمزیست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

''شکر''، عظیم عبادت ہے

یہ شکر کی عبادت کوئی معمولی عبادت ہے؟ یہ تو اتنی بڑی عبادت ہے کہ حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الطَّاعِمُ الشَّاكِرُ بِمَنْزِلَةِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ

یعنی جو آدمی کھانا کھا کر شکر ادا کرے، اس کو اتنا اجر ملے گا جتنا روزہ رکھ کر صبر کرنے والے کو ملتا ہے۔ اور یہ شکر ایسی عبادت ہے جو انسان کو شیطان کے حملوں سے بچاتی ہے، لہٰذا باریک سے باریک اور چھوٹی سے چھوٹی نعمت جس کی طرف آدمی کا دھیان بھی نہیں جاتا، اس کی طرف دھیان لے جاؤ، اور پھر اس پر شکر ادا کرو۔

ناشکری کے کلمات مت نکالو

اللہ تعالیٰ بچائے (آمین) بعض لوگوں کی ایسی طبیعت ہوتی ہے کہ ہمیشہ برائی کی طرف ان کا دھیان جاتا ہے مثلاً کسی واقعہ کے دو پہلو ہیں، تو تاریک پہلو کی طرف ان کا دھیان جائے گا، اچھے پہلو کی طرف ان کا دھیان نہیں جائے گا، چنانچہ بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ جب ان سے پوچھا جائے کہ کیسے مزاج ہیں؟ تو جواب میں کچھ نہ کچھ خرابی ضرور بتائیں گے، ورنہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ جب بھی کسی مسلمان کی خیریت پوچھی جاتی تو وہ جواب میں کہتا کہ ''اللہ کا شکر ہے، الحمدللہ'' لیکن آج کل اچھے بھلے چلتے پھرتے انسان سے پوچھا جائے کہ کیا حال ہے؟ تو جواب

میں کہتے ہیں کہ کیا بتاؤں، کیسی گزر رہی ہے، بعض لوگ یہ جواب دیتے ہیں کہ ''ٹائم پاس ہو رہا ہے'' جس کا مطلب یہ ہے کہ میں تکلیف اور مصیبتوں کا شکار ہوں، بس میری ہمت ہے کہ میں وقت گزار رہا ہوں اور ٹائم پاس کر رہا ہوں، اس کے جواب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکلیف دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ العیاذ باللہ العظیم۔ یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ میں ٹائم پاس کر رہا ہوں۔ ایسی ناشکری کے کلمات زبان سے نکالتے ہیں، خدا کے لئے ان کلمات سے بچو، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرو۔

شکر کی عادت ڈالو اور نعمتوں کا دھیان کرو

ہر آن اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی جو بارش ہے اور جو اَن گنت اور بے شمار نعمتیں ہر وقت حاصل ہیں، ان کے سامنے اس ذراسی تکلیف کی کوئی حقیقت نہیں، آج ہم ان نعمتوں کو تو نہیں دیکھتے، اور ذراسی تکلیف آجائے تو اس پر شور مچانا شروع کر دیتے ہیں، لہٰذا اُن نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالو، جب شکر کی عادت پڑ جائے گی تو پھر نعمتوں کی طرف نظر جانے لگے گی کہ کون سی چیز ایسی ہے جس پر میں شکر ادا کروں، جب سوچنے کی عادت پڑ جائے گی، اور نعمتوں کی طرف نظر جانے لگے گی تو اس وقت یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا

یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو گے تو شمار نہیں کر سکو گے، لہٰذا نعمتوں کا تصور کر کے اور سامنے رکھ کر ان کی طرف سے شکر ادا کرو۔ بہر حال! زمانہ

حال کے اندر شکرادا کرنا ہے، یا صبر کرنا ہے۔

تکلیف شاذ و نادر ہی آتی ہے

ہمیشہ اس بات کی کوشش کرو کہ ''شکر'' ''صبر'' پر غالب رہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں تکلیف دہ امور پر غالب ہیں، تکلیف دہ امور تو شاذ و نادر کبھی پیش آجاتے ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ

اس آیت میں ''وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِالْخَوْفِ'' نہیں فرمایا، بلکہ ''بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ'' تنوین تنکیر کے ساتھ لائے، جس کے معنی یہ ہیں کہ ہم تمہیں تھوڑا سا خوف دے کر آزمائیں گے، تھوڑی سے بھوک دے کر، اور تمہارے اموال میں، تمہاری جانوں اور ثمرات میں تھوڑی سی کمی کر کے آزمائیں گے، اور پھر اس آزمائش پر صبر کرنے والوں کو اتنی بڑی بشارت عطا فرمادی۔

''شکر'' صبر پر غالب رہنا چاہئے

لہٰذا تکلیف دہ امور تو تھوڑے سے ہیں، زیادہ تر نعمتیں ہی نعمتیں ہیں، نعمتیں ہی غالب ہیں، لہٰذا شکر صبر پر غالب ہونا چاہئے، وہ اس طرح کہ تمہاری زبان اکثر و بیشتر اللہ کے شکر سے تر رہے، تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کا شکر جاگزیں رہے، چلتے، پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے شکر جاری رہے، مثلاً کہیں جانا چاہتے تھے، سواری آرام دہ مل گئی، کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، گاڑی میں بیٹھنے کی جگہ مل گئی، کہو:

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، منظر اچھا سامنے نظر آرہا ہے، کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، ہوا کا جھونکا آیا، اچھا لگا، کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، گھر میں داخل ہوئے، بچہ کو کھیلتا دیکھ کر خوشی ہوئی، کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، کھانا سامنے آیا، کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، بھوک لگ رہی ہے، کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ، کھانا ذائقہ دار ہے، کہو: اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ۔ ہر وقت زبان سے ان کلمات شکر کی رٹ لگاؤ۔ اب بتاؤ، کیا ان الفاظ کو ادا کرنے میں کوئی محنت ہو رہی ہے؟ کیا کوئی مشقت ہو رہی ہے؟ کیا زیادہ وقت صرف ہو رہا ہے؟ نہ زیادہ محنت صرف ہو رہی ہے، نہ زیادہ وقت صرف ہو رہا ہے، لیکن زبان سے مسلسل ذکر جاری ہے، اور کسی کو پتہ بھی نہیں کہ یہ بندہ اللہ کا ذکر کر رہا ہے، جس ذات کو پتہ لگنا چاہئے بس اس ذات کو پتہ ہے کہ میرا بندہ میرا شکر ادا کر رہا ہے، میرا ذکر کر رہا ہے اور جس وقت یہ ذکر کر رہا ہے تو ہر ذکر کے وقت اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہو رہا ہے۔

''تعلق مع اللہ'' حاصل ہو رہا ہے

اور جب ایک بندہ ہر لمحے یا تو نعمتوں پر اللہ کا شکر ادا کر رہا ہے یا مصائب پر صبر کر رہا ہے یا اللہ تعالیٰ سے دعا کر رہا ہے تو اس کے نتیجے میں اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہو رہا ہے اور اسی مضبوط تعلق کا نام ''تعلق مع اللہ'' ہے۔

وہ تو دل میں ہی مل گئے

حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک شعر میں فرماتے ہیں کہ:

وہ اتنے تھے قریب کہ دل ہی میں مل گئے
میں جا رہا تھا دور کا ساماں کئے ہوئے

یعنی میں تو کبھی اِدھر بھاگ رہا تھا اور کبھی اُدھر بھاگ رہا تھا، لیکن جب صاحبِ نظر نے راستہ دکھا دیا، اور یہ بتادیا کہ اتنی دور جانے کی ضرورت نہیں، وہ تو اپنے دل ہی میں مل گئے۔ لہٰذا جب تم ہر وقت شکر ادا کر رہے ہو، اور ہر وقت دعا کر رہے ہو، اور ہر وقت ان کے ساتھ رابطہ قائم ہے، تو وہ دل ہی میں مل گئے، یہ تو زمانہ حال میں کرنے کا کام تھا۔

مستقبل کے بارے میں پناہ مانگو

اب باقی رہا مستقبل کا مسئلہ۔ تو مستقبل کے بارے میں انسان کے دل میں اندیشے پیدا ہوتے رہتے ہیں کہ کہیں یہ نہ ہو جائے، وہ نہ ہو جائے، کہیں کاروبار میں نقصان نہ ہو جائے، میرا امتحان قریب ہے، کہیں امتحان میں فیل نہ ہو جاؤں، اب میں فارغ ہو رہا ہوں، فارغ ہونے کے بعد پتہ نہیں کہیں ملازمت ملے گی یا نہیں؟ کہیں پریشانی میں مبتلا نہ ہو جاؤں، کسی سے قرض نہ لینا پڑ جائے، اس قسم کے ہزاروں اندیشے دل میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان کا علاج یہ ہے کہ جب دل میں کوئی اندیشہ پیدا ہو، اس وقت کہو "اَعُوْذُ بِاللّٰہِ" اے اللہ میرے دل میں یہ اندیشہ پیدا ہو رہا ہے، میں اس اندیشے سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں اور میں نے اپنے کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔ اس طرح ہر اندیشہ پر اللہ سے پناہ مانگو۔

وہ بندہ ذاکرین میں سے ہے

اب جو بندہ ہر لمحے ماضی پر استغفار کر رہا ہے اور حال پر کبھی شکر ادا کر رہا ہے، کبھی صبر کر رہا ہے اور مستقبل پر اللہ تعالیٰ سے پناہ مانگ رہا ہے تو اس بندے کا تو کوئی لمحہ اللہ کے ذکر سے خالی ہی نہیں ہے، وہ تو ہر وقت اللہ کے ذکر میں لگا ہوا ہے، اسی کا نام ذکر قلبی ہے اور اس کے ذریعے وہ ''تعلق مع اللہ'' جو بڑی بڑی ریاضتوں اور بڑے بڑے مجاہدات کے بعد حاصل ہوتا تھا، آسانی کے ساتھ حاصل ہو جائے گا، بس اس کو اختیار کرنے کی دیر ہے، بہرحال یہ ''کثرت ذکر اللہ'' کا ایک آسان اور مفید اور انتہائی مؤثر طریقہ ہے، جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بتا دیا۔

نعمتوں کو سوچا کرو

لیکن کوئی بھی کام محض کہنے سے نہیں ہوتا، بلکہ اس کام کی مشق کرنی پڑتی ہے، اس کی عادت ڈالنی پڑتی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرنے کی عادت ڈالو۔ مثلاً جیسے اس وقت ہم یہاں بیٹھے ہیں، اس وقت ہمیں اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمتیں حاصل ہیں؟ اس طرف ہمارا ذہن نہیں جاتا، لیکن سوچ سوچ کر یاد کرو کہ سر سے لے کر پاؤں تک ہمیں کیا کیا نعمتیں اس وقت میسر ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کی کثرت کا پہلا قدم ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ذکر کی کثرت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

ادعیہ ماثورہ

کثرت ذکر اللہ کا بہترین طریقہ

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۵

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

ادعیہ ماثورہ

کثرتِ ذکراللہ کا بہترین طریقہ

الحمد للّٰہ رب العٰلمین، و العاقبة للمتقین، و الصلوٰة و السلام علی رسوله الکریم، و علی آله و اصحابه اجمعین، أما بعد!

تمہید

گذشتہ دوروز سے یہ بات چل رہی تھی کہ سارے طریقت، تصوف اور سلوک کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی محبت دل میں جاگزیں ہو جائے، اور اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق اتنا مضبوط ہو جائے کہ ہر وقت اللہ جل شانہ کا دھیان رہے۔ اگر یہ چیز حاصل ہو جائے تو دین کے سارے احکام پر عمل آسان ہو جائے۔

اصطلاحات کی فکر میں مت پڑو

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اصطلاحات کی فکر میں مت پڑو، چنانچہ تصوف میں بہت سی اصطلاحات ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کے

ساتھ اس درجہ کا تعلق قائم ہو جائے تو اس کا یہ نام ہے، اس سے زیادہ ہو جائے تو اس کا یہ نام ہے، سب سے آخری اور انتہائی درجہ کو "ملکہء یادداشت" کہتے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت دل میں اللہ جل شانہ کا دھیان رہے۔ لیکن حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اصطلاحات کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، بہت سے لوگ اس فکر میں رہتے ہیں کہ ان کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت میں جس حالت سے گزر رہا ہوں، یہ حالت کس قسم کی ہے؟ اور اس کا کیا نام ہے؟ حضرت والا فرماتے تھے کہ تمہیں آم کھانے کی فکر ہونی چاہیے، پیڑ گننے سے کیا مطلب؟ اگر تمہیں وہ چیز حاصل ہو رہی ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ جیسے ایک آدمی ریل گاڑی کے ذریعے لاہور جا رہا ہے، اب سفر کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ ہر اسٹیشن کا نام یاد کرے کہ فلاں فلاں اسٹیشن راستے میں آئے، فلاں فلاں اسٹیشن پر گاڑی رکی، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ پڑا سوتا رہے، صبح جب بیدار ہوگا تو انشاء اللہ لاہور پہنچ جائے گا۔ اگر اس سے پوچھا جائے کہ راستے میں کون کون سے اسٹیشن آئے تو وہ اسٹیشن کے نام تو نہیں بتا سکتا، لیکن لاہور پہنچ گیا۔

اصل مقصد اللہ کی یاد کا دل میں بس جانا

اسی طرح تصوف وسلوک کی اصطلاحات کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، لیکن تصوف کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یاد دل میں بس جائے، اللہ جل شانہ کی محبت دل میں قائم ہو جائے، اور تعلق مضبوط ہو جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

اس ملفوظ میں اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے اسباب بتلا رہے تھے، پہلا سبب بیان فرمایا "کثرت ذکر اللہ" یعنی اللہ جل شانہ کے ذکر کی کثرت، اس کا بیان گذشتہ کل شروع کیا تھا۔

ادعیہ ماثورہ کا اہتمام کریں

کثرت "ذکر اللہ" کا مقصد جن طریقوں سے حاصل ہوتا ہے، ان میں سے ایک طریقہ "ادعیہ ماثورہ" کا اہتمام ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ عجیب طریقہ تلقین فرمایا، وہ یہ کہ صبح سے لے کر شام تک کی زندگی میں ہم جن مراحل سے گزرتے ہیں، ان میں سے ہر ہر مرحلے کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دعا تجویز فرمادی کہ جب صبح کو سو کر بیدار ہو تو یہ دعا پڑھو، جب غسل خانے میں داخل ہونے لگو تو یہ دعا پڑھو اور جب باہر نکلو تو یہ دعا پڑھو، جب وضو کرنا شروع کرو تو یہ دعا پڑھو، جب وضو سے فارغ ہو جاؤ تو یہ دعا پڑھو، مسجد میں داخل ہوتے وقت یہ دعا پڑھو، مسجد سے باہر نکلتے وقت یہ دعا پڑھو، کھانا سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو، کھانے سے فارغ ہو جاؤ تو یہ دعا پڑھو، جب دستر خوان اٹھاؤ تو یہ دعا پڑھو، وغیرہ، اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مراحل میں مختلف دعائیں تجویز فرمادیں۔

ان دعاؤں کو معمولی مت سمجھو

لوگ ان دعاؤں کے پڑھنے کو معمولی سمجھتے ہیں کہ کسی موقع پر دعا پڑھ لی تو کیا نہیں پڑھی تو کیا! خاص طور پر مولوی صاحبان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دعائیں پڑھنا مستحب ہے، اور مستحب کی تعریف یہ ہے کہ پڑھو تو ثواب، نہ پڑھو تو کوئی گناہ نہیں۔

لہٰذا دعائیں پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ چنانچہ وہ دعائیں پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتے، حالانکہ ہر موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مانگی ہوئی دعا کو مانگنا اتنی عجیب وغریب چیز ہے کہ اس کے منافع اور فوائد کی کوئی حد ونہایت ہی نہیں۔

یہ الہامی دعائیں ہیں

اوّل تو ان میں سے ایک ایک دعا ایسی ہے کہ اگر ان میں سے ایک دعا بھی اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شرف قبول پالے تو ہمارا بیڑا پار ہوجائے، اس کے علاوہ یہ کہ ان دعاؤں کے الفاظ میں نور ہے، ان کے معنی میں نور ہے، ان کے فوائد میں نور ہے، گویا کہ ان دعاؤں میں نور ہی نور بھرا ہوا ہے۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ یہ دعائیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے "دلائل النبوۃ" میں سے ہیں، کسی انسان کے بس میں نہیں تھا کہ وہ ایسی چیزیں اللہ تعالیٰ سے مانگے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مانگنا سکھا گئے، اور جن الفاظ سے مانگنا سکھا گئے، وہ حاجتیں جو ہمارے اور آپ کے تصور میں نہیں آسکتیں، ایسی حاجتیں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم مانگ گئے، دنیا وآخرت کی کوئی بہتری ایسی نہیں جو ان دعاؤں کے اندر موجود نہ ہو۔ اس لئے میں تو کہتا ہوں کہ یہ دعائیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے "دلائل النبوۃ" میں سے ہیں، کیونکہ یہ دعائیں ایسی ہیں کہ انسان وحی کی روشنی کے بغیر نہیں مانگ سکتا، ایسے ایسے جامع کلمات ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے، میرا دل چاہتا تھا کہ ان دعاؤں کی شرح کی جائے، چنانچہ جامع مسجد بیت المکرّم کے جمعہ کے بیانات میں ان دعاؤں کی تشریح شروع کی ہے، اللہ تعالیٰ آسانی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچادے۔ آمین، (اب

الحمدللہ وہ تشریح مکمل ہو چکی ہے اور تحریر میں بھی آچکی ہے اور اصلاحی خطبات کی جلد (۱۳) انہی دعاؤں کی تشریحات پر مشتمل ہے۔ مرتب)

ہر کام کے وقت اللہ سے تعلق

یہ دعائیں اپنے پیچھے معنی کی بڑی کائنات رکھتی ہیں، لہٰذا ایک طرف تو یہ دعائیں بڑی مؤثر ہیں، دوسری طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی کے مختلف مراحل پر یہ دعائیں تجویز فرمادیں۔ اس لئے کہ اگر تم ایک مرتبہ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا چاہو گے تو کتنا ذکر کرو گے؟ ہزار مرتبہ، پانچ ہزار مرتبہ، یا زیادہ سے زیادہ دس ہزار مرتبہ کرلو گے، لیکن فارغ ہونے کے بعد پھر اپنے کاموں میں مشغول ہو کر غافل ہو جاؤ گے، ہم تمہیں ذکر کا ایسا طریقہ بتادیتے ہیں کہ تم جس کام میں لگے ہوئے ہو، اس کام کے اندر ہی تمہارا ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، یہاں تک کہ اگر تم بیت الخلاء جارہے ہو، وہاں بھی ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، اگر وہاں سے نکل رہے ہو تو بھی ذکر کا مقصد حاصل ہو رہا ہے، گویا کہ ہر کام میں تمہیں اللہ تعالیٰ کے ذکر کی فضیلت عطا کی جارہی ہے، اور تمہارا تعلق اللہ تعالیٰ سے جوڑا جارہا ہے۔

خدائی پاور ہاؤس سے تعلق جڑ جائے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ تمہارے گھر کے اندر بجلی آرہی ہے، تم نے جیسے ہی بٹن دبایا، تمہارے گھر کا تعلق پاور ہاؤس سے سے جڑ گیا، اور پاور ہاؤس سے یہاں تک بجلی آنے میں بے شمار تار ہیں، بے شمار کھمبے ہیں، بے شمار ٹرانسفارمر ہیں، ان کے ذریعے سینکڑوں میل سے بجلی تمہارے

گھر میں آرہی ہے، جیسے ہی تم نے سوئچ آن کیا، اس بجلی نے سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کرلیا، اور تمہارا تعلق پاور ہاؤس سے جڑ گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ادعیہ ماثورہ تلقین فرما کر گویا کہ یوں فرما دیا کہ بار بار اپنا سوئچ آن کرتے رہو اور جس جس وقت تم ان دعاؤں کا سوئچ آن کرو گے، تمہارا تعلق خدائی پاور ہاؤس سے جڑتا رہے گا۔

اللہ کا دروازہ بار بار کھٹکھٹاؤ

دنیا کے دوسرے تعلقات کا تو یہ حال ہے کہ اگر تمہارا کسی سے تعلق ہو جائے اور تم اس کو بار بار پکارو، بار بار اس کے گھر جا کر اس کے دروازے پر دستک دو، تو وہ ایک مرتبہ برداشت کرلے گا، دو مرتبہ برداشت کرلے گا، تین مرتبہ برداشت کرلے گا، چوتھی مرتبہ دستک دینے پر پٹائی کرے گا، یا مثلاً آپ نے کسی کو ایک مرتبہ ٹیلیفون کیا، تھوڑی دیر بعد دوبارہ ٹیلیفون کیا، تو وہ اس سے ناراض اور غصہ ہو جائے گا کہ بار بار مجھے فون پر پریشان کر رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھ سے جتنی مرتبہ چاہو، تعلق قائم کرلو، اور جس وقت چاہو، جس لمحے چاہو، جس کام کے لئے چاہو، تعلق قائم کرلو، میرے پاس آجاؤ، میرا دروازہ کھٹکھٹاؤ، اور مجھ سے تعلق قائم کرنے کے لئے سوئچ آن کرتے رہو۔ یہ ادعیہ ماثورہ دراصل اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق جوڑ رہی ہیں، اور جتنی مرتبہ دعا کرو گے، اتنا ہی اس تعلق میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اتنی ہی اللہ تعالیٰ سے محبت بڑھے گی، لہٰذا یہ ادعیہ ماثورہ معمولی چیز نہیں، ان کو خوب یاد کرو، اور بروقت ان دعاؤں کے پڑھنے کی عادت ڈالو۔

زندگی کے ہر موڑ کے لئے دعائیں موجود ہیں

مسنون دعاؤں کی بے شمار کتابیں چھپی ہوئی ہیں، مناجات مقبول ہے، حصن حصین ہے، میں نے بھی ایک رسالہ "پُر نور دعائیں" کے نام سے لکھا ہے، جس میں ساری دعائیں جمع کر دی ہیں، ان کتابوں کو پڑھو، اور دیکھو کہ کہاں کہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا دعائیں مانگی ہیں، اگر کوئی شخص ان دعاؤں کے پڑھنے کی پابندی کر لے تو صبح سے لے کر شام تک کی زندگی کا کوئی موڑ ایسا نہیں ہے جس میں وہ اپنے اللہ سے رجوع نہ کر رہا ہو، اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم کرنے کا ایک نایاب طریقہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں تلقین فرما دیا۔

زباں بھی ذاکر اور تعلق بھی قائم

تجربہ یہ ہے کہ جو شخص ان دعاؤں کے پڑھنے کا عادی بن جاتا ہے، اس کا تعلق بھی اللہ تعالیٰ سے جڑ جاتا ہے، البتہ بعد میں ایسا لگتا ہے کہ چونکہ الفاظ یاد ہو گئے ہیں اور پڑھنے کی عادت ہو گئی ہے، اس لئے اس دعا کو پڑھتے وقت معنی اور مفہوم کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ اس وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح دعا پڑھنے سے کیا فائدہ؟ آٹومیٹک مشین چل پڑی، اور زبان سے خود بخود الفاظ ادا ہو گئے، حالانکہ دل کہیں ہے، اور دماغ کہیں ہے، اس لئے اس طرح دعا پڑھنا بے فائدہ ہے۔ یہ خیال غلط ہے، کیونکہ اس طرح دعا پڑھنا بھی فائدہ سے خالی نہیں، کم از کم تمہاری زبان تو اللہ تعالیٰ کے ذکر میں مشغول ہے، تمہارا ایک عضو تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگا ہوا ہے، اس لئے یہ بھی کوئی کم نعمت نہیں، لیکن اگر ان دعاؤں کو ان کے

معنیٰ کی طرف دھیان کرکے توجہ سے پڑھو گے تو اس کے نتیجے میں جو فائدہ ہوگا، اور جو تعلق مع اللہ حاصل ہوگا، وہ عظیم الشان ہے۔ بہرحال، یہ ادعیہ ماثورہ کا پڑھنا کثرت ذکر اللہ کا دوسرا طریقہ ہے۔

ہر وقت مانگتے رہو

کثرت ذکر اللہ کا تیسرا طریقہ "کثرت دعا" ہے، یعنی اللہ تعالیٰ سے مانگنے کی کثرت، کثرتِ دعا کی اتنی مشق کی جائے کہ ہر وقت تمہارا دل اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہو، چاہے زبان پر دعا ہو یا نہ ہو، لیکن دل میں اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہو، مثلاً چلتے، پھرتے، اٹھتے، بیٹھتے کام میں لگے ہوئے مانگتے رہو، اب سوال یہ ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کیا چیز مانگیں؟

انسان حاجتوں کا پتلہ

اگر غور کرکے دیکھو تو یہ نظر آئے گا کہ انسان حاجتوں کا پتلہ ہے، ہر لمحہ اس کو کوئی نہ کوئی حاجت اور ضرورت ہے، کوئی لمحہ اس کا احتیاج سے خالی نہیں، مثلاً اس وقت ہم یہاں مسجد میں بیٹھے ہوئے ہیں، بظاہر تو کوئی حاجت نہیں، لیکن بے شمار حاجتیں اس وقت بھی ہمارے ساتھ لگی ہوئی ہیں، مثلاً اگر گرمی لگ رہی ہے تو پنکھے اور ہوا کی حاجت ہے، اگر دھوپ آرہی ہے تو سائے کی حاجت ہے، اگر سردی زیادہ لگ رہی ہے تو گرمائش کی حاجت ہے، کیونکہ انسان کو کسی ایک حال پر قرار نہیں، ذرا سی ٹھنڈ زیادہ ہوجائے تو پریشان ہوجاتا ہے، اگر گرمی زیادہ ہوجائے تو پریشان ہوجاتا ہے۔ لہٰذا ہر وقت اس کو کوئی نہ کوئی حاجت ہے، لہٰذا ہر ہر لمحے جو

حاجتیں تم کو پیش آ رہی ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔

اس طرح مانگو

مثلاً اگر گرمی لگ رہی ہے تو یہ کہو یا اللہ! گرمی دور فرما دیجئے، اگر سردی لگ رہی ہے تو کہو: یا اللہ! یہ سردی دور فرما دیجئے، کسی آدمی کی تلاش ہے، دعا کرو کہ: یا اللہ! فلاں آدمی سے ملاقات ہو جائے، کہیں جانا ہے، اور بس کے انتظار میں اسٹاپ پر کھڑے ہو، کہو: یا اللہ! آسانی سے بس مل جائے، ٹیکسی کی تلاش ہے، کہو: یا اللہ! آسانی سے ٹیکسی مل جائے، جب سواری میں بیٹھ گئے، کہو: یا اللہ! سگنل کھلا مل جائے، یا اللہ! ٹریفک جام نہ ہو۔ لہٰذا جو حاجت جس وقت پیش آ رہی ہے، اسی وقت وہ حاجت اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا کہ اگر تمہارے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ سے مانگو۔

یقینی طور پر حاصل ہونے والی چیز بھی اللہ سے مانگو

ایک اور باریک بات جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی، وہ یہ کہ جو چیز آنکھوں سے نظر آ رہی ہے کہ یہ چیز یقینی طور پر ابھی مجھے حاصل ہونے والی ہے، وہ بھی اللہ سے مانگو۔ مثلاً آپ روزہ افطار کرنے بیٹھے، سامنے دستر خوان پر افطاری کا سامان موجود ہے، اب بظاہر یہ بات یقینی ہے کہ ہاتھ بڑھا کر افطاری کھا لیں گے۔ حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ اس وقت بھی اللہ سے مانگو کہ: یا اللہ! مجھے یہ چیز کھانی نصیب ہو جائے، اور اس چیز کی لذت مجھے عطا فرما دیجئے، اس کے ذریعے مجھے طاقت اور صحت عطا فرما دیجئے، اور اس کے ذریعے

مجھے بدہضمی نہ ہو، میرا پیٹ خراب نہ ہو، بلکہ صحت و عافیت کے ساتھ مجھے کھلا دیجئے۔

اعلیٰ درجہ کا ''توکل'' یہ ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو عجیب علوم عطا فرمائے تھے، انسان کی عقل حیران رہ جاتی ہے، فرماتے ہیں کہ جہاں آدمی کے سامنے اسباب موجود نہیں ہیں، اگر اس جگہ پر ''توکل'' کیا تو یہ کوئی بڑی بات نہیں، کیونکہ وہاں اسباب موجود ہی نہیں، اور ''توکل'' کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ ''توکل'' کا مزہ تو اس جگہ پر ہے جہاں اسباب سو فیصد موجود ہیں، جیسے ابھی میں نے مثال دی کہ کھانا سامنے موجود ہے، کھانے کے لئے صرف ہاتھ بڑھانے کی دیر ہے، اس موقع پر بھی نظر ان اسباب پر نہ ہو، بلکہ اس وقت بھی نظر مسبب الاسباب پر ہو، اور اس وقت یہ کہو کہ: اے اللہ! یہ کھانا سامنے موجود تو ہے، لیکن تیری توفیق کے بغیر نہ میں کھا سکتا ہوں اور نہ ہی اس کھانے سے فائدہ اٹھا سکتا ہوں، یہ ''توکل'' اعلیٰ درجے کا ہے، کیونکہ سو فیصد اسباب موجود ہونے کے باوجود نگاہ ان اسباب کی طرف نہیں ہے۔ اس ''توکل'' کی بھی مشق کرنی چاہئے۔

اسباب کی موجودگی میں ''توکل'' کی ضرورت کیوں؟

تمام اسباب موجود ہونے کے موقع پر ''توکل'' کی ضرورت اس لئے ہے کہ بے شمار واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ سو فیصد اسباب موجود ہونے کے باوجود اور کھانا سامنے ہونے کے باوجود وہ کھانا منہ تک نہیں پہنچ سکا، مثلاً یہ کہ عین اس وقت کسی

بیماری کا حملہ ہوگیا، فالج ہوگیا، موت واقع ہوگئی، بے ہوشی طاری ہوگئی، تو اب وہ کھانا تو سامنے موجود ہے، لیکن کھانے کی توفیق نہیں ہوئی۔

کھانا الگ نعمت، کھلانا الگ نعمت

کھانے کے بعد جو دعا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تلقین فرمائی ہے، اس کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ رَزَقَنَا وَ اَطْعَمَنَا وَ سَقَانَاوَ جَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ''میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اس میں دو الفاظ الگ الگ ارشاد فرمائے ہیں، ایک ''رَزَقَنَا'' اور دوسرا ''اَطْعَمَنَا'' یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہمیں غذا عطا فرمائی، ہمیں رزق دیا، اور ہمیں کھلایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ رزق دینا الگ نعمت ہے اور رزق کھلانا الگ نعمت ہے، کیونکہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ رزق کی نعمت تو موجود ہوتی، لیکن معدہ خراب ہوتا، بدہضمی ہورہی ہوتی، تو اس صورت میں ''رَزَقَنَا'' تو ہے، لیکن ''اَطْعَمَنَا'' نہیں ہے، کیونکہ کھلانے کی نعمت حاصل نہیں ہوئی۔ ایسے واقعات زندگی میں بہت پیش آتے ہیں کہ چیز تو موجود ہے، لیکن اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ یہ موقع اللہ تعالیٰ پر ''توکل'' اور بھروسا کرنے کا ہے کہ اے اللہ! آپ کی مشیت پر اس سے فائدہ اٹھانا موقوف ہے، آپ کی مشیت ہوگی تو میں اس سے فائدہ اٹھاؤں گا، آپ کی مشیت نہیں ہوگی تو فائدہ نہیں اٹھا سکوں گا، لہٰذا میں آپ سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ مجھے یہ چیز کھلا بھی دیجئے، اور اس کا نفع بھی پہنچا دیجئے۔

مانگنے سے محبوب بن جاؤ گے

بہر حال، انسان حاجتوں کا پتلا ہے، جو بھی حاجت پیش آئے وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سامنے پیش کرے۔ اور دعا کی قبولیت کے جو اوقات ہیں، نمازوں کے بعد اور دوسرے اوقات میں، ان اوقات میں ذرا اہتمام کے ساتھ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ لو۔ دنیا کے اندر تو یہ معاملہ ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی سخی داتا ہو، اگر تم اس کے پاس جا کر ایک مرتبہ مانگو گے، دیدے گا، دوسری مرتبہ بھی دیدے گا، تیسری مرتبہ بھی دیدے گا، اس کے بعد مانگو گے تو اس شخص کو تمہارے چہرے سے نفرت ہو جائے گی کہ یہ شخص اب مانگنے کے لئے پھر آ گیا ہے۔ لیکن اللہ جل شانہ کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے، تو یہ اصول ہے کہ "من لم یسئل اللّٰہ یغضب علیه" یعنی جو شخص اللہ سے نہیں مانگتا، اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سے جب چاہو، مانگو، جتنا چاہو، مانگو، جتنی مرتبہ چاہو، مانگو، اور تم جتنا زیادہ مانگو گے، اتنا ہی تم ہمارے یہاں محبوب ہو گے، اگر نہیں مانگو گے تو ہم ناراض ہوں گے کہ تم نے کیوں نہیں مانگا۔ لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ سے مانگتے رہو، منگتے بنے رہو، یہ ایسا دربار ہے تو اس دربار سے فائدہ اٹھاؤ، اور مانگو، اور دعا کرو۔ اس دعا کی کثرت کا فائدہ یہ ہو رہا ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق مضبوط ہو رہا ہے، اور کثرت ذکر کا فائدہ حاصل ہو رہا ہے۔

عجیب وغریب دعا

بہر حال، کثرت ذکر کے تین طریقے ہوئے، ایک یہ کہ ان چار اعمال کا

اہتمام کرنا (جن کا بیان گذشتہ مجلس میں تفصیل سے ہو چکا) دوسرے یہ کہ "ادعیہ ماثورہ" پڑھنے کا اہتمام کرنا، تیسرے یہ کہ "دعا کی کثرت" کرنا۔ یہاں تک کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری دعائیں کرلیں، اور دنیا و آخرت کی کوئی حاجت نہیں چھوڑی تو آخر میں پھر ایک عجیب وغریب دعا فرمائی، وہ یہ کہ:

اَیُّمَا عَبْدٍ اَوْ اَمَةٍ مِنْ اَهْلِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَقَبَّلْتَ
دَعْوَتَهُمْ وَ اسْتَجَبْتَ دُعَائَهُمْ، فَاِنَّا نَسْئَلُكَ
اَنْ تُشْرِكَنَا فِيْ صَالِحِ مَا يَدْعُوْنَكَ فِيْهِ، وَاَنْ
تُشْرِكَهُمْ فِيْ صَالِحِ مَا نَدْعُوْكَ فِيْهِ وَاَنْ
تُعَافِيَنَا وَاِيَّاهُمْ وَاَنْ تَجَاوَزَ عَنَّا وَ عَنْهُمْ۔

یہ ایسی عجیب دعا ہے کہ کسی دوسرے انسان کے تصور میں بھی یہ الفاظ نہیں آسکتے، فرمایا کہ اے اللہ! خشکی اور سمندر میں آپ کے کسی بندے نے اور کسی بندی نے ساری زندگی میں جو بھی دعا مانگی ہو، اے اللہ! ہمیں بھی اس دعا میں شامل کرلیجیے، اور اُن کو ہماری دعاؤں میں شامل کرلیجیے، اور اُن کی مغفرت فرمادیجیے، اور ہماری بھی مغفرت فرمادیجیے۔

دل دل میں مانگ لو

اور صرف زبان سے نہیں، بلکہ دل دل میں ذکر کرتے رہو، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الحمد للہ، کبھی اس سے تخلف نہیں ہوتا کہ ایک شخص آیا، اور اس نے کہا کہ حضرت! ایک مسئلہ پوچھنا ہے، اسی وقت فوراً اللہ تعالیٰ سے یہ دعا

کرلیتا ہوں کہ یا اللہ! یہ شخص پتہ نہیں کیا سوال کرے گا، اس کا صحیح جواب میرے دل میں ڈال دیجئے، اس طرح دل ہی دل میں اللہ تعالیٰ سے رابطہ قائم ہے۔ لہٰذا جو آدمی ماضی پر استغفار کررہا ہے، حال میں صبر کررہا ہے یا شکر کررہا ہے، اور مستقبل کے لئے استعاذہ کررہا ہے، اور مختلف مراحل زندگی میں ادعیہ ماثورہ کا پابند ہے، اور اس کا دل ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگ رہا ہے، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ضرور قائم ہوجائے گا، لہٰذا کثرت ذکر اللہ، اللہ تعالیٰ کی محبت اور تعلق قائم کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

ان تسبیحات کا معمول بنالو

پھر ہمارے بزرگوں نے یہ بھی فرمادیا کہ چوبیس گھنٹوں میں سے تھوڑا وقت ایسا مخصوص کرلو جس میں ذکر ہی مقصود ہو، اور بہتر یہ ہے کہ فجر سے پہلے کا وقت یا فجر کے بعد کا متصل وقت اس کے لئے مخصوص کرلو، لیکن اگر اس وقت عذر ہو تو دوسرے اوقات میں کوئی وقت ذکر کے لئے مختص کرلو، اور اس وقت میں یکسوئی کے ساتھ اللہ کا ذکر کرو، تلاوت کرو، تسبیحات پڑھو، مثلاً "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ بِحَمْدِهٖ سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ" ایک تسبیح "سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ" کی ایک تسبیح اور استغفار کی ایک تسبیح، درود شریف کی ایک تسبیح، اور لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ کی ایک تسبیح، اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ کی ایک تسبیح۔ ان اذکار کے پڑھنے کا اہتمام کرو، ان سب اذکار کی ایک ایک تسبیح پڑھنے کا معمول بنالو، اگر زیادہ

وقت نہیں تو ایک تہائی تسبیح کا معمول بنالو، اور ۳۳-۳۳ مرتبہ تمام اذکار پڑھ لیا کرو، لیکن جب ذکر کے لئے وقت مقرر کرلو تو پھر اس وقت کو اسی کام میں صَرف کرو، اور پہلے یہ دیکھو کہ میں چوبیس گھنٹے میں سے کتنا وقت اس کام کے لئے نکال سکتا ہوں، پھر اس کے حساب سے معمولات مقرر کرلو، چاہے آدھا گھنٹہ ہو یا پندرہ منٹ ہوں، یا دس منٹ ہوں، لیکن پھر اس کی پابندی کرو، اور اس وقت کے اعتبار سے اذکار کی تعداد میں کمی کرلو، اگر اس وقت میں سو کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ٦٦ کی تعداد مقرر کرلو، ٦٦ کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ۳۳ کی تعداد مقرر کرلو، ۳۳ کی تعداد پوری نہیں ہوتی تو ۱۱ کی تعداد مقرر کرلو۔

پابندی والا عمل پسندیدہ ہے

لیکن جو مقرر کرو پھر اس کی پابندی بھی کرو، ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

قلیل تدوم علیہ ارجی من کثیر مملول

یعنی وہ تھوڑا سا عمل جس پر تم مداومت کرو، اس میں اللہ تعالیٰ یہاں اجر وثواب اور قبولیت کی زیادہ امید ہے بنسبت اس کثیر عمل کے جس کو آج کیا اور کل چھوڑ دیا، ایک اور حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

خیر العمل مادیم علیہ و ان قلّ

یعنی "بہترین عمل وہ ہے جس پر مداومت کی جائے اگر چہ وہ تھوڑا ہو" مداومت کے اندر برکت ہوتی ہے، اس لئے بہتر یہ ہے کہ اذکار کا وقت بھی مقرر ہو،

اور جگہ بھی مقرر ہو، اور تعداد بھی مقرر ہو، کیونکہ ایک جگہ پر بیٹھ کر جب آدمی ذکر کرتا ہے تو اس کا فائدہ بھی زیادہ ہوتا ہے، بنسبت اس کے کہ آدمی چلتے پھرتے ذکر کرے، جگہ اور وقت مقرر کرنے میں زیادہ فائدہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس ذکر کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس زمان و مکان کو ذکر اللہ کے نور سے منور کر دیتے ہیں۔

کائنات کی ہر چیز کا ذکر کرنا

یہ جو قرآن کریم میں ہے کہ:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ (سورۂ ص:۱۸)

یعنی جب حضرت داؤد علیہ السلام ذکر کرتے تھے تو ان کے ساتھ پہاڑ بھی ذکر کرتے تھے، اور پرندے بھی ذکر کرتے تھے، اور اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو انعام کے طور پر ذکر فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام پر ہمارا یہ انعام تھا جب وہ ذکر کرتے تو ان کے ساتھ پہاڑ بھی ذکر و تسبیح کیا کرتے تھے۔

ذکر میں دلجمعی پیدا ہوتی ہے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر پہاڑ ذکر و تسبیح کرتے تھے تو حضرت داؤد علیہ السلام پر کیا احسان اور انعام ہوا؟ اگر وہ تسبیح کر رہے ہیں تو کرنے دو، ان کا حضرت داؤد علیہ السلام سے کیا تعلق؟ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ پہاڑوں کا ذکر کرنا حضرت داؤد علیہ السلام پر انعام اس طرح ہے کہ جب ذاکر ذکر کرتا ہے، اور اس کے ساتھ کائنات کے دوسرے عناصر بھی ذکر کرنے میں مشغول ہوتے ہیں تو اس کے ذکر میں دلجمعی اور لطف زیادہ پیدا

ہوتا ہے۔

ذکر کے وقت یہ تصور کیا کرو

اسی وجہ سے صوفیاء کرام نے ذکر کا ایک طریقہ ایسا تجویز فرمایا ہے جس میں ذاکر ذکر کرتے وقت یہ تصور کرتا ہے کہ میرے ساتھ پوری کائنات ذکر کر رہی ہے، یہ چاند بھی ذکر کر رہا ہے، یہ سورج بھی ذکر کر رہا ہے، یہ آسمان بھی ذکر کر رہا ہے، یہ پہاڑ وغیرہ سب میرے ساتھ ذکر کر رہے ہیں، اس تصور کا بڑا عظیم فائدہ خود ذاکر کو محسوس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے جب آدمی ذکر کے لئے کوئی جگہ اور وقت مقرر کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ذکر سے اس جگہ اور وقت کو منور فرما دیتے ہیں، اور اب وہ وقت اور جگہ بھی اس کے ساتھ ذکر میں شریک ہو جاتے ہیں، اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کے ذکر کی برکت کا انعکاس ایک دوسرے پر ہوتا ہے، اس لئے ایک جگہ اور ایک وقت مقرر کر کے ذکر کرنے میں زیادہ فائدہ ہے، اگر چہ تھوڑی دیر کے لئے کرو، مگر پابندی سے کرو۔

خلاصہ

بہر حال؛ کثرت ذکر کا چوتھا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑا سا وقت مقرر کر کے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو، اگر یہ کام کر لیا تو انشاء اللہ کثرت ذکر کا مقصود حاصل ہوگا، اور اس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ کے ساتھ محبت پیدا ہوگی، اور تعلق مضبوط ہوگا، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو بھی اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ

اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۸۶

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ کی نعمتوں کا مراقبہ کریں

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَ الْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ وَ الصَّلٰوةُ
وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ
وَعَلٰى كُلِّ مَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۔أَمَّا بَعْدُ !

تمہید

پچھلے کئی روز سے حضرت والا کے ایک ملفوظ کا بیان چل رہا ہے، جس کا موضوع یہ ہے کہ دین پر چلنے کا جب کوئی شخص ارادہ کرے تو اس کے لئے اس کو کچھ محنت کرنی پڑتی ہے، اس ''محنت'' کو حضرات صوفیاء کرام ''مجاہدہ'' اور ''ریاضت'' کہتے ہیں، لیکن ان تمام مجاہدات اور ریاضتوں کا جو اصل مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے ساتھ مضبوط تعلق قائم ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سما جائے، جب یہ تعلق قائم اور مضبوط ہو جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سما جاتی ہے تو پھر دین کے تمام احکام پر عمل آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ''محبت'' کے نتیجے میں مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتے ہیں، لہٰذا اصل چیز یہ ہے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ کی محبت مطلوب درجے میں پیدا ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس مطلوب

درجے میں تعلق قائم ہو جائے، جب یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے تو باقی سارے کام خود بخود ہوتے رہتے ہیں۔

بیویوں کے درمیان مساوات

حضرت والا فرمارہے ہیں کہ ویسے تو محبت غیر اختیاری چیز ہے، کسی سے محبت ہے، کسی سے محبت نہیں ہے، یا ایک سے محبت زیادہ ہے، اور دوسرے سے محبت کم ہے، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات کے درمیان ہر طرح سے مثالی مساوات قائم فرمائی، اور ہر ایک کے ساتھ برابری کا سلوک فرمایا، لیکن اس سب کے باوجود آپ نے یہ دعا فرمائی کہ:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا قَسْمِىْ فِيْمَا اَمْلِكُ ، وَلَا تَلُمْنِىْ فِيْمَا لَا اَمْلِكُ

اے اللہ! جو میں نے تقسیم کیا ہے وہ اپنے اختیاری معاملات میں تقسیم کیا ہے کہ جتنے پیسے ایک بیوی کو دئے، اتنے ہی پیسے دوسری بیویوں کو دئے، جیسا کھانا ایک بیوی کو دیا، ویسا ہی کھانا دوسری بیویوں کو دیا، جیسے کپڑے ایک بیوی کو دئے، ویسے ہی کپڑے دوسری بیویوں کو دئے، جیسا برتاؤ ایک بیوی کے ساتھ کیا، ویسا ہی برتاؤ دوسری بیویوں کے ساتھ کیا، لہٰذا اختیاری معاملات میں تو میں نے ''عدل'' اور مساوات کی کوشش کرلی، لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جو میرے اختیار میں نہیں ہیں، اے اللہ! ان غیر اختیاری چیزوں پر مجھ سے مؤاخذہ مت فرمایئے گا۔

محبت اختیار میں نہیں

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا چیز آپ کے اختیار میں نہیں تھی؟ حضرات علماء

کرام نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ وہ "محبت'' ہے کہ یہ اختیار میں نہیں کہ تمام ازواج مطہرات سے محبت بھی برابر ہو، بلکہ محبت کسی سے زیادہ ہے، اور کسی سے کم ہے۔ یہ چیز انسان کے اختیار سے باہر ہے، انسان وہ پیمانہ کہاں سے لائے، جس سے وہ یہ ناپے کہ میں جتنی محبت اس سے کرتا ہوں، دوسرے سے بھی اتنی محبت کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ''محبت'' انسان کے اختیار میں نہیں، اور جب اختیار میں نہیں تو سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ محبت کس طرح قائم ہو؟ اس کے جواب میں حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اگرچہ ''محبت'' اختیار میں نہیں، لیکن اس کے "اسباب" اختیار میں ہیں، جب ان اسباب کو اختیار کرو گے تو وہ ''محبت'' دل میں پیدا ہوگی، اس ملفوظ میں حضرت والا ان "اسباب" کو بیان فرمارہے ہیں، ان میں سے پہلا سبب یہ بیان فرمایا کہ ''کثرت ذکر اللہ'' جتنا انسان اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے گا اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں پیدا ہوگی، اور ''کثرت ذکر اللہ'' کے کچھ طریقے میں نے بتائے تھے کہ ادعیہ مأثورہ کا اہتمام کرے، اور دعا کی کثرت کرے، اور ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگے، اور تھوڑا سا وقت مخصوص کر کے اس میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام کرے، ان سب کا بیان تفصیل سے ہوگیا۔

اللہ کے انعامات اور اپنے برتاؤ کو سوچنا

آگے حضرت والا ''محبت'' پیدا ہونے کا دوسرا ''سبب'' بیان فرمارہے ہیں، چنانچہ فرمایا کہ ''اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنا'' اس میں حضرت والا نے دو چیزیں بیان فرمائیں، ایک یہ کی اللہ تعالیٰ کے انعامات کو سوچنا، دوسری

یہ کہ پھر اپنے برتاؤ کو سوچنا، ان دونوں چیزوں کو سوچنا اللہ تعالیٰ کی ''محبت'' پیدا کرنے کے لئے اور اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنے کے لئے بڑا اکسیر ہے، ہر وقت ہم پر اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں مبذول ہیں، ہر وقت نعمتوں کی جو بارش برس رہی ہے، اس کا دھیان کرو، اس کو سوچو، ان نعمتوں کا ''مراقبہ'' کرو، ''مراقبہ'' اور ''دھیان'' کرنے سے سمجھ میں آئے گا، اس کے بغیر سمجھ میں بھی نہیں آئے گا۔

نعمتوں کا مراقبہ اور دھیان کرو

انسان صبح سے شام تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں پل رہا ہے، ہر ہر فرد بشر پر ہر آن اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، لیکن اس طرف دھیان اور خیال بھی نہیں جاتا کہ یہ بھی کوئی نعمت ہے جو ہمیں حاصل ہے، اس کے نتیجے میں انسان غفلت کا شکار رہتا ہے، لیکن جب انسان اہتمام اور دھیان کے ساتھ ان نعمتوں کی طرف توجہ کرتا ہے تو پھر ان نعمتوں کا استحضار ہو جاتا ہے، اور ان کی طرف نگاہ جانے لگتی ہے، اور اس بات کا احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، جو مجھے ہر وقت ہر آن حاصل ہیں۔

اللہ والوں کی صحبت سے دھیان اور استحضار حاصل ہوتا ہے

یہ دھیان اور احساس اور استحضار اس وقت حاصل ہوتا ہے جب انسان کسی اللہ والے کی صحبت میں بیٹھتا ہے، جب تک اللہ والے کی صحبت نصیب نہیں تھی تو اس وقت تو غفلت میں وقت گزر رہا تھا، اس وقت اس طرف دھیان ہی نہیں تھا کہ اللہ تعالیٰ کی کیا کیا نعمتیں میری طرف مبذول ہیں، بلکہ ہر وقت کسی نہ کسی مصیبت کو لے

کر روتا ہی رہتا تھا، ذراسی کوئی تکلیف آگئی، ذراسی پریشانی آگئی تو بس اسی کو لئے بیٹھا ہے، اس کو لے کر رو رہا ہے۔ لیکن جب اللہ جل شانہ کسی اللہ والے کے ساتھ تعلق قائم فرما دیتے ہیں، اور انسان کسی اللہ والے کا دامن پکڑ لیتا ہے تو پھر یہ فہم اور سمجھ آتی ہے کہ ارے تو کس ذراسی مصیبت کو لے کر بیٹھا تھا، تیرے اوپر تو صبح سے لے کر شام تک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی بارش برس رہی ہے۔

قرآن کریم میں تدبر اور تفکر کی دعوت

اور قرآن کریم بھی تمہیں یہی دعوت دے رہا ہے کہ ذرا سوچا کرو، ذرا غور و فکر کیا کرو، جگہ جگہ قرآن کریم میں تدبر اور تفکر کا حکم دیا گیا ہے، اب لوگ اس تدبر اور تفکر کا غلط مطلب سمجھ بیٹھے، چنانچہ آج کل لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم بار بار تدبر اور تفکر کی دعوت دے رہا ہے، اس کا مطلب یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں خوب ترقی کرو، یہ مطلب درست نہیں۔ ویسے تو سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کرنا کوئی بری بات نہیں، بلکہ جائز اور مستحب ہے، اور بعض حالات میں واجب ہے۔ لیکن قرآن کریم نے جس تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں، بلکہ قرآن کریم کے تدبر اور تفکر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی نعمتوں کا، اور اس کی تخلیق کی حکمتوں کا، اور اس کی قدرت کاملہ کا، اور کی حکمت بالغہ کا انسان دھیان کرے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو تہجد کے لئے بیدار ہوتے تو آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتے، اور یہ آیت کریمہ تلاوت کرتے:

إِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ
الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ○ الَّذِيْنَ
يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ
وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ

یعنی ان آسمانوں کی تخلیق میں، اور زمینوں کی تخلیق میں، اور دن رات کے آنے جانے میں عقل والوں کے لئے نشانیاں ہیں، عقل والے کون لوگ ہیں؟ اس کی تفصیل آگے اللہ تعالیٰ نے خود فرمادی کہ عقل والے وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہونے کی حالت میں، اور بیٹھنے کی حالت میں، اور لیٹنے کی حالت میں، اور وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے یہ آسمان، زمین، یہ ستارے اور کائنات کی تمام اشیاء بے فائدہ پیدا نہیں کیں، بلکہ ہمارے فائدے کے لئے اور ہماری مصلحت کے لئے پیدا فرمائی ہیں، ان میں سے ہر چیز ہمارے لئے ایک نعمت ہے، اے اللہ! جب آپ نے اس دنیا میں ہمیں یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو اے پروردگار! ہمیں اپنی رحمت سے جہنم کے عذاب سے بھی نجات عطا فرما۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے وقت یہ آیات تلاوت کیا کرتے تھے۔

یہ زمین میرے لئے، یہ آسمان میرے لئے

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک نظم ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ:

یہ زمیں میرے لئے، یہ آسماں میرے لئے

چل رہا ہے دیر سے یہ کارواں میرے لئے

یہ سب کارواں اللہ تعالیٰ نے میرے لئے پیدا فرمایا ہے، یعنی میری مصلحت کے لئے، میرے فائدے کے لئے۔ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ یہ سورج تمہاری خدمت کر رہا ہے، یہ چاند تمہاری خدمت کر رہا ہے، یہ ستارے تمہاری خدمت کر رہے ہیں، یہ ہوائیں تمہاری خدمت کر رہی ہیں، یہ سمندر، یہ دریا، یہ پہاڑ، یہ جنگل، غرض ہر چیز تمہارے لئے ہی اللہ تعالیٰ نے پیدا کی ہے، چنانچہ فرمایا:

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا

یعنی جو کچھ اس نے زمین میں پیدا کیا ہے، وہ تمہارے لئے پیدا کیا ہے۔

یہ سورج میرے لئے ہے

روزانہ صبح کے وقت سورج نکلتا ہے، اور اپنی کرنیں پھیلاتا ہے، اور دھوپ ڈالتا ہے، اور شام کو غروب ہوتا ہے، یہ سب کیوں؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے انسان! یہ سورج جو اتنی بڑی مخلوق ہے، یہ میں نے تیرے لئے پیدا کی ہے، تاکہ تجھے روشنی حاصل ہو، تجھے گرمی حاصل ہو، اور اس کی روشنی میں تو اپنی زندگی کے مقاصد پورے کرے، اور اس سورج کو اتنے فاصلے پر رکھا کہ اس کا فائدہ تو تمہیں حاصل ہو جائے، لیکن اس کے نقصان سے تم محفوظ رہو۔ پھر اس سورج کی کرنوں میں مفید اجزاء بھی ہیں، اور مضر اجزاء بھی ہیں، اب مضر اجزاء سے انسان کو بچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا کے اردگرد ایک ''چھلنی'' لگا دی ہے، جس کو آج کل ''اوزون'' *ozone* کہا جاتا ہے، یہ چھلنی بڑی مہین اور لطیف ہے، اس چھلنی سے

سورج کی کرنیں چھن کر اس کے صرف مفید اجزاء انسان تک پہنچتے ہیں، اور مضر اجزاء روک دیئے جاتے ہیں، آج کے دور میں مدتوں کے بعد، صدیوں کے بعد یہ ''اوزون'' دریافت ہوا، ورنہ انسان کو پتہ بھی نہیں تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کے وقت ہی وہ چھلنی لگادی تھی، ہمیں کچھ پتہ نہیں کہ ہمارے فائدے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں کیا کچھ نظام مقرر فرما رکھا ہے، ایک ایک چیز کی ماہیت اور حقیقت پر غور کروگے تو یہ نظر آئے گا کہ صرف ایک چیز کے اندر اللہ تعالیٰ کی لاکھوں نعمتیں موجود ہیں۔

اپنے جسم کے اندر غور کرلو

یہ تو ''آفاق'' کی باتیں ہیں، ارے تم جسم پر غور کرلو، سَر سے لے کر پاؤں تک، اور بال سے لے کر ناخن تک، تمہارے جسم کا ایک ایک حصہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ، اس کی حکمت بالغہ، اس کی رحمت واسعہ کا کرشمہ ہے، تمہیں تو بھی پتہ نہیں کہ تمہارے جسم میں کیا ہو رہا ہے، آج تک تم اپنے جسم کو بھی پوری طرح دریافت نہیں کرسکے، تمہارے جسم کا کون سا حصہ کیا عمل کر رہا ہے؟ جب سے انسان نے سوچنا شروع کیا، اس وقت سے لے کر آج تک اپنے وجود کی تحقیق میں مصروف ہے، چنانچہ طب اور میڈیکل سائنس کا شعبہ اسی تحقیق میں مصروف ہے کہ اس چھ فٹ کے وجود میں اللہ تعالیٰ نے کیا کارخانہ لگا رکھا ہے، لیکن آج تک یہ کارخانہ کلی طور پر دریافت نہیں ہوسکا، اور جو کچھ دریافت ہوا، اس سے پتہ چلا کہ یہ عجیب و غریب کارخانہ ہے، دنیا کا کوئی کارخانہ، کوئی فیکٹری، کوئی مِل ایسی عجیب و غریب

نہیں ہے، جیسے انسان کے جسم کی فیکٹری ہے، جو اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے، انسان اس فیکٹری کو اِدھر سے اُدھر لئے پھر رہا ہے، اس کو استعمال کر رہا ہے، اس کے ایک ایک عضو سے فائدہ اٹھا رہا ہے، لیکن خود اس کو پتہ نہیں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔

بھوک کب لگتی ہے؟

انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے بھوک لگ رہی ہے، پھر بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، ذائقہ اور لذت حاصل کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہے، اس بیوقوف کو یہ پتہ نہیں کہ اس وقت اس سرکاری مشین کو تیل کی ضرورت ہے، اس کو ایندھن کی ضرورت ہے، یہ تیل کب ختم ہو رہا ہے، اور کتنا باقی ہے؟ اس کو جاننے کے لئے کوئی میٹر تو لگا ہوا نہیں ہے، گاڑی کے اندر تو تم نے میٹر لگا دیا ہے، جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ اب اس گاڑی کا پٹرول ختم ہونے والا ہے، اس لئے اس میں پٹرول ڈلوادو۔ اس جسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے اتنا مزیدار میٹر لگا دیا ہے کہ جب اس جسم کو ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کو بھوک لگ جاتی ہے، خود بخود کھانا کھانے کو دل چاہتا ہے۔ یہ بیوقوف انسان یہ سمجھ رہا ہے کہ میں بھوک مٹانے کے لئے کھانا کھا رہا ہوں، اور لذت حاصل کرنے کے لئے کھانا کھا رہا ہوں۔

’’ذائقہ‘‘ ایک عظیم نعمت

پھر اللہ تعالیٰ نے اس منہ کے اندر ایک ذائقہ رکھ دیا، تاکہ اس ذائقے کو حاصل کرنے کے لئے خود انسان کھانے کی طرف مائل ہو، اور اس ذائقے کی تسکین کے لئے کھانا کھائے، اب یہ انسان سمجھ رہا ہے کہ میں ذائقے کی تسکین کے لئے

کھانا کھا رہا ہوں، لیکن حقیقت میں اس کے جسم کو "غذا" کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ ذائقہ تمہاری چھوٹی سی زبان میں رکھ دیا، اگر یہ مزیدار کھانا تم ناک میں رکھ لو، یا جسم کے کسی اور حصہ میں لگاؤ تو کیا کوئی ذائقہ محسوس ہوگا؟ کیا یہ پتہ چلے گا کہ یہ کھٹا ہے یا میٹھا ہے؟ کچھ بھی نہیں، لیکن اس چھوٹی سی زبان میں اللہ تعالیٰ نے ایسے لعاب پیدا فرمادئے، کہ اس لعاب کے نتیجے میں ذائقہ معلوم ہوتا ہے، اور کھانے میں مزہ آتا ہے، اگر وہ ذائقہ خراب ہو جائے تو اچھی خاصی میٹھی چیز بھی کڑوی معلوم ہوتی ہے۔

اگر یہ "ذائقہ" خراب ہو جائے تو

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ مجھے شاید نزلہ ہو گیا تھا، اس کے نتیجے میں ذائقہ بالکل رخصت ہو گیا، چنانچہ میں ایک جگہ دعوت میں گیا، کسی نے مجھے مرچوں والا قیمہ لا کر دیا، اور اس کے بعد میٹھی کھیر لا کر دی، میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ قیمہ کھانے میں اور کھیر کھانے میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا تھا، نہ مرچیں محسوس ہوئیں، اور نہ مٹھاس محسوس ہوئی، بس ویسے ہی حلق سے اتار لیا۔ عام حالات میں اللہ تعالیٰ نے اس زبان کے اندر ایسا ذائقہ رکھ دیا کہ کھانے میں لذت آرہی ہے، مزہ آرہا ہے، اسی ذائقے کے حصول کی خاطر انسان متنوع اور مختلف قسم کی اشیاء بنا رہا ہے، ایک بڑی مخلوق صرف تمہارے اس ذائقے کی تسکین کے لئے لگی ہوئی ہے، اور اشیاء میں چٹخارہ پیدا کرنے کے لئے لگی ہوئی ہے، اب آدمی تو یہ سمجھ رہا ہے کہ میں چٹخارے کی تسکین کر رہا ہوں، حقیقت میں اس کے نتیجے میں اس کے بدن کو غذا مل

رہی ہے، اس کے بدن کو ایندھن مل رہا ہے۔

''معدہ'' میں خود کار مشین لگی ہوئی ہے

اور پھر تم نے تو ذائقہ حاصل کرنے کی خاطر ہر چیز کو منہ میں ڈال کر اس کو حلق سے اتار لیا، افطار کے وقت دیکھیں کہ آپ کیا کرتے ہیں، ابھی میٹھی چیز کھائی، ابھی کھٹی چیز کھائی، اب پھلکیاں کھالیں، اب پکوڑے کھالئے، اب کھجور کھالی، الّم غلّم سب کچھ اندر بھر لیا، اس کی کوئی فکر نہیں کی کہ اندر کیا ہوگا؟ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے جسم کے اندر ایک کارخانہ لگا دیا ہے، جو ہر ہر چیز کو الگ کر رہا ہے، اور چھانٹی کر رہا ہے، یہ میرا بندہ اپنے ذائقے کے حصول کے لئے لسٹم پسٹم سب کچھ کھا گیا ہے، اس لئے ہم نے اندر ایک خود کار مشین لگا دی ہے، جو ہر چیز کو الگ کر رہی ہے، جس چیز سے خون بننا چاہئے، اس سے خون بن رہا ہے، جس چیز سے جسم کو توانائی ملنی چاہئے، اس سے توانائی مل رہی ہے، جو فضلہ اور بے کار ہے، وہ خارج ہو رہا ہے، ایک طرف سے غذا آرہی ہے، اور دوسری طرف سے خارج ہو رہی ہے، ایک مکمل نظام قائم ہے، جو اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے۔

بغیر طلب کے یہ سب کچھ دیدیا

اگر اس نظام کی ایک کل ذرا سی ڈھیلی ہو جائے تو آدمی بے چین اور پریشان ہو جاتا ہے، اس کی حالت خراب ہو جاتی ہے، اور اب ڈاکٹروں کے پیچھے پھر رہا ہے۔ کیا تم نے اللہ میاں سے کہا تھا کہ ہم کھانا کھائیں گے تو اس کھانے کے نظام کو ٹھیک کر دیجئے گا؟ ہمارے جسم کے اندر ایسا جگر بنا دیجئے گا، ایسا گردہ اور ایسا معدہ

بنادیجئے گا، کیا تم نے اللہ تعالیٰ سے ان چیزوں کے بنانے کی فرمائش کی تھی؟ نہیں، بلکہ اسی نے محض اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے یہ سارا کارخانہ تمہارے لئے بنادیا، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ما نبودیم و تقاضۂ ما نبود
لطف او ناگفتۂ ما می شنود

یعنی نہ ہم موجود تھے، اور نہ ہماری طرف سے کوئی فرمائش اور تقاضا تھا، اسی کے کرم نے ہماری وہ بات سن لی جو ہم نے کہی نہیں تھی۔ ہماری نہ کہی ہوئی بات سن کر ہمارے لئے یہ کارخانہ بنادیا۔

''آنکھیں'' عظیم نعمت ہیں

یہ ایسا عجیب وغریب کارخانہ ہے کہ دنیا کا کوئی کارخانہ اس کی نظیر نہیں ہے، نہ اس کی نظیر مل سکتی ہے، اگر کوئی انسان یہ کارخانہ بنانا چاہے تو اربوں کھربوں میں بھی یہ کارخانہ نہیں بن سکتا۔ اب جو صاحب نظر ہے وہ ان نعمتوں کو دیکھتا ہے، ان کا استحضار کرتا ہے، ان کے بارے میں وہ سوچتا ہے کہ یا اللہ! آپ نے ہمیں یہ آنکھ عطا فرمائی ہے کہ جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں، اس وقت سے لے کر آج تک حسین مناظر اس آنکھ سے دیکھ رہے ہیں، اور اس آنکھ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، کبھی تمہارے ذہن میں اس کے نعمت ہونے کا خیال آیا؟ کبھی تم نے اس نعمت کا شکر ادا کیا؟ اور یہ کہا یا اللہ! آپ نے یہ آنکھ دی، اس میں بینائی اور روشنی عطا کی، ہم نے شکر نہیں ادا کیا، بلکہ غفلت کے عالم میں اس عظیم نعمت کو استعمال کر رہے ہیں، بے

پروائی کے عالم میں اس کو استعمال کر رہے ہیں۔ ہاں! خدانہ کرے کبھی یہ بینائی چلی جائے، یا اس میں کمی واقع ہو جائے، تب پتہ چلے گا کہ یہ کتنی بڑی نعمت تھی جو ہم سے چھن گئی، لیکن اس وقت لاپروائی سے استعمال کر رہے ہیں، پھر اس کے استعمال میں حلال وحرام سب ایک کر رکھا ہے۔ لہٰذا کبھی سوچا کرو کہ یہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے، کیا ہمارے بس میں تھا کہ ایسی بینائی والی چیز کسی طرح حاصل کر لیتے؟ جب چلی جاتی ہے تو لاکھوں کروڑوں خرچ کرنے کے بعد بھی واپس نہیں آتی، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کے لئے دو پہرے دار بٹھا دئے، یہ دو پلکیں پہرے دار ہیں، جب کوئی چیز آنکھ کی طرف آتی ہے تو یہ پلکیں اس کو روک لیتی ہیں، تاکہ براہ راست آنکھ پر ضرب نہ لگے، اس لئے کہ یہ آنکھیں اتنی نازک ہیں کہ اگر ذرا سی بھی کوئی چیز لگ جائے گی تو خراب ہو جائیں گی، ایسی نعمت کے بارے میں بیٹھ کر غور کیا کرو، سوچا کرو، اور اس پر شکر ادا کیا کرو۔

''کان'' اور ''زبان'' عظیم نعمتیں ہیں

یہ کان اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم نعمت ہے، ان لوگوں سے اس کی قدر پوچھو جو سننے کی قوت سے محروم ہیں، یہ زبان اور قوت گویائی عطا فرمائی، اپنے دل کی بات کہنے کا ذریعہ عطا فرمایا، ورنہ تمہارے دل میں جذبات اٹھتے رہتے، اور زبان سے کچھ نہ کہہ سکتے، اس کی قدر ان لوگوں سے پوچھو جن کی زبان پر فالج گر جاتا ہے، وہ لوگ کوئی بات کہنا چاہتے ہیں، اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہتے ہیں، لیکن اظہار نہیں کر پاتے۔ آپ کو یہ نعمت اللہ تعالیٰ نے مفت میں عطا فرما رکھی ہے، بہر

حال! سر سے لے کر پاؤں تک اپنے وجود ہی میں غور کرلو کہ اللہ تعالیٰ نے کیا کیا نعمتیں عطا فرما رکھی ہیں۔

رات کو سونے سے پہلے یہ عمل کرلو

ان نعمتوں کا مراقبہ کیا کرو، اس مراقبہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس ذات نے یہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں، اس کی محبت دل میں پیدا ہوگی۔ اس مراقبہ کا بہترین طریقہ جو حضرت والا نے بیان فرمایا: یہ ہے کہ رات کو سونے سے پہلے پانچ دس منٹ اس مراقبہ کے لئے مختص کرلو، اور اس مراقبہ میں ان نعمتوں کا دھیان کرو جو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہوئی ہیں، ایک ایک نعمت کا دھیان کر کے اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے جاؤ، اے اللہ! آپ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے آنکھ عطا فرمائی ہے، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے میری آنکھ میں صحت اور بینائی عطا فرمائی ہے، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے کان عطا فرمائے ہیں، اور اس میں شنوائی کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے زبان عطا فرمائی، اور اس میں گویائی کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے یہ دانت عطا فرمائے، جو صحیح سالم ہیں، اور یہ کھانے کا کام دے رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے یہ ہاتھ عطا فرمائے ہیں، جن کے ذریعے میں اپنے کام انجام دیتا ہوں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے پاؤں عطا فرمائے، اس میں چلنے کی طاقت عطا فرمائی، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ

وَلَکَ الشُّکْرُ، اس طرح ایک ایک عضو کا تصور کر کے اوران کے اندر جو نعمتیں اللہ تعالیٰ نے رکھی ہیں، ان کا تصور کرو، اور پھر اِن پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

گردو پیش کی نعمتوں پر شکر

پھر اپنے اِرد گرد کے ماحول پر نظر ڈالو اور یہ کہو کہ: اے اللہ! آپ نے مجھے گھر عطا فرمایا، جو عافیت کا گھر ہے، اور نہ جانے کتنے لوگ ہیں جو گھر کے بغیر زندگی گزار رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے آرام دہ بستر عطا فرمایا، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اے اللہ! آپ نے مجھے بیوی بچے عطا فرمائے جو محبت کرنے والے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، ایک ایک چیز کی طرف دھیان لے جاؤ، اور پھر ان نعمتوں پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

پریشانی کے وقت نعمتوں کا استحضار

انسان پر کوئی نہ کوئی تکلیف اور پریشانی بعض اوقات آجاتی ہے، لیکن انسان کا کام یہ نہیں ان پریشانیوں کو لے کر بیٹھ جائے، اوراس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول جائے، بلکہ عین پریشانی اور عین تکلیف کے وقت بھی اگر غور کرو گے تو اس وقت میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اس مصیبت اور تکلیف کے مقابلے میں ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ نظر آئیں گی، مگر چونکہ انسان بے صبرا ہے، جب کوئی تکلیف آتی ہے تو اسی کو لے کر بیٹھ جاتا ہے، اور نعمتوں کو بھول جاتا ہے۔

میاں صاحب پیدائشی ولی تھے

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک استاذ تھے، حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ، جو ''میاں صاحب'' کے نام سے مشہور تھے، بڑے عجیب بزرگ تھے، اور پیدائشی ولی تھے، میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، میرے دادا فرمایا کرتے تھے کہ یہ پیدائشی ولی ہیں، اس لئے کہ یہ بچپن سے میرے پاس پڑھنے کے لئے آیا کرتے تھے، اس وقت سے لے کر آج تک کبھی انہوں نے جھوٹ نہیں بولا، جب میں بچوں کو پڑھا رہا ہوتا، کوئی بچہ کوئی شرارت کر لیتا، تو میں ڈانٹ کر پوچھتا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ سب بچے خاموش دم بخود ہو جاتے، لیکن یہ کھڑے ہو جاتے اور کہتے کہ استاد جی! مجھ سے یہ غلطی ہو گئی، اس وقت بھی کبھی ان کی زبان پر جھوٹ نہیں آیا۔

بیماری میں شکر کا انداز

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ مجھے اطلاع ملی کہ وہ بیمار ہیں، میں ان کی عیادت کے لئے گیا، جا کر دیکھا تو شدید بخار کے اندر تپ رہے ہیں، شدید بے چینی کے اندر ہیں، میں نے پوچھا کہ حضرت کیسی طبیعت ہے؟ فرمایا کہ اللہ کا شکر ہے کہ ہماری آنکھیں صحیح کام کر رہی ہیں، اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے کان بہت اچھی طرح کام کر رہے ہیں، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اللہ کا شکر ہے کہ گویائی کی قوت بحال ہے، الحمد للہ جگر، دل اور معدہ ٹھیک ہے، بس بخار ہو رہا ہے، دعا کر دیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو بھی دور فرما دیں۔ دیکھئے! جو

تکلیفیں نہیں تھیں، ان کا ذکر کر کے پہلے ان پر شکر ادا فرمایا، پھر آخر میں بخار کا ذکر کیا۔ یہ وہ لوگ تھے کہ عین تکلیف کے وقت بھی اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں مبذول ہیں، ان کی طرف دھیان جا رہا ہے، اور ان پر شکر ادا ہو رہا ہے، اس کے بعد تکلیف کا بھی تھوڑا سا تذکرہ کر دیا، اور اس کو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر دیا، یہ ہے ایک شکر گزار بندے کا طرزِ عمل۔

نعمتوں پر شکر ادا کرو

ہم جیسوں کا تو یہ حال ہے کہ جب ذرا سی تکلیف آجائے تو اس وقت ہم ساری نعمتیں بھلا بیٹھتے ہیں، اور اس تکلیف کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اسی پر شکوہ شکایت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ

یعنی میرے بندوں میں شکر گزار بندے بہت کم ہیں، جو نعمتیں میں نے ان پر ہر وقت مبذول کر رکھی ہیں، ان کا احساس ہی نہیں ہے، ان نعمتوں کا دھیان ہی نہیں۔ اس لئے فرمایا کہ نعمتوں کو یاد کرو، اور ان پر شکر ادا کرو، جو تکلیفیں تم پر آرہی ہیں، بے شک ان کو بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرو، اور کہو کہ: اے اللہ! میں کمزور ہوں، مجھ سے یہ تکلیف برداشت نہیں ہو رہی ہے، آپ اپنے فضل و کرم سے میری اس تکلیف کو دور کر دیجئے، آپ نے جہاں اتنی نعمتیں عطا فرمائی ہیں، اس تکلیف کے دور ہونے کی نعمت بھی عطا فرما دیں، لیکن خدا کے لئے ان موجودہ نعمتوں کی ناشکری نہ کریں۔

''دانت'' ایک عظیم نعمت ہے

ہماری ایک بہن کی جب عمر زیادہ ہوگئی، اور ان کے دانت ٹوٹنے لگے، ایک مرتبہ وہ اپنا دانت نکلوا کر واپس آئیں تو وہ حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے کہنے لگیں کہ ابا جی! یہ دانت بھی عجیب چیز ہیں کہ یہ آتے وقت بھی تکلیف دیتے ہیں اور جاتے وقت بھی تکلیف دیتے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ جب بچپن میں دانت نکلتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بچے کو دست آرہے ہیں، کبھی بخار آرہا ہے، اور بڑی عمر میں جب یہ ٹوٹتے ہیں تو اس وقت بھی یہ بہت تکلیف دیتے ہیں، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی بات سن کر ایک آہ بھری، اور فرمایا: خدا کی بندی! تمہیں ان دانتوں کی دو ہی چیزیں یاد رہیں کہ انہوں نے آتے وقت بھی تکلیف دی، اور جاتے وقت بھی تکلیف دے رہے ہیں، اور پچاس ساٹھ سال کی درمیانی مدت میں ان سے جو مزہ لیا ہے، ان سے جو راحت حاصل کی ہے، جو ذائقہ حاصل کیا ہے، اس کا کبھی دھیان اور خیال نہیں آیا؟ ٹھیک ہے کہ آتے وقت بھی تکلیف ہوئی، اور جاتے وقت بھی تھوڑی سی تکلیف ہورہی ہے، لیکن سالہا سال تک اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی اس چکی سے منوں اور ٹنوں خوراک کو پیسا ہے، اور اس کو اپنے جسم کا جز بنایا ہے، اس کی طرف دھیان نہیں۔ بس ذرا سی تکلیف آجاتی ہے تو ہم اس کو لے کر بیٹھ جاتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بھول جاتے ہیں۔

اللہ والوں کی صحبت کا فائدہ

اللہ والوں کی صحبت سے یہی بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ انسان کا زاویہ نگاہ

درست کردیتے ہیں، اب تک نگاہ تکلیفوں پر، مصیبتوں پر اور پریشانیوں پر جارہی تھی، اللہ والے کی صحبت کے نتیجے میں نعمت پر جانے لگتی ہے۔ ٹھیک ہے جو تکلیفیں ہیں وہ بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کر دیں، اور کہہ دیں کہ: یا اللہ! میں کمزور ہوں، میں اس تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا، اے اللہ! اپنی رحمت سے اس کو دور فرما دیجئے، لیکن جو تمہیں نعمتیں دی ہیں، کم از کم ان کو تو مت بھولو۔

کیا محسن سے محبت نہیں ہوگی؟

لہٰذا رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر بیٹھ کر نعمتوں کا جائزہ لو، اپنے جسم پر ہونے والی نعمتوں کا، اپنے گردوپیش پر ہونے والی نعمتوں کا، اپنے گھر والوں پر ہونے والی نعمتوں کا جائزہ لو، اور ان میں سے ایک ایک پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اسی کا نام ''مراقبہ'' ہے، یہ مراقبہ بڑا اکسیر ہے، روزانہ کر کے دیکھو، اس لئے کہ جب روزانہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا مراقبہ کرو گے تو اس کے نتیجے میں خود بخود اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔ فرض کرو کہ کوئی شخص تمہارے دروازے پر روزانہ پیسے پھینک کر چلا جاتا ہے، تم اس کو اٹھا کر اپنی ضروریات پوری کر لیتے ہو، اور اس طرح تمہارا کام چل رہا ہے، اب خود بخود تمہارے دل میں اس شخص کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو جائے گا کہ یہ شخص جو روزانہ پیسے ڈال کر جارہا ہے، اور میری حاجتیں پوری کر رہا ہے، اس کو دیکھوں تو سہی، پھر اس کو دیکھنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لیکن اس کی محبت دل میں ضرور پیدا ہوگی۔ وہ ایک انسان جو دن میں صرف ایک مرتبہ تمہارے دروازے پر پیسے ڈال گیا، اور اس کے ذریعے تمہاری حاجتیں پوری ہوگئیں، جب

اس کا تصور کر کے تمہارے دل میں اس کی محبت پیدا ہو رہی ہے، تو وہ ذات جو ہر وقت تمہارے اوپر نعمتوں کا گھن نچھاور کر رہی ہے، وہ ذات اگرچہ نظر نہیں آرہی ہے، لیکن کیا تم اس سے محبت نہیں کرو گے؟ کیا اس کی نعتوں کے تصور سے اس کے ساتھ محبت پیدا نہیں ہوگی؟ اس لئے روزانہ رات کو دس منٹ کے لئے نعمتوں کے استحضار کا مراقبہ کیا کرو، اور ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کرو۔

شکر ادا کرنے کا عجیب وغریب واقعہ

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے یہ چیز اپنے ایک عزیز سے سیکھی، وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے بستر پر بیٹھے ان الفاظ کی رٹ لگاتے، اور بار بار فرماتے، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ ، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ آپ رات کو سونے سے پہلے یہ کیا کرتے ہیں؟ جواب میں فرمایا: ہاں بھائی، سارے دن تو نعمتوں پر شکر ادا کرنے کا موقع نہیں ملتا، اس لئے میں رات کو سونے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار کرتا ہوں، اور ایک ایک نعمت کا دھیان کر کے اس پر اللہ تعالیٰ شکر ادا کرتا ہوں۔ حضرت ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ انہوں نے شکر ادا کرنے کا عجیب طریقہ بیان فرمادیا۔ بہرحال، رات کو سونے سے پہلے صرف دس منٹ اس کام کے لئے نکال لو، اور اس وقت چھوٹی چھوٹی نعمتوں کا بھی تصور کرو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، یہ عمل تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کی ذات سے

محبت اور تعلق پیدا ہو جائے گا تو پھر سب کچھ آسان ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اللہ کی محبت

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶

مجلس نمبر : ۸۷

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ کی محبت

پیدا کرنے کے اسباب اور طریقے

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبۃ للمتقین، والصّلوٰۃ والسّلام علٰی رسولہ الکریم وعلٰی آلہ و اصحابہ اجمعین، امّا بعد!

دوسرا طریقہ: انعامات کو سوچنا

یہ مضمون کئی روز سے چل رہا ہے، اس کا موضوع ہے "تعلق مع اللہ کی اہمیت اور اس کو پیدا کرنے کا طریقہ" اللہ جل شانہ کی محبت سارے دین کی بنیاد ہے، حضرت والا نے اللہ کی محبت پیدا کرنے کے طریقوں میں پہلا طریقہ بیان فرمایا "کثرت ذکر اللہ" اس کی تھوڑی سی تفصیل پچھلے بیانات میں عرض کر دی۔ دوسری چیز جس کا گذشتہ کل تھوڑا سا ذکر ہوا تھا، وہ یہ ہے کہ "اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اپنے برتاؤ کو سوچنا" اللہ جل شانہ کی وہ نعمتیں جو ہر وقت ہر انسان پر مبذول ہیں، ان کا تصور اور دھیان کرنے کے نتیجے میں اپنے محسن حقیقی کی محبت

دل میں پیدا ہوگی، ظاہر ہے کہ جو شخص ہر وقت دوسرے کا زیر بار احسان ہو، اور دوسرا شخص اس پر بے مانگے بھی احسان کر رہا ہے تو طبعی بات یہ ہے کہ اس شخص سے محبت پیدا ہوگی۔

ان کے انعامات سب پر عام ہیں

اللہ تعالیٰ جن کے انعامات کا سلسلہ غیر متناہی ہے، جب ان انعامات کا بار بار تصور کیا جائے گا، تو ان کی محبت دل میں پیدا ہوگی، بات صرف دھیان کی ہے، ان کے انعامات تو مسلسل جاری ہیں، تم شکر کرو، یا ناشکری کرو، ان کے انعامات میں تو کمی نہیں ہے، ان کی نعمتوں میں کمی نہیں آرہی ہے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ادیم زمین سفرۂ عام اوست

بری خوانِ نعمت چہ دشمن چہ دوست

یعنی اللہ تعالیٰ نے اس پوری زمین کو ایسا عام دستر خوان بنا رکھا ہے کہ ساری مخلوق اس کی نعمتوں سے مستفید ہو رہی ہے، اور اس دستر خوان پر دشمن اور دوست کی کوئی تفریق نہیں، دشمن کو بھی اسی طرح دے رہے ہیں، جس طرح دوست کو دے رہے ہیں، اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ظاہری نعمتیں مسلمان اور کافر سب پر جاری ہیں، بلکہ بعض اوقات کافروں پر زیادہ ہو رہی ہیں، وہ مسلمانوں سے زیادہ خوشحال ہیں، زیادہ ترقی کر رہے ہیں، ان کے پاس زیادہ پیسہ ہے، ان کے پاس دولت زیادہ ہے، اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں کہ فلاں دشمن مجھے جھٹلا رہا

ہے، میری توہین کررہا ہے، میری گستاخی کررہا ہے، میرے وجود کا بھی منکر ہے، پھر بھی اللہ تعالیٰ اس کو نعمتیں دے رہے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے۔

دوستوں کو تنگی اور دشمنوں کو فراخی

بلکہ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں اپنے پیارے محبوب بندوں کو اس دنیا میں تنگی کا شکار کیا جاتا ہے، اور دشمنوں کو نوازا جاتا ہے، چنانچہ مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

ماپروریم دشمن ومامی کشیم دوست
کس را چرا و چوں نہ رسد در قضاء ما

یعنی بعض اوقات ہم دشمن کو پالیتے ہیں، اور اپنے دوست کو مارتے ہیں، قتل کرادیتے ہیں، جیسے سامری جادوگر کو جبرئیل امین علیہ السلام کے ذریعہ پالا جارہا ہے، اور دوسری طرف حضرت الیاس علیہ السلام کو آروں سے چروادیا گیا۔ لہٰذا دنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دوست، دشمن، مسلم اور کافر سب پر جاری ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے اندر تو کوئی کمی واقع نہیں ہورہی ہے۔

ان نعمتوں کی طرف دھیان نہیں

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

وہ تو ہر وقت جاری ہیں، بات صرف دھیان کی ہے کہ ہم اس کی ان نعمتوں کی طرف سے غافل ہیں، اس کا دھیان نہیں کرتے، اس کا استحضار نہیں

کرتے، اس کی وجہ سے ان نعمتوں کا خیال نہیں کرتے، اگر اللہ تعالیٰ ان کا دھیان کرنے کی توفیق عطا فرمادے، اور ان کو یاد کرنے کی توفیق عطا فرمادے، تو پھر یہ ممکن نہیں ہے کہ آدمی ان نعمتوں کو سوچے، اور پھر بھی اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا نہ ہو۔ اس لئے کل میں نے عرض کیا تھا کہ رات کو سونے سے پہلے نعمتوں کا استحضار کر کے اس پر شکر ادا کیا کرو۔ بہرحال! محبت پیدا کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو سوچنا۔

تیسرا طریقہ: اپنے برتاؤ کو سوچنا

اس کے بعد حضرت فرماتے ہیں کہ ساتھ میں اپنے برتاؤ کو بھی سوچے، یعنی یہ سوچے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا یہ عالم ہے کہ بارش کی طرح ہر لمحے برس رہی ہیں، اور دوسری طرف میرا برتاؤ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو ذرا سی عبادت کا حکم دیا ہے، اسی میں سستی کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جس گناہ سے بچنے کا حکم دیا تھا، اس سے بچنے میں سستی کر رہا ہوں، اسی کو مولانا رومی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ:

کارسازِ ما بسازِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

یعنی ہمارا کارساز تو دن رات ہمارے کام میں لگا ہوا ہے، ہماری حاجتوں کو پورا کر رہا ہے، ہم پر اپنی نعمتوں کا نازل فرما رہا ہے، لیکن جو کام ہمارے سپرد کیا گیا تھا، وہ کام ہمارے لئے آزار بنا ہوا ہے، ہم اس کو اپنے لئے

مصیبت سمجھ رہے ہیں کہ یہ نماز پڑھنا، یہ روزے رکھنا اور گناہوں سے بچنا، ان کو مصیبت سمجھ رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے جواب میں بندے کا طرزِ عمل کتنی ناشکری والا طرزِ عمل ہے، اگر انسان یہ سوچے کہ میرے اس طرزِ عمل کے باوجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا ہوگی۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات کو اور پھر اپنے برتاؤ کو سوچو۔

اپنی حیثیت میں غور کرو

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی اس عبارت کا ایک اور مطلب بھی ہوسکتا ہے جو حضرت والا نے دوسری جگہ بیان فرمایا ہے، جیسا کہ ہمارے بھائی کلیم صاحب نے بتایا کہ انہوں نے حضرت کے وعظ میں یہ پڑھا کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو اور اپنے برتاؤ کو سوچنے سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور اپنی حیثیت میں غور کرنے سے بھی دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ اپنی حیثیت میں غور کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کی عظمت، اس کا جلال، اس کی کبریائی، اس کی رحمتیں، اس کی قدرتِ کاملہ، اس کی حکمتِ بالغہ میں غور کرے، اور دوسری طرف اپنی کم حیثیتی کا تصور کرے کہ میری تو کوئی حقیقت نہیں، میں تو کسی کام پر قادر نہیں، میرے پاس جو کچھ ہے وہ سب ان کی عطا ہے، ورنہ میرے پاس تو کچھ نہیں تھا، نہ میں اپنے وجود کو خود سے وجود میں لاسکتا تھا، نہ میں اپنے آپ زندہ رکھ سکتا تھا، نہ یہ شکل وصورت، نہ یہ صحت، نہ یہ

علم حاصل کرسکتا تھا، ان میں سے کچھ بھی میرے پاس نہیں تھا، یہ سب کچھ انہی کی عطا ہے، اور وہ جب چاہیں چھین لیں، واپس لے لیں۔

اس سے اللہ کا شکر اور محبت بڑھتی ہے

اور جب سب کچھ انہی کی عطا ہے تو پھر میں کس بات پر تکبر کروں، کس بات پر اتراؤں، کس بات پر عجب اور خود پسندی کے اندر مبتلا ہوں، اس لئے کہ اپنی ذات میں تو میرے پاس کچھ بھی نہیں، یہ ہے "اپنی حیثیت کو سوچنا" اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اس لئے کہ جتنا اپنی کم حیثیتی کا احساس ہوگا، اتنا ہی اللہ جل جلالہ کی نعمتوں کی عظمت کا احساس ہوگا۔ اگر انسان اپنے آپ کو ان نعمتوں کا مستحق سمجھے تو وہ سوچے گا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ کام میرے ساتھ کرنا ہی چاہئے تھا، اللہ تعالیٰ کو یہ نعمتیں مجھے دینی تھیں، ایسا انسان اللہ تعالیٰ کا کیا شکر ادا کرے گا، اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کہاں سے پیدا ہوگی؟ لیکن اگر انسان یہ سوچتا ہے کہ میں بے حیثیت ہوں، اس کے باوجود اللہ تعالیٰ کی نعمتیں میرے اوپر نازل ہو رہی ہیں، تو پھر اللہ تعالیٰ کے شکر کا اور اس کی محبت کا احساس دل میں پیدا ہوگا۔

ایک بزرگ اور متکبر کا واقعہ

جب دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم بڑے آدمی ہیں، ہمیں شان و شوکت حاصل ہے، تکبر کے احساسات دل میں پیدا ہو رہے ہیں، اس وقت انسان دوسرے سے کہتا ہے کہ: جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ چنانچہ ایک شخص سے

ایک بزرگ نے کوئی اصلاح کی بات کہی تو اس نے پلٹ کر کہا کہ: جانتے نہیں ہم کون ہیں؟ یعنی ہم تو اتنے بڑے آدمی ہیں، تم ہماری اصلاح کرتے ہو؟ جواب میں ان بزرگ نے فرمایا کہ ہاں! میں جانتا ہوں تم کون ہو، تمہاری حقیقت یہ ہے کہ:

انسان کی حقیقت

اَوَّلُكَ نُطْفَةٌ مَذِرَةٌ وَآخِرُكَ جِيفَةٌ قَذِرَةٌ،

وَأَنْتَ فِيمَا بَيْنَ ذٰلِكَ تَحْمِلُ الْعَذِرَةَ

یعنی تمہاری ابتداء ایک گندہ اور ناپاک نطفہ اور منی کا قطرہ تھا، اصل تو تمہاری یہ ہے، اور آخری انجام تمہارا یہ ہے کہ تم بدبودار مردار بننے والے ہو، ایسے بدبودار کہ تمہارے گھر والے بھی چوبیس گھنٹے تمہیں اپنے گھر میں رکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے، وہ تمہارے مرنے پر روئیں گے، لیکن رکھنے کو تیار نہیں ہوں گے، وہ یہ کہیں گے کہ اس میں سے جو بدبو اٹھے گی اس کو برداشت کرنا ہمارے بس میں نہیں، لہٰذا فوراً قبرستان لے جا کر قبر میں ڈال دیں گے، اور پیدائش سے لے کر وفات تک جو درمیان کا زمانہ ہے، اس زمانے میں تو ہر وقت نجاست کا بوجھ اٹھائے پھر رہا ہے، یہ کوئی مبالغہ نہیں، بلکہ حقیقت ہے، کیونکہ اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ انسان سر سے لے کر پاؤں تک نجاستوں کا پلندا ہے، یہ تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اس کھال کے ذریعہ ہماری پردہ پوشی کر رکھی ہے، عیب چھپے ہوئے ہیں، گندگی چھپی ہوئی ہے، ورنہ اس خوبصورت چہرے

پر ذرا سا چیرا لگاؤ، تو اندر سے گندگی نکل آئے گی، کہیں خون بھرا ہوا ہے، کہیں پیپ بھری ہوئی ہے، کہیں پیشاب اور کہیں پاخانہ بھرا ہوا ہے، اس وقت تو سب لوگ محبت کر رہے ہیں، اپنے پاس بٹھا رہے ہیں، لیکن اگر چہرے سے کھال اتر جائے تو کوئی پاس بیٹھنے کو بھی تیار نہ ہو، بلکہ نفرت کریں، اور دیکھنے کو بھی تیار نہ ہو، وہی خوبصورت چہرہ خوفناک بن جائے گا، اور دیکھ کر ڈر لگے گا۔ لہٰذا تیری ابتداء گندے نطفے سے ہوئی، اور تیری انتہاء ایک بدبودار مردار پر ہوگی، اور درمیان کے زمانے میں تو گندگی اٹھائے پھر رہا ہے، یہ تیری حقیقت ہے، اور پھر بھی یہ کہتا ہے کہ ''جانتا نہیں میں کون ہوں؟

شکستگی مطلوب ہے

جب تک انسان کو اپنی اس حقیقت کا ادراک اور احساس نہ ہو، اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی نہ تو نعمتوں کا ادراک ہو سکتا ہے، اور نہ ہی اللہ جل شانہ کی محبت کما حقہ پیدا ہو سکتی ہے، اسی لئے حضرت فرماتے ہیں کہ ''اپنی حیثیت کو پہچانو'' اور اس طریق میں اول و آخر سبق یہی ہے کہ ''اپنی حقیقت کو پہچاننا اور اپنے آپ کو مٹانا اور فنا کرنا'' جس میں دعویٰ ہو، جس میں تعلّی ہو، جو شان و شوکت بنائے، اور جو تکبر کرے، اس کو اس طریق کی ہوا بھی نہیں لگی، یہاں شکستگی مطلوب ہے، اپنی حیثیت کا احساس ہو، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے شکستگی ہو۔

اپنی نظر میں چھوٹا دوسروں کی نظر میں بڑا

اس لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی: اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ

فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا ، اے اللہ! مجھے اپنی آنکھ میں چھوٹا بنا دیجئے، یعنی جب میں اپنے آپ کو دیکھوں تو اپنے آپ کو چھوٹا سمجھوں، تاکہ میرے اندر تواضع پیدا ہو، البتہ لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا دیجئے، اس لئے کہ اگر لوگ بھی مجھے چھوٹا سمجھنے لگیں گے تو وہ مجھ پر ظلم اور زیادتی کریں گے، کسی نے خوب کہا ہے کہ:

سگ باش ، و برادر خورد مباش

کتے بن جاؤ، لیکن چھوٹے بھائی مت بنو۔ مطلب یہ ہے کہ ساری بلائیں چھوٹے بھائی پر نازل ہوتی ہیں، اس لئے کہ اگر دوسرے یہ سمجھنے لگیں کہ یہ چھوٹا ہے تو لوگ اس پر ظلم کریں گے، اس کو بھون کر ہی کھا جائیں گے، چونکہ یہ چھوٹا ہے اس لئے جو سلوک چاہو، اس کے ساتھ کرو۔ لہٰذا اپنے دفاع کے لئے اور اپنے بچاؤ کے لئے لوگوں کی نگاہ میں اے اللہ! مجھے بڑا بنا دیجئے، لیکن میں اپنے آپ کو چھوٹا ہی سمجھتا رہوں۔

اول و آخر "فنا ہی فنا"

حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں کہ ہمارے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں تو پہلا و آخری سبق "فنا ہی فنا" ہے، یعنی اپنے آپ کو مٹانا، فرماتے ہیں کہ جو شخص مشیخت، پیری اور شان و شوکت کا راستہ اپنائے، اس کو ہمارے راستے کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اسلئے عام آدمی کی طرح رہو، کوئی شان و شوکت بنانے کی ضرورت نہیں، شان بنانے سے پرہیز کرو، اور اپنی

حیثیت کو پیش نظر رکھو، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک ہوگا، اور پھر شکر کی توفیق ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی۔

چوتھا طریقہ: اللہ والوں کی صحبت

آگے حضرت والا نے محبت پیدا کرنے والے اسباب میں سے چوتھا سبب یہ بیان فرمایا کہ "کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا" یہ بھی محبت پیدا کرنے کا بڑا قوی ذریعہ ہے، بلکہ شاید سب سے قوی ذریعہ ہو، اس لئے کہ اللہ والوں سے جتنی محبت ہوگی، اور اللہ والوں سے تعلق ہوگا، ان کی صحبت اٹھاؤ گے، ان کے ساتھ رہو گے، اتنی ہی اللہ جل جلالہ کی محبت دل میں بڑھے گی۔ ہمارے حضرت ایک شعر پڑھا کرتے تھے:

ان سے ملنے کی ہے یہی اک راہ
ملنے والوں سے راہ پیدا کر

ان سے ملنے کا طریقہ یہ ہے کہ ان سے جو ملنے والے ہیں، ان سے راہ پیدا کر، ان سے تعلق جوڑ لے، تو پھر انشاء اللہ وہ بھی مل جائیں گے۔ لہٰذا جو اللہ والے ہیں، جن کے دلوں میں اللہ کی محبت سمائی ہوئی ہے، ان کی صحبت اختیار کرنا، ان کے قریب رہنا، ان سے تعلق پیدا کرنا، ان سے محبت کرنا، ان کاموں سے اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دل میں بھی پیدا ہوگی۔

اللہ کی محبت بھر رہا ہوں

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک مرتبہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مجلس میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت پر بیان فرمارہے تھے، حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوب رحمۃ اللہ علیہ بھی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے، دوران بیان حضرت مجذوب صاحب نے فرمایا کہ حضرت! خدا کے واسطے کچھ ہمارے دل میں بھی بھر دیجئے، حضرت نے فرمایا میں اور کیا کر رہا ہوں، یعنی یہ جو بیان ہو رہا ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دلوں میں بھری جارہی ہے، اور کیا کر رہا ہوں۔ بہر حال! جب آدمی اللہ والوں کے پاس بیٹھتا ہے، ان کی باتیں سنتا ہے، ان کے ملفوظات کو سنتا ہے، ان کی اداؤں کو دیکھتا ہے، تو ان سب کاموں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے رابطہ جڑتا ہے، اسی سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں قوت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے حضرت والا نے اسباب محبت میں یہ بیان فرمایا کہ: کسی اللہ والے سے تعلق رکھنا۔

پانچواں طریقہ: طاعت پر مواظبت

اسباب محبت میں پانچواں سبب یہ بیان فرمایا کہ "طاعت پر مواظبت کرنا" یعنی اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کرنا، جتنی زیادہ اطاعت کرو گے اتنی ہی محبت بڑھے گی۔ اللہ تعالیٰ نے "محبت" اور "اطاعت" کے درمیان عجیب رشتہ رکھا ہے، وہ یہ کہ "اطاعت" سے محبت پیدا ہوتی ہے، اور پھر "محبت" سے مزید اطاعت ہوتی ہے، پھر اس "اطاعت" سے مزید "محبت" پیدا ہوتی ہے، پھر اس "محبت" سے مزید "اطاعت" انجام پاتی ہے، یہ سلسلہ ایک لامتناہی حد تک چلا جاتا ہے۔

یہ تو ''دور'' لازم آ رہا ہے؟

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ یہ کہا جاتا ہے اللہ کے حکم کی اطاعت کرنے اور دین کے حکم پر چلنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں پیدا کر لی جائے، جب یہ پوچھا گیا کہ ''محبت'' کیسے پیدا کریں؟ تو یہ کہا گیا کہ محبت پیدا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرو، یہ تو ''دور'' لازم آ گیا، یعنی یہ کہا جا رہا ہے کہ دین پر چلنا ہے تو محبت کرو، اور محبت پیدا کرنے کے لئے دین پر چلو، یہ تو ''دور'' لازم آ رہا ہے کہ جن دو چیزوں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان میں سے ہر ایک دوسرے پر موقوف ہو رہی ہے۔ اس کے جواب کو غور سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

شروع میں تھوڑی سے محنت اور ہمت

اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جو بندہ بھی ابتداء میں تھوڑی سے محنت کر کے اطاعت کرے گا تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کو ''محبت'' کا ایک خاص درجہ عطا فرمائیں گے، پھر ''محبت'' کے اس درجہ کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مزید ''اطاعت'' کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ جس کا حاصل یہ ہوا کہ شروع میں بغیر کسی محنت اور عمل کے خود بخود محبت پیدا نہیں ہوگی، اور نہ ہی خود بخود اطاعت کرنا آسان ہوگا، بلکہ دین شروع میں تھوڑی سے قربانی مانگے گا، تھوڑی سے محنت اور ہمت مانگے گا، اس ہمت اور محنت کے بغیر یہ دولت نہیں ملتی، لہٰذا شروع میں آدمی کو یہ کرنا پڑے گا کہ اپنی خواہشات کے خلاف، اور

اپنے دنیاوی اور بشری تقاضوں کے خلاف تھوڑی سے محنت کرنی پڑے گی، اور جب ایک مرتبہ انسان وہ محنت کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ایک نورِ محبت پیدا فرما دیتے ہیں۔

ریل بھاپ کے ذریعہ تیز چلتی ہے

اس بات کو حضرت والا نے دوسری جگہ پر ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا ہے، فرمایا کہ جیسے ریل کے انجن میں اگر بھاپ بھری ہوئی ہو (اُس زمانے میں ریل بھاپ کے ذریعہ چلائی جاتی تھی، پٹرول اور ڈیزل دستیاب نہیں تھا) تو وہ ریل بہت تیز بھاگتی ہے، لیکن اگر ریل میں سب چیزیں موجود ہیں، پہیے بھی لگے ہیں، لیکن انجن کے اندر بھاپ نہیں ہے، اب اگر کوئی شخص دھکا لگا کر اس ریل کو چلانا چاہے گا تو وہ ریل پورے دن میں بمشکل ایک دو کلومیٹر کا فاصلہ طے کرے گی، لیکن اگر انجن میں بھاپ بھری ہوئی ہے، اور اس بھاپ کے ذریعہ اس ریل کو چلایا جائے گا تو وہ دن بھر میں چار پانچ سو میل کا فاصلہ طے کرے گی۔

"محبت" بمنزلہ "بھاپ" کے ہے

حضرت فرماتے ہیں کہ ٹرین کے تیز رفتار چلنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے، ایک بھاپ کی، دوسارے پہیوں کی، اگر انجن اور بھاپ نہ ہو، صرف پہیے ہوں تو وہ ٹرین تیز نہیں چل سکتی، اور اگر بھاپ ہو، لیکن پہیے نہ ہوں، تو وہ بھاپ اس ٹرین کو تباہ کر دے گا، اور وہ ٹرین زمین کے اندر دھنس جائے گی۔ لہٰذا بھاپ کی بھی ضرورت ہے، اور پہیوں کی بھی ضرورت ہے۔ حضرت

فرماتے ہیں کہ اسی طرح انسان کے اندر "محبت" بمنزلہ "بھاپ" کے ہے، اور "عمل" بمنزلہ "پہیے" کے ہیں، اس لئے پہلے تھوڑا سا "عمل" تو کرنا پڑے گا، پھر اس "عمل" کے نتیجے میں جب "محبت" کی بھاپ پیدا ہوگی، تو پھر تیز رفتاری سے ترقی ہوگی، اور تیز رفتاری سے "عمل" ہوگا۔

اڑنے سے پہلے زمین پر جہاز کا چلنا

آج کل کی مثال سے یوں سمجھ لیں، جیسے یہ ہوائی جہاز ہے، یہ ہوا میں اُڑتا ہے، اور ہوا میں پانچ سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے سفر کرتا ہے، لیکن اُڑنے سے پہلے ہوائی جہاز کو زمین پر "ٹیکسی" کرنے پڑتی ہے، کوئی جہاز ایسا نہیں ہے جو کھڑا کھڑا سیدھا اُڑ جائے، بلکہ تھوڑی دیر اس کو زمین پر چلنا پڑتا ہے، یہ وقت مجھ جیسے مسافر کے لئے بڑا صبر آزما وقت ہوتا ہے، اس لئے کہ جب جہاز اُڑ جاتا ہے تو میں اپنے لکھنے کے کام میں مشغول ہو جاتا ہوں، اور جب تک زمین پر چل رہا ہوتا ہے اس وقت تک کوئی کام نہیں کرسکتا، بہرحال! ہر جہاز اُڑنے سے پہلے زمین پر آہستہ آہستہ چلتا ہے، پھر اُڑتا ہے۔ بالکل اسی طرح "محبت" پیدا کرنے کے لئے تھوڑی محنت کرنے پڑے گی، اور تھوڑا سا "عمل" کرنا پڑے گا، اور جب اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت میں اپنی خواہشات کے خلاف عمل کرنا شروع کرو گے تو پھر "محبت" کی بھاپ تمہارے اندر پیدا ہو جائے گی، اور پھر تیز رفتاری سے ترقی ہوگی۔

ایمان کی لذت حاصل کرلو

یہی معنی اس حدیث کے ہیں جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی نامحرم پر لذت لینے کے لئے نگاہ ڈالنے کو دل چاہ رہا ہے، اور بہت شدید تقاضا ہو رہا ہے کہ میں اس پر نگاہ ڈال کر لذت حاصل کرلوں، لیکن اگر تم نے اللہ کے حکم کا خیال کر کیا اللہ کے ڈر سے اس نگاہ کو بچالیا، اور نظر نہیں ڈالی، اور نظر ہٹانے کے تکلیف اپنے نفس پر برداشت کرلی تو اللہ تعالیٰ تمہیں ایمان کی ایسی لذت عطا فرمائیں گے کہ گناہوں کی لذت اس کے سامنے ہیچ در ہیچ ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ بندے سے فرماتے ہیں کے اے بندے! میں نے تیرے اوپر صبح سے لے کر شام تک کتنے انعامات کر رکھے ہیں، تیرے اوپر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے، تجھ سے صرف یہ مطالبہ ہے کہ میری خاطر ناجائز خواہشات سے اپنے آپ کو تھوڑی دیر کے لئے بچالے، اور جب تو اپنے آپ کو اس سے بچائے گا تو میں تجھ سے یہ وعدہ کر رہا ہوں کہ:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (سورۃ الروم:٦٩)

یعنی جو لوگ ہمارے راستے میں تھوڑی سی کوشش کریں گے تو ہم ضرور بالضرور ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستوں پر لے جائیں گے۔

خواہشات کو روکنے کے لئے یہ تصور مفید ہے

لہٰذا تھوڑی سی قربانی دینی ہوگی، یہ جنت اتنی سستی نہیں ہے، اور یہ محبت اتنی سستی نہیں ہے، اور وہ قربانی یہ ہے کہ نفس کو ناجائز خواہشات سے روکنے کی

عادت ڈالو، اور اس کام میں آسانی پیدا کرنے کے لئے یہ تصور کرو کہ یہ دنیا ہے، یہ جنت نہیں ہے، اور اس دنیا کے اندر بڑے سے بڑا انسان چاہے وہ بڑے سے بڑا حاکم ہو، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو، اور دولت مند ہو، کیا وہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ میری مرضی کے موافق ہو رہا ہے، بلکہ اس دنیا میں ہر انسان پر اس کی مرضی کے خلاف حالات پیش آتے ہیں، اور آتے رہیں گے، اس سے بچنا ممکن نہیں۔ آج جن کے ہاتھ میں پوری دنیا کی کمان ہے، جن کے پاس دولت کے انبار لگے ہوئے ہیں، نوکر چاکر ہیں، حشم خدم موجود ہیں، اور دنیا بھر کے تمام وسائل ان کو میسر ہیں ان سے جا کر پوچھو کیا تمہاری طبیعت کے خلاف کوئی واقعہ ہوا یا نہیں؟ بسا اوقات ان کی طبیعت کے خلاف اتنی زیادہ باتیں ہوتی ہیں، جتنی ہماری اور آپ کی طبیعت کے خلاف نہیں ہوتیں۔ لہٰذا یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں ہمیشہ خوش رہوں، اور مجھے کبھی کوئی غم اور تکلیف نہ آئے، کبھی کوئی صدمہ نہ پہنچے، اور کبھی کوئی خلاف طبع بات نہ ہو۔ لہٰذا طبیعت کے خلاف تو حالات پیش آئیں گے۔

دو راستے

اب دو راستے ہیں، ایک راستہ تو یہ ہے کہ طبیعت کے خلاف کرنے کے لئے ایسے کاموں کو اختیار کر لو جس کے نتیجے میں اللہ جل شانہ راضی ہو جائیں۔ اور اللہ تعالیٰ فرمائیں کہ دیکھو! یہ ہے میرا بندہ، جس نے میری خاطر اپنی طبیعت کے تقاضے کو پامال کر دیا۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرتے رہو،

اس کی کوشش کرتے رہو، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تم ساری زندگی خواہشات کو پورا کرنے میں لگے رہو گے، اور اللہ تعالیٰ سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔ لہٰذا جب خواہشات کے خلاف کام ہونے ہی ہیں، چاہے تم کچھ بھی کرلو، تو پھر اللہ کے حکم کی خاطر خواہشات کے خلاف کام کیوں نہ کرلو۔

یہ تکلیف لذیذ بن جائے گی

اور جب تم ایک مرتبہ یہ تصور کرو گے کہ میں طبیعت کے خلاف یہ کام اللہ جل شانہ کی اطاعت میں کررہا ہوں، تو اس صورت میں وہ تکلیف بھی بالآخر لذیذ بن جائے گی، کیوں؟ اس لئے کہ جب یہ تصور آئے گا کہ میں نے الحمدللہ اپنے محبوب حقیقی کی خاطر اپنے نفس کو پامال کیا ہے تو اس سے طبیعت کو جو انشراح نصیب ہوگا، اور اس سے جو نور پیدا ہوگا، اس سے جو فرحت اور انبساط پیدا ہوگا، اس کے سامنے دنیا کی ہزاروں لذتیں قربان ہیں۔

اللہ تعالیٰ ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ ہے

اللہ تعالیٰ تم سے یہ چاہتے ہیں کہ کبھی کبھی میرا بندہ اپنے دل پر چوٹ مارا کرے، مثلاً ایک کام کرنے کو دل چاہ رہا ہے، لیکن اپنے دل پر چوٹ کار کر رک گیا، اور جب اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنے دل پر چوٹ مار لی تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس دل میں آکر بیٹھوں گا، یہ دل میری تجلی گاہ ہوگا، چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ

یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے ساتھ ہیں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں۔
اب دل کا ٹوٹنا دو طرح سے ہوتا ہے، ۱۔ یا تو غیر اختیاری طور پر دل ٹوٹے ہوئے ہیں، اس لئے کہ ان کے ساتھ مصائب پیش آئے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کے ساتھ ہوں، ۲۔ دوسرے معنٰی یہ ہیں کہ دل میں گناہ کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی تھی، لیکن انہوں نے اپنی خواہشات کو پامال کر کے اپنا دل توڑا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

یہ دل ان کی تجلی گاہ ہے

اس بات کو کہنے کے لئے اقبال مرحوم نے بڑا خوبصورت شعر کہا ہے کہ:

تو بچا بچا کہ نہ رکھ اسے کہ یہ آئینہ ہے وہ آئینہ
جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

یعنی ایسا نہ کر کہ تیرا دل بچا رہے، اور اس میں جو خواہش پیدا ہو رہی ہے تو اس کو ہمیشہ پورا کرتا رہے، تو ایسا نہ کر، اس لئے کہ جس ذات نے یہ دل کا آئینہ بنایا ہے، اس ذات کا کہنا یہ ہے کہ جتنا یہ دل کا آئینہ ٹوٹے گا اتنا ہی یہ محبوب ہوگا، اتنا ہی میں اس دل کا ساتھی بنوں گا۔ یہ "دل" اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے بنایا ہے، یہ "دل" انہی کی تجلی گاہ ہے، اس میں کسی دوسری چیز کی شمولیت اللہ تعالیٰ کو گوارہ نہیں ہے، اور یہ "دل" اللہ تعالیٰ کے لئے اس وقت بنتا ہے جب خواہشات کے شیشے توڑے جاتے ہیں۔

ہم اس گھر میں رہیں گے جسے برباد کیا

میں نے بھی ایک شعر کہا تھا، ہمارے بزرگ حضرت حکیم محمد اختر صاحب دامت براکاتہم اس شعر کو بہت پسند کرتے ہیں، اور اپنی مجلسوں میں سنایا کرتے ہیں، وہ یہ کہ:

دردِ دل دے کے مجھے اس نے ارشاد کیا
ہم اسی گھر میں رہیں گے جسے برباد کیا

دل کو برباد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خواہشات کو اللہ کے لئے پامال کریں، دل میں گناہوں کے تقاضے اٹھ رہے ہیں، دل میں گناہوں کے داعیے پیدا ہو رہے ہیں، اور چاروں طرف سے گناہ کے محرکات گناہ کی طرف بلا رہے ہیں، لیکن میں نے اپنے اللہ کی خاطر اس دل کو توڑ کر برباد کیا، تو پھر اللہ تعالیٰ اس دل میں مقیم ہوتے ہیں، پھر وہ دل اللہ تعالیٰ کی تجلی گاہ بنتا ہے۔

محبت سے طاعت، طاعت سے محبت کا نتیجہ

اسی بات کو حضرت والا یہاں فرما رہے ہیں کہ جب پہلے اطاعت کرنے کے لئے تھوڑی سی قربانی دو گے، تھوڑا سا آگے بڑھو گے، اور خواہشات کو پامال کرنے کی کوشش کرو گے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنی "محبت" عطا فرمائیں گے، یہ ان کا وعدہ ہے، ممکن نہیں ہے کہ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا نہ ہو، اور جب "محبت" پیدا ہو جائے گی تو اس "محبت" کے نتیجے میں جو کام پہلے بھاری اور مشکل معلوم ہو رہے تھے، وہ آسان نظر آئیں گے، اور مزید "طاعت"

ہوگی اور جب مزید "طاعت" ہوگی تو "محبت" اور بڑھے گی، اور "محبت" میں اضافہ ہوگا، اور جب "محبت" میں اضافہ ہوگا تو اور "طاعت" آئے گی، اور یہ سلسلہ مرتے دم تک چلتا رہے گا، یہاں تک کہ موت کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ پیغام آجائے گا کہ:

يَاأَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ٥ ارْجِعِيْ إِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ٥فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ ٥وَ ادْخُلِيْ جَنَّتِيْ (سورۃ الفجر: ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۰)

اے اطمینان والی جان: آج اپنے پروردگار کی طرف آجا، جس کی محبت میں تو نے زندگی کے دن رات گزارے ہیں، آج آکر میرے بندوں میں شامل ہوجا، اور میری جنت میں داخل ہوجا۔ یہ ہے انجام اس سارے تسلسل کا، یعنی طاعت سے محبت، اور محبت سے طاعت، پھر طاعت سے محبت، پھر محبت سے طاعت، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس مقام تک پہنچادیتے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں اس راستے پر لگادے، آمین۔

اطاعت کا آسان نسخہ، اتباع رسول

اسی طاعت کا سب سے آسان اور مختصر نسخہ وہ ہے جو قرآن کریم نے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے کا بتایا ہے، وہ یہ ہے کہ فرمایا:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ

(سورۃ ال عمران: ۱۳)

اللہ تعالیٰ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمارہے ہیں کہ ان سے کہہ

دو، یعنی تمام ایمان والوں سے کہدو کہ اگر تم واقعی اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہو۔ اس کا ایک ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو، تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ تم میری اتباع کرو، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پھر اللہ تعالیٰ تم سے محبت کریں گے۔

حضور کی اتباع کرو، اللہ تعالیٰ محبت کریں گے

بظاہر تو یوں کہنا چاہئے تھا کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو اس کا آسان راستہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی محبت تمہارے دل میں پیدا ہو جائے گی، اور تم اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے لگو گے۔ لیکن اس طرح نہیں فرمایا۔ بلکہ یہ فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا ارادہ ہے تو میری اتباع کرو، تو اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔ اس طرح کیوں فرمایا؟ دراصل اس سے اشارہ اس طرف فرمادیا کہ ارے تم کیا اللہ تعالیٰ سے محبت کروگے، تم کہاں، اللہ میاں کہاں، اس لئے کہ تمہارا وجود ناقص، تمہاری ذات ناقص، تمہاری ذات متناہی، جبکہ اللہ تعالیٰ کی ذات واجب الوجود، غیر متناہی، تم کیسے اللہ تعالیٰ سے محبت کروگے؟ اور تمہیں اللہ تعالیٰ کی حقیقی محبت اور اس کے اندر کمال کیسے حاصل ہوسکتا ہے؟ البتہ جب تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کروگے تو پھر اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا، اور پھر اس کی محبت کا عکس تمہارے دلوں پر پڑے گا، اس عکس کو اللہ تعالیٰ کی محبت کہیں گے۔

محبت پہلے محبوب کے دل میں پیدا ہوتی ہے

کسی فارسی شاعر نے اسی بات کو شعر میں کہا ہے کہ:

عشق اوّل در دلِ معشوق پیدا می شود

یعنی پہلے محبوب اور معشوق کے دل میں محبت پیدا ہوتی ہے، اور پھر محبوب کی محبت کا عکس محب کے دل پر پڑتا ہے، اس طرح محبت محبّ کی طرف منتقل ہوتی ہے۔ یہی معاملہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا ہے، کیونکہ جس ذات کو دیکھا نہ ہو، جس کی معرفت کاملہ حاصل نہ ہو تو اس ذات سے انسان کیسے محبت کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی ذات ہمارے تصور اور خیال سے ماوراء ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ پہلے میں تم سے محبت کروں گا، اور جب میں محبت کروں گا تو میری محبت کا عکس تمہارے دل میں آئے گا، اور پھر تم اللہ سے محبت کرو گے۔

ہر کام میں حضور کی اتباع

بہر حال! قرآن کریم نے یہ حقیقت بتادی کہ اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کا بہترین اور آسان ترین راستہ ''اتباع سنت'' ہے، ہر کام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع ہے، اپنی چال ڈھال میں، اپنی وضع قطع میں، اپنی بول چال میں، اپنی صورت و سیرت میں، اپنی کردار میں، اٹھنے بیٹھنے میں، کھانے پینے میں، معاملات میں، معاشرت میں، ایک دوسرے کے ساتھ میل جول میں، اخلاق میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ''سنت'' اختیار کرلو، جوں جوں ''سنت'' کی اتباع کرتے جاؤ گے، اتنی ہی اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھتی جائے گی۔

کوئی ''سنت'' چھوٹی نہیں

ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کوئی بندہ جس کسی وقت بھی کس سنت پر عمل کر رہا ہوتا ہے، چاہے وہ سنت دیکھنے میں چھوٹی نظر آ رہی ہو، ویسے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی سنت چھوٹی نہیں، ہر سنت عظیم الشان ہے۔ اس وقت وہ بندہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہوتا ہے، مثلاً مسجد میں داخل ہوتے ہوئے تم نے دایاں پاؤں پہلے اندر رکھا یہ سوچتے ہوئے کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور مسجد میں داخل ہوتے وقت وہ دعا پڑھی جو مسنون ہے، "اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِیْ اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ" اگرچہ یہ چھوٹا سا عمل ہے، لیکن جب اتباع سنت کی خاطر تم یہ عمل کر رہے ہو تو جس وقت یہ عمل کر رہے ہو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو۔

اس وقت تم اللہ کے محبوب بن رہے ہو

یا مثلاً تم بیت الخلاء میں داخل ہو رہے ہو، داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں اس نیت سے داخل کیا کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور داخل ہونے سے پہلے مسنون دعا پڑھ لی تو اس وقت تم اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو، بیت الخلاء سے باہر نکلتے وقت دایاں پاؤں اس نیت سے باہر نکالا کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اور باہر نکل کر مسنون دعا پڑھ لی تو تم اس وقت اللہ تعالیٰ کے محبوب بن رہے ہو، اس لئے کہ تم اللہ کے محبوب کی سنت پر عمل کر رہے ہو۔ لہٰذا جتنا جتنا تم اتباع سنت میں بڑھتے چلے جاؤ گے، اللہ تعالیٰ کی محبت

بڑھتی چلی جائے گی، اور اس کے نتیجے میں دین پر عمل کرنا مزید آسان ہوتا چلا جائے گا۔

وہ سنتیں جس میں کوئی مشقت نہیں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتیں تو بے شمار ہیں، اور ہر شعبہ زندگی میں ہیں، لیکن بہت سی سنتیں ایسی ہیں کہ ان کو اختیار کرنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا، نہ وقت لگتا ہے، نہ پیسے لگتے ہیں، نہ محنت صرف ہوتی ہے، صرف دھیان کی بات ہے، جیسے ابھی بتایا کہ سنت یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوتے وقت دایاں پاؤں داخل کرو، اور نکلتے وقت بایاں پاؤں نکالو، بتاؤ! اس پر عمل میں کیا تکلیف ہے؟ کتنا وقت صرف ہوتا ہے؟ کتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں؟ کتنی محنت لگتی ہے؟ ارے بھائی! پاؤں تو نکالنا ہی ہے، صرف دھیان کرنے کی بات ہے، دھیان نہ کرنے کے نتیجے میں سنت کی برکت اور رحمت سے محروم ہو جاتے ہیں، کوئی اگر یہ سوال کرے کہ کیا دایاں پاؤں مسجد سے نکالنا گناہ ہے؟ یہی جواب دیا جائے کہ گناہ نہیں، کیا فرض و واجب ہے کہ بایاں پاؤں ہی پہلے نکالو؟ نہیں، فرض و واجب بھی نہیں، لیکن اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں ایک بڑی رحمت سے محرومی ہے، اس لئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے نتیجے میں جو رحمتیں نازل ہوتی ہیں، اور جو اللہ تعالیٰ کی محبوبیت حاصل ہوتی ہے، اس نعمت سے محرومی ہے۔ اسی طرح کھانا کھاتے وقت کی سنت یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے کھانا کھاؤ، اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا شروع کرو، اور جب کھانا کھا چکو تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو،

اور دعا پڑھو، کیا ایسا کرنا فرض و واجب ہے؟ نہیں، ایسا نہ کرنا گناہ ہے؟ نہیں، گناہ بھی نہیں، اللہ تعالیٰ کے یہاں نہ کرنے پر کوئی پکڑ بھی نہیں، لیکن نہ کرنے کے نتیجے میں انسان اپنے آپ کو ایک عظیم نعمت سے محروم کر رہا ہے، جو نعمت مفت میں حاصل ہو رہی تھی۔

سنتوں کی ڈائری

لہٰذا ہر انسان اپنی زندگی کا ذرا جائزہ لے، اور یہ دیکھے کہ میں کہاں کہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو چھوڑے ہوئے ہوں، ہمارے حضرت والا کی کتاب ہے "اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم" حضرت فرمایا کرتے تھے کہ میں نے تمہارے لئے ڈائری بنادی ہے، اس کتاب کو سامنے رکھ کر اپنا جائزہ لیتے رہو کہ کہاں کہاں میں سنت پر عمل کر رہا ہوں، اور کہاں کہاں چھوڑے ہوئے ہوں، بس، جہاں عمل چھوڑے ہوئے ہو، وہاں عمل کرنا شروع کردو، بے شمار سنتیں ایسی ہیں جو صرف تمہارے دھیان کی منتظر ہیں، اس میں نہ محنت، نہ مشقت، نہ پیسہ، نہ وقت کچھ بھی خرچ نہیں ہوتا، البتہ کچھ سنتیں ایسی ہیں جو کچھ وقت اور محنت کا تقاضا کرتی ہیں، تھوڑی سے محنت کرلو گے تو ان پر بھی عمل ہو جائے گا۔

جب تک بازار میں لوکی ملے ضرور لاؤ

ہمارے حضرت والا یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ میں نے اپنے گھر میں دیکھا کہ دستر خوان پر لوکی کی ترکاری یا سالم

ضرور ہوتا تھا، کئی دن تک دیکھتا رہا کہ روزانہ لوکی کی ترکاری ضرور ہوتی ہے، میں ایک دن اہلیہ سے پوچھا کہ کیا وجہ ہے آپ کئی روز سے لوکی کی ترکاری مسلسل پکا رہی ہیں، انہوں نے جواب دیا کہ میں ایک کتاب میں پڑھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو لوکی بہت پسند تھی، اس لئے میں نے سودا لانے والے سے کہہ دیا ہے کہ جب تک بازار میں لوکی ملے تو ضرور لوکی لایا کرو، تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس عمل کی کچھ اتباع نصیب ہو جائے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب میں نے اپنی اہلیہ کی یہ بات سنی تو مجھے لرزہ سا آ گیا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی سنت جو نہ فرض ہے، نہ واجب ہے، بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محض ایک عادت ہے، اس عورت کو تو اس سنت کا اتنا اہتمام ہے، اور ہم اپنے آپ کو عالم کہلاتے ہیں، لوگ ہمیں عالم کہتے ہیں، سمجھتے ہیں، لیکن ہمیں حضور کی سنت کا اتنا اہتمام نہیں۔

تین دن تک زندگی کا جائزہ

اس کے بعد میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ جب تک میں اپنی ساری زندگی کا جائزہ لے کر نہیں دیکھوں گا کہ میں کہاں کہاں حضور کی سنت پر عمل نہیں کر رہا ہوں، اس وقت تک آگے نہیں بڑھوں گا، چنانچہ زندگی کا جائزہ لینے میں تین دن لگائے، اور یہ دیکھا کہ کہاں کہاں میں اتباع سنت سے محروم ہوں، اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے راہِ عمل واضح ہو گیا، اور جو سنتیں چھوٹی ہوئی تھیں، اللہ تعالیٰ نے ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرما دی۔ بہر حال! یہ اتباع سنت ایسی چیز

ہے کہ جتنا بھی آپ اس کی طرف بڑھیں گے، اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں سمائے گی۔

یہ طعنے گلے کا ہار ہیں

بسا اوقات جب آدمی اتباع سنت کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کو طعنے بھی دیے جاتے ہیں، اس پر فقرے بھی کسے جاتے ہیں، بعض اوقات اس کا مذاق بھی اُڑایا جاتا ہے، ان فقروں اور طعنوں کی وجہ سے بعض لوگ کمزور پڑ جاتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے کہ:

یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ

(سورۃ المآئدۃ: ۵۴)

یعنی یہ لوگ اللہ کے راستے میں محنت کرتے ہیں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے، دنیا والے لوگ جو چاہیں کہا کریں، چاہے وہ ہمیں "دقیانوس" کہیں، یا ہمیں "رجعت پسند" کہیں، یا "جاہلانہ اسلام والے" کہیں، ارے یہ طعنے تو اللہ کے راستے پر چلنے والے کا ہار ہے، یہ طعنے تو انبیاء علیہم السلام کو دیے گئے، ان کو "بے وقوف" کہا گیا، اور ان انبیاء کے متبعین سے کہا گیا کہ:

اَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ (سورۃ البقرۃ: ۱۳)

کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لائے، یہ سارے طعنے انبیاء علیہم السلام کو بھی ملے ہیں، اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو بھی ملے ہیں، ان کو "پاگل" کہا گیا، ان کو "گمراہ" کہا گیا، لیکن

درحقیقت جب اللہ تعالیٰ کے راستے میں یہ طعنے پڑتے ہیں تو ایک مؤمن کے لئے تمغہ ہے، کہاں تک دنیا والوں کی زبانیں روکو گے؟ کب تک ان کی پرواہ کرو گے۔

قیامت کے روز ایمان والے ان پر ہنسیں گے

لہٰذا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے راستے میں چلو تو طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، کمر کس کر تیار ہو جاؤ، اور یہ سوچو کہ جو طعنہ ہمیں اس راستے میں ملے گا وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے باعث اعزاز ہے، لیکن قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ:

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ

(سورۃ التطفیف: ۳۴)

کہ آج وہ وقت آ گیا کہ آج ایمان والے ان منکرین پر ہنسیں گے، وہ وقت آ کر رہے گا، اس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ لہٰذا دنیا والوں کے طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، اگر تم اللہ کے راستے پر چلنا چاہتے ہو۔

جس کو ہو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

جب اس راستے پر چلے ہو تو ان طعنوں کو برداشت کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل کرم سے اور اپنی رحمت سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

اللہ سے اللہ کی محبت مانگیے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ٦

مجلس نمبر : ٨٨

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

اللہ سے اللہ کی محبت مانگیے

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین و العاقبة للمتقین و الصلوٰة و السلام علیٰ رسوله الکریم و علیٰ آلهٖ و اصحابهٖ أجمعین،امّا بعد!

محبت حاصل کرنے کا پانچواں سبب

گذشتہ چند دنوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے اسباب کا بیان چل رہا ہے، اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کرنے کے پانچ اسباب بیان فرمائے ہیں، ان میں سے چار اسباب کا بیان الحمد للہ تفصیل سے ہو چکا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

آگے پانچواں سبب یہ بیان فرمایا کہ حق تعالیٰ سے دعا کرنا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں، ایک مطلب تو وہ ہے جو کل عرض کیا تھا کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے کچھ نہ کچھ مانگتے رہو، دل ہی دل میں چلتے پھرتے مانگتے رہو، اٹھتے بیٹھتے مانگتے رہو۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ''محبت بھی انہی سے مانگو'' اور کہو کہ یا

اللہ! ہم آپ کی محبت کے محتاج ہیں، آپ ہی اپنی محبت ہمیں دیدیجئے۔ چنانچہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ حُبَّكَ وَ حُبَّ مَنْ يَّنْفَعُنِیْ حُبُّهٗ عِنْدَكَ

اے اللہ! میں آپ سے آپ کی محبت مانگتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی محبت پیدا ہو، اور جس کی محبت آپ کے نزدیک مجھے فائدہ پہنچانے والی ہو، اس کی محبت عطا فرما۔ ایک اور دعا میں آپ نے فرما:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْيَاءِ اِلَیَّ

اے اللہ! اپنی محبت کو دنیا کی ساری چیزوں سے زیادہ محبوب بنادیجئے۔

اللہ کی محبت ان تین چیزوں سے زیادہ

ایک اور دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَ اَهْلِیْ وَمِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ

اے اللہ! اپنی محبت کو مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز بنادیجئے، اپنے گھر والوں سے زیادہ عزیز بنادیجئے، اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دیجئے۔ اس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ٹھنڈے پانی سے محبت اور شوق کا اندازہ ہوتا ہے۔

ٹھنڈا پانی بہت مرغوب تھا

چنانچہ آپ کو ٹھنڈا پانی اتنا مرغوب تھا کہ ''بئر غرس'' جو مدینہ منورہ سے دو میل کے فاصلے پر کنواں تھا، وہاں سے آپ کے لئے پانی لایا جاتا تھا، چنانچہ کسی

اور چیز کے بارے میں احادیث میں یہ منقول نہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو فلاں غذا زیادہ مرغوب تھی، اور وہ غذا فلاں جگہ سے لائی جاتی تھی، صرف پانی کے بارے میں یہ منقول ہے کہ "بُرِ غرس" سے آپ کے لئے لایا جاتا تھا، اس لئے کہ اس کا پانی دوسرے کنوؤں کے مقابلے میں زیادہ ٹھنڈا اور شاید زیادہ میٹھا ہوتا تھا، اور آپ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ وفات کے بعد مجھے غسل بھی اس "بُرِ غرس" کے پانی سے دیا جائے، چنانچہ "بُرِ غرس" کے پانی سے آپ کو غسل کو دیا گیا۔ آپ کو ٹھنڈا پانی اتنا زیادہ پسند تھا اس لئے آپ دعا فرما رہے ہیں کہ اے اللہ! اپنی ذات کو میری جان سے زیادہ محبوب بنا دیجئے، میرے گھر والوں سے زیادہ محبوب بنا دیجئے، اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دیجئے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ سے مانگو کہ یا اللہ! اپنی محبت عطا فرما، اور اپنی محبت کو تمام محبتوں پر غالب فرما۔

جھولی اور پیالہ بھی انہی سے مانگو

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ واقعہ سنایا کرتے تھے کہ ایک دن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجلس میں یہ مضمون بیان فرما رہے تھے کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ سے مانگنی چاہئے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں دینے میں کوئی کمی نہیں۔ وہی بات جو کسی نے کہی ہے کہ:

کوئی جو ناشناسِ ادا ہو تو کیا علاج
ان کی نوازشوں میں تو کوئی کمی نہیں

حضرت نے فرمایا کہ مانگنے میں نقص رہ جاتا ہے، ورنہ اگر انسان مانگے تو

اللہ تعالیٰ کے یہاں دینے میں کوئی کمی نہیں۔ بس میاں! اللہ تعالیٰ کے سامنے جھولی پھیلانے والا چاہئے، پھر اللہ تعالیٰ اس جھولی کو بھر کر ہی بھیجتے ہیں، حضرت مجذوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے سوال کیا کہ حضرت! اگر کسی کے پاس جھولی ہی نہ ہو تو پھر کیا کرے؟ حضرت نے فرمایا کہ جھولی بھی انہی سے مانگے، اور یہ کہے کہ یا اللہ! میرے پاس تو جھولی بھی نہیں ہے، اپنی رحمت سے مجھے جھولی بھی عطا فرما دیجئے، میرے اندر مانگنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے، مانگنے کا سلیقہ بھی عطا فرما دیجئے۔

مانگنے کا طریقہ بھی انہی سے مانگو

چنانچہ ایک دعا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح مانگا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ خَیْرَ الْمَسْئَلَةِ وَخَیْرَ الدُّعَاءِ وَخَیْرَ الْاِجَابَةِ

اے اللہ! میں آپ سے بہترین سوال کرنے کا سوال کرتا ہوں، یعنی میں آپ سے اچھے سوال کروں، اور اچھی باتیں مانگوں، اے اللہ! میں آپ سے یہ مانگتا ہوں کہ مجھے اچھی دعا کرنے کی توفیق ہو، اور اچھی طرح قبول بھی ہو۔ لہٰذا جھولی بھی انہی سے مانگو۔

اچھی دعا مانگنے کی توفیق انہی سے مانگو

جب آپ کسی قبولیتِ دعا کے مواقع میں جائیں، یا قبولیتِ دعا کا موقع آپ کو مل جائے، جس میں دعا کی قبولیت کی امید زیادہ ہوتی ہے، مثلاً افطار کا وقت ہے، یا سحری کا وقت، یا تہجد کا وقت، یا جمعہ کا دن ہے، یا بیت اللہ شریف پر

پہلی نظر پڑنے کا موقع ہے، یا آپ طواف کر رہے ہیں وغیرہ، ایسے مواقع پر دعا کرنے سے پہلے یہ مانگو کہ یا اللہ! مجھے اچھی دعا کرنے کی توفیق دیدے، یعنی ایسی دعا کروں جو میرے دین و دنیا کے لئے فائدہ مند ہو، اور پھر اے اللہ! اس کو میرے حق میں قبول بھی فرما لیجئے۔ لہٰذا ان تمام مواقع قبولیت میں دعا کرنے کی توفیق بھی اللہ ہی سے مانگو۔

بیت اللہ پر پہلی نظر کے وقت دعا

جب آدمی پہلی مرتبہ بیت اللہ شریف کو دیکھتا ہے تو آدمی کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ موقع آرہا ہے، اس موقع پر کیا مانگوں؟ اللہ کے بندوں کے عجیب عجیب مدارک ہوتے ہیں، چنانچہ ایک مرتبہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ اس موقع پر کیا مانگوں؟ امام صاحب نے فرمایا کہ میاں دعا مانگ لینا کہ میں ''مستجاب الدعوات'' بن جاؤں کہ ساری عمر میری ساری دعائیں قبول ہوا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے امام صاحب کے دل میں یہ بات ڈال دی۔ بہر حال! مانگنا بھی ایک ہنر اور ایک فن ہے، جو ہر ایک کو نہیں آتا۔ میرا جب حرمین جانا ہوا، اور بیت اللہ پر نظر پڑی تو میں نے کہا: یا اللہ! میری سمجھ میں تو نہیں آرہا ہے، یا اللہ! جو دعا آپ کے نزدیک میرے حق میں بہتر ہو، وہ دعا میرے دل میں ڈال دیجئے، اور اس طرح دعا کے کرنے کی توفیق دیدیجئے۔ وہی بات جو حضرت والا نے بیان فرمائی کہ جھولی بھی انہی سے مانگو۔ اسی طرح محبت بھی انہی سے مانگو کہ یا اللہ! اپنی محبت میرے دل میں پیدا فرما دیجئے، اور اس محبت کو ساری

محبتوں پر غالب فرما دیجئے۔

اسباب محبت کا خلاصہ

بہرحال! حضرت والا نے اسباب محبت میں چھ باتیں ذکر فرمائیں، (۱) کثرتِ ذکر اللہ (۲) اللہ تعالیٰ کے انعامات کو یاد کرنا (۳) اپنے برتاؤ کو اور حقیقت کو سوچنا (۴) کسی اہل اللہ سے تعلق رکھنا (۵) طاعت پر مواظبت کرنا (۶) اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا۔ ان چھ باتوں سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہوتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی محبت دل میں راسخ ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ان سب باتوں ہمیں عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

محبت کا کوئی خاص درجہ طلب مت کرو

آگے حضرت والا کی مجددانہ باتیں سنئے، فرمایا کہ:

> اس تدبیر میں تو کوئی غلطی نہیں، صرف ایک غلطی علمی محتمل ہے، وہ قابل تنبیہ ہے، وہ یہ کہ اپنے ذہن سے محبت کا کوئی درجہ تراش کر اس کا منتظر رہے، یہ غلطی ہوگی۔
>
> (انفاس عیسیٰ: ۱۹۴)

یعنی یہ باتیں اور محبت پیدا کرنے کے جو اسباب بتائے ہیں، ان کے اندر تو کوئی غلطی نہیں ہے، یہ انشاء اللہ بالکل صحیح ہیں، مستند اور معتبر ہیں، اور انشاء اللہ انہی کے ذریعہ محبت پیدا ہوگی۔ لیکن غلطی اس طرح لگتی ہے کہ ''محبت'' کا کوئی

خاص درجہ اپنی طرف سے تراش کر اس کے انتظار میں آدمی بیٹھ جاتا ہے کہ مجھے محبت کا یہ درجہ حاصل ہونا چاہئے، مثلاً دماغ میں یہ تصور لئے بیٹھا ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے حاصل ہو جائے، یا حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے حاصل ہو جائے، اور حضرت شاہ عبد القادر گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو جو محبت حاصل تھی، وہ مجھے بھی حاصل ہو جائے، گویا کہ ''محبت'' کا ایک درجہ اپنے ذہن سے تراش کر اپنے لئے اس کو تجویز کر لیا کہ مجھے ''محبت'' کا یہ درجہ ملنا چاہئے، اب اس درجے کے انتظار میں بیٹھا ہے، اور پھر جب وہ درجہ محبت کا حاصل نہیں ہوتا تو پھر وہ شخص یا تو اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے، یا محبت پیدا کرنے کی تدبیروں کے صحیح ہونے پر شک کرتا ہے، یا پھر مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

محبت اس کے ظرف کے مطابق دی جاتی ہے

اس لئے یہ فیصلہ کہ کس درجہ کی ''محبت''، تمہیں حاصل ہو؟ تمہیں یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں، یہ فیصلہ وہی ذات کرے گی جو ''محبت'' دینے والی ہے کہ تمہیں کس درجہ کی محبت دینی ہے، اور جس درجہ کی محبت تمہیں دینی ہے، وہی ''محبت'' تمہارے حق میں مفید بھی ہے۔

وہ دیتے ہیں بادۂ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

''ظرف'' کے حساب سے چیز دی جاتی ہے، تمہارا ''ظرف'' جتنا ہے، اتنی ''محبت''، تمہیں ملے گی، باقی تم اپنی طرف سے محبت کا ایک درجہ تراش کر یہ کہو

کہ یہ درجہ محبت کا مجھے ملنا چاہئے، اس کے مطالبے کا تمہیں کوئی حق نہیں، لیکن محبت کا جو درجہ تمہیں ملے گا، انشاء اللہ تمہارے حق میں وہ کافی ہوگا، بشرطیکہ ان تدبیروں پر عمل کرلیا۔

ناشکری اور مایوسی کا شکار ہوجاؤ گے

ہوتا یہ ہے کہ ہم لوگ ایک طرف تو بزرگوں کی بتائی ہوئی تدبیروں پر عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں، اور دوسری طرف اپنے لئے کوئی اعلیٰ درجہ تجویز کر لیتے ہیں کہ یہ میری منزل ہے، اور مجھے اس منزل پر پہنچنا ہے، ان تدبیروں پر عمل شروع کرنے کے بعد جب وہ مطلوب منزل بہت دور نظر آتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اب تک جو کچھ حاصل ہوا ہے اس کی ناقدری اور ناشکری شروع کر دیتے ہیں، اور چونکہ وہ مطلوب منزل حاصل نہیں ہو رہی ہے، اس لئے مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں، اور پھر اس مایوسی کے نتیجے میں ان تدابیر کو چھوڑ دیتے ہیں، اور عمل کرنا ترک کر دیتے ہیں۔ اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی درجہ تجویز مت کرو، اگر تدبیریں صحیح ہیں تو انشاء اللہ ان سے نتیجہ ضرور حاصل ہوگا، چاہے اس درجہ کا نتیجہ نہ ہو جو تم نے اپنے لئے تجویز کر رکھا ہے، البتہ تمہارے حق میں جتنا مفید ہے اتنا ضرور حاصل ہوگا، کسی نے خوب کہا ہے کہ:

بر صراط مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جب اس راستے پر آگئے تو انشاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی، بس اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں، جو کچھ تمہیں ملا ہے، اس پر شکر ادا کرو، اور تدبیروں میں

لگے رہو، تمہارے لئے اتنا کافی ہے۔

میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر بڑا عجیب وغریب ہے، کوئی دوسرا شخص اس شعر کو اس وقت تک سمجھ ہی نہیں سکتا جب تک یہ مضمون اس کے سامنے نہ ہو جو میں بیان کر رہا ہوں، فرماتے ہیں کہ:

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مئے
میرے پیمانے میں لیکن حاصل میخانہ ہے

یعنی مجھ کو اس سے کیا غرض کہ دوسرے لوگوں کو کیا ملا، اور کیا نہیں ملا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے جو کچھ عطا فرمایا ہے، میرے لئے تو مناسب وہی ہے، اور حاصل بھی وہی ہے۔ لہٰذا اپنے لئے کوئی درجہ تجویز کرنا، اور پھر نہ ملنے پر شکایت پیدا ہونا، مایوس ہونا، یہ سب غلط ہے، جب تدبیریں سب صحیح ہیں تو انشاء اللہ اس کا نتیجہ بھی یقیناً ظاہر ہو رہا ہے۔

ایک خط اور حضرت والا کا جواب

ایک مرتبہ میں نے حضرت والا کو خط میں لکھا کہ فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، فلاں کام مجھ سے نہیں ہوتا، اور جس آدمی سے یہی کام نہیں ہوتے، وہ دنیا میں اور کیا کام کرے گا؟ حضرت والا نے اس آخری عبارت پر لکیر کھینچ کر اس کے سامنے یہ جواب لکھا کہ:

کیا اپنی ذات سے جلیل القدر امور متوقع ہیں؟

یعنی تمہارا یہ فقرہ کہ جس سے یہ کام نہیں ہو سکتے، اس سے کیا کام ہوگا، گویا کہ اپنی ذات سے بہت جلیل القدر امور کی توقع لگائے بیٹھے ہیں کہ ہم تو اس مقام کے آدمی ہیں، لہٰذا اس بلند مقام کے امور ہم سے سرزد ہونے چاہئیں، وہ امور چونکہ نہیں ہو رہے ہیں لہٰذا مایوسی ہو رہی ہے۔

دراصل اس جواب کے ذریعہ یہ تنبیہ فرمادی کہ درحقیقت دل میں اس خیال کے پیدا ہونے کا منشاء کبر ہے، یعنی اپنے لئے بہت جلیل القدر امور تجویز کر رکھے ہیں کہ یہ ہونے چاہئیں، اور جب وہ نہیں ہو رہے ہیں تو اب مایوس ہو رہے ہیں۔ لہٰذا اس کا منشاء حقیقت میں کبر ہے۔

خلاصہ

بہرحال! خلاصہ یہ ہے کہ ''محبت'' کے حصول کی جو تدبیریں بتائی گئی ہیں، ان پر عمل کرو، اور اپنے لئے ''محبت'' کا کوئی درجہ تجویز مت کرو کہ ''محبت'' کے فلاں درجے تک ہمیں پہنچنا ہے، ان تدبیروں کے نتیجے میں ''محبت'' کا جو درجہ تمہیں ملے گا، وہی تمہارے حق میں بہتر ہوگا، تم اسی کے مستحق ہوگے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان تدبیروں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین

عبادات میں ذوق وشوق مطلوب نہیں

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ٦

مجلس نمبر : ۸۹

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

عبادات میں ذوق وشوق مطلوب نہیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَ الْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہ الْکَرِیْم وَ عَلٰی آلِہٖ وَ اَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ ،اَمَّا بَعْدُ !

محبت میں بے چین رہوں

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ:

"مجھے اس کا بڑا شوق ہے کہ کسی طرح ہو، اللہ تعالیٰ کی محبت میں "بے چین" رہوں"

اس خط کے جواب میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جملہ تحریر فرمایا کہ:

"مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس "بے چینی" میں چین رہے"

(انفاس عیسیٰ : ۱۹۴)

جواب کچھ اور ہونا چاہئے تھا

یہ جواب جو حضرت والا نے تحریر فرمایا اگر غور کریں تو بڑا عجیب وغریب

جواب ہے، اگر کسی نے یہ جواب نہ پڑھا ہو، اور صرف سوال اس کے سامنے آئے تو جن حضرات نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ اور ملفوظات پڑھے ہوئے ہیں، اور جو لوگ حضرت کے مزاج سے کچھ واقف ہیں، ان کا گمان یہ ہوگا کہ حضرت والا جواب میں یہ فرمائیں گے کہ: یہ کیا تمہیں ''بے چینی'' کا شوق پیدا ہوگیا؟ اس لئے کہ ''بے چینی'' تو ایک غیر اختیاری کیفیت ہے، وہ حاصل ہو کہ نہ ہو، اس کے پیچھے کیوں پڑتے ہو؟ کیونکہ حضرت والا کی تعلیمات کا ایک بہت بڑا اصول یہ ہے کہ آدمی ''اختیاری'' امور کا اہتمام کرے، اور ''غیر اختیاری'' کی فکر میں نہ پڑے، یہ بڑا زرین اصول ہے، اس لئے کہ یہ غیر اختیاری کیفیات کہ کسی وقت عبادت کا ذوق وشوق ہو رہا ہے، کسی وقت ذوق وشوق نہیں ہو رہا، کسی وقت عبادت میں دل لگ رہا ہے، کسی وقت دل نہیں لگ رہا، یہ سب کیفیات آنی جانی ہیں، ان کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں، اصل مقصود ''عمل'' ہے، یہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ اس لئے جو لوگ ''کیفیات'' کے بہت پیچھے پڑتے ہیں، حضرت والا عام طور پر ان کی ہمت افزائی نہیں کیا کرتے۔

ہر مریض کے لئے علیحدہ نسخہ

بہرحال، اگر حضرت والا کا یہ جواب نہ پڑھا ہوتا تو ذہن اس طرف جاتا کہ حضرت والا جواب میں یہ تحریر فرمائیں گے کہ شرعاً یہ کوئی مطلوب بات نہیں کہ آدمی ''بے چین'' رہے۔ لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں پر ان صاحب کو یہ جواب نہیں دیا۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ طبیب کا کام ہوتا ہے کہ وہ آنے والے

مریض کی حالت کے مناسب نسخہ تجویز کرے، یہ نہیں کہ بس ایک ہی نسخہ سب مریضوں کو گھوٹ کر پلا رہا ہے، اس لئے کہ مریض کے حالات کے مناسب ہر مریض کی دوا اور علاج میں فرق ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک مرشد کامل کا کام بھی یہی ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اس آدمی کے موجودہ حالات میں یہ بات اس کے مناسب ہوگی یا نہیں؟ یہی ملکہ اللہ تعالیٰ مرشد کامل کو عطا فرماتے ہیں، اور ہم جب اس مرشد کامل کے پاس جاتے ہیں تو وہ ہمارے حالات کے لحاظ سے جواب دیتا ہے۔

''وارد'' اللہ کا مہمان ہوتا ہے

یہاں پر حضرت والا نے اس خط کے جواب میں یہ نہیں لکھا کہ ''تمہیں یہ بے چین ہونے کا شوق کیوں پیدا ہوا؟ اس کی کیا ضرورت ہے؟'' یہ جواب کیوں نہیں لکھا؟ اس کی وجہ غالباً یہ ہے- واللہ سبحانہ اعلم- کہ حضرت والا نے یہ محسوس فرمایا کہ اس آدمی کے دل میں جو یہ شوق پیدا ہوا ہے، یہ بھی اس شخص کے حق میں ایک ''وارد قلبی'' ہے، اور حضرات صوفیاء کرام رحمۃ اللہ علیہم یہ فرماتے ہیں کہ من جانب اللہ قلب پر جو ''واردات'' ہوتے ہیں، ان ''واردات'' کی ناقدری نہ کرو، اس لئے کہ یہ ''واردات'' اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے مہمان ہوتے ہیں، اگر اس مہمان کی خاطر تواضع کروگے تو یہ مہمان بار بار آئے گا، اور اگر تم نے اس مہمان کی خاطر تواضع نہ کی، بلکہ ناقدری کر دی تو یہ مہمان روٹھ کر بھاگ جائے گا، پھر نہیں آئے گا۔

شریعت میں تو ''چین'' مطلوب ہے

اب اگر اس شخص کو جواب میں یہ لکھ دیتے کہ تیرا اس بے چین رہنے کا خیال درست نہیں ہے، تو اس صورت میں یہ ''وارد'' جو اس کے قلب پر وارد ہو رہا ہے، اس کی مخالفت کرنے سے اس کا نقصان ہوتا، اور آئندہ یہ ''واردات'' بند ہو جاتے، اور اگر جواب میں اس کی ہمت افزائی فرماتے کہ یہ ''بے چینی'' کا حاصل ہونا تو بڑی اچھی بات ہے، ہم بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں یہ ''بے چینی'' عطا فرما دے، تو یہ جواب شریعت کے خلاف ہوتا، اس لئے کہ شریعت میں ''بے چینی'' مطلوب نہیں، شریعت میں تو ''چین'' اور ''اطمینان'' کا حصول مطلوب ہے، قرآن کریم میں ہے کہ:

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

(:)

یعنی اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا شریعت میں یہ مطلوب نہیں کہ کوئی آدمی ''بے چینی'' کو اپنا مقصود بنا لے، بلکہ شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی ''اطمینان'' اور ''چین'' کو مقصود بنائے، اسی لئے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی:

'' اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ رَحْمَۃً مِنْ عِنْدِکَ تَجْمَعُ بِھَا اَمْرِیْ وَتَلُمُّ بِھَا شَعْثِیْ ''

یعنی اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رحمت کا سوال کرتا ہوں، جس کے نتیجے میں مجھے جمعیت خاطر اور سکونِ خاطر حاصل ہو جائے، اور میری پراگندی کو جمعیت سے

بدل دیجئے۔ معلوم ہوا کہ شریعت میں اطمینان اور چین مقصود ہے، بذات خود ''بے چینی'' مقصود نہیں۔

عجیب وغریب جواب

بہرحال، اگر اس خط کے جواب میں پہلی بات لکھ دیتے تو ''طریقت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اور اگر دوسری بات لکھ دیتے تو ''شریعت'' کی خلاف ورزی لازم آتی، اس لئے حضرت والا نے بڑا عجیب جواب یہ دیا کہ ''مگر اس کے ساتھ یہ بھی دعا کرو کہ اس ''بے چینی'' میں چین رہے''۔ اس لئے کہ ''بے چینی'' بذات خود مطلوب نہیں، بلکہ ''چین'' مطلوب ہے، لیکن وہ ''چین'' اللہ تعالیٰ کی محبت کی ''بے چینی'' کے ذریعہ حاصل ہو، یعنی اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضطراب ہو، اور اس اضطراب ہی میں اسے ''چین'' مل جائے۔

ہم اضطراب سے حاصل ''قرار'' کرلیں گے
یہ ''جبر'' ہے تو اسے اختیار کرلیں گے

یہ ''اضطراب'' بذات خود مقصود نہیں، لیکن یہ اضطراب بعض اوقات ''قرار'' پر منتج ہوتا ہے، اور جو آدمی اس راستے سے گزرا نہ ہو، اس کو پوری طرح اس کا ادراک اور احساس اور فہم نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ابتداء محبت میں تو جوش وخروش، اُبال اور بے چینی ہوتی ہے، پھر ایک مرحلہ ایسا آتا ہے کہ اس بے چینی کے اندر ''چین'' آجاتا ہے، اس لئے حضرت والا نے یہ جواب تحریر فرمایا۔

''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی

اس سے پتہ چلا کہ دوسروں کی اصلاح کا کام ہر ایک کے بس کی بات نہیں کہ بس چند اصطلاحات یاد کرلیں، اور لوگوں کی اصلاح کرنی شروع کردی:

هزار نكتهء باريك تر زمو ايں جاست
نه هر كه سر بتراشد قلندری داند

اس لئے یہ بڑا نازک کام ہے، کسی شخص کے لئے یہ فیصلہ کرنا اس کے لئے کیا بات اس وقت فائدہ مند ہوگی، بڑا مشکل کام ہے۔ اسی واسطے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے میں یہ ''خلافت'' اس طرح سستی نہیں بٹتی تھی، جیسا کہ بعض مشائخ کے یہاں رواج ہے کہ جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، جو آرہا ہے، اس کو ''خلافت'' دے رہے ہیں، کسی کو دیکھا کہ وہ نماز وغیرہ پڑھنے لگا ہے، اور اس کے اندر کچھ خشوع وخضوع پیدا ہوگیا ہے، اور کچھ ذکر واذکار کرنے لگا ہے، بس جاتو بھی ''خلیفہ'' ہمارے حضرات کا یہ مزاج نہیں تھا۔

ڈاکٹر بننے کے لئے صحت مند ہونا کافی نہیں

یہ مزاج کیوں نہیں تھا؟ اس لئے کہ خود درست ہوجانا اور بات ہے، اور دوسرے کا علاج کرنا اور بات ہے، ہر صحت مند شخص ''ڈاکٹر'' نہیں ہوتا، صحت مند شخص کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس کے اندر کوئی بیماری نہیں ہے، کوئی خرابی نہیں ہے، بہت تندرست ہے، لیکن وہ صحت مند دوسرے بیمار کا علاج کردے، یہ ضروری نہیں۔ اس لئے کہ ''ڈاکٹر'' بننے کے لئے بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے، پاپڑ بیلنے

پڑتے ہیں، اب تک جا کر اس کو ''مطب'' کھولنے کی اجازت ملتی ہے، اب کوئی شخص یہ کہے کہ میں تو بالکل تندرست ہوں، میری ساری رپوٹیں درست ہیں، میرا سارا جسمانی نظام درست ہے، لہٰذا میں ''ڈاکٹر'' بننے کے لائق ہوں، یا کوئی شخص ڈاکٹر کے پاس علاج کے لئے آئے، ڈاکٹر اس کا علاج کرے، اور جب وہ شخص سو فیصد بالکل تندرست ہو جائے تو ڈاکٹر اس کو سرٹیفکیٹ دیدیں کہ تم بھی ڈاکٹر بن جاؤ، اس لئے کہ تم اب تندرست ہو گئے ہو۔

''خلافت'' ایک شہادت اور گواہی ہے

یہی حال یہاں ہے کہ شیخ کے پاس ایک آدمی اپنی اصلاح کے لئے آیا، شیخ نے اس کے حالات کی اصلاح کی، وہ اتباع سنت کی طرف آ گیا، اس کی نماز درست ہو گئی، اس کا روزہ درست ہو گیا، تو محض ان اعمال کے درست ہونے سے وہ ''خلافت'' کا اہل نہیں بن جاتا، اور ''خلافت'' کا مطلب ہے دوسرے کے علاج کرنے کی صلاحیت پیدا ہونا، اور دوسروں کا علاج کرنا، یہ ہر ایک کی بس کی بات نہیں۔

اس لئے ہمارے حضرات کے یہاں ''خلافت'' بہت دیکھ بھال کے بعد جب پورا اطمینان ہو جائے اس وقت دی جاتی ہے، اس لئے کہ ''خلافت'' دینے کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق خدا کے سامنے یہ شہادت اور سرٹیفکیٹ دینا ہے کہ ''ہم نے اس کو اچھی طرح پرکھ لیا ہے، اور جانچ لیا ہے، اور اب یہ شخص تمہارا روحانی علاج یعنی تمہارے امراض باطنی کا علاج کرنے کا اہل ہے'' یہ ''خلافت'' اس بات کا سرٹیفکیٹ دینا نہیں ہے کہ یہ ''تندرست'' ہے، یا متبع سنت ہے، لہٰذا جب تک یہ

اطمینان نہ ہو جائے کہ یہ شخص دوسروں کے علاج کے لائق ہے اور یہ شخص طالبین اور اصلاح کے لئے آنے والوں کو ان کے مزاج اور ان کی ضرورت کے مطابق اس کی حاجت کے مطابق نسخہ تجویز کر سکتا ہے، اس وقت تک یہ ''شہادت'' دینا جائز نہیں۔

ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے

بزرگوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں، بعض بزرگوں کا یہ رنگ اور مزاج ہوتا ہے کہ جب اس شخص کو ہم ''خلافت'' دیدیں گے تو اللہ تعالیٰ اس کو قابل بھی بنا دیں گے، لیکن ہمارے حضرات یہ خطرہ مول نہیں لیتے، ہمارے حضرات یہ کہتے ہیں کہ جب تک یہ اطمینان نہیں ہو جائے گا، اس وقت تک یہ خطرہ مول نہیں لیتے، اس لئے کہ اگر کسی نے یہ اصول تو یاد کر لیا کہ ''فلاں چیز محمود ہے، اور فلاں چیز مذموم ہے'' تو بس وہ ہر جگہ یہ اصول چلائے گا، حالانکہ اتنی بات کافی نہیں، بلکہ ایک آنے والے کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس کے لئے کیا مناسب ہے؟ اور کیا مناسب نہیں۔ لہٰذا دوسروں کی اصلاح کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

''خلافت'' کا خیال بدترین حجاب ہے

حضرت والا نے یہ بھی فرمایا کہ جب کسی شیخ کے پاس علاج کے لئے جاؤ تو بس اپنے علاج کی طرف متوجہ رہو، اس فکر میں مت رہو کہ فلاں درجہ مجھے حاصل ہو جائے، فلاں مقام حاصل ہو جائے، بلکہ شیخ کے حکم کی تعمیل میں اور اس کی نگرانی میں نتائج اور ثمرات سے بے فکر ہو کر عمل کرتے رہو۔ بعض لوگ جب کسی شیخ کے پاس اپنی اصلاح کے لئے جاتے ہیں تو ان کے حاشیہ خیال میں یہ بات رہتی ہے کہ یہ شیخ

مجھے کسی وقت ''خلافت'' دیدے گا، یہ ''خیال'' اصلاح کے راستے میں بدترین حجابؒ ہے، اس خیال کے ہوتے ہوئے کبھی اصلاح مکمل ہو ہی نہیں سکتی، بلکہ ''اصلاح'' کا امکان ہی نہیں۔ اس لئے کہ اس صورت میں اپنی اصلاح کرانے کی نیت میں اخلاص ہی نہیں، بلکہ نیت یہ ہے کہ خاص منصب حاصل ہو جائے، گویا کہ اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کیا، اور اپنی اصلاح میں طلب صادق نہیں تھی، اور جب طلب صادق نہیں ہوتی اور اللہ کے لئے شیخ سے تعلق قائم نہیں کرتا تو شیخ کے پاس جانے کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔

لہٰذا جب کبھی شیخ کے پاس جاؤ تو اس خیال سے ذہن کو خالی کر کے جاؤ، صرف اپنی اصلاح کی غرض سے جاؤ، نہ کوئی خاص درجہ حاصل کرنا مقصود ہو، اور نہ کوئی مقام حاصل کرنا مقصود ہو۔

عبادت میں شوق، ولولہ، لذت مطلوب نہیں

آگے حضرت والا ایک اور ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> ''شوق'' بمعنیٰ ''ولولہ'' نہ بالذات مطلوب ہے، نہ شرائط قبول سے ہے، اخلاص کے ساتھ عمل ہونا کافی ہے، گو ''ولولہ'' نہ ہو، بلکہ طبعاً گرانی ہو، حدیث: اسباغ الوضوء علی المکارہ، اس کی نقلی دلیل ہے، جس سے دعاء مذکورہ سے زائد یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایسے ''مکارہ'' سے اجر وفضل

بڑھ جاتا ہے، اور عقلی حقیقت اس کی یہ ہے کہ طاعات بعض کے لئے مثل ''غذا'' کے ہیں، اور بعض کے لئے مثل ''دوا'' کے، اور ظاہر ہے کہ ''دوا'' کا نافع ہونا اس کی رغبت پر موقوف نہیں ہے، نیز ایسی حالت میں اس کا استعمال اور زیادہ ہمت اور مجاہدہ ہے، اور اس میں حکمتیں بھی ہوتی ہیں، جیسے عجب سے حفاظت، اور اپنے نقص کا مشاہدہ ونحوہما، پس عبد کامل کا مذہب یہ ہونا چاہئے''

بدرد و صاف تراحکم نیست دم درکش
که آنچه ساقی ماریخت عین الطاف ست

(انفاس عیسیٰ : ۱۹۵)

ذوق وشوق محمود ہیں، اخلاص مطلوب ہے

اس ملفوظ میں حضرت والا نے بڑا عجیب اصول بیان فرمادیا ہے، اس میں بہت سے لوگ گمراہ اور پریشان ہوجاتے ہیں، وہ یہ کہ: عبادت میں ذوق وشوق اور ولولہ، یہ نہ تو مطلوب ہے کہ آدمی اس کو اپنا مقصود بنالے کہ میرے اندر شوق اور ولولہ پیدا ہوجائے، اور جوش پیدا ہوجائے، اور نہ ہی اعمال کی قبولیت کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ جب تم جوش کے ساتھ، شوق کے ساتھ عمل کروگے تب یہ عمل قبول

ہوگا، ورنہ قبول نہیں ہوگا۔ شوق کا مطلب یہ کہ نماز کے اندر آپ کو مزہ آنے لگے، اور یہ شوق پیدا ہو جائے کہ جلدی جا کر نماز پڑھوں، اگر یہ شوق و ذوق پیدا ہو جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور اچھی بات ہے، اور محمود ہے، لیکن یہ شوق مقصود بالذات نہیں، اور نہ ہی عمل کی قبولیت کے لئے شرط ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ تو نے جو نماز پڑھی تھی وہ ذوق و شوق کے بغیر پڑھی تھی، لہٰذا تیری نماز قبول نہیں۔ اس لئے کہ نماز کی قبولیت کے لئے ''اخلاص'' شرط ہے، لہٰذا اگر عمل ''اخلاص'' کے ساتھ ہو، اور سنت کے مطابق ہو، بس یہ دو چیزیں اگر عمل کے اندر پائی جائیں گی تو مقصود حاصل ہو جائے گا، اور انشاء اللہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوگا، چاہے وہ عمل کتنی ہی مشقت کے ساتھ کیا تھا، اور اس عمل کے کرنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا، ستی ہو رہی تھی، لیکن آپ نے یہ سوچا نماز تو فرض ہے، جو مجھے پڑھنی ہے۔ یہ سوچ کر بلا شوق اور ذوق کے زبردستی اپنے اوپر جبر کر کے نماز سنت کے مطابق پڑھ لی، چونکہ ''اخلاص'' تھا، اور سنت کے مطابق وہ نماز تھی، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوگی۔ اللہ تعالیٰ یہ نہیں فرمائیں گے کہ چونکہ تم نے طبیعت کی گرانی اور بدشوقی کے ساتھ نماز پڑھی، اس لئے تمہیں سزا ملنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ چیز نہ مقصود ہے، اور نہ ہی شرائط قبول میں سے ہے۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے

البتہ نماز کے اندر ذوق و شوق اور ولولہ محمود ہے، اور اس کی دلیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث ہے کہ جس میں آپ نے فرمایا:

جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِیْ فِی الصَّلَاۃِ

یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز کے اندر وہ لطف اور وہ کیف محسوس ہوتا تھا جو دنیا کی کسی اور چیز میں محسوس نہیں ہوتا تھا، یہ بات آپ کو حاصل نہیں تھی، لیکن آپ نے دوسروں سے یہ نہیں فرمایا کہ جب تک نماز کے اندر تمہیں وہ کیفیت حاصل نہیں ہوگی جو کیفیت مجھے حاصل ہوتی ہے، اس وقت تک تمہاری نماز قبول نہیں ہوگی، بلکہ آپ نے دوسروں سے فرمایا کہ:

"صَلُّوْا كَمَا رَأَيْتُمُوْنِیْ أُصَلِّیْ"

جس طرح تم مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھتے ہو اس طرح نماز پڑھ لو، بس تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔

بلاشوق والا عمل ثواب میں بڑھ جاتا ہے

بعض لوگ اس فکر میں بہت زیادہ پڑے رہتے ہیں کہ نماز میں مزہ نہیں آتا، ذوق وشوق پیدا نہیں ہوتا۔ تو بھائی! مزہ مطلوب ہی کہاں ہے؟ مطلوب اور مقصود تو اللہ کی رضا ہے، اگر وہ حاصل ہو رہی ہے تو پھر مطمئن ہو جاؤ، بلکہ حضرت فرماتے ہیں کہ: بعض اوقات اجر کے اعتبار سے وہ شخص بڑھا جاتا ہے جس نے عبادت کا کوئی عمل ناگواری اور مشقت کے ساتھ کیا، اور اس کو اس عمل میں مزہ بالکل نہیں آیا، دوسرے شخص کے مقابلے میں جس کو عبادت میں بہت مزہ آیا، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِسبَاغُ الوَضُوءِ عَلَی المَکَارِہِ ......فَذٰلِکُمُ الرِّبَاطُ

یعنی جو شخص اس وقت پورا اچھی طرح وضو کرے جس وقت وضو کرنا طبیعت پر بہت شاق اور گراں ہو رہا ہو، اس کو جہاد کا ثواب ملتا ہے، مثلاً سخت سردی اور جاڑے کا موسم ہے، برف گر رہی ہے، پانی بہت ٹھنڈا ہے، گرم پانی کا کوئی انتظام نہیں، نماز کا وقت آچکا ہے، اس وقت میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے، لیکن جو شخص اس مشکل کے باوجود اللہ کا حکم سمجھ کر وضو کرے تو یہ ایسا عمل ہے جیسے جہاد میں رات کو سرحد پر پہرا دینا۔ اب بتایئے! اس وضو کے اندر اس کو کب مزہ آیا؟ معلوم ہوا کہ دل کی گرانی کے ساتھ عمل کرنے میں بعض اوقات ثواب بڑھ جاتا ہے، اس عمل کے مقابل میں جس کو شوق اور ذوق کے کے ساتھ کیا ہو، اس لئے کہ ذوق وشوق والے عمل میں تکلیف اور مشقت نہیں ہوتی۔

جس کو نماز میں مزہ نہ آئے اس کو مبارک باد

اسی لئے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں اس شخص کو مبارک باد دیتا ہوں جس کو ساری عمر نماز پڑھنے میں مزہ نہیں آیا، لیکن پھر بھی اللہ کا حکم بجالانے کی خاطر نماز پڑھتا رہا'' اس لئے کہ اگر نماز میں مزہ آجائے، یہ اچھی بات تو ہے، لیکن اس میں خطرہ بھی ہے، وہ یہ کہ ہوسکتا ہے کہ وہ مزہ کی خاطر نماز پڑھ رہا ہو، اللہ کی رضا کے لئے نماز نہ پڑھ رہا ہو۔ لہٰذا اس بات کا اندیشہ ہے کہ ''اخلاص'' مفقود ہو جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب نماز کے اندر مزہ زیادہ آنے لگتا ہے تو آدمی کے اندر عجب پیدا ہونے لگتا ہے، اور یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ

''میں تو اس مقام تک پہنچ گیا'' اور خود پسندی کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے کہ میں تو اب بزرگی کے اعلیٰ مقام تک پہنچ گیا ہوں، اور اللہ والا بن گیا ہوں کہ یہ عبادات اب میری طبیعت ثانیہ بن گئی ہیں۔ یہ برائیاں انسان کے اندر اس مزہ کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں، اور جس بیچارے کو نماز میں مزہ ہی نہیں آ رہا ہے اس کے دل میں یہ خیالات کہاں سے آئیں گے، اس کو تو یہ فکر ہوگی کہ کہیں میری نماز میرے منہ پر نہ ماردی جائے۔

ریٹائرڈ شخص کی نماز

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ایک بڑی پیاری مثال دیا کرتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ لوگ ''کیفیات'' کو ''روحانیت'' سمجھتے ہیں، یعنی عبادت میں شوق، ذوق، لطف اور مزہ آ رہا ہو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ ''روحانیت'' زیادہ ہے۔ یہ سب باتیں غلط ہیں، بلکہ جس عبادت میں جتنی زیادہ سنت کی اتباع ہوگی، اتنی ہی روحانیت زیادہ ہوگی۔ ان کیفیات کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں۔ پھر ایک مثال دیتے ہوئے فرماتے تھے کہ دو آدمی ہیں، ان میں سے ایک ریٹائرڈ ہے، اور ملازمت سے بالکل فارغ ہے، فارغ زندگی گزار رہا ہے، اور پنشن جاری ہے، اور اس پنشن سے اچھی طرح گزارا ہو رہا ہے، اولاد بھی کما رہی ہے، بچوں اور بچیوں کی شادی کر کے فارغ ہو گیا ہے، اب اس کو کسی چیز کی کوئی فکر نہیں ہے، آرام سے گھر میں فراغت کی زندگی گزار رہا ہے، وہ شخص یہ کرتا ہے کہ اذان سے پہلے ہی وضو کر کے تیار ہو گیا، اور اذان ہوتے ہی مسجد کی طرف روانہ ہو گیا، اور صف اول میں پہنچ

گیا، اور وہاں پہنچ کر اس نے تحیۃ المسجد کی نوافل ادا کیے، اور پھر سنتیں ادا کیں، اور نماز کے انتظار میں بیٹھا ذکر کرتا رہا، اور جب جماعت کھڑی ہوئی تو بڑے اطمینان کے ساتھ خشوع وخضوع کے ساتھ نماز ادا کی، اور پھر اطمینان سے گھر واپس آگیا، اور دوسری نماز کے انتظار اور اس کی تیاری میں لگ گیا۔

ٹھیلے پر سامان بیچنے والے کی نماز

دوسرا آدمی ٹھیلے پر اپنا سامان بیچ کر اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے، سڑک کے کنارے کھڑا ہو کر آواز لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا رہتا ہے، گھر میں دس افراد کھانے والے ہیں، ہر وقت اسی فکر میں لگا رہتا ہے کہ کسی طرح میرا سامان فروخت ہو جائے تو کچھ پیسے کما کر بچوں کی روٹی کا بندوبست کروں۔ اسی حالت اذان ہوگئی، اب گاہک اس سے سامان خرید رہے ہیں، ایک کو کچھ دے رہا ہے، دوسرے کو کچھ دے رہا ہے، لیکن اس کا دماغ اس طرف لگا ہوا ہے کہ اذان ہو چکی ہے، اور مجھے نماز پڑھنی ہے، اب وہ اپنے گاہکوں کو جلدی جلدی نمٹا رہا ہے، جب بالکل عین جماعت کا وقت ہو گیا تو اس وقت اس نے جلدی سے ٹھیلے کو ایک طرف کھڑا کیا، اور اس کے اوپر کپڑا ڈالا، اور بھاگتا ہوا مسجد میں پہنچا، اور جلدی جلدی وضو کیا، اور جماعت میں شامل ہو گیا، اب اس وقت اس کا دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، اور یہ خیال آرہا ہے کہ کہیں کوئی چور ٹھیلا نہ لے جائے، کوئی سامان چوری نہ کر لے، اب اپنی طرف سے اس نے نماز کے اندر دل لگانے کی کوشش کر لی، لیکن ایسے حالات میں نماز پڑھ رہا ہے کہ ان خیالات کی طرف سے دماغ کو

خالی کرنا مشکل ہے، لیکن بہر صورت، اس نے سنت کے مطابق نماز پڑھ لی، اور پھر جلدی سے سنتیں ادا کیں، اور سلام پھیر کر سیدھا اپنے ٹھیلے پر پہنچ گیا، اور کپڑا ہٹایا، اور پھر آوازیں لگانا شروع کر دیں، اور سامان بیچنا شروع کر دیا۔

روحانیت کس کی نماز میں زیادہ ہے؟

حضرت فرماتے ہیں کہ بتاؤ! ان دونوں میں سے کس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے؟ بظاہر تو یہ نظر آرہا ہے کہ پہلا آدمی جو ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا ہے، جس نے بڑے اطمنان اور سکون سے نماز ادا کی تھی، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، لیکن حقیقت میں دوسرا آدمی جو ٹھیلا لگا کر اپنا سامان فروخت کرتا تھا، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔ اس لئے کہ پہلے آدمی کو تو کوئی کام ہی نہیں تھا، اس لئے اس نے اپنے آپ کو نماز کے لئے اور عبادت کے لئے فارغ کر لیا تھا، لہٰذا نماز پڑھنا اس کا کوئی کمال نہیں تھا، بلکہ کمال تو اس ٹھیلے والے کا ہے کہ اس کے گھر میں دس افراد کھانے والے تھے، ان کے لئے روزی کمانی تھی، اور ٹھیلے پر گاہک سامان خریدنے کے لئے کھڑے ہوئے تھے، ایسی حالت میں اذان کی آواز سن کر ٹھیلے کو ایک طرف کر کے مسجد کی طرف نماز کے لئے چلا گیا، اس کی نماز میں زیادہ روحانیت ہے، اس لئے کہ اس نے نماز کے لئے جسمانی اور ذہنی مشقت زیادہ اٹھائی، اس مشقت کی وجہ سے اس کے عمل میں روحانیت زیادہ ہے، اور اس پر اس کو اجر بھی زیادہ ملے گا۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ اگر ذوق وشوق وولولہ اور جذبہ ہوگا تب عبادت قبول ہوگی، ورنہ نہیں، یہ بات درست نہیں ہے۔

وہاں تعمیل حکم کا جذبہ دیکھا جاتا ہے

اللہ تعالیٰ کے یہاں اصل چیز جو دیکھی جاتی ہے، وہ تعمیل حکم کا جذبہ ہے کہ ہم نے بندے کو عبادت کا حکم دیا تھا، یہ بندہ عبادت ادا کرنے کے لئے ہمارے حکم کی تعمیل میں آگیا، اگرچہ حالات نے اس کے دل و دماغ کو منتشر کر رکھا ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاص کے ساتھ آگیا، اور اس نے ہمارے حبیب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق عبادت انجام دے لی، بس اس کی عبادت قبول ہے۔ اس لئے حضرت والا فرماتے ہیں کہ اس ذوق وشوق کے حصول کی فکر میں مت پڑو۔

ساقی جیسے پلادے وہ اس کی مہربانی ہے

ہاں! اگر کسی کو ذوق وشوق کی یہ نعمت میسر آجائے تو اس پر بھی وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ یا اللہ! آپ نے میری اس عبادت کو آسان فرمادیا، اور مجھے عبادت میں لطف اور مزہ بھی آنے لگا، لیکن اس لطف اور مزہ کی طلب میں بہت زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں، چنانچہ آخر میں حضرت والا نے مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شعر لکھا ہے کہ:

بدرد و صاف ترا حکم نیست دم در کش
که آنچه ساقیء ما ریخت عین الطاف ست

یعنی تجھ کو یہ حق نہیں کہ تو ساقی سے یہ مطالبہ کرے کہ مجھے صاف صاف شراب دینا، اور تلچھٹ مت دینا، بلکہ ساقی جیسی شراب بھی تجھ کو دیدے، یہ اس کی عین مہربانی ہے، اب چاہے وہ صاف صاف شراب دیدے، یا تلچھٹ دیدے،

لیکن دیدے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ سے ''عمل'' کی توفیق مانگتے رہو، جب ان کی طرف سے ''عمل'' کی توفیق ہو جائے تو یہ ان کا کرم ہے، چاہے اس ''عمل'' میں مزہ آئے یا نہ آئے، لطف آئے یا نہ آئے، بس! اس پر راضی رہو کہ عمل کی توفیق ہو رہی ہے، اس سے آگے بڑھنے کی فکر مت کرو۔

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ عبادت کے اندر شوق، ولولہ اور مزہ کا آنا مطلوب نہیں، اور عبادت کی قبولیت کی شرائط میں سے نہیں، لہٰذا اس فکر میں پڑے بغیر عبادت کو اخلاص کے ساتھ اور سنت کے مطابق کرنے کی فکر کرو، پھر اگر وہ حاصل ہو جائے تو بہت اچھا، نہ ملے تو کوئی غم نہیں۔ آج بہت بڑی مخلوق اس فکر میں پریشان رہتی ہے کہ ہم نماز پڑھتے ہیں، مگر نماز میں مزہ ہی نہیں آتا۔ اس کی وجہ سے پھر اپنے اعمال کی اور اپنی عبادات کی ناقدری شروع کر دیتے ہیں، ایسا نہیں کرنا چاہئے، عبادت کے اندر دو باتوں کا ہونا کافی ہے، ایک یہ کہ اخلاص ہو، دوسرے یہ کہ سنت کے مطابق ہو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین،

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

محبت طبعی یا عقلی

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ٦

مجلس نمبر : ۹۰

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

محبت طبعی یا محبت عقلی

الحمدللّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبة للمتقین، والصّلوٰۃ والسّلام علی رسولہ الکریم وعلی آلہ و اصحابہ اجمعین امابعد!

وہ آدمی مؤمن نہیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''محبت عقلی یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو شریعت پر عمل کرنے کی طرف متوجہ کرے'' (انفاس عیسیٰ: ۱۹۵)

ایک حدیث میں نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں (یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو اس کے مال سے، اس کی جان سے، اس کی اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ یعنی جب تک یہ کیفیت پیدا نہ ہو جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی محبت انسان کے دل میں اس کے مال و اولاد سے بھی زیادہ نہ ہو جائے، یہاں تک کہ اس کی جان سے بھی زیادہ نہ ہو جائے، اس وقت تک آدمی مؤمن نہیں ہوسکتا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنی بڑی بات ارشاد فرمادی۔

ایمان کے بارے میں خطرہ

جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تو فاروق اعظم حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنا جائزہ لیا تو آپ بیشک مجھے اپنے مال سے بھی زیادہ محبوب ہیں، اپنی اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں، لیکن اپنی جان سے زیادہ محبوب معلوم نہیں ہوتے، اس لئے مجھے اپنے ایمان کے بارے میں بڑا خطرہ ہو گیا ہے۔ اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سینے پر مارا، اور فرمایا کہ کوئی شخص اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کو اس کی جان، مال اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ اس وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: یا رسول اللہ! اَلآن، یعنی اب آپ مجھے میری جان سے بھی زیادہ عزیز ہو گئے۔

مدار ایمان اللہ کی محبت یا رسول اللہ کی محبت

یہ بڑی مشکل حدیث ہے، اور ہم اور آپ کے لئے اس مقام کو سمجھنا آسان نہیں ہے، اس لئے کہ جس مقام سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ

بات ارشاد فرمائی، اور جس مقام سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اشکال کیا، اور جس مقام سے پھر وہ اشکال دور ہوا، یہ سب اتنی اونچی باتیں ہیں کہ ہماری اور آپ کی پرواز وہاں تک مشکل ہے۔ اس حدیث پر پہلا اشکال یہ ہے کہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی محبت کو "مدار ایمان" قرار دیا، اللہ کی محبت کو "مدار ایمان" قرار نہیں دیا، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کو "مدار ایمان" قرار دینا چاہئے تھا۔ اس اشکال کا جواب تو آسان ہے، وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اللہ تعالیٰ کی محبت لازم اور ملزوم ہیں، دونوں محبتیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوسکتیں، جب کسی کے دل میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہوگی تو لازماً اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہوگی، کیونکہ اگر کسی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے تو وہ محبت اللہ ہی کے لئے ہے، کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کا پیغام لے کر ہمارے پاس تشریف لائے، آپ نے اللہ تعالیٰ کے احکام ہم تک پہنچائے، آپ نے ہمیں اللہ تعالیٰ سے روشناس کرایا، آپ نے ہمارا رابطہ اللہ تعالیٰ سے قائم فرمایا۔ لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی وجہ درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی محبت ہے۔

ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے

یہی وجہ ہے کہ کسی کے دل میں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے زیادہ محبت ہے، اور کسی کے دل میں یہ احساس ہوتا ہے کہ مجھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ محبت ہے۔ لیکن حقیقت میں جب ایک کی محبت

ہوگی تو دوسرے کی محبت ضرور ہوگی، چنانچہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ذکر ہے، وہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا بھی ذکر ہے، فرمایا: وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (سورة الاحزاب: ۷۱) لہٰذا اللہ تعالیٰ کی محبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو مستلزم ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اللہ تعالیٰ کی محبت کو مستلزم ہے۔

حضرت رابعہ بصریہؒ اور اللہ کی محبت

حضرت رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا بڑے اونچے درجے کی تابعہ ہیں، خواتین میں جو اولیاء اللہ گزری ہیں، ان میں ان کا بڑا اونچا مقام ہے، ان کے بارے میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی تو اس موقع پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے معاف فرمایئے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی محبت میرے دل میں اتنی زیادہ پیوست ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں اتنی زیادہ مستغرق رہتی ہوں کہ اس کی وجہ سے اکثر و بیشتر اوقات میں میرا آپ کی طرف دھیان نہیں جاتا، اور آپ کی محبت مجھے اپنے دل میں زیادہ محسوس نہیں ہوتی، جتنی محبت اللہ تعالیٰ کی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا کہ اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ تم جو اللہ تعالیٰ کی محبت میں مستغرق رہتی ہو، وہ بھی میری ہی محبت ہے، لہٰذا اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔

دونوں کی محبت کا حاصل ایک ہی ہے

پریشانی کی کوئی بات اس لئے نہیں کہ محبت کے الوان جدا جدا ہوتے ہیں،

کسی وقت اللہ تعالیٰ کی محبت کا جوش، جذبہ اور ولولہ زیادہ محسوس ہوتا ہے، اور کسی وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا جوش، جذبہ اور ولولہ زیادہ محسوس ہوتا ہے، لیکن حقیقت میں ایک کی محبت دوسرے کی محبت کو مستلزم ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمانا کہ میں سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں اس وقت تک تم مؤمن نہیں ہو سکتے، درحقیقت اس کا مطلب یہ ہے کہ یا میں محبوب ہو جاؤں یا اللہ تعالیٰ محبوب ہو جائیں، یا دونوں محبوب ہو جائیں، اس لئے کہ دونوں کی محبت کا حاصل ایک ہی ہے۔ پہلے اشکال کا تو یہ جواب ہو گیا۔

کیا ایمان غیر اختیاری ہے؟

اس حدیث پر دوسرا اشکال وہ ہوتا ہے جس میں علماء کرام بڑے حیران رہے، وہ یہ کہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک میں تمہاری جان، مال اور اولاد سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں اس وقت تک تم مؤمن نہیں، اور محبت ایسی چیز ہے جو اپنے اختیار میں نہیں، اب اگر کسی کے دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس درجے کی نہیں تو اس کا ایمان بھی نہیں، اور جب ایمان نہیں رہا تو وہ ''کافر'' ہو گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایمان بھی اختیاری نہ رہا، اس لئے کہ جب ''محبت'' غیر اختیاری چیز ہے اور ایمان اس ''محبت'' پر موقوف ہے تو پھر ایمان بھی اختیاری نہ رہا۔

ایک لمحہ میں یہ انقلاب کیسے آگیا؟

تیسرا اشکال یہ پیدا ہو رہا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے آدمی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی جان قربان کرنے والے تھے، وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ مجھے اپنی جان سے زیادہ محبوب نظر نہیں آتے۔ پھر دوسرے لمحے میں جب آپ نے اپنا دست مبارک ان کے سینے پر مار کر دوبارہ وہ بات دہرائی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ "اَلْآن" اب آپ سے اپنی جان سے زیادہ محبت ہوگئی، سوال یہ ہے کہ ایک لمحہ میں یہ زبردست انقلاب کیسے آگیا؟

محبت طبعی

علماء کرام نے ان دونوں اشکالات کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں، لیکن حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی جو توجیہ بیان فرمائی ہے، وہ بڑی عجیب وغریب ہے، فرمایا کہ محبت کی دو قسمیں ہیں، ایک محبت طبعی اور دوسری محبت عقلی۔ عام طور پر ہم لوگ جس کو "محبت" کہتے ہیں وہ "محبت طبعی" ہوتی ہے، یعنی طبیعت میں کسی چیز کے ساتھ ایسی محبت ہو جائے کہ اس کی یاد میں آدمی بے چین ہو رہا ہے، اس کا تصور لگائے بیٹھا ہے، ہر وقت اس کو یاد کر رہا ہے، اور جب اس کا تصور آتا ہے تو دل میں ایک جوش اور اُبال پیدا ہوتا ہے، یہ "طبعی محبت" ہے، جیسے باپ کو اپنی اولاد سے ہوتی ہے، اگر بیٹا کہیں دور ہے تو اس کی بار بار یاد آتی ہے، اور اس سے ملنے کو دل چاہتا ہے، تو یہ جو یاد

آ رہی ہے، اور ملنے کو دل چاہ رہا ہے، اور طبیعت اس کی طرف تڑپ رہی ہے، بس یہی ''محبت طبعی'' ہے، یہ ''محبت طبعی'' غیر اختیاری چیز ہے، اس کا کوئی درجہ کسی کو حاصل ہوتا ہے، کسی کو حاصل نہیں ہوتا، کسی کو زیادہ محبت ہوتی ہے، کسی کو کم ہوتی ہے۔

محبت عقلی

دوسری قسم ہے ''محبت عقلی'' اور محبت عقلی کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ دل میں محبت کا جوش اور اُبال تو پیدا نہیں ہو رہا، لیکن جب میں سوچتا ہوں تو دماغ میں یہ بات آتی ہے کہ یہ ذات محبت کے لائق ہے، اور اس ذات سے ضرور محبت ہونی چاہئے، پھر اس محبت عقلی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اس کے حکم کی اطاعت کرتا ہے، اس کے اشاروں کو دیکھتا ہے، اور اس کی ہدایات پر چلتا ہے، اور اس کے کہنے پر عمل کرتا ہے، اسی کا نام ''محبت عقلی'' ہے۔

محبت عقلی کا نتیجہ

اسی لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ:

> ''محبت عقلی یہ ہے کہ انسان اپنی طبیعت کو شریعت پر عمل کرنے کی طرف متوجہ کرے''

کیونکہ یہ شریعت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجی ہوئی ہے، جب میں عقل سے غور کرتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہی شریعت واجب الاتباع ہے، اور اپنی زندگی کو اسی کے مطابق

ڈھالنا چاہئے، اور یہی شریعت میری صلاح و فلاح کی ضامن ہے۔ جب یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تو بس "محبت عقلی" دل میں پیدا ہو گئی۔

محبت عقلی کی مثال

اس "محبت عقلی" کی مثال بلا تشبیہ یہ ہے کہ جیسے ایک آدمی بیمار ہو گیا، اب ڈاکٹر نے اس کے لئے ایک کڑوی دوا تجویز کر دی، یا انجکشن لگانا تجویز کر دیا، ظاہر ہے کہ کڑوی دوا پینے کو یا انجکشن لگوانے کو دل نہیں چاہتا، بلکہ دل یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس انجکشن سے بچ جاؤں تو بہتر ہے، لیکن دل نہ چاہنے کے باوجود وہ شخص اس دوا کو پئے گا، البتہ اس دوا سے اس کو محبت نہیں ہے، چنانچہ جس دن ڈاکٹر اس سے یہ کہہ دے گا کہ اب اس دوا کو پینے کی ضرورت نہیں، اس دن وہ اس دوا کو پھینک دے گا، لیکن جب تک ڈاکٹر نے یہ کہہ رکھا ہے کہ تیری شفاء اس کڑوی دوا میں ہے، ورنہ تجھے شفاء نہیں ہوگی، اس وقت تک وہ بیمار اس دوا کو پیتا رہے گا۔ اب دوا سے اس بیمار کو "محبت طبعی" نہیں، لیکن "محبت عقلی" ہے، لہٰذا طبیعت میں گرانی کے باوجود اس دوا کو پی لے گا۔

یہ مثال "محبت طبعی" کی بلا تشبیہ کے بیان کر دی ہے، اس لئے کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دوا کی محبت کی طرح نہیں ہوا کرتی، صرف محبت عقلی اور محبت طبعی کا فرق سمجھانے کے لئے یہ مثال بیان کر دی، ورنہ کہاں دوا کی محبت اور کہاں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، دونوں کے درمیان کوئی نسبت ہی نہیں۔

غور وفکر کے نتیجے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت

بہر حال! جب آدمی یہ سوچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ میرا خالق ہے، میرا مالک ہے، اس نے اپنے محبوب پیغمبر کو میری ہدایت اور رہنمائی کے لئے بھیجا، آپ نے ہماری ہدایت کے لئے کتنی مصیبتیں جھیلیں، اور کتنی پریشانیاں اٹھائیں، میرے لئے یہ شریعت لے کر آئے، میرے لئے ہدایت کا سامان فرمایا۔ تو اس غور وفکر کے نتیجے میں عقلی طور پر انسان حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے، چاہے اس محبت میں وہ جوش اور ولولہ نہ ہو، جو جوش اور ولولہ اپنے بچے سے محبت میں ہوتا ہے، لیکن عقلی طور پر وہ یہ سمجھتا ہے کہ آپ کی ذات تمام چیزوں سے زیادہ قابل محبت ہے۔

محبت عقلی مطلوب ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ محبت کا جو درجہ مطلوب ہے اور جس کو ایمان کی شرط قرار دیا گیا ہے وہ ''محبت عقلی'' ہے کہ یہ ''محبت عقلی'' حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تمام چیزوں کے مقابلے میں غالب ہونی چاہئے۔ پھر حضرت والا نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کی توجیہ اس طرح فرمائی کہ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ حدیث سنی کہ ''جب تک میں اس کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں، اس وقت تک وہ مؤمن نہیں'' تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شروع میں یہ سمجھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ''محبت طبعی'' کا ذکر فرما رہے ہیں، اور محبت طبعی اس درجے کی حاصل نہیں تھی،

اس لئے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے اپنا اشکال پیش کیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دست مبارک ان کے سینے پر مار کر دوبارہ وہ بات دھرائی، تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بات سمجھ میں آئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ''محبت طبعی'' کے بارے میں نہیں فرما رہے ہیں، بلکہ ''محبت عقلی'' کے بارے میں فرما رہے ہیں، اور وہ ''محبت عقلی'' مجھے حاصل ہے، اس لئے انہوں نے فرمایا ''اَلآن'' یعنی اب بات سمجھ میں آ گئی، اور الحمد للہ اس ''محبت عقلی'' کا وہ درجہ مجھے حاصل ہے۔ یہ وہ توجیہ ہے جو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمائی، حاصل یہ کہ مطلوب ''محبت عقلی'' ہے۔

حضرت شاہ صاحبؒ کی توجیہ

البتہ ایک توجیہ وہ ہے جو حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں جس محبت کا ذکر ہے اس کو ''محبت عقلی'' پر محمول کرنا اس حدیث کے زور کو گھٹا دیتا ہے، اس لئے کہ ''محبت عقلی'' تو یہ ہے کہ دل میں تو اس ذات سے کوئی خاص محبت نہیں ہے، لیکن دلائل سے سوچنے کے نتیجے میں محبت زبردستی کی جاتی ہے، اس لئے اس حدیث میں ''محبت طبعی'' ہی مراد ہے ''محبت عقلی'' مراد نہیں، لیکن وہ ''محبت طبعی'' مراد ہے جو نتیجہ ہوتی ہے ''محبت عقلی'' کا۔

طبعی محبت صغریٰ وکبریٰ کی محتاج نہیں

دیکھئے! ایک ''محبت طبعی'' وہ ہوتی ہے جو کسی تصنع اور تکلف کے بغیر، کسی

دلیل کے بغیر اور غور وفکر کے بغیر طبعًا انسان کے دل میں موجود ہوتی ہے، جیسے بچے سے باپ کو محبت طبعی ہوتی ہے، کیا ایسا ہوتا ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو باپ صغریٰ وکبریٰ نکال کر منطقی طور پر نتیجہ نکالتا ہے کہ یہ بچہ میرا ہے، اور ہر باپ کو اپنے بچے سے محبت کرنی چاہئے، لہٰذا مجھے اس سے محبت ہے، ایسا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ جیسے ہی بچہ پیدا ہوتا ہے، اس سے محبت خود بخود پیدا ہو جاتی ہے، یہ محبت خالصۃً محبت طبعی ہے۔

محبت عقلی کے نتیجے میں محبت طبعی

دوسری ''محبت طبعی'' وہ ہوتی ہے جو ''محبت عقلی'' کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی پہلے ذرا سوچتا ہے، غور وفکر کرتا ہے، پھر جوں جوں وہ غور کرتا ہے تو اس غور کرنے کے نتیجے میں محبت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ لہٰذا اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جس محبت کا ذکر ہے، وہ ''محبت طبعیہ'' ہی ہے، البتہ اس تک پہنچنے کا راستہ ''محبت عقلیہ'' ہے۔ اس لئے اگر کسی کے دل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ''محبت طبعیہ'' پیدا نہیں ہو رہی ہے تو وہ یہ سوچے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس امت کے ایک ایک فرد پر کیا کیا احسانات ہیں، اور محبت کے اسباب پر غور کرے۔

حضور کے اندر محبت کے چاروں اسباب موجود ہیں

چنانچہ ''نشر الطیب'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ محبت کے چار اسباب ہوتے ہیں، اگر کسی سے محبت ہوتی ہے تو انہی اسباب میں سے

کسی سبب کے نتیجے میں محبت ہوتی ہے، (۱) یا تو اس کے جمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے، (۲) یا اس کے کمال کی وجہ سے محبت ہوتی ہے، (۳) یا اس کے نوال (جود وسخاوت) کی وجہ سے محبت ہوتی ہے، (۴) یا اس کے مال کی وجہ سے اس سے محبت ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس میں یہ چاروں اسباب موجود ہیں، اور اس درجے میں موجود ہیں کہ کائنات میں کسی کے اندر بھی اس درجے میں موجود نہیں ہو سکتے، آپ کا جمال تو ایسا تھا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرما رہی ہیں کہ زلیخا کی سہیلیوں نے تو حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے، اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جلوہ جہاں آراء دیکھ لیا ہوتا تو ہاتھ کے بجائے اپنے سینے چیر ڈالتیں۔ اس درجہ کا آپ کا جمال تھا۔ آپ کا کمال اس درجہ کا تھا کہ اس کائنات میں کسی بھی مخلوق کے لئے کمال کا وہ درجہ متصور ہو ہی نہیں سکتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ اور نوال یعنی جود وسخاوت ایسی کہ پیسے کی جود وسخاوت، اموال کی جود وسخاوت، علم کی جود وسخاوت، دین کی جود وسخاوت، پوری امت چودہ سو سال سے آپ کی جود وسخاوت سے سیراب ہو رہی ہے، اور قیامت تک ہوتی رہے گی، اس لئے جب انسان ان اسباب میں غور وفکر کرے گا تو پھر وہ محبت عقلی نہیں رہے گی، بلکہ ''محبت عقلی'' رفتہ رفتہ ''محبت طبعی'' میں تبدیل ہوتی چلی جائے گی۔

ہر مسلمان کے دل میں حضور کی محبت

سچی بات یہ ہے کہ ایک مسلمان چاہے وہ کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو،

فاسق ہو، فاجر ہو، گناہوں کے اندر مبتلا ہو، غنڈہ ہو، آوارہ ہو، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے قلب کے اندر اس درجہ میں جاگزیں ہوتی ہے کہ چاہے وہ نماز نہ پڑھے، روزے نہ رکھے، فرائض سے غافل رہے، لیکن اگر کوئی شخص اس کے سامنے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کردے تو وہ لڑنے مرنے کو تیار ہو جائے گا، اور اپنی جان دیدے گا۔ چنانچہ بعض لوگوں نے جان دیدی، مثلاً غازی علم الدین ابھی کچھ عرصہ پہلے گزرا ہے، اس کے سامنے ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی تو اس نے اس کو قتل کر دیا، جب اس کے خلاف مقدمہ چلا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ تم ایک مرتبہ اتنا کہہ دو کہ میں نے قتل نہیں کیا، یا کچھ تاویل کردو، اس نے جواب دیا کہ میں کیسے تاویل کروں، ساری زندگی میں ایک ہی تو عمل کیا، میرے اعمال نامہ میں تو صرف یہی ایک عمل ہے، کوئی اور عمل ہی ہے نہیں، چنانچہ اس کے خلاف مقدمہ ہوا، اور اس کو پھانسی دیدی گئی، بہر حال! اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں اپنی جان دیدی۔

اختر شیرانی کا واقعہ

اختر شیرانی جو مشہور شاعر ہے، اور بہت آزاد قسم کا شاعر تھا، اور پینے پلانے کا عادی تھا، چونکہ اس کی شاعری مقبول تھی، اس لئے کسی کو خاطر میں نہیں لاتا تھا، ایک مرتبہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا، پینے پلانے کا شغل جاری تھا، لوگ اس کو چھیڑتے تھے، اور نشے کی حالت میں اس سے مختلف

لوگوں کے بارے میں سوال کر کے اس سے بات کہلواتے تھے، چنانچہ لوگ اس سے مختلف لوگوں کے بارے میں پوچھتے رہے کہ تمہارا فلاں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے جواب میں اس پر کوئی فقرہ کس دیا، فلاں کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے اس پر کوئی فقرہ کس دیا، کبھی کسی سیاسی لیڈر کے بارے میں، کبھی کسی شاعر کے بارے میں، کبھی کسی ادیب کے بارے میں اس سے سوال کرتے رہے، وہ ہر ایک پر فقرہ کستا چلا گیا، اسی دوران کسی کمبخت نے اس سے یہ سوال پوچھ لیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ اب ایک طرف تو وہ شراب کے نشے میں ہے، اور دوسری طرف ماحول ایسا بنا ہوا ہے کہ وہ ہر ایک پر فقرے کس رہا ہے، یہ سوال سنتے ہی ایسا معلوم ہوا کہ جیسے ایک دم سے اس کو کرنٹ لگ گیا، اس کے ہاتھ میں ایک گلاس تھا، وہ گلاس اس سوال کرنے والے کے منہ پر پھینک کر مارا، اور کہا: کمبخت! تو مجھ سے میری زندگی کا آخری سہارا بھی چھیننا چاہتا ہے؟ میں بہت گناہ گار سہی، بہت گیا گزرا سہی، لیکن اس ذات اقدس کے بارے میں میرے لئے کوئی کلمہ قابل برداشت نہیں۔ بہر حال! ایک مسلمان کا یہ عالم ہوتا ہے، وہ چاہے کتنا ہی گیا گزرا کیوں نہ ہو، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے دل میں جاگزیں ہوتی ہے، یہ ''محبت'' نری ''محبت عقلی'' نہیں ہوتی، بلکہ یہ ''محبت طبعی'' ہے، لیکن ''محبت عقلی'' کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے، اس حدیث میں یہی محبت مراد ہے۔

محبت اور چیز ہے، جوش وخروش اور

اور پھر حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''محبت'' اور چیز ہے، اور اس کا جوش وخروش اور چیز ہے، بعض اوقات کسی کے ساتھ محبت کا جوش وخروش زیادہ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقی ''محبت'' دوسرے کی زیادہ ہوتی ہے، جیسے اولاد سے باپ کو محبت ہوتی ہے، اس محبت میں جوش وخروش زیادہ ہوتا ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کو پیار کروں، اس کو گود میں لوں، اس کو چمٹاؤں، اس سے باتیں کروں۔ اس کے مقابلے میں باپ سے جو محبت ہوتی ہے، اس میں جوش وخروش نہیں ہوتا، کیا باپ کو چمٹانے، اس کو گود لینے اور اس کو پیار کرنے کا جوش ہوتا ہے؟ نہیں۔ معلوم ہوا کہ باپ سے جوش وخروش کا وہ انداز نہیں ہوسکتا جو بیٹے سے ہوتا ہے، لہٰذا باپ کے ساتھ جوش وخروش تو نہیں، لیکن باپ کی محبت میں بھی کمی نہیں، بلکہ بعض اوقات ماں باپ سے محبت اولاد کی محبت سے زیادہ ہوتی ہے، چنانچہ اگر کبھی دونوں محبتوں میں تعارض ہوجائے تو آدمی ماں باپ کو ترجیح دیتا ہے۔ تو محبت ماں باپ کی زیادہ ہے، اور جوش وخروش اولاد سے زیادہ ہے۔ لہٰذا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت زیادہ ہونی چاہئے، البتہ جوش وخروش کی زیادتی مطلوب نہیں،۔ بہرحال! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ''محبت طبعی'' ہی مطلوب ہے، جو محبت عقلی کے نتیجے میں پیدا ہوئی ہے۔

دونوں کا مقصود ایک ہی ہے

یہ وہ تفصیل ہے جو میں نے حضرت علامہ انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی

عبارت سے سمجھی، واقعہ یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ نے بہت باریک اور بہت اونچی بات بیان فرمائی ہے، اور میں سمجھتا ہوں کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد حضرت شاہ صاحبؒ کی بات سے معارض نہیں ہے، بلکہ شاید دونوں کا مقصود ایک ہی ہے، اس لئے کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ جس کو ''محبت عقلی'' فرما رہے ہیں، اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ وہ محبت عقل واستدلال سے حاصل ہوتی ہے، لیکن وہ محبت بھی دل ہی سے ہوتی ہے، اس لئے کہ ''محبت'' کا محل ''دل'' ہی ہے، اور ''عقل'' کا محل ''دماغ'' ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت ہے وہ اگرچہ عقل کے غور وفکر کے نتیجے میں حاصل ہوئی، لیکن ہے تو وہ ''محبت'' اور جب ''محبت'' ہے تو وہ دل سے ہوگی، اس لئے دونوں حضرات کی بات میں فرق نہیں، البتہ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس محبت کی تعبیر ایسی فرمائی جو بات کو اقرب الی الفہم کر دیتی ہے، اور اس کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے، اور اس میں کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

اہل محبت کا کلام پڑھیئے

آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''محبت، درد اور دل جمعی پیدا ہونے کے لئے مثنوی معنوی و دیوان حافظ کے دو دو صفحے کا روزانہ مطالعہ کیا جائے تو نافع ہوگا'' (انفاس عیسیٰ: ۱۹۵)

بات دراصل یہ ہے کہ یہ ''محبت'' اور ''عشق'' کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس

پر کوئی لکچر دیدیا جائے، اور وہ حاصل ہو جائے، بلکہ یہ تو ایک کیفیت ہے جو دل میں پیدا ہوتی ہے، اس کیفیت کے پیدا ہونے کے جو اسباب پیچھے بیان کئے گئے، ان میں سے ایک سبب تھا ''اہل اللہ سے تعلق'' تو جس طرح اہل اللہ سے تعلق اس کے لئے فائدہ مند ہوتا ہے، اسی طرح جو اہل محبت گزر چکے ہیں، ان کے حالات، ان کی سوانح، ان کے ملفوظات اور تعلیمات کا مطالعہ بھی انسان کے اندر محبت کے اضافے کا سبب بنتا ہے، یہ دونوں حضرات یعنی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ صاحبِ مثنوی اور حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ صاحب دیوانِ حافظ یہ دونوں ایسے اہل محبت ہیں کہ ان کے سینوں میں محبت کی آگ کی بھٹی کی سلگی ہوئی تھی، ان کا جب کلام پڑھو گے تو اس سے اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوگی، انشاء اللہ۔

حضرت خواجہ شمس الدین تبریزیؒ کی دعا

یہ محبت کیوں پیدا نہ ہو؟ اس لئے کہ یہ مثنوی جو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھی ہے، یہ بڑی عجیب وغریب چیز ہے، اور یہ الہامی کتاب ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کے جو شیخ تھے حضرت خواجہ شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ، یہ بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، مگر اُمّی تھے، یعنی پڑھنے لکھنے کا سلسلہ نہیں تھا، ان کے دِل پر عجیب وغریب علوم وارد ہوتے تھے، اور وہ علوم مجالس میں بیان بھی کردیتے تھے، لیکن وہ علوم مجلس کی حد تک محدود رہتے تھے، ایک دن انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ! آپ میرے قلب پر ایسے ایسے مضامین القاء فرماتے ہیں، لیکن وہ مضامین اس مجلس کی حد تک محدود رہتے ہیں، میں بالکل بے

زبان آدمی ہوں، نہ مجھ سے تصنیف ہوتی ہے، نہ تألیف ہوسکتی ہے، نہ کوئی شعر مجھ سے کہا جاسکتا ہے، اس لئے یا اللہ! مجھے ایک زبان عطا فرمادیں، جو میرے ان علوم کو لوگوں تک پہنچادے۔

شمس الدین تبریزؒ کی دعا کا نتیجہ

چنانچہ اس دعا کے نتیجے میں مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ حضرت خواجہ تبریزؒ سے بیعت ہوگئے، یہ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے پہلے ساری عمر کوئی شعر نہیں کہا تھا، جب یہ شیخؒ کی خدمت میں اصلاح کے لئے حاضر ہوئے، اور پھر بیعت ہوگئے، اسی پر انہوں نے بعد میں یہ شعر کہا:

مولوی ہر گز نہ شد مولائے روم
تا غلامِ شمسِ تبریزیؒ نہ شد

بہر حال! شیخ کی غلامی اختیار کی، اور ان سے بیعت ہوگئے، اور اس کے نتیجے میں حضرت کی دعا قبول ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے مولانا رومی رحمۃ اللہ کو شمس تبریذ رحمۃ اللہ علیہ کی زبان بنادیا۔ وہ اس طرح کہ بیٹھے بیٹھے اچانک مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی زبان پر اشعار جاری ہوگئے، حالانکہ اس سے پہلے کبھی شعر نہیں کہا تھا، بس اچانک اشعار وارد ہونا شروع ہوگئے، اور ان اشعار میں عجیب وغریب علوم، معارف، قصے، کہانیاں، اسرار ورموز بیان ہونا شروع ہوگئے، یہاں تک کہ چھ دفتر اشعار سے بھر گئے، ان اشعار میں زیادہ تر حکایات اور کہانیاں بیان کی ہیں، لیکن ہر حکایت سے عجیب وغریب معانی اور معارف نکالتے ہیں، آخر

میں ایک حکایت بیان کرنا شروع کی وہ حکایت ابھی درمیان میں چل رہی تھی، بس اچانک اشعار کی آمد بند ہوگئی، آگے لکھ دیا کہ اس حکایت کو مکمل کرنا میرے بس میں نہیں، میرے اختیار میں نہیں، اللہ تعالیٰ ہی کسی بندے کو پیدا فرمائیں گے جو اس حکایت کو مکمل کرے گا۔

مثنوی کی تکمیل کس طرح ہوئی؟

اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ جو کچھ اشعار وجود میں آرہے تھے، یہ ہمارے القاء اور الہام سے آرہے تھے، چنانچہ اس کے بعد صدیاں گزر گئیں، کسی نے اس حکایت کو پورا نہیں کیا، آخر میں اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا مفتی الٰہی بخش کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ کو اس کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائی، اور ان کی زبان پر اشعار جاری ہو گئے، اور جہاں پر مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے وہ ادھوری حکایت چھوڑی تھی، وہیں سے انہوں نے وہ حکایت شروع کر کے ''مثنوی'' کی تکمیل فرمائی، اسی لئے وہ ''خاتم المثنوی'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس سے پتہ چلا کہ یہ کتاب ''مثنوی'' الہامی کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے الہام کے ذریعہ ان حضرات کے دلوں پر القاء فرمائی، اب جو شخص اس کو پڑھتا ہے، اس کے دل میں بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہو جاتی ہے، اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس کتاب کو پڑھا کریں، جن لوگوں کو فارسی نہیں آتی، ان کے لئے اردو میں اس کا ترجمہ چھپا ہوا ہے، اور اردو میں اس کی شروحات بھی موجود ہیں۔

دیوان حافظ اور مثنوی کی شرح

دوسری کتاب جس کو پڑھنے کے بارے میں حضرت نے فرمایا، وہ ہے ''دیوان حافظ'' یہ بھی عجیب وغریب کتاب ہے، اور عجیب بات یہ ہے کہ جن دو کتابوں کا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ مطالعہ کرنے کو فرمارہے ہیں، ان دونوں کی شرح بھی حضرت نے اردو میں تحریر فرمائی ہے، ''مثنوی'' کی شرح ''کلیدِ مثنوی'' کے نام سے کئی جلدوں میں تحریر فرمائی ہے، اور ''دیوانِ حافظ'' کی شرح ''عرفانِ حافظ'' کے نام سے لکھی ہے۔ اب عقل حیران ہوتی ہے کہ حضرت والا کو کہاں فرصت تھی، اس کے باوجود دیوان حافظ کی شرح لکھ دی، جو شعروشاعری کا مجموعہ ہے، اور اس کے اندر اکثر غزلیں ہیں، اور شراب کا اس میں تذکرہ ہے، لیکن اس سے مراد وہ شراب نہیں جو مٹکوں اور بھٹیوں میں کشید کی جاتی ہے، بلکہ اس سے مراد ''شراب محبت'' اور ''شراب معرفت'' ہے، اور اس کے ایک ایک شعر میں محبت اور معرفت بھری ہوئی ہے، آپ جانتے تھے کہ یہ کتاب پڑھنے والے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرے گی، اس لئے آپ نے اس کتاب کی شرح لکھی۔

حافظ شیرازیؒ کا ایک واقعہ

اور حافظ شیرازیؒ کا معاملہ بھی عجیب تھا، اور یہ بھی اَللّٰہُ یَجْتَبِیْ اِلَیْہِ مَنْ یَّشَاءُ میں داخل تھے۔ ان کے والد صاحب کے کئی بیٹے تھے، تمام بیٹے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے، کوئی تعلیم حاصل کررہا تھا، کوئی تجارت کررہا

تھا، کوئی ملازمت کررہا تھا، لیکن حافظ شیرازیؒ آوارہ جنگل میں گھومتے پھرتے رہتے تھے، نہ کوئی تعلیم، نہ تربیت، نہ کام کاج، نہ روزی اور نہ روزگار، ان کے والد صاحب کو ان کی طرف سے فکر رہتی تھی، اور پریشان رہتے تھے، ان کے والد حضرت خواجہ شیخ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، ایک مرتبہ وہ ان کے گھر تشریف لائے تو انہوں نے اپنے تمام بچوں کو اپنے شیخ کے سامنے پیش کیا، اور دعا کرائی، حضرت شیخ نے سب بچوں کو دعائیں دیں، پھر پوچھا تمہارا ایک اور بیٹا بھی تو ہے، وہ کہاں ہے؟ والد صاحب نے جواب دیا وہ تو فضول آوارہ ہے، اس کا کوئی پتہ نہیں، کہیں جنگل میں ہوگا، شیخ نے کہا اس کو تو بلواؤ، ان کے والد صاحب نے ایک آدمی کو ان کے بلانے کے لئے جنگل کی طرف بھیج دیا، اور اس نے جا کر کہا کہ شیخ گھر میں آئے ہوئے ہیں، ان سے آکر مل لو، اور دعائیں کرالو۔ چنانچہ یہ آئے، جب گھر میں داخل ہوئے اور شیخ پر نظر پڑی تو وہیں کھڑے ہو کر ایک شعر پڑھا کہ:

آنا کہ خاک را بنظر کیمیا کنند

آیا بود کہ گوشہ چشم بما کنند

یعنی وہ لوگ جو خاک کو ایک نظر میں کیمیا بنانے والے ہیں، مراد تھے حضرت خواجہ بہاؤالدین رحمۃ اللہ علیہ۔ کیا کبھی ایسا ہوگا کہ وہ اپنی آنکھ کا ذرا اشارہ ہمارے اوپر بھی کریں، مجذوبیت کے عالم میں یہ شعر پڑھا، یہ شعر سن کر حضرت شیخ بہاؤالدین رحمۃ اللہ کھڑے ہوگئے، اور ان کو اپنے قریب بلایا، اور

ان کے سر پر ہاتھ رکھا، اور کہا:

نظر کردم ، نظر کردم ، نظر کردم

یعنی جس نظر کو ڈالنے کے لئے تم کہہ رہے تھے، میں نے وہ نظر ڈال دی، اس دن کے بعد وہ آوارگی ختم کردی، اور شیخ کی خدمت میں پڑ گئے، ان کے غلام بن گئے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو وہ مقام بخشا کہ بڑے بڑے لوگ ان پر رشک کرتے ہیں۔

دیوان حافظ کا ایک شعر

اس کے بعد انہوں نے دیوان حافظ لکھی، یہ ''دیوان حافظ'' عشق اور محبت سے بھری ہوئی بھٹی ہے، اگر کوئی اس کو سمجھنے والا ہو، چونکہ اس کو سمجھنے والے کم تھے، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح لکھ دی، تاکہ اگر براہِ راست سمجھ میں نہ آئے تو شرح کی مدد سے سمجھ لو کہ انہوں نے اس دیوان میں کیا کہا ہے، بظاہر تو دیکھنے میں شعر و شاعری ہے، چنانچہ ایک شعر میں وہ کہتے ہیں کہ:

بِدِہ ساقی مئے باقی کہ در جنت نخواہی یافت
کنارِ آب رکن آباد و گلگشتِ مصلا را

اب بظاہر تو ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ آوارگی کا شعر ہے، اس لئے کہ اس شعر میں وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اے ساقی! جو شراب باقی رہ گئی ہے وہ بھی مجھے دیدے، کیونکہ جنت میں یہ شراب نہیں ملے گی، اور وہاں جنت میں نہ رکن آباد

کے دریا کے کنارے کا حسن نظر آئے گا، اور نہ گلگشت مصلا نظر آئے گا، اور نہ یہ شراب نظر آئے گی، لہٰذا جو کچھ دینا ہے، مجھے یہیں دنیا میں دیدو۔ اب بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے دنیا والی شراب اور دنیا کے دریا کا کنارا مراد ہے۔

اس شعر کا صحیح مطلب

لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ اس شعر کے ذریعہ حافظ صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جنت میں اور ساری نعمتیں ملیں گی، لیکن جستجو اور طلب کی لذت وہاں نہیں ملے گی۔ اس لئے کہ وہاں پہنچنے کے بعد ساری لذتیں، نعمتیں حاصل ہو جائیں گی، اور محبوب کی جستجو اور طلب کی جو لذت اسی دنیا میں ہے، لہٰذا جب تک تو زندہ ہے، اس جستجو اور طلب کی لذت سے فائدہ اُٹھاتا جا، یہ کہیں نہیں ملے گی۔ حافظ شیرازیؒ اس شعر میں یہی کہنا چاہتے ہیں۔

نہ سمجھنے والا اعتراض کرے گا

بہر حال! اس طرح کے اشعار حافظ شیرازیؒ نے کہے، اب جو نادان لوگ ہیں، جو ان اشعار کو نہیں سمجھ سکے، انہوں نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ پر تنقید بھی کی کہ انہوں نے ایسی کتاب کی شرح لکھ دی جس میں شراب کا ذکر ہے، اس لئے کہ انہوں نے صاف صاف لکھ دیا کہ جو شراب جنت میں نہیں ملے گی، اب اس سے یہی دنیاوی شراب کے علاوہ اور کون سی شراب مراد ہوگی؟ ورنہ اصل شراب تو جنت میں ملے گی۔ لیکن حضرت نے اس شعر کو بھی تصوف کے معنی

پہنادے، بات دراصل یہ ہے کہ جو آدمی نہیں سمجھتا وہ ضروراعتراض کرے گا۔ بہرحال! یہ کتاب ایسی ہے کہ جب آدمی اس کو پڑھتا ہے، اور اس کے مضامین پر غور کرتا ہے تو اس سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا ہوتی ہے، اس لئے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ روزانہ دو صفحے مثنوی کے اور دیوانِ حافظ کے پڑھ لیا کرو، اس سے انشاء اللہ، اللہ تعالیٰ کی محبت مس ترقی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں بھی اپنی محبت کا کوئی ذرہ عطا فرمادے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

ہر چیز اللہ کی عطا ہے

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک

اصلاحی مجالس : جلد نمبر ٦

مجلس نمبر : 91

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

ہر چیز اللہ کی عطا ہے

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبة للمتقین، والصّلوٰۃ والسّلام علی رسوله الکریم، و علی آله و اصحابه اجمعین ـ امّابعد!

یہ اعضاء اللہ کی نعمت ہیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''سالک جس وقت دیکھتا ہے کہ ہمارے اعضاء نے قربِ حق میں ہماری اعانت کی ہے تو وہ اس حیثیت سے ان سے محبت کرتا ہے، اور اپنی آنکھ کی بھی رعایت کرتا ہے، اپنے دماغ کی بھی حفاظت کرتا ہے، نہ اس واسطے کہ وہ اپنی چیزیں ہیں، بلکہ اس واسطے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی چیزیں ہیں'' (انفاس عیسیٰ: ۱۹۷)

اللہ جل جلالہ کی محبت اور تعلق مع اللہ کا بیان چل رہا ہے، اس ملفوظ میں حضرت والا بیان فرما رہے ہیں کہ جب انسان کی نظر درست ہو جاتی ہے، اور اللہ تعالیٰ زاویہ نگاہ صحیح فرما دیتے ہیں تو اسے کائنات کی ہر چیز میں اللہ تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آتا ہے، اور جس چیز سے بھی محبت ہوتی ہے وہ درحقیقت اللہ جل شانہ ہی کی محبت کی بناء پر ہوتی ہے، چنانچہ فرمایا کہ ہمارے اعضاء جو اللہ جل شانہ نے ہمیں عطا فرمائے ہیں، یہ آنکھ ہے، یہ کان ہے، یہ ناک ہے، یہ ہاتھ پاؤں ہیں، محبت کرنے والے بندے کو ان اعضاء سے جو محبت ہوتی ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہوتی کہ یہ میری چیزیں ہیں، بلکہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ یہ اللہ جل شانہ کی عطا ہے، اس کی دی ہوئی نعمت ہے، اور ان کے ذریعہ مجھے اللہ جل جلالہ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لئے ان اعضاء سے محبت ہوتی ہے۔

اپنے اعضاء سے محبت کریں، لیکن

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شعر ہے:

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است
اُفتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

یعنی مجھے اپنی آنکھ پر ناز ہے کہ اس نے تیرا جمال دیکھا ہے، تیرا حسن دیکھا ہے، اور میں اپنے پاؤں پر ناز کرتا ہوں، اس بناء پر کہ وہ چل کر تیری گلی تک گیا ہے، اور مجھے تیری گلی تک پہنچایا ہے، اس وجہ سے مجھے ان سے محبت ہے۔ لہٰذا جو سالک اللہ جل شانہ کے راستے پر چل رہا ہو، اللہ جل شانہ کی محبت

اور اس کے ساتھ تعلق اس کے دل میں پیدا ہو رہا ہو، وہ اپنے اعضاء سے بھی محبت کرتا ہے، لیکن محبت کا عنوان مختلف ہوتا ہے، ہم اور آپ ان اعضاء سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ یہ ہمارے ہیں، یہ ہماری آنکھ ہے، ہماری ناک ہے، ہمارے کان ہیں، ہمارے ہاتھ ہیں، ہمارے پاؤں ہیں، اور ان اعضاء سے ہمیں فائدہ پہنچ رہا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جس شخص کو اپنی معرفت عطا فرمائی ہو، وہ بھی اپنے ان اعضاء سے محبت کرتا ہے، لیکن درحقیقت وہ اس لئے محبت کرتا ہے کہ ان اعضاء کے ذریعہ مجھے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوا، اور یہ اعضاء اللہ جل شانہ کی عطا ہے، اس لئے محبت کرتا ہے۔

غور کرو، یہ چیز کہاں سے آئی؟

ایک اور موقع پر حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے محبت اور تعلق بڑھانے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ کائنات کی جو چیز تمہیں اچھی نظر آئے، جس سے تمہیں راحت پہنچے، جس سے تمہیں لطف حاصل ہو، اس کے بارے میں سوچا کرو کہ یہ چیز کہاں سے آئی؟ کس نے یہ چیز بنائی؟ کس نے یہ چیز مجھے دی؟ جتنا سوچو گے، اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوگا، اس لئے کہ اس صورت میں کائنات کی ہر شئی میں تمہیں اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے گا، مثلاً کھانا سامنے آیا، وہ کھانا مزے دار ہے، تمہیں اچھا لگ رہا ہے، اس سے تمہیں راحت مل رہی ہے، اب تم ذرا یہ سوچو کہ یہ کھانا کہاں سے آیا؟ اور کس نے عطا کیا؟ اگر نظر تنگ ہوگی تو بس آدمی اس حد تک سوچے گا کہ گھر والوں نے یہ کھانا پکایا، اور اچھا پکایا،

بس اس حد پر آکر ذہن بند ہو جائے گا۔لیکن اگر اللہ تعالیٰ زاویہ نگاہ درست فرما دیں، اور عقل و سمجھ عطا فرمادیں تو وہ سوچے گا کہ گھر والوں میں یا باورچی میں کہاں طاقت تھی کہ وہ اتنا اچھا کھانا پکا سکتے، اور بظاہر کھانے کے اندر جو اجزاء نظر آرہے ہیں، چاہے وہ کسی جانور کا گوشت ہو، چاہے وہ سبزی اور ترکاری ہو، یا مسالے ہوں، یہ سب کہاں سے آئے؟ جب ان چیزوں میں گہری نظر ڈالو گے تو یہ نظر آئے گا کہ ہر چیز بالآخر اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور اس کی عطا ہے، ورنہ کسی انسان کی مجال نہیں کہ وہ ان چیزوں کو پیدا کر لیتا، یا ان چیزوں کو حاصل کر لیتا۔

یہ گوشت کہاں سے آیا؟

یہ گوشت جو تم مزے حاصل کرنے کے لئے کھا گئے، یہ گوشت کہاں سے آیا؟ کس نے پیدا کیا؟ اگر تم یہ جواب دو کہ پیسے دے کر بازار سے خریدا تھا، لہٰذا میں ہی اس کا سبب بنا ہوں، اور میں نے پیسے دے کر خریدا ہے، اور بازار سے لایا ہوں۔لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا بھی تو ہو سکتا تھا کہ تم جیب میں پیسے لئے پھرتے، اور بازار میں تمہیں گوشت نہ ملتا، اور نہ کوئی جانور ملتا، پھر کیا کرتے؟ ذرا سوچو کہ یہ جانور کہاں سے آیا؟ کس نے پیدا کیا؟ کیا کسی نے پیسے دے کر پیدا کروایا تھا؟ بلکہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق اور حکم کے نتیجے میں یہ جانور وجود میں آیا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس جانور کو تمہارے لئے حلال کر دیا، ورنہ حقیقت میں جاندار ہونے کے اعتبار سے تم اور وہ برابر تھے، تمہارے اندر بھی جان ہے، اس کے اندر بھی جان ہے، اگر تم اس کو کھانے کا حق رکھتے ہو تو وہ جانور تمہیں کھانے

کا حق کیوں نہیں رکھتا؟ اس کے اندر بھی طاقت اور قوت ہے، بلکہ بعض جانوروں میں تم سے زیادہ طاقت موجود ہے۔ اللہ جل شانہ نے اس جانور کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، اور ایسا مسخر کر دیا کہ تم اس کی نسلوں کی نسلیں نگل گئے، لیکن وہ جانور کبھی تمہارے خلاف احتجاج نہیں کرتے کہ تم نے ہماری نسلوں کی نسلیں تباہ کر دیں، ہلاک کر دیں۔ اور پھر ان جانوروں کو ہر جگہ اس طرح پھیلا دیا کہ تم جس جگہ بھی پیسے دے کر گوشت حاصل کرنا چاہو تو بآسانی تمہیں وہاں گوشت مل جاتا ہے۔

یہ ترکاریاں اور پھل کہاں سے آئے؟

دوسری طرف نباتات اور ترکاریوں کو دیکھو، تم نے زیادہ سے زیادہ یہ کام کیا کہ ان کو حاصل کرنے کے لئے زمین میں بیج ڈالا، لیکن کیا تمہارے اندر اس کی طاقت تھی کہ اس بیج کو کونپل بنا دو؟ اور پھر اس کونپل سے پودا بناؤ؟ اور اس پودے میں ترکاریاں اُگاؤ؟ اس چھوٹے سے بیج سے کونپل پھوٹتی ہے، وہ کونپل اتنی نازک اور کمزور ہوتی ہے کہ اگر ایک بچہ بھی اس کو انگلی لگا دے تو وہ کونپل ختم ہو جائے، لیکن وہ نازک کونپل اتنی سخت زمین کا پیٹ پھاڑ کر باہر نکل رہی ہے، اللہ تعالیٰ ہی اپنی قدرت کاملہ سے اس کونپل سے زمین کا پیٹ چاک کرا رہے ہیں، اور پھر وہ کونپل پودا بن رہی ہے، اور پھر اس پودے پر کائنات کی ساری طاقتیں نچھاور ہو رہی ہیں، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہوائیں چل رہی ہیں، اس کے اوپر سورج اپنی کرنیں نچھاور کر رہا ہے، چاند اس کے اوپر

اپنی روشنی ڈال رہا ہے، اور اس کے ذریعہ اس کی نشو ونما ہو رہی ہے، پھر اس پودے پر ترکاریاں اور پھل آتے ہیں، پھر ان کو کاٹ کے بازار لایا جاتا ہے، اور بازار سے پھر وہ تم تک پہنچتے ہیں، لہٰذا کھانے کا ایک نوالہ جو تم کھا رہے ہو، اس نوالے کو تمہارے حلق تک پہنچانے کے لئے کائنات کی ساری طاقتیں گردش کر رہی ہیں، اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ابرو باد و مه و خورشید و فلك در کار نند

تا تو نانے بکف آری و بغفلت بخوری

یعنی روٹی کا ٹکڑا جو ٹکڑا تم کھا رہے ہو، اگر غور کرو گے تو یہ نظر آئے گا کہ اس میں بادل، ہوا، چاند، سورج ساری کائنات کی طاقتیں صرف ہوئی ہیں، تب جا کر یہ لقمہ تمہارے ہاتھ میں پہنچا ہے۔

کھانے میں ذائقہ کہاں سے آیا؟

جب کھانا سامنے آیا تو تم نے کہا کہ یہ اچھا باورچی ہے، اس نے بڑا اچھا کھانا پکایا، اس کو کھانا پکانے کا بڑا اچھا ڈھنگ آتا ہے۔ لیکن ذرا یہ سوچو کہ باورچی کھانا پکانے کا وہ ڈھنگ ماں کے پیٹ سے لے کر آیا تھا؟ اس باورچی کو یہ ڈھنگ کس نے سکھایا؟ ایک ہی چیز ہے، وہ ایک ملک میں ایک طریقے سے پک رہی ہے، اور دوسرے ملک میں دوسری طرح پک رہی ہے، ایک آدمی اس چیز کے اندر ایک ذائقہ پیدا کر رہا ہے، دوسرا آدمی دوسرا ذائقہ پیدا کر رہا ہے، وہ کون سی ذات ہے جو انسانوں کے دماغوں میں کھانے پکانے کی مختلف ترکیبیں

ڈال رہا ہے کہ اس طرح پکاؤ گے تو لذت زیاد حاصل ہوگی۔ کھانا کھاتے وقت اگر یہ باتیں سوچا کریں تو اس کھانے کے اندر بھی اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے گا، اور اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی محبت میں اضافہ ہوگا۔

یہ گلاس کا پانی کہاں سے آیا؟

جب پانی پیو تو یہ غور کرو کہ یہ پانی کا بھرا گلاس میرے پاس کہاں سے آیا؟ کس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے سمندر سے مون سون اٹھایا، جب تک یہ سمندر میں تھا، اس وقت تک وہ پانی کھارا اور کڑوا تھا، پینا چاہتے تو پی نہیں سکتے تھے۔ اور سمندر کے پانی کو کھارا رکھنے میں یہ حکمت ہے کہ بے شمار جانور سمندر کے اندر مر رہے ہیں، اگر سمندر کے پانی میں یہ نمکیات نہ ہوتیں تو اس پانی میں بدبو پیدا ہو جاتی، اس لئے اللہ تعالیٰ سمندر کے پانی کو کھارا رکھا، لیکن تمہیں پلانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے سمندر سے مون سون بادل اٹھائے، اور اس مون سون بادلوں میں ایسی خودکار مشین لگی ہوئی ہے کہ پانی کی ساری نمکیات اور کڑواہٹ سمندر کے اندر رہ گئی، اور وہ پانی میٹھا بن گیا۔

تم پانی کا ذخیرہ کر سکتے تھے؟

پھر اگر اللہ تعالیٰ ہم سے یہ کہہ دیتے کہ دیکھو! ہم سمندر سے بادل اٹھا رہے ہیں، اور تمہارے لئے بارش برسا رہے ہیں، لہٰذا تم چھ مہینے کے لئے پانی کا ذخیرہ کر کے رکھ لو، چھ مہینے کے بعد دوبارہ برسائیں گے، اور تم خود اس پانی کی حفاظت کرو، کیا انسان کے بس میں یہ بات تھی کہ چھ مہینے کا پانی ذخیرہ کر کے رکھ

لیتا؟ نہیں۔ چونکہ یہ بات انسان کے بس میں نہیں تھی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس پانی کو خود ہی محفوظ کر دیا، چنانچہ فرمایا:

فَاَسْكَنّٰهُ فِی الْاَرْضِ ‌ (المؤمنون:۱۸)

یعنی یہ پانی بادل کی ''کارگوسروس'' کے ذریعہ سمندر سے اٹھ کر پہاڑوں تک جارہا ہے، اور جب پہاڑوں پر پانی برستا ہے تو وہاں پر خودکار ''فریزر'' اللہ تعالیٰ نے قائم کر دیے ہیں، چنانچہ وہ پانی ''برف'' کی شکل میں پہاڑوں پر جمع ہے، تمہیں یہ تکلیف نہیں دی کہ تم خود اس اپنے پاس ذخیرہ کر کے رکھ لو۔

اور تم نے سوچا بھی نہیں

اس کے بعد پھر اگر تم سے یہ کہتے کہ ہم نے پہاڑوں پر تمہارے لئے پانی ذخیرہ کر دیا ہے، تم وہاں سے جا کر اٹھا لاؤ۔ تم میں سے کسی کے بس میں نہیں تھا کہ پہاڑوں سے پانی لا کر استعمال کرتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے سورج کی گرمی سے اس کو پگھلایا، اور پھر دریا کی شکل بنائی، اور دریاؤں کے ذریعہ اس پانی کو ساری مخلوق تک پہنچایا، اور پھر زمین کے اندر رگوں میں پانی چلایا، تاکہ تم جہاں کہیں زمین کو کھودو، وہیں سے تمہارے لئے پانی نکل آئے، اتنے واسطوں سے تمہارے پاس یہ پانی کا ایک گلاس آیا، اور تم نے غٹا غٹ کر کے ایک دم سے پی لیا، اور اپنی پیاس بجھالی، اور کبھی تم نے سوچا تک نہیں کہ یہ پانی کہاں سے آیا تھا۔

یہ رنگارنگ پھول کہاں سے آئے؟

اگر تم غور کرو گے تو تمہیں اللہ جل شانہ کا جلوہ اس پانی میں بھی نظر آئے

گا، اس کھانے میں بھی نظر آئے گا، بلکہ کائنات کی ہر چیز میں اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آئے گا، مثلاً تم باغ میں گئے، وہاں تمہیں خوبصورت اور خوشنما پھول اچھا لگا، وہ پھول دل کو بھا رہا ہے، آنکھوں کو اچھا لگ رہا ہے، بس اسی حد پر آکر رک گئے، ارے آگے بھی غور کرو، اور یہ دیکھو یہ پھول کہاں سے آیا؟ کس ذات نے اس پھول کے اندر یہ حسن پیدا کیا؟ کس ذات نے اس کے اندر جمال پیدا کیا؟ اور یہ غور کرو کہ یہ کھاد ایک ہی ہے، پانی ایک ہی ہے، اور بیج ایک طرح کے ہیں، لیکن جب ان بیجوں کو زمین کے اندر ڈالو تو ایک بیج سے ایک طرح کا پھول نکل رہا ہے، دوسرے بیج سے دوسری طرح کا پھول نکل رہا ہے، اس طرح ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ نے انواع و اقسام کے پھول پھیلا دئے، کون ذات ہے جو یہ پھول بوٹے پیدا کر رہا ہے؟ اور پھر اس میں غور کرو کہ وہ خود کتنا خوبصورت ہوگا جس نے یہ ساری خوبصورتیاں پیدا فرمائیں، بہر حال! جو چیز بھی اس کائنات میں ہے، وہ اسی ذات نے پیدا کی ہے، اسی نے اس کے اندر حسن و جمال ڈالا، اسی نے اس کو خوشنما بنایا، اور یہ سب کچھ اس کی عطا ہے۔

ایک دیہاتی کا قصہ

ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اسی بات کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھایا کرتے تھے کہ ایک دیہاتی تھا، اس نے کبھی ریل گاڑی نہیں دیکھی تھی، جب پہلی مرتبہ اس نے ریل گاڑی دیکھی تو اس کو بڑا تعجب ہوا کہ اتنے بڑے جسم کو کون حرکت دے رہا ہے، کون چلا رہا ہے؟ جو اس کو

حرکت دے رہا ہے اس کے اندر بڑی طاقت ہے، چنانچہ وہ اسٹیشن پہنچا، وہاں ریل گاڑی کھڑی ہوئی تھی، اس نے دیکھا کہ ریل کا گارڈ ہاتھ میں سبز جھنڈی لئے کھڑا ہے، جب اس نے اس جھنڈی کو ہلایا تو ریل چلنی شروع ہوگئی، دیہاتی سمجھا کہ اتنی بڑی ریل کو چلانے والی سبز جھنڈی ہے، اس میں بڑی طاقت ہے، چنانچہ اس دیہاتی نے اس جھنڈی کے پاس جاکر اس کی ''ڈنڈوت'' اور پوجا شروع کردی کہ تیرے اندر بڑی طاقت ہے، تو نے اتنی بڑی ریل کو چلا دیا (''ڈنڈوت'' ہندوؤں کے ہاں عبادت کا ایک طریقہ ہے کہ جس کی عبادت کرتے ہیں اس کے پاس جاکر ہاتھ جوڑ کے کھڑے ہوجاتے ہیں، اور اس کے آگے بار بار سر جھکاتے ہیں)

ڈرائیور کی ڈنڈوت

کسی نے اس سے کہا کہ یہ تو کیا حرکت کر رہا ہے کہ ایک جھنڈی کو ''ڈنڈوت'' کرنا شروع کردی؟ اس دیہاتی نے جواب دیا کہ یہ جھنڈی بڑی طاقتور ہے کہ اتنی بڑی ریل گاڑی کو چلا دیتی ہے، اس لئے میں اس کو ''ڈنڈوت'' کر رہا ہوں، کسی نے اس سے کہا کہ جھنڈی تو کچھ بھی نہیں ہے، یہ تو محض ایک ''علامت'' ہے، دراصل گاڑی کو چلانے والا تو ڈرائیور ہے، جو گاڑی کے اندر بیٹھ کر اس کو چلا رہا ہے، وہاں انجن کے اندر جاکر اس کو دیکھ لے۔ چنانچہ یہ انجن کے پاس گیا، اور اندر گیا تو واقعتہ ایک ڈرائیور بیٹھا تھا، اس دیہاتی نے اس سے پوچھا کہ یہ گاڑی تم چلاتے ہو؟ ڈرائیور نے کہا کہ ہاں میں چلاتا ہوں، دیہاتی نے کہا

کہ تم اتنی بڑی ریل کو چلاتے ہوتو درحقیقت تم ''ڈنڈوت'' کے لائق ہو، چنانچہ اس دیہاتی نے ڈرائیور کے آگے ''ڈنڈوت'' کرنی شروع کردی، اس ڈرائیور نے کہا کہ بھائی میں تو تمہاری طرح کا ایک انسان ہوں، اور میرے اندر اتنی طاقت نہیں ہے کہ اتنی بڑی ریل کو چلا سکوں، بلکہ انجن میں جو بھاپ نظر آرہی ہے، اس کے اندر طاقت ہے اور یہ بھاپ ریل کو چلاتی ہے، اس کے اندر طاقت ہے، اس دیہاتی نے جاکر بھاپ کی ''ڈنڈوت'' شروع کردی، اور یہاں تک پہنچ کر ساری داستاں ختم ہوگئی۔

بھاپ کو پیدا کرنے والا کون؟

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''بھاپ'' تک پہنچ کر ساری داستاں اس لئے ختم ہوگئی کہ وہ ''جھنڈی'' بھی آنکھ سے نظر آرہی تھی، اور وہ ''ڈرائیور'' بھی آنکھ سے نظر آرہا تھا، اور وہ ''بھاپ'' بھی آنکھ سے نظر آرہی تھی، اس وجہ سے انہی چیزوں کو سب کچھ سمجھ کر ان کی پرستش شروع کردی۔ لیکن اس دیہاتی نے یہ نہیں سوچا کہ اس بھاپ میں طاقت کہاں سے آگئی، جو اتنی بڑی ریل کو چلا رہی ہے، اس کی عقل ''بھاپ'' سے آگے نہ بڑھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے ان ظاہری اسباب کو اپنا سب کچھ سمجھ کر اسی کو اپنا مائی باپ سمجھ لیا، اگر حقیقت دیکھنے والی نگاہ ہوتی تو وہ ایک قدم اور آگے بڑھتا، اور یہ سوچتا کہ اس بھاپ کو پیدا کرنے والا کون ہے؟ پھر اس کو اللہ جل شانہ کا جلوہ نظر آتا۔ بہر حال! کائنات کی کسی چیز کو بھی جب حقیقت بین نگاہوں سے دیکھو گے تو اس میں

اللہ جل شانہ کا جلوہ ضرور نظر آئے گا، بس دیکھنے والی آنکھ چاہئے، اور سوچنے والا دل چاہئے۔

عمارت میں اللہ کا جلوہ

مثلاً تم نے ایک بہت شاندار بنی ہوئی عمارت دیکھی، اب تم اس کی بہت تعریف کر رہے ہو کہ یہ بہت شاندار، بہت اعلیٰ اور بہت خوبصورت عمارت ہے، لیکن یہ سوچو کہ یہ عمارت کیسے وجود میں آئی؟ اگر یہ سلسلہ آگے چلاؤ گے تو ابتداءً دیکھنے میں یہ نظر آئے گا کہ یہ ''معمار'' نے بنائی ہے، اور پھر سوچو کہ یہ معمار ایسی شاندار عمارت کیسے بنا سکتا ہے، ضرور کسی ''آرکیٹیکٹ'' نے اس عمارت کا نقشہ بنایا ہوگا، اب زیادہ سے زیادہ ''آرکیٹیکٹ'' پر نگاہ رک جائے گی۔ لیکن آگے قدم بڑھاؤ، اور یہ سوچو کہ اس ''آرکیٹیکٹ'' کے دل میں یہ خیال اور تجویز کس نے ڈالی؟ جب یہ سوچو گے تو تمہیں اس عمارت میں اللہ جل شانہ کا جلوہ کارفرما نظر آئے گا۔

سالک کو ہر قدم پر اللہ کا جلوہ

اک شاعر گزرے ہیں بہزاد لکھنوی مرحوم، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔ بڑی اچھی نعتیں کہا کرتے تھے، ان کی غزل کا ایک شعر ہے کہ:

وہ کہاں کا راہرو ہے، اسے کیا ملے گی منزل
جسے ہر قدم پہ ہر سو تو ہی تو نظر نہ آئے

یعنی جس مسافر کو ہر قدم پر ہر سو، اے اللہ! تیرا جلوہ نظر نہ آئے، وہ کیسا

مسافر ہے، وہ کیسا راہ رو ہے، وہ کیسا سالک ہے، حقیقت میں تو ''سالک'' وہ ہے کہ جسے ہر قدم پر ہر سو اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔

تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

جب یہ سوچ بہت آگے بڑھ جاتی ہے تو پھر یہ نظر آنے لگتا ہے کہ اس پوری کائنات میں حقیقی اور اصل وجود تو صرف اللہ جل شانہ کا ہے، باقی سب وجود تو اس کے پیدا کئے ہوئے ہیں، اس کے تابع ہیں، اور اس پر موقوف ہیں، اسی کو ''وحدۃ الوجود'' کہہ دیتے ہیں، آپ حضرات نے ''وحدۃ الوجود'' کا لفظ سنا ہوگا، اس کی غلط تفسیریں بھی کی گئیں، اور اس کی وجہ سے لوگ گمراہیوں میں بھی مبتلا ہوئے، لیکن ''وحدۃ الوجود'' کے صحیح معنیٰ یہ ہیں کہ کائنات میں وجود حقیقی اللہ جل شانہ کے علاوہ کسی کا نہیں ہے، سارے وجود اس کے وجود کے سامنے ماند اور کالعدم ہیں، ہمارے حضرت مجذوب رحمۃ اللہ علیہ نے ''وحدۃ الوجود'' کا سارا فلسفہ ایک شعر میں بیان فرما دیا، فرمایا کہ:

جب مہر نمایاں ہوا سب چھپ گئے تارے
تو مجھ کو بھری بزم میں تنہا نظر آیا

آسمان پر ساری رات تاروں کی محفل جمی رہتی ہے، ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں تارے چمک رہے ہیں، ستارہ اپنا حسن اور جلوہ دکھا رہا ہے، پورے آسمان کو گھیرا ہوا ہے، اور اس پر اپنی بزم سجائی ہوئی ہے، لیکن جب صبح کو سورج نمودار ہوا، ابھی نمودار بھی نہیں ہوا تھا بلکہ ابھی اُفق کے نیچے ہی تھا، اور

نیچے سے ہی اس نے صبح کا اُجالا پھیلایا، تو بس سارے ستارے ماند پڑ گئے، کیا وہ ستارے کہیں چلے جاتے ہیں؟ نہیں۔ موجود ہی رہتے ہیں، لیکن جب سورج کی روشنی آئی تو اس نے سارے ستاروں کو ماند کر دیا۔

صبح دم خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

اسی بات کو غالبؔ مرحوم نے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا کہ:

ہر ستارہ رات کو محفل میں محوِلاپ تھا
صبح دم خورشید جب نکلا تو مطلع صاف تھا

یعنی رات کے وقت ہر ستارہ بڑی ڈینگیں مار رہا تھا کہ میری روشنی اتنی تیز ہے، میری روشنی اتنی تیز ہے، لیکن صبح کو جب سورج نکلا تو مطلع صاف تھا، سارے ڈینگیں مارنے والے ستارے محو ہو گئے، اور مٹ گئے، کسی کا نشان باقی نہیں رہا، بس ایک سورج ہی تھا جو نظر آ رہا تھا۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کے جلوے کا سورج نکلتا ہے تو سارے وجودوں کے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں، بس یہی ''وحدۃ الوجود'' ہے۔

ہر چیز اللہ کی تابع فرمان ہے

بہرحال! آدمی ذرا یہ سوچنے کی عادت ڈالے کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں، اس کے پیچھے کسی اور کا جلوہ نظر آ رہا ہے، اور وہ اللہ جل شانہ کا جلوہ ہے، چاہے کوئی عمارت دیکھے، کوئی پہاڑ دیکھے، سمندر دیکھے، دریا دیکھے، اور یا انسان کی بنائی ہوئی چیزیں دیکھے، مثلاً گاڑیاں دیکھے، ہر چیز کے پیچھے اللہ جل شانہ کا

جلوہ کارفرما نظر آئے گا، دیکھئے! اگر آپ کے سامنے ہوائی جہاز اُڑ رہا ہو، تو اب دیکھنے میں صرف ہوائی جہاز نظر آرہا ہے، نہ اس کے اندر بیٹھے مسافر نظر آتے ہیں اور نہ جہاز کو چلانے والا پائیلیٹ نظر آتا ہے، لیکن کوئی بھی اس جہاز کو دیکھ کر یہ نہیں کہتا کہ یہ جہاز خود بخود اڑا جارہا ہے، بلکہ ہر انسان پورے یقین کے ساتھ یہ کہے گا کہ کوئی پائیلیٹ اس جہاز کو اڑارہا ہے، اور اس جہاز میں مسافر سوار ہیں۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ حقیقت بین نگاہ عطا فرمادیں، تو یہ نظر آئے گا کہ کائنات میں جو چیز بھی جہاں بھی اور جس حیثیت میں بھی اپنا جلوہ دکھارہی ہے درحقیقت وہ چیز اللہ تعالیٰ کی تابع فرمان ہوکر اپنا جلوہ دکھارہی ہے۔

حقیقت بین نگاہ کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

اور یہ حقیقت بین نگاہ پیدا ہوتی ہے اللہ والوں کی صحبت سے، اچھی مجلسوں میں بیٹھنے سے، جن کے دلوں میں اللہ جل شانہ کی محبت ہے، جن کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق مضبوط ہے، ان کے ساتھ اُٹھنے بیٹھنے سے، ان کی باتیں سننے سے، ایسی نظر پیدا ہوجاتی ہے۔ ایک عام آدمی ایک چیز کو دیکھتا ہے، اور دیکھ کر گزر جاتا ہے، لیکن جس کو اللہ والوں کی صحبت نصیب ہو، وہ جب اس چیز کو دیکھتا ہے، تو اس کے دیکھنے سے اس کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ حضرت والا فرماتے ہیں کہ سالک کا پہلا سبق یہ ہے کہ جو چیز بھی دیکھو، اور جو نعمت بھی تمہارے سامنے آئے، اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی صناعی کا مراقبہ کرو، پھر انشاء اللہ تعالیٰ ہر چیز میں اللہ تعالیٰ کا جلوہ نظر آنے لگے گا۔ اور یہ چیز مشق سے حاصل

ہوتی ہے، جتنی مشق کرو گے، اتنی ہی اللہ تعالیٰ ایسی نگاہ عطا فرمادیں گے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو یہ صفت عطا فرمادے، آمین۔

وہ ذات کیسی باکمال ہوگی؟

آگے حضرت والا نے ایک ملفوظ میں ارشاد فرمایا کہ:

''جس چیز سے کسی کو محبت ہو، اس میں یہ غور کرے کہ یہ کمال اس میں کہاں سے آیا؟ (ظاہر ہے کہ جس چیز سے محبت ہوتی ہے وہ کسی کمال کی وجہ سے ہوتی ہے) مسلمان کا دل فوراً جواب دے گا کہ حق تعالیٰ نے (یہ کمال) پیدا کیا تو اب دل کو یہ سمجھانا چاہئے کہ:

چه باشد آں نگار خود که بند آں نگار ها

کہ جس نے ایسی ایسی چیزیں پیدا کی ہیں، وہ خود کیا کچھ ہوگا، اور اس کے ساتھ ہی محبوب مجازی کی فنا و نیست ہونے کو بھی ذہن میں حاضر کیا جائے'' (انفاس عیسیٰ: ۲۰۰)

ہمیشہ رہنے والی ذات سے محبت کرو

یعنی دنیا میں جس شخص سے یا جس چیز سے محبت ہو رہی ہے تو یہ سوچے کہ بظاہر تو یہ چیز بڑی اچھی لگ رہی ہے، لیکن ایک وقت آنے والا ہے کہ اس کا حسن، اس کا جمال، اس کا کمال سب فنا اور ختم ہو جائے گا، لیکن وہ ذات جس کا کمال ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے، یہ وہ ذات ہے جس نے اس میں کمال پیدا

کیا، لہٰذا محبت کی حق دار یہ عارضی چیزیں نہیں ہیں، بلکہ محبت کا اصل اور حقیقی حق دار تو اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، جس نے یہ سارے کمالات پیدا کئے۔ اقبال مرحوم نے کہا کہ:

وہ عشق جس کی آگ بجھادے اجل کی پھونک
اس میں مزہ نہیں تپشِ انتظار کا

یعنی جس عشق کی آگ موت کی پھونک کی وجہ سے ختم ہو جائے کہ اِدھر موت آئی اور اُدھر سارا عشق ڈھیلا پڑ گیا، اس عشق میں تپشِ انتظار کا مزہ نہیں، ہاں وہ عشق جس کی آگ کبھی بھی نہ بجھے، موت کی پھونک سے بھی نہ بجھے، جس کو موت چھوئے بھی نہیں، وہ ہے اللہ تعالیٰ کی محبت، وہ ہی عشق ہر مؤمن سے اور ہر انسان سے مطلوب ہے۔

مردہ کے ساتھ عشق مت کرو

آگے فرمایا کہ اس کے ساتھ ہی محبوب مجازی کے فنا و نیست ہونے کو بھی ذہن میں حاضر کیا جائے کہ یہ چند روز میں فنا ہو کر خاک ہو جائے گا، اس کا کمال وحسن عارضی ہے، اور حق تعالیٰ کا کمال ذاتی اور باقی:

عشق بامردہ نہ شد پائیدار
عشق را باحیؔ و قیوم دار

یعنی کسی مردہ کے ساتھ عشق پائیدار نہیں ہوسکتا، ہاں حی وقیوم کے ساتھ جو عشق ومحبت ہوگی، وہ درحقیقت لازوال ہے، کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

اللہ کی محبت سے مصائب آسان ہو جاتے ہیں

ایک ملفوظ میں حضرت نے فرمایا کہ:

''اہل اللہ کا خدا کی محبت میں یہ حال ہوتا ہے کہ تمام مصائب ان کو آسان ہو جاتے ہیں، نہ قید خانے سے ان کو تکلیف ہوتی ہے، نہ فاقے سے کلفت، ان کی تو شان یہ ہوتی ہے کہ ان کے پاس کچھ نہیں ہے، مگر خوش ہیں، کیونکہ ایک چیز ان کے پاس ایسی ہے کہ اس کے پاس ہوتے ہوئے ان کو کسی چیز کی پرواہ نہیں، وہ آغوش محبوب ہے، رضاء محبوب ہے، لذت طاعات ہے، لذت مناجات ہے، لذت قرب ہے''

(انفاس عیسیٰ: ۲۰۱)

یعنی اللہ تعالیٰ جس کو اپنی محبت کا ذوق عطا فرما دیں تو پھر اگر اس کے اوپر دنیا کے مصائب اور پریشانیاں بھی آتی ہیں تو اس کے لئے یہ سب آسان ہو جاتی ہیں، ان کی وجہ سے ان کو پریشانی لاحق نہیں ہوتی، وہ اپنی جگہ مگن ہوتا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں اپنی محبت کی شمع روشن کو دی ہے، اس کے نتیجے میں سارے مصائب آسان ہو جاتے ہیں، بظاہر وہ کتنی تکلیف میں نظر آرہا ہو، لیکن چونکہ اللہ جل شانہ کے ساتھ اس کا تعلق جڑا ہوا ہے، اس لئے اس کو کبھی پریشانی لاحق نہیں ہوتی۔

حضرت ایوب علیہ السلام اور آزمائش

حضرت ایوب علیہ السلام کیسی بیماری میں مبتلا ہوئے، اور اس بیماری میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعائیں بھی مانگیں، چنانچہ فرمایا:

اَنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء:۸۳)

اے اللہ! مجھے سخت تکلیف پہنچ گئی ہے، آپ بڑے رحم فرمانے والے ہیں، مجھ پر رحم کر کے مجھ سے یہ تکلیف دور کر دیجئے۔ لیکن اس بیماری میں بھی ان کو پریشانی لاحق نہیں ہوئی، ان کا ایک صحیفہ "صحیفہ ایوبی" کے نام سے بائبل میں موجود ہے، اس صحیفے میں ان کے عجیب حالات اور مکالمے موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی آزمائش میں مبتلا کیا کہ ایک طرف تو ان کی بیماری شدید تھی جو بذات خود ایک آزمائش تھی۔ پھر ان کی مزید آزمائش کے لئے بیماری کے دوران اللہ تعالیٰ نے ان کے پاس دو فرشتے انسانوں کی شکل میں بھیجے، وہ فرشتے روزانہ ان کے پاس آجاتے، اور ان سے گفتگو کرتے، اور ان سے یہ کہتے کہ تمہیں یہ جو تکلیف پہنچی ہے یہ تکلیف تمہارے اللہ تعالیٰ کی طرف سے راندہ درگاہ ہونے کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے، اس کی وجہ سے یہ تکلیف تمہیں لاحق ہوئی ہے۔

یہ بھی میرے مولیٰ کی طرف سے ہے

ان کے ہر مکالمے کے جواب میں حضرت ایوب علیہ السلام فرماتے کہ یہ بات نہیں، بلکہ جب تک میں عافیت میں تھا، وہ بھی ان کا کرم تھا، اور اب جس

حالت میں ہوں، یہ بھی ان کا کرم ہے، بس کرم کا عنوان مختلف ہے، وہ خوشی کا عنوان تھا، یہ تکلیف کا عنوان ہے، وہ خوشی بھی میرے مولیٰ کی دی ہوئی تھی، اور یہ تکلیف بھی میرے مولیٰ کی دی ہوئی ہے، وہ پورا صحیفہ اس مکالمے سے بھرا ہوا ہے، اس صحیفے کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو اس حالت میں بھی کیسی سکینت اور طمانیت عطا فرمائی تھی کہ جبکہ درد اور تکلیف میں بے چین معلوم ہو رہے تھے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور محبت کا جو رشتہ ہے، وہ اس حالت میں مزید مستحکم ہو رہا ہے، اور فرماتے کہ میں چونکہ کمزور ہوں، اس لئے اس کرم کا متحمل نہیں ہوں، اس لئے دعا کر رہا ہوں کہ اے اللہ! مجھ سے یہ تکلیف دور کر دیجئے، لیکن حقیقت میں یہ بھی ان کے کرم کا عنوان ہے۔ اور اس تکلیف کے نتیجے میں وہ میرے کتنے درجات بلند کر رہے ہوں گے، اور اس کے عوض وہ مجھے کیا انعام عطا کرنے والے ہیں، مجھے یہ معلوم نہیں۔

یہ بھی رحمت کا عنوان ہے

اسی بات کو حضرت والا اس طرح فرما رہے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کی محبت نصیب ہو گی، اور اس کو یہ محسوس ہو گا کہ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ کی آغوش محبت میں ہوں، تو پھر تکلیف میں بھی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کا بہت ہی عزیز دوست ہو، اور اچانک تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے، اور وہ تم سے گلے ملتے وقت تمہیں خوب دبانا شروع کر دے، اب اس کے دبانے کے نتیجے میں تمہیں تکلیف تو ہو گی، لیکن وہ تکلیف لذیذ تکلیف ہو گی، اس لئے کہ

وہ تکلیف میرے محبوب کی طرف سے آرہی ہے، میرے دوست کی طرف سے آرہی ہے۔ یہی حالت اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی ہوتی ہے کہ جب ان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی آزمائش آجاتی ہے تو وہ پریشان نہیں ہوتے، بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بھی میرے مولیٰ کی رحمت کا ایک عنوان ہے، لیکن چونکہ ہم کمزور ہیں، اس وجہ سے ہم اس رحمت کا تحمل نہیں کر پا رہے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! اس تکلیف کو دور فرما دیجئے، اور رحمت کا دوسرا عنوان راحت کی شکل میں ہمیں عطا فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس محبت کا کچھ حصہ ہمیں بھی عطا فرما دے، آمین۔

ایک صاحب کا خط اور پریشانی کا اظہار

ایک صاحب جو بیچارے تکلیفوں کے اندر مبتلا تھے، مختلف قسم کی پریشانیاں ان کو لاحق تھیں۔ اس قسم کے حالات ہر انسان کے ساتھ کبھی نہ کبھی پیش آتے ہی ہیں، کبھی بیماری آگئی، کبھی مالی تنگی پیش آگئی، کبھی بے روزگاری ہوگئی، کبھی گھر والے بیمار ہوگئے وغیرہ، اس طرح کی تکلیفیں ایک صاحب کو لاحق ہوئیں تو انہوں نے حضرت والا کو خط میں لکھا کہ حضرت! مجھے اس طرح کی مختلف تکلیفیں آج کل پیش آرہی ہیں، اور ان تکلیفوں کی وجہ سے بعض اوقات دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں کمی ہوگئی ہے، جب تک نعمتیں اور راحت و آرام میسر تھا، اس وقت تک دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت محسوس ہوتی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی ساری نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے، لیکن جب سے تکلیفیں آئی

ہیں، اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت اور تعلق میں کمی محسوس ہوتی ہے، ہم جیسے کمزور لوگوں کے دلوں میں ان تکلیفوں کی وجہ سے بعض اوقات شکوہ بھی پیدا ہونے لگتا ہے، اور بعض اوقات ناشکری کے کلمات بھی زبان سے نکل جاتے ہیں کہ کیا میں ہی رہ گیا تھا ان پریشانیوں کے لئے؟ مجھ پر ہی اتنی تکلیفیں کیوں آرہی ہیں؟ وغیرہ، اللہ تعالیٰ اس قسم کی ناشکری سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے، آمین۔

تکالیف کے وقت چند تدابیر

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ان صاحب کے خط میں چند تدبیریں لکھی ہیں، جو ہم سب کے لئے فائدہ مند ہیں، اور یہ تدبیریں ہر اس حالت کے لئے فائدہ مند ہیں، جب کسی شخص کو کوئی تکلیف پہنچی ہو، یا پریشانی لاحق ہو، یا کوئی صدمہ لاحق ہو، یا کوئی تشویش لاحق ہو، وہ کیا تدبیریں ہیں؟ چنانچہ حضرت نے لکھا ہے کہ:

> ''توبہ و استغفار کرو، اور ہر روز پانچ سو مرتبہ کم از کم ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' کا وظیفہ مقرر کرلو، ایک ہفتہ میں یہ مصیبت دور ہوجائے گی، کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ'' كَنْزٌ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ، وَدَوَاءٌ تِسْعِيْنَ دَاءً اَيْسَرُهَا الْهَمَّ، یعنی یہ کلمہ ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، اور یہ نوے بیماریوں کی دوا ہے، جس

میں سے ادنیٰ بیماری غم اور حزن ہے، غرضیکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرو، اس کو علاوہ سب سے قطع نظر کرو، کیونکہ راحت وکلفت سب اس کے ہاتھ میں ہے، اس کو راضی کرو، انشاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرمادیں گے، اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَ یَکْشِفُ السُّوْءَ وَ یَجْعَلُکُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰہٌ مَّعَ اللّٰہِ قَلِیْلًا مَّا تَذَکَّرُوْنَ (النمل:٦٢)

(انفاس عیسیٰ: ۲۰۲)

پہلی تدبیر: توبہ واستغفار

ا۔ پہلی تدبیر اس ملفوظ میں یہ بتائی کہ ”توبہ واستغفار کرو“ یعنی جب انسان پر کوئی مصیبت، کوئی پریشانی آئے تو اس وقت انسان کو توبہ واستغفار کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، کیوں؟ اس لئے کہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

ما اصابکم من مصیبة فبما کسبت ایدیکم و یعفو عن کثیر (الشوریٰ: ۳۰)

یعنی تمہیں دنیا میں جو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، تو وہ تمہارے اپنے اعمال کی وجہ سے پہنچتی ہے، کوئی نہ کوئی عمل میں کوتاہی ہوتی ہے، کوئی گناہ ہوا ہے، کوئی معصیت ہوئی ہے، جس کی وجہ سے دنیا کے اندر تکلیف آجاتی ہے، لہٰذا جب بھی کوئی تکلیف آئے تو یہ سمجھو کہ شاید میرے کسی گناہ کا نتیجہ ہو، اس لئے پہلا کام توبہ

واستغفار کا کرو کہ یا اللہ! میں توبہ واستغفار کرتا ہوں، جو کچھ مجھ سے گناہ ہوئے ہیں، جو میری سمجھ میں آرہے ہیں، اور سمجھ میں نہیں آرہے، ان سے بھی آپ کے حضور معافی مانگتا ہوں، یہ پہلی تدبیر ہوئی۔

دوسری تدبیر: لاحول ولاقوۃ کا وِرد

۲۔ دوسری تدبیر یہ بیان فرمائی کہ روزانہ کم از کم پانچ سو مرتبہ ''لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ '' کا وظیفہ مقرر کرلو، کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ یہ کلمہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے۔ اور دوسری چیز حدیث میں یہ بیان فرمائی کہ یہ کلمہ ''نوے'' بیماریوں کا علاج ہے، جن میں سے سب سے ہلکی بیماری فکر اور تشویش ہے، یعنی اگر کسی کو کوئی فکر اور پریشانی لاحق ہو، تشویش ہو تو یہ ان سب سے ہلکی بیماری ہے، جس کا یہ کلمہ ''لَا حَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ '' علاج ہے، لہٰذا اگر کسی کو پریشانی اور فکر لاحق ہو وہ اس کلمہ کو پانچ سو مرتبہ روزانہ پڑھنے کا معمول بنالے۔

''لَا حَوْلَ'' جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے

لوگ عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کلمہ ''لاحول ولاقوۃ الا باللہ'' شیطان کو دور کرنے کا طریقہ ہے، اور اس کے نتیجے میں اس کلمہ کی حقیقی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں ہے، اور اس کلمہ کی قدر و قیمت کا اندازہ کون کرسکتا ہے جبکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمادیا یہ جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے، اور جب جنت ناقابل تصور ہے تو اس کے خزانے کا تصور کیسے کرسکتے ہیں،

لیکن اس کلمہ کی بڑی عظیم صفات ہیں، اسی وجہ سے جب مبتدی کو تسبیحات پڑھنے کو بتائی جاتی ہیں تو ایک تسبیح اس کلمہ کی بھی بتائی جاتی ہے۔

اس کلمہ کا مطلب و معنی

اس کلمہ کے معنی کیا ہیں؟ اس کلمہ کے دو ترجمے اور دو مطلب ہو سکتے ہیں، اور دونوں ہی صحیح ہیں، ایک ترجمہ یہ کہ ''اللہ کے سوا کسی میں کوئی طاقت نہیں، اور کوئی قوت نہیں، جو بلند ہے، جس سے زیادہ بلند کوئی ذات نہیں، اور جو عظیم ہے، جس سے زیادہ عظیم کوئی نہیں'' یعنی جو طاقت و قوت ہے وہ علی و عظیم کے اندر ہے۔ اس ترجمہ کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص پریشانی کے عالم میں یہ کلمات پڑھے وہ یہ سوچتے ہوئے پڑھے کہ جو کچھ مجھے پریشانی لاحق ہوئی ہے یہ اللہ ہی کی مشیت سے لاحق ہوئی ہے، اس کائنات میں کسی کے اندر یہ طاقت اور یہ قوت نہیں تھی کہ وہ مجھے اس پریشانی میں مبتلا کرتا۔ اور پھر دوسری مرتبہ یہ سوچتے ہوئے یہ کلمات پڑھو کہ جب اس کی مشیت سے یہ تکلیف پہنچی ہے تو پھر یہ تکلیف اس کی مشیت کے بغیر دور بھی نہیں ہوگی، وہی دور کرے گا، کائنات میں کسی اور چیز کے اندر یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اس تکلیف کو مجھ سے دور کر سکے، اگر یہ طاقت ہے تو صرف اللہ میں ہے، جو علی و عظیم ہے۔

تبصرہ کے بجائے اللہ کی طرف رجوع

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل جب کسی کو پریشانی لاحق ہوتی ہے، خواہ اجتماعی ہو، یا انفرادی ہو، عام

طور پر لوگ بیٹھ کر اس تکلیف پر تبصرے تو بہت کرتے ہیں کہ فلاں جگہ یہ ہو گیا، فلاں نے اتنا ظلم کیا، فلاں نے اتنا ظلم کیا، حضرت فرمایا کرتے تھے کہ جتنی دیر تک تم آپس میں بیٹھ کر تبصرے کرتے ہو، اس تبصرے میں وقت صرف کرنے کے بجائے وہ وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں صرف کرلو، اور یہ کہو کہ اے اللہ! یہ پریشانی ہے، جو ہم سے برداشت نہیں ہو رہی ہے، آپ اپنے فضل وکرم سے اس پریشانی کو دور فرما دیجئے، اور اس پریشانی کے آنے میں ہماری جن غلطیوں کو دخل ہو، اے اللہ! ہمیں ان غلطیوں کی اصلاح کی توفیق عطا فرما دیجئے۔ جب یہ عمل کرو گے تو کم از کم دعا کرنے کا ثواب تو ملے گا اور کچھ پتہ نہیں اللہ کے کسی بندے کے دل سے نکلی ہوئی کون سی دعا کس وقت اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبول ہو جائے، اور اس کے نتیجے میں ساری پریشانیاں دور ہو جائیں۔ اس لئے تبصرے کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو۔

اضطراب اور بے چینی دور ہو جائے گی

اگر یہ کلمہ ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' کثرت سے پڑھا جائے، اور اس نیت سے پڑھا جائے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اور اللہ کے سوا کون ہے، جو اس کو دور کر سکے؟ کوئی نہیں ہے، جب اس اعتراف کے ساتھ پڑھو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس پریشانی کے نتیجے میں دل میں جو اضطراب اور بے چینی ہے، وہ دور ہو گی۔ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ روزانہ پانچ سو مرتبہ یہ کلمات پڑھا کرو۔

دوسرا مطلب اور معنی

ان کلمات کے دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ کسی کے اندر کوئی طاقت کوئی قوت اللہ کے دیے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، لہٰذا اے اللہ! اس پریشانی کو برداشت کرنے کی طاقت اور قوت آپ عطا فرمائیں گے تب مجھے حاصل ہوگی، آپ اپنی رحمت سے مجھے یہ طاقت اور قوت عطا فرما دیں۔ جب یہ سوچ کر ان کلمات کو پڑھو گے تو انشاء اللہ ہر پریشانی زائل ہوجائے گی۔ آخر میں حضرت والا نے فرمایا:

> ''غرضیکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرو، اس کے سوا سب سے قطع نظر کرو، کیونکہ راحت وکلفت سب اس کے ہاتھ میں ہے، اس کو راضی کرو، انشاء اللہ وہ تمام مصائب کا انتظام فرمادیں گے''

خلاصہ

خلاصہ یہ کہ پریشانی کے موقع پر حضرت والا نے تین باتیں ارشاد فرمائیں (۱) توبہ واستغفار کی کثرت (۲) اور ''لَاحَوْلَ وَلَاقُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ'' کا کثرت سے ورد، کم از کم دن میں پانچ سو مرتبہ (۳) اللہ تبارک وتعالیٰ سے تعلق اور اس کی اطاعت کا اہتمام، یہ تین کام کرنے کے نتیجے میں انشاء اللہ پریشانی اور بے چینی جاتی رہے گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

خوف اور رجا

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

خوف اور رجا

دونوں مطلوب ہیں

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین، والعاقبۃ للمتقین،
والصّلوٰۃ والسّلام علی رسولہ الکریم،
وعلی آلہ و اصحابہ اجمعین، امّا بعد!

گذشتہ رمضان ۱۴۲۱ھ میں "انفاس عیسیٰ" کے جس حصے کی تشریح کی تھی، وہ "تعلق مع اللہ اور محبت خداوندی" سے متعلق تھا، الحمد للہ بقدر ضرورت اس کی تشریح ہوگئی تھی، آگے ایک نیا باب شروع ہو رہا ہے، جس کا عنوان ہے "خوف و رجا" اس کے بارے میں حضرت والا کے ملفوظات یہاں پر مذکور ہیں، اللہ کے نام پر اس رمضان ۱۴۲۲ھ میں یہ باب شروع کرتے ہیں۔

ایمان "خوف" اور "رجا" کے درمیان ہے

جن باطنی اخلاق اور اعمال کا حصول انسان کے لئے ضروری اور مطلوب

ہے، ان میں ”خوف ورجا“ بھی ہیں، ”خوف“ کے معنی ہیں، ”اللہ کا ڈر“ کیونکہ اگر انسان کو اللہ تعالیٰ کا ڈر نہ ہو تو آدمی غفلت میں گناہوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، اور ”رجا“ کے معنی ہیں ”امید“ یعنی انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا ڈر بھی ہو، اور اللہ جل شانہ کی ذات سے اور اس کی رحمت سے امید بھی ہو، دونوں چیزیں جب ساتھ ساتھ ہوں تب ایمان کامل ہوتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ”الایمان بین الخوف و الرجاء“ یعنی ایمان خوف ورجا کے درمیان ہے، اگر ان دونوں میں توازن صحیح ہو جائے تو ایمان کامل ہو جائے، جتنا انسان کے اندر اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا چاہئے، اتنا ہی خوف ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، اسی طرح جتنی ”رجا“ ہونی چاہئے، اتنی ہی رجا ہو، اس سے کم زیادہ نہیں ہو، تو اس انسان کا ایمان کامل ہے۔

خوف اور رجا دونوں کا ہونا ضروری ہے

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ”خوف اور رجا“ دو پَر ہیں، جن کے ذریعہ صالحین اس دنیا سے جنت کی طرف پرواز کرتے ہیں، جس طرح پرندہ اپنے پروں کے ذریعہ پرواز کرتا ہے۔ اس لئے ان دونوں کو حاصل کرنا ضروری ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ اس کے ضروری ہونے کی طرف اشارہ فرمایا ہے، چنانچہ خوف کے بارے میں فرمایا:

تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا

(السجدہ:۱۶)

یعنی جو اللہ کے نیک بندے ہیں، ان کے پہلو رات کے وقت اپنے بستر سے جدا رہتے ہیں، اور اپنے پروردگار کو اس حالت میں پکارتے ہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈر بھی رہے ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے امید بھی رکھے ہوتے ہیں۔

رحمت کی امید اور جہنم کا خوف

پورے قرآن کریم میں آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کا ذکر علیحدہ اور جہنم کا ذکر علیحدہ کہیں نہیں کیا، بلکہ جہاں کہیں جنت کا ذکر فرمایا وہیں جہنم کا ذکر بھی فرمایا، اور جہاں جہنم کا ذکر فرمایا وہیں جنت کا بھی ذکر فرمایا، مجھے اس میں کہیں استثناء نظر نہیں آیا۔ یہ اس لئے کیا تاکہ ایک مرتبہ جنت کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنی رحمت سے امید پیدا کریں، اور دوسری طرف جہنم کی جھلک دکھا کر لوگوں کے دلوں میں اپنا خوف پیدا کریں۔ چنانچہ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نَبِّئْ عِبَادِیْٓ اَنِّیْٓ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ وَ اَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ

(الحجر: ۴۹، ۵۰)

یعنی میرے بندوں کو بتادو کہ میں بڑا غفور رحیم ہوں، بڑی مغفرت کرنے والا اور بڑی رحمت کرنے والا ہوں، اور ساتھ میں یہ بھی بتادو کہ میرا عذاب بھی بڑا دردناک ہے، دیکھئے! دونوں باتیں ساتھ ساتھ بتادیں۔ اب رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید باندھے، اور اس کے عذاب کا

تقاضہ یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے ڈرے، جب انسان دونوں چیزیں ساتھ ساتھ لے کر چلے گا تو اپنا ایمان کامل کرے گا۔

کتنا خوف ہونا چاہئے؟

اگر انسان پر تنہا "خوف" طاری ہو جائے تو وہ بھی خطرناک چیز ہے، جب خوف ہی خوف طاری ہو گیا، اور "امید" بالکل نہیں ہے تو اس کے نتیجے میں ایک طرف تو زندگی اجیرن ہو جائے گی، اور دوسری "یاس" اور "ناامیدی" پیدا ہو جائے گی، وہ یہ سوچے گا کہ میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں، اور یہ "ناامیدی" بڑی خطرناک چیز ہے، یہ انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے، اس لئے اگر اللہ کی عظمت کا، اس کے جلال کا، اس کے عذاب کے خوف کا استحضار اس قدر ہو جائے کہ ہر وقت وہی دماغ پر چھا جائے تو آدمی کھانے سے، پینے سے رک جائے، اور دنیا کے کام بھی نہ کر سکے، اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اللہ تعالیٰ سے خوف مانگا، لیکن کتنا مانگا؟ فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اقْسِمْ لَنَا مِنْ خَشْيَتِكَ مَا تَحُوْلُ بِهٖ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعَاصِيْكَ

مطلق یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنا ڈر دیجئے، بلکہ فرمایا کہ یا اللہ! اتنا خوف دیدے جو میرے اور آپ کی معصیت کے درمیان حائل ہو جائے۔ مطلق ڈر نہیں مانگا، اس لئے کہ جن لوگوں پر اللہ تعالیٰ کا مطلق ڈر طاری ہو جاتا ہے، اور خوف کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس سے ان کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے، دوسری دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ مَخَافَةً تَحۡجِزُنِیۡ عَنۡ مَعَاصِیۡکَ

اے اللہ! میں آپ سے اتنا خوف مانگتا ہوں جو مجھے آپ کی معصیت سے روک دے، اس میں آپ نے قید لگا کر خوف مانگا کہ اس سے زیادہ نہیں مانگا، اس لئے کہ اگر خوف کی زیادتی کے نتیجے میں مایوسی پیدا ہو جائے تو انسان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔

"خوف" اور "تقویٰ" میں فرق ہے

یہاں یہ بات بھی واضح کر دوں کہ قرآن کریم میں بعض جگہوں پر "تقویٰ" کا لفظ بھی آیا ہے، اور بعض جگہوں پر "خوف" کا لفظ بھی آیا ہے۔ "تقویٰ" کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:

یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ آمَنُوۡا اتَّقُوۡا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ (آل عمران:۱۰۲)

یعنی اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اللہ کا حق ہے۔ جبکہ "خوف" کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اتنا خوف کرو جتنا کہ اللہ کا حق ہے، اس لئے کہ "تقویٰ" اور "خوف" میں فرق ہے، "خوف" کے معنی ہیں مطلق ڈر جس سے آدمی مرعوب ہو جائے، اور دل و دماغ پر اس کا ڈر مسلط ہو جائے، یہ ہے "خوف" جبکہ "تقویٰ" مطلق "ڈر" کا نام نہیں، بلکہ تقویٰ اس کیفیت کا نام ہے جو "خوف" کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے، یعنی یہ فکر کہ جس سے مجھے خوف ہو رہا ہے، میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کروں، اس کیفیت کا نام "تقویٰ" ہے، لہٰذا "خوف" نام ہے ڈر کا، اور اس ڈر کی وجہ سے گناہ سے بچنے کا نام "تقویٰ"

ہے، چنانچہ یہ ڈر کہ اللہ تعالیٰ زبردست طاقت والے ہیں، بدلہ لینے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کا عذاب بڑا شدید ہے، اس نے ایسی جہنم تیار کر رکھی ہے، اس تصور کے بعد جو ڈر پیدا ہو رہا ہے اس کا نام ہے "خوف" اور اس ڈر کی وجہ سے اگر تم جھوٹ بولنے سے بچ گئے تو اس کا نام "تقویٰ" ہے، اگر اس ڈر کے نتیجے میں تم غیبت سے بچ گئے بدنظری سے بچ گئے تو اس کا نام "تقویٰ" ہے۔

ناسخ اور منسوخ

بعض حضرات علماء یہ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ جو آیت ہے کہ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (آل عمران: ۱۰۲) یہ آیۃ منسوخ ہوگئی ہے، اور اس آیۃ کا ناسخ دوسری آیۃ ہے، فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (التغابن: ۱۶) یعنی پہلے یہ حکم آیا تھا کہ جیسا اللہ تعالیٰ کا حق ہے ویسا تقویٰ اختیار کرو، یہ حکم سن کر صحابہ کرام کو بڑی پریشانی ہوگئی کہ یا اللہ! ہم تقویٰ کا حق کیسے ادا کر سکتے ہیں؟ ہمارے بس میں نہیں ہے کہ ہم اللہ کے تقویٰ کا حق ادا کریں، صحابہ کرام کی اس پریشانی کے بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا، اور پھر یہ آیۃ نازل ہوئی فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا سْتَطَعْتُمْ (التغابن: ۱۶) یعنی اتنا تقویٰ اختیار کرو، جتنا تمہاری استطاعت میں ہو۔ لہٰذا اب "حَقَّ تُقٰتِهٖ" کا مطالبہ باقی نہیں رہا۔

پہلی آیۃ دوسری آیۃ کی تفسیر ہے

لیکن دوسرے اہل علم یہ کہتے ہیں کہ ان آیات کو ناسخ اور منسوخ کہنے کی

ضرورت نہیں، بلکہ درحقیقت پہلی آیۃ دوسری آیۃ کی تفسیر ہے، یعنی جب یہ کہا گیا کہ جیسا اللہ کا حق ہے ویسا تقوی اختیار کرو، اس وقت صحابہ کرام ڈر گئے کہ تقوی کا حق ہم سے کہاں ادا ہوگا؟ تو ان کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیۃ نازل فرمائی کہ تقوی کا حق اتنا ہی ہے جتنی تمہارے اندر طاقت ہے، ہم نے تم سے تقوی کا بہت اونچا مطالبہ نہیں کیا، بلکہ ''حَقَّ تُقٰتِهٖ'' سے مراد ''مَا اسْتَطَعْتُمْ'' ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی استطاعت سے زیادہ کا مکلف نہیں کرتے ''لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا'' لہٰذا یہ دوسری آیۃ پہلی آیۃ کی تفسیر ہے۔

''احیاء العلوم'' کا باب الخوف

خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ اتنا ''خوف'' مطلوب نہیں جس کے نتیجے میں آدمی کے اندر ''مایوسی'' پیدا ہوجائے، اور ''تقوی'' اتنا مطلوب ہے جو استطاعت کے مطابق ہو۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ''احیاء العلوم'' بڑی زبردست کتاب ہے، ہر چیز کے اندر اس کی عجیب شان ہے، لیکن میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ اس کتاب کا باب الخوف ایک مجلس میں پورا نہیں پڑھنا چاہئے، بلکہ مختلف مجلسوں میں تھوڑا تھوڑا پڑھنا چاہئے، اس لئے کہ اگر کوئی شخص پورے باب کو ایک مجلس میں پڑھے گا تو بعض اوقات پڑھنے والے پر ''خوف'' کا اتنا غلبہ ہوجائے گا جو مطلوبہ خوف سے بڑھ جائے گا، چنانچہ اس باب کو پڑھنے کے نتیجے میں بہت سے لوگوں کے حالات خراب ہوگئے، ان کے ذہن اُلٹ گئے، اور وہ مایوسی کی طرف چل پڑے، یہ

تفصیل تو ''خوف'' کے بارے میں تھی۔

''امید'' میں حد اعتدال مطلوب ہے

دوسری چیز ''رجا'' ہے، جس کے معنی ہیں ''امید''۔ یہ ''امید'' بھی مطلوب ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید رکھنا مطلوب ہے، لیکن یہ ''امید'' بھی اعتدال کے اندر ہو، اگر ''امید'' اعتدال سے بڑھ جائے تو اس کا نام ''دھوکہ'' اور ''غرور'' ہے، ''امید'' اعتدال سے کس طرح بڑھ جاتی ہے؟ اس کے بارے میں ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلْعَاجِزُ مَنْ اِتَّبَعَ نَفْسَہٗ ھَوٰ ھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ

یعنی ''عاجز'' وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو ''خواہشات'' کے پیچھے لگائے ہوئے ہے، اس کی نفسانی خواہشات اس کو جہاں لے جارہی ہیں، وہ جارہا ہے، گناہ کرنے میں کبھی کوئی کھٹک نہیں ہوتی، گناہوں سے بچنے کا کوئی اہتمام نہیں، دل میں جو خواہش پیدا ہورہی ہے، اس کو پورا کررہا ہے، حلال حرام ایک کررہا ہے، ساتھ میں اللہ تعالیٰ پر آرزو باندھے بیٹھا ہے، چنانچہ جب اس کو یہ کہا جائے کہ یہ کام ناجائز ہے تو جواب میں کہتا ہے کہ اللہ بڑا غفور رحیم ہے، اس شخص کو ''غفور رحیم'' ہونے کا دھوکہ ہوگیا ہے، یہ ''رجا'' نہیں، اس لئے کہ جب ''امید'' اپنی حد سے آگے بڑھ جائے تو وہ غرور اور دھوکہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا ''رجا'' کو اپنی حد پر رکھنا چاہئے، تاکہ یہ دھوکہ نہ بنے، اور ''خوف'' کو اپنی حد میں رکھنا چاہئے، تاکہ وہ ''یاس'' اور ''ناامیدی'' میں تبدیل نہ ہوجائے، دونوں کو اپنی

اپنی حد پر رکھ کر چلنا چاہئے۔

دونوں کی حد اعتدال کس طرح معلوم ہو؟

اب سوال یہ ہے کہ انسان ان دونوں کو اپنی اپنی حد پر رکھ کر کس طرح چلے؟ کون شخص یہ بتائے گا کہ یہ "خوف" اپنی حد کے اندر ہے، اور یہ "رجا" اپنی حد کے اندر ہے؟ اور کون بتائے گا کہ تمہیں "خوف" کا مطلوبہ درجہ حاصل ہے، اور "رجا" کا بھی مطلوبہ درجہ حاصل ہے؟ یہ پتہ لگانے ہی کے لئے "فن تصوف" ہے، اور یہ پیری مریدی اس کام کے لئے ہے، اور شیخ سے رجوع اسی مقصد کے لئے کیا جاتا ہے، وہ شیخ بتاتا ہے کہ "خوف" کا وہ درجہ جو مطلوب ہے وہ الحمد للہ تمہیں حاصل ہو چکا ہے، اور جتنی "رجا" مطلوب تھی، اللہ تعالیٰ نے وہ تمہیں عطا فرما دی، اور تم اعتدال کے اندر ہو، اور اگر کوئی شخص اعتدال کی حد کے اندر نہیں ہے تو شیخ اس کی اصلاح کر کے اس کو اعتدال کی حد کے اندر لاتا ہے، تصوف کا اور کسی شیخ سے رجوع کرنے کا اصل مقصود یہی ہے۔ آج کل لوگوں نے "تصوف" کا مقصد یہ سمجھ لیا ہے کہ شیخ کچھ تسبیحات پڑھنے کو بتا دے گا کہ صبح یہ پڑھا کرو، اور شام کو یہ پڑھا کرو، یاد رکھئے! یہ تسبیحات اصلاح کے اندر معاون ضرور ہیں، لیکن اصل مقصود نہیں، تسبیح تو آپ شیخ کے بغیر گھر میں بیٹھ کر بھی پڑھ سکتے ہیں۔ لہٰذا تصوف کا اور شیخ سے تعلق کا اصل مقصود یہ ہے کہ جو اعمال باطنہ مقصود ہیں وہ انسان کے اندر پیدا ہو جائیں، اور جن اعمال سے بچنا ضروری ہے انسان ان سے بچ جائے۔ بہر حال! حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس باب میں "خوف"

اور "رجا" دونوں بیان کو بیان کیا ہے، تا کہ ہم دونوں کے درمیان رہتے ہوئے زندگی گزاریں۔

مایوس اور ناامید ہونا جائز نہیں

چنانچہ ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا:

"ناامیدی عقلی مذموم ہے، یعنی اگر یہ اعتقاد ہو جائے کہ مجھ پر ہرگز رحمت نہ ہوگی، اور میری موجودہ حالت ایسی نہیں کہ اس پر رحمت ہو" (انفاس عیسیٰ: ۲۰۴)

اگر کسی کے دماغ میں یہ بات بیٹھ جائے کہ مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کبھی نہیں ہوگی، تو یہ "یاس" ہے، اسی کا نام "ناامیدی" ہے، یہ مذموم ہے، اور کسی مؤمن کے لئے یہ "یاس" جائز نہیں، ہرگز نہیں ہونی چاہئے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا

(الزمر: ۵۳)

اے میرے بندوں! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کر رکھا ہے، اور زیادتیاں کر بیٹھے ہو، تم اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہونا، بیشک اللہ تعالیٰ سارے گناہوں کو معاف فرمانے والے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہو، چاہے انسان نے کتنا ہی بڑے سے بڑا گناہ کر لیا ہو، اور برے سے برا گناہ

کر بیٹھا ہو، تب بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسی حال میں مایوس نہ ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ایسی ہے کہ تم نے چاہے کیسا ہی بڑے سے بڑا گناہ کرلیا ہو، ایک مرتبہ جب تم سچے دل سے توبہ کرلوگے، اور یہ کہوگے "اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّیْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّ اَتُوْبُ اِلَيْهِ" تو انشاء اللہ اسی لمحے اللہ تعالیٰ تمہیں سارے گناہوں سے پاک صاف کردیں گے، اس میں کوئی شبہ اور شک نہیں۔ لہٰذا ایک مسلمان کے دل میں مایوسی کا کہاں گزر ہوسکتا ہے۔

جس کا اللہ ہو اس کو پریشانی کیسی؟

مایوسی تو اس شخص کو ہو جس کے ساتھ یہ وعدے نہ کئے گئے ہوں، جس کو اللہ تعالیٰ نے یہ راستے نہ بتائے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بتادیا کہ میں نے تمہارے لئے توبہ کا دروازہ کھولا ہوا ہے، اور مرتے دم تک کھلا رہے گا، پھر مایوسی کیوں؟ میرے حضرت والا فرمایا کرتے تھے کہ:

جس کا اللہ ہو، اس کو پریشانی کیسی؟

لہٰذا جب اللہ تعالیٰ نے یہ وعدے فرما رکھے ہیں، اور طریقے بھی بتا رکھے ہیں، پھر کہاں کی پریشانی؟ کیسی مایوسی؟ جب گناہ کرکے پریشان ہو تو فوراً اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو، توبہ کرو، استغفار کرو، اور آئندہ اس گناہ سے بچنے کی فکر کرو، باقی اپنے گناہ کا مراقبہ کبھی مت کرو کہ میں نے فلاں گناہ کیا، میں نے فلاں گناہ کیا، فلاں گناہ کیا، ارے جتنا وقت تم اس مراقبہ میں گزار رہے ہو، وہ وقت "اللہ کے ذکر" میں، اور "سبحان اللہ" پڑھنے میں گزار دو، اور توبہ کرو کہ یا

اللہ! میں نے جو کچھ گناہ کئے، میں ان پر اقراری مجرم ہوں، گناہوں کا اقرار کرتا ہوں، لیکن یا اللہ! آپ کی رحمت بڑی وسیع ہے، آپ کی رحمت سے توبہ کرتا ہوں، اور استغفار کرتا ہوں۔ لہٰذا اللہ کی رحمت سے ناامید نہ ہو، یہ خیال کہ میں تو راندہ درگاہ ہوں، اور میں تو اللہ کی رحمت سے دور ہوں، اللہ کی رحمت مجھ پر ہو ہی نہیں سکتی، یہ سب شیطانی خیالات ہیں۔

ناامیدی کے غلبہ کا نتیجہ

بعض اوقات غلبہ حال کے نتیجے میں "خوف" کا یا "یاس" کا انسان پر غلبہ ہو جاتا ہے، یہ غلبہ بڑی خراب چیز ہے، اس لئے کہ اس کے نتیجے میں انسان پر قبض کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، عبادت میں دل نہیں لگتا، توبہ کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اور دماغ میں یہی خیال سوار ہو جاتا ہے کہ میں اللہ کی رحمت سے دور ہوں۔ ایسے موقع پر شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، اور حکمت سے کام لینا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک بزرگ کا ایک مرید تھا، اس پر "قبض" کی کیفیت طاری ہو گئی، اور اس کے دماغ پر یہ خیال مسلط ہو گیا کہ میں شیطان ہوں، اور شیطان کے بارے میں یہ طے ہے کہ وہ جہنمی ہے، اس لئے اپنے جہنمی ہونے کا یقین ہو گیا، جس سے ملاقات ہوتی تو اس سے یہ کہتا کہ میں شیطان ہوں۔ جب ان کے شیخ کو پتہ چلا تو ان کو بلایا اور پوچھا کہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا کہ میں تو شیطان ہو گیا ہوں، اور میں اللہ کی رحمت سے دور ہو گیا ہوں، اور اب سوائے جہنم کے میرا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، شیخ نے اس سے کہا کہ یہ بتاؤ شیطان کس کی مخلوق ہے؟ ارے شیطان

بھی انہی کی مخلوق ہے، انہوں نے ہی تو شیطان کو پیدا کیا ہے، پھر کیوں ڈرتا ہے؟ بس یہ سن کر اس کی گرہ کھل گئی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی کیفیت زائل کر دی۔ بہر حال! علاج کے لئے بھی شیخ کو دیکھنا پڑتا ہے کہ اس وقت اس کے لئے کیا مفید ہوگا؟ اسی لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ یہ اعتقاد کہ مجھ پر ہرگز اللہ کی رحمت نہ ہوگی، یہ ناامیدی ہے، اور مذموم ہے، اس سے بچنا چاہئے۔

ناامیدی کس طرح پیدا ہوتی ہے؟

یہ ناامیدی کی کیفیت اس طرح پیدا ہوتی ہے کہ جو اعمال کرنے کی اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرما رہے ہیں، ان کی ناقدری کرنے سے رفتہ رفتہ یہ کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اکثر و بیشتر ہماری زبانوں پہ یہ رہتا ہے کہ ہماری نمازیں کیا ہیں؟ یہ تو ٹکریں مارنا ہے، یہ وقت گزاری کر رہے ہیں، یہ سب ناقدری کی باتیں ہیں، یہ ناقدری نہیں کرنی چاہئے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ارے بھائی! اس عبادت کی ادائیگی کی توفیق پر پہلے شکر ادا کرلو، کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو ایسی عبادت کرنے کی بھی توفیق میسر نہیں، اس لئے جب اللہ تعالیٰ نے تمہیں اس عبادت کو انجام دینے کی توفیق دیدی تو پہلے اس پر شکر ادا کرلو، اور یہ کہو: یا اللہ! آپ کی توفیق اور آپ کے فضل و کرم سے مجھے یہ توفیق ملی، آپ مجھے مسجد میں لے آئے، مجھ سے نماز پڑھوادی، اے اللہ! اس پر آپ کا شکر ہے۔

نماز کے بعد استغفار کرلو

شکر ادا کرنے کے بعد یہ کہو کہ یا اللہ! مجھ سے یہ نماز صحیح طور پر نہیں پڑھی

گئی، اور اس نماز کے اندر کمی کوتاہی ہوگئی، اس پر میں استغفار کرتا ہوں، لہٰذا نماز پڑھنے کے بعد "الحمدللہ" بھی کہو، اور "استغفراللہ" بھی کہو، اس کے بعد پھر اپنی نماز کی ناقدری مت کرو، اس لئے کہ یہ ناقدری رفتہ رفتہ انسان کو "مایوسی" کی طرف لے جاتی ہے، اور یہ خیال ہوتا ہے کہ میں کچھ بھی عبادت کرلوں، لیکن وہ قابل قبول نہیں ہوگی، اس مایوسی سے بچو، اور جو عبادت کرنے کی توفیق ہو، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو: اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَ لَکَ الشُّکْرُ، لہٰذا توفیق پر "شکر" اور کوتاہی پر "استغفار" کرتے رہو، ساری عمر یہ کرتے رہو، انشاء اللہ پھر "مایوسی" پیدا نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

مخلوق کا ڈر

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبد اللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱، لیاقت آباد، کراچی ۱۹

مقام خطاب : جامع مسجد دار العلوم کراچی
وقت خطاب : بعد نماز ظہر، رمضان المبارک
اصلاحی مجالس : جلد نمبر ۶
مجلس نمبر : ۹۳

بسم اللّٰہ الرّحمٰن الرّحیم

مخلوق کا ڈر
خالق کے ڈر سے زیادہ ہونا

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین ، والعاقبة للمتقین،
والصّلوٰة ولسّلام علی رسوله الکریم، وعلی آله
واصحابه اجمعین ـ اما بعد!

مخلوق سے زیادہ ڈرنا

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو خط میں لکھا کہ "مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے دل میں مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ہے" یہ حالت اکثر و بیشتر پیش آتی ہے، شاید سب کو پیش آتی ہوگی، مثلاً کسی شخص سے ایک گناہ سرزد ہوگیا، اب اس شخص کو یہ ڈر ہے کہ اگر مخلوق میں سے کسی کو اس گناہ عظیم کا علم ہو جائے گا تو بڑی بدنامی ہوگی، بڑی رسوائی ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کو یہ علم ہے ہی کہ اس سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے، اب طبعی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

اس وقت مخلوق کا ڈر اللہ تعالیٰ کے ڈر کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

مخلوق کا ڈر زیادہ ہونے کی مثال

مثلاً دنیا میں انسان کو یہ ڈر ہوتا ہے کہ مجھے کوئی درندہ نہ کھالے، کوئی ظالم مجھے نقصان نہ پہنچادے، یا پولیس کا خوف ہے، جیل میں جانے کا خوف ہے، یا افسر بالا کا خوف ہے، یا دشمن کا خوف ہے، اس قسم کا خوف جب انسان پر طاری ہوتا ہے تو ایک دم سے اس کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے۔ لیکن یہ خوف کہ اگر مجھ سے گناہ ہوگیا تو مجھے جہنم سے سابقہ پیش آئے گا، یا اللہ جل جلالہ کی ناراضگی کا سامنا ہوگا، یہ خوف دل و دماغ پر چھاتا نہیں ہے۔ مثلاً اگر گھر کے اندر ڈاکو گھس جائیں، اور گردن پر پستول رکھ کر کہیں کہ پیسے نکالو، تو اس ڈاکو سے جتنا ڈر لگے گا، گناہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس درجے کا یہ ڈر نہیں لگتا کہ میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کیسے پیش ہوں گا، کہیں اللہ تعالیٰ مجھے عذاب نہ دیدیں، کہیں مجھے جہنم میں نہ ڈال دیں، اس کا ڈر اتنا نہیں ہوتا۔ بہرحال! ان صاحب نے حضرت والا کو یہ لکھا کہ مجھے مخلوق کا خوف خالق کے خوف سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ حالت بڑی خطرناک ہے، کیونکہ قرآن کریم میں تو یہ حکم ہے کہ وَاللّٰہُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰہُ (الاحزاب: ۳۷) یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کے زیادہ حقدار ہیں کہ انسان اللہ سے زیادہ ڈرے۔ اور مجھے مخلوق سے زیادہ ڈر لگتا ہے، واقعۃً ان صاحب نے بڑا اہم سوال کیا، اس لئے کہ مخلوق کا زیادہ ڈر کہیں ایمان کی کمزوری کی علامت تو نہیں ہے؟

طبعاً مخلوق کا ڈر زیادہ ہونا مذموم نہیں

اب حضرت والا کا جواب سنئے! آپ نے جواب میں فرمایا کہ:

"مخلوق کا ڈر خالق سے طبعاً زیادہ ہونا مذموم نہیں کہ غیر اختیاری ہے، اور عقلاً واعتقاداً زیادہ ہونا البتہ مذموم ہے، لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِنَ اللّٰهِ (الحشر:۱۳) کا بھی محمل ہے" (انفاس عیسیٰ:۲۰۴)

یعنی یہ جو طبعی طور پر ایک آدمی کو مخلوق سے زیادہ ڈر محسوس ہو رہا ہے، اللہ تعالیٰ سے ڈر کم محسوس ہو رہا ہے، یہ کم اور زیادہ ہونا طبعی معاملہ ہے، اور انسان کے اختیار سے باہر ہے، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر گرفت نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کا خوف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ

چنانچہ حدیث شریف میں یہ واقعہ آیا ہے کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھیں، اور بے تکلفی کی باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کر رہی تھیں، اتنے میں یہ اطلاع ملی کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آرہے ہیں، اس وقت تک پردے کا حکم نازل نہیں ہوا تھا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے آنے کی اطلاع کا سن کر تمام ازواج مطہرات وہ بے تکلفانہ انداز ختم کر کے سب ادب سے بیٹھ گئیں، جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجلس میں آگئے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا کہ یہ عجیب معاملہ ہے کہ تمہارے آنے سے پہلے یہ

سب بڑی بے تکلفی سے باتیں کر رہی تھیں، اور تمہارے آنے پر یہ ڈر گئیں، اور مؤدب ہوکر بیٹھ گئیں، اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ازواج مطہرات سے کہا کہ:

اَیْ عَدُوَّاتِ اَنْفُسِهِنَّ ،اَتَهَبْنَنِیْ وَلَا تَهَبْنَ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

یعنی اے جانوں پر ظلم کرنے والیو! تم مجھ سے ڈرتی ہو، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں ڈرتی ہو؟ ازواج مطہرات نے جواب دیا:

نَعَمْ ،اَنْتَ اَفَظُّ وَاَغْلَظُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

جی ہاں! اس لئے کہ آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں سخت کلام اور سخت مزاج والے ہیں۔ اب دیکھئے کہ ازواج مطہرات کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے طبعی خوف زیادہ تھا، اس لئے کہ یہ غیر اختیاری معاملہ ہے۔

شیطان کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ڈرنا

ایک حدیث میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس راستے سے عمر گزرتے ہیں، شیطان ڈر کے مارے اس راستے سے نہیں گزرتا۔ میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ جس راستے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ گزرتے ہیں، اس

راستے سے شیطان نہیں گزرتا، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ یہ معاملہ نہیں تھا، اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ نہیں آیا کہ جس راستے سے آپ گزریں اس راستے سے شیطان نہیں گزرتا، کیا شیطان حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ڈرتا ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نہیں ڈرتا ہے؟ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا معمول یہ تھا کہ پہلے ظرافت کا جواب دیا کرتے تھے، اور پھر تحقیقی جواب دیا کرتے تھے، اس لئے جب اس شخص نے یہ سوال کیا تو پہلے آپ نے اس شخص سے فرمایا: پوچھو اس بیوقوف سے وہ ایسا کیوں کرتا تھا؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کیوں نہیں ڈرتا، اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیوں ڈرتا ہے؟

کسی سے زیادہ ڈر اس کی عظمت کی دلیل نہیں

پھر تحقیقی جواب دیا کہ دراصل یہ ڈر اور خوف طبعی کیفیت ہے، اور اس کے مختلف اسباب ہوتے ہیں، لہٰذا کسی شخص سے ڈر زیادہ ہونا اس کے اعظم ہونے کی دلیل نہیں کہ اس کی عظمت دل میں زیادہ ہے، یا اس کی محبت زیادہ ہے، بلکہ اس شخص کی ایک خاص طبیعت ہے، اس طبیعت کی وجہ سے آدمی کے دل میں رکاوٹ اور ڈر پیدا ہوتا ہے۔ ایک دوسرا آدمی ہے، جو پہلے والے شخص سے افضل اور اعظم ہے، لیکن اس کے دل میں نرمی ہے، جس کی وجہ سے لوگ اس سے بے تکلف ہو جاتے ہیں، اور اس سے اپنے دل کی بات کہنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتے، اس وجہ سے اس سے ڈر محسوس نہیں ہوتا، لہٰذا کسی سے ڈر کا زیادہ

ہونا اس کے اعظم ہونے کی دلیل نہیں، اگر شیطان حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ ڈرتا ہے تو یہ ان کا طبعی معاملہ ہے، اور اس بات کی دلیل نہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے افضل ہو گئے، اسی لئے اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ "مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے طبعاً زیادہ ہونا مذموم نہیں کہ غیر اختیاری ہے"

عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونا چاہئے

آگے فرمایا کہ "اور عقلاً اور اعتقاداً زیادہ ہونا البتہ مذموم ہے" یعنی عقلاً اللہ کا ڈر مخلوق کے ڈر سے زیادہ ہونا چاہئے، طبعاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونا کوئی ضروری نہیں، اب سوال یہ ہے کہ عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونے کا کیا مطلب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عقلاً اللہ کا ڈر زیادہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب آدمی دل میں یہ سوچے کہ مجھے مخلوق سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے یا اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف پہنچ سکتی ہے؟ جب ان دونوں میں موازنہ کرے گا تو اس وقت ظاہر ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے گا کہ اللہ کے عذاب سے زیادہ تکلیف ہو گی، لہٰذا عقلی طور پر اللہ کے عذاب سے بچنے کی فکر زیادہ کرنی چاہئے، جب یہ بات دل میں ہے تو بس انشاء اللہ مقصود حاصل ہے۔ اس کے بعد طبعی طور پر خوف کی جو کیفیت ہوتی ہے، مثلاً ڈر جانا، سہم جانا، دہل جانا، فکر طاری ہو جانا، دماغ پر خوف کا مسلط ہو جانا، یہ سب غیر اختیاری کیفیات ہیں، لہٰذا اگر یہ غیر اختیاری کیفیات

مخلوق سے زیادہ ہوگئیں ہیں تو اس میں گھبرانے کی بات نہیں۔ کیسی عجیب بات حضرت والا نے بیان فرمادی، اور کتنا بڑا خلجان دور کردیا، اس لئے کہ بعض اوقات جب آدمی یہ سوچتا ہے کہ میں خالق کے مقابلے میں مخلوق سے زیادہ ڈرتا ہوں، تو دماغ میں یہ خیال آئے گا کہ میرا تو ایمان ہی جاتا رہا، حضرت والا نے اس خلجان اور خیال کو دور فرمادیا۔

مخلوق محسوس ہیں، اللہ محسوس نہیں

پھر آگے عجیب بات ارشاد فرمائی کہ قرآن کریم کی آیۃ "لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَھْبَۃً فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِنَ اللّٰہِ" کا بھی یہی محمل ہے، یعنی مخلوق کا ڈر خالق کے ڈر سے زیادہ ہونا اعتقاداً مذموم ہے، طبعاً مذموم نہیں، اور طبعاً مذموم نہ ہونے کی تین وجوہ ہیں، پہلی وجہ یہ ہے کہ مخلوق محسوس ہے، اللہ تعالیٰ محسوس نہیں، یعنی مخلوق نظر آرہی ہے، مثلاً ایک شخص پستول تانے کھڑا ہے تو وہ شخص بھی نظر آرہا ہے، اور پستول بھی نظر آرہا ہے، اور یہ بھی نظر آرہا ہے کہ اگر پستول سے گولی چل گئی تو میں مرجاؤں گا۔ جبکہ اللہ جل شانہ بذات خود محسوس نہیں، اللہ تعالیٰ کو نہ آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے، نہ ہاتھوں سے چھوا جاسکتا ہے، اور نہ جہنم کا عذاب نظر آرہا ہے، اور انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ اس چیز کا اثر زیادہ لیتا ہے جو چیز محسوس ہورہی ہو، بنسبت اس چیز کے اثر کے جو محسوس نہ ہو، اگرچہ عقلاً اس کے وجود کو مانتا ہے، لیکن طبیعت پر اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا جتنا محسوس چیز کا ہوتا ہے۔

غائب کے مقابلے میں حاضر سے ڈر زیادہ ہوتا ہے

یا مثلاً کسی شخص کو اس بات کا خطرہ لگا ہوا ہے کہ کل کو یہ واقعہ پیش آجائے گا، لیکن ایک واقعہ ابھی آنکھوں کے سامنے پیش آرہا ہے، تو اس واقعہ کا ڈر، خوف اور اس سے بچنے کی فکر اور اس کی گھبراہٹ زیادہ ہوگی، بنسبت اس واقعہ کے خوف کے جو کل آنے والا ہے، اس لئے جو وقعہ ابھی پیش آرہا ہے، وہ محسوس ہو رہا ہے، اور جو واقعہ کل پیش آئے گا وہ محسوس نہیں ہے۔ یہ انسان کی طبعی بات ہے۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر مؤاخذہ بھی نہیں ہوگا کہ تمہارے اندر مخلوق کے خوف کی زیادتی کیوں ہے؟ اس لئے کہ "طبعاً حاضر کا اثر زیادہ ہوتا ہے غائب سے" جو شخص سامنے بیٹھا ہے اس کا جو اثر ہوگا وہ غائب کا نہیں ہوگا، چاہے غائب کی عظمت دل میں زیادہ ہو۔

مخلوق سے معافی کی امید کم ہے

دوسری وجہ یہ ہے کہ "مخلوق سے تسامح کی توقع کم ہے اور خالق سے زیادہ ہے" یہ بہت بڑی بات بیان فرمادی، اس لئے کہ مخلوق بڑی خراب چیز ہے، یہ کسی کو نہیں بخشتی، اگر مخلوق کے سامنے یہ بات آجائے کہ فلاں نے یہ گناہ کیا ہے، تو یہ مخلوق اس کو نہیں بخشے گی، بلکہ اس کو بدنام اور رسوا کرے گی، اس کو سزا دلوائے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ ایسا ہے کہ بندہ گناہ بھی کر رہا ہے، لیکن ساتھ میں شرمندہ بھی ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ میرا معاملہ میرے اللہ سے ہے، اللہ تبارک و تعالیٰ شاید مجھے معاف فرمادیں۔ تو وہاں معافی کی توقع زیادہ ہے، بنسبت مخلوق

کے، اس لئے بندوں کے سامنے گناہ ظاہر ہونے کے خیال سے انسان پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

جہنم میں جانا گوارا کر لے گا

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ذرا تصور کرو کہ تم اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوئے، اور تم نے درخواست کی کہ یا اللہ! مجھ سے جو گناہ سرزد ہوئے ہیں، اپنی رحمت سے مجھے معاف فرما۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ ہم تمہارے گناہ معاف تو کر دیں گے، اور تمہیں جہنم کا عذاب نہیں دیں گے، لیکن ایک شرط ہے، وہ شرط یہ ہے کہ تمہارے اعمال نامہ کی ایک فلم لوگوں کے سامنے چلائیں گے، اور اس فلم کو دیکھنے والوں میں تمہارا باپ ہوگا، تمہاری ماں ہوگی، تمہارے بہن بھائی ہوں گے، تمہارے بیوی بچے ہوں گے، تمہارے دوست احباب ہوں گے، تمہارے شاگرد ہوں گے، تمہارے مرید بھی ہوں گے، اور فلم چلانے کے بعد ہم تمہیں معاف فرما دیں گے، اور تمہیں جنت میں بھیج دیں گے، اگر اللہ تعالیٰ معاف کرنے پر یہ شرط لگا دیں تو کوئی آدمی ایسا بھی ہوگا جو کہے گا کہ یا اللہ! آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے جہنم میں بھیج دیں، یہ بہتر ہے اس سے کہ آپ ان لوگوں کے سامنے میری فلم چلائیں، اس لئے کہ مخلوق کے سامنے رسوائی سے زیادہ خوف ہوتا ہے، اور یہ خوف اس لئے ہوتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ یہ مخلوق بڑی سنگ دل ہے، اگر اس کے علم میں میری کوئی کمزوری آگئی تو یہ مجھے نہیں بخشے گی، اور اللہ جل جلالہ میرے خالق و

مالک ہیں، اصل عظمت انہی کو حاصل ہے، لیکن ان کے بارے میں مجھے یہ امید ہے کہ وہ مجھے معاف فرمادیں گے، ان سے کیا چھپانا، جو کچھ ہے ان کے سامنے ہے۔

مخلوق کی نظر میں ذلت ناگوار ہے

تیسری وجہ یہ ہے کہ مخلوق کی نظر میں ذلت ناگوار ہے، اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں ذلیل ہونا گوارا ہے، اس لئے کہ مخلوق کے سامنے کوئی گناہ آگیا تو ذلت ہوگی، وہ مخلوق یہ کہے گی کہ یہ بڑا بدعمل آدمی ہے، بڑا فاسق و فاجر آدمی ہے، بڑا گناہ گار، بڑا مکار ہے، بڑا منافق ہے، اور مخلوق کی نظر میں ذلت بڑی ناگوار بات ہے۔ دوسری طرف اگر اللہ جل شانہ کی نظر میں یہ بات آجائے کہ بندہ بڑا فاسق و فاجر ہے، یہ بڑا گناہ گار اور خطا کار ہے، تو یہ بھی ذلت ہے، لیکن یہ ذلت مطلوب ہے، اس لئے بندہ خود ہی اللہ تعالیٰ کے سامنے اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ! میں بڑا گناہ گار ہوں، بڑا خطا کار ہوں، مجھ سے بڑی غلطی ہوگئی، اقراری مجرم ہوں، مجھے معاف فرمایں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سامنے ذلیل ہونا مطلوب ہے، اور مخلوق کے سامنے ذلیل ہونا ناگوار ہے، اور شرعاً بھی ذلت مطلوب نہیں، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ صَغِیْرًا وَ فِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ کَبِیْرًا

اے اللہ! مجھے اپنی نگاہ میں تو چھوٹا بنا، اور لوگوں کی نگاہ میں بڑا بنا۔ اس لئے کہ لوگوں کی نگاہ میں عزت مطلوب ہے، ذلت مطلوب نہیں، البتہ اللہ تعالیٰ

کے سامنے ذلت عین مطلوب ہے، اسی لئے حضرت والا نے فرمایا کہ مخلوق کا ڈر زیادہ ہوتا ہے خالق کے ڈر کے مقابلے میں، اور یہ ایمان کی کمزوری کی علامت نہیں، اور نہ گھبرانے کی بات ہے۔

شیخ کامل ہی صحیح علاج بتا سکتا ہے

یہ باتیں شیخ کامل ہی بتا سکتا ہے، ورنہ اگر کسی معمولی آدمی کے سامنے یہ بات کہی جائے کہ مجھے مخلوق سے زیادہ ڈر لگتا ہے خالق کے مقابلے میں، تو وہ جواب میں یہ کہے گا کہ تو کافر ہوگیا، یہاں سے بھاگ جا، تو اللہ سے نہیں ڈرتا؟ اللہ تعالیٰ تو فرماتے ہیں وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (الاحزاب: ۳۷) لیکن جو شخص نفس کی باریکیوں سے واقف ہے، اور جو یہ جانتا ہے کہ یہ انسان ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی طبیعت کے اندر کیا کیا باتیں رکھی ہیں، اور حقیقت حال کیا ہے؟ اس نے چند لفظوں میں یہ سارا مسئلہ حل کر دیا، اور سارا شک وشبہ دور کر دیا۔ اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے، یہ ایک ایسا مقام ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی رہنمائی غلط ہو جائے تو آدمی کفر اور نفاق تک پہنچ جاتا ہے، مایوسی تک پہنچ جاتا ہے، اس کے اوپر یاس طاری ہو جاتی ہے، اور شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ لیکن شیخ کامل نے کانٹا بدل دیا کہ سارے شکوک وشبہات کافور ہو گئے، اور جو حقیقت حال ہے وہ بیان کر دی۔

علاج کا ایک طریقہ "تصور شیخ"

اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے علاج کا جو ایک طریقہ تجویز فرمایا ہے،

اس میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو لوگوں کے لئے غلط فہمی کی وجہ سے اعتراض کا سبب بن گئیں، چنانچہ "تصور شیخ" کا لفظ آپ نے سنا ہوگا، یہ علاج کا ایک طریقہ تھا، جو مشائخ اپنے مریدین سے بطور علاج کرایا کرتے تھے، اور مشائخ اپنے مریدین سے کہتے کہ جس وقت تم ذکر کرو تو ذکر کے وقت اپنے شیخ کا تصور کرو، اگر کسی گناہ کا تقاضہ دل میں پیدا ہو رہا ہے تو اس وقت بھی اپنے شیخ کا تصور کرو۔ اس پر لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ ذکر کے وقت تصور شیخ تو "شرک" ہے، اس لئے کہ ذکر تو اللہ کے لئے کیا جاتا ہے، لہٰذا تصور بھی اللہ کا کرنا چاہئے، نہ کہ شیخ کا تصور۔

حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ اور تصور شیخ

یہاں تک نوبت آئی کہ حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کے شیخ حضرت شاہ سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مرید شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو یہ تجویز کیا کہ آپ "تصور شیخ" کیا کریں، جواب میں حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت! اگر آپ مجھے کسی گناہ کے کرنے کا حکم دیتے تو میں اس خیال سے وہ گناہ کر لیتا کہ بعد میں توبہ کرلوں گا، لیکن اس عمل میں مجھے شرک کی بو آتی ہے، اس لئے یہ کام میں نہیں کرسکتا۔ حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ چلو تم اس سے مستثنیٰ ہو۔ اب دیکھئے! ان کو اس کے اندر شرک کی بو آئی، حالانکہ حقیقت میں اس کے اندر کوئی شرک نہیں ہے، لیکن چونکہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر توحید کا غلبہ تھا، اور اللہ تعالیٰ نے توحید پر استقامت عطا فرمائی تھی، اس وجہ سے انہوں نے یہ کہا۔

"تصورِ شیخ" کا مقصد یکسوئی حاصل کرنا

لیکن بعض لوگوں نے "تصورِ شیخ" پر اعتراض کرتے ہوئے باقاعدہ یہ کہہ دیا کہ یہ شرک ہے، اور جو لوگ "تصوف" پر اعتراض کرنے والے ہیں، وہ "تصورِ شیخ" ہی کی بنیاد پر یہ کہتے ہیں کہ یہ "تصوف" شرک کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ "تصورِ شیخ" کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ دماغ کو ذکر اللہ کے وقت یکسو کیا جائے، اس لئے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا خیال دل ودماغ میں اس لئے نہیں جمتا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات "محسوس" نہیں، کسی محسوس چیز کا تصور انسان کرے گا تو وہ تصور جم جائے گا، غیر محسوس چیز کا تصور نہیں جمے گا، مبتدی شخص جس کے دل ودماغ پر اللہ کا ذکر اور فکر چھایا نہیں ہے، اس کے لئے صوفیاء نے ایک محسوس تجویز کردی کہ اپنے شیخ کا تصور کیا کرو، اور پھر جو حضرات اس تصور کو تجویز کرتے تھے، وہ صرف اس حد پر اکتفاء نہیں کرتے تھے، بلکہ تصورِ شیخ کے ذریعہ جب ایک مرتبہ یکسوئی حاصل ہوگئی تو بعد میں اس یکسوئی کا رُخ اللہ تعالیٰ کی جانب پھیر دیتے تھے، اور پھر وہ ذاکر اللہ تعالیٰ کی جانب متوجہ ہو جاتا تھا۔

"تصورِ بھینس" سے علاج

جیسے میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک بزرگ کے پاس ایک دیہاتی اپنی اصلاح کرانے اور مرید ہونے کے لئے گیا، اس نے جاکر کہا کہ حضرت! مجھے مرید کرلو، ان بزرگ نے اس کو مرید کرلیا، اس کے بعد اس نے کہا کہ میں کیا کروں، میرا نہ ذکر میں دل لگتا ہے، نہ نماز میں دل لگتا ہے، میں

تو بس نماز میں اٹھک بیٹھک کرتا رہتا ہوں۔ ان بزرگ نے اس سے پوچھا کہ ساری دنیا میں تجھے کس چیز سے زیادہ محبت ہے؟ اس دیہاتی نے جواب دیا کہ میری ایک بھینس ہے، مجھے اس سے بہت زیادہ محبت ہے، ان بزرگ نے اس سے کہا کہ تو روزانہ رات کو اپنے کمرے میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ تک بھینس کا تصور کیا کر۔ اس دیہاتی نے کہا کہ میں تو اللہ میاں کی طرف متوجہ ہونا چاہتا ہوں۔ ان بزرگ نے فرمایا کہ میں جو کہہ رہا ہوں تو وہ کر، چنانچہ وہ کمرے میں بیٹھ گیا، اور بھینس کا تصور کرنے لگا، چنانچہ چند دنوں کے بعد اس کے دل و دماغ پر بھینس مسلط ہوگئی کہ بھینس آرہی ہے، بھینس جارہی ہے، بھینس دودھ دے رہی ہے، بھینس چر رہی ہے، بھینس نہارہی ہے، یہاں تک نوبت آگئی کہ جب شیخ اس کے کمرے میں داخل ہوئے تو اپنے شیخ سے کہنے لگا کہ نہیں، ابھی یہاں نہ آنا، یہاں بھینس آرہی ہے، جب اس حد تک بھینس اس کے دل و دماغ پر مسلط ہوگئی تو شیخ نے کہا کہ بس، اب کام بن گیا، چنانچہ بھینس کے تصور کے رخ کو اللہ کے تصور کی طرف پلٹ دیا۔ یہ سب اس لئے کیا کہ ابتداءً اللہ جل شانہ کی طرف دھیان لے جانا اس کے لئے ممکن نہیں تھا، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ محسوس نہیں ہیں، اس لئے پہلے اس کے ذہن کو تمام خیالات سے فارغ کر کے یکسو کر دیا، تو اب اس کا رخ موڑنا آسان ہوگیا۔

یکسوئی کے بعد رخ موڑ دو

یہ "تصور شیخ" بھی اسی لئے کرایا جاتا ہے کہ تمام خیالات سے فارغ

کر کے ذہن کو یکسو کر دیا جائے، پھر اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف موڑ دیا جائے، لیکن اعتراض کرنے والوں نے یہ کہہ دیا کہ یہ "بھینس" کا تصور بھی شرک ہے، اور "شیخ" کا تصور بھی شرک ہے، حالانکہ یہ ذہن کو فارغ کرنے اور اس کو یکسو کرنے کا ایک علاج تھا، اور جب ذہن یکسو ہو گیا تو اس کا رخ موڑ دیا، اس کے اندر یہ بات نہیں ہے کہ مخلوق کو خالق کے برابر ٹھہرا دیا، بلکہ یہ ایک علاج ہے۔

بدنظری کا ایک علاج

چنانچہ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب کبھی دل میں بدنظری کا داعیہ پیدا ہو تو اس وقت یہ تصور کر لیا کرو کہ اگر اس وقت میرے استاذ میرے سامنے آ جائیں، یا میرے والد آ جائیں، یا میری اولاد آ جائے، اور وہ مجھے اس حالت میں دیکھ لیں کہ میں غیر محرم کو دیکھ کر لذت لے رہا ہوں، تو اس وقت وہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔ جب تم یہ سوچو گے تو انشاء اللہ اس گناہ کرنے کا داعیہ کمزور ہو جائے گا۔

اللہ کے دیکھنے کا تصور کیوں نہ کرے

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت نے یہ تو فرمایا کہ اس گناہ کے وقت یہ سوچے کہ میرا استاذ دیکھ رہا ہے، میرا باپ دیکھ رہا ہے۔ یہ کیوں نہیں فرمایا کہ وہ یہ سوچے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ علم تو ہمیں حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہمیں دیکھ رہے ہیں، لیکن چونکہ اللہ جل شانہ کی ذات محسوس نہیں، اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کا تصور قائم کرنے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس

لئے مبتدی کے لئے آسانی اس میں ہے کہ وہ کسی ایسی شخصیت کا تصور کرلے جو محسوس ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ استاذ اور باپ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں زیادہ عظمت والے ہیں، اور ان حضرات کی ناراضگی اللہ کی ناراضگی کے مقابلے میں زیادہ خطرناک ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس لئے کہ ان کے علم میں آنے سے زیادہ بدنامی اور زیادہ رسوائی ہے، اور یہ لوگ اس طرح سے معاف نہیں کرسکتے جس طرح سے اللہ تعالیٰ معاف کرسکتے ہیں۔

حضرت معاویہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ کے درمیان مکالمہ

ایک مرتبہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھانا کھارہے تھے، اتنے میں حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے پاس پہنچ گئے، یہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دوست بھی تھے، اور ان دونوں کے رمیان لطیفے بھی ہوا کرتے تھے، جب وہاں پہنچے تو حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

اُدْنُ فَکُلْ۔ آؤ کھانا کھالو،

انہوں نے جواب دیا:

قَدْ اَکَلْتُ یَا اَمِیْرَ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ اے امیرالمؤمنین! میں کھانا کھاچکا ہوں،

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

اِنَّ مِنْ شَحَاحَةِ الْمَرْءِ اَنْ لَّا یَدَعَ الْمَرْءُ فِیْ بَطْنِهٖ مُسْتَزَادًا لِلْمُسْتَزِیْدِ۔

یہ بلیغ جملہ کہا کہ یہ بڑی طمع اور حرص کی بات ہے کہ آدمی جب کھانا کھائے تو اتنی گنجائش بھی نہ چھوڑے کہ دوسرا آدمی کھانا کھلانا چاہے تو اس کی فرمائش بھی قبول نہ کرے۔ اس طرح کھانا تو بری بات ہے۔

انہوں نے جواب دیا: چونکہ وہ حاضر جواب تو تھے،

قَدْ فَعَلْتُ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ!

امیر المؤمنین، میں نے ایسا ہی کیا ہے، یعنی میں نے یہ نہیں کیا کہ پورا پیٹ بھر لیا ہو، اور جگہ نہ چھوڑی ہو، بلکہ پیٹ میں جگہ چھوڑی ہے،

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پوچھا:

اَلِمَنْ هُوَ اَوْجَبُ حَقًّا مِنْ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ

یعنی یہ جو تم نے جگہ چھوڑی ہے کسی ایسے شخص کے لئے چھوڑی ہے جس کی فرمائش پوری کرنا امیر المؤمنین کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہو؟ یعنی جب میں نے تمہیں کھانے کے لئے بلایا تو تم نے انکار کر دیا، اب یہ جو جگہ تم نے چھوڑی ہے وہ کس کے لئے چھوڑی ہے؟ اس طرح حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو پھانس دیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب دیا:

لَا، وَلٰكِنْ لِمَنْ لَا يَعْذُرُ عُذْرَ اَمِيْرِ الْمُؤْمِنِيْنَ

یعنی میں نے یہ جگہ اس شخص کے لئے چھوڑی ہے جو امیر المؤمنین کی طرح معذرت قبول نہ کرے، اور معاف نہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ تو معاف کر دیں گے، اور معذرت قبول کر لیں گے، لیکن بعض لوگ ایسے ضدی ہوتے ہیں جو معذرت قبول نہیں کرتے، ان کی وجہ سے یہ جگہ چھوڑی ہے، آپ کی وجہ سے نہیں چھوڑی ہے۔

خلاصہ

بہرحال! آدمی بعض اوقات کسی دوسرے سے اس وجہ سے ڈرتا ہے کہ اگر اس کو پتہ چل گیا تو یہ مجھے نہیں چھوڑے گا، معاف نہیں کرے گا، لیکن دوسرا شخص جو پہلے کے مقابلے میں کتنے ہی بڑے درجے کا کیوں نہ ہو، اس سے اس لئے نہیں ڈرتا کہ اگر اس کو پتہ لگ گیا تو اس سے معافی مانگ لوں گا، اس کے آگے ہاتھ پاؤں جوڑ لوں گا، تو وہ مجھے معاف کر دے گا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے والے شخص کی عظمت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمارے دلوں میں اپنا خوف اور اپنی رجا دونوں پیدا فرما دے، اور دونوں میں اعتدال بھی عطا فرما دے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

اعمال کے دنیاوی اثرات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز
۱۸۸/۱۔ لیاقت آباد، کراچی ۱۹

بسم اللہ الرّحمٰن الرّحیم

اعمال کے دنیاوی ثمرات

الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین ، والعاقبة للمتقین ،

والصّلوٰۃ والسّلام علی رسوله الکریم وعلی آله

اصحابه اجمعین ۔ امابعد!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

''اعمال صالحہ میں نفع نقد بھی ہے، صرف اُدھار ہی نہیں، ہاں! ایک اُدھار بھی ہے، یعنی ثواب، اور اس کے ساتھ ایک چیز نقد بھی ہے، یعنی رجا اور امید، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا وابستہ ہو جانا، جو بدون اعمال صالحہ کے حاصل نہیں ہوتا، اسی طرح اعمال سیۂ کا ایک ثمرہ ادھار ہے، اور ایک نقد ہے، ادھار تو عذاب جہنم ہے، اور نقد وہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے'' (انفاس عیسیٰ: ۲۰۵)

اعمال کا ثمرہ نقد بھی، اُدھار بھی

اس ارشاد کا مقصود ایک غلط فہمی کا ازالہ ہے، وہ یہ کہ عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ اعمال اس دنیا میں کرتے ہیں، چاہے وہ نیک اعمال ہوں یا برے اعمال ہوں، ان کا نتیجہ اور ثمرہ، اور ان کا فائدہ اور نقصان آخرت میں ظاہر ہوگا۔ اگر اعمال اچھے ہیں تو ثواب ملے گا انشاء اللہ، اگر اعمال خراب ہیں تو عذاب ہوگا۔ گویا کہ جو کچھ بھی ہے وہ ادھار ہے، یہاں دنیا

میں نقد کچھ نہیں، حضرت والا اس ملفوظ میں اُس غلط فہمی کی تردید فرما رہے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے کہ اعمال کے تمام ثمرات اور ان کے تمام نفع نقصان ادھار ہی ہوں، بلکہ اعمال کے کچھ ثمرات انسان کو اس دنیا میں بھی مل جاتے ہیں۔

نیک عمل کا پہلا نقد فائدہ

وہ نقد ثمرات کیا ہیں؟ اس پر فرمایا کہ نیک اعمال کا سب سے پہلا ثمرہ یہ ملتا ہے کہ نیک عمل کرنے کے بعد انسان کو یہ امید ہو جاتی ہے کہ شاید اللہ تبارک وتعالیٰ اس عمل کی بدولت اپنے فضل وکرم سے اس عمل کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرما کر مجھے نواز دیں، اس کا نام ''رجا'' اور ''امید'' ہے، یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو انسان کو حاصل ہوتا ہے۔

اپنے عمل پر نظر خود پسندی ہے

یہاں ایک باریک بات کا سمجھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو نیک عمل کرنے کی توفیق دی ہے، اگر انسان کی نگاہ اس عمل کی طرف ہو جائے، اور وہ یہ سوچے کہ مجھ سے یہ بڑا اچھا کام ہو گیا، اور اس کے نتیجے میں آدمی عجب کے اندر مبتلا ہو جائے، یا یہ سمجھے کہ بس یہ میرا نیک عمل مجھے نجات دلائے گا، اور مجھے جنت میں لے جائے گا تو یہ بڑی خطرناک بات ہے، اور اسی کو صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ''رؤیت عمل'' اور ''خود پسندی'' کہا جاتا ہے، مثلاً ایک شخص نماز پڑھے، اور یہ سوچے کہ میں بڑی اچھی نماز پڑھتا ہوں، اور چونکہ میں اچھی نماز پڑھتا ہوں، اس لئے میں بڑا اچھا ہوں، یا یہ سوچے کہ میری یہ نماز مجھے جنت میں لے جائے گی، یہ سوچ بڑی خطرناک ہے۔ اب ایک طرف تو حضرت والا یہ فرما رہے ہیں کہ عمل کا نقد ثمرہ یہ ہوتا ہے کہ اس نیک عمل سے امید پیدا ہو جاتی ہے، اور دوسری طرف صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ''رؤیت عمل'' اور ''خود پسندی'' ناجائز ہے، بقول کسی کے:

هزار نکتہ باریك تر زمو ایں جاست
نہ هر کہ سر بتراشد قلندری داند

یہ بہت خطرناک وادیاں اور گھاٹیاں ہیں، جن سے انسان کو گزرنا پڑتا ہے۔

خود پسندی اور رجا میں فرق

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان فرق کس طرح کیا جائے؟ آیا کہ یہ سوچ ''خود پسندی'' میں داخل ہے یا یہ ''رجا'' اور ''امید'' میں داخل ہے؟ دونوں کے درمیان فرق اس طرح ہے کہ اگر کسی عمل کے کرنے کے بعد طبیعت میں بشاشت اور خوشی پیدا ہوئی، اور اس بشاشت کے نتیجے میں شکر ادا کیا کہ الحمد للہ مجھے اس نیک عمل کی توفیق ہوگئی، اور یہ امید بندھ گئی کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اس عمل کی توفیق دی ہے کہ اس بات کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے نواز دیں گے، بس اس حد تک تو یہ ''رجا'' ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِذَا سَرَّتْكَ حَسَنَتُكَ وَسَائَتْكَ سَيِّئَتُكَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ

جب تمہیں اپنے اچھے عمل سے خوشی ہو، اور برے کام سے رنج اور تکلیف ہو، تو یہ تمہارے ایمان کی علامت ہے۔ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات میں کوئی اچھا عمل کرتا ہوں، تو عمل کرنے کے بعد مجھے خوشی ہوتی ہے کہ الحمد للہ میں نے ایک اچھا عمل کیا، کیا یہ خوشی ''عجب'' اور ''تکبر'' تو نہیں ہے؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لَا تِلْكَ عَاجِلُ بُشْرَى الْمُؤْمِنِ

یعنی نیک عمل کر کے تمہیں جو خوشی حاصل ہوئی، یہ مؤمن کے لئے نقد خوشخبری ہے، لہٰذا گھبرانے کی بات نہیں۔

جنت فضل پر ملے گی، عمل پر نہیں

صوفیاء کرام جس کو "رؤیت عمل" اور "خود پسندی" کہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آدمی کو نیک عمل کرنے کے بعد اپنے عمل پر یہ گھمنڈ ہو جائے کہ یہ میرا عمل اتنا اچھا ہے کہ یہ مجھے سیدھا جنت میں لے جائے گا۔ اور میرا جنت میں جانا اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی بنیاد پر نہیں، بلکہ میرے عمل کی ذاتی خاصیت کی بنیاد پر میں اس بات کا مستحق ہو چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں داخل کر دیں۔ یہ بڑی خطرناک بات ہے۔ ارے استحقاق کوئی چیز نہیں، تم کتنا ہی عمل کرتے رہو، مگر جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ جنت کی نعمتیں غیر متناہی ہیں، اس کے آگے تمہارے عمل کی کیا حقیقت ہے؟ تم نے تو دو منٹ میں ایک عمل کر لیا، یا پانچ منٹ میں ایک عمل انجام دیدیا، اور پھر کہنے لگے کہ مجھے اس عمل کے بدلے جنت چاہیئے، وہ جنت جو غیر متناہی ہے، اور جس کی نعمتیں ابدی ہیں، جن کی کوئی حد و نہایت نہیں، چار رکعات کے بدلے ایسی جنت مانگتے ہو؟ تم کتنا ہی عمل کرتے رہو پھر بھی جنت کا استحقاق نہیں ہوگا، فرض کرو کہ تم کو اسّی سال کی زندگی ملی، اور تم نے اپنی پوری زندگی سجدے میں پڑے پڑے گزار دی، تو اس کا مطلب یہ ہوا تم سے زیادہ نے زیادہ اسّی سال عبادت کی، اور دوسری طرف جنت کی نعمتیں، نہ سو سال، نہ ہزار سال، نہ لاکھ سال، بلکہ دائمی اور ابدی ہیں، اگر انسان ساری عمر بھی عبادت کرتا رہے تو جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا انسان کا کوئی عمل ایسا نہیں جو انسان کو جنت کا مستحق بنا دے، یہ ان کا کرم ہے کہ بعض مرتبہ وہ کہہ دیتے ہیں کہ اے بندے! تو نے چونکہ یہ عمل کیا تھا، اس لئے ہم تمہیں جنت کا مستحق بنا دیتے ہیں۔ قرآن کریم کی بعض آیات میں استحقاق کی طرف اشارہ بھی فرمایا، مگر وہ استحقاق بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے پیدا کیا ہوا ہے، ورنہ عمل کے اندر اپنی ذات میں یہ طاقت نہیں کہ

وہ جنت کا مستحق بناتا، ساری زندگی روزے میں گزاردو، ساری زندگی عبادت میں ذکر و تسبیح میں گزاردو، تب بھی استحقاق پیدا نہیں ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور جنت

اسی لئے حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کسی انسان کا کوئی عمل اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے سوال کیا کہ آپ کا بھی عمل آپ کو جنت میں نہیں لے جائے گا؟ آپ نے جواب میں فرمایا:

لَا، اِلَّا اَنْ یَّتَغَمَّدَنِیَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهٖ

نہیں، میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ نہ لیں۔ آپ دیکھیں کہ ساری کائنات میں کسی کا بھی عمل کما اور کیفاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے برابر تو کجا اس کا پاسن بھی نہیں ہوسکتا، آپ یہ فرمارہے ہیں کہ میرا عمل بھی مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ نہ لے، اس سے پتہ چلا کہ عمل سے جنت کا استحقاق پیدا نہیں ہوتا۔

نیک اعمال فضل کی علامت ہیں

البتہ اللہ تعالیٰ نے ان نیک اعمال کو اپنے فضل و کرم کی علامت بنایا ہے، یعنی اگر کوئی شخص یہ اعمال کر رہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ انشاء اللہ، اللہ کا فضل اس شخص پر ہوگا، اور اس نیک عمل کے انجام پانے پر خوشی اس بات کی ہے کہ جب مجھے اللہ تعالیٰ نے نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی تو الحمدللہ میرے اندر وہ علامت پائی گئی جس سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے مجھے نواز دیں گے۔ لہٰذا یہ مسرت، علامت پائے جانے کی مسرت ہے، یہ اس بات کی مسرت نہیں کہ مجھ سے کوئی بہت بڑا کام انجام پا گیا ہے، جو مجھے

جنت کا مستحق بنادے گا۔ یہ باریک بات ہے، جو ذہن میں رہنی چاہئے۔

عمل سے جنت کا مستحق نہیں ہوتا

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی بندہ نیک عمل کرتا ہے تو اس کو نواز دیتے ہیں، اور اس کو اپنے فضل و کرم کا مورد بنا دیتے ہیں، اور بغیر عمل کے عادۃً فضل و کرم کا مورد نہیں بناتے، اب اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ جب میرا عمل مجھے جنت میں نہیں لے جائے گا تو پھر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لئے کہ عمل سے جنت کا استحقاق تو پیدا ہوتا نہیں ہے، بس اللہ تعالیٰ سے بیٹھ کر مانگتے رہو کہ یا اللہ! مجھے اپنی رحمت کا مورد بنا دیجئے۔ یاد رکھیں کہ اللہ کی رحمت کا مورد بننے کے لئے اور جنت کا مستحق بننے کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی شخص عمل کرے گا تو اس کو نوازا جائے گا، لہٰذا عمل ضروری بھی ہے، اور جنت میں جانے کے لئے علت تامہ بھی نہیں، اور جنت کے استحقاق کے لئے بھی علت تامہ نہیں، بلکہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کے فضل کی ایک علامت ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ کا حکیمانہ ارشاد

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی حکیمانہ بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ جو شخص عمل کرتا ہے اور اس عمل کی بنیاد پر جنت کی آس لگائے بیٹھا ہے کہ اس کا یہ عمل اس کو جنت میں لے جائے گا تو وہ شخص خواہ مخواہ فضول محنت کر رہا ہے، اور جو شخص یہ آرزو کر رہا ہے کہ میں عمل کے بغیر جنت میں چلا جاؤں گا تو وہ شخص اپنے آپ کو دھوکہ دے رہا ہے، اس لئے کہ دونوں باتیں غلط ہیں، کیونکہ کوئی بھی شخص عمل کے بغیر جنت میں نہیں جائے گا، اور تنہا عمل بھی اس کو جنت میں نہیں لے جائے گا، جب تک اس عمل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم اور اس کی رحمت شامل نہ ہو۔ لہٰذا عمل بھی کرنا ہے اور اس عمل کو علامت نجات بھی سمجھنا ہے،

لیکن اس عمل کو جنت کے استحقاق کا سبب نہیں سمجھنا ہے، لہٰذا جب اللہ جل شانہ کی طرف سے نیک عمل کی توفیق ہو تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور کہو کہ اے اللہ! آپ کا فضل وکرم ہے کہ آپ نے مجھے اس عمل کی توفیق عطا فرمادی۔ اور یہ امید رکھو کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی ہے تو اس نے ہمیں نوازنے کا ارادہ فرمایا ہے، اگر نوازنا نہ ہوتا تو نیک عمل کی توفیق نہ دیتے۔

نیک عمل کی توفیق ان کی طرف سے جواب ہے

حضرت مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات آدمی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں اللہ میاں کو اتنا پکارتا ہوں لیکن ان کی طرف سے کبھی جواب ہی نہیں آتا، کبھی تو جواب آتا، ہم دعا کر رہے ہیں تو انہیں پکار رہے ہیں، کبھی ذکر کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، کبھی نماز کے ذریعہ، کبھی تلاوت کے ذریعہ انہیں پکار رہے ہیں، لیکن کبھی جواب ہی نہیں آتا، یک طرفہ کاروبار ہو رہا ہے، یہ احمقانہ خیال بعض اوقات دل میں پیدا ہوجاتا ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس خیال کا جواب دے رہے ہیں کہ:

گفت اے اللہ تو لبیك ما است

یعنی تجھے ہمارا نام لینے کی جو توفیق ہو رہی ہے، یہی ہماری طرف سے جواب ہے، جب تم نے ایک مرتبہ ہمارا ذکر کیا، اس کے بعد دوبارہ تمہیں ہمارا نام لینے کی توفیق ہوگئی تو یہ خود ہماری طرف سے جواب اور لبیک ہے، اگر یہ جواب نہ ہوتا تو پھر دوبارہ تمہیں ہماری بارگاہ میں آنے کی توفیق ہی نہ ہوتی، تیرا ''اللہ'' کہنا ہی ہماری طرف سے ''لبیك'' ہے، اور تمہارے پہلے ذکر کی قبولیت کی علامت ہے۔

ایک نیک عمل کے بعد دوسرے نیک عمل کی توفیق

اسی لئے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب ایک نیک

عمل کے بعد دوبارہ اسی نیک عمل کی توفیق ہو جائے تو سمجھ لو کہ پہلا عمل قبول ہو گیا، اگر پہلا عمل قبول نہ ہوتا دوسری بار عمل کی توفیق نہ ملتی۔ مثلاً ظہر کی نماز آپ نے پڑھی، اور پھر عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق ہو گئی تو سمجھ لو کہ ظہر کی نماز قبول ہو گئی، اگر ظہر کی نماز قبول نہ ہوتی تو عصر کی نماز پڑھنے کی توفیق نہ ملتی۔ گذشتہ کل آپ نے روزہ رکھا تھا، آج پھر رکھ لیا تو سمجھ لو کہ گذشتہ کل کا روزہ قبول ہو گیا، اگر وہ روزہ قبول نہ ہوتا تو دوبارہ روزہ رکھنے کی توفیق نہ ملتی۔ بہر حال! انسان عمل کرتا رہے، عمل کرنا نہ چھوڑے، اور عمل کر کے اس بات پر خوش ہو کہ اللہ تعالیٰ نے نیک عمل کی توفیق عطا فرمائی، اور جب توفیق عطا فرمائی ہے تو انشاء اللہ نوازنے کا ارادہ بھی فرمایا ہے، بس اس سے آگے مت بڑھنا، اور یہ مت سوچنا کہ مجھ سے یہ بہت بڑا عمل ہو گیا، میں نے بڑا تیر مار لیا، اور اب میں جنت کا مستحق ہو گیا ہوں، اس لئے کہ یہ سوچنا "رؤیت عمل" اور "خود پسندی" ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ بہر حال! نیک عمل کا ایک نقد فائدہ تو یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے "رجا" اور "امید" بندھ جاتی ہے۔

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ

نیک عمل کا دوسرا نقد فائدہ "تعلق مع اللہ" کا پیدا ہونا ہے، تم جو بھی نیک عمل کرو گے، وہ نیک عمل اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرے گا، اور اللہ تعالیٰ کی محبت بڑھائے گا، اور تمام کامیابیوں کی جڑ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق کا مضبوط ہونا ہے۔ مثلاً آپ نے فجر کی نماز پڑھی، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہو گیا، پھر ظہر کی نماز پڑھی تو اب تعلق میں اضافہ ہو گیا، پھر عصر کی نماز پڑھی، پھر مغرب اور عشاء پڑھی، تو ہر مرتبہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ ہو رہا ہے۔ انسانوں کا معاملہ تو یہ ہے کہ اگر ایک انسان دوسرے انسان

سے ملاقات کرے تو ایک حد تک تو ملاقات کرنے سے محبت بڑھتی ہے، اور تعلق میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن ایک حد ایسی آجاتی ہے کہ انسان زیادہ ملاقات کرنے سے زچ ہو جاتا ہے، اور یہ سوچتا ہے کہ یہ شخص تو ہر وقت سر پر کھڑا رہتا ہے، آخر کار اس کو جھڑک دے گا کہ تو نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ لہٰذا زیادہ ملنے سے بعض اوقات ملال پیدا ہو جاتا ہے، اور اکتاہٹ ہو جاتی ہے، اور آدمی زچ ہو جاتا ہے۔ اسی لئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''زُرْ غِبًّا تَزْدُدْ حُبًّا'' یعنی ایک دن کے وقفے سے ملاقات کرو تو محبت میں اضافہ ہوگا۔

تم ہی اکتا جاؤ گے

لیکن اللہ جل شانہ کا معاملہ یہ ہے کہ جتنی مرتبہ ملاقات کرو گے، اتنا ہی تعلق میں اضافہ ہوگا، ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اِنَّ اللّٰہَ لَایَمَلُّ حَتّٰی تَمَلُّوا'' اللہ تعالیٰ تمہاری بار بار ملاقات کرنے سے نہیں اکتاتے، حتی کہ تم خود ہی اکتا جاؤ۔ لہٰذا جتنی عبادت چاہو کرو، جتنا چاہو اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھاؤ، وہ تعلق بڑھتا چلا جائے گا، اس میں ملال پیدا نہیں ہوگا، لہٰذا ہر نیک عمل اللہ تعالیٰ سے تعلق میں اضافہ کا سبب ہے، اور جتنا اللہ تعالیٰ سے تعلق بڑھتا جائے گا، اتنا ہی سرور اور کیف حاصل ہوگا، اتنا ہی سکون حاصل ہوگا، اور اتنا ہی گناہوں سے بچنے کی قوت پیدا ہوگی، اتنی ہی شیطان کے حملوں سے حفاظت ہوگی۔ نفس و شیطان اس وقت حملہ آور ہوتے ہیں، جب اللہ تعالیٰ سے تعلق میں کمی ہوتی ہے، ایسی صورت میں کبھی نفس بہکا دیتا ہے، اور کبھی شیطان بہکا دیتا ہے، لیکن جب اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہو گیا تو اب شیطان کمزور ہو جائے گا، اور وہ حملہ آور نہیں ہوگا۔ لہٰذا ہر نیک عمل کا نقد فائدہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق میں اضافہ کرتا ہے، دو نقد فائدے تو یہ ہوئے۔

نیک عمل کا تیسرا نقد فائدہ

تیسرے نقد فائدے کا حضرت والا نے یہاں ذکر نہیں فرمایا، لیکن دوسری جگہوں پر

اس کا ذکر آیا ہے، اور خود قرآن کریم نے اس فائدے کا ذکر کیا ہے، وہ یہ کہ نیک عمل انسان کے قلب کو اطمینان، سکون اور طمانیت عطا کرتا ہے۔

اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ

یعنی اللہ ہی کے ذکر سے دلوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور یہ اطمینان اور سکون ایسی متاع ہے کہ لاکھوں، کروڑوں خرچ کرنے سے بھی حاصل نہیں ہوتی، کہیں بازار میں یہ نہیں ملتی۔ البتہ نیک اعمال کی یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کے قلب کو سکون وطمانیت عطا کرتے ہیں، اور یہ طمانیت وہ دولت ہے کہ شاید دنیا میں اس کے برابر کوئی دولت نہ ہو۔ ایک آدمی کے پاس مال ودولت ہے، کوٹھی ہے، بنگلے ہیں، نوکر چاکر ہیں، لیکن دل میں سکون وطمانیت نہیں تو اس کے لئے یہ سب دولتیں بے کار ہیں۔ لیکن ایک دوسرا شخص ہے اس کے پاس مٹی کا گھر ہے، جھونپڑی ہے، لیکن دل میں اطمینان اور سکون ہے، تو یہ دوسرا شخص پہلے والے شخص سے ہزار درجہ بہتر ہے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے اپنے ذکر میں اپنی عبادت میں سکون کی خاصیت رکھی ہے، اور یہ نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو اس دنیا میں حاصل ہوتا ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ کا مقولہ

چنانچہ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا کے بادشاہوں کو پتہ لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کیسی لذت اور سکون والی زندگی عطا فرما رکھی ہے تو وہ بادشاہ تلواریں سونت کر ہم سے یہ دولت چھیننے کے لئے آجائیں کہ یہ ہمیں دو، لیکن ان بے وقوفوں کو یہ پتہ نہیں کہ یہ دولت اس طرح تلواروں کے ذریعہ حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ دولت تو اللہ جل شانہ کی بارگاہ سے حاصل ہوتی ہے، اس کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے حاصل ہوتی

ہے۔ بہر حال! یہ سکون کا حاصل ہونا نیک عمل کا نقد فائدہ ہے، جو دنیا ہی میں حاصل ہو جاتا ہے۔

نیک عمل کا چوتھا فائدہ

نیک عمل کا چوتھا فائدہ یہ ہے کہ ایک نیک عمل دوسرے نیک عمل کا ذریعہ بنتا ہے، جب تم ایک نیک عمل کرو گے تو وہ تمہیں دوسرے نیک عمل کی طرف کھینچے گا۔ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کی طرف کھینچتا ہے، اسی طرح جب تم نے ایک نیک عمل کیا تو تمہیں دوسرے نیک عمل کی توفیق ہو جائے گی۔ بہر حال! نیک عمل کے یہ چار نقد فائدے ہیں، جو انسان کو دنیا ہی میں مل جاتے ہیں۔

گناہوں کا پہلا نقصان

آگے فرمایا کہ اسی طرح اعمال سیئہ کا ایک ثمرہ ادھار ہے، اور ایک نقد۔ یعنی گناہوں کا ایک نتیجہ تو ادھار ہے، جو آخرت میں ملے گا، وہ ہے عذاب جہنم، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔ اور گناہوں کا نقد نتیجہ وحشت، ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کو لازم ہے، یعنی گناہوں کے اندر بے چینی اور ظلمت اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے، کسی کا مذاق ہی بگڑ جائے، اور ذائقہ ہی خراب ہو جائے تو اس کو پتہ نہیں چلتا کہ یہ ظلمت ہے اور بے چینی ہے، بلکہ وہ اس کو مزیدار سمجھتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ ظلمت اور بے چینی ہے، اور اس کا نتیجہ ظاہر ہو کر رہتا ہے۔

گناہوں کی لذت کی مثال

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے گناہوں کی لذت کی ایک بہترین مثال بیان فرمائی کہ

گناہوں کی لذت ایسی ہے جیسے کسی کو خارش کی بیماری ہو تو اس کو کھجانے میں مزہ آئے گا، یہاں تک کہ لوگوں نے کہہ دیا کہ دنیا میں دو ہی چیزوں میں مزہ ہے، یا کھاج میں، یا راج میں، یعنی یا تو کھجانے میں مزہ آتا ہے، یا راج اور حکومت کرنے میں مزہ آتا ہے، کھجانے میں اتنی لذت ہے کہ اس کو حکومت کے ساتھ ملا کر ذکر کیا، اور واقعۃً جب انسان کو خارش ہو تو کھجانے میں اتنا مزہ آتا ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں، اس سے بچنا مشکل ہوتا ہے، لیکن جب کھجانا چھوڑا تو اب اس جگہ پر مرچیں لگنی شروع ہو گئیں، اور وہ بیماری اور بڑھ گئی، پھر دوبارہ کھجایا تو پھر مزہ آیا، لیکن بیماری اور بڑھ گئی، اس طرح کھجانے کے نتیجے میں بیماری بڑھتی چلی جاتی ہے۔ یہی معاملہ گناہوں کا ہے کہ گناہ کرنے سے لذت آتی تو ہے لیکن وہ لذت بالآخر ٹیسیں، ظلمت اور بے چینی چھوڑ جاتی ہے۔

مذاق ہی بگڑ جائے تو

ہاں! اگر کسی کا مذاق ہی بگڑ جائے تو پھر اس کو گناہ کے بعد بے چینی اور ظلمت محسوس نہیں ہوتی، جیسے اگر کسی کو بدبو کا احساس ہی ختم ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کو بدبو کے اندر کھڑا ہونے میں مزہ آتا ہے، میں نے ایک مرتبہ دیکھا کہ ایک جگہ پر کوڑے کا ڈھیر تھا، اور اس کوڑے میں سے شدید بدبو اٹھ رہی تھی، کہ قریب سے گزرنا مشکل تھا۔ لیکن ایک آدمی جو پاگل تھا، وہ اس کوڑے کے ڈھیر کے درمیان میں کھڑا ہے، اور ایک کتا جو ایک بوٹی اٹھا کر لے جا رہا تھا، اس شخص نے اس کتے سے وہ بوٹی چھین لی، اور اس پر فاتحانہ خوشی کا اظہار کر رہا تھا کہ میں کامیاب ہو گیا، اور فاتحانہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا، اس شخص کو کوئی بدبو نہیں آ رہی تھی، کیوں؟ اس لئے کہ اس کی حس مٹ چکی تھی، اور اس کی حس خراب ہو گئی تھی، اس نتیجے میں یہ مردار اور یہ گندگی اس کو دولت معلوم ہو رہی تھی۔

جب تقوی کی حس مٹ جائے تو

اسی طرح جب انسان کے اندر سے ایمان کی اور تقوی کی حس مٹ جاتی ہے تو مذاق خراب ہو جاتا ہے، اور پھر آدمی گناہوں کو بھی لذت کی چیز سمجھتا ہے، اور پھر اس کو گناہوں کے اندر نہ ظلمت محسوس ہوتی ہے اور نہ وحشت محسوس ہوتی ہے، اور اللہ بچائے، یہ بڑی خطرناک بات ہے، اس لئے کہ حقیقت یہ ہے کہ گناہوں کے اندر ظلمت اور بے چینی ہے، اور وحشت ہے، لہٰذا گناہوں کا نقد نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد سکون قلب حاصل نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان لوگوں کو دیکھو جن کو دنیا کے اندر دولت، عزت، شہرت اور آرام کے اسباب میسر ہیں، اس کے باوجود وہ خودکشی کر رہے ہیں، کیوں خودکشی کر رہے ہیں؟ اگر پیسے نہ ہوتے اور پھر خودکشی کرتے تو ایک بات تھی، سب کچھ ہونے کے باوجود جو خودکشی کر رہے ہیں، وہ اس لئے کہ دل میں سکون میسر نہیں۔

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان

گناہوں کا دوسرا نقد نقصان یہ ہے کہ یہ انسان کی عقل خراب کر دیتا ہے، گناہ انسان کے سامنے اچھائی کو برائی، اور برائی کو اچھائی بنا کر پیش کرتا ہے، یہ بھی ظلمت ہی کا ایک حصہ ہے، اور یہ بھی گناہ کا نقد نقصان ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں گناہوں سے بھی اور گناہوں کے نقصانات سے بھی محفوظ فرمائے، آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمد للہ ربّ العٰلمین

جلد ۷

اِصلاحی مجالِس

بسلسلہ تہذیبِ اخلاق و تربیتِ باطن

- ”صبر“ ایک عظیم عبادت
- ایک تکلیف اور تین ثواب
- تکالیف ترقی درجات کا سبب ہیں
- مصیبت میں نورانیت
- راحت حاصل کرنے کا طریقہ
- تفویض کی حقیقت
- توکل کی حقیقت

حضرت مولانا مُفتی مُحمّد تقی عُثمانی مدظلہم

یمن اسلامک پبلشرز

اصلاحی مجالس

۷

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

میمن اسلامک پبلشرز

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

مجالس ❁ حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

ضبط وترتیب ❁ محمد عبداللہ میمن استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

مقام خطاب ❁ جامع مسجد دارالعلوم کراچی

وقت خطاب ❁ رمضان المبارک / بعد نماز ظہر

اشاعت اول ❁ 2011ء

ناشر ❁ میمن اسلامک پبلشرز

باہتمام ❁ محمد مشہود الحق کلیانوی : 0313-920 54 97

کمپوزنگ ❁ عبدالماجد پراچہ

قیمت ❁ =/ روپے

حکومت پاکستان کاپی رائٹس رجسٹریشن نمبر:

ملنے کے پتے

☆ میمن اسلامک پبلشرز، کراچی۔ :0322-241 88 20

☆ مکتبہ دارالعلوم، کراچی ۱۴۔ ☆ مکتبہ رحمانیہ، اُردو بازار، لاہور۔

☆ دارالاشاعت، اُردو بازار، کراچی۔

☆ ادارۃ المعارف، دارالعلوم، کراچی ۱۴۔

☆ مکتبہ معارف القرآن، دارالعلوم، کراچی ۱۴۔

☆ کتب خانہ اشرفیہ، قاسم سینٹر، اُردو بازار، کراچی۔

☆ مکتبۃ العلوم، سلام کتب مارکیٹ، بنوری ٹاؤن، کراچی۔

☆ مکتبہ عمر فاروق، شاہ فیصل کالونی، نزد جامعہ فاروقیہ، کراچی۔

عرضِ مرتب

استاذ مکرم حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، اللہ جل شانہ نے علم ظاہری و باطنی دونوں سے نوازا ہے، ایک طرف آپ شیخ الحدیث ہیں تو دوسری طرف آپ پیر طریقت بھی ہیں، جس طرح طبیب جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں، اسی طرح آپ روحانی بیماریوں کا علاج فرماتے ہیں، اور اس وقت سینکڑوں روحانی مریض آپ کے زیر علاج ہیں۔

''رمضان المبارک'' کو اصلاحِ باطن کے لئے خاص مناسبت حاصل ہے، اس لئے حضرت والا مدظلہم نے اصلاح باطن کی مجالس کے لئے اس مہینے کو منتخب فرمایا، چنانچہ کئی سالوں سے رمضان المبارک میں بعد نماز ظہر اصلاحی مجالس کا سلسلہ جاری ہے، اور سینکڑوں طالبین اصلاح اس مجلس سے فیضیاب ہورہے ہیں۔

احقر کو اللہ تعالیٰ نے حضرت والا کی صحبت اور آپ کے قرب کی عظیم نعمت سے محض اپنے فضل وکرم سے نوازا ہے، چنانچہ اس قرب سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احقر نے وہ مجالس ریکارڈ کرلیں، اور اب ان حضرات تک ان مجالس کو پہنچانے کی سعادت حاصل کررہا ہوں جو دور ہونے کی وجہ سے براہ راست ان مجالس سے فیضیاب نہیں ہوئے، اب ان مجالس سے اٹھانا، اور ان پر عمل کرکے اپنی زندگیوں میں تبدیلی لانا آپ کا کام ہے، اللہ تعالیٰ حضرت والا کے درجات بلند فرمائے، آپ کی عمر میں برکت عطا فرمائے، اور مجھے اور آپ سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

محمد عبداللہ میمن

دارالعلوم کراچی ۱۴، ۹ رشعبان ۱۴۲۱ھ

اجمالی فہرست

اصلاحی مجالس　　جلد نمبر : ۷

فہرستِ مضامین (تفصیلی فہرست)

عنوان	صفحہ نمبر

خوف کے درجات

مجلس نمبر ا

امید کے درجات

مجلس نمبر ۲

''صبر'' ایک عظیم عبادت

مجلس نمبر ۳

نعمتوں پر شکر ادا کریں

مجلس نمبر 101

صفحہ نمبر	عنوان
۱۵۵	ہر نعمت کو اپنی لیاقت سے زیادہ تصور کرنا چاہئے
۱۵۶	نعمتوں پر اترانا اچھی بات نہیں
۱۵۶	قارون کی طرح نعمت کو اپنی محنت کا نتیجہ تصور کرنا
۱۵۷	ہر نعمت پر شکر کی عادت ڈالو
۱۵۸	اللہ کا شکر شیطان کے داؤ سے بچاتا ہے
۱۵۸	زبان سے شکر کا طریقہ
۱۵۹	رات کو سونے سے پہلے یہ عمل کر لو
۱۶۰	حمد اور شکر کے بہترین کلمات
۱۶۱	حمد و تعریف کے عمدہ کلمات
۱۶۲	نعمت کو گناہوں میں استعمال مت کرو
۱۶۳	یہ آنکھ کی نعمت کی ناشکری ہے
۱۶۴	خلاصہ

کونسا ہدیہ اللہ کی نعمت ہے؟

مجلس نمبر ۸

صفحہ نمبر	عنوان
۱۶۷	تمہید
۱۶۷	ایک طالب اصلاح کا خط
۱۶۸	دوسرے کے احسان کی وجہ سے گرانی
۱۶۸	آج کل شیخ سے یہ کام لئے جاتے ہیں
۱۶۸	کہیں یہ ناشکری تو نہیں ہے؟

عنوان	صفحہ نمبر

اسباب کی موجودگی میں ''توکل'' مطلوب ہے

مجلس نمبر107

توکل کی حقیقت

مجلس نمبر109

بسم اللہ الرحمن الرحیم

خوف کے درجات

مجلس نمبر 95

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی.

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 95

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَاصَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَابَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

خوف کے درجات

مجلس نمبر 95

الحمد لله ربّ العلمين ، والعاقبة للمتقين ، والصّلاة والسّلام على رسوله الكريم ، و على آله اصحابه اجمعين ، اما بعد!

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

''ایک ''خوف'' تو بمعنی عقلی عذاب ہے، یہ تو شرط ایمان ہے، اور ایک درجہ خوف کا یہ ہے کہ تقاضائے معصیت کے وقت آیات اور عذاب خداوندی کو یاد کر کے سوچ سوچ کے گناہوں سے بچا جائے، یہ درجہ فرض ہے، اس کے فقدان سے کفر نہ ہوگا، ہاں! گناہ ہوگا۔ اور ایک درجہ خوف کا یہ ہے کہ مراقبات واشتغال سے آیات وعید اور عظمت وجلال حق کو ہر دم متحضر اور پیش نظر رکھا جائے، یہ درجہ مستحب ہے، اور سب درجات مکتسب ہیں، جو کسب سے حاصل ہو جاتے ہیں، اور ان سے آگے ایک اور درجہ

ہے، جو اختیار سے باہر ہے، وہ یہ کہ آثار خوف اس قدر غالب ہو جائیں کہ اگر ان کو کم کرنا یا بھلانا بھی چاہے تو اختیار و قدرت سے باہر ہو، یہ محض وہبی ہے، جو درجات سابقہ مکتسبہ کے حاصل کرنے کے بعد محض عطاء حق سے بعض کو حاصل ہو جاتا ہے، ایسا ہی اس کے مقابلے میں ''رجا'' کے بھی درجات ہیں، ایک درجہ شرط ایمان بمعنی احتمال نجات، اور ایک درجہ فرض ہے، اور ایک درجہ مستحب ہے، اور ایک درجہ محض وہبی ہے'' (انفاس عیسیٰ، ص:۲۰۶)

اللہ کا خوف مطلوب ہے

اس چھوٹی سی عبارت میں حضرت تھانوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ''خوف'' اور ''رجا'' کے سارے درجات کا بیان فرما دیا۔ پہلے ''خوف'' کے درجات بیان فرمائے ہیں، اور پھر ''رجا'' کے درجات بیان فرمائے ہیں، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ایک مؤمن کے اندر یہ دونوں چیزیں ہونی ضروری ہیں ''الایمان بین الخوف الرجاء'' قرآن کریم میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ سے اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کا ذکر ہے، اس لئے یہ ''ڈرنا'' مطلوب ہے، قرآن کریم میں ہے کہ:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ،فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى (النزعت: ۴۰، ۴۱)

لہٰذا انسان اس بات سے ڈرے کہ مجھے ایک دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا ہے، اور اپنے اعمال کا جواب دینا ہے، یہ ''ڈر'' مطلوب ہے۔

خوف کا پہلا درجہ شرط ایمان ہے

لیکن اس ''ڈر'' کے درجات مختلف ہیں، ''ڈر'' اور خوف کا ایک درجہ تو وہ ہے جو شرط ایمان ہے، اگر ''خوف'' کا یہ درجہ حاصل نہ ہو تو وہ آدمی مؤمن ہی نہیں، بلکہ کافر ہے، وہ خوف کیا ہے؟ وہ ''خوف'' یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اس بات کا احتمال ہو کہ شاید مجھے کہیں اللہ تعالیٰ میری بدعملی پر عذاب نہ دیدے، اور میرے کسی گناہ اور ناجائز عمل کی بنا پر مجھے مورد غضب نہ بنالے۔ یا یوں کہا جائے کہ اس بات پر ایمان ہونا کہ اگر کوئی شخص کفر کرے گا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب ہوگا، لہٰذا خدا نہ کرے اگر میں بھی کفر میں مبتلا ہوا تو مجھ کو بھی عذاب ہوگا، اس بات پر اعتقاد ''شرط ایمان'' ہے، اگر کسی کو یہ اعتقاد حاصل نہ ہو تو وہ مؤمن ہی نہیں، گویا کفر پر عذاب کا ترتب ہونا اور یہ احتمال دل میں رہنا کہ کہیں میں مورد عذاب نہ بن جاؤں، یہ احتمال دل میں رہنا ''شرط ایمان'' ہے، اگر یہ اعتقاد نہیں تو ایمان ہی نہیں، بہرحال! یہ ''خوف'' کا ادنیٰ درجہ ہے، جو مدار ایمان ہے۔

خوف کا دوسرا درجہ فرض ہے

''خوف'' کا دوسرا درجہ حضرت والا نے جو بیان فرمایا، وہ یہ ہے کہ جب دل میں گناہ کا تقاضہ اور داعیہ پیدا ہو، یا گناہ کا کوئی موقع سامنے آجائے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈر کر اپنے آپ کو اس گناہ سے بچانا۔ مثلاً دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ میں جھوٹ بولوں، اب اس وقت یہ تصور کرنا کہ جھوٹے پر اللہ کی لعنت ہے، اور اگر میں جھوٹ بولوں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے عذاب دیں گے، اس

عذاب کا تصور اور استحضار کر کے اپنے آپ کو اس جھوٹ سے بچانا "خوف" کا یہ درجہ فرض ہے، اگر "خوف" کا یہ درجہ کسی انسان کو حاصل نہ ہو تو وہ کافر تو نہیں ہوگا، لیکن فرض کا تارک کہلائے گا، گویا کہ وہ شخص ایسا ہے جیسے اس نے فرض نماز چھوڑ دی، فرض روزہ چھوڑ دیا، یا مثلاً دل میں بدنظری کا تقاضا پیدا ہوا، اس وقت اپنے دل میں بدنظری کے عذاب کا استحضار کر کے اس عذاب سے ڈر کر اپنے آپ کو اس "بدنظری" سے بچانا فرض ہے، اب اگر اس نے اس وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب کا استحضار نہ کیا، اور وہ گناہ کر گزرا تو وہ شخص فرض کا تارک ہوا، جیسے فرض نماز اور فرض روزے کا تارک۔

خوف کا نتیجہ مقصود ہے

یہی وہ بات ہے جس کو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى، فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى (النزعت: ٤٠، ٤١)

یعنی جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا، اور اس ڈر کے نتیجے میں اپنے نفس کو خواہشات نفسانی کے پیچھے چلنے سے روک دے تو جنت اس کا ٹھکانہ ہے، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بتا دیا کہ "خوف" بذات خود مقصود نہیں، بلکہ "خوف" کا نتیجہ مقصود ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کا خوف ہو، اور اس کے نتیجے میں انسان اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے چلنے سے روک دے، یہاں یہ ہی بتایا جا رہا ہے کہ وہ "خوف" جو انسان کو نفسانی

خواہشات کے پیچھے چلنے سے روک دے، خوف کا یہ درجہ فرض ہے۔ اس لئے ہر مسلمان کے لئے لازم ہے کہ وہ خوف کا یہ درجہ حاصل کرے، اگر کسی کو خوف کا یہ درجہ حاصل نہیں ہے تو وہ فرض کا تارک ہے۔

گناہ ہونا جیسے پہاڑ کا ٹوٹ پڑنا

جو اللہ کے نیک بندے ہوتے ہیں، اگر ان سے شریعت کے خلاف کوئی عمل ہو جائے تو ان پر ایسا گراں ہوتا ہے، جیسے ان کے اوپر پہاڑ ٹوٹ پڑا،

بر دلِ سالک ہزاراں غم بود
گر زباغِ دل خلالے کم بود

یعنی سالک کے دل پر ہزاروں غم طاری ہو جاتے ہیں، اگر اس کے دل کے باغ میں سے ایک خلال بھی کم ہو جائے، اور ایک گناہ بھی سرزد ہو جائے۔ اور جو شخص فاسق و فاجر ہے، اس سے اگر گناہ ہو جائے تو وہ اس کی نظر میں ایسا ہے جیسے کوئی مکھی اس کی ناک پر بیٹھی اور اس نے اس کو اُڑا دیا، اس کو اس گناہ کی کوئی پرواہ بھی نہیں ہوتی، یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے، لہٰذا یہ ڈر کہ میں گناہ کر کے اللہ تعالیٰ کے سامنے کیسے کھڑا ہوں گا، کیا منہ لے کر جاؤں گا، ڈر کا یہ درجہ فرض ہے، اس کی تحصیل ضروری ہے، اگر حاصل نہیں ہے تو اس کو حاصل کرو۔

خوف کو حاصل کرنے کا طریقہ

اب ڈر کا یہ درجہ کیسے حاصل ہو؟ اس کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی وہ آیات تلاوت کرو جس میں جہنم کے عذاب کا ذکر ہے، وہ احادیث پڑھو جس میں

اللہ کے عذاب کا تذکرہ ہے، اس کا استحضار کرو، اس کا تصور کرو، اس کے نتیجے میں دل کے اندر یہ "خوف" پیدا ہوگا۔

خوف کا تیسرا درجہ مستحب ہے

خوف کا تیسرا درجہ وہ ہے جس پر نہ تو ایمان موقوف ہے، اور نہ وہ فرض ہے، بلکہ وہ درجہ مستحب ہے، وہ یہ کہ ابھی گناہ کا تقاضا دل میں نہیں ہے، نہ گناہ کا داعیہ ہے، اور نہ موقع ہے، لیکن اس کے باوجود دل و دماغ میں یہ دھیان اور فکر ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا پاؤں پھسل جائے، اور میں گناہ کے اندر مبتلا نہ ہو جاؤں، اور پھر مجھے عذاب کا سامنا کرنا پڑے، لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کھٹکا دل میں رہے، اور اس کے نتیجے میں گناہ کا موقع آنے سے پہلے ہی گناہ سے بچ جائے، یہ خوف مستحب ہے۔

مستحب خوف کی مثال

اس کی مثال یہ سمجھیں جیسے ایک بچہ ہے، جو بڑا شریر ہے، اب ایک صورت تو یہ ہے کہ استاذ ڈنڈا لے کر اس بچے کے سر پر کھڑا ہو، اور اس سے کہے تو شرارت سے باز آجا، چنانچہ وہ بچہ مار کے ڈر اور خوف کے نتیجے میں شرارت سے باز آگیا۔ دوسرے یہ کہ استاذ اس کے اوپر ڈنڈا لے کر کھڑا نہ ہو، لیکن اس بچے کے دماغ میں ہر وقت یہ تصور ہو کہ میں استاذ کی نگرانی میں ہوں، اگرچہ اس وقت تو استاذ مجھے نہیں دیکھ رہے ہیں، لیکن کسی بھی وقت استاذ مجھے شرارت کرتے ہوئے دیکھ لیں گے، اور مجھے سزا دیں گے، تو یہ کھٹکا جو اس بچے کے دماغ پر چھایا

ہوا ہے، یہ خوف کا تیسرا درجہ ہے،

اس کا نام ''خلش'' اور ''تقویٰ'' ہے

لہٰذا یہ کھٹکا کہ مجھ سے کہیں گناہ نہ ہو جائے، کہیں میں پھسل نہ جاؤں، کہیں غلطی نہ ہو جائے، اور اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے، یہ خوف کا تیسرا درجہ ہے، جس کو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ ''خلش'' سے تعبیر کیا کرتے تھے، اور حضرت فرماتے تھے کہ ''تقویٰ'' کا ترجمہ ہے ''خلش'' یعنی کھٹک دل میں ہے کہ کہیں مجھ سے گناہ نہ ہو جائے، ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے محروم فرما دیں، اور کہیں ایسا نہ ہو کہ مجھے اپنے کرتوتوں کی وجہ سے اللہ کے عذاب کا سامنا کرنا پڑے۔

انبیاء ہر وقت اللہ سے ڈرتے ہیں

دیکھئے! انبیاء علیہم الصلوۃ والسلام گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں، لیکن پھر بھی اللہ تعالیٰ سے ڈر رہے ہیں، اور آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رو رہے ہیں، گڑگڑا رہے ہیں، وہ کس بات پر رو رہے ہیں؟ جبکہ گناہوں سے معصوم ہیں، گناہ تو ان سے سرزد ہی نہیں ہوسکتا، اس کے باوجود رو رہے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے ڈر رہے ہیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رات کو میری آنکھ کھلی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بستر پر نہیں پایا، اندھیرا تھا، اس لئے میں نے ہاتھ سے ٹٹولا کہ آپ کہاں ہیں، تو میرا ہاتھ آپ کے پائے مبارک کے انگوٹھے پر پڑا، اس وقت آپ سجدے میں پڑے ہوئے تھے، اور یہ دعا فرما رہے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ، وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوْبَتِكَ، وَاَعُوْذُبِكَ مِنْكَ، لَااُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ، اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ۔

اے اللہ! میں آپ کی رضا مندی کی پناہ مانگتا ہوں آپ کی ناراضگی سے، اے اللہ! آپ سے معافی کی پناہ مانگتا ہوں آپ کے عذاب سے۔ اب سوال یہ ہے کہ آپ کس چیز کی پناہ مانگ رہے ہیں؟ جبکہ آپ کے بارے میں یہ اعلان ہو چکا ہے کہ:

لِیَغْفِرَلَكَ اللّٰهُ مَاتَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَاتَأَخَّرَ (الفتح: ۲)

یعنی اللہ تعالیٰ نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ معاف کر دیے۔ اولاً تو آپ سے کوئی گناہ سرزد ہو ہی نہیں سکتا، اور اگر کوئی بھول چوک ہوئی بھی تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ ہم نے سب معاف کر دیے، اس کے باوجود رات کو سجدے میں پڑے ہوئے رضامندی طلب کر رہے ہیں، اور ناراضگی سے پناہ چاہ رہے ہیں۔

انبیاء کو ڈر کیوں؟

یہ سب کیوں ہے؟ دراصل وہی کھٹک ہے، اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا استحضار ایسا ہے کہ ہر وقت یہ خطرہ لگا ہوا ہے کہ کہیں کوئی عمل اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کے خلاف مجھ سے سرزد نہ ہو جائے، جو اس کے شایان شان نہ ہو، اس لئے کہ "حَسَنَاتُ الْاَبْرَارِ سَیِّئَاتُ الْمُقَرَّبِیْنَ" جو عمل ان کی شان کے خلاف ہوگا تو وہ میرے لئے گناہ ہی ہے، یہ "خلش" ہے، اور ڈر کا وہ درجہ ہے جو مستحب

ہے، اور جس کو حاصل کرنا چاہئے، اس لئے کہ جب تک یہ درجہ حاصل نہ ہو، اس وقت تک ''خوف'' کا فرض درجہ حاصل کرنا بھی مشکل ہے، اس لئے یہ ''کھٹک'' حاصل کرنی ہے۔

تعمیر کعبہ کے وقت اللہ سے ڈر

حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ شریف کی تعمیر فرما رہے ہیں، اتنا بڑا عمل انجام دے رہے ہیں کہ قیام قیامت تک جتنے لوگ اس بیت اللہ میں عبادت کریں گے سب کا اجر وثواب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نامہ اعمال میں لکھا جا رہا ہے، لیکن بیت اللہ کی تعمیر کے وقت زبان پر یہ دعا جاری ہے:

وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمِ

(البقرة:۱۲۸)

اے اللہ ہمیں مناسک حج کا علم عطا فرما دیجئے، اور ہماری توبہ کو قبول فرما لیجئے، آپ توبہ قبول کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ توبہ تو کسی گناہ سے کی جاتی ہے، جبکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کر رہے ہیں، ساری دنیا کے انسانوں کے لئے ایک معبد تعمیر کر رہے ہیں، لیکن اس وقت بھی دعا یہ کر رہے ہیں کہ یا اللہ! مجھے معاف کر دیجئے، ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ اس لئے کہ دل میں کھٹکا لگا ہوا ہے کہ میں یہ عمل کر تو رہا ہوں، مگر میرا یہ عمل اللہ جل شانہ کے شایان شان ہے یا نہیں؟ کوئی کام ایسا نہ ہو جائے جو اس کی شان کے خلاف ہو، اور اس کے نتیجے میں کہیں اللہ کے غضب کا مورد نہ بن جاؤں، سارے انبیاء علیہم

السلام مغفرت مانگ رہے ہیں، کیوں؟ دراصل یہ کھٹک ہے جس کو حضرت والا ''خلش'' سے تعبیر کر رہے ہیں، اسی خلش کا نام ''تقویٰ'' ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو عطا فرمائے، آمین۔

مستحب درجہ فرض درجے کے حصول کا ذریعہ

''خوف'' کا یہ درجہ مستحب ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت یہ کھٹک اور خلش رہے، یہ فرض نہیں، اس لئے کہ اگر فرض کہہ دیں گے تو پھر اگر ایک لمحہ کے لئے بھی ''خوف'' جاتا رہا تو ہم فرض کے تارک ہو جائیں گے، لہٰذا اس کو فرض تو نہیں کہیں گے، لیکن یہ ایسا مستحب ہے کہ اگر اس کا اہتمام نہ کیا جائے تو فرض کی ادائیگی بھی مشکل ہے، البتہ اللہ تعالیٰ نے ہماری آسانی کے لئے اس کو فرض قرار نہیں دیا کہ یہ لوگ کمزور ہیں، اور ہر وقت خوف کا استحضار نہ رکھ سکیں گے۔ البتہ اس کو مستحب قرار دیدیا، کیونکہ اگر ہر وقت اللہ کا خوف مستحضر نہ ہو تو گناہ کے تقاضے کے وقت خوف کو مستحضر کرنا مشکل ہوگا۔

ہر وقت جہنم کا استحضار کرو

اس لئے کہ ایک طرف گناہ کا تقاضہ اور داعیہ پیدا ہو رہا ہے، اور دوسری طرف تم عذاب کا استحضار لانا چاہ رہے ہو، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں میں سے جو قوی ہوگا وہ جیت جائے گا، اگر گناہ کا داعیہ قوی ہوگا تو وہ انسان کو گرادے گا، اور تم عذاب کا استحضار اپنے ذہن میں لانے کی فکر میں ہی رہو گے، اور وہ اپنا کام کر جائے گا۔ اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ہر وقت دل میں جہنم

کے عذاب کا استحضار رہے، اگر وہ دل میں رہے گا تو اس کے اندر پائیداری ہوگی، اور پائیداری کے نتیجے میں اس کے اندر قوت زیادہ ہوگی، اور اس قوت کے نتیجے میں وہ گناہ کے تقاضے پر غالب آجائے گا، اور اس تقاضے کو دبا دے گا۔ بہر حال! خوف کے اس درجہ کا نام تو "مستحب" ہے، لیکن یہ "مستحب" ایسا ہے کہ اس کے بغیر فرض کی ادائیگی بھی مشکل ہے، لہٰذا ہر وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا تصور کیا کرو۔

اپنی موت کا مراقبہ کیا کرو

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دن کے چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ وقت نکال کر یہ تصور کیا کرو کہ میری روح پرواز کر گئی ہے، اور مجھے موت آگئی ہے، اور میں قبر میں چلا گیا، اور پھر وہاں میرے ساتھ یہ معاملات پیش آئے، قبر میں فرشتے آئے، انہوں نے مجھ سے سوالات کئے، میں نے جواب دیئے، پھر حشر کے میدان میں مجھے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کر دیا گیا، میں اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوں، اور میرے اعمال میرے سامنے آرہے ہیں، اور جنت بھی میرے سامنے ہے، اور جہنم بھی میرے سامنے ہے۔ روزانہ تھوڑی دیر بیٹھ کر ان باتوں کا تصور کیا کرو۔ حدیث شریف میں ہے کہ

"حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا"

وہ حساب تو اپنے وقت پر ہوگا، اس سے پہلے اپنا حساب خود کر لیا کرو۔ اس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ دل میں وہ خلش اور کھٹک پیدا ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ

اپنے فضل سے ہم سب کے دل میں یہ خلش پیدا فرما دے، آمین۔

یہ تینوں درجات کسبی ہیں

آگے حضرت والا فرمارہے ہیں کہ "خوف" کے یہ تینوں درجات جو میں نے بیان کئے، ان میں پہلا شرط ایمان ہے، دوسرا فرض ہے، تیسرا مستحب ہے، یہ تینوں درجات کسبی ہیں، اور اختیاری ہیں، ان کو حاصل کرنا اختیار سے باہر نہیں، بلکہ انسان اپنی محنت سے، کوشش سے اور مشق سے یہ تینوں درجات حاصل کرسکتا ہے، البتہ "مستحب" درجے سے شروع کرو، اس لئے کہ سیڑھی یہی ہے، اس کے نتیجے میں فرض کا درجہ اور شرط ایمان والا درجہ بھی حاصل ہو جائے گا۔

خوف کا چوتھا درجہ جو وہبی ہے

آگے حضرت والا فرماتے ہیں کہ خوف کا ایک چوتھا درجہ ہے، جو وہبی اور غیر اختیاری ہے، اور کسب سے باہر ہے، اس لئے وہ درجہ مأمور بہ بھی نہیں ہے۔ اگر خوف کا یہ درجہ کسی کو حاصل نہ ہو تو کوئی مضائقہ بھی نہیں، اگر حاصل ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، وہ درجہ یہ ہے کہ انسان پر خوف کے آثار اس حد تک غالب ہو جائیں کہ اگر وہ بھلانا بھی چاہے تو نہ بھلا سکے، مثلاً یہ کہ ہر وقت سامنے جہنم نظر آرہی ہے، ہر وقت اللہ تعالیٰ کے عذاب کا استحضار ہے، اور اس حد تک ہے کہ اگر انسان اس کو اپنے دماغ سے نکالنا چاہے تو نہ نکال سکے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کیفیت

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ جو آتا

ہے کہ ''کَانَ دَائِمَ الْفِکْرَةِ مُتَوَاصِلَ الْاَحْزَانِ'' یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت کسی سوچ میں رہتے تھے، اور ایک غم کے بعد دوسرا غم آپ کے دل و دماغ پر چھایا رہتا تھا، یہ فکر کس چیز کی تھی؟ یہ امت کی فکر تھی، اللہ جل شانہ کی رضا حاصل کرنے کی فکر تھی، امت کو عذاب سے بچانے کی فکر تھی، یہ سارے افکار تھے، اور ان افکار کو بھلانے کے باوجود وہ نہیں بھولتے تھے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَنْ لَا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (الشعراء:۳)

کیا آپ اپنی جان کو ہلاک کر دیں گے اس وجہ سے کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دل و دماغ پر امت کی فکر اس درجہ غالب تھی کہ گویا جان ہلاک ہونے والی نظر آتی تھی، اور بار بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلی کے باوجود وہ فکر دماغ سے نہیں نکلتی تھی، یہ دراصل غیر اختیاری فکر تھی، جس طرح یہ فکر انبیاء علیہم السلام کو ہوتی ہے، اسی طرح انبیاء علیہم السلام کا پیغام پھیلانے والوں کو بھی ہوتی ہے، اور یہ فکر ایسی ہوتی ہے کہ اگر انسان کسی وقت اپنے آپ کو اس سے فارغ کرنا بھی چاہے تو نہیں کرسکتا۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی کیفیت

حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ کے بارے میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل میں دعوت کا جذبہ اس طرح رکھ دیا تھا، جیسے انسان کے اندر حوائج طبعیہ ہوتے ہیں، جیسے بھوک لگ رہی ہو تو انسان کو کھائے بغیر چین نہیں آتا، پیاس لگ رہی ہو تو پانی پیے بغیر چین نہیں

آتا، اسی طرح حضرت شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دیئے بغیر چین نہیں آتا تھا، ہر وقت دل و دماغ پر دعوت کی فکر مسلط رہتی تھی کہ فلاں تک کس طرح حق بات پہنچا دوں، فلاں کو کس طرح گمراہی سے نکال دوں، فلاں کو کس طرح راہ راست پر لے آؤں۔ بہر حال! انبیاء علیہم السلام کے وارثوں کو بھی یہ فکر ہو جاتی ہے، اگر انسان اس کو اپنے ذہن سے نکالنا بھی چاہے تو نہیں نکال سکتا، اس لئے یہ حالت غیر اختیاری اور وہبی ہے، اگر حاصل ہو جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی عطا اور نعمت ہے، لیکن اگر حاصل نہ ہو تو کوئی نقص بھی نہیں، اس لئے اس کو حاصل کرنے کی فکر میں زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں، البتہ "خوف" کے جو پہلے تین درجے ہیں، ان کو حاصل کرنا ضروری ہے۔

خوف حاصل کرنے کا طریقہ

اور خوف کو حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر بیٹھ کر یہ تصور کیا کرو کہ میری روح نکل گئی ہے، اب مجھے غسل دیا جا رہا ہے، اب کفن پہنایا جا رہا ہے، اب میری نماز جنازہ ہو رہی ہے، اب قبر کی طرف مجھے لے جا رہے ہیں، اب مجھے قبر کے اندر لٹا دیا گیا، قبر بند کر کے لوگ چلے گئے، اب فرشتے آ گئے، اب سوال و جواب شروع ہو گیا، پھر عالم برزخ شروع ہو گیا، پھر قیامت قائم ہو گئی، اب میزان عمل قائم ہے، اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہیں، اعمال کا وزن ہو رہا ہے۔ یہ تصور کیا کرو، اور دنیا کی بے ثباتی کا تصور کیا کرو۔

یہ کتاب بار بار پڑھو

ہمارے حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین۔ ان کی سب سے زیادہ مقبول کتاب جس سے سب سے زیادہ

فائدہ پہنچا، وہ ہے ”مرنے کے بعد کیا ہوگا؟“ یہ بڑی اچھی کتاب ہے، اور اللہ تعالیٰ نے پوری دنیا میں اس کتاب کا فیض پھیلا دیا، لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہی ہے کہ اس کو پڑھ کر ذرا سوچو کہ یہ زندگی جو صبح سے شام تک گزر رہی ہے، بس یہی زندگی نہیں ہے، بلکہ ایک اور زندگی مرنے کے بعد آنے والی ہے، جب آنکھ بند ہوگی تو پھر کیا ہوگا؟ اس کتاب کو بار بار پڑھو، اس کے نتیجے میں موت اور بعد الموت کے مناظر تمہارے سامنے آئیں گے، اس سے ”خوف“ کا استحضار پیدا کرنے میں مدد ملے گی۔

وطن کا شوق پیدا کرو

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ہے، جس کا نام ہے ”شوقِ وطن“ وطن سے مراد آخرت ہے، یعنی ہر مسلمان کے دل میں یہ بات رہنی چاہیے کہ یہ دنیا تو میرا مسافر خانہ ہے، اصل وطن تو آخرت ہے، اس کا شوق ہونا چاہیے، اس شوق کو پیدا کرنے کے لئے حضرت والا نے یہ رسالہ لکھا ہے، اس رسالہ کو پڑھو، اس کے پڑھنے سے ”خوف“ کا استحضار ہوگا۔ اور اگر روزانہ عشا کی نماز کے بعد دو تین منٹ کا وقت مقرر کر کے موت کا مراقبہ کرلو یا سونے سے پہلے کرلو، تو اس کے نتیجے میں انشاء اللہ تعالیٰ خوف کا مطلوب درجہ حاصل ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو عطا فرمائے، آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العٰلمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

"بل تؤثرون الحیوٰۃ الدنیا والاخرۃ خیر وابقیٰ"
(سورۃ الاعلیٰ: ۱۶،۱۷)

لیکن تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو
جبکہ آخرت کی زندگی بہت بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امید کے درجات

مجلس نمبر 96

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط وترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی.

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 96

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امید کے درجات

مجلس نمبر 96

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبۃ للمتقین، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

تمہید

گزشتہ کل یہ بیان ہوا تھا کہ ''خوف'' کے چار درجات ہیں، جن میں سے پہلا درجہ ایمان کی شرط ہے۔ اسکے بغیر آدمی مسلمان ہی نہیں ہوتا، دوسرا درجہ ایمان کی شرط تو نہیں، لیکن فرض ہے، اور تیسرا درجہ مستحب ہے، اور یہ تینوں درجات کسبی ہیں، یعنی اختیار سے کوشش کر کے محنت کر کے حاصل کئے جا سکتے ہیں۔ چوتھا درجہ خوف کا وہبی ہے اور غیر اختیاری ہے۔ لہٰذا وہ مقصود نہیں۔ اسلئے اسکو حاصل کرنے کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو گزشتہ کل کے بیان کا خلاصہ تھا۔

امید کے چار درجات

اس ملفوظ کے آخر میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''ایسا ہی اسکے مقابلے میں ''رجا'' کے بھی درجات ہیں۔
ایک درجہ شرط ایمان بمعنٰی احتمال نجات اور ایک درجہ فرض ہے،
ایک درجہ مستحب ہے اور ایک درجہ محض وہبی ہے۔''

(انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۶)

جس طرح ''خوف'' کے چار درجات تھے، اسی طرح ''رجا'' یعنی ''امید'' کے بھی چار درجات ہیں۔ پہلا درجہ جو شرط ایمان ہے، اسکے بغیر ایمان ہی کامل نہیں ہوتا۔ وہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اس بات کا اعتقاد ہو کہ عین ممکن ہے کہ اللہ جل شانہ مجھے کسی سزا کے دیئے بغیر یونہی بخش دے۔ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت عطا فرمادی ہے۔ تو ایمان کے بعد اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کچھ بعید نہیں کہ شاید میری ساری بداعمالیوں پر خط نسخ پھیر کر اللہ تعالیٰ مجھے یونہی بے حساب جنت میں داخل فرمادے۔ اس اعتقاد کا دل میں ہونا کہ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو کوئی ان کا ہاتھ پکڑنے والا نہیں، یہ اعتقاد ''شرط ایمان'' ہے۔ لہٰذا اگر کسی کے دل میں یہ اعتقاد نہیں تو وہ شخص ایمان ہی سے محروم ہے۔

امید کا پہلا درجہ

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ اعلان فرمادیا کہ:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (سورۃ نساء)

یعنی شرک کی اللہ تعالیٰ کے یہاں معافی نہیں ہے۔ اور یہاں جس معافی کا ذکر ہو رہا ہے، وہ توبہ والی معافی کا نہیں ہو رہا ہے۔ اس لئے کہ ''توبہ'' کے

ذریعے تو ''شرک'' بھی معاف ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص ''مشرک'' تھا۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کو توبہ کی توفیق دیدی۔ اور وہ مسلمان ہو گیا تو اسکا یہ ''شرک'' کا گناہ معاف ہو جائے گا۔ اس آیت میں بغیر توبہ کے معافی کا ذکر ہو رہا ہے، جو اللہ جل شانہ محض اپنے فضل وکرم سے کسی کو معافی سے نواز دیں۔ بہرحال ہم نے یہ قاعدہ مقرر کر رکھا ہے کہ جو شرک کرے تو بغیر توبہ کے شرک کی معافی ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم اسکو توبہ کے بغیر کبھی بھی معاف نہیں کریں گے۔ لیکن شرک کے علاوہ جتنے نچلے درجہ کے گناہ ہیں، جس کو چاہیں گے معاف فرما دیں گے۔ نہ تو اللہ تعالیٰ پر کوئی زبردستی کرنیوالا ہے کہ آپ ضرور معاف کریں، اور نہ کوئی شخص آپ کی مشیت میں رکاوٹ ڈالنے والا ہے کہ آپ کسی کو معاف کر دیں تو کوئی یہ اعتراض کرے کہ آپ نے اسکو کیوں معاف کر دیا؟ ان کے فیصلے میں کسی کو چوں وچرا کی مجال نہیں۔ لہٰذا یہ احتمال بدرجہ اعتقاد دل میں ہونا کہ کیا پتہ میں بھی ان خوش نصیبوں میں شامل ہو جاؤں جن کے بارے میں یہ فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ان کو بلا حساب جنت میں داخل فرما دیں گے۔ یہ احتمال اور اعتقاد دل میں ہونا ''رجا'' کا پہلا درجہ ہے اور شرط ایمان ہے۔

امید کا دوسرا درجہ

''رجا'' کا دوسرا درجہ جو ''فرض'' ہے وہ یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا اللہ تعالیٰ کی شریعت کی طرف سے کسی کام کا حکم متوجہ ہو، مثلاً نماز کا وقت ہو گیا، اذان ہو گئی، تو اب اللہ تعالیٰ کا حکم متوجہ ہو گیا کہ جاؤ، نماز ادا کرو۔ لہٰذا جب نماز کا حکم متوجہ ہوا، اگر اس وقت دل سستی کرے اور طبیعت میں سستی ہو تو

اس سستی کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے دل سے کہے کہ جب اس حکم کی تعمیل کرنے کے لئے جاؤں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے ثواب عطا فرمائیں گے۔ اب ثواب کا تصور کر کے اس سستی کو دور کرے اور مامور بہ کو بجالائے ایسا کرنا فرض ہے۔

امید کی ایک مثال

دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ اگر وہ دل میں ثواب کا تصور نہ لاتا اور جنت کا تصور نہ لانا، اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا دھیان نہ کرتا تو اس فریضہ کی ادائیگی سے محروم رہ جاتا۔ کیونکہ سستی نے اسکے دل پر غلبہ پالیا تھا۔ نفس وشیطان نے اسکو دبالیا تھا۔ جس کے نتیجے میں یہ اس بات پر آمادہ ہو گیا تھا کہ آج کی نماز چھوڑ دی جائے، لیکن جب اس بات کا تصور کیا کہ میں کیا کر رہا ہوں، اگر میں نفس کے تقاضے کی مخالفت کر کے نماز ادا کرنے کے لئے چلا جاؤنگا تو اللہ تعالیٰ مجھے نواز دیں گے۔ تو اس تصور نے ہمت پیدا کر دی۔ اور نماز کے لئے چلا گیا۔ تو یہ جو ''رجا'' پیدا ہوئی کہ اس نماز کے پڑھنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ مجھے ثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ ''رجا'' کا درجہ فرض ہے۔ اگر یہ رجا نہ ہوتی تو ایک فریضہ چھوٹ جاتا۔ لہٰذا جتنے فرائض شرعیہ ہیں۔ جیسے، نماز، روزہ، زکاۃ، حج وغیرہ ان سب میں یہ امید رکھنا کہ جب ان کو بجا لاؤں گا تو اللہ تعالیٰ مجھے اپنی رحمت سے نواز دیں گے انشاء اللہ، ''رجا'' کا یہ درجہ فرض ہے۔

اعمال صالحہ پر ثواب کی امید

یہی وہ بات ہے جس کی طرف نبی کریم ﷺ نے احادیث میں کئی جگہوں پر اشارہ فرمایا ہے۔ وہ یہ کہ جس نیک عمل کی اللہ تعالیٰ تمہیں توفیق دے

رہے ہیں۔ مثلاً وضو ہے، نماز ہے، روزہ ہے، زکاۃ ہے، حج ہے، تلاوت ہے، تسبیح ہے، ذکر واذکار ہیں وغیرہ جتنے بھی اعمال وافعال صالحہ ہیں۔ ان میں اس بات کا تصور کیا کرو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید کر رہا ہوں کہ میرے اس عمل کو اللہ تعالیٰ قبول فرما کر اپنے فضل وکرم سے مجھے نواز دیں گے۔ حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مَنْ صَامَ رَمَضَانَ اِيْمَا نًا وَ احْتِسَا بًا

یعنی جو شخص رمضان المبارک کے روزے رکھے، کس طرح رکھے؟ ایمان کی بنیاد پر کہ دل میں ایمان موجود ہے، وہ ایمان روزے رکھوا رہا ہے، اور احتساب کی بنیاد پر، یعنی ثواب حاصل کرنے کی غرض سے روزہ رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل وکرم سے نواز کر ثواب عطا فرمائیں گے۔ یہ ''احتساب'' کیا چیز ہے؟ یہ وہی ''رجا'' ہے، یہ ثواب حاصل کرنے کی طلب ہے، اسکی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ ثواب عطا فرمائیں گے، یہ امید رکھنا ''فرض'' ہے۔

''عبادت'' عادت بن گئی ہے

حضرت مولانا سیّد ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک بات سنی، انہوں نے بڑی اچھی بات ارشاد فرمائی۔ فرمایا کہ ہم لوگ عبادات انجام دیتے رہتے ہیں ، مثلاً وضوء کر لیا، نماز پڑھ لی، روزہ رکھ لیا، تلاوت کر لی وغیرہ، اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ روزانہ یہ عبادات انجام دے رہے ہیں، اور روزانہ ہونے کے نتیجے میں ان کی عادت بن گئی ہے، اور عادت بن جانے کی وجہ سے اس طرف خاص دھیان بھی نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں، کیا نہیں کر رہا ہوں۔ بس ایک روٹین

بن گئی ہے، اس کے تحت عبادت ہو رہی ہے، اور عادت بن جانے کی وجہ سے عبادت میں کیف اور لذت محسوس نہیں ہوتی، اور لذت سے اور کیف سے محرومی ہو جاتی ہے۔ اسلئے حضرت والا نے فرمایا کہ عبادت اس اہتمام سے ادا کرنی چاہیے کہ اس عبادت پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حدیث میں اجر و ثواب کے جتنے وعدے فرمائے ہیں، ان اجر و ثواب کا دھیان کرے۔

اس دھیان کے ساتھ وضو کرو

مثلاً آپ وضو کر رہے ہیں۔ اور دن میں آپ کئی مرتبہ وضو کرتے ہیں، لیکن وضو کرتے وقت یہ کیفیت ہوتی ہے کہ دل کہیں، دماغ کہیں، دھیان کہیں، اور وضو کر کے ختم کر لیا۔ ایک عادت اور روٹین بن گئی ہے۔ لہٰذا وضو کرتے وقت جب چہرہ دھوتو یہ دھیان کرو کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب انسان وضو کرتے وقت چہرہ دھوتا ہے تو آنکھ سے کئے ہوئے تمام گناہ دھل جاتے ہیں۔ لہٰذا میرے وضو کرنے کے نتیجے میں میرے گناہ دھل رہے ہیں۔ اور جب ہاتھ دھوتو یہ تصور کرو کہ ہاتھ سے کیئے ہوئے گناہ دھل رہے ہیں۔ جب پاؤں دھوتو یہ تصور کرو کہ پاؤں کے گناہ دھل رہے ہیں۔ جب اس تصور کے ساتھ وضو کرو گے تو اس وضو کی لذت اور کیف ہی اور ہوگا۔ اور عبادت کی حقیقی روح حاصل ہوگی۔

مسجد کی طرف اس دھیان کے ساتھ جاؤ

جب نماز کے لئے مسجد کی طرف جا رہے ہو تو یہ سوچو کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب آدمی مسجد کی طرف جاتا ہے تو ایک قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے، اور ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ لہٰذا چلتے وقت یہ تصور کرو کہ ایک ایک قدم پر

میرے گناہ معاف ہو رہے ہیں۔ اور ایک ایک قدم پر مجھے نیکی مل رہی ہے۔ اس تصور سے چلو گے تو اس چلنے میں بھی ایک لطف اور مزا آئیگا۔ اور عبادت کی روح حاصل ہوگی۔

اس دھیان سے تلاوت کرو

مثلاً تلاوت قرآن کریم کر رہے ہو تو یہ سوچو کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک حرف کی تلاوت پر اللہ تعالیٰ دس نیکیاں دیتے ہیں۔ ''الٓمٓ'' کی تلاوت کی تو تیس نیکیاں لکھی گئیں۔ لہٰذا تلاوت کے وقت یہ تصور کرو کہ میں جو تلاوت کر رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ میری نیکیوں میں اضافہ فرما رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ تصور کرو، نہ کہ اپنے عمل پر بھروسہ کرتے ہوئے۔ اسلئے کہ عمل محض علامت ہے، علت تامہ نہیں ہے۔ بہرحال ہر عبادت پر اللہ تعالیٰ نے جو وعدے فرمائے ہیں، عبادت انجام دیتے وقت ان وعدوں کا دھیان کرنا اس عبادت کی تکمیل میں معاون مفید ہوتا ہے۔ یہ ''رجا'' کا دوسرا درجہ تھا، جو فرض ہے۔

''رجا'' کا تیسرا درجہ

''رجا'' کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ آدمی پر اکثر و بیشتر اوقات میں اللہ تعالیٰ کی جنت کا خیال دل میں رہے، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کا خیال رہے، اور اکثر و بیشتر وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے تصور میں زندگی گزارے، جیسا کہ ''خوف'' کے بیان میں کہا تھا کہ اکثر و بیشتر خوف دل میں رہے، یہ ''رجا'' کا تیسرا درجہ ہے۔

''رجا'' کا چوتھا درجہ

''رجا'' کا چوتھا درجہ جو غیر اختیاری ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت اور جنت کی نعمتوں کا تصور دل و دماغ پر اتنا چھا جائے کہ کوشش کے باوجود یہ تصور زائل نہ ہو، اور آدمی ہر وقت ان رحمتوں اور نعمتوں کے تصور کے اندر مست ہو، یہ ''رجا'' کا غیر اختیاری درجہ ہے۔ فرائض اور واجبات کی ادائیگی میں اس کو کوئی رکاوٹ اور سستی پیدا نہیں ہو رہی ہے کہ اسکے لئے ان چیزوں کا تصور کرنا پڑ رہا ہو۔ بلکہ یہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی تو اس کے لئے طبیعت ثانیہ بن چکی ہے۔ لیکن اسکے باوجود وہ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے تصور میں مست ہے۔ یہ ''رجا'' کا چوتھا درجہ ہے، یہ چوتھا درجہ مقصود نہیں۔ البتہ ابتدائی تین درجات مقصود ہیں، ان کے حاصل کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

خوف و رجا کے حاصل کرنے کا طریقہ

جیسا کہ کل عرض کیا تھا کہ خوف کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ موت کا اور موت کے بعد کے حالات کا، اور جہنم کا مراقبہ کرنا چاہیے۔ اور رجا کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جنت کا تصور کرے، اور یہ قرآن کریم کے طرز کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ قرآن کریم میں جہاں جہنم کا ذکر آیا ہے وہاں جنت کا ذکر ضرور فرمایا ہے۔ بہر حال ''رجا'' کے چار درجات ہیں، ایک شرط ایمان، دوسرا درجہ فرض، تیسرا درجہ مستحب، اور چوتھا درجہ غیر اختیاری ہے۔

امید کا پانچواں درجہ جو حرام ہے

ایک درجہ ''رجا'' کا وہ ہے جو ناجائز اور حرام ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی اپنی اصلاح سے تو غافل ہے، حرام اور حلال کی تمیز ہی نہیں۔ خواہشاتِ نفسانی کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ جہاں نفس لیجا رہا ہے، اسی طرف جا رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ پر امیدیں باندھے بیٹھا ہے کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے۔ اس کے بارے میں حدیث شریف میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

اَلْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهٗ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ......

فرمایا کہ عاجز بندہ وہ ہے کہ اپنے نفس کو تو خواہشات کے پیچھے لگا لے۔ جیسی خواہش پیدا ہو رہی ہے، اسی کے مطابق کرتا جا رہا ہے۔ بے دھڑک گناہ کر رہا ہے۔ کوئی رکاوٹ دل میں نہیں ہے۔ اس سے کہو کہ یہ کام گناہ ہے تو کہتا ہے کہ ارے اللہ میاں بڑا غفور و رحیم ہے۔ رجا اور امید کا یہ درجہ حرام ہے۔ جو آدمی کو گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ شیطان دھوکہ میں ڈالتا ہے

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُم بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔

(سورۃ الفاطر: ۵)

یعنی یہ دنیاوی زندگی تمہیں دھوکہ میں نہ ڈالے۔ اور وہ دھوکہ باز یعنی شیطان تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکے میں نہ ڈالے۔ شیطان یہی دھوکہ دیتا ہے کہ ارے گناہ کرتے جاؤ، ابھی تو جوانی ہے، جب بڑھاپا آئے گا تو دیکھا

جائے گا۔ اللہ میاں بڑا غفور و رحیم ہے۔ سب معاف کردے گا۔

امید کے درجات

یاد رکھیے، جو ''امید'' انسان کو گناہ پر آمادہ کرے وہ ''رجا'' نہیں ہے۔ بلکہ وہ دھوکہ ہے، وہ غرور ہے، رجا کا یہ درجہ حرام ہے۔ بہر حال ''رجا'' میں ایک درجہ شرط ایمان، دوسرا درجہ فرض، تیسرا درجہ مستحب، چوتھا درجہ غیر اختیاری، پانچواں درجہ حرام، پہلے چار درجے حاصل کرنے ہیں۔ اور پانچویں درجے سے بچنا ہے، احتراز کرنا ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے بچائے۔ آمین.

خوف کا حرام درجہ

اسی طرح خوف کا ایک درجہ ''فرض'' ہے، ایک درجہ ''واجب''، ایک درجہ ''مستحب''، ایک درجہ ''غیر اختیاری''، اور ایک درجہ ''حرام'' بھی ہے۔ حرام درجہ وہ ہے جو انسان کو مایوسی میں مبتلا کردے، یاس پیدا کردے۔ وہ خوف حرام ہے۔ اب آپ نے دیکھا کہ خوف اور رجا کے اندر کتنی باریکیاں ہیں اب کون شخص ان کے درمیان امتیاز کر کے بتائے کہ تمہیں ''خوف'' کا جو درجہ حاصل ہے وہ صحیح ہے۔ اسی طرح کون یہ بتائے کہ تمہیں ''رجا'' کا جو درجہ حاصل ہے وہ صحیح ہے۔ اس کام کے لئے شیخ کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو متعین کر کے بتاتا ہے کہ اس درجے تک کا خوف صحیح ہے، اس سے آگے غلط ہے۔ شیخ کا کام ہی یہ ہے۔ بہر حال اوپر کی تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دونوں چیزیں مطلوب ہیں۔ خوف بھی اور رجا بھی، تنہا ایک سے کام نہیں چلتا۔

دونوں میں برابری ضروری نہیں

البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں کے درمیان توازن ہمیشہ برابر ہی رہے کہ ترازو کے ایک پلّہ میں ''خوف'' رکھا، اور دوسرے میں ''رجا'' رکھی، اور دونوں کو برابر کردیا، ایسا ہونا ضروری نہیں۔ کیونکہ بعض اوقات خوف کا رجا پر غلبہ ہوجاتا ہے۔ اور بعض اوقات رجا کا خوف پر غلبہ ہوجاتا ہے۔ خوف کے غلبہ کا مطلب یہ ہے کہ خوف زیادہ ہے، لیکن امید ختم نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ جن بندوں کو کمال عطا فرماتے ہیں، ان کے ترازو کے دونوں پلّے برابر ہوتے ہیں۔ نہ ایک پلّہ جھکا ہوتا ہے، نہ دوسرا پلّہ جھکا ہوتا ہے۔ جیسے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ تھے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا خوف اور امید

چنانچہ ایک مرتبہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہوجائے کہ میرے سارے بندے جہنم میں جائیں گے، صرف ایک بندہ جنت میں جائے گا تو مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہوگی کہ وہ ایک بندہ میں ہونگا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اعلان ہوجائے کہ میرے سارے بندے جنت میں جائیں گے، صرف ایک بندہ جہنم میں جائے گا تو مجھے یہ ڈر ہوگا کہ وہ جہنم میں جانے والا میں ہونگا۔ تو خوف بھی کامل، اور امید بھی کامل۔ دونوں پلّے برابر تھے۔ یہ تو ان کا مقام تھا۔ لیکن ایک عام آدمی ان دونوں کے درمیان کہاں تک توازن برقرار رکھے گا، کہاں ان کے پلّے برابر رکھے گا۔ اسلئے شریعت نے ان کے درمیان برابری کرنے کا مکلّف نہیں بنایا۔ بلکہ کبھی

خوف کا غلبہ ہو گیا تو کبھی امید کا غلبہ ہو گیا۔ جب تک دوسرے کا خاتمہ نہ ہو۔ تو پھر ایک کے غلبہ ہونے سے نقصان نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات فائدہ ہو جاتا ہے۔

امید کا غلبہ زیادہ نافع ہے

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اسکا بھی ایک اصول بیان فرمادیا کہ:

> ''جن لوگوں میں اعمال صالحہ کا غلبہ ہو کہ وہ زیادہ تر اعمال صالحہ میں مشغول ہیں۔ اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام بھی کرتے ہیں۔ گو کبھی کبھی ابتلا بھی ہو جاتا ہے۔ ان پر غلبہ رجا انفع ہے۔'' (انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۵)

یعنی وہ لوگ جن پر عام طور پر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اعمال صالحہ ان کی زندگی پر غالب ہوں، مثلاً عبادت کر رہے ہیں، اللہ کے ذکر میں اور طاعات میں مشغول ہیں۔ نمازی ہیں اور ساتھ میں گناہوں سے بچنے کا بھی اہتمام ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی غفلت بھی ہو جاتی ہے۔ کبھی گناہ میں ابتلا بھی ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ ان پر ''امید'' کا غلبہ ہو تو انفع ہے۔ کیوں؟ اس واسطے کہ اگر ایسے لوگوں پر خوف کا غلبہ ہو جائے تو بعض اوقات وہ مضر ہو جائے گا۔ اسلئے کہ پھر شیطان ان کو بہکاتا ہے کہ ارے میاں، سب کچھ تو کر کے دیکھ لیا، نماز بھی پڑھ لی، روزہ بھی رکھ لیا، تلاوت بھی کر لی، ذکر بھی کر لیا۔ پھر بھی ایک جگہ جا کر شیطان راستہ مار گیا، پھر بھی گناہ میں مبتلا ہو گئے۔ لہٰذا تمہاری اصلاح ممکن نہیں۔ تم ناقابل اصلاح ہو۔ لہٰذا یہ سب دھندا چھوڑ دو۔ بہر حال جب خوف کا غلبہ ایسے شخص کو ہو جائے تو شیطان اس کا راستہ اس طرح مار دیتا ہے۔

اور جتنا کچھ وہ کر رہا تھا اس سے بھی اسکو محروم کر دیتا ہے۔

امید کے غلبہ کا نتیجہ

اسکے برخلاف اگر ایسے شخص پر ''امید'' کا غلبہ ہوگا تو جب اس شخص سے گناہ ہوگا، غلطی ہوگی تو وہ کہے گا کہ: یا اللہ، غلطی ہوگئی آپ کی رحمت سے امید ہے، آپ مجھے معاف فرمادیں۔ امید کی مشعل جلتی رہتی ہے، اس مشعل کے جلنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اس شخص سے جو غلطیاں ہوتی رہتی ہیں، ان غلطیوں پر تنبہ بھی ہوتا رہتا ہے، اور توبہ کی توفیق بھی ہوتی رہتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید بھی رہتی ہے، اس لئے ایسے لوگوں کے لئے غلبہ امید انفع ہے۔ آگے ارشاد فرمایا:

غلبہ خوف زیادہ فائدہ مند ہے

''اور جن میں اعمال سیئہ کا غلبہ ہے کہ وہ زیادہ تر اعمال سیئہ میں مبتلا ہیں، اور اعمال صالحہ قلیل ہیں، ان کے لئے غلبہ خوف انفع ہے، جب تک کہ اعمال صالحہ کا غلبہ نہ ہو، پس جب تک اعمال صالحہ کا غلبہ نہ ہو اس وقت تک غلبہ خوف ہی میں ان کو رکھا جائے گا۔'' (انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۵)

یعنی ایسے لوگ جو گناہوں کے اندر مبتلا ہیں۔ نیک اعمال بہت کم کرتے ہیں، ان کے اندر غلبہ خوف انفع ہے، لہٰذا جب ایسے لوگوں کو دعوت دی جائے، ان سے دین کی باتیں کی جائیں تو اس میں ان کو اللہ کا خوف دلایا جائے، انبیاء علیہم السلام کو ''نذیر'' کہا گیا۔ یعنی ڈرانے والا، ان لوگوں کو جنہوں نے کفر اور شرک میں پوری زندگی گزار دی، ان کو ڈراتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار اور مشرکین کو ڈرایا

چنانچہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کھلم کھلا دعوت و تبلیغ کا حکم ہوا تو آپ نے سب کو جمع فرمایا۔ تو پھر فرمایا:

اِنِّیْ نَذِیْرٌ لَّکُمْ بَیْنَ یَدَیْ عَذَابٍ شَدِیْدٍ۔ (القران)

ان سب کو اللہ کے عذاب سے ڈرایا، اسلئے کہ کفر کا، شرک کا اور اعمال سیئہ کا غلبہ تھا۔ اسلئے وہاں ڈرانے کی ضرورت تھی۔ جب آدمی دین کی طرف آجائے، اور اعمال صالحہ کرنے لگے اور اسکے اعمال میں بہتری پیدا ہو جائے تو اس وقت ''بشیر'' (خوشخبری دینے والا) کی صفت آئیگی۔ بہر حال، حضرت نے یہ اصول بیان فرمایا کہ اگر غلبہ اعمال صالحہ کا ہے تو ''امید'' کا غلبہ انفع ہے۔ اور اگر خدانخواستہ اعمال سیئہ کا غلبہ ہے تو ''خوف'' کا غلبہ انفع ہے۔ اسلئے جتنا ڈریگا، اتنا اعمال سیئہ کو چھوڑے گا۔ اور نیکی کے قریب آئیگا۔

جوانی میں خوف، بڑھاپے میں رجا

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا وہ فرمایا کرتے تھے کہ جوانی میں ''خوف'' کا غلبہ انفع ہے۔ اور بڑھاپے میں ''رجا'' کا غلبہ انفع ہے۔ کیونکہ جوانی کے زمانے میں گناہوں کے داعیے زیادہ ہوتے ہیں۔ اور قوت والے ہوتے ہیں۔ اسلئے گناہوں سے بچنے کے لئے خوف کا غلبہ زیادہ فائدہ مند ہے۔ اور بڑھاپے میں پہنچنے کے بعد گناہوں کے داعیے مضمحل ہو جاتے ہیں، اور عمر گزارنے کے نتیجے میں کچھ عقل آجاتی ہے۔ اگر اس وقت خوف کا غلبہ ہو جائے تو وہ انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے۔ اسلئے اس

وقت انفع یہ ہے کہ رجا کا غلبہ ہو۔لیکن بہر حال، دونوں چیزیں اپنے اپنے وقت پر ہونی ضروری ہیں۔

آج کے دور میں رجا زیادہ نافع ہے

لیکن ہمارے شیخ حضرت عبدالحی صاحب قدس اللہ سرہ کی دعوت میں اور اصلاح میں اور طرز عمل میں ''امید'' کا غلبہ تھا۔اور فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کے دور میں لوگوں کو قریب لانے کے لئے امید زیادہ نافع ہے....

سوئے نا امیدی مرو امید ھاست
سوئے تاریکی مرو خورشید ھاست

یعنی نا امیدی کے راستے پر مت چلو، اور تاریکی کے راستے پر مت چلو، بلکہ امید اور خورشید کا راستہ اختیار کرو، لہٰذا دین کو آسان بنا کر اور سہل بنا کر پیش کرنا چاہیے۔کیونکہ آج کل لوگوں کے دماغوں میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ دین پر عمل بہت مشکل ہے، اگر ہم دین پر چلیں گے تو پہاڑ ڈھونے پڑیں گے۔اور قیامت آجائے گی، آسمان ٹوٹ جائے گا، یہ سب شیطان نے ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیالات ڈالے ہوئے ہیں۔اسکے نتیجے میں لوگ دین پر ایک قدم چلنے سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔

لوگوں کو پہلے قریب لاؤ

ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے دانہ ڈال کر لوگوں کو قریب لاؤ، اسکے لئے آسان راستہ سے کام شروع کرو، ایک دم سے اس پر بوجھ مت ڈالدو۔اسکے نتیجے میں اسکے اندر دین کی طرف آنے کا شوق پیدا

ہوگا، رغبت پیدا ہوگی، اللہ تعالیٰ نے نیکی کی یہ خاصیت رکھی ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچتی ہے۔ لہٰذا جب ایک نیکی کرنے کی توفیق ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ دوسری نیکی کرنے کی بھی توفیق دیدیں گے۔ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کا طریقہ یہ تھا۔

آسانی کا راستہ بتاؤ

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ''خوف'' کا تذکرہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ جب مجلس میں بیان ہوتا تو اس میں خوف کی باتیں بھی ہوتی تھیں۔ لیکن غلبہ ''امید'' اور ''رجا'' کا رہتا تھا۔ اور لوگوں کے لئے آسانی پیدا کرنے کا غلبہ رہتا تھا۔ تا کہ لوگ قریب آئیں۔ ہر ایک کے اپنے اپنے اصلاح کرنے کے طریقے ہیں۔

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر رست

لیکن ہم نے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے طریقے میں فائدہ دیکھا، اس میں کوئی شک نہیں، وہ یہ کہ لوگ کھنچ کھنچ کر آتے تھے۔ جو ایک مرتبہ جال میں آگیا، وہ پھر نکلتا نہیں تھا۔ اسلئے لوگوں کو اپنے قریب کرنے کے لئے آسانی کا راستہ بتادیتے تھے۔

دو دن برابر نہ ہونے چاہئیں

ایک ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''آج کل عملی خرابی عام طور پر پھیلی ہوئی ہے کہ جو شخص عمل کے اعتبار سے جس حالت میں ہے، وہ اس پر قناعت کئے

ہوئے ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ میرے اندر کوئی نقص نہیں، تغیر اور تبدل کی حاجت نہیں، یہ خشیت وفکر اور ذہن کی کمی ہے۔"

(انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۷)

یہ بڑی بات بیان فرمائی ہے، اور ہمارا بہت بڑا مرض پکڑا ہے کہ جو شخص جس حالت میں ہے وہ اس پر قناعت کئے ہوئے ہے، اصل معاملہ تو وہ ہے جو کسی نے کہا کہ

"مَنِ اسْتَوىٰ يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ۔"

یعنی جس کے دو دن کل اور آج برابر ہو گئے یعنی آج کا دن بھی ویسا ہی گزرا جس طرح کل کا دن گزرا تھا۔ اور آج کے دن میں کوئی ترقی نہ ہوئی تو ایسا شخص خسارہ میں ہے، اسلئے کہ آج کا دن کل کے مقابلے میں ترقی پایا ہوا ہونا چاہیے تھا۔ آج کی میری حالت گزشتہ کل کے مقابلے میں بہتر ہونی چاہیے تھی۔ اگر آج بھی وہی حالت رہی جو کل تھی تو خسارہ میں ہوں۔

خوبصورت دعا

اسی لئے حضور اقدس ﷺ کی مانگی ہوئی دعاؤں میں ایک دعا یہ بھی ہے کہ:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ يَوْمَنَا خَيْرًا مِنْ اَمْسِنَا، وَاجْعَلْ غَدَنَا خَيْرًا مِنْ يَوْمِنَا

یا اللہ! ہمارے آج کو گزشتہ کل سے بہتر بنا، اور آئندہ کل کو آج سے بہتر بنا، یعنی ہر دم ترقی ہو رہی ہو۔ روزانہ ترقی ہو رہی ہو۔ یہ نہیں کہ سالہا سال سے

ایک ہی حالت پر قانع ہیں۔ اور اطمینان ہے کہ اس میں کسی اضافہ کی ضرورت نہیں ،اس کی وجہ بیان فرمائی ہے کہ خشیت کی کمی اسکا سبب ہے۔ اور خشیت کی وجہ سے آدمی کے اندر آگے بڑھنے کی فکر پیدا ہوتی ہے۔

ایک اور خوبصورت دعا

ایک اور دعا میں آپ نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْحَیَاۃَ زِیَادَۃً لِّی فِیْ کُلِّ خَیْرٍ۔

اے اللہ: میری زندگی کو ہر بھلائی میں اضافے کا ذریعہ بنا۔ یعنی میری عمر جتنی بڑھتی جائے، خیر میں اضافہ ہوتا چلا جائے، جتنے دن بڑھیں، اتنی ہی نیکیوں میں اضافہ ہو، اور نیکیوں میں ترقی ہو۔

نیکیوں میں حریص اور دنیا میں قانع بن جاؤ

اب ہمارا معاملہ الٹا ہے کہ جہاں "قناعت" مطلوب تھی، یعنی دنیا کمانے میں، مال حاصل کرنے میں، وہاں تو ہمارے اندر حرص بڑھی ہوئی ہے، اور دنیا حاصل ہوجائے، اور مال حاصل ہوجائے، اور دنیا کمالوں۔ اور جہاں حرص مطلوب تھی، مثلاً علم میں، وہاں ہمارے اندر قناعت ہے۔ یہ الٹا معاملہ ہو رہا ہے، ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بھائی معاملہ سیدھا کرو۔ اور دنیا کے معاملے میں یہ دعا کرو کہ:

اَللّٰھُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ

اے اللہ: جو کچھ آپ نے مجھے رزق عطا فرمایا ہے اس کے اندر مجھے قناعت بھی عطا فرما۔ اور آخرت کے معاملے میں حریص بنو کہ میں کس طرح اپنی

آخرت کو بہتر سے بہتر بنالوں۔ اور نیکی کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کو کرنے کی حرص کرو، خشیت کا یہی تقاضہ اور یہی نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین..

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

اللہ اکبر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

(سورہ شوریٰ، آیت ۴۳)

یعنی جو صبر کرے اور معاف کردے تو یہ بڑی عزیمت کی بات ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''صبر'' ایک عظیم عبادت

مجلس نمبر 97

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقامِ خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔
تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب : بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7
مجلس نمبر : 97

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''صبر'' ایک عظیم عبادت

مجلس نمبر 97

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رسولہ الکریم، وعلٰی آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

''صبر'' ایک عظیم عبادت

پچھلی نشستوں میں ''خوف'' اور ''رجا'' کا بیان تھا، اسکی بقدر ضرورت تفصیل اور تشریح آپ حضرات کی خدمت میں عرض کردی گئی ہے۔ آگے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ارشادات ''صبر'' سے متعلق ہیں، یہ ''صبر'' بھی ایک عظیم عبادت ہے۔ قرآن کریم میں جگہ جگہ اسکا حکم دیا گیا ہے۔ اور اسکی تاکید بھی فرمائی گئی ہے۔ اسکے فضائل اور اسکے اجر وثواب کا بھی ذکر فرمایا گیا ہے۔ ایک جگہ قرآن کریم میں فرمایا:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ

(الزمر:۱۰)

یعنی صبر کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ جو اجر عطا فرمائیں گے وہ بے حساب ہوگا۔ اسکی کوئی گنتی نہیں ہوگی۔ جبکہ دوسرے بہت سے اعمال ایسے ہیں کہ ان کے

اجروثواب کا ایک پیمانہ مقرر کر دیا گیا ہے کہ فلاں عمل کا دس گنا ثواب، فلاں عمل کا ستر گنا ثواب، فلاں عمل کا سات سو گنا ثواب ملیگا وغیرہ، لیکن صبر کے بارے میں فرمایا کہ اسکا اجروثواب بے حساب ہے، کوئی گنتی نہیں۔ اللہ جل شانہ اپنے فضل وکرم سے اتنا عطا فرمائیں گے کہ کوئی حدوحساب نہیں۔ اس وجہ سے ''صبر'' مطلوب ہے۔

ہر وقت صبر کی ضرورت

اور یہ ''صبر'' ایسی چیز ہے کہ جسکی ضرورت سے کوئی مسلمان کسی دن بھی فارغ نہیں۔ لوگ عام طور پر ''صبر'' کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ جب کوئی بڑا صدمہ پیش آیا، مثلاً کسی قریبی عزیز کا انتقال ہوگیا، تو اس پر صبر کر لیا۔ یا کوئی بڑی تکلیف یا حادثہ پیش آجائے تو اس پر ''صبر'' کر لیا۔ لیکن حقیقت میں صبر ان مواقع کے ساتھ خاص نہیں۔ بلکہ صبر کی ضرورت ہر مسلمان کو ہر دن، بلکہ ہر وقت ہے۔ اسلئے کہ قرآن کریم میں جس کو صبر کہا جا رہا ہے وہ یہ اردو والا صبر نہیں ہے۔ جس کو ہم اردو میں صبر کہتے ہیں۔ مثلاً کسی تکلیف پر صبر کرنا۔ یا کسی کی موت پر صبر کرنا۔ یا کسی حادثہ پر صبر کرنا۔

''صبر'' کے معنٰی نفس کو روکنا

بلکہ عربی زبان میں صبر کے معنٰی ہیں ''روکنا''، اور یہ رمضان کا مہینہ جو آج کل چل رہا ہے، اسکو بھی ''شهر الصبر'' کہا گیا ہے کہ یہ صبر کا مہینہ ہے۔ مقصد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو اس بات سے روکے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عائد کئے ہوئے فرائض، واجبات اور طاعات جن سے ہمارا نفس بھاگنا چاہتا ہے،

اس نفس کو بھاگنے سے روکے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوٰۃ ادا کرو، حج کرو۔ اور جتنی طاعات وعبادات ہیں ان کو بجالاؤ۔ اب انسان کا نفس ان چیزوں سے بھاگتا ہے۔ نماز پڑھنے سے بھاگتا ہے، روزہ رکھنے سے بھاگتا ہے، زکوٰۃ ادا کرنے سے بھاگتا ہے کہ اس میں پیسے خرچ ہونگے، حج ادا کرنے سے بھاگتا ہے کہ اسکی ادائیگی میں تکلیف ہوگی۔ لہٰذا انسان کا نفس یہ نہیں چاہتا کہ وہ ان طاعات کو بجالائے۔ بلکہ وہ نفس تو آرام کا خوگر ہو گیا ہے۔ اسکو تو سونے میں مزہ آرہا ہے۔ اسکو کھانے پینے میں مزہ آرہا ہے۔ اسکو اس میں مزہ ہے کہ وہ بالکل آزاد ہو۔ اسکے اوپر کوئی روک ٹوک نہ ہو۔ لہٰذا وہ عبادات اور طاعات جو انسان پر روک ٹوک عائد کرے، نفس ان عبادات سے بھاگتا ہے۔

صبر کی پہلی قسم ''صبر علی الطاعة''

اب آپ نے اس نفس کو بھاگنے سے قید کر دیا۔ اور اس سے کہا کہ تمہیں یہ نماز پڑھنی ہوگی۔ اللہ کا حکم آگیا ہے، وقت آگیا ہے، اللہ کا منادی نماز کے لئے پکار رہا ہے، لہٰذا یہ نماز تمہیں پڑھنی پڑیگی، چاہے تیرا دل چاہے یا نہ چاہے۔ اب آپ نے اس نفس کو بھاگنے سے روک دیا، اسی کا نام ''صبر'' ہے۔ اور یہ ''صبر علی الطاعة'' کہلاتا ہے۔ اسی طرح نفس تو یہ چاہ رہا تھا کہ میں ہر وقت کھاؤں پیوں، میرے اوپر کوئی روک ٹوک نہ ہو، دن میں بھی کھاؤں، رات میں بھی کھاؤں، لیکن تم نے اس سے کہا کہ نہیں، یہ رمضان کا مہینہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، روزہ رکھنا ہوگا اور اب صبح سے لیکر شام تک کچھ نہیں کھانا۔ اب نفس کو جو اس عبادت سے بھاگنا چاہ رہا تھا، تم نے اسکو روک دیا۔ یہ ''صبر'' ہو گیا۔ اسلئے فرمایا گیا کہ یہ رمضان کا مہینہ ''صبر کا مہینہ'' ہے۔

صبر کی دوسری قسم ''صبر عن المعصیة''

اسی طرح انسان کا نفس طرح طرح کے گناہوں کے تقاضے اور داعیے دل میں پیدا کرتا رہتا ہے کہ فلاں گناہ کرلو، یہ گناہ کرلو، وہ گناہ کرلو، آنکھ کو غلط جگہ پر استعمال کرلو۔ کان کو غلط جگہ پر استعمال کرلو۔ زبان سے جھوٹ بول دو۔ زبان سے غیبت کرلو۔ یہ تقاضے اور داعیے جو گناہوں کے پیدا ہو رہے ہیں، اور انسان کا نفس یہ چاہتا ہے کہ میں یہ گناہ کرلوں۔ اب آپ نے اس نفس کو روک دیا۔ اور اس سے کہا کہ میں تجھے یہ گناہ نہیں کرنے دونگا۔ یہ گناہ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس سے منع کیا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔ یہ جہنم کا راستہ ہے۔ اس طرح آپ نے اس نفس کو اس گناہ کے ارتکاب سے روک دیا۔ یہ روکنا ''صبر عن المعصیة'' ہے۔

صبر میں بڑی طاقت ہے

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اس ''صبر'' میں بڑی طاقت رکھی ہے۔ یہ ''صبر'' ایسی چیز ہے کہ اس کو جتنا چاہو کھینچ لو، اور جتنا بڑے سے بڑا کام اس کے ذریعے لے لو۔ شروع شروع میں ''صبر'' کرنا انسان کو مشکل لگتا ہے۔ لیکن جب انسان اپنے نفس کو ''صبر'' کا عادی بنا دیتا ہے تو بڑے سے بڑا اور سخت سے سخت کام بھی اس صبر کے ذریعہ انجام پا جاتا ہے۔ جیسے ''ربر'' دیکھنے میں چھوٹی ہوتی ہے۔ لیکن اسکو کھینچتے ہیں تو بڑی ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے کی جو ہمت اور طاقت دی ہے، اس سے جتنا چاہو کام لے لو۔

صبر کو ترک کرنے کا نتیجہ

جب آدمی نفس وشیطان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے، اور اس کا مقابلہ نہیں کرتا تو یہ نفس وشیطان اسکے اوپر شیر ہو جاتے ہیں۔ اور اسکو زیر کر کے چھوڑتے ہیں۔ اب یہ ہوتا ہے کہ گناہ کا ذرا سا تقاضہ پیدا ہوا تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اس گناہ کو کرلیا۔ اب وہ نفس وشیطان اس پر شیر ہو گیا کہ یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ یہ جلدی قابو آجاتا ہے۔ اب یہ ہوگا کہ آج ایک گناہ میں مبتلا کر دیا تو کل دوسرے گناہ میں مبتلا کر دیگا۔ پرسوں تیسرے گناہ میں مبتلا کر دیگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صبر اور ہمت کی جو طاقت تھی وہ کمزور پڑتے پڑتے بہت معمولی رہ جاتی ہے۔ اب بے دھڑک گناہ ہو رہے ہیں۔ بے دھڑک معصیتیں ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین.

صبر کرتے ہوئے نفس کے سامنے ڈٹ جاؤ

لیکن جب یہ تہیہ کرلیا کہ اللہ جل شانہ نے مجھے صبر کی طاقت دی ہے۔ اور اس نفس وشیطان کا مقابلہ کرونگا۔ خواہ کچھ ہو جائے میں یہ گناہ نہیں کرونگا۔ اور گناہ سے بچوں گا۔ جب ایک مرتبہ اس نفس وشیطان کے آگے ڈٹ گئے تو تم نے اس صبر اور ہمت کو استعمال کیا۔ تو اس کے نتیجے میں اس صبر کے اندر مزید طاقت پیدا ہوگئی۔ بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو استعمال کرنے سے کم ہوتی ہیں۔ اور بہت سی چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو استعمال کرنے سے بڑھتی ہیں۔ مثلاً قوت حافظہ ایسی چیز ہے کہ اسکو جتنا استعمال کرو گے یہ اتنا ہی بڑھے گا۔ اسی طرح یہ ''صبر'' کی اور ہمت کی طاقت ہے، اسکو جتنا استعمال کرو گے اس میں

اتنی ہی طاقت آئے گی۔ جب تم ایک مرتبہ نفس و شیطان کے آگے ڈٹ گئے۔ اور اس سے یہ کہہ دیا کہ ہمیں تیری بات منظور نہیں تو یہ نفس و شیطان پھٹک سے اڑ جائیگا۔

شیطان کا مکر کمزور ہے

اس لئے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ كَيۡدَ الشَّيۡطٰنِ كَانَ ضَعِيۡفًا (سورۃ النساء، آیت ۷۶)

ارے تم کس سے ڈر رہے ہو۔ اس شیطان کا مکر تو بڑا ہی کمزور ہے۔ ذرا اس کے سامنے ڈٹ کر دیکھو، یہ تمہارے سامنے ھوا ہو جائے گا۔ ایک مرتبہ دل میں یہ بات بٹھا لو کہ چاہے میرے دل پر آرے چل جائیں۔ چاہے میرے اوپر قیامت ٹوٹ پڑے۔ لیکن میں اس گناہ کے قریب نہیں جاؤنگا۔ اور یہ گناہ نہیں ہونے دونگا۔ جب ایک مرتبہ تم نے پکا ارادہ کرلیا تو شیطان بھی رفو چکر ہو جائیگا انشاء اللہ۔ اور تمہارا نفس بھی قابو میں آجائیگا۔ اور جتنا اسکو استعمال کروگے، اتنی قوت بڑھتی جائیگی۔

مصیبت اور پریشانی پر صبر کرو

اور گناہوں کے تقاضے کے وقت یہ تصور کرلیا کرو کہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے "صبر" پر عمل کر رہا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَيۡرِ حِسَابٍ۔ (سورۃ الزمر: ۱۰)

کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے۔ بہر حال، صبر کے معنی ہیں "روکنا" یعنی جو نفس طاعات اور عبادات سے بھاگ

رہا ہے، اس سے روکنا، اور معصیتوں کی طرف جو نفس جا رہا ہے اسکو اس سے روکنا۔ جو تکلیف آئی ہے، اس پر صبر کرنا، یعنی جب تکلیف پہنچے، پریشانی ہو، صدمہ ہو، تو اس وقت نفس آدمی کو ناشکری پر آمادہ کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے دل میں شکوہ پیدا کرتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے میرے حق میں جو فیصلہ کیا۔ وہ انصاف کا فیصلہ نہیں کیا، العیاذ باللہ یہ باتیں شیطان دل میں پیدا کرتا ہے۔

موت کے وقت صبر سے کام لو

اسی طرح کسی کے انتقال کے وقت ہم لوگ زبان سے جو کلمات کہہ دیتے ہیں کہ اس آدمی کی بے وقت موت ہوگئی۔ العیاذ باللہ۔ یہ بڑا خطرناک کلمہ ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ میاں کو اسکی موت کا صحیح وقت معلوم نہیں تھا۔ تم اسکی موت کا صحیح وقت جانتے ہو۔ یہ ناشکری ہے، اور یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتراض ہے، اور شکوہ ہے، یہ الفاظ زبان سے ادا کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ اب موت کے وقت انسان کا نفس یہ چاہتا ہے کہ وہ واویلا کرے، شور مچائے، اور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ کرے، لیکن ایسے موقع پر ایک مؤمن یہ کہتا ہے کہ مجھے اپنے اللہ سے کوئی شکوہ نہیں، میں اللہ کے فیصلے پر راضی ہوں، چاہے میرا دل جل رہا ہے، چاہے میری زبان سے آہیں نکل رہی ہیں، میری آنکھوں سے آنسوں نکل رہے ہیں، لیکن میں اللہ تعالیٰ کی اس مشیت اور اس فیصلے پر راضی ہوں، اور اس فیصلے پر سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ بس اسکا نام ''صبر'' ہے۔ یہ ''صبر علی المصیبة'' ہے۔ اس لئے کہ اس میں آپ نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کا شکوہ کرنے سے اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض کرنے سے روک لیا۔

ہر وقت آپ سے ایک مطالبہ

بہر حال، صبر کی ضرورت ہر مؤمن کو، ہر روز، ہر وقت ہے، کیوں؟ اسلئے کہ مسلمان سے بحیثیت مسلمان کے ہر وقت اللہ جل شانہ کے دین کا کچھ مطالبہ ہے، مثلاً جب نماز کا وقت آ گیا تو اب یہ مطالبہ ہے کہ نماز ادا کرو، روزہ کا وقت آ گیا تو اب مطالبہ یہ ہے کہ روزہ رکھو، اگر کوئی اچھا واقعہ پیش آ گیا تو اب مطالبہ یہ ہے کہ اس پر شکر ادا کرو، اگر کوئی ناگوار واقعہ پیش آ گیا تو اب مطالبہ یہ ہے کہ صبر کرو۔ لہٰذا کونسا لمحہ انسان پر ایسا گزرتا ہے جو یا تو اچھا نہ ہو، یا برا نہ ہو، جو نہ نعمت ہے، نہ تکلیف ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھو تو زیادہ تر نعمتیں ہی نعمتیں ہیں، کبھی کبھار ان کے ساتھ کوئی تکلیف آ کر لگ جاتی ہے۔

ہر وقت صبر مطلوب ہے

مثلاً اس وقت ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ اور ہمارا سانس عافیت سے چل رہا ہے۔ اس پر کہو "الحمد للہ" اگر یہ سانس نہ چلتا، بلکہ رک جاتا تو ہماری قیامت آ جاتی، موت آ جاتی۔ اسلئے سانس چلنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ اسی طرح ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں، بینائی موجود ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے۔ اگر یہ بینائی چلی جائے تو ہمارا کیا انجام ہو جائے۔ لہٰذا مطالبہ یہ ہے کہ اس نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ اگر گرمی لگ رہی ہے، یہ تھوڑی سی تکلیف ہے، اب مطالبہ ہے کہ اس پر صبر کرو۔ اور کہو: انا للّٰہ وانا الیہ راجعون" اور اس تکلیف پر راضی رہو۔ اور صبر کرو۔ بہر حال کونسا وقت ایسا ہے جس میں دین کا اور شریعت کا انسان سے کوئی مطالبہ نہ ہو۔ جب تم اپنے نفس کے تقاضے کے بر خلاف اس

تقاضے کو پورا کرو گے تو اسی کا نام ''صبر'' ہے۔ اس لئے یہ کہا جائے تو کوئی بعید نہیں کہ ہم سے ہر لحہ ''صبر'' مطلوب ہے۔ یا تو ''صبر علی الطاعة'' مطلوب ہے۔ یا ''صبر علی المعصية'' مطلوب ہے یا ''صبر علی المصيبة'' مطلوب ہے۔ لہٰذا کوئی لمحہ ''صبر'' سے خالی نہیں۔

فکر اور تشویش پر صبر کرو

یہاں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''انفاس عیسیٰ'' میں جو ارشادات بیان فرمائے ہیں۔ وہ زیادہ تر ''مصیبت پر صبر'' کرنے سے متعلق ہیں۔ اور صبر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جب کوئی بڑی مصیبت ہو، اس پر صبر کرے، بلکہ ہلکی اور معمولی تکلیف بھی جو انسان کی طبیعت کے خلاف ہو، اس پر بھی صبر مطلوب ہے۔ جیسے گرمی لگ رہی ہے، اس پر بھی صبر کرو، کانٹا لگ گیا، اس پر بھی صبر کرو، یا ذہن میں کوئی تشویش اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، یہ بھی صبر کا موقع ہے، اسلئے کہ حدیث شریف میں فرمایا کہ ''حَتّٰى الْهَمَّ يَهُمُّهُ'' یعنی یہاں تک کہ کوئی فکر اور تشویش جس میں بندہ مبتلا ہوتا ہو، اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ اور یہ کفارہ سیئات بن جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ فکر اور تشویش بھی محل صبر ہیں۔

چراغ گل ہونے پر صبر

جیسا کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے چراغ کے گل ہونے پر ''انا للّٰه وانا اليه راجعون'' پڑھا، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بھی تکلیف ہے۔ اور یہ بھی صبر کا محل ہے۔ لہٰذا ذرا سی بھی تکلیف ہو، یا پریشانی ہو۔ یا

کوئی بھی ایسی بات لاحق ہو جائے تو اس پر "صبر" کرو، اور "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھو۔

رونا صبر کے خلاف نہیں

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

آنسو بہنا، آہ آہ منہ سے نکلنا، خلاف صبر نہیں، بلکہ رو لینے سے صبر حقیقی زیادہ آسان ہو جاتا ہے، کیونکہ دل کا غبار نکل جاتا ہے۔ (انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۵)

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کے مرنے پر رونا صبر کے خلاف ہے، اسلئے کہ صبر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بالکل نہ روئے، بلکہ چپکا بیٹھا رہے۔ حضرت والا نے اسکی تردید فرمادی کہ صبر کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی کے آنسوں نہ بہیں، روئے نہیں۔ آہ نہ نکلے۔ یہ مطلب نہیں۔ بلکہ صبر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے فیصلے پر راضی ہونا، اسکے خلاف کوئی شکایت، کوئی اعتراض، کوئی گلہ نہ ہو، بلکہ یہ کہو کہ اے اللہ ہم کمزور ہیں، چونکہ ہمیں صدمہ ہوا ہے اس صدمہ پر ہم روتے ہیں۔ آنسوں بھی بہہ رہے ہیں، دل میں آگ بھی لگی ہوئی ہے، لیکن سب کچھ ہماری کمزوری کی وجہ سے ہے، ہم جانتے ہیں کہ اے اللہ، آپ کی مشیت کا فیصلہ برحق ہے، یہ معنیٰ ہیں "صبر" کے۔

رونے سے غبار نکل جاتا ہے

اسلئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رو لینے سے بعض اوقات حقیقی صبر میں اور زیادہ آسانی پیدا ہو جاتی ہے، کیونکہ دل کا غبار نکل

جاتا ہے، کیونکہ جب تک دل کا غبار نہیں نکلا ہوتا، صدمہ کی شدت اور غصہ کی شدت ہوتی ہے تو اس میں بعض اوقات عقل خراب ہو جاتی ہے، اور عقل خراب ہو جانے کی وجہ سے انسان اول فول بکنے لگتا ہے، اور فضول باتیں اس کے دماغ میں آنے لگتی ہیں۔ لیکن جب دل سے غبار نکل گیا، تو اب عقل معمول پر آجائیگی، اور عقل معمول پر آجانے سے انشاء اللہ خطرہ نہیں رہیگا کہ وہ بے صبری کریگا۔ یا اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض کریگا۔

رونے میں کوئی حرج نہیں

یہ دیکھو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتنی رحمت ہے کہ جتنی غیر اختیاری چیزیں ہیں، ان میں سے کسی کا ہمیں مکلف نہیں بنایا، اگر غیر اختیاری طور پر رونا آرہا ہے تو رو لو۔ ہاں جان بوجھ کر مصنوعی طور پر مت رو، حتی الامکان کوشش کرو کہ رونے میں آوازیں بلند نہ ہوں۔ اور بلا وجہ بین کا انداز نہ ہو، جب تک تمہارے دل میں اس بات پر ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ درست ہے، اور میں اس فیصلے پر سر تسلیم خم کرتا ہوں تو پھر رونے میں کوئی گھاٹا نہیں۔ خود حضور اقدس ﷺ نے اپنے بیٹے کے انتقال پر رو کر دکھایا۔ اپنے نواسے کے انتقال پر روئے، اور فرمایا کہ یہ ایک رحمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے دل میں پیدا کی ہے۔ اسلئے یہ گھبرانے کی بات نہیں۔

تکلیف اور رضامندی جمع ہو سکتی ہیں

بعض لوگوں کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ صدمہ کا اظہار کرنا اور عقل سے اس فیصلے پر راضی ہونا، یہ دونوں باتیں کیسے جمع ہو سکتی ہیں؟ ہمارے حضرت

تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی بڑی اچھی مثال بیان فرمائی ہے کہ جب ڈاکٹر سے آپریشن کرواتے ہو تو اس وقت تمہارا کیا حال ہوتا ہے؟ اب آپریشن کے وقت تکلیف بھی ہو رہی ہے۔ اسلئے کہ جسم کو کاٹا جارہا ہے، اور دوا لگانے کی وجہ سے ٹیسیں اُٹھ رہی ہیں، لیکن ساتھ میں اس بات کا اطمینان ہے کہ یہ ڈاکٹر میرا ہمدرد ہے، بلکہ ڈاکٹر کی خوشامد کریگا اور اس کی فیس بھی دیگا کہ میرا جلدی سے آپریشن کردو۔ اسلئے کہ وہ شخص جانتا ہے کہ یہ آپریشن کے ذریعہ ڈاکٹر جو تکلیف مجھے دے رہا ہے، اسی میں میرا فائدہ ہے، اور اس کے نتیجے میں مجھے صحت حاصل ہو جائے گی، اب دیکھئے، تکلیف بھی ہو رہی ہے لیکن ساتھ میں اس تکلیف پر راضی بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت پر راضی رہو

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی طرف سے جب تکلیفیں پہنچتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی مشیت سے پہنچتی ہیں۔ اسلئے کہ کوئی کام کائنات میں ایسا نہیں ہے جو اسکی مشیت کے بغیر ہو جائے، بس اس وقت انسان یہ سوچے کہ میرے حق میں یہی بہتر تھا، اور یہ سوچ کر اس تکلیف پر راضی ہو جائے، بس اسی کا نام ''صبر'' ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر اور ہر مشیت پر راضی ہونا کہ اس کا ہر فیصلہ برحق ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض نہ ہو

آجکل پوری امت مسلمہ افغانستان پر امریکی حملے کے صدمہ سے دوچار ہے، مشرق و مغرب کے تمام مسلمان اس صدمہ کی وجہ سے تکلیف میں ہیں۔ بعض اوقات ان تکالیف اور صدمات کے مواقع پر پاؤں پھسل جاتے ہیں۔ اور مایوسی کی

طرف جانے لگتے ہیں۔ زبانوں پر اللہ تعالیٰ کی تقدیر کا شکوہ آنے لگتا ہے کہ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟____ ایک صاحب جو اچھے پکے نمازی، مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے والے، انہوں نے اس موقع پر زبان سے یہ الفاظ کہہ دیئے کہ یہ اللہ میاں نے اچھا نہیں کیا۔ العیاذ باللہ۔ یہ کلمہ زبان سے نکال دیا، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس قسم کے خیال سے محفوظ رکھے، آمین۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض کرنا، یہ بڑی خطرناک چیز ہے، ارے تم کیا، تمہاری عقل کیا، تمہاری خواہشات کیا، تمہاری عقل محدود، تمہاری خواہشات محدود، تمہارے خیالات محدود، تم اس محدود عقل اور خواہشات کے دائرے میں رہ کر سوچتے ہو۔ اس پوری کائنات کا نظام اسکے قبضہ قدرت میں ہے۔ اسکی قدرت کاملہ اور اسکی حکمت بالغہ اس نظام میں کارفرما ہے۔ اگر تمہاری خواہشات کے مطابق اللہ تعالیٰ اس کا نظام چلاتے تو آسمان اور زمین کا نظام کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَائَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ
وَمَنْ فِيهِنَّ۔ (سورة المومنون: ۷۱)

اللہ تعالیٰ کی حکمت جاری ہے

کیا اللہ تعالیٰ تمہاری خواہشات کے پابند ہیں؟ تمہاری آرزوؤں کے پابند ہیں؟ تم جیسا چاہو، کائنات میں ویسا ہونا چاہیئے؟ یا وہ قادر مطلق ہیں۔ وہ حکیم مطلق ہیں، اور فیصلہ اسکے ہاتھ میں ہے، حکمت اسکی چل رہی ہے یا تمہاری چل رہی ہے؟ سمجھ اسکی ہے یا تمہاری ہے؟ خدائی اسکی، فیصلہ اسکا۔ حکمت اسکی، مصلحت اسکی، تمہاری سمجھ میں آئے تو، نہ آئے تو۔ اس کا حکم بالا ہے، اس کا فیصلہ بالا ہے۔

بعض واقعات تازیانے ہوتے ہیں

اگر کسی بات پر کسی واقعہ پر صدمہ ہوا، چلا ہو گیا۔ لیکن ساتھ ہی اس بات پر ایمان ہونا چاہیئے کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ جل شانہ کی مشیت سے ہوا۔ جو کچھ ہوا، وہ اسکی حکمت کے عین مطابق ہوا، چاہے اسکی حکمت ہماری سمجھ میں آ رہی ہو، یا نہ آ رہی ہو۔ بہت سی باتیں، بہت سے واقعات اللہ جل شانہ کی طرف سے تازیانہ ہوتے ہیں۔ یہ واقعات جگانے والے اور تنبیہ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہ اسلیئے ہوتے ہیں تا کہ اللہ کے بندے اپنا جائزہ لیکر دیکھیں کہ ہمارے طرز عمل میں کوئی غلطی تو نہیں تھی؟ اس غلطی کو متعین کریں۔ اور آئندہ اس غلطی سے بچنے کی کوشش کریں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں مسلمانوں کو شکست

تاریخ اسلام میں اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں بھی اور آپ کے صحابہ کے عہد مبارک میں بھی جہاں فتوحات بے شمار ہیں۔ وہاں شکستیں بھی ہیں ہزیمتیں بھی ہیں، غزوہ احد کے موقع پر اگرچہ عارضی طور پر مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ ستر صحابہ کرام شہید ہوئے، غزوہ حنین کے موقع پر جب صحابہ کرام کی تعداد بہت زیادہ تھی، اس وقت بھی مسلمانوں کو شکست ہوئی اور یہ شکست حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہوئی، کیوں؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان شکستوں کا ذکر کر کے اس طرف متوجہ کیا، تا کہ تمہارے دماغ میں یہ بات نہ آ جائے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں، وہ ٹھیک کر رہے ہیں۔ بلکہ اسکے ذریعے تمہاری غلطیوں کی طرف توجہ کرائی، غزوہ احد کی شکست کے اسباب بھی بتائے، اور غزوہ حنین کی شکست کے اسباب بھی بتائے کہ کیا اسباب تھے؟ لہٰذا ان اسباب کو سوچو،

اور آئندہ کیلئے پرہیز کرو۔

تم سے بھی غلطی ہوسکتی ہے

اب ہوتا یہ ہے کہ اپنی غلطی کی طرف تو ذہن جاتا نہیں۔ بلکہ یہ طے کرلیا ہے کہ ہم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی، نہ غلطی ہوسکتی ہے، اور شکوہ اللہ تعالیٰ سے ہے، اسلئے کہ جب ہماری غلطی نہیں ہے تو -نعوذ باللہ- اللہ میاں کی غلطی ہوگی، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ یہ سب فضول خیالات شیطان دل میں پیدا کرتا ہے، ایسے موقع پر سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے آگے سر جھکانا، اور یہ کہنا کہ اے اللہ، ہم آپکے ہر فیصلے پر راضی ہیں۔ چاہے صدمہ ہو، چاہے غم ہو، چاہے تکلیف ہو، اسی کا نام صبر ہے، اور دوسرا کام یہ ہے کہ اپنا جائزہ لو، کہ ہم سے کہاں کہاں غلطی ہوئی، پھر ان غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرنا، تأویل اور توجیہ کے چکر میں نہ پڑنا، اور آئندہ اس غلطی سے پرہیز کرنا، بس ایسے موقع پر ایک مسلمان کا طرز عمل یہ ہونا چاہئے۔

یہ دنیا ہے، جنت نہیں

اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو ''دنیا'' بنایا ہے، یہ جنت نہیں ہے، لہٰذا اس دنیا میں اچھا بھی پیش آئیگا، اور برا بھی پیش آئیگا۔ نفع بھی ہوگا، نقصان بھی ہوگا، فتح بھی ہوگی، شکست بھی ہوگی، راحت بھی ملیگی، تکلیف بھی پہنچے گی۔ اگر اس دنیا میں راحت ہی راحت ہو، تکلیف نہ ہو، پھر تو یہ دنیا نہیں، پھر تو یہ جنت ہو جائیگی۔ لہٰذا جنت جیسی راحت یہاں کسی کو نہیں مل سکتی، لہٰذا اس دنیا میں اچھا اور برا، سرد اور گرم، میٹھا اور تلخ، ہر طرح کا واقعہ پیش آئیگا۔ اگر اس طرح تم مایوس ہوکر بیٹھ جاؤ گے تو پھر تو تم نے زندگی گزار لی۔

کوئی سورج نکلنے والا ہے

اس کائنات میں رات کی تاریکی بھی آتی ہے، اور رات کے بعد دن بھی آتا ہے۔ اور پھر سورج نکلتا ہے، گرمی بھی آتی ہے۔ پھر سردی بھی آتی ہے۔ اللہ تبارک نے یہ دنیا ایسی ہی بنائی ہے۔

ظلمتوں کا جو بول بالا ہے
کوئی سورج نکلنے والا ہے

سورج تو جبھی نکلتا ہے جب تاریکیاں آتی ہیں۔ تاریکیوں کے بعد جب سورج نکلتا ہے تو اسکی روشنی کی قدر بھی ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا ہوتا ہے کہ اے اللہ، تاریکی کے بعد آپ نے ہمیں یہ روشنی بھی عطا فرمائی۔

مایوس مت ہو جاؤ

لہذا کبھی ہمت ہار کر مت بیٹھو کہ حالات میں تاریکی ہوگئی ہے۔ اور مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ ارے کہاں کی مایوسی، یہ تو رات کی تاریکی ہے۔ اسکے بعد انشاء اللہ صبح بھی آنے والی ہے۔ سورج بھی نکلنے والا ہے۔ بس فکر اس بات کی کرو کہ اس صبح کے نکلنے میں تمہارا بھی حصہ لگ جائے۔ اور تم اپنی غلطیوں کی تلافی کرلو۔ نہ یہ کہ مایوس ہو کر بیٹھ جاؤ۔ بلکہ اپنا جائزہ لیکر عزم و ہمت کو تازہ کرلو، اور اپنا سفر از سر نو شروع کرو۔

قید خانہ میں تو تکلیف ہوگی

حدیث شریف میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَلدُّنیَا سِجنُ الْمُؤمِنِ وَجَنَّتُ الْکَافِرِ

یہ دنیا مؤمن کیلئے قید خانہ ہے، اور کافر کیلئے جنت ہے۔ اور جب یہ قید خانہ ہے تو کیا قید خانہ میں تمہیں عیش و آرام ملیگا؟ قید خانہ میں تو تکلیف ہی پہنچتی ہے۔ تو اس دنیا کے اندر اصل تو ''تکلیف'' ہے۔ اگر کبھی عیش و آرام مل جائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ جو استحقاق کے بغیر آپ کو عطا ہوگئی۔ ورنہ اصلاً تو دنیا میں تکلیف ہی ملنی چاہئے۔ اگر تکلیف ہو رہی ہے تو یہ اصل کے مطابق ہے۔ اس پر نہ تو مایوسی کی بات ہے، نہ تعجب اور پریشانی کی بات ہے۔ بس اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہو۔

اپنی غلطی کو سوچو

بہر حال، صبر کا حاصل یہ ہوا کہ جب بھی کوئی تکلیف پہنچے، کوئی صدمہ آئے، کوئی پریشانی پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر پہلے راضی ہو جاؤ۔ اور راضی ہو کر اپنی غلطی کو سوچو، اگر غلطی سمجھ میں آئے تو اسکی تلافی کرلو۔ اگر سمجھ میں نہ آئے تو کسی اور سے پوچھ لو۔ ورنہ اللہ تعالیٰ سے کہو کہ یا اللہ، جس غلطی کی یہ سزا ہے، اس پر مجھے متنبہ فرما دیجئے۔ اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما دیجئے۔ اسلئے کہ جو مصیبت ہمیں پیش آئی ہے، وہ کسی غلطی کا نتیجہ ہے۔ اس غلطی کو معاف فرما دیجئے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں صبر کی تینوں قسموں پر عمل کرنے کی توفیق عطاء فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔

(سورة الزمر: ١٠)

کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر عطا فرمائیں گے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک تکلیف اور تین ثواب

مجلس نمبر 98

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 98

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَاصَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَابَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ایک تکلیف اور تین ثواب

مجلس نمبر 98

الحمدللہ رب العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاۃ والسلام علی رسوله الکریم، وعلی آله وأصحابه اجمعین۔ امابعد:

"صبر" کا ثواب کس صورت میں ملے گا

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے صبر کے بارے میں بڑا اہم سوال کیا، اور حضرت والا نے بڑی تفصیل کے ساتھ اس کا جواب دیا۔ اور اس جواب میں بڑے علوم ہیں، وہ سوال یہ کیا کہ:

> صبر پر جو وعدہ ثواب کا ہے، وہ کس صورت میں ہے؟ یعنی کوئی شخص کسی انتقام یا تکلیف کے دور کرنے پر قادر ہے، اور نہ کرے، تب اجر ملے گا؟ یا قادر نہ ہو۔ پھر صبر کرے اس پر اجر ملے گا؟ (انفاس عیسیٰ صفحہ ۲۰۹)

سوال کا حاصل یہ ہے کہ ایک شخص کو دوسرے شخص سے کوئی تکلیف پہنچی، اب وہ شخص اس ظالم تکلیف پہنچانے والے شخص سے انتقام لینے پر قادر نہیں۔ اگر

انتقام لینا بھی چاہے تو نہیں لے سکتا، اس صورت میں انتقام نہ لینے کی وجہ سے ''صبر'' کرنے کا اجر اس کو ملے گا یا نہیں؟

ایک تکلیف پر تین ثواب

یہاں میں وضاحت کردوں کہ جب بھی کسی انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اس تکلیف پر اللہ تعالیٰ نے اجر وثواب کے تین مختلف راستے رکھے ہیں۔ ایک تو مطلق تکلیف پہنچنے سے ہی ثواب مل جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے یہاں اس تکلیف پر کوئی شرط عائد نہیں ہے، مثلاً پاؤں میں کانٹا لگا، تکلیف ہوئی اور ثواب لکھا گیا۔

دوسرا ثواب ''صبر'' بمعنی ''رضا بالقضاء'' کا، یعنی آدمی نے تکلیف پر صبر کیا اس معنی میں کہ میں اللہ جل شانہ کے فیصلے پر راضی ہوں۔ اس کی مشیت پر راضی ہوں۔ مجھے اس پر کوئی گلہ اور شکوہ، کوئی اعتراض نہیں۔ دوسرا ثواب اس صبر پر ملے گا۔

بدلہ نہ لینے پر ثواب

تیسرا ثواب اس پر ملتا ہے کہ یہ شخص تکلیف پہنچانے والے سے بدلہ نہ لے، مثلاً کسی آدمی کی طرف سے تکلیف پہنچی اور اس کو انتقام لینے کا حق تھا، لیکن اس نے انتقام نہیں لیا، اس پر یہ تیسرا ثواب اس کو ملے گا، مثلاً ایک آدمی نے آکر آپ کو مکہ مار دیا، اس ایک مکے پر تین ثواب ملیں گے، ایک ثواب اس مکے سے پہنچنے والی تکلیف پر، دوسرا ثواب اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا اور تیسرا ثواب انتقام نہ لینے کا، یہ تین الگ الگ ثواب اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو

ایک تکلیف پر ملتے ہیں۔ اس ذات کی رحمت تو دیکھو کہ ایک تکلیف پہنچائی تو ثواب کے تین دروازے کھول دیئے۔

بے صبری کی متعدد صورتیں

ثواب کی یہ جو تیسری قسم ہے، یعنی انتقام اور بدلہ نہ لینا، اس کے بارے میں سوال کرنے والے سوال کر رہے ہیں کہ بدلہ نہ لینے پر جو ثواب ملتا ہے، آیا یہ ثواب اس وقت ملتا ہے جب انسان بدلہ لینے پر قادر ہو، اور پھر بدلہ نہ لے، یا اس وقت بھی ملتا ہے جب کہ بدلہ لینے پر قادر نہ ہو______ اس سوال کا حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑا تفصیلی جواب دیا، چنانچہ فرمایا:

''بے صبری کی متعدد صورتیں ہیں''

یہاں ''صبر'' سے ثواب کی تیسری قسم مراد ہے، یعنی انتقام اور بدلہ نہ لینا، اس لئے کہ ''بدلہ لینا'' بے صبری ہے، اور بدلہ نہ لینا صبر ہے، حضرت نے فرمایا کہ اس بے صبری کی بھی متعدد صورتیں ہیں۔

① انتقام بالمثل لینا، اس کا ترک کرنا صبر ہے۔

یہ مشروط ہے قدرت کے ساتھ'' (ایضاً)

انتقام بالمثل کے ترک پر ثواب

مثلاً ایک شخص نے آپ کو مکا مارا، آپ نے بھی اتنی ہی زور کا مکہ مار دیا، اب جیسی تکلیف اس نے پہنچائی تھی، ویسی ہی تکلیف آپ نے پہنچا دی۔ یہ انتقام بالمثل ہے۔ یہ انتقام لینا صبر کے خلاف ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تیسری قسم کا

ثواب نہیں ملے گا، اور البتہ انتقام لینے کے باوجود پہلی دو قسموں کا ثواب اس کو ملے گا، لہٰذا جو تکلیف پہنچی۔ اس کا ثواب اس کو ملا، اور اس تکلیف کے فیصلے پر اور اللہ کی مشیت پر راضی رہا، اس ''رضا بالقضاء'' کا ثواب بھی ملے گا۔ البتہ بدلہ نہ لینے پر جو ثواب ملنا تھا۔ وہ نہیں ملے گا۔ لہٰذا انتقام بالمثل لینا بے صبری کی ایک صورت ہوئی، اور انتقام نہ لینا صبر ہے، یہ صبر تیسرے معنی اور تیسرے ثواب کے لحاظ سے ہے، اس لئے کہ جب دوسرے شخص نے مکہ مارا تو یہ بھی مکہ مارنے پر قادر تھا، لیکن اس کے باوجود اس نے سوچا کہ چلو چھوڑو۔

صبر کا اعلیٰ درجہ

قرآن کریم نے تو کہہ دیا کہ جس نے کسی دوسرے کو تکلیف پہنچائی ہو، اتنی ہی تکلیف دوسرے کو پہنچانے کا حق حاصل ہے، لیکن قرآن کریم نے یہ بھی فرمایا کہ:

وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ

(سورہ شوریٰ، آیت ۴۳)

یعنی جو صبر کرے اور معاف کردے تو یہ بڑی عزیمت کی بات ہے۔ اس پر بڑا اجر و ثواب ہے، لہٰذا باوجود قدرت کے اگر انتقام نہ لیا، اور معاف کر دیا تو یہ صبر کا اعلیٰ درجہ ہے، اور اس پر انشاء اللہ تیسرا ثواب بھی مرتب ہوگا۔

یہ ثواب قدرت ہونے پر موقوف ہے

البتہ یہ ثواب قدرت کی شرط کے ساتھ مشروط ہے، یعنی یہ ثواب اس وقت ملے گا جب مکہ مارنے پر قدرت تھی، اور چاہتا تو مار دیتا، لیکن پھر بھی اللہ کی

خاطر اور اللہ کو راضی کرنے کے لئے مکہ نہیں مارا تو اس پر تیسرا ثواب ملے گا، لیکن اگر انتقام لینے کی قدرت نہیں تھی، مثلاً ایک حاکم مکہ مار گیا، جس سے بدلہ لینا اپنے اختیار میں نہیں تھا، تو اب سوائے خون کے گھونٹ پینے کے کوئی چارہ نہیں، اب جو انتقام نہیں لیا، اس پر تیسری قسم کا ثواب اس کو نہیں ملے گا، البتہ پہلی دو قسموں کا ثواب اس کو ملے گا، تیسری قسم کا ثواب اس لئے نہیں ملے گا کہ اس نے اللہ کے لئے انتقام نہیں لیا، بلکہ قدرت نہ ہونے کی وجہ سے انتقام نہیں لیا۔

بے صبری کی دوسری صورت

آگے حضرت والا بے صبری کی دوسری صورت بیان فرما رہے ہیں کہ:

> ② دوسری صورت زبان سے برا بھلا کہنا، سامنے یا پسِ پشت بددعا دینا، غیر قادر علی الانتقام بھی اس پر قادر ہے، اس کے لئے ترک کرنا صبر ہے (ایضاً)

یعنی جس آدمی کو زیادتی کا انتقام اور بدلہ لینے کی قدرت نہیں تو کیا ایسا شخص تیسرے ثواب سے محروم رہے گا؟ کیونکہ تیسری قسم کا ثواب تو اس شخص کو ملتا ہے، جس کو انتقام پر قدرت ہو، اور پھر انتقام نہ لے، حضرت والا ایسے شخص کے لئے فرما رہے ہیں کہ تم بھی تیسری قسم کا ثواب حاصل کر سکتے ہو۔ وہ اس طرح کہ اگرچہ تم جسمانی طور پر اس شخص سے بدلہ لینے پر قادر نہیں تھے، لیکن تم اس بات پر تو قادر تھے کہ جب وہ شخص سامنے سے چلا جائے تو پیٹھ پیچھے اس کی برائی بیان کرتے، یا اس کی غیبت کرتے، اور لوگوں سے کہتے کہ یہ بڑا ظالم اور جابر ہے، برا خراب آدمی ہے، یا اس کے لئے تم بددعا تو کر سکتے تھے کہ یا اللہ! اس کو ہلاک

کر دے، کیونکہ اس نے مجھے پریشان کیا، اور ستایا، کم از کم اس پر تو تم کو قدرت حاصل تھی، لیکن قدرت کے باوجود تم نے یہ کام نہیں کئے، نہ تو تم نے اس کی غیبت کی، نہ برا بھلا کہا، نہ بد دعا دی۔ بلکہ تم نے اس کو یہ دعا دی کہ یا اللہ! اس کو ہدایت دیدے، تو اب تمہیں تیسری قسم کا ثواب بھی مل جائے گا۔

کسی کے انتقال پر ثواب کب ملیگا؟

آگے ارشاد فرمایا:

> اسی طرح اہل میت گو مدافعت پر قادر نہیں، لیکن نوحہ کرنے اور شکایت کرنے پر تو قادر ہیں۔ ان کی یہ بے صبری ہے، اور اس کا ترک کرنا صبر ہے (ایضاً)

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی کے قریبی عزیز کا انتقال ہو گیا، والد کا، یا بھائی کا، یا بیٹے کا، یا بیوی کا انتقال ہو گیا، اب یہ شخص مدافعت پر قادر نہیں کہ اللہ تعالیٰ سے نعوذ باللہ انتقام لے، یا بدلہ لے، لہٰذا عدم قدرت کے نتیجے میں اس شخص کو صبر کرنے پر تیسری قسم کا ثواب نہ ملنا چاہئے، کیونکہ یہ اصول بتا دیا کہ جب انتقام لینے پر قدرت ہو، اور پھر انتقام نہ لینے پر یہ ثواب ملتا ہے اور کسی کے انتقال ہو جانے پر آدمی صبر کرنے پر مجبور ہے، انتقام کا کوئی راستہ نہیں ہے ـــــ

تسلیم و رضا کے بغیر چارہ نہیں

مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

در پنجۂ شیرِ نر خونخوارے
جز بتسلیم و رضا چوں چارے

یعنی اگر کوئی خونخوار شیر کسی انسان کو اپنے پنجوں میں لے لے، تو اس انسان کے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں۔ اب سوائے تسلیم و رضا کے کوئی چارہ کار نہیں۔ اب بچنے کا کوئی راستہ نہیں، جو شیر کی مرضی ہوگی، کرے گا، پھاڑنا چاہے گا، پھاڑ دے گا، کھالے گا ــــــ اب یہاں تسلیم و رضا مجبوری کی وجہ سے ہوتی ہے۔

نوحہ اور شکوہ نہ کرنے پر ثواب

اس طرح اللہ تعالیٰ نے جب ہمارے کسی عزیز کو موت دیدی تو اب ہم مجبور ہیں، بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، اب یہاں جو تسلیم و رضا ہو رہی ہے، وہ مجبوری کی وجہ سے ہو رہی ہے، لہٰذا اس پر ثواب نہیں ملنا چاہئے، اس سوال کا جواب حضرت والا یہاں سے دینا چاہتے ہیں کہ یہ بات تو ٹھیک ہے کہ انسان اپنے عزیز کی موت دفع کرنے پر تو قادر نہیں ہے، لیکن اس پر قادر ہے کہ موت کے نتیجے میں نوحہ کر سکتا تھا، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر شکوہ کرنے پر تو قادر تھا۔ لیکن اس شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پیش نظر رکھتے ہوئے نہ تو نوحہ کیا، نہ ہی اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر شکوہ کیا۔ تو اس پر بھی صبر کی تیسری قسم کا ثواب بھی اس کو حاصل ہو جائے گا، کیونکہ یہ اصول بتا دیا کہ جب انتقام لینے پر قدرت ہو تو اس کے ترک کرنے پر ثواب ملتا ہے۔

آگے حضرت والا فرماتے ہیں کہ:

> ''اور جو کسی فعل پر بھی قادر نہ ہو، جیسے اندھا کہ دیکھنے پر تو بالکل قادر نہیں، مگر تصور یا عزم بصورت ابصار، یا تمنائے

ابصار للابصار پر تو قادر ہے، اس کی بے صبری یہ ہے، اور
اس کا ترک صبر ہے، لہٰذا ہر شخص کو اس کے مناسب صبر پر اجر
ملتا ہے۔'' (ایضاً)

آنکھ والے کو بدنگاہی سے بچنے پر ثواب

جس شخص کی آنکھیں درست ہوں، اس کے دل میں کسی نامحرم کو دیکھ کر لذت لینے کا تقاضہ پیدا ہوا، لیکن اس نے اللہ جل شانہ کے خوف اور ڈر سے اور اللہ کو راضی کرنے کے لئے اس نے سوچا کہ اگرچہ میرا دل نامحرم کو دیکھنے کا تقاضہ کر رہا ہے، لیکن میں اپنے آپ کو روکتا ہوں اور اپنی نظر کو غلط جگہ پر نہیں ڈالوں گا، چنانچہ اس نے اپنی نظر کو روک دیا، اس پر اس کو صبر کا ثواب ملا، کیونکہ اس کے دل میں دیکھنے کا تقاضہ پیدا ہوا تھا، اور اس کا نفس اس کو گناہ کی طرف لے جا رہا تھا، لیکن اللہ کی خاطر اس نے یہ گناہ نہیں کیا، اور نفس کو روک لیا، لہٰذا اس پر اس کو صبر کا ثواب ملے گا۔

اندھے غیر قادر کو ثواب نہیں ملے گا

لیکن ایک آدمی اندھا ہے، وہ دیکھ ہی نہیں سکتا، ایسے شخص کے دل میں اولاً تو بدنظری کی خواہش پیدا ہی نہیں ہوگی، اگر خواہش پیدا ہو بھی، اور پھر بدنظری سے بچ جائے تو اس پر ثواب بھی نہیں ملے گا، کیونکہ وہ بدنظری سے اس لئے نہیں بچا کہ اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا، بلکہ وہ اس لئے بچا کہ اس کے اندر دیکھنے کی قدرت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا بدنظری سے بچنے پر اس اندھے کو کوئی ثواب نہیں ملے گا، اسی طرح اگر کوئی نامرد آدمی زنا کاری سے بچے تو اس پر کوئی ثواب نہیں۔

اسی طرح ایک اپاہج آدمی چوری کرنے سے بچے، اس پر کوئی ثواب نہیں، اسی طرح گونگا آدمی غیبت کرنے اور جھوٹ بولنے سے بچے تو اس پر کوئی ثواب نہیں، کیونکہ اس کو اس گناہ کے کرنے پر قدرت ہی نہیں تھی، اگر جھوٹ بولنا چاہتا بھی تو نہیں بول سکتا تھا، نہ غیبت کر سکتا تھا، لہٰذا اس کو ان گناہوں کے ترک پر کوئی ثواب نہیں ملے گا۔

اندھے کو تمنا نہ کرنے کا ثواب ملے گا

آگے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ وہ اندھا شخص اگرچہ دیکھنے پر تو قادر نہیں تھا، لیکن دیکھنے کی تمنا پر تو قادر تھا، یعنی یہ تمنا تو کر سکتا تھا کہ کاش میری آنکھ ہوتی تو یہ لذت لیتا، یا فلاں گناہ کرتا، گونگا بول نہیں سکتا، لیکن یہ تمنا کر سکتا تھا کہ کاش میری زبان ہوتی تو یہ جھوٹ بولتا، یا فلاں کی غیبت کرتا، اب تمنا بھی کر رہا ہے، اور قصد بھی ہو رہا ہے، اور اپنے اختیار سے گناہ کی تمنا کرنا بھی گناہ ہے، اب اگر اس شخص کے دل میں گناہ کی تمنا کرنے کا داعیہ اور تقاضہ پیدا ہوا تھا، لیکن اس نے تمنا نہیں کی، اللہ کے ڈر اور خوف سے تمنا کرنے سے رک گیا تو پھر اس کو صبر کی تیسری قسم کا ثواب بھی ملے گا۔

تکلیف کا اجر تو ضرور ملے گا

آگے ارشاد فرمایا کہ:

> یہ تفصیل تو اجر صبر میں ہے، اور ایک اجر خود تکلیف پر بھی ہوتا ہے، اس میں صبر کی قید نہیں، اگر صبر کیا تو دو اجر ملیں گے، ایک صبر کا، دوسرے تکلیف کا، اور اگر صبر نہ کیا تو تکلیف کا اجر

ملے گا، اور بے صبری کا گناہ ہوگا، جیسے ایک شخص نماز پڑھے، اور روزہ نہ رکھے تو نماز کا ثواب ملے گا اور روزہ نہ رکھنے کا گناہ ہوگا (ایضاً)

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بے صبری کا مظاہرہ کرے، مثلاً نوحہ کرے، یا ماتم کرے، یا دل میں اللہ جل شانہ کے فیصلے پر شکوہ ہو، یہ بے صبری ہے تو بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اس بے صبری کے نتیجے میں تکلیف پر جو ثواب ملتا، وہ چلا گیا، حضرت والا فرما رہے ہیں کہ یہ سمجھنا غلط ہے، کیونکہ دونوں ثواب الگ الگ ہیں، ایک ثواب تو تکلیف پہنچتے ہی مل گیا، چاہے صبر کرو، یا صبر نہ کرو، وہ ثواب صبر کرنے پر موقوف نہیں، اگر کوئی شخص بے صبری کرے تو بے صبری کا گناہ ہوگا، لیکن تکلیف پہنچنے کا ثواب بھی ملے گا۔

نماز کا ثواب، گناہ کا عذاب

یہ بالکل ایسا ہے جیسے ایک شخص نماز پڑھے، ساتھ میں کوئی گناہ بھی کرے، تو اب نماز کا ثواب بھی اس کو ملے گا، اور گناہ پر عذاب بھی ملے گا، دونوں اپنی اپنی جگہ پر ہونگے، ایسا نہیں ہوگا کہ چونکہ گناہ کیا تھا، لہٰذا نماز کا ثواب بھی ضائع ہو گیا۔

ہر چیز کا حساب الگ مقرر ہے

اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں قاعدہ یہ ہے کہ جو ثواب کا کام ہے، اس پر ثواب ملے گا، جو عذاب کا کام ہے، اس پر عذاب، یہ نہیں کہ عذاب کے کام کی وجہ سے ثواب کا کام بھی جاتا رہا، ایسا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر ایک چیز کا

حساب الگ مقرر ہے، یہ اور بات ہے کہ بعض گناہوں کی بے برکتی ایسی ہوتی ہے کہ آدمی بعض اوقات نیک کام سے محروم ہو جاتا ہے، وہ الگ بات ہے، لیکن جہاں تک ثواب کا تعلق ہے، ثواب ضرور ملے گا، ایک شخص نے نماز پڑھی، اس کو نماز کا ثواب مل گیا، اب مسجد سے باہر نکل کر اس نے جھوٹ بول دیا، اب اس کو جھوٹ کا گناہ بھی ہوگا۔ لیکن جھوٹ بولنے کی وجہ سے نماز کا ثواب ضائع نہیں ہوگا۔

ایک تکلیف پر تین رحمتیں

اسی بات کو حضرت والا فرما رہے ہیں کہ جو تکلیف پہنچی، اس تکلیف کے نتیجے میں انسان کو جو صدمہ ہوا، اس پر براہ راست ثواب اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا، قطع نظر اس سے کہ تم اس تکلیف صبر کرتے ہو یا نہیں اور اگر تم نے صبر بھی کیا تو دوسرا ثواب عطا فرما دیا، اور اگر صبر نہیں کیا، بلکہ بے صبری کی تو اس پر گناہ ہوگا-----یہ بڑی دقیق باتیں ہیں جو حضرت والا نے یہاں بیان فرمائی ہیں-----خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک تکلیف کے اوپر تین ثواب رکھے ہیں۔ ایک تکلیف کا ثواب، دوسرے اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہنے کا ثواب، تیسرے قدرت کے باوجود انتقام نہ لینے کا ثواب، میرے مولیٰ کا کرم دیکھو کہ ایک تکلیف دی، اور اس پر رحمت کے تین دروازے کھول دیئے۔

زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام دین ہے

اسی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کے نیک بندے ہیں، تکلیف کے وقت ان کی نظر ان رحمتوں کی طرف ہوتی ہے، دیکھنے میں یہ تکلیف اور پریشانی لگ رہی ہے،

لیکن حقیقت میں اس کے ذریعے درجات بلند ہو رہے ہیں، بس تھوڑا سا دھیان دینے کی بات ہے ــــــ ہمارے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں: دین تو زاویہ نگاہ کی تبدیلی کا نام ہے، وہی کام تم پہلے بھی کر رہے تھے، اب ذرا زاویہ نگاہ بدل دو، اور دوسرے زاویہ سے کرنا شروع کر دو، پہلے وہ دنیا تھی، اور اب دین ہو گیا۔

تکلیف کو راحت بنانے کا آسان طریقہ

دنیا میں کوئی آدمی ایسا ہے جس کو تکلیف نہ پہنچے؟ اس دنیا میں تو تکلیف ضرور پہنچے گی، بڑے سے بڑا بادشاہ، بڑے سے بڑا صاحب اقتدار، بڑے سے بڑا فلسفی، بڑے سے بڑا دانشور، بڑے سے بڑا صاحب دولت ایسا نہیں ہے، جس کو کبھی تکلیف نہ پہنچی ہو، اب ایک طریقہ یہ ہے کہ تم اس تکلیف کو تکلیف بنائے رکھو، اور اس تکلیف کو اپنے لئے وبال جان بنالو، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ اس تکلیف کا ایسا علاج کرو کہ تکلیف تمہارے لئے راحتوں کا اور رحمتوں کا ذریعہ بن جائے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب تکلیف پہنچے تو اس وقت یہ تصور کرو کہ بیشک یہ تکلیف پہنچی ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو میرے لئے ثواب کا ذریعہ بنایا ہے:

اللّٰهم لك الحمد ولك الشكر

دوسرے یہ سوچو کہ میں اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے پر راضی ہوں، چاہے صدمہ ہو، چاہے تکلیف ہو، چاہے رنج ہو، لیکن میں اس پر راضی ہوں، تو اللہ تعالیٰ مجھے رضا بالقضا کا ثواب بھی عطا فرمائیں گے، تیسرے یہ سوچو کہ میں انتقام لے کر کیا کروں گا، مجھے جو تکلیف پہنچی ہے، اگر میں ویسی تکلیف دوسرے کو پہنچا دوں گا،

شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن اس سے مجھے کیا ملے گا؟ لیکن اگر معاف کردوں گا تو مجھے بہت کچھ ملے گا، اس لئے میں بدلہ نہیں لیتا، میں معاف کرتا ہوں ـــــــ لہٰذا میں کیوں ایک تکلیف پر تین ثواب نہ کمالوں، جب یہ سوچو گے تو اس سے زاویہ نگاہ بدل جائے گا، اور زاویہ نگاہ کے بدلنے سے وہ تکلیف راحت اور عافیت اور رحمت بن جائے گی۔

یہ رحمت دشمنوں کو کیوں ملے

اسی بات کو ایک شعر میں کہا گیا ہے، یہ شعر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو بہت پسند تھا، اور آپ کے تقریباً ہر وعظ میں یہ شعر موجود ہے:

نہ شود نصیب دشمن کہ بود ھلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

اس شعر کا مصداق بڑا خطرناک ہے، ہمارے بس کی بات نہیں، اس لئے کہ ہم کمزور ہیں، لیکن حضرت فرماتے ہیں کہ: تیری تلوار سے ہلاکت میرے دشمنوں کا مقدر کیوں ہو؟ دوستوں کا سر سلامت ہے تو اس پر اپنا خنجر آزما، یعنی ہمیں تو تیرے خنجر آزمانے میں لذت ہے، یہ لذت ہمارے دشمنوں کو کیوں ملیں، یعنی تیری طرف سے جو تکلیفیں پہنچ رہی ہیں، ان تکلیفوں پر ان ثوابوں کا تصور کریں جو ان پر ملنے والے ہیں، یا اس تکلیف کا رونا روئیں، کیونکہ جو تکلیف آپ کی طرف سے پہنچتی ہے وہ حقیقت میں رحمت ہوتی ہے، اور جب وہ رحمت ہوتی ہے تو وہ رحمت میرے دشمن کے پاس کیوں جائے، میرے پاس کیوں نہ آئے ـــــ ہم جیسے کمزوروں کو یہ بات نہیں کہنی چاہئے۔ یہ اونچے لوگ ہیں جو

یہ بات کہتے ہیں، ہمارے بس کی بات نہیں، ہمیں تو اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگنی چاہئے۔

بزرگوں کی صحبت زاویہ نگاہ بدل دیتی ہے

لیکن حضرت والا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ سے تکلیف مت مانگو، لیکن جب تکلیف آجائے تو اس وقت یہ تصور کرو کہ میاں، یہ تو دینے والے کی عطا ہے، یہ عنوان اگرچہ تکلیف کا ہے، لیکن حقیقت میں رحمت ہے، اس کے ذریعہ کتنے اجر و ثواب کے دروازے کھول دیئے ــــــ یہ چیز زاویہ نگاہ کے تبدیل کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اور بزرگوں کی صحبت سے یہی چیز حاصل ہوتی ہے کہ ان باتوں کی طرف نگاہ جانے لگتی ہے، پہلے تو غفلت کے عالم میں تھے، خوشی آگئی تو آنے دو، تکلیف آگئی تو آنے دو، نہ خوشی پر کوئی شکر ہے، نہ تکلیف پر کوئی صبر ہے، اس طرح کی زندگی گزر رہی تھی، لیکن جب کسی اللہ والے سے تعلق قائم کیا، اور اس کے پاس اٹھنا بیٹھنا شروع کیا تو اس نے زاویہ نگاہ کو بدل دیا۔ اس کے نتیجے میں خوشی بھی وہی رہے گی جو پہلے ہوا کرتی تھی، لیکن اب اس خوشی پر زاویہ نگاہ بدل جائے گا کہ خوشی آنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو گے، تو وہ خوشی تمہارے لئے باعث اجر و ثواب بن جائے گی، اور تکلیف جیسے پہلے آتی تھی، اب بھی آئے گی، شیخ کے پاس آنے سے تکلیفیں رفع نہیں ہوتیں، لیکن پہلے تکلیف اس طرح آتی تھی کہ تکلیف ہی تکلیف ہوتی تھی، اب ہم نے تمہارا زاویہ نگاہ تبدیل کر دیا، اب یہ تکلیف تمہارے لئے رحمت بن کر آئے گی، بزرگوں کے پاس جانے سے یہ فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کے پاس

کوئی جنتر منتر ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ تمہیں گناہوں سے بچالیں گے، تمہیں جنت میں پہنچادیں گے، ایسا کچھ نہیں ہوتا، بلکہ جو کچھ کرنا ہوتا ہے، آدمی کو خود کرنا ہوتا ہے، لیکن ان کے پاس جاؤ گے تو وہ تمہارا زاویہ نگاہ تبدیل کردیں گے۔

صحبت اولیاء سو سالہ عبادت سے بہتر

اسی واسطے فرماتے ہیں:

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء
بہتر است از صد سالہ طاعتِ بے ریا

یعنی اللہ والے کی ذرا دیر کی صحبت سو سال کی بے ریا طاعت سے بہتر ہے، کیوں؟ اس لئے کہ جب اس کے پاس نہیں گئے تھے اور اس کی صحبت حاصل نہیں کی تھی تو زاویہ نگاہ درست نہیں ہوا تھا، اور اس نے ایک لمحہ میں زاویہ نگاہ تبدیل کردیا، جو باتیں پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ اب سمجھ میں آنے لگیں، جن باتوں کی طرف پہلے دھیان نہیں ہوتا تھا، اب ہونے لگا، جس چیز کی طرف پہلے نگاہ نہیں جاتی تھی، اب جانے لگی، یہ چیزیں بزرگوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہیں، جو صد سالہ طاعت بے ریا سے بہتر ہے۔

راحت اور تکلیف دونوں پر اجروثواب

بہرحال! اس دنیا میں خوشی بھی آئے گی، اور تکلیف بھی آئے گی، جب خوشی آئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور جب تکلیف آئے تو اس وقت ان تین باتوں کا تصور کرو کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ نے اجروثواب کے تین راستے عطا فرمادیے ہیں، اور میرا زاویہ نگاہ بھی درست ہوگیا، اب الحمدللہ وہ حدیث صادق

آ گئی جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ مؤمن کا کسی حال میں گھاٹا نہیں، اگر اس کو راحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے، وہ اس پر شکر ادا کرتا ہے، اس پر اسکو ثواب ملتا ہے، اگر تکلیف پہنچتی ہے، اس پر صبر کرتا ہے تو اس پر اس کو ثواب ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''تکالیف'' ترقی درجات کا سبب ہیں

مجلس نمبر 99

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 99

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

''تکالیف'' ترقی درجات کا سبب ہیں

مجلس نمبر 99

الحمدللہ ربّ العالمین، والعاقبۃ للمتقین، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رسولہ الکریم، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین۔ امابعد:

افلاطون کا سوال، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جواب

گزشتہ چند روز سے صبر کا بیان چل رہا ہے، انہی ملفوظات میں ایک ملفوظ یہ ہے کہ:

افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر حوادث تیر ہوں، اور آسمان کمان ہو، تیر انداز حق تعالیٰ ہوں، تو بچنے کی کیا صورت ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر انداز کے پہلو میں جا کھڑا ہو، پھر تیر سے بچ جائے گا، کیونکہ تیر اسی کو ہلاک کرتا ہے جو اس کی زد پر ہو، اور جو تیر انداز کے پہلو میں کھڑا ہو، اس پر تیر نہیں پہنچتا، یعنی تعلق مع اللہ ایک ایسی چیز

ہے جس سے حوادث ضرر نہیں پہنچا سکتے۔

(انفاس عیسیٰ ص ۲۱۱)

ایسے تیروں سے بچنے کا کیا راستہ؟

یہ ایک روایت ہے، اس زمانے کی روایات کوئی بہت زیادہ مضبوط سند والی نہیں ہوتیں، لیکن جس طرح اور تاریخی روایات ہیں، اسی طرح کی یہ بھی ایک روایت ہے ____ اس میں افلاطون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ اگر حوادث تیر ہوں، یعنی حوادث زمانہ کو تیر تصور کریں، اور آسمان کو کمان، جس طرح کمان سے تیر چلتا ہے، اسی طرح آسمان سے حوادثِ روزگار انسانوں کو پہنچ رہے ہیں، اور حق تعالیٰ تیر انداز ہیں، یعنی وہ حوادث زمانہ کے تیر چلا رہے ہیں، تو ایسی صورت میں ان تیروں سے بچنے کا کیا راستہ ہے؟ کیونکہ پورا آسمان کمان بنی ہوئی ہے تو ساری دنیا اس کی زد میں ہے، اور تیر انداز بھی کوئی اناڑی نہیں ہے، جس کا نشانہ خطا ہو جائے، بلکہ تیر انداز حق تعالیٰ ہیں، تو اب بچنے کا کیا راستہ ہے؟

تیر انداز کے پہلو میں کھڑے ہو جاؤ

موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا کہ تیر انداز کے پہلو میں جا کر کھڑا ہو جائے، وہاں تیر نہیں آئے گا، کیونکہ تیر اسی کو ہلاک کرتا ہے جو اس کی زد پر ہو، اور جو شخص تیر انداز کے پہلو میں کھڑا ہوگا، اس پر تیر نہیں پہنچتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مراد یہ تھی کہ اگر ان تیروں سے بچنا چاہتے ہو تو اس کا واحد راستہ یہ ہے کہ تعلق مع اللہ پیدا کرو، اللہ جل شانہ سے تعلق پیدا کرو، جب اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہو جائے گا، تو پھر یا تو تیر لگے گا نہیں، یعنی حادثہ پیش نہیں آئے گا، یا اگر حادثہ پیش آئے گا تو اس

پیش آنے والے حادثہ پر غم، صدمہ اور پریشانی اس درجہ کی نہیں ہوگی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جڑا ہوا ہے، اور جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق جڑا ہوا ہوتا ہے تو پھر تکلیف اور پریشانی بھی پریشانی نہیں رہتی، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ مجھے یہ جو کچوکے لگ رہے ہیں، یہ جو مجھے تکلیف پہنچ رہی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت سے پہنچ رہی ہے اور میرے حق میں بالآخر فائدہ مند ہے، اور مجھے اس پر اجر ملنے والا ہے، اس کے ذریعہ میرے درجات بلند ہونے والے ہیں۔

یہ تکلیف میرے فائدے کیلئے ہے

جیسے کل میں نے ایک مثال دی تھی کہ کوئی شخص ڈاکٹر سے آپریشن کرار ہا ہے، تو اس آپریشن کے نتیجے میں تکلیف بھی ہو رہی ہے، آہ آہ بھی کر رہا ہے، لیکن دل میں یہ یقین ہے کہ ڈاکٹر میرا ہمدرد ہے، یہ میرا خیر خواہ ہے، تو جب انسان کا اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق قائم ہو جاتا ہے تو اگر اس کے بعد کوئی پریشانی اور تکلیف بھی آتی ہے تو آدمی کے دل میں یہ ایمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے فائدے کے لئے یہ تکلیف دی ہے، اگرچہ مجھے اس سے تکلیف ہو رہی ہے---- جب یہ اطمینان ہے تو ٹیسیں بھی اٹھیں گی، آہیں بھی نکلیں گی، آنسو بھی نکلیں گے، لیکن دل میں شکوہ نہیں ہوگا، بلکہ دل میں اطمینان ہوگا کہ انجام کار بہتر ہے، اور انشاء اللہ اس سے مجھے فائدہ پہنچے گا۔

یہ تکالیف ''اضطراری مجاہدہ'' ہیں

اور جب تعلق مع اللہ کے ساتھ تکلیفیں ا ی ہیں، یا مصائب آتے ہیں، تو ایک طرف تو یہ فائدہ ہے کہ آدمی کو پریشانی نہیں ہوتی، اور پریشانی کا مطلب ہے

کہ گھبراہٹ ہے، چین نہیں آرہا ہے، اور بے چینی ہے، بلکہ تکلیف کے باوجود اللہ جل شانہ کے فیصلے پر راضی ہے ____ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جب تعلق مع اللہ کے ساتھ مصائب آتے ہیں تو یہ ''مجاہدہ اضطراری'' ہوتا ہے، یعنی یہ ''غیر اختیاری مجاہدہ'' ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندہ پر آرہا ہے، اور بزرگوں کا تجربہ یہ ہے کہ غیر اختیاری مجاہدے میں انسان کے درجات بہت تیزی سے بڑھتے ہیں۔

پہلے صوفیاء اختیاری مجاہدے کراتے تھے

آپ نے سنا ہوگا کہ پہلے زمانے میں لوگ جب اولیاء کرام اور صوفیاء کرام کے پاس اصلاح کے لئے جاتے تھے تو وہ صوفیاء مجاہدے کرایا کرتے تھے، اور مجاہدوں کا مطلب یہ ہے کہ مشقتوں اور ریاضتوں کا کام کرایا کرتے تھے، مثلاً کسی کو اس کام پر لگا دیا کہ تم مسجد کے حمام کے چولہے جھونکا کرو، کسی کو اس کام پر لگا دیا کہ تم نمازیوں کے جوتے سیدھے کیا کرو، کسی کو لگا دیا کہ تم وضو کے لئے پانی بھر کے لایا کرو، یہ سب مشقت کے کام کرا رہے ہیں، تاکہ جو نفس گناہوں کا عادی ہو گیا ہے، اس کو ذرا مشقت سہنے کا عادی بنا دیا جائے، اور بالآخر وہ گناہوں سے بچے، اس کام کے لئے مجاہدے کرائے جاتے تھے۔

مکہ مکرمہ میں مجاہدے کرائے گئے

حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے ساتھ یہ ہوا کہ مکہ مکرمہ میں مجاہدے ہو رہے ہیں، مشرکین مکہ نے ظلم وستم ڈھانے کا کوئی طریقہ ان پر نہیں چھوڑا، مارنا، پیٹنا، دھوپ میں تپتی ہوئی ریت پر لٹانا، پتھروں کی سلیں سینوں پر رکھنا، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم دیا جارہا تھا کہ صبر

کرو، اور جواب مت دو، وہ اگر تھپڑ مار رہے ہیں تو ایک تھپڑ بھی تم ان کو نہ مارو، یہ سب مجاہدہ ہو رہا تھا۔ اس لئے کہ مجاہدات کے ذریعہ انسان کی اصلاح ہوتی ہے اور اس کے درجات میں ترقی ہوتی ہے۔

غیر اختیاری مجاہدات سے ترقی تیزی سے ہوتی ہے

لیکن ایک مجاہدہ اختیاری ہوتا ہے، جو بندہ اپنے اختیار سے کرتا ہے، جیسے صوفیاء کرام اپنے مریدوں سے کراتے ہیں ـــــ اور ایک مجاہدہ غیر اختیاری اور اضطراری ہوتا ہے۔ یعنی من جانب اللہ ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ اس کی وجہ سے مشقتوں سے گزر رہا ہے، صدمے اور تکلیفیں آ رہی ہیں، اگر تعلق مع اللہ کے ساتھ ساتھ راستہ صحیح ہو تو پھر ان غیر اختیاری مجاہدات میں روحانی ترقی بڑی تیز رفتاری سے ہوتی ہے ـــــ لہٰذا اگر ایک سال تک کسی خانقاہ میں رہ کر جو مجاہدات کرو گے، ان کا وہ فائدہ نہیں ہوگا جو ایک مہینہ تک غیر اختیاری طور پر مصائب اور مشکلات سے فائدہ ہوگا، تو مجاہدہ اضطراری کے نتیجے میں ایک مہینے میں وہ فاصلہ طے ہو جائے گا جو سال بھر میں طے نہیں ہوا تھا۔ بہرحال! مجاہدہ اضطراریہ میں یہ فائدہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ تکالیف جو آتی ہیں، یہ بالآخر ایک مؤمن کے لئے فائدہ مند ہوتی ہیں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں ترقی درجات کا باعث ہوتی ہیں، روحانی مدارج طے ہو جاتے ہیں، اور آخرت میں اس پر اجر و ثواب ملتا ہے۔

تکلیف نہیں، عافیت مانگو

یہ اور بات ہے کہ تکالیف مانگنے کی چیز نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت

مانگو، کہ یا اللہ! ہم کمزور ہیں، معلوم نہیں کہ ہم ان تکالیف کا تحمل کرسکیں، یا نہ کرسکیں، ہم اپنی بہادری کا دعویٰ نہیں کرتے، اس لئے یا اللہ! ہم آپ سے عافیت مانگتے ہیں، لیکن جب تکلیف آئے گی تو اس پر صبر و تحمل کی بھی توفیق آپ سے مانگتے ہیں، البتہ ان تکالیف کے دور کرنے کا علاج بھی کرو، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ یقین رکھو کہ یہ تکالیف بالآخر میرے لئے انشاء اللہ فائدہ مند ہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ کا واقعہ

یہ ''تعلق مع اللہ'' تکالیف کے وقت پریشانی کو دور کر دیتا ہے، کیونکہ ''تعلق مع اللہ'' کے بعد جو مصیبتیں آئیں گی، یا پریشانیاں آئیں گی، اس کے نتیجے میں گھبراہٹ اور بے چینی نہیں ہوگی، جس وقت ''مشرقی پاکستان'' کے الگ ہونے کا واقعہ پیش آیا، اس وقت پاکستان کے نوے ہزار فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیے، تو اس موقع پر اتنا صدمہ ہوا کہ کسی طرح قرار نہیں آتا تھا، ہر وقت دماغ پر وہی صدمہ مسلط ہوگیا، نہ نماز میں دل لگ رہا تھا، نہ تلاوت قرآن کریم میں دل لگ رہا تھا، کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا، ہر وقت پریشانی دل پر چھائی رہتی کہ یا اللہ! یہ کیا ہوگیا، تاریخ میں کبھی بھی اتنی بڑی تعداد میں مسلمان فوجیوں نے کافروں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے تھے، جیسے وہاں ڈال دیے۔

چنانچہ میں نے اپنے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ حضرت! مجھے یہ صدمہ ہے، اور اس صدمہ کی وجہ سے کسی پل قرار نہیں آرہا ہے، پریشانی ہے کہ آئندہ کیا ہوگا، اور اس کی وجہ سے نہ نماز میں دل لگ رہا ہے، نہ کسی اور کام میں دل لگ رہا ہے، جواب میں حضرت والا نے ایک جملہ تحریر فرمایا، اس جملہ نے دروازہ کھول دیا کہ الحمدللہ آج تک اس کی ٹھنڈک دل میں محسوس ہوتی

ہے، اور جب کبھی اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو حضرت والا کا یہ جملہ یاد آجاتا ہے جس کی وجہ سے پریشانی نہیں ہوتی، وہ جملہ یہ تھا کہ:

غیر اختیاری امر پر اتنا تأثر قابل اصلاح

''غیر اختیاری امور پر اتنا تأثر لینا قابل اصلاح ہے''

یعنی جو بات انسان کے اختیار میں نہیں، اور غیر اختیاری طور پر ہوگئی، اور منجانب اللہ ہوگئی، کیا تمہارے اختیار میں ہے اس کا مداوا کرنا؟ اس کا علاج تمہارے اختیار میں ہے؟ نہیں، تو غیر اختیاری طور پر جو بات پیش آگئی ہے، اس پر اتنا تأثر لینا کہ آدمی بے چین اور بے حد پریشان ہو جائے، یہ خود قابل اصلاح ہے، اس کے معنی یہ ہیں کہ رضا بالقضا میں کمی ہے اور اللہ تعالیٰ پر توکل میں کمی ہے، جس شخص کو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت پر بھروسہ ہوگا، وہ کبھی کسی غیر اختیاری حادثے اور واقعہ پر اتنا تأثر نہیں لے گا، کہ پریشانی لاحق ہو جائے۔

جس کا اللہ ہو، اس کو کیسی پریشانی

ایک مرتبہ میرے دوسرے شیخ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین) کو ایک بات لکھی، اس کے جواب میں حضرت والا نے ایک جملہ ارشاد فرمایا وہ جملہ بھی بڑا عجیب وغریب تھا، وہ جملہ یہ تھا کہ:

''میاں! جس کا اللہ ہو، اس کا پریشانی سے کیا تعلق''

یعنی جتنا بھی بڑے سے بڑا حادثہ پیش آجائے، کتنا بڑے سے بڑا

صدمہ آجائے، یا تکلیف آجائے، لیکن جب اللہ جل شانہ کے ساتھ تعلق قائم ہے تو پھر کیسی پریشانی؟ وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر جب تک اپنی خواہشات کو فنا نہ کردے گا، اس وقت تک وہ اللہ کا صحیح بندہ نہیں بنے گا، لہٰذا اپنی خواہشات کو اپنی تمناؤں اور آرزوؤں کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے میں فنا کردو۔

کوئی کام میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتا

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کیا حال ہے؟ کیسی گزر رہی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ میں بڑے عیش اور بڑی راحت میں ہوں، پھر فرمایا کہ میاں! اس شخص کا حال کیا پوچھتے ہو جس کا حال یہ ہے کہ کائنات میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا، جب کوئی کام میری مرضی کے خلاف نہیں ہوتا تو اس سے میری راحت کا اندازہ لگالو ______ سوال کرنے والے نے کہا کہ حضرت: یہ مقام تو کسی نبی کو بھی حاصل نہیں ہوا کہ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہوا ہو، اور کائنات کے سارے کام اس کی مرضی کے مطابق ہوتے ہوں، انبیاء کو بھی تکلیفیں پیش آئیں، ان کی مرضی کے خلاف بھی واقعات پیش آئے۔ جواب میں حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے تو اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا ہی کردیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی مرضی، وہ میری مرضی، اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ بخار آجائے تو میری مرضی بھی یہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ میری پٹائی ہو، میری مرضی بھی یہی ہے کہ میری پٹائی ہو، اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ مجھے تکلیف پہنچے، میری مرضی یہ ہے کہ مجھے تکلیف پہنچے، لہٰذا میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع بنادیا ہے، اور جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہو رہا ہے، گویا کہ وہ میری مرضی

سے ہو رہا ہے، کیونکہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔

تکلیفیں آئیں گی، لیکن پریشانی نہیں آئیگی

بہر حال! جب ''تعلق مع اللہ'' پیدا ہو جاتا ہے تو پھر کیسی تکلیف! کیسی پریشانی، اس لئے ہمارے حضرت نے فرمایا کہ میاں! جس کا اللہ ہو، اس کا پریشانی سے کیا تعلق؟ جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اس کی طرف سے ہو رہا ہے، لہٰذا اس پر اس کو مطمئن ہونا چاہئے، مطمئن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونا چاہئے، اور اگر صدمہ ہو رہا ہے تو ہونے دو، آنسو بہہ رہے ہیں تو بہنے دو، لیکن دل مطمئن ہونا چاہئے، یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمائی کہ حوادث سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ تیر انداز کے پہلو میں جا کر کھڑے ہو جاؤ، یعنی اس کے ساتھ تعلق پیدا کرلو، البتہ اس تعلق کے بعد بھی حادثات پیش آئیں گے، کیونکہ یہ دنیا ہے، یہ جنت نہیں ہے، اور تکلیفیں بھی آئیں گی، پریشانیوں کے اسباب بھی پیدا ہوں گے، جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق پیدا ہو گیا تو وہ مصیبت کے اسباب پریشانی کا سبب نہیں بنیں گے۔

اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ

کتنے کام کی بات بتا دی کہ کیسی ہی پریشانی آجائے، کیسی ہی تکلیف آجائے، بس اس وقت آدمی یہ سوچ لے کہ یہ میرے اختیار میں نہیں ہے، اور جب میرے اختیار میں نہیں ہے تو یہ منجانب اللہ ہے، اور جب یہ منجانب اللہ ہے تو میں اس پر راضی ہوں، بس اتنی سی مختصر بات ہے ____ یہ جو افغانستان میں جو کچھ ہوا، کیا اس کو دفع کرنا تمہارے اختیار میں تھا؟ نہیں، جب یہ غیر اختیاری ہے،

تو منجانب اللہ ہے اور جب منجانب اللہ ہے تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جاؤ، اور ان کے حوالے کر دو۔

وَأُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِO

(سورہ مومن، آیت ۴۴)

میں اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ ہی بندوں کو دیکھنے والا ہے، تم بندوں کو دیکھنے والے نہیں ہو کہ فلاں بندے کے ساتھ یہ ہونا چاہیے تھا، یہ کیوں ہو گیا؟ اللہ تعالیٰ بندوں کو دیکھنے والے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لئے جو فیصلہ کیا ہے، وہی فیصلہ برحق ہے، اس پر راضی ہو جاؤ، صدمہ ہو رہا ہے تو ہونے دو، اس صدمہ پر تمہیں انشاء اللہ ثواب ملے گا، اور اللہ تعالیٰ سے مانگو، یا اللہ! تنگی ہو رہی ہے، فراخی پیدا فرما دیجئے، لیکن فیصلے پر راضی رہو۔

کیا اپنے دشمنوں کے خلاف بددعا نہ کی جائے؟

ایک صاحب نے یہ سوال کیا ہے کہ "کل آپ نے صبر پر بیان فرمایا تھا، اس میں یہ فرمایا تھا کہ کوئی شخص انتقام لینے پر تو قادر نہیں، مگر اس کے لئے بددعا کرنے پر قادر ہے، اگر وہ بددعا نہ کرے تو اس کو بھی صبر کرنے کا ثواب ملے گا، آج کل کے حالات کے پیش نظر جبکہ امریکہ اور اس کے اتحادی مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں، وہ ان سے انتقام لینے پر قادر نہیں، لیکن مسلمان ان کے لئے بددعائیں کر رہے ہیں، تو کیا مسلمان بددعا نہ کریں؟ اور قنوت نازلہ نہ پڑھیں؟

اجتماعی مسئلہ کی صورت میں نہ صبر، نہ معافی

اس کا جواب یہ ہے کہ جو کچھ میں نے بیان کیا تھا، وہ اس بارے میں تھا

جہاں انسان کو اپنی ذاتی تکلیف کا انتقام کسی شخص سے لینا ہو، وہاں بد دعا دینا اچھا نہیں، اور انتقام لینا بھی اچھا نہیں، لیکن جہاں کوئی اجتماعی مسئلہ ہو، جیسے جہاد ہے کہ جہاد کے اندر کافر تم پر حملہ کر رہا ہے، اور تم بیٹھ کر صبر کرو، اور یہ کہو کہ میں معاف کرتا ہوں، اس صورت میں نہ تو صبر کا موقع ہے، نہ معافی کا موقع، بلکہ یہ اقدام کا موقع ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کا حکم یہ ہے کہ جتنا تمہاری طاقت میں ہے، اتنا انتقام لو، اگر تلوار اور اسلحہ کے ذریعہ جواب دینا طاقت میں نہیں ہے، تو پھر دعا کرو کہ یا اللہ! اس کو مجھ سے دور کر دیجئے، یہ صبر کا موقع نہیں، صبر کا موقع وہ ہوتا ہے جہاں انسان کا ذاتی مسئلہ ہو، یا ذاتی تکلیف ہو، اس ذاتی تکلیف کو رفع کرنے کے لئے دوسرے آدمی کو حق ہے، چاہے وہ انتقام لے، چاہے انتقام نہ لے، دعا کرے، چاہے تو نہ کرے، بہر حال! جہاد والی صورت پر یہ بات صادق نہیں آتی۔

اعمال شرعیہ میں ہمت کی ضرورت

ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

> ''اعمال شرعیہ کو اللہ تعالیٰ نے ''صبر'' کے عنوان سے بیان فرمایا ہے: اِصۡبِرُوۡا وَ صَابِرُوۡا وَرَابِطُوۡا تاکہ سنتے ہی مخاطب کو معلوم ہو جائے کہ اس میں ہمت کی ضرورت ہوگی، پس اب سالکین کو جی نہ لگنے کی شکایت کرنا فضول ہے، کیونکہ تم کو تو صبر ہی کرنے کا امر ہے۔ اور ہر عمل کی حقیقت صبر ہی ہے، اور صبر میں جی نہ لگنا کیسا؟ بلکہ جی نہ لگنے کی صورت میں زیادہ خوش ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ تم کو ثواب زیادہ دینا چاہتے ہیں'' (انفاس عیسی ص ۲۱۲)

تقویٰ کا مقام صبر سے حاصل ہوگا

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ''صبر'' کا مفہوم بڑا وسیع ہے، طاعات پر صبر، معصیتوں سے صبر، مصیبت پر صبر، سارے اعمال شرعیہ اس میں آجاتے ہیں، تو قرآن کریم میں سورۃ آل عمران کی آخری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ (سورہ آل عمران، آیت ۲۰۰)

اس آیت میں اللہ جل شانہٗ نے تقویٰ کا حکم سب سے آخر میں دیا، اور اس سے پہلے فرمایا کہ صبر کرو، اور ایک دوسرے کو صبر کرنے کی تلقین بھی کرو، یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کو صبر کی تلقین کرے، اور اپنے نفس کو باندھ کر رکھے، یہ تینوں لفظ درحقیقت صبر ہی کے بارے میں بیان فرمائے ہیں، پھر آخر میں فرمایا کہ: ''واتقوا اللہ'' تقویٰ اختیار کرو ____ اسی سے اشارہ اس طرف فرمادیا کہ تقویٰ کا مقام حاصل کرنے کے لئے پہلے صبر کی ضرورت ہوگی، اس نفس کو روکنا بھی پڑے گا، اس کو باندھنا بھی پڑے گا، طبیعت کے خلاف اور مزاج کے خلاف باتوں پر صبر بھی کرنا پڑے گا، تب جاکر تقویٰ حاصل ہوگا، اور اس میں نفس کو تھوڑا سا کچلنا بھی پڑے گا، مارنا بھی پڑے گا، یہ تقویٰ ویسے ہی حاصل نہیں ہوگا۔

آزمائشوں سے گزرنا ہوگا

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا آمَنَّا وَھُمْ لَا یُفْتَنُوْنَ O (سورۃ العنکبوت، آیت ۲)

کیا لوگوں نے یہ سمجھا ہے کہ بس جب یہ کہہ دیں گے ہم ایمان لے آئے، بس اتنا کہنا کافی ہوگا، کیا ان پر آزمائش نہیں آئے گی؟ ہرگز نہیں، بلکہ جب تم ایمان لائے ہو، اور جنت کی خواہش ہے، اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خواہش ہے تو پھر تمہیں آزمائشوں سے گزرنا پڑے گا، ان آزمائشوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ شریعت نے جس کام کے کرنے کو کہا ہے، وہ کام کرنا پڑے گا، یا تمہارا دل ایک کام کے کرنے کو چاہ رہا ہوگا، لیکن شریعت کے حکم کی وجہ سے اس کام سے رکنا پڑے گا، طبیعت کے خلاف یہ سب کام کرنے ہوں گے، اس کے بغیر تقویٰ کی منزل حاصل نہیں ہوگی۔

تھوڑی سی ہمت کرنی ہوگی

حضرت والا رحمہ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ جس راستے پر تم چلے ہو، اس راستے میں تمہیں تھوڑی سی ہمت کرنی ہوگی، لہٰذا کمر کس لو، یہ نہیں ہوگا کہ جیسی زندگی پہلے گزر رہی تھی، ویسی زندگی گزرتی چلی جائے گی، اور تقویٰ بھی حاصل ہو جائے گا، اور جنت بھی مل جائے گی ـــــ رِند کے رِند رہے، ہاتھ سے جنت نہ گئی ـــــ ایسا نہیں ہوگا، بلکہ تھوڑی سی محنت کرنی ہوگی۔

کیا نماز لذت اور مزہ کیلئے پڑھتے ہو؟

دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جو لوگوں کو اکثر و بیشتر شکایت ہوتی ہے کہ نماز میں

دل نہیں لگتا، نماز میں مزہ نہیں آتا۔ نماز میں کیف وسرور نہیں محسوس ہوتا، اسی طرح ذکر میں عبادت میں کیف وسرور اور لطف محسوس نہیں ہوتا۔ بس ایک عادت ہے، اس عادت کے مطابق نماز پڑھتے رہتے ہیں، لیکن نماز میں نہ کیف ہے، نہ لطف ہے، نہ رقت ہے، نہ خشوع وخضوع ہے، ذکر واذکار اور معمولات بھی ہو رہے ہیں، لیکن ان میں بھی دل نہیں لگتا، نہ مزہ آتا ہے، بس رسم کے مطابق انجام دے رہے ہیں، سالکین کو جو یہ شکایت ہوتی ہے، اس کے بارے میں حضرت والا فرما رہے ہیں کہ یہ سوچو کہ یہ جو نماز پڑھتے ہو، یا ذکر واذکار کرتے ہو، کیا اس کا مقصد مزہ اور لطف لینا ہے؟ کیا کیف وسرور کا حصول مقصود ہے؟ اگر لذت اور مزہ لینے کے لئے یہ عمل کر رہے ہو، پھر تو اخلاص ہی نہ ہوا۔ کیونکہ جس راستے پر تم چلے ہو۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کا راستہ ہے، اور حکم کی اطاعت میں تو نفس کے خلاف کرنا پڑے گا۔

طاعات میں لگا رہے

لہٰذا اگر عبادات وطاعات میں لذت نہیں آرہی ہے تو اصل تقاضہ یہ ہے کہ لذت نہ آئے، مزہ نہ آئے، اور طاعات کی ادائیگی میں صبر کرنا پڑ رہا ہے، لہٰذا مزہ لذت نہ آنے کی صورت میں گھبرانے کی ضرورت نہیں، ہاں! دل نہ لگنے کے باوجود، مزہ نہ آنے کے باوجود پھر بھی طاعات میں لگا رہا اور یہ سوچا کہ میں یہ کام کروں گا، کیونکہ میرے اللہ کا حکم ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اجر وثواب زیادہ ملتا ہے۔

دل لگنا ضروری نہیں، لگانا ضروری ہے

کسی شخص نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کو خط لکھا کہ حضرت! کیا کروں؟ ساری عبادات کرتا ہوں، نماز پڑھتا ہوں، ذکر کرتا ہوں، مگر دل لگتا ہی نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو حال پہلے دن تھا، وہی حال آج ہے، کوئی ترقی ہی نہیں ہوئی، حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ:

''دل لگنا ضروری نہیں، لگانا ضروری ہے''

یعنی اپنی طرف سے تم کوشش کرو کہ دل لگ جائے، توجہ ہو جائے، کوشش کرنا فرض ہے، کوشش کرنے کے بعد واقعی دل لگ بھی جائے اور سارے خیالات دور ہو جائیں، یہ کوئی ضروری نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، وہ اگر چاہیں گے تو دل لگے گا، وہ نہیں چاہیں گے تو دل نہیں لگے گا، اپنی طرف سے کوشش دل لگانے کی جاری رہے، مثلاً نماز پڑھتے وقت جو الفاظ زبان سے نکل رہے ہیں، ان کی طرف دھیان دو، جب تم

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

پڑھو تو تمہیں معلوم ہو کہ میں

اَلْحَمْدُلِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

پڑھ رہا ہوں، بس اتنا کر لینا کافی ہے، جب یہ کام کر لیا تو بس خشوع حاصل ہو گیا، اب اگر غیر اختیاری طور پر خیالات آ گئے، وہ غیر اختیاری ہیں، لہٰذا وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معاف ہیں، اس پر گرفت نہیں، اس لئے کہ دل کا لگانا ضروری ہے، تمہاری کوشش کے بعد دل کا لگنا ضروری نہیں۔

میں ایسے شخص کو مبارکباد دیتا ہوں

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

''جس شخص کو ساری عمر کبھی نماز میں مزہ نہ آیا، نہ کوئی کیفیت محسوس ہوئی، لیکن اس نے نماز چھوڑی نہیں، بلکہ پڑھتا رہا، میں اس کو مبارکباد دیتا ہوں کہ اس کا یہ عمل مقبول ہے''

کیونکہ اگر اس کو نماز میں لذت آرہی ہوتی تو اس میں اس بات کا شائبہ تھا کہ یہ لذت کے لئے اور مزہ کے لئے نماز پڑھ رہا ہے، لیکن جس کو ساری عمر لذت نہ آئی، وہ تو اپنے دل پر آرے چلاتا رہا، اور اللہ کے لئے چلاتا رہا، اس کا عمل زیادہ اخلاص پر مبنی ہے۔ انشاء اللہ

حکم بجالاتے رہو

لہٰذا ہمارے دلوں میں اکثر و بیشتر یہ خیال پیدا ہوتا رہتا ہے کہ نماز میں دل نہیں لگتا، مزہ نہیں آتا، لذت نہیں آتی، ارے نہ ہوا کرے، ان چیزوں کا حاصل ہونا کہاں مطلوب و مقصود ہے، حاصل نہ ہو____ اصل چیز دیکھنے کی یہ ہے کہ تمہارا قدم صحیح راستے پر ہے یا نہیں؟ جو حکم تمہیں دیا گیا تھا، اس کو بجالا رہے ہو یا نہیں؟ اگر بجالا رہے ہو تو کہو

''اَلْحَمْدُلِلّٰہ'' اَللّٰھُمَّ لك الحمد ولك الشكر

برصراطِ مستقیم اے دل کسے گمراہ نیست

جب صراط مستقیم پر قدم ہیں تو پھر کوئی گمراہ نہیں، البتہ کوشش میں لگے

رہو:

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا

(سورہ عنکبوت، آیت ٦٩)

جولوگ ہمارے راستے میں کوشش کریں گے، مجاہدہ کریں گے، ہم ضرور بالضرور ان کو اپنے راستوں پر لے چلیں گے ____ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ جولوگ ہمارے راستے میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم ان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے راستے پر لے چلیں گے۔

تم آگے ایک دو قدم بڑھاؤ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی یہ مثال بیان فرمائی کہ جب بچہ چلنا سیکھتا ہے تو ماں باپ اس بچے کو دور کھڑا کر دیتے ہیں، پھر بچے کو اپنے پاس بلاتے ہیں کہ بیٹا قریب آؤ، اب اگر وہ بچہ قریب آنے کے لئے قدم نہ بڑھائے تو باپ اس کو نہیں اٹھاتا، لیکن جب بچہ ایک دو قدم بڑھاتا ہے اور اس کے نتیجے میں گرنے لگتا ہے تو باپ اس کو گرنے نہیں دیتا، بلکہ آگے بڑھ کر اس کو گود میں اٹھا لیتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ ہم سے یہ چاہتے ہیں کہ ہم قدم بڑھائیں۔ لہٰذا ایک قدم بڑھاؤ، دو قدم بڑھاؤ، تمہارے بس میں جتنے قدم بڑھانا ہے، اتنے قدم بڑھاؤ، اور جب تم گرنے لگو گے تو ہم گرنے نہیں دیں گے، بلکہ آگے بڑھ کر تمہیں پکڑ لیں گے، اور تمہیں گود میں اٹھالیں گے۔

اصل فکر عمل کی ہونی چاہئے

اس لئے اس فکر میں مت پڑو کہ عبادت میں لذت نہیں آرہی ہے، مزہ اور کیف اور سرور حاصل نہیں ہو رہا ہے، اگر یہ لذت اور کیف آجائے تو اس کی عطا

ہے، ان کا کرم ہے، ایک اضافی نعمت تمہیں عطا فرمادی، اس پر شکر ادا کرو کہ دنیا ہی میں عبادت کی کیف اور لذت دیدی، ان کا کام ہے، لیکن اگر کبھی لذت نہ آئے تو نہ پریشان ہو، نہ شکوہ کرو، نہ مایوس ہو جاؤ، اس لئے کہ یہ سب کیفیات آنی جانی ہیں، ان کے پیچھے نہیں پڑنا، ان کی فکر میں پڑنے کی ضرورت نہیں، اصل فکر عمل کی ہونی چاہئے کہ وہ عمل اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق اور سنت کے مطابق ادا ہو جائے، چاہے کیف اور لذت کے ساتھ ہو، یا بے کیفی اور بے لذتی کے ساتھ ہو، لیکن عمل چھوڑے نہیں۔ عمل کا چھوٹ جانا عذاب اور مصیبت ہے، اللہ تعالیٰ اس سے محفوظ رکھے، آمین۔

لذت آنے سے جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا مقام نہیں ملیگا

دیکھئے، عبادت میں اور نماز میں لذت کا آنا مقرب ہونے کی علامت نہیں، اور لذت کا نہ آنا مردود ہونے کی علامت نہیں، اگر کسی کو نماز میں لذت آجائے تو وہ یہ نہ سمجھے کہ میں جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے مقام پر پہنچ گیا، بلکہ جب لذت آئے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، یہ صورت نہ ہو کہ:

صَلّٰی الْحَائِكُ رَكْعَتَيْنِ وَانْتَظَرَ الْوَحْیَ

کہ ایک جولاہے نے ایک مرتبہ دو رکعت نماز پڑھی تو اس کے بعد وحی کے انتظار میں بیٹھ گیا کہ چونکہ میں نے دو رکعت نماز پڑھی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے اوپر وحی نازل ہونی چاہیے ______ بہرحال! اگر لذت حاصل ہو جائے تو اس کی وجہ سے تکبر اور عجب میں مبتلا نہ ہو، بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور اگر لذت نہیں آرہی ہے تو یہ مت سمجھو کہ میں مردود ہو گیا، شیطان

ہوگیا ہوں، کیونکہ یہ کیفیات تو آنی جانی ہیں، کبھی آئیں، کبھی نہیں آئیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ عمل ہو، اور وہ عمل اللہ تعالیٰ کے لئے ہو، اور استقامت کے ساتھ ہو، اللہ تعالیٰ اس کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

دل نہ لگنے کی شکایت فضول ہے

بہرحال! اس ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی کام کی بات فرما دی کہ سالکین کو جی نہ لگنے کی شکایت کرنا فضول ہے، کیونکہ تم کو تو صبر ہی کا امر ہے، حکم یہ دیا جا رہا ہے کہ صبر کرو، عبادت میں دل نہیں لگ رہا ہے، پھر بھی صبر کرتے ہوئے عبادت کرتے رہو، اور ہر عمل کی حقیقت صبر ہی ہے، اور صبر میں جی نہ لگنا کیسا ہے؟ اس لئے کہ صبر تو اسی کا نام ہے کہ جو تکلیف ہو رہی ہے، اس کو برداشت کرو، بلکہ جی نہ لگنے کی صورت میں زیادہ خوش ہونا چاہئے، کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں ثواب زیادہ دینا چاہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

و آخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

نیم جاں بستاند وصد جاں دهند
آ در و ہمت نیاید آن دهند

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصیبت میں نورانیت

مجلس نمبر 100

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط وترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی.

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 100

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَاصَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَابَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
mEmonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مصیبت میں نورانیت

مجلس نمبر 100

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاة والسلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ واصحابہ اجمعین، امابعد

اختیاری اور غیر اختیاری پریشانی

صبر کے بارے میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے ملفوظات کا بیان چل رہا ہے۔ ایک اور ملفوظ میں حضرت والا رحمہ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

> ''جس مصیبت کا ایسا غلبہ ہو جائے کہ اس کی مدافعت پر بھی قادر نہ ہو، سو یہ واقعی مجاہدہ ہے، اور اب اس پریشانی سے کچھ ضرر نہ ہوگا۔ بلکہ اس میں نورانیت ہوتی ہے، اور جو پریشانی اختیار سے لائی جاتی ہے، اس میں نور نہیں ہوتا، بلکہ ظلمت ہوتی ہے، جیسے کسی کا بچہ بیمار ہے، اور وہ اس کا علاج نہیں کرتا، اس میں پریشان ہے تو اس میں نور نہ ہوگا اور ایک صورت یہ ہے کہ بچہ بیمار تھا، اس کا علاج کیا گیا اور علاج کے بعد وہ مر

گیا تو اس سے پریشانی نہ ہوگی، عارف کا ایسی مصیبت میں دل
شاد ہوتا ہے اور ظاہر میں مغموم۔'' (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۴)

مصیبت اور تکالیف کی دو قسمیں

فرمایا کہ بعض مصیبتیں اور تکلیفیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کے اندر نورانیت ہوتی ہے، تکلیف، صدمہ اور غم کے باوجود اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس کے نتیجے میں قلب کے اندر ایک نورانیت ہوتی ہے اور اس سے درجات بھی بلند ہوتے ہیں، اور ترقی بھی ہوتی ہے، اور بعض مصائب ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں نورانیت نہیں ہوتی۔ بلکہ ظلمت ہوتی ہے، اور اس ظلمت کے نتیجے میں کوئی روحانی فائدہ حاصل نہیں ہوتا، بلکہ آدمی اور پیچھے چلا جاتا ہے۔ ان دونوں میں فرق کس طرح کریں؟ کب مصیبت کے نتیجے میں نورانیت پیدا ہوگی؟ اور کب نورانیت پیدا نہیں ہوگی؟ اس کا ایک اصول حضرت والا رحمہ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں بیان فرمایا ہے۔

غیر اختیاری میں نورانیت

وہ اصول یہ ہے کہ جو مصیبت یا تکلیف اپنے کسی اختیار کے بغیر آ گئی، اور اس کی مدافعت پر بھی انسان قادر نہیں، اگر اس پر صبر کرے گا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی رہے گا تو اس میں نورانیت پیدا ہوگی، اور اس سے دنیا کے اندر درجات میں ترقی ہوگی، اور آخرت کا ثواب بھی ملے گا، اور ایک مصیبت وہ ہے جو انسان خود اپنے اختیار سے لے کر آیا، اس مصیبت کو دفع کرنا اختیار میں تھا۔ لیکن اس مصیبت کو دفع نہیں کیا، بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا، ایسی مصیبت میں نورانیت نہیں ہوگی، بلکہ اس میں ظلمت ہوگی۔

اختیاری مصیبت کی ایک مثال

اس کی مثال حضرت والا نے یہ دی کہ مثلاً ایک شخص کا بچہ بیمار ہو گیا، اب بچے کا علاج کرنا اختیار میں ہے کہ ڈاکٹر کے پاس جائے، اور جا کر اس کا حال بتائے، اور وہ جو دوا کہے وہ پلائے، اب اس شخص کے پاس دوا خریدنے کے لئے پیسے بھی تھے، ڈاکٹر کو ادا کرنے کے لئے بھی پیسے موجود تھے، لیکن وہ شخص سستی کے مارے بیٹھا رہا اور بچے کا علاج نہیں کیا، اب علاج نہ کرنے کے نتیجے میں اگر اس بچے کا مرض بڑھ گیا، یا وہ بچہ مر گیا تو یہ جو مصیبت آئی، صدمہ آیا، اس کا سبب اپنے اختیار میں تھا، لہٰذا وہ یہ مصیبت اپنے ہاتھ سے لایا۔ اس میں نورانیت نہیں ہوگی۔ بلکہ ظلمت ہوگی، کیونکہ یہ بھی مامور بہ ہے کہ مصیبت دور کرنے کے لئے جائز اسباب کو اختیار کرو۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا عالم اسباب بنائی ہے، لہٰذا اسباب کو ترک کرنا یہ کوئی بزرگی نہیں، بلکہ اسباب اختیار کرو اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو، یہ بزرگی کی بات ہے۔ لہٰذا اس شخص نے جب اس بچے کا علاج نہیں کیا، بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا تو اس کا یہ عمل اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں آیا، لہٰذا اس مصیبت اور تکلیف پر جو نورانیت حاصل ہونی تھی، درجات میں جو ترقی ہونی تھی، وہ نہیں ہوگی۔ بلکہ ظلمت ہوگی، کیونکہ اپنے اختیار سے وہ مصیبت لے کر آیا ہے۔

ایسی تکلیف میں ظلمت ہوگی

اسی طرح اگر کوئی مصیبت غیر اختیاری طور پر آئی تھی، لیکن اس کو دفع کرنا اختیار میں تھا۔ لیکن اس کو دفع نہیں کیا تو اس مصیبت میں بھی ظلمت ہوگی، نورانیت نہیں ہوگی، مثلاً ایک شخص آپ کے اوپر حملہ آور ہو گیا، اور آپ کو جسمانی تکلیف

پہنچانے لگا، آپ کے اختیار میں تھا کہ آپ اس کی مدافعت کریں، آپ کے پاس جو اسباب ہوں ان کو استعمال کر کے اس کو دفع کرنے کی کوشش کریں، لیکن آپ نے کوئی مدافعت نہیں کی، اور خاموش ہو کر بیٹھ گئے، اس صورت میں جو صدمہ اور تکلیف آئے گی، وہ اختیاری ہوگی، ایسی تکلیف میں ظلمت ہوگی۔

اس مصیبت پر اجر و ثواب ملے گا

لہٰذا جب کوئی تکلیف یا صدمہ پیش آنے لگے، یا کوئی مصیبت پیش آنے لگے تو حتی الامکان انسان اس کو دفع کرنے کی کوشش کرے، یہ نہ سوچے کہ مصیبت آنے پر بڑے فوائد ہیں۔ بڑے اجر و ثواب ملتے ہیں۔ لہٰذا یہ تکلیف آنے دو، نہیں، بلکہ جب تکلیف یا مصیبت آنے لگے تو اس کا مداوا کرو، اس کی مدافعت کرو، البتہ پوری کوشش کرنے کے باوجود اور اسباب مدافعت اختیار کرنے کے باوجود وہ مصیبت آ گئی، اب اگر اس پر صبر کرو گے تو انشاء اللہ تعالیٰ اس پر اجر و ثواب مرتب ہوگا۔

مصیبت کا خیر مقدم کرنا خطرناک ہے

لیکن اگر انسان پر جب مصیبت آئے تو وہ اس کے دفع کی کوشش ہی نہ کرے، بلکہ اس مصیبت کا خیر مقدم کرے، اس کو اچھا سمجھے تو یہ دو لحاظ سے خطرناک بات ہے۔ ایک اس لحاظ سے خطرناک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا تھا، لیکن تم نے نہیں کیے، یہ بات اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں۔ دوسرے اس لحاظ سے خطرناک ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری کا دعویٰ ہے کہ ہم تو بڑے بہادر ہیں، یہ بڑا خطرناک ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو اس سے

محفوظ رکھے آمین۔ ارے وہاں تو شکستگی اور درماندگی چاہیے، اپنی کمزوری کا اظہار چاہیے، یا اللہ میں کمزور ہوں، میں اس تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا، یا اللہ! اس تکلیف کو مجھ سے دور کردیجئے۔

سبق آموز واقعہ

میں نے اپنے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ ایک بزرگ تھے، ہر وقت اللہ تعالیٰ کی عبادت اور ذکر میں مشغول رہتے تھے، اس ذکر میں ان کو کیف محسوس ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ غلبہ حال میں ان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ:

وَلَيْسَ لِيْ فِيْ سِوَاكَ حَظٌّ
فَكَيْفَ مَاشِئْتَ فَاخْتَبِرْنِيْ

یعنی اے اللہ! مجھے آپ کے سوا کسی چیز میں مزہ نہیں، جس طرح چاہیں آپ مجھے آزما کر دیکھ لیں۔ العیاذ باللہ۔ اللہ تعالیٰ کو آزمانے کی دعوت دیدی۔ بس اس کے بعد ان کا پیشاب بند ہوگیا۔ اب مثانہ پیشاب سے بھرا ہوا ہے، تکلیف ہورہی ہے، لیکن پیشاب خارج نہیں ہورہا ہے، علاج ہر طرح کا کرلیا، دوا لیلیں، لیکن پیشاب نہیں ہوتا۔ بالآخر ان کو تنبہ ہوا کہ میں نے کیسی غلط بات کہہ دی کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو دعوت دیدی کہ آپ جس طرح چاہیں، مجھے آزمالیں، یہ میں نے کتنی غلط بات کہہ دی، چنانچہ اپنی غلطی سے توبہ کی، ان کے پاس چھوٹے بچے پڑھنے کے لئے آتے تھے، ان بچوں سے دعا کے لئے کہا کہ:

اُدْعُوْ لِعَمِّكُمُ الْكَذَّابِ

یعنی اپنے جھوٹے چچا کے لئے دعا کرو، اس لئے کہ میں نے یہ جھوٹا دعویٰ کر دیا کہ مجھے کسی چیز میں حظ اور مزہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے خاص بندوں کی پکڑ بھی بڑی سخت ہوتی ہے، چنانچہ کئی دن اس حالت میں گزر گئے۔ دکھانا دراصل یہ تھا کہ تم تو کہہ رہے تھے کہ مجھے کسی چیز میں حظ نہیں، ارے تمہیں تو پیشاب اور پاخانہ میں حظ اور مزہ ہے۔

اللہ کے سامنے کمزوری کا مظاہرہ کرو، بہادری کا نہیں

لہٰذا یہ بات کہ مصیبت آرہی ہے۔ لیکن اس مصیبت کو دفع نہیں کر رہے ہیں، اور مصیبت دفع کرنے کے جو ذرائع اور اسباب ہیں، ان ذرائع کو استعمال نہیں کرتے، یہ ایک طرح سے بہادری کا دعویٰ ہے کہ ہم بڑے بہادر ہیں۔ العیاذ باللہ۔ کبھی اللہ تعالیٰ کے سامنے بہادری مت دکھاؤ، وہاں تو کمزوری اور شکستگی چاہئے، وہاں تو یہ کہنا چاہئے اے اللہ! ہمارے بس میں نہیں:

رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَتَ لَنَا بِهٖ

اے اللہ! ہم پر ایسا بوجھ مت ڈالئے گا، ہمارے اندر جس کے سہنے کی طاقت نہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ فَقَوِّ فِیْ رِضَاكَ ضُعُفِیْ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے کہ اے اللہ! میں تو کمزور ہوں، کون یہ دعا مانگ رہا ہے؟ جس سے زیادہ طاقت ور کوئی نہیں ہوسکتا، یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، اے اللہ میں کمزور ہوں، مجھے اپنے رضا کے کاموں میں تقویت عطا فرما۔ اے اللہ! میری کمزوری کو قوت سے تبدیل فرما دیجئے، اپنی کمزوری کا اظہار اللہ تعالیٰ کے سامنے فرما رہے ہیں۔

دشمن سے مقابلہ طلب مت کرو

ایک اور دعا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں:

اَللّٰھُمَّ لَا تُسَلِّطْ عَلَیْنَا مَنْ لَا یَرْحَمُنَا

اے اللہ! ہم پر ایسے دشمن کو مسلط مت کیجئے، جو ہم پر رحم نہ کریں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ نہیں کر رہے ہیں کہ جیسا بھی دشمن آ جائے، ہم مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہیں، نہیں، بلکہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم پر مسلط نہ فرمائیے، اسی لئے آپ نے فرمایا کہ:

لَا تَتَمَنَّوْا لِقَاءَ الْعَدُوِّ، وَاسْئَلُوْا اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ، فَاِذَا لَقِیْتُمْ فَاثْبُتُوْا

یعنی دشمن سے مقابلے کی تمنا مت کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، ہاں جب دشمن سے مقابلہ پیش آ جائے، تو پھر ثابت قدمی کا اظہار کرو۔ پہلے سے تمنا نہ کرو، مانگو نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، بلکہ اگر مصیبت آ رہی ہو تو اس کو مسنون طریقے سے دفع کرنے کی کوشش کرو۔

مصیبت کو دور کرنے کیلئے اسباب اختیار کرو

بہر حال! نہ تو مصیبت کو دعوت دینی ہے، اور نہ ہی اس کی مدافعت پر قدرت ہونے کے باوجود مدافعت میں کوتاہی کرنی ہے، بلکہ جتنی مدافعت کرنا تمہارے بس میں ہو، اتنی مدافعت کرو، پھر جب سارے اسباب اختیار کرنے کے باوجود مدافعت اختیار کرنے کے باوجود، دعائیں کرنے کے باوجود

غیر اختیاری طور پر کوئی مصیبت آ گئی تو اب صبر کرو، کیونکہ اب جو صبر کرو گے تو اس صبر کی وجہ سے اس مصیبت میں نورانیت ہوگی، اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ تمہارے درجات دنیا و آخرت میں بلند فرمائیں گے، لیکن اگر اسباب اختیار نہ کیے، تو اس مصیبت میں ظلمت ہوگی، تاریکی ہوگی، نور نہیں ہوگا۔

مصیبت کے وقت رجوع الی اللہ کی توفیق

ایک اور بات جو حضرت والا نے بیان فرمائی ہے، وہ اگرچہ یہاں مذکور نہیں ہے، لیکن بہرحال ہے، وہ یہ کہ بعض اوقات ''مصیبت'' انسان کی بدعملی کا نتیجہ اور عذاب ہوتا ہے، سزا ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ عذاب اور سزا کے اندر نور نہیں ہوتا، اور جو مصیبت سزا نہیں ہوتی، اس کے اندر نور ہوتا ہے، پھر اس کے اوپر صبر کرنے سے اجر ملتا ہے، اب کون سی ''مصیبت'' عذاب اور سزا ہے؟ اور کونسی مصیبت عذاب اور سزا نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے درجات بلند کرنے کے لئے بھیجی ہے؟ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جب بھی مصیبت اور تکلیف کے آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع میں اضافہ ہو جائے، مثلاً مصیبت آئی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے کی توفیق ہو رہی ہے کہ یا اللہ! اس مصیبت کو دور فرما دیجئے، اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کر رہا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مصیبت عذاب نہیں۔ بلکہ یہ مصیبت انشاء اللہ تمہارے درجات کی بلندی کے لئے آئی ہے، کیونکہ اگر یہ عذاب ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق نہ ہوتی۔

مصیبت کے عذاب من اللہ ہونے کی علامت

اور وہ مصیبت اور تکلیف جس میں اللہ جل شانہ کی طرف رجوع کم ہو جائے، اور آدمی اپنے فرائض و واجبات سے غافل ہو جائے، اور رجوع کے بجائے دل میں اللہ تعالیٰ سے شکوے اور شکایتیں پیدا ہونے لگے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مصیبت تمہاری کسی بدعملی کی سزا ہے، ایسی مصیبت میں آدمی غفلت سے نمازیں چھوڑ دے، اور معمولات کو ترک کردے اور عبادات چھوٹ گئیں، اور یہ عبادات اور نمازوں کا چھوٹنا اس وجہ سے نہیں ہوا کہ وقت نہیں ملا، بلکہ اس وجہ سے کہ مصیبت کے آنے کے بعد طبیعت میں ایک مایوسی اور بے حسی طاری ہوگئی، سستی طاری ہوگئی، نماز کے لئے وقت مل رہا ہے، لیکن نماز کے لئے نہیں جاتا، اور اللہ تعالیٰ کی کی طرف رجوع نہیں کرتا، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ جو مصیبت آئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سزا اور عذاب ہے۔

مصیبت کے وقت مجبوری کی وجہ سے معمولات کا ترک

بعض اوقات مصیبت کے وقت نمازیں ترک ہو جاتی ہیں، معمولات چھوٹ جاتے ہیں، اگر یہ چھوٹ جانا غفلت کی وجہ سے نہ ہو، بلکہ مجبوری کی وجہ سے چھوٹ جاتی ہیں کہ کیا کریں، مصیبت آگئی تھی، مثلاً دشمن کا مقابلہ تھا، اب اگر وہاں سے اٹھ کر نماز کے لئے جاتے تو جان چلی جاتی، یہ مجبوری پیش آگئی، اس مجبوری کی وجہ سے چھوٹنے میں کوئی نقصان نہیں، نہ اس سے نورانیت میں کمی آتی ہے، نہ اس سے مصیبت کے عذاب ہونے کا تأثر ملتا ہے۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی نمازیں دشمن کے مقابلے کے دوران قضا

ہوئیں۔ یا مثلاً بیمار ہوئے، اور بیماری کی وجہ سے آپریشن ہوا، اور اب آپ آپریشن تھیٹر میں بے ہوش پڑے ہوئے ہیں، جس کی وجہ سے نمازیں چھوٹ گئیں، تو اس کی وجہ سے نورانیت میں کمی نہیں آئے گی، اس لئے کہ مجبوری کی وجہ سے جو فرائض اور معمولات چھوٹ جائیں، تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اس کا یہاں ذکر نہیں ہو رہا ہے۔

بے حسی اور غفلت کی وجہ سے نماز کا ترک

یہاں ان نمازوں اور معمولات کا ذکر ہو رہا ہے جو کسی مجبوری کی وجہ سے نہیں چھوٹیں، بلکہ اس وجہ سے چھوٹیں کہ مصیبت کے آنے کے بعد طبیعت پر ایک بے حسی اور غفلت طاری ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا جذبہ سرد پڑ گیا، جس کی وجہ سے نماز کا وقت اور موقع ہونے کے باوجود نماز پڑھنے نہیں گیا، بلکہ پڑا رہا، جب غم اور صدمہ کا عالم ہوتا ہے تو بعض اوقات یہ کیفیت آجاتی ہے کہ آدمی اچھا خاصا صحت مند ہے، لیکن نماز کے لئے نہیں جا رہا ہے، یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ مصیبت عذاب اور سزا ہے۔

مصیبت کے وقت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرو

اور جب اس مصیبت کے عذاب ہونے کا احساس ہو جائے تو اس کا علاج بھی یہی ہے کہ دل چاہے، یا نہ چاہے، دل پر آرے چل رہے ہوں۔ لیکن نماز کی طرف اور عبادات کی طرف اور معمولات کی طرف متوجہ ہو جائے، اور اللہ جل شانہ کی طرف رجوع کرنا شروع کر دے، لہٰذا مصیبت، غم اور صدمہ کے موقع پر اپنا جائزہ لے کر دیکھو، اگر یہ محسوس ہو کہ عبادات سے غفلت ہو رہی ہے اور اللہ

تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں ہو رہا ہے، اور اس سے یہ خطرہ محسوس ہو کہ کہیں میرے لئے یہ عذاب نہ ہو تو فوراً اس کا علاج کرو، اور وہ فوری علاج بھی یہی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع شروع کردو، اور جو معمولات چھوٹ رہے ہیں، ان کی ادائیگی شروع کردو، چاہے صدمہ ہو، چاہے تکلیف ہو، چاہے دل پر آرے چل جائیں، نمازیں پڑھنا شروع کردو۔ جب یہ عمل کرو گے تو انشاء اللہ اس مصیبت کے عذاب اور سزا ہونے کے اثرات ختم ہو جائیں گے۔ وہ مصیبت تمہارے لئے باعث اجر و ثواب بن جائے گی۔

ساری عمر تراش خراش چلتی رہیگی

بس اس راستے یہی تراش و خراش چلتی رہتی ہے۔ مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

اندریں راہ می تراش و می خراش
تا دمِ آخر دمے فارغ مباش

یعنی تصوف و سلوک کی راہ میں تراش خراش چلتی رہتی ہے، یہ مت سمجھنا کہ کسی وقت تم کامل اور مکمل ہو جاؤ گے تو اس وقت کسی اضافے اور ترمیم کی ضرورت نہیں ہوگی، ایسا نہیں ہوگا، بلکہ ساری عمر یہ تراش و خراش چلتی رہے گی، یہ تو جنم روگ ہے، لہٰذا آخری سانس تک ایک لمحے کے لئے بھی فارغ ہو کر مت بیٹھنا، لہٰذا اپنے حالات میں ہر وقت غور کرتے رہو کہ جب مصیبت آتی ہے تو میں کیا کرتا ہوں، جب خوشی آتی ہے، تو اس وقت کیا کرتا ہوں۔

مصیبت کے وقت دل شاد ہوگا

جب تمہیں یہ بات حاصل ہوگئی، یعنی مصیبت میں نورانیت پیدا ہوگئی، کیوں پیدا ہوئی؟ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونے کے نتیجے میں نورانیت پیدا ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے مصیبت پر جو اجر رکھا ہے، اس اجر وثواب کے تصور سے نورانیت پیدا ہوگئی، ایسی صورت کے بارے میں حضرت والا فرماتے ہیں کہ ''عارف ایسی مصیبت کے وقت دل میں شاد ہوتا ہے اور ظاہر میں مغموم'' یعنی ظاہری اعتبار سے تو اس مصیبت پر صدمہ ہو رہا ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں۔ آہیں نکل رہی ہے، لیکن عقلاً اس بات پر مطمئن ہے کہ فیصلہ انہی کا برحق ہے، مشیت انہی کی ہے، حکمت انہی کی ہے، مصلحت انہی کی ہے، وہ جو فیصلہ کریں گے، میرا فائدہ اسی میں ہے، میں کیا، میری عقل وفہم کیا، جب یہ سمجھ لے گا تو پھر چاہے آنسو بہہ رہے ہوں، چاہے دل میں کچھ ہو رہا ہو، لیکن جب ان کے فیصلے پر راضی ہوگا تو دل شاد ہوگا۔

اللہ کی مشیت کو سوچنے سے صدمہ ختم ہو جائیگا

دیکھئے: ایک صدمہ وہ ہوتا ہے کہ آدمی کو تکلیف تو پہنچی، مثلاً جان ضائع ہوئی تو صدمہ اور تکلیف پہنچنی چاہئے تھی، یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، یا مثلاً آپ ڈاکٹر کے پاس گئے، اس نے انجکشن لگایا، اس کے نتیجے سوئی چبھی، تکلیف ہوئی، لیکن یہ تکلیف ہونی ہی تھی، یا کوئی زخم تھا، مرہم پٹی کرانے گئے تو اس سے تکلیف ہوگی، لیکن ساتھ میں دل مطمئن ہے کہ یہ تکلیف تو ہونی تھی، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ ایک وہ تکلیف ہے کہ کسی شخص نے آکر خنجر مار دیا، اور ناحق مارا،

ناانصافی سے مارا، اس کی تکلیف زیادہ ہوگی، کیونکہ خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے مار دیا۔ جب کہ کوئی قصور نہیں تھا۔ اور صدمہ بھی ہوگا۔ لیکن جب یہ سوچے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہو رہا ہے، اس کے حکم سے اس کے فیصلے سے ہو رہا ہے، اس لئے یہ عمل ہونا ہی تھا، کیونکہ ان کی مشیت اور ان کا فیصلہ تھا۔ چاہے ہماری سمجھ میں آ رہی ہو، یا نہ آ رہی ہو۔ اس سوچ کے نتیجے میں یہ دوسری قسم بھی پہلی قسم کی طرح ہو جائے گی۔ جیسے کسی ڈاکٹر کے پاس گئے، اور اس نے انجکشن لگایا اور اس سے تکلیف ہوئی، کیونکہ دل مطمئن ہے۔ اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ عارف کا ایسی مصیبت میں دل شاد ہوتا ہے ''شاد'' ہونے کے معنی یہ ہیں کہ مطمئن ہے کہ یہ کام ہونا ہی تھا۔ البتہ ظاہر میں عارف مغموم ہوتا ہے۔

یہ مصیبت تجارت میں داخل ہے

ایک اور ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''یہ واقعاتِ مصائب درحقیقت سب تجارت میں داخل ہیں کہ ایک چیز ہم سے لی جاتی ہے اور اس کے عوض دوسری چیز دے دی جاتی ہے اور تجارت بھی ایسی کہ:

نیم جان بستاند و صد جاں دھند
آنچہ در وہمت نیاید آں دھند

علاوہ اس کے مصیبت حالاً تو مصیبت ہے، مگر مآلاً نعمت ہے، کیونکہ اس سے منافع ومصالح دینیہ ودنیویہ حاصل ہوتی ہیں، ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ''برسوں کے مجاهدات سے باطن کو

وہ نفع نہیں ہوتا جو ایک ساعت کے حزن سے ہوتا ہے، خاص کر
ایمان کو پختگی ہوتی ہے۔ جو امور باطنہ میں سب سے افضل
ہے۔'' (انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۵)

راحت لیکر اجر وثواب اور جنت دیتے ہیں

دیکھئے: تجارت میں یہ ہوتا ہے کہ دوکاندار نے ہم سے پیسے لئے، اور ہمیں اپنی مطلوبہ چیز دیدی، اسی طرح اللہ تعالیٰ مصائب کے موقع پر ایک چیز لیتے ہیں، اور دوسری چیز اس کے بدلے میں دیتے ہیں، لیتے کیا ہیں؟ مثلاً راحت کہ وہ راحت تکلیف میں بدل گئی، یا خوشی تھی، غم میں بدل گئی اور وہ راحت بھی عارضی طور پر لیتے ہیں، ہمیشہ کے لئے نہیں لیتے، اگر ہمیشہ کے لئے راحت لیلیں تو پھر تو ہم زندہ ہی نہیں رہ سکتے، بہر حال! ہم سے خوشی اور راحت لی، اور اس کے بدلے ہمیں نعمتیں دیں، جنت کی، آخرت کی نعمتیں دیں، ہمیں اجر عطا فرمایا اور دنیا میں بھی درجات بلند کئے، یہ سب تجارت میں داخل ہے۔ کہ ایک چیز ہم سے لی جاتی ہے اور اس کے عوض دوسری چیز دی جاتی ہے۔

آدھی جان لے کر سو جانیں دیتے ہیں

یہ تجارت بھی ایسی ہے جس کے بارے میں مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

نیم جاں بستاند وصد جاں دھند
آنچہ در وہمت نیاید آن دھند

یعنی وہ آدھی جان لیتے ہیں اور اس کے عوض سو جانیں دیتے ہیں، ان کی

رحمت کو دیکھئے کہ وہ تھوڑی سی چیز لیتے ہیں اور دیتے بہت زیادہ ہیں، تھوڑی سی راحت اور وہ بھی عارضی طور پر لیتے ہیں، ہمیشہ کے لئے نہیں لیتے، اور اس کے عوض جو نعمتیں دیتے ہیں، وہ ابدی دیتے ہیں، اور نہ ختم ہونے والی نعمتیں دیتے ہیں، اور وہ چیزیں دیتے ہیں جو تمہارے وہم وگمان میں بھی نہیں آتیں۔

حالاً مصیبت مآلاً نعمت

آگے حضرت نے وہی بات ارشاد فرمائی ہے جو میں نے پہلے عرض کی تھی کہ ''علاوہ اس کے مصیبت حالاً تو مصیبت ہے، مگر مآلاً نعمت ہے، کیونکہ اس سے منافع دینیہ ودنیویہ حاصل ہوتے ہیں، ایک بزرگ کا ارشاد ہے'' یہ وہی بات ہے جو میں نے آپ کو پہلے سنائی تھی، اب وہ بات ان بزرگ کے لفظوں میں آ گئی کہ: ''برسوں کے مجاہدات سے باطن کو وہ نفع نہیں ہوتا، جو ایک ساعت کے ''حزن'' سے ہو جاتا ہے''۔ یعنی برسوں تک کسی خانقاہ میں جا کر مجاہدے اور ریاضتیں کرتے رہو، اس سے اتنا فائدہ نہیں ہوگا، جتنا ایک ساعت کے غم سے ہو جاتا ہے، اور وہ غم بھی غیر اختیاری ہو، آگے فرمایا ''اور خاص کر ایمان کو پختگی ہوتی ہے، جو امور باطنہ میں سب سے افضل چیز ہے''۔

وہ نعمت بتاؤ جسکے مانگنے کی اجازت نہیں

یہ ایک ''معمہ'' ہے کہ ایسی نعمت بتاؤ جس کو مانگنے کی اجازت نہیں، یہ غم اور حزن اور مصیبت کی نعمت ہے کہ اس نعمت کے مانگنے کی بھی اجازت نہیں، بلکہ حکم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، مصیبت مت مانگو، بلکہ یہ نعمت آنے والی ہو تو اس کو دفع کرنے کی کوشش بھی کرو، اور اگر دفع نہیں کرو گے تو بھی تمہاری پکڑ

ہو جائے گی، دفع کرنا بھی اپنی حد تک ضروری ہے، اس کے دفع کرنے اور ٹلانے کے اسباب اختیار کرنا بھی ضروری ہے، ورنہ پکڑ ہو جائے گی، لیکن جب آ جائے تو یہ تمہارے لئے نعمت ہے اور رحمت ہے اور دنیا میں بھی رحمت ہے اور آخرت میں بھی رحمت ہے، دنیا میں اس کی وجہ سے درجات کی ترقی ہو رہی ہے، باطن کی ترقی ہو رہی ہے۔ باطن میں فضائل حاصل ہو رہے ہیں۔ اور رزائل فنا ہو رہے ہیں اور آخرت میں درجات بلند ہو رہے ہیں۔ ثواب کا ذخیرہ جمع ہو رہا ہے۔

اس نعمت کے دور کرنے کی کوشش کرو

اب سوال یہ ہے کہ یہ کیا بات ہوئی کہ اس نعمت کو مانگنے کی اجازت نہیں، اور جب یہ نعمت مل جائے تو اس کو دور کرنے کی پوری کوشش کرو۔ لیکن وہ ہے نعمت اور رحمت۔ بات دراصل یہ ہے کہ دراصل یہ مصیبت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا ایک ایسا عنوان ہے، ایک ایسا کرشمہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو نوازنے کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اس کی ناگواری کو اس کی تکلیف کو بھی اس کے واسطے جنت کا ذریعہ بنا دوں، اس وجہ سے یہ مصائب اور تکالیف آتی ہیں، اس لئے ان تکالیف پر صبر کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نعمتوں پر شکر ادا کریں

مجلس نمبر 101

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	101

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نعمتوں پر شکر ادا کریں

مجلس نمبر 101

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم، وعلی آلہ وأصحابہٖ اجمعین۔ امابعد:

تمہید

پچھلے چند روز سے ''صبر'' کا بیان چل رہا تھا، الحمدللہ بقدر ضرورت ہو گیا، اب آگے اس کتاب ''انفاس عیسیٰ'' میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ارشادات ''شکر'' کے بارے میں منقول ہیں، جیسا کہ ''خوف'' اور ''رجا'' کے بارے میں کہا گیا تھا کہ یہ سالک کے دو پر ہیں، جس کے ذریعہ وہ جنت کی طرف پرواز کرتا ہے۔ اسی طرح ''صبر اور شکر'' یہ دو عبادتیں ایسی ہیں کہ ایک مؤمن کے لئے اس کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو باعثِ اجر و ثواب بنا دیتی ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے لمحے لمحے پر اس کو ثواب کی امید ہو جاتی ہے، کیونکہ صبر اس وقت مشروع ہے، جب طبیعت کے خلاف کوئی کام پیش آئے، چاہے وہ کام چھوٹا ہو، یا

بڑا ہو، اس پر جب آدمی صبر کرے گا تو ایک صبر پر تین ثواب حاصل ہونگے، جس کی تفصیل میں نے پچھلے بیانات میں عرض کر دی اور اگر طبیعت کے موافق کوئی کام پیش آیا، یا حالات خوشی کے ہیں تو اس پر ''شکر'' کی عبادت انجام دینی ہے۔

ہوا چلنے پر شکر ادا کرو

میرے شیخ حضرت ڈاکٹر عبدالحیؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ایسی عبادت ہے کہ دل ہی دل میں تم نے یہ عبادت انجام دے لی اور کسی کو پتہ بھی نہیں چلا کہ کیا کر لیا، مثلاً آپ کو گرمی لگ رہی تھی۔ اس وقت ہوا کا جھونکا چل گیا، جس سے جسم نہال ہو گیا، گرمی کا احساس جاتا رہا۔ گرمی کی شدت میں کمی آگئی، اس وقت تمہارے جسم کے روئیں روئیں نے اس ہوا سے فائدہ اٹھایا، اس لئے تمہارے روئیں روئیں سے شکر نکلا، اور تم نے کہا **اَللّٰھُمَّ لک الحمد و لک الشکر**، اور دل سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ یا اللہ! آپ نے کیسی نعمت عطا فرمائی کہ ہوا چلا دی، اگر ہوا نہ چلتی تو میں گرمی کی تکلیف میں مبتلا رہتا، آپ نے یہ نعمت عطا فرمائی۔ اے اللہ آپ کا شکر ہے، آپ کا فضل ہے، آپ کا کرم ہے، اب یہ ایسی عبادت انجام پاگئی کہ کسی کو کان و کان خبر بھی نہ ہوئی، اگر تم نماز پڑھتے تو دیکھنے والے دیکھ لیتے کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، اس نماز کی عبادت میں دکھاوے کا اور نام و نمود کا شائبہ ہو سکتا تھا، لیکن شکر کی عبادت میں نام و نمود کا کوئی شائبہ نہیں، دل ہی دل میں یہ عبادت انجام دی جا رہی ہے۔

میان عاشق و معشوق رمز یست
کراماً کاتبین را ہم خبر نیست

شکر کی حقیقت

پہلے تو اس ''شکر'' کی حقیقت سمجھنی چاہئے کہ شکر کیا ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''شکر کی حقیقت یہ ہے کہ جو حالت طبیعت کے موافق ہو، خواہ اختیاری ہو، یا غیر اختیاری ہو، اس حالت کو دل سے خدا تعالیٰ کی نعمت سمجھنا، اور اس پر خوش ہونا اور اپنی لیاقت سے اس کو زیادہ سمجھنا، اور زبان سے خدا تعالیٰ کی تعریف کرنا، اور اس نعمت کا گناہوں میں استعمال نہ کرنا شکر ہے۔''

(انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۶)

اس تعریف سے پتہ چلا کہ شکر بہت ساری باتوں کا مجموعہ ہے، سب سے پہلے تو یہ کہ طبیعت کے موافق کوئی حالت یا واقعہ پیش آیا، خواہ اپنے اختیار سے آیا ہو، یا غیر اختیاری آیا ہو، مثلاً ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا، اور دل خوش ہوا، اور جسم ٹھنڈا ہوگیا، یہ غیر اختیاری نعمت تھی، یا بعض مرتبہ اختیاری طور پر نعمت حاصل ہو جاتی ہے، مثلاً آپ نے اپنے اختیار سے کہیں ملازمت کی، اور اس کے نتیجے میں آپ کو تنخواہ ملی، یا اپنے اختیار سے تجارت کی، اور اس تجارت کے نتیجے میں منافع حاصل ہوا، یہ بھی نعمت ہے، تو یہ دونوں نعمتیں واجب الشکر ہیں، غیر اختیاری نعمت پر تو شکر واجب ہونا بالکل واضح ہے، کیونکہ اس میں بندے کا کوئی دخل ہی نہیں، محض اللہ تبارک و تعالیٰ کا کرم ہی کرم ہے کہ اس نے یہ گرمی دور کردی، اور ٹھنڈک عطا فرمادی، یا بارش نہیں ہو رہی تھی، اللہ تعالیٰ نے بارش بھیج دی۔ یہ سب غیر اختیاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا بالکل واضح ہے۔

یہ قارونی فکر اور سوچ ہے

البتہ جو اعمال اختیاری ہیں، ان کے بارے میں انسان کے دماغ میں یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس میں شکر ادا کرنے کی کیا بات ہے، کیونکہ میں نے خود مہینہ بھر محنت کی، اس کے نتیجے میں مجھے تنخواہ ملی، یا دکان کھولی اور اس کے کھولنے میں پیسے خرچ کئے، دن رات ایک کئے، محنت کی، دکان پر بیٹھا، سرمایہ لگایا، اس کے بعد مجھے اس دکان سے منافع حاصل ہوا، لہٰذا یہ تو میری قوت بازو کا کرشمہ ہے، جیسے قارون نے کہا تھا کہ مجھے یہ جو دولت ملی ہے، یہ میرے علم کی بنیاد پر ملی ہے۔ یہ شبہ دماغ میں آ جاتا ہے۔

مؤمن اور کافر کی سوچ میں فرق

یہی فرق ہے، ایک مؤمن اور کافر میں، کافر اور غیر صاحب ایمان یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب کچھ میری محنت اور میری قوت بازو، میرے عمل کا نتیجہ ہے، لیکن ایک صاحب ایمان اور اللہ کا بندہ اس حقیقت کو خوب اچھی طرح جانتا ہے، جو کافر نہیں جانتا، میرا کام اس سارے عمل میں بس اتنا تھا کہ میں نے موانع دور کر دیئے، اور کچھ اسباب جمع کر دیئے، لیکن ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنا، اور ان اسباب کو نافع بنانا، یہ میرے بس میں نہیں تھا، میرا کام بس اتنا تھا کہ دکان کھول کر بیٹھ جاؤں، گاھک بھیجنا کسی اور ہی کا کام ہے، اگر وہ گاھک نہ بھیجتا تو میں صبح سے لے کر شام تک دکان پر بیٹھا رہتا اور مکھیاں مارا کرتا، اس لئے کہ کوئی گاھک نہیں آتا، تم کیا کر لیتے، یہ کون ہے جو تمہارے پاس گاھک بھیج رہا ہے؟ وہ کون ہے جو گاھک کے دل میں یہ خیال ڈال رہا ہے کہ جا کر فلاں دکان سے مال خریدو، وہ

کون ہے جو گاہک کے دل میں یہ خیال ڈال رہا ہے کہ جو قیمت تم بتارہے ہو، اس قیمت پر خریدلو، ورنہ وہ بھی کہہ سکتا تھا کہ مجھے اس قیمت پر نہیں چاہئے، لہٰذا انسان کا کام صرف یہ ہے کہ اسباب کو جمع کرلے، البتہ ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنا اللہ جل شانہ کا کام ہے۔

اختیاری نعمتوں پر بھی شکر واجب ہے

لہٰذا جن نعمتوں کو ''اختیاری'' نعمتیں کہا جارہا ہے، وہ بھی حقیقت میں اختیاری نہیں، بلکہ وہ بھی کسی اور ذات کی تاثیر کے نتیجے میں پیدا ہورہی ہیں، مثلاً ڈگریاں تم نے بہت حاصل کرلیں، ایم اے کرلیا، پی ایچ ڈی کرلیا، ڈاکٹر بن گئے، لیکن ڈگریاں اٹھا کر اور درخواست لے کر پھر رہے ہو کہ کہیں ملازمت مل جائے، لیکن نہیں ملتی، کتنے لوگ ایسے ہیں جو بہترین ڈگریوں کے حامل ہیں، لیکن ملازمت نہیں ملتی، اور جب وہ چاہتے ہیں تو گھر میں پیغام آجاتا ہے کہ آپ کی ضرورت ہے، آپ آجایئے، اس سے پتہ چلا کہ اسباب کو اختیار کرنا تو انسان کے بس میں ہے، لیکن ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنا تو کسی اور ہی کا کام ہے، انسان کے بس میں نہیں، لہٰذا جو چیزیں تمہیں اختیاری نظر آرہی ہیں، وہ بھی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے شکر کو واجب کرنے والی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ چیزیں عطا فرمائیں۔

یہ اعضاء وجوارح، عقل، سمجھ کس نے دی ہے؟

اور جو تمہارا اپنا عمل ہے جس پر تم اترا رہے ہو کہ میں نے پیسے جمع کئے، میں نے دکان کھولی، میں نے تعلیم حاصل کی، اور میں نے ڈگریاں حاصل کیں، میں نے ملازمت حاصل کرلی، تو یہ سوچو کہ تمہارے اعضاء وجوارح کے اندر یہ

طاقت کہاں سے آ گئی؟ یہ سمجھ تم کو کس نے دی؟ یہ دماغ یہ عقل تم کو کس نے دی؟ یہ ہاتھ پاؤں کس نے دیئے؟ ہاتھ پاؤں میں چلنے کی طاقت کس نے دی؟ اور ان کے ذریعہ کام کرنے کی قوت کس نے دی؟ یہ سب کچھ انہی کی عطا ہے، تمہاری کیا چیز ہے؟ اس لئے جو اختیاری نعمتیں ہیں، وہ بھی واجب الشکر ہیں۔ ان کے اوپر بھی شکر ادا کرنا ہے۔

نعمت ملنے پر خوشی کا اظہار ہونا چاہئے

حضرت والا فرماتے ہیں کہ ''اس حالت کو دل سے یہ سمجھنا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے'' ان باتوں کا تصور کر کے جو ابھی میں نے آپ کے سامنے عرض کیں، ان کو دیکھ کر بظاہر یہ نعمتیں اختیاری لگ رہی ہیں، لیکن حقیقت میں اگر غور کرو تو انسان کے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ اگر توفیق نہ دے تو انسان کے بس کا کام نہیں، انسان دنیا کے اندر کوئی کام نہیں کرسکتا، ان باتوں کا تصور کرکے ان چیزوں کو دل سے اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھنا اور کہنا کہ یا اللہ، یہ آپ کا کام ہے کہ آپ نے یہ نعمت عطا فرمادی، ورنہ میرے بس میں یہ کام نہیں تھا۔ دل میں یہ تصور جمانا چاہئے، اور اس نعمت پر خوش ہونا چاہئے، جب کوئی نعمت ملے تو اس پر [illegible] کا اظہار کرنا اور فرحت کا اظہار کرنا، یہ اس نعمت پر شکر کرنے کا حصہ ہے، ایسا [illegible] جب نعمت ملی تو اس نعمت کے ملنے سے پہلے جو حالت تھی وہی حالت تمہاری اب بھی ہے، نعمت ملنے سے پہلے جیسے منہ بنائے بیٹھے تھے، نعمت ملنے کے بعد بھی ویسے ہی منہ بنائے رہے، اس نعمت کا کوئی اثر آپ کے چہرے پر ظاہر نہیں ہوا، حالانکہ نعمت کا اثر آپ کے چہرے سے ظاہر ہونا چاہئے، خوش ہونا چاہئے، کیونکہ یہ خوشی اس نعمت کا حق بھی ہے اور اس منعم کا حق بھی ہے، نعمت دینے والے کا حق ہے، آپ

اگر یہ کہیں کہ آپ مجھے کوئی نعمت دیتے رہیں، میں تو ویسے ہی رنجیدہ اور پریشان اور مغموم بیٹھا رہوں گا، اور چہرے سے ذرا بھی نعمت ملنے کا اظہار نہ کروں گا اور یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں سرکشی ہے، لہٰذا تمہارے کردار، تمہاری رفتار، تمہاری گفتار پر اس نعمت کا اثر ظاہر ہونا چاہئے۔

نعمت کا اثر جسم پر ہونا چاہئے

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ اَنْ یُرىٰ اَثَرَ نِعْمَتِهٖ عَلٰی عَبْدِهٖ

یعنی اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ اپنے بندے کو جو نعمت دی ہے، اس کے آثار اس بندے پر نظر آئیں، اس کی تفصیل میں علماء کرام نے فرمایا کہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے اور کھاتا پیتا انسان ہے، لیکن وہ شخص فقیروں کی طرح رہتا ہے، دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی فقیر ہے، اور اس کو پیسے دینے کو دل چاہے، یہ صورت حال نعمت کی ناشکری میں داخل ہے، کیونکہ جو نعمت اللہ تعالیٰ نے دی ہے، اس کے آثار تمہارے اوپر ظاہر ہونے چاہئیں، اور ان آثار کا ایک حصہ یہ ہے کہ اس نعمت کے ملنے پر خوش ہو کر کہے کہ الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے یہ نعمت عطا فرمادی۔

عید الفطر کے موقع پر بشاشت کا اظہار

اسی وجہ سے علماء کرام نے فرمایا کہ عید الفطر کے آداب میں سے ہے کہ اس موقع پر بشاشت کا اظہار آپ کے چہرے مہرے سے، آپ کے انداز و ادا سے،

آپ کی رفتار و گفتار سے معلوم ہو کہ آپ خوش ہیں، اس لئے جب دوسرے سے ملے تو بشاشت کے ساتھ خندہ پیشانی کے ساتھ ملے، اور یہ چیز عید الفطر کے آداب کے اندر داخل ہے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ عید الفطر اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے، اس نعمت پر خوشی کا اظہار بھی نعمت پر شکر کا ایک حصہ ہے۔

کسی غریب کو ایک لاکھ روپے مل جانے پر خوشی

آپ ذرا تصور کریں کہ کوئی آپ کا چھوٹا یا ماتحت ہے۔ ضرورت مند ہے، کھانے کو مشکل سے ملتا ہے، فاقے ہو رہے ہیں، آپ نے اس کو اپنے پاس بلایا، اور اس کو ایک لاکھ روپے دیدیئے، اتنی بڑی رقم شاید اس کے لئے ایک سال یا دو سال کے لئے کافی ہو جائیں۔ اب اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اتنی بڑی رقم مجھے مل جائے گی۔ لیکن وہ شخص جیسا رنجیدہ شکل میں آپ کے پاس آیا تھا، ویسا ہی رنجیدہ شکل میں واپس چلا گیا، اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی تأثر پیدا نہیں ہوا، اب ظاہر ہے کہ اس کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ کیسا بے حس آدمی ہے کہ ایسے فاقہ کی حالت میں اس کو ایک لاکھ روپے مل گئے، مگر اس کی پیشانی کے بل میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس سے یہی معلوم ہوگا یہ بالکل بے حس آدمی ہے۔

ایسے ہی وہ شخص ہے جس کو اللہ جل شانہ کی نعمتیں پہنچ رہی ہیں۔ پھر بھی اس کے ماتھے کے بل پر فرق نہیں آتا، پھر بھی اس کے چہرے پر بشاشت ظاہر نہیں ہوتی۔ پھر بھی اس کے دل میں خوشی پیدا نہیں ہوتی، یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناشکری ہے، اس لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نعمت ملنے پر خوش ہونا بھی شکر کا ایک حصہ ہے۔

اللہ والے ہمیشہ خوش وخرم دکھائی دیتے ہیں

چنانچہ آپ حضرات نے ہمارے بزرگوں کو دیکھا ہوگا کہ ہر وقت ایک خوشی کی حالت میں رہتے تھے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ہم جب جاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ہر وقت ایک نشاط کا عالم ہے، خوشی کا عالم ہے، ایسا کیوں؟ اس واسطے کہ ہر وقت ان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استحضار رہتا تھا۔ جب نعمتوں کا استحضار ہے تو اس کا حق یہ ہے کہ خوشی کا اظہار ہو۔

ہر نعمت کو اپنی لیاقت سے زیادہ تصور کرنا چاہئے

بہر حال! یہ خوش ہونا بڑی کانٹے کی بات ہے، لیکن یہ خوش ہونا بھی یہ سوچ کر ہو کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے یہ نعمت دیدی، چنانچہ اگلے جملے میں حضرت والا نے فرمایا کہ ''خوش ہونا اور اس نعمت کو اپنی لیاقت سے زیادہ سمجھنا'' یعنی یہ سمجھنا کہ یا اللہ! یہ نعمت تو آپ نے مجھے دیدی، لیکن میں تو اس لائق تھا نہیں، میں اس قابل کہاں تھا؟ نہ میرے اندر یہ صلاحیت تھی۔ نہ میرا کوئی قرضہ آپ کے اوپر آتا تھا۔ نہ میرا کوئی حق آپ پر واجب تھا کہ آپ مجھے یہ نعمت عطا فرماتے، آپ نے محض اپنے فضل وکرم سے عطا فرمادی، میں اس لائق نہ تھا۔ یہ بات شکر کا لازمی رکن اعظم ہے، وہ یہ کہ جو نعمت ملی ہوئی ہے، اس کو یہ سمجھنا کہ میں تو اس نعمت کا مستحق نہیں تھا۔ آپ نے اپنے فضل وکرم سے عطا فرمائی۔ تو یہ شکر عجب اور تکبر کی جڑیں کاٹتا رہے گا، جو آدمی یہ سمجھتا ہے کہ جو کھانا اللہ تعالیٰ مجھے دے رہے ہیں۔ میں تو اس قابل نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے اتنا اچھا کھانا عطا فرمایا۔ کیا ایسے شخص کو کبھی کھانا ملنے پر تکبر ہوگا؟ کبھی نہیں ہوگا، کپڑ

عالیشان پہنا ہوا ہے، لیکن دل میں یہ اعتراف موجود ہے کہ میں تو اس قابل نہیں تھا۔ انہوں نے اپنے فضل و کرم سے مجھے عطا فرمادیا۔ یہ ان کی عطا ہے، وہ جب چاہیں واپس لیلیں۔ اس اعتراف کے نتیجے میں تکبر کی جڑ کٹ جائے گی۔

نعمتوں پر اترانا اچھی بات نہیں

یہی فرق ہے ایک اس شخص کے خوش ہونے میں جس پر اللہ تعالیٰ نے کرم فرمایا ہو، اور جس کا تزکیہ نفس ہو چکا ہو اور دوسرا وہ شخص جو رزائل اور گناہوں کے اندر مبتلا ہے، اس کو نعمت ملنے پر خوش ہونے میں، کیونکہ جو شخص گناہوں کے اندر مبتلا ہے، وہ بھی نعمتوں پر خوش ہوتا ہے، لیکن وہ خوشی کے ساتھ اتراتا ہے کہ میری قوت بازو کا کرشمہ دیکھو کہ مجھے یہ نعمت ملی، اور میں اتنا بڑا دولت مند ہوگیا، میری دنیا میں اتنی شہرت ہوگئی، اتنے لوگ میرے معتقد ہوگئے، اور وہ نہیں سوچتا کہ میں اس لائق نہیں تھا، اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے مجھے یہ نعمتیں عطا فرمادیں، بلکہ وہ یہ سوچتا ہے کہ میرے اندر ایسی صلاحیت اور لیاقت ہے، اس کی وجہ سے میں اتنا اونچا پہنچ گیا، اور اس پر وہ خوش ہو رہا ہے۔

قارون کی طرح نعمت کو اپنی محنت کا نتیجہ تصور کرنا

جیسا کہ قارون نے کہا تھا کہ:

اِنَّمَا اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ

میں کیوں شکر ادا کروں، میں نے جو سارا خزانہ جمع کیا ہے، یہ اپنے علم کے نتیجے میں جمع کیا ہے۔ وہ قارون بھی اس نعمت پر خوش ہو رہا تھا، لیکن اس کو کہا گیا کہ:

لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ

یعنی ایسی خوشی کا اظہار مت کرو، اس لئے کہ یہ حقیقت میں خوشی نہیں، بلکہ ''اتراہٹ'' ہے۔ اتراہٹ سے مقصد یہ ہے کہ میں خود اس قابل تھا کہ مجھے یہ دولت ملے، اس لئے مجھے یہ دولت مل گئی، لہٰذا اس دولت پر شکر ادا کرنے کے بجائے فخر کرتا پھر رہا ہے اور دوسرے لوگوں کو حقیر سمجھ رہا ہے، اور اپنے کو بڑا سمجھ رہا ہے۔ بہرحال! خوش ہونے میں فرق ہے، دونوں کو خوش ہونا کہا جائے گا، لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، ایک خوش ہونا عبادت ہے۔ دوسرا خوش ہونا معصیت اور گناہ ہے۔ اگر اپنی لیاقت اور صلاحیت کی بنیاد پر خوش ہو رہا ہے تو معصیت ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کے فضل، اس کی نعمت ملنے پر خوش ہو رہا ہے تو یہ عبادت ہے۔

ہر نعمت پر شکر کی عادت ڈالو

اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ شکر کی عبادت بڑی عجیب چیز ہے، اس لئے ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی عادت ڈالنی چاہئے، اور ہر نعمت پر انسان کہاں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر سکتا ہے، یہ اس کے بس میں نہیں ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر لمحے بے شمار نعمتیں حاصل ہو رہی ہیں، لیکن انسان عادت ڈالے کہ وہ ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرتا رہے تو یہ ایسی چیز ہے کہ انسان کو بہت سی باطنی بیماریوں سے بچانے والی ہے، چنانچہ اس شکر سے تکبر کی جڑ کٹتی ہے۔

اللہ کا شکر شیطان کے داؤ سے بچاتا ہے

حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بڑے نکتے کی بات بیان فرمائی کہ شیطان کو جب راندہ درگاہ کیا گیا تو اس نے اپنا باقاعدہ پورا پلان اللہ میاں کو بتا دیا کہ آپ نے تو مجھے نکال دیا، اب میرا پلان یہ ہے کہ یہ آدم جس کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنا پڑا، میں اس کی اولاد کو چھوڑوں گا نہیں۔ میں اس کے داہنی طرف سے آؤں گا، بائیں طرف سے آؤں گا، آگے سے آؤں گا، پیچھے سے آؤں گا، چاروں طرف سے اس پر حملہ آور ہوں گا، اور اس کے بعد آخر میں یہ جملہ کہا کہ:

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ (القران)

کہ آپ ان میں سے اکثر لوگوں کو شکر کرنے والا نہیں پائیں گے، یعنی میں ایسا داؤ چلاؤ نگا کہ ان کو شکر سے محروم کردوں گا، اور شکر سے محروم کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ میرے جال میں آسانی سے پھنس جائیں گے، اور میرا داؤ ان پر آسانی سے چلے گا، اس سے پتہ چلا کہ شیطان کے داؤ سے بچنے کا بہترین طریقہ شکر کی کثرت ہے، اس لئے خوب اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی کوشش کرو، تم جتنا شکر ادا کرو گے، اتنا ہی انشاء اللہ تعالیٰ شیطان کے حملوں سے محفوظ رہو گے۔

زبان سے شکر کا طریقہ

آگے فرمایا کہ: ''زبان سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کرنا'' اور یہ کہنا ''الحمد للہ''

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

یعنی ایک طرف تو اس نعمت پر دل سے خوش ہوا، اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا اعتراف کیا، اور اپنی نالائقی کا اعتراف کیا، اور پھر زبان سے اللہ تعالیٰ کی تعریف کی، اور کہا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

رات سونے سے پہلے یہ عمل کرلو

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمہ اللہ علیہ اپنے ایک بزرگ کا واقعہ بیان کیا کرتے تھے، کہ میں رات کو ان کو دیکھتا کہ جب وہ اپنے بستر پر لیٹنے کے لئے جاتے تو سونے سے پہلے عجیب والہانہ انداز میں پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

بار بار پڑھتے، اور مسلسل بے تحاشہ ۵۔۷ منٹ تک اسی کی رٹ لگاتے، ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت، یہ رات کو سونے سے پہلے آپ یہ بار بار کیوں پڑھتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ سارا دن اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں زندگی گزر رہی ہے، اور جو نعمت حاصل ہوتی ہے اس وقت پر اس پر شکر ادا کرنے کی طرف دھیان نہیں جاتا، اور انسان کے بس میں بھی نہیں ہے، وہ کہاں تک ان نعمتوں پر شکر ادا کرے گا، اس لئے میں رات کو یہ عمل کرتا ہوں کہ ایک ہی مرتبہ میں بیٹھ کر دن کی ساری نعمتوں کا ایک ایک کر کے تصور کرتا ہوں، اور پھر ایک ایک نعمت پر شکر ادا کرتا ہوں، مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے رزق دیا،

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اللہ تعالیٰ نے مجھے اچھا کھانا دیا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اللہ تعالیٰ نے مجھے اچھا لباس دیا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اللہ تعالیٰ نے گھر کا ماحول اچھا رکھا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اللہ تعالیٰ نے مجھے راحت والا مکان عطا فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ وَلَکَ الشُّکْرُ

اس طرح ہر ہر نعمت کا تصور کر کے اس پر شکر ادا کرتا ہوں، تاکہ کچھ تو شکر ادا ہو جائے۔ لہٰذا رات کو سونے سے پہلے ہم لوگ بھی اس طرح شکر ادا کرنے کا معمول بنالیں۔

حمد اور شکر کے بہترین کلمات

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حمد کے ایسے ایسے کلمات تلقین فرما دیئے کہ اگرچہ حق شکر تو ادا نہیں ہوسکتا، لیکن آدمی ان کلمات کے ذریعہ اپنی سی کوشش کرلے، مثلاً فرمایا:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حمدًا دَائِماً مَعَ دَوَامِكَ اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا خَالِدًا مَعَ خُلُودِكَ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا مُنْتَھٰی لَهٗ دُوْنَ مَشِیَّتِكَ، اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا لَا یُرِیْدُ قَائِلُهٗ اِلَّا رِضَاكَ، وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا عِنْدَ طَرْفَةِ کُلِّ عَیْنٍ، وَلَکَ الْحَمْدُ حَمْدًا عِنْد تَنَفُّس

كُلِّ نَفْسٍ۔

یعنی اے اللہ! آپ کی تعریف ہے، ایسی تعریف کہ جب تک آپ باقی ہیں، وہ تعریف بھی باقی ہے، اے اللہ! آپ کی تعریف ہے ایسی تعریف جو آپ کے ہمیشگی کے ساتھ وہ تعریف بھی ہمیشہ باقی رہے، اور اے اللہ! آپ کی ایسی تعریف کہ وہ تعریف کرنے والا آپ کی رضا کے علاوہ کوئی ارادہ نہیں رکھتا، اور اے اللہ! ہر پلک کے جھپکنے پر آپ کا ایک شکر، اور اے اللہ، ہر سانس کے آنے پر آپ کا ایک شکر۔

حمد وتعریف کے عمدہ کلمات

ایک اور موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی تعریف ایسے الفاظ سے فرمائی کہ ایک پیغمبر ہی ایسے الفاظ لاسکتا ہے، عام انسان کے بس کی بات نہیں کہ ایسا شکر ادا کرے، چنانچہ فرمایا:

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ زِنَةَ عَرْشِكَ۔

اے اللہ! آپ کے عرش کے وزن کے برابر آپ کی تعریف کرتا ہوں۔ کیا کوئی بندہ ان الفاظ سے تعریف کرے گا؟

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ مِدَادَ كَلِمَاتِكَ

اے اللہ! آپ کے کلمات کو لکھنے کے لئے جتنی سیاہی درکار ہوسکتی ہے۔ اس کے برابر آپ کی تعریف ہے۔ جبکہ قرآن کریم نے یہ کہہ دیا کہ:

لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ (القرآن)

اگر دنیا کے سارے سمندر سیاہی بن جائیں، اور اللہ تعالیٰ کے کلمات لکھنا شروع کریں تو سارے سمندر ختم ہو جائیں، لیکن اللہ تعالیٰ کے کلمات ختم نہ ہوں، جب یہ سارے سمندر مل کر بھی آپ کے کلمات کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔ تو اے اللہ! جتنی بھی سیاہی آپ کے کلمات کے لئے کافی ہو جائے اس سیاہی کے برابر آپ کا شکر۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ عَدَدَ خَلْقِكَ

اے اللہ! آپ کی جتنی مخلوقات ہیں۔ ان کی گنتی کے برابر آپ کا شکر، صرف انسان نہیں۔ صرف حیوان نہیں، جانور نہیں، بلکہ تمام مخلوقات، جس میں انسان بھی، حیوانات بھی، نباتات بھی، جمادات بھی آ گئے، ساری مخلوق اس میں آ گئی۔ پھر اس سے بھی آگے یہ جملہ ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ رِضَا نَفْسِكَ

اے اللہ! آپ کا اتنا شکر جس سے آپ راضی ہو جائیں۔ اب اس کی کوئی انتہاء ہی نہیں۔ شکر کا حق تو بندہ کیا ادا کرے گا۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کلمات تلقین فرمائے۔ ان کو یاد کر لیں اور رات کو سونے سے پہلے ان کلمات کو کہہ لیا کریں۔

نعمت کو گناہوں میں استعمال مت کرو

پھر حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے نعمت پر شکر کا آخری طریقہ یہ بیان فرمایا کہ:

''اس نعمت کو گناہوں میں استعمال نہ کرنا''

یہ بڑی اہم بات ہے کہ جس نعمت پر تم شکرادا کر رہے ہو، اس کا سب سے بڑا شکر یہ ہے کہ وہ نعمت جس نے عطا کی ہے، اس کی مرضی کے خلاف اس نعمت کو استعمال نہ کرو، اس کے حکم کے بغیر استعمال نہ کرو۔ اس کی معصیت میں، اس کی نافرمانی میں استعمال نہ کرو، مثلاً کسی شخص نے آپ کو پچاس ہزار روپے ہدیہ دے، جبکہ آپ کے تصور میں بھی زندگی میں اتنے پیسے ملنے کی امید نہیں تھی۔ جب آپ کے جیب میں وہ پیسے آگئے تو آپ نے ایک آدمی کو بلایا اور اس سے کہا کہ ایسا کرو کہ ان پیسوں سے ایک پستول خریدو اور اس آدمی کو ماردو، قتل کردو۔ گویا کہ اس کی دی ہوئی نعمت کو اسی کے خلاف استعمال کر رہے ہو، اس سے بڑی ناشکری، اور اس سے بڑی بغاوت اور کیا ہوگی؟

یہ آنکھ کی نعمت کی ناشکری ہے

اسی طرح اللہ جل شانہ نے جو نعمت عطا فرمائی ہے، اس نعمت کو ان کی معصیت میں استعمال مت کرو۔ اب اللہ میاں نے فرمایا تھا کہ یہ جو پیسے ہم نے تمہیں دئے ہیں، اس کو حلال کاموں میں اور حلال مقاصد میں استعمال کرنا، کسی حرام اور معصیت کے کام میں استعمال مت کرنا۔ لیکن تم نے ان پیسوں کو معصیت اور حرام کام میں استعمال کیا تو اس سے بڑی ناشکری کیا ہوگی؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے آنکھ کی نعمت عطا فرمائی، یہ بھی عظیم نعمت ہے، ایسی نعمت ہے کہ اگر ساری دنیا کی دولت خرچ کر کے بھی اس کو حاصل کرنا چاہو تو بھی نہ ملے، لیکن اللہ جل شانہ نے مفت میں یہ نعمت عطا فرمادی، اور پیدائش سے لے کر مرتے دم تک تمہارا ساتھ دے رہی ہے، نہ اس کی سروس کی ضرورت نہ اس کو گریس کی ضرورت، نہ اس کو پیٹرول اور ڈیزل کی ضرورت، نہ اس کی آور ہالنگ کی ضرورت، لیکن یہ مسلسل

اپنا کام کر رہی ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ دیا، اس کو خوب استعمال کرو، اس سے مزہ لو، اسی سے راحت حاصل کرو، بس چند چیزوں میں اس کا استعمال مت کرنا۔ وہ یہ کہ کسی نامحرم کو لذت کی نگاہ سے مت دیکھنا، اسی طرح اس کے ذریعہ میرے کسی بندے کو تحقیر کی نگاہ سے مت دیکھنا، بس یہ دو چار کام ہیں ان کو مت کرنا، باقی اس کے ذریعہ ساری دنیا کو دیکھو، لیکن بندہ یہ کہتا ہے کہ نہیں، میں تو اس آنکھ کو اسی جگہ استعمال کروں گا، جس جگہ سے آپ نے منع کیا ہے۔ نامحرم عورتوں کو دیکھوں گا، لوگوں کو حقارت سے دیکھوں گا، اب بتایئے، اس سے بڑی ناشکری اور کیا ہوگی؟

خلاصہ:

لہٰذا جو نعمت اللہ جل شانہ نے عطا فرمائی ہے، اس نعمت کو اس کی معصیت میں نافرمانی میں، گناہوں میں استعمال کرنے سے بچو، یہ بھی شکر کا آخری مطالبہ ہے، بہرحال یہ ''شکر'' بے شمار عبادتوں کا مجموعہ ہے، اور بہت سے روحانی امراض کا علاج ہے، اور انسان کے لئے گھر بیٹھے آسانی کے ساتھ ثواب کے ذخیرے لگانے کا بڑا آسان طریقہ ہے اور اسی طرح رزائل سے محفوظ رہنے اور باطنی امراض سے بچنے کا اور ان کے علاج کا بڑا آسان طریقہ ہے، یہ ''شکر'' اتنی بڑی نعمت ہے۔ اللہ جل شانہ ہم سب کو اس ''شکر'' کی ادائیگی کی توفیق عطا فرمادے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کونسا ہدیہ اللہ کی نعمت ہے؟

مجلس نمبر 102

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط وترتیب

محمد عبداللہ میمن
استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دار العلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	102

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کونسا ہدیہ اللہ کی نعمت ہے؟

مجلس نمبر 102

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علیٰ رسوله الكريم، وعلى آله وأصحابه اجمعين۔ امابعد:

تمہید

حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کا اصلاح کا یہ طریقہ تھا کہ جو لوگ حضرت والا سے اصلاحی تعلق قائم کرتے، یا بیعت ہوتے، وہ لوگ خط کے ذریعہ حضرت والا کو اپنے حالات سے مطلع کرتے رہا کرتے تھے، حضرت والا ان کے حالات کے مناسب ان کے خطوط کا جواب بھی دیا کرتے تھے، یہ اسی قسم کا ایک خط ہے جو ایک طالب اصلاح نے حضرت والا کو لکھا کہ:

ایک طالب اصلاح کا خط:

''احقر کے استاذ جو طبیب ہیں، اچھے مالدار ہیں، وہ خرچ کے متعلق بہت کچھ اعانت کرتے رہتے ہیں، احقر نے عرض بھی کیا کہ گرانی ہوتی ہے، لیکن انہوں نے تسلیم نہیں کیا، ڈر لگتا ہے کہ شاید اس کا منشا مرض ہو۔ (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۶)

دوسرے کے احسان کی وجہ سے گرانی:

ان کو یہ شبہ ہوا کہ میرے استاذ جو طبیب ہیں، بظاہر حکیم ہوں گے اور مالدار بھی ہیں، وہ اکثر پیسے دیتے ہیں اور میری مدد کرتے ہیں، اور کثرت سے ان کے پیسے دینے سے طبیعت پر گرانی اور بوجھ ہوتا ہے، کہ ایک آدمی مسلسل پیسے دئے چلا جارہا ہے، ان کا احسان بڑھتا ہے اور شریف آدمی دوسرے کا احسان لینا گوارہ نہیں کرتا، اور میں نے ان سے کہا بھی کہ آپ مجھے بار بار پیسے دیتے ہیں، میری طبیعت پر بوجھ ہوتا ہے، براہ کرم آپ ایسا نہ کریں، لیکن وہ نہیں مانے۔ تو اب اس کے باوجود مجھے جو گرانی ہو رہی ہے، یہ کوئی بیماری تو نہیں؟ اور شرعاً اور اخلاقاً یہ گرانی ہونا درست ہے یا نہیں؟

آج کل شیخ سے یہ کام لئے جاتے ہیں:

یہی باتیں شیخ سے پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ آج کل لوگ شیخ سے تعویذ مانگتے ہیں کہ فلاں چیز کا تعویذ دیدو، فلاں چیز کا کوئی وظیفہ بتادو، مثلاً قرض اتارنے کا کیا وظیفہ ہے؟ آمدنی میں اضافہ کرنے کا کیا وظیفہ ہے؟ تعلقات درست کرنے کا کیا وظیفہ ہے؟ دن رات اسی طرح کے سوالات پوچھے جاتے ہیں، اور انہی چیزوں میں دھیان لگا ہوا ہے، آج کل شیخ سے تعویذ لکھوانے کا کام لیتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ خواب کی تعبیر پوچھ لی کہ میں نے فلاں خواب دیکھا ہے، اس کی کیا تعبیر ہے؟ بس شیخ اسی کام کے لئے رہ گیا ہے۔

کہیں یہ ناشکری تو نہیں ہے؟

حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ انسان اپنی ایک ایک نقل وحرکت کا جائزہ

لے، جائزہ لے کر پھر شیخ سے پوچھے کہ مجھے یہ بات پیش آئی تھی، یہ درست تھی یا غلط تھی؟ یہ کوئی بیماری تو نہیں تھی۔ اب اس خط کے اندر دیکھیں کہ ان صاحب کو یہ شبہ ہو رہا ہے کہ پیسے لینے سے جو میں انکار کر رہا ہوں اور بار بار اپنی گرانی کا اظہار کر رہا ہوں، کہیں یہ تکبر کے اندر داخل تو نہیں؟ کہیں یہ ناشکری تو نہیں ہے؟ کیونکہ ایک چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ رہی ہے، اور میں نے اپنی طرف سے منع بھی کر دیا، پھر وہ مجھے دے رہے ہیں، اس کے باوجود ان کے دینے سے مجھے گرانی اور تکلیف ہو رہی ہے۔ کہیں یہ گرانی اور تکلیف ناشکری میں تو داخل نہیں؟ کہیں یہ تکبر میں تو داخل نہیں؟ کہ میں اپنے آپ کو بڑا سمجھ رہا ہوں، اس لئے لینے سے گریز کر رہا ہوں، یہ سوال ان کے دل میں پیدا ہوا۔

شیخ ان کاموں کیلئے نہیں:

یہ بات خوب سمجھ لیجئے کہ شیخ سے تعلق کا مقصد نہ تو خواب کی تعبیر پوچھنا ہے، اور نہ تعویذ گنڈے لینا ہے، اور نہ ذاتی امور میں مشورہ لینا ہے۔ لوگ شیخ سے پوچھتے ہیں کہ فلاں چیز کی تجارت کروں یا نہ کروں؟ اس کا تعلق شیخ سے نہیں، یہ اور بات ہے کہ شیخ تبرعاً مشورہ دیدے، لیکن فی نفسہ شیخ اس کام کے لئے نہیں ہے۔ یا زیادہ سے زیادہ شیخ سے معمولات پوچھ لئے کہ کس وقت کونسی تسبیح پڑھا کروں؟ اور کس مقدار میں پڑھا کروں؟ بس شیخ اسی کام کا رہ گیا ہے۔ حقیقت میں یہ بات نہیں۔

ہر وقت دل میں یہ خیال لگا رہنا چاہئے:

اصل بات یہ ہے کہ ہر وقت دل میں ایک کانٹا لگا ہوا ہو کہ فلاں وقت

میں مجھ سے یہ کام سرزد ہوا تھا۔ کہیں کسی بیماری کی وجہ سے تو سرزد نہیں ہوا تھا؟ کہیں تکبر کی وجہ سے، یا حسد کی وجہ سے، یا ناشکری کی وجہ سے تو نہیں ہوا؟ بے صبری کی وجہ سے تو نہیں ہوا، ہر وقت دل میں یہ خیال لگا رہنا چاہئے۔ اور پھر وہ واقعہ بتا کر شیخ سے رجوع کرنا چاہئے...... چونکہ میں لوگوں سے بار بار کہتا رہتا ہوں کہ شیخ سے تعلق کا مقصد باطنی امراض کا ازالہ، اور اخلاق کا تزکیہ کرنا ہے، اور اسی بارے میں شیخ سے پوچھنا چاہئے نہ یہ کہ خواب کی تعبیر اور تعویذ گنڈے پوچھے جائیں۔ بار بار کہنے کے نتیجے میں لوگوں کی سمجھ میں بات تو آ گئی۔ لیکن اب لوگ اس طرح سے سوال کرتے ہیں کہ "مجھے یہ شبہ ہے کہ میرے اندر تکبر کی بیماری ہے، میرے اندر حسد ہے، میرے اندر بغض ہے، میرا علاج فرمائیں"......

شیخ عالم الغیب نہیں:

ذرا سوچو تو سہی کہ جس کو خط لکھ رہے ہو، کیا وہ عالم الغیب ہے؟ کہ اس کو پتہ ہے کہ تمہیں جس بیماری کا شبہ ہو رہا ہے وہ شبہ درست ہے، یا غلط ہے، کہاں تکبر کا مظاہرہ ہوتا ہے؟ کہاں بغض کا مظاہرہ ہوتا ہے؟ کہاں حسد کا مظاہرہ ہوتا ہے؟ آپ نے شیخ کو کوئی واقعہ نہیں لکھا، بلکہ یہ لکھ دیا کہ میرے اندر یہ یہ امراض ہیں۔ آپ علاج تجویز فرمادیں۔......

یاد رکھئے! اس لکھنے کا کچھ حاصل نہیں۔ شیخ کو جب تم لکھو، اور تمہیں کسی بیماری کا شبہ ہو، مثلاً تکبر کا، حسد کا، بغض کا، ریاکاری کا، حُبِّ جاہ کا، حُبِّ مال کا شبہ ہو، تو شیخ کو وہ واقعات بھی لکھو جن کی وجہ سے وہ شبہ پیدا ہوا، نہ یہ کہ صرف یہ لکھدیا کہ میرے اندر "حُبِّ مال" ہے، میرے اندر "حُبِّ جاہ" ہے۔ اس کا علاج کریں، اس کا مطلب یہ ہے کہ خود ہی اپنی طرف سے اپنے مرض کی تشخیص کر لی اور حالات

بتائے نہیں، اور شیخ سے کہا کہ اس کا علاج کر دو۔

ڈاکٹر کے پاس جا کر آپ کیا کرتے ہیں:

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کوئی شخص ڈاکٹر کے پاس جائے اور ڈاکٹر سے کہے کہ میرا جگر خراب ہے، مجھے جگر کی دوا دیدو، خود ہی فیصلہ کر لیا کہ میرا جگر خراب ہے، حالانکہ یہ فیصلہ کرنا ہر ایک آدمی کے بس کا کام نہیں، آدمی کو خود فیصلہ نہیں کرنا چاہئے کہ میرا جگر خراب ہے، یا دل خراب ہے، کیونکہ جو شخص اپنی بیماری خود تشخیص کر لے اس کی کوئی اور چیز خراب ہو یا نہ ہو، لیکن دماغ ضرور خراب ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے جا کر ڈاکٹر کو وہ وجہ بتاؤ جس کی بنیاد پر تم یہ سمجھ رہے ہو کہ تمہارا ''جگر'' خراب ہے، اپنی تکلیف اور اپنی پریشانی ڈاکٹر کو بتاؤ، عوارض بتاؤ، جب تم تکلیف اور عوارض بتاؤ گے تو پھر ڈاکٹر ان عوارض کی روشنی میں تشخیص کرے گا کہ تمہارا جگر خراب ہے، یا گردہ خراب ہے۔ چونکہ ہر بیماری کے علاج بھی مختلف ہوتے ہیں، اس لئے کہ جگر کی خرابی کی بہت سی قسمیں ہیں، ہر قسم کی خرابی کے لئے ایک طرح کا علاج تو کارآمد نہیں ہوگا، لہٰذا جب تک تم ڈاکٹر کو عوارض نہیں بتاؤ گے کہ فلاں جگہ تکلیف ہے، فلاں جگہ درد ہے، اس وقت تک ڈاکٹر نہ تو صحیح تشخیص کر سکے گا، اور نہ ہی اس کی صحیح دوا تجویز کر سکے گا۔

پیش آمدہ واقعات شیخ کو لکھو:

بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے شیخ کو یہ لکھدے کہ میرے اندر ''تکبر'' ہے، یا میرے اندر ''حسد'' ہے، یا میرے اندر ''بغض'' ہے، آپ اس کا علاج فرما دیں۔ اس طرح لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ واقعہ لکھو جس کی بنا پر تمہارے دل میں یہ شبہ پیدا ہوا کہ شاید میرے اندر ''تکبر'' ہے۔ وہ

واقعہ لکھو جس کی وجہ سے تمہیں یہ خیال ہوا کہ شاید میرے اندر ''حسد'' ہے، یا شاید میرے اندر ''بغض ہے، جب تم واقعہ لکھو گے تو اس کے ذریعہ شیخ پہچانے گا کہ واقعی تمہارے اندر تکبر ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو پھر اس قسم کے ''تکبر'' کا کیا علاج ہے؟ پھر وہ علاج شیخ بتائیے گا، لہٰذا صرف اجمالی طور پر بیماری لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ان صاحب نے پورا واقعہ لکھا:

اب دیکھئے: اوپر جس خط کا ذکر آیا، اس میں آپ نے دیکھا کہ ان صاحب کو شبہ پیدا ہوا، اور قاعدہ کے مطابق انہوں نے پورا واقعہ لکھا، یہ نہیں لکھا کہ میرے اندر یہ بیماری ہے، اس کا علاج بتائیے۔ بلکہ تفصیل سے پورا واقعہ لکھا کہ وہ میرے استاذ ہیں، طبیب ہیں، مالدار ہیں، میری مالی اعانت کرتے رہتے ہیں، میرے منع کرنے کے باوجود نہیں مانتے، اور اس سے مجھے گرانی ہوتی ہے، آیا یہ گرانی ہونا بیماری ہے اور ناشکری میں داخل ہے یا نہیں؟ پوری بات لکھدی۔ بات سمجھ میں آ گئی، اب شیخ اس کا جواب دے گا، اور اس کے نتیجے میں اگر ان صاحب کی غلطی ہے تو اصلاح ہو جائے گی، اور اگر غلطی نہیں ہے، بلکہ یہ طرز عمل درست ہے تو توثیق ہو جائے گی، اور آئندہ کے لئے راہ عمل کھل جائے گا۔

حضرت والا کا جواب:

اب حضرت والا کا جواب سنیئے: فرمایا کہ:

''ڈرنا تو بہت اچھی بات ہے، ڈر ہی سے امن ہے، لیکن جب اپنی طرف سے نہ طلب ہے، نہ اشراف، بلکہ انقباض کو بھی ظاہر کر دیا، پھر بھی وہ خدمت کرتے ہیں تو یہ نعمت ہے،

اس پر گو طبعاً انقباض ہو، مگر عقلاً انبساط ہونا چاہئے، اور اوّلاً خدا تعالیٰ کا کہ منعم حقیقی ہیں، اور ثانیاً ان صاحب کا کہ منعم مجازی ہیں، یعنی واسطہ نعمت ہیں، شکر ادا کرنا چاہئے، اور وہ شکر حق تعالیٰ کا تو اطاعت ہے اور ان صاحب کا ان کے لئے دعا کرنا ہے''۔ (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۶)

ڈر ہی سے امن ہے:

ان صاحب نے لکھا تھا کہ ''ڈر لگتا ہے کہ شاید اس کا منشاء مرض ہو'' تو جواب میں حضرت نے فرمایا کہ ''ڈرنا تو بہت اچھی بات ہے، ڈر ہی سے امن ہے'' کیا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا: کیونکہ ''ڈر'' اور ''امن''، حقیقت میں یہ دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ اس لئے کہ ''امن'' کا مطلب ہے ''بے خوفی'' اور ڈر ہے ''خوف''، دونوں متضاد ہیں، لیکن فرمایا کہ ''ڈر ہی سے امن ہے'' یعنی جو آدمی اپنی زندگی میں ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو جائے، میرا کام اللہ کی رضا کے خلاف نہ ہو جائے، مجھ سے گناہ سرزد نہ ہو جائے، ایسے شخص کو انشاء اللہ آخرت میں امن ملے گا، اور اگر دل سے ڈر نکل جائے۔ تو اللہ بچائے، پھر غفلت طاری ہو جاتی ہے، اور غفلت کا انجام بہت برا ہے۔ اس لئے فرمایا کہ ''ڈرنے سے مت گھبراؤ، اگر تمہیں یہ ڈر لگ رہا ہے کہ کہیں یہ کوئی بیماری تو نہیں ہے تو یہ ڈرنا بہت اچھی بات ہے، اس لئے کہ ڈر ہی سے امن ہے۔

بغیر اشراف کے آنے والی چیز نعمت ہے:

آگے پھر اصل سوال کا جواب دیا کہ: لیکن جب اپنی طرف سے نہ طلب ہے نہ اشراف، بلکہ انقباض کو بھی ظاہر کر دیا اور پھر بھی وہ خدمت کرتے ہیں، تو یہ

نعمت ہے''، یعنی نہ طلب ہے کہ جا کر ان سے مانگا ہو کہ مجھے اتنے پیسے دیدو، اور اشراف بھی نہیں، ''اشراف'' کا مطلب ہے کہ انتظار لگا ہوا ہے کہ یہ صاحب مجھے ہر مرتبہ دیتے ہیں، اب کی مرتبہ بھی مجھے کچھ دیں گے، اس انتظار کا نام ہے ''اشراف''۔

دراصل عربی زبان میں ''اشراف'' کے معنی ہیں اُچک اُچک کر دیکھنا، یعنی منہ اٹھا کر اچک کر دیکھنا کہ اس جگہ کیا ہو رہا ہے، مقصد یہ ہے کہ دوسروں کی چیز کو انسان اچک اچک کر دیکھے کہ یہ چیز مجھے مل جائے، یا وہ شخص مجھے یہ چیز دیدے، چاہے جائز طریقے سے دیدے، لیکن دل میں اس چیز کی لالچ اور انتظار لگا ہوا ہے، اصول یہ ہے کہ جو چیز انتظار اور ''اشراف'' کے بعد ملے اس میں برکت نہیں ہوتی، برکت اس میں ہوتی ہے جس چیز کی نہ تو طلب تھی، اور نہ اشراف تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے غیب سے وہ چیز بھیج دی تو اس چیز میں برکت ہوگی۔

ایسے ہدیہ میں برکت نہیں ہوتی

مثلاً ایک شخص ہر رمضان میں مجھے ہدیہ دیا کرتا ہے، اب رمضان شروع ہوتے ہی انتظار لگ گیا کہ فلاں شخص ہدیہ لائے گا، اب ہدیہ کا انتظار بھی لگا ہوا ہے، اور اشتیاق بھی لگا ہوا ہے، اور امید بھی ہے، اس کے بعد وہ شخص ہدیہ لے آیا۔ یہ ہدیہ ''اشراف'' کے بعد آیا، اس ہدیہ کو لینا فقہی اعتبار سے کوئی حرام نہیں، ناجائز نہیں، گناہ نہیں، بلکہ جائز ہے، اور حلال ہے، لیکن صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ایسے ہدیہ میں برکت نہیں ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر مخلوق کی طرف امید کی نگاہ سے کیوں دیکھا؟ امید باندھتے تو اللہ تعالیٰ سے باندھتے، انتظار لگتا تو اللہ کی عطا کا لگتا، مخلوق کی عطا کا انتظار کیوں لگا؟ اس لئے اس ہدیہ میں بے برکتی

ہوگی۔ اس کی تائید ایک روایت سے بھی ہوتی ہے، اگرچہ وہ روایت اتنی پکی نہیں کہ اشراف نفس کے بعد جو چیز ملے اس میں برکت نہیں ہوتی۔ اس لئے صوفیاء کرام اس کا اہتمام فرماتے ہیں کہ کوئی چیز اشراف نفس کے ساتھ نہ آئے، اور جو چیز اشراف نفس کے ساتھ آئے، اس کو واپس کر دیں۔

شیخ عبدالقدوس گنگوھی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمہ اللہ علیہ پر فاقے بہت گزرتے تھے، مجاہدات بھی بہت کرتے تھے، ایک مرتبہ فاقوں سے گزر رہے تھے، ایک مرید نے دیکھا کہ آپ کے چہرے پر کمزوری کے آثار ہیں اور بھوک کے آثار ہیں۔ جس کی وجہ سے بولنے میں دقت ہو رہی تھی، مرید نے محسوس کیا کہ شیخ پر فاقے اور بھوک کا عالم ہے، اس لئے شیخ کے لئے میں کچھ کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔ چنانچہ وہ مرید عین مجلس سے اٹھ کر چلا گیا، اور جا کر کھانے کا انتظام کیا، اور ایک تھال مین کھانا رکھ کر شیخ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ جب شیخ کے سامنے کھانا پیش کیا تو شیخ نے کھانے سے انکار کر دیا، فرمایا کہ میں نہیں کھاؤں گا، مرید نے ان سے کوئی حجت نہیں کی، بلکہ کھانا اٹھایا اور واپس لے گیا۔ کیونکہ وہ مرید سمجھ گیا کہ شیخ کھانا کھانے سے اس لئے منع کر رہے ہیں کہ جب میں مجلس سے اٹھ کر گیا تھا اس وقت انہوں نے محسوس کر لیا تھا کہ میں مجلس سے اس لئے اٹھ کر گیا ہوں، تاکہ شیخ کے لئے کھانے کا انتظام کروں، چونکہ شیخ کو "اشراف" ہو گیا تھا، اس وجہ سے شیخ کھانا کھانے سے انکار کر رہے ہیں۔ اس لئے مرید نے کوئی حجت نہیں کی، اور کھانا اٹھا کر واپس چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی تھال واپس لے کر آ گیا، اور آ کر کہا حضرت! اب قبول فرمالیں، کیونکہ جب مرید وہ کھانے کا تھال واپس لے کر

چلا گیا تو جو اشراف اور انتظار تھا۔ وہ ختم ہو گیا، چنانچہ شیخ نے وہ کھانا قبول کر لیا اور کھانا کھا لیا۔ بہر حال! صوفیاء کرام ''اشراف'' سے بھی بچتے ہیں، تا کہ بے برکتی نہ ہو۔

اللہ کی نعمت سمجھ کر لے لو:

اس لئے حضرت فرما رہے ہیں کہ ''اگر کوئی شخص آپ کو کوئی چیز اس طرح دے رہا ہے کہ نہ تو آپ کو اس چیز کی طلب ہے اور نہ اشراف ہے۔ اس لئے کہ طلب کر کے مانگ کر کسی سے کوئی ہدیہ لینا بہت گھٹیا حرکت ہے۔ اس لئے کہ اس شخص کے لئے سوال کرنا حرام ہے، جس کے پاس ایک دن ایک رات کے کھانے کا انتظام موجود ہو۔ بلکہ انقباض ہوتا ہے، اور پیسے لینے میں طبیعت پر بوجھ ہوتا ہے، لیکن اس کے باوجود وہ استاد صاحب آپ کی خدمت کرتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔

چیزے کہ بے طلب رسد آں دادۂ خداست
اورا تو رد مکن کہ فرستادۂ خداست

جب اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز بغیر طلب کے عطا فرمائی تو یہ اس کی نعمت ہے۔ اس کی عطا ہے، اس کو رد نہیں کرنا، کیونکہ وہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہے۔ لہٰذا جب طلب نہیں تھی، اشراف نہیں تھا، بلکہ لینے میں تھوڑا سا طبیعت پر بوجھ بھی ہے کہ دوسروں کا احسان کیوں لوں، جب یہ سب باتیں موجود ہیں، اس کے باوجود اللہ میاں دے رہے ہیں، کیا اب استغناء برتو گے؟ کہ میں نہیں لیتا۔ ...... العیاذ باللہ ...... یہ بڑی گستاخی کی بات ہے۔ اب استغناء نہیں، جب وہ دے رہے ہیں تو پھر محتاج بن کر لے لو۔

حضرت ایوب علیہ السلام کا واقعہ:

جیسے حضرت ایوب علیہ السلام نے لیا۔ ایک مرتبہ حضرت ایوب علیہ السلام غسل خانے میں غسل فرما رہے تھے، اس دوران آپ کے اوپر سونے کی تتلیاں گرنی شروع ہوگئیں، اب حضرت ایوب علیہ السلام نے غسل کرنا چھوڑ دیا، اور سونے کی تتلیاں کپڑنے لگے، اور جمع کرنے لگے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے ایوب! کیا ہم نے تمہیں بہت کچھ مال و دولت نہیں دے رکھا ہے؟ حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا: اے اللہ! آپ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے، لیکن

لَا غِنًی بِی عَنْ بَرَکَتِكَ

اے اللہ! میں آپ کی برکت سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا۔

جب آپ مجھے میری طلب اور انتظار کے بغیر دے رہے ہیں تو کیا میں پھر بھی بے نیازی کا مظاہرہ کروں کہ مجھے یہ نہیں چاہئے؟ میں تو پھر محتاج بن کر اس کی طرف دوڑوں گا، اور اس کو حاصل کروں گا۔ یہ دراصل حضرت ایوب علیہ السلام کا امتحان تھا، کہ دیکھیں کہ آیا وہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں، یا محتاج بن کر اس کو قبول کرتے ہیں، چنانچہ آپ نے اس کو آگے بڑھ کر لے لیا، اور قبول کرلیا۔

محتاج بن کرلو

بہر حال! جب اللہ تعالیٰ دے رہے ہیں تو پھر بے نیازی کیسی؟ پھر تو محتاج بن کرلو، بلکہ ان سے مانگو، اور کہو یا اللہ، یہ جو آپ نے دیا ہے، آپ کی عطا ہے، آپ کا شکر ہے، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین

خاک برفرقِ قناعت بعد ازیں

جب سلطانِ دین مجھ سے یہ چاہتے ہیں کہ میں لالچ کا مظاہرہ کروں، میں طمع کا مظاہرہ کروں، تو پھر ایسی حالت میں قناعت کے سر پر خاک ہو، پھر قناعت مطلوب نہیں۔ پھر طمع ہی مطلوب ہے، جب وہ چاہ رہے ہیں کہ ہم طمع کا اظہار کریں تو پھر قناعت نہیں چاہئے، پھر طمع ہی چاہئے۔

ایسی طمع کرنا جائز ہے:

لہٰذا یہ موقع بھی طمع کا ہے۔ اس لئے کہ نہ طلب تھی، نہ اشراف تھا، نہ انتظار تھا، لیکن اللہ جل شانہ نے اپنے فضل وکرم سے عطا فرمایا۔ یہ عطاء حق ہے جب عطاء حق ہے تو پھر طمع ہی مطلوب ہے، ''طمع'' اس وقت ناپسندیدہ ہوتی ہے، جب دنیا کی طلب کے ساتھ ہو، اور مخلوق سے ہو، لیکن اللہ میاں سے طلب کرنے میں طمع مطلوب ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ جس کے پاس ایک دن ایک رات کا کھانا موجود ہو، اس کے لئے مخلوق سے سوال کرنا منع ہے، لیکن اللہ میاں سے مانگنا منع نہیں، آدمی چاہئے کتنا ہی کروڑ پتی ہو جائے، ارب پتی ہو جائے، اس کے لئے بھی اللہ میاں سے مانگنا جائز ہے کہ یا اللہ اور دیدے، یہ طمع نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی احتیاج کا اظہار ہے، ہاں دنیا والوں سے مانگنا بری بات ہے۔

اس نعمت کو محتاج بن کر لو

اس لئے حضرت والا نے ان صاحب کو لکھا کہ ''وہ جو خدمت کر رہے ہیں، یہ نعمت ہے، اور اس پر گو طبعاً انقباض ہو، مگر عقلاً انسباط ہونا چاہئے'' یعنی اگر چہ طبعی طور پر گرانی ہو رہی ہے کہ میں ان کا بہت احسان مند ہوتا جا رہا ہوں،

اور طبیعت پر بار ہو رہا ہے، لیکن عقلاً انبساط ہونا چاہئے، اس لئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور اس کی عطا ہے، ارے وہ دینے والا شخص تو ایک آلہ ہے، حقیقت میں دینے والا تو کوئی اور ہے، وہ تم کو دینا چاہتا ہے، البتہ ان صاحب کو واسطہ بنا دیا ہے، تمہاری طرف سے طلب نہیں تھی، تمہارے دل میں اشراف اور انتظار نہیں تھا۔ اس کے باوجود تمہیں دے رہے ہیں، تو یہ اس کی نعمت ہے۔

چیزے کہ بے طلب رسد آں دادۂ خداست
اورا تو رد مکن کہ فرستادۂ خداست

لہٰذا اس نعمت کو رد مت کرو، بلکہ اس نعمت کو چومتے ہوئے لے لو، اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر لو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔

حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا حال:

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔ اگر کوئی اللہ کا بندہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو کوئی ہدیہ پیش کرتا، خاص طور پر ایسا شخص جس کی مالی حیثیت زیادہ نہ ہوتی، لیکن اس نے اپنی بساط کے مطابق مثلاً ۸ آنے بطور ہدیہ کے دیدئے، یا ایک روپیہ دیدیا تو والد صاحب اس کو بڑی قدر سے لیتے، محسوس ہوتا تھا کہ آپ اس ہدیہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور اس پر خوش کا اظہار بھی فرماتے، یہ اور بات ہے کہ بعد میں اس کی مکافات اور بدلہ بھی دیتے، لیکن اس کو بڑی قدر و منزلت سے لیتے۔

سب سے زیادہ طیب اور پاکیزہ مال

ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ حضرت! آپ اس معمولی سے ہدیہ کی اتنی قدر فرماتے ہیں؟ اس پر آپ نے فرمایا کہ انسان کے جتنے ذرائع آمدنی

ہیں، ان سب ذرائع میں سے اس سے زیادہ طیب اور پاکیزہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں، جتنا ایک مسلمان کا ہدیہ محبت ہے، کیوں؟ اس لئے کہ اور جتنے ذرائع آمدنی ہیں، مثلاً تجارت ہے، زراعت ہے، ملازمت ہے، ان سب میں یہ شبہ ہے کہ پتہ نہیں ہم نے اس کا صحیح حق ادا کیا تھا، یا نہیں کیا تھا؟ وہ مال ہمارے لئے پوری طرح حلال ہوا؟ یا نہیں ہوا؟ مثلاً مدرسہ میں ہم نے اسباق پڑھائے، اور اس کی تنخواہ لی، لیکن کیا پتہ کہ جو فرائض مدرسہ کی طرف سے ہمارے ذمے تھے، اور وہ فرائض ادا کئے یا نہیں؟ اور جتنا وقت دینا چاہئے تھا، اتنا وقت دیا؟ اس کا سو فیصد یقین ہے؟ اور اگر وقت تو دیا، لیکن جتنی محنت کے ساتھ، جس توجہ کے ساتھ، جس قابلیت کے ساتھ درس دینا چاہئے تھا۔ وہ قابلیت، وہ محنت موجود تھی؟ کیا اس کا سو فیصد یقین ہے؟ ہوسکتا ہے کہ وقت میں کمی رہ گئی ہو، ہوسکتا ہے کہ توجہ میں کمی رہ گئی ہو، ہوسکتا ہے کہ قابلیت اتنی نہ ہو، اور خواہ مخواہ پڑھانے بیٹھ گئے، یہ سارے احتمالات موجود ہیں۔ لہٰذا تنخواہ پر بھی ان شبہات کے سائے پڑے ہوئے ہیں کہ وہ تنخواہ میرے لئے حلال اور طیب ہے یا نہیں؟

تجارت کی آمدنی میں بھی شبہ:

یا مثلاً تجارت کے ذریعہ جو پیسے کمائے، کیا وہ پیسے حلال ہیں؟ مفتی صاحب سے فتویٰ لوگے تو وہ کہیں گے کہ یہ پیسے حلال ہیں، لیکن کیا پتہ کہ تجارت کے دوران کس وقت کس حکم شرعی کی خلاف ورزی ہوگئی ہو، جس کی وجہ سے اس کا اثر اس آمدنی پر پڑ گیا ہو۔ لہٰذا ہر جگہ یہ شبہات موجود ہیں۔ لیکن ایک مسلمان محبت اور خلوص کے ساتھ آپ کے پاس کوئی ہدیہ لے کر آیا، اور اس نے آکر پیش کیا، اور اس کا مقصد اللہ کی وجہ سے محبت کے علاوہ کچھ اور نہیں، اخلاص کے ساتھ اس

نے ہدیہ دیا، وہ ہدیہ تو ایسا ہے جیسے آسمان سے ابھی کوثر سے دھل کر آرہا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بندے کے دل میں ڈالا ہے، دینے والے تو اللہ تعالیٰ ہیں، اللہ تعالیٰ جس کو چاہیں، واسطہ بنادیں، جب ان کی طرف سے آرہا ہے تو اس کے حلال طیب ہونے میں کوئی شائبہ نہیں، اس لئے کہ یہ کسی خدمت کے معاوضہ میں تو نہیں دیا جارہا ہے۔ نہ کسی اور چیز کے معاوضہ میں ہے، جس کی وجہ سے یہ اندیشہ ہو معلوم نہیں کہ یہ معاوضہ درست ہوا، یا نہیں؟ بلکہ یہ تو ان کی خالص عطا ہے۔ جو حلال وطیب ہے۔

غریب کے ہدیہ میں اخلاص ہوتا ہے:

فرمایا کرتے تھے کہ خاص طور پر مجھے ان غریب لوگوں کے ہدیہ سے بہت خوشی ہوتی ہے، اس لئے کہ ان کے دینے میں اخلاص کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں ہوتا، اس لئے اگر کسی غریب نے ہدیہ کے طور پر ایک آنہ دیا تو وہ میرے لئے ہزار روپے سے بہتر ہے، اس لئے کہ وہ اخلاص کے ساتھ دے رہا ہے، دولت مند اور مالدار لوگ دکھاوے کے طور پر بھی ہدیہ دے سکتے ہیں، اور دوسرے مقاصد بھی ان کے ہوسکتے ہیں۔ لیکن غریب کے ہدیہ میں یہ چیز نہیں، اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔

وہ ہدیہ ہو، رشوت نہ ہو:

البتہ یہ سمجھ لیں کہ وہ ہدیہ واقعتہً ہدیہ ہی ہو، رشوت نہ ہو، آج کل ہمارے معاشرے میں ہدیہ کے نام سے رشوت کا بہت رواج ہو چکا ہے، نام ہدیہ ہے کہ یہ آپ کے لئے تحفہ ہے، جبکہ حقیقت میں وہ آگ کا انگارہ ہے، جس ہدیہ میں رشوت کا شائبہ ہو، اس سے زیادہ خطرناک کوئی چیز نہیں۔ ایسے ہدیہ سے

بھاگو۔ اسی لئے فرمایا کہ قاضی ان لوگوں کا ہدیہ قبول نہ کرے، جن کے مقدمات اس کے پاس آتے ہوں، اگرچہ فقہی مسئلہ میں یہ تفصیل ہے کہ اگر وہ شخص پہلے سے ہدیہ دیا کرتا تھا تو اس کا ھدیہ قبول کرنا جائز ہے، اور اگر قاضی بننے کے بعد دینا شروع کیا تو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں۔ لیکن محتاط حضرات نے فرمایا کہ اس چکر میں نہیں پڑنا چاہئے، بس قاضی ہدیہ قبول ہی نہ کرے، اس لئے کہ اندیشہ ہے کہ وہ رشوت ہوگی۔

تقریبات میں دیا جانے والا ہدیہ

اسی طرح ایسا ہدیہ جو سماج اور معاشرے کے دباؤ سے دیا جائے، وہ اگرچہ رشوت نہ سہی، لیکن زبردستی کا ہدیہ ہے، مثلاً شادی کے موقع پر تحفہ دینا ضروری سمجھ لیا گیا ہے، چاہے دل نہیں چاہ رہا ہو، کیونکہ اگر تحفہ نہیں دیں گے، تو معاشرے میں ناک کٹ جائے گی، اس وجہ سے دینا ضروری ہے، اب اس ناک کٹنے سے بچنے کے لئے وہ تحفہ دیا جا رہا ہے، لہٰذا نہ دینے والے کے لئے برکت، اور نہ لینے والے کے لئے برکت، نہ دینے والے کے لئے جائز، اور نہ لینے والے کے لئے جائز، کیونکہ کسی مسلمان کا مال طیب نفس اور خوش دلی کے بغیر حلال نہیں، ہاں! جو ہدیہ اللہ کے لئے کسی مسلمان کو دیا جائے اور تَھَادَوْتَحابُّوْا والی حدیث پر عمل کرتے ہوئے دیا جائے تو اس ہدیہ میں بڑی برکت ہے۔

بندوں کا شکر بھی ادا کرو

آخر میں ان صاحب کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ ''اوّلاً اللہ تعالیٰ جو منعم حقیقی ہیں'' ان کا شکر ادا کرنا چاہئے، اور ثانیاً ان صاحب کا کہ منعم مجازی

ہیں۔ یعنی جنہوں نے وہ ہدیہ دیا۔ وہ حقیقتاً تو دینے والے نہیں ہیں، دینے والے تو اللہ تعالیٰ تھے۔ لیکن مجازی طور پر، یا ظاہری طور پر انہی کے ذریعہ وہ ہدیہ ملا، لہٰذا وہ واسطہ نعمت ہیں، یعنی وہ اس نعمت کا واسطہ بن گئے، اس لئے ان کا بھی شکر ادا کرنا چاہئے۔ اور شکر حق تعالیٰ کا تو اطاعت ہے، اور ان صاحب کا شکر ان کے لئے دعا کرنا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کا شکر تو یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے بغیر طلب کے عطا فرمایا تو اس کا حق یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اور جو ظاہری دینے والا ہے، اس کا حق یہ ہے کہ اس کے حق میں دعا کی جائے۔ لہٰذا زبانی شکر بھی ادا کرو، اور کہو کہ آپ کا شکریہ: جَزَاکَ اللّٰہُ خَیْرَ الْجَزَاء اور بہترین شکریہ "جزاک اللہ" کہنا ہے۔ کیونکہ اس میں شکر بھی ادا ہو گیا، اور اس کے حق میں دعا بھی ہو گئی۔

ہدیہ حلال آمدنی کا ہو:

لیکن ہدیہ قبول کرنے کی بہت سی شرائط اور آداب ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ ہدیہ حلال آمدنی سے دیا گیا ہو۔ حرام آمدنی کا ہدیہ قبول کرنا اور اس کو استعمال کرنا جائز نہیں، اگر کبھی حرام آمدنی کا ہدیہ آجائے تو بغیر نیت ثواب کے کسی فقیر کو دیدو۔ البتہ یہ اس وقت ہے جب کہ اس شخص کی غالب آمدنی، اکثر آمدنی حرام ہو، لیکن اگر غالب آمدنی حلال ہو، اور کچھ آمدنی حرام ہو تو اس کا ہدیہ قبول کرنے کی گنجائش ہے، لیکن جہاں غالب آمدنی حرام ہو تو اس کا ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں، اگر لے لیا تو صدقہ کرنا واجب ہے۔

ہدیہ رشوت نہ ہو:

دوسری شرط یہ ہے کہ جہاں یہ اندیشہ ہو کہ یہ ہدیہ اخلاص کے ساتھ نہیں

آ رہا ہے، بلکہ اس میں دینے والے کے کس مقصد کا شائبہ ہے، مثلاً رشوت کا شائبہ ہے تو ایسا ہدیہ قبول کرنا کوئی ضروری نہیں، احتیاط یہ ہے کہ اس کو قبول نہ کرے۔ لیکن اگر رشوت ہونے کا یقین ہو تو پھر تو قبول کرنا جائز بھی نہیں۔

اپنی حیثیت سے زائد ہدیہ دینا:

ہدیہ کا ایک ادب یہ ہے کہ جہاں ھدیہ دینے میں اخلاص کے اندر تو کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن یہ پتہ ہے کہ یہ ہدیہ دینے والا ہدیہ دینے کے بعد تکلیف میں مبتلا ہو جائے گا، مثلاً ایک غریب آدمی جس کی ماہانہ آمدنی تین ہزار روپے ہے، اب وہ شخص تین ہزار روپے بطور ہدیہ کے لے آیا تو اس میں اس بات کا خطرہ ہے کہ یہ شخص اگرچہ اخلاص کے ساتھ ہدیہ لایا ہے، لیکن بعد میں تکلیف میں مبتلا ہوگا تو اس شخص کو تکلیف سے بچانے کی خاطر ہدیہ قبول کرنے سے انکار کر سکتے ہیں۔

ہدیہ واپس کرنا:

ایک ادب یہ ہے کہ بعض اوقات ہدیہ دینے والے کی اخلاقی تربیت مقصود ہوتی ہے، جس کی وجہ سے وہ ہدیہ واپس کر دیا جاتا ہے، مثلاً حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمہ اللہ علیہ کا اصول یہ تھا کہ اگر کسی شخص سے پہلے سے کوئی واقفیت نہیں، اس سے ہدیہ قبول نہیں کرتے تھے۔ اس لئے کہ اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں کہ کس غرض سے لایا ہے۔ اسی طرح ہدیہ دینے والے کو چاہئے کہ ہدیہ اس طرح دے کہ لینے والے پر بار نہ ہو۔ مثلاً ہدیہ میں کوئی بڑی چیز دیدی تو اب لینے والے پر بار ہوگا کہ اس نے اتنا بڑا ہدیہ دیدیا، یہ بھی مناسب نہیں۔

خلاصہ:

بہر حال! یہ سب ہدیہ کے آداب ہیں، اگر ان سب آداب اور شرائط کے ساتھ کوئی ہدیہ اللہ تعالیٰ کی طرف آ جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کی نعمت سمجھ کر قبول کر لے، اور اللہ کا شکر ادا کرے، اور دینے والے کا بھی شکر ادا کرے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں شکر کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

بسم الله الرحمن الرحيم

أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ

صدق الله العظيم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راحت حاصل کرنے کا طریقہ

مجلس نمبر 103

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	103

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

راحت حاصل کرنے کا طریقہ

مجلس نمبر 103

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، والصلاة والسلام علیٰ رسولہ الکریم، وعلی آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

تمہید

پچھلے دنوں میں تین باتوں کا بیان الحمدللہ بقدر ضرورت ہوگیا، ایک خوف ورجا کا، دوسرے صبر کا، تیسرے شکر کا...... اب شاید یہ آخری دن ہو، آگے حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے جو بیان فرمایا ہے وہ تفویض اور توکل سے متعلق ہے اور یہ بھی انہی صفات باطنہ میں سے ہے جن کی تحصیل ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے، مسلمان کے دل میں تفویض بھی اللہ تعالیٰ کی طرف کامل ہونی چاہئے اور توکل بھی کامل ہونا چاہئے۔

تفویض اور توکل کے معنی:

''تفویض'' کے معنی ہیں کہ اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کردینا کہ جو کچھ اللہ جل شانہ میرے حق میں فیصلہ فرمائیں گے، میں اس پر راضی رہوں گا، اور وہ فیصلہ ہی برحق ہوگا، چاہے مجھے اس سے تکلیف پہنچ رہی ہو۔ چاہے مجھے اس سے رنج ہو

رہا ہو، یہ مطلب ہے ''تفویض'' کا، اور توکل کے معنی یہ ہیں کہ اللہ جل شانہ پر بھروسہ رکھنا کہ جو کچھ اس کائنات میں ہوگا، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت سے ہوگا، اور اللہ تعالیٰ کی حکمت سے ہوگا، اور میرے حق میں بالآخر بہتر ہوگا۔ یہ مطلب ہے ''توکل'' کا، یہ دونوں چیزیں حاصل کرنے کی ہیں، دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، زیادہ فرق نہیں ہے۔

''تفویض'' حاصل کرنے کا طریقہ:

''تفویض'' کو حاصل کرنے کا طریقہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ کے اندر بیان فرما رہے ہیں کہ:

> ''خدا کی تجویز میں اپنی تجویز کو فنا کردو، ابتداء میں تو اہل اللہ کو یہ حالت تکلف کے ساتھ حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت اور قدرت کو سوچ سوچ کر اپنے ارادے اور تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے، پھر یہ حالت ان کے لئے امر طبعی بن جاتی ہے۔''

ایک اور ملفوظ میں ارشاد فرمایا کہ:

> ''اپنے ارادے کو خدا کے ارادے کا تابع کردے، جو کچھ ہوگا، ہم اس پر راضی ہیں، اس پر عمل شروع کردیجئے اور برابر کرتے رہیئے، انشاء اللہ ایک دن ملکۂ راسخہ پیدا ہوجائے گا، اور اسی سے راحت حاصل ہوگی، بدون اس کے راحت نہیں مل سکتی، اور یہ کچھ مشکل نہیں، کیونکہ کثرت تکرار سے سب کام آسان ہو جاتے ہیں۔ دیکھئے جو لوگ آج کل پختہ

حافظ ہیں، وہ پہلے دن سے پختہ نہیں ہوئے، بلکہ کثرت تکرار سے پختہ بنے ہیں، یا جو آج خوشنویس ہے، وہ کثرت مشق سے ہی خوش نویس ہوا ہے، اسی طرح کثرت تکرار سے ''تفویض'' حاصل ہو جائے گا، یہی عین عبدیت ہے، اور بندگی ہے، اور غلام کو ایسا ہی ہونا چاہئے''

(انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۷)

یعنی یہ مقام کہ انسان اپنا ہر معاملہ اللہ کے حوالے کر دے، اللہ کے سپرد کر دے، اور اس پر بھروسہ رکھے کہ جو کچھ وہ کریں گے، وہی برحق ہوگا اور حکمت اور مصلحت کے مطابق ہوگا، یہ مقام مشق سے حاصل ہوتا ہے۔

تدبیر کرنا ''تفویض'' کے منافی نہیں:

پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ ''تفویض'' یعنی اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دینا، یہ ''تدبیر'' کے منافی نہیں ہے، بلکہ ایک مومن کا کام یہ ہے کہ تدبیر کرنے کے بعد پھر معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دے کہ میرے بس میں جو کچھ تھا، وہ میں نے کر لیا، میرے بس میں اتنا ہی تھا، اس کے بعد اب اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائیں گے، وہ برحق ہوگا اور حکمت کے مطابق ہوگا، میں اس فیصلے پر راضی ہوں...... مثلاً ایک بیماری آ گئی، تو آپ نے پہلے تدبیر کی، وہ یہ کہ اپنے خیال میں جو بہتر معالج ہو سکتا تھا، اس سے رجوع کیا، اس معالج نے جو دوا بتائی، بازار سے جا کر وہ دوا خریدی، اور جس وقت میں کھانے کے لئے کہا تھا، اس کے مطابق دوا کھائی، یہ ساری تدبیر کر لی، تدبیر کرنے کے بعد اب اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے کہ یا اللہ، میرے بس میں یہی تھا کہ معالج کے پاس چلا جاؤں، اور پھر اس کے کہنے کے مطابق بازار

سے دوا لا کر کھانا شروع کردوں، اور پھر آپ سے دعا کروں کہ اے اللہ! مجھے شفا عطا فرما دیجئے، اب میں نے اپنے آپ کو آپ کے سپرد کر دیا، اب آپ جو کچھ فیصلہ کریں گے، میں اس پر راضی ہوں وہ فیصلہ آپ کی حکمت کے عین مطابق ہوگا۔

اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِO

(سورۃ المومن، آیت ۴۴)

یعنی میں اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کرتا ہوں، اللہ کے سپرد کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو خود دیکھنے والا ہے، یہ ہے تفویض، جو تدبیر کے منافی نہیں۔

تدبیر کے بغیر ''تفویض'' کرنا غلط ہے:

بعض لوگ وہ ہیں جو ''تدبیر'' کے بغیر ''تفویض'' پر عمل کرنا چاہتے ہیں، یاد رکھئے، یہ شریعت کا تقاضہ نہیں۔ مثلاً بیماری آ گئی، اب وہ شخص کہتا ہے کہ میں علاج نہیں کرتا، اور میں نے اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا، اب نہ کسی معالج کے پاس جاتا ہے، نہ علاج کرتا ہے، نہ دوا کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ میں نے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا، یہ ''تفویض'' مطلوب نہیں، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسباب کو اختیار کرو...... یا مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ میں نہ تو ملازمت کروں گا، نہ زراعت کروں گا، بس میں تو گھر میں بیٹھا ہوں اور میں تو اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کرتا ہوں، یہ تفویض مطلوب نہیں، بلکہ مطلوب یہ ہے کہ رزق حلال کی تلاش میں نکلو، اور اس کے لئے جو اسباب اور تدابیر ہو سکتی ہیں، ان کو اختیار کرو، اور کوشش کرو، اس کے بعد پھر اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو کہ یا اللہ، میرے کرنے کا جو کام تھا، وہ میں نے کر لیا، اب آگے کا معاملہ آپ کے حوالے

کرتا ہوں، آپ جو فیصلہ کریں گے میں اسی پر راضی ہوں۔ یہ مطلب ہے، ''تفویض'' اور ''توکل'' کا، لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تدبیر کے بغیر توکل کرلو، وہ لوگ اس کا صحیح مطلب نہیں سمجھتے۔

اونٹ کی پنڈلی باندھو، پھر توکل کرو:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا کہ یا رسول اللہ! میں سفر میں جاتا ہوں، اور میں اونٹنی پر سفر کرتا ہوں، سفر کے دوران کہیں رکنے کی ضرورت پیش آتی ہے، مثلاً مجھے نماز پڑھنی ہے، چنانچہ میں اس اونٹنی سے اتر کر نماز پڑھتا ہوں، اب کیا اس وقت میں اس اونٹنی کو باندھ دیا کروں، تاکہ یہ کہیں نماز پڑھنے کے دوران بھاگ نہ جائے، یا میں اللہ تعالیٰ پر توکل کروں کہ جب میں اللہ کی عبادت کر رہا ہوں تو وہی میری اونٹنی کی حفاظت کرے گا اور دیکھ بھال بھی کرے گا اور اس کو بھاگنے نہیں دے گا...... جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حکیمانہ جملہ ارشاد فرمایا:

اِعقِلْ سَاقَهَا وَ تَوَكَّلْ

پہلے اس اونٹ کی پنڈلی باندھو، اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو۔ یعنی تمہارے اختیار میں یہ ہے کہ تم اس کو رسی سے باندھ دو، اور باندھنے کے بعد پھر اللہ پر بھروسہ کرو کہ میرے کرنے کا جو کام تھا وہ میں نے کرلیا، اب دل میں جو مختلف قسم کے خیالات آرہے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ میرے نماز پڑھنے کے دوران وہ اونٹ کہیں رسی توڑ کر نہ بھاگ جائے، ہوسکتا ہے کہ کوئی چور یا ڈاکو اس کی رسی کاٹ کر اس کو لے جائے، ایسے خیالات کو دل میں جگہ نہ دو، اور یہ کہو کہ میرے کرنے کا جو کام تھا وہ میں نے کرلیا، اب میں اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت

فرمائیں گے، اور اگر بالفرض یہ اونٹنی چلی بھی گئی تو میں اس پر بھی راضی ہوں۔

برتوکل پایہ اشتر ببند:

اسی بات کو مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا کہ:

برتوکل پایۂ اشتر ببند

کہ توکل کے اوپر اونٹ کا پاؤں باندھ دو۔ لہٰذا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسباب کو اختیار نہ کرو، اور تدبیریں چھوڑ دو۔ اور اللہ پر بھروسہ کرو، وہ لوگ توکل کی صحیح تشریح نہیں کرتے اور خود بھی مغالطے میں مبتلا ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی مغالطے میں مبتلا کرتے ہیں۔ صحیح یہی ہے کہ وہ سارے اسباب اختیار کرنے کے بعد جو اپنے بس میں ہیں اور تدبیر کر لینے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کیا جائے۔

اسباب میں تاثیر اللہ تعالیٰ ڈالتے ہیں:

یہ بات یاد رکھو کہ توکل کی حقیقت یہ ہے کہ تدبیر کرنے کے بعد اور اسباب اختیار کرنے کے بعد اس بات کا اعتقاد کامل دل میں بیٹھا ہوا ہو کہ یہ اسباب اپنی ذات میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے، اور ان اسباب میں تاثیر اللہ جل شانہ کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتی، وہ اگر چاہیں گے تو ہو گی، نہیں چاہیں گے، تو نہیں ہو گی...... مثلاً میں اس بیماری کی دوا بیشک لے رہا ہوں، لیکن جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نہیں آ جائے گا، اس وقت تک یہ دوا اثر نہیں کرے گی، اور ان کی اذن اور مشیت کے بغیر یہ دوا فائدہ مند نہیں ہو گی، یہ اعتقاد دل میں مکمل ہونا چاہئے، اس کا نام توکل ہے کہ بھروسہ اللہ پر ہے، اور اس دوا پر بھروسہ نہیں، البتہ اسباب اس لئے اختیار کر رہا ہوں کہ مجھے اس کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے،

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو عالم اسباب بنایا ہے، اس لئے یہ اسباب اختیار کر رہا ہوں۔

ایک مؤمن اور کافر میں فرق:

بس یہی فرق ہے ایک کافر میں اور ایک مومن میں، اور ایک غافل میں اور ایک سالک میں، کافر اور غافل کی نگاہ مکمل طور پر اسباب پر ہوتی ہے، مثلاً یہ دوا اچھی ہے، اور یہ دوا خراب ہے، اس دوا سے فائدہ ہوتا ہے اور اس دوا سے فائدہ نہیں ہوتا، یہ تدبیر کار آمد ہے، یہ تدبیر کار آمد نہیں، سارا بھروسہ ان تدبیروں پر اور اسباب پر ہوتا ہے، جبکہ ایک مومن اور ایک سالک اسباب تو اختیار کرتا ہے، لیکن بھروسہ ان اسباب پر نہیں کرتا، اس لئے کہا جاتا ہے کہ ''عارف'' جامع اضداد ہوتا ہے کہ اسباب اختیار بھی کرتا ہے، لیکن اختیار کرنے کے بعد ان پر بھروسہ بھی نہیں کرتا، بلکہ بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر کرتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ بات سمجھے ہوئے ہوتا ہے کہ ایک ہی چیز ایک وقت میں فائدہ مند ہو جاتی ہے، اور دوسرے وقت میں نقصان دہ ہو جاتی ہے۔

فائدہ کروں یا نقصان:

وہی دوا ہے، وہی مریض ہے، وہی مرض ہے، جب پہلے اس مریض کو اس مرض میں وہ دوا دی تھی، اس وقت اس کو فائدہ ہو گیا تھا، جب بعد میں کچھ عرصہ کے بعد وہی بیماری اسی مریض کو پیدا ہوئی، وہی دوا دی گئی، وہ دوا الٹی پڑ گئی، اور فائدہ نہیں ہوا۔ میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے معالج ایک ڈاکٹر صاحب تھے، ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب بوڑھے ہو گئے تھے،

۷۵ سال تقریباً عمر تھی، وہ کہا کرتے تھے کہ میری ساری زندگی کا تجربہ یہ ہے کہ جب دوا مریض کے جسم میں داخل ہوتی ہے تو پہلے وہ اللہ تعالیٰ سے پوچھتی کہ کیا کروں؟ کیا نہ کروں؟ فائدہ کروں؟ یا نقصان کر جاؤں؟ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو جو حکم مل جاتا ہے، اس کے مطابق وہ عمل کر گزرتی ہے، بہرحال! کسی تدبیر پر کوئی بھروسہ نہیں کرنا چاہیئے، تدبیر کرنے کا چونکہ حکم ہے، اس لئے تدبیر کر رہے ہیں، اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اسباب بنایا ہے، اس لئے اسباب اختیار کر رہے ہیں، لیکن بھروسہ اسی ذات پر ہے۔

ہمارا ذہن اسباب میں الجھا ہوا ہے:

مومن کا ان تمام باتوں پر اعتقاد تو ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والا ہے، اللہ کے سوا کوئی بھی تاثیر پیدا نہیں کرسکتا، لیکن اس طریق میں آنے کے بعد وہ اعتقاد انسان کا حال اور مقام بن جاتا ہے، یعنی ایک تو یہ ہے کہ آپ اس پر ایمان بھی لائے، اور دل میں اعتقاد بھی ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ تعالیٰ حکم سے ہوتا ہے، اسی کی حکمت جاری ہے، لیکن اس اعتقاد کے ساتھ جب کاروبار زندگی میں داخل ہوتا ہے تو وہ اعتقاد ذہن کے کسی کونے میں پڑا ہوتا ہے، اس اعتقاد کا دھیان اور استحضار نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعتقاد ہونے کے باوجود ذہن اسباب ہی میں الجھا رہتا ہے، ان اسباب سے آگے کی وہ سوچتا ہی نہیں۔

سالک کو یہ اعتقاد کامل ہو جاتا ہے:

لیکن جس سالک کی تربیت اللہ والوں کے ذریعہ ہو جاتی ہے، تو پھر وہ

اعتقاد جو اس کے دماغ کے کسی کونے میں پڑا ہوا تھا، وہ اعتقاد اس سالک کی رگ و پے میں سرائیت کر جاتا ہے، لہٰذا جب کبھی وہ کوئی کام کرے گا، اس وقت اس اعتقاد کا دھیان اس کے دل و دماغ میں ہوگا، اور اس دھیان اور استحضار کے ساتھ اس کام کو کرے گا، یہ فرق ہوتا ہے ایک سالک اور غیر سالک کے درمیان کہ اعتقاد کے درجے میں اور چیز ہے اور عمل کے درجے میں اور چیز ہے، اللہ والوں کے پاس جا کر ان کی صحبت سے جو چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہی ہے، دیکھئے کہ اعتقاد تو اس کو پہلے سے حاصل تھا، لیکن وہ دماغ کے کسی کونے میں پڑا ہوا تھا، اور اب اللہ والوں کی صحبت کے نتیجے میں اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا، اب دماغ جانتا ہے کہ یہ اسباب سب بے حقیقت چیز ہیں، اللہ تعالیٰ ہی ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والے ہیں، اگر اللہ تعالیٰ تاثیر پیدا کریں گے تو فائدہ ہوگا، تاثیر پیدا نہیں کریں گے تو فائدہ نہیں ہوگا، پھر اللہ تعالیٰ جو بھی فیصلہ تاثیر یا عدم تاثیر کا کریں گے وہ فیصلہ برحق ہوگا، یہ سب باتیں اس سالک کا ''حال'' بن جاتی ہیں، اور اس کے رگ و پے میں سرائیت کر جاتی ہیں۔

اسباب میں ناکامی توکل کا موقع نہیں:

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ''توکل'' ہونے یا نہ ہونے کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کسی مقصد کے حاصل کرنے میں ظاہری اسباب ناکام ہو رہے ہوں، مثلاً ایک آدمی بیمار ہے، وہ اپنا علاج کرا رہا ہے، دوا کھا رہا ہے، لیکن فائدہ نہیں ہو رہا ہے، ایسے موقع پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ''توکل'' کے امتحان کا موقع ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ توکل کے امتحان کا موقع نہیں ہے، اس لئے کہ جن اسباب کو آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ ان اسباب سے فائدہ

نہیں ہورہا ہے، تو اس وقت آپ لامحالہ یہی کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ کو ان اسباب سے فائدہ پہنچانا منظور نہیں ہے، اس لئے فائدہ نہیں ہورہا ہے، یہاں تو توکل کے امتحان کا موقع نہیں ہے۔ کیونکہ اس موقع پر خود بخود دل و دماغ میں توکل پیدا ہو جائے گا، اس لئے کہ ظاہری اسباب خراب ہورہے ہیں، اور ان سے فائدہ نہیں ہو رہا ہے تو اب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف ذہن جائے گا۔

اسباب موجود ہونے کے وقت توکل کرو:

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ''توکل کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب کہ اسباب پوری طرح سو فیصد کارآمد ہورہے ہیں، اور یہ یقین ہے کہ بظاہر ان اسباب سے یہ نتیجہ نکل آئے گا، جیسے مثلاً آپ کو بھوک لگی ہے، اور گھر میں کھانا پکا ہوا تیار ہے، آپ نے گھر والوں سے کہا کہ کھانا نکالدو، تاکہ کھانا کھائیں، گھر والوں نے دسترخوان پر کھانا لگالیا، آپ ہاتھ دھوکر کھانا کھانے بیٹھ گئے، اب کیا کسر رہ گئی کھانے میں؟ کچھ نہیں، بس ہاتھ بڑھائیں گے اور کھانا کھالیں گے اور بھوک دور ہو جائے گی، کیونکہ بھوک دور کرنے کے سارے اسباب سو فیصد مہیا ہیں اور اس بات کا آپ کو پورا یقین ہے کہ اب ہماری بھوک مٹنے کا وقت آ گیا ہے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ توکل کے امتحان کا موقع ہے کہ آیا اس وقت بھوک مٹنے کے لئے نگاہ اس کھانے کی طرف جارہی ہے، یا کھانے کے پیدا کرنے والے کی طرف جارہی ہے؟ یہ ہے توکل کا امتحان...... اب اگر اس وقت نگاہ اللہ تعالیٰ کی طرف جارہی ہے اور آدمی یہ سوچ رہا ہے کہ اگرچہ یہ سارے اسباب بھوک مٹانے کے موجود ہیں، لیکن جب تک ان کا حکم نہیں ہوگا، اس وقت تک یہ کھانا نہ حلق سے اترے گا، نہ یہ کھانا میری بھوک دور کرے گا، اور نہ یہ کھانا

میری صحت کا سبب بنے گا۔

سب کام اللہ کی مشیت پر موقوف ہیں:

اس وقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان جانا کہ اگرچہ سب اسباب مہیا ہیں، کھانا سامنے چنا ہوا ہے، ہاتھ بھی موجود ہیں، صحت مند ہوں، جب چاہوں گا، نوالہ اٹھا کر کھالوں گا، لیکن اللہ تعالیٰ اگر نہ چاہیں تو ان تمام اسباب کے موجود ہوتے ہوئے بھی میں کھانا نہ کھاسکوں گا، مثلاً یہ کہ میرا ہاتھ شل ہو جائے، اور میں وہ کھانا نہ کھاسکوں، یا کھانے میں کتا آ کر منہ ڈال دے، اور میں یہ کھانا نہ کھاسکوں، یا کوئی اور آفت آ جائے، جس کی وجہ سے مجھے ہڑ، بڑا کر بھاگنا پڑے، اور میں یہ کھانا نہ کھاسکوں، اور اگر کھا بھی لوں، تب بھی اس کھانیکا حلق سے اتر کر میرے لئے جزو بدن بنانا اور میرے لئے صحت کا سبب بننا، یہ صرف اللہ کا کام ہے، ورنہ کیا معلوم کہ کھانا کھا کر ہیضہ میں مبتلا ہو جاؤں، اور یا بدہضمی ہو جائے، یا فوڈ پائزننگ ہو جائے، یہ سب کچھ ہوسکتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا کہ میرے بھوک مٹنے کا اور بھوک دور ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ اور بدن کو قوت حاصل ہونے کا وقت آ گیا؟ نہیں، بلکہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے، اس کی مشیت ہوگی تو یہ سب کچھ ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔

بسم اللہ پڑھنے کا حکم:

لہٰذا ''توکل'' کا امتحان اس وقت ہے جب سارے اسباب پوری طرح مہیا ہوں، کہ اس وقت نگاہ کہاں جا رہی ہے؟ اللہ والوں کی صحبت سے یہ چیز حاصل ہوتی ہے کہ اس موقع پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف نگاہ جانے لگتی ہے، اور یہ جو

ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب کھانا شروع کرو تو پہلے ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' پڑھو، یہ حکم درحقیقت اسی طرف دھیان کو لے جانے کے لئے ہے کہ بظاہر تم یہ سوچ رہے ہو کہ کھانا سامنے موجود ہے اور میں اس کو کھالوں گا، اور اس سے میری بھوک مٹ جائے گی، لیکن یہ بات کبھی بھی دماغ میں مت لانا کہ یہ کھانے کا وجود تمہاری قوت بازو کا کرشمہ ہے۔ کیونکہ اگر یہ کھانا کسی دینے والے کی دین نہ ہوتی تو تمہاری مجال نہیں تھی کہ اس کھانے کو مہیا کر پاتے۔

دھیان اللہ کی طرف کرلو:

دوسرے یہ خیال کبھی بھی ذہن میں نہ لانا کہ اب یہ کھانا میرے سامنے آ گیا، اب میرا مقصد حاصل ہوگیا۔ اب لازماً اس کھانے کے ذریعہ مجھے قوت حاصل ہو جائے گی، اور مجھے صحت حاصل ہو جائے گی، یاد رکھئے، جب تک ان کا حکم نہیں ہوگا، اس وقت تک کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔ لہٰذا کھانا کھاؤ تو پہلے اس کا نام لو اور کہو ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اس اللہ کے نام سے جو رحمٰن ہے، جو رحیم ہے، جس نے اپنی رحمت سے یہ کھانا دیا ہے اور اپنی رحمت ہی سے یہ کھانا کھلائے گا اور اپنی رحمت ہی سے اس کھانے کو میرے لئے مفید بنائے گا، اس دھیان کو متوجہ کرنے کے لئے بسم اللہ پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے، یہ کوئی منتر نہیں ہے جو تم سے پڑھوایا جا رہا ہے کہ کھانے سے پہلے یہ منتر پڑھ کر پھونک مار لیا کرو، بلکہ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان لانے کے لئے پڑھوایا جا رہا ہے۔

کھانا سامنے آنے پر دعا

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ علیہ فرمایا کرتے

تھے کہ دیکھو، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا سامنے آنے پر دو دعائیں تلقین فرمائیں، جب کھانا سامنے آئے تو آپ نے یہ دعا تلقین فرمائی کہ:

اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ بِمَا رَزَقْتَنِیْہِ مِنْ غَیْرِ حَوْلٍ مِّنِّی وَلَا قُوَّۃ

ابھی کھانا شروع نہیں کیا، ابھی بسم اللہ نہیں پڑھی، بلکہ ابھی آپ دسترخوان پر بیٹھے اور کھانا سامنے آ گیا تو اس وقت یہ دعا پڑھو کہ اے اللہ! آپ کا شکر ہے کہ آپ نے مجھے یہ رزق میری کسی طاقت اور قوت کے بغیر عطا فرمایا، یہ رزق میری قوت بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ آپ کی عطا ہے۔

کھانا کھلانا علیحدہ نعمت ہے:

پھر جب کھانا شروع کرو تو یہ دعا پڑھو: ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' اور جب کھانا کھا چکے تو اب کہو:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ہ

اے اللہ آپ کا شکر ہے کہ آپ نے ہمیں یہ کھانا کھلایا، اور پلایا اور ہمیں مسلمانوں کے اندر پیدا کیا۔ میرے والد ماجد رحمہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ دیکھو ''رَزَقْنَا'' پر الگ شکر ادا کیا اور ''اَطْعَمَنَا'' پر الگ شکر ادا کیا، کیونکہ ''رَزَقْنَا'' پر شکر یہ ہے کہ اے اللہ، آپ کا شکر ہے آپ نے مجھے یہ کھانا دیا، کیونکہ رزق دینا یہ ایک مستقل نعمت ہے اور دوسرے شکر یہ ہے کہ مجھے وہ کھانا کھلایا، کیونکہ یہ بھی ممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رزق تو دیا ہوتا، لیکن کوئی ایسی بیماری ہوتی کہ ڈاکٹر نے کھانے سے منع کر دیا ہے، اب یہ صورت ہے کہ انواع و اقسام کی تمام نعمتیں موجود ہیں، کھانے بھی موجود ہیں، پھل بھی موجود ہیں، میوے بھی موجود ہیں، ساری دنیا

کی نعمتیں ہیں، لیکن فرج میں موجود ہیں، اور ڈاکٹر نے کہہ رکھا ہے کہ خبردار کسی کو استعمال مت کرنا، اب "رَزَقْنَا" تو پایا جارہا ہے، لیکن "اَطْعَمَنَا" نہیں پایا جارہا ہے۔

بھوک لگنا علیحدہ نعمت ہے:

یا کھانا دسترخوان پر چن دیا گیا، اور کھانے کے لئے بیٹھے، عین اس وقت کوئی پریشانی کی خبر آگئی جس کے نتیجے میں اس کھانے کی لذت ہی نہیں آئی۔ سب کھانا پینا چھوڑ کر بھاگنا پڑا، تو اس صورت میں "رَزَقَنَا" تو پایا گیا، لیکن "اَطْعَمَنَا" نہیں پایا گیا، یا گھر میں انواع واقسام کے کھانے موجود ہیں، لیکن بھوک غائب ہے، بھوک نہیں لگتی، "رَزَقَنَا" تو ہے، لیکن "اَطْعَمَنَا" نہیں ہے، اس لئے یہ دونوں نعمتیں الگ الگ ہیں، اللہ تعالیٰ کا تمہیں رزق دینا ایک مستقل نعمت ہے اور کھلانا ایک مستقل نعمت، اس لئے یہ حکم دیا کہ جب کھانا سامنے آئے تو یہ دعا پڑھو،

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ بِمَا رَزَقْتَنِيهِ مِنْ غَيْرِ حَوْلٍ مِنِّي وَلَا قُوَّة۔

ایک مرتبہ ضرور پڑھ لو، اور جب کھانا کھا چکو تو پھر یہ دعا پڑھو

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ٥

تمہارے جسم میں خودکار مشین لگادی:

اور آگے بڑھیے، جب آپ نے کھانا کھایا تو اس وقت لذت لینے کی

خاطر جو سامنے آیا بس کھاتے چلے گئے، جیسے افطاری کے وقت خاص طور پر ہوتا ہے کہ کبھی پکوڑا کھایا، کبھی پھل کھایا، کبھی کباب کھایا، کبھی دھی بڑے کھا لئے، جو ہاتھ آیا، کھاتے چلے گئے، کھاتے وقت آپ نے یہ نہیں سوچا کہ یہ سب کچھ پیٹ کے اندر جا کر کیا فساد مچائیں گے؟ اور اندر جا کر کیا ملغوبہ تیار ہوگا؟ اور کیا تاثیر پیدا کرے گا؟ اور پیٹ کا کیا حشر بنائے گا؟ اس کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیا، بس زبان کے چٹخارے کے لئے آپ کھاتے چلے گئے......کون ہے جو اس سارے ملغوبے کو جو تم نے اندر ڈال دیا ہے، اس کو چھانٹ رہا ہے؟ کہ اس میں کونسا حصہ تمہارے جسم کے لئے فائدہ مند ہے، اس کو اندر باقی رکھوں، کس جز سے خون بناؤں؟ کونسا حصہ ناکارہ ہے؟ اس کو پیشاب اور پاخانہ کی شکل میں باہر پھینک دوں، کس سے گوشت بناؤں؟ کس جز سے تمہاری ہڈیوں کو فائدہ پہنچے، کس جز سے تمہارے گوشت کو طاقت ملے، کس سے تمہاری بینائی کو قوت حاصل ہو؟ اور کس جز سے تمہاری سماعت کو قوت ملے؟ تمہارے پیٹ کے اندر چھانٹی کا ایک کاروبار چل رہا ہے، اس غذا کا تجزیہ کر کے تمہارے جسم کے ایک ایک حصے میں پھیلایا جا رہا ہے اور تمہیں اس کا فائدہ پہنچایا جا رہا ہے، اگر یہ عمل تمہارے سپرد کر دیا جاتا کہ بھائی تم نے خود ہی کھایا، تم نے کھانے کے مزے لئے، لہٰذا اب یہ کام بھی تم ہی کرو، اور اس کے اندر چھانٹی کرو، اور یہ دیکھو کہ ان میں سے کونسے اجزاء فائدہ مند ہیں، ان کو اپنے پاس رکھو۔ اور باقی فضول اجزاء کو باہر پھینک دو۔ کیا تم میں سے کسی کے بس میں یہ عمل تھا؟ نہیں، بلکہ وہی ذات ہے جو یہ عمل کر رہی ہے، اس طرح کر رہی ہے کہ:

مانبودیم و تقاضہ ما نبود
لطف او نا نگفتۂ مامی شنود

نہ ہم نے کہا تھا، نہ ہمارے بس میں تھا، نہ ہم نے مطالبہ کیا تھا، لیکن وہ اپنے لطف و کرم سے یہ سب کام کر رہے ہیں کہ یہ میرا بندہ ہے، جو زبان کے چٹخارے کا خوگر ہے، اس کو جو ذائقہ پسند ہے، چلو کھانے دو، ہم سب اندر جا کر ٹھیک کر دیں گے۔ اب اندر جانے کے بعد اس غذا کو اس کے مناسب خانوں میں بٹھایا جاتا ہے کہ یہ حصہ جگر میں جائے گا، یہ گردے میں جائے گا۔ اس سے خون بنے گا، سر کے بالوں سے لیکر پاؤں کے ناخن تک جسم کے ایک ایک حصے کو وہ غذا پہنچ رہی ہے۔

یہ شکر ادا کرنے کا موقع ہے:

جب سارے مراحل طے ہو گئے، اور اب آپ بیت الخلاء چلے گئے، اب پیٹ کے اندر جو فضلہ اور بیکار چیزیں تھیں، اللہ تعالیٰ نے سب باہر نکلوا دیں۔ اس موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا تلقین فرمائی کہ:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذَاقَنِیْ لَذَّتَہٗ وَاَبْقٰی فِیَّ قُوَّتَہٗ وَدَفَعَ عَنِّیْ اَذَاہُ۔

ایک پیغمبر ہی ایسے کلمات ادا کر سکتے ہیں کہ شکر اس اللہ کا جس نے مجھے اس کھانے کی لذت چکھا دی، اور اس کھانے میں جتنے قوت والے اجزاء تھے، ان کو میرے جسم کے اندر باقی رکھا، اور اس غذا کے اندر جو تکلیف دہ اور گندی چیزیں تھیں، ان کو باہر پھینک دیا۔

انسان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں:

یہ سب حقائق ہیں، کون ان حقائق کا انکار کرسکتا ہے، لیکن انسان کی آنکھوں پر پردے پڑے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے ان حقائق کی طرف دھیان نہیں جاتا، اس وجہ سے انسان اللہ پر بھروسہ کرنے کے بجائے اسباب کے چکر میں پڑا رہتا ہے، ہر وقت اسباب کا دھیان رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کا، اللہ کی حکمت کا تصور اور دھیان نہیں بنتا، اور جب وہ انسان اللہ والوں کی صحبت میں جاتا ہے تو وہ اعتقاد جو اس کے ذہن اور دماغ کے کسی کونے میں پڑا ہوا تھا، وہ اعتقاد ان کی صحبت سے زندہ اور پائندہ ہو جاتا ہے، اور ہر وقت وہ اعتقاد سامنے موجود رہتا ہے، وہ ہر چیز کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ سب کچھ نہیں، جب تک اللہ تعالیٰ کا حکم نہ آ جائے۔

میں کس معطی کا آلہ کار ہوں:

میں اس وقت بول رہا ہوں، لیکن اللہ والوں کی صحبت کی برکت سے عین بولتے وقت بھی دماغ میں دھیان رہتا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں، زبان سے جو کلمات نکال رہا ہوں، اس کی کوئی حقیقت نہیں، نہ میرے اندر یہ طاقت ہے کہ میں بول سکوں، نہ میرے پاس علم ہے جو ان باتوں کا ادراک کر سکے۔ میری حیثیت تو ایسی ہے جیسے لکھنے والے کے ہاتھ میں قلم، اب دیکھنے میں بظاہر وہ قلم لکھ رہا ہے، لیکن اس قلم کی کوئی حقیقت نہیں، وہ تو بے جان ہے۔ نہ اس میں شعور ہے، نہ اس میں عقل ہے۔ نہ اس میں طاقت ہے، وہ ہاتھ لکھوانے والا اس قلم سے لکھوا رہا ہے...... ایسے ہی میرے بولنے کا معاملہ ہے، نہ میری طاقت، نہ میری قوت، نہ

میرے پاس علم، اور نہ میرے پاس ادراک، بلکہ میں کسی معطئ حقیقی کا آلہ کار بنا ہوں، وہ میرے دل میں باتیں ڈال رہے ہیں، اور میری زبان سے کہلوا رہے ہیں، میں تو ایک پرزہ ہوں، میری کوئی حقیقت نہیں، میری کوئی حیثیت نہیں، اللہ والوں کی صحبت میں جا کر یہ تصور بندھنے لگتا ہے اور ہر کام میں یہ تصور رہتا ہے، اور اسی کا نام ہے ''توکل'' اور اسی کا نام اللہ پر بھروسہ ہے، بزرگوں کی صحبت سے یہی چیز حاصل ہوتی ہے۔

اپنے ارادے کو فنا کرو

اگر لوگوں سے یہ کہا جائے کہ بھائی ہر کام اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، اس کا جواب یہی دیا جاتا ہے کہ ہم اس بات کو تو پہلے ہی سے مانتے ہیں، ہمارا تو اس پر اعتقاد ہے...... تو بیشک یہ اعتقاد موجود ہے، لیکن یہ اعتقاد تمہارے دماغ کے کسی کونے میں پڑا ہوا ہے، اب جب تم اللہ والوں کے پاس جاؤ گے تو اللہ والے اس اعتقاد کو تمہارے رگ و پے میں سرائیت کرا دیں گے، اور پھر ہر وقت اس اعتقاد کا دھیان مستحضر رہے گا، اب سوال یہ ہے کہ یہ حاصل کیسے ہوگا؟ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ یہ مشق کرنے سے حاصل ہوگا، ویسے ہی بیٹھے بیٹھے حاصل نہ ہوگا، بلکہ یہ عمل کرو کہ ''اپنے ارادے کو اللہ کے ارادے کا تابع کر دو، کہ میں نے اپنی طرف سے تدبیریں اختیار تو کی ہیں، لیکن اب جو کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور منشاء ہوگی، میں اس پر راضی ہوں، وہ اگر مجھے کوئی تکلیف بھی پہنچائیں گے تو مجھے منظور ہے، میں ان کے فیصلے پر راضی ہوں، ہاں تکلیف آنے کی صورت میں ہائے ہائے بھی کرونگا اور دعا بھی کروں گا کہ یا اللہ، اس تکلیف کو دور کر دے، لیکن پھر بھی اس کے فیصلے پر راضی رہوں گا۔

پریشانی ایسی سوچ سے ہوتی ہے

شروع شروع میں ذرا تکلف سے یہ عمل کرنا پڑے گا، لیکن رفتہ رفتہ پھر یہ اعتقاد انسان کا ''حال'' بن جاتا ہے، اور پھر ''حال'' سے آگے ''مقام'' بن جاتا ہے، اس کے بعد انسان کو جو راحت حاصل ہوتی ہے کہ اس راحت تک کوئی دوسرا شخص نہیں پہنچ سکتا، اس لئے کہ انسان کو جتنی بے چینی، پریشانی، اور تکلیف ہوتی ہے وہ اس وجہ سے ہوتی ہے کہ انسان یہ سوچتا ہے کہ ''ہونا یوں چاہئے تھا، لیکن یوں ہوگیا'' اس سوچ سے تکلیف ہوتی ہے، مثلاً مجھے صحت ہونی چاہئے تھی، لیکن ہوگئی بیماری، تو اب تکلیف ہو رہی ہے، یا مثلاً مجھے پیسے ملنے چاہئے تھے۔ مگر نہیں ملے، اب تکلیف ہو رہی ہے، ساری تکلیف کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ جو کام ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا، اور جو کام نہیں ہونا چاہئے تھا، وہ ہوگیا۔

میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع بنادیا

لیکن جب تم نے ایک مرتبہ یہ اعتقاد دل میں بٹھالیا، اور اس کو اپنا ''حال'' اور ''مقام'' بنالیا کہ جو کچھ ہوا، وہی ہونا چاہئے۔ اللہ کی مشیت یہ تھی، وہی ہونا چاہئے تھا، اب کہاں کی تکلیف؟ پھر تو راحت ہی راحت ہے، جیسا کہ حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا تھا کہ میں تو ہر وقت آرام اور راحت میں ہوں، اس لئے کہ اس کائنات میں جو کچھ کام ہوتا ہے، وہ میری مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں، اس لئے کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی کے تابع بنالیا ہے، اس سے بڑی راحت کی چیز اور کیا ہوگی کہ جو کچھ ہونا چاہئے تھا، وہی ہوا، اور جو نہیں ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا، پھر کیسی تکلیف؟ پھر کیسا صدمہ؟ بہر حال! راحت

حاصل کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی طریقہ نہیں۔

گھر بیٹھے راحت حاصل کرلو

آج ساری دنیا راحت حاصل کرنے کے لئے دوڑ رہی ہے، راحت حاصل کرنی مقصود ہے، انسان یہ چاہتا ہے اس کے پاس پیسہ ہو، کوٹھیاں ہوں، بنگلے ہوں، کاریں ہوں، ساز و سامان ہو، ان سب سے مقصود کیا ہے؟ راحت حاصل کرنا، لیکن ان سب چیزوں کے مل جانے کے بعد بھی راحت حاصل نہیں ہوتی، کہیں نہ کہیں کوئی پریشانی لاحق ہو جاتی ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کی خواہشات بے پناہ ہیں، اور وہ خواہشات پوری نہیں ہوتیں، لہٰذا راحت نہیں ملتی، وہ راحت نایاب ہے، لیکن جس دن تم اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی اور اللہ کی مشیت میں فنا کر دو گے کہ بس جو ہونا تھا، وہی ہوا تو بس پھر گھر بیٹھے راحت حاصل ہو جائے گی، اس کے ذریعہ راحت کی منزل ایک لمحہ میں حاصل ہو جائے گی۔

سکون ترکِ تمنا میں پالیا میں نے

ہمارے بڑے بھائی، بھائی ذکی کیفی مرحوم، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے آمین، انہوں نے ایک بڑا خوبصورت شعر کہا تھا کہ:

سکون ترک تمنا میں پالیا میں نے
قدم رکے تھے کہ منزل کو جالیا میں نے

جب تمنیٰ اور آرزوئیں ترک کردیں کہ ارے جو کچھ اللہ تعالیٰ کریں گے، وہ درست ہوگا، تو اس سے بڑا سکون اور کیا ہوگا؟ اور اس بات کو دوسرے مصرعہ میں اس طرح تعبیر کیا کہ ''قدم رکے تھے کہ منزل کو جالیا میں نے'' یعنی جب تک

قدم آگے بڑھ رہے تھے، اور تمنائیں اور آرزوئیں کی جا رہی تھیں، اور یہ کوشش جاری تھی کہ یہ تمنائیں حاصل کرلوں، اس وقت تک منزل ہاتھ میں نہیں آرہی تھی، لیکن جب اپنی تمناؤں کو روک دیا، جب اپنی تجویز کو فنا کر دیا اور قدم روک لئے تو اب منزل کو جا لیا میں نے، اب منزل پر پہنچ گئے، یعنی سکون اور اطمینان حاصل ہو گیا۔

مرکب کوئی بہتر نہ ملا ترک طلب سے

یہی بات میں نے بھی ایک شعر میں کہی تھی کہ

دو گام چلے تھے کہ نظر آگئی منزل
مرکب کوئی بہتر نہ ملا ترکِ طلب سے

یعنی دو قدم چلے تھے کہ منزل پر پہنچ گئے، "طلب" کو ترک کرنے سے بہتر کوئی سواری نہیں...... لہٰذا اگر راحت حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنی مرضی کو اللہ کی مشیت میں فنا کر دو بس، پھر دیکھو کیا عیش ہی عیش ہو جائیں گے۔

مَاشَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَالَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ

جو اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں، وہ ہوتا ہے، جو نہیں چاہتے نہیں ہوتا، اس کے علاوہ راحت کسی اور چیز میں نہیں، ہزار کوشش کرلو، جتنے چاہو، اسباب اختیار کرلو، راحت کے پیچھے بھاگتے رہو، یہ کبھی نہیں ملے گی، ہاں اگر راحت ملے گی تو اللہ کے اوپر تفویض اور توکل ہی سے ملے گی، اللہ کے سپرد کرو، اور اللہ پر بھروسہ کرو۔

طلب میں زیادہ انہماک نہ ہو

حدیث شریف میں ہے کہ:

اَجۡمِلُوۡا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوۡا عَلَیۡہِ

یعنی طلب میں اجمال سے کام لو، طلب میں بھی بہت زیادہ انہماک نہیں ہونا چاہئے، بہت جز رسی نہیں ہونی چاہئے کہ انتہا درجے کے اسباب اختیار کرلو، نہیں، بلکہ سامنے سامنے کے جو اسباب واضح نظر آ رہے ہیں، ان کو اختیار کرو، اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو، یہ ہے ایک مؤمن کا کام، اور یہ ایسی بات ہے کہ اگر اس بات پر عمل کی توفیق ہو جائے، اور ہمارے دلوں میں یہ بات اتر جائے تو یقین جانو یہ دنیا جنت بن جائے۔ اگر اللہ تعالیٰ یہ عطا فرمادے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ہم سب کو یہ دولت عطا فرمادے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مفوض کامل کی پہچان

مجلس نمبر 104

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط وترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دار العلوم کراچی۔
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	104

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَاصَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ
اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
كَمَابَارَكْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰى اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ
اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

میمن اسلامک پبلشرز
memonip@hotmail.com

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفوض کامل کی پہچان

مجلس نمبر 104

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رسوله الکریم، وعلٰی آله وأصحابه اجمعین۔ امابعد:

تمہید:

گزشتہ کل مختصراً ''تفویض اور توکل'' کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی گئی تھیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ''تفویض'' کے معنی ہیں کہ اپنا تمام تر معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا جائے کہ جو کچھ وہ کریں گے، وہ ٹھیک ہوگا، اس کے مقابل میں ہے ''تجویز'' تجویز کا مطلب یہ ہے کہ آدمی خود اپنی طرف سے یہ تجویز کرے کہ فلاں کام اس طرح ہونا چاہئے، اور بعد میں اگر وہ کام اس طرح نہ ہوتو اس کو اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہو کہ ایسا کیوں نہیں ہوا؟

تفویض کا مطلب:

مثلاً آپ نے ایک دوا استعمال کی، اور یہ تجویز کیا کہ اس دوا سے مجھے

ہر حال میں صحت ہونی چاہئے، چاہے کچھ ہو جائے، خدا نہ کرے اگر اس دوا سے فائدہ نہ ہو تو اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہو جائے کہ یا اللہ: فائدہ کیوں نہیں ہوا؟ ایسی ''تجویز'' گناہ ہے۔ جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف شکوہ ہو جائے، اور ''تفویض'' یہ ہے کہ آپ نے یہ کہا کہ یا اللہ: میں ''تدبیر'' تو کر رہا ہوں، کیونکہ آپ نے تدبیر کرنے کا حکم دیا ہے، دعا بھی کر رہا ہوں کہ اے اللہ! اس تدبیر کو کامیاب بنا دیجئے۔ لیکن میں ہر اس فیصلے پر راضی ہوں، جو آپ میرے حق میں فیصلہ فرمائیں گے، یہ ہے ''تفویض''۔ اور توکل بھی اس سے ملتی جلتی چیز ہے کہ آدمی اللہ پر یہ بھروسہ رکھے کہ جو کچھ وہ کریں گے وہ میرے حق میں بہتر ہوگا، یہ توکل ہے۔ آگے حضرت والا یہ فرما رہے ہیں کہ:

مفوض کامل کون؟

> مفوض کامل وہ ہے کہ اگر عمر بھر اس کے کان میں یہ آواز آئے کہ "اِنَّكَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ" یا یہ آواز آتی رہے کہ "اِنَّكَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ" تو کسی وقت بھی عمل میں ذرہ برابر بھی کمی نہ کرے، بدستور کام میں لگا رہے، نہ پہلی آواز سے بے فکر ہو، نہ دوسری آواز سے دل برداشتہ ہو۔
>
> (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۸)

یعنی ساری عمر عمل کر رہا ہے، اور یہ آواز ساری عمر میں آ رہی ہے کہ تو جنتی ہے، جنت میں جائے گا، تب بھی یہ سوچ کر عمل میں کمی نہ کرے کہ جب جنت میں جانا ہی ہے تو عمل کرنے کی کیا ضرورت؟ اور اگر یہ آواز آ جائے کہ تو دوزخی ہے، دوزخ میں جائے گا، تب بھی یہ سوچ کر عمل میں کمی نہ کرے کہ دوزخ

میں جانا تو ہے، اب محنت کر کے کیا کرنا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عمل کرتا رہے، اور معاملہ اللہ کے حوالے کر دے کہ یا اللہ! فیصلہ آپ کا ہے، چاہے جنت میں بھیجیں، یا جہنم میں بھیجیں، جو آپ کا فیصلہ ہوگا آپ کے سپرد کرتا ہوں،

اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ

ایسا شخص مفوض کامل ہے۔

صحابہ کرام مفوض کامل تھے

حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیکھیں کہ کتنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ بشارت عطا فرمادی تھی کہ یہ جنتی ہیں، ان میں عشرہ مبشرہ دس صحابہ رضی اللہ عنہم تو مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جن کے جنتی ہونے کی پیشنگوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادی تھی، لیکن پھر بھی ساری عمر عمل کرتے رہے، اور اپنے عمل میں ذرہ برابر کمی نہیں کی، بلکہ ساتھ میں ڈرتے بھی رہے، مثلاً حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اپنے کانوں سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سن چکے ہیں کہ عمر جنتی ہے، لیکن اس کے باوجود حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھ رہے ہیں کہ خدا کے لئے مجھے یہ بتادو کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی جو فہرست تمہیں بتائی تھی، اس میں کہیں میرا نام تو نہیں ہے؟ یہ ڈر لگا ہوا ہے-- کیوں؟ اس لئے کہ ہوسکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت یہ جو فرمایا تھا کہ یہ جنتی ہے، یہ میرے اس وقت کے حالات کے مطابق فرمایا ہو، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ بعد میں میرے حالات میں کوئی تبدیلی واقع ہوگئی ہو۔ بہر حال! نہ صرف یہ کہ عمل کر رہے ہیں، بلکہ ڈر بھی لگا ہوا ہے۔ اسی لئے ہمارے

بزرگ فرماتے ہیں کہ انسان عمل کرتا رہے اور ڈرتا رہے، عمل چھوڑے بھی نہیں، عمل کرنے میں لگا بھی رہے، لیکن ساتھ میں ڈرتا بھی رہے کہ پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کے یہاں یہ عمل مقبول ہے یا نہیں۔

ایک بزرگ کا واقعہ

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا واقعہ لکھا ہے کہ وہ روزانہ تہجد کی نماز کے لئے اٹھا کرتے تھے، روزانہ کا معمول تھا، ایک مرتبہ تہجد کی نماز کے لئے اٹھے، وضو کے لئے لوٹا اٹھایا، لوٹے میں پانی بھرا تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی کہ ''نہ تیرا وضو قبول، نہ تیرا اٹھنا قبول، نہ تیری نماز قبول، نہ تیری تہجد قبول، ان بزرگ نے وہ آواز اپنے کانوں سے سنی اور لوٹا اٹھا کر وضو کیا، نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، اور معمول کے مطابق نماز تہجد ادا کی، اگلی رات جب نماز تہجد کے لئے اٹھے، اور تیاری شروع کی تو پھر وہی آواز آئی کہ نہ تیرا اٹھنا قبول، نہ وضو قبول، نہ نماز قبول، نہ تہجد قبول، یہ آواز سنی، پھر وضو کیا اور اطمینان سے حسب معمول نماز ادا کی، تین دن تک یہ آواز سنی، ان کے شاگرد جوان کے ساتھ ہی خدمت کے لئے رہتے تھے، وہ بھی یہ آواز سنتے تھے۔ بالآخر شاگرد نے کہا کہ حضرت: یہ آواز روزانہ آرہی ہے کہ نہ تیری نماز قبول، نہ تیرا وضو قبول، نہ تیری تہجد قبول، کچھ بھی قبول نہیں تو پھر کیوں آپ اتنی محنت اور مشقت برداشت کر رہے ہیں کہ راتوں کو اٹھ رہے ہیں، نماز ادا کر رہے ہیں؟ اس کے جواب میں ان بزرگ نے فرمایا کہ اگرچہ ان کی طرف سے یہ کہہ دیا گیا کہ تمہاری کوئی عبادت قبول نہیں۔ لیکن کوئی اور در ہو تو بتاؤ، وہاں چلا جاؤں، میرے پاس تو ایک ہی دروازہ ہے، وہ اگر کہیں گے، تب بھی وہیں جاؤں گا، لہٰذا قبول کریں تو، قبول نہ

کریں تو، میں تو وہی دروازہ کھٹکھٹاتا رہوں گا، جب یہ بات ان بزرگ نے کہی تو پھر غیب سے یہ آئی کہ

قبول است گرچہ ہنر نیست
کہ جز ماپناہ دگر نیست

اب تیرا سب کچھ قبول ہے، تیرا وضو بھی قبول، تیری نماز بھی قبول، تیرا تہجد بھی قبول، اگرچہ تیری اس نماز اور وضو میں کوئی ہنر نہیں، یعنی کوئی خاص خصوصیت نہیں، لیکن اس کے باوجود سب قبول ہے، کیونکہ ہمارے سوا تیری کوئی اور پناہ گاہ نہیں ہے۔

میرا کام حکم بجالانا ہے:

یہی بات حضرت والا اس ملفوظ میں بیان فرمارہے ہیں کہ اگر ساری عمر یہ آواز آتی رہے کہ تو جہنمی ہے، تب بھی عمل نہ چھوڑے اور اگر ساری عمر یہ آواز آتی رہے کہ تو جنتی ہے، تب بھی عمل نہ چھوڑے، کیوں؟ اس واسطے کہ میرا کام یہ ہے کہ مجھے جو حکم دیا گیا ہے، میں اس کو بجالاتا رہوں، میں کسی کا بندہ ہوں، اور بندہ ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ جو مجھ سے کہا جارہا ہے، میں وہ کئے جاؤں، جب وہ روک دیں گے تو رک جاؤں گا، لیکن جب تک کرنے کو کہا جارہا ہے تو میں کروں گا، اس لئے کہ یہ عمل جو میں کررہا ہوں، بحیثیت بندہ ہونے کے کررہا ہوں، یہ عمل ثواب اور عذاب کی شرط پر نہیں ہورہا ہے کہ پہلے اللہ میاں سے شرط لگاؤں کہ یا اللہ! اگر ثواب دیں گے تو عبادت کروں گا، ورنہ نہیں کروں گا، اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ شرط لگالی تو پھر یہ بندگی کیا ہوئی؟ بندگی تو یہ ہے کہ بندہ یہ کہدے کہ یا اللہ! آپ میرے خالق ہیں، آپ میرے مالک ہیں، لہٰذا آپ کا جو حکم ہے، وہ

مجھے ہر حالت میں بجالانا ہے۔ چاہے کچھ ہو جائے۔ یہ تو آپ کا کرم ہے کہ آپ نے حکم بجالانے پر جنت کے وعدے کئے ہوئے ہیں، لیکن کیا جنت میرے عمل کا بدلہ ہے؟ کیا میرا عمل اس لائق ہے کہ اس کے بدلے جنت مل جائے؟ لہٰذا مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اللہ میاں کے ساتھ شرط لگاؤں کہ اگر جنت ملے گی تو عمل کروں گا ورنہ نہیں کروں گا، اگر نہیں ملے گی تو عمل نہیں کروں گا، مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ

تو بندگی چوں گدایا بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

کیا مزدوری کی شرط لگا کر اللہ کی بندگی کرو گے؟ اتنی مزدوری لوں گا تو تہجد پڑھوں گا، اتنی مزدوری لوں گا تو روزہ رکھوں گا، یہ کیا ہے؟ یہ تو تجارت ہوئی، بندگی نہ ہوئی، لہٰذا شرط لگا لگا کر بندگی ہرگز مت کرو۔ اس لئے کہ جس کی عبادت کر رہے ہو، اس کو خود بندہ پروری آتی ہے، وہ بندہ پروری اپنے فضل و کرم سے کرے گا۔

لہٰذا اگر یہ آواز آ جائے کہ تو جہنمی ہے، جہنم میں جائے گا، تب بھی عمل نہیں چھوڑنا، کیونکہ بندہ اسی کا ہے، کسی اور کا تو نہیں ہے، اور جب اسی کا بندہ ہے تو اس کی بندگی کرنی ہے، اور اگر یہ آواز آ جائے تو جنت میں جائے گا، تب تو خیر بطریق اولیٰ اس کی بندگی کرے گا، ایک وجہ تو یہ ہے۔

کشف، الہام، خواب حجت نہیں

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ آواز کا آنا ہماری شریعت میں کوئی حجت نہیں،

اسی طرح اگر کسی شخص کو کشف یا الہام ہو تو شریعت میں کوئی حجت نہیں، ایسا الہام جو شرعاً حجت ہو، وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر ختم ہو گیا، انبیاء کرام پر جو وحی آتی ہے وہ حجت ہوتی ہے، اور الہام اور وحی میں یہی فرق ہے کہ وحی حجت ہوتی ہے اور الہام حجت نہیں ہوتا، اسی طرح کشف بھی حجت نہیں ہوتا۔

آج کل اچھے خاصے پڑھے لکھے دیندار لوگوں میں یہ وبا چل پڑی ہے کہ انہوں نے کشف، الہام اور خواب کو حجت سمجھنا شروع کر دیا ہے، کہ ہم نے فلاں خواب دیکھا تھا، اب اس خواب کی بنیاد پر وہ کام کرلیا۔ کچھ عرصہ پہلے ایک صاحب دیندار حلقے کے ایک بڑے سربراہ کے بارے میں بتا رہے تھے کہ جہاں ان سے کسی نے پوچھا کہ یہ کام کروں یا نہ کروں؟ وہ کہتے کہ میں ذرا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لوں، پھر بتاتا ہوں، استغفر اللہ، فوراً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھنے کا سلسلہ جاری ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس طرح پوچھتے تھے؟ اگر اس کو کشف اور الہام بھی کہا جائے تو بھی اس کا یہ کہنا کہ میں ہر کام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ کر کرتا ہوں، اور لوگوں کے سامنے اس کا اعلان کرنا، اور اس کو حجت سمجھنا، یہ سب فتنہ ہے۔

مریدین اڑاتے ہیں

جب ہم قندھار گئے تھے اور وہاں ملا عمر صاحب سے ملاقات ہوئی تھی۔ بے شمار لوگوں نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ ہم نے سنا ہے کہ انہوں نے آپ سے یہ کہا تھا کہ آپ ہمیں تو یہ تلقین کر رہے ہیں کہ جنگ بند کریں، اور صلح کرلیں۔ ہم آپ کی بات مانیں، یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانیں؟ ہمیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ خواب میں یہ فرمایا کہ تم آگے بڑھو اور مقابلہ

کرو، چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ فرما دیا ہے، لہٰذا ہم آپ کی بات مانیں، یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بات مانیں؟......اب اس بارے میں بے شمار لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ایسی باتیں ان سے ہوئی تھیں؟ حالانکہ ان باتوں کا کوئی ذکر فکر نہیں ہوا، نہ انہوں نے مجھ سے ایسی کوئی بات کی۔ بات وہی ہے کہ

پیراں نمی پرند، مریداں می پرانند

یعنی پیر نہیں اڑتے، بلکہ ان کے مریدین اڑاتے ہیں۔

شیطانی الہام:

بہر حال! ہماری قوم کی حالت عجیب و غریب ہوگئی ہے کہ کشف و کرامت میں اور خوابوں میں بڑی دلچسپی لینے لگی ہے، حالانکہ شریعت نے کشف و کرامت اور خواب میں سے کسی کو بھی حجت نہیں بنایا۔ چاہے کتنی ہی مرتبہ خواب آئے، کتنی ہی مرتبہ کشف ہو، کتنی ہی مرتبہ الہام ہو، لیکن شرعی اعتبار سے وہ کوئی دلیل نہیں، بلکہ بعض اوقات آدمی کو دھوکہ ہو جاتا ہے، آدمی یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ مجھے کشف ہو رہا ہے، مجھے الہام ہو رہا ہے، جبکہ حقیقت میں شیطانی الہام ہوتا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ علیہ بڑے اونچے درجے کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، اور اولیاء کرام کے بارے میں جو قصے لوگوں میں مشہور ہو جاتے ہیں، وہ بھی بعض بے سروپا ہوتے ہیں، اور ان کی سند وغیرہ نہیں ہوتی، لیکن

بعض واقعات وہ ہیں جو مستند طریقے سے ثابت ہیں، شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمہ اللہ علیہ بڑے مستند بزرگ ہیں، یہ جس طرح صوفی اور ولی اللہ ہیں۔ اسی طرح یہ بڑے عالم بھی ہیں اور عالم شریعت کے بھی بڑے امام ہیں۔ اس لئے یہ کوئی کچی بات نہیں کہتے، بلکہ مستند اور پکی بات کہتے ہیں۔ بہر حال! یہ اپنی کتاب "المیزان الکبری" میں لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ تہجد کی نماز پڑھ رہے تھے، اچانک ایک نور چمکا، اور اس نور میں سے آواز آئی کہ اے عبدالقادر، تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کر دیا، اس لئے حق ادا کرنے کے صلہ میں ہم تمہیں یہ انعام دیتے ہیں کہ اب تیرے اوپر نماز فرض نہیں، روزے بھی فرض نہیں، اور جتنے فرائض ہیں، وہ سب تمہارے اوپر سے ساقط کرتے ہیں۔ گویا کہ عبادت کی قبولیت کا اعلان اور آئندہ کے لئے تمام فرائض شرعیہ سے چھٹی دیدی گئی۔

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ علیہ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ دور ہو جا کمبخت، مجھے دھوکہ دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے تو کبھی فرائض معاف کئے نہیں، آپ سے زیادہ کون عبادت کر سکتا ہے، آپ سے زیادہ کون بندگی کا حق ادا کر سکتا ہے، لیکن اس کے باوجود آپ سے تو فرائض معاف کئے نہیں، مجھ سے کیسے معاف کر دیں گے؟ مجھے دھوکہ دیتا ہے۔ آپ سمجھ گئے کہ یہ شیطان ہے۔ چنانچہ وہ نور ایک دم سے غائب ہو گیا، تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک نور چمکا اور اس نور میں سے آواز آئی کہ اے عبدالقادر! آج تجھے تیرے علم نے بچا لیا، ورنہ یہ وہ داؤ ہے جس کے ذریعہ میں نے بے شمار لوگوں کو تباہ و برباد کر دیا، شیخ عبدالقادر رحمہ اللہ علیہ نے جب یہ آواز سنی تو فرمایا: کمبخت، دوبارہ مجھے دھوکہ

دیتا ہے کہ میرے علم نے مجھے بچالیا، ارے میرا علم کیا بچاتا، یہ تو اللہ تعالیٰ کا فضل تھا جس نے مجھے بچالیا۔

دوسرا وار زیادہ سخت تھا:

علماء کرام نے فرمایا کہ یہ دوسرا وار زیادہ خطرناک تھا، اس لئے پہلا وار تو ایسا تھا کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ نمازیں معاف نہیں ہوسکتیں، اور دوسرے وار میں ان کو علم کے گھمنڈ اور تکبر میں مبتلا کرنا مقصود تھا کہ دیکھو، آج تمہارا علم تھا، جس نے تمہیں بچالیا، تو اس علم پر بھروسہ، اس پر ناز، اس پر فخر، اور تکبر میں مبتلا کرنا تھا، اس لئے یہ بڑا خطرناک داؤ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ علیہ کو فہم عطا فرمائی، اور اس داؤ کو سمجھ گئے اور اس کو دھتکار دیا۔

یہ چیزیں حجت نہیں:

بہرحال! یہ آوازیں، یہ خواب، یہ روشنیاں، یہ رنگ، یہ مختلف نظارے جو نظر آتے ہیں، ان میں سے کوئی چیز حجت نہیں، اور عافیت کا راستہ یہ ہے کہ اس فکر ہی میں مت پڑو۔ بہت سے لوگ مجھے اپنے اصلاحی خطوں کے اندر اپنے خواب لکھتے رہتے ہیں، میں نے ان کو منع کر دیا کہ خبردار، آئندہ مجھے خواب لکھ کر مت بھیجنا، اس لئے کہ رفتہ رفتہ یہ ہوگا کہ یہ کوئی بڑی فضیلت کی چیز ہے، جو ہمیں حاصل ہورہی ہے، ہر روز ایک نیا خواب آتا ہے، اور اس میں کوئی نہ کوئی بشارت ہوتی ہے، رفتہ رفتہ اس کے نتیجے میں آدمی غلط راستے پر پڑ جاتا ہے۔

مجنون کو بھی کشف ہو جاتا ہے:

حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ کشف ہونے کے لئے ایمان بھی شرط نہیں۔ کافر کو بھی کشف ہو جاتا ہے اور کشف کے لئے عاقل ہونے کی بھی شرط نہیں، مجنون کو بھی صحیح کشف ہو جاتا ہے، اور یہ میرا خود ذاتی تجربہ ہے، میری ایک ہمشیرہ تھیں، ان کو کچھ ذہنی تکلیف ہوگئی تھی، اور جس کے نتیجے میں نفسیاتی بیمار ہوگئی تھیں، اس حالت میں وہ ہوش میں نہیں تھیں، اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی تھیں۔ جس وقت میں اپنے گھر سے ان کی عیادت کے لئے نکلتا تو وہ اپنے پاس بیٹھنے والوں کو بتا دیتی تھیں کہ ''تقی'' میرے پاس آنے کے لئے گھر سے نکلا ہے، اب دیکھئے کہ ان کو کشف ہو رہا تھا، اور صحیح کشف ہو رہا تھا، اس سے پتہ چلا مجنون کو بھی کشف صحیح ہو جاتا ہے، اس لئے کہ کشف تقرب کی علامت نہیں اور اگر کسی کو کشف نہیں ہوتا تو یہ کوئی نقص بھی نہیں۔ اگر ساری عمر کوئی بھی کشف نہ ہو تو اس کی دینداری میں، اس کے تدین میں اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کی مقبولیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی، لہٰذا جب یہ بات ہے تو اس کے پیچھے پڑنے اور اس کو حاصل کرنے کی حاجت نہیں۔ بلکہ اس کشف و کرامت کے راستے میں پڑنے سے آدمی کے گمراہ ہونے کا خطرہ ہوتا ہے، جب تک کسی شیخ کی رہنمائی نہ ہو، آدمی اس کے نتیجے میں گمراہ ہو جاتا ہے۔

کشف میں کسب کو بھی دخل ہے:

میرے والد ماجد صاحب رحمہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ ''کشف'' اصلاً تو وہبی ہے، لیکن اس کے اندر کسب کو بھی کچھ دخل ہے، پھر خود فرمانے لگے کہ

ایک دن میں نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ حضرت: الحمدللہ آپ کی تربیت اور تعلیم کی برکت سے کشف و کرامت کی حقیقت تو بالکل واضح ہوچکی ہے کہ یہ نہ کوئی حجت ہیں، نہ یہ مطلوب ہیں اور نہ ان کے پیچھے پڑنا چاہئے، لیکن کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ اس وادی کی بھی کچھ سیر کرلیں۔ پہلے تو حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ارے بھائی چھوڑو، اس میں کیا رکھا ہے، پھر فرمایا کہ اگر تمہارا دل سیر کرنے کو چاہتا ہے، تو تمہیں بتادیتے ہیں، چنانچہ حضرت والا نے ایک طریقہ بتایا، میں نے اس طریقے کو استعمال کیا تو مجھے عجیب وغریب مناظر نظر آئے اور میں نے اس میں گاندھی کا کٹا ہوا سر دیکھا۔ یہ اس زمانے کا واقعہ ہے کہ جب گاندھی کا طوطی بول رہا تھا، اس کے علاوہ اور بہت کچھ دیکھا۔ جب صبح حضرت والا سے ملاقات ہوئی تو پوچھا کہ ہاں! بھائی سیر کرلی؟ اب اس کو چھوڑ دو، اور آئندہ دوبارہ اس کی طرف متوجہ مت ہونا۔

کشف معیار فضیلت نہیں:

بہرحال! جتنا وقت آدمی کشف حاصل کرنے کی مشق میں خرچ کرے گا، اگر اتنا وقت اللہ تعالیٰ کے ذکر میں لگائے تو اس کو کتنا فائدہ پہنچے گا، اور اگر اس کام میں وقت صرف کرے گا تو کچھ حاصل نہ ہوگا، لہٰذا یہ کشف وکرامت نہ معیار فضیلت ہے، اور نہ یہ حجت ہے، نہ یہ مطلوب ہے، نہ یہ مقصود ہے، ہاں! اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے کسی کو عطا فرمادے تو یہ نعمت ہے، اگر کسی کو یہ حاصل نہیں ہے تو اس کے لئے کوئی نقص کی بات نہیں۔

اس کا نام تفویض کامل ہے:

لہٰذا جب یہ بات ہے تو اگر تمہیں عبادت کے دوران یہ آواز آجائے کہ تو جنّتی ہے، تو کیا اس آواز کے نتیجے میں جنتی ہونے کی گارنٹی مل گئی؟ نہیں، اس لئے کہ یہ آواز کوئی حجت نہیں۔ اس لئے کہ کچھ پتہ نہیں کہ یہ آواز کہاں سے آئی، اسی طرح اگر یہ آواز آجائے تو دوزخی ہے تو بھی کوئی حجت نہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہ سوچو اللہ اور اللہ کے رسول صلی علیہ وسلم کی طرف سے جو حکم آجائے، میں اس حکم کی تعمیل کروں، اور سنت کی اتباع کروں، بس، اس سے آگے کا میں مکلّف نہیں۔ اور جب میں اللہ کے حکم کی اتباع کر رہا ہوں تو اس کے بعد میرا معاملہ اللہ کے حوالے ہے، ''اُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ، اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ'' وہ جو فیصلہ کریں گے، وہ فیصلہ میرے لئے برحق ہوگا اور میں اس فیصلے پر مکمل طور پر راضی ہوں، یہ ہے ''تفویض کامل''

یہ خیال غلط ہے:

ابھی میں نے جو بات کہی تھی کہ اللہ کی عبادت بندگی کی وجہ سے کرو، ثواب کی شرط پر نہ کرو، اس لئے کہ:

ہزار نکتۂ باریک ز مو این جاست
نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

لیکن اس بات کے نتیجے میں کوئی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائے، کیونکہ بعض اس نکتۂ کو غلط سمجھنے کی وجہ سے گمراہی میں پڑ گئے، چنانچہ وہ لوگ کہنے لگے کہ ہمیں جنت نہیں چاہئے۔ یا یہ کہہ دیا کہ ہمیں تو جنت کی خواہش اور دعا بھی نہیں کرنی

چاہیئے، اس لئے کہ ہم تو اللہ کے بندے ہیں، ہمیں جنت مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم تو بندہ ہونے کی وجہ سے اللہ کی عبادت کریں گے، یاد رکھئے، یہ خیال بھی غلط ہے۔

جنت سے استغناء غلط ہے:

یعنی ایک طرف تو بندگی کی شرط کے طور پر جنت کا مطالبہ کرنا کہ اگر جنت دو گے تو بندگی کروں گا، ورنہ نہیں۔ یہ بھی غلط ہے۔ اس کے برخلاف جنت سے استغناء، یا جنت مانگنے سے استغفناء برتنا، یہ بھی غلط ہے۔ جیسا کہ غالب کا بیہودہ شعر مشہور ہے کہ:

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبین کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

یعنی طاعت کے اندر یہ شائبہ نہ رہے کہ میں یہ عبادت اس لئے کر رہا ہوں کہ مجھے جنت ملے گی، اور جنت کی نعمتیں ملیں گی، جنت کے محلات ملیں گے وغیرہ، اس لئے اس بہشت کو دوزخ میں ڈال دو، اس لئے کہ یہ بہشت میری طاعت کو جنت کی نعمتوں کی لالچ کے ساتھ ملوث کر رہی ہے، اور میں جنت کی لالچ کے ساتھ عبادت کرنا نہیں چاہتا۔ یہ ہے اس شعر کا مطلب۔

ہم جنت کے محتاج ہیں:

لیکن یہ بالکل بیہودہ شعر ہے، اس لئے کہ اگر چہ جنت کی شرط پر بندگی کرنا اور عبادت کرنا تو ٹھیک نہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ جنت سے بے نیازی بھی ٹھیک نہیں، کیونکہ ہم جنت کے محتاج ہیں اور اللہ تعالیٰ سے جنت مانگنی ہے کہ یا

اللہ ہمیں جنت دیدے۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں آپ کی بندگی کرتا ہوں، بلکہ اس وجہ سے کہ میں آپ کا بندہ ہوں، اور آپ میرے آقا ہیں، میرے مولیٰ ہیں، آپ میرے داتا ہیں، لہٰذا آپ تو مجھ پر کرم ہی فرمایئے، اور مجھے جنت دید یجئے۔

ایک بزرگ کا واقعہ:

ایک بزرگ کا جو واقعہ مشہور ہے، اس کو بھی بعض لوگ حجت کے طور پر پیش کرتے ہیں کہ ایک بزرگ تھے جب ان کے مرنے کا وقت آیا تو ان کو جنت کی نعمتیں دکھائی گئیں کہ تمہارے لئے جنت میں یہ باغات ہیں، یہ محلات ہیں، جنت کے مناظر ان کے سامنے پیش کئے گئے، اور ان سے کہا گیا اب تم یہاں آنے والے ہو، ان بزرگ نے جنت کے مناظر سے منہ موڑ لیا، اور دوسری طرف کروٹ لے لی، اور یہ شعر پڑھا کہ:

اِنْ كَانَ مَنْزِلَتِی بِالْحُبِّ عِنْدَ كُمْ
مَا قَدْ رَأَيْتُ فَقَدْ ضَيَّعْتُ اَيَّامِیْ

کہ اگر میری محبت کا درجہ آپ کے نزدیک یہی جنت تھی تو میں نے پھر اپنی ساری زندگی ضائع کر دی، اس لئے کہ میری محبت جو آپ کے ساتھ تھی، وہ اس جنت کی خاطر نہیں تھی۔ اس واقعہ سے لوگ استدلال کرتے ہیں کہ دیکھو، ان بزرگ نے کتنا اچھا کام کیا کہ جنت کو بھی ٹھکرا دیا کہ میری محبت تو خالص محبت تھی، اس میں جنت کی لالچ کا کوئی شائبہ نہیں تھا۔

یہ طرز عمل قابل تقلید نہیں:

خوب سمجھ لیں کہ ان بزرگ نے جو طرز عمل اختیار کیا، وہ قابل تقلید نہیں،

کیونکہ غلبہ ءحال میں ان سے یہ عمل سرزد ہوا، اور ''غلبۂ حال'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی خاص کیفیت کا ان پر ایسا غلبۂ ہو جاتا ہے کہ وہ اس میں ایک طرح سے معذور ہو جاتے ہیں اور بزرگوں سے جو کام غلبۂ حال میں صادر ہوتے ہیں، وہ قابل تقلید نہیں ہوتے، اس لئے ان کی تقلید کی تمہیں اجازت نہیں ہوگی کہ تم بھی جنت سے منہ موڑ لو، اور جنت سے بے نیاز ہو جاؤ، اس لئے کہ ہم سے اور آپ سے جو بات مطلوب ہے، وہ اتباع سنت ہے، اور اس کائنات میں اتباع سنت سے کوئی اونچا درجہ پیدا نہیں ہوا، بڑے سے بڑا ولی، بڑے سے بڑا صوفی، بڑے سے بڑا بزرگ اتباع سنت سے آگے کا کوئی درجہ لا نہیں سکتا، اور اتباع سنت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو چیز مانگی ہے، تم بھی مانگو، آپ نے یہ دعا مانگی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُكَ رِضَاكَ وَالۡجَنَّةَ

اے اللہ! میں آپ سے آپ کی رضا مندی بھی چاہتا ہوں،
اور جنت بھی چاہتا ہوں۔

سنت کا مقام بلند ہے:

یہی مقام بلند ہے، کیونکہ یہ عبدیت کاملہ کا مقام ہے، وہ مقام بلند نہیں ہے، جس میں جنت سے استغنائیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اگر چہ بظاہر دیکھنے میں ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ وہ زیادہ اونچی بات ہے، لیکن حقیقت میں وہ کوئی اونچی بات نہیں، اونچی بات وہی ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو، وہ یہ کہ اے اللہ! میں آپ سے جنت طلب کرتا ہوں، ایک اور دعا میں

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اَدْخِلْنِي الْجَنَّةَ بِمَنِّكَ وَ كَرَمِكَ

اے اللہ! اپنے احسان اور کرم کے ذریعہ مجھے جنت میں داخلہ نصیب فرمایا۔

لہٰذا جو لوگ جنت سے بے نیازی برتتے ہیں، وہ غلبۂ حال ہے، قابل تقلید نہیں، بندے کا کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے جنت مانگے۔

فقیر بن کر جنت مانگو:

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ سے جنت ضرور مانگے، لیکن اپنے عمل کی مزدوری کے طور پر نہیں۔ بلکہ اپنے مالک کو کریم آقا، رحمٰن، اور رحیم سمجھ کر مانگے، ایک ہوتا ہے مزدور، جب وہ اپنا کام پورا کر لیتا ہے تو کہتا ہے کہ لاؤ پیسے؟ اس لئے کہ میں نے جو کام کیا تھا، اس کا تقاضہ ہی یہ تھا، لہٰذا اگر تم پیسے دو گے تو یہ تمہارا کوئی احسان نہیں ہے۔ اس لئے کہ میں نے کام کیا، لہٰذا تم پیسے لاؤ۔ اور ایک ہوتا ہے بھکاری، وہ بھی پیسے مانگتا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ میرا حق تو تمہارے اوپر کچھ نہیں ہے، لیکن میں ضرورت مند ہوں، مجھ پر احسان کرتے ہوئے مجھے کچھ دیدو۔ تو دونوں کے مانگنے میں فرق ہوا۔

لہٰذا اللہ تعالیٰ سے جنت کو کام کی مزدوری کے طور پر مت مانگو، بلکہ فقیر بن کر مانگو کہ یا اللہ! میرا حق تو آپ کے اوپر کوئی نہیں آتا، لیکن اپنے فضل و کرم سے مجھے جنت دیدیجئے۔ میں اس کا محتاج ہوں۔ لہٰذا نہ تو یہ بات درست ہے کہ اس جنت کو اپنے عمل کی مزدوری سمجھو، اور نہ یہ بات درست ہے کہ اس جنت سے

آدمی استغناء برتے، اور بے نیازی برتے کہ مجھے جنت نہیں چاہئے۔

نذر ماننا پسندیدہ نہیں

لوگوں میں نذر ماننے اور منت ماننے کا رواج ہے مثلاً میرا بیٹا اچھا ہو گیا تو میں اتنی رکعت نفل پڑھوں گا، میں اگر امتحان میں کامیاب ہو گیا تو اتنے روزے رکھوں گا، میرا فلاں کام ہو گیا تو اتنے روپے صدقہ کروں گا، یا حج کروں گا، یا عمرہ کروں گا، حدیث شریف میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا کہ نذر مت مانو۔ اس سے منع کیوں فرمایا؟ مجھے ایسا لگتا ہے (واللہ سبحانہٗ اعلم) کہ منع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ نذر ماننا اللہ تعالیٰ سے سودہ بازی کرنا ہے کہ اللہ میاں آپ میرا یہ کام کر دیں، میں آپ کا یہ کام کر دوں گا، اور دوسری طرف یہ بات ہو رہی ہے کہ اے اللہ، آپ مجھے فائدہ پہنچا دیں، میں آپ کو فائدہ پہنچا دوں گا، اور اس کے نتیجے میں وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں جو عبادت کروں گا، اس سے اللہ تعالیٰ کا فائدہ ہوگا۔ اس لئے نذر کا معاملہ اللہ جل شانہٗ کے شایان شان نہیں۔ اور بندے کا یہ کام نہیں، البتہ اگر کوئی نذر مان لے گا تو وہ نذر درست ہو جائے گی، اور وہ عبادت اس کے ذمے لازم ہو جائے گی، لیکن یہ نذر ماننا پسندیدہ نہیں۔

کنجوس سے پیسے نکلوانے کا ذریعہ

ایک حدیث میں نذر کے بارے میں ایک جملہ یہ آتا ہے کہ:

اِنَّمَا یُسْتَخْرَجُ بِهٖ مِنَ الْبَخِیْلِ

البتہ کنجوس آدمی سے پیسے نکلوانے کا ایک ذریعہ ہے۔ یعنی آدمی ایسا کنجوس تھا کہ کسی اور صورت میں تو پیسے خرچ نہ کرتا، اب اس کے دماغ میں یہ بات آ گئی کہ

میں اگر نذر مان لوں گا تو میرا یہ کام بن جائے گا، تو اس طرح اللہ میاں کنجوس سے مال نکلوا کر غریب تک پہنچا دیتے ہیں۔ ایک معنی تو اس جملے کے یہ ہوئے، اس جملے کے اندر دوسرے معنی کا بھی احتمال ہے کہ شاید یہ مراد ہو، وہ یہ کہ تم جو یہ نذر مان رہے ہو کہ اگر میرا یہ کام ہو جائے گا تو فلاں عبادت کروں گا، یہ طریقہ تو کسی بخیل سے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ کوئی بخیل آدمی ہو تو اس سے کہو کہ تم مجھے اتنے پیسے دیدو، تو کنجوس ہونے کی وجہ سے وہ پیسے نہیں دے گا، لہٰذا تم اس کو لالچ دیتے ہو کہ میں تمہارا فلاں کام کر دوں گا، تم مجھے اتنے پیسے دیدو۔ لہٰذا یہ نذر ماننا تو کسی بخیل سے مال نکلوانے کا طریقہ ہے۔

جنت کی شرط پر عبادت مت کرو:

یہاں یہ دیکھو کہ تم کس سے رابطہ قائم کئے ہوئے ہو؟ تم کس سے مانگ رہے ہو؟ کیا اس ذات کو تم لالچ دو گے کہ مجھے فلاں چیز دیدیجئے تو میں آپ کے لئے فلاں عبادت انجام دوں گا، ہاں! بغیر شرط کے ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ کے محتاج ہیں، اس سے ہم رزق بھی مانگیں گے، اس سے ہم صحت بھی مانگیں گے، اس سے ہم خوشحالی بھی مانگیں گے، اس سے ہم جنت بھی مانگیں گے، لیکن ہم یہ سب چیزیں فقیر کی طرح مانگیں گے، نہ کہ مزدور کی طرح۔ بس یہ مثال یاد رکھو کہ مزدور کی طرح مانگنا درست نہیں، فقیر کی طرح مانگنا چاہئے کہ یا اللہ ہمارا حق تو آپ پر کوئی نہیں آتا، لیکن آپ اپنے فضل وکرم سے عطا فرما دیجئے اور اس طرح مانگنا ''تفویض'' کے خلاف نہیں۔

یہ وضاحت میں نے اس لئے کر دی کہ جو شروع میں بات کہی تھی کہ جو

کچھ عبادت کرو، وہ جنت کی شرط پر مت کرو، بلکہ بندگی کی وجہ سے کرو۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ، فَإِنْ أَصَابَهُ خَيْرٌ اطْمَأَنَّ بِهِ وَإِنْ أَصَابَتْهُ فِتْنَةُ انْقَلَبَ عَلٰى وَجْهِهِ

(سورۃ الحج: آیت ۱۱)

یعنی بعض لوگ وہ ہیں جو کنارے پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، یعنی عبادت کرنے کے نتیجے میں اگر دنیا کا کوئی فائدہ حاصل ہو گیا تو مطمئن ہو گیا کہ یہ عبادت موافق آگئی ہے، اور اس سے ہمارے کاروبار میں ترقی ہوئی، اور اس سے ہمارے پیسوں میں اضافہ ہوا، اس سے ہماری صحت اچھی ہوگئی، اس سے ہماری اولاد بہتر ہوئی۔ لہٰذا بہت اچھی بات ہے۔ اور اگر کبھی آزمائش آگئی تو عبادت کو چھوڑ کر واپس بھاگ جاتا ہے کہ یہ نماز مجھے موافق نہیں آئی۔

ایک لطیفہ

حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے ایک لطیفہ لکھا ہے کہ ایک مولوی صاحب ایک مرتبہ ایک گاؤں میں چلے گئے، وہاں جا کر گاؤں والوں کو نصیحت کی کہ تم مسلمان ہو، پھر بھی نماز نہیں پڑھتے، وہ لوگ نماز نہیں پڑھتے تھے۔ گاؤں والوں نے پوچھا کہ ہمیں نماز پڑھنے سے کیا فائدہ ہوگا؟ مولوی صاحب نے سوچا کہ اگر میں ان کو جنت کے بارے میں بتاؤں گا تو یہ لوگ نہیں سمجھیں گے، اس لئے مولوی صاحب نے کہا کہ نماز پڑھنے کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ برکت دیں گے۔

انہوں نے پوچھا کہ برکت کیا ہے؟ مولوی صاحب نے کہا کہ تمہارے کاروبار میں برکت ہوگی، تمہارے مال میں برکت ہوگی، اور خوشحالی حاصل ہوگی۔ چنانچہ گاؤں والوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی اور نماز شروع کر دی۔ جب نماز شروع کی تو ایک دیہاتی کی ایک بھینس مرگئی، اس نے جا کر مولوی صاحب سے کہا کہ آپ نے تو کہا کہ برکت ہوگی، یہاں تو نماز پڑھنے سے میری بھینس مرگئی، مولوی صاحب نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش ہوتی ہے، گھبراؤ نہیں اور نماز مت چھوڑنا، چنانچہ وہ نماز پڑھتا رہا، اگلے دن اس کی گائے مرگئی، اب پھر مولوی صاحب کے پاس پہنچ گئے، انہوں نے پھر اطمینان دلا کر رخصت کر دیا، اس دیہاتی کے پاس ایک بکری بھی تھی، اگلے دن وہ میں میں کرنے لگی تو اس دیہاتی نے اس بکری سے کہا کہ خاموش ہو جا، ورنہ ابھی میں وضو کے لئے لوٹا اٹھاتا ہوں۔ اور ان دیہاتیوں نے کہا کہ یہ مولوی دھوکے باز ہے، اس کی بات نہ مانو۔ چنانچہ انہوں نے نماز چھوڑ دی اور پھر جب کسی کو دھمکی دینی ہوتی تو وہ کہتا کہ تو میرا یہ کام کرتا ہے یا نہیں؟ ورنہ اٹھاؤں لوٹا؟ پڑھوں نماز؟............

بہرحال! ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ لوگ ایک کنارے پر کھڑے ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں، اگر اس عبادت کے ذریعہ کوئی دنیاوی فائدہ پہنچ گیا، تب تو ٹھیک ہے، نماز بڑی اچھی ہے، اور اگر کوئی فتنہ اور آزمائش آ گئی تو الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ العیاذ باللہ۔ فرمایا کہ ایسے لوگ دنیا و آخرت دونوں میں خسارے میں ہیں، اس لئے کہ وہ بندگی دنیا کے فائدے کے لئے کر رہا ہے، یہ کسی طرح بھی ٹھیک نہیں۔ بندگی خالص اللہ کیلئے کرو۔

قرآنی آیات اور دنیاوی مقاصد:

اسی وجہ سے ہمارے بزرگوں نے فرمایا کہ آج کل لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ قرض کی ادائیگی کے لئے کونسی سورت پڑھوں؟ اور ملازمت حاصل کرنے کے لئے کونسی آیت پڑھوں؟ اور فقر و فاقہ دور کرنے کے لئے کونسی آیت پڑھوں؟ اور صحت حاصل کرنے کے لئے کونسی آیت پڑھوں؟ اور عام طور پر اس کو روحانی علاج کہا جاتا ہے۔ حالانکہ اس کو روحانی علاج کہنا بالکل غلط ہے، اور اگر کوئی مولوی صاحب ان مقاصد کے لئے کوئی وظیفہ نہ بتائے تو کہتے ہیں کہ اس کو کچھ نہیں آتا، کیونکہ ان کے نزدیک اصل علم یہ ہے کہ مولوی صاحب کو تعویذ گنڈے کرنا آتا ہو، اور اس کو عملیات آتے ہوں اور وہ یہ بتا سکے کہ کونسی سورت کا اور کونسی آیت کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اور ہر سورت کا فائدہ ہوتا ہے۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے ''اعمال قرآنی'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس میں یہ لکھا ہے کہ کس آیت سے کیا فائدہ ہوتا ہے۔

تلاوت کا ثواب نہیں ملیگا

لیکن خوب سمجھ لو کہ قرآن کریم کی جو آیت بھی کسی دنیاوی مقصد کے لئے پڑھی جائے گی اس آیت کے پڑھنے سے تلاوت کا ثواب نہیں ملتا، لہٰذا یہ جو حدیث شریف میں آتا ہے کہ قرآن کریم کے ایک حرف پر دس نیکیاں لکھی جاتی ہیں، یہ نیکیاں اس نیت سے پڑھنے پر نہیں ملیں گی، کیوں؟ اس لئے کہ تم قرآن کریم کی تلاوت اللہ تعالیٰ کی عبادت کے طور پر نہیں کر رہے ہو، بلکہ تم ایک ذاتی اور دنیاوی مقصد کے لئے تلاوت کر رہے ہو، اگرچہ اس طرح تلاوت جائز ہے،

گناہ نہیں، لیکن اس پر تلاوت کرنے کا ثواب نہیں ملے گا، عبادت تو وہ ہے جس کے پیچھے کوئی دنیاوی مقصد نہ ہو، بلکہ عبادت تو محض اس لئے ہو کہ اس کی بندگی کروں، اس کے آگے سر جھکاؤں، تب تو وہ عبادت معتبر ہے، اور دنیاوی مفاد کے لئے عبادت کرنا اخلاص کے خلاف ہے، یہ عبادت نہیں، بلکہ یہ تو سودہ بازی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ان تمام باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰہِ ربِّ العالمین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ (القرآن)

آج کس کی بادشاہت ہے؟......

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (القرآن)

"اللہ ہی کی بادشاہت ہے، جو ایک ہے اور سب پر غالب ہے"

صدق اللہ العظیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفویض کی حقیقت

مجلس نمبر 105

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	105

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تفویض کی حقیقت

مجلس نمبر 105

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلىٰ رسوله الکریم، وعلى آله وأصحابه اجمعین۔ امابعد:

تمہید

گزشتہ کئی سالوں سے رمضان المبارک میں یہ معمول ہے کہ ظہر کی نماز کے بعد حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے ملفوظات کا یہ مجموعہ ''انفاسِ عیسیٰ'' پڑھا کرتے ہیں اور اس کی جو تشریح اللہ تعالیٰ دل میں ڈالتے ہیں، وہ عرض کر دیتا ہوں۔ آج سے یہ سلسلہ شروع کیا جا رہا ہے۔

مگر پہلے دو باتیں سمجھ لیں، ایک یہ کہ مجھے رمضان المبارک میں حرمین شریفین کا ایک سفر در پیش ہوا کرتا ہے، شاید اسی ہفتہ میں کسی دن جانا ہو جائے، اس سفر کے دوران یہ سلسلہ موقوف رہے گا۔

کسی دن ناغہ ہوسکتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ جب کوئی سلسلہ شروع کر دیا جاتا ہے اور اس کا

اعلاج کیا جاتا ہے کہ فلاں وقت میں فلاں آدمی بیان کیا کرے گا تو سارے مجمع میں صرف ایک آدمی ہوتا ہے جو اس اعلان کے بعد پابند ہو جاتا ہے، مثلاً جب میں نے کہہ دیا کہ ظہر کی نماز کے بعد بیان ہوگا تو آپ میں سے کوئی شخص آنے کا پابند نہیں، چاہیں آئیں، چاہیں نہ آئیں، مرضی کے مالک ہیں، نہ آنے کی صورت میں اطلاع دینے کی ضرورت بھی نہیں، لیکن ایک آدمی آنے کا پابند ہے، اس کو ہر حال میں آنا ہے، اور نہ آنے کی صورت میں پہلے سے اطلاع کرنی ہوگی، اطلاع نہ کرنے کی صورت میں لوگوں کو شکایت ہوگی کہ ہم تو اتنی دور سے آئے تھے، لیکن وہ نہیں آیا۔ یہ اس لئے بتادیا کہ میں آپ سے یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ جب اعلان کر دیا تو الحمدللہ اس کی کوشش کرتا ہوں کہ پابندی کروں، لیکن بعض اوقات ایسے حالات پیش آجاتے ہیں کہ کسی سابق اطلاع کے بغیر بھی غیر حاضری کرنی پڑتی ہے۔ اس وجہ سے میں آپ حضرات سے پیشگی معذرت لینا چاہتا ہوں کہ اگر کبھی اچانک بغیر اطلاع کے غیر حاضری ہو جائے تو آپ حضرات اس کو بعید نہ سمجھیں، کیونکہ پورے مہینہ کے لئے پابند ہونا بعض اوقات ناقابل عمل ہوسکتا ہے، کیونکہ بعض اوقات مجھے اچانک کہیں جانا پڑ جاتا ہے، لہٰذا جو حضرات دور سے تشریف لاتے ہیں ان کے ذہن میں یہ بات رہے کہ کبھی ناغہ بھی ہوسکتا ہے۔

اپنے اندر طلب اور پیاس پیدا کرو:

دوسرے یہ بھی ذہن میں رہے کہ اگر کبھی ایسا ہو جائے تو اپنی آمد کو اور آنے کی مشقت اٹھانے کو بیکار نہ سمجھیں، انشاء اللہ، اللہ تبارک وتعالیٰ آنے کی برکت سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور عطا فرمائیں گے، اس لئے کہ فائدہ کوئی آدمی

دوسرے کو نہیں دے سکتا، میرے بس میں کیا ہے جو میں کسی کو فائدہ پہنچا دوں، فائدہ پہنچانے والا تو کوئی اور ہی ہے، عطا کرنے والا تو وہ ہے، وہ جب چاہتا ہے کسی کو عطا فرما دیتا ہے، لہٰذا جب کسی بندے میں خالص طلب صادق ہو تو ان کی سنت یہ ہے کہ ضرور عطا فرما دیتے ہیں، مولانا رومی رحمہ اللہ علیہ و فماتے ہیں:

آب کم جو تشنگی آور بدست

تا بجوشد آب از بالا و پست

یعنی پانی کم تلاش کرو، پیاس زیادہ پیدا کرو، پھر دیکھو گے کہ اوپر نیچے ہر طرف سے پانی اُبلے گا، لہٰذا اگر طلب صادق ہے اور تشنگی موجود ہے تو اللہ جل شانہٗ اپنے فضل و کرم سے کرم فرما ہی دیتے ہیں۔ جب یہ بات ہے تو کسی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ انشاء اللہ کوئی نقصان بھی نہیں ہوگا۔

تصوف کی حقیقت:

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ ''انفاس عیسیٰ'' جو حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، یہ تصوف سے متعلق ہے، تصوف کے حقائق، دقائق اور معارف حضرت والا نے اس میں بیان فرمائے ہیں، تصوف کے بارے میں لوگوں نے خدا جانے کیا کیا تصورات اپنے ذہن میں قائم کئے ہوئے ہیں، تصوف کی حقیقت اگر دیکھو تو وہ ''تزکیہ'' ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں جن چیزوں کو بیان کیا گیا ہے، وہ یہی ''تزکیہ'' ہے، یعنی اخلاق کو پاک صاف کر دینا، گویا کہ ''تصوف'' نام ہے اخلاق کو پاک صاف کرنے کا۔

سارے تصوف کا خلاصہ:

اخلاق کیا ہیں؟ ''اخلاق'' دل کے اندر پیدا ہونے والی صفاتِ باطنی میں کچھ صفات ایسی ہیں جو حاصل کرنے کی ہیں۔ جن کا حاصل کرنا ہر بندے کے لئے ضروری ہے، مثلاً شکر کے موقع پر شکر کرنا ضروری ہے، صبر کے موقع پر صبر کرنا ضروری ہے، تواضع اختیار کرنا ضروری ہے، اخلاص اختیار کرنا ضروری ہے، یہ سب دل کے اعمال ہیں، ان کا حاصل کرنا ضروری ہے، ان کو ''اخلاقِ فاضلہ'' اور ''اخلاقِ حسنہ'' اور فضائل کہا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف بعض صفات باطنی وہ ہیں، جن سے بچنا ضروری ہے، مثلاً تکبر سے بچنا ضروری ہے، ریاکاری سے بچنا ضروری ہے، حسد سے بچنا ضروری ہے، بغض سے بچنا ضروری ہے، یہ سب صفات حرام ہیں۔ ان کو ''اخلاق رذیلہ'' اخلاق سیئہ اور ''رذائل'' کہا جاتا ہے، فضائل کا حصول اور رذائل سے اجتناب کرنا، بس یہ سارے تصوف کا خلاصہ ہے۔

شیخ سے تعلق کا مقصد:

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی پیر صاحب کے پاس جائیں گے اور وہ پھر ہمیں کوئی وظیفہ پڑھنے کے لئے بتائیں گے، وہ وظیفہ پڑھتے رہیں گے، اس کے نتیجے میں اچھے خواب آنے لگیں گے، اس کے بعد کشف ہونے لگیں گے، اور الہام ہونے لگے گا۔ حالانکہ ان سب چیزوں کا تصوف کی حقیقت میں کوئی دخل نہیں، اصل چیز یہ ہے کہ اچھے اخلاق پیدا ہو جائیں اور برے اخلاق دور ہو جائیں۔ اور کسی پیر کے پاس جانے کا مقصد بھی یہ ہے کہ وہ اچھے اخلاق حاصل کرنے کی مشق کرائے اور برے اخلاق سے بچنے کی مشق

کرائے، اور ساری باتیں تو اس عمل کے لئے مد اور معاون ہیں۔ مثلاً پیر صاحب نے کوئی وظیفہ بتا دیا کہ یہ ذکر کیا کرو، تو ذکر کرنے سے طبیعت میں ایک صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اصل مقصد فضائل کا حصول اور رذائل سے بچنا ہے، جب یہ مقصود ٹھہرا تو سب سے پہلے ''فضائل'' کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ فضائل کیا ہیں، جن کو حاصل کرنا ہے، اور وہ رذائل کیا ہیں جن سے بچنا ہے۔

گزشتہ سال کے بیانات:

گزشتہ سال رمضان المبارک میں ''فضائل'' کے بارے میں کچھ باتیں عرض کی تھیں، اور ان فضائل میں سے پورے مہینے میں جن کا بیان ہوا تھا۔ وہ خوف و رجا کا بیان، صبر کا بیان، تقویٰ کا بیان، اور صبر کی حقیقت، اس کے مدارج اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ، پھر شکر کا بیان، اور اس کو حاصل کرنے کا طریقہ اور پھر اس کے بعد ''تفویض اور توکل'' کا بیان شروع ہوا تھا، جو درمیان میں رہ گیا تھا، یہاں تک کہ رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہو گیا تھا۔

تفویض کے معنی:

''تفویض'' اور ''توکل'' یہ دو لفظ ہیں، اور یہ دونوں ملتے جلتے الفاظ ہیں، لیکن حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے، اور دونوں مطلوب ہیں، اور دونوں کو حاصل کرنا چاہئے، ''تفویض'' کے معنی ہیں سونپ دینا اور سپرد کر دینا، جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے اپنے اختیارات فلاں شخص کے سپرد کر دیئے، یعنی اس کے حوالے کر دیئے، اسی طرح کسی شخص کو اپنا نمائندہ بنا دینا، آپ نے کسی شخص سے کہا کہ یہ سامان لے جا کر بازار میں فروخت کر دو، گویا کہ

آپ نے اس کو اپنا وکیل بنا دیا، اور یہ کام اس کے سپرد کر دیا۔

اپنا ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دے:

''تصوف'' کی اصطلاح میں ''تفویض'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے سارے معاملات اللہ جل شانہٗ کے سپرد کر دے، اور یہ کہے کہ یا اللہ! میں نہیں جانتا کہ کیا چیز میرے حق میں بہتر ہے، آپ ہی بہتر جانتے ہیں، آپ ہی میرے لئے فیصلہ فرمائیے، اس کو ''تفویض'' کہتے ہیں:

سپردم بتو مایۂ خویش را
تو دانی حسابِ و کم و بیش را

اے اللہ! میں نے اپنا سب معاملہ آپ کے سپرد کر دیا، آپ اچھا برا، کم زیادہ، یہ سب آپ بہتر سمجھتے ہیں، میں نہیں سمجھتا، یہ ہے ''تفویض''۔ اور یہ مقصود اور مطلوب ہے، ہر انسان کو چاہئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تفویض کا معاملہ رکھے، اور اپنا ہر معاملہ اللہ کے سپرد کر دے۔

''تفویض'' کی ضد ہے ''تجویز''۔ یعنی اپنی طرف سے انسان یہ فیصلہ کر لے کہ یہ معاملہ اس طرح ہونا چاہئے، یہ ہے ''تجویز'' اور اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں اپنی تجویز چلانا اچھی بات نہیں۔ مثلاً ایک شخص روزی کمانے کے لئے گھر سے نکلا، اب ایک صورت تو یہ ہے کہ آدمی اللہ سے دعا کرے اور اسباب تلاش کرے کہ کونسی روزی میرے لئے بہتر ہے، اور تلاش کے بعد دس جگہوں پر ملازمت کے لئے درخواست دیدی، اور پھر اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا کہ جہاں اللہ تعالیٰ میرے لئے بہتر سمجھیں گے وہاں میری ملازمت لگ جائے گی، اور دعا کر لی کہ یا اللہ ان میں سے جو ملازمت میرے حق میں بہتر ہو، اس کو میرے لئے

مقرر فرما دیجئے، میں نہیں جانتا کہ کونسی ملازمت میرے لئے بہتر ہے، یہ ''تفویض'' ہوئی۔

اپنی طرف سے تجویز کرنا اچھا نہیں:

دوسری صورت یہ ہے کہ آپ نے خود ہی یہ فیصلہ کرلیا اور طے کرلیا کہ ان دس ملازمتوں میں سے یہ ملازمت مجھے ہر حال میں لینی ہے اور کوئی ملازمت نہیں لینی، اگر مل جائے تو بڑے خوش، کہ اپنے مطلب کی ملازمت مل گئی اور اگر وہ ملازمت نہیں ملی تو اس پر بڑا رنج اور بڑا صدمہ اور بڑی پریشانی ہو رہی ہے، اللہ تعالیٰ سے شکوہ ہو رہا ہے کہ یا اللہ، میں آپ سے یہ ملازمت مانگ رہا تھا، آپ نے یہ ملازمت نہیں دی، یہ ہے ''تجویز'' اور تجویز بری بات ہے، اور اس سے اپنے آپ کو بچانا چاہئے، اور تفویض اچھی بات ہے، اس کو حاصل کرنا چاہئے۔

تفویض کا واجب درجہ:

''تفویض'' کا ایک درجہ تو واجب ہے، اور اس کی ضد حرام ہے، اور ایک درجہ مستحسن اور مستحب ہے، کہ اگر حاصل ہو جائے تو بڑی اچھی بات ہے، انسان اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے، اگر حاصل نہ ہو تو اس سے آدمی گناہ گار نہیں ہوتا، ''تفویض'' کا واجب درجہ یہ ہے کہ آدمی کو اس حد تک تفویض کرنا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر اعتراض اور شکوہ پیدا نہ ہو، جیسا کہ میں نے ابھی مثال دی کہ ایک آدمی نے یہ فیصلہ کرلیا کہ مجھے تو یہ ملازمت ملنی ہی چاہئے تھی، جب وہ نہیں ملی تو اب شکوہ ہو رہا ہے کہ یا اللہ! میں نے تو آپ سے یہ ملازمت مانگی تھی، لیکن آپ نے مجھے نہیں دی۔ اب اعتراض ہو رہا ہے کہ اللہ

تعالیٰ نے میری مرضی کے مطابق کام نہیں کیا، اور جب اعتراض اور شکوہ پیدا ہو جائے تو یہ ''تفویض'' کے واجب درجہ کی خلاف ورزی ہے، اور گناہ کے اندر داخل ہے۔

تفویض کا مستحب درجہ:

ایک درجہ ''تفویض'' کا اس سے آگے کا ہے، وہ درجہ واجب تو نہیں، لیکن اگر حاصل ہو جائے تو نعمت ہے، وہ یہ کہ اپنی طرف سے دل میں کسی چیز کی تجویز نہ ہو، اور بلکہ اپنی تجویز بالکل فنا کردے۔ یعنی اپنا نہ کوئی مطالبہ ہے، نہ کوئی ارادہ ہے، نہ کوئی خواہش ہے، چاہے یہ ملازمت مل جائے، یا دوسری ملازمت مل جائے، میری طرف سے کوئی خواہش نہیں۔ بلکہ جو ملازمت آپ دلوادیں، وہی میرے لئے بہتر ہے، یا بیمار ہو جائے تو اب سنت کے مطابق علاج شروع کر دیا، اب اگر آپ مجھے شفاء دیدیں تو وہ آپ کی نعمت، اگر شفاء نہ دیں تو کوئی شکوہ نہیں، کیونکہ اپنی طرف سے میری کوئی خواہش ہی نہیں، ''تفویض'' کا یہ درجہ واجب نہیں، اور ہر ایک کے بس کی بات بھی نہیں، لیکن اگر یہ درجہ حاصل ہو جائے تو نعمت ہے۔

حضرت ذوالنون مصری کا خوبصورت جواب:

حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا کہ کیسے مزاج ہیں؟ کیا حال ہے؟ فرمایا کہ اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ کائنات میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ میری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اس شخص کی زندگی کے لطف کا کیا عالم ہوگا کہ کائنات

میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے، ہر کام اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے، کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں۔...... لوگوں نے کہا کہ حضرت! یہ کیسے ہوگیا؟ یہ بات تو پیغمبروں کو بھی حاصل نہیں ہوئی کہ جو چاہا، وہ ہو جائے، جواب میں حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ یہ اس طرح ہوگیا کہ میں نے اپنی مرضی کو اللہ تعالیٰ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کی مرضی، وہ میری مرضی ہے، اور کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اللہ کی مرضی سے ہو رہا ہے، گویا کہ میری مرضی سے ہو رہا ہے۔ اگر میں صحت مند ہوں تو اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوں، لہٰذا میری مرضی بھی یہی ہے، اگر میں بیمار ہوں تو اللہ تعالیٰ کی مرضی سے ہوں، اس بیماری میں بھی میں خوش ہوں، اور راضی ہوں۔ اگر ان کی مرضی یہ ہے کہ میں بھوکا رہوں، میں بھی اس پر راضی ہوں۔ اس لئے کہ میں نے اپنی تجویز فنا کر دی ہے۔

ترک تمنا میں سکون ہے:

میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم کا ایک خوبصورت شعر ہے کہ:

سکون ترک تمنا میں پالیا میں نے
قدم رکے تھے کہ منزل کو جالیا میں نے

پریشانی کہاں سے پیدا ہو رہی ہے؟ تمناؤں سے، آرزوؤں سے، دل میں تمنائیں اور آرزوئیں بھری ہوئی ہیں کہ مجھے یہ مل جائے، مجھے دولت مل جائے، مجھے فلاں چیز مل جائے، مجھے عزت مل جائے، مجھے شہرت مل جائے۔ مجھے عہدہ مل جائے، مجھے منصب مل جائے، یہ سب آرزوئیں پیدا ہو رہی ہیں، اور

جب یہ چیزیں نہیں مل رہی ہیں تو اس پر تکلیف ہو رہی ہے، رنج اور صدمہ ہو رہا ہے، پریشانی ہو رہی ہے۔ اگر انسان تمنا ہی ترک کر دے کہ دل میں کسی چیز کی کوئی تمنا ہی نہیں۔ نہ دولت کی تمنا، نہ شہرت کی تمنا، نہ مقبولیت کی تمنا، نہ پیسوں کی تمنا، نہ عہدہ اور منصب کی تمنا، ساری تمنائیں ختم کر دیں، اور جب تمنائیں ہی ختم کر دیں تو اب کس بات پر رونا؟ رونا ختم ہو گیا، اور سکون حاصل ہو گیا۔

سکون، ترک تمنا میں پالیا میں نے
قدم رُکے تھے کہ منزل کو جالیا میں نے

یعنی تمنا کرنے سے جہاں قدم روک دیے وہیں منزل مل گئی۔

نہ خواہش، نہ پریشانی:

یہ بات اللہ کے بندوں میں پیدا ہو جاتی ہے کہ ان کے دل میں کوئی خواہش نہیں ہوتی، کیونکہ اپنی ساری خواہشوں کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا، جب کوئی خواہش نہیں، تو صدمہ بھی کوئی نہیں۔ کیونکہ صدمہ تو خواہش کے پورا نہ ہونے سے ہوتا ہے، جب خواہش ہی کوئی نہیں تو صدمہ کس چیز کا؟ اس لئے کوئی پریشانی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے بندے پیدا فرمائے ہیں اور ان کو یہ مرتبہ عطا فرمایا ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ! آپ کے فیصلے اور آپ کی رضا میں اپنی ہر خواہش مٹا دی ہے۔

نتیجہ اللہ کے حوالے کر دو:

یہ جو مقام ہے کہ خواہشات ہی ختم ہو جائیں، خواہشات فنا کر دے، تو بات دراصل یہ ہے کہ خواہشات دل میں پیدا تو ہوتی ہیں، اس لئے کہ انسان ہے،

اور انسان ہونے کے ناطے خواہش پیدا ہوگی، لیکن اس خواہش کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا، اس وجہ سے وہ خواہش کالعدم ہوگئی، ''تفویض'' کا یہ درجہ حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، اور اللہ تعالیٰ نے اس کو واجب بھی نہیں فرمایا، البتہ واجب یہ ہے کہ جو کوئی کام کرو، اس کا نتیجہ اللہ کے حوالے کر دیا کرو، اور یہ دعا کیا کرو کہ:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا الْجُهْدُ وَ عَلَيْكَ التُّكْلَان

اے اللہ! میں نے اپنی سی کوشش کر لی، باقی معاملہ آپ کے حوالے ہے۔ اب آپ پر بھروسہ ہے، آپ جو فیصلہ فرمائیں گے میں اس پر راضی ہوں۔

دعا کی قبولیت اللہ کے حوالے کر دو:

یہاں تک کہ دعا کرنے میں بھی یہی تفویض اختیار کرو، اور کاموں میں تو ''تفویض'' کرتے ہی ہو، مثلاً بیماری کے اندر علاج شروع کیا، اور دوا استعمال کی، لیکن نتیجہ اللہ کے حوالے کر دیا، اسی طرح ملازمت تلاش کی، درخواست دیدی، اور نتیجہ اللہ کے حوالے کر دیا، اسی طرح دعا کرنے میں بھی ''تفویض'' اختیار کرو، اللہ تعالیٰ سے دعا کرو، اور اس کے قبول ہونے اور نہ ہونے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دو، اور دعا ہی کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰهُمَّ هٰذَا الْجُهْدُ وَ عَلَيْكَ التُّكْلَان

یا اللہ! میں جتنا آپ سے مانگ سکتا تھا، اتنا مانگ لیا، آپ کی بارگاہ میں اپنا قضیہ پیش کر دیا، اب فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے، آپ جو فیصلہ کریں گے مجھے

وہ فیصلہ منظور ہوگا، چاہے وہ فیصلہ میری خواہش کے مطابق ہو، چاہے وہ فیصلہ میری خواہش کے خلاف ہو، لیکن مجھے منظور ہے، اسی کا نام ''تفویض'' ہے۔ دوسرا لفظ جو یہاں لائے ہیں وہ ہے ''توکل'' توکل کے معنی ہیں: اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنا، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ جو کچھ دنیا میں ہو رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کر رہے ہیں، اسباب کے اندر یہ طاقت نہیں کہ وہ یہ سب کام انجام دے سکے، بہرحال! تفویض اور ''توکل'' میں تھوڑا سا فرق ہے، اس کی تفصیل انشاء اللہ کل عرض کروں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخردعوانا ان الحمد لِلّٰہِ ربِّ العالمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کثرتِ تکرار سے عمل آسان ہوجاتا ہے

مجلس نمبر 106

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط وترتیب

محمد عبداللہ میمن

استاذ جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی.

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 106

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کثرت تکرار سے عمل آسان ہو جاتا ہے

مجلس نمبر 106

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ کل من تبعھم باحسان الیٰ یوم الدین۔ امابعد:

تمہید

گزشتہ کل ''تفویض'' کا بیان شروع کیا تھا کہ ''تفویض'' کے معنی ہیں کہ اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دینا اور دوسری چیز ''توکل'' یعنی اللہ جل شانہ پر بھروسہ کرنا، یعنی یہ سمجھنا کہ اس کائنات میں جو کچھ ہوگا، وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق ہوگا، اس کی اجازت سے ہوگا، اور وہی سب کچھ کرنے والا ہے، اسباب کے اندر اپنی ذات میں کوئی طاقت نہیں، یہ اعتقاد ''توکل'' کہلاتا ہے، چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے پہلے ملفوظ میں یہ ارشاد فرمایا کہ:

''خدا کی تجویز میں اپنی تجویز کو فنا کر دو، ابتداء میں تو اہل اللہ کی یہ حالت تکلف کے ساتھ حاصل ہوتی ہے، خدا تعالیٰ کی

حکمت اور قدرت کو سوچ سوچ کر اپنے ارادہ و تجویز کو فنا کرنا پڑتا ہے، پھر یہ حالت ان کے لئے امر طبعی بن جاتی ہے۔''

(انفاس عیسیٰ ص ۲۱۷)

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ''تفویض'' کے معنی ہی یہ ہیں کہ اپنی تجویز کو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر فنا کر دیا۔ میں کچھ نہیں جانتا کہ میرے کے لئے کیا بہتر ہے، کیا بہتر نہیں، میں تو اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر چکا ہوں، وہ جس میں میرے لئے بہتری قرار دیں گے، وہی میرے لئے بہتر ہوگا، میں اسی پر راضی ہوں، اور اسی پر مطمئن ہوں، اس کا نام ''تفویض'' ہے۔

یہ جو فرمایا کہ اپنے سارے معاملات اللہ کے حوالے کر دو، اور یہ یقین رکھو کہ جو کچھ فیصلہ ہوگا، وہی میرے حق میں بہتر ہے، اور اسی پر میں مطمئن ہوں۔ اس حالت کو حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ باری تعالیٰ کی قدرت اور اس کے علم کا مراقبہ کرو اور یہ مراقبہ کرو کہ مجھے کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہونے والا ہے، آئندہ کیا حالات پیش آنے والے ہیں؟ اللہ جل شانہ عالم الغیب ہیں، اللہ جل شانہ کو سب کچھ پتہ ہے، جب آدمی اس بات کا مراقبہ کرے گا کہ مجھے تو کچھ پتہ ہے نہیں، اے اللہ! آپ کو سب پتہ ہے، اور ظاہر ہے کہ کام اسی کے حوالے کرنے چاہئیں، جس کو پتہ ہے کہ کس کام میں خیر ہے، اور کس کام میں خیر نہیں، چنانچہ استخارہ کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعا بتائی، اس میں یہ الفاظ ہیں کہ:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَخِيْرُكَ بِعِلْمِكَ، وَاَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ،
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ، اَللّٰهُمَّ اَنْتَ تَعْلَمُ وَلَا اَعْلَمُ، وَاَنْتَ

تَقْدِرُ وَلَا اَقْدِرُ۔

یعنی اے اللہ! آپ کو علم ہے، مجھے علم نہیں، آپ کو قدرت حاصل ہے، مجھے قدرت حاصل نہیں، آپ ہی علام الغیوب ہیں۔ اس کا مراقبہ کرو، جب تم اس کا مراقبہ کرو گے تو خود بخود ''تفویض'' کی طرف طبیعت چلے گی، یہ ہے ''تفویض'' حاصل کرنے کا طریقہ۔

حصول تفویض کا دوسرا طریقہ:

حضرت والا نے فرمایا کہ:

اپنے ارادے کو خدا کے ارادے کے تابع کردیں کہ جو کچھ ہوگا ہم اس پر راضی ہیں، اس پر عمل شروع کردیجئے، اور برابر کرتے رہیئے، انشاء اللہ ایک دن ملکۂ راسخہ پیدا ہوجائے گا، اور اسی سے راحت حاصل ہوگی، بدون اس کے راحت نہیں مل سکتی، اور یہ کچھ مشکل نہیں، کیونکہ کثرت تکرار سے سب کام آسان ہوجاتے ہیں، دیکھئے، آج کل جو لوگ پختہ حافظ ہیں، وہ پہلے ہی دن سے پختہ نہیں ہوئے، بلکہ کثرت تکرار سے پختہ بنے ہیں، یا آج جو خوش نویس ہے، وہ کثرت مشق ہی سے خوش نویس ہوا ہے۔ اسی طرح کثرت تکرار سے تفویض حاصل ہوجائے گی، یہی عین عبدیت ہے، اور بندگی ہے، غلام کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۷)

یعنی ''تفویض'' حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بار بار یہ بات علم میں لاتے رہو کہ جو کچھ ہوگا وہ اللہ کی مرضی سے ہوگا اور میں اللہ کی مرضی پر راضی ہوں، بار بار یہ بات دل میں لاتے رہو، لاتے رہو، رفتہ رفتہ یہ چیز حالت ''تفویض'' بن جائے گی، اور پھر یہ حالت آگے چل کر ''مقام'' میں تبدیل ہو جائے گی۔ یعنی پھر اس کو مستقل طور پر یہ استحضار رہے گا کہ میں نے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کر رکھا ہے، جو کچھ ان کی طرف سے فیصلہ ہوگا، وہی حق ہے اور میں اس پر راضی ہوں۔

کثرت تکرار کا فائدہ:

پھر فرمایا کہ یہ کثرت تکرار، یعنی اس بات کو بار بار دل میں لانا، اور اس کی طرف دھیان کرنا، یہ چیز ''مقام'' پیدا کر دے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تکرار کے اندر بڑی عجیب خاصیت رکھی ہے۔ دیکھئے قرآن کریم میں ایک ہی بات بار بار آئی ہے۔ مثلاً "اَقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ" کا لفظ ۶۲ مرتبہ آیا ہے، حالانکہ صرف ایک مرتبہ ہی کہنا کافی تھا کہ ''نماز قائم کرو'' اور ایک مرتبہ کہنے کی وجہ سے بھی نماز ہمارے اوپر اسی طرح فرض ہو جاتی جس طرح اب ۶۲ مرتبہ کے بعد فرض ہے، ۶۲ مرتبہ کہنے کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ ایک جگہ قرآن کریم میں بیان کر دیتے، بس وہ کافی تھا، لیکن کئی مرتبہ ان کا قصہ بیان فرمایا۔ تو قرآن کریم میں مختلف باتوں کا تکرار ہے، ایک ہی بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے، ایسا کیوں کیا؟ اس لئے انسان کی خاصیت یہ ہے کہ جو چیز اس کے کان میں بار بار پڑتی رہتی ہے، وہ بات دل میں راسخ ہو جاتی ہے، قرآن کریم میں تکرار کا یہی راز ہے۔

آج پبلیسٹی کا دور ہے:

آج ''پبلسٹی'' ایک مستقل فن بن گیا ہے، گوبلز کہتا تھا کہ ''جھوٹ اتنی کثرت سے بولو کہ دنیا اس کو سچ سمجھنے لگے'' یعنی جھوٹ اتنے دھڑلے سے، اتنے اعتماد سے بولو اور بار بار بولو کہ لوگ اس کو سچ سمجھنے لگیں کہ یہ بات سچ ہے۔ یہ ہمارے ہاں جو چائے پی جاتی ہے، یہ ابتداء انگریزوں نے چلائی تھی، ابتداء انگریزوں نے یہ کیا کہ مختلف راستوں میں چوراہوں پر ریڑھیاں لگوائیں، اور ان ریڑھیوں پر چائے پکنے لگی، اور لوگوں کو مفت پلانی شروع کردی، اور اس زمانے میں یہ جملہ جاری کردیا کہ:

''گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے''

ہر جگہ یہ جملہ لکھ دیا، دیواروں پر، مکانات پر، اخبارات میں، اشتہارات میں یہ جملہ جاری کردیا، یہ بالکل جھوٹی بات تھی، اس کی کوئی حقیقت نہیں تھی، لیکن اس جملے کو اتنی کثرت سے پھیلایا کہ وہ ایک حقیقت بن گئی، اور لوگوں نے یہ محسوس کرنا شروع کردیا کہ واقعتاً گرمیوں میں گرم چائے ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ رفتہ رفتہ لوگ چائے کے عادی ہوگئے، اب چائے کے بغیر گزارہ نہیں۔ اگر چائے نہیں پی تو کچھ بھی نہیں پیا، بلکہ سر میں درد ہوگا۔ طبیعت خراب ہوگئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ کثرت سے بار بار پینے سے اس کے عادی ہوگئے۔

انسان عادی کیسے بنتا ہے؟

جتنی بھی چیزوں کے لوگ عادی ہوتے ہیں، اگر غور کرو تو یہ نظر آئے گا وہ بالکل بے مزہ چیزیں ہیں۔ جیسے لوگ تمباکو کے عادی ہیں، اور یہ ایسا بدمزہ ہوتا

ہے کہ جس نے کبھی تمباکو نہ کھایا ہو، اس کو تمباکو کھلاؤ تو اس کو قے ہو جائے گی۔ لیکن جب تمباکو کی عادت پڑ گئی تو اب اسی میں مزہ آنے لگا، اور اب اس کے بغیر گزارہ نہیں۔ اسی طرح لوگ ''قہوہ'' کے عادی بن جاتے ہیں۔ میں نے سب سے پہلے زندگی میں جب قہوہ پیا تو بہت کڑوا لگا، واقعہ یہ ہوا کہ ایک مرتبہ کراچی میں قطر کے کوئی شیخ آ گئے، انہوں نے دارالعلوم کے کچھ طلباء کی دعوت کی تو ہم لوگ اس دعوت میں گئے تو سب سے پہلے ہمارے سامنے ایک چھوٹے سے فنجان میں قہوہ لایا گیا، جو مقدار میں بہت تھوڑا سا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اس کا پہلا گھونٹ منہ میں لیا تو فوراً سر میں درد شروع ہو گیا، وہ اتنا کڑوا لگا کہ اس ایک گھونٹ کو حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا، میں سوچنے لگا کہ یا اللہ، یہ لوگ کس طرح اس کو مزے لے کر پیتے ہیں۔ لیکن بعد میں جب عربوں کے ساتھ زیادہ اٹھنا بیٹھنا ہوا تو اب ہر دعوت میں سامنے قہوہ آ رہا ہے، رفتہ رفتہ اس کو پینا شروع کیا تو اب پیتے پیتے اچھا لگنے لگا، اور اب اس کو پینے میں بڑا لطف محسوس ہوتا ہے۔

نفس کو عبادت کا عادی بناؤ:

اسی طرح جتنی عبادات ہیں، جتنی طاعات ہیں، یا اللہ تبارک وتعالیٰ نے جتنے اخلاق فاضلہ پیدا فرمائے ہیں، وہ بھی درحقیقت اس طرح حاصل ہوتے ہیں کہ شروع میں یہ کڑوے لگتے ہیں، بدمزہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن جب انسان بار بار ان اعمال کو کرتا ہے تو رفتہ رفتہ اس کا عادی بن جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اس کے دل میں ان اعمال واخلاق کی ایسی محبت پیدا فرما دیتے ہیں کہ پھر اس انسان کو اس عمل کے بغیر چین نہیں آتا۔ .... مثلاً ایک آدمی بے نمازی ہے، اگر اس سے کہا جائے تو نماز پڑھ تو اس کے لئے نماز پڑھنے سے زیادہ بھاری کام کوئی اور نہیں

ہوگا۔ لیکن ایک شخص سے بار بار نماز پڑھوائی، یہاں تک اس کی عادت بن گئی، اب اگر وہ نماز نہ پڑھے تو اس کو چین نہیں آتا۔ اگر عشاء کی نماز نہیں پڑھی تو رات کو نیند نہیں آئے گی، اس لئے کہ اس کو عبادت کی عادت ہوگئی ہے۔

مشق سے تفویض حاصل ہو جائیگی:

یہی بات حضرت والا بیان فرما رہے ہیں اور یہ تصوف کا بڑا عجیب راز ہے، کہ جو کام حاصل ہوتا ہے وہ کثرت تکرار سے حاصل ہوتا ہے، بار بار کرنے سے حاصل ہوتا ہے، مشق کرنے سے ہوتا ہے، اسی طرح یہ ''تفویض'' بھی اگر حاصل ہوگی تو وہ مشق سے حاصل ہوگی، وہ یہ کہ بار بار ہر معاملے میں یہ کہو کہ:

أُفَوِّضُ اَمْرِیْ اِلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیْرٌ بِالْعِبَادِ

میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دیکھنے والے ہیں۔

بار بار دل میں یہ خیال لاؤ کہ میں نہیں جانتا ہوں، اللہ تعالیٰ جاننے والے ہیں، میری قدرت میں کچھ نہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں سب کچھ ہے اور مجھے پتہ نہیں کہ کس کام میں خیر ہے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ کس کام میں خیر ہے، لہٰذا میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، وہ جو فیصلہ کریں گے، وہ میرے حق میں بہتر ہوگا۔ جب بار بار یہ خیال دل میں لاؤ گے تو کثرت تکرار سے ''تفویض'' حاصل ہو جائے گی۔

بے حقیقت بندہ کیا تجویز کرے:

''یہی عین عبدیت ہے اور بندگی ہے، غلام کو ایسا ہی ہونا چاہئے'' یعنی

انسان تو ''بندہ'' ہے، اور بندہ اپنے آقا سے کیا تجویز کرے، بلکہ دنیا کے اندر تو غلام اور آقا دونوں انسان ہوتے ہیں، جیسی غلام کی عقل ہے، ویسی ہی آقا کی عقل ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ غلام کے اندر عقل آقا کے مقابلے میں زیادہ ہو، لیکن یہاں تو وہ نسبت بھی نہیں، بلکہ یہاں تو بندہ اور خدا کی نسبت ہے، اب یہ بے حقیقت، بے علم، چھوٹا سا بندہ، جس کے پاس نہ علم ہے، نہ قدرت ہے، وہ کیا اللہ میاں کو تجویز پیش کرے کہ اللہ میاں آپ ایسا کر دینا۔ لہٰذا تجویز تو اللہ ہی کی ہے، اور فیصلہ انہی کا ہے، مشیت انہی کی کارفرما ہے۔ ہاں! بے علمی کی وجہ سے ہم صدمہ بھی کرتے ہیں، کوئی واقعہ پیش آیا، اس پر صدمہ ہو رہا ہے، یہ صدمہ بے علمی کی وجہ سے ہو رہا ہے، اگر حقیقی علم ہمیں ہوتا تو پھر صدمہ نہ ہوتا۔

مفوّضِ کامل کی پہچان:

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

> ''مفوّض کامل وہ ہے کہ اگر عمر بھر اس کے کان میں یہ آواز آئے کہ "اِنَّکَ مِنْ اَھْلِ الْجَنَّۃِ" یا یہ آواز آئے کہ "اِنَّکَ مِنْ اَھْلِ النَّارِ" تو کسی وقت بھی عمل میں ذرہ برابر بھی کمی نہ کرے، بلکہ بدستور کام میں لگا رہے، نہ پہلی آواز سے بے فکر ہو، نہ دوسری آواز سے دل برداشتہ ہو۔
>
> (انفاس عیسیٰ ص ۲۱۸)

فرمایا کہ ایک شخص کے کان میں مسلسل یہ آواز آرہی ہے، یعنی اس کو الہام ہو رہا ہے کہ تو جنتی ہے، تو یہ آواز سن کر عمل میں کوئی فرق نہیں واقع ہونا

چاہئے ـــــ یہ نہیں کہ جب میں جنتی ہوگیا تو اب مجھے عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے اور یہ سوچ کر عمل چھوڑ دے ـــــ یا خدانہ کرے یہ آواز آجائے تو جہنمی ہے، تو اس وقت بھی اپنے عمل کو نہ چھوڑے، اور یہ نہ سوچے کہ جب جہنم ہی میں جانا ٹھہرا تو اب کیا نماز پڑھوں، کیا روزے رکھو ـــــ حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اگر مسلسل یہ آواز آتی رہے تب بھی عمل میں کوئی فرق واقع نہ ہو۔ بلکہ عمل میں لگا رہے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

مولانا رومی رحمہ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کا واقعہ بیان فرمایا ہے کہ ایک بزرگ روزانہ تہجد میں اٹھا کرتے تھے، ایک مرتبہ معمول کے مطابق تہجد کی نماز کے لئے اٹھے، وضو کے لئے لوٹا اٹھایا، اس میں پانی بھرا، جب وضو کے لئے بیٹھنے لگے تو کان میں ایک آواز آئی کہ ''نہ تیرا اٹھنا قبول ہے، نہ تیرا وضو قبول ہے، نہ تیری نماز قبول ہے، نہ تیرا تہجد قبول ہے'' ـــــ شاگرد بھی ساتھ تھا، اس نے بھی یہ آواز سنی ـــــ اس کے بعد انہوں نے اطمینان سے وضو کیا، تہجد ادا کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے، اور روزانہ کا جو معمول تھا، وہ پورا کیا ـــــ اگلی رات کو جب اٹھے تو پھر وہی آواز آئی کہ نہ تیرا اٹھنا قبول، نہ تیرا وضو قبول، نہ تیری نماز قبول، نہ تیرا تہجد قبول، کچھ قبول نہیں۔ سننے کے بعد اطمینان سے وضو کیا، نماز پڑھی، اور اسی شان سے تہجد کی نماز ادا کی جس شان سے روزانہ پڑھا کرتے تھے، تیسری رات کو جب تہجد کے لئے اٹھے تو پھر وہی آواز آئی تو شاگرد جو روزانہ یہ آواز سن رہا تھا، اس نے کہا کہ حضرت! آپ یہ آواز روزانہ سن رہے ہیں کہ آپ کی کوئی عبادت قبول نہیں، تو اب خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے اور محنت کرنے کا کیا فائدہ؟ جواب

میں ان بزرگ نے فرمایا کہ میاں! ٹھیک ہے کہ وہ فرمار ہے ہیں کہ یہ عبادت قبول نہیں، لیکن اور کوئی دروازہ ہوتو بتادو، وہ قبول کریں تو، نہ قبول کریں تو، مجھے وہیں جانا ہے۔ جانے کے لئے میرے پاس کوئی اور جگہ نہیں ہے، اسی دروازہ پر پیشانی ٹیکنی ہے، اسی کے سامنے رونا ہے، اسی سے مانگنا ہے ـــــ جب ان بزرگ نے یہ کہا تو پھر آواز آئی:۔

قبول ست قبول ست گرچہ ہنرنیست
کہ جز ما پناہ دگر نیست

اگرچہ تیرے پاس ہنر تو نہیں تھا، لیکن اب سب کچھ تیرا قبول ہے، تیرا وضو بھی قبول، تیری نماز بھی قبول، تیری تہجد بھی قبول۔ چونکہ تم نے اس بات کا اقرار کرلیا کہ ہمارے علاوہ کوئی پناہ کی جگہ میرے پاس نہیں ہے۔

بندگی کی شان یہی ہے:

حضرت والا فرمارہے ہیں کہ اگر تمہیں یہ پتہ چل جائے کہ تم جنتی ہوتو تمہارے عمل میں کوئی فرق نہ ہونا چاہئے، اور اگر تمہیں یہ پتہ چل جائے کہ تم جہنمی ہوتو عمل میں کوئی کمی نہ ہونی چاہئے۔ اگر یہ پتہ چل جائے کہ عبادت قبول نہیں ہو رہی ہے تو بھی عمل میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے، بلکہ جیسے پہلے عبادت میں لگے ہوئے تھے، ویسے ہی لگے رہنا چاہئے ـــــ اور درحقیقت بندگی کی شان یہی ہے، میں اس کے در پر پڑا رہوں گا، اس کے در کا غلام ہوں، چاہیں قبول کریں، یا قبول نہ کریں۔

ایک عجیب سوال:

ایک بہت بڑے جلیل القدر محدث گزرے ہیں، حضرت عبدالرحمٰن بن

اُبی نعم رحمۃ اللہ علیہ ان کے حالات میں لکھا ہے کہ ان کے زمانے میں ایک شخص کو یہ شوق پیدا ہوا کہ میں اللہ والوں کے پاس اور علماء کے پاس جاؤں، اور ان سے یہ سوال کروں کہ اگر آپ کو یہ پتہ چل جائے کہ آئندہ ۲۴ گھنٹے کے بعد آپ کا انتقال ہونے والا ہے تو یہ ۲۴ گھنٹے آپ کس طرح گزاریں گے؟ اور ان ۲۴ گھنٹوں میں آپ کیا نیک اعمال کریں گے؟ اب ظاہر ہے کہ جب آدمی کو یہ پتہ چل جائے کہ میں ۲۴ گھنٹے بعد دنیا سے رخصت ہونے والا ہوں تو وہ اس وقت وہی کام کرے گا جو اس کے نزدیک سب سے افضل کام ہوں گے، اس لئے اس نے یہ سوال بنایا۔

میرے پاس اضافہ کیلئے کچھ نہیں:

چنانچہ وہ شخص بڑے بڑے علماء اور محدثین کے پاس گیا، کسی نے کچھ اعمال بتائے، کسی نے کچھ اعمال بتائے۔ مختلف عبادات، اذکار اور تسبیحات بیان کیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن اُبی نعیم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جب وہ شخص پہنچا اور اس نے یہ سوال ان سے بھی کیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں وہی اعمال کروں گا، جو آج کر رہا ہوں، یعنی میں اس وقت جو اعمال کر رہا ہوں، میرے پاس ان میں اضافہ کرنے کے لئے کچھ نہیں ہے، اس لئے کہ میں نے اپنی ساری زندگی اسی نظم پر ڈھال رکھی ہے کہ شاید اگلے چوبیس گھنٹے میں میرا انتقال ہو جائے گا، اس لئے جو اعمال میں روز کرتا ہوں، وہی اعمال میں آج بھی کرونگا ____ بہرحال! کوئی بھی حالت ہو، آدمی کے معمول میں، اس کے طریق کار میں، اللہ جلّ شانہ کے ساتھ تعلق میں، عبادات میں، طاعات میں، کوئی فرق واقع نہیں ہونا چاہیئے۔ اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ اگر یہ آواز آ جائے کہ تو جنتی ہے، یا یہ آواز آ جائے تو جہنمی ہے۔ العیاذ باللہ۔ تب بھی اس کے عمل میں کوئی فرق نہیں

ہونا چاہئے، کسی حالت میں بھی عمل کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

استقامت کیلئے ہمت کو کام میں لانا ہوگا:

اسی کو ''استقامت'' کہتے ہیں، اور یہ استقامت مشق سے حاصل ہوتی ہے، لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ معمولات کی پابندی نہیں ہوتی، ناغہ ہو جاتا ہے ــــــ یہ ناغہ کیوں ہو جاتا ہے؟ اس ــــــ لئے ناغہ ہو جاتا ہے کہ اس کی مشق نہیں کی، یاد رکھو کہ اختیاری امور کو اپنی زندگی کے معمول میں داخل کرنے کا سوائے زبردستی کے اور کوئی اس کا طریقہ نہیں، تم اگر سمجھتے ہو کہ تمہیں کوئی تعویذ گھول کر پلا دیا جائے گا۔ یا تمہارے اوپر کوئی جھاڑ پھونک کر دے گا، اور اس کے نتیجے میں تم معمولات کے پابند ہو جاؤ گے، یہ سب خام خیالی ہے، اس کو دل سے نکال دو، ایسا نہیں ہو سکتا ــــ بلکہ اپنے ارادے سے اور اپنی ہمت کو استعمال کرنے سے، اور زبردستی اپنے آپ کو کام میں لگا کر یہ چیز حاصل ہوگی، جب تک تم اپنے اوپر زبردستی نہیں کرو گے، اس وقت تک کسی چیز کی مشق نہیں ہوگی، اور کسی کام پر استقامت حاصل نہیں ہوگی۔

فضول کاموں میں مشق:

اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمت میں بڑی طاقت رکھی ہے، یہ ہمت ربر کی طرح ہے، اس کو جتنا چاہو کھینچ لو، چاہے اس کو غلط کام میں استعمال کرو، چاہے اچھے کام میں اس کو استعمال کرلو، اب لوگ اس ہمت کو غلط کاموں میں استعمال کرتے ہیں ــــــ ابھی چند روز پہلے میں اٹلی گیا تھا، وہاں پر ایک سڑک پر سے جب گزرا تو وہاں دیکھا کہ وہاں دو دیواریں ڈھلوان والی بنی ہوئی تھیں۔ اس

کے اوپر پہیے رکھے ہوتے تھے، اب لوگ ان پہیوں کے ذریعہ ان دیواروں پر اوپر کی طرف جاتے، اور پھر ہوا میں قلا بازیاں کھا کر دوبارہ اس دیوار پر آ جاتے ـــــــ لوگ برسرعام یہ کرتب دکھا رہے تھے، دیکھ کر بہت حیرانی ہوئی کہ یہ کیسے انسان ہیں۔ جو یہ عمل کر رہے ہیں، لیکن انہوں نے مشق کی، اور مشق کر کے اس فضول کام میں مہارت پیدا کر لی، میں نے اپنے دوست سے کہا کہ دیکھو، اللہ تعالیٰ نے انسان کی ہمت میں کتنی طاقت دی ہے کہ یہ آدمی مشق کر کے ایسے کام کرنے پر قادر ہو گئے کہ ہمیں دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ ایسا کام بھی انسان کر سکتا ہے۔ جب ایک فضول کام میں مشق کرنے سے اللہ تعالیٰ ہمت میں یہ برکت دیتے ہیں تو اگر ہم طاعات، عبادات اور گناہوں سے بچنے میں اپنی ہمت کو استعمال کریں تو اللہ تعالیٰ کیوں مدد نہیں فرمائیں گے۔

نفس کو زبردستی طاعات میں لگاؤ:

اس لئے اپنے نفس کو زبردستی طاعات میں لگاؤ۔ وہ غالب نے خوب کہا ہے کہ:

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں جاتی

اگر طبیعت ادھر نہیں جاتی تو اس کو زبردستی کر کے لاؤ، جب اس طبیعت کے ساتھ زبردستی کرو گے تو کچھ دن تو زبردستی کرنی ہوگی، لیکن پھر رفتہ رفتہ اس کی عادت بن جائے گی، جب عادت بن جائے گی تو اس کام کی طبیعت ثانیہ بن جائے گی ـــــ کوئی کام زبردستی کئے بغیر نہیں ہو سکتا۔

حاصلِ تصوف:

ہمارے حضرت حکیم الامت، مجدد ملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ علیہ ساری عمر تصوف کے کوچوں کی خاک چھاننے کے بعد تصوف کا حاصل بیان فرمارہے ہیں کہ:

> وہ ذرا سی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جب کسی طاعت کے کرنے میں سستی محسوس ہو، اس سستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کر گزرے اور جب کسی گناہ کے کرنے کا تقاضہ ہو، اس تقاضے کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے، بس اسی سے تعلق مع اللہ پیدا ہوتا ہے، اس سے ترقی کرتا ہے، اور اسی سے تعلق باقی رہتا ہے۔

بہر حال! نفس کے ساتھ زبردستی کر کے اس کو طاعت کی طرف لاؤ، اور گناہوں سے زبردستی کر کے اس کو دور رکھو، اگر یہ چیز حاصل ہوگئی تو بس تم کامیاب ہو جاؤ گے۔

توکل مطلوب:

ایک ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

> ''توکل مطلوب یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ پر اعتقاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا، جو وہ چاہیں گے، وہی ہوگا اور خلاف شرع تدبیر نہ کرو، واللہ تم متوکل ہو''

(انفاس عیسیٰ: ص ۲۱۸)

یعنی یہ اعتقاد اس بات کا کہ اللہ کے حکم کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا اور دوسرے کہ جو تدبیر اختیار کرو، وہ خلاف شرع نہ ہو، تدبیر توکل کے خلاف نہیں، مثلاً بیمار ہو گئے تو اس بیماری کا علاج کرنا تدبیر ہے، جائز تدبیر ہے، لہٰذا یہ تدبیر توکل کے خلاف نہیں ــــ البتہ خلاف شرع تدبیر نہ ہو، مثلاً یہ کہ بیماری کے علاج کے لئے کسی جادوگر کے پاس چلے گئے، اور اس سے سفلی عمل کرانا شروع کر دے تو یہ ناجائز تدبیر ہے۔ حرام ہے، اور توکل کے خلاف ہے، لہٰذا تدبیر ضرور کرے، مگر وہ تدبیر شریعت کے مطابق ہو۔

آج کی مجلس کا خلاصہ:

بہر حال! آج کی مجلس کا خلاصہ یہ ہے کہ تفویض کے حصول کے لئے اس مراقبہ کی ضرورت ہے کہ اللہ جل شانہ جانتے ہیں، میں نہیں جانتا، اللہ تعالیٰ قادر ہیں، اور میں اپنے سارے معاملات اللہ کے حوالے کرتا ہوں، ان کے فیصلے پر راضی ہوں، چاہے وہ فیصلہ بظاہر دیکھنے میں ناگوار معلوم ہوتا ہو۔ لیکن حقیقت میں وہی فیصلہ میرے حق میں بہتر ہوگا، اس کا بار بار مراقبہ کرنے سے یہ حالت پیدا فرما دیتے ہیں اور پھر وہ حالت مقام میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو تفویض کامل اور توکل عطا فرمائے۔ آمین

وآخر دعوانا ان الحمد لِلّٰہِ ربِّ العالمین

✓ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

✓ السلام علیکم
تم پر سلامتی ہو۔

✗ اسام علیکم
تم کو موت آئے۔

✗ اسا علیکم
تم خوشی کو ترسو۔

✗ سلالیکم
تم پر لعنت ہو۔

✗ سام علیکم
تم برباد ہو۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسباب کی موجودگی میں
''توکل'' مطلوب ہے

مجلس نمبر 107

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب
محمد عبداللہ میمن
استاد جامعہ دارالعلوم کراچی

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	107

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

كَمَاصَلَّيْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ

اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

كَمَابَارَكْتَ عَلٰی اِبْرٰهِيْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰهِيْمَ

اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسباب کی موجودگی میں
''توکل'' مطلوب ہے

مجلس نمبر 107

الحمدللہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسولہ الکریم، وعلی آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

جب تمام تدبیریں ختم ہو جائیں

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

''بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں جن میں تمام تدبیریں ختم ہو جاتی ہیں، اور کام نہیں ہوتا، بس گرہ اس وقت کھلتی ہے جب بندہ یوں کہتا ہے کہ اے اللہ! آپ ہی اس کام کو پورا کریں گے تو پورا ہوگا، میں تو عاجز و درماندہ ہوں''

(انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۸)

مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنی زندگی میں ایسے واقعات بکثرت پیش

آتے ہیں کہ انسان تدبیریں کرتا ہے، لیکن کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ یہ نظارے بندوں کو دکھاتے رہتے ہیں کہ ایک وقت میں وہی تدبیریں کارگر ہوگئی تھیں، اور ان سے فائدہ پہنچ گیا تھا۔ لیکن دوسرے وقت میں وہی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ لیکن کچھ بھی فائدہ نہ ہوا ______

دوا کس سے پوچھتی ہے

اللہ تعالیٰ یہ چیزیں بندوں کو دکھاتے رہتے ہیں ______ ہمارے ایک ڈاکٹر تھے، ڈاکٹر صغیر احمد ہاشمی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کے خاص معالج تھے، بڑے تجربہ کار ڈاکٹر تھے، تقریباً ۸۰ سال کی عمر ہوگئی تھی۔ وہ ایک جملہ فرمایا کرتے تھے کہ میری ساری زندگی کے تجربہ کا نچوڑ یہ ہے کہ جب کوئی دوا کسی مریض کے لئے تجویز کی جاتی ہے تو وہ دوا جسم میں جانے کے بعد کسی سے پوچھتی ہے کہ کیا عمل کروں؟ فائدہ کروں؟ یا الٹی پڑ جاؤں؟ جب وہاں سے اشارہ مل جاتا ہے تب وہ دوا کام کرتی ہے ______ فرماتے تھے کہ وہی دوا، وہی مریض، وہی حالت، وہی مرض تھا کل فائدہ کر گئی تھی، آج جب وہی دوا دی تو الٹی پڑ گئی، یہ نظارے نظر آتے رہتے ہیں۔

پھر بھی انسان غافل ہے

فرماتے تھے کہ جس بیمار کے بارے میں ہمیں پکا یقین تھا کہ کل کو یہ بیمار اسپتال سے ڈسچارج ہو جائے گا اور دوسرے مریض کے بارے میں یہ یقین تھا کہ یہ آج رات دنیا سے چلا جائے گا۔ لیکن جب صبح آ کر دیکھا تو پتہ چلا کہ جو مریض ڈسچارج ہونے والا تھا، وہ قبرستان پہنچ گیا، اور جس کے بارے میں یہ سوچا تھا کہ زد

کل کو مر جائے گا وہ تندرست ہو کر ڈسچارج ہو گیا ـــــــ تو ساری تدبیریں، ساری دوائیں، سارے علاج، سب کہیں پوچھتے ہیں کہ کیا کروں؟ اللہ تعالیٰ یہ مناظر آنکھوں سے دکھاتے رہتے ہیں، پھر بھی انسان غافل ہے، اور اپنی نگاہ انہی تدبیروں پر جمائے رکھتا ہے کہ اس تدبیر سے یہ فائدہ ہو جائے گا، اس تدبیر سے یہ فائدہ ہو جائے گا، حالانکہ ان نظاروں کو دیکھ کر یہ اعتقاد جازم پیدا ہو جائے کہ یہ تدبیریں کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، اصل تو مسبب الاسباب ہیں۔ وہ جس تدبیر میں تاثیر پیدا فرمادیں تو تاثیر ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی۔

اس وقت گرہ کھلتی ہے

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ساری تدبیریں کرلیں۔ سارے جوڑ توڑ کر لئے اور ساری کوششیں بروئے کار لے آئے، لیکن نتیجہ نکل کر نہیں آیا۔ اس وقت انسان جب تمام تدبیروں سے مایوس ہو چکا ہوتا ہے، یہ کہتا ہے کہ اے اللہ! بس آپ ہی کا سہارا ہے، آپ کے سوا کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ اگر آپ کریں گے تو یہ کام ہو جائے گا، آپ نہیں کریں گے تو یہ کام نہیں ہوگا، اس وقت بعض اوقات اللہ تعالیٰ کی طرف سے دروازہ کھل جاتا ہے، اسی لئے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ: ''اس وقت گرہ کھلتی ہے جب یوں کہتا ہے کہ اے اللہ، آپ اس کام کو پورا کریں گے، میں تو عاجز اور درماندہ ہوں۔'' ساری تدبیریں اختیار کرکے آخر میں اعتراف کرلے کہ میں تو کچھ نہیں کرسکتا، جب تک آپ کی توفیق نہ ہو۔

ایک سبق آموز واقعہ

انسان کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آتے ہیں ـــــــ ۱۹۶۷ء

کی بات ہے، آج سے تقریباً ۳۵ سال پہلے کا واقعہ ہے کہ مجھے پہلی مرتبہ حرمین شریفین کے سفر پر پانی کے جہاز سے جانا ہوا، میرے ساتھ میرے بڑے بھائی مولانا ولی رازی صاحب تھے، ہم دونوں اس سفر پر روانہ ہوئے، راستے میں پانی کا جہاز عدن کے ساحل پر ایک رات کے لئے رکتا تھا، اور پھر وہاں سے اگلے دن روانہ ہوتا تھا، چنانچہ جب جہاز عدن پر پہنچا تو ہم دونوں جہاز سے اتر گئے۔ وہاں یکے بعد دیگرے تین شہر ہیں، چنانچہ وہاں اتر کر گھومے پھرے، کچھ چیزیں سستی مل رہی تھیں، وہ خرید لیں، کچھ کھایا پیا، اور پھر ایک ٹیکسی لی، اور ساحل پر پہنچے، جب اس ٹیکسی والے کو پیسے دینے کی نوبت آئی تو پتہ چلا کہ وہ ہمارا تھیلا جس میں ساری رقم، جہاز کا ٹکٹ، اور پاسپورٹ وغیرہ تھا، وہ تھیلا غائب ہے۔ اور جہاز سمندر کے درمیان کھڑا ہوا تھا، اور ساحل سے جہاز تک کشتی کے ذریعہ جانا تھا، رات کے ۱۱ بج گئے تھے، آخری کشتی جانے والی تھی اور صبح سویرے جہاز روانہ ہو جائے گا، اور رات کو ایک بجے کے بعد جہاز سے سیڑھی ہٹا دی جائے گی۔

مایوسی کے بعد مسجد کی طرف

اب ٹیکسی والے کو بھی دینے کے لئے پیسے نہیں تھے ____ اور ہم دونوں نے اپنے ٹکٹ، پاسپورٹ، پیسے سب کچھ ایک ہی تھیلے میں رکھے تھے۔ اگر الگ الگ ہوتے تو کم از کم یہ ہوتا کہ ایک کے پیسے غائب ہو جاتے، دوسرے کے موجود ہوتے، اب ٹیکسی ڈرائیور سے ساری صورت حال بتائی کہ یہ صورت پیش آ گئی ہے، اب ایسا کرو کہ تم ہمیں دوبارہ اسی جگہ لے چلو جہاں سے ہم سوار ہوئے تھے، وہاں پر وہ تھیلا تلاش کریں گے، اس لئے کہ وہیں کسی دکان پر وہ تھیلا ہم چھوڑ کر آئے ہیں۔ جب تھیلا مل جائے گا تو تمہیں واپسی کا کرایہ بھی دیدیں گے، وہ ٹیکسی والا

راضی ہوگیا، اور ہمیں دوبارہ اس بازار میں لے گیا۔ جب وہاں پہنچے تو رات کے ۱۲/ بج چکے تھے، اور جن دکانوں پر ہم گئے تھے، وہ سب دکانیں بند ہوگئیں، ایک ایک جگہ جا کر تلاش کیا، لیکن کوئی دکان کھلی نہیں تھی، اور جہاز کے جانے کا وقت قریب آرہا تھا، اجنبی شہر جہاں نہ کوئی جان پہچان۔ جب تلاش کر کے مایوس ہوگئے تو میں نے کہا کہ چلو مسجد قریب ہے۔ وہاں چلتے ہیں اور صلاۃ الحاجہ پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں ــــــ چنانچہ مسجد میں جا کر صلاۃ الحاجۃ پڑھی، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی، یا اللہ! اب ہمارے لئے کوئی راستہ نہیں، اگر رات یہاں رہ گئے تو نہ ہمارے پاس پیسے ہیں۔ نہ رہنے کی کوئی جگہ ہے، نہ کوئی جاننے والا ہے، یا اللہ، آپ ہی ہمارے لئے کوئی راستہ نکال دیجئے۔

تھیلا مل گیا

ابھی ہم دعا کر کے فارغ ہوئے تھے کہ ایک آدمی گلی میں سے دوڑتا ہوا آیا، اور آکر پوچھا کیا بات ہے؟ کیوں بیٹھے ہو؟ ہم نے بتایا کہ اس طرح ہمارا تھیلا گم ہوگیا ہے، اور ہم اس کی وجہ سے پریشان ہیں۔ اس نے پوچھا کہ وہ تھیلا کیسا تھا؟ ہم نے اس کی علامتیں بتادیں، اس نے کہا کہ اس طرح کوئی تھیلا ملا کرتا ہے جس طرح تم تلاش کر رہے ہو ــــــ اس کے بعد وہ چلا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے چلے، اور ہم نے سوچا کہ یہ شخص اس طرح یہاں آیا ہے تو ضرور کوئی بات ہوگی ــــــ چلتے چلتے آگے گئے تو گلی میں ایک کیبن کے اندر ایک دیا ٹمٹما رہا تھا، وہ شخص اندر گیا، اور ہمیں کہا کہ ذرا تم لوگ یہاں ٹھہرو، پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ تھیلا لاکر دیدیا، اور کہا کہ تم یہاں چھوڑ کر چلے گئے تھے، اور آئندہ ہرگز ایسی حرکت مت کرنا ــــــ اب ہمیں یہ بھی یاد نہیں آیا کہ ہم اس دکان پر گئے

بھی تھے یا نہیں؟

جب ساری تدبیریں ناکام ہوگئیں

جب ساری تدبیریں فیل ہوگئیں، سارے اسباب ختم ہوگئے، اس وقت جب بندہ اللہ تعالیٰ کو پکارتا ہے تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کا اور اپنے کرم کا نظارہ دکھاتے ہیں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرما رہے ہیں کہ جب تم یہ نظارے دیکھتے رہتے ہو کہ یہ تمام تدبیریں محض اسباب کا درجہ رکھتی ہیں، ان تدبیروں میں تاثیر پیدا کرنے والا کوئی اور ہے، تو جب آخر میں ان تدبیروں سے نگاہ ہٹ گئی، اور مسبب الاسباب کی طرف نگاہ چلی گئی، اور کسی اور طرف نہیں گئی اور یہ کہا کہ اے اللہ! میری ساری تدبیریں ناکام ہوگئیں، اب صرف آپ ہی کا سہارا ہے، آپ ہی یہ کام کریں گے ـــــــ یہی بات پہلے دن کہہ دی ہوتی، جبکہ اسباب بھی موجود تھے، تدبیریں نظر آرہی تھیں کہ یا اللہ: یہ تدبیریں یہ اسباب ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں، ان میں تاثیر آپ ڈالیں گے تو کام ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا ـــــــ اگر پہلے دن ہی یہ بات کہہ دو گے تو اس کا نام ''توکل'' ہے، اور اسی کا نام ''تفویض'' ہے۔

توکل کا حقیقی موقع

جو واقعہ میں نے بیان کیا اس میں تو سب کچھ ہاتھ سے نکلنے کے بعد ''تفویض'' اختیار کی ـــــــ لیکن اگر ہاتھ میں پیسے موجود ہوتے، اور ٹکٹ ہاتھ میں ہوتا، پاسپورٹ ہاتھ میں ہوتا، اس وقت ''تفویض'' اور ''توکل'' اختیار کرنے کا اصل موقع تھا، اور اس وقت یہ سوچتے کہ نہ اس ٹکٹ میں کچھ رکھا ہے، نہ

ان پیسوں میں کچھ رکھا ہے، نہ اس پاسپورٹ میں کچھ رکھا ہے، بلکہ جو کچھ ہے، وہ اللہ کی عطا ہے، وہ اگر چاہیں گے تو مجھے پہنچا دیں گے، وہ اگر نہیں چاہیں گے تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی نہیں پہنچ پاؤں گا، لہٰذا جب آنکھوں سے اسباب نظر آ رہے ہوں، اس وقت ''تفویض'' اور ''توکل'' کا حقیقی موقع ہے۔

اسباب کی موجودگی میں توکل کرو

چنانچہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اصل ''توکل'' اس وقت ہوتا ہے جب انسان کو کسی کام کو کرنے کے سارے اسباب سامنے موجود نظر آ رہے ہوں ـــــــ مثلاً گھر میں کھانا پک رہا ہے، آپ نے اپنی آنکھوں سے کھانا پکتا ہوا دیکھ لیا، اور کیا پک رہا ہے؟ یہ بھی معلوم ہے، کون پکا رہا ہے؟ یہ بھی معلوم ہے، اس بارے میں کوئی شبہ ہے کہ شام کو یہ کھانا ملے گا؟ ـــــــ کوئی شبہ نہیں، بلکہ یقین ہے کہ شام کو افطاری کے وقت یہ کھانا ملے گا، اب اسباب سارے موجود ہیں، اس وقت ''توکل'' مطلوب ہے کہ اس وقت نگاہ ان اسباب پر نہ ہو، بلکہ اس وقت بھی نگاہ اللہ جل شانہ کی طرف ہو کہ حقیقت میں معطی وہ ہیں، اگر وہ نہ چاہیں تو ہانڈی الٹ جائے، وہ اگر نہ چاہیں تو چولہے کو آگ لگ جائے، یا کوئی اور مانع کھڑا ہو جائے، اور پتہ چلے کہ ساری محنت اکارت گئی، حاصل کچھ بھی نہ ہوا ـــــــ بہرحال! جس وقت سارے اسباب موجود ہوں، اس وقت یہ دھیان کرنا کہ وہ اگر چاہیں گے، ملے گا، اور وہ اگر نہیں چاہیں گے، نہیں ملے گا، یہ ہے حقیقی ''توکل'' اور حقیقی ''تفویض''۔

سنت کی اتباع کیلئے تدبیر کرو

اسی بات کو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ آگے ایک ملفوظ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ:

''صاحب تفویض تو ہر امر میں ابتداء ہی سے ''تفویض'' کرتا ہے اور تدبیر جو کچھ کرتا ہے، وہ محض سنت و اطاعت سمجھ کر کرتا ہے، اس کی نیت یہ نہیں ہوتی کہ تدبیر ضرور کامیاب ہی ہوگی، بلکہ وہ کامیابی اور ناکامی کو حق تعالیٰ کے سپرد کر کے کوشش کرتا ہے اور دونوں حالت میں راضی رہتا ہے''

(انفاس عیسی، ص ۲۱۸)

یعنی وہ تدبیر اس لئے اختیار کر رہا ہے کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، یا مثلاً بیمار ہوا تو علاج کر رہا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے اور اطاعت ہے، چونکہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اسباب کو اختیار کرو، اس لئے اسباب اختیار کر رہا ہوں ــــــ لیکن کامیابی ہوگی یا نہیں ہوگی؟ یہ میرے دائرہ اختیار سے باہر ہے ــــــ

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور جنگ صفین

میں نے اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ سے سنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، جب جنگ صفین کے لئے روانہ ہو رہے تھے ــــــ تو چونکہ صاحب کشف تھے ــــــ اس لئے کسی نے آپ سے پوچھا کہ حضرت! آپ جنگ کے لئے جا رہے ہیں۔ آپ کو فتح بھی ہوگی یا نہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ فتح

نہیں ہوگی، ان صاحب نے کہا کہ پھر آپ جنگ کے لئے کیوں جا رہے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ کا حکم ہے ـــــــ دیکھئے کہ پہلے سے پتہ ہے کہ فتح نہیں ہوگی، بلکہ شکست ہوگی، لیکن پھر بھی جنگ کے لئے جا رہے ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ جانے کا حکم ہے، بہر حال! تدبیر اس لئے اختیار کی جا رہی ہے کہ اللہ کا حکم ہے اور اس حکم کی تعمیل میں تدبیر ہو رہی ہے۔

حضرت میاں صاحب کا عجیب واقعہ

میرے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے ایک قصہ حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سنایا جو بڑے درجے کے اولیاء اللہ میں سے تھے، صاحب کشف و کرامات بزرگ تھے، دارالعلوم دیوبند کے اونچے درجے کے اساتذہ میں سے تھے، مادرزاد ولی اللہ تھے ـــــــ میرے دادا حضرت مولانا محمد یٰسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں صاحب کے استاذ تھے، وہ فرماتے تھے کہ جب میاں صاحب میرے پاس پڑھتے تھے، اس وقت یہ بچے تھے اور میں اس وقت ان کو مادرزاد ولی اللہ کہا کرتا تھا، اس لئے کہ میں نے کبھی ان سے کوئی خلاف اولیٰ کام ہوتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

ایک مرتبہ درس گاہ میں کسی بچے سے دری پر سیاہی گر گئی، استاذ ناراض ہوئے اور بچوں سے پوچھا کہ کس نے یہ سیاہی گرائی ہے اور دری خراب کر دی؟ اب تمام بچے خاموش، کسی نے اقرار نہیں کیا۔ یہ کھڑے ہوئے اور کہا کہ حضرت: مجھ سے غلطی ہوگئی، حالانکہ وہ سیاہی کسی اور بچے نے گرائی تھی، لیکن ان کا بھی ہاتھ لگ گیا تھا، جس بچے نے گرائی تھی، وہ تو نہیں بولا، لیکن یہ کھڑے ہو گئے اور کہا کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ بہر حال! بچپن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو مادرزاد ولی اللہ بنایا تھا۔ ایسے بزرگ تھے۔

حضرت میاں صاحب پاکستان کے حامی تھے

حضرت میاں صاحب کا تعلق حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے سے تھا، اگرچہ ان کے شیخ تو کوئی اور تھے، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے شیخ کی جگہ تصور کرتے تھے ____ جس وقت پاکستان بنانے کی تحریک چل رہی تھی تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ پاکستان بننے کے حق میں تھے، جبکہ دوسری طرف حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء پاکستان بننے کے حق میں نہیں تھے، اس اختلاف کے وقت کچھ علماء مسلم لیگ کے حق میں تھے، اور کچھ علماء کانگریس کے حق میں تھے، اس اختلاف کے وقت حضرت میاں اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تھے۔ یعنی پاکستان بننے کے حق میں تھے اور پاکستان کے لئے کوشش کرنے والوں کے ساتھ تھے۔

نماز استسقاء کا عجیب واقعہ

حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ سنایا کہ اسی زمانے میں ایک مرتبہ دیوبند میں بارش رک گئی اور کافی دنوں تک بارش نہیں ہوئی، دارالعلوم دیوبند کی طرف سے یہ اعلان ہوا کہ چونکہ بارش نہیں ہو رہی ہے۔ اس لئے فلاں وقت میں نماز استسقاء پڑھی جائے گی اور تین روز تک نماز پڑھی جائے گی ____ چنانچہ پہلے دن تمام طلباء اور اساتذہ نماز استسقاء کے لئے میدان کی طرف چلے تو حضرت میاں صاحب بھی تشریف لے جانے لگے، چونکہ صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے، اس لئے میرے والد صاحب نے ان سے پوچھا کہ حضرت بارش ہوگی بھی یا نہیں؟ فرمایا: بارش وارش تو نہیں ہوگی، بس سنت کا ثواب حاصل کرنے

کے لئے جارہا ہوں، خیر: نماز کے لئے گئے، نماز پڑھی، اور واپس آ گئے، کوئی بارش نہیں ہوئی ______

اگلے دن صبح پھر نماز استسقاء کے لئے روانہ ہوگئے، میں نے کہا حضرت: آج پھر جارہے ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ دیکھو: میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ثواب حاصل کرنے کے لئے اور سنت پر عمل کرنے کے لئے چلو، بارش وارش نہیں ہونی ______ گئے، نماز پڑھی، اور واپس آ گئے ______

تیسرے دن پھر نماز استسقاء کے لئے روانہ ہوگئے۔ لیکن جب تیسرے دن نماز کے لئے میدان میں پہنچے تو صفین بن رہی تھیں اور حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا انتظار ہو رہا تھا، کہ آپ تشریف لائیں گے اور نماز پڑھائیں گے۔ جب حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تو حضرت میاں صاحب نے ان سے فرمایا کہ حضرت! اجازت ہو تو آج میں نماز پڑھا دوں؟ اب لوگ ان کو دیکھ کر بہت حیران ہوئے کہ میاں صاحب آج نماز پڑھانے کی اجازت طلب کر رہے ہیں۔ جبکہ آج تک آپ نے پنج وقتہ نماز بھی کبھی نہیں پڑھائی، چہ جائیکہ فرمائش کر کے امامت کریں ______ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس سے اچھی کیا بات ہے، آپ ضرور نماز پڑھائیں۔ چنانچہ تیسرے دن آپ نے نماز پڑھائی، اور واپس تشریف لے آئے، اور بارش نہیں ہوئی۔

حضرت والد صاحب فرماتے تھے کہ میں بڑا حیران ہوا کہ تین دن سے یہ فرمارہے تھے کہ بارش وارش نہیں ہوگی، اور کبھی ساری عمر امامت نہیں کی، لیکن آج باقاعدہ فرمائش کر کے امامت کرائی، ایسا کیوں کیا؟ بعد میں میں نے میاں صاحب سے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا قصہ ہے؟ آپ نے تو کبھی نماز نہیں پڑھائی،

لیکن آج آپ نے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمائش کی کہ آج میں نماز پڑھاؤں؟ لوگ یہ سمجھ رہے تھے کہ ان کو نماز پڑھانے کا بڑا شوق ہے ــــــــ جواب میں فرمایا: ارے میاں چھوڑو ان باتوں کو ــــــــ یہ کہہ کر بات ٹلا دی، حضرت والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بے تکلفی بہت تھی، اس لئے حضرت والد صاحب نے اصرار کیا کہ نہیں حضرت! آپ بتائیں، کیا قصہ ہے؟

اللہ والوں کی نرالی شان

فرمانے لگے کہ بات دراصل یہ ہے کہ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اوپر یہ منکشف فرما دیا تھا کہ بارش وارش تو ہونی نہیں، اور تین دن سے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نماز پڑھا رہے تھے، تم جانتے ہو کہ یہ مسلم لیگ والے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں، اگر حضرت مدنی تین دن تک نماز پڑھاتے اور پھر بھی بارش نہ ہوتی تو لوگ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی شان میں گستاخیاں کرتے، اور یہ کہتے کہ دیکھو، حضرت مدنی نے چونکہ نماز پڑھائی اس لئے بارش نہیں ہوئی ــــــــ اس لئے مجھے خیال آیا کہ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو جاؤں، اور یہ الزام تنہا حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ پر نہ آئے، اس وجہ سے تیسرے دن میں نے کہا کہ میں نماز پڑھاؤں گا۔ اب یہ ایسی بات تھی جو نہ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم تھی اور نہ کسی اور کو معلوم تھی۔

پہلے اونٹ کو بیماری کہاں سے لگی؟

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے آکر کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ تو فرماتے ہیں کہ

"لَاعَدْوٰی" یعنی ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اونٹ خارش زدہ ہوتا ہے، جب وہ دوسرے اونٹ کے پاس جاتا ہے تو اس کو بھی خارش ہو جاتی ہے، تیسرے کے پاس جاتا ہے تو تیسرے کو بھی خارش ہو جاتی ہے، آپ فرماتے ہیں کہ ایک کی بیماری دوسرے کو نہیں لگتی ـــــ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھا یہ بتاؤ کہ سب سے پہلے اونٹ کو خارش کہاں سے لگی؟ اب وہ خاموش ہو گئے ـــــ مطلب یہ ہے کہ تم جو یہ سمجھ رہے ہو کہ جب بھی بیماری ہوگی، وہ عدویٰ کی وجہ سے ہوگی، یا ایک کو بیماری ہوگی تو وہ ضرور دوسرے کو لگے گی، یہ جو تم نے دل میں ملازمہ قائم کر رکھا ہے کہ یہ اس بات سے ٹوٹ جاتا ہے کہ پہلے اونٹ کو بیماری کہاں سے لگی؟ معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم "لَاعَدْوٰی" کے ذریعہ اس عقیدے کی نفی فرما رہے ہیں جس کو تم نے علت تامہ قرار دیدیا ہے۔

احتیاطی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں

لیکن اگر سبب محض کا درجہ دیدیا ہو کہ جس طرح بیماری کے دوسرے اسباب ہوتے ہیں، یہ بھی ایک سبب ہے، ایک کے جراثیم دوسرے کی طرف منتقل ہو گئے، یہ بات اس حدیث کے منافی نہیں۔ اسی بنا پر ایک دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فِرَّمِنَ الْمَجْذُوْمِ فِرَارَكَ مِنَ الْاَسَدِ

کوڑھی کی بیماری والے سے ایسے بھاگو جیسے شیر سے بھاگتے ہو، یا ایک دوسری حدیث میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بیمار اونٹ کسی صحت منداونٹ کے

پاس لاکر نہ اتارا جائے ـــــــ یا ایک حدیث میں آپ نے فرمایا کہ جہاں طاعون پھیل جائے، وہاں سے نکلو نہیں، اور باہر والا آدمی اندر جائے نہیں ـــــــ یہ سب احتیاطی تدابیر ہیں کہ اسباب کے درجہ میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، جب تک اس سبب کو انسان ''علت حقیقیہ'' نہ سمجھے، اور جب تک یہ بات نہ ہو کہ یہی سبب کام بنانے والا ہے۔

نگاہ مسبب الاسباب پر ہو

اگر اسباب کے ساتھ نگاہ مسبب کی طرف بھی ہے، تو پھر کوئی بھی تدبیر اختیار کرو، مضائقہ نہیں، چاہے علاج کرو، چاہے حفظ ماتقدم کی تدبیریں کرو، چاہے کوئی اور سبب اختیار کرو، کوئی چیز مضر نہیں، اور نہ ہی توکل کے خلاف ہے۔ جب تک دل میں یہ بات ہو کہ اصل تاثیر دینے والا ''اللہ'' ہے، اس کی تاثیر کے بغیر کوئی سبب مؤثر نہیں ہوسکتا ـــــــ اس لئے حضرت والا نے فرمایا کہ ایسا شخص تدبیر سنت سمجھ کر کرتا ہے۔ اور اس کی نگاہ اس تدبیر کی طرف نہیں ہوتی، بلکہ اس کی نگاہ مسبب الاسباب کی طرف ہوتی ہے، یہ ہے ''توکل'' اور بعد میں انجام کیا ہوتا ہے؟ تدبیر کامیاب ہوتی ہے، یا ناکام ہوتی ہے، اس بارے میں وہ معاملہ اللہ کے حوالے کردے کہ جو مانگا تھا، وہ ملتا ہے، یا نہیں ملتا، دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ جو فیصلہ کریں گے، میں اس پر راضی ہوں یہ ہے ''تفویض''

منزل سے بے نیاز ہو جاؤ

بنا کر بے نیازِ راہ و منزل
کوئی لے جا رہا ہے جا رہا ہوں

یعنی مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ منزل ملے گی یا نہیں ملے گی؟ میں نے اپنی دانست میں جو صحیح راستہ تھا، وہ اختیار کرلیا ہے، اس کے بعد مجھے منزل ملتی ہے یا نہیں؟ اس کی مجھے پرواہ نہیں

یا بم اورا نیابم جستجوئے می کنم

مجھے وہ ملیں یا نہ ملیں، میں جستجو کر رہا ہوں ـــــ یہ جستجو کرنا اور تدبیر اختیار کرنا بذات خود مقصود ہے، اور انسان کامیابی اور ناکامی سے قطع نظر کرلے، یہ ''تفویض'' ہے، اور جس دن ''تفویض'' حاصل ہوگئی، بس اس دن راحت حاصل ہوگئی، دنیا میں راحت حاصل کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ کوئی نہیں ـــــ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں تفویض عطا فرمادے اور توکل بھی عطا فرمادے۔ آمین

و آخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

لا إله إلا الله محمد رسول الله

الله

ادخلوها بسلام آمنين

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا حکم سمجھ کر تفویض اختیار کرو

مجلس نمبر 108

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط و ترتیب

محمد عبد اللہ میمن

استاد جامعہ دار العلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب	:	جامع مسجد دارالعلوم کراچی.
تاریخ خطاب	:	رمضان المبارک 1422ھ
وقت خطاب	:	بعد نماز ظہر
اصلاحی مجالس	:	جلد نمبر 7
مجلس نمبر	:	108

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَاصَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَابَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللہ کا حکم سمجھ کر تفویض اختیار کرو

مجلس نمبر 108

الحمدللّٰہِ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسولہ الکریم، وعلیٰ آلہ وأصحابہ اجمعین۔ امابعد:

تفویض

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ:

''تفویض سے بڑھ کر راحت کا ذریعہ دنیا میں کوئی نہیں، مگر راحت کی نیت سے تفویض کرنا دین نہیں، بلکہ دنیا ہے، حقیقی تفویض وہ ہے جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا، بلکہ محض رضا حق کا ارادہ ہو''۔ (انفاس عیسیٰ، ص ۲۱۹)

کئی دن سے تفویض کا بیان چل رہا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اپنے سارے معاملات اللہ کے حوالے کر دینا کہ اے اللہ! آپ ہی اس بات کو جانتے ہیں کہ کونسی چیز میرے حق میں بہتر ہے اور کونسی چیز میرے حق میں بہتر نہیں۔ میں اپنی طرف سے تدبیر کرنے کے بعد اور دعا کرنے کے بعد اپنا معاملہ آپ کے حوالے کرتا ہوں، آپ جو فیصلہ کریں گے، وہ فیصلہ مجھے منظور ہوگا۔ اور

میں اس پر راضی رہوں گا، یہ ہے حاصل تفویض کا۔

تجویز کے نتیجے میں تکلیف ہوگی:

چنانچہ اس ملفوظ میں حضرت والا فرمارہے ہیں کہ: ''تفویض سے بڑھ کر راحت کا ذریعہ دنیا میں کوئی اور نہیں کہ آدمی تفویض اختیار کرے، یعنی اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کردے کہ جو کچھ وہ میرے حق میں فیصلہ کریں گے وہ بہتر ہوگا، کیونکہ اگر تم تفویض اختیار نہیں کروگے تو اس کی ضد ''تجویز'' ہے، اور تجویز کا مطلب یہ ہے کہ اپنی طرف سے آدمی یہ طے کرلے یہ معاملہ اس طرح ہونا چاہئے، فلاں معاملہ اس طرح ہونا چاہئے۔ فلاں ملازمت ملنی چاہئے، اور اتنی تنخواہ ملنی چاہئے، میرا گھر ایسا ہونا چاہئے، میری گاڑی ایسی ہونی چاہئے، ایسے اسباب راحت ہونے چاہئیں، دل میں اپنی طرف سے تجویز کررکھا ہے، اب جو تجویز خود سے کررکھی ہے، کیا اس تجویز کے مطابق ہر چیز مل جائے گی؟ نہیں ملے گی، کوئی بڑے سے بڑا بادشاہ، بڑے سے بڑا صاحب اقتدار، بڑے سے بڑا سرمایہ دار، کوئی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ جو میں چاہتا ہوں، وہ ہوجاتا ہے۔ بلکہ تم جو اپنے لئے تجویز کروگے کہ مجھے فلاں چیز مل جائے۔ فلاں چیز مل جائے۔ تو اس میں سے کچھ تو مل جائے گا، اور کچھ نہیں ملے گا، اور اب جبکہ دل میں تو یہ خواہش ہے کہ فلاں چیز مل جائے، اور وہ چیز نہیں ملی، تو اس کے نتیجے میں صدمہ اور غم اور تکلیف ہوگی۔

پھر تو راحت ہی راحت ہے:

یاد رکھو! یہ صدمہ، غم اور تکلیف اس وقت ہوتی ہے جب انسان کی

خواہش پوری نہ ہو، اور جب خواہش ہی کوئی نہیں، بلکہ معاملہ اللہ کے حوالے کر رکھا ہے کہ یا اللہ، آپ جو میرے حق میں کریں گے، وہ میرے لئے بہتر ہوگا اور میں اس پر راضی ہوں، پھر صدمہ اور تکلیف نہیں ہوگی ___ پھر تو راحت ہی راحت ہے۔ مثلاً کسی کے دل میں یہ خواہش ہوئی کہ اس ماہ مجھے ایک لاکھ روپے ملنے چاہئے، اب ایک لاکھ روپے حاصل کرنے کی کوشش کی، تدبیر بھی کی، اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کی، لیکن ساتھ ہی دل میں یہ اعتقاد ہے کہ یا اللہ! میرے حق میں خیر ہوگا تو آپ دلوادیں گے، اور اگر میرے حق میں خیر نہیں ہوگا، تو نہیں دلوائیں گے، اور میں آپ کے فیصلے پر راضی ہوں، جو آپ فیصلہ کریں گے، وہی بہتر ہے ___ اب وہ ایک لاکھ روپے نہیں ملے، تو اب صدمہ نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ پہلے ہی سے یہ طے کر رکھا تھا کہ اگر نہیں ملیں گے تو بھی میں اس پر راضی ہوں گا۔

ہر خواہش پوری نہیں ہوسکتی:

لیکن اگر ''تفویض'' کی صفت حاصل ہے، تو اس وقت یہ ہوگا کہ بیشک میری یہ خواہشات ہیں۔ لیکن یا اللہ! فیصلہ آپ ہی کا برحق ہے۔ آپ جو فیصلہ کریں گے وہ خیر ہوگا، میں اس پر راضی ہوں۔ جب یہ بات ہوگی تو پھر اگر کوئی خواہش پوری نہیں ہوگی تو اس پر کوئی صدمہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ہم نے تو پہلے ہی یہ معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا تھا، اب اس صورت میں تکلیف نہیں ہوگی۔ معمولی سا صدمہ ہوسکتا ہے، کہ میری یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ لیکن وہ تکلیف کے درجہ میں نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ تفویض کر رکھی ہے۔ اس لئے حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اس

کائنات میں تفویض سے بڑھ کر کوئی نسخہ راحت حاصل کرنے کا نہیں۔ اس لئے اپنا معاملہ اللہ کے حوالے کردو۔ بس۔ وہ جانے، ان کا کام جانے۔

جبری تفویض کو اختیاری تفویض بنالو:

حقیقت تو یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی تو جبری طور پر تفویض کرنا ہی پڑتا ہے، کیونکہ تفویض کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔ لیکن آپ اس ''جبری تفویض'' کو ''اختیاری تفویض'' بنالو، اور اللہ سے یوں کہو کہ اے اللہ! جو بھی آپ فیصلہ کریں گے۔ میں اس پر راضی ہوں۔ آپ کا فیصلہ برحق ہے، بس! اس سے آپ کو راحت حاصل ہو جائے گی۔

تجویز میں تکلیف ہے:

اس لئے کہ ساری تکلیف اپنی طرف سے تجویز کرنے کی وجہ سے ہوتی ہیں کہ فلاں کام اس طرح ہو جائے۔ فلاں کام یوں ہو جائے اور ضرور ہو جائے۔ پھر جب اس کے خلاف ہوتا ہے تو صدمہ اور تکلیف ہوتی ہے۔ لیکن جب معاملہ اللہ کے حوالے کر دیا تو اب کوئی تکلیف نہیں۔ بہرحال! راحت تفویض ہی میں ہے۔

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ

چنانچہ پرسوں میں نے حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا مقولہ سنایا تھا کہ ان سے کسی نے پوچھا کہ کیا حال ہے؟ کہا کہ اس شخص کا کیا حال پوچھتے ہو کہ اس کائنات میں کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف ہوتا ہی نہیں ______ لوگوں نے

اعتراض کیا کہ یہ کیسے ہوگیا۔ یہ چیز تو بڑے بڑے پیغمبروں کو حاصل نہیں ہوتی کہ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو، انہوں نے جواب دیا کہ دراصل میں نے اپنی مرضی کو اللہ کی مرضی میں فنا کر دیا ہے۔ جو اللہ کی مرضی، وہی میری مرضی۔ وہ اگر یہ چاہ رہے ہیں کہ مجھے زخم لگے تو میری مرضی بھی یہی ہے۔ وہ اگر چاہ رہے ہیں کہ مجھے صدمہ ہو۔ میری مرضی بھی یہی ہے۔ اس لئے سب کام میری مرضی سے ہو رہے ہیں۔ بہرحال! راحت اسی سے حاصل ہوتی ہے۔

راحت کی نیت سے تفویض مت کرو:

لیکن ایک باریک نکتہ حضرت والا آگے بیان فرما رہے ہیں کہ: وہ یہ کہ تفویض جو کرو، وہ راحت حاصل کرنے کی نیت سے مت کرو، بلکہ اللہ کے لئے اور اللہ کی رضا حاصل کرنے کی نیت سے تفویض کرو، کیونکہ اگر راحت حاصل کرنے کی نیت سے تفویض کروگے تو یہ دنیا داری ہوگئی، دین داری نہ ہوئی، اللہ کی رضا مقصود نہ ہوئی۔ مزہ اور لذت حاصل کرنی مقصود ہوگئی۔

نماز سے مقصود اللہ کی رضا ہے:

اسی سے وہ بات بھی واضح ہوگئی کہ یہ جو نماز اور دوسری عبادات ہیں، ان سے مقصود اللہ کو راضی کرنا ہے، لہٰذا اس فکر میں مت پڑو کہ نماز میں مزہ آتا ہے یا نہیں؟ بہت سے لوگ یہ شکایت کرتے ہیں کہ ہم نماز پڑھتے ہیں، مگر مزہ ہی نہیں آتا۔ ارے بھائی! کیا مزہ حاصل کرنے کی خاطر نماز پڑھ رہے تھے؟ نماز تو اللہ کو راضی کرنے کے لئے پڑھ رہے تھے۔ لہٰذا اس فکر میں نہ رہو کہ اس میں مزہ آ رہا ہے، یا نہیں آ رہا ہے۔ بلکہ اگر مزہ نہیں آ رہا ہوگا۔ مگر تم پھر بھی اللہ کو راضی کرنے

کے لئے نماز پڑھتے رہو گے تو اس میں اتنا ہی ثواب زیادہ ہوگا۔ وہ نماز اتنی ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہوگی۔ اس لئے کہ باوجودیکہ نماز پڑھنا اس کو مشکل لگ رہا تھا۔ نماز میں مشقت محسوس ہو رہی تھی، اور اس کو مزہ نہیں آ رہا تھا، اس کے باوجود یہ بندہ میرے حکم کی اطاعت میں کھڑا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کو اجر و ثواب بھی زیادہ دوں گا۔

قابل مبارکباد شخص:

اس وجہ سے نماز کے اندر مزہ حاصل ہونے کی فکر مت کرو۔ ہاں، اگر کبھی مزہ آ جائے تو اس کو اللہ تعالیٰ کا انعام تصور کرو، اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، لیکن اگر نماز کے اندر مزہ نہیں آیا تو اس کی وجہ سے یہ مت سمجھو کہ میری نماز بیکار ہوگئی، کیونکہ نماز پڑھنے سے مقصود مزہ حاصل کرنا تھا ہی نہیں ـــــــ سید الطائفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

> ''جس شخص کو ساری عمر نماز میں مزہ نہ آیا، پھر بھی وہ ساری زندگی نماز پڑھتا رہا، میں اس کو دل سے مبارکباد پیش کرتا ہوں، اس لئے کہ اس کی عبادت مکمل اخلاص والی عبادت ہے''۔

کیونکہ جس شخص کو نماز میں مزہ آ رہا ہو، اس کے بارے میں خطرہ ہو سکتا ہے کہ یہ شخص جو نماز پڑھ رہا ہے، یہ مزہ حاصل کرنے کے لئے پڑھ رہا ہے۔ اگر مزہ کے لئے پڑھ رہا ہے تو پھر اخلاص نہ ہوا۔ وہ نماز اللہ کے لئے نہ ہوئی۔ لیکن جس شخص کو نماز میں مزہ نہیں آ رہا ہے۔ اس کے باوجود وہ پابندی سے نماز پڑھتا جا

رہا ہے، اس کے اندر اخلاص کے سوا اور کیا ہوگا؟

مزہ کی خاطر نماز نہ پڑھے:

لہٰذا اگر کبھی نماز کے دوران خشوع خضوع طاری ہو جائے۔ اور لطف آ جائے، یا کیفیت طاری ہو جائے، یا رونا آ جائے، تو یہ بہت اچھا ہے، نعمت ہے، اللہ تعالیٰ کی عطا ہے، لیکن اگر کبھی ایسا نہ ہو تو یہ مت سمجھو کہ میری نماز قبول نہیں ہو رہی ہے۔ اور میری یہ نماز بیکار جا رہی ہے، اور جو میرا مقصد حاصل ہو رہا تھا، وہ اب حاصل نہیں ہو رہا ہے، اور شاید اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبولیت میں کمی آ گئی ہے بہت سے لوگ مجھے خط کے اندر یہی باتیں لکھتے ہیں ــــــ خوب سمجھ لیں کہ اس کے نتیجے میں نہ مقبولیت میں کمی آتی ہے، اور نہ ہی انسان راندہ درگاہ ہوتا ہے، اگر مزہ نہیں آ رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، بس شرط یہ ہے کہ انسان کام نہ چھوڑے، نماز نہ چھوڑے، بلکہ یہ عزم کرے کہ نماز میں مزہ آئے تو بھی پڑھوں گا، مزہ نہ آئے تو بھی پڑھوں گا، کیونکہ مقصود تو اللہ کو راضی کرنا ہے، اور اللہ کے حکم کی اطاعت ہے ــــــ بس یہ کرتے رہو، بیڑہ پار ہو جائے گا۔

ایک لطیفہ:

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بعض اوقات ہنسی مذاق کی بات بھی کرلیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک صاحب آئے، اور کہا کہ حضرت! میں کیا کروں، نماز میں مزہ ہی نہیں آتا۔ جواب میں حضرت نے فرمایا کہ مزہ تو مذی میں ہے ــــــ نماز میں کہاں مزہ تلاش کر رہے ہو ــــــ مطلب یہ تھا کہ نماز اس لئے پڑھنا کہ نماز میں لطف اور مزہ آئے، ارے اللہ تعالیٰ نے نماز لطف اور مزہ کے لئے

نہیں رکھی، بلکہ نماز تو اللہ کی اطاعت کے لئے ہے، جب تک تم اطاعت کر رہے ہو، اللہ تعالیٰ کے یہاں مقصود حاصل ہے۔

مزہ کی خاطر دوبارہ نماز پڑھنا:

بہرحال! جس طرح نماز میں مزہ آنے لگے، اور سرور طاری ہو جائے، اور کیف آنے لگے تو یہ اللہ کی نعمت ہے۔ لہٰذا اس پر شکرادا کرو کہ اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت دیدی۔ لیکن اگر مزہ نہ آئے، سرور طاری نہ ہو تو اس کی وجہ سے نماز کو بیکار مت سمجھو، نماز پھر بھی نماز ہے ـــــــ اب اگر کسی کو نماز میں مزہ آیا، اور اس نے سوچا کہ آج دوبارہ اس مزہ کو حاصل کرنے کی خاطر نماز پڑھتے ہیں، تو اب نماز پڑھنے کا مقصود ''مزہ'' حاصل کرنا ہو گیا، اب اخلاص نہ رہا، اور اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا مقصود نہ رہا ـــــــ تو جس طرح نماز کے اندر مزہ کو مقصود بنانا، نماز کو غارت کر دیتا ہے، اسی طرح اگرچہ ''تفویض'' سے راحت حاصل ہوتی ہے، لیکن تفویض کا مقصود ہی راحت کو قرار دیدینا کہ میں اس لئے تفویض کر رہا ہوں، تاکہ مجھے راحت ملے، تاکہ آرام ملے تو یہ غلط ہے، بلکہ تفویض صرف اللہ کی رضا کے لئے ہونی چاہئے، ہاں، اگر اس تفویض کے نتیجے میں راحت حاصل ہو جائے تو یہ بہت اچھی بات ہے، اس پر شکرادا کرو، لیکن راحت کی خاطر تفویض مت کرو۔

بڑھ گئی اور خلش ترکِ تمنا کر کے:

میرے بڑے بھائی جناب ذکی کیفی صاحب مرحوم، شاعر تھے، اور شعر میں تصوف کی باتیں بھی کہا کرتے تھے۔ اسی مضمون پر ان کا ایک شعر ہے کہ:

حسرتِ ترکِ تمنا بھی تمنا نکلی

بڑھ گئی اور خلش ترکِ تمنا کر کے

یعنی تفویض کے معنی ہیں ''تمنا کو ترک کر دینا'' تو اس تفویض کو حاصل کرنے کی تمنا کرنا، تاکہ مجھے تفویض حاصل ہو جائے، یہ بھی ایک تمنا ہے، اب جو میں نے تمنا کو ترک تو کیا، لیکن اللہ کی خاطر نہیں کیا۔ بلکہ مزہ حاصل کرنے کے لئے کیا تو اس کے نتیجے میں بجائے راحت حاصل ہونے کے اور خلش بڑھ گئی۔

تین ترک:

صوفیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے بڑی باریک بین نگاہ عطا فرمائی ہے، چنانچہ صوفیاء کے یہاں تین ''ترک'' مشہور ہیں: ① ترک دنیا ② ترک عقبیٰ ③ ترکِ ترک، ایک تو دنیا کو ترک کرنا۔ اور دنیا کو ترک کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے پاس جو مال و دولت ہے، اس کو ختم کر دو ____ نہیں، بلکہ ترک دنیا کا مطلب ہے، دنیا کی محبت دل سے نکال دینا ____ پھر فرمایا ترکِ عقبیٰ، ترک عقبیٰ کا مطلب یہ ہے کہ انسان جو عبادت کرے وہ اس نیت سے نہ کرے کہ مجھے اس کے بدلے میں جنت کے اندر پھل ملیں گے، اور اس میں بڑا مزہ آئے گا ____ بلکہ عبادت صرف اللہ کی رضا کے لئے کرے، ترکِ عقبیٰ کے یہ معنی ہیں۔

ترکِ ترک کی حقیقت:

تیسری چیز ہے ''ترکِ ترک'' یعنی یہ جو دنیا کی محبت چھوڑی ہے، اسے چھوڑنے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ کہ میں نے یہ چیز ترک کر دی ہے۔ اسی کو ''ترکِ ترک'' کہا جاتا ہے، کیونکہ اگر اس ترک کا خیال دل میں آ گیا تو وہ بھی طلب دینا ہو جائے گی ____ اب سوال یہ ہے کہ یہ بہت باریک بات کیسے

حاصل ہو؟ کہ دنیا بھی چھوڑی، دنیا کی محبت بھی چھوڑی، اور عقبیٰ کو بھی چھوڑا، اور اب اسے چھوڑنے کے خیال کو بھی چھوڑ دیں؟ یہ کیسے حاصل ہوگا؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ یہ کیسے حاصل ہوسکتی ہے، فرمایا کہ جب تم سو جاتے ہو، تو اس وقت تم دنیا سے بے خبر ہو جاتے ہو، اور تمہیں کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ تمہارے آس پاس کیا ہو رہا ہے، لیکن اگر تمہیں اس وقت یہ پتہ ہو کہ میں سو رہا ہوں، یہ سونا ہوگا؟ نہیں، بلکہ وہ کچی نیند ہے، کیونکہ آپ کو پتہ ہے کہ میں سو رہا ہوں، اصلی نیند اس وقت ہوگی جب آدمی کو یہ بھی پتہ نہ ہو کہ میں سو رہا ہوں۔ سونے کا احساس بھی ختم ہو جائے، تب حقیقت میں پکی نیند اور پکا سونا ہوگا۔ اس کا نام ''ترکِ ترک'' ہے، یعنی محبت دنیا بھی چھوڑی، اور محبت دنیا چھوڑنے کا احساس اور خیال بھی چھوڑ و، تب حقیقت میں ''ترکِ دنیا'' ہوگی، ورنہ اگر تمہارے دل میں یہ احساس ہے کہ میں بڑا زاہد ہوں، میں نے دنیا چھوڑ رکھی ہے، یہ تو ''ترک دنیا'' کا دھوکہ ہے، حقیقت میں ''ترکِ دنیا'' نہ ہوئی۔

تمام صفات میں ترکِ ترک ہونی چاہئے:

جیسے ''تواضع'' کی صفت ہے، تواضع کے معنی ہیں کہ اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھنا، یہ اس وقت صحیح ہوتی ہے جب آدمی واقعۃً اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھ رہا ہو، اور اس کو یہ خیال بھی نہ ہو کہ میں تواضع اختیار کر رہا ہوں، اگر کوئی شخص یہ سوچ کر تواضع کرے کہ میں تواضع اختیار کر رہا ہوں، تو وہ حقیقت میں تواضع نہ ہوئی۔ بلکہ تواضع کا دھوکہ ہو گیا ____ اسی کا نام ''ترکِ ترک'' ہے ____ اسی طرح انسان ''تفویض'' اختیار کرے، اور اس کو یہ خیال بھی نہ ہو کہ اس کے

ذریعے مجھے راحت حاصل ہو جائے گی، اسی طرح ترکِ دنیا ہو، لیکن ترکِ دنیا ہونے کا بھی احساس نہ ہو ـــــ یہ صوفیاء کرام کی باریک باتیں ہیں ـــــ یہ حضرات نفسیات کی بڑی گہری باتیں بتاتے ہیں۔

ہر کام اللہ کیلئے کرو:

خلاصہ یہ ہے کہ ''تفویض'' اختیار کرو، لیکن راحت حاصل کرنے کی نیت سے ''تفویض'' مت کرو ـــــ یہ بات تمام عبادات پر عائد ہوتی ہے۔ مثلاً نماز پڑھو تو صرف اللہ کی رضا کے لئے پڑھو، روزہ رکھو تو محض اللہ کی رضا کے لئے رکھو، مزہ حاصل کرنے اور لذت حاصل کرنے کی غرض سے نہ رکھو، مثلاً اگر کوئی شخص یہ سوچ کر روزہ رکھے کہ روزہ رکھنے سے صحت اچھی ہو جائے گی، پیٹ درست ہو جائے گا، اور شام کو افطاری کے وقت بڑی لذت حاصل ہو جائے گی، تو اس صورت میں وہ روزہ نہ ہوا، روزہ وہ ہے جو اللہ کے لئے رکھا جائے، چاہے اس سے پیٹ درست ہو جائے، اور افطاری میں لذت حاصل ہو جائے، لیکن یہ مقصود نہ ہو ـــــ یہی بات حضرت والا اس ملفوظ میں بیان فرما رہے ہیں کہ ''راحت کی نیت سے تفویض کرنا دین نہیں، بلکہ دنیا ہے۔ حقیقی ''تفویض'' وہ ہے جس میں یہ بھی قصد نہ ہو کہ اس سے چین ملے گا۔ بلکہ محض رضاءِ حق کا قصد ہو''

اسلام کی حقیقت:

آگے ایک اور ملفوظ میں حضرت والا نے ارشاد فرمایا کہ:

''اسلام کی حقیقت ''تفویض'' ہے، جو تمام حالات کو شامل ہے، خواہ حالات آفاقیہ ہوں، خواہ حالات انفسیہ ہوں، پھر

انفسیہ میں خواہ حسیہ ہوں، جیسے مرض وصحت اور قوت وضعف،
خواہ باطنیہ ہوں، جیسے قبض وبسط، ہیبت وانس، اور محبت وشوق
وامثالہا، سب کو اپنے سر آنکھوں پر رکھے''

(انفاس عیسی ص ۲۲۰)

فرمایا کہ: ''اسلام کی حقیقت تفویض ہے'' یعنی اسلام کے عربی زبان میں تقریباً وہی معنی ہیں جو تفویض کے ہیں، اس لئے کہ اسلام کے معنی ہیں'' اپنے آپ کو کسی کے سپرد کر دینا:

اَسۡلَمۡتُ نَفۡسِیۡ لِلّٰہِ ربّ الۡعَالَمِیۡنَ

میں نے اپنے آپ کو اللہ رب العالمین کے سپرد کر دیا۔

یہ ہے اسلام، لہٰذا جو معنی تفویض کے ہیں، وہی معنی اسلام کے ہیں۔

آفاقی حالات میں تفویض:

آگے فرمایا کہ ''جو تمام حالات کو شامل ہے'' یعنی ہر حالت میں تفویض اختیار کرے، ہر معاملہ اللہ کے حوالے کرے، اور تقدیر پر راضی رہے، ''خواہ حالات آفاقیہ ہوں''، آفاقی حالت جیسے گرمی لگ رہی ہے، تو اس وقت تفویض اختیار کرو کہ اللہ کو ایسا ہی منظور ہے، اس لئے گرمی ہو رہی ہے، اور میں اس پر راضی ہوں، سخت سردی پڑ گئی تو اللہ کی مرضی ایسی ہی ہے، میں اس پر راضی ہوں'' البتہ دعا مانگنا تفویض کے خلاف نہیں۔ مثلاً یہ دعا کی کہ یا اللہ! گرمی بہت لگ رہی ہے، اپنی رحمت سے گرمی کو دور فرما دیجئے، یا اللہ! بارش نہیں ہوئی، بارش عطا فرما دیجئے ____ یا اللہ! سردی بہت ہوگئی ہے۔ اس میں کمی کر دیجئے ____ لہٰذا دعا

مانگنا تفویض کے خلاف نہیں۔ لیکن دعا کرنے کے بعد جو کچھ پیش آئے، اس کو اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت کے مطابق قرار دینا اور اُسی میں بہتری سمجھنا تفویض ہے۔

نفسی حالات میں تفویض:

خواہ ''نفسی'' حالات ہوں، یعنی انسان کے اپنے جسم میں پیدا ہونے والے حالات، جیسے کہ کبھی کوئی بیماری آ گئی، کبھی صحت آ گئی، اور کبھی قوت آ گئی، اور کبھی ضعف آ گیا، ان حالات میں علاج ضرور کرے، تدبیر ضرور کرے، لیکن اگر شفا حاصل ہونے میں دیر لگ جائے تو پھر اس کو اللہ کے حوالے کرے کہ میرے لئے اسی میں خیر ہے ____ خواہ ''باطنی'' حالات ہوں، جیسے قبض و بسط، یعنی کبھی تو خوب نماز کا، عبادتوں کا ذوق اور شوق پیدا ہو رہا ہے، اور کبھی انقباض ہو رہا ہے، اور طبیعت عبادات کی طرف نہیں چل رہی ہے، اور پانچ وقت نماز پڑھنا مشکل ہو رہا ہے، مسجد تک جانا مشکل ہو رہا ہے، یہ سب ''قبض'' کے نتیجے میں پیش آ رہے ہیں ____ اور ''بسط'' کے معنی یہ ہیں کہ نماز کی طرف خوب رغبت ہے، اور بڑی خوشی سے مسجد کی طرف جا رہا ہے، یہ سب حالات انسان پر آتے جاتے رہتے ہیں ____ ان سب حالات میں ''تفویض'' مطلوب ہے۔

مسجد جانا نہ چھوڑے

لہٰذا اگر کبھی طبیعت عبادت کی طرف نہیں چل رہی ہے اور نماز کے لئے مسجد کی طرف جانے کا شوق نہیں ہو رہا ہے تو اس کو بھی اللہ کے حوالے کر دو کہ یا اللہ! یہ کیفیت بھی آپ کی پیدا کردہ ہے، آپ ہی کا فیصلہ ہے، اور میں [illegible] کے

اس فیصلے پر راضی ہوں ____ لیکن اصل بنیادی بات یہ ہے کہ نماز کے لئے مسجد جانا نہ چھوڑے، چاہے قبض ہو، یا بسط ہو، طبیعت میں انقباض ہو، یا بشاشت ہو، مسجد کی طرف جانے کا دل نہیں چاہ رہا ہے، اور طبیعت پر گرانی ہو رہی ہے، اس وقت یہ کہو کہ میں ضرور مسجد جاؤں گا، چاہے میرے دل پر آرے چل جائیں۔ چاہے میرے سر پر پہاڑ ٹوٹ جائے، لیکن مسجد ضرور جاؤں گا ____ اگر یہ کام کرلیا تو پھر قبض کی وہ کیفیت جو تمہارے لئے نقصان دہ ہو رہی تھی، وہ کیفیت تمہارے لئے مزید اجر و ثواب کا باعث بن جائے گی۔ انشاء اللہ

بہار ہو کہ خزاں لا اِلہ الا اللہ

اقبال بعض اوقات بڑی حکیمانہ بات کہتے ہیں، ان کا ایک شعر ہے کہ:

یہ نغمہ فصل گلِ و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

چاہے موسم کیسا بھی ہو، ہر وقت لا الہ الا اللہ پڑھنا ہے، یہ نہیں کہ جب پھولوں کا اور بہار کا موسم آئے گا تو لا الہ اِلا اللہ پڑھیں گے، جب خزاں کا موسم آئے گا تو نہیں پڑھیں گے، نہیں۔ بلکہ ہر حالت میں، ہر موسم میں کلمہ لا الہ الا اللہ'' پڑھیں گے، چاہے پڑھنے میں مزہ آ رہا ہو، چاہے پڑھنے میں تکلیف ہو رہی ہو، چاہے ایسے حالات ہوں، جس میں اللہ کا نام لینے کی آزادی ہو، چاہے ایسے حالات ہوں، جس میں اللہ کا نام لینے میں خطرات ہوں، لیکن ہر حالت میں اللہ کا نام ''لا الہ الا اللہ'' لیتے رہو اور اللہ کی عبادت کرتے رہو۔

اللہ کے بندے بنو:

لہٰذا یہ نہ ہو کہ جب دل چاہا، تب تو نماز پڑھ لی، اور جب دل نماز پڑھنے کو نہیں چاہا تو نماز چھوڑ بیٹھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنے دل کے بندے بن گئے، اللہ کے بندے تو نہ ہوئے ____ لہٰذا چاہے دل چاہ رہا ہو، یا نہ چاہ رہا ہو، مشقت ہو رہی ہو، یا تکلیف ہو رہی ہو، ہر حالت میں اللہ کی طرف متوجہ رہو، اس وقت تمہارا امتحان ہے کہ تمہارے دل پر آرے چل رہے ہیں، بستر سے اٹھا نہیں جا رہا ہے، اور طبیعت کسمسا رہی ہے، طبیعت کسل مند ہو رہی ہے۔ لیکن کان میں ''حی علی الصلاۃ، حی علی الفلاح'' کی آواز آ گئی اور آواز سن کر مسجد کی طرف چل پڑے تو بس تم کامیاب ہو گئے، چاہے بے دلی کے ساتھ نیند کی حالت میں نماز کے لئے کھڑے ہو گئے، تب بھی تم کامیاب گئے۔

شیطان نے تمہیں چت کر دیا:

لیکن اگر تم نے اس وقت مسجد کی طرف جانے کو ترک کر دیا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان نے تمہیں چت کر دیا، اس لئے کہ تم نے اس کی بات مان لی ____ بہرحال! قبض ہو کہ بسط ہو، دل چاہے، یا نہ چاہے، نماز میں مزہ آئے، یا نہ آئے، لیکن ہر حال میں اللہ کے حکم کی اطاعت کرنی ہے، بس، یہی سارے دین کا خلاصہ ہے، اگر یہ بات ہمارے ذہن میں بیٹھ جائے تو انشاء اللہ، سارے دین پر عمل آسان ہو جائے، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

و آخر دعوانا ان الحمدللہ ربّ العالمین

اللّٰہُ أکبر اللّٰہُ أکبر

لا إلٰہ إلا اللّٰہ

واللّٰہ أکبر

اللّٰہ أکبر

وللّٰہ الحمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توکل کی حقیقت

مجلس نمبر 109

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہم

ضبط وترتیب
محمد عبداللہ میمن
استاد جامعہ دارالعلوم کراچی۔

میمن اسلامک پبلشرز

مقام خطاب : جامع مسجد دارالعلوم کراچی۔

تاریخ خطاب : رمضان المبارک 1422ھ

وقت خطاب : بعد نماز ظہر

اصلاحی مجالس : جلد نمبر 7

مجلس نمبر : 109

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ
اَللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرٰھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرٰھِیْمَ
اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

توکل کی حقیقت

مجلس نمبر 109

الحمدللّٰہ ربّ العالمین، والعاقبة للمتقین، وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلیٰ رسوله الکریم، وعلی آله وأصحابه اجمعین۔ وعلی کل من تبعهم باحسان الی یوم الدین۔ امابعد:

ترک اسباب کی حقیقت:

ایک ملفوظ میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا:

''ترکِ اسباب کی حقیقت یہ ہے'' ترکِ اسباب مظنونہ غیر مامور بہا، یعنی جن اسباب پر مسبب کا ترتب عادۃً یقینی اور قطعی نہ ہو، اور شرعاً وہ واجب بھی نہ ہو، ان کو ترک کر دینا جائز ہے، باقی جن اسباب پر عادۃً مسببات کا ترتب یقینی ہے، ان کا ترک جائز نہیں، مثلاً عادۃً کھانا کھانے پر شبع کا ترتب، اور پانی پینے پر سیرابی کا ترتب، اور اسباب مظنونہ کا ترک بھی اس شخص کو جائز ہے جو خود بھی قوی الہمت ہو، اور

اس کے اہل و عیال بھی، یا اس کے اہل و عیال ہی نہ ہوں،
اسی طرح اسباب مامور بہا کا ترک توکل نہیں، کیونکہ وہ سب
اسباب قطعیہ یقینیہ ہیں۔ (انفاس عیسی ص ۲۲۱)

یہ چند مختصر جملوں نے حضرت والا قدس اللہ سرہ نے ''توکل'' کی حقیقت، اور صوفیاء کرام سے توکل کے بارے میں جو واقعات منقول ہیں، ان کی حقیقت بیان فرمادی۔

توکل معنی:

پہلے تو یہ سمجھ لیں کہ توکل کے معنی ہیں: ''اللہ پر بھروسہ کرنا'' یعنی یہ یقین رکھنا کہ جتنے بھی اسباب ہیں، ان اسباب میں کچھ بھی نہیں رکھا، ان اسباب میں اللہ تعالیٰ جب تاثیر پیدا فرمائیں گے تو تاثیر ہوگی، ورنہ نہیں ہوگی، لہٰذا بھروسہ اس سبب نہیں، بلکہ بھروسہ مسبب الاسباب یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ پر ہے، جیسے ایک آدمی روزگار تلاش کررہا ہے، تو اب اس لئے اسباب بھی اختیار کررہا ہے، وہ یہ کہ مختلف جگہوں پر ملازمت کے لئے درخواستیں دے رہا ہے، لیکن ان درخواستوں پر بھروسہ نہیں ہے، بلکہ وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ یہ درخواست بھیجنا تو ایک سبب ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے اس میں تاثیر ڈال دی تو فائدہ ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا، اور بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہے۔۔۔۔۔

میں دوا کرتا ہوں، شفا اللہ دیگا:

یا مثلاً ایک شخص بیمار ہوا، اور علاج کے لئے ایک اچھے ڈاکٹر کی طرف رجوع کیا، اس ڈاکٹر نے نسخہ لکھا اور آپ نے دوا منگوائی، اور دوا استعمال کرلی، یہ

سب تدابیر اور اسباب ہیں۔ لیکن ان اسباب پر بھروسہ نہیں، بلکہ بھروسہ اللہ تعالیٰ پر ہے کہ نہ ڈاکٹر کے اندر کچھ رکھا ہے، نہ دوا میں کچھ رکھا ہے، نہ کسی نسخہ میں کچھ رکھا ہے، بلکہ اصل میں شفا دینے والا وہ ہے______ ہمارے ڈاکٹر نذیر صاحب یہاں بیٹھے ہیں، انہوں نے اپنے مطب میں ایک خوبصورت جملہ لکھوا رکھا ہے، مجھے بہت پسند آیا، وہ یہ کہ:

''میں دوا کرتا ہوں، آپ دعا کرو، اللہ شفاء دے گا''

یعنی میرا کام ہے دوا کرنا، تمہارا کام ہے دعا کرنا، اور شفاء دینے والی ذات اللہ ہے، بس یہ ہے ''توکل'' یعنی تدبیر تو کر لی، لیکن اس تدبیر پر بھروسہ نہیں، بھروسہ اللہ جل شانہ کی ذات پر ہے۔

اسباب کا ترک کرنا توکل نہیں:

لہٰذا توکل کے اندر یہ نہیں ہوتا کہ آدمی اسباب کو چھوڑ کر بیٹھ جائے، یعنی نہ ڈاکٹر کے پاس جائے اور اگر جائے اور وہ ڈاکٹر نسخہ لکھ دے تو دوا نہ منگوائے، اور اگر دوا آ جائے تو آدمی دوا نہ کھائے، اور پھر یہ کہے کہ مجھے تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے، وہ مجھے شفاء دے گا۔ یہ توکل نہیں، یا ملازمت کے لئے نہ تو درخواست دی، نہ ملازمت کی تلاش میں بھاگ دوڑ کی، بلکہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر گھر میں بیٹھ گئے اور یہ سوچا کہ اللہ میاں خود ہی رزق بھیج دے گا، یہ ترکِ اسباب توکل کا حصہ نہیں۔

اونٹ کو رسی سے باندھ کر پھر توکل کرو:

خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حقیقت بیان فرما دی، وہ یہ کہ ایک صحابی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! بعض اوقات میں

اونٹنی پر سفر کرتا ہوں، سفر کے دوران مجھے کہیں نماز کے لئے یا دوسری ضرورت کے لئے رکنے کی ضرورت پیش آتی ہے، اس وقت مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نماز کے لئے کھڑا ہو جاؤں، اور اونٹنی بھاگ جائے، تو کیا اس وقت میں اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اونٹنی کو ویسے ہی چھوڑ دوں؟ کیونکہ میں اللہ تعالیٰ کے لئے نماز پڑھ رہا ہوں تو اللہ تعالیٰ میری اونٹنی کی حفاظت کریں گے، یا اس اونٹ کی پنڈلی کو رسی سے باندھ دوں، تاکہ وہ بھاگ نہ جائے؟ جواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اِعْقِلْ سَاقَهَا وَتَوَكَّلْ

پہلے اس اونٹنی کی پنڈلی کو رسی سے باندھو، اور پھر اللہ پر توکل کرو ____

اپنے حصے کا کام تم کرو:

اس حدیث شریف کے ذریعہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا کہ اسباب کو اختیار کرنا بھی تمہارا کام ہے۔ اپنے حصے کا کام تم کرو، اور باقی کو اللہ کے حوالے کر کے اس پر بھروسہ کرو، مثلاً اونٹ کی پنڈلی کو اچھی طرح رسی سے باندھ دیا، اب باندھنے کے بعد یہ وہم نہ کرو کہ اگر اونٹنی رسی توڑ کر بھاگ جائے گی تو کیا ہوگا؟ کوئی چور آ کر رسی کاٹ کر اونٹنی کو لے جائے گا تو کیا ہوگا؟ ان اوہام کے اندر نہ پڑو۔ بلکہ تمہارے اختیار میں جو سبب ہے، وہ اختیار کر کے پھر اللہ پر بھروسہ کرو، کہ اللہ تعالیٰ اس کے بعد جو کچھ کریں گے اس میں خیر ہوگی ---- بہرحال! اسباب اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ توکل کے منافی نہیں، بلکہ اسباب اختیار کرنا توکل کا ایک حصہ ہے۔

بعض صوفیاء کا ترک اسباب کرنا:

البتہ بعض صوفیاء اکرام سے منقول ہے کہ انہوں نے اسباب کو بالکل ترک کر دیا، مثلاً نہ انہوں نے روزگار تلاش کیا، نہ محنت کی، بلکہ اطمینان سے بیٹھے اللہ اللہ کر رہے ہیں، اور اللہ پر بھروسہ کئے ہوئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ رزق بھیج دے گا، اس طرح انہوں نے اسباب کو بالکل ترک کر دیا، کیا ان صوفیاء کا یہ طرز عمل شریعت کے خلاف ہے؟ ــــــ اس کے جواب کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اسباب کو ترک کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس ملفوظ میں اسی کو بیان فرمایا ہے۔

اسباب یقینیہ کا ترک جائز نہیں:

فرمایا کہ: اسباب دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک اسباب وہ ہوتے ہیں جس پر نتیجہ کا ترتب تقریباً قطعی اور یقینی ہوتا ہے، مثلاً بھوک لگ رہی ہے، اور کھانا سامنے موجود ہے، اب کھانا کھاؤ گے تو اس کے نتیجے میں بھوک مٹ جائے گی، لہٰذا کھانا کھانا سبب ہے، اور بھوک مٹنا اس کا نتیجہ ہے۔ جس کو اصطلاح میں مسبب کہا جاتا ہے۔ اب یہاں سبب اختیار کرنے کے بعد نتیجہ کا حصول یقینی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ــــــ یا مثلاً پیاس لگ رہی ہے اور پانی موجود ہے، اور پانی پینا پیاس بجھنے کا یقینی سبب ہے، ان کو اسباب یقینیہ کہا جاتا ہے، حضرت والا فرما رہے ہیں کہ اسباب یقینیہ کو ترک کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں، لہٰذا اگر کھانا موجود ہے اور بھوک لگ رہی ہے، لیکن پھر بھی کھانا نہ کھائے کہ میں تو اللہ تعالیٰ پر توکل کر رہا ہوں، کھانا کھائے بغیر اللہ تعالیٰ ویسے ہی میری بھوک مٹا دے گا۔ ایسا توکل

کرنا حرام ہے، گناہ ہے۔ اگر اس حالت میں بھوک کی وجہ سے مر جائے گا تو حرام موت مرے گا ــــــ پانی موجود ہونے کے باوجود نہیں پی رہا ہے، اگر مر جائے گا تو حرام موت مرے گا، کیونکہ یقینی اسباب کے موجود ہوتے ہوئے ان کو ترک کرنا حرام ہے، کسی بھی حالت میں جائز نہیں۔

اسباب ظنّیہ:

اسباب کی دوسری قسم وہ ہے جن کو ''اسباب ظنیہ'' کہا جاتا ہے، یعنی گمان اس بات کا ہے کہ اگر یہ سبب اختیار کریں گے تو اس پر یہ نتیجہ مرتب ہوگا۔ اس نتیجہ کا صرف گمان اور خیال ہے، یقین نہیں۔ مثلاً اگر میں فلاں جگہ ملازمت کے لئے درخواست دوں گا تو ملازمت ملنے کا گمان ہے، یقین نہیں۔ اس کا احتمال ہے کہ ملازمت مل جائے، اور یہ احتمال بھی ہے کہ درخواست رد ہو جائے، یا مثلاً بیماری میں دوا کھاؤں گا، تو اس میں اس کا بھی احتمال ہے کہ شفا ہو جائے، اور لیکن ساتھ میں یہ بھی احتمال ہے کہ فائدہ نہ ہو۔ لہٰذا یہ اسباب ایسے ہیں کہ آن کا نتیجہ ظاہر ہونا یقینی نہیں، بلکہ صرف گمان ہیں، یہ اسباب کی دوسری قسم میں داخل ہیں۔

اسباب ظنّیہ کے ترک کا حکم:

اسباب کی دوسری قسم کا حکم یہ ہے کہ اس کو ترک کرنا بھی عام آدمی کے لئے اور کمزوروں کے لئے جائز نہیں۔ اور اس شخص کے لئے بھی ان اسباب کو ترک کرنا جائز نہیں جس کے ذمے دوسروں کے حقوق ہوں، مثلاً روزی کی تلاش، ملازمت کی تلاش اور اس کے درخواست دینا وغیرہ یہ اسباب ایسے ہیں کہ ان کے نتیجے میں روزگار کا مل جانا یقینی نہیں۔ بلکہ گمان ہے۔ مثلاً اگر میں ٹھیلا لے کر

سامان لے کر بازار جاؤں گا تو مجھے امید ہے کہ میری بکری ہو جائے گی، اور میری آمدنی ہو جائے گی، یا مثلاً دکان کھول کر بیٹھوں گا تو آمدنی ہو جائے گی۔ یہ سب اسباب ظنی ہیں، یقینی نہیں ـــــ ان اسباب کا ترک کرنا ہم جیسے کمزوروں کے لئے جائز نہیں، اور ہم سب اس کے اندر داخل ہیں ـــــ اسی طرح جس شخص کے ذمے دوسروں کے حقوق واجبہ ہیں، اس کے لئے ان اسباب کا ترک جائز نہیں۔ مثلاً ایک شخص بڑا طاقت ور ہے، قوی ہیکل ہے، بڑا صحت مند ہے۔ اگر اس پر دس دن کے فاقے آجائیں گے تو اس پر کوئی اثر نہیں پڑے گا ـــــ لیکن اس کے بیوی بچے بھی ہیں، تم تو فاقہ برداشت کر لو گے، لیکن بیوی بچے کھانا مانگیں گے تو کیا ان کو یہ جواب دو گے کہ میں توکل کئے بیٹھا ہوں، لہٰذا تم بھی توکل کرو، اور کھانا نہیں ملے گا ـــــ یہ درست نہیں، کیونکہ ان بیوی بچوں کے حقوق تمہارے ذمے واجب ہیں۔ اس لئے اگر تم نے روزگار کی تلاش نہ کی تو گناہ گار ہو گے ـــــ کیونکہ تم نے بیوی بچوں کا حق فوت کر دیا۔

ایسے شخص کیلئے توکل مستحب ہے:

ہاں! ایک شخص بالکل تن تنہا ہے، اکیلا ہے، نہ اس کی بیوی ہے، نہ بچے ہیں، اور نہ اس کے والدین، اور نہ اس کے ذمے حقوق واجبہ ہیں، اور صحت کے اعتبار سے وہ قوی ہے، وہ یہ سوچتا ہے کہ میں کہاں ملازمتیں تلاش کروں، اور ملازمت کے چکر میں پڑوں، یا تجارت کروں، بس اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہے، جب اللہ تعالیٰ دیں گے، شکر کر کے کھالوں گا، نہیں دیں گے تو صبر کروں گا، اور اگر کئی دنوں تک فاقے بھی آجائیں تو میں شکوہ نہیں کروں گا، نہ مطالبہ کروں گا۔ ایسا

شخص جو قوی الہمت ہے، اور یہ اگر توکل کرے اور اسباب مظنونہ، کو بھی ترک کر دے تو اس کے لئے ایسا توکل کرنا نہ صرف جائز، بلکہ مستحب ہے۔

حضور اقدس ﷺ کا توکل:

مستحب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اگرچہ شروع کے دور میں بکریاں بھی چرائیں، تجارت بھی فرمائی، زراعت بھی فرمائی، یہ سارے اسباب اختیار کئے۔ لیکن مدینہ منورہ میں ایک زمانہ ایسا آیا کہ آپ ﷺ نے ان تمام اسباب کو ترک کر دیا، نہ زراعت، نہ تجارت، نہ ملازمت، اور گھر میں تین تین مہینے تک آگ نہیں جل رہی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم تین تین چاند دیکھ لیتے تھے اور ہمارے گھر کے چولہے ٹھنڈے ہوتے تھے۔ اور ان میں آگ نہیں جلتی تھی ____ ان سے کسی نے پوچھا کہ پھر آپ کا گزارہ کیسے ہوتا تھا؟ آپ نے فرمایا کہ دو چیزوں پر ہمارا گزر بسر تھا، ایک کھجور اور ایک پانی۔ دو وقت پیٹ بھر کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا تناول نہیں فرمایا، اور ساری عمر گندم کی روٹی تناول نہیں فرمائی۔ بلکہ جو کی روٹی تناول فرمائی۔ ان سب حالات کے باوجود آپ ﷺ نے معاش کی تلاش نہیں فرمائی ____ لیکن لوگوں کو آپ نے یہی حکم دیا کہ معاش کو تلاش کرو۔ لہٰذا یہ توکل سنت کے خلاف نہیں۔ بلکہ مستحب ہے۔

ایسے شخص کیلئے اسباب مظنونہ کا ترک جائز ہے:

بہر حال! اگر کوئی شخص ایسا ہے کہ اس کے ذمے دوسروں کے حقوق بھی نہیں، یا دوسروں کے حقوق تو ہیں، لیکن جن کے حقوق ہیں وہ بھی اسی جیسے قوی

الہمت ہوں، یعنی بیوی بچے بھی اسی کی طرح ہوں، جیسے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں، وہ فرماتی ہیں کہ تین تین مہینے تک گھر میں آگ نہیں جلتی تھی، لیکن زبان پر شکوہ کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا، کسی تکلیف کا اظہار نہیں ہو رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ ہے، اور یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جیسی زندگی گزار رہے ہیں، ہم بھی ویسی ہی زندگی گزاریں گے، ایسے لوگوں کے لئے اسباب مظنونہ کو ترک کرنا اور توکل اختیار کرنا مستحب ہے۔

صوفیاء کرام اور اسباب ظنّیہ کا ترک:

لہٰذا جتنے صوفیاء اکرام سے یہ بات منقول ہے، جیسے حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ وہ معاش کے لئے کوئی کام نہیں کرتے تھے، کئی کئی دنوں تک فاقوں پر فاقے ہو رہے ہیں، لیکن بڑے اطمینان سے زندگی گزار رہے ہیں ــــــ اب بعض لوگ ایسے بزرگوں پر اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ یہ صوفیاء کرام خلاف فطرت اور خلاف شریعت کام کر رہے ہیں، ایسا کرنا جائز نہیں ــــــ حالانکہ ایسے صوفیاء کرام اعتراض کا محل نہیں۔ کیونکہ یہ بھی سنت کا طریقہ ہے، البتہ قوی الہمت انسان کے لئے ہے، ہم جیسے لوگوں کے لئے نہیں، بلکہ ہم جیسے لوگ سبب معاش اختیار کریں اور پھر اللہ پر بھروسہ کریں، لیکن جن حضرات نے قوی الہمت ہونے کی وجہ سے اسباب کو ترک کر دیا ہے ان پر اعتراض بھی نہ کریں۔ اسی بات کو حضرت والا نے اس ملفوظ میں بیان فرمایا ہے:

''توکل مستحب کے لئے ضرورت ہے فطرۃً قوتِ قلب، اور
حقوق واجبہ کا ذمہ نہ ہونا، یا اہل حقوق کا بھی ایسا ہی ہونا''

(انفاس عیسیٰ ص ۲۱۹)

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں تم جو بھی کام کرو تو جو کام تمہارے کرنے کے ہیں، یعنی اسباب اختیار کرنا، ان کو ضرور اختیار کرو، لیکن بھروسہ ان اسباب پر نہ کرو، بھروسہ صرف اللہ جل شانہ کی ذات پر کرو، اگر ایسا کرو گے تو یہ توکل کے خلاف نہیں ــــــ توکل کے خلاف یہ ہے کہ صبح سے لے کر شام تک نگاہ صرف سبب پر لگی ہوئی ہے، مسبب الاسباب یعنی اللہ جل شانہ کی طرف دھیان نہیں، مثلاً ملازمت کے لئے کبھی ایک دفتر میں درخواست دے رہا ہے، کبھی دوسرے دفتر میں درخواست دے رہا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتا، کہ یا اللہ! میں یہ تدبیر تو کر رہا ہوں، لیکن دینے والی ذات تو آپ کی ہے، آپ عطا فرما دیجئے، یہ بات توکل کے خلاف ہے۔

اسباب میں غلو اور انہماک درست نہیں:

دوسری بات توکل کے خلاف یہ ہے کہ اسباب کی دو قسمیں ہیں، ایک قسم کے اسباب وہ ہیں جو ظاہری اسباب ہیں، اور دوسری قسم کے اسباب وہ ہیں جس میں تعمق اور انہماک ہے ــــــ مثلاً آپ کو کہیں سفر پر جانا ہے، تو اب ایک سبب یہ ہے کہ اچھی سواری کا بندوبست کرلو، لیکن اسباب میں انہماک اور تعمق کرنا، مثلاً یہ کہ فلاں وقت میں گاڑی آتی ہے، مجھے فلاں وقت میں اسٹیشن پہنچنا ہے، لیکن راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آئے، اب ہر ہر مرحلہ کے لئے الگ الگ اسباب اختیار کر رہا ہے یہ غلو فی الاسباب ہے اور توکل کے خلاف ہے، حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

اَجۡمِلُوۡا فِی الطَّلَبِ وَتَوَکَّلُوۡا عَلَیۡهِ

یعنی طلب میں اجمال سے کام لو، اور معمول کے جو اسباب ہیں، بس ان کو اختیار کرو، اسباب اختیار کرنے میں بہت زیادہ کنج کاؤ میں نہ پڑو، بہت زیادہ انہماک میں مبتلا نہ ہو ـــــــ

داغنے کا علاج غلو فی الاسباب ہے:

اسی لئے ایک طرف تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے علاج کا حکم دیا کہ جب تم بیمار ہو جاؤ تو اپنا علاج کرو، دوا استعمال کرو، اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی بیماریوں کی دوائیں بھی بتائیں، لیکن بعض علاج کے ذرائع کو آپ نے ناپسند فرمایا، مثلاً ''کئ'' کے ذریعہ علاج کرنے کو آپ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا، اس زمانے میں جب کوئی دوسرا علاج کارگر نہ ہوتا تو اہل عرب ''کئ'' یعنی داغنے کے ذریعے علاج کیا کرتے تھے، لوہے کی سلاخ کو آگ پر گرم کر کے اس کے ذریعہ جسم کے کسی حصے کو داغتے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا اس لئے کہ یہ طریقہ علاج تدبیر میں انہماک کرنے میں داخل ہے، اس انتہا تک پہنچنا کسی طرح مناسب نہیں۔

دل کو حرکت دینے والی مشین:

آج کل لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بعض اوقات مریض کے اوپر کئی مشینیں لگا دی جاتی ہیں، اب مشین کے ذریعہ دل کی حرکت چل رہی ہے، مشین کے ذریعہ سانس آ رہا ہے، اور غالب گمان یہ ہے کہ اگر مشین ہٹا دیں گے تو دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔ سانس بند ہو جائے گا، اور آدمی مر جائے گا ــــــ ایسے موقع پر لوگ سوال کرتے ہیں کہ مشین ہٹانا جائز ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر محققین

نے طبّی نقطہ نظر سے بھی اور شرعی نقطہ نظر سے بھی لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں، میرے پاس پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک کتاب ہے، جس میں یہ بحث کی ہے کہ وہ مشین ہٹانا جائز ہے یا نہیں؟ اور کیا موت دل کے بند ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے یا دماغ کے فیل ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے؟ ـــــ

ایسی مشین کو ہٹانا جائز ہے:

یہ ساری بحثیں اس غلط فہمی پر مبنی ہیں کہ وہ لوگ مشین لگانا ضروری سمجھ رہے ہیں--- یاد رکھئے، اگر زندگی کسی مشین پر موقوف ہو جائے تو مشین لگانا واجب نہیں ہوتا، بلکہ اس مشین سے پرہیز کیا جائے تو بہتر ہے، اس لئے کہ مشین لگانا غلو فی الاسباب میں داخل ہے، لہٰذا مشین جس کے استعمال پر لاکھوں روپیہ کا خرچہ آرہا ہے اور اس کے بغیر زندگی باقی نہیں رہ سکتی، ایسی مشین لگانا کوئی ضروری نہیں۔ اگر کوئی شخص اس مشین کو نہ لگائے، یا لگا کر پھر ہٹا دے تو اس پر نہ صرف یہ کہ گناہ نہیں ہوگا۔ بلکہ شاید عدم غلو فی الاسباب کا ثواب مل جائے گا۔ لہٰذا اس مشین کے ہٹانے کے نتیجے میں اس شخص کی جان جاتی ہے تو جانے دے ــــــ اس لئے کہ یہ مشین ان اسباب میں سے نہیں ہے جن کو اختیار کرنا ضروری ہے، بلکہ اس کا استعمال غلو فی الاسباب کے اندر داخل ہے۔

خلاصہ:

بہر حال! توکل کے خلاف دو باتیں ہوئیں، ایک یہ کہ آدمی کی نگاہ صرف اسباب کی طرف ہو، اور اللہ تعالیٰ کی طرف نگاہ نہ ہو ــــــ دوسرے یہ کہ اسباب میں بھی اتنا انہماک اور غلو ہو کہ آدمی آخری درجہ تک چلا جائے، اس کی

بھی ضرورت نہیں، بلکہ فرمایا کہ:

اجملوا فی الطلب وتوکلوا علیہ

بس، سامنے سامنے کی جو سادہ تدبیریں ہیں ان کو اختیار کرو۔ اور پھر اللہ پر بھروسہ کرو ــــــــ یہ ہے توکل کا حاصل، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت سے یہ توکل عطا فرمادیں۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمدللّٰہ ربّ العالمین

محمد مشہود الحق کلیانوی
03?3-920 54 97
0322-2?41 88 20
E-mail : memonip@hotmail.com